نذر

محبت کے آنسوؤں کے ساتھ

ان کے قدموں میں

جو اس دنیا میں موجود ہیں۔ یا دوسری دنیا میں چلے گئے۔ اور جن کی محبت، اخلاص اور دوست نوازی کی یاد ہمیشہ ہی سے میرے دل میں مسرت، راحت اور طہارت پیدا کرنے کا باعث ہوئی۔

نذر گزار

دیوان سنگھ

یکم نومبر ۱۹۵۷ء

دیباچہ

دوسرے لوگوں کے لئے تو شاید جیل مصائب ومشکلات کا باعث ہو۔مگر جیل کی زندگی میرے لئے تو ہمیشہ ہی ایک نعمت ثابت ہوئی۔کیونکہ جیل سے باہر جہاں مجھے ایک منٹ کے لئے بھی فرصت نہ ملتی تھی۔میں اپنے ماضی، حال اور مستقبل کے متعلق سوچ نہ سکتا تھا۔اور مالی مشکلات ہمیشہ ہی ذہنی کوفت اور پریشانی کا باعث رہیں۔ جیل میں کوئی کام نہ ہونے کے باعث مجھے اپنی حالت پر غور کرنے کے لئے کافی وقت ملا۔اور چونکہ وہاں مالی پریشانیوں کا سوال ہی نہیں ہوتا۔میں وہاں ہمیشہ ہی اس کوشش میں رہا کہ اپنی حالت پر سنجیدگی سے غور کروں۔اور وہاں کے فرصت کے زمانے کو''ریاست'' اور پبلک کے لئے زیادہ سے زیادہ مفید اور کارآمد بنا سکوں۔ چنانچہ نواب بھوپال والے مقدمے میں جب میں تین ماہ کے لئے ناگ پور جیل رہا تو میں نے ''ریاست'' کے مستقل کالم''جذبات مشرق'' کے لئے ہندی کے بہترین شعراء کے کلام کا اتنا ترجمہ کرلیا جو آئندہ کئی ماہ کے لئے کافی تھا۔اور رہا ہوتے ہی دہلی پہنچ کر میں نے اس نئے اور مستقل کالم کو شروع کردیا۔اور انبالہ وفیروز پور جیل میں جب ایک سال کے قریب رہنے کا اتفاق ہوا تو میں نے اپنے ذہن پر زور دے کر اپنی گزشتہ زندگی کے اکثر واقعات کے نوٹ لے لیے اور دہلی پہنچتے ہی مستقل عنوان''ناقابل فراموش'' قائم کر کے اس کے لئے ہر ہفتہ ایک مضمون لکھنا شروع کردیا۔ چنانچہ اگر میں جیل نہ جاتا تو کالم شاید کبھی جاری نہ ہوسکتا۔کیونکہ جیل سے باہر پچھلے واقعات کو یاد کرکے ان کے متعلق نوٹ لینے کی فرصت ہی نہ تھی۔

''ریاست'' میں جب ہر ہفتہ''ناقابل فراموش'' کالم کے مضامین شائع ہونے شروع ہوئے تو یہ پبلک میں بے حد مقبول ہوئے اور مجھے یاد ہے،اس زمانہ میں جب چھوٹے سائز پر چند مضامین کا مجموعہ شائع ہوا،تو ایک بہت بڑے ادیب جو اس زمانہ میں دہلی میں گورنمنٹ ہند کے ایک بہت بڑے عہدہ پر تھے۔آج کل پاکستان میں

ایک منسٹر کی پوزیشن میں ہیں ۔ اور جو اپنے مطالعہ کے لئے پانچ سو روپیہ ماہوار کی کتابیں یورپ اور امریکہ سے مستقل طور پر خریدا کرتے تھے، میں نے ایک خط لکھا، جس میں آپ کا ارشاد تھا کہ آپ نے اپنی زندگی میں اس کتاب سے زیادہ دلچسپ دوسری کوئی کتاب کسی زبان میں نہیں دیکھی، اور ان کی خواہش ہے کہ اس کتاب کا انگریزی زبان میں بھی ترجمہ شائع ہو۔ اس بڑی پوزیشن کے ادیب کا یہ خط میری اور بھی حوصلہ افزائی کا باعث ہوا۔ اور ان مضامین کا سلسلہ کئی برس تک جاری رہا۔ جواب موجودہ کتاب کی صورت میں شائع کیا جا رہا ہے۔ اور اس میں ایسے بہت سے نئے مضامین بھی شامل کر دیئے گئے ہیں جو صرف اس کتاب کے لئے حال ہی میں لکھے گئے ہیں اور جو قطعی غیر مطبوعہ ہیں۔

''ریاست'' ۱۹۲۴ء میں جاری کیا گیا، اور آج اس کو تینتیس برس ہوئے اور گو ''ریاست'' اردو زبان کا بہترین باتصویر ہفتہ وار تھا۔ جو انگریزی زبان کے اچھے سے اچھے رسائل کا مقابلہ کر سکتا تھا۔ اور تینتیس برس تک ہی میں نے کوشش کی کہ میری زبان غلطیوں سے پاک ہو۔ مگر میں ایمان داری کے ساتھ اس کا اقرار کرتا ہوں۔

کہ ''بارہ برس دہلی میں رہے بھاڑ جھونکتے رہے'' کے مصداق تینتیس برس میں بھی میں اردو زبان پر قادر نہ ہو سکا۔ کیونکہ اردو میری مادری زبان نہیں، اور میرے لئے یہ ممکن ہی نہ تھا کہ زبان کے لحاظ سے مجھے وہ مرتبہ حاصل ہوتا، جو دہلی کے رہنے والے ایک معمولی تعلیم یافتہ شخص کو بھی حاصل ہے۔ اور نہ یہ ممکن ہے کہ پنجاب کا رہنے والا کوئی شخص جس کو ماں کے دودھ کے ساتھ پنجاب کی صرف پنجابی زبان نصیب ہوئی ۔ وہ ایک دوسرے علاقے میں بولی جانے والی اردو زبان پر قادر ہو سکے۔ چنانچہ میرا یہ بھی یقین ہے کہ اردو زبان کا کوئی ادیب بھی (مع مولانا ظفر علی خاں، مولانا سالک اور مرحوم سر عبدالقادر) جو اردو زبان پر ایک اتھارٹی تسلیم کیے جاتے ہیں۔)

ایسا نہیں جو پنجاب میں پیدا ہوا ہو، اور وہ یہ کہہ سکے کہ وہ اردو زبان پر قادر ہے۔

یعنی میری رائے میں کوئی شخص بھی کسی غیر زبان پر قادر ہونے کا دعویٰ نہیں کرسکتا اور اگر وہ دعویٰ کرتا ہے تو وہ یقیناً غلط فہمی میں مبتلا ہے، جس کے ثبوت میں پروفیسر محمد حسین آزاد کا ایک دل چسپ واقعہ بیان کرتا ہوں۔

مرحوم پروفیسر محمد حسین آزاد تو دہلی میں پیدا ہوئے۔ مگر آپ فارسی زبان کے بہت بڑے عالم تھے۔ اور اپنی اس کوالیفیکشن کے باعث ہی سال ہا سال تک گورنمنٹ کالج لاہور میں فارسی زبان کے پروفیسر رہے۔ آپ کو یہ وہم تھا کہ آپ فارسی زبان کے اعتبار سے ایران کے اہل زبان کا بھی مقابلہ کر سکتے ہیں۔ اور اس غلط فہمی ہی میں مبتلا تھے کہ آپ ایران تشریف لے گئے، تا کہ وہاں کے اہل زبان علماء پر اپنی فارسی دانی کا سکہ بٹھا سکیں۔ طہران پہنچنے کے بعد آپ وہاں کے ایک عالم اور مصنف کے مہمان ہوئے، اور دوسرے تیسرے روز کا واقعہ ہے۔ آپ مکان کے صحن میں بیٹھے تھے۔

اور قریب ہی چولہا جل رہا تھا۔ اتنے میں دیگچی زیادہ آنچ ہونے کے باعث ابل پڑی، اور دیگچی کا ڈھکنا ایک طرف ہو گیا۔ مولانا آزاد یہ کیفیت دیکھ رہے تھے اور سوچ رہے تھے کہ دیگچی کی اس کیفیت کو کیا کہنا چاہیئے کہ اتنے میں کمرے کے اندر سے ایک چھوٹی لڑکی صحن میں آئی اور اس نے دیگچی کو ابلتی ہوئی حالت میں دیکھا تو فوراً اپنی ماں کو متوجہ کرتے ہوئے بولی اماں ۔ ۔ ۔ دیگچی سر کردہ ۔ ۔ مرحوم پروفیسر نے جب یہ سنا تو آپ کو احساس ہوا کہ آپ غلط فہمی میں مبتلا ہیں اور کوئی شخص بھی چاہے کسی غیر زبان میں کتنا بھی اتھارٹی تسلیم کیا جاتا ہو، وہ کسی غیر زبان پر قادر نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ مرحوم پروفیسر صاحب ایران میں اپنی فارسی دانی کا سکہ بٹھائے بغیر واپس ہندوستان تشریف لے گئے۔

میں نے اپنی پچھلی زندگی میں بہت کوشش کی کہ میں صحیح اور درست اردو لکھ سکوں۔ اور اس سلسلہ میں ملا واحدی صاحب مسز ممتاز مرزا، بہادر شاہ بادشاہ کے خاندان کی ایک مرحوم خاتون اور بعض دوسرے دوستوں نے میری بہت امداد کی۔ یہ شخصیتیں

’’ریاست‘‘ میں شائع ہوچکی ہیں۔مضامین کی غلطیوں پر طویل عرصہ تک مجھے توجہ دلاتی رہیں۔اور میں ان کا انتہائی شکر گزار ہوں۔مگر پھر بھی مجھے قطعی درست اور صحیح اردو لکھنے میں کامیابی نصیب نہیں ہوئی اور نہ ہوسکتی ہے۔اور یہ واقعہ ہے کہ اب بھی زبان کی غلطیاں ہو جاتی ہیں۔اور گو بطور ایک طالب علم کے میری یہ کوشش ہوتی ہے کہ میں بغیر غلطیوں کے اردو لکھ سکوں۔مگر کامیابی نہ ہوئی اور نہ ہوسکتی ہے۔کیونکہ اردو میری مادری زبان نہیں، چنانچہ اس کتاب کے پڑھنے والوں سے درخواست ہے کہ وہ زبان کی خامیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے میرے اس مقصد کو پیش نظر رکھیں۔جس مقصد کے لئے یہ کتاب لکھی گئی ہے۔۔۔اور وہ مقصد یہ ہے کہ میں اس کتاب کے ذریعہ پبلک کے کریکٹر کو بلند لے جانے کے اعتبار سے ملک کی کچھ خدمت انجام دے سکوں اور اپنے جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے مولانا روم کا ایک واقعہ یاد دلاتا ہوں۔مولانا پر کسی شخص نے اعتراض کیا کہ آپ کے اشعار میں غلطیاں ہوتی ہیں تو مولانا نے اس اعتراض کا جواب اس شعر میں دیا تھا:۔

من زدانم فاعلاتن فاعلات

شعر می گویم بہ از آب حیات

(میں شاعری کے فن اور عروض سے واقف نہ سہی،) مگر اشعار تو ایسے کہتا ہوں، جن کو آب حیات سے تشبیہ دی جاسکتی ہے۔یعنی یہ نہ دیکھیے کہ کس نے لکھا ہے؟ ۔یہ پڑھیے کہ کیا لکھا ہے اور کیا پڑھا ہے؟ ۔اور میری خواہش ہے کہ اس کتاب کے پڑھنے والے ’’عزت کی قربانی‘‘ (جو مرحوم دیوان دیا رام گدومل کے متعلق ہے) وغیرہ مضامین نہ صرف پڑھیں بلکہ ایسی قابل احترام شخصیتوں کے بلند کریکٹر کی پیروی کی بھی کوشش کریں۔

اس کتاب کی اشاعت کے لئے میں کئی برس سے کوشش میں تھا۔مگر مالی مشکلات کے باعث کامیابی نصیب نہ ہوئی اور میں ان دوستوں کا صدق دل کے ساتھ شکر گزار

ہوں، جن کی مالی امداد سے آج یہ کتاب شائع ہو رہی ہے۔ اور چونکہ یہ دوست نہیں چاہتے کہ ان کا نام شائع ہو۔ اس لئے مجبور ہوں کہ اس شکریہ کے ساتھ ان کا نام نہ لکھا جائے۔

یکم نومبر ۱۹۵۷ء	نیاز کیش
دھلی	دیوان سنگھ

اردو زبان میں ناقابل فراموش اضافہ

(شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی)

میرے مخلص ترین دوست سردار دیوان سنگھ مفتوں ہماری قدیم وضع داری، ہماری قدیم شرافت، ہماری قدیم دریا دلی اور اخلاقی جرات کی ایک ایسی عظیم یادگار ہیں کہ اگر ہماری قوم اندھی نہ ہو چکی ہوتی تو ان کو اسی احتیاط کے ساتھ رکھا جاتا۔ جس احتیاط سے حکومتیں اپنے آثار قدیمہ کو برقرار رکھتی ہیں۔

سردار صاحب کی یہ کتاب ان کی زندگی کا ایک زبردست کارنامہ اور اردو زبان میں ایک ایسا اضافہ ہے۔ جسے کبھی فراموش نہیں کیا جا سکے گا۔

انہوں نے اپنی زندگی کی پیچیدہ اور طویل راہوں سے اپنے منتشر نقوش قدم کو بڑی دیدہ وری کے ساتھ چن چن کر اس سلیقے کے ساتھ الفاظ کے ڈھانچے میں ڈالا ہے کہ جو اس کتاب کو غور سے پڑھے گا۔ اس کی زندگی کے راستوں پر ایسے چراغ جگمگا اٹھیں گے، جن کی مستقل روشنی میں وہ بے خوف وخطر آگے بڑھے گا اور کسی نشیب وفراز یا کسی موڑ پر وہ ٹھوکر نہیں کھا سکے گا۔

میری دلی آرزو ہے کہ اس کتاب کو بہمہ وجوہ فروغ حاصل ہو۔ اور حکومت ہند اس کے بعض حصوں کو نصاب میں داخل کر کے آئندہ نسلوں تک اس روح شرافت کے چشمے کو پہنچا دے۔ جو عنقریب خشک ہو جانے والا ہے۔ کاش ایسی کتاب کسی زندہ قوم میں شائع ہوتی!۔

ناقابل فراموش اردو کی یادگار کتاب

(ڈاکٹر ایم، ڈی تاثیر ایم، اے، پی، ایچ ڈی مرحوم)

دیوان سنگھ مفتوں ایڈیٹر ''ریاست'' کا جہاں کہیں ذکر چھڑ جائے۔ نہایت ہندوستانی قسم کی بحث کا آغاز ہو جاتا ہے۔ گرما گرم بحث جس میں ہر کوئی دوسرے کی سنے بغیر اپنی کہے جاتا ہے۔

راجے نواب کوسیں گے تو دائیں بائیں دیکھ کر۔ تعریف کریں گے تو چیں بہ ابرو ہو کر۔ ان کے وزیروزراء ایسے حیرن ناک قصے سنائیں گے، کہ سچ جھوٹ معلوم ہونے لگے اور اوپر جا کے لوگ اسے مہاتما قسم کا قائد اعظم یا عمرو عیار قسم کا گوبلز بتائیں گے۔ پارٹی باز سیاسی لوگوں کو ایک سانس میں گالی اور دوسرے میں قصیدہ سنائیں گے۔ غرض ہر کوئی اپنے ظرف کے مطابق اندازہ لگائے گا۔ البتہ ایک بات پر سب کو اتفاق ہے کہ دیوان سنگھ مفتوں بڑا یار آدمی ہے۔

دیوان سنگھ مفتوں کے یاروں کا حلقہ دولت مندی کے دنوں سے لے کر اب تک نہایت متنوع رہا ہے۔ سرکاری افسر، مفرور قیدی، رند مزاج ادیب، سادھو منش فرنگی ہر طرح کے ہندو مسلمان، سکھ، عیسائی اور دہریے اس میں شامل ہیں۔ اور ان میں سے ہر ایک کا دیوان سنگھ مختلف ہے۔

دیوان سنگھ کوئی گہرا فلسفی یا سیاست دان نہیں، وہ جو کچھ بھی کہتا یا کرتا ہے، ہر کسی کی سمجھ میں آسانی سے آسکتا ہے۔ مگر وہ جو کہتا ہے، وہی کرتا ہے، اور جو کرتا ہے اسے برملا بیان کر دیتا ہے۔

''ناقابل فراموش'' کے عنوان سے جو سلسلہ مضامین ۳ اپریل ۱۹۴۴ء سے ''ریاست'' میں شروع ہوا، وہ ابھی تک جاری ہے۔ شروع ہی سے ایسا سلسلہ مقبول ہوا کہ اب یہ کتابی صورت میں شائع ہو رہا ہے۔ یہ کتاب دیوان سنگھ کی برملا گوئی کی

شاہد ہے۔

ہندوستان میں برملا گوئی کا دستور عام نہیں، اور اردو نثر میں اس طرح کی تحریریں بہت کم ہیں، جن میں زندگی کے حالات صاف صاف بیان کیے گئے ہوں۔ جو ہوں بھی تو ضروری نہیں کہ مصنف کی زندگی اس طرح کی ہو۔ کہ ہر شخص کو اس میں دلچسپی ہو۔ اور پھر یہ بھی ہوتا ہے کہ جن لوگوں کی زندگی دلچسپ ہوتی ہے۔ وہ ہر قسم کا واقعہ پوری تفصیل سے اس طرح بیان کرتے ہیں کہ سننے والا اکتا جاتا ہے۔ یہ نہیں تو زیب داستان کے لئے یوں رنگ آمیزی کی جاتی ہے۔ کہ واقعہ قصہ اور قصہ داستان بن جاتا ہے۔

''ناقابل فراموش'' ان عیوب سے پاک ہے۔ مصنف کی زندگی اہم تاریخی قسم کے واقعات میں سے گزر رہی ہے۔ بلکہ کئی بار اس نے سوانح سازی میں تاریخ کا ہاتھ بٹایا ہے۔ اس نے واقعات کے انتخاب میں صرفے سے کام لیا ہے۔ اور اس کی شخصیت اس قدر بھرپور ہے اور اسے زندگی کا اتنا گہرا چسکا ہے کہ اس پر گزری ہوئی ہر بات کسی کو اپنے اوپر گزری ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ جو واقعات وہ بیان کرتا ہے۔ وہ اس قدر جان دار ہیں کہ اسے انہیں بڑھانے سجانے کی ضرورت نہیں، اور اس کی یادداشت اس بلا کی ہے کہ وہ بھول کر بھی غلط بیانی نہیں کرتا۔

بیشتر واقعات بظاہر اور لوگوں سے متعلق ہیں، مگر ان کا راوی سے اتنا تعلق ہے یا اسے ان سے اس قدر انہماک ہے کہ ان میں سے اس کا اپنا کردار، اپنی شخصیت اپنا آپ پھوٹ پھوٹ کر نکل رہا ہے۔ بات خواہ مہاراجہ نابھ کی ہو یا کسی خفیہ پولیس والے کی، دوست کی ہو یا دشمن کی، اس میں سے بات کرنے والا جھلملاتا نظر آتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں کبھی کبھی صحافت واقعہ نویسی وقوعہ گوئی سے مل جاتی ہے۔

اس ادبیت کا ظہور کچھ اس بے ساختہ پن سے ہوتا ہے کہ بسا اوقات تلاش نہ کرنے والے کو واضع دکھائی دیتا ہے۔ اور تلاش کرنے والے سے اوجھل رہتا ہے۔ اس لیے کہ دیوان سنگھ مفتوں کا طرز تحریر مصنوعی آرائش سے پاک ہے۔ وہ پھول کو کلی

کہتا ہے۔ ''گرہ رنگ و بو'' نہیں کہتا، نہ کدال (آلہ زمین کنی) جب غصے کا اظہار کرتا ہے تو محض آپ کے قبلہ و کعبہ کی شان میں گستاخی کے ارادے کا اعلان نہیں کرتا۔ اور خوش ہوتا ہے تو ''تا خدا باشد بہادر شاہ باد'' قسم کے قصیدے نہیں لکھتا، کھری کھری بات کھردرے لہجے میں صاف صاف کہتا ہے۔ بے خوف اور برملا کہتا ہے۔

وہ اول و آخر صحافت نگار ہے اور دیانت دار ہے۔ یہ اجتماع ہمارے ہاں کمیاب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں ''ناقابل فراموش'' کو اردو کی چند یادگار کتابوں میں شمار کرتا ہوں۔ اردو کیا ہندوستان میں انگریزی میں بھی اس قسم کی کتابیں کم شائع ہوئی ہیں۔

اس کتاب کی ہر سطر دلچسپ ہے کیونکہ لکھنے والا دلچسپ ہے۔ اور بے حد دلچسپ انسان ہے۔ البتہ ہر واقعہ کے بعد جو اخلاقی سبق نکالا گیا ہے۔ وہ مجھے بہت بوجھل معلوم ہوا۔ میں اسے دیوان سنگھ مفتوں کی شخصیت سے باہر کی بات سمجھتا ہوں۔ یوں تو ظاہر ہے جس شخص نے جبر و استبداد کا اس طرح ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ اس کی اخلاقی اقدار بہت راسخ ہوں گی۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ اخلاق کے ساتھ ''اخلاقیت'' بلکہ واعظ گوئی بھی شامل ہو۔ یہ لیڈری، مشیخیت، مہاتمائیت قسم کی خو ہے۔ مفتوں اس سے اب تک محفوظ رہا ہے۔ امید ہے آئندہ بھی بچا رہے گا۔ جس طرح وہ بے اختیار اور بے پناہ قہقہے لگاتا ہے۔ اپنے پر اور دوسروں پر ہنستا ہنساتا ہے۔ یہ طور طریقے اور طرح کے ہیں۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ لیگی کانگرسی، اکالی، ہندو، مسلم، عیسائی، گورے ،کالے ،وزیر، رند اور نمازی سب ایک ہی رسی میں بندھے ہوئے ہیں۔ انسانیت کی رسی میں مفتوں کی جنبہ داری، دوستی، دشمنی، سب انسانی ہے۔ اس دور میں اس فتنہ و شر کے دور میں اس قسم کے لوگ بہت غنیمت ہیں۔ آپ ان سے اس کتاب میں مل کر بہت خوش ہوں گے۔

ع ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

بہترین دوست اور خطرناک دشمن

(حضرت علامہ نیاز فتح پوری)

اب سے سینتیس (37) سال قبل ۱۹۲۰ء کی بات ہے۔ دھلی سے ملا واحدی روز نامہ ''رعیت'' نکال رہے تھے۔ اور مجھے بھوپال سے اس کی ایڈیٹری کے لئے طلب کیا جاتا ہے۔ میں آجاتا ہوں اور ملا واحدی کے مکان پر اخبار ''رعیت'' کے دفتر میں اول اول سردار سنگھ سے میرا تعارف ہوتا ہے۔

میں صبح صبح دو تین گھنٹے کے لئے دفتر جاتا تھا اور اداریہ وغیرہ لکھ کر اپنی جائے قیام پر لوٹ آتا تھا۔ اس سے قبل و بعد وہاں کیا ہوتا تھا۔ اخبار کہاں چھپتا تھا، کب شائع ہوتا تھا؟۔ اس کا مجھے کوئی علم نہ تھا۔ اس کی ملکیت کے متعلق ضرور یہ بات کانوں میں پڑی تھی کہ اس اخبار کو پہلے خواجہ حسن نظامی کی تحریک سے بھیا احسان الحق نے جاری کیا تھا۔ پھر جب ان کو کچھ دشواریاں پیش آئیں تو ملا واحدی نے اسے لے لیا۔

عوام کی آواز حکومت تک پہنچانا اس کی پالیسی تھی۔ اور حکومت اسے کچھ اچھی نگاہ سے نہ دیکھتی تھی۔ غالباً بھیا احسان اسی لئے اس سے دست بردار ہو گئے تھے۔ ملا واحدی سمجھتے تھے کہ حکومت اس اخبار کو زیادہ دن چلنے نہ دے گی۔ اور ضمانت طلب کر کے اسے ختم کر دے گی۔ اس لئے انہوں نے فیصلہ کیا کہ جب صورت یہ ہے تو کیوں نہ اس کے لب ولہجہ کو سخت کر دیا جائے۔ اور جب وہ بند ہو تو اپنا نقش عوام کے دلوں پر چھوڑ جائے۔ مجھ کو بلانے کی وجہ یہی تھی۔ کیونکہ اس وقت میرے سیاسی مضامین اور سیاسی نظمیں ''الہلال'' اور ''زمیندار'' وغیرہ میں شائع ہوتے تھے۔ ان کا لب ولہجہ بہت پر جوش ہوتا تھا۔ اور حکومت پر میری نکتہ چینیاں پسند کی جاتی تھیں۔ آخر کار جب چند دن بعد یہ معلوم ہو گیا کہ حکومت نے اپنی جگہ ''رعیت'' کو ختم کر دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ تو واحدی صاحب نے مجھ سے کہا کہ جب صورت حال یہ ہے تو کیوں نہ سنبھالا

دیا جائے۔

آخر کار میں نے مسئلہ مصر پر دو اداریے زیادہ سخت لکھ دیے۔ اور حکومت کو ایک اور بہانہ رعیت بند کرا دینے کا ہاتھ آ گیا۔ اور یہ بساط الٹ دی گئی۔

یہ ذکر میں نے اس لئے کیا کہ میرے اور دیوان سنگھ کے اولین تعارف کا پس منظر سامنے آ جائے۔ سردار صاحب سے روز دفتر میں ملاقات ہوتی تھی۔ لیکن بہت سرسری۔ وہ مجھے دیکھ کر کیا سمجھتے ہوں گے۔ مجھے نہیں معلوم، لیکن میں نے ان کی مستعدی، بے چینی، گفتگو کا انداز، بلند لب ولہجہ اور رجائی میلان کو دیکھ کر ضرور ان کو سمجھنے کی کوشش کی۔ اور آخر کار ایک دن واحدی صاحب کے دریافت کرنے پر میں نے ان سے کہہ بھی دیا کہ رعیت چلے نہ چلے لیکن دیوان سنگھ سا راہی آپ کو مشکل سے ملے گا۔

مجھے نہیں معلوم میرے دہلی سے بھوپال لوٹ آنے کے بعد دیوان سنگھ واحدی صاحب سے وابستہ رہے یا نہیں اور انہوں نے ان کے جانے کے بعد کیا کیا۔ کیونکہ انہوں نے جو حالات اپنے قلم بند کیے ہیں۔ ان میں کوئی تاریخی تسلسل نہیں پایا جاتا۔ لیکن ان کے تاریخی مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد ہی انہوں نے ''ریاست'' جاری کرنے کا فیصلہ کیا۔ اور پھر اس سلسلے میں جو ''ہفت خواں'' انہوں نے طے کیے۔ ان کا علم بالتفصیل آپ کو اس کتاب کے مطالعہ سے ہو سکتا ہے۔ میرے واپس بھوپال جانے کے بعد میں اور دیوان سنگھ مفتوں عرصہ تک بیگانہ رہے۔ لیکن یہ بے گانگی ایسی نہ تھی کہ میں ان کو بھول جاتا۔ اس لئے ''ریاست'' کے اجراء کے بعد جب کبھی دہلی جاتا تو انہیں کے پاس قیام کرتا، اور صرف اس لئے کہ مجھے ان کی سادگی اور بے تکلفی پسند تھی۔ وہاں ٹھہرنے کے بعد میں اپنے آپ کو بالکل آزاد محسوس کرتا تھا۔

سردار دیوان سنگھ مفتوں کی خانگی زندگی کی میں نے کبھی جستجو نہیں کی، اور نہ ہی اس کی ضرورت تھی۔ میں نے ہمیشہ ان کو تنہا سادھوؤں کی سی زندگی بسر کرتے دیکھا۔ لیکن

اس کے معنی یہ نہیں کہ وہ دنیا کے اسباب عیش و راحت سے متنفر تھے۔آراستہ مکان، اچھا فرنیچر، متعدد ملازم، سواری کے لئے موٹر سب ہی کچھ ان کے پاس تھا۔اور اپنے احباب کی خاطر مدارت میں وہ بڑی دریا دلی سے کام لیتے تھے۔لیکن خود ان کی زندگی راہبانہ اندازکی تھی، جوانہوں نے کبھی ترک نہیں کی۔اور اب تک اس پر قائم ہیں۔

سردار دیوان سنگھ مفتوں کی طبعی خصوصیات جو کبھی ان سے منفک نہ ہوئیں۔ان کا مردانہ عزم واستقلال ہے۔مصیبت و پریشانی میں گھبرا جانا انسانی فطرت ہے۔لیکن قدرت نے یہ احساس ان میں پیدا نہیں کیا۔اور وہ مصائب کا مقابلہ ایسی پامردی، خوش دلی، اور صبر وضبط کے ساتھ کرتے ہیں کہ دیکھ کر حیرت ہو جاتی ہے۔

وہ بڑے بولنے والے بذلہ سنج انسان ہیں۔اور غم وفکر کو کبھی اپنے پاس نہیں آنے دیتے۔وہ فطرتاً بڑے بے باک، آزاد صاف گو انسان ہیں دل و زبان کی ہم آہنگی میں نے کم کسی میں دیکھی ہے۔وہ بڑے اچھے اور سچے دوست ہیں۔لیکن اسی حد تک خطرناک دشمن بھی۔وہ بڑے مضبوط کردار کے انسان ہیں۔اور ایک بار جس سے جو تعلقات قائم ہو گئے۔وہ ہمیشہ نبھاتے ہیں۔لیکن وہ مار آستین کو کبھی معاف نہیں کرتے۔اور جب تک اس کا سر نہ کچل دیں پیچھا نہیں چھوڑتے۔

سردار دیوان سنگھ مفتوں کی ساری زندگی صحافت ہی میں بسر ہوئی۔اور اس سے انکار ممکن نہیں کہ اخبار ''ریاست'' ان کی صحافی زندگی کا اتنا زبردست کارنامہ ہے کہ ہم اس سے ہٹ کر ان کو اچھی طرح سمجھ نہیں سکتے۔کسی کام کا ارادہ کر لینا ان کے نزدیک ایک ایسا روحانی عہد ہے کہ جس کی تکمیل میں وہ اپنی تمام ذہنی و حیوانی قوت صرف کر دیتے ہیں۔وہ ہر کام کا اسلوب پہلے سے سوچ لیتے ہیں۔اور پھر اس سے نہیں ہٹتے۔ان کی محنت کا یہ حال ہے کہ وہ تھکنا جانتے ہی نہیں۔اور ایک مشین کی طرح ہر وقت کام کرتے رہتے ہیں۔ان کی کامیاب صحافی زندگی کا سب سے بڑا راز ان کا یہی جوش عمل ہے۔اور اس کے ساتھ ضمیر کی پاسداری۔کہ موج خون سر سے گزر ہی کیوں نہ

جائے۔لیکن وہ اپنے ضمیر کے خلاف کبھی کچھ نہ لکھیں گے۔

سردار دیوان سنگھ مفتوں بڑے تن و توش کے آدمی ہیں۔اور ایک زمانہ سے یورک ایسڈ کے مریض ہیں، لیکن میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ اس کی وجہ سے کبھی ان کے مشاغل میں کوئی فرق آیا ہو۔

بہت صبح اٹھنا اور کام میں لگ جانا یہ ان کی زندگی کے ایسے تعینات ہیں، جن سے انحراف ممکن نہیں، وہ اپنا ایک تخلص بھی رکھتے ہیں، مفتوں، لیکن میں نے ان کی زبان سے کبھی ان کا کوئی شعر نہیں سنا۔البتہ انشاء پرداز کی حیثیت سے ان کے بہت سے کار نامے ہمارے سامنے موجود ہیں۔

وہ صحافی ادیب ہیں، اور اس فن کے پورے ماہر ہیں۔وہ جانتے ہیں کہ ایک صحافی کو کس وقت کس انداز سے لکھنا چاہیئے۔لیکن کبھی کبھی فرط جوش میں ان کا قلم مناسب حدود سے آگے گزر جاتا ہے۔

الغرض سردار دیوان سنگھ مفتوں بڑا سچا دوست، بڑا خطرناک دشمن، نہایت بے باک صحافی، بے خوف اور نڈر انسان ہے۔اور میں نے کم ایسے انسان دیکھے ہیں جو سردار دیوان سنگھ مفتوں کی طرح صابر و ضابط اور مصائب کا مقابلہ کرنے کے لئے شیر کا سا دل رکھتے ہوں۔یہ کتاب اسی ناقابل فراموش ہستی کے حالات اور واقعات پر مشتمل ہے۔اور اس قدر دلچسپ ہے کہ مجھے اس کے مطالعہ میں کم از کم اتنا ہی لطف آتا ہے۔جتنا غوث علی شاہ کے ”تذکرہ غوثیہ“ کے مطالعہ میں۔

ناقابل فراموش ایڈیٹر کے ناقابل فراموش مضامین

(بھیا شیخ احسان الحق عشقی رئیس اعظم میرٹھ)

ہفت روزہ اخبار ''ریاست'' دہلی کے نامور ایڈیٹر سردار دیوان سنگھ مفتوں کی ہمہ رنگی زندگی بھی قدرت کی تخلیقی عجوبہ کاریوں اور ستم ظریوں کا ایک نادر مرقع ہے۔ اس بو قلموں مرقع میں سردار صاحب کی طوفانی زندگی کے مدوجزر سیرت انسانی کی بلندی وپستی اور خیروشر کی آمیزش وآویزش کے ایسے بصیرت افروز مناظر دیکھنے میں آتے ہیں جو دوسرے خود بساختہ (سیلف میڈ) مشہور ومعروف لوگوں کے حیاتی مرقعوں میں بہت کم ملتے ہیں۔ سردار دیوان سنگھ ان خود ساختہ مشاہیر میں سے ہیں جو محض اپنی اولعزمی، جرات مندی، محنت، جفاکشی، اور صبر واستقامت وغیرہ جیسی فطری قابلیتوں کے ذریعے چھوٹی اور گمنام حیثیتوں سے ترقی کرکے بام شہرت وعروج پر پہنچے۔ جن کی ساری زندگی اپنی فلاح وترقی کے لئے نئی نئی راہیں نکالنے پر مختلف جولان گاہوں میں ہمت ومردانگی کے کمالات دکھانے اور پیش آنے والی رکاوٹوں اور مشکلوں کا کامیابی سے مقابلہ کرنے میں صرف ہوئی ہے۔ جنھوں نے اپنی لرزہ خیز تحریروں سے بااختیار حکمرانوں اور بڑے بڑے بااثر لیڈروں کے دل ہلا دینے اور اپنی حیرت انگیز حکمت عملیوں اور حریف شکن منصوبوں سے اپنے بڑے بڑے مخالفوں کے چھکے ڈھیلے کر دیئے۔ اور ان سے ہتھیار رکھوا لیے۔ سردار صاحب نے اپنی ہمہ رنگی زندگی کے ایسے بصیرت افروز واقعات کو جو خود ان کے نزدیک ناقابل فراموش ہیں۔ متفرق مضمونوں میں قلم بند کرکے ان مضمونوں کا ایک مجموعہ ''ناقابل فراموش'' کے نام سے شائع کیا ہے۔ یہ مجموعہ مضامین سردار صاحب کی زندگی کی کوئی مکمل اور صحیح مرقع نہیں ہے۔ کیونکہ اس میں بہت سے واقعات زندگی تو درج ہی نہیں کیے گئے ہیں۔ اور جو واقعات درج کیے گئے ہیں۔ ان میں سے بعض اہم واقعات کی پوری تفصیلات مصلحتاً نہیں بیان کی گئی

۔لیکن ناقص وناکمل مرقع زندگی ہونے کے باوجود اس مجموعہ مضامین کے مندرجہ واقعات سے سردار صاحب کی زندگی اوران کے کردار کے ہر ایک پہلو پر کافی روشنی پڑتی ہے۔اورواقعات کے مطالعہ کے بعد ہر غیر جانب دار شخص کو اس نتیجہ پر پہنچنا پڑتا ہے کہ سردار دیوان سنگھ میں کچھ ایسی عجیب وغریب اہلیتیں اور متضاد قابلیتیں اور صلاحیتیں موجود ہیں۔جو عام انسانوں میں نہیں ہوا کرتیں۔اس لحاظ سے سردار دیوان سنگھ صاحب بلا شبہ ایک غیر معمولی انسان ہیں۔اور اگر اس غیر معمولی انسان کے سینکڑوں قابل قدر کارناموں میں سے کچھ کارنامے ایسے ہیں جن کو مقدس اور متدین طبقوں میں اخلاقی معیاروں سے گراہوا اور ناپسندیدہ کہا جا سکتا ہے۔تو سردار دیوان سنگھ صاحب کے ان ناپسندیدہ کارناموں کو بھی کم ازکم اولوالعزمانہ، جرات مندانہ کارنامے ہونے کی عزت سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔سردار دیوان سنگھ صاحب کی رسمی تعلیم صرف درجہ پنجم تک تھی۔لیکن جو قدرتی تعلیم وتربیت سردار صاحب نے خود اپنی پر آشوب زندگی اور مکتب حوادث میں پائی ہے۔وہ مروجہ اعلیٰ تعلیمات کے مقابلہ میں کہیں زیادہ گراں بہا اور قابل قدر ہے۔سردار صاحب آج کل کے ان اعلیٰ ڈگری یافتہ علم برداروں میں سے نہیں جو "چار پائے بر و کتابے چند" کے مصداق ہیں اور جن کی فطری صلاحیتیں ان کے اکتسابی علوم وفنون کے بوجھ میں دب کرنا کارہ ہوگئی ہیں۔ سردار صاحب اس قدرتی تعلیم سے فیض یاب ہوئے ہیں۔جس نے ان کی تمام فطری صلاحیتوں کو بیدار اور مجلی کر دیا ہے۔سردار صاحب کی فطرت میں الوالعزمی، بلند ہمتی، جرات مندی وعالی حوصلگی، خود داری وخود نمائی، ایثار وقربانی، فیاضی ودریا دلی، ہمدردی ودل سوزی، غریب پروری ومظلوم نوازی، اور وطن پرستی وحریت پسندی جیسی اعلےٰ اور قابل قدر صلاحیتیں موجود ہیں۔ان صلاحیتوں کو سردار صاحب کی قدرتی تعلیم نے اس قدر بیدار کر دیا ہے کہ وہ سردار صاحب کے تمام جوارح فکر وعمل پر چھا گئی۔اور سردار صاحب کے اندر انہوں نے خود اعتمادی کا ایسا احساس پیدا کر دیا

ہے کہ سردار صاحب مروجہ ضوابط واخلاق کی پابندی وتقلید سے بھی کسی قدر آزاد و بے نیاز ہو گئے ہیں۔اوراعمال کے تابع نیت ہونے کے اصول پر وہ ایسی سختی سے عامل ہیں کہ ہراس عمل کو جو نیک نیتی سے کسی اچھے مقصد کے لئے کیا جائے۔اچھا اور نیک ہی سمجھتے ہیں۔خواہ وہ عمل فی نفسہ برا اور غیر اخلاقی ہی کیوں نہ ہو۔اورخواہ اس سے نظام معاشرت وتمدن میں خلل ہی کیوں نہ واقع ہوتا ہو۔اس کے علاوہ اپنی نیت اور اپنے مقصد کی اچھائی اور برائی کا فیصلہ بھی سردار صاحب خوداپنے ضمیر سے کراتے ہیں ۔اوراس ضمیر سے جوان کے فطری تقاضوں کا تابع ہوتا ہے۔ چنانچہ جب سردار صاحب اپنی رحم دلی یا دوست نوازی کے تقاضوں سے کسی ضرورت مندیا عزیز دوست کی مدد کرنا چاہتے ہیں تو وہ امداد کے ناجائز ذرائع کو بھی استعمال کرنے میں اخلاقاً کوئی ہرج نہیں سمجھتے۔اسی طرح جب سردار صاحب اپنے کسی مخالف یا دشمن کا کامیابی سے مقابلہ کرنے اوراس کو شکست دینے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں تو بعض اوقات وہ قانون کی زد سے بچتے ہوئے ایسے غیر اخلاقی اقدامات بھی کر گزرتے ہیں جو جرائم کی تعریف میں بھی آسکتے ہیں۔سردار صاحب کا انتقامی جوش اس قدر بڑھا ہوا ہے کہ وہ اپنے دشمن کو مر جانے اوراس دنیا سے رخصت ہوجانے کے بعد بھی معاف نہیں کرتے ۔اورمرنے کے بعد بھی اس سے انتقام لیے جاتے ہیں۔وہ عفولذت است کہ درانتقام نیست کے عارفانہ اصول کو وہ نہیں مانتے۔اور دشمن کے معاف کر دینے کو کریکٹر کی کمزوری سمجھتے ہیں۔سردار صاحب کے ایسے ہی متضادرجحانات واقدامات کی وجہ سے سردار صاحب کے دوست بھی اگر سردار صاحب کو ایک بہت اچھا اور قابل قدر دوست سمجھتے ہیں تو ساتھ ہی ایک بہت بڑا اور نہایت خطرناک دشمن بھی کہتے ہیں۔اور جو لوگ سردار صاحب سے کوئی قریبی تعلق نہیں رکھتے ،اورنفسیات کے ماہر بھی نہیں ہیں۔ ان کے لئے بسااوقات یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوجاتا ہے کہ سردار صاحب کو ملکوتی اوصاف کی حامل شخصیتوں کی صف میں جگہ دی جائے۔یا ان کے برعکس خصائل رکھنے والی

شخصیتوں کی صف میں جگہ دی جائے۔

سردار دیوان سنگھ صاحب ایک کہنہ مشق اور کامیاب اخبار نویس ہی نہیں بلکہ ایک بلند پایہ ادیب وانشاء پرداز بھی ہیں۔وہ سیدھے سادے لفظوں اور بے تکلفانہ فقروں میں اپنے جمالی تاثرات اور جلالی جذبات کی ایسی صحیح تصویر کھینچ دیتے ہیں کہ پڑھنے والے کا دل اس سے وہی اثرات قبول کرتا ہے۔جو سردار صاحب اس پر ڈالنا چاہتے ہیں۔سردار صاحب کے ایڈیٹوریل نوٹس اس قدر پرزور، پرجوش اور پراثر ہوتے ہیں کہ ان کا کوئی دوسرا اہم عصر یہاں تک کہ ان کا کوئی دوسرا اہم قوم وہم وطن یعنی پنجابی اور سکھ بھی اس خصوصیت میں ان کی ہم سری کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔وقائع نگاری میں بھی سردار صاحب کو بڑی دسترس حاصل ہے۔وہ واقعہ کے تمام بصیرت افروز اور دلچسپ پہلوؤں کو ملحوظ نظر رکھ کر اس واقعہ کو اس سادگی اور روانی کے ساتھ اپنے خصوصی پرزور انداز میں اس طرح قلم بند کرتے چلے جاتے ہیں کہ پڑھنے والے کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ واقعہ خود اس پر گزر رہا ہے۔یا اس کے سامنے ہو رہا ہے۔مجموعہ مضامین ''نا قابل فراموش'' عبرت وبصیرت کے ماتحت مرقعوں کا ایک دل کش البم ہے۔جس کے ہر مضمون میں ایسے قیمتی تجربات اور انمول نصائح موجود ہیں کہ جن سے مرد عورت ،جوان اور بوڑھے سب ہی فائدہ اٹھاسکتے ہیں۔خصوصا جن لوگوں میں جرات مندانہ قدامات کی کچھ اہلیت موجود ہو۔ان کے لئے نا قابل فراموش'' مضامین کا یہ مجموعہ ایک ایسے قابل اعتماد اور کامل رہنما کا کام دے سکتا ہے۔جس سے وہ اپنے اولو العزمانہ منصوبوں اور ارادوں کی تکمیل اور زندگی کی تشکیل میں ہر قسم کی قیمتی امداد واعانت حاصل کرسکتے ہیں۔مجموعہ مضامین نا قابل فراموش کی دلچسپی ودل کشی کی کیفیت یہ ہے کہ اگرچہ اس کا ہر ایک مضامین ایک مستقل حیثیت رکھتا ہے۔اور ایک ہی واقعہ سے متعلق ہے۔لیکن پڑھنے والا ایک مضمون کے ختم ہوتے ہی دوسرا مضمون پڑھنا چاہتا ہے۔اور دوسرے کے بعد تیسرا مضمون اس طرح جب تک کتاب ختم نہ ہو

جائے۔ کتاب ہاتھ سے رکھنے کو دل نہیں چاہتا۔

سردار دیوان سنگھ صاحب کے نا قابل فراموش مضامین کے اس دلچسپ و پر نصائح مجموعہ کو بیسویں صدی کے ایک غیر مسلم کی لکھی ہوئی گلستان کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

سردار دیوان سنگھ صاحب نے نا قابل فراموش مضامین میں زیادہ تر اپنے ان کارناموں کا ذکر کیا ہے۔ جن کا تعلق ان کے مخالفوں اور دشمنوں سے ہے۔ لیکن اپنی دوست نوازیوں اور وضع داریوں کا ذکر سردار دیوان سنگھ صاحب نے بہت کم کیا ہے۔ حالانکہ سردار دیوان سنگھ صاحب کی زندگی کے بہت سے ایسے واقعات بھی نا قابل فراموش ہیں جو ان کی دوست نوازیوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ چونکہ راقم الحروف کو بھی سردار دیوان سنگھ صاحب کی دوستی کا شرف حاصل ہو رہا ہے۔ اس لئے یہ مختصر دیباچہ میں چند ایسے واقعات کا ذکر کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ جن کا تعلق سردار دیوان سنگھ صاحب کی دوست نوازی اور رواداری سے ہے۔ اور جن کو سردار دیوان سنگھ صاحب کے نا قابل فراموش مضامین کا ایک جز سمجھا جا سکتا ہے۔

پہلا واقعہ:

ایک زمانہ میں غفران مآب حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب کے ساتھ سردار دیوان سنگھ صاحب کے بھی نہایت گہرے دوستانہ بلکہ نیاز مندانہ اور عقیدت مندانہ تعلقات تھے۔ جو بعد میں بدقسمتی سے باہمی اختلافات اور پھر باہمی منافرت سے عدوات میں تبدیل ہو گئے۔ اور ایک عرصہ تک دونوں حضرات کے درمیان نہایت افسوسناک تحریری جنگ وجدل کا سلسلہ رہا۔ جناب ملا واحدی صاحب اور راقم الحروف کو بھی حضرت خواجہ صاحب سے دیرینہ الفت وعقیدت تھی۔ اور حضرت خواجہ صاحب بھی ہم دونوں پر اپنے عزیزوں کی طرح شفقت فرماتے تھے اور ہم کو اپنا مخلص اور بہی خواہ سمجھتے تھے۔ سردار دیوان سنگھ صاحب کو بھی اس کا بخوبی علم تھا، کہ ملا واحدی صاحب اور راقم الحروف کے خواجہ صاحب کے ساتھ کتنے اخلاص مندانہ تعلقات ہیں

۔مگر حضرت خواجہ صاحب کو اپنا شدید مخالف بلکہ دشمن سمجھنے کے باوجود اور باہمی جنگ وجدل ہونے کے باوجود سردار دیوان سنگھ صاحب نے ملا واحدی اور راقم الحروف سے دوستی کے تعلقات منقطع نہیں کیے۔ بلکہ اس کے برخلاف سردار دیوان سنگھ صاحب ہم دونوں پر اور زیادہ مہربانیاں کرنے لگے۔اس وجہ سے نہیں کہ ان کو اپنے دشمن حضرت خواجہ صاحب کے خلاف ہم سے کچھ مدد ملنے کی امید تھی۔ بلکہ غالباً صرف اس وجہ سے کہ وہ ہم دونوں کے اخلاص مندانہ کریکٹر سے واقف تھے۔اور ان کو اگر ہم سے کوئی امید مدد ملنے کی نہیں تھی ،تو اس کا بھی اندیشہ نہیں تھا کہ ہم ان کو حضرت خواجہ صاحب کی نیازمندی کی وجہ سے کچھ نقصان پہنچائیں گے۔

ملا واحدی صاحب اور میں نے خواجہ صاحب اور سردار صاحب کی جنگ کے دوران میں خواجہ صاحب کے دشمن سردار صاحب سے اپنے تعلقات دوستی اس لئے بر قرار رکھے۔کہ سردار صاحب کی مخلصانہ عنایتوں اور مہربانیوں کی وجہ سے ان تعلقات کے منقطع کردینے کی جرات نہ ہوسکی۔اس کے علاوہ ہمیشہ اندیشہ تھا کہ سردار صاحب سے ہمارے تعلقات منقطع ہونے کی صورت میں ممکن ہے کہ باہمی جنگ زیادہ طول پکڑے اور مقدمہ بازی وغیرہ تک نوبت پہنچ جائے۔جس کو رکوانے کی ہم ہمیشہ امکانی کوشش کرتے رہے۔سردار دیوان سنگھ صاحب کی انتہائی رواداری اور دوست نوازی کا یہ واقعہ بھی یقیناً ناقابل فراموش ہے۔کیونکہ سردار صاحب جیسے مضبوط کریکٹر شخص سے یہ امید کہاں ہوسکتی تھی۔کہ وہ اپنے ایک دشمن کے مخلص دوستوں سے تعلقات دوستی قائم رکھ سکے گا۔

دوسرا واقعہ:

سردار دیوان سنگھ صاحب کی طرح میں بھی ہندوستان کی تقسیم کا مخالف تھا۔اور پاکستان کے ایک اسلامی مملکت ہونے کے تخیل کو شیخ چلی کے منصوبے سے زیادہ وقعت نہیں دیتا تھا۔لیکن جب ہندوستان تقسیم ہوگیا اور پاکستان بن گیا اور مجھے یقین

ہو گیا کہ اب کسی باہمی سمجھوتے سے تقسیم ہند کے فیصلے کا تبدیل ہونا ناممکن ہے۔ اور اب اگر اس فیصلے میں کوئی تبدیلی ہو سکتی ہے تو صرف بھارت اور پاکستان کی باہمی جنگ کے ذریعہ سے ہو سکتی ہے۔ اور جنگ کی صورت میں پاکستان کے مسلمانوں اور ہندوؤں میں اور زیادہ کشیدگی بلکہ سخت عداوت اور دشمنی کا پیدا ہو جانا یقینی ہے۔ اس لئے میں سردار صاحب اور اپنے دوسرے نیشنلسٹ مسلم اور غیر مسلم دوستوں کو پاکستان کی مخالفت سے روکا کرتا تھا۔ جب میری تمام فیملی پاکستان چلے آنے کی وجہ سے (جس کو مجبوراً ۴۸ء ہی میں بھارت چھوڑنا پڑا تھا۔) اپریل ۱۹۵۱ء کو مجھ کو خود مستقل طور پر پاکستان ہجرت کرنے کی ضرورت پڑی۔ اور پاکستان کو میں نے بادل نخواستہ اپنا وطن بنا لیا۔ تو یہاں کے حالات اندازہ کرنے کے بعد مجھے بھارتی اخبارات کا پاکستان کی مخالفت کرنا زیادہ ناگوار گزرنے لگا۔ اور سردار دیوان سنگھ صاحب کے ایک ایڈیٹوریل نوٹ سے جو انہوں نے پاکستان اور باسیان پاکستان کے خلاف اپنے مخصوص انداز میں نہایت سخت لکھا تھا۔ مجھ کو بہت تکلیف پہنچی اور میں نے ایک خط سردار صاحب کے نام لکھ کر ان کے مذکورہ مضمون کے خلاف اپنے غم و غصہ کا اظہار کیا۔ اور سردار صاحب سے درخواست کی کہ وہ پاکستان کے خلاف لکھنا چھوڑ دیں۔ مجھے اندیشہ تھا کہ میرے اس خط کو پڑھ کر سردار صاحب ناراض ہو جائیں گے۔ لیکن میرے اندیشے کے برخلاف سردار صاحب نے میرا وہ خط ریاست کے ایک لیڈر میں نقل کر کے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ اس قسم کے خطوط پاکستانیوں کی طرف سے ان کے پاس اکثر آتے رہتے ہیں۔ مگر وہ ان کو قابل اعتنا نہیں سمجھتے۔

لیکن یہ خط چونکہ سردار صاحب کے ایک ایسے دوست نے لکھا ہے۔ جس کی اخلاص مندی کا سردار صاحب کو پورا یقین ہے۔ اس لئے وہ اس کا جواب دینا ضروری سمجھتے ہیں۔ اور جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ دیوان سنگھ تقسیم ہند کا مخالف ہے۔ اور جب تک یہ تقسیم ختم نہ ہو گی۔ وہ برابر مخالفت کرتا رہے گا۔ سردار صاحب کا میرے ساتھ یہ

مخلصانہ رویہ اور طرز عمل بھی سردار صاحب کی دوست نوازی اور رواداری کا ثبوت دیتا ہے ۔ کہ ان کی قوم اور وطن پرستی نے بھی میری پاکستانی حمایت کو گوارا کر لیا ۔ اور ہمارے تعلقات میں کوئی فرق نہ آیا۔

تیسرا واقعہ:

۱۹۴۷ء میں دہلی میں ہندو مسلم خون ریز فسادات کا زور تھا۔ میرا مرحوم لڑکا عرفان الحق شبلی جو میری مرضی اور اجازت کے خلاف فرقہ وارانہ سرگرمیوں میں پر جوش اور نمایاں حصہ لے رہا تھا ۔ اور میرے داماد مسٹر قمر الاسلام کے والد مسٹر ضیا الاسلام صاحب ہندوؤں پر فائرنگ کے الزام میں گرفتار ہو کر دہلی جیل کی حوالات میں بند کر دیئے گئے تھے۔ ان کی رہائی اور جیل میں ان کو خورد و نوش کی آسانیاں بہم پہنچانے کی غرض سے مجھ کو سردار صاحب سے امداد لینے کی ضرورت تھی ۔ سردار صاحب اس زمانے میں محلّہ چرخے والاں میں رہا کرتے تھے۔ جس میں مسلمانوں کے صرف چند مکانات تھے ۔ اور وہ مسلمان بھی فسادات کے ڈر سے اپنا گھر بار چھوڑ کر محلے سے بھاگ گئے۔ محلّہ چھوڑ جانے والے کچھ مسلمانوں نے اپنے مکانات اور مال و اسباب اور ایک مسجد کی حفاظت سردار صاحب کے سپرد کر دی تھی ۔ مسجد اور مکانات کی حفاظتی کوششوں کی وجہ سے محلّہ کے تقریباً تمام ہندو سردار صاحب کے مخالف ہی نہیں بلکہ دشمن ہو گئے ۔ اور کچھ عرصہ بعد سردار صاحب کو خود بھی یہ ہندو محلّہ چھوڑ کر اپنی رہائش اور کاروبار ایک دوسرے محلے میں منتقل کرنا پڑا۔ میرا قیام اس زمانے میں اپنے ایک دوست ڈاکٹر محمد عمر صاحب مرحوم کے بیٹے ڈاکٹر محمد اصغر عرف اجی میاں کے مکان واقع میٹا محل میں تھا۔ کیونکہ میرے سکونتی مکان واقع محلّہ کاشغری پر ہندو شرناتھیوں کا قبضہ ہو گیا تھا ۔ اور میرا کافی گھریلو سامان اور کتب خانہ لوٹ لیا گیا تھا ۔ اور سردار صاحب اپنی دور اندیشانہ احتیاط پسندی کی وجہ سے مجھ سے ملنے کے لیے مسلمانی محلے میٹا محل میں آنا پسند نہیں کرتے تھے ۔ اور مجھ جیسے کمزور دل شخص کے لئے چرخے والے

جانا ناممکن تھا۔ اس لیے باہمی مشورہ سے یہ طے پایا کہ ہم دونوں کسی ایسی جگہ جمع ہو جایا کریں، جہاں ہندوؤں کا غلبہ ہو نہ مسلمانوں کا۔ چنانچہ دریائے گنج میں کوچہ چیلاں کے نکڑ پر ایک نان بائی کی دکان کو اس غرض کے لئے منتخب کیا گیا۔ سردار صاحب اور ان کے مسلمان دوست اس دکان پر جمع ہوتے اور اپنی ضرورتوں کے متعلق مشورہ کیا کرتے تھے۔ میں اپنے سمدھی ضیاالاسلام کو جیل میں بی کلاس کی مراعات دلوانا چاہتا تھا۔ اس غرض سے سردار صاحب مجھ کو اور اپنے دو دوستوں کو ساتھ لے کر ایک تانگہ پر مسٹر رندھاوا ڈپٹی کمشنر دہلی سے ملنے ٹاؤن ہال روانہ ہوئے۔ تانگہ ٹھنڈی سڑک اور چاندنی چوک ہوتا ہوا ٹاؤن ہال پہنچا۔ سردار صاحب مسٹر رندھاوا سے ملے۔ اور ضیاالاسلام صاحب کو بی کلاس دیے جانے کا حکم لکھوایا۔ یہ حکم لے کر ہم سب واپس آنے کے لئے اسی تانگے پر سوار ہوئے۔ تانگے والا بھی غالباً ہندو نہ تھا۔ اس تانگے پر دو ہندو، دو سکھ اور ایک میں مسلمان تھا۔ واپسی کے لئے قریب کا راستہ نئی سڑک کا تھا۔ جو اس وقت تمام تر ہندوؤں کے قبضہ میں تھی۔ میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا مجھ کو ساتھ لے کر نئی سڑک پر سے گزرنا مناسب نہیں، بہتر یہ ہے کہ پہلی ہی سڑک سے واپس جایا جائے، مگر میرے ساتھی نہ مانے۔ اور تانگہ نئی سڑک کو عبور کر کے جب شاہ بولا کے بڑ کے قریب پہنچا تو چاوڑی بازار کی طرف سے دو مسلمان تانگے والے اپنے تانگے سرپٹ دوڑاتے ہوئے ہمارے پاس سے گزرے۔ اور انہوں نے مجھ کو تانگے پر دیکھ کر چلا کر کہا، ادھر مت جاؤ۔ واپس آ جاؤ، مگر سردار صاحب اور ان کے ساتھی لوٹنے پر رضامند نہ ہوئے۔ اور جب تانگہ شاہ بولا کے بڑ پر پہنچا تو ہم نے دیکھا کہ ایک ٹوٹی ہوئی بیل گاڑی کے قریب چند مسلمانوں کی لاشیں جامع مسجد جانے والی سڑک کے قریب پڑی ہیں۔ اور سڑک کو والنٹیروں اور پولیس والوں نے آمد و رفت کے لئے بند کر رکھا ہے۔ بعد میں پتا چلا کہ یہ لاشیں ان بدنصیب مسلمانوں کی تھیں۔ جو ایک بیل گاڑی پر پرانے قلعہ پناہ لینے جا رہے تھے۔ کہ یہاں پہنچ کر کسی ہندو نے

کوٹھے پر سے بم پھینک دیا۔اور بے چارے سب شہید ہو گئے۔

جامع مسجد کا راستہ مسدود پا کر ہم سب پریشان ہوئے کہ اب میٹا محل کیوں کر پہنچا جائے،لیکن مسئلے کا کوئی حل نہ نکل سکا۔اور میرے سب ساتھیوں نے مجھ سے کہا کہ بھیا اب تو سردار صاحب کے مکان پر ہی جانا پڑے گا۔میں کیا کرسکتا تھا۔سہمے ہوئے دل سے اس فیصلے کو قبول کیا۔اور ہمارا تانگہ محلے چرخے والوں جانے کے لئے بلی ماروں کی گلی کی طرف مڑا۔راستے میں کچھ ہندو ملے جو سردار صاحب سے زیادہ واقف نہ تھے۔وہ خوشی کا اظہار کر رہے تھے کہ ایک اور مسلمان شکاریوں کے جال میں پھنسا ہے۔پھر کچھ ہندو سردار صاحب کے ہم محلّہ ملے جو سردار صاحب کو بہت برے الفاظ سے مخاطب کر کے کہنے لگے کہ یہ دیکھو ایک خبیث سردار مسلمانوں کو جان بچانے کے لئے اپنے ساتھ لے جارہا ہے۔میں یہ آواز سن رہا تھا۔اور میرا دل دھڑک رہا تھا۔کہ ہمارا تانگہ چرخے والاں کی گلی کے قریب پہنچ گیا۔جہاں سے سردار صاحب کا گھر صرف چند گز کے فاصلے پر تھا۔تانگے کے کھڑے ہوتے ہی اس کا ہندوؤں نے محاصرہ کرلیا۔اور انہوں نے مجھ کو تانگے پر سے گھسیٹنے کا ارادہ کیا۔سردار صاحب نے اول تو متین لہجے میں محاصرہ کرنے والے ہندوؤں کو سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ اپنے برے ارادے سے باز آجائیں اور مجھ کو جو ایک سچا نیشنلسٹ مسلمان ہے۔کوئی تکلیف نہ دیں۔لیکن جب سردار صاحب کی اس فہمائش کا کوئی اثر نہ ہوا تو سردار صاحب کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔اور انہوں نے اپنے پنجابی جوشیلے لہجے میں ہندوؤں کو گالیاں دینا شروع کیں۔اور کہا کہ اگر کسی نے بھی میرے ساتھ کوئی زیادتی کی تو وہ اس کا سر توڑ دیں گے۔سردار صاحب کے اس غصہ اور جوش کو دیکھ کر بھیڑ چھٹنا شروع ہوئی اور محاصرہ ختم کر دیا گیا۔میں اپنے ساتھیوں کی حفاظت میں سردار صاحب کے گھر پہنچا تو وہاں سردار صاحب کا سابق سکھ ملازم جو مجھے جانتا تھا،اور فوج میں ملازم تھا۔گلے میں کارتوسوں کی پیٹی ڈالے اور رائفل لیے کھڑا تھا۔سردار صاحب کے پوچھنے پر اس نے

بتایا کہ وہ محض سردار صاحب سے ملنے آیا تھا۔ سردار صاحب نے کہا بہت اچھا۔ لو اب تم بھیا کو اپنی حفاظت میں میٹا محل پہنچا آؤ۔ میں نے کہا میں کسی مسلح شخص کے ساتھ ہر گز نہیں جاؤں گا۔ میرے ساتھ میرے تانگے کے سب ساتھیوں کو چلنا پڑے گا۔ میرے اس کہنے پر سردار صاحب اور اس کے ساتھی اس مسلح شخص کو ساتھ لے کر روانہ ہوئے اور چوڑی والاں کے محلے سے ہوتے ہوئے محلّہ میٹا محل کی طرف چلے کہ سامنے مسلمانوں کا ایک مجمع نظر آیا۔ یہ مسلمان محلّہ جنت فروشاں کے تھے۔ جو مطبع مجتبائی سے متصل تھا۔ میرے ساتھیوں نے مسلمانوں کے اس مجمع کو دیکھ کر کہا کہ بھیا اب آپ چلے جائیں۔ ہمارے آپ کے ساتھ جانے کی ضرورت نہیں۔ میں نے بھی ان کو واپس جانے کی اجازت دے دی۔ میں تنہا مسلمانوں کے محلے میں پہنچ گیا۔ وہاں کے سب مسلمان میرے جاننے والے تھے۔ انہوں نے مجھ کو اپنے ساتھ لے جا کر بحفاظت میٹا محل پہنچا دیا۔ اگر تانگے کے محاصرے کے وقت سردار دیوان سنگھ صاحب اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر میری حفاظت نہ کرتے تو غالباً مجھے زندہ نہ چھوڑ دیا جاتا۔ اپنے دوستوں کے لئے جان کو خطرے میں ڈال دینے کا واقعہ بھی سردار صاحب کی زندگی کا ایک ناقابل فراموش واقعہ ہے۔ جس کا میں اپنی احسان مندی کے تقاضے سے یہاں ذکر کر دینا ضروری سمجھا۔

سردار دیوان سنگھ صاحب نے عنوان مضمون ہذا میں ناقابل فراموش لکھا ہے۔ حالانکہ سردار صاحب خدا کے فضل سے ابھی زندہ ہیں، اور عنقریب مرنے کا ارادہ بھی نہیں رکھتے۔ کیونکہ وہ اپنے خارجی دشمنوں کے طرح اپنے اندرونی دشمنوں یعنی بڑھاپے کا بھی شباب آور دواؤں سے مقابلہ کرتے رہتے ہیں۔ اور اگر خدانخواستہ سردار صاحب دنیا میں نہ ہوتے اور مجھے ان کا مجموعہ مضامین ناقابل فراموش پر کچھ لکھنے کے لئے کہا جاتا تو میں ہرگز اس آزادی اور صاف گوئی سے نہ لکھ سکتا تھا۔ جتنی آزادی اور صاف گوئی سے اس وقت سردار صاحب کی زندگی میں لکھ رہا ہوں۔ میری

اس صاف گوئی اور جسارت کے کریڈٹ کے مستحق بھی سردار صاحب ہی ہیں۔ کیوں کہ ان جیسا روادار اور دوست نواز شخص ہی کسی مخلص دوست ہی کے کسی شخص کو اس جسارت کی ہمت ہوسکتی ہے۔

زندہ باد ناقابل فراموش سردار دیوان سنگھ

سبق آموز عبرت انگیز

(ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب بانی انجمن ترقی اردو)

دنیا میں پند و نصیحت کی ہزار ہا کتابیں ہیں۔ایک سے ایک اچھی اور ہر زبان میں ہیں۔الہامی اور آسمانی صحیفے بھی ہیں۔اخلاق و کردار پر تقریریں اور واعظ بھی ہوتے ہیں۔ ماں باپ اپنی اولاد کو وقت بے وقت نصیحتیں کرتے رہتے ہیں۔ بڑے چھوٹوں کو سمجھاتے اور ہدایت کرتے رہتے ہیں۔لیکن یہ تدبیریں کچھ زیادہ کارگر اور موثر نہیں ہوتیں۔ایک میں حکم و فرمان ہے۔دوسری پھیکی اور بدمزہ، جس میں کوئی دل کشی نہیں۔اسکولوں، کالجوں اور یونورسٹیوں کے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ یہ ذہنی قابلیت اور امتحان پاس کرنے کے لئے اچھی درس گاہیں ہیں۔لیکن اخلاق اور کردار کی بلندی جغرافیہ اور ریاضی کی طرح پڑھنے اور رٹنے سے میسر ہوتی ہے اور نہ ہی پروفیسروں کے لیکچروں سے۔ یہ نایاب شے شائستہ ماحول، صالح صحبت سے ہی حاصل ہو سکتی ہے۔بلاشبہ یہی ایک کارگر اور موثر تدبیر ہے۔لیکن ہر کہیں اعلیٰ اخلاق اور پاکیزہ سیرت کے نمونے نصیب نہیں ہو سکتے۔خصوصا اس زمانے میں جب دولت اور اقتدار کی ہوس مقصد حیات بن گئی ہے۔ایسی صورت میں اس کا صرف ایک ہی بدل ہے کہ وہ یہ کہ ان اولوالعزم اور برگزیدہ ہستیوں کی آپ بیتی یا حالات زندگی مطالعہ کے لئے پیش کیے جائیں۔جنھوں نے اپنی خودی کو مٹا کر اپنا جان و مال اور اپنا سب کچھ اپنی قوم یا وطن یا خلق خدا کی خدمت کے لئے نثار کر دیا۔جن کی بے نفسی فروتنی اور بے لوث خدمت اور عزم راسخ نے افراد اور قوموں کی قسمتیں بدل دیں۔یا جن کی حق پرستی، باطل شکنی اور راست گوئی کے کارناموں نے مردہ دلوں میں نئی روح پھونک دی۔ان حالات کو پڑھ کر دلوں میں امنگ، ولولہ اور جوش پیدا ہوتا ہے۔اور ویسا ہی بننے اور ویسے ہی کام کرنے کا شوق دلوں کو گدگداتا ہے۔

یہ کتاب ناقابل فراموش ایک ایسی ہی کتاب ہے۔ اس میں ایک ایسے شخص کے تجربوں، مشاہدات اور تاثرات کا بیان ہے۔ جو عمر بھر حق کی حمایت میں باطل سے دلیرانہ مقابلہ کرتا رہا۔ اس کی بدولت اس نے طرح طرح کی مصیبتیں اور عقوبتیں سہیں۔ اس پر چور، جعل سازی، سازش، کوکین بیچنے اور نوٹ چھاپنے تک کے طرح طرح عجیب الزامات لگائے گئے۔ جھوٹے مقدمات بنائے گئے۔ اور اس کی پاداش میں اسے بارہا جیل کا منہ دیکھنا پڑا۔ اس نے ایسے ایسے والیان ریاست کا مقابلہ کیا، جن کی قوت اور دولت بے حساب تھی۔ اور جنہوں نے بڑے بڑوں کو نیچا دکھایا تھا۔

دیوان سنگھ کا گھر مظلوموں اور ظلم رسیدوں کی پناہ گاہ تھا۔ وہ اپنی فریادیں لے کر وہاں پہنچتے یا لکھ بھیجتے تھے۔ ان میں امیر، غریب، اور رئیس سب ہی قسم کے لوگ تھے۔ جب تحقیق ہو جاتی کہ شکایت صحیح ہے تو وہ ان کی حمایت پر کمربستہ ہو جاتے۔ ان میں اکثر ظالم، جابر بے درد والیاں ریاست کے ستائے ہوئے ہوتے تھے۔ جن کے مقابل آتے ہوئے بڑے بڑے سورماؤں کے پتے پانی ہوتے تھے۔ سردار صاحب نے ایک جگہ مسٹر ہارنی مین کا یہ قول نقل کیا ہے۔ کہ اخبار نویس دنیا میں ان لوگوں کا ساتھ دینے کے لئے پیدا ہوا ہے۔ جو مصائب میں ہوں۔ ان لوگوں سے ہمارا کوئی تعلق نہیں جو عیش و آرام میں ہوں۔ دیوان سنگھ مفتوں نے ہارنی مین کے اس قول پر ہمیشہ عمل کیا۔ اور جان جوکھوں میں ڈال کر مظلوموں کی حمایت کی۔ اگرچہ اس کی بدولت انہیں بہت سے برے دن دیکھنے پڑے۔ پندرہ بار گرفتار ہوئے اور آٹھ جیلوں کی سیر کی۔ لیکن ان پر جتنی مصیبتیں نازل ہوئیں اور جتنے مقدمات قائم ہوئے۔ اسی قدر ان کی عزت اور قدر بڑھتی گئی۔ وہ چاہتے تو بغیر کسی زیادہ دوا دوش کے گھر بیٹھے بے شمار دولت حاصل کر لیتے۔ لیکن بڑی سے بڑی رشوت اور بڑے سے بڑا لالچ بھی ان کو اپنے اصولوں میں ڈانواں ڈول نہ کر سکا۔

یہ آپ بیتی بڑی سبق آموز اور عبرت انگیز ہے۔ اس میں جہاں پولیٹیکل

ڈیپارٹمنٹ کے راز، دیسی ریاستوں کے اسرار، مظالم اور سازشوں، رشوت کی گرم بازاری، پولیس اور حکومت کی چیرہ دستیوں، جیلوں کی زندگی، اخلاق کی انتہائی پستی، خود غرضی، ہوا و ہوس، غداری، نمک حرامی کے حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے۔ وہاں غریبوں کی مہمان نوازی، مخلص دوستوں کی وفاداری، اور وضع داری، احسان شناسی اور بے لوث خدمت کا بھی کوئی نہ کوئی واقع نظر آئے گا۔ غرض یہ کتاب انسانی فطرت کے مطالعہ کے لئے عجیب مرقع ہے۔

سردار دیوان سنگھ کی زندگی سے ہمیں ایک اور سبق بھی ملتا ہے کہ ان کی تعلیمی حالت کچھ بھی نہ تھی۔ صرف پانچ جماعتیں پڑھنے پائے تھے کہ حالات سے مجبور ہو کر تعلیم ترک کرنا پڑی۔ اور محض اپنے سرگرم شوق اور مطالعہ شب و روز سے ایسی لیاقت حاصل کی کہ وہ صحافت (جرنلزم) میں صف اول میں آگئے۔ اور ان کا اخبار آزادی صحافت، آزادی رائے اور بے لاگ تبصرے کی وجہ سے بہترین اخبار سمجھا جانے لگا۔ کامیابی کا راز محنت، کام کی لگن اور استقلال میں ہے جو اقوام اور افراد کام سے بھاگتے ہیں، اور محنت سے جی چراتے ہیں۔ وہ ہمیشہ ناکام اور غلام رہیں گے، کامیابی اور آزادی ان کی قسمت میں نہیں۔۔۔

ناقابل فراموش میں جرات اور صاف گوئی

(جناب حافظ محمد یوسف صاحب ایڈیٹر شمع دہلی)

سردار دیوان سنگھ مفتوں مدیر ''ریاست'' کی تحریریں میں گزشتہ بیس بائیس سال سے پڑھتا ہوں۔ سات آٹھ سال سے میرا ان کا میل جول بھی ہے۔ یہ چیز کچھ انسانی فطرت سی بن گئی ہے کہ ہم اپنی اچھی باتیں تو بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہیں۔ اور خامیوں کو دوسروں سے چھپاتے ہیں۔ مفتوں صاحب کو قدرت نے یہ خوبی عطا کی ہے کہ وہ اپنی خامیاں اور خوبیاں دونوں بیان کرنے کے عادی ہیں۔

شاید قدرت کا یہی وہ بڑا عطیہ ہے کہ جس نے انہیں ایک نڈر اور بے باک صحافی بنا دیا ہے۔ کہ اردو جرنلزم میں ان کی صاف گوئی کی مثال نہیں ملتی۔ ان کی تحریروں سے جہاں ایک بڑا آدمی خائف نظر آتا ہے۔ وہاں ایک چھوٹا آدمی متاثر بھی معلوم ہوتا ہے۔ انہیں جگ ہنسائی کی باتیں بھی آتی ہیں۔ اور آپ بیتی بھی خوب بیان کرتے ہیں۔

''ناقابل فراموش'' ان کے ایسے ہی واقعات کا ایک مرقع ہے۔ جس میں انہوں نے بیتے واقعات کی یاد ایک نہایت دل چسپ پیرائے میں قلم بند کی ہے۔ جو ان کی زندگی کے بعض اہم واقعات سے بھی پردہ اٹھاتی ہے۔ اس انکشاف میں بڑی بڑی سیاسی شخصیتوں، امیروں، نوابوں اور راجاؤں، مہاراجاؤں سے بھی تعارف ہوتا ہے۔

مجھے یاد ہے کہ مفتوں صاحب کو ان کی بے باکانہ تحریروں کے سبب اکثر حلقوں میں انہیں خوف ناک سمجھا جاتا ہے۔ ایک صاف گو اور بے باک انسان کے لئے یہ اعزاز اس ملک میں ارزاں ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ مفتوں صاحب کو یہ اعزاز پسند تھا یا ناپسند۔ میرا خیال ہے کہ وہ دوستوں اور مخالفوں کے اس دیے گئے اعزاز پر وہ کبھی ناخوش نہیں ہوئے ہوں گے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ یہ اعزاز انہیں صاف گوئی کے صلے میں چند بڑے آدمیوں کے حواریوں کے دربار سے ملا تھا۔ اس کی پاداش میں کہ انہوں

نے بعض پراسرار محلوں اور خلوتوں کے سربستہ راز افشا کیے تھے۔اس صاف گوئی اور بے باکی کے لئے انہیں قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کرنا پڑیں۔جیل ایک ایسی جگہ ہے۔ جہاں اچھے اچھے لوگ ڈول جاتے ہیں۔لیکن انہوں نے جیل کی چار دیواری میں بھی نہایت ثابت قدمی کے ساتھ اپنے خصوصی کردار کو برقرار رکھا۔

میں سمجھتا ہوں کہ ان کی تحریریں کیا جوان کیا بوڑھے سبھی کے لئے یکساں مفید ہیں۔کیونکہ ان کے مطالعہ سے انسان میں جرات، صاف گوئی اور خود اعتمادی کے اوصاف پیدا ہوتے ہیں۔ میں تو کہوں گا کہ وہ اس نا قابل فراموش کارنامے کو اردو کے علاوہ دیگر مروجہ زبانوں میں بھی منتقل کریں۔تا کہ ہر طبقہ اور ہر خیال کا آدمی ان سے مستفید ہو سکے۔اور اپنے کردار کو ان کی تحریروں میں پیش کیے گئے سانچے میں ڈھال سکے۔

بہترین دوست اور بدترین دشمن

(جناب ملا واحدی صاحب ایڈیٹر نظام المشائخ کراچی)

اس کتاب ناقابل فراموش کو میں نے پڑھا۔ سردار دیوان سنگھ مفتوں صاحب کی زندگی اتار چڑھاؤ، اور جوار بھاٹوں سے پر ہے۔ مفتوں صاحب نے بڑی طوفانی زندگی بسر کی ہے۔ وہ جہاں کو دیکھتے نہیں پھرے۔ لیکن جہان ان کے پاس برابر آتا رہا۔ انہیں ہر قسم کے انسانوں اور ہر قسم کے حالات وواقعات کے ساتھ سابقہ پڑا ہے۔ چالیس دن کے تھے کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ حوصلہ مند ماں نے بارہ سال تک پڑھایا لکھایا۔ بارہ سال کی عمر میں پڑھنا لکھنا چھوڑ کر پانچ روپیہ ماہوار کی نوکری کر لی۔

ابتدا پانچ روپے ماہوار کی نوکری سے ہوئی اور انتہا یہ کہ اخبار ریاست کے صرف اشتہاروں کی آمدنی ہزار ہا روپیہ ماہوار تھی۔

سردار صاحب کی عادت ہے کہ جاڑا گزرنے کے بعد گرمی میں کام نہ آنے والے جاڑے کے کپڑے اور گرمی گزر جانے کے بعد جاڑے میں کام نہ آنے والے کپڑے خیرات کر دیتے تھے۔ دوسرے جاڑے اور دوسی گرمی کے واسطے کپڑے روکتے نہیں تھے۔ لیکن یہ تماشا بھی ان آنکھوں نے دیکھا ہے کہ سردار صاحب جیل سے لوٹے ہیں اور ایک سے دوسرا جوڑا بدلنے کو نہیں ہے۔ اسے ہی دھوتے اور پہن لیتے ہیں۔

یک بیک گردش چرخ پھر سے لبریز ہو جاتی ہے۔ سردار صاحب کی زندگی میں لبریز کا بھی کچھ ٹھکانہ نہیں۔ اور ایسا وقت بھی آتا ہے کہ سردار صاحب کہتے ہیں کہ دہلی کی حکومت نے مجھے مہاراجہ پٹیالہ کے حوالے کر دیا تو ہیرے کی کنی کھا لوں گا اور مر جاؤں گا۔ مہاراجہ کے رحم وکرم پر نہیں جیوں گا۔

مہاراجہ پٹیالہ سردار صاحب پر پٹیالہ بلا کر مقدمہ چلانا چاہتے تھے۔ مگر دلی کے چیف کمشنر سر جان تھامسن نے جو حکومت ہند کے پولیٹیکل سیکرٹری رہ چکے تھے۔ اور

راجہ نوابوں کی بدعنوانیوں سے واقف تھے۔ مہاراجہ پٹیالہ کی اس خواہش کو ٹھکرا دیا۔

لہر بہر کا دور ہو یا خودکشی پر آمادہ ہو جانے کا دور۔ پانچ روپے کی ملازمت کر رہے ہوں یا ہزار ہا روپے ماہوار کما رہے ہیں۔ سردار صاحب کی عقل حالات و واقعات سے نتائج ضرور اخذ کرتی ہے۔

پانچ روپے ماہوار کی ملازمت سردار صاحب نے اپنے وطن حافظ آباد کے کسی ہندو بزاز کے ہاں کی تھی۔ بزاز کی دکان پر ایک بوڑھا مسلمان درزی بھی بیٹھا کرتا تھا۔ اس کے جواب بیٹے نے کہیں سبز رنگ کا مخمل کا کوٹ سفید رنگ کے دھاگے سے سی دیا۔ درزی نے بیٹے سے کہا کوٹ سلوانے والے گنوار کا خیال نہیں کیا تھا تو مخمل کا خیال تو کرنا چاہیئے تھا۔ تو نے مخمل کا ناس کر دیا۔ درزی نے دوبارہ سارا کوٹ ادھیڑا اور پھر سیا۔

سردار صاحب لکھتے ہیں کہ اس واقعہ کا مجھ پر اتنا اثر ہوا کہ میں ہر کام توجہ سے کرنے لگا۔

جو شخص بارہ سال کی عمر میں اتنا اثر لے سکتا ہے۔ اس نے آئندہ حالات و واقعات سے کتنا اثر لیا ہوگا۔ اور حالات و واقعات سے کیا کیا نتائج اخذ کیے گئے ہوں گے۔ اس کتاب میں سردار صاحب نے اپنے ان ہی تاثرات اور تجربات کو جمع کر دیا ہے۔

سردار صاحب کی تحریر میں اللہ تعالیٰ نے خاص نوعیت کی قوت بخشی ہے۔ تحریر بناوٹ اور تصنع سے پاک ہوتی ہے۔ سردار صاحب خیالات کو تکلف اور پیچ پچر کے ساتھ پیش نہیں کرتے، بالکل بے ساختہ لکھتے ہیں۔ غالباً یہی ان کی تحریر کی قوت کا راز ہے۔ اس بات نے تحریر میں وہ زور بھر دیا ہے۔ اور تحریر کو وہ پختگی دے دی ہے۔ جس کی بناء پر باوجود زبان کے نقائص کے انہیں صاحب طرز لکھنے والا کہا جا سکتا ہے۔

اخبار ''ریاست'' کے ایڈیٹوریل سٹاف میں بہت سے ممتاز اہل قلم اور زبان دان شامل رہ چکے ہیں۔ لیکن اہل قلم اور زبان دان حضرات اور مضامین لکھا کرتے تھے۔ یا اوروں کے مضامین کی اصلاح کیا کرتے تھے۔ اخبار ''ریاست'' کا ایڈیٹوریل ہمیشہ سردار صاحب نے لکھا۔ کبھی اتفاق سے بیمار ہو گئے اور ایڈیٹوریل اہل قلم اور زبان

دان حضرات کو لکھنا پڑ گیا تو اخبار ''ریاست'' پھیکا اور پھس پھسا سمجھا جاتا تھا۔ اور پڑھنے والے کو مزہ نہ آتا تھا۔ سردار صاحب کے خلاف محاورہ فقروں کو ہلا دینا ایڈیٹوریل کی جان سلب کر لیتا تھا۔

تحریر کا یہی طرز اور تحریر کا یہی ٹھاٹھ سردار صاحب کی کتاب نا قابل فراموش میں ہے۔ اس کتاب کے بیشتر مندرجات تو اقعی نا قابل فراموش اور یاد رکھنے کے قابل ہیں۔ اور ان پر رائے زنی غور کرنے کے قابل ہے۔ اخبار ریاست کے ایڈٹوریل جیسی جرات مندانہ رائے زنی۔

ضروری نہیں کہ آپ سردار صاحب کے ہر تاثر سے اتفاق ہی کر لیں۔ میں بھی ہر رائے اور ہر تاثر سے متفق نہیں ہوں۔ لیکن ان کے اظہار کی قوت سے انکار بہر حال محال ہے۔ سردار صاحب کی تحریر کی اور بھی خصوصیات ہیں۔ مثلاً اس میں جتنا زور پہلے دن تھا۔ اتنا زور آج بھی ہے۔ سردار صاحب کی تحریریں بوڑھی نہیں ہوئی۔ تحریر میں جوانی کی سی جان ہے۔

جیسے عبرت ناک اور سبق آموز واقعات سے سردار صاحب کو سابقہ پڑا۔ ویسے واقعات سے کم لوگوں کو سابقہ پڑتا ہے۔ پھر سردار صاحب نے واقعات کے بیان میں افسانوں کی سی دل کشی پیدا کر دی ہے۔

کئی جگہ خواجہ حسن نظامی کا تذکرہ بھی آیا ہے۔ ظاہر ہے یہ میرے لئے دل کش نہیں ہو سکتا۔ اس کے متعلق بس اس قدر کہنا چاہتا ہوں کہ سردار صاحب بہت اچھے دوست ہیں۔ اور بہت بڑے دشمن۔ جب خواجہ صاحب کے دوست تھے تو خواجہ صاحب کا فدا کار سردار صاحب کے برابر کم از کم میں نے نہیں دیکھا۔

سردار صاحب بہترین دوست اور بدترین دشمن نہ ہوتے تو نا قابل فراموش کتاب ہمیں پڑھنے کو نہ ملتی، جن حالات سے سردار صاحب گزرے ہیں، معمولی انسان ان حالات سے نہیں گزرتا،

پنجاب کا تیسرا معجزہ

(پروفیسر غلام احمد صاحب فرقت کاکوروی ایم اے)

دیوان سنگھ مفتوں ایڈیٹر ریاست کو میں اس وقت سے جانتا ہوں جب سے وہ مجھے نہیں جانتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ پورے تیس سال یعنی اپنے بچپن سے ۴۰ء تک میرے جملہ حقوق صرف شہر لکھنؤ کے میونسپل حدود کے نام محفوظ رہے۔ اس لیے ہندوستان کی بڑی سے بڑی مشہور تاریخی عمارتوں سے لے کر ایڈیٹر ریاست جیسی شخصیت تک سے میرا تعارف دلی آنے سے قبل تک صرف غائبانہ رہا۔ غائبانہ یوں کہ میں ان کا اخبار اس وقت سے جب کہ وہ پہلے پہل آرٹ پیپر پر چھپنا شروع ہوا تھا۔ الف سے لے کر بڑی یے تک بڑی پابندی سے پڑھتا رہا تھا۔ اس اخبار کی ترتیب اور انداز بیان اور مضامین کی ندرت کے پیش نظر میرے لئے یہ فیصلہ کرنا دشوار ہو گیا تھا کہ ایڈیٹوریل نوٹوں سے قلم زار تک کون سی چیز زیادہ دل چسپ نہیں ہے۔ ان کے قلم کی بے باکی، ان کی معلومات کی پختگی، ان کی تحریر کا زور، ان کا غیر متعصبانہ انداز بیان اور ان کے قلم کی شوخیاں پڑھ کر میں سوچا کرتا تھا کہ نہ جانے یہ شخص کس وضع قطع طول و عرض، ذہانتوں اور بذلہ سنجیوں کا مجسمہ ہو گا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ سکھ ہیں کبھی میرے دماغ میں ان کی تحریروں کی روشنی میں یہ خیال جگہ نہ پا سکا کہ ان کے سر پر بال اور چہرے پر داڑھی بھی ہو گی۔ اگر کبھی داڑھی کا تصور آتا بھی تھا تو اس وقت جب کہ ان کی تحریر میں کوئی شرعی بات غیر شرعی موقع پر، رواداری میں کسی اسلامی مذہبی مسئلے کے سلسلے میں نکل جاتی تھی۔ اور اس سے میرا دماغ دوسرا نتیجہ یہ نکالتا تھا کہ یہ شخص یا تو مسلمان زدہ سکھ ہے۔ نہیں تو سکھ زدہ مسلمان ضرور ہے۔ بہر حال جہاں جہاں اور جب بھی ریاست میں کسی اسلامی مسئلے پر روشنی ڈالی جاتی یا مذہبی حوالے دیئے جاتے تو مجھے ایسا محسوس ہوتا کہ ایڈیٹر ریاست نے میدان صحافت میں قدم

رکھنے سے قبل ضرور کسی خالص اور عربی النسل مولوی کے پاؤں دابے ہوں گے۔ یا پنج وقتہ اس کی بدھنیوں کو غسل دے کر یہ شرعی نکتے جمع کیے ہوں گے۔ بہر حال ایک عرصے بعد جب انہوں نے اپنے اخبار نا قابل فراموش کے عنوان سے مضامین کا سلسلہ شروع کیا۔ جس میں ان کی آپ بیتی ہوتی تھی۔ تو اسے پڑھ کر مجھے ان کے مذہب کے بارے میں اندازہ ہوا کہ وہ صرف انسانیت کو اپنا دین و مذہب مانتے ہیں ۔اور کرم اور اعمال کے قائل ہیں۔ چنانچہ اپنے مذہبی عقائد کے بارے میں وہ زیر نظر مجموعے کے صفحہ۱۱۲ میں لکھتے ہیں:

> ایڈیٹر ریاست نہ تو خدا پر یقین رکھتا ہے۔ اور نہ خدا سے منکر ہے۔ اور نہ کبھی اس نے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی ہے کہ خدا ہے یا نہیں۔ یا اس دنیا کو چلانے والا خدا ہی ہے۔ یا کوئی اور قدرت مگر وہ تین باتوں کا قائل ضرور ہے، جوتش یعنی ستاروں کی گردش کا اثر انسانوں پر۔ دوسرے پچھلا یا آئندہ جنم یعنی مسئلہ تناسخ (گویا اعمال اور دعا یا بد دعا کا اثر)۔

یہ واقعہ ہے کہ جو شخص دعاؤں یا بد دعاؤں کا قائل ہوگا۔ وہ نیکی اور بدی کا بھی سختی سے قائل ہوگا۔ نیک اعمال پر بھی وہ پورا پورا بھروسہ رکھتا ہوگا۔ اس کی زندگی تصنع اور بناوٹ، مکروفریب سے بالا ہوگی۔ اس کا ظاہر اور باطن ایک ہوگا۔ وہ اپنی اچھائیوں اور برائیوں کو ظاہر کرنے میں ذرا بھی شرم وحیا محسوس نہ کرتا ہوگا۔ چنانچہ مہاتما گاندھی جیسی بلند پایہ شخصیت کی طرح ایڈیٹر ریاست کی تحریروں کی بھی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنی کمزوریوں کا ذکر بھی اسی طرح نہایت تفصیل سے مزے لے کر بیان کرتے ہیں۔ چنانچہ اس تصنیف کے صفحہ۵۱ پر انہوں نے باوجود اتنے بلند پایہ صحاف ہونے کے اس واقعہ کا ذکر کرنے میں ذرا بھی جھجک محسوس نہیں کی کہ ''ایڈیٹر ریاست'' پانچ روپیہ ماہوار پر حافظ آباد کے ایک بزاز کی دکان پر ملازم ہوا۔ کام یہ تھا کہ اندر سے

کپڑوں کے تھان لا کر گاہکوں کو دکھائے جائیں۔ اور اس سلسلے میں دوسری جگہ جب
کہ وہ اپنے ذوق صحافت کی تشنگی دور کرنے کے سلسلے میں لکھنو آ کر سید جالب مرحوم
دہلوی ایڈیٹر "ہمدم" کے پاس گئے۔ اور ان سے کہا کہ اگر آپ میرے تیس روپے
ماہوار بھی مقرر کر دیں تو میں اطمینان کے ساتھ آپ کی خدمت میں رہ کر کام کرنا اور
سیکھنا چاہتا ہوں۔ سید جالب نے جواب دیا کہ کوئی جگہ خالی نہیں۔ میں نے پھر عرض کیا
کہ مجھے بطور چپراسی ہی رکھ لیں۔ میں چپڑاسی کے طور پر دن بھر کام کیا کروں گا اور
ساتھ ساتھ آپ سے صحافت بھی سیکھا کروں گا۔ سید جالب میری اس درخواست پر
حیران تھے۔ مگر آپ نے فرمایا کہ افسوس اس وقت دفتر میں چپڑاسی کی بھی کوئی جگہ خالی
نہیں۔ یہ جواب سن کر میں نے عرض کیا، آپ کو میرے مفت کام کرنے پر اعتراض
ہے۔ سید جالب نے مسکراتے ہوئے فرمایا مفت کام لینے میں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔
چنانچہ راقم الحروف نے اگلے روز سے دفتر ہمدم میں بغیر تنخواہ کے کام کرنا شروع کر دیا۔
دن بھر دفتر ہمدم میں بغیر کسی معاوضہ کے کام کرتا ہے۔ رات کو بارہ بجے تک ایک
کیمسٹ کی دکان پر پندرہ روپے ماہوار پر ملازم ہے۔ اور اس کے ذاتی آمدنی یا خرچ
آٹھ آنے روز سے زیادہ نہیں۔۔۔۔

مذکورہ بالا واقعہ سے ایڈیٹر ریاست" کے کردار کی بلندی کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا
ہے۔ اگر آپ اسے مزاق پر محمول نہ فرمائیں تو میں کہوں گا کہ فرشتوں کی فروگزاشت
سے اگر ایڈیٹر ریاست" ہندوستان میں نہ پیدا ہوا ہوتا۔ اور امریکہ یا کسی دوسرے
یورپین ممالک میں پیدا ہوا ہوتا تو آج وہاں کا صدر ریاست ضرور ہوتا۔ کیونکہ ایسے ہی
ذہین اور جفاکش انسان وہاں کے بارہا صدر ہوئے ہیں۔

ایڈیٹر "ریاست" کی تحریر کی شوخی کا اندازہ آپ مندرجہ ذیل فقروں سے کر سکتے ہیں
۔ جس میں صفحہ ۶۰ پر مرحوم قاضی سر عزیز الدین احمد وزیر اعظم دتیا کے بارے میں لکھتے
ہیں کہ قاضی صاحب مرحوم بہت وضع دار بزرگ تھے۔ دہلی میں آپ کی حجامت کے

لئے سال ہا سال سے وہی حجام آتا۔ جس نے کنگ جارج، کنگ ایڈورڈ، درجنوں وائسراؤں، کمانڈر انچیفوں ممبران انتظامیہ کونسل اور کنگ حبیب اللہ آف افغانستان وغیرہ کی حجامت بنائی تھی۔ یہ واقعہ ہے کہ اس مجموعہ میں جو ذاتی تجربات ایڈیٹر ''ریاست'' نے لکھے ہیں۔ انہیں پڑھ کر جب ناظرین ایڈیٹر ''ریاست'' کا تصور کریں گے تو ایک ریش دار بزرگ قسم کی انسائیکلوپیڈیا ہاتھ باندھے سامنے کھڑی نظر آئے گی۔

دراصل ناقابل فراموش میں ایڈیٹر ''ریاست'' نے اپنے جن ذاتی تجربات پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ ایک اخلاقی درس ہے جو انہوں نے عام انسانوں کو دیا ہے۔ یہ کتاب ایک اخلاقی صحیفے کی حیثیت رکھتی ہے۔ جسے پڑھ کر نوجوانوں کو اپنا مستقبل بنانے میں مدد ملے گی۔

ایڈیٹر ''ریاست'' کی تحریر میں جو دل کشی پائی جاتی ہے۔ اس کی مثال نہ تو کسی صحافت نگار کے ہاں ملتی ہے۔ اور نہ ہی کسی دوسرے ادیب کے یہاں۔ اور غالباً اسی چیز کو دیکھ کر بابائے صحافت سید جالب دہلوی نے کہا تھا کہ ان کے شاگردوں میں سب سے زیادہ کامیاب دیوان سنگھ ہے۔ اور اس کامیابی پر آپ کو فخر ہے۔

ایڈیٹر ''ریاست'' کی تحریر کی ایک دوسری نمایاں خوبی ان کا بے باکانہ انداز بیان ہے۔ اب سے بیس پچیس برس پہلے جب کہ ہندوستانی صحافت کے گلے پر ہر وقت انگریزی قانون کی شمشیر برہنہ لٹکی رہتی تھی۔ وہ اس وقت بھی بدیسی حکومت اور اس کے پروردہ والیان ریاست پر اتنی ہی شدت سے تنقید کرتے تھے۔ اور لطف یہ ہے کہ جس طرح آج حکام اور ملک کے ارباب حل وعقد ان کے قلم سے لرزاں براندام رہتے ہیں۔ وہی حالت بدیسی حکومت کے دور میں والیان ریاست اور ان کے آقائے نامداران کی تھی۔ بہر حال اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سر زمین پنجاب سے تین معجزے وجود میں آئے۔ اول سر اقبال، دوسرے مولانا ظفر علی خان اور تیسرے سابق بھاری بھرکم اور موجودہ نحیف الجثہ دیوان سنگھ مفتون ایڈیٹر ''ریاست''۔

غیر فانی کتاب

(حضرت مولانا عبدالرزاق صاحب ملیح آبادی)

بجلی کی کڑک، کوندے کی لپک، بادلوں کی گرج، گھنگھور گھٹاؤں کی رم جھم، ہنسیاں ،چہلیں، دل لگیاں! پھر دفعتۃً پولیس اور پولیس کی رنگارنگ نیکیاں، شیطانی حکومت کا قہر و ستم، قید و بند، حبس دوام، پھانسی بھی!

پھر راجے مہاراجے اور راجوں مہاراجاؤں کی "رشک ملائک" بوقلموں سیرتیں!

پھر عزم وہمت کے مرقعے، پہاڑوں سے ٹکر لینے کا عزم، سمندروں سے بھڑ جانے والی ہمت۔

جلوے، حیرت انگیز جلوے! باطل کی یلغار، ظلم کا طوفان، حق کی بے کسی، بے بسی ،کس مپرسی، راون ارجن کی شان سے فتح مند سینہ تانے ناچ رہا ہے۔ سچائی کا بے گور وکفن لاشہ پڑا تڑپ رہا ہے۔ نہ آسمان کے آنسو ٹپکتے ہیں اور نہ ہی زمین کی چھاتی پھٹ جاتی ہے۔

مگر؟

تو مگر کے بعد سچ مچ ایک طلسم ہوش ربا سے آنکھیں چار ہوتی ہیں۔

غرور کا سر کچل ڈالنے والا ایک سر ابھرتا نظر آتا ہے۔ جوش حق سے یہ سر اونچا ہوتے ہوئے دوش ثریا تک پہنچ جاتا ہے۔

ایک گردن نمودار ہوتی ہے جس نے ظلم واستبداد کے سامنے جھکنا جانا ہی نہیں۔

ایک گدائے بوریہ نشین، شیروں کی طرح دہاڑتا، چنگھاڑتا، جبار وقہار قوتوں پر مردانہ وار بڑھتا چلا آتا ہے۔

باطل اپنی طاغوتی طاقتوں، قارونی خزانوں کے بل بوتے پر جان لیوا آہنی ضربیں لگارہا ہے۔ لیکن یہ دیکھو گدائے بے نوا نے باطل کو پچھاڑ دیا ہے۔ اور باطل اپنی نمرودی

چنگیزی، گنگا جمنی دریائے غرور میں پڑا ڈبکیاں کھا رہا ہے۔

یہ ہے کتاب نا قابل فراموش"

پھر مفتوں صاحب کے قلم کی گل کاریاں ہنسا بھی رہی ہیں اور رلا بھی رہی ہیں۔ نشتر ہیں کہ دلوں میں چبھے چلے جا رہے ہیں۔

پھر سبق ہیں، مکارم اخلاق کے سبق، روکھی سوکھی زبان میں نہیں، شہد برساتی ہوئی زبان میں اخلاقیات کے سبق چل رہے ہیں اور اس طرح چل رہے ہیں کہ وہم ہی نہیں ہوتا کہ ہم سبق پڑھ رہے ہیں۔ مگر سبق ہیں کہ دلوں میں رستے بستے چلے جا رہے ہیں۔ چہلیں ہیں کہ گدگدا، گدگدا کے بے دم کیے ڈال رہی ہیں۔

پھر تجربے ہیں لہو رلانے والے تجربے، دلوں کو گرما ڈالنے والے تجربے،

کہیں انسانیت برہنہ پڑی سسک رہی ہے۔ اور ہم ابکائیاں لے رہے ہیں۔ شرم سے گڑے چلے جا رہے ہیں کہ ہم بھی انسان ہیں۔

اور کہیں انسانیت اپنی پوری رعنائیوں، جلالتوں کے ساتھ کھڑی مسکرا رہی ہے۔ اور ہم فخر سے سر اونچا کیے چلے جا رہے ہیں کہ ہم بھی انسان ہیں۔

بخدا مجھے تو رشک آتا ہے۔ کتاب پڑھتا جاتا تھا اور پٹھانی شیطان بھی انگڑائیاں لیتا جاتا تھا۔ لگاتار کانا پھوسی کیے جاتا تھا کہ سردار کے ہاتھ سے قلم چھین لے۔ لبھاؤ بڑا تھا تو عقل نے کہا تو پٹھان ہی، مگر مفتوں بھی سکھ ہے۔ زبردستی تو سردار قبضے میں آنے سے رہا۔ پٹھانوں کی روایتی چالاکی سے کام لیا جائے تو شاید سردار اپنا قلم تیرے سپرد کر دے۔ آخر سردار ہی تو ہے۔

عمرو بن معدی کرب عرب کا شہرہ آفاق سورما تھا۔ ایک دنیا اس کی ترک تازیوں، بے پناہ حملوں سے تھرایا کرتی تھی۔ ابن معدی کرب کی تلوار کا صمصامہ تھا۔ اور اپنی کاٹ میں ضرب المثل تھی۔ عمر فاروقؓ خلیفہ ہوئے، خود بھی بڑے جرار سپاہی تھے۔ خیال ہوا کہ ابن معدی کرب کی تلوار کا صمصامہ کو دیکھیں۔ حکم کی دیر تھی۔ تلوار

حاضر ہوگئی ۔ ہاتھ میں لی اور جھٹک کر ہلائی، تو ذرا نہ جچی ۔ حیرت سے چیخ اٹھے اسی صمصامہ کی یہ دھوم ہے ۔ بلاؤ معدی کرب کے بیٹے کو ۔'' حاضر ہوا تو فرمایا تیری تلوار تو کچھ بھی نہیں ۔'' عرب سورما نے عرض کیا، امیر المومنین! تلوار تو محض ایک لوہے کا ٹکڑا ہے ۔ لیکن وہ ابن معدی کرب کا بازو ہے جس نے لوہے کے اس ٹکڑے کو پورے عرب میں شہرت دے رکھی ہے ۔ خطا معاف آپ کے جسم میں ابن معدی کرب کا بازو موجود نہیں ۔

تو بس آپ خود ہی فرمائیں، دیوان سنگھ کا قلم کسی طرح چھین بھی لوں یا دم دلاسا دے کر اینٹھ بھی لوں تو نتیجہ وہی صمصامہ جیسا ہی تو نکلے گا۔

''امابعد'' دیوان سنگھ کی نا قابل فراموش'' آپ چاہیں تو میں قسم کھا کر کہہ دوں کہ یہ کتاب اردو لٹریچر میں نا قابل فراموش رہے گی ۔

عمر بھر کسی کتاب کا دیباچہ کبھی لکھا ہی نہیں، کوئی کتاب کبھی جچی ہی نہیں ۔ قلم سے تعریف کرنے میں اول درجے کا کنجوس مکھی چوس ہوں ۔ لیکن دیوان سنگھ کی نا قابل فراموش نے واقعی ہی مجھ پر نا قابل فراموش اثر کیا ہے ۔

پورے جزم، پورے یقین اور پورے وثوق سے کہتا ہوں کہ اردو ادب نے نا قابل فراموش جیسی کتاب پہلے کبھی نہیں دیکھی ۔ ہمارے ادب میں یہ کتاب زندہ رہے گی ۔ کیوں؟ ۔ اس لئے زندہ رہے گی کہ یہ کتاب انسانی زندگی کی بھیانک خون چکانیوں اور دل فریب رعنائیوں کی ہو بہو تصویر ہے ۔ ایک زندگی ہے جو صفحے صفحے سے پھوٹ رہی ہے، چھلک رہی ہے ۔ اڈر ہی ہے ۔

دیوان سنگھ بے شک فانی انسان ہے ۔ ایک دن مر ہی جائے گا ۔ مگر دیوان سنگھ کی نا قابل فراموش غیر فانی ہے ۔ کبھی نہیں مرے گی ۔

بہترین خودنوشت سوانح عمری

(جناب ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ ایم،اے،پی،ایچ،ڈی لٹ،ہیڈ پنجابی ڈیپارٹمنٹ پنجاب یونیورسٹی)

مفتوں صاحب کئی برس ہوئے میں نے درخواست کی تھی کہ آپ اپنی سوانح حیات کتابی صورت میں شائع کیجیے۔ان دنوں ''ریاست'' کے توسط سے سردار مفتوں صاحب ہر ہفتہ اپنی کتاب زندگی کا کوئی ورق پیش کرتے تھے۔مجھے تو چندہی واردات نے سردارجی کی شخصیت کامداح۔ان کی اعجاز بیانی کا شیدائی اوران کی صاف گوئی اور ان کے نڈرپن کا والا وشیدا بنادیا تھا۔بہت ممکن ہے کہ اوراصحاب نے بھی اس طرح کا تقاضا کیاہو۔

ذاتی ملاقات تو مدیر ریاست سے غالبا ۱۹۴۹ء میں ہوئی۔دریائے گنج کے ایک کونے میں پڑے تھے اور میری طرح انقلاب کو دعائیں دے رہے تھے۔جب چائے میز پر آئی اور تکلفات پر نظر پڑی تو معلوم ہوا کہ ایک صادق دوست، سخی میزبان اور دریا دل داتا ایک اجنبی کو بھی باوجود اپنی مالی مشکلات کے وہ کچھ پیش کرسکتا ہے۔جس کا مہمان کو خواب وخیال تک نہ ہو۔توقع کی بات تو جانے دیجیے۔ہاں بے واسطہ دیوانہ ۱۹۱۹ء سے سردار دیوان سنگھ مفتوں صاحب کو جانتا ہے۔غالبا ۱۹۲۰ء۱۹۲۱ء میں سردار سردول سنگھ کولیشر سے مفتوں صاحب کی بلندی کرداری کے قصائد سنے اور جبھی قائل ہوگیا کہ جسے سردار کویشر سنگھ اچھا کہیں،وہ بہت اچھا ہے فی الواقع۔

مفتوں صاحب کی یہ خودنوشت سوانح عمری پڑھ چکا تو دل نے شاعری شروع کر دی۔کیا فرماتے ہیں حضرت دل مجھ سے کوئی پوچھے نہ پوچھے۔میں کہوں گا اس کتاب کا ترجمہ ہندوستان کی تمام تسلیم شدہ زبانوں میں کیا جائے۔اس کتاب کا انگریزی ترجمہ امریکہ میں شائع ہو۔اوراس کتاب سے موزوں اقتباسات سیکنڈری اسکولوں

کے ادبی لسانی نصاب میں شامل کیے جائیں۔

میں جانتا ہوں دل دیوانہ کیوں مفتوں صاحب کی تحریرات پر لٹو ہے۔عرصہ ہوا ایک شعر ہوا تھا۔وہ بھی سنیئے۔

تھا دل دیوانہ ایک پتلا! خلوص وصدق کا
راز کی سب باتیں چہرے سے نمایاں ہو گئیں

میری طرح ہر وہ شخص جس کے دل میں درد ہے۔جو جذب وسلوک کا قائل ہے۔ جو وحدت الوجود پر ایمان رکھتا ہے۔جسے روز حساب کی فکر ہے۔ جو حقیقی اور باقی مساوات کا قائل ہے۔جو ہر فرد واحد، ہر گروہ، ہر قوم اور ہر ملک میں کچھ نہ کچھ اچھائی دیکھنے کا عادی ہے۔ جو اخلاقی اقدار کی تینوں بنیادوں کو تسلیم کرتا ہے۔خاندانی تربیت، ذاتی تجربات اور اللہ تعالیٰ کا کرم جسے اپنے وطن کی اخلاقی اور روحانی ترقی کی اور بھی زیادہ فکر ہے۔اقتصادی اور سیاسی ارتقاء کے ساتھ ساتھ۔ہاں ہر وہ شخص مفتوں صاحب کی سوانح حیات پڑھ کر بے اختیار ان کے دل ودماغ اور قلم کی بے پناہ داد دینے پر خود کو مجبور پائے گا۔

فقیر نے انگریزی زبان میں شائع ہوئی بہت سی خودنوشت سوانح عمریاں، ادیبوں ،سیاست دانوں اور روحانیت پرست دوستوں کی جن میں ہندوستانی، امریکن، فرانسیسی، انگریزی، یونانی، اور جرمن شامل ہیں، بڑے غور وانہاک اور سبق اندوزی کے جذبے سے پڑھی ہیں۔اس مطالعہ کی بناء پر مصنفانہ انداز بیان اور تقابلی نکتہ نظر سے فقیر کہتا ہے کہ آج تک کوئی ایسی کتاب شائع نہیں ہوئی جس میں مفتوں صاحب کی خودنوشت سوانح عمری کی طرح ہر واقعہ بلا کم وکاست، بے غلو اور بے رنگ آمیزی کے بے طرح داری کے لکھ دیا گیا ہو۔اس قدر رندر پن سے سچ کو سچ اور جھوٹ کو جھوٹ کہا گیا ہو۔تجربات کی اتنی وسعت، امارت، عمق، ان کا اتنا تنوع ہوا اور تجربات ہر طبقہ ہر رنگ، ہر سطح ہر رنگ کردار سے متعلق ہوں۔ بیان کا ڈھنگ اتنا رواں

شفاف، توجہ گیر اور ہلکا ہو۔ زبان ہر موقع اور واقعہ کے لئے موزوں ہو۔ نیز مجموعی طور پر زبان کا استعمال قادرانہ ہو اور لغات وطرز خاص وعام کی تمیزوں کو بھلوا دینے والا ہو ۔ داستان گوئی کے ساتھ ساتھ معرفت پیائی ہو۔ تصویر کشی کے ساتھ ساتھ حق پروری ہو۔ اور واقعہ نگاری کے ساتھ ساتھ نکتہ آفرینی ہو۔ غریبی میں امیری اور امیری میں غریبی میں مزے لینے والا مصنف زندگی کا سارا کھیل شروع سے آخر تک ایک بے لاگ لیلا کے طور پر کھیل سکا ہو۔ یعنی ہر قدم پر عامل خود کو شاہد و ناقد بھی محسوس کرتا ہو۔

میاں اپنے بچوں کو، اپنے دوستوں کو، اپنی بیوی کو اپنے شوہر کو، اپنے افسروں کو اپنے ماتحتوں کو اپنے پڑوسیوں کو، اپنے دشمنوں کو اگر تعلیم دینا مقصود و منظور ہو تو ساری کی ساری کتابیں انہیں پڑھوا دو۔ اور اگر اتنا نہیں کر سکتے وہ یا آپ تو صرف اتنا ہی کریں کہ اس کتاب کے ابواب کے عنوانوں کو الگ الگ تختہ کاغذ پر لکھ کر درون خانہ کی دیواروں پر چسپاں کرا دو۔ یہ تو میں نہیں کہتا کہ زندگی کام یاب ہو جائے گی۔ ہاں زندگی زندگی ہو جائے گی۔ دیکھو تو کیا فرماتے ہیں سردار صاحب؟۔

واللہ یہ عنوان ہیں یا اخلاق خداوندی پر مشتمل ایک عارف پر نازل ہوئے۔

ظلم وزیادتی کو برداشت نہ کرو

والیان ریاست کا پرسٹیج

عزت کی قربانی

عزت مرنے کے بعد

پانی کا اثر طبائع پر

سی آئی ،ڈی کے معتبر رپورٹر

غدار نا قابل معافی ہیں

گورنمنٹ کی کاغذی مشینری

جرنلزم کا روشن پہلو

قانون	اور	فرض
معقولیت	باعث	اطمیان

بغیر	نیت	کے	جرائم

نفرت	اور	محبت	کے	اسباب

وہ خاص بات جس نے مجھے سردار صاحب کا بے حد گرویدہ کر دیا ہے۔ اور جو میرے پچاس سالہ تجربات میں کسی اور ادیب رہنما عامل اور عارف میں شاذونادر ہی ملی ہے۔ وہ یہ ہے کہ سردار صاحب نے سوانح قلم بند کرتے وقت واقعہ کی اہمیت اس کی سبق آموزی، اس کی دل چسپی اور اس کی معنی خیزی کو پیش نظر رکھا ہے۔ خواہ وہ واقعہ کسی غریب پیشہ مجرم یا ولایتی شخص سے متعلق ہے۔ خواہ کسی امیر فارغ البال پاک دامن یا دیسی شخص سے۔

عام طور پر یہی دیکھا جاتا ہے کہ سوانح صرف انہی ناموں، کاموں، مقاموں، واقعوں، تعلقوں کو لیتے ہیں۔ بلکہ گھسیٹ لاتے ہیں جو بڑے ہیں۔ جن سے کوائف نگار کی بڑائی یا بڑاپن ثابت ہو۔ اور پڑھنے والے پر اس بات کا رعب چھا جائے کہ میں اس بڑے آدمی کی زندگی کے بڑے واقعات پڑھ کر بڑے نکتے حاصل کر سکتا ہوں۔ مگر سردار دیوان سنگھ مفتوں صاحب ایک معمولی کھتری سکھ گھرانے کا کافرد تھا۔ یہی تھا اور یہی ہے اور یہی ہوگا۔ یعنی اس نے خاندانی روایات، سکھ تعلیمات، اور عوامی فطری صلاحیتوں کو ایسا سنبھالا اور انہیں وہ فروغ دیا اور اس سختی سے ان پر کاربند رہا۔ کہ سب کچھ سہہ، سن، دیکھ کر بھی وہ وہی ہے جو پہلے تھا۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اول ہی سے چھوٹا یا بڑا تھا۔ اور اب بھی وہی ویسا ہی ہے۔ ہاں تلخ دوراں نے ستم ہائے زمانہ نے اسے کوئلہ سے ہیرا بنا دیا ہے۔ اور پتھر سے سنگ مرمر۔ اسے اظہار عقیدت سمجھیئے یا بیان واقعی۔

درس عمل

(ڈاکٹر محمد حفیظ سید ایم ،اے ، پی ،ایچ ،ڈی ۔ممبر برٹش انسٹی ٹیوٹ آف فلاسفی لندن)

دیباچہ کا مقصد ہے کہ کسی کتاب کا قارئین سے تعارف کرانا ۔لیکن پیشتر اس کے کہ راقم الحروف اس فریضہ کو انجام دے کہ اطمینان ومسرت حاصل کرے ۔نا قابل فراموش کتاب'' کے مصنف کے کارناموں پر انہیں مبارکباد دیتا ہے ۔

ادبی اور اخلاقی کتابوں کے مضامین عموماً فرضی ،قیاسی اور تخلیقی ہوتے ہیں ۔اور زیادہ تر جگ بیتی کے واقعات پر مبنی ۔لیکن زیر نظر تصنیف اس نظریہ سے مستثنیٰ ہیں ۔ اس کے فاضل مصنف نے جو کچھ قلم بند کیا ہے ۔وہ آپ بیتی ہے ۔جسے ان کے نا قابل فراموش تجربات ،تاثرات ،مشاہدات کا جیتا جاگتا مرقع سمجھیے یا عبرت آموز واقعات کا سر چشمہ ۔ان کی حقیقت بین اور مآل اندیش نگاہیں ،روزمرہ کے حادثات اور واقعات کو سر سری نظروں سے نہیں دیکھتیں ۔ بلکہ ان پر غائرانہ نظر ڈالتی ہیں ۔اور ان سے سبق حاصل کرتی ہیں ۔اور یہی عمل زندگی کا ماحاصل ہونا چاہیئے ۔کون ذی ہوش اور باحس انسان ہوگا ،جو اس عبرت انگیز مرقع کو پڑھ کر اثر پذیر نہ ہوگا ۔ادب کے مطالعہ کی غرض وغایت بھی یہی ہونی چاہیئے ۔جس شعبہ ادب کا اثر روزانہ زندگی پر نہ ہو ۔اور جس کے مطالعہ سے چشم بصیرت وانہ ہو ۔وہ حقیقتاً غیر مفید ہے ۔

''نا قابل فراموش'' کتاب کا ہر ورق بصیرت افروز ہے ۔یہ کتاب اس قابل ہے کہ ہر برنا وپیر ہر کس وناقص اس کے مطالعہ سے مستفیض ہو سکتا ہے ۔بشرطیکہ اس میں ذاتی اصلاح اور ضبط نفس کا قدرے ذوق ہو ۔اس کے مصنف حضرت سردار دیوان سنگھ مفتوں صاحب سراپا خلوص وپیکر صدق وصفا ہیں ۔جن لوگوں نے بالاستیعاب ''ریاست'' کا مطالعہ کیا ہوگا ۔وہ بلا تامل میری ہم نوائی فرمائیں گے ۔ہر شندرہ کی تہہ

میں اخلاقی پہلو مخفی رکھتے ہیں۔ ادنیٰ سے ادنیٰ واقعہ موصوف کے لئے سبق آموز ہے۔ اور معمولی سے معمولی بات ان کے واسطے تنبیہ کا تازیانہ معیار اخلاق، دیانت داری اور راست بازی کے اصول سے جو حادثہ منطبق نہیں ہوتا۔ وہ ان کے مشاہدہ کی گرفت سے بچ نہیں سکتا۔ ان کی روداد حیات جفاکشی کی ایک زندہ مثال ہے۔ جس کو پیش نظر رکھ کر یہ زندہ اصول اور زریں سبق حاصل کیا جا سکتا ہے۔ کہ ہر کامیابی مقصد کے لئے ارادہ کی پختگی اور محنت کی عادت ضروری ہے۔ اپنے حصول مقاصد کے لئے انہیں جن جن مشکلات کا مقابلہ کرنا پڑا۔ اس کا بیان اپنی سادگی عبارت کے باوجود کچھ اس انداز سے کیا گیا ہے کہ متاثر ہوئے بغیر رہا نہیں جاتا۔ چند واقعات میں انہوں نے اپنی قابل تقلید زندگی کی ان حقیقتوں کو بے نقاب کیا ہے۔ جن کے انکشاف و اعتراف سے عام طور پر لوگ گریز کرتے ہیں۔

یہ یگانہ روزگار کتاب اپنی قسم کی پہلی کتاب مصنف کی خودنوشت سوانح عمری ہے۔ اس کے بغور مطالعہ سے قاری کا ضمیر بیدار ہو جاتا ہے۔ یہ عالم باعمل کے گونا گوں مشاہدات کا بے نظیر مجموعہ ہے۔ جس کو پڑھ کر معمولی سے معمولی شخص بھی سبق حاصل کر سکتا ہے۔ اردو زبان و ادب سے مفتوں صاحب کو شغف ہے۔ اور ان کا اسلوب بیان جاذب اور دل کش ہے۔

ایک نشست میں پوری کتاب پڑھی جا سکتی ہے۔ اس کے مطالعہ سے جی نہیں اکتاتا۔ روح میں بالیدگی اور عقل میں روشنی پیدا ہوتی ہے۔ یہ کتاب ہر طبقہ کے طلبا کے لئے بھی مفید ثابت ہو سکتی ہے۔

قارئین کرام یقین کریں یا نہ کریں، مگر درحقیقت یہ نا قابل فراموش واقعہ ہے کہ سردار دیوان سنگھ صاحب نے تین چار سو روپے کی نوکری کو خیرباد کہہ کر ساٹھ روپے ماہوار کی ملازمت محض اس واسطے قبول کی کہ فن اخبار نویسی میں مہارت حاصل کریں۔ ایک واقعہ کے مطابق آپ پنجاب سے سفر کر کے لکھنؤ ہمدم کے ایڈیٹر جالب مرحوم کی

خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور بلا معاوضہ اس فن کو سیکھنے کے لئے مستعد ہو گئے۔ رئیسوں اور امیروں کی خوشنودی کی فکر انہوں نے کبھی نہیں کی۔ بلکہ ان کی ہر غلطی اور فروگزاشت کی سخت تنقید کی، اور بے دھڑک ان عیوب کو طشت از بام کیا۔ اس ذات پات، کنبہ پروری اور فرقہ پرستی کے زمانے میں بے لوث ہو کر رائے زنی کی مثالیں نایاب نہیں تو کم یاب ضرور ہیں۔ اس کتاب میں متعدد واقعات ایسے درج ہیں۔ جن سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ محترمی دیوان سنگھ صاحب نے اپنے اور غیروں میں جہاں تک کہ واقعات کا تعلق ہے۔ کوئی امتیاز نہیں برتا۔ ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی ان میں سے کسی فرقے کے فرد سے اگر کوئی دیدہ دانستہ غلطی سرزد ہوئی یا لغزش سرزد ہوئی تو اس نے آپ پر بے کم و کاست۔ بلا خوف و خطر، بے باکانہ نکتہ چینی کرنا اپنا فرض سمجھا۔ آپ فطرتاً حق جو، حق بین، اور حق پسند واقع ہوئے ہیں۔

مجھ کو تیس برس کے عرصے میں انگریزی اور اردو کے ایڈیٹروں سے کافی سابقہ رہا ہے۔ میں وثوق کے ساتھ لکھنے کی جسارت کرتا ہوں کہ میں نے سردار دیوان سنگھ ایڈیٹر کو بحیثیت ایڈیٹر کے بہر نوع مجموعہ صفات پایا۔ یہ صادق القول، صادق الاقرار اور اپنی بات کا دھنی انسان اپنی آپ بیتی سنا کر ہمیں غیر محسوس طریقے پر زندگی کا وہ درس عمل دیتا ہے۔ جو ہر پہلو اور ہر نقطہ نظر سے مفید، کارآمد اور اعلیٰ ہے۔

مجھے امید ہے کہ اس ناقابل فراموش مجموعہ کو قارئین توجہ اور دلچسپی سے پڑھ کر مستفیض ہوں گے۔

ریاستوں کی قومی زندگی کا علم بردار

(جناب مالک رام صاحب ''ذکرِ غالب وغیرہ'')

میں نے ۱۹۲۴ء میں وکٹوریہ ڈائمنڈ جوبلی ہائی سکول وزیر آباد سے میٹریکولیشن کی سند لی۔ اور اسی سال گورنمنٹ کالج گجرات میں ایف۔ اے کلاس میں داخلہ لے لیا۔ یاد ش بخیر اس زمانہ کا گجرات سراسر شعر و نغمہ کا شہر تھا۔ یہاں کا ہر چھوٹا بڑا شعر کہتا تھا اور اگر خود نہ کہتا تھا تو دوسروں ہی کے گنگناتا رہتا تھا۔ ہر گلی کوچے سے طبلے کی تھاپ اور سارنگی کی دل نواز لے کی آواز سنائی دیتی تھی۔ ہفتہ وار طرحی مشاعرے ہوتے تھے۔ ان میں مقامی اصحاب کے علاوہ باہر کے شعراء بھی اپنا کلام سنانے کو آیا کرتے تھے۔ اختر شیرانی اور عابد علی عابد کو میں نے پہلی مرتبہ یہیں دیکھا اور سنا تھا۔ میری عمر بھی ۱۶۔ ۱۷ برس کی ہوگی ممکن نہ تھا کہ میں اس فضا سے متاثر نہ ہوتا۔ چنانچہ میں بھی ان مشاعروں میں جانے لگا۔ شعر سنانے کے لئے نہیں بلکہ سننے کے لئے۔ کیونکہ اگر چہ میں نے اس زمانے میں دو تین غزلیں لکھیں اور ان مشاعروں میں پڑھیں لیکن میں نے بہت جلد یہ محسوس کر لیا کہ یہ بے کاری کا مشغلہ ہے۔ نہ شعر میں تازگی ہوتی ہے۔ نہ کوئی خاص بات ہی۔ وہی ایک مضمون ہے جو آپ لفظوں کے ہیر پھیر سے لکھ دیتے ہیں۔ اگر اس لفظی نٹ بازی میں کوئی محاورہ یا ترکیب عمدہ اور جدید طریقے پر بندھ گئی تو واہ واہ۔ ورنہ دوسروں کا تو کیا ذکر شعر خود اپنی نظر میں گر جاتا ہے۔ غرض کہ اس کے بعد میں نے شعر کہنا بالکل ترک کر دیا۔ البتہ ان مجلسوں میں باقاعدہ شریک ہوتا رہا۔

تو خیر یہاں میری ملاقات ایک صاحب محمد یوسف سے ہوئی۔ ان کی تعلیم تو بالکل واجبی سی تھی۔ شاید چوتھے پانچویں درجے تک ہو۔ لیکن وہ بہت ذہین تھے اور انہوں نے اپنے شوق اور محنت سے اچھی استعداد حاصل کر لی تھی۔ ان کا حافظہ بھی بہت اچھا تھا۔ ہزاروں شعر یاد تھے۔ خود شعر بھی کہتے تھے۔ یوسف تخلص تھا۔ چونکہ سیماب اکبر

آبادی مرحوم سے اصلاح لیتے تھے۔اس لئے اپنے نام کے ساتھ سیمابی بھی لکھتے تھے ۔یعنی محمد یوسف، یوسف سیمابی گجراتی ۔سنا ہے کہ یہ شروع میں درزی کی دکان کرتے تھے۔اس کام میں ضرور نفع ہوا ہوگا اور شاید باپ دادا کی کمائی سے بھی کچھ بچا کھچا پاس ہو،انہوں نے درزی کا کام چھوڑ کر کپڑے کا کاروبار کر لیا۔میں جس زمانے میں انہیں ملا ہوں ۔ان کے پاس یہی بزازی کی دکان تھی ۔ دن بھر تو وہ خدا جانے کیا کرتے تھے۔لیکن دن ڈھلنے کے ساتھ ہی دوست احباب ان کی دکان پر جمع ہونے لگتے اور پھر یہ جمگھٹا رات گئے تک رہتا۔دراصل یوسف صاحب نے یہ دکان تو محض سرپل کی طرح دوستوں سے ملاقات کے لئے ایک جگہ مہیا کرنے کے لئے کھول رکھی تھی ۔ورنہ حقیقت میں انہیں شوق صرف دو چیزوں کا تھا۔شعر اور کھانا۔

چنانچہ جتنی دیر یہ مجمع رہتا یار لوگ یا تو شعر پڑھتے اور سنتے رہتے یا دعوتیں اڑاتے رہتے۔نتیجہ ظاہر ہے یوسف صاحب کے پاس کوئی قاروں کا خزانہ تو تھا نہیں ۔دو تین برس میں دکان خالصے لگ گئی ۔

یوسف صاحب کے ہاں مختلف رسالے اور اخبار بھی آیا کرتے تھے ۔''نگار'' زمانہ، پیمانہ، دور، نیرنگ خیال وغیرہ اس دور کے مشہور پرچے تھے۔وہ ان سب کے خریدار تھے۔گاہے ماہے ان میں سے کسی میں ان کی غزل بھی چھپ جاتی تھی ۔اور غالباً اسی غرض سے وہ انہیں منگواتے تھے۔ایک دن شام کو جو میں ان کی دکان پر گیا تو یہاں ایک نیا پرچہ دیکھا ۔''ریاست'' بڑا سائز، بڑا چکنا کاغذ،لکھائی چھپائی اعلیٰ،تصویریں اعلیٰ۔غرض

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجا است

یہ تھا میرا پہلا تعارف سردار دیوان سنگھ مفتوں سے جو ''ریاست'' کے ایڈیٹر تھے۔ میں پہلی نظر میں ''ریاست'' پر فریفتہ ہو گیا۔اور یہ واقعہ ہے کہ اس کے بعد ہر ہفتے مجھے

اس کا انتظار اسی بے چینی سے رہا کرتا، جیسے نامہ دلدار کا۔ اور میں جب اسے کھولتا تو جی چاہتا کہ ''جان نذر دل فریبی عنوان'' کر دوں۔ میں اسے بلاناغہ پندرہ برس تک پڑھتا رہا (۲۴ء تا ۳۹ء)۔ اس کے بعد میں ذرا پاؤں کے چکر سے مجبور ہو کر دشت نوردی کرنے ملک سے باہر چلا گیا۔ اور پندرہ برس کی جہاں گردی کے بعد ۱۹۵۴ء کے اواخر میں واپس وطن آیا۔ اس دوران مجھے ریاست دیکھنے کو نہیں ملا۔ لیکن حقیقت ہے کہ میں کہیں بھی رہا۔ اس کے خیال سے غافل نہیں رہا۔ جب میں یہاں آیا تو چونکہ گھر بار تو غیر حاضری کے زمانے میں تقسیم ملک کے باعث پاکستان کو پیارا ہو چکا تھا۔ لامحالہ مجھے دہلی میں قیام کرنا پڑا۔ لیکن معلوم نہیں کیوں میں نے سردار دیوان سنگھ سے ملنے کی کوشش نہیں کی۔ میں جلسے جلوس کا قائل نہیں اور ایسی تقریبوں میں جہاں ہنگامہ ہو بہت کم شامل ہوتا ہوں۔ معلوم ہوتا ہے کہ سردار دیوان سنگھ جی مجھ سے بھی زیادہ کم آمیز ہیں۔ کیونکہ میں نے ان تین برسوں میں انہیں کسی جگہ بھی نہیں دیکھا۔

پچھلے جاڑوں میں میرے ایک مہربان بزرگ نے لکھنو سے لکھا کہ میں دو تین دن کے لئے دہلی آرہا ہوں۔ اور حسب معمول سردار دیوان سنگھ مفتوں کے ہاں ٹھہروں گا۔ چونکہ ان سے ملنا ضروری تھا، اس لئے جس دن آنے کا وعدہ تھا۔ میں مکان تلاش کر کے حاضر ہوا۔ وہ بزرگ تو تشریف نہیں لائے تھے۔ لیکن اس بہانے سردار دیوان سنگھ مفتوں صاحب سے ملاقات ہوگئی۔ زمانے کے اتفاقات کہ یوں میں جس شخص کو غائبانہ طور پر تینتیس برس سے جانتا تھا۔ پہلی مرتبہ ۱۹۵۷ء میں دیکھا۔

''ریاست'' نے تحریک آزادی میں جو نمایاں خدمات سرانجام دی ہیں۔ وہ اہل نظر سے مخفی نہیں۔ جنگ کا ایک محاذ تو یہ تھا کہ برطانوی اقتدار سے براہ راست ٹکر لی جائے۔ کانگرس نے یہی کیا۔ اس کی تمام تر تحریکیں اسی مقصد سے شروع کی گئیں۔ اس سے قوم میں بیداری پیدا ہوئی اور بدیسی حکمرانوں کا جو مادی اور جسمانی رعب لوگوں کے دلوں پر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ زائل ہو گیا۔ دوسرا محاذ وہ تھا جس کی لڑائی ہماری

صحافت نے لڑی۔ اخبار نویسوں نے یہ کوشش کی کہ تحریروں سے انگریزوں کو اور یہاں ان کے طرز حکومت کو خودسر اور مطلق العنان اور اس طرح مضحکہ خیز ثابت کیا جائے۔ تا کہ اخلاقی اور معنوی حیثیت سے بھی ان کی کم مائیگی ثابت ہو۔ اگر چہ اس میں بسا اوقات ان غریبوں کا نقصان اس حد تک ہوا کہ وہ تباہ ہی ہو گئے۔ اور بعض کو قید و بند کی سختیاں بھی جھیلنا پڑیں۔ لیکن آفرین ہے ان پر کہ یہ ہمت نہیں ہارے۔ اور برابر میدان میں ڈٹے رہے۔ ریاست نے دوسرا راستہ اختیار کیا۔ بلکہ اپنی سرگرمیوں کو ریاست تک وسیع رکھ کر اس نے اپنی دشواریوں میں اور اضافہ کر لیا۔ ہندوستان میں انگریزی نوکر شاہی کی سب سے بڑی پشت پناہ دیسی حکمران تھے۔ چونکہ ان کی اپنی ہستی اور زندگی سراسر انگریز حکمرانوں کے رحم و کرم پر موقوف تھی۔ اس لئے یہ ہمیشہ ان کے قول و فعل کی تائید کرنا اپنا فرض خیال کرتے تھے۔ اور اس کا دوسرا رخ یہ ہے کہ حالانکہ بیشتر ریاستوں کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ ان میں بدانتظامی اور ظلم وستم کا دور دورہ تھا۔ یہاں کے نواب اور مہاراجے دن رات من مانی کرتے اور گلچھرے اڑاتے تھے۔ ریاست کی آمدنی گویا ان کا جیب خرچ تھی۔ اس کے باوجود نہ تو انگریز کھلے بندوں ریاست کے معاملے میں دخل دیتا تھا اور نہ ہی ان کے حکمرانوں کو آئینی اصلاحات نافذ کرنے کا مشورہ دیتا تھا۔ غرض دونوں ایک دوسرے کے محتاج تھے۔ انگریز کی موجودگی میں کوئی کسی نواب یا مہاراجہ کا بال بیکا تک نہ کر سکتا تھا۔ اور رائے عامہ کے بڑھتے ہوئے سیلاب کے لئے یہ دیسی حکمران سب سے بڑا بند تھے۔ سردار دیوان سنگھ مفتوں کے ریاست نے ان دیسی حکمرانوں اور رئیسوں کے خلاف جہاد شروع کیا۔ تا کہ عوام کے دماغ سے ان کا ہوا نکلے۔ اور اس طرح ان کے دل میں خود انگریز کے خلاف نفرت پیدا ہو۔ جو ایسے ناکارہ لوگوں کی حمایت کرتا تھا۔ ریاست کو کسی غلط بیانی یا مبالغے کی ضرورت نہ تھی۔ واقعی ریاستوں کی رعایا کا نہ جان و مال محفوظ تھا اور نہ ہی عزت و ناموس۔ پھر ستم بالائے ستم یہ کہ نہ داد تھی نہ فریاد۔ خوش قسمتی سے اسے نامہ نگار

بھی وہ مل گئے تھے جو گھر کے بھیدی تھے۔اس لیے ہر ہفتے اس میں ایسے کچے چٹھے چھپتے کہ پڑھ کر لطف آجاتا۔ ان مضامین اور خبروں نے آگ سی لگا دی۔سرکاری حلقوں پر ان سے جو گزر جاتی ہوگی اس کا تو بس اندازہ ہی کیا جا سکتا ہے۔غرضیکہ ریاستوں کا وقار اور ان کے حکمرانوں کی عزت ملیا میٹ ہو کر رہ گئی۔اور خود انگریز بھی ان شعلوں کی لپیٹ سے نہ بچا۔اور یہی ریاست کا مقصد تھا۔ریاستوں میں قومی تحریک کی بنیاد رکھنے اس کے نشو و نما میں ریاست کا بہت بڑا حصہ ہے۔کاش کہ کوئی اس کی تاریخ لکھ دے۔اس کے لئے بھی سردار دیوان سنگھ مفتوں سے زیادہ کون موزوں ہوگا۔

ظاہر ہے سردار دیوان سنگھ مفتوں کی زندگی بڑی ہنگامہ خیز رہی ہے۔''ریاست'' کی ایڈیٹری پھولوں کی سیج نہیں بلکہ تلوار کی دھار تھی۔ریاستوں کا تمام روپیہ اور ان کا اثر و رسوخ کی پوری مشینری ان کے خلاف تھی۔چنانچہ تلاشیاں ہوئیں۔مقدمے قائم کیے گئے۔گرفتاریاں ہوئیں،انہیں اپنے بچاؤ کے لئے کیا کیا نہ جوڑ توڑ کرنا پڑے ہوں گے۔اسی دوران میں دوستوں کی دوستی آزمانے اور دشمنوں کی دشمنی کا مقابلہ کرنے کے بیسیوں موقعے ہاتھ آئے ہوں گے۔ایسی بھرپور زندگی کے سینکڑوں واقعات نا قابل فراموش ہونے چاہئیں۔چنانچہ اپنے تجربات بیان کرنے کو انہوں نے ایک زمانے میں ریاست میں نا قابل فراموش کے عنوان سے اپنی زندگی کے چیدہ چیدہ واقعات لکھنے شروع کیے تھے۔ان ہی کا مجموعہ یہ کتاب ہے۔

سردار دیوان سنگھ مفتوں کا اسلوب نگارش سادہ اور پروقار ہے۔ان کے قلم میں زور ہے۔چونکہ ساری عمر صحافت میں گزری۔اس لئے ان کے بیان میں روانی بہت ہے۔زندگی کی افتاد نے انہیں واقعیت پسند بنا دیا ہے۔اس لئے لگی لپٹی رکھنا یا باتیں چبا چبا کر کرنا ان کے بس کی بات نہیں۔ان کے مدنظر مغز ہوتا ہے۔نہ کہ اس کا چھلکا۔اگر ان کا مافی الضمیر کسی خاص لفظ سے ظاہر ہوتا ہے تو وہ اس کے لکھنے سے دریغ نہیں

کرتے ۔ خواہ اس سے کسی اہل زبان یا زبان داں کے پیشانی پر بل ہی کیوں نہ پڑ جائیں ۔ میں نے جب یہ کتاب پڑھی تو مجھے اس میں داستان کا لطف آیا ۔ ناممکن ہے کہ آپ اسے ایک دفعہ شروع کر کے ہاتھ سے رکھ دیں ۔ کیا اچھا ہو کہ وہ اپنے علم وصلاحیت سے دنیائے ادب کو اور زیادہ مستفید کریں ۔ اور ان ریاستوں کے نظم ونسق اور ان کے حکمرانوں کی کارگزاریوں کے متعلق جو کچھ انہیں معلوم ہے ۔ اسے قلم بند کر دیں ۔ یہ مستقبل کے مورخ اور افسانہ نویس (اور فلم نگار) کے لئے خام مواد کا کام دے گا۔ اور اس طرح ان کا یہ احسان ہمارے علم وادب پر دائمی رہے گا۔

اب ایک مشورہ:

ہماری زبان میں اچھی سوانح عمریوں کی بہت کمی ہے ۔ ان کے نام آسانی سے ایک ہاتھ کی انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں ۔ جہاں یہ حالت ہو، وہاں کو دنوشت سوانح عمری کا کیا ذکر ۔ اس صنف میں سر رضا علی مرحوم کے ''اعمال نامے'' کے سوا کوئی اور کتاب میرے علم میں نہیں جو ادبی لحاظ سے بھی دیکھنے کے قابل ہو ۔ اس افسوس ناک کمی کو پورا کرنے کی ایک ہی صورت ہے کہ وہ اصحاب جن کی زندگی کے واقعات دل چسپ اور سبق آموز ہوں اور وہ لکھنے پر بھی قادر ہیں بخل سے کام نہ لیں ۔ اور اپنے حالات اور تجربات لکھ ڈالیں ۔ سردار دیوان سنگھ مفتوں نے زندگی معمولی حیثیت سے شروع کی ۔ تعلیم بھی معمولی تھی، لیکن مسلسل محنت، خلوص ۔ استقلال، اور خود اعتمادی سے انہوں نے قابل رشک کامیابی حاصل کی ۔ ان کے سوانح حیات ہمارے نوجوانوں کے لئے مشعل راہ کا کام دے سکتے ہیں انہیں چاہیئے کہ وہ انہیں حوالہ قلم کر دیں ۔

ہے آج جو داستاں اپنی
کل اس کی کہانیاں بنیں گی

خیر مقدم

(جناب پنڈت ہری چند صاحب اختر)

میری ان چند سطور کو سردار دیوان سنگھ مفتوں کا تعارف یا نا قابل فراموش کا دیباچہ سمجھنا درست نہ ہوگا۔ دور حاضر کا اردو دان طبقہ اخبار ریاست کی معرفت سردار دیوان سنگھ مفتوں کے طرز تحریر اور انداز بیان ہی سے نہیں بلکہ ان کے کردار کے تمام پہلوؤں سے بخوبی واقف ہو چکا ہے۔ اس طرز تحریر کے متعلق اختلاف رائے ہو سکتا ہے۔ مگر اس کی مقبولیت کے بارے میں اب شک وشبہ کی گنجائش نہیں رہی۔ دیوان سنگھ نے کبھی انشاء پرداز یا ادیب ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ زندگی کے ابتدائی دوڑ دھوپ کے چند سالوں کو چھوڑ کر عمر بھر صحافت ہی ان کی تمام تر توجہ اور سرگرمیوں کا مرکز رہی۔ اور صحافت میں وہ ایک ایسی طرز تحریر کی ایجاد کا دعویٰ کر سکتے ہیں۔ جو اخبار ریاست کے روز اجرا سے اب تک بڑے بڑے ادیبوں اور انشاء پردازوں سے داد تحسین حاصل کرتی رہی ہے۔

عہد انگریزی کے آخری تیس پینتیس سال ہندوستانی صحافت کے لئے ابتلاء وآزمائش کا زمانہ تھے۔ اس وقت قوم پرست اخباروں اور اخبار نویسوں کو بے شمار مشکلات اور مصائب کا سامنا ہوا۔ پھر دیوان سنگھ مفتوں صاحب کا اخبار تو نہ صرف قوم پرست تھا بلکہ والیان ریاست کے اس گروہ کے خلاف جہاد کر رہا تھا، جو انگریز کا پشتبان اور قانون کالا ڈلا تھا۔ اپنے کرتوتوں کو چھپانے کے لئے سب کچھ کر گزرتا تھا۔ اور غیر محدود ذرائع، اور طاقت ارفع کی پشت پناہی کی بدولت سب کچھ کر گزرنے کی طاقت رکھتا تھا۔ ان لوگوں نے ریاست اور اس کے ایڈیٹر کو مٹا ڈالنے کے لئے مختلف پہلوؤں سے پے در پے حملے کیے۔ ہر طریقہ اور ہر ہتھیار سے کام لیا۔ اور نیک وبد کی تمیز کو چھوڑ کر اس دشمن کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاموش کر دینے کی ہر ممکن کوشش کی۔

سردار دیوان سنگھ کو ان لوگوں کے پس پردہ کارناموں اور کرتوتوں کا حال معلوم کرنے کے لئے اور ان کے مختلف الانوع حملوں کا مقابلہ کرنے کے سلسلے میں ہر طبقہ اور ہر قماش کے بے شمار لوگوں سے سابقہ پڑا۔ ہزاروں تعلقات بنانے اور بگاڑنے پڑے ۔اور انسانی نفسیات اور ذہنیت کے متعلق ان گنت اچھے برے تجربے ہوئے ۔انسان عمر بھر میں جو کچھ سنتا، دیکھتا، لکھتا، پڑھتا ہے ۔اگر وہ سب کا سب یاد رہے تو یہ بے چارہ کثرت معلومات کے طوفان میں گم ہو کے رہ جائے ۔ چنانچہ بعض تجربے تو محض ہنگامی حیثیت کے ہوتے ہیں۔اور انسان انہیں بہت جلدی بھول جاتا ہے ۔لیکن بعض تجربوں سے انسان کا اپنی طبیعت اور مزاج سے خاص لگاؤ ہوتا ہے ۔اور وہ ان سے بہت زیادہ متاثر ہوتا ہے ۔ یہ تجربے دل کے کسی گوشے میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جاگزین اور دماغ کے کسی خانے میں عمر بھر کے لئے محفوظ ہو جاتے ہیں ۔''ناقابل فراموش ''ایڈیٹر ریاست'' کے ایسے ہی تجربوں کی داستان ہے ۔ جو تجربوں کی کثرت تعداد اور بوقلمونی کی بدولت انسانی زندگی کے قریباً تمام پہلوؤں اور شعبوں پر حاوی ہو کر بے حد دلچسپ اور سبق آموز بن گئی ہے ۔

روانی اور صاف گوئی سردار دیوان سنگھ کی تحریر کی نمایاں ترین خصوصیات ہیں ۔ انہوں نے عبارت آرائی اور الجھاؤ سے ہمیشہ احتراز کیا ہے ۔ جو کچھ کہنا ہو سیدھے سادے جملوں میں پوری صفائی اور بے باکی سے کہہ دیتے ہیں ۔ ہر تحریر میں یہی خواہش جھلکتی نظر آتی ہے ۔کہ جو کچھ کہا ہے پڑھنے والے کی سمجھ میں اچھی طرح آ جائے ۔اس لئے جہاں کہیں ضروری سمجھتے ہیں اپنے کسی بیان کا پس منظر اور تلمیحات بطور جملہ معترضہ لکھ کر پھر سلسلہ کلام شروع کر دیتے ہیں۔ چنانچہ بعض اوقات آٹھ دس الفاظ کے ایک فقرے کے عین درمیان میں پانچ چھ فقروں کا جملہ معترضہ آ جاتا ہے ۔ بعینہ جیسے عام بات چیت میں ہوتا ہے ۔ یہ خصوصیت جو صحافت میں سردار دیوان سنگھ کی کامیابی اور ان کے اخبار کی مقبولیت کے لئے بہت بڑی حد تک ذمہ دار ہے ۔

''نا قابل فراموش'' میں موجود ہے۔ البتہ ایک فرق ضرور ہے۔ ریاست کی اداراتی تحریروں میں قدرتی طور پر سردار دیوان سنگھ کے اپنے خیالات وجذبات کے ساتھ ساتھ پبلک کے احساسات اور جذبات بھی شامل ہوتے تھے۔ اور نا قابل فراموش میں سردار دیوان سنگھ اور صرف سردار دیوان سنگھ بول رہا ہے۔ حتیٰ کہ جہاں دوسرے لوگوں کے اقوال اور بیانات ہی لکھے ہیں۔ وہاں بھی بین السطور میں خود سردار دیوان سنگھ کا ذہنی اور نفسیاتی ردعمل جھلکتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ ایک طرف تو مختلف واقعات پر بزرگوں کے سے فلسفیانہ انداز میں تنقید وتبصرہ کرتا ہے۔ اور دوسری جانب بچوں کی سی سادگی سے اپنی اور اپنے عزیزوں اور دوستوں کی کمزوریوں اور حماقتوں کی داستان سناتا ہے۔ مگر انداز بیان دونوں جگہ ایسا ہے۔ جس سے محرر اور قاری دونوں میں خود بخود ایک مفاہمت بلکہ یگانگت سی پیدا ہو جاتی ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ داستان گو اپنے مخاطبوں کو رازدان اور رازدار بنا لینے کا آرزومند ہے۔ اور اس مقصد کے لئے صدق دلی سے کوشش کر رہا ہے۔ مطلوبہ تاثر پیدا کرنے کے لئے اس انداز کی کامیابی یقینی تھی۔ چنانچہ نا قابل فراموش کے مختلف واقعات جب ریاست میں شائع ہوئے تو مفتوں کی اس تازہ اپچ سے نہ صرف دلچسپی کا اظہار کیا۔ بلکہ ان واقعات وتجربات کو کتابی صورت میں چھاپنے کا پراصرار مطالبہ ہونے لگا۔

ایک اور بات کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ دیوان سنگھ نے کسی شخص کے ان مشاغل و عادات سے کبھی تعرض نہیں کیا۔ وہ صرف ان اشغال وحرکات کو اخبار نویس اور نقاد کی توجہ کا مستحق سمجھتا ہے۔ جن کا بلا واسطہ یا بلواسطہ طور پر دوسرے لوگوں پر اثر پڑتا ہو۔ کوئی بیس بائیس سال پہلے کا ذکر ہے۔ جب میں پہلے پہل دہلی آیا تو سردار صاحب سے ملنے گیا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے نام اور تحریروں سے آشنا تھے۔ مگر اب تک ملاقات نہ ہوئی تھی۔ سردار دیوان سنگھ مفتوں مجھے اور رام رچھپال سنگھ شیدا مرحوم کو اپنی کار میں بٹھا کر دہلی کی سیر کرانے لے گئے۔ شام کو کناٹ پیلس پہنچے تو مجھ

سے پوچھا کچھ پئیں گے۔ میں نے کہا میں شراب نہیں پیتا۔ چنانچہ ایک فیشن ایبل ریستوران میں چائے پینے بیٹھ گئے۔ وہاں کیک پیسٹری آئی تو میں نے کہا۔ میں گوشت اور انڈا نہیں کھاتا۔ دیوان سنگھ نے دونوں مرتبہ میرے اس انکار کو سن کر اس صوفی پن پر تنقید وتبصرہ تو درکنار معمولی حیرت وتعجب کا اظہار بھی نہیں کیا۔ نہ تو بعض دوسرے لوگوں کی طرح شراب اور گوشت کے فضائل ومناقب بیان کیے۔ نہ اس بات پر حیرانی ظاہر کی کہ ایک شاعر شراب سے اور نئے زمانے کا ایک گریجویٹ گوشت سے احتراز کرتا ہے۔ میری بات کو یوں سنا، جیسے میں نے صرف یہ کہا ہو کہ میں خط ڈاک خانہ میں ڈال آیا ہوں۔ یا صبح سے دو پان کھا چکا ہوں۔ ''ناقابل فراموش'' میں بھی ان کے کردار کا یہ پہلو نمایاں نظر آتا ہے۔ حتیٰ کہ جہاں کہیں اپنی کسی کمزوری یا غیر معمولی طرز عمل کا ذکر آ گیا ہے۔ وہاں اسکے متعلق صفائی پیش کرنے کی کوشش نہیں کی۔ مثلاً ایک موقع پر سخت مصیبت میں گرفتار ہیں تو کوئی شخص سکھنی صاحب کا پاٹھ کرنے کا مشورہ دیتا ہے۔ مگر یہ مشورہ پسند نہیں آتا۔ ''کیونکہ میں نے کبھی عبادت نہیں کی''۔ اس کے بعد نہ تو اس بات یعنی عبادت نہ کرنے پر فخر ومباہات کا اظہار ہے۔ نہ توجیہہ ومعذرت کی کوشش۔ بس ایک حقیقت تھی جو ضمناً بیان کر دی۔ کسی شخص کے ذاتی معاملات اور پبلک کریکٹر کے درمیان یہ بہت ہی غیر نمایاں اور مبہم سی حد فاصل عام طور پر ہمارے صحافیوں کی نظر سے اوجھل رہتی ہے۔ مفتوں نے ہمیشہ سے پیش نظر اور ملحوظ خاطر رکھنے کی کوشش کی ہے۔

میں ابتدا ہی میں کہہ چکا ہوں کہ میرا مقصد سردار دیوان سنگھ کا تعارف یا ناقابل فراموش کی دیباچہ نگاری نہیں، بعض باتیں جو میرے نزدیک ان کی تحریروں کی نمایاں خصوصیت ہیں۔ ان کا اشارہ کر دیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ ناقابل فراموش کے قارئین ان واقعات وتجربات کو کتابی صورت میں دیکھ کر خوش ہوتا ہوں۔ اور دیوان سنگھ کی اس تصنیف کا دلی جوش اور مسرت سے خیر مقدم کیا جائے گا۔

دلچسپ، پرکشش اور مفید

(مسٹر گوپال متل ایڈیٹر رسالہ تحریک دہلی)

۱۹۲۴ء کے اواخر کی بات ہے۔ میں ان دنوں اپنے وطن مالیر کوٹلے میں آٹھویں کا طالب علم تھا۔ ایک روز میں بھائی کی دکان پر بیٹھا ہوا تھا کہ ڈاک سے "ریاست" کا ایک پرچہ موصول ہوا، میں نے اسے پڑھنا شروع کیا تو اس وقت تک ہاتھ سے نہیں چھوڑا جب تک ختم نہ ہو گیا۔ آج ۳۳ سال بعد جب ریاست کے ایڈیٹر سردار دیوان سنگھ کی کتاب ناقابل فراموش کو پڑھنا شروع کیا تو بھی ایسا ہی ہوا کہ اسے تمام وکمال پڑھے بغیر ہاتھ سے نہ رکھ سکا۔ اس سے صرف یہی پتا نہیں چلتا کہ سردار دیوان سنگھ کے انداز تحریر میں غیر معمولی کشش ہے۔ بلکہ یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ مذہبی کتابوں کی طرح ان کی نگارش میں بھی کوئی ایسی بات ہے۔ جس کی ہر شخص اپنی اپنی بساط کے مطابق پذیرائی کر سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس ۳۳ سال کے عرصے میں میرے مزاج میں بڑی بڑی تبدیلیاں آئی ہوں گی۔ اور اس تمام مدت میں چونکہ میں نے لکھنے پڑھنے کے سوا کوئی کام نہیں کیا۔ اس لئے میرے علم اور معلومات کا دائرہ بھی ضرور وسیع ہوا ہو گا۔ کم سنی کے کچے جذبات کی جگہ مزاج میں تھوڑی بہت پختگی آ چکی ہے۔ اور کچھ لوگ تو مجھ پر سنگین مزاجی کا الزام بھی لگاتے ہیں۔ لیکن ان تمام تبدیلیوں کے باوجود سردار دیوان سنگھ کی تحریر میرے لئے مسلسل باعث کشش بنی رہی۔ یہ اور بات ہے کہ کشش کے اسباب بدلتے رہتے ہیں۔ پہلے جہاں ان کی بے خوفی، جرات مندی اور ان کی تحریر کا جوش وخروش موجب کشش تھا۔ وہاں اب ان کے اور ان کی تحریر کے بالکل مختلف اوصاف دل ودماغ کو متاثر کرتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ انہوں نے زندگی کا براہ راست مطالعہ کیا ہے۔ اور اس کے بے شمار گوشوں کو بڑے قریب سے دیکھا ہے۔ ان کے تجربات دقیع، متنوع اور رنگا رنگ ہیں۔ جنہیں انہوں نے مکمل بے ریائی کے

ساتھ بغیر کسی تصنع کے قلم بند کر دیا ہے۔

آپ بیتی میں جو قدرتی کشش ہوتی ہے۔ اسے بسا اوقات یہ بات زائل کر دیتی ہے۔ کہ مصنف اپنی زندگی کے واقعات بے کم وکاست بیان کرنے کی بجائے اپنی برتری ثابت کرنے کے لئے کسی مصنوعی اور مثالی شخص کی زندگی بیان کرنے بیٹھ جاتا ہے۔ اس طرح زندگی کے حقیقی گوشے بے نقاب ہونے سے رہ جاتے ہیں۔ اور ایک کٹھ پتلی کی سرگزشت سامنے آجاتی ہے۔ جو نہ دل کے لئے کشش رکھتی ہے اور نہ دماغ کے لئے۔ ایک اور بات جو آپ بیتی کی کشش کو زائل کرتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ آدمی اپنی زندگی کے واقعات بیان کرتے وقت حقیقی تاثرات کی بجائے ایسے خیالات قلم بند کرنے لگتا ہے کہ جو مفروضوں کی چھلنی سے چھن کر نکلتے ہیں۔ سردار دیوان سنگھ کی کتاب اگر موجب کشش ہے۔ تو اس کا باعث یہی ہے کہ وہ اپنے چہرے پر کوئی نقاب نہیں ڈالتے۔ اور اپنی زندگی کے تمام خط وخال بے ریائی کے ساتھ سامنے لے آتے ہیں۔ یہ بات موجودہ دور میں مجھے ان کی کتاب کے علاوہ صرف مہاتما گاندھی کی خود نوشت ''سوانح حیات'' سچائی کے ساتھ میرے سامنے آئی ہے۔ اور میرے تجربات میں نظر آئی ہے۔

ایک اخبار نویس کی حیثیت سے سردار دیوان سنگھ کی کامیابی مسلمات میں شامل ہے۔ اور اس کے بیانات میں اگر وہ چاہتے تو انتہائی مبالغے سے کام لے سکتے تھے۔ لیکن جہاں انہوں نے یہ بیان کر دیا ہے کہ انہوں نے اپنے اخبار کے لئے خبریں کن کن ذرائع سے لیں۔ وہاں یہ بات بیان کرنے سے بھی گریز نہیں کیا کہ ایسوسی ایٹڈ پریس آف انڈیا کے مینجنگ ڈائریکٹر مرحوم مسٹر کے، سی، رائے نے ان کی خبریں حاصل کرنے کے شوق سے فائدہ اٹھا کر انہیں کس طرح ایک دل چسپ مذاق کا ہدف بنایا۔ سردار دیوان سنگھ مسٹر رائے سے اکثر ملنے جاتے۔ اور باتوں باتوں میں بہت سی راز کی خبریں معلوم کر کے ریاست میں شائع کر دیتے۔ ایک روز سردار دیوان سنگھ کی

موجودگی میں مسٹر رائے نے اپنے ایک اسٹنٹ سے مخاطب ہو کر کہا: امریکہ سے جو اطلاع مہاراجہ اندور کی امریکن بیوی کے طلاق کے متعلق آئی ہے ۔ وہ فی الحال اخبارات کو نہ بھیجے ۔دو چار روز بعد بھیجی جائے ۔سردار دیوان سنگھ نے اس مصدقہ خبر پر بھروسہ کرتے ہوئے ریاست میں جو دوسرے ہی روز شائع ہونا تھا۔ایک نوٹ سپرد قلم کر دیا۔اور یہ عقدہ مسٹر رائے سے دوبارہ ملنے کے بعد ہی کھلا کہ وہ ایک مذاق کا ہدف بن گئے ہیں، جو ایک سازش کا نتیجہ تھا۔سردار دیوان سنگھ اگر چاہتے تو اس واقعہ کو نظر انداز کر دیتے ۔لیکن انہوں نے خبریں حاصل کرنے کی مشکلات بیان کرتے وقت اپنی کامیابیوں کے ذکر کے ساتھ اس واقعے کو بھی بیان کر دیا۔

اخبار نویس کی حیثیت سے ان کے کریکٹر کی بلندی کا پتا چلتا ہے کہ انہوں نے پاداش کے ڈر سے اپنی خبروں کے ماخذ کو کبھی افشا نہیں کیا۔انہوں نے بڑے بڑوں کو برہم کیا۔لیکن اگر کبھی ادھر سے عتاب نازل ہوا تو انہوں نے اس وار بھی اپنے سینے پر لیا۔اور ان لوگوں کے نام کبھی ظاہر نہیں کیے جن کے ذریعے یہ خبریں ان تک پہنچی تھیں ۔مثلاً ایک بار مسٹر شیام لال نہرو نے باتوں باتوں میں یہ بتا دیا کہ پنڈت موتی لال نہرو نے بھوپال سے ایک قانونی مشورے کی فیس بیس ہزار روپے وصول کی ہے ۔اور اس کے ساتھ یہ بھی کہہ دیا کہ قانونی مشورہ اور مقدمہ کیا ہے؟ ۔یہ تو بہانے ہیں ۔اصل مقصد تو یہ ہے کہ بھوپال کے لوگ ایجی ٹیشن نہ کریں ۔اور چچا سے گہری دوستی ہو۔اس پر سردار دیوان سنگھ نے ریاست میں ایک نوٹ لکھا،جس میں نواب بھوپال پر یہ الزام لگایا گیا کہ وہ پبلک کی آواز کو دبانے کے لئے ملک کے لیڈروں کو دعوتیں دیتے ہیں ۔ اور قانونی مشورے کے نام پر بیس بیس ہزار روپیہ نذر کیا جاتا ہے ۔جسے رشوت قرار دیا جا سکتا ہے۔

نواب بھوپال نے پنڈت موتی لال نہرو کو بھڑکایا کہ آپ پر رشوت لینے کا الزام لگایا گیا ہے ۔موتی لال نہرو برہم ہوئے ۔نوٹس دیا۔مقدمے کی دھمکی دی ۔لیکن

سردار دیوان سنگھ نے کنایتہً بھی یہ ظاہر نہ کیا کہ بیس ہزار کے متعلق خبر انہیں پنڈت موتی لال کے سگے بھتیجے پنڈت شیام لال نہرو نے فراہم کی تھی۔

سردار دیوان سنگھ طوائفوں سے سخت متنفر تھے۔ انہیں گندگی کے ڈھیر سے تشبیہ دیتے تھے۔ انہیں یہ بھی یقین تھا کہ طوائف کی فطرت کبھی تبدیل نہیں ہوتی اور ان کے دل میں اخلاص کا گزر ناممکن ہے۔ لیکن جب ان طوائفوں کی زندگی کے کچھ ایسے پہلو سامنے آتے ہیں۔ جن سے مظلومیت برستی ہے تو وہ ان کے بیان میں بخل سے کام نہیں لیتے۔

سردار دیوان سنگھ ایک سلیف میڈ آدمی ہیں۔ اور انہوں نے بہت ہی معمولی زندگی سے ترقی کے مراحل طے کیے۔ عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ اس میں ان کی غیر معمولی ذہانت، جرات، اور بے خوفی کو دخل ہے۔ لیکن اس کتاب کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ اس میں ان کی محنت شاقہ کو بھی کچھ کم دخل نہیں۔ جس سے اکثر ذہین لوگ محروم ہوتے ہیں۔ وہ مشکل سے مشکل اور ناگوار ماحول میں کام کر سکتے ہیں۔ اور صلے سے بے نیاز ہو کر جس آدمی میں یہ وصف ہو۔ ناکامی اس کے راستے میں حائل نہیں ہو سکتی۔

اس کتاب کی دلچسپی اور کشش شک سے بالا ہے۔ لیکن اس سے استفادہ ہر شخص اپنی بساط کے مطابق ہی کر سکے گا۔ اسے اگر سرسری پڑھا جائے تو بھی پڑھنے والے کو ایک اچھے سے اچھے ناول سے زیادہ لطف آئے گا۔ اور اگر کوئی اسے گہری نظر سے پڑھے تو یہ بات بھی ممکنات میں سے باہر نہیں کہ اس کا مطالعہ اس کی زندگی کا رخ بدل دے۔ کم از کم میں نے سردار دیوان سنگھ جی سے بہت کچھ حاصل کیا ہے۔ میرے دل میں اخبار نویسی کی دھن ان کی تحریریں پڑھ کر پیدا ہوئی۔ یہ بات بھی میں نے ان ہی سے سیکھی کہ افلاس اور مشکلات کو آدمی کے راستے میں مزاحم نہیں ہونا چاہیئے۔ اور یہ بھی کہ ذہانت کا پودا محنت شاقہ کے بغیر بار آور نہیں ہوتا۔

سچا افسانہ

(جناب عرش ملسیانی ایڈیٹر آج کل دہلی'')

''زمیندار والے مولانا ظفر علی خان، پیسہ اخبار والے شیخ محبوب عالم، اخبار عالم والے لالہ گوپی ناتھ،'' دیش کے ایڈیٹر لالہ دینا ناتھ،اور ہندوستان والے لالہ رام رچھپال سنگھ شیدا، پنجاب کے پرانے صحافیوں میں ایک خاص شہرت کے مالک ہوئے۔ انہیں کے ساتھ ساتھ اخبار نویسوں کی جو صف آراستہ تھی۔ اس کے پیشروؤں میں سردار دیوان سنگھ مفتوں کا نام آتا ہے۔سردار دیوان سنگھ مفتوں کے اخبار ریاست کا مطالعہ میں اس وقت سے کرتا ہوں، جب یہ جاری ہوا تھا۔ میں نے اس کے انتہائی عروج کا زمانہ بھی دیکھا ہے۔اور اس کج نہاد زمانے کی ناقدر شناسی بھی کہ آج یہ اخبار اس منزل میں ہے کہ اس کا مجاہد مدیر اسے بند کرنے کا اعلان کر چکا ہے۔

اس اخبار میں سردار دیوان سنگھ مفتوں گاہ گاہ اپنے تجربے کی کہانیاں ''ناقابل فراموش'' کے نام سے درج کیا کرتے تھے۔ان کو کتابی صورت میں پہلے بھی شائع کیا گیا تھا۔اب دوبارہ شائع کیا جارہا ہے۔

اس زمانے میں جب کہ اردو کی اچھی کتابیں شائع نہیں ہوتی تھیں۔اور اگر شائع ہوتی تھیں تو کس نمی پرسد کی نذر ہو جایا کرتی تھیں۔یہ ضخیم کتاب اردو کے اس پرانے مجاہد کا کارنامہ ہائے عظیم ہے۔یہ کتاب کہنے کو چھوٹے چھوٹے واقعات کی تفصیلات کا مجموعہ ہے۔لیکن یہ ایک مسلسل تگ و دو اور جہد البقا کا قصہ ہے۔

زندگی کی گوناگوں روزمرہ کے واقعات سے زندگی کے لئے سبق، جہد مسلسل، اور ان سب کے علاوہ کردار کی بلندی ان قصوں میں نظر آتی ہے۔یہ قصے ہندوستان کے عہد کی ایک تاریخ ہیں۔کتنے مختلف النوع لوگ ہیں۔جن سے سردار دیوان سنگھ مفتوں زندگی میں دوچار ہوئے۔امیر بھی ہیں اور وزیر بھی۔رہنمایان قوم بھی ہیں اور مردان

طریقت بھی۔ مخلص قسم کے دوست، جان نثار ہم نشین بھی اور خفیہ پولیس کے افسران بھی اور والیان ریاست بھی۔ قبروں کے مجاور بھی، رجعت پسند بھی اور انقلاب دوست بھی۔

آپ نے اس کتاب میں کسی تعصب آمیز تاثر سے کام نہیں لیا۔ آپ ایک محب وطن انسان ہیں۔ صحافت وسیاست کی خاطر کئی بار جیل گئے ہیں۔ لیکن جہاں دیانت وامانت کا تقاضا ہے۔ آپ نے اپنے ہم مذہبوں کو برا بھلا کہا ہے۔ انگریز دوستوں کی بحیثیت انسان تعریف کی ہے۔ اور مسلمان احباب پر اپنی جان چھڑکی ہے۔ نصف صدی تک جس شخص نے بڑی بے پرواہی سے قلم رانی کی ہو۔ اس کا ایک حصہ کتابی صورت میں محفوظ ہو جائے۔ یہ بہت ضروری تھا۔ والیان ریاست کے وہاں جو فتنہ آرائیاں ہوتی رہیں،

عیاشی اور لا ابالی کے جو جو مظاہرے ہوتے رہے۔ قانون شکنی کے جو دل خراش واقعات اور ننگ انسانیت حادثات وقوع پذیر ہوتے رہے۔ ان کی نقاب کشائی سردار صاحب نے جس ہمت مردانہ سے کی ہے۔ وہ ہندوستانی صحافت کا ایک اہم باب ہے۔

انہیں واقعات کے اجزاء اس کتاب کا موضوع ہیں۔ اس سرگرم زندگی میں آپ نے ایسے تجربے حاصل کیے، جو خود انہیں اب تک یاد ہیں۔ اور جو شخص انہیں پڑھے گا ، اسے بھی یاد رہیں گے۔

مختصر افسانہ نویس اور ناول دونوں کا مزہ اس کتاب میں ملتا ہے۔ ہر واقعہ جداگانہ حیثیت رکھتا ہے۔ اس لیے ایک مختصر افسانہ ہے اور افسانہ بھی سچا۔ لیکن تمام واقعات ایک ہی آدمی کے گرد گھومتے ہیں۔ اس لیے یہ کتاب ایک ناول کا مقام بھی رکھتی ہے۔

کتاب میں ادبیت ہے، تاریخ ہے۔ داستان عہد حاضر کے تمام عناصر ہیں۔ دوا بیچنے والوں نے تو کتنی ہی ایسی دوائیں بنا ڈالیں جن سے ہر مرض کا علاج ہو۔ لیکن

صحافی یا ادیب نے کوئی ایسی کتاب نہیں لکھی جس سے ہر ذوق کی تسکین ہو۔

میرے ایک دوست ایک دن تشریف لائے۔ میز پر ناقابل فراموش کے مطبوعہ اوراق پڑے تھے۔ جو دیباچہ لکھنے کے لئے میں نے سردار صاحب سے طلب کیے تھے۔ پہلے ہی صفحے پر عنوان تھا۔ ''طوائفوں سے نفرت'' وہ بوکھلا اٹھے، کہنے لگے یہ کون بد ذوق ہے۔ میں نے کہا یہ سردار دیوان سنگھ مفتوں ہیں۔ انہوں نے کہا یوں تمہیں کہہ دیا ہوگا۔ مجھے ان کی خوش ذوقی پر اعتماد ہے۔
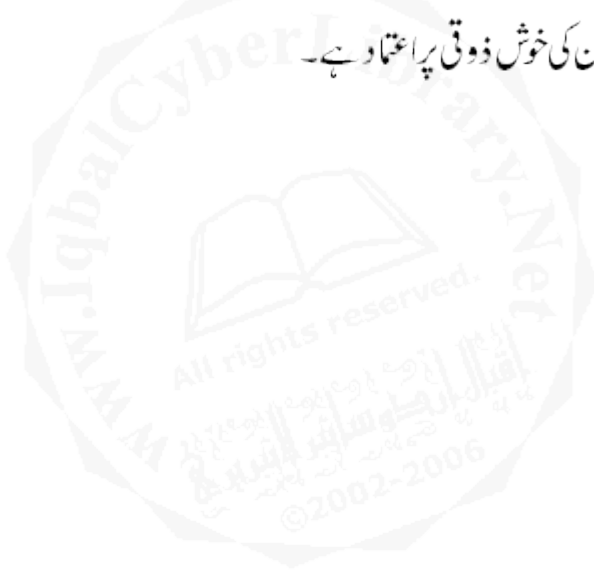
کام سے محبت

ایڈیٹر ریاست کا وطن حافظ آباد ضلع گوجرانوالہ ہے۔ یہ وہاں کے ایک کھنہ سکھ کھتری خاندان میں پیدا ہوئے۔ خاندان کے لوگ عام طور پر ملازمت پیشہ اور اچھے عہدوں پر ہیں۔ اور بعض سرکاری خطاب یافتہ بھی ہیں۔ ایڈیٹر ریاست کے والد اپنے زمانہ میں ایک کامیاب ڈاکٹر تھے۔ "ایڈیٹر ریاست" کی عمر ایک ماہ دس روز کی تھی، جب والد کا انتقال ہو گیا اور یتیمی نصیب ہوئی۔ اس وقت گھر میں کافی روپیہ، زیورات، زمین اور مکانات تھے۔ مگر والد کے انتقال کے بعد رشتہ داروں نے زمین اور مکان پر قبضہ کر لیا۔ اور بارہ سال تک بغیر کسی آمدنی کے ضروریات زندگی اور بڑے بھائی اور چار بہنوں کی شادی پر روپیہ صرف ہونے کا نتیجہ یہ ہوا کہ "ایڈیٹر ریاست" کی عمر جب بارہ سال کی تھی تو گھر میں کھانے کے لئے کچھ بھی نہیں تھا۔ چنانچہ تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا اور "ایڈیٹر ریاست" پانچ روپیہ ماہوار پر حافظ آباد میں ایک بزاز کی دکان پر ملازم ہو گیا۔ کام یہ تھا کہ اندر سے کپڑے کے تھان لا کر گاہکوں کو دکھائے جائیں۔ اس ملازمت کے دو واقعات مجھے یاد ہیں۔ جن کا میرے کریکٹر پر نمایاں اثر ہوا۔ یہ دکان ہندو بزاز کی تھی اور اس پر ایک بوڑھا مسلمان درزی اور اس کا جوان بیٹا کام کرتے تھے۔ یہ باپ اور بیٹا حافظ آباد کے کسی گاؤں کے رہنے والے تھے۔ ایک روز چند دن کے لئے باپ کسی شادی میں شریک ہونے کے لئے اپنے گاؤں گیا اور اپنی غیر حاضری میں دکان اپنے بیٹے کے سپرد کر گیا اور چند کپڑے بھی سینے کے لئے دے گیا۔ تاکہ وہ ان کو تیار کر رکھے۔ جب واپس آیا اور اس نے بیٹے کے تیار کیے ہوئے کپڑوں کو دیکھا تو ان میں کسی بچہ کا سبز رنگ کا مخمل کا ایک کوٹ بھی تھا۔ جس کو بیٹے نے بجائے سبز رنگ کے تاگے کے سفید رنگ کے تاگے سے سی دیا تھا۔ اس غلطی کو دیکھ کر بوڑھے باپ نے جوان بیٹے کے منہ پر زور سے تھپڑ مارا اور کہا: نالائق تو دیہات کے رہنے والے جاٹ کے لڑکے (جس کا کوٹ سیا تھا) پر رحم نہ کرتا، مگر اس

مخمل پر تو رحم کرتا۔ جس کا ستیاناس کر دیا۔ چنانچہ بوڑھے باپ نے مخمل کے اس کوٹ کی سلائی کو کھولا۔ سفید تاگے نکالے اور دوبارہ سبز رنگ کے دھاگے سے سیا۔

اس واقعہ کا میری طبیعت پر ایسا گہرا اثر ہوا کہ چاہے میں نے چھ روپے تنخواہ لی یا بارہ روپے۔ یا دوسو روپے، چاہے ملازمت کی یا اپنا کام کیا۔ تمام زندگی ہمیشہ کام کو دیکھ کر کام کیا نہ کہ اس کے معاوضہ کو۔

ہمیشہ بارہ سے آٹھارہ گھنٹے تک کام کیا۔ چاہے تنخواہ کچھ ہی ملتی تھی۔ اور شاید ایک دفعہ بھی ایسا نہ ہوا ہوگا کہ کسی کام کو کرتے وقت اس پر پوری توجہ نہ دی ہو۔ غرض میرے کریکٹر پر اس واقعہ نے بہت اثر کیا۔
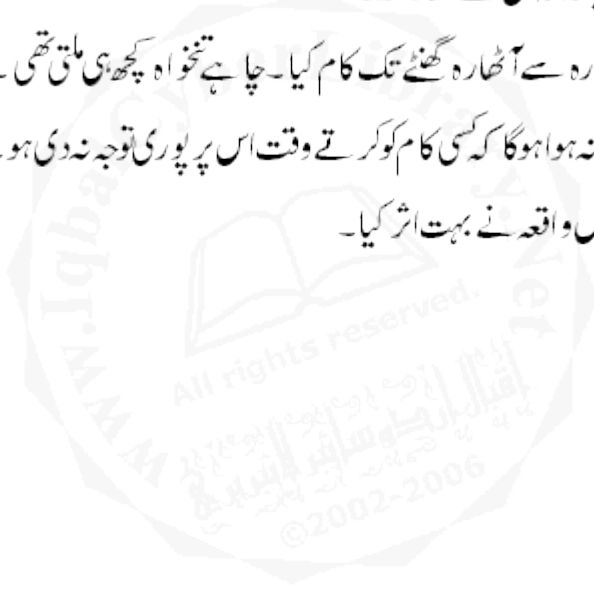
طوائفوں سے نفرت

بزازی کی دکان کی اس ملازمت کا دوسرا واقعہ یہ ہے کہ اس دکان کے بالکل سامنے اور قریب طوائفیں رہتی تھیں۔ اور یہ طوائفیں ادنیٰ اور ارزاں قسم کی میلی اور گندی تھیں، دکان پر آتے جاتے اور کام کرتے ہوئے ان طوائفوں کو دیکھتا کہ یہ کیوں کر چار چار آنے اور آٹھ آٹھ آنے کے لئے اپنے ضمیر کو فروخت کرتی ہیں۔ کتنے گندے اور سڑے ہوئے لوگ آتے ہیں۔ جن سے یہ بناوٹی مسکراہٹ سے پیش آتی ہیں۔ ان کے جانے کے بعد ان کو بے وقوف سمجھ کر ان کے خلاف باتیں کرتی ہیں۔ اور ان میں سے اکثر شرمناک بیماریوں میں مبتلا ہیں۔ چنانچہ اس دکان پر جوں جوں وقت گزرتا گیا۔ ان طوائفوں سے نفرت اور حقارت کے جذبات میں اضافہ ہوتا گیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ میں اب کسی اچھی صاف اور خوش سلیقہ طوائف کا گانا تو سن سکتا ہوں۔ اور موسیقی کی اس مجلس میں بیٹھ سکتا ہوں۔ جہاں کوئی بلند معیاری طوائف گا رہی ہو۔ مگر پیشہ ور عورتوں کے بازار یا محلّہ میں سے موٹر میں گزرتے ہوئے بھی اتنی تکلیف ہوتی ہے۔ جتنی کہ پاخانہ یا گندگی کے ڈھیر سے گزرتے ہوئے۔ اور اس کی وجہ بچپن کے وہ تاثرات ہیں جو پیشہ ور عورتوں کے حالات دیکھنے سے پیدا ہوتے تھے۔

خودداری کا کریکٹر

''ریاست'' جاری ہو چکا تھا اور دفتر ''ریاست'' پریڈ کے میدان کے قریب سڑک پر تھا۔ ایک روز ایڈیٹر ریس ہند'' اچکن میں سونے کے بٹن لگائے تشریف لائے۔ اور تھوڑی دیر باتیں کرنے کے بعد فرمایا کہ کرنل امریک سنگھ اے ڈی سی مہاراجہ پٹیالہ ملنا چاہتے ہیں۔ میں نے جواب دیا اچھی بات ہے۔ مل لوں گا۔ چنانچہ اگلے روز کرنل امریک سنگھ (جو چیمبر آف پرنس کے دنوں میں مہاراجہ پٹیالہ کے ساتھ کنگز وے کے کیمپوں میں مقیم تھے۔) دفتر ''ریاست'' میں تشریف لائے۔ اور آپ نے رسمی گفتگو کے بعد کہا کہ مجھے مہاراجہ پٹیالہ نے بھیجا ہے کہ مہاراجہ کو معلوم ہوا ہے کہ ایڈیٹر ''ریاست'' کا بطور ایک دوست مہاراجہ نابھ پر بہت اثر ہے۔ مہاراجہ پٹیالہ کو مہاراجہ نابھ کی گدی سے دست برداری کا بہت افسوس ہے۔ اور مہاراجہ پٹیالہ چاہتے ہیں کہ ایڈیٹر ریاست (مہاراجہ پٹیالہ اور مہاراجہ نابھ کے درمیان صلح کی بات چیت کرے۔) ایڈیٹر ریاست نے جواب دیا کہ اگر صلح ہو جائے تو اس سے زیادہ بہتر کیا ہے؟۔ چنانچہ ایڈیٹر ریاست رات کی گاڑی سے ڈیرہ دون گیا۔ مہاراجہ نابھ سے ملا۔ کرنل سردار امریک سنگھ کا آنا اور مہاراجہ پٹیالہ کا پیغام بیان کیا اور کہا کہ مہاراجہ پٹیالہ معافی مانگنے کے لئے بھی تیار ہے۔ مہاراجہ نابھ نے تمام واقعات سننے کے بعد جو الفاظ کہے۔ وہ ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہے ہیں۔ وہ یہ تھے:

''یہ تو ممکن ہے کہ مہاراجہ نابھ تنگ دستی، افلاس اور غربت کے باعث گداگری اختیار کرے۔ اس کے پاس نہ کھانے کے لئے کچھ ہو اور نہ رہنے کے لئے مکان۔ دن کو ڈیرہ دون کی سڑکیں کوٹ کر روٹی حاصل کرے۔ اور رات کو گوردوارہ رام رائے (جو ڈیرہ دون میں ہے) کے برآمدے میں پڑ کر سو رہے۔ مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ اپنی خودداری کو جواب دے کر وہ مہاراجہ پٹیالہ سے ہاتھ ملائے۔

اس جواب کو سن کر ایڈیٹر ریاست رات کو ڈیرہ دون سے سوار ہوا۔ صبح دہلی پہنچا۔

کرنل امریک سنگھ منتظر تھے۔ جن کو پیغام کا جواب من وعن سنا دیا گیا۔ اس جواب کا کرنل امریک سنگھ اور ایڈیٹر ریاست دونوں کو افسوس تھا۔ مگر اس واقعہ کا میرے کریکٹر پر یہ اثر ہوا کہ اس کے بعد زندگی میں کم ہی ایسے واقعات ہیں، جب خودداری کو جواب دے کر ایڈیٹر ''ریاست'' کبھی دشمن کے سامنے جھکا ہو۔ چنانچہ نواب بھوپال کے مقدمہ میں میرے اس کریکٹر نے بہت بڑا پارٹ ادا کیا۔ اور چھ برس کی مقدمہ بازی میں قدم آگے ہی بڑھتا گیا۔

اعتماد کشی جرم ہے

پنجاب کے مارشل لاء کے بعد کانگریس کی طرف سے تحقیقاتی کمیٹی قائم ہوئی۔ پنڈت موتی لال نہرو اور پنڈت مالویہ جیسے بڑے بڑے لیڈروں کے علاوہ مہاتما گاندھی بھی تشریف لائے۔ اور شہادتیں شروع ہوئیں۔ سردار دول سنگھ کویشر شہادتیں جمع کر رہے تھے۔ خالصہ کالج کے ایک لڑکے نے سردار دول سنگھ کو بتایا کہ امرتسر کے واقعہ جلیانوانہ کے بعد جب خالصہ کالج کے طلباء نے ہڑتال کر دی اور غم وغصہ کا اظہار کرنے کے لئے مجمع کی شکل اختیار کر لی تو اس شور کو سن کر مسٹر وادن (انگریز پرنسپل) لڑکوں کے پاس آئے۔ اور ان کو تسلی دیتے ہوئے اپنی بےبسی کا اظہار کیا۔ اور کہا کہ وہ ہندوستان کے خیر خواہ ہیں۔ اور جنرل ڈائر نے گولی چلانے سے پہلے جب امرتسر کے تمام یورپینز کو جمع کر کے فائر کرنے کے متعلق رائے لی تھی تو میں (یعنی مسٹر وادن) نے جنرل ڈائر سے صاف الفاظ میں کہا تھا کہ اس انڈسکریمنیٹ شوٹنگ (اندھا دھند گولی چلانے) کو میں پسند نہیں کرتا۔

سردار دول سنگھ کویشر نے جب یہ سنا تو بہت خوش ہوئے۔ فوراً پنڈت مالویہ کے پاس پہنچے اور کہا کہ مسٹر وادن انگریز ہیں۔ انگریزوں کا کریکٹر ہے کہ وہ جھوٹ نہیں بولتے۔ اگر مسٹر وادن کو تحقیقاتی کمیٹی میں طلب کیا جائے تو وہ یقیناً یہ کہہ دیں گے کہ وہ اس وقت بھی اس خون ریزی کو اندھا دھند سمجھتے تھے۔ اور جائز قرار نہ دیتے تھے۔ اور انہوں نے یہ الفاظ طلباء کے سامنے کہے تھے۔

سردار دول سنگھ سے مسٹر وادن کے الفاظ سن کر پنڈت مالویہ بھی بہت خوش ہوئے اور یہ فیصلہ کیا گیا۔ کہ راقم الحروف (ایڈیٹر ریاست) لاہور کے ایک اخبار میں کام کرتا تھا) امرتسر جائے اور مسٹر وادن سے بیان لے۔ اور وہ بیان اخبار میں شائع کیا جائے۔ تاکہ بطور شہادت کام میں لایا جا سکے۔

اس مشورہ کے بعد پنڈت مالویہ اور سردار دول سنگھ مہاتما گاندھی کے پاس گئے۔

تمام واقعات بیان کیے اور چاہا کہ مہاتما گاندھی جی اس سکیم کے ساتھ متفق ہوں۔
پنڈت مالوی اور سردار دول سنگھ کا بیان سن کر مہاتما گاندھی نے جو الفاظ کہے وہ یہ تھے:
"مسٹر دادن نے اگر پرائیویٹ طور پر لڑکوں سے یہ بات کہی ہوتی تو یہ ایک قسم کا ان پر اعتماد کیا۔ مسٹر دادن کے اس اعتماد کے ساتھ ہمارا غداری کرنا اور اس سے ناجائز فائدہ اٹھانا بری بات ہے۔ اس لیے میں اس سکیم کے ساتھ متفق نہیں ہوں۔ اور ہمیں کسی قیمت پر بھی مسٹر دادن کے اس اعتماد کا ناجائز فائدہ نہ اٹھانا چاہیے، جو انہوں نے لڑکوں پر کیا۔
مہاتما گاندھی کے یہ الفاظ سن کر پنڈت مالویہ اور سردار دول سنگھ دونوں سن ہو گئے اور کچھ نہ کہہ سکے۔ چنانچہ اس اسکیم کو یونہی چھوڑ دیا گیا۔ اور مسٹر دادن کے بیان لینے کا خیال ترک کر دیا گیا۔
اس واقعہ اور مہاتما گاندھی کے کریکٹر کا راقم الحروف پر یہ اثر ہوا۔ کہ جب کسی نے راز کی بات کہی۔
اس کو ہمیشہ ایک امانت کے طور پر چھپائے رکھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ درجنوں مہارانیوں اور بیگمات نے اپنے شوہروں اور عزیزوں کے خلاف اطلاعات دیں اور خطوط لکھے۔ مگر ان خطوط اور اطلاعات کے ناجائز استعمال کرنے کا کبھی خیال تک نہیں آیا۔ اور اس مسئلہ پر سوچنے کو بھی ہمیشہ کمینہ پن سمجھا۔

محنت کی عادت

ریاست نابھ کی ملازمت سے ایک سال پہلے ''ایڈیٹر ریاست'' اور خواجہ حسن نظامی دونوں نے مل کر دونوں نے ایک روزانہ اخبار ''رعیت'' جاری کیا۔ اخبار بہت اچھا تھا۔ اڑھائی سو روپیہ ''ایڈیٹر ریاست'' نے بطور حصہ دیئے اور فیصلہ ہوا کہ باقی روپیہ خواجہ حسن نظامی لگائیں گے۔ ''ایڈیٹر ریاست'' اپنے کھانے کے لئے ایک روپیہ یعنی تیس روپے ماہوار سے زیادہ نہ لے گا۔ خواجہ حسن نظامی کی کتابوں کے اشتہار کا ایک صفحہ مفت چھپے گا۔ جس کی اجرت ادا نہ کی جائے گی۔ اس کے بعد اگر منافع ہوگا تو دونوں کا مساوی ہوگا۔ اور اگر نقصان ہوگا تو خواجہ حسن نظامی پورا کریں گے۔ یہ اخبار چند ماہ جاری رہا۔ اور جب خواجہ حسن نظامی کو اس میں چھ سو روپے کے قریب نقصان ہوا تو آپ نے اس کو بند کر دینے کا فیصلہ کیا۔ یہ فیصلہ ''ایڈیٹر ریاست'' کے لئے افسوسناک تھا۔ چنانچہ کوشش کی گئی کہ یہ اخبار زندہ رہے۔ لالہ شیام لال کپور ایڈیٹر ''گورو گھنٹال'' کو لاہور تار دیا۔ وہ آئے۔ ان کے پاس بھی سرمایہ نہ تھا۔ وہ چند روز بھی نہ چلا سکے۔ پھر بھیا شیخ احسان الحق نے اور بعد میں اس کو ملا واحدی صاحب ایڈیٹر نظام المشائخ نے لے لیا۔ واحدی صاحب کے پاس رعیت جانے کے بعد اس کا دفتر بھی واحدی صاحب کے مکان میں چلا گیا۔ ایڈیٹر ریاست اتنے مکان بدلنے کے بعد بھی مسلسل محنت سے کام کرتا رہا۔ کام کرتے کرتے رات کے دس بج گئے تو واحدی صاحب اتفاق سے اپنے رہائشی حصہ سے پیشاب کرنے کے لئے دفتر کے حصہ میں آئے۔ آپ نے دیکھا کہ میں اکیلا بیٹھا کام کر رہا ہوں۔ آپ یہ دیکھ کر چلے گئے۔ اتفاق سے پھر ایک بجے پیشاب کی حاجت ہوئی اور تشریف لائے تو آپ نے دیکھا کہ میں پھر میز پر بیٹھا کام کر رہا ہوں۔ چنانچہ آپ کمرہ کے اندر میری میز کے قریب آ گئے اور پوچھا کہ اس وقت تک کام کر رہے ہو۔ میں نے جواب دیا، کام موجود تھا، اس لئے کر رہا ہوں۔ کام باقی ہو تو اطمینان نہیں ہوتا۔ اس کے بعد باتیں شروع ہوئیں

۔واحدی صاحب میری باتیں غور سے سن رہے تھے ۔آپ نے باتوں باتوں میں پوچھا اتنا زیادہ کام کیوں کر رہے ہو؟ ۔صبح سورج نکلتے ہی بیٹھ جاتے ہو۔اور اب رات کے ایک بجے تک کام کر رہے ہو۔ میں نے جواب دیا کہا انسان کی کام یاب زندگی کے لئے ضروری ہے کہ وہ سخت محنت کا عادی ہو۔اور اپنی زندگی میں بہت کام کرے ۔ واحدی صاحب نے سوال کیا کہ کام یاب زندگی کا معیار کیا ہے؟ ۔اور کامیاب زندگی کس کو سمجھتے ہو؟ ۔ میں نے اس سوال کا جو جواب دیا ۔وہ مجھے اور واحدی صاحب دونوں کو اب تک یاد ہے۔ میں نے کہا۔

''میں کام یاب زندگی اس شخص کی سمجھتا ہوں کہ جب مرے تو چند لاکھ روپے نقد چھوڑے اور چند ہزار آدمی اس کے جنازہ کے ساتھ ہوں ۔

زندگی کی کامیابی کا معیار میرے ذہن میں اب بھی وہی ہے ۔ جو''رعیت'' کے زمانہ میں تھا۔مگر نہیں کہہ سکتا کہ اس میں کامیابی کہاں تک ہوئی یا کب ہوئی ۔بہر حال اگر کوئی شخص کام یاب زندگی حاصل کرنا چاہے تو اس کا معیار یہی ہونا چاہیئے ۔کہ وہ مالی اعتبار سے لاکھوں روپیہ پیدا کرے ۔چاہے اس روپیہ کو خیرات کر دے یا ضرورت مند لوگوں پر خرچ کرے ۔اور جب مرے تو مقبولیت اور ہر دل عزیزی کے ساتھ ہزار ہا لوگ اس کے جنازے کے ساتھ ہوں ۔

کامیابی کے لئے مضبوط قدم کی ضرورت

''ایڈیٹر ریاست'' نے موگا سے مستعفی ہونے کے بعد مانسہ (ریاست پٹیالہ) میں میڈیکل پریکٹس شروع کر دی۔ آنکھوں کے یعنی موتیا بند کے کثرت کے ساتھ آپریشن کیے۔ اپنا ہسپتال جاری کیا۔ جہاں ان ڈور بیمار بھی رہتے تھے۔ اس زمانہ میں راقم الحروف کی آمدنی تین چار سو روپیہ ماہوار کے درمیان تھی۔ اخبار اور رسائل کے پڑھنے اور نامور مضمون نگاروں اور ایڈیٹروں اور شعراء سے ملنے اور ان سے خط و کتابت کا بہت شوق تھا۔ اردو زبان کا شاید ہی کوئی رسالہ یا کتاب ایسی ہو گی کہ جس کا باقاعدہ مطالعہ نہ کرتا۔ اس شوق میں ایک روز مضمون لکھا جو لاہور کے اردو ہفتہ وار اخبار خالصہ کو چھپنے کے لئے بھیجا۔ یہ مضمون ایک فرضی نام ایشر سنگھ فیروز پوری کے نام سے شائع ہوا۔ اور چونکہ میں محسوس کرتا تھا کہ اگر مضمون اچھا نہ ہوا اور میرے نام سے چھپا تو لوگ مذاق اڑائیں گے۔ اس مضمون کے شائع ہونے پر اس قدر خوشی ہوئی کہ بیان نہیں کر سکتا۔ اس کے بعد میں نے دو، تین مضمون اسی نام سے شائع کرنے کے لئے بھیجے۔ ان مضامین کے چھپنے کے بعد بھائی مولی سنگھ منیجر خالصہ اخبار کا خط میرے پاس پہنچا، جس میں پوچھا گیا تھا کہ میں مانسہ میں کیا کام کرتا ہوں۔ تعلیم کہاں تک ہے۔ آمدنی کتنی ہے؟۔ خالصہ اخبار کو ایڈٹ کرنے کے لئے لاہور آ سکتا ہوں۔ اور اگر آ سکتا ہوں تو کیا تنخواہ لوں گا؟۔

اس خط کو دیکھ کر مسرت اور حیرانی کے ملے جلے جذبات کے باعث میری حالت عجیب سی تھی۔ خط کو بار بار پڑھتا تھا۔ غور سے دیکھتا تھا اور خیال کرتا تھا کہ کیا یہ بھی ممکن ہے کہ میں کسی اخبار کا ایڈیٹر بن سکوں۔ اس خط کا میں نے جواب دیا کہ میں میڈیکل پریکٹس کرتا ہوں۔ آمدنی تین چار سو روپیہ ماہوار کے درمیان ہے۔ تعلیم معمولی ہے۔ مگر لٹریچر کا مطالعہ کافی ہے۔

اس جواب کے بعد بھی میں کچھ بے تاب سا تھا۔ اور رہ رہ کر خیال کرتا تھا کہ میں

جرنلزم اختیار کروں۔ شاید اس میں میڈیکل پریکٹس سے زیادہ کامیابی نصیب ہو۔ چنانچہ میں نے ایک محترم خیر خواہ بھگت لکشمن سنگھ بی،اے انسپکٹر آف سکولز فیروز پور جو کئی کتابوں کے مصنف تھے۔اور جن کو میرے فرضی نام سے بھیجے گئے ان مضامین کا علم تھا کہ میں نے لکھے ہیں) کو خط لکھ کر خالصہ اخبار کے مالک مجھے ایڈیٹر مقرر کرنا چاہتے ہیں۔مگر تنخواہ صرف ساٹھ روپے ماہوار دیں گے۔میری موجودہ آمدنی تین ،چار سو کے درمیان ہے۔میں اس اخبار میں جاؤں یا نہ جاؤں۔بھگت لکشمن سنگھ کا جو جواب آیا،اس کے الفاظ ابھی تک میرے کان میں گونج رہے ہیں۔اور شاید میں انہیں زندگی بھر نہ بھول سکوں۔کیونکہ یہی الفاظ میری زندگی میں بہت بڑا انقلاب پیدا کرنے کا باعث ہوئے۔آپ نے لکھا:

''اس میں کوئی شک نہیں کہ تمہارے قلم میں غیر معمولی زور ہے۔یہ غیر ممکن نہ ہوگا کہ تم بطور جرنلسٹ کامیاب ہو جاؤ۔میری رائے میں جرنلزم اختیار کرکے دیکھنا چاہیے کہ تم کس حد تک کامیاب ہوتے ہو۔

اس خط کے پہنچنے کے بعد میں نے بھائی مول سنگھ کو لکھا کہ میں ساٹھ روپے ماہوار پر ہی آنے کو تیار ہوں۔ان کا جواب آیا آجاؤ۔چنانچہ میں تین چار سو روپیہ ماہوار کی میڈیکل پریکٹس چھوڑ کر ساٹھ روپے ماہوار تنخواہ پر لاہور پہنچ گیا۔

لاہور پہنچنے کے بعد میں نے سردار مول سنگھ سے یہ فیصلہ کیا کہ میرے لاہور آنے کی اطلاع کسی کو نہ دی جائے۔اور میں پوشیدہ طور پر اخبار کو ایڈٹ کروں گا۔میرے اپنے آپ کو چھپانے کی غرض صرف یہ تھی کہ میں ناکامی سے خوف زدہ تھا اور سوچتا تھا کہ اگر ناکام ہوا تو دوست احباب مذاق اڑائیں گے۔

''خالصہ اخبار'' کو میں شاید چار ماہ ایڈٹ کرتا رہا۔اس عرصہ میں اخبار میں نئی زندگی پیدا ہوگئی۔ہر شخص ایڈیٹوریل مضامین کا مداح تھا۔مگر مجھے قانون سے ناواقفیت تھی۔نتیجہ یہ ہوا کہ اس چار ماہ میں مالک اخبار سردار ہرچند سنگھ رئیس لائل پور اور سردار

مول سنگھ پرنٹر پبلشرز پر فوج داری مقدمات دائر ہو گئے۔ ان مقدمات میں ایک مقدمہ سردار امر سنگھ ایڈیٹر ''شیر پنجاب'' نے بھی کیا، جن کے خلاف مضامین لکھے گئے تھے۔ چنانچہ میں ان مقدمات کے باعث علیحدہ کر دیا گیا۔

میری زندگی کا یہ دور بہت نازک تھا۔ میڈیکل پریکٹس چھوڑ چکا تھا اور خالصہ اخبار سے علیحدہ کر دیا گیا تھا۔ دوسری کوئی جگہ نہ تھی۔ مگر میں ایک لمحہ کے لئے بھی مایوس نہیں ہوا۔ اور لاہور ہی میں بہت تھوڑی تنخواہ پر کئی ایک اخباروں میں کام شروع کر دیا۔ لاہور کے اخبارات میں مجھے کام کرتے ہوئے کچھ عرصہ ہو چکا تھا۔ ایک روز میں نے لالہ رام چھپال سنگھ صاحب شیدا ایڈیٹر ''ہندوستان'' سے پوچھا کہ اردو جرنلزم میں سب سے زیادہ لائق کون صاحب ہیں۔ آپ نے فرمایا سب سے زیادہ وسیع معلومات کے اعتبار سے سب سے زیادہ اہم ایڈیٹر سید جالب ''ایڈیٹر ہم دم ہیں''۔ راقم الحروف نے سید جالب کو لکھنؤ خط لکھا کہ مجھے جرنلزم سیکھنے کا شوق ہے۔ اگر آپ اجازت دیں اور میرے اخراجات کے لئے معمولی تنخواہ مقرر کر دیں تو میں آپ کی خدمت میں حاضر ہونا چاہتا ہوں۔ سید جالب نے اس خط کا کوئی جواب نہ دیا۔ ایک ہفتہ کے بعد میں نے دوبارہ خط لکھا۔ جواب ندارد۔ اس بے اعتنائی سے میں بے حد مایوس نہ ہوا۔ لکھنؤ کا ٹکٹ لیا اور لکھنؤ پہنچ گیا۔ لکھنؤ پہنچ کر سیدھا گوردوارہ گیا۔ وہاں بطور مسافر ایک کوٹھری میں سامان رکھا۔ اگلے روز صبح آٹھ بجے دفتر ہم دم پہنچا۔ ہمدم کا دفتر اس زمانے میں حضرت گنج کی ایک بلڈنگ میں تھا۔ جو ''آئی، ڈی، ٹی'' کے ساتھ مشترک تھی۔ کیونکہ غالباً دونوں اخبار کے مالک غالباً مرحوم راجہ صاحب آف محمود آباد تھے۔ ''ہمدم'' کے دفتر میں پہنچ کر میں نے پنسل سے ایک کاغذ کے ٹکڑے پر اپنا نام لکھا اور چپڑاسی کے ہاتھ سید جالب کے پاس بھیجا۔ سید صاحب نے مجھے فوراً اندر بلا لیا۔ میں ابھی کھڑا ہوا ہی تھا کہ آپ نے فرمایا:

''آپ کے دو خط ملے، مجھے افسوس ہے کہ جواب نہ دے سکا۔ کیونکہ یہاں کوئی جگہ خالی

نہیں ہے۔اب بھی یہی پوزیشن ہے۔مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کے لئے مفید نہیں ہوسکتا۔

میں نے عرض کیا مجھے کام سیکھنے کا شوق ہے۔چونکہ میں نے سنا ہے کہ آپ اردو جرنلزم میں لائق ترین شخصیت ہیں۔اس غرض سے آیا ہوں۔اگر آپ ماہوار تیس روپے بھی مقرر کر دیں تو میں اطمیان کے ساتھ آپ کی خدمت میں حاضر رہ کر کام کرنا اور سیکھنا چاہتا ہوں۔سید جالب نے جواب دیا کہ کوئی جگہ خالی نہیں، میں نے پھر عرض کیا کہ مجھے بطور چپڑاسی ہی رکھ لیں۔ میں چپڑاسی کے طور پر دن بھر کام کروں گا اور ساتھ ساتھ آپ سے جرنلزم بھی سیکھوں گا۔سید جالب میری اس درخواست پر حیران تھے۔مگر آپ نے فرمایا کہ افسوس اس وقت چپڑاسی کی بھی جگہ خالی نہیں۔یہ جواب سن کر میں نے کہا۔آپ کو میرے مفت کام کرنے پر اعتراض ہے۔سید جالب نے مسکراتے ہوئے کہا مفت کام لینے میں کیا انکار ہوسکتا ہے۔چنانچہ راقم الحروف نے اگلے روز سے دفتر ہمدم میں بغیر تنخواہ کے کام شروع کر دیا۔گزارا کے لئے امین آباد پارک کے قریب ایک بنگالی کیمسٹ کی دکان پر پندرہ روپیہ ماہوار پر ملازمت اختیار کر لی۔دن بھر دفتر ہمدم میں کام کرتا۔شام کو چھ سے بارہ بجے تک کیمسٹ کی دکان پر کام کرتا۔رات کو گوردوارہ میں سوتا۔اور چونکہ قد، جسم اور شکل بارعب تھی، جب لکھنو کے بازاروں میں سے گزرتا تو پولیس کے ٹرافک کے سپاہی یہ سمجھ کر سیلوٹ کرتے کہ شاید کوئی نیا سب انسپکٹر یا انسپکٹر مقرر ہوا ہے۔کیونکہ یوپی کی پولیس میں سکھ کافی تعداد میں اعلیٰ عہدوں پر تھے۔ان بے چاروں کو کیا معلوم تھا کہ جس کو وہ سیلوٹ کر رہے ہیں۔وہ دن بھر ہمدم کے دفتر میں بغیر تنخواہ کے کام کرتا ہے۔رات کو بارہ بجے تک ایک کیمسٹ کے ہاں پندرہ روپیہ ماہوار پر کام کرتا ہے۔اس کی ذاتی آمدنی یا خرچ آٹھ آنے روز سے زیادہ نہیں۔

''ہمدم اور امین پارک کے کیمسٹ کے ہاں کام کرتے کچھ عرصہ گزر گیا، جون کا مہینہ تھا، جون کی گرمی، صبح آٹھ بجے ہمدم کے دفتر پہنچتا۔اور دو بجے دوپہر کو پیدل گوردوارہ واپس آتا۔ایک روز گرمی زیادہ تھی۔لو لگ گئی، تیز بخار ہو گیا۔گوردوارا کی

ایک کوٹھری میں پڑا تھا۔ گوردوارہ کے گرنتھی نے پوچھا، کہاں کے رہنے والے ہو؟۔ اپنا حسب نسب بتاؤ، اگر مر جاؤ تو تمہارے گھر والوں کو اطلاع کی جائے ۔ میں نے جواب دیا حافظ آباد ضلع گوجرانوالہ کا رہنے والا ہوں ۔ گرنتھی نے جواب دیا ۔ اسی حافظ آباد کے جہاں سردار گوربخش سنگھ ڈپٹی سپرٹنڈنٹ ٹیلی گراف رہنے والے ہیں ۔ میں نے کہا ہاں ۔ اس گرنتھی نے بغیر میری اطلاع کے

سردار گوربخش سنگھ کو خبر کی ۔ سردار گوربخش سنگھ میرے قریبی چچا زاد بھائی تھے ۔ اور لکھنو میں آٹھ، نو سو کے قریب تنخواہ پاتے تھے ۔ جب ان کو پتہ چلا کہ میں گوردوارہ میں بیمار ہوں ۔ گوردوارہ پہنچے اور مجھے دیکھ کر حیران رہ گئے ۔ پوچھا کہ لکھنو کب آئے ، میں نے کہا کہ چند ماہ ہوئے ، پوچھا کہ اطلاع کیوں نہ دی ۔ میں نے جواب دیا کہ جب انسان اچھی حالت مین نہ ہو تو بلند پوزیشن رشتہ داروں کو اطلاع نہ دینا ہی مناسب ہے ۔ سردار گوربخش سنگھ مجھے اپنی کوٹھی میں لے گئے ۔ چند روز علاج کیا ۔ اور میں اچھا ہو کر واپس پنجاب آ گیا ۔

اوپر کے حالات بتانے کا مقصد یہ ہے کہ جو لوگ بلند جانا چاہتے ہیں، ان کے لئے ضروری ہے کہ وہ ہر قسم کے خطروں کو لبیک کہنے کے لئے تیار رہیں ۔ مصائب و مشکلات سے گھبرائیں نہیں، اور کوئی راہ ایسی نہ چھوڑیں، جو ان کی بہتری کے لیے ہو ۔ چاہے اس راہ کو اختیار کرتے وقت ان کے لئے کتنی بھی مشکلات پیدا کیوں نہ ہوں ۔

’’ ایڈیٹر ریاست کو شکایت ہے کہ مرحوم سید جالب نے اس زمانہ میں اس کے ساتھ حوصلہ افزا سلوک نہیں کیا ۔ سید جالب ان واقعات کے بعد کئی سال زندہ رہے ۔ جب کبھی اپنے وطن دہلی آتے تو ریاست کے دفتر میں بھی تشریف لایا کرتے تھے ۔ اور لکھنو اور دہلی میں جب کبھی اپنے شاگردوں کا (جو درجنوں کی تعداد میں تھے) ذکر کرتے تو فرمایا کرتے تھے ۔ کہ ان کے شاگردوں میں سب سے زیادہ کامیاب دیوان سنگھ ہے ۔ اور اس کی کامیابی پر انہیں فخر ہے ۔

خبریں حاصل کرنے میں مشکلات

روزانہ اخبارات کو ہر روز سینکڑوں تار نیوز ایجنسیوں سے مل جاتے ہیں۔ اور ان خبروں کے لئے پبلک کو روزانہ اخبارات پڑھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ مگر ہفتہ وار اخبارات میں چونکہ نیوز ایجنسیوں کے تار نہیں ہوتے۔ اس لئے لازم ہے کہ یہ اپنے ناظرین کے لئے ایسی خبریں شائع کریں جو روزانہ اخبارات میں نہ ہوں۔ تاکہ روزانہ اخبارات کے پڑھنے والے بھی ان ہفتہ وار اخبارات کو خریدیں، کیونکہ اگر روز انہ اخبارات سے کچھ مواد ہفتہ وار اخبار میں نہ دیا جائے تو پھر کسی کو ہفتہ وار اخبارات خریدنے کی کیا ضرورت ہے۔ اس اصول کے تحت ہمیشہ یہ کوشش کی گئی کہ ریاست چونکہ ہفتہ وار ہے۔ اس لئے اس میں ادبی، تفریحی، اور تاریخی مواد کے علاوہ ایسی خبریں بھی دی جائیں جو روزانہ اخبارات میں نہ ہوں۔

ایک زمانہ میں ''ریاست'' کی خبروں کے لئے دوسرے اصحاب کے علاوہ مرحوم کے سی رائے ڈائریکٹر ایسوسی ایٹڈ پریس آف انڈیا اور مرحوم قاضی سر عزیز الدین احمد دیوان دیتا دو بہت بڑے ذرائع تھے۔ راقم الحروف کے مسٹر رائے کے ساتھ بہت گہرے دوستانہ تعلقات تھے۔ ایڈیٹر ''ریاست'' ہر دوسرے تیسرے روز شام کو مسٹر رائے سے ملنے کے لئے آپ کی کوٹھی (جو انڈر ہل لین پر تھی) اور مسٹر رائے بھی ہفتہ میں ایک دو بار اپنی کوٹھی سے ایسوسی ایٹڈ پریس کے دفتر جاتے ہوئے دفتر ریاست میں تشریف لاتے تھے۔ مسٹر رائے اردو نہیں جانتے تھے۔ اس لئے ان کو کچھ معلوم نہ ہوتا کہ ریاست میں کیا کچھ چھپا ہے۔ اور ایڈیٹر ''ریاست'' مسٹر رائے سے ملتے وقت باتوں باتوں میں ریاستوں اور گورنمنٹ ہند کے متعلق ایسی خبریں حاصل کر لیتا کہ جن کو وہ اپنی ایجنسی کے ذریعے روزانہ اخبارات کو بھیجنا مناسب نہ سمجھتے تھے۔ اور یہ خبریں ریاست کے نوٹوں میں تنقید کے ساتھ شائع کر دی جاتیں۔ مرحوم مسٹر رائے کا گورنمنٹ ہند پر بہت زیادہ اثر تھا۔ کوئی ممبر گورنمنٹ یا سیکرٹری ایسا نہ تھا جو سیاسی

رائے میں مسٹر رائے کو گورو نہ سمجھتا ہو۔ ہر شخص عزت کرتا تھا۔ وائسرائے ہاؤس میں جب کوئی مشکل پیش آتی تو مسٹر رائے کو مشورہ کے لئے طلب کیا جاتا۔ اور بعض دن تو ایسے بھی ہوتے کہ جب مسٹر رائے مشورے کے لئے وائسرائے سے کئی کئی بار ملتے۔ چنانچہ اس راز کا آج مسٹر رائے کے انتقال کے بعد انکشاف کیا جاتا ہے کہ مقدمہ نواب بھوپال بنام ایڈیٹر ریاست کے سلسلہ میں مسٹر رائے آٹھ دس بار وائسرائے سے ملے، اور اس مقدمہ میں نواب بھوپال کے مقابلہ میں جو کامیابی ان حاصل ہوئیں۔ ان میں کافی حصہ مرحوم مسٹر رائے کے اثر اور ان کی کوششوں کا تھا۔

مسٹر رائے کی ملاقات اور دوستی سے ریاست کے لئے خبریں حاصل کرتے ایک طویل عرصہ گزر گیا۔ کئی شخصوں نے مسٹر رائے سے شکایت کی کہ دیوان سنگھ آپ سے خبریں حاصل کر کے ریاست میں شائع کرتا ہے۔ مسٹر رائے نے نہ صرف یہ کہ ان شکایتوں کی کبھی کوئی پرواہ نہیں کی، بلکہ وہ ایڈیٹر ریاست کے بہت معترف تھے۔ اور اس کو صحیح معنوں میں جرنلسٹ سمجھتے تھے۔ کہ یہ باتوں باتوں میں خبریں حاصل کر لیتا ہے۔ چنانچہ ایک روز مسٹر رائے کو مذاق سوجھا۔ ایڈیٹر ریاست جب آپ سے ملنے گیا تو آپ نے اپنے ایک اسٹنٹ (مجھے ٹھیک یاد نہیں غالباً مسٹر سری کرشن تھے) کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''امریکہ سے جو اطلاع مہاراجہ اندور کی امریکن بیوی کے طلاق کے متعلق آئی ہے۔ وہ فی الحال اخبارات کو نہ بھیجئے۔ دو چار روز بعد بھیجی جائے۔

اس ہدایت کو دیتے ہوئے مسٹر رائے نے ایڈیٹر ریاست کو دیکھا تک نہیں۔ تا کہ میں اس مذاق کو تاڑ نہ جاؤں۔ ملاقات کے بعد میں دفتر ریاست پہنچا۔ اگلے روز اخبار شائع ہونا تھا۔ اس اہم خبر کے متعلق فوراً نوٹ لکھا:

ریاست کا پرچہ چھپنے کے بعد دوسرے روز ایڈیٹر ریاست مسٹر رائے سے ملنے گیا۔ تو اس سے پہلے مسٹر رائے کو وہ پرچہ ان کے اسٹنٹ دکھا چکے تھے۔ بہت قہقہہ پڑا۔

چنانچہ ایڈیٹر ریاست کو بتایا گیا کہ یہ خبر ایک سازش کا نتیجہ تھی ۔تا کہ مذاق اڑایا جائے ۔ کیونکہ ایڈیٹر ریاست مسٹر رائے سے ملتے وقت باتوں باتوں میں ہمیشہ خبریں حاصل کر لیتا ہے۔

مسٹر رائے جب تک زندہ رہے ۔ان کے ذریعہ ریاست کے لئے کافی اور بہت اچھی خبروں کا مواد ملتا رہا۔آپ ہر جرنلسٹ کے لئے مفید تھے۔کوئی دن ایسا نہ جاتا کہ آپ کے گھر چائے یا ڈنر میں چند جرنلسٹ یا گورنمنٹ آف انڈیا کے چند بڑے حکام شامل نہ ہوتے ۔ کیا پر لطف زمانہ تھا۔آہ ، دہلی کے جرنلسٹ مرحوم مسٹر رائے کے اخلاص، مہربانی ،شفقت اور امداد سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو گئے ۔ اور جرنلسٹوں کا حلقہ آپ کی موت سے اب تک ایک یتیمی محسوس کرتا ہے۔

''ریاست'' کے لئے خبریں حاصل کرنے کے سلسلے میں بہت سے واقعات بے حد دلچسپ ہیں جگہ کم ہونے کے باعث یہاں ایک واقعہ درج کیا جاتا ہے۔

مرحوم قاضی سر عزیز الدین احمد وزیر اعظم دیتا ایڈیٹر ''ریاست'' پر اس طرح مہربانی فرماتے تھے ۔ جیسے اپنے عزیزوں پر ۔آپ مہینہ میں ایک ادھ بار دہلی ضرور آتے ۔آپ کا اثر پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ پر بہت تھا۔ ہر انگریز افسر آپ کو بزرگ اور خیر خواہ سمجھتا ۔درجنوں والیان ریاست آپ سے سفارشیں کراتے ۔آپ جب بھی دہلی تشریف لاتے ،اسٹیشن پر اترتے ہی ریلوے انکوائری آفس سے ایڈیٹر ریاست کو ٹیلی فون کرتے کہ آپ پہنچ گئے ہیں۔قاضی صاحب سے ملنے کا بہترین وقت صبح پانچ بجے سے سات بجے تک کا تھا۔آپ علی الصبح چار بجے بیدار ہوتے اور اسی وقت ان کے خاص خاص دوست ملنے کے لئے پہنچ جاتے ۔ باتیں کرنے میں دانت صاف کرتے ،حجامت بنواتے ۔(قاضی صاحب مرحوم بہت وضعدار بزرگ تھے ۔) دہلی میں آپ کی حجامت کے لئے سال ہا سال سے وہی حجام آتا ۔جس نے کنگ جارج ، کنگ ایڈورڈ ، درجنوں وائسرائے ، کمانڈر انچیفوں ممبران انتظامیہ کونسل اور

کنگ حبیب اللہ آف افغانستان وغیرہ کی حجامت بنوائی تھی ۔ مجھے یاد ہے اس حجام کو حجامت بنوانے کے بعد قاضی صاحب ہر روز پانچ روپے دیا کرتے تھے ۔ منہ ہاتھ دھوتے، خطوط لکھواتے اور دوسرے کام کرتے، ایڈیٹر ریاست کا معمول تھا کہ جب تک قاضی صاحب دہلی میں قیام کرتے ۔ صبح پانچ بجے ان کے کمرہ سیسل ہوٹل پہنچ جاتا اور سات بجے تک وہیں رہتا۔ پھر شام کو کبھی پانچ، چھ بجے اپنی کار میں قاضی صاحب کو سیر وغیرہ کے لئے نئی دہلی لے جاتا۔ صبح کے دو گھنٹہ میں قاضی صاحب اپنے پچھلے دن کی تمام مصروفیات اور والیان ریاست، پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے حالات بیان کرتے رہتے، جو ریاست کے کئی صفحوں کے لئے کافی مواد ہوتا۔

ایک دن قاضی صاحب نے فرمایا کہ آپ ڈپٹی سیکرٹری پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ گورنمنٹ ہند کے ہاں چائے پر گئے تھے ۔ تو باتوں باتوں میں ڈپٹی سیکرٹری نے بتایا، کہ نواب بھوپال جب ولایت گئے ۔ تو نواب صاحب نے بطور چانسلر والیان ریاست وزیر ہند سر سیموئیل ہور سے درخواست کی کہ اخبار ریاست سے والیان ریاست بہت تنگ ہیں ۔ اگر معمولی قانون اخبار ریاست کے خلاف کاروائی کے لئے کافی نہیں تو وائسرائے ایک آرڈیننس کے ذریعہ ہی اس اخبار کو بند کردیں ۔ سر سیموئیل ہور نے وائسرائے کو لکھا کہ نواب بھوپال کو اور ایڈیٹر ریاست کے زاتی جھگڑے ہیں ۔ گورنمنٹ کو ان میں دخل دینے کی ضرورت نہیں ۔ ایڈیٹر ریاست نے اس واقعہ کو کہ نواب بھوپال نے وزیر ہند سے کیا کہا ہے ۔ اور اس کا نتیجہ کیا نکلا ہے ۔ ریاست میں شائع کردیا۔ اس خبر کا شائع ہونا تھا کہ بھوپال کے حلقہ میں ہلچل مچ گئی ۔ مرحوم کرنل امیر احمد ملٹری سیکرٹری نواب بھوپال دہلی آئے ۔ اور سر چارلس وانسن پولیٹیکل سیکرٹری سے ملے ۔ اس راز کی خبر شائع ہونے کے خلاف سخت پروٹسٹ کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ گورنمنٹ ہند نے دہلی گورنمنٹ کو لکھا کہ ایڈیٹر ریاست کے خلاف آفیشیل سیکرٹ ایکٹ (قانون رازداری) کے ماتحت مقدمہ چلایا جائے ۔ اس زمانہ میں دہلی کے

چیف کمشنر سر جان تھا مپسن تھے۔آپ پانچ سال تک پولیٹیکل سیکرٹری گورنمنٹ ہندرہ چکے تھے۔اور تمام والیان ریاست کے اعمال سے اچھی طرح واقف ہونے کے ساتھ ریاست کے بہت بڑے مداح تھے۔آپ نے گورنمنٹ ہندکو جواب دیا کہ یہ اتنا اہم معاملہ نہیں کہ ایڈیٹر ریاست کے خلاف مقدمہ چلایا جائے۔صرف تنبیہ کافی ہے۔ چنانچہ تنبیہ یعنی وارننگ کے لئے آپ نے ڈپٹی کمشنر کو ہدایت کی۔ڈپٹی کمشنر کا حکم ایڈیٹر ریاست کو پہنچا۔ کہ فلاں تاریخ اور فلاں وقت ڈپٹی کمشنر کی کوٹھی پہنچو۔ایڈیٹر ''ریاست'' جب وہاں گیا تو ڈپٹی کمشنر نے کہا یہ خبر غلط ہے،اس لیے آپ کو وارننگ دی جاتی ہے کہ آپ آئندہ ایسی خبریں شائع نہ کرو۔ایڈیٹر ''ریاست'' نے جواب دیا کہ خبر تو بالکل درست ہے۔ہاں وارننگ دینا آپ کا فرض ہے۔چنانچہ اس وارننگ سے اس مقدمہ کا خاتمہ ہوا۔

ان کے اوپر کے دو واقعات سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ ایک جرنلسٹ کے لئے خبریں حاصل کرنا کتنا مشکل ہے۔کوئی خبر حاصل کی جائے تو اس کو شائع نہ کرنا اور صبر سے اس کو اپنے ذہن میں محفوظ رکھنا ایک اخبار نویس کے لئے کتنا تکلیف کا باعث ہے۔اور خبریں چھپنے کے بعد کیوں کر مقدمے دائر کیے جاتے ہیں۔

کام کرو روپیہ کی کمی نہیں

بعض لیڈر اور اخبار نویس زندگی بھر روتے ہیں۔ اور پبلک پر قدر ناشناسی کا الزام لگا کر ہمیشہ ہی چلاتے رہے کہ روپیہ نہیں کام کیوں کر کریں۔ مگر راقم الحروف کو صرف اپنی ذات کے متعلق نہیں بلکہ دوسرے تمام لیڈروں اور اخبار نویسوں کے متعلق بھی یہ تجربہ ہے کہ اگر اخلاص اور ایمان داری کے ساتھ کام کیا جائے تو پبلک روپے کی تھیلیاں اور کرنسی نوٹوں کے بنڈل لے کر کام کرنے والوں سے درخواستیں کرتی ہے کہ قبول کرلو۔ اور اگر کوئی لیڈر یا اخبار نویس خود غرض ہے تو وہ روپے کے لئے لوگوں کے پیچھے مارا مارا پھرتا ہے۔ مگر اس کو روٹی کا ایک ٹکڑا بھی نصیب نہیں ہوتا۔ آپ دیکھیے کیا مہاتما گاندھی۔ پنڈت جواہر لال نہرو۔ مسٹر جناح اور مسٹر تارا سنگھ یا دوسرے مخلص کام کرنے والوں کو کبھی بھی روپیہ کی کمی ہوئی۔ اور کبھی انہوں نے ہاتھ پھیلایا۔

تو کیا لاکھوں اور کروڑوں روپیہ ان کے پاس نہیں پہنچ گیا۔ ان لیڈروں کو بھی چھوڑیئے، مولانا ظفر علی خان جیسے اخبار نویسوں کو پبلک نے شروع شروع میں کتنا روپیہ ضمانتوں کے لئے دیا۔ ہمارے اس لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ اگر کام کرنے والے اپنی زاتی اغراض سے بالاتر رہ کر پبلک کا کام کریں تو ان کو روپیہ کی کبھی بھی کمی نہیں ہوتی۔ اور اگر مقصد پبلک روپیہ سے ذاتی جائدادیں بنانا ہے۔ تو پھر پبلک سے روپے کے توقع کرنا بے انصافی ہے۔ پبلک روپیہ کیوں دے؟۔

ریاست جب جاری کیا گیا تو ایڈیٹر ’’ریاست‘‘ کے پاس کل ڈیڑھ ہزار روپیہ تھا۔ اور یہ ڈیڑھ ہزار روپیہ مرحوم سردار کیسر سنگھ کلسی ٹھیکدار کی معرفت انبالہ چھاونی کے ایک بنیئے کے پاس زیور رکھ کر قرض لیا گیا تھا۔ یہ پندرہ سو روپیہ تو غالباً تین ماہ کے اندر صرف ہو گیا۔ اس کے بعد درجنوں بار مالی پریشانیاں پیش آئیں اور ان پریشانیوں کی وجہ روپے کو بے دردی سے خرچ کرنا تھا۔ کیونکہ ایڈیٹر ’’ریاست‘‘ اپنی فطرت سے مجبور ہے۔ ورنہ واقعہ یہ ہے کہ ریاست کو آج تک کبھی نہ روپے کی کمی محسوس ہوئی اور نہ ہی

روپیہ دینے والے قدردانوں کی۔

کئی برس پہلے کی بات ہے۔ریاست کو شائع ہوئے شاید چار ماہ ہوئے تھے۔دفتر ریاست جامع مسجد کے بالکل سامنے مچھلی والاں بازار کی ایک بلڈنگ میں تھا۔دوپہر کا وقت تھا۔ایک بارعب جسم والے مسلمان سوٹ پہنے تشریف لائے۔ان کے ساتھ ان کے دو ملازم بھی تھے۔ایڈیٹر ''ریاست'' نے سمجھا کہ شاید پولیس کے کوئی آفیسر ہیں۔اور وارنٹ لے کر آئے ہیں۔آپ نے آتے ہی پوچھا کہ سردار دیوان سنگھ کہاں ہیں۔راقم الحروف نے جواب دیا،فرمایئے میں ہی دیوان سنگھ ہوں۔میرے پاس کاتب اور دفتر کے سٹاف کے دوسرے لوگ بیٹھے تھے۔آپ نے فرمایا علیحدگی میں بات کرنا چاہتا ہوں۔ دفتر کا ایک ہی بڑا کمرہ تھا۔ میں ان کو برآمدہ میں لے گیا، ہم وہاں کھڑے تھے کہ آپ نے اپنی جیب سے ایک بند لفافہ نکالا اور مجھے دے کر کہا:

''میں آپ کے اخبار کا معترف ہوں،لہذا یہ آپ کے اخبار کی امداد کے لئے ہے۔

میں نے پوچھا آپ کون صاحب ہیں۔اور دہلی کیسے تشریف لائے ہیں۔آپ نے بتانے سے انکار کر دیا اور چلے گئے۔اس واقعہ کے ایک سال بعد معلوم ہوا کہ آپ یوپی کے ایک خان بہادر اور ڈپٹی کلکٹر پنشنر تھے۔

ایڈیٹر اور ''ریاست'' پر نوٹوں کا مقدمہ چل رہا تھا کہ لاہور سے ایک خط پہنچا۔یہ ایک مسلمان کا خط تھا۔اس میں لکھا تھا کہ اگر روپے کی ضرورت ہے تو لکھو کتنا روپیہ چاہیئے۔میرا خیال ہے کہ اس زمانہ میں تو میں نے جواب نہیں دیا تھا۔اس کے بعد جب ریاست کو دوبارہ جاری ہونے کا انتظام ہو رہا تھا۔اور بکھرے ہوئے کاغذات کو دوبارہ درست کر رہا تھا۔تو یہ خط دوبارہ نظر سے گزرا۔ان کو لکھا کہ آپ کون صاحب ہیں اور آپ کے لکھنے کا کیا مقصد تھا؟۔تو معلوم ہوا کہ آپ کا نام شیخ محمد عمر تھا۔لاہور میں چمڑے کا کاروبار کرتے ہیں اور ریاست کے پرانے معترف ہیں۔چنانچہ جب آپ کو معلوم ہوا کہ ریاست دوبارہ جاری ہونے والا ہے تو آپ نے امپریل بنک کا

ایک ڈرافٹ بھیجا جو کافی معقول رقم کا تھا۔ میں ان صاحب سے آج تک نہ کبھی ملا ہوں اور نہ ہی انہیں جانتا ہوں۔ ان کے خط سے معلوم ہوا کہ یہ خود ان کی والدہ اور گھر کے دوسرے لوگ ریاست کے معترف ہیں۔

نوٹوں کا مقدمہ چل رہا تھا کہ ریلوے اسٹیشن پر ایک دوست ملے انہوں نے بتایا کہ گورنمنٹ آف انڈیا کے بڑے افسر جو خطاب یافتہ سر ہیں ملنا چاہتے ہیں۔ میں نے پوچھا کیا کام ہے۔ جواب ملا کام کا تو علم نہیں بس ملنا چاہتے ہیں۔ میں دوسرے یا تیسرے روز ان صاحب سے ملنے گیا مقدمہ کے حالات پوچھتے رہے اور باتیں ہوتی رہیں۔ جب چلنے لگا تو ایک بند لفافہ دیا اور کہا کہ مقدمہ کے باعث بہت روپیہ خرچ ہو رہا ہوگا۔ یہ دوستانہ ہدیہ ہے۔ میں نے بار بار انکار کیا۔ آپ نے مانے تو آخر کہا کہ اگر نہ لوگے تو بہت تکلیف ہوگی۔ اور لفافہ میری جیب میں زبردستی ڈال دیا۔

ستمبر ۱۹۴۳ء میں جیل سے رہا ہو کر آیا اور اخبار جاری کرنے کی فکر میں تھا کہ دریا گنج ایک جرنلسٹ دوست سے ملنے گیا۔ دیر تک باتیں ہوتی رہیں، جب چلنے لگا تو آپ نے جو الفاظ کہے، ان کو میں شاید نہ بھلا سکوں۔ آپ نے فرمایا:

''پچھلے زمانہ میں ایک بہت بڑا یگیہ ہوا۔ جس میں لاکھوں یا کروڑوں روپے صرف ہوئے۔ ایک کوا اپنی چونچ میں ایک چاول لے آیا، اور اسے یگیہ میں ڈال دیا۔ تا کہ وہ یگیہ کی خدمت اور سعادت سے محروم نہ رہے۔ ریاست کا جاری ہونا بھی ایک یگیہ ہے۔ اس لیے میری درخواست ہے کہ اس کے لئے یہ رقم قبول کر لیجیے۔

خلوص ومحبت کے ان الفاظ کو سن کر مجھ پر ایک ناقابل بیان سی کیفیت طاری ہوگئی۔ میں نے کہا ان لفظوں کی قیمت کروڑوں سے بھی زیادہ ہے۔ میں روپیہ نہیں لیتا۔ آپ نے بار بار اصرار کیا اور میں انکار کرتا ہوا چلا آیا۔ آپ پھر بھی باز نہ آئے اور اپنے دفتر کے ایک آدمی کے ہاتھ چیک بھیج دیا۔

میری زندگی میں اس قسم کے دو چار، دس بیس نہیں سینکڑوں واقعات ہیں کہ

دوستوں اور معترفین نے چاہے ان سے کبھی ملا ہوں یا نہیں فراخ دلی کے ساتھ ریاست کی امداد کی۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ جب جیل سے باہر آیا تو خیال تھا کہ اخبار کو دوبارہ جاری کرنے کے لئے روپیہ کی ضرورت ہوگی۔ اور اس روپیہ کے لئے وطن کی ایک زمین فروخت کردوں گا۔ زمین کا ابھی سودا ہی ہو رہا تھا۔ ابھی فروخت نہ ہوئی تھی۔ مگر اخبار کی ڈھائی ہزار روپے کی ضمانت بھی داخل کر دی گئی۔ اخبار بھی جاری ہو گیا اور کام چل نکلا۔

میرے اس لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ پبلک کا کام کرنے والے جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ان کو کام کرنے کے لئے روپیہ نہیں ملتا۔ وہ اپنے آپ کو دھوکہ دیتے ہیں۔ ان میں اخلاص اور ایمان داری کی کمی ہے۔ پبلک آواز پبلک کام کرنے والوں کے ایمان اور اخلاص کا سب سے بڑا تھرمامیٹر ہے۔ اور کام کرنے والوں کے ایمان کا پتا پبلک کی آواز ہی سے لگایا جاتا سکتا ہے۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ پبلک کی آواز کبھی غلط نہیں ہوتی۔ کام کرنے والوں کا جیسا اعمال نامہ ہوگا۔ ویسی ہی ان کے متعلق پبلک کی آواز اور شہرت ہوگی۔ گاندھی جی نے اپنی لمبی زندگی میں کبھی پبلک سے یہ نہیں کہا کہ وہ نیک ہیں۔ مگر کیا دنیا میں ایک شخص بھی ایسا ہے۔ جو ہزار اختلاف کے باوجود آپ کو نیک نہ سمجھے، برخلاف اس کے حسن نظامی نے اپنے اخبار ''منادی'' میں دن رات اپنی تعریفیں کرتے تھے۔ مگر کیا ایک شخص بھی آپ کو ایسا ملے گا جو آپ کو سیاسی چار سو بیس اور مذہبی فراڈ نہ سمجھتا ہو۔ یعنی دنیا نیک کہلوانے کی کوشش نہ کرنا چاہیئے بلکہ نیک بننا چاہیئے۔ انسان نیک ہوگا تو دنیا خود بخود نیک کہے گی۔ اسی طرح جو لوگ پبلک کے روپیہ کو ٹرسٹ کی امانت سمجھیں گے اس کو اپنی ذاتی اغراض کے لئے استعمال نہ کریں گے۔ ان کو پبلک کے کاموں کے لئے روپیہ کی کبھی کمی نہ ہوگی۔ جو لوگ چار سو بیس کے ذریعے پبلک کی جیب خالی کر کے اپنی ذاتی جائیدادیں بنا لیں گے۔ وہ ہمیشہ ہی گداگر رہیں گے۔ اور ان کے کاسہ میں ٹکڑا پہنچنے کا کوئی امکان نہیں، کمزوری ہے تو ہم کام

کرنے والوں میں نہ کہ پبلک والوں کو میں یعنی جو لوگ قومی میدان میں کام کرنا چاہتے ہیں۔انہوں نے اگر اخلاص اور ایمان داری کا ساتھ نہ چھوڑا تو روپیہ ان کے ساتھ ہے۔اور اگر ان کی پبلک لائف میں خود غرضی اور بے ایمانی ہے تو ان کے لئے پبلک کے پاس نہ روپیہ ہے نہ شہرت۔

کریکٹر کا دشمنوں پر بھی اثر ہوتا ہے

مجھے ٹھیک تو یاد نہیں مگر غالباً ۱۹۳۰ء کا واقعہ ہے۔ دفتر ریاست" اجمیری دروازہ کے باہر ایک بلڈنگ میں تھا۔ گرمی کا زمانہ تھا۔ صبح دس بجے کے قریب میرے ایک بزرگ تشریف لائے، جو رائے بہادر ہیں۔ میری برادری میں سے ہیں۔ اس زمانہ میں گورنمنٹ آف انڈیا کے انٹیلی جینس ڈیپارٹمنٹ (سی، آئی، ڈی) میں سپرنٹنڈنٹ پولیس تھے، اب ریٹائر ہو چکے ہیں۔ یہ رائے بہادر وطنی تعلقات کے باعث پہلے بھی کبھی کبھی تشریف لایا کرتے تھے۔ جب یہ کمرہ میں پہنچے تو میں ان کو ڈرائنگ روم میں لے آیا۔ باتیں ہوتی رہیں تو آپ نے فرمایا کہ میں ایک بات کہنا چاہتا ہوں، کسی دوسرے کمرے میں چلیے تو میں ان کو ڈرائنگ روم میں لے آیا، اور کہا فرمایئے۔ ان رائے بہادر صاحب اور راقم الحروف کے درمیان جو بات چیت ہوئی، مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ رائے بہادر نے کہا راجہ بھرت پور آپ کے دوست ہیں، اور آپ ان سے ملتے رہتے ہیں۔ مہاراجہ نے اس تمام خط و کتابت کو ایک کتابی صورت میں چھاپ کر شائع کر دیا ہے۔ جو مہاراجہ اور پولیٹیکل ایجنٹ کے درمیان ہوتی رہی۔ گورنمنٹ کی اس میں بہت بدنامی ہوئی، کیونکہ یہ کتابیں ہندوستان کے لیڈروں کو بھیجی گئیں۔ اب مہاراجہ نے پولیٹیکل ایجنٹ کے کلرکوں کو رشوت دے کر اس تمام خط و کتابت کی نقلیں حاصل کر لیں۔ جو کانفیڈنشل طور پر ایجنٹ گورنر جنرل راجپوتانہ اور پولیٹیکل سیکرٹری گورنمنٹ ہند کے درمیان مہاراجہ کے متعلق ہوتی رہی۔ اور مہاراجہ اس کو بھی کسی پریس میں چھپوا رہے ہیں۔ گورنمنٹ اس کے متعلق بہت متفکر ہے۔ کیونکہ یہ کارسپانڈنس کانفیڈنشل تھی۔ آپ کے ذرائع بہت وسیع ہیں اور پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے کلکروں سے آپ بھی اطلاعیں حاصل کرتے رہتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں آپ ایک تو یہ پتا کر لیجیے کہ مہاراجہ نے یہ نقلیں پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے کس کس کلرک کے ذریعے حاصل کی ہیں۔ تاکہ ان پر آفیشیل سیکرٹ ایکٹ کے تحت مقدمہ چلایا جائے۔

اور دوسرے یہ پتا لے دیجیئے کہ مہاراجہ یہ کتاب کس پریس میں چھپوا رہے ہیں ۔ تا کہ ہم چھاپہ مار کر یہ کتاب شائع ہونے سے پہلے ضبط کر لیں ۔ میں اس مقصد کے لئے ہی شملہ سے آیا ہوں ۔ رائے بہادر نے اپنی جیب سے نوٹوں کی ایک گڈی نکالی اور کہا کہ یہ روپیہ آپ کے اخراجات کے لئے ہے ۔ کیونکہ شاید کچھ لوگوں کو روپیہ دینا پڑیا ور شاید آپ کو کہیں آنے جانے کی بھی ضرورت ہو ۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ روپیہ کتنا تھا، پانچ ہزار، سات ہزار یا دس ہزار ۔ یہ گڈی نصف اور ایک انچ کے درمیان موٹائی میں تھی ۔

میں نے رائے بہادر سے کہا کہ اس کا مطلب ہے میں آپ کا پیڈ انفارمر ہوں ۔ اور آپ مجھے اس قدر ذلیل اور کمینہ سمجھتے ہیں کہ میں آپ سے روپیہ لے کر مہاراجہ بھرت پور اور دوسرے دوستوں کے ساتھ غداری کروں گا ۔ اور آپ کی سی، آئی، ڈی کی مخبری کی خدمات سر انجام دوں گا ۔ رائے بہادر نے نوٹوں کی وہ گڈی میرے کوٹ (مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس زمانہ میں میں نے کھدر کے سوٹ سلوائے تھے ۔ اور وہ کوٹ کھدر ہی کا تھا) میں ڈالنے کی کوشش کی اور کہا تم بے وقوف ہو، گورنمنٹ کافی روپیہ لیڈروں اور اخباروں کو دیتی ہے ۔ اس میں کوئی ہرج نہیں ۔

رائے بہادر کو میں نے جواب دیا کہ اگر لیڈر اس قدر کمینہ ہو تو ہو، مگر میں اس قدر کمینہ نہیں ۔

رائے بہادر میرے اس جواب سے مطمئن نہیں ہوئے ۔ آپ نے پھر آگے بڑھ کر نوٹوں کی وہ گڈی میرے کوٹ کی جیب میں ڈالنے کی کوشش کی تو میں پیچھے ہٹ گیا ۔ اور پیشانی پر بل ڈالتے ہوئے میں نے نیم غصہ اور نیم سنجیدگی کی حالت میں رائے بہادر سے کہا، رائے بہادر صاحب آپ اس میں کوئی ہرج نہیں سمجھتے، مگر میں سمجھتا ہوں اور میرا ایمان ہے کہ اگر کوئی شخص اخبار نکالتے ہوئے یا پبلک ورکر ہوتے ہوئے گورنمنٹ سے روپیہ لے کر مخبری کرتا ہے تو اس سے بہتر یہ ہے کہ وہ اپنی ماں کو چاوڑی بازار میں بٹھا کر پیشہ کرائے ۔ اور روپیہ حاصل کرے ۔ رائے بہادر میرے

ان الفاظ کو سن کر سکتہ میں رہ گئے ۔ ان کا ہاتھ میری جیب کی بجائے نوٹوں سمیت اپنی جیب کی طرف چلا گیا۔ اور ہم پھر ڈرائنگ روم میں واپس چلے آئے ۔ ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر رائے بہادر نے کھسیانہ پن سے ایک بار پھر کہا کہ تم کوشش کرنا کہ یہ اطلاعیں حاصل ہو سکیں، میں نے پھر جواب دیا کہ یہ میرے بس کی بات نہیں اور چند منٹ بعد آپ واپس تشریف لے گئے ۔

سی، آئی، ڈی اور پولیس کے چھوٹے اور ادنیٰ لوگ تو اپنی کارگزاری دکھانے کے لئے اپنے افسروں کو بہت جھوٹی اور غلط رپورٹیں دیتے ہیں ۔ مگر بڑے افسر اپنی ذمہ داری کو محسوس کرتے ہوئے اپنے بڑے افسروں کے پاس جھوٹی رپورٹیں نہیں کرتے ۔ کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ اگر جھوٹے ثابت ہوئے تو ان کے لئے ندامت کا باعث ہوگا۔ رائے بہادر نے وہ تمام بات چیت جوان کے اور ایڈیٹر ریاست کے درمیان ہوئی تھی ۔ من وعن اپنے افسر سر ڈیوڈ پیٹری ڈائریکٹر انٹیلی جینس بیورو جو اس زمانہ میں تمام ہندوستان کی سی آئی ،ڈی کے اعلیٰ ترین افسر اور اپنی دیانت داری اور قابلیت کے باعث بعد میں پریذیڈنٹ فیڈرل پبلک سروس کمیشن مقرر ہوئے کو پہنچا دی۔

گرمیوں کا موسم ختم ہوا۔ سردیاں شروع تھیں ۔ اور گورنمنٹ آف انڈیا شملہ سے دہلی آرہی تھی ۔ ایک روز شام کو ایک بہت لمبے قد کے مسلمان سوٹ اور ہیٹ پہنے ہوئے دفتر ریاست میں تشریف لائے ۔ میں اوپر اپنے ذاتی دفتر کے کمرے میں بیٹھا کام کر رہا تھا۔ آپ نے چپڑاسی سے پوچھا کہ دیوان سنگھ کہاں ہیں؟ ۔ چپڑاسی نے جواب دیا ۔ اوپر، پھر بڑی بے تکلفی سے اوپر میرے ذاتی دفتر کے کمرے میں چلے آئے ۔ میں ان کے خیر مقدم کے لئے اٹھ کھڑا ہوا، اور ساتھ والے ڈرائنگ روم میں لے آیا۔ ڈرائنگ روم بیٹھتے ہی آپ نے بڑی بے تکلفی سے کہا۔ ارے بھائی چائے منگاؤ۔ میں نے بجلی کا بٹن دبایا۔ چپڑاسی آیا۔ اس سے کہا باورچی کو بھیجو۔ اس زمانہ میں میرے پاس گوا کا رہنے والا باورچی کویلو تھا۔ کویلو سے میں نے کہا کہ چائے لاؤ۔ مگر

سوچ رہا تھا کہ یہ کون صاحب ہیں۔ شاید پہلے کبھی ان سے مل چکا ہوں۔ کس ریاست کے وزیر ہیں۔ کہاں ملا ہوں؟۔ یہ سوچ رہا تھا کہ آپ نے خود ہی مسکرا کر کہا۔ شاید آپ نے مجھے پہچانا نہیں۔ میں جھجکتے ہوئے کہا جی ہاں مجھے یاد نہیں پڑتا۔ کہ آپ سے کہاں نیاز حاصل ہوا تھا؟۔ آپ نے ذرا زیادہ مسکراتے ہوئے فرمایا کہ میں تصدق حسین ڈپٹی ڈائریکٹر انٹیلی جینس بیورو ہوں۔ اور آپ کے ہم وطن رائے بہادر کے ساتھ کام کرتا ہوں۔ میں نے کہا بہت مہربانی فرمائی آپ نے۔ میں آپ کے نام سے تو واقف تھا۔ مگر آپ سے نیاز حاصل کرنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا تھا۔ خان بہادر تصدق حسین نے کہا کہ میں اور میرے سر ڈیوڈ پٹیری کے دل میں آپ کی بہت عزت ہے۔ رائے بہادر نے رپورٹ میں وہ سب کچھ لکھ دیا تھا۔ جو آپ کے اور ان کے درمیان بات ہوئی۔ ہم لوگ آپ کے کریکٹر کے بہت مداح ہیں۔ اور اسی لیے آپ سے ملنے آیا ہوں۔ یہ افسوس ناک واقعہ ہے کہ ہندوستان کے لیڈروں اور اخبار نویسوں میں کثرت ایسے لوگوں کی ہے۔ جن کا کوئی کریکٹر نہیں۔ جو بہت تھوڑی رقم سے خریدے جاسکتے ہیں۔ اور ان میں بعض ممبران اسمبلی بھی ہیں۔ یہ لوگ گو ہمارے لئے مفید ہوتے ہیں۔ مگر کریکٹر نہ ہونے کے باعث ہمارے دل میں ان کی کوئی عزت نہیں ہوتی۔

خان بہادر چائے پیتے رہے اور باتیں ہوتی رہیں۔ اس روز نصف گھنٹہ کے قریب بیٹھے ہوں گے۔ چار روز کے بعد آپ نے مجھے ڈنر پر بلایا۔ اس کے بعد یہ کبھی کبھی تشریف لایا کرتے۔ اور میں جب کبھی شام کو نئی دہلی ان کی سڑک پر سیر کو جاتا تو ان کی کوٹھی پر ان سے ملنے حاضر ہوتا۔ اور تعلقات بہت گہرے ہو گئے۔ خان صاحب بہت مخلص، بہت محبت والے اور بہت ہمدرد اور مخلص انسان تھے۔ کچھ عرصہ بعد میرے اور ان کے بھائیوں جیسے تعلقات ہو گئے۔ مجھے یاد ہے کہ انتقال سے چند روز پہلے بیمار ہو گئے۔ راجہ اکبر علی صاحب کی کوٹھی پر مقیم تھے۔ میں ہوشنگ آباد مقدمہ کی

پیشی پر جا رہا تھا۔ ملنے کے لئے گیا۔ آپ کو پلورسی کے باعث سخت تکلیف تھی۔ جب آنے لگا، اٹھ نہ سکے۔ لیٹے لیٹے ہاتھ پھیلا دیئے۔ اور آنکھوں میں آنسو بھر کر فرمایا کہا کہ اچھا بھائی جاؤ، اب تو شاید ملاقات نہ ہو سکے۔ یہ سن کر میرے بھی آنسو نکل آئے۔ میں ہوشنگ آباد چلا گیا۔ وہاں مقدمہ کے لئے آٹھ، دس روز کی مسلسل تاریخیں تھیں۔ پہنچنے کے چار یا پانچ روز بعد سٹیٹس مین میں پڑھا کہ آپ کا انتقال ہو گیا۔ اور گورنمنٹ ہند کا غیر معمولی گزٹ سیاہ حلقہ کے ساتھ شائع ہوا۔

خان بہادر تصدق حسین انتقال کر گئے۔ سی آئی، ڈی کے ذلیل محکمے میں سپرٹنڈنٹ پولیس اور ڈپٹی ڈائریکٹر انٹیلی جینس بیورو گورنمنٹ ہند تھے۔ مگر طبعاً اتنے اچھے دیانت دار، مخلص اور بلند انسان کہ ان کے قدموں پر درجنوں وہ کانگرسی قربان کیے جا سکتے ہیں۔ جو اپنی ذاتی اغراض کے لئے قومی میدان میں موجود ہیں۔ مرحوم کے انتقال کو کئی سال ہو گئے۔ مگر جب بھی یاد آتا ہے۔ آنکھیں تر ہو جاتی ہیں۔

ان تمام حالات کے بتانے کا مقصد یہ ہے کہ اگر انسان کے اندر کریکٹر ہو تو اس کے دشمنوں کے دل میں بھی اس کی عزت ہوتی ہے۔ اور اگر انسان کے اندر کریکٹر نہ ہو تو اس کے دوست، احباب، ماں باپ، بھائی، بہن اور عزیز بھی اس سے نفرت کرتے ہیں۔ چاہے یہ لوگ اپنی اغراض کے لئے اس کے منہ پر اس کی تعریف ہی کیوں نہ کریں۔

راجپوتانہ کے قومی ورکر اور لیڈر شری رام نرائن چودھری اپنا زیادہ وقت مہاتما گاندھی کے پاس گزارتے۔ جب کبھی وہ دہلی تشریف لاتے تو ریاست کے دفتر میں بھی آتے اور کئی کئی گھنٹے مہاتما گاندھی کے حالات کا ذکر ہوتا۔ ان کا بیان ہے کہ باوجود اس بات کے کہ مسٹر جناح کی مسلم لیگی پالیسی ملک اور کانگرس کے لئے انتہائی نقصان کا باعث ہے۔ مگر مہاتما گاندھی کے دل میں مسٹر جناح کی بہت عزت ہے۔ اور مہاتما گاندھی پرائیویٹ سے پرائیویٹ دوستوں میں بھی جب کبھی مسٹر جناح کا

ذکر کرتے ہیں تو انتہائی عزت اور محبت کے ساتھ۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ مہاتما گاندھی سمجھتے ہیں کہ مسٹر جناح کے اندر کریکٹر ہے۔ گورنمنٹ کسی قیمت پر بھی ان کو خرید نہیں سکتی۔ اور یہی وجہ ہے کہ گورنمنٹ نے مسٹر جناح کو کبھی بھی اپنا نہ سمجھا۔ اور آپ سے گورنمنٹ ہمیشہ بدکتی ہی رہی۔ جناح کے مقابلہ میں جن کانگرسیوں کے اندر کریکٹر نہیں، مہاتما جی ان کو چوروں سے زیادہ بدتر اور ذلیل سمجھتے ہیں۔ مگر بے بس ہیں، ان کے خلاف کچھ کر نہیں سکتے۔

جو لوگ پبلک میں عزت اور شہرت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے لئے سب سے زیادہ ضروری ہے کہ وہ اپنے اندر کریکٹر پیدا کریں۔ دنیا میں روپیہ اور دولت ہی سب کچھ نہیں ہوتا۔ انسان کو اپنی عزت پر روپیہ قربان کرنا پڑتا ہے۔ اور عزت تب ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ جب انسان میں کریکٹر ہو۔ غور کیا جائے تو اس شخص سے جس کے اندر کریکٹر نہیں، جو دوستوں کے ساتھ بھی بداعتماد ہے۔ بددیانت ہے۔ اور جو قومی غدار ہے۔ بازار کا ایک آوارہ کتا بھی اچھا ہے۔ جو اپنے دوست اور دشمن میں تمیز کرتا ہے۔ اور دوستوں کے ساتھ غداری نہیں کرتا۔

اچھے لوگ اپنے ہم وطنوں کے لئے باعث عزت ہیں

ایڈیٹر ریاست گوجرانوالہ کے ضلع کا رہنے والا ہے ۔اس ضلع نے سینکڑوں کی تعداد میں اخبار نویس، مصنف اور علم دوست حضرات پیدا کیے ہیں ۔ چنانچہ اس ضلع کے رہنے والوں ایڈیٹروں اور مصنفین میں مولوی محبوب عالم ایڈیٹر پیسہ اخبار، مولانا ظفر علی خان ایڈیٹر زمیندار، لالہ دینا ناتھ ایڈیٹر دیش و ہندوستان، لالہ پنڈی داس، حضرت وارث شاہ مصنف ہیر، راجہ مہدی علی خان، مسٹر حامد علی، مہا تما نند گو پال، اور مولوی نصر اللہ خان عزیز ایڈیٹر کوثر وغیرہ درجنوں شخصیتیں ہیں جنہوں نے علم و ادب کی بہت خدمات انجام دی ہیں ۔

ایڈیٹر ریاست جن دنوں لکھنو کے اخبار ہمدم میں کام کرتا تھا ۔ دوسرے تیسرے روز سہ پہر کے بعد منشی نوبت رائے صاحب نظر سابق ایڈیٹر ادیب الہ آباد کی خدمت میں بھی حاضر ہوا کرتا ۔نظر صاحب اس زمانہ میں اردو کے ایک بہترین ادیب اور شاعر تسلیم کیے جاتے تھے ۔اس زمانہ میں آپ روزانہ اودھ اخبار کے ایڈیٹر تھے ۔اور پنجاب کے اخبار نویسوں اور مصنفین کے حالات سے خوب واقف تھے ۔ ایک روز باتوں باتوں میں آپ نے مجھ سے پوچھا کہ وطن کہاں ہے؟ ۔میں نے جواب دیا۔ پنجاب ،پھر ضلع پوچھا میں نے کہا گوجرانوالہ، گوجرانوالہ کا نام سنتے ہی فرمایا کہ یہ کیوں نہیں کہتے کہ شیراز ہند کے رہنے والے ہو۔ کیونکہ ایران میں شیراز نے سینکڑوں علم دوست اور مصنف پیدا کیے۔اور ہندوستان میں گوجرانوالہ نے ۔

دعا اور بددعا کا اثر

مرحوم راجہ نابھ بہت بڑے قوم پرست اور لٹریری ذوق رکھنے والی علم دوست شخصیت تھے۔ان کے دشمن بھی ان کی صفات کا اقرار کرتے ہیں۔مگر ریاست نابھ کی ایڈمنسٹریشن اور دوسرے حالات کا جہاں تک تعلق ہے۔نابھ اور دوسری ریاستوں میں کوئی فرق نہ تھا۔

راقم الحروف جس زمانے میں مہاراجہ کے پاس ریاست نابھ میں ملازم تھا۔وہاں ایک سادھو برہمن رہا کرتے تھے۔

جن کا نام میں بھول گیا ہوں۔آنکھوں سے معذور تھے۔ایک طویل عرصہ تک سوامی دیانند بانی آریہ سماج کے ساتھ رہے۔اورانہوں نے سوامی جی سے سنسکرت پڑھی تھی۔یہ پنڈت جی اکثر ایڈیٹر ریاست سے ملنے آیا کرتے تھے۔اورسوامی دیانند کے چشم دید اور دلچسپ واقعات سنایا کرتے تھے۔پنڈت جی سادھوؤں کے لباس میں رہتے تھے۔بوڑھے ہو چکے تھے۔ان کے بیوی اور بچے بھی موجود تھے۔بچوں میں ایک لڑکی کا نام ایشر کور تھا۔اور لڑکے کا نام ایشر سنگھ تھا۔(یہ دونوں آج کل غالباً ڈیرہ دون میں رہتے ہیں۔)پنڈت جی کی بیوی کافی دبلی پتلی بوڑھی اور کمزور سی تھیں۔

مہاراجہ نابھ اپنے ایک اے ڈی سی سے ناراض ہو گئے۔اس اے ڈی سی کا ناجائز تعلق پنڈت جی کی صاحب زادی ایشر کور کے ساتھ تھا۔مہاراجہ کی ناراضی کے سبب جب یہ اے ڈی سی نابھ سے چلا گیا تو اس نے ایک عورت بھیج کر ایشر کور کو بھی اپنے پاس بلا لیا۔ایشر کور کے جانے کے بعد جب مہاراجہ کو علم ہوا تو پولیس نے پنڈت جی سے ایک درخواست لی،جس میں لکھا گیا کہ یہ اے ڈی سی ان کی دختر کو اغواہ کر کے لے گیا ہے۔باپ کی درخواست پر بیٹی اور اس کے آشنا کے خلاف وارنٹ گرفتاری جاری کیے گئے۔اوراس کے ساتھ ہی ایشر کور کی ماں یعنی بوڑھے پنڈت جی کی بیوی کو بھی اغواہ کے جرم میں مدد دینے کے جرم پر بغیر ضمانت لیے حوالات میں بند کر دیا گیا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ یہ ضعیفہ حوالات میں بند تھی۔ مئی، جون کا مہینہ تھا۔ چھت کے اوپر سونے والے بھی گرمی کی شدت سے تڑپتے تھے۔ مگر یہ خاتون بغیر کسی جرم یا قصور کے حوالات کے بند کمروں میں قید تھی۔ تمام رات سو نہ سکتی تھی۔ اور تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد جب یہ بلند آواز میں کہتی ''ہائے میں مر گئی'' ہائے میں بے قصور ہوں، ہائے میں بے گناہ ہوں۔ کہتی تو کوتوالی کے قریب سوئے ہوئے لوگوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے۔

ظلم کے کئی واقعات میں سے ایک یہ واقعہ ہے جس کو دیکھ کر ایڈیٹر ''ریاست'' کو نابھ کی ملازمت میں ہی یہ خیال پیدا ہوا کہ والیان ریاست کے مظالم کے خلاف آواز اٹھانی چاہیئے۔ اور اس مقصد کے لئے اخبار جاری ہو۔ اور ریاستوں میں انقلاب پیدا کیا جائے۔

اب تو نہ مہاراجہ نابھ دنیا میں موجود ہیں اور نہ ہی یہ ضعیف اور کمزور خاتون، مگر میرا یقین ہے کہ مہاراجہ نابھ کی تباہی کا باعث جن لوگوں کی بد دعائیں تھیں۔ ان میں اس بے گناہ اور بے قصور خاتون کا بھی کافی حصہ تھا۔

اس خاتون کا یہ واقعہ ہی اخبار ریاست کو جاری کرنے کی بنیادوں کا باعث ہوا۔ اور ایڈیٹر ''ریاست'' کا ایمان ہے کہ ان لوگوں کو قدرت ضرور سزا دیتی ہے۔ جو معصوم اور بے گناہ لوگوں پر ظلم کرتے ہیں۔ چاہے یہ سزا اسی وقت ملے یا دو چار سال بعد۔ اور خدا کا وجود ہو یا نہ ہو (بقول دیوان سنگھ) مگر سزا دینے والی کوئی نہ کوئی طاقت ضرور موجود ہے۔ اور یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ دعا اور بد دعا کا اثر نہ ہو۔

ماں کی ممتا

پنجاب کی اکالی تحریک کا آغاز دہلی کے گوردوارہ رکاب گنج سے ہوا۔ یہ گوردوارہ گورنمنٹ سیکرٹریٹ کے بالکل قریب ہے۔ گورنمنٹ چاہتی تھی کہ اس گوردوارہ کی بیرونی اونچی دیوار کو گرا دیا جائے۔ تاکہ کوئی بمب باز یا انارکسٹ اس دیوار کے پیچھے چھپ کر کبھی کوئی وار نہ کر سکے۔ سکھ اس دیوار کو مسجد مچھلی بازار کانپور کے غسل خانہ کی طرح گوردوارہ کا ایک حصہ سمجھتے تھے۔ اور اس دیوار کی حفاظت کے لئے اکالی (جو مرنے سے نہ ڈریں) عالم وجود میں آئے۔ اس دیوار کی کامیابی نے اکالی تحریک کو ایک مستقل اور مضبوط حیثیت دینے کا کام کیا۔ چنانچہ آج پنجاب منسٹری اور گورنمنٹ ہند کی وزارات میں اکالیوں کے مشورہ سے ہی سکھ وزراء لیے جاتے ہیں۔

میں جب ریاست نابھ میں ملازم تھا۔ اس وقت ہم وہاں چار جرنلسٹ موجود تھے۔ (۱) میں (۲) مسٹر ایس رنگا آئر سابق سب ایڈیٹر لیڈر الہ آباد (۳) سردار سوہن سنگھ راہی (۴) اور سردار چرن سنگھ شہید۔ اکالی تحریک جب زور پکڑ رہی تھی، تو مہاراجہ نابھ نے ایک روز مجھ سے کہا کہ میں پنجاب کا دورہ کر کے معلوم کروں کہ اس نئ اکالی تحریک کہ تہہ میں کیا مقصد ہے۔ اور اس کے ساتھ کون کون بااثر حضرات شامل ہیں۔ چیف خالصہ دیوان (حکومت پرست پارٹی کا) اس کے ساتھ کس حد تک تعلق ہے۔ گورنمنٹ میں اس کی کیا پوزیشن ہے، اور اس کا مستقبل کیا نظر آتا ہے۔ میں مہاراجہ کے حکم کے مطابق نابھ سے روانہ ہو کر سب سے پہلے امرتسر پہنچا۔ وہاں سکھوں کے اکثر لیڈر اور ورکرز سے واقفیت تھی۔ متعدد اصحاب سے ملنے کے بعد ماسٹر تارا سنگھ (جو اکالی تحریک کے سب سے بڑے لیڈر تھے) سے ملا، ماسٹر صاحب سے دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ باتوں باتوں میں آپ سے معلوم ہوا کہ پٹیالہ کے سردار لال سنگھ کے قتل کے متعلق کاغذات ان کے ایک دوست سردار تلوک سنگھ منیجر گوردوارہ پنجہ صاحب حسن ابدال (ضلع راولپنڈی) کے پاس ہیں۔

سردار لال سنگھ مرحوم مہاراجہ پٹیالہ کی مہارانی (موجودہ مہارانی پٹیالہ کی حقیقی والدہ) کے چچا تھے۔ سردار لال سنگھ کی بیوی دلیپ کور غیر معمولی خوب صورت تھیں۔ اور مہاراجہ کا اس کے ساتھ ناجائز تعلق تھا۔ مہاراجہ نے چاہا کہ سردار لال سنگھ پچاس ہزار یا اس سے زیادہ رقم لے کر دوسری شادی کر لیں اور دلیپ کور کو چھوڑ دیں۔ مگر سردار لال سنگھ اس پر آمادہ نہ ہوئے۔ اس انکار کے بعد مہاراجہ نے لال سنگھ کو قتل کرا دیا۔ اس قتل میں جن لوگوں کا حصہ تھا۔ ان میں سے کچھ تو مر چکے تھے۔ اور کچھ ابھی زندہ ہیں۔ چنانچہ جن کاغذات کا ماسٹر تارا سنگھ نے ایڈیٹر ''ریاست'' سے ذکر کیا، ان میں وہ مسودہ بھی تھا، جو سردار لال سنگھ کو اس غرض سے دیا گیا تھا کہ وہ اپنی بیوی کو چھوڑنے کے متعلق اس کاغذ پر دستخط کر دیں۔ اور سردار بہادر سر سندر سنگھ مجیٹھہ سابق منسٹر پنجاب گورنمنٹ کے خطوط بھی تھے۔ جن سے ثابت ہوتا تھا کہ قتل کے بعد جب لوگوں کو اور گورنمنٹ کو قتل کا علم ہوا تو اس واقعہ پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی گئی۔ اس قتل کے واقعات بہت دل چسپ، دردناک، طویل اور ایک پوری کتاب لکھے جانے کے مستحق ہیں۔

ایڈیٹر ''ریاست'' ماسٹر تارا سنگھ سے مل کر لاہور وغیرہ کئی مقامات پر دوسرے سکھ لیڈروں سے ملنے کے لئے گیا، اور ایک عشرہ کے اس دورہ کے بعد جب واپس نابھ پہنچا تو اکالی تحریک کے متعلق اپنی رپورٹ کے ساتھ مہاراجہ کو لکھا کہ کاغذات قتل سردار لال سنگھ کے متعلق ماسٹر تارا سنگھ سے کیا بات چیت ہوئی۔ مہاراجہ ان کاغذات کو حاصل کرنے کے لئے ایک عرصہ سے کوشش کر رہے تھے۔ کیونکہ یہ کاغذات مہاراجہ پٹیالہ کے خلاف قتل کا جرم ثابت کر سکتے تھے۔ میرا خط دیکھ کر مہاراجہ بہت خوش ہوئے، مجھے طلب کیا، زبانی سب کچھ پوچھا اور کہا کہ جس طرح بھی ممکن ہو۔ ان کاغذات کو حاصل کیا جائے۔ چاہے ان کاغذات پر کتنا بھی روپیہ خرچ ہو۔

میں نے ہز ہائی نس سے پوچھا کہ کتنا روپیہ ان کاغذات پر زیادہ سے زیادہ خرچ

کیا جا سکتا ہے۔

مہاراجہ نے جواب دیا، ایک لاکھ، دو لاکھ یا اگر ضرورت زیادہ ہو تو زیادہ بھی۔

اگلے روز میں نے پانچ سو روپیہ سفر کے اخراجات کے لئے سردار گورو دیال سنگھ پرائیویٹ سیکرٹری (جو بعد میں نابھ میں منسٹر ہوئے اور سردار بہادر تھے۔) سے لیا اور سیدھا گوجر خان ضلع راولپنڈی گیا۔ سردار نانک سنگھ کے مکان پر پہنچا۔ (سردار نانک سنگھ کسی وقت پٹیالہ میں سپرنٹنڈنٹ پولیس سی آئی ڈی تھے۔ اور سردار لال سنگھ کے قتل کے الزام میں اس وقت پٹیالہ جیل میں تھے۔ اور قتل کے کاغذات انہوں نے اپنے بہنوئی سردار تلوک سنگھ کو دیئے تھے۔ تاکہ محفوظ رہیں، مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ سردار نانک سنگھ کے گھر میں ان کی بوڑھی اور ضعیف والدہ اور ایک بہن تنی۔ ان کی بہن کا نام غالباً گوبند کور تھا۔ اس لڑکی کی شادی ہوئے ابھی دو تین ماہ ہوئے تھے۔ اور اس کے ہاتھوں میں سرخ چوڑیاں جو غالباً پنجاب میں ایک سال تک پہنی جاتی ہیں۔ ان دونوں خواتین کو جب یہ علم ہوا کہ میں نابھ سے آیا ہوں۔ نابھ اور پٹیالہ دونوں کی عداوت ہے۔ اور اگر قتل لال سنگھ کے کاغذات مہاراجہ نابھ سنگھ کو دے دیئے جائیں تو مہاراجہ پٹیالہ قتل کے جرم میں گدی سے اتر سکتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ سردار نانک سنگھ بھی پٹیالہ جیل سے رہا کر دیئے جائیں گے۔ تو ان ماں بیٹی کے چہروں پر مسرت اور خوشی کا رنگ چمکنے لگا۔ اس کے بعد سردار نانک سنگھ کی ماں نے مجھے متاثر کرنے کے لئے بیٹے کی جدائی اور اپنے غم کی داستان سنانا شروع کی۔ اس ضعیف اور دکھی خاتون نے جب یہ کہا کہ نانک سنگھ قید ہونے کے باعث اپنی بہن کی شادی میں شامل نہیں ہو سکا۔ تو پاس بیٹھی معصومہ، خوب صورت اور جوان اور خوب صورت گوبند کور (سرخ چوڑیاں والی) بہن کی آنکھیں آنسوؤں سے تر ہو گئیں۔ اور اس نے حیا کے ساتھ اپنی آنکھیں نیچی کر لیں۔ اس کے بعد سردار نانک سنگھ کے ماموں اور دوسرے عزیز آ گئے۔ راولپنڈی اور سرحد کے لوگ تو فطرتاً بہت مہمان نواز ہوتے ہیں۔ مگر مجھے تو وہ اس

وقت ایک فرشتہ سمجھ رہے تھے۔ جو نا نک سنگھ کو رہا کرانے کے لئے آسمان سے اترا ہے ۔ان لوگوں نے اخلاص ومحبت اور خاطر تواضع کی انتہا کر دی۔ میں ان کے مکان پر دو روز رہا۔صلاح مشورے ہوتے رہے ۔آخر میں اور سردار تلوک سنگھ کے پاس پنجہ صاحب (حسن ابدال) روانہ ہوئے ۔پنجہ صاحب پہنچ کر مشورہ ہوا۔پھر تینوں واپس گوجر خان پہنچے ۔پھر مشورہ ہوا۔ یہ لوگ والیان ریاست کو نا قابل اعتبار، خود غرض اور جھوٹا سمجھتے تھے ۔اس لئے مہاراجہ نابھ پر بھروسہ نہ کرنا چاہتے تھے ۔اور کاغذات حوالہ کرنے میں ان کو تامل تھا۔اور بعض اس بات کے حق میں تھی کہ کاغذات ایک یا دو لاکھ میں فروخت کر دیئے جائیں ۔اور نابھ سے روپیہ لے لیا جائے ۔اور میری یہ خواہش تھی کہ یہ کاغذات بغیر ایک پیسہ خرچ کیے مہاراجہ نابھ کو مل جائیں ۔مہاراجہ نابھ ان کو مہاراجہ پٹیالہ کے خلاف استعمال کریں ۔اور سردار نا نک سنگھ بھی جیل سے رہا ہوں ۔ چنانچہ جب میں نے دیکھا کہ سردار نا نک سنگھ کے گھر والوں کی پنچایت کسی نتیجہ پر نہیں پہنچتی ۔اور ان کی مختلف رائے ہیں ۔تو میں نے سب کے سامنے قطعی فیصلہ کرنے کے لئے دو تجویزیں رکھیں ۔(۱) یا تو آپ روپیہ لے لیجیئے ،ہم ایک لاکھ روپیہ دینے کو تیار ہیں (۲) ہم ان کاغذات کو جیسا چاہیں استعمال کریں ،اور آپ کو حق حاصل نہ ہوگا۔ اگر ہم ان کاغذات کو استعمال کرتے ہوئے سردار نا نک سنگھ کے مسئلے کو چھوڑ دیں ۔

(۲) آپ کوئی روپیہ نہ لیجیئے ۔آپ بغیر ایک پیسہ لیے یہ کاغذات مہاراجہ نابھ کے حوالے کر دیجیے ۔مہاراجہ کا آپ سے وعدہ ہے کہ وہ ان کاغذات کا استعمال کرتے ہوئے سردار نا نک سنگھ کی رہائی کے لئے انتہائی کوشش کریں گے ۔اور اس مسئلہ کو کسی قیمت پر نہ چھوڑا جائے گا۔ چاہے دس لاکھ روپیہ خرچ ہو۔

میں نے جب قطعی فیصلے کے لئے یہ دونوں شرائط سامنے رکھیں تو سردار نا نک سنگھ کی ماں نے جو بیٹے کی جدائی میں بے حال تھیں، بغیر کچھ سوچے یا غور کیے فوراً جواب دیا:

''مجھے روپے کی ضرورت نہیں، مجھے اپنے بچے کی ضرورت ہے۔ میں روپیہ نہیں چاہتی۔ آپ یہ کاغذات لے جایئے اور مہاراجہ نابھ کے حوالے کر دیجیے۔ اور میرے بچے کو جیل سے چھڑانے کی کوشش کیجیے۔

سردار نانک سنگھ کی والدہ کا یہ جواب سن کر تمام لوگ خاموش ہو گئے۔ اور آخر فیصلہ ہوا کہ کاغذات بغیر روپیہ لیے مہاراجہ نابھ کے حوالے کر دیئے جائیں۔ چنانچہ میں سردار تلوک سنگھ اور سردار جے سنگھ کو ساتھ لے کر واپس نابھ آ گیا۔ کاغذات ایک ٹین کے نلکے میں بند تھے۔ اور یہ نلکا سردار تلوک سنگھ کے کوٹ کے اندر چھاتی اور گردن کے ساتھ بندھا ہوا تھا۔

تیسرے روز رات کو ہم نابھ پہنچے۔ میں نے ان کی رہائش کا انتظام مہمان خانہ سرائے شاہیات میں کیا، اور خود اپنے مکان پر جا کر سویا۔ آٹھ بجے کے قریب سردار گوردیال سنگھ پرائیویٹ سیکرٹری کے مکان پر پہنچا۔ سردار صاحب نے پوچھا کہ کاغذات کا کیا ہوا؟۔ میں نے کہا کہ کاغذات لے آیا ہوں۔ وہ حیران ہوئے اور کہا روپیہ ساتھ نہیں لے گئے تھے۔ ابھی صرف معلوم کرنے گئے تھے کہ کاغذات کہاں ہیں؟۔ کاغذات کیوں کر آ گئے۔ یہ ممکن ہی کیوں کر ہے؟۔ کیا مذاق کر رہے ہو۔ میں نے تمام قصہ بیان کیا۔ سردار گوردیال سنگھ حیران رہ گئے۔ انہوں نے ہیرا محل جا کر مہاراجہ کو تمام حالات بتائے۔ مہاراجہ حیران تھے کہ دو لاکھ روپیہ تک خرچ کرنے کی اجازت دے دی گئی تھی۔ مگر ایک پیسہ خرچ کیے بغیر کاغذات مل گئے۔ مہاراجہ واقعات کو سن کر بہت خوش ہوئے۔

رات کو نو بجے کے قریب میں سردار تلوک سنگھ اور سردار جے سنگھ کو لے کر قلعہ میں گیا۔ دونوں کو مہاراجہ سے ملایا۔ کاغذات والا نلکا کوٹ کے اندر سے نکالا گیا۔ تمام کاغذات مہاراجہ کو دے دیئے گئے۔ مہاراجہ نے ان کو دیکھا بہت خوش ہوئے اور وعدہ کیا کہ سردار نانک سنگھ کی رہائی کو اپنا مسئلہ سمجھ کر کوشش کریں گے۔ چنانچہ ان لوگوں

کے ذریعہ مہاراجہ نے سردار نانک سنگھ کی والدہ کو دو ہزار روپیہ نقد بھجوایا۔ اور ایک سو روپیہ ماہوار پنشن تمام حیات مقرر کی۔ (جو شاید چند ماہ ملی۔) اس کے بعد راجہ گدی سے دست بردار ہو گئے۔ اور اگلے روز جب راقم التحریر مہاراجہ سے ملا تو مہاراجہ نے کہا

۔

میں اور دربار نابھ آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہ بھول سکیں گے۔

یہ کاغذات گو مہاراجہ پٹیالہ کے خلاف قتل کا الزام ثابت کرنے کے اعتبار سے بہت قیمتی تھے۔ مگر گورنمنٹ مہاراجہ پٹیالہ کے حق میں تھی۔ اور مہاراجہ نابھ کے خلاف ۔ اور صرف گورنمنٹ ہی قتل کے متعلق کوئی کاروائی کر سکتی تھی۔ یہ کاغذات استعمال نہ ہو سکے۔ اور ان کاغذات کی پوزیشن بالکل ایک چیک کی سی تھی۔ جو معیاد گزر جانے کے بعد بینک سے کیش نہیں ہو سکتا۔

سردار نانک سنگھ غالباً ایک عرصہ کے بعد جیل سے رہا ہوئے اور وہ غالباً ڈیرہ دون میں کوئی کام کرتے ہیں۔

ان اوپر کے واقعات سے ماں کے جذبات کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ جو اس کے اپنی اولاد اور اپنے بچہ کے لئے ہوتے ہیں۔ یعنی یہ اپنی اولاد کے مقابلے میں لاکھوں روپیہ کی بھی کوئی قیمت نہیں سمجھتی۔

محنت اور کامیابی

کئی برس ہوئے ''ریاست'' جب جاری ہوا،تو اس کے دفتر میں نہ کوئی سب ایڈیٹر تھا، نہ مترجم اور نہ کوئی مینجر ۔صرف ایک کلرک تھا اور ایک چپڑ اسی ،کلرک کی تنخواہ تیس روپیہ تھی۔اور چپڑ اسی کی تنخواہ پندرہ روپیہ تھی۔ ''ریاست'' کا دفتر دہلی درواہ کے قریب موجودہ تھانہ کے بالکل سامنے ایک گلی کے اندر تھا۔اس مکان کا کرایہ آٹھائیس روپے ماہوار تھا۔اس میں سے بھی کچھ حصہ بارہ روپے ماہوار پر ایک ریلوے گارڈ کو دیا گیا تھا۔اور کام کی حالت یہ تھی کہ ویسے تو ایڈیٹر ''ریاست'' کی تمام زندگی ہی دن رات میں سے چودہ، چودہ یا سولہ ،سولہ گھنٹے کام کرتے گزر گئی ،مگر اس زمانہ میں یہ لگا تار اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے روزانہ کام کرتا اور چھ گھنٹے سوتا تھا۔چنانچہ کئی بار ایسا ہوا کہ صبح چھ بجے کام شروع کیا۔شام ہوگئی، رات ہوگئی، رات بھر کام جاری رہا۔ دن نکل آیا۔ ضروری حاجات سے فارغ ہوا،غسل کیا اور پھر میز پر بیٹھ گیا۔اور پھر رات ہوگئی، یعنی چھتیس چھتیس گھنٹہ مسلسل کام کرتا رہا۔اس محنت کا نتیجہ یہ ہوا کہ اخبار میں کامیابی ہوئی ۔دو تین ماہ کے اندر ہی اشتہارات کے آٹھ، دس صفحے ہو گئے ۔اور لاہور، دہلی اور دوسرے مقامات کے اخبار نویس ''ریاست'' کو رشک کی نظروں سے دیکھنے لگے۔

''ریاست'' کو جاری ہوئے ڈیڑھ سال کا عرصہ ہو چکا تھا اور اس کی اشاعت تیزی کے ساتھ بڑھ رہی تھی ۔اس زمانہ میں جامع مسجد کے قریب ایڈورڈ پارک میں شام کے وقت چند اہم شخصیات جمع ہوا کرتیں ۔مرحوم مولانا راشد الخیری، خواجہ حسن نظامی، واحدی صاحب، ایڈیٹر نظام المشائخ ، قاری عباس حسین، منشی عبد الحمید ایڈیٹر''مولوی'' اور مولانا عارف ہسوی، اور بھیا شیخ احسان الحق وغیرہ، یہ مجلس بہت دل چسپ ہوتی تھی ۔ایڈیٹر ''ریاست'' بھی کبھی کبھی فرصت نکال کران دوستوں کی خدمت میں حاضر ہو جاتا، کیونکہ یہ تمام ہی اس نیاز مند کے کرم فرما تھے ۔اور مرحوم مولانا راشد الخیری کے اخلاص ومحبت میں تو بہت بڑی کشش تھی۔

ایک روز ایڈیٹر ''ریاست'' ان بزرگوں کی خدمت میں حاضر تھا۔ تو قاری عباس حسین نے مجھ سے فرمایا کہ آپ ایک اخبار جاری کرنا چاہتے ہیں، جو بالکل ریاست کے سائز کا ہوگا۔ اس کے لئے ریاست والا سفید کاغذ استعمال کیا جائے گا اور ترتیب کے اعتبار سے بھی ریاست جیسا ہوگا۔ اس میں مجھے کوئی اعتراض تو نہیں۔ میں نے کہا مجھے کیا اعتراض ہوسکتا ہے۔ جتنے زیادہ اخبارات جاری ہوں، اتنا ہی زیادہ میدان وسیع ہوگا۔ قاری صاحب نے پوچھا کہ اگر اخبار جاری ہو تو میں اس میں کیا امداد دوں گا۔ میں نے عرض کیا، جو خدمت ہو مجھے بتایئے میں حاضر ہوں۔ پھر پوچھا کہ کیا کامیابی ہوگی۔ میں نے کہا اگر ریاست کو کامیابی ہوئی ہے تو کیا وجہ آپ کے اخبار کو کامیابی حاصل نہ ہو۔ چنانچہ اگلے روز ایڈیٹر ''ریاست'' نے قاری صاحب کے ریاست کے چھپے ہوئے مسطر کے کاغذ بھیجے۔ اخبار قوم کا ڈیکلریشن داخل کیا گیا، اور دو ہفتہ کے اندر اس اخبار کا پہلا پرچہ بازار میں آ گیا۔

قاری عباس حسین صاحب اس پہلے ''بندے ماترم'' لاہور وغیرہ میں متعدد روزانہ ہفتہ وار قومی اخبارات میں ایڈیٹری اور سب ایڈیٹری کے فرائض انجام دے چکے تھے۔ اور آپ ایک اچھے جرنلسٹ ہیں، مگر اخبار کو ایڈٹ کرنا اور اخبار کو تجارتی اعتبار سے چلانا دو مختلف چیزیں ہیں۔ قاری صاحب نے مجھ سے پوچھا تھا کہ میں نے کتنے سرمایہ سے ''ریاست'' جاری کیا تھا۔ تو میں نے عرض کیا پندرہ سو روپیہ سے۔ چنانچہ قاری صاحب نے بھی اس اخبار قوم کو جاری کرنے کے لئے ڈیڑھ ہزار روپے کا انتظام کیا۔ تین ماہ کے اندر اس اخبار پر ڈیڑھ ہزار روپیہ صرف ہوگیا۔ مگر اخبار کو کامیابی نہ ہوئی۔ تین ماہ کے بعد قاری صاحب ایڈورڈ پارک میں ملے۔ تو آپ نے فرمایا کہ ڈیڑھ ہزار روپیہ تو صرف ہو چکا مگر کامیابی نہیں ہوئی، نقصان ہو رہا ہے۔ ایڈیٹر ''ریاست'' نے عرض کی اور کوشش کیجیے۔ قاری صاحب نے مزید بارہ سو روپے کا انتظام کیا، وہ روپیہ بھی صرف ہوگیا۔ اس کے بعد ایک ہزار روپے کا اور انتظام کیا، وہ بھی غرق ہوا تو ایک روز ایڈورڈ

پارک میں پھر ملے۔آپ نے فرمایا کہ ساڑھے تین ہزار روپیہ سے زیادہ صرف ہو چکا ہے ۔نہ زیادہ اشاعت ہے نہ اشتہارات کافی ۔اخبار میں گھاٹا ہے ۔کیا صورت ہو؟۔ ایڈیٹر ’’ریاست‘‘ نے عرض کیا،اگر گھاٹا ہے تو بند کر دیجیے ۔قاری صاحب دوستانہ شکوہ کے انداز میں بولے ۔آپ نے کوئی مدد نہیں کی ۔نہ اشتہارات لے کر دیئے ۔نہ کوئی صورت خریدار زیادہ کرنے کی بتائی ۔

اس دوستانہ شکوہ کے بعد آپ نے سنجیدگی کے ساتھ پوچھا کہ نا کامی کا باعث کیا ہے ۔تو ایڈیٹر ’’ریاست‘‘ نے جو کچھ عرض کیا وہ یہ تھا:

’’قاری صاحب آپ کے لئے کامیابی کا کوئی امکان نہ تھا اور میں جانتا تھا کہ آپ کو کامیابی حاصل نہ ہوگی ،مگر اس خیال سے کہ اگر میں اخبار جاری کرنے سے پہلے آپ کو اخبار جاری کرنے سے روکتا تو آپ مجھ پر خودغرضی ،حسد اور رقابت کا الزام لگاتے ،اس لئے میں نے آپ کو منع نہیں کیا ،ورنہ سوچیے کہ آپ کو کامیابی کیوں کر ہوتی ۔آپ صبح آٹھ بجے جاگتے ہیں ،ایک گھنٹہ پلنگ پر کروٹیں بدلتے رہتے ہیں ۔

پھر بیگم صاحب سے فرماتے ہیں ۔کہ پان لاؤ ،بیگم صاحبہ آپ کے پلنگ کے قریب چھالیا کترتی ہیں ۔ چھالیا کترتے ہوئے چوڑیوں کی آواز سننے اور پان کھانے کے لیے آپ کو نصف گھنٹہ چاہیئے ۔پھر پاخانہ جاتے ہیں ،ہاتھ منہ دھوتے اور ناشتہ کرتے آپ کو ساڑھے دس بج جاتے ہیں اور گیارہ بجے اچکن پہن کر دفتر میں تشریف لے جاتے ہیں ۔آپ کے ملازم جب جانتے ہیں کہ آپ گیارہ بجے تشریف لاتے ہیں تو وہ بھی پونے گیارہ بجے سے پہلے دفتر میں قدم رکھنا حرام سمجھتے ہیں ۔آپ کے تمام کے تمام ملازم دہلی کے رہنے والے نازک مزاج اصحاب ہیں ۔دفتر بند ہونے کا وقت پانچ

بجے ہے، تو یہ تین بجے ہی سے گھڑی دیکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ کہ گھڑی کی سوئی کب آگے بڑھے اور یہ کب گھر کو جائیں۔ آپ چار بجے دفتر سے روانہ ہو کر گھر پہنچتے ہیں۔ بیوی چائے پلاتی ہے۔ پان کھلاتی ہیں اور آپ اچکن پہن کر اور چھڑی ہاتھ میں لے کر سیر کے لئے نکل جاتے ہیں۔ ایک دو چکر چاوڑی بازار کے بھی ضروری ہیں۔ کیونکہ اس کے بغیر تفریح نامکمل ہوتی ہے۔ پھر ایڈورڈ پارک آتے ہیں، اور سیر و تفریح کے بعد دس بجے گھر تشریف لے جاتے ہیں۔ یہ تو کیفیت آپ کی ہے۔ میری حالت یہ ہے کہ صبح چھ بجے میز پر بیٹھتا ہوں، میز پر ہی چائے پیتا ہوں۔ یہاں ہی کھانا کھاتا ہوں۔ دفتر میں تمام کے تمام لوف پنجابی ہیں۔ جو فطرتاً کام کی پرواہ کرتے ہیں۔ وقت کی پرواہ نہیں کرتے۔ دس بجے کا وقت ہو تو نو بجے ہی دفتر پہنچ جاتے ہیں۔ کیونکہ ان کے گھر میں کوئی کام نہیں ہوتا۔ اور بغیر کام ان کا جی گھبراتا ہے۔ شام کو یہ لوگ دفتر سے نہیں جا سکتے کہ جب تک یہ اپنا کام ختم نہ کر لیں۔ چنانچہ ان کو بھی دفتر میں رات کے آٹھ آٹھ بج جاتے ہیں۔ میں صبح چھ بجے کا میز پر بیٹھا رات کو دس گیارہ بجے بلکہ بعض اوقات بارہ بجے اٹھتا ہوں۔ رات کو خواب آتے ہیں تو وہ بھی اشاعت کو زیادہ کرنے اور اشتہارات بڑھانے کے۔ نہ کوئی سیر ہے، نہ تفریح، نہ کبھی پارٹی میں جاتا ہوں نہ کسی دوست کے ہاں تو فرمایئے آپ کو کامیابی کیوں ہو اور مجھے ناکامی کیوں!

قاری صاحب میری یہ بات سن کر خاموش ہو گئے اس ہفتہ میں ہی انہوں نے اپنے اخبار کو بند کر دیا۔ آپ آج کل ریڈیو اسٹیشن کراچی میں ملازم ہیں۔ ان کے ساتھ کئی برس سے دوستانہ گہرے تعلقات ہیں۔ جب بھی کبھی ملتے ہیں تو ساڑھے تین ہزار

کے نقصان کا گلہ اسی طرح کرتے ہیں، جس طرح کوئی قرض خواہ بنیا کسی نادہندہ مقروض سے قرضہ وصول کرنے کا تقاضا کرتا ہے۔ اور اس قرضہ کو بھول نہیں سکتا۔

میرے اس لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ اگر کوئی فرشتہ بھی آسمان سے نازل ہو اور وہ محنتی نہ ہو، تو اس کی کامیابی کا اس دنیا میں کوئی امکان نہیں، اور اگر کوئی شخص انتہائی محنتی ہے۔ اور اس میں کوئی غیر معمولی نقص نہیں جو اس کو قدم قدم پر ناکامی کی طرف لے جاتا ہے۔ تو اس شخص کے کامیاب ہونے میں کوئی شک نہیں۔ میں نے درجنوں سیلف میڈ لوگوں کی زندگی کا گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے۔ ان سے ملا ہوں، اور ان سے ان کی کامیابی کے متعلق گھنٹوں باتیں کی ہیں۔ ان میں سے ایک بھی ایسا نہیں ملا جو انتہائی محنتی نہ ہو۔ اور میں نے تجارتی اعتبار سے ناکام اور تباہ حال لوگوں کے حالات پر بھی غور کیا ہے۔ ان میں سے پچھتر فی صدی لوگ ایسے تھے، جن کا وقت محنت کی جگہ عیش و آرام کی نذر رہا۔

"ریاست" کے پچھلے کئی برس کی زندگی میں میرا اندازہ ہے کہ لاہور، دہلی، یوپی اور دوسری جگہوں سے ایک سو کے قریب ایسے اخبارات جاری ہوئے، جنہوں نے ریاست کی نہ صرف شکل وشباہت بلکہ مضامین کی ترتیب اور اس کے عنوانات کی بھی تقلید کی، مگر ان میں سے شاید ہی کوئی ایسا اخبار ہوگا، جس کو ریاست جیسی کامیابی نصیب ہوئی ہو۔ چنانچہ اب اس کے نئے دور ہی کو لیجیے۔ یہ پرچہ ریاست کا بارہواں نمبر ہے۔ ابھی صرف تین ماہ ہوئے ہیں، مگر باوجود اس بات کے کہ کام کرنے والے اچھے آدمی اب تک نہیں مل سکے۔ اس مئی کے مہینے میں اس کے اشتہارات کی آمدنی دو ہزار روپیہ ماہوار کے قریب ہے۔ اور اشاعت کے لحاظ سے بھی چیلنج کیا جا سکتا ہے۔ کہ تمام ہندوستان میں شاید ہی کوئی اخبار ایسا ہوگا جو "ریاست" کا مقابلہ کر سکے۔

ان تمام حالات کے لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ ریاست کی تمام کامیابی کا سبب صرف محنت ہے۔ اور جو لوگ ناکام ہوئے، وہ محنت نہ کرنے کے باعث۔

والیان ریاست کا انتقام

ایڈیٹر ''ریاست'' جب مانسہ (ریاست پٹیالہ) میں تھا۔ تو اس زمانہ میں اس کے تعلقات وہاں کے ایک بنیئے لالہ جوت رام کے ساتھ بہت گہرے اور دوستانہ تھے۔ یہ لا جوت رام ذات کے تو بنیئے تھے۔ مگر بہت بہادر، فیاض دوست نواز اور سیر چشم تھے۔ چنانچہ ان تمام صفات کی بنا پر تمام دوست آپ کو پٹھان بنیا کہا کرتے تھے۔ ان لالہ لا جوت رام کے ساتھ ایڈیٹر ''ریاست'' کا لین دین بھی تھا۔ یعنی جب ضرورت ہوتی روپیہ لیا جاتا اور پھر واپس کر دیا جاتا۔

ایڈیٹر ''ریاست'' جب مانسہ سے لاہور ''خالصہ اخبار'' کو ایڈٹ کرنے چلا گیا، تو اس وقت حساب میں ایڈیٹر ''ریاست'' کے ذمہ لالہ لا جوت رام کے دوسو روپے تھے۔ ایڈیٹر ''ریاست'' نے لاہور پہنچ کر لالہ لا جوت رام کو ایک پوسٹ کارڈ لکھا کہ یہ دوسو روپیہ میں آپ کو چند دن کے اندر ادا کر دوں گا۔ چند ایک ماہ کے بعد یہ روپیہ لالہ لا جوت رام کو واپس کر دیا گیا۔

اس واقعہ کے کئی برس بعد ایک مقامی مقدمہ کے سلسلے میں لالہ لا جوت رام کے گھر کی تلاشی ہوئی۔ پٹیالہ پولیس جب تلاشی لے رہی تھی۔ تو تلاشی لینے والے سب انسپکٹر نے وہ کارڈ بھی دیکھا جو ایڈیٹر ''ریاست'' نے دوسو روپے کے متعلق لالہ لا جوت رام کو کئی برس پہلے لکھا تھا۔ اور چونکہ تلاشی لینے والے کو علم تھا کہ مہاراجہ پٹیالہ ''ریاست'' کے مضامین کے باعث ایڈیٹر ''ریاست'' کے دشمن ہیں۔ اس نے یہ کارڈ لے لیا اور انسپکٹر جنرل پولیس کو بھیجا۔ اس کارڈ کے پہنچنے پر پٹیالہ کے افسروں کے درمیان کانفرنسیں ہوئیں کہ اس کارڈ کو کس طرح استعمال کیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے فیصلہ کیا کہ اس کارڈ کے دوسو روپے کو ایک امانت قرار دیا جائے اور امانت میں خیانت کا جھوٹا مقدمہ قائم کیا جائے۔

پٹیالہ کے افسروں کو اس فیصلہ کے بعد اس معاملہ کے لئے ایک بڑا پولیس افسر

خاص طور سے مقرر کیا گیا۔ یہ افسر مانسہ آیا۔ اس نے لالہ لاجوت رام سے حکومت کا دباؤ ڈال کر یہ بیان لیا۔ کہ کارڈ لکھنے سے چند ماہ پہلے دیوان سنگھ مانسہ سے بھٹنڈہ جا رہا تھا تو لالہ لاجوت رام نے دوسو روپیہ ساون سنگھ ٹھیکدار شراب بھٹنڈہ کو دینے کے لئے دیوان سنگھ کو دیئے۔ مگر دیوان سنگھ نے ساون سنگھ کو یہ روپیہ نہ دیا اور امانت میں خیانت کی۔ مانسہ کے دو نمبرداروں سے بیان لیا گیا کہ ان کے سامنے اور ان کی موجودگی میں لالہ لاجوت رام نے دیوان سنگھ کو دوسو روپیہ اس غرض کے لئے دیا۔ کہ یہ روپے ساون سنگھ کو دیئے جائیں۔ اس افسر نے بھٹنڈہ جا کر ساون سنگھ سے یہ بیان لیا کہ لالہ لاجوت رام نے دیوان سنگھ کے ہاتھ دوسو روپیہ بھیجا۔ مگر دیوان سنگھ نے یہ روپیہ اسے نہیں دیا۔ چنانچہ ان شہادتوں کی بنیاد پر ایڈیٹر ''ریاست'' کے خلاف مقدمہ کی کاروائی ریاست پٹیالہ میں شروع ہوئی۔

لالہ لاجوت رام بہت نیک فطرت اور دوست پرست انسان تھے۔ آپ نے دباؤ میں آ کر یہ بیان تو دے دیا۔ مگر آپ اگلے روز ہی دہلی پہنچے اور ایڈیٹر ''ریاست'' سے ملے اور تمام واقعات بیان کیے۔ کہ پولیس نے کس طرح ان کو دھمکی دی کہ اگر وہ دیوان سنگھ کے خلاف بیان نہ دیں گے تو خود ان پر کوئی جھوٹا مقدمہ قائم کر دیا جائے گا۔ ساون سنگھ ٹھیکدار سے کہا کہ اگر وہ بیان نہ دے گا تو اس کا ٹھیکہ ضبط کر لیا جائے گا۔ اور آئندہ کبھی ٹھیکہ نہ دیا جائے گا۔ اور نمبردار تو پولیس کے قدیمی اور خاندانی گرگے تھے۔ جن کا کام ہی پولیس کی امداد اور جھوٹی گواہیاں دینا تھا۔

لالہ لاجوت رام نے جب یہ تمام حالات بتائے تو ایڈیٹر ''ریاست'' نے پوچھا کہ کیا آپ وہ دوسو روپیہ اس زمانے میں لے چکے ہیں یا نہیں۔ لالہ صاحب نے کہا ہاں۔ ایڈیٹر ''ریاست'' نے پوچھا کیا آپ کو رسید دینے میں کوئی اعتراض ہے۔ آپ نے کہا کوئی اعتراض نہیں۔ چنانچہ لالہ لاجوت رام نے رسیدی ٹکٹ لگا کر رسید لکھ دی۔ کہ دوسو روپیہ جو حساب میں دیوان سنگھ کے ذمہ تھے۔ کارڈ لکھنے کے چند روز بعد ہی

آپ نے واپس لے لیا تھا۔اوراس کے بعد ایڈیٹر ''ریاست'' کے ذمہ کوئی روپیہ نہ تھا ۔اس رسید کے بعد لالہ لاجوت رام کی پوزیشن بہت نازک تھی۔ مانسہ میں وہ پولیس کو بیان دے چکے تھے کہ دیوان سنگھ نے امانت میں خیانت کا جرم کیا۔یہاں انہوں نے رسید لکھ دی۔آپ مہاراجہ پٹیالہ کی رعیت اور مہاراجہ پٹیالہ دیوان سنگھ کے دشمن۔یہ سب کچھ تھا۔مگر بہادراور دوست پرست انسان لالہ جوت رام سچائی اور دوستی کو لبیک کہنے کے لئے تیار ہو گئے۔چنانچہ لالہ جوت رام ایڈیٹر ''ریاست'' کوتمام حالات بتا کراور رسید دے کرنیز دو تین دن رہ کر مانسہ روانہ ہو گئے۔

ایڈیٹر ''ریاست'' کا تجربہ ہے کہ جب کبھی اس نے ظلم کے خلاف آواز بلند کی، لوگ بغیر واقفیت کے بھی اس کے ہم درد ہو گئے۔اورکوئی ریاست ایسی نہیں تھی کہ وہ اس کے خلاف ہواور وہاں کے لوگ اس کے ہمدرداور معاون ثابت نہ ہوئے ہوں۔ چنانچہ یہی کیفیت پٹیالہ کی تھی۔لالہ جوت رام کے دہلی سے جانے کے چند روز بعد پٹیالہ سے ایک سب انسپکٹر پولیس کا ایک پرائیویٹ پیغام لے کرایڈیٹر ''ریاست'' کے پاس پہنچا کہ پولیس لالہ جوت رام کے بیان کی بنیادوں پر مقدمہ کی تکمیل کر رہی ہے۔ اور کوشش کی جارہی ہے کہ ایجنٹ گورنر جنرل ریاست ہائے پنجاب اس مقدمہ میں ایکسٹراڈیشن ایکٹ کے مطابق دیوان سنگھ کوریاست پٹیالہ کے حوالے کردیں۔تا کہ مہاراجہ پٹیالہ جیل میں دیوان سنگھ سے انتقام لے سکیں۔

اس اطلاع کے چند روز بعد ایڈیٹر ''ریاست''ایک روز صبح چھ بجے اخبار کر لئے مضامین لکھ رہا تھاتو دیکھا کہ دفتر ریاست اور رہائشی مکان دونوں جگہ(جواس زمانہ میں دریائے گنج کی ایک کوٹھی میں تھے۔)پولیس نے محاصرہ کرلیا ہے۔اوردہلی سی آئی ڈی کے انسپکٹر مسٹر نذیر الحق، پٹیالہ پولیس کے سپرنٹنڈنٹ مسٹر فضل کریم اوردو درجن کے قریب دہلی اور پٹیالہ کے انسپکٹر اور سب انسپکٹر، ہیڈ کانسٹیبل اور کانسٹیبل موجود ہیں ۔ایڈیٹر ''ریاست'' نے نذیر الحق سے پوچھا کہ معاملہ کیا ہے؟۔تو آپ نے بتایا کہ

ریاست پٹیالہ نے امانت میں خیانت کا ایک مقدمہ ایڈیٹر ''ریاست'' کے خلاف چلایا ہے۔اس سلسلہ میں تلاشی اور گرفتاری ہو گی۔نذیر الحق کے بتانے پر ایڈیٹر ''ریاست'' نے کہا کہ سب سے پہلے آئرن سیف میں سے لالہ جوت رام کی رسید لے لی جائے۔ چنانچہ رسید لے لی گئی اور اس پر نذیر الحق صاحب اور مسٹر فضل کریم اور گواہوں کے دستخط ہو گئے۔لالہ جوت رام کی رسید دیکھ کر فضل کریم صاحب کے چھکے چھوٹ گئے۔ یہ پولیس کے کام میں بہت ہوشیار تھے۔انہوں نے محسوس کیا کہ مقدمہ تیار کرنے کی سب محنت پر پانی پھر گیا۔دفتر میں سامان بہت تھا۔سورج کے غروب ہونے تک تلاشی ہوتی رہی۔مگر ابھی کئی کمرے باقی تھے۔اس لئے بقایا کمروں کو تالا لگا کر پہرہ لگا دیا گیا ۔تاکہ اگلے روز صبح پھر تلاشی لی جائے۔تلاشی کی خبر سارے شہر میں پھیل گئی۔دہلی کے اخبارات کے ایڈیٹر اور دوست احباب دن بھر جمع رہے۔رات کے آٹھ بجے کے قریب نذیر الحق صاحب ایڈیٹر ''ریاست'' کو کوتوالی لے گئے۔ملزم کو اس زمانہ کے ڈپٹی سپرٹینڈنٹ پولیس **ملک** دیوی دیال کے سپرد کر دیا گیا۔اور فضل کریم صاحب نے ڈپٹی سپرٹینڈنٹ پولیس سے کہا کہ ملزم کو حوالات میں بند کر دیا جائے۔**ملک** صاحب اپنے کام میں بہت ہوشیار اور نیک شخصیت تھے۔آپ نے جواب دیا حوالات میں بند کرنا دہلی پولیس کا کام ہے۔آپ ہوٹل میں جا کر آرام کیجئے۔اور صبح تلاشی کے لئے پھر تشریف لایئے۔فضل کریم صاحب کے فاتحانہ انداز میں ہوٹل جانے کے بعد **ملک** دیوی دیال نے سپرنٹنڈنٹ سی ،آئی ،ڈی مسٹر مارگن کو ٹیلی فون پر کہا کہ دیوان سنگھ با اثر اخبار نویس ہے۔اسمبلی اور کونسل آف اسٹیٹ کے اکثر ممبر اس کے دوست ہیں۔ اور مقدمہ کی کیفیت یہ ہے کہ زیر بحث الزام کے متعلق ملزم نے مستغیث کی رسید پیش کر دی ہے۔جس کا مطلب ہے مقدمہ کا کوئی وجود نہیں رہا۔

پٹیالہ والے چاہتے ہیں کہ ملزم کو حوالات میں بند کر دیا جائے۔معاملہ بہت اہم ہے۔ممکن ہے کل کو لوکل پولیس اور لوکل گورنمنٹ کے لئے آسمبلی یا کونسل آف سٹیٹ

میں جواب دینا مشکل ہو جائے۔سوچ لیجیے کہ ملزم کو حوالات میں بند کروں یا نہ کروں ۔مسٹر مارگن نے ڈپٹی کمشنر مسٹر جانسن کو ٹیلی فون کیا،تمام حالات بتائے ۔مسٹر جانسن نے ذمہ داری لینے سے انکار کر دیا۔اور حکم دیا کہ ملزم کو پانچ سو روپے کی ضمانت پر فورا رہا کر دیا جائے ۔ یہ اطلاع ملک دیوی دیال کو رات کے دس بجے کے قریب پہنچی ۔ ملک صاحب نے ایڈیٹر ریاست اور اس کے ضامن مسٹر کرشن داس کوہلی مینجر مسل کال (جو اس وقت ہندوستانی ٹائمز کے مینجر تھے ۔) کو موٹر میں ساتھ لیا ۔ہم لوگ رات گیارہ بجے کے قریب مسٹر لوئیس سٹی مجسٹریٹ کی کوٹھی پر پہنچے ۔مسٹر لوئیس کو جگایا ،ضمانت کی تصدیق ہو گئی اور ملک صاحب اسی موٹر میں ایڈیٹر ریاست کو دفتر ریاست میں چھوڑ گئے ۔

مسٹر فضل کریم صبح اٹھتے ہی دفتر پہنچے ،تاکہ پٹیالہ کی اپنی امت سے خیر خیریت پوچھیں، جو رات بھر دفتر ریاست کی نگرانی کرتی رہی ۔آپ نے جب دیکھا کہ ایڈیٹر ’’ریاست‘‘ بجائے حوالات کے اپنے گھر پر ہے ۔ان کا رنگ فق ہو گیا ۔ بھاگے ہوئے کوتوالی گئے ۔ ملک دیوی دیال سے پوچھا تو ملک صاحب نے بتایا کہ ملزم کو ڈپٹی کمشنر کے حکم سے ضمانت پر رہا کیا گیا ہے۔فضل کریم صاحب کیا کر سکتے تھے ۔ اپنا سر پکڑ کر رہ گئے ۔

اگلے روز پھر تلاشی ہوئی، جو چند گھنٹے جاری رہی ۔تلاشی کے بعد ایڈیٹر ’’ریاست‘‘ نے مسٹر ویدمورتی ممبر کونسل آف اسٹیٹ (جو ایڈیٹر ریاست کے مکان پر ٹھہرے ہوئے تھے ۔) سے مشورہ کیا اور مشورہ کے بعد دیوان گیان ناتھ سیکرٹری ایجنٹ گورنر جنرل ریاست ہائے پنجاب (جو بعد میں اندور وزیر اعظم ہوئے) کو لاہور ٹیلی فون کیا کہ کرنل سینٹ جان ایجنٹ گورنر جنرل کہاں ہیں ۔ دیوان صاحب نے بتایا کہ وہ شملہ میں ہیں ۔اور وہاں کرزن ہاؤس میں ٹھہرے ہوئے ہیں ۔ ایڈیٹر ’’ریاست‘‘ رات کو دہلی سے سوار ہو کر صبح کالکا پہنچا ۔ کالکا سے موٹر ریل میں شملہ پہنچا ۔اور وہاں

سے کرزن ہاؤس ٹیلی فون کیا تو ایک لیڈی نے بتایا کہ کرنل جان سینٹ آج صبح بذریعہ موٹر ڈلہوزی چلے گئے ہیں۔ اور وہاں دو روز ٹھہر کر ریاست چمبہ کے دورہ پر جائیں گے۔ ایڈیٹر ''ریاست'' اسی روز ڈلہوزی پہنچ کر چمبہ ہاؤس میں کرنل سینٹ جان سے ملنے گیا۔ چمبہ ہاؤس پہنچ کر چپڑاسی کو وزیٹنگ کارڈ دیا، تو مسز سینٹ جان برآمدہ میں آ گئیں۔ یہ خاتون بہت اچھی طرح سے پیش آئیں۔ مجھے ڈرائنگ روم میں لے گئیں، چائے وغیرہ پوچھی۔ میں نے کہا ابھی ہوٹل میں پی کر آیا ہوں۔ مسز سینٹ جان نے اپنے شوہر کو اطلاع کی تو ان کے شوہر نے دفتر کے کمرے میں بلا لیا۔ میں نے کرنل سینٹ جان کو بتایا کہ یہ مقدمہ جھوٹا اور بے بنیاد ہے۔ اور چونکہ مہاراجہ پٹیالہ دشمن ہیں۔ اس لئے یہ مقدمہ بنایا گیا ہے۔ تاکہ مہاراجہ ایکسٹراڈیشن ایکٹ کے ماتحت ظلم کرنے کے لئے مجھے پٹیالہ لے جائیں۔

کرنل سینٹ جان کی باتوں سے معلوم ہوا کہ اس مقدمہ کے متعلق مہاراجہ پٹیالہ اور ان کے وزراء میں سے کسی سے بات چیت ہو چکی ہے۔ بلکہ ان کی منظوری سے کاروائی شروع کی گئی ہے۔ اور ان کو تمام واقعات کا علم ہے۔ کرنل سینٹ جان نے صاف طور سے کہا کہ مقدمہ چاہے جھوٹا ہے یا سچا، گورنمنٹ کسی صورت میں بھی والیان ریاست کو بے نقاب ہوتا نہیں دیکھ سکتی۔ اور وہ ایڈیٹر ''ریاست'' کو ایکسٹراڈیشن ایکٹ کے تحت لازمی طور سے ریاست پٹیالہ کے حوالے کر دے گی۔ ایڈیٹر ''ریاست'' نے کہا کہ کیا برطانوی انصاف یہی ہے۔ تو کرنل سینٹ جان نے فوجی انداز میں جواب دیا۔ ہم انصاف نہیں جانتا۔ ہمارا کام ہے کہ نوابوں اور مہاراجوں کی پریس کے حملوں سے حفاظت کی جائے۔

یہ جواب سن کر میں سمجھ گیا کہ ایجنٹ گورنر اور مہاراجہ پٹیالہ ایک ہیں۔ اور اگر ایجنٹ گورنر جنرل نے ایڈیٹر ''ریاست'' کو مہاراجہ کے حوالہ کر دیا تو اس حکم میں ہائی کورٹ بھی دخل نہیں دے سکتا۔ اور اگر ایجنٹ گورنر جنرل کے حکم سے اگر ایڈیٹر ریاست'' کو

پٹیالہ بھیج دیا گیا،تو وہاں دشمن کے جیل کا ایک دن بھی سال ہا سال کی ہر روز کی موت سے بدتر ہو گا۔اور زیادہ عذاب کا باعث ہو گا۔ چنانچہ میں نے یہ فیصلہ کرلیا کہ اپنے آپ کو ریاست پٹیالہ کے حوالے نہ دوں گا۔

ڈلہوزی سے سوار ہو کر تانگہ میں پٹھان کوٹ پہنچا۔ کیونکہ وہاں کوئی موٹر یا لاری نہ مل سکی۔ پٹھان کوٹ سے ریل شروع ہوتی ہے۔مگر میں ریل میں نہ بیٹھا۔خیال تھا کہ شاید پٹیالہ پولیس نے ایجنٹ گورنر جنرل سے وارنٹ حاصل کر لیے ہوں۔ پٹھان کوٹ سے لاری میں سوار ہوا۔امرتسر پہنچا،امرتسر سے دوسری لاری میں سوار ہوا۔ جالندھر چھاؤنی جا پہنچا۔رات کو کلکتہ جانے والی گاڑی جب لاہور سے جالندھر چھاؤنی پہنچی تو فرسٹ کلاس کا ٹکٹ لے کر کوپے میں بیٹھ گیا اور کمرہ کو اندر سے بند کرلیا ۔رات بھر نیند نہ آئی۔زندگی کا آئندہ پروگرام بناتا رہا۔اگلے روز صبح دس بجے لکھنو پہنچا ۔لکھنو ریلوے اسٹیشن سے انڈین ڈیلی ٹیلی گراف کے دفتر پہنچا۔وہاں اس اخبار کے ایڈیٹر مسٹر آر رنگا سے ملا،تمام حالات بتائے اور کہا کہ میں ہمیشہ کے لئے پانڈی چری میں جا رہا ہوں۔راستہ اور مدراس کے لوگوں سے ناواقف ہوں۔میرے ساتھ پانڈی چری چلیئے اور مجھے وہاں چھوڑ آیئے۔مسٹر رنگا آئر میرے گہرے دوست تھے۔فوراً تیار ہو گئے۔ہم لکھنو سے کان پور آ گئے۔اور کان پور سے جھانسی۔جھانسی صبح کے وقت پہنچے ۔جھانسی سے سولہ میل کے فاصلے پر ریاست دیتا ہے۔وہاں ایک ہم وطن اور دوست لالہ بشن داس چوپڑہ ملازم تھے۔جھانسی سے دیتا پہنچے۔تاکہ اخبار،پریس اور حافظ آباد کی جو کچھ بھی تھوڑی بہت زمین،مکان وغیرہ جائیداد ہے۔ان کے نام منتقل کر دوں،کیونکہ اب فیصلہ کر چکا تھا کہ اب آئندہ زندگی میں ہندوستان کے برطانوی علاقہ میں نہ آسکوں گا۔

ہم دیتا لالہ بشن داس چوپڑہ کے مکان پر پہنچے۔لکھت پڑھت کے متعلق مشورہ ہو رہا تھا۔تو ایک افسر نے ہمیں لالہ بشن داس کے مکان پر بیٹھا دیکھا۔وہ صاحب قاضی

سر عزیز الدین احمد دیوان دیتا کی کوٹھی پر ان سے ملنے جا رہے تھے۔ انہوں نے قاضی صاحب سے ذکر کر دیا کہ دیوان سنگھ آیا ہوا ہے۔ اور لالہ بشن داس چوپڑہ کے مکان پر ٹھہرا ہوا ہے۔ قاضی صاحب کو جب میرے آنے کا پتا چلا تو قاضی صاحب نے موٹر بھیج کر ہمیں بلوالیا۔ ہم جب وہاں پہنچے تو آپ نے دوستانہ شکایت کی کہ ان کو آنے کا پتا کیوں نہ دیا۔

قاضی صاحب سے باتیں ہو رہی تھیں۔ مگر میرا دل پانڈی چری میں تھا۔ قاضی صاحب نے محسوس کیا کہ میں کچھ متفکر ہوں۔ آپ نے پوچھا متفکر کیوں ہو؟۔ میں نے کہا کچھ نہیں۔ انہوں نے جب بار بار پوچھا تو مسٹر رنگا آئر نے تمام قصہ سنا دیا۔ اور بتایا کہ آج رات تو ہم ایکسپریس ٹرین سے بمبئی جا رہے ہیں اور پھر بمبئی سے مدراس جائیں گے اور وہاں سے پانڈی چری۔ قاضی صاحب اخبار ریاست کے نہ صرف مداح تھے، بلکہ اس کو محبت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اور ایڈیٹر ریاست'' کو اپنا دوست سمجھتے تھے۔ جب آپ کو معلوم ہوا کہ میں پانڈی چری جا رہا ہوں اور ''اخبار ریاست'' بند ہو جائے گا۔ اور بند نہ بھی ہوا تو دیوان سنگھ اس کو ایڈیٹ نہیں کر سکیں گے ۔تو آپ کو بہت افسوس ہوا اور آپ کچھ دیر سوچتے رہے۔ سوچنے کے بعد فرمایا کہ پٹیالہ اور دیتا کے درمیان ایکسٹراڈیشن کے متعلق کوئی معاہدہ نہیں۔ اور پٹیالہ کے وارنٹوں کی تعمیل دیتا کی حدود میں نہیں ہو سکتی۔ اور ایڈیٹر ریاست'' قاضی صاحب یا ریاست دیتا کے مہمان کی صورت میں دیتا میں رہے۔ جب تک اس جھگڑے کا فیصلہ نہیں ہو جاتا۔ ایڈیٹر ریاست'' نے قاضی صاحب سے عرض کیا کہ مہاراجہ پٹیالہ آپ کے دشمن ہو جائیں گے۔ یا پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کی طرف سے اعتراض ہو۔ یہ مناسب نہیں۔ قاضی صاحب نے جواب دیا کہ مہاراجہ پٹیالہ کے تعلقات کو دیوان سنگھ کی دوستی پر قربان کیا جا سکتا ہے۔ پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے اعتراض کا وہ جواب دے دیں گے۔ چنانچہ مشورہ کے بعد یہ طے ہوا کہ میں چند روز دیتا میں رہوں۔ ایک دوسرے

دوست سردار تارا سنگھ انجینئر بھی وہاں ملازم تھے۔ وہ مجھے موٹر میں اپنے ہاں لے گیا۔ میں نے ان کے مکان پر قیام کیا۔ مسٹر وید موری کو دہلی تار دے دے گیا۔ کہ آپ فورا دیتا پہنچیں۔ وہ دیتا پہنچے، پھر سب نے مشورہ کیا۔ مشورہ کے بعد اسی روز رات کو مسٹر وید موری شملہ گئے۔ اسمبلی کا اجلاس ہو رہا تھا۔ آپ نے اسمبلی کے تمام ممبران کو جوان کے دوست تھے۔ سب حالات بتائے۔ ممبران اسمبلی حالات سن کر حیران رہ گئے۔ مسٹر نیوگی نے ایڈ جرنمنٹ موشن پیش کر دی۔ مسٹر پٹیل اسمبلی کے صدر تھے۔ ایک ہلچل سی پیدا ہو گئی۔ ہوم ممبر کو بھی حالات کا کچھ پتا نہ تھا۔ وہ بھی حیران رہ گئے۔ کہ ریاستوں میں کیا ہو رہا ہے۔ اور دو سو روپے کے الزام میں ایک جرنلسٹ کو کیوں کر ایک دشمن ریاست کے حوالے کیا جا رہا ہے۔ ہوم ممبر نے پریذیڈنٹ اسمبلی سے کہا کہ تھوڑے عرصہ کی مہلت دی جائے۔ تا کہ پولیٹیکل سیکرٹری سے حالات معلوم کیے جائیں۔ مسٹر کومین ڈائریکٹر انفرمیشن بیورو گورنمنٹ ہند تھے۔ ہوم ممبر کی ہدایت کے مطابق سر تھامسن پولیٹیکل سیکرٹری گورنمنٹ ہند سے پوچھا تو انہوں نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ آخر ہوم ممبر کے یہ وعدہ کرنے پر التوا کی تحریک واپس لے لی گئی کہ جب تک اسمبلی میں اس مسئلہ پر بحث نہ ہو گی۔ اور سوالات کے جواب نہ دیئے جائیں گے۔ دیوان سنگھ کو ایکسٹرا ڈیشن ایکٹ کے ماتحت پٹیالہ کے حوالہ نہ کیا جائے گا۔

اسمبلی ہوم ممبر کے اس وعدے پر سر جان تھامسن پولیٹیکل سیکرٹری نے کرنل سینٹ جان کو لاہور تار دیا کہ ایڈیٹر ریاست کے معاملہ میں کچھ نہ کیا جائے، جب تک پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے سیکرٹری سے اجازت حاصل نہ لی جائے۔ اور مسٹر وید موری نے ایڈیٹر ریاست کو دیتا تار دیا کہ فورا شملہ پہنچو اسمبلی کے ممبران خود مل کر حالات دریافت کرنا چاہتے ہیں۔ میں تار ملنے پر شملہ گیا۔ وہاں مسٹر بی داس، مسٹر ٹی سی گوسوامی (جو پچھلے دنوں بنگال میں منسٹر تھے۔) مسٹر راما ایڈی، مسٹر رنگا آئر، اور مسٹر نیوگی وغیرہ دوستوں سے ملا۔ تمام حالات بتائے۔ اسمبلی کے سوالات تیار کیے گئے۔

ایک درجن کے قریب اسمبلی ممبران نے سپلیمینٹری سوالات پوچھنے کا فیصلہ کیا۔ نوٹس کے بعد سوالات دریافت کیے گئے۔ اور ضمنی سوالات پوچھے گئے۔ مقدمہ کی نوعیت پر اکثر ممبروں نے مذاق اڑایا۔ اور آخر ہوم ممبر نے یقین دلایا کہ دیوان سنگھ کو اس مقدمہ میں پٹیالہ کے حوالہ نہ کیا جائے۔

گورنمنٹ کے اس فیصلہ کے بعد مہاراجہ پٹیالہ سر جان تھامپسن کے پاس پہنچے اور کہا کہ ریاست پٹیالہ کی بہت توہین ہوئی ہے۔ اور اگر دیوان سنگھ کو پٹیالہ کے حوالہ نہ کیا جائے گا، تو آپ گدی چھوڑ دیں گے۔ سر جان تھامپسن نے مہاراجہ کو ٹال دیا۔ اور جب مہاراجہ سر جان سے مل کر چلے گئے تو آپ نے ڈپٹی پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے سیکرٹری مسٹر جے بی گلینسی (جو بعد میں سر برٹرینڈ) گلینسی گورنر پنجاب تھے) سے کہا کہ اگر مہاراجہ گدی چھوڑنا چاہتے ہیں تو چھوڑ دیں، مگر ایک بکری کو بھیڑوں کے حوالہ نہیں کیا جا سکتا۔

ان واقعات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کے والیان ریاست اپنے دشمنوں سے بدلہ لینے کے لئے کیا کچھ کر سکتے تھے۔ اور ان کا مقابلہ کرنے کے لئے کتنی مشکلات اور مصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

انگریزوں کا کریکٹر

''ریاست'' کا دفتر اجمیری دروازے کے باہر تھا۔ایک روز حافظ آباد سے میرے ایک قریبی رشتے دار اور دوست سردار حاکم سنگھ کپور کا خط آیا کہ حافظ آباد کا سب انسپکٹر یہ تحقیقات کر رہا ہے کہ دیوان سنگھ کی زمین، مکان، جائیداد وغیرہ حافظ آباد میں کیا کچھ اور کتنی مالیت کی ہے۔میں نے سمجھا کہ پولیس سیاسی کام کرنے والوں کی ہسٹری شیٹ تیار کرتی ہے۔اور اس کو اپ تو ڈیٹ کرنے کے لئے ہر سال اضافہ کیا جاتا ہے۔پہلی بھی کئی بار ایسی تحقیقات ہوتی رہیں اس سلسلہ میں اب شاید جائیداد بھی معلوم کی جا رہی ہے۔چنانچہ سردار حاکم سنگھ کو میں نے جواب دیا کہ معمولی بات ہے۔پولیس پتا لیتی ہے تو لینے دو جو پوچھتی ہے۔بتادو۔

اس خط کے آنے کے دو ہفتہ بعد ایک روز راقم الحروف دفتر سے نیچے اترا اور موٹر میں سوار ہو کر باہر جانے والا تھا کہ دیوانی عدالت کے پیادہ نے دو سمن دیئے۔ایک سمن تو سول جج سکھر (سندھ) کی عدالت کا تھا۔جس میں لکھا تھا کہ مسٹر نائٹن آئی، سی،ایس چیف منسٹر ریاست خیر پور جو بعد میں (گورنر بمبئی کے ایڈوائزر اور منسٹری معطل ہونے کے باعث صوبہ بمبئی کے سیاہ وسفید کے مالک تھے۔) نے دس ہزار روپے کا دعویٰ دائر کیا ہے۔فلاں تاریخ کو جواب دعویٰ کے لئے سکھر میں حاضر ہو جاؤ۔دوسرا سمن یہ تھا کہ اسی تاریخ کو حاضر ہو کر بتاؤ کہ مقدمہ کے فیصلہ سے پہلے یعنی قبل از ڈگری تمہاری حافظ آباد کی جائیداد کیوں نہ عارضی طور پر قرق کر لی جائے۔تاکہ تم اس جائیداد کو خرد برد نہ کر سکو۔

میں نے دونوں سمنوں پر دستخط کر دیئے اور موٹر پر سیر کو چلا گیا۔

اس مقدمہ کے واقعات یہ ہیں کہ مرحوم ہز ہائی نس میر صاحب خیر پور دہلی میں آئے۔تو ایک روز ملنے کے لئے دفتر ''ریاست'' بھی تشریف لائے۔میر صاحب کا وزن مولانا شوکت علی سے دوگنے کے قریب تھا۔آپ زینہ پر چڑھ نہ سکتے تھے۔اپنی

کار کو نیچے کھڑا کیا۔ اور اپنے اے ڈی سی کو بھیج کو مجھے نیچے بلوایا۔ میں موجود نہ تھا۔ واپس چلے گئے۔ جب دفتر پہنچا تو معلوم ہوا کہ میر صاحب آئے تھے۔ چنانچہ اگلے روز ان کی جائے رہائش (جو دریا گنج) میں ایک کوٹھی میں تھی۔ پر پہنچا۔ میر صاحب سے ملا۔ دو گھنٹہ کے قریب باتیں ہوتی رہیں۔ یہ اپنی مظلومیت کے حالات بتاتے رہے کہ ان کا وزیر اعظم مسٹر ناٹمن آئی سی ایس' جس کو بمبئی گورنمنٹ نے خیر پور میں پورے اختیارات کے ساتھ وزیر اعظم مقرر کیا تھا، کیونکہ اس زمانہ میں ریاست خیر پور ریذیڈنٹ پنجاب کے ماتحت نہ تھی۔ بلکہ سندھ میں ہونے کے باعث گورنر بمبئی کے ماتحت تھی۔ ان کو تنگ کر رہا ہے۔ اور یہ اپنے اس وزیر کے ہاتھوں سخت پریشان ہیں۔ ان واقعات کو بیان کرنے کے ساتھ میر صاحب نے یہ بھی بتایا کہ ان کے پاس ایک روز پہلے خیر پور سے یہ اطلاع آئی ہے کہ مسٹر ناٹمن شکار کو گئے ہوئے تھے۔ وہاں آپ نے کسی جانور پر بد احتیاطی سے بندوق چلائی اور گولی ایک لڑکی کو لگی جو ہلاک ہو گئی۔ میر صاحب کی ذاتی تکلیفیں اور پریشانیاں تو ایڈیٹر ''ریاست'' کے لئے کچھ زیادہ دلچسپی کا باعث نہ تھیں۔ مگر ایک دیہاتی لڑکی کا گولی سے مار دیا جانا بہت افسوس ناک تھا۔ چنانچہ ایڈیٹر ''ریاست'' نے اس ہفتہ کے پرچہ میں ایک نوٹ لکھا، جس میں تمام واقعات لکھنے کے بعد تنقید کی گئی کہ انگریز آئی سی ایس ریاستوں میں جا کر انسانوں کو جانوروں سے زیادہ حیثیت نہیں دیتے۔ اور بے احتیاطی کے ساتھ معصوم لڑکیوں تک کو گولی کے ساتھ ہلاک کر دیا جاتا ہے۔ ریاست میں یہ نوٹ چھپ گیا تو میر صاحب کو کسی نے یہ اطلاع دی کہ وہ لڑکی مری نہیں بلکہ چھروں سے صرف زخمی ہوئی ہے۔ اور چھرے ہسپتال میں ڈاکٹر نے نکال دیئے ہیں۔ چنانچہ اگلے ہفتے ہی اس نوٹ کے متعلق لکھا گیا کہ لڑکی چھروں سے زخمی ہوئی تھی اور چھرے نکال دیئے گئے ہیں۔

پہلے نوٹ کے چھپنے کے بعد دہلی گورنمنٹ کے پریس سپرنٹنڈنٹ (جو اس زمانہ میں مرزا عبدالرحمان تھے۔) نے اپنی ڈیوٹی سمجھتے ہوئے اس نوٹ کا کٹنگ اور اس کا

ترجمہ بمبئی گورنمنٹ کو بھیجا بمبئی گورنمنٹ کے مسٹر نائٹن سے جواب طلب کیا۔ کیونکہ معاملہ ایک لڑکی کے ہلاک ہونے کا تھا۔ مسٹر نائٹن نے جواب دیا کہ الزام غلط ہے انہوں نے کسی لڑکی کو ہلاک نہیں کیا۔ صرف ایک دو چھرے لگے جو نکال دیئے گئے۔ اس جواب کے بعد بمبئی گورنمنٹ نے مسٹر نائٹن سے کہا کہ اپنی پوزیشن صاف کرنے کے لئے ایڈیٹر ''ریاست'' پر دیوانی مقدمہ دائر کرو۔ چنانچہ سکھر کا سرکاری وکیل مقدمہ کی پیروی کرنے کے لئے مقرر ہوا۔ اور سرکاری کورٹ فیس لگا کر مقدمہ دائر کر دیا گیا ۔ اس سلسلہ میں ہی مقدمہ سے پہلے حافظ آباد کی جائیداد دریافت کی گئی اور سمن پہنچے۔

مقدمہ کی تاریخ سے تین چار روز پہلے ایڈیٹر ''ریاست'' مسٹر برج بہاری تو کلی ایڈووکیٹ دہلی اور مسٹر بشن داس چوپڑہ (جو بعد میں خطاب یافتہ رائے صاحب اور ریاست بیکانیر میں ریونیو کمشنر تھے۔ سکھر گئے۔ وہاں روہڑی جنکشن کے ریلوے اسٹیشن کے ویٹنگ روم میں قیام کیا۔ اور توکلی صاحب تو سکھر گئے، تاکہ کوئی مقامی وکیل بھی مقرر کیا جائے۔ اور لالہ بشن داس خیر پور گئے تاکہ وہاں کے اسٹیٹ انجینیر مسٹر سناسنی سے مل کر مسٹر نائٹن سے صلح وصفائی اور مقدمہ واپس لینے کی گفت وشنید کی جائے۔

لالہ بشن داس جب واپس آئے تو انہوں نے بتایا کہ صلح صفائی کا کوئی سوال نہیں۔ مسٹر سناسنی نے بہت کوشش کی مگر مسٹر نائٹن نہیں مانتے کہ وہ اپنی بہت سخت توہین سمجھتے ہیں کہ ان پر لڑکی ہلاک کرنے کا الزام لگایا گیا۔ سکھر میں جب ہم لوگ عدالت میں گئے تو مسٹر توکلی نے پرائیویٹ طور سے سرکاری وکیل سے کہا کہ بطور ایک غیر جانب دار جرنلسٹ کے ایڈیٹر ''ریاست'' نے اپنے پرچہ کی اگلی اشاعت میں ہی جب کہ اس کو علم ہوا، لڑکی کے مرنے کی تردید کر دی۔ اور چھروں سے مسٹر ناٹن بھی انکار نہیں کر سکتے۔ ان حالات میں مقدمہ واپس لے لیا جائے۔ مگر سرکاری وکیل نے اپنی بے بسی کا اظہار کیا کہ مسٹر ناٹن کسی صورت میں بھی مقدمہ واپس نہیں لیں گے۔ وہ

بہت سخت غصہ میں ہیں اور محسوس کرتے ہیں کہ ان کی بڑی سخت توہین ہوئی ہے۔

ہم لوگ مقدمہ کی پیشی کے بعد واپس آگئے۔ اگلے روز راقم الحروف شام کو مسٹر کے سی رائے مینجنگ ڈائرکٹر ایسوسی ایٹیڈ پریس (جن سے بہت گہرے دوستانہ تعلقات تھے۔ اور جن سے ایڈیٹر ''ریاست'' دوسرے تیسرے روز ملا کرتا تھا۔ کے ہاں گیا تو مسٹر رائے نے کئی روز تک نہ ملنے کا سبب پوچھا کہ مسٹر ناٹن کس صوبہ کی سول سروس سے تعلق رکھتے ہیں۔ میں نے کہا بمبئی کے صوبہ سے۔ وہاں سے بطور ریلیٹ آفیسر خیر پور میں گئے۔ اور ریاست خیر پور گورنر بمبئی کے ماتحت ہے۔ مسٹر رائے نے فرمایا کہ بمبئی گورنمنٹ میں ان کے دو افسر بہت گہرے دوست ہیں۔ ایک سر ارنیسٹ ہاٹسن ہوم ممبر (جو گورنر کے رخصت پر جانے کے بعد عارضی طور پر ان دنوں بمبئی کے گورنر تھے) اور دوسرے مسٹر یونگ جنرل سیکرٹری بمبئی گورنمنٹ۔ ان دونوں کے نام خط لے کر بمبئی جاؤ۔ تاکہ مقدمہ واپس لیا جائے، دو تین روز کے بعد مسٹر رائے نے دونوں اصحاب کے نام مجھے خط دیئے۔ جن میں لکھا تھا کہ دیوان سنگھ آپ کا گہرا دوست ہے، مقدمہ واپس لے لیا جائے۔ ایڈیٹر ''ریاست'' یہ خط لے کر بمبئی گیا۔ گرمیوں کا زمانہ تھا۔ بمبئی پہنچ کر معلوم ہوا کہ نہ تو گورنر ارنیسٹ ہاٹسن ہیں اور نہ مسٹر یونگ دونوں بمبئی گورنمنٹ کے گرمائی صدر صدر مقام مہاں بلیشور پہاڑ پر ہیں۔ ایڈیٹر ''ریاست'' بمبئی سے پونا گئے۔ پونا سے موٹر کے ذریعے مہاں بلیشور پہنچا۔ وہاں ایک ہوٹل میں قیام کیا۔ ہوٹل کا مالک ایک پارسی تھا۔ غسل کر کے کپڑے بدلے اور مسٹر یونگ کے پاس پہنچا۔ مسٹر یونگ نہایت شریف، ملنسار اور اچھے آدمی تھے۔ مسٹر رائے کا خط دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ کچھ دیر مسٹر رائے کی صحت کے بارے میں پوچھا۔ پھر آپ نے بتایا کہ ریاست کا محکمہ ٹرنر آئی سی ایس پولیٹیکل سیکرٹری بمبئی گورنمنٹ کے ماتحت ہے۔ جو کچھ مسٹر رائے چاہتے ہیں۔ مسٹر ٹرنر کر دیں گے۔ اور سر ارنیسٹ ہاٹسن سے ملنے کی ضرورت نہیں۔ چنانچہ مسٹر یونگ نے مسٹر ٹرنر کو ٹیلی فون کرنے کے علاوہ ایک خط بھی دیا، اور ساتھ مسٹر

رائے کا خط بھی ایک لفافے میں ملفوف کر دیا۔ میں یہ خط لے کر مسٹر ٹرنر کے پاس پہنچا۔ تھوڑی تھوڑی بوندا باندی ہو رہی تھی۔ مسٹر ٹرنر برآمدے میں بیٹھے فائلیں دیکھ رہے تھے۔ میں نے وزیٹنگ کارڈ بھیجا۔ فوراً بلا لیا۔ مسٹر ٹرنر بہت تند مزاج اور متعصب قسم کے آئی سی ایس تھے۔ آپ نے کہا لڑکی کو ہلاک کرنے کی اطلاع کہاں سے ملی۔ میں نے جواب دیا میں اس کے متعلق کچھ نہیں بتا سکتا کہ یہ صحافتی کریکٹر کے خلاف ہے۔ آپ نے کہا کہ مسٹر ناٹن کا بیان ہے کہ میر صاحب خیر پور نے یہ اطلاع دی، میں نے کہا میں اس کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اس پر وہ غصہ میں آ گئے اور کہا کہ میر خیر پور جیسے ناقابل اعتبار آدمی کا اعتبار کیوں کیا گیا؟۔ میں نے کہا کہ میں اس کا اقرار نہیں کرتا۔ مگر چونکہ آپ کہتے ہیں تو میں پوچھتا ہوں کہ اگر میر خیر پور اتنے ہی ناقابل اعتبار ہیں۔ تو گورنمنٹ کے کاغذات میں وہ ہز ہائی نس کیوں ہیں۔ اور ان کی توپوں کی سلامی کیوں مقرر ہے۔ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ گورنمنٹ ریاستوں کی بے زبان رعایا کو ناقابل اعتبار والیان ریاست کے سپرد اس طرح کرتی ہے کہ جیسے بھیڑوں کو بھیڑیوں کے سامنے ڈال دیا جائے۔ یہ جواب سن کر مسٹر ٹرنر میرے منہ کی طرف دیکھنے لگے کیونکہ وہ توقع نہ کرتے تھے کہ ان سے یہ الفاظ وہ شخص کہے گا جو مقدمہ میں صلح کی درخواست کر رہا ہو۔ اس کے بعد مسٹر ٹرنر نے کہا اخبارات کے حملے سے انڈین سول سروس کے افسر بھی محفوظ نہیں۔ میں نے کہا مسٹر ناٹن سے کوئی عداوت نہ تھی۔ بغیر واقعہ کے الزام نہیں لگایا گیا تھا۔ مسٹر ناٹن کی بندوق سے لڑکی زخمی ہوئی تھی۔ اور جب یہ معلوم ہوا کہ لڑکی مری نہیں زخمی ہوئی ہے۔ تو فوراً لکھ دیا گیا کہ مرنے کی اطلاع غلط تھی۔ لڑکی صرف زخمی ہوئی ہے۔ اس میں اخبار کا کیا قصور؟ مسٹر ٹرنر نے کہا کہ گورنمنٹ کسی بھی قیمت پر اخبارات کے آئی سی ایس افسروں کے خلاف لکھنے کو برداشت نہیں کر سکتی۔ مسٹر ٹرنر میرے جواب سے بہت غصے میں تھے آپ نے کہا مقدمہ کبھی واپس نہیں لیا جا سکتا۔ جس صورت میں کہ ایڈیٹر "ریاست" کا رویہ یہ ہے کہ۔ میں نے کہا میرے لئے جھوٹی خوشامد کرنا بھی

ممکن نہیں۔یہ کہہ کر میں کھڑا ہوگیا اور کھڑا ہوتے ہی کہا۔مجھے افسوس ہے کہ میں نے اپنا اور آپ کا قیمتی وقت ضائع کیا۔مجھے آپ سے ملنے نہیں آنا چاہیئے تھا۔مسٹر ٹرز میرے اس جواب سے اور بھی حیران ہوئے۔وہ خیال بھی نہ کر سکتے تھے کہ ایسا جواب ملے گا۔ جب میں چلا گیا تو وہ حیرانی سے میری پشت دیکھنے لگے۔اور میں جب ان کی کوٹھی سے مڑا تو ان کی نگاہیں میری طرف تھیں۔ مسٹر ٹرز کے بعد میں نے مسٹر یونگ کو ملنا مناسب نہ سمجھا اور دل میں فیصلہ کیا کہ دس ہزار روپیہ کی ڈگری کا روپیہ مسٹر ناٹمن کو ادا کر دوں گا۔مہابلیشور سے واپس پونا پہنچا۔وہاں سے واپس دہلی آیا اور مسٹر رائے کو تمام واقعہ سنایا۔مسٹر رائے کو افسوس ہوا کہ میں مسٹر ارنیسٹ ہاٹسن گورنر سے نہ ملا۔میں نے کہا اب تو میں دس ہزار روپیہ ڈگری کا دوں گا۔مگر ملوں گا نہیں۔

ایک ہفتہ بعد پیشی پر پھر سکھر گیا اور فیصلہ کیا کہ مقدمہ اچھی طرح سے لڑا جائے۔ دو ہفتہ بعد میں اور مسٹر توکلی پھر سکھر گئے۔روہڑی ریلوے ویٹنگ روم میں ٹھہرے۔ کیونکہ یہ جگہ سٹیشن سے بلند بہت پر فضا مقام ہے۔دس بجے سکھر سول جج کورٹ میں گئے،اور عدالت کے اہلمد سے پوچھا کہ پیشی کس وقت ہوگی؟تو اہلمد نے مجھے بتایا کہ سرکاری وکیل کا منشی مجھے تلاش کر رہا تھا۔وکیلوں کے بیٹھنے کی جگہ پر گئے۔سرکاری وکیل کے منشی کو تلاش کیا تو اس نے کہا کہ سرکاری وکیل ملنا چاہتے ہیں۔ہم سرکاری وکیل کے پاس گئے تو اس نے بتایا کہ بمبئی گورنمنٹ کا حکم اس کے پاس پہنچا ہے کہ کورٹ فیس وغیرہ پر جو کچھ خرچ ہوا ہے۔وہ لے کر مقدمہ واپس لے لیا جائے۔چنانچہ کورٹ فیس اور سرکاری وکیل کی فیس چودہ سو روپیہ جو گورنمنٹ نے ادا کی تھی۔وہ ہم نے سرکاری وکیل کو دی۔عدالت میں گئے۔سرکاری وکیل نے مقدمہ واپس لینے کے لئے عدالت سے درخواست کی۔مقدمہ واپس لے لیا گیا اور ہم واپس دہلی آ گئے۔

مسٹر ٹرز اور ایڈیٹر ''ریاست'' کے درمیان گو باتیں کچھ تلخی کے ساتھ ہوئیں۔اور ایڈیٹر ''ریاست'' سخت جواب دے کر مسٹر ٹرز سے جدا ہو گیا۔مگر آپ نے میرے

جانے کے بعد سرکاری وکیل سکھر کے نام حکم لکھ دیا کہ جو روپیہ گورنمنٹ کا خرچ ہوا ہے ۔وہ لے کر مقدمہ واپس لے لیا جائے ۔ چنانچہ ایک صورت تو وہ تھی کہ ہم مسٹر ناٹن مدعی سے مقدمہ واپس لینے کی درخواستیں کرتے رہے، مگر وہ صلح پر آمادہ نہ ہوتے تھے۔ اور ایک صورت یہ کہ سرکاری وکیل کا منشی صلح کے لئے ہمیں تلاش کرتا رہا۔ یہ سب کچھ مسٹر رائے کی کوشش، دوست نوازی اور محبت کا نتیجہ تھا۔ اور اس واقعہ سے انگریزوں کے قومی کریکٹر کا بھی پتا چلتا ہے۔ کہ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں سے متاثر نہیں ہوتے تھے ۔اور اگر بات چیت میں تعلقات شریفانہ طریقہ سے ناخوش گوار بھی ہو جائیں تو ان پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا ۔اور وہ بطور ایک سپورٹس مین اپنی اور دوسروں کی کمزوریوں سے درگزر کرتے ہیں ۔

مہاراجہ نابھ کی نظر بندی کا سبب

مہاتما گاندھی کا پوسٹ کارڈ

مرحوم راجہ نابھ میں بھی انسانی کمزوریاں تھیں۔ مگر آپ کی معزولی کا اصلی باعث پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کا آپ کے خلاف ہونا تھا۔ چنانچہ پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کی مخالفت کا سلسلہ اس وقت سے شروع ہوتا ہے جب کہ آپ ابھی ولی عہد تھے۔ گورنمنٹ نے تو اپنی حمایت کے لئے آپ کو سینٹرل اسمبلی جو اس وقت امپیریل لیجسلیٹو کونسل کے نام سے تھی) کا ممبر نامزد کیا۔ مگر آپ اسمبلی میں گورنمنٹ کا ساتھ چھوڑ کر مرحوم مسٹر گوکھلے کے ساتھ مخالف بنچوں پر جا بیٹھے۔ چنانچہ آپ کے مصائب کی بسم اللہ یہاں سے ہوتی ہے۔ آپ کے ولی عہدی کے زمانہ میں ہی سر لوئیس ڈین گورنر پنجاب جن کے ماتحت ان دنوں پنجاب کی ریاستیں تھیں نے گورنمنٹ آف انڈیا کو رپورٹ کی تھی کہ ٹکہ نابھ (یعنی مرحوم مہاراجہ نابھ) کو جب گرمی پر بٹھانے کا زمانہ آئے تو یہ غور کر لیا جائے کہ یہ گورنمنٹ کے خلاف ہیں۔ وفا شعار نہیں ہیں۔ اس کے بعد کشیدگی زیادہ بڑھتی گئی اور نتیجہ آپ کی معزولی کی صورت میں ہوا۔ آپ کی معزولی کی داستان بہت طویل ہے۔ اس کے چشم دید حالات پھر عرض کروں گا۔ کیونکہ میں معزولی کے وقت نابھ میں موجود تھا، اور میری آنکھوں کے سامنے سب کچھ ہوا۔ میرے اس لکھنے کا مطلب یہ ہے کہ بقول مرحوم مولانا محمد علی صاحب جیسا کہ آپ نے اپنی کانگرس کی صدارتی تقریر میں فرمایا تھا کہ مہاراجہ کی معزولی کا سبب آپ کی صفات یعنی حب الوطنی اور خودداری تھی۔ نہ کہ آپ کے نقائص (جن کو سامنے رکھ کر گورنمنٹ نے آپ کو معزول کیا) کیونکہ اگر ان نقائص کی بنا پر دوسرے اہالیان ریاست کو بھی سزا دی جاتی تو شاید ایک والی ریاست بھی گدی پر حکمران نہ رہتا۔

مہاراجہ نابھ نے اپنی معزولی کے بعد گورنمنٹ کے حکام سے تو تعاون کرنا ہمیشہ

کے لئے چھوڑ دیا تھا۔ اور آپ اس کوشش میں رہے کہ کانگرس اور پارلیمنٹ کے لیبر ممبروں کے ذریعے انصاف حاصل کریں۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے آپ کی دعوت پر سر چمن لال سیتا وادا اور مرحوم پنڈت موتی لال نہرو اور سر رنگا آئر، مسٹر جناح، سر دول سنگھ کویشر۔ ماسٹر تارا سنگھ، مولانا محمد علی، سر سنکر انائر، سری پی، راما، سوامی آئر وغیرہ درجنوں ہندوستانی لیڈر اور مسٹر مارڈی جونس اور مسٹر تھرٹھل وغیرہ ممبران پارلیمنٹ مہاراجہ سے ملے اور ان لوگوں میں سے اکثر نے مختلف طریقوں سے مہاراجہ سے روپیہ بھی حاصل کیا۔ چنانچہ بعض اصحاب نے تو ایک ایک، دو دو لاکھ بھی گدی پر واپس بٹھانے کے نام پر وصول کیا۔

مہاراجہ نابھ ان تمام اصحاب کی معرفت کوشش کرتے رہے۔ کبھی پارلیمنٹ میں سوال، کبھی اسمبلی میں تقریریں، کبھی میموریل، کبھی ڈیپوٹیشن، مگر نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ کیونکہ پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ آپ کے خلاف تھا۔ مہاراجہ کو مشورہ دیا گیا کہ اگر مہاتما گاندھی آپ کے مسلہ میں دلچسپی لیں تو آپ گدی پر واپس جا سکتے ہیں۔ چنانچہ مہاتما گاندھی پر اثر ڈالنے کی کوشش کی گئی۔ پنڈت موتی لال نہرو کی مسوری میں دعوتیں ہوئیں۔ مرحوم مولانا محمد علی نے مہاتما جی سے کہا۔ مختلف ممبران اسمبلی اور لیڈروں کے ذریعے سے اثر ڈالنے کی کوشش کی گئی۔ سردار سر دول سنگھ کویشر اس سلسلہ میں کئی بار مہاتما جی سے ملے اور مہاراجہ نے اپنی مظلومیت کے متعلق نہ صرف تمام مطبوعہ لٹریچر بھیجا جو چھاپا گیا تھا۔ بلکہ ٹائپ کرا کر بہت طویل خط بھی مہاتما جی کو لکھے کہ آپ اس مسلہ پر ذاتی توجہ کیجئے۔ اور وائسرائے سے مل کر واپس گدی پر بھجوائیے۔

اس تمام لٹریچر، اثرات اور خط و کتابت کے بعد مہاتما جی کا ایک پوسٹ کارڈ مہاراجہ نابھ کے نام مسوری پہنچا۔ جس میں صرف دو چار سطریں پنسل سے لکھی تھیں۔ اور جن کا مطلب یہ تھا کہ تمام لٹریچر اور خطوط پڑھنے اور حالات سننے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ مہاراجہ نابھ کانگریس یا مہاتما گاندھی کی امداد کے مستحق نہیں۔

مہاتما گاندھی تو ہر شخص کو اپنے کریکٹر کی بلندی کے پیمانہ سے ناپتے تھے۔انہوں نے دیکھا کہ مہاراجہ نابھ چونکہ انسانی کمزوریوں سے پاک نہیں ہیں۔اس لئے وہ مہاتما جی یا کانگرس کی ہمدردی یا امداد کے مستحق نہیں۔مگر یہ پنسل کا لکھا ہوا پوسٹ کارڈ ہی مہاراجہ نابھ کی مزید تباہی یا کوڈائی کنال میں نظر بندی کا باعث ہوا۔مہاراجہ کی ڈاک سنسر ہوتی تھی۔اس کارڈ کا فوٹو گورنمنٹ کے پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے پاس پہنچ گیا،اور اس کے بعد گورنمنٹ نے فیصلہ کیا کہ مہاراجہ کو ہمیشہ کے لئے کسی دور دراز مقام پر بند کر دیا جائے۔چنانچہ ایک دوسرا الزام لگا کر آپ کو ڈائی کنال میں نظر بند کر دیا گیا۔جہاں سے آپ مرتے دم تک رہا نہ کیے گئے اور وہیں نظر بندی کی حالت میں انتقال کر گئے۔

روپیہ سے محبت نہ کرو

دہلی سے روزانہ ''ریت'' جاری کرنے سے پہلے راقم الحروف لکھنو، کان پور اور آلہ آباد اس غرض کے لئے گیا کہ اگر کسی پریس کانفرنس کا انتظام ہو جائے تو وہاں سے روزانہ اخبار جاری کیا جائے۔ اس زمانہ میں پریس ایکٹ بہت سخت تھا۔ کسی پریس میں بھی اخبار چھاپنے کا انتظام نہ ہو سکا۔ میں اس سلسلہ میں جب آلہ آباد گیا تو سید اکبرالہ آبادی کی خدمت میں بھی حاضر ہوا۔ میں رات کو تو ایک سرائے میں سوتا تھا۔ جہاں ایک کوٹھری کرایہ پر لے رکھی تھی۔ مگر دن بھر اکبر صاحب کی خدمت میں عشرت منزل رہتا۔ وہاں چار پانچ روز رہا۔ حضرت اکبر جیسے شاعروں اور فلاسفروں کو دنیا صدیوں کے بعد پیدا کرتی ہے۔ اکبر تمثیل دینے کے اعتبار سے بھی اپنا ثانی نہ رکھتے تھے۔ ایک روز فیاضی اور کنجوسی کے فلسفہ پر باتیں ہو رہی تھیں کہ آپ نے فرمایا کہ روپیہ سے اتنی محبت کرنی چاہیے۔ جتنا ایک انگریز اپنے بہرا یا خانساماں سے کرتا ہے۔ یعنی جب بہرا یا خانساماں سے کام لینا ہو تو انگریز بہرا اور خانساماں کو اپنے کمرے میں بلا لیتا ہے۔ مگر جب کام نکل جاتا ہے تو اس بہرا یا خانساماں کو اس کے کمرے میں ایک منٹ بھی ٹھہرنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ یعنی روپیہ سے کام لو، مگر اس سے محبت نہ کرو

۔

سیاسی جرائم کی تعزیز لا حاصل

میں لاہور کے ہفتہ وار ہندوستان میں کام کرتا تھا کہ ایک روز ماسٹر موتا سنگھ جن کو سکھوں میں ڈی ویلرا کہتے ہیں۔ جو پنجاب پولیس کی انتہائی کوشش کے باوجود کئی برس تک گرفتار نہ ہو سکے۔ جو مرحوم کنگ نادر خان آف افغانستان کے ذاتی دوستوں میں سے تھے۔ جن کی زندگی کا زیادہ حصہ جیلوں میں گزرا۔ جن کی شہادت جیل کمیشن کے سامنے قیدیوں کے نمائندہ کے طور پر ہوئی، اور جو آج کل پنجاب اسمبلی کے ممبر ہیں، مجھ سے ملے اور انہوں نے بتایا کہ مرحوم راجہ پٹیالہ بھسوڑ (ریاست پٹیالہ) کے قومی ورکر بابو تیجا سنگھ کو بہت تنگ کر رہے تھے۔ (بابو تیجا سنگھ بہت بلند کریکٹر کے بزرگ تھے۔) وہاں کے لڑکیوں کے ہائی سکول کے منیجر تھے۔ مہاراجہ پٹیالہ نے بابو تیجا سنگھ کو اپنے گرمائی صدر مقام چایل سے پیغام بھیجا کہ کچھ لڑکیوں کو ساتھ لے آؤ۔ بابو تیجا سنگھ بہت باغیرت شخص تھے۔ آپ نے مہاراجہ پٹیالہ کی رعیت ہوتے ہوئے بھی اس خواہش کی تکمیل سے انکار کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مہاراجہ بابو تیجا سنگھ کے دشمن ہو گئے۔ اور ماسٹر موتا سنگھ نے یہ بھی کہا کہ بابو تیجا سنگھ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ میں بھسوڑ آؤں۔ ماسٹر موتا سنگھ نے یہ بھی کہا کہ بابو تیجا سنگھ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ میں بھسوڑ آؤں، ماسٹر تیجا سنگھ ان دنوں بھسوڑ ہائی سکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ ماسٹر موتا سنگھ کی خواہش کے مطابق میں بھسوڑ پہنچ گیا۔ وہاں ماسٹر موتا سنگھ، بابو تیجا سنگھ اور سکھوں کے دوسرے قومی ورکر موجود تھے۔ مشورہ ہوتا رہا کہ کیا کرنا چاہیئے؟ ۔ آخر طے پایا کہ مہاراجہ پٹیالہ کی زیادتیوں کے متعلق اخبارات میں مضامین شائع ہوں۔ اور ان تمام سختیوں کو جو آپ بابو تیجا سنگھ کے خلاف کر رہے ہیں۔ پبلک میں بے نقاب کر دیا جائے۔ چنانچہ مجھ سے کہا گیا کہ اردو زبان میں ایک پمفلٹ لکھوں جو شائع ہو۔

میں لاہور واپس آ گیا۔ ان دنوں میرا قیام لاہور موری دروازہ کے اندر اولڈ ہندو

ہوٹل میں تھا۔ جہاں کھانے اور رہائش دونوں کے لئے ہر بورڈر سے چھ روپے ماہوار لیا جاتا تھا۔ کھانے میں ایک دال اور ایک سبزی ملتی تھی۔ دال تو خیر پھر بھی غنیمت ہوتی مگر سبزی وہ پکائی جاتی ہمیشہ جس کا موسم جا چکا ہوتا، اور بازار میں جسے کوئی نہ خریدتا۔ میرا خیال ہے کہ اس زمانہ میں یہ ہوٹل شاید تمام لاہور میں ارزاں ترین بورڈنگ ہاؤس تھا۔ جس میں ساٹھ کے قریب بورڈر رہتے تھے۔

اسی ہوٹل میں پہنچ کر میں نے پمفلٹ لکھا جس کا نام ''خون شہادت کا تازہ قطرہ تھا۔'' یہ پمفلٹ بہت اچھا لکھا گیا۔ جس کی کتابت امرت سر کے بہت اچھے کاتب منشی فرخ سے کرائی گئی۔ اور لاہور پہنچنے کے بعد دوستوں سے مشورہ کیا۔ اور وہاں کے سب سے اچھے پریس میں یہ دو ہزار چھپا۔ جب یہ پمفلٹ چھپ چکا۔ ابھی اس کی سلائی نہیں ہوئی تھی۔ تو میں دو سو کاپیاں سلوا کر پریس سے لے آیا، جن میں سے کچھ میں نے اسی روز بعض دوستوں میں تقسیم کیں، پمفلٹ کو دیکھتے ہی اس کا چرچا شروع ہوا۔ شام تک مہاراجہ پٹیالہ کے دوستوں کو بھی علم ہو گیا جو لاہور میں تھے۔ ان میں سے ایک صاحب نے جو لاہور میں سکھوں کے ایک لیڈر تھے۔ اور اس زمانہ میں حکام رس تھے۔ یہ پمفلٹ حکام تک پہنچا دیا۔ رات بھر مشورہ ہوتا رہا کہ کیا کرنا چاہیئے۔ آخر طے پایا کہ اس پمفلٹ کو دوبارہ چھاپ کر شائع کیا جائے۔ بابو تیجا سنگھ نے مجھے دو سو روپے اخراجات کے لئے دیئے۔ پمفلٹ کی ایک کاپی لے کر میں لدھیانہ پہنچ گیا۔ لدھیانہ سے دہلی آیا۔ یہاں مہاراجہ ہوٹل میں قیام کر کے منشی فردوس خوش نویس کے گھر گیا۔ ان کو پمفلٹ کتابت کرنے کے لئے دیا اور کہا کہ جو اجرت چاہو لے لو۔ مگر دن رات لگا کر اس پمفلٹ کو جلدی لکھ کر دو۔ منشی فردوس نے تمام کام چھوڑ کر کتابت کر دی۔ کاپیاں لے کر میں مچھلی والاں کے ایک پریس میں گیا۔ جس کا نام جے اینڈ سنز پریس تھا۔ پریس اب بند ہو چکا ہے۔ مالک پریس سے میں نے پمفلٹ چھاپنے کے لئے کہا۔ اگلے روز دو ہزار پمفلٹ تیار صورت میں مجھے مل گئے۔ میں ان پیکٹوں کو لے کر

لدھیانہ پہنچا۔ کچھ وہاں کے ڈاک خانے میں پوسٹ کیے پھر جالندھر پہنچا، وہاں پوسٹ کیے، پھر امرت سر گیا، وہاں پوسٹ کیے اور باقی لاہور آ کر پوسٹ کر دیئے۔

ادھر تو یہ پمفلٹ اس طریقہ سے پوسٹ کر دیئے گئے۔ ادھر دہلی گورنمنٹ کو جب یہ علم ہوا کہ ضبط شدہ پمفلٹ دوبارہ چھاپ کر تقسیم کیا گیا ہے تو جے اینڈ سنز کی ضمانت ضبط کر لی گئی۔ اور منشی فردوس کاتب کو پولیس نے پریشان کیا اور پوچھا کہ پمفلٹ کتابت کے لئے کس نے دیا اور کون لے گیا وغیرہ۔

پمفلٹ کے تقسیم ہونے کے بعد میں بدستور اسی ہندو ہوٹل میں رہتا تھا۔ اور کام ہندوستان میں لالہ رام رچھپال سنگھ شیدا مرحوم کے ماتحت کرتا تھا۔ ایک روز اتوار تھا۔ ہوٹل میں صبح بیدار ہوا۔ پاخانہ گیا اور جب واپس آیا تو میرے کمرے میں میری چارپائی پر ایک مسلمان بیٹھے تھے۔ میں نے پوچھا فرمایئے کس طرح تشریف لائے؟۔ آپ نے بتایا کہ کوتوالی میں انسپکٹر صاحب نے ملنے کے لئے بلایا ہے۔ میں نے پوچھا کیا کام ہے۔ تو آپ نے کہا کہ ان کو کچھ علم نہیں۔ میں تانگہ میں ان کے ساتھ دہلی دروازہ والی کوتوالی میں گیا۔ انسپکٹر انچارج کوتوالی کے سامنے پیش کیا گیا۔ انسپکٹر نے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس مسٹر کلارک کو ٹیلی فون کیا۔ ایک سب انسپکٹر پولیس آیا اور مجھے وہ سب انسپکٹر مسٹر کلارک کی کوٹھی پر لے گیا۔ کیونکہ اتوار کے باعث یہ اپنی کوٹھی ہی پر تھے۔ یہ مسٹر کلارک کٹر قسم کے اینگلو انڈین تھے۔ بہت تند مزاج جو ہندوستانیوں کو انسان ہی نہ سمجھتے تھے۔ اور ان کی پبلک میں یہ عام شکایت تھی۔ میں جب ان کے سامنے پیش کیا گیا تو انہوں نے کہا کہ پولیس دو ہفتہ سے تمہیں تلاش کر رہی تھی، تم کہاں تھے۔ میں نے کہا کہ اولڈ ہندو ہوٹل میں رہتا تھا اور کام اخبار ''ہندوستان'' میں کرتا تھا۔ ان سے پتا چلا کہ پمفلٹ کے شائع اور ضبط ہونے کے بعد مجھ پر مقدمہ ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کے ماتحت قائم کیا گیا ہے۔ پولیس مجھے میرے وطن حافظ آباد تلاش کرتی رہی اور آخر بہت مشکل سے پولیس کو اولڈ ہندو ہوٹل کا پتہ ملا۔ مسٹر

کلارک نے سب انسپکٹر کو حکم دیا کہ مجھے ہتھکڑی لگائی جائے اور چونکہ آج اتوار ہے۔ سب انسپکٹر مجھے ڈپٹی کمشنر کی کوٹھی پر ہی ریمانڈ کے لئے لے جائے۔ کیونکہ گرفتاری کے وارنٹ ڈپٹی کمشنر کے دستخط سے ہی جاری ہوئے تھے۔

سب انسپکٹر اور کانسٹیبل مجھے ڈپٹی کمشنر کی کوٹھی پر لے گئے۔ ڈپٹی کمشنر مسٹر ٹالنٹن تھے۔ ان کی اس زمانے میں غالباً شادی نہیں ہوئی تھی۔ شراب کثرت سے پیتے تھے۔ اور چونکہ آج اتوار تھا، اس لئے معلوم ہوا کہ شراب میں مخمور ہیں۔ سب انسپکٹر نے بہرا سے کہا کہ وہ صاحب بہادر سے ملنا چاہتے ہیں۔ ایک ملزم کا ریمانڈ لینا ہے۔ بہرا نے مسٹر ٹالنٹن کو اطلاع دی تو مسٹر ٹالنٹن نشہ میں غٹ کچھ تھوڑے سے لڑکھڑاتے ہوئے برآمدہ میں تشریف لائے۔ اور آتے ہی سب انسپکٹر سے پوچھا۔ سب انسپکٹر نے سلیوٹ کرتے ہوئے کہا کہ حضور ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کا یہ ملزم ہے۔ آج اتوار ہے اور ریمانڈ لینا ہے۔ چنانچہ سب انسپکٹر نے وارنٹ پیش کیے جو وہ مسٹر کلارک سے لایا تھا۔

مسٹر ٹالنٹن نشے میں چور تھے۔ انسان شراب کے نشہ میں بہت فیاض اور فراخ دل ہوتا ہے۔ آپ نے میری طرف دیکھا اور مخمور آواز میں بولے۔ ویل کیا تم کل ہماری کورٹ میں آئے گا؟۔ میں نے کہا ضرور آؤں گا اگر آپ کہتے ہیں۔ میرے اس جواب پر مسٹر ٹالنٹن نے سب انسپکٹر سے کہا۔ کھول دو ہتھکڑی اور مجھ سے کہا کہ کل ہماری کورٹ میں حاضر ہو جاؤ۔ ڈپٹی کمشنر تو یہ حکم دے کر برآمدہ سے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ مگر سب انسپکٹر حیران کہ ڈیفنس آف انڈیا کا مقدمہ ہے۔ دو ہفتے مختلف مقامات پر تلاش کرنے کے بعد مشکل سے ملزم ملا اور ڈپٹی کمشنر نے شراب کے نشے میں چھوڑ دیا۔ کیا کیا جائے۔ سب انسپکٹر مجبور تھا۔ اس نے ہتھکڑی کھول دی اور وہ تو واپس مسٹر کلارک کے پاس چلا گیا اور میں ہوٹل میں واپس آ گیا۔

اگلے روز سوموار کو میں مسٹر ٹالنٹن کی عدالت میں گیا اور جب پیش ہوا تو مسٹر ٹالنٹن بغلیں جھانکنے لگے۔ بہت پریشان نظر آتے تھے کہ کل نشہ میں کیا حکم دے چکے تھے۔

کبھی کاغذات کو الٹتے اور کبھی میری طرف دیکھتے، کبھی سوچتے، آخر آپ نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا:

''ویل اگر تم معافی مانگو اور یہ وعدہ کرو کہ آئندہ تم کبھی اس قسم کا پمفلٹ نہ چھاپو گے تو ہم تم کو چھوڑ دیتا ہے۔

ناتجربہ کاری اور جوش کا زمانہ تھا، میں نے جواب دیا میں کوئی وعدہ نہیں کرتا۔ نہ میں معافی مانگتا ہوں۔ اور نہ میں نے کوئی جرم کیا ہے۔ آپ مقدمہ چلایئے۔

میرا یہ خلاف توقع جواب سن کر مسٹر ٹالنٹن اور پریشان ہوئے اور آپ نے چپڑاسی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ اس لڑکے کو عدالت سے باہر نکال دو۔ چھوکرا ہے جانتا ہی نہیں کہ مقدمہ کیا ہوتا ہے۔

چپڑاسی نے میری پیٹھ پر ہاتھ رکھا اور مجھے باہر جانے کے لئے کہا۔ میں عدالت سے باہر آ گیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ مسٹر ٹالنٹن نے یہ لکھ کر مقدمہ داخل دفتر کر دیا کہ ملزم نوجوان لڑکا ہے۔ ناتجربہ کار ہے۔ اس کو تنبیہ کر دی گئی ہے کہ آئندہ گورنمنٹ اور راجہ پٹیالہ کے خلاف کبھی کچھ نہ لکھے۔ اور چونکہ پہلی بار جرم کیا ہے۔ اس لئے تنبیہ ہی کافی سمجھی گئی ہے۔

یہ میری پہلی گرفتاری تھی۔ اس کے بعد مجھ پر درجنوں مقدمات قائم کئے گئے۔ اگر کسی اخلاقی جرم کا مرتکب ہوتا تو شاید کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتا۔ مگر سیاسی زندگی کی یہ ابتدا ایک دوامی زندگی کا باعث ثابت ہوئی۔ اور جب بھی کوئی نیا مقدمہ قائم ہوا، گو اس میں تکلیفیں تو بہت ہوئیں، مگر جوش، زندگی، قوت ارادی میں ہمیشہ اضافہ ہی ہوا۔ چنانچہ دنیا میں سیاست کی راہ میں گرفتاریاں، سزائیں کبھی بھی توبہ کرنے کا باعث نہ ہو سکیں۔ بشرطیکہ ملزم ملک کے مخلص اور بے غرض خادم ہوں۔

تعزیر جرم عشق ہے بے ضرر محتسب
بڑھتا ہے اور ذوق گناہ اور سزا کے بعد

احسان کرنا اور احسان جتانا

رائے بہادر ڈاکٹر متھرا داس جو ہندوستان کے بہترین آئی سپشلسٹ تسلیم کیے جاتے تھے۔ جب ملازمت میں داخل ہوئے تو ان کی ماہوار تنخواہ پچیس روپے تھی۔ اور ایک ہاسپٹل اسٹنٹ (جن کو اب سب اسٹنٹ سرجن کہا جاتا ہے۔) آپ ہندوستان بھی میں سب سے پہلے ہاسپٹل اسٹنٹ تھے۔ جو میڈیکل کالج میں تعلیم حاصل کیے بغیر اسٹنٹ سرجن ہوئے اور بعد میں سول سرجن کے عہدہ پر پہنچے۔ آپ نے اپنی زندگی میں موتیا بند آنکھوں کے اتنی تعداد میں آپریشن کیے کہ غالباً دنیا کے تمام ڈاکٹروں کے آپریشنوں کی مجموعی تعداد بھی اس سے کم ہے۔ آپ نے اپنی حیات میں لاکھوں روپیہ پیدا کیا، اور لاکھوں خیرات میں دیا۔ آپ کے روپے سے اس وقت ایک کالج اور کئی اسکول چل رہے ہیں۔ اور اگر میرا اندازہ غلط نہیں تو آپ پانچ چھ ہزار روپیہ ماہوار مسلسل خیرات میں صرف کرتے ہیں۔ اور آپ کو تمام ہندوستان میں شہرت نصیب ہے۔ چنانچہ عرصہ ہوا مہاتما گاندھی نے بھی آپ کی تعریف میں اپنے اخبار میں ایک مضمون لکھا تھا۔ ڈاکٹر متھرا داس نہ صرف بطور ڈاکٹر بہت کامیاب انسان ہیں، بلکہ بطور انسان میں ان میں اخلاص اور نیک نیتی وغیرہ کی بعض ایسی صفات موجود ہیں، جو ان کی کامیابی کا سب سے بڑا سبب کہی جاسکتی ہیں۔ اور جن کے باعث آپ کو عالمگیر شہرت اور ہر دل عزیزی نصیب ہوئی۔ ڈاکٹر متھرا داس کی شروع کی زندگی میں جب کہ آپ موگا کے اسپتال میں مقرر ہوئے۔ فیروزپور کے سول سرجن کرنل ایڈی تھے۔ کرنل ایڈی شاہانہ مزاج کے خوشامد پرست انگریز تھے۔ مگر نہایت شریف اور نیک۔ جس پر مہربانی کرتے ہمیشہ ہی اس کی امداد پر کمربستہ رہتے۔ یہ ڈاکٹر متھرا داس پر بہت مہربان تھے۔ اور آپ نے ڈاکٹر متھرا داس کی قدم قدم پر مدد کی۔ یہ کئی برس فیروزپور میں سول سرجن رہے۔ وہاں سے پنجاب کے چیف میڈیکل آفیسر وغیرہ ہو گئے۔ اور ریٹائر ہونے کے بعد پھر آپ نے فیروزپور میں ہی

مستقل رہائش وغیرہ اختیار کر لی۔ کیونکہ فیروز پور کی آب وہوا ان کو موافق تھی۔ اور وہاں دوستوں کا حلقہ بھی پیدا ہو چکا تھا۔

کرنل ایڈی کو ریٹائر ہونے کے بعد کئی برس فیروز پور میں رہتے ہو گئے۔ ڈاکٹر متھر اداس کا معمول تھا کہ وہ جب کبھی فیروز پور کسی کام سے جاتے تو کرنل ایڈی سے ملنے ان کی کوٹھی ضرور پہنچ جاتے۔ ایک دن کرنل ایڈی نے ڈاکٹر متھر اداس سے کہا کہ ان کو ایک گائے کی ضرورت ہے۔ موگا سے خرید کر بھجوا دی جائے۔ ڈاکٹر متھر اداس نے واپس موگا پہنچ کر ایک بہت اچھی گائے اسی روپے میں خریدی اور اپنے آدمی کے ساتھ فیروز پور کرنل ایڈی کو بھیج دی۔ ایک ماہ کے بعد ڈاکٹر متھر اداس کو پھر فیروز پور جانے کا اتفاق ہوا تو آپ حسب معمول کرنل ایڈی سے ملنے گئے۔ باتوں باتوں میں کرنل ایڈی نے کہا گائے بہت اچھی تھی۔ یہ کتنے میں خریدی گئی ہے۔ ڈاکٹر متھر اداس نے کہا قیمت کا کیا سوال؟ ۔ یہ سب کچھ آپ کا ہے۔ کرنل ایڈی حاکمانہ سپرٹ کے انگریز تھے۔ آپ نے کہا نہیں ہم حکم دیتا ہے کہ گائے کتنے میں خریدی گئی۔ ڈاکٹر متھر اداس کرنل ایڈی کی نبض پہچانتے تھے اور جانتے تھے کہ جب وہ حکم کا لفظ استعمال کریں اور پھر ضد بھی کی جائے تو وہ ناراض ہو جاتے ہیں۔ آپ نے جواب دیا کہ اسی روپے میں۔ کرنل ایڈی نے فوراً اسی روپے کا چیک لکھ کر ڈاکٹر متھر اداس کو دے دیا۔ اور ڈاکٹر متھر اداس صاحب چلے آئے۔

چیک لانے کے بعد یہ چیک کئی روز تک ڈاکٹر متھر اداس کے پاس پڑا رہا۔ ڈاکٹر متھر اداس صاحب سوچا کرتے تھے کہ اس چیک کا کیا کریں۔ کرنل ایڈی کے ان پر بہت احسان تھے۔ ان کا ضمیر یہ گوارا نہ کرتا تھا کہ اتنے بڑے محسن سے گائے کی قیمت لی جائے۔ کرنل ایڈی اپنی طرف سے روپیہ ادا کر چکے تھے۔ ان کے بینک میں کئی لاکھ روپے تھے۔ اور ان کو خیال بھی نہ رہا ہوگا کہ چیک کیش بھی ہوا یا نہیں۔ ڈاکٹر متھر اداس کئی روز سوچتے رہے کہ کیا کریں۔ آخر انہوں نے اپنے محسن سے گائے کی قیمت

لینا گوارا نہ کی، اور چیک بغیر کرنل ایڈی کو بتائے پھاڑ دیا۔ اور لطف یہ کہ کرنل ایڈی جب تک زندہ رہے وہ یہی سمجھتے رہے کہ وہ گائے کی قیمت ڈاکٹر متھرا داس کو ادا کر چکے ہیں۔

اس واقعہ سے ڈاکٹر متھرا داس کے اخلاص، محسن شناسی، اور نیک نیتی کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ میرا یقین ہے کہ اگر یہ صفات ڈاکٹر متھرا داس میں نہ ہوتیں تو وہ بھی معمولی ڈاکٹروں کی طرح گم نامی کی زندگی بسر کرتے۔ اور موجودہ عروج حاصل کرنا ان کے لئے ممکن نہ ہوتا۔ جب کوئی شخص کسی سے اخلاص اور نیک سلوک کرتا ہے تو قدرت لازمی طور پر اس مخلص اور نیک شخص کو اس کا معاوضہ دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کا ہر مخیر شخص ہمیشہ مالا مال رہا ہے۔

یہ واقعہ ان لوگوں کے لیے آنکھیں کھولنے کا باعث ہونا چاہیئے۔ جو اگر احسان کرتے تو جتا کر اور بقول ہندی کے مشہور شاعر کے، اگر خیرات دینے والے نے خیرات دے کر اس کا اظہار کر دیا تو اس نے اپنی نیکی کو خود اپنے ہاتھوں مٹی میں ملا دیا۔

خبریں حاصل کرنے میں مشکلات

مرحوم مہاراجہ الور ایڈمنسٹریشن کی بدانتظامی اور اپنے اعمال کے باعث اپنی ریاست سے نکال دیے گئے تھے۔ اور پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ نے آپ کو حکم دیا تھا۔ کہ آپ ریاست الور کی حدود سے ایک سو میل دور رہیں۔ تاکہ الور کے ملازموں یا رعایا کے ساتھ مل کر کوئی سازش نہ کرسکیں۔ چنانچہ آپ بمبئی تشریف لے گئے اور وہاں آپ نے رہائش اختیار کرلی۔

والیان ریاست گدی پر ہوں یا معزول حالت میں، چونکہ ان کو لاکھوں روپیہ سالانہ الاؤنس ملتا ہے۔ خود غرض لوگ ہر صورت میں ان کے ساتھ چسپاں رہتے ہیں۔ مہاراجہ کے بمبئی پہنچنے پر بہت سے لیڈروں اور دوسرے لوگوں نے ان کو گھیر لیا۔ کوئی گدی پر واپس بٹھانے کی روشنی دکھاتا۔ کوئی بااختیار کرنے کا وعدہ کرتا۔ اور کوئی اپنا اثر دکھاتے ہوئے تمام زخموں کو مندمل کرنے کا یقین دلاتا۔ ایسے ہی لوگوں میں سے ایک صاحب مسٹر جمنا داس دوارکا داس بھی تھے۔ جو تھیاسوفسٹ اور مسز اینی بیسنٹ کے خاص چیلوں میں شمار ہوتے تھے۔ اور جب مسز اینی بیسنٹ انگلستان گئیں اور لندن میں لیڈی ولنگڈن کی بہن یعنی لارڈ ولنگڈن وائسرائے ہند کی سالی کے گھر بطور مہمان مقیم تھیں، تو اس وقت یہ مسٹر جمنا داس دوارکا داس بھی مسز اینی بیسنٹ کے ساتھ ملاقات کیا کرتے تھے۔ یعنی مسٹر جمنا داس دوارکا داس کی کوالفیکیشن صرف یہ تھی کہ آپ لارڈ ولنگڈن وائسرائے کی بیوی کے پرانے واقف تھے۔ اس سرٹیفکیٹ پر آپ نے مرحوم مہاراجہ الور کو یقین دلایا کہ مہاراجہ کو گدی پر بٹھا دیں گے۔ اور مہاراجہ گدی پر بیٹھنے کی صورت میں پچیس، تیس لاکھ روپیہ صرف کرنے پر بھی آمادہ ہو گئے۔ چنانچہ مسٹر جمنا داس دوارکا داس اس مشن پر دہلی تشریف لے گئے۔ مسٹر میول پرائیویٹ سیکرٹری وائسرائے سے ملے۔ پھر لیڈی ولنگڈن سے ملے اور بعد میں لارڈ ولنگڈن کی خدمت میں حاضر ہو کر آپ نے عرض کی کہ مہاراجہ الور کو واپس الور جانے کی اجازت

دے دی جائے۔ اور لارڈ ولنگڈن نے تمام کچھ سننے کے بعد جواب دیا کہ اگر پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کو اعتراض نہ ہو تو آپ مہاراجہ کو واپس الور جانے کی اجازت دے دیں گے۔ اس جواب کو سن کر آپ پولیٹیکل سیکرٹری کو ملے۔ پولیٹیکل سیکرٹری نے ٹالتے ہوئے کہا کہ اگر میجر کیمبل ایڈمنسٹریٹر الور کو کوئی اعتراض نہیں تو آپ کو بھی کوئی اعتراض نہیں۔ چنانچہ مسٹر جمنا داس دوارکا داس پولیٹیکل سیکرٹری کے اس جواب سے خوش ہو کر میجر کیمبل سے ملنے کے لئے الور تشریف لے گئے۔

ایڈیٹر ''ریاست'' کو ان تمام باتوں کا علم وائسرائے ہاؤس کے ایک دوست سے ہوتا رہا۔ اور راقم الحروف دیکھتا رہا کہ دیکھیے اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ چنانچہ اس دوست نے اطلاع دی کہ مسٹر جمنا داس دوارکا داس الور سے واپس تشریف لے آئے ہیں۔ اور سوس ہوٹل میں مقیم ہیں۔ اور سوس ہوٹل میں مقیم ہیں۔ ایڈیٹر ''ریاست'' نے سوس ہوٹل ٹیلیفون کیا اور مسٹر جمنا داس دوارکا داس کو بلا کر پوچھا کہ میں کب مل سکتا ہوں۔ مسٹر جمنا داس دوارکا داس ملنے سے گھبراتے تھے۔ مگر ایڈیٹر ''ریاست'' بھی بطور عزرائیل نظر آ رہا تھا۔ آپ نے فرمایا کہ لنچ کے بعد دو بجے دوپہر آئیے۔ ایڈیٹر ''ریاست'' دو بجے دوپہر سوس ہوٹل پہنچ گیا۔ مسٹر جمنا داس دوارکا داس ہوٹل کے ڈائننگ روم کے برآمدہ میں بید کی ایک کرسی پر بیٹھے میرا انتظار کر رہے تھے۔ ملاقات ہوئی۔ ایڈیٹر ''ریاست'' نے خیریت پوچھنے کے بعد سوال کیا کہ فرمائیے مسٹر جمنا داس دوارکا داس آپ الور میں کیا کچھ کر کے آئے ہیں۔ یہ سوال پوچھنا تھا کہ آپ کا رنگ فق ہو گیا کیونکہ آپ یہ تمام کاروائی راز میں کر رہے تھے۔ آپ نے فوراً جواب دیا آپ کو پوچھنے کا کیا حق ہے۔ میں نے جواب دیا کہ ایک اخبار کے ایڈیٹر کے طور پر مجھے پوچھنے کا حق حاصل ہے۔ کہ میں معلوم کروں کہ الور کی غریب رعایا کس بھیڑیئے کے سپرد کی جا رہی ہے۔ فرمائیے آپ الور جا کر میجر کیمبل سے مہاراجہ کے لئے چارٹر لے آئے ہیں یا نہیں۔ مسٹر جمنا داس دورکا داس کے منہ سے بات تک نہ نکلتی تھی۔

حیران تھے کہ ایڈیٹر ''ریاست'' کو تمام حالات کا علم کیوں کر ہو گیا۔ آپ نے ٹالتے ہوئے جواب دیا، مہاراجہ الور اخبار ریاست کے بہت مداح ہیں۔ اور باوجود اس بات کے کہ ریاست نے مہاراجہ کے خلاف بہت سے مضامین لکھے اور ایجی ٹیشن میں حصہ لیا ۔ مہاراجہ اخبار ریاست کو پسند کرتے ہیں۔ کئی بار آپ کے متعلق ذکر آیا، ہمیشہ آپ کی تعریف کرتے تھے۔ آپ بمبئی چلیے، مہاراجہ سے ملیے وہ خود آپ کو سب کچھ بتا دیں گے۔ میں نے جواب دیا کہ میں بمبئی جانے اور مہاراجہ سے ملنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ آپ صرف یہ بتا دیجیے کہ مسٹر کیمبل نے آپ کو کیا جواب دیا۔ مسٹر جمنا داس دوارکا داس کیا کہتے، بس یہی کہتے رہے کہ اخبار ریاست بہت اچھا ہے اور ایڈیٹر ''ریاست'' بہت اچھے ہیں۔ مہاراجہ الور اخبار ریاست کے بہت مداح ہیں۔ اور اخبار ریاست کے زور قلم کے مداح ہیں، میں الور گیا تھا۔ مگر میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ کچھ کہنا قبل از وقت ہے۔ آپ بمبئی چلیے۔ وہاں سے مہاراجہ سے مشورہ کریں گے وغیرہ۔

مسٹر جمنا داس دوارکا داس سے مل کر میں واپس آ گیا۔ اور میں نے وائسرائے ہاؤس والے دوست کو ٹیلی فون کیا۔ وہ مزید معلومات بہم پہنچاتے رہیں۔ اگلے روز مسٹر جمنا داس دوارکا داس ہوٹل والوں کو کچھ بتائے بغیر بارہ کھمبہ روڈ پر آنرایبل مسٹر آسکریا ممبر کونسل آف سٹیٹ کے ہاں چلے گئے۔ ہوٹل میں ٹیلی فون کیا تو پتا چلا کہ آپ واپس بمبئی چلے گئے ہیں۔ وائسرائے ہاؤس ٹیلی فون کیا تو معلوم ہوا کہ مسٹر آسکریا کے ہاں بارہ کھمبہ روڈ پر مقیم ہیں۔

مسٹر جمنا داس دوارکا داس سے مل کر واپس آیا اور میں نے وائسرائے ہاؤس والے دوست کو ٹیلی فون کیا۔ کہ وہ مزید معلومات بہم پہنچاتے رہیں۔ اگلے روز مسٹر جمنا داس دوارکا داس ہوٹل والوں کو کچھ بتائے بغیر بارہ کھمبہ روڈ پر آنرایبل مسٹر آسکریا ممبر کونسل آف سٹیٹ کے ہاں چلے گئے۔ ہوٹل میں ٹیلی فون کیا تو پتا چلا کہ آپ واپس بمبئی چلے گئے ہیں۔ وائسرائے ہاؤس میں ٹیلی فون کیا تو معلوم ہوا کہ مسٹر

آسکریا کے ہاں بارہ کھمبہ روڈ پر مقیم ہیں۔

مسٹر جمنا داس دوارکا داس مسٹر آسکریا کے ہاں پانچ چھ روز تک مقیم رہے۔ اس عرصہ میں آپ کئی بار مسٹر سیول پرائیویٹ سیکرٹری سے ملے۔ کئی خطوط لکھے، آخر آپ کو لارڈ ولنگڈن نے جواب لکھا کہ چونکہ میجر کیمبل مہاراجہ الور کا واپس جانا مناسب نہیں سمجھتے اور پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کو اعتراض ہے۔ اس لئے وائسرائے مداخلت کرنا پسند نہیں کرتے۔ اور وہ مہاراجہ الور کے لئے کچھ نہیں کر سکتے۔ یہ خط وائسرائے نے لکھ کر مسٹر میول کے حوالہ کیا۔ مسٹر میول نے یہ خط وائسرائے ہاؤس کے ایک چپڑاسی کو دیا کہ آسکریا صاحب کی کوٹھی پر مسٹر جمنا داس دوارکا داس کو پہنچا دیا جائے۔ مگر مسٹر جمنا داس دوارکا داس کو یہ خط نہیں ملا۔ آپ جواب کا دو روز انتظار کرتے رہے۔ تو آپ نے مسٹر میول کو جواب کے لئے ٹیلی فون کیا۔ مسٹر میول نے جواب دیا کہ دو روز ہوئے، جواب تو ایک لفافہ میں بھیجا جا چکا ہے۔ وائسرائے کے خط کا گم نام ہونا تمام لوگوں کے لئے پریشانی کا باعث ہوا۔ تو ایک گھبراہٹ سی پیدا ہو گئی۔ مسٹر جمنا داس دوارکا داس مسٹر میول کے پاس فوراً پہنچے خط لے جانے والے چپڑاسی کو بلایا گیا۔ خط ڈلیور کرنے والی چپن بک دیکھی گئی۔ اس میں اردو زبان میں دیوی داس کے دستخط تھے۔ جس نے خط وصول کیا۔ چپڑاسی نے کہا کہ جب وہ مسٹر آسکریا کی کوٹھی پر پہنچا تو وہاں ایک شخص سے پوچھا کہ مسٹر جمنا داس دوارکا داس کہاں ہیں۔ اس شخص نے بتایا کہ وہی ہیں، دستخط کر کے خط لے لیا۔ تمام لوگ حیران تھے کہ معاملہ کیا ہے؟۔ خط کون اڑا کر لے گیا۔ مسٹر جمنا داس دوارکا داس نے مسٹر میول کو بتایا کہ ایڈیٹر ریاست سوس ہوٹل میں ان سے ملا تھا۔ وہی پیچھا کر رہا تھا۔ اس نے ہی خط اڑایا ہو گا۔ اور اسی کا کوئی آدمی ہے۔ جس نے اردو میں دستخط کر کے یہ خط وصول کیا۔

وائسرائے ہاؤس میں سنسنی پھیل گئی۔ مسٹر میول نے سینئر سپرنٹنڈنٹ پولیس کو ٹیلی فون کیا گیا۔ سینئر سپرنٹنڈنٹ پولیس آئے۔ تمام حالات بتائے گئے۔

سینئر سپر نٹنڈنٹ پولیس نے سپر نٹنڈنٹ پولیس سی آئی ڈی کو بلایا۔ وہ مع ڈپٹی سپر نٹنڈنٹ خان بہادر میاں محمد صادق وغیرہ پہنچے۔ کانفرنس ہوئی مشورے ہوئے تو سب لوگ اس بات پر متفق ہو گئے کہ دیوان سنگھ مسٹر جمنا داس دوارکا کا پیچھا کر رہا تھا۔ اس نے ہی کوئی اپنا آدمی چھوڑ رکھا ہے، جس کی معرفت یہ خط اڑایا گیا ہے۔ چنانچہ دونوں سینئر سپر نٹنڈنٹوں نے فیصلہ کیا کہ ایڈیٹر ''ریاست'' کو گرفتار کیا جائے اور دفتر ریاست کی تلاشی لی جائے۔ ان تمام حالات کی ''ایڈیٹر ریاست'' کو بھی وائسرائے ہاؤس کے دوست سے ٹیلی فون پر اطلاع ملتی رہی۔ اور ایڈیٹر ''ریاست'' گرفتاری و تلاشی کا منتظر رہا۔

خان بہادر میاں محمد صادق ڈپٹی سپر نٹنڈنٹ پولیس جو اب ریٹائر ہو چکے ہیں۔ لاہور کی احمدیہ جماعت سے تعلق رکھتے ہیں۔ مذہبی قسم کے بہت نیک اور شریف بزرگ ہیں۔ آپ نے شاید اپنی تمام زندگی ایک پیسہ رشوت نہیں لی، اور نہ جھوٹے مقدمے بنائے۔ آپ موگا (ضلع فیروز پور) کے علاقہ میں کئی برس سب انسپکٹر اور انسپکٹر پولیس رہے۔ اور وہاں آپ کے رائے بہادر ڈاکٹر متھرا داس کے ساتھ بہت گہرے تعلقات تھے۔ چنانچہ رائے بہادر ڈاکٹر متھرا داس جب کبھی دہلی تشریف لے جاتے اور ایڈیٹر ریاست کے مکان پر ٹھہرتے تو میاں محمد صادق بھی ڈاکٹر متھرا داس سے ملنے ایڈیٹر ریاست کے مکان پر تشریف لے جایا کرتے تھے۔ اس ذریعہ سے ایڈیٹر ریاست'' کی میاں محمد صادق سے ذاتی واقفیت تھی۔ اور میاں صاحب ایڈیٹر ریاست'' کے صفات یا برائیوں سے واقف تھے۔ جب پولیس کے دونوں سپر نٹنڈنٹوں نے ایڈیٹر ریاست'' کی گرفتاری اور تلاشی کا فیصلہ کیا تو میاں صاحب نے ان سے کہا کہ اگر یہ خط دیوان سنگھ نے اڑایا ہے تو وہ بہت ہوشیار آدمی ہے، اس نے کبھی خط اپنے گھر میں نہ رکھا ہوگا۔ اس کی درجنوں بار تلاشیاں ہوئیں، مگر کبھی ایک پرزہ بھی برآمد نہ ہو سکا۔ یہ طریقہ غلط ہے۔ اس صورت میں خط کا ملنا ناممکن ہوگا، اور

حالات اور زیادہ بگڑ جائیں گے۔ بہتر ہے کہ اس معاملہ کو خوش اسلوبی سے سلجھایا جائے۔ دیوان سنگھ اپنے ذاتی دوستوں سے کبھی جھوٹ نہیں بولتا، اگر اسے نہ بتانا ہوگا تو وہ کہہ دے گا کہ وہ بتانا نہیں چاہتا۔ اور اگر خط اس نے لیا ہے اور وہ بتانے میں ہرج نہیں سمجھے گا تو فوراً بتا دے گا۔ اور اگر اسے خط کو اخبار میں شائع کرنا ہے تو وہ شائع کر دے گا۔ کسی کی پرواہ نہیں کرے گا۔ وہ بزدل نہیں کہ ان باتوں سے ڈر جائے۔ چنانچہ دو تین گھنٹہ کی بحث اور مشورہ کے بعد یہ تحقیقات میاں محمد صادق کے سپرد کر دی گئیں۔ میاں صاحب موٹر میں بیٹھ کر اپنے دفتر میں پہنچے۔ ادھر مجھے وائسرائے ہاؤس سے تمام مشوروں اور کا نتیجہ ٹیلی فون پر پتا چل گیا تھا۔ میں منتظر تھا کہ میاں صاحب نے دفتر پہنچ کر مجھے ٹیلی فون کیا اور اس طرح بات چیت شروع ہوئی۔

میاں صاحب: فرمایئے کیا حال ہے مزاج اچھے ہیں

ایڈیٹر ''ریاست'': آپ کی مہربانی ہے میاں صاحب

میاں صاحب: کیا ڈاکٹر صاحب کا کوئی خط آیا ہے؟۔

ایڈیٹر ''ریاست'': حال میں تو کوئی نہیں آیا، ہاں پندرہ بیس روز ہوئے خط آیا تھا۔

میاں صاحب: ڈاکٹر صاحب دہلی تو نہیں آئے۔

ایڈیٹر ''ریاست'': ان کا کیا ہے میاں صاحب کام ہوا فوراً چلے آئے۔ نہ کام ہوا تو مہینوں نہیں آتے۔

میاں صاحب: میری طبیعت بہت اداس تھی، کام کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ میں نے کہا آپ کو ٹیلی فون ہی کر لوں۔

ایڈیٹر ''ریاست'': آج کل موسم ہی ایسا ہے۔ شاید ملیریا کی آمد ہو۔

میاں صاحب: ہاں شاید آپ کیا کر رہے ہیں؟۔

ایڈیٹر ''ریاست'': میاں صاحب کام کر رہا ہوں۔ ہم مزدور آدمی ہیں۔ صبح سے رات تک کام کرتے ہیں۔ آپ کی طرح تو نہیں کہ کوئی کام نہیں اور آپ کی طرح حکم

چلاتے ہیں۔

میاں صاحب: اگر آپ کو فرصت ہو تو تھوڑی دیر کے لئے یہاں آجایئے۔ یا مجھے حکم دیں، میں وہاں آجاؤں۔

میں نے جواب دیا، میں ہی آتا ہوں، کیونکہ جانتا تھا کہ اگر نہ جاؤں گا تو کانسٹیبل یا سب انسپکٹر بھیج کر بلا لیں گے۔ پولیس کے افسر ہیں چاہے کتنے دوست ہوں، نہ باپ کے نہ بھائی کے اور نہ دوستوں کے۔ میں اپنی کار میں میاں صاحب کے دفتر گیا ۔میاں صاحب اکیلے بیٹھے میرا انتظار کر رہے تھے۔ میں تو تمام حالات سے واقف تھا کہ وائسرائے ہاؤس میں کیا مشورے ہوئے، مگر میاں صاحب سمجھتے تھے کہ میں بالکل بے خبر ہوں۔ میرے پہنچنے کے بعد باتیں شروع ہوئیں۔ ڈاکٹر متھراداس کے متعلق، موسم کے متعلق، اخبار ریاست کے کاروبار کے متعلق، پانچ سات منٹ کی ادھر ادھر باتیں کرنے کے بعد کہا کہ مہاراجہ الور کہاں ہیں آج کل؟۔ یہ سن کر میں مسکرا دیا، مجھ سے رہا نہ گیا اور جواب میں کہا: میاں صاحب یہ نہ پوچھیئے کہ مہاراجہ الور کہاں ہیں۔ یہ پوچھیئے کہ لارڈ ولنگڈن کے ہاتھوں کی لکھی ہوئی چٹھی کہاں ہے؟۔ جو کہ مہاراجہ الور کے متعلق مسٹر جمنا داس دوارکا داس کو مسٹر آسکریا کی کوٹھی پر بھیجی اور جو گم ہے۔ میاں صاحب یہ سن کر دنگ رہ گئے حیران تھے کہ مجھے تمام واقعات کا کیوں کر علم ہوا؟۔ آخر میاں صاحب نے اقرار کیا کہ ہاں اس خط کی تحقیقات کے سلسلہ میں ہی مجھے یہاں دفتر بلایا گیا ہے۔

میں نے میاں صاحب سے کہا کہ آپ کے بطور ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس سی آئی ،ڈی میں آپ کو کوئی جواب دینا نہیں چاہتا۔ مگر چونکہ آپ میرے زاتی دوست ہیں، اس لیے آپ سے کہتا ہوں کہ چٹھی میرے پاس نہیں پہنچی اور نہ میں نے اڑائی ہے اور نہ ہی مجھے کوئی علم ہے۔ اور مجھے سخت افسوس ہے کہ ایسی چٹھی میرے ہاتھ کیوں نہ لگی۔ جس میں وائسرائے نے پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے سامنے اپنی بے بسی کا اظہار

کیا ہے ۔اور اگر یہ چٹھی مجھے مل جاتی تو اس کا نتیجہ چاہے کچھ ہوتا ، میں اس چٹھی کو ریاست اخبار میں ضرور شائع کر دیتا۔

میاں صاحب کو میری اس بات سے یقین ہو گیا کہ خط کے اڑانے میں میرا ہاتھ نہیں ۔آپ نے وائسرائے ہاؤس جا کر اس چپڑاسی سے پھر پوچھنا شروع کیا ۔ سوالات ہوئے ،اور وہ کچھ ہوا جس کو پولیس اپنی زبان میں انویسٹی گیشن کہتی ہے ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چپڑاسی نے اقرار کر لیا کہ اس کا لڑکا سخت بیمار تھا۔اور اس بیماری کے باعث وہ خط نہ لے جا سکا۔اگلے روز اس خوف سے کہ خط لیٹ کیوں ہوا۔اس نے خط کو چولھے میں جلا دیا۔چنانچہ چولھے میں دیکھا گیا تو جلے ہوئے اس خط کے ٹکڑے موجود تھے ۔چپڑاسی جو پنجاب کا رہنے والا مسلمان تھا۔اس جرم میں موقوف کر دیا گیا ۔اور مسٹر میول کو یقین ہو گیا کہ خط دیوان سنگھ نے نہیں اڑایا،اور نہ دیوان سنگھ سے وائسرائے ہاؤس غیر محفوظ ہے۔(مسٹر میول نے پولیس کے سپرنٹنڈنٹوں سے کہا تھا۔) کہ دیوان سنگھ کے ہاتھوں سے ریاست کے علاوہ وائسرائے بھی محفوظ نہیں) اس واقعہ سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اخبارات کے لئے خبریں حاصل کرنا کتنا مشکل کام ہے اور ان کے لئے کیوں کر قدم قدم پر خطرہ برداشت کیا جاتا ہے ۔

ایک پاگل کی ''ریاست'' کو امداد

ایڈیٹر ''ریاست'' اور مسٹر ہارنیمین ایڈیٹر بمبئی سینٹی نل دونوں نے دہلی سے انگریزی کا ایک ہفتہ وار باتصویر اخبار ''ہیرلڈ'' جاری کیا۔ ریاست اور ہیرلڈ دونوں کے دفاتر اجمیری دروازہ کے باہر لالہ دیوان چند کی بلڈنگ میں تھے۔ مسٹر ہارنیمین کام تو دفتر میں کرتے تھے۔ مگر رہتے تھے نئی دہلی رائے بہادر سردار نرائن سنگھ ٹھیکہ دار کی کوٹھی کے ایک حصہ میں، جب ''ہیرلڈ'' کو جاری ہوئے دو ہفتے گزر چکے تھے۔ کہ ایک روز صبح نو بجے کے قریب ایک گجراتی نوجوان کھدر کے کپڑے پہنے ہوئے دفتر میں آئے ،اور آپ نے پوچھا کہ مسٹر ہارنیمین کہاں ہیں۔ ایڈیٹر ''ریاست'' نے جواب دیا کہ وہ نئی دہلی میں ہیں۔ کوئی ضروری کام ہو تو بتائیے۔ میں آدمی ساتھ بھیج دیتا ہوں۔ آپ نے بتایا کہ مسٹر ہارنیمین نے آپ سے وعدہ کیا تھا کہ بمبئی میں ایک جاری ہونے والے اخبار میں روزانہ انگریزی اخبار کو ایڈٹ کریں گے۔ اس وعدہ پر آپ نے اڑھائی ،تین لاکھ روپے کی مشینری کا آرڈر ولایت دے دیا تھا۔ اور اب جب کہ مشینری بمبئی پہنچ گئی ہے تو مسٹر ہارنیمین دہلی آگئے ہیں۔ میں نے ان صاحب کے لئے چائے منگائی، چائے پر باتیں ہوئیں تو انہوں نے بتایا کہ آپ ایک کروڑ پتی سیٹھ ہیں ۔ اخبارات نکالنے کا آپ کو شوق ہے۔ بمبئی اور کراچی میں آپ کا کاروبار ہے۔ اور جاری کیے جانے والے روزانہ انگریزی اخبار کے لئے آپ دس لاکھ روپیہ صرف کر دیں گے۔

اس گجراتی سیٹھ کی باتیں سن کر ایڈیٹر ''ریاست'' کو ایک نئی دنیا نظر آرہی تھی۔ اور وہ خیال کر رہا تھا کہ اگر اتنا روپیہ صرف کیا جائے تو ''ریاست'' ''ٹائمز آف انڈیا'' ۔۔۔ السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا'' کی طرح تمام کا تمام اردو ٹائپ اور تصاویر میں شائع کیا جا سکتا ہے۔ ایڈیٹر ''ریاست'' نے اس گجراتی کو اپنی کار میں ساتھ لیا اور اسے مسٹر ہارنیمین کے پاس نئی دہلی لے گیا۔ مسٹر ہارنیمین مضمون لکھ رہے تھے اور مصروف تھے

۔معمولی بات چیت کرنے کے بعد آپ نے فرمایا۔ کہ لنچ کے وقت دفتر میں بات چیت کریں گے۔ میں سیٹھ صاحب کو لے کر واپس آ گیا۔ان کو ڈرائنگ روم میں بٹھایا ۔باورچی سے (جس کا نام کویلو تھا۔گوا کا رہنے والا تھا۔اور انگریزی کھانا بہت اچھا پکاتا تھا۔) کہ آج لنچ غیر معمولی طور سے بہت اچھا اور پر تکلف ہو۔باورچی سے جس کا نام کویلو تھا، گوا کا رہنے والا تھا۔اور کھانا بہت اچھا پکاتا تھا۔ میں ایک بجے تک ان گجراتی صاحب کے ساتھ باتیں ہی کرتا رہا۔اور ایک بجے مسٹر ہارنیمین آئے۔اس زمانے میں میرے ہاں لنچ اور ڈنر پر پانچ سات دوست ضرور ہوا کرتے تھے۔لنچ کھایا باتیں ہوتی رہیں اور یہ فیصلہ ہوا کہ جو مشینری ولایت سے آئی ہے، وہ فی الحال بمبئی میں ہی رکھی جائے۔ نیا اخبار بمبئی سے جاری کیا جائے، اور پھر مناسب موقع پر ریاست کو بھی وہیں منتقل کر دیا جائے۔کیونکہ وہاں پریس کے متعلق زیادہ سہولتیں ہوں گی۔

مسٹر ہارنیمین شام تک کام کرتے رہے۔شام کو ان گجراتی سیٹھ صاحب کے اعزاز میں پر تکلف چائے کا انتظام کیا گیا۔نصف درجن کے قریب دوست چائے پر موجود تھے۔چائے کے بعد سب دوست اور مسٹر ہارنیمین اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ گجراتی سیٹھ صاحب بیٹھے رہے۔دو گھنٹہ کے بعد میں ان کو دہلی کی سیر کرانے کے لئے کار میں لے گیا۔راستہ میں آپ نے پوچھا کہ ریاست کی مالی حالت کیسی ہے۔ میں نے کہا کہ کاروبار اچھا چل رہا ہے۔آپ نے فرمایا، اخبارات کو مالی پریشانیاں تو رہتی ہی ہیں۔ میں نے جواب دیا جی ہاں، ہندوستان میں جرنلزم کی حالت ہی ایسی ہے۔سیر سے واپس آئے تو آپ نے پہنچتے ہی چیک بک نکالی، اس میں سے دس ہزار روپیہ کا ایک چیک کراچی بنک کا ''ریاست'' کے لئے لکھ کر راقم الحروف کو لکھ کر دیا اور کہا فی الحال یہ دس ہزار روپیہ لو۔ اگر اور ضرورت ہوئی تو دس، بیس یا پچاس ہزار تک ریاست کی امداد کریں گے۔یہ گجراتی سیٹھ رات کو ڈنر کھانے کے بعد تشریف لے گئے

۔آپ نے فرمایا کہ آپ لاہور، راولپنڈی اور پشاور وغیرہ سیر کے لئے جارہے ہیں۔ اگلے روز وہ چیک کیش کرنے کے لئے مسلم بینک جہاں کہ اس زمانے میں ریاست کا حساب تھا، کو بھیجا اور اس دس ہزار روپے کے صرف کرنے کی اسکیم پر غور ہونے لگا۔ اتنا روپیہ مسٹر ہارنمین کو دیا جائے گا۔ اتنا فلاں دوست کو۔ اتنا قرضہ میں ادا کیا جائے گا۔ اتنے کی فلاں فلاں چیز منگوائی جائے گی۔ ایک ہفتہ ان دل خوش کن خیالات میں گزرا ۔ایک ہفتہ کے بعد وہ چیک واپس آیا، تو یقین نہیں آتا تھا کہ گجراتی سیٹھ صاحب کا بنک میں کوئی اکاؤنٹ نہیں ہے۔ میں کبھی چیک کو سیدھی طرف سے دیکھتا، کبھی الٹی طرف سے، کبھی ساتھ والی سلپ کو، سمجھ میں نہ آتا کہ معاملہ کیا ہے۔ باربار خیال آتا کہ کراچی والے بنک نے شاید غلطی سے ایسا لکھ دیا ہو۔ یہ کیوں کر ممکن ہے کہ بنک میں حساب نہ ہو۔ واپس آئے ہوئے چیک پر میں اور مسٹر ہارنمین دو روز تک غور کرتے رہے۔ کبھی خیال آتا کہ کراچی کے کسی دوست کو اصلی حالات معلوم کرنے کے لئے لکھا جائے۔ ان ہی خیالات میں تھا کہ کوتوالی سے پولیس انسپکٹر کا فون آیا کہ ایک صاحب جو اپنے آپ کو ایڈیٹر ''ریاست'' کا ذاتی دوست بیان کرتے ہیں، حوالات میں بند ہیں اور ملنا چاہتے ہیں۔ میں حیران تھا کہ کون دوست حوالات میں بھیج دیئے گئے۔ کار میں بیٹھ کر کوتوالی پہنچا تو وہی صاحب جنگلے کے اندر تشریف فرما ہیں۔ مجھے دیکھ کر بڑے تپاک اور گرم جوشی سے ملے۔ ہیلو دیوان سنگھ۔ میں نے پوچھا آپ یہاں کیسے تشریف لائے۔ آپ نے فرمایا کہ کچھ غلط فہمی سی ہے۔ انسپکٹر پولیس سے ملا، پوچھا کیا معاملہ ہے۔ تو انسپکٹر نے بتایا کہ سیٹھ صاحب ایک ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ فرنچ موٹر کار کمپنی کو پانچ ہزار روپے کا جعلی چیک دے کر موٹر خریدی، پتھر والے بائیسکوپ کے پاس ایک گھڑی ساز کو چیک دے کر گھڑیاں خریدیں، اور اس طرح ایک درجن کے قریب جعلی چیک دے کر مختلف لوگوں سے سامان خریدا، مگر سامان لیا نہیں۔ انسپکٹر کی باتیں سن کر یقین ہو گیا کہ دس ہزار چیک والا معاملہ بھی ایسا ہی ہے جو

کیش نہیں ہو سکتا۔

تین روز کے بعد سیٹھ صاحب کی پیشی مسٹر رشید مجسٹریٹ صاحب کی عدالت میں تھی ۔مقدمہ چارسوبیس یعنی دھوکا قابل ضمانت تھا۔مجسٹریٹ نے ملزم سے کہا کہ اگر ضمانت دو تو ضمانت پر رہا ہو سکتے ہو۔کیا کوئی ضامن ہے جو ضمانت دے ۔سیٹھ صاحب نے فرمایا کہ دیوان سنگھ آپ کا بہت گہرا دوست ہے۔مسٹر رشید نے ٹیلی فون کر کے ایڈیٹر ''ریاست'' کو عدالت میں بلایا،اور کہا کہ سیٹھ صاحب آپ کے دوست ہیں اگر آپ ان کی ضمانت دیں تو یہ رہا ہو سکتے ہیں ۔یہ سن کر میں مسکرا دیا اور کہا کہ اگر آپ فرمائیے تو میں تمام حالات عرض کروں۔میں نے من وعن تمام حالات بتائے کہ کس طرح مجھے بھی دس ہزار کا چیک دیا گیا۔اور لنچ اور ڈنر کی دعوتیں ہوئیں ۔عدالت میں مسکراہٹ اور قہقہوں کی ایک دل چسپ کیفیت سی تھی ۔آخر میں نے کہا سیٹھ صاحب کے دماغ میں خلل ہے۔ان کی نیت بری نہیں ۔صرف چیک جاری کرنے کا شوق اور پاگل پن ہے ۔ورنہ مجھے دس ہزار کا چیک کیوں دیتے؟۔کیونکہ مجھ سے تو انہوں نے کوئی چیز معاوضے میں نہیں لی،چنانچہ میری شہادت ہوئی، میں نے تمام حالات لکھوائے اور سیٹھ صاحب دماغی عارضہ میں مبتلا قرار دیئے جانے کی بنا پر بری کر دیئے گئے ۔اور واپس بمبئی تشریف لے گئے اور وہ دس ہزار کا چیک جو ایک ہفتہ تک دل کو انتہائی خوش کرنے اور نئی سکیمیں بنانے کا باعث بنا پھاڑ دیا گیا۔

پبلک لائف اور شادی

''ریاست'' جاری ہو چکا تھا۔ میں مہاراجہ نابھ کے پاس منصوری پہاڑی پر مقیم تھا ۔مہاراجہ اور مہارانی مجھے اپنے ایک فیملی ممبر کی طرح سمجھتے تھے۔ مہاراجہ کے ساتھ کئی برس سے گہرے تعلقات تھے۔ اور مہارانی بھی مجھے اپنے بھائیوں کی طرح عزیز سمجھتی تھی۔ مجھے منصوری گئے ہوئے پندرہ بیس روز ہوئے تھے کہ حافظ آباد سے میری والدہ کا خط آیا کہ شادی کی تمام تیاریاں مکمل ہو چکی ہیں۔ اور تاریخ مقرر کی جا رہی ہے۔ روپیہ کا انتظام کرو۔ میرے پاس روپیہ کہاں؟۔ تمام زندگی کبھی بھی روپیہ جمع نہ ہو سکا ، بلکہ ہمیشہ مقروض ہی رہا۔ روپیہ جمع بھی کیوں کر ہو، جب کہ روپیہ آنے سے پہلے ہی اس کے خرچ کرنے کا پروگرام بنا لیا جائے۔ اس خط کو پڑھ کر سوچتا رہا کہ کیا کروں۔ دو روز سوچنے کے بعد میں نے یہ خط مہارانی کو دکھایا۔ دوپہر کو جب ہم لوگ لنچ کھا رہے تھے تو مہارانی نے مہاراجہ سے کہا کہ دیوان سنگھ کی شادی کی تاریخ مقرر ہو رہی ہے۔ اس کے پاس روپیہ موجود نہیں، زیور اور کپڑا تو تیار ہے۔ مگر دوسرے اخراجات کے لئے روپے کی ضرورت ہے۔ مہاراجہ نے پوچھا کتنا روپیہ چاہیئے ۔ مہارانی نے کہا دو ہزار کافی ہوں گے۔ مہاراجہ یہ سن کر خاموش ہو گئے ۔

لنچ کے بعد ہم لوگ ڈرائنگ روم میں آ گئے ۔ وہاں بیٹھے تھے کہ مہاراجہ نے میری شادی کا ذکر چھیڑ دیا۔ مہاراجہ نے کہا کہ جو لوگ پبلک کی خدمت کرتے ہیں، ان کو شادی نہ کرنا چاہیئے ۔ میں نے جواب دیا کہ میں تنہائی کی زندگی سے تنگ آ چکا ہوں۔ اور چاہتا ہوں کہ شادی کر لوں ۔ یہ بحث دیر تک جاری رہی ۔ مہاراجہ بار بار زور دیتے رہے کہ میں شادی نہ کروں ۔ میں کہتا تھا کہ میں شادی کرنا چاہتا ہوں ۔ مہارانی میرے ساتھ متفق تھیں اور کہتی تھیں کہ شادی کر لینی چاہیئے ۔ کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ رات کو ڈنر پر پھر بحث ہوئی تو مہاراجہ نے اپنے متعلق کہا۔

''اگر میری شادی نہ ہوئی ہوتی ، بیوی بچے نہ ہوتے تو حالات بالکل مختلف ہوتے

۔ یہ بیوی بچے ہیں جن کے لئے میں نے گورنمنٹ کے سامنے گھٹنے ٹیک دیے ہیں۔ اور نابھ کی گدی سے دست بردار ہو گیا، اگر بیوی بچے نہ ہوتے تو میں کبھی دست بردار نہ ہوتا اور زندگی کے آخری لمحوں تک کھڑا رہتا۔

مہاراجہ کے ان الفاظ کا مجھ پر کوئی اثر نہ ہوا، کیونکہ میں شادی کے خوش گوار خواب دیکھ رہا تھا۔ تین چار روز یہ بحث جاری رہی۔ مہاراجہ بار بار زور دیتے کہ میں شادی نہ کروں۔ پبلک لائف اختیار کرنے والوں کی راہ میں بیوی بچے بہت بڑی رکاوٹ ہوتے ہیں۔ اور انسان شادی کے بعد جرات، بہادری اور شجاعت سے محروم ہو جاتا ہے۔ مگر مجھ پر ان نصیحتوں کا کوئی اثر نہ ہوتا تھا۔ مہارانی بے چاری کبھی تو غیر جانب دار بن کر خاموش رہتیں۔ کبھی فرماتیں کہ دیوان سنگھ کی شادی کرنی چاہیئے۔ آخری دن رات اس مسلہ پر بحث ہونے کے بعد جب میں نہ مانا تو مجبوراً مہاراجہ نے اپنی چیک بک منگائی، چیک لکھنے لگے تو پھر فرمایا کہ:

سردار دیوان سنگھ تم نہیں مانتے تو ایک دن پچھتاؤ گے۔ چونکہ تم نہیں مانتے، اس لئے میں تمہیں شادی کے لئے دو ہزار روپیہ دیتا ہوں۔

جب آپ دو ہزار روپے کا چیک لکھ چکے تو پھر فرمایا، دیوان سنگھ جی آپ زندگی بھر پچھتاؤ گے۔ میں پھر آپ سے کہتا ہوں شادی نہ کرو، پبلک لائف اختیار کرنے والوں کو شادی نہیں کرنی چاہیئے۔ میں آپ کو شادی کے لئے دو ہزار کا چیک دے چکا ہوں، لیکن اگر تم شادی نہ کرو تو میں آپ کو دو ہزار روپے کا ایک اور چیک دیتا ہوں۔ یعنی اگر شادی کرو تو دو ہزار اور اگر نہ کرو تو چار ہزار۔

میں دو ہزار روپیہ لے کر دہلی واپس آ گیا۔ اور چند روز بعد اپنے وطن حافظ آباد شادی کے لئے چلا گیا۔ اور شادی ہو گئی، مگر میرے کانوں میں ابھی تک مہاراجہ نابھ کے وہ الفاظ گونج رہے تھے۔

''شادی نہ کرو، تمام زندگی پچھتاؤ گے، پبلک لائف اختیار کرنے
والوں کو شادی نہیں کرنی چاہیے۔

۱۹۴۲ء میں جب کانگریسی اصحاب کے ساتھ راقم الحروف بھی نظر بند کر دیا گیا، جیل میں سوائے کتابیں پڑھنے کے کوئی دوسرا کام نہ تھا۔ تو دہلی کے ایک کانگریسی بزرگ شری برج کرشن جی چاندی والا، جو مہاتما گاندھی کے سچے بھگت اور جو غالباً دہلی کے تمام کانگرسیوں سے زیادہ نیک ہیں۔ اور پبلک کے بے لوث خادم ہیں) نے ایک چھوٹی سی کتاب جنگل پر بھات دی جو مہاتما گاندھی کی تصنیف ہے۔ شاید سولہ یا بیس صفحے کا چھوٹا سا پمفلٹ، مگر جس کے ایک ایک صفحہ ایک ایک سطر ایک ایک لفظ اور ایک ایک حرف پر جواہرات قربان کیے جا سکتے ہیں۔ اس تصنیف میں بھی ایک جگہ لکھا ہے کہ پبلک لائف اختیار کرنے والے شخص کو شادی نہیں کرنی چاہیئے۔ اور اگر اس کی شادی ہو چکی ہے تو پھر بھی اس کا فرض ہے کہ وہ اپنی بیوی کو بہن کے برابر سمجھے، اور میاں بیوی کے تعلقات نہ رکھے۔

پچھلے تجربہ کے بعد میری رائے یہ ہے کہ انسان کی ترقی کے راستہ میں بیوی، بچے اور روپیہ ایک لعنت ہیں، بیوی بچوں اور روپیہ کے باعث انسان جرات اور شجاعت سے محروم ہو کر خطرات کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اور وہ لوگ خوش نصیب ہیں جو اگر پبلک لائف اختیار کریں تو ان کے بیوی بچے نہ ہوں اور وہ روپیہ سے محروم ہوں۔ اور شادی صرف ان لوگوں کو کرنا چاہیئے جو کلرک ٹائپ ہوں اور جن کی زندگی کا مقصد کھانا پہننا، شادی کرنا، بچے پیدا کرنا اور بچوں کو کھلانا ہے۔ ملازمت کرنا اور اگر ان کا افسر مسکرا دے تو خوش ہو جانا ہے۔ اور اگر افسر کی پیشانی پر شکن پڑ جائے تو رات کو نیند نہ آتا ہو۔

ایڈیٹر ”ریاست پر چوری کا مقدمہ“

میں نواب بھوپال والے مقدمہ کی پیشی پر مسٹر برج بہاری توکلی اور سردار بہادر دیوان سنگھ وکلاء کے ساتھ ہوشنگ آباد گیا ہوا تھا۔ واپس آیا تو دفتر کے لوگوں نے بتایا کہ مرحوم نواب صاحب رام پور کے اے ڈی سی کرنل محمد علی آئے تھے۔ اور کہتے تھے کہ نواب صاحب رام پور کی حقیقی بہن شہزادی بیگم دہلی آئی ہیں۔ رام کشور لین کی ایک کوٹھی میں مقیم ہیں اور ملنا چاہتی ہیں۔ میں شام کے وقت کار میں ان سے ملنے کے لئے گیا تو جس کوٹھی کا پتا بتایا گیا تھا۔ وہ خالی تھی۔ کوٹھی کے چوکیدار سے معلوم ہوا کہ بیگم صاحبہ نئی دہلی کی کسی کوٹھی میں چلی گئی ہیں۔ میں نے پڑوسیوں سے پوچھا کہ نئی دہلی میں کس سڑک پر وہ کوٹھی واقع ہے۔ تو کچھ پتا نہ چلا۔ واپس آ گیا۔ ڈاک خانہ کو ٹیلی فون کیا کہ ان کی ڈاک کہاں جاتی ہے۔ تو انہوں نے بتایا کہ ان کے پاس بھی کوئی ہدایت نہیں ہے۔ دو روز بعد کرنل محمد علی پھر آئے، انہوں نے بتایا کہ شہزادی بیگم صاحبہ نئی دہلی پارک روڈ کی ایک کوٹھی میں مقیم ہیں۔ حالات بتانا چاہتی ہیں۔ اور کئی بار یاد فرما چکی ہیں۔ شام کو جب سیر کے لئے گیا تو پارک روڈ والی اس کوٹھی میں پہنچا، جس کا پتا بتایا گیا تھا۔ کرنل محمد علی منتظر تھے۔ مجھے ڈرائنگ روم میں لے گئے، بیگم صاحبہ کے دونوں صاحب زادے (موجود نواب رام پور کے حقیقی بھانجے بھی بیٹھے تھے۔) تھوڑی دیر بعد ساتھ والے کمرہ میں بیگم صاحبہ تشریف لائیں، اور دروازہ کی اوٹ میں پردہ کے اندر بیٹھ گئیں اور باتیں شروع کیں۔ آپ نے پوچھا کہ کیا دفتر ریاست میں رام پور سے گمنام خطوط ملا کرتے تھے؟۔ میں نے کہا مجھے تو یاد نہیں، شاید ملے ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ رام پور کے شاہی محلات سے آپ بغیر نام لکھے وہاں کے مظالم کے متعلق خطوط لکھا کرتی تھیں۔ اور ملازموں کو دے کو اسٹیشن پر پوسٹ کرایا کرتی تھیں۔ میں نے ذہن پر زور دیا تو مجھے یاد آیا کہ گمنام کئی خطوط رام پور سے ملے تھے۔ جن میں رام پور پیلس کے اندرونی افسوس ناک حالات کا ذکر ہوتا تھا۔ آپ نے فرمایا کہ آپ

نے ایک طویل عرصہ بطور ایک قیدی کے پیلس میں بسر کیا۔ آپ کو محلات سے باہر جانے کی اجازت نہ تھی۔ آپ نواب صاحب اور اپنی بھاوج وغیرہ کے ساتھ منصوری گئیں اور جب سب لوگ، منصوری سے ڈیرہ دون جارہے تھے تو آپ راستہ میں ڈیرہ دون رام پور والی گاڑی کی بجائے دہلی والی گاڑی میں سوار ہو گئیں۔ ملازموں کو بہت تشویش ہوئی۔ مگر کسی میں جرات نہ تھی کہ آپ کو روکتا۔ اور اب آپ دہلی میں اس لئے آئی ہیں کہ پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ آپ کے ساتھ انصاف کرے۔ اور پبلک کو بتایا جائے کہ بھائی نے بہن کے ساتھ کس قدر زیادتی کی ہے۔ میں دو گھنٹہ کے قریب بیگم صاحبہ سے باتیں کرتا رہا۔ میں ڈرائنگ روم میں تھا اور وہ پردہ کے باہر دروازہ کی اوٹ میں۔ دوسرے کمرہ کے اندر باتیں ہو چکنے کے بعد میں یہ وعدہ کر کے چلا آیا کہ حاضر ہوا کروں گا۔

شہزادی بیگم صاحبہ کے آنے کی اطلاع تمام شہر میں پھیل گئی۔ اور بھائی کی بہن کے ساتھ کی گئی زیادتیوں کے چرچے ہونے شروع ہو گئے۔ خواجہ حسن نظامی کو جب یہ معلوم ہوا تو آپ فوراً رام پور پہنچے اور بیس ہزار کے قریب روپیہ اس لئے لائے کہ شہزادی بیگم صاحبہ کو دہلی میں ذلیل و رسوا کیا جائے۔ آپ نے ایک روزانہ اخبار عادل جاری کیا۔ اس میں ہر روز شہزادی بیگم صاحبہ کے خلاف کئی کئی کالم کے مضامین شروع ہوئے۔ آپ نے کرایہ کے کچھ لوگ تھوڑے روپیہ کے ساتھ خریدے۔ اور باقی روپیہ جو دوسرے لوگوں کے نام سے لائے تھے۔ وہ بھی ہضم کر گئے۔ چند روز کے بعد پھر رام پور تشریف لے گئے۔ اس طرح سے ہیرا پھیری کر کے آپ نے کافی روپیہ اخبار عادل کو چلانے اور لوگوں کا ضمیر خریدنے کے لئے حاصل کیا۔ اور نواب رام پور کو یقین دلایا کہ آپ پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ پر بھی اپنا اثر استعمال کر کے شہزادی بیگم صاحبہ کو جبراً دہلی سے رام پور بھجوا دیں گے۔ حالانکہ پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ آپ کو جو کچھ سمجھتا تھا۔ اس کو دیکھ کر ہنسی آتی تھی۔ کہ نواب صاحب رام پور کو کیوں کر بے وقوف بنایا جا رہا ہے

ادھر تو خواجہ حسن نظامی نے شہزادی بیگم صاحبہ کے خلاف اخبار عادل اور دوسرے چند اخبارات میں پراپیگنڈہ شروع کیا۔ ادھر شہزادی بیگم صاحبہ کے ہاں خودغرض لوگوں نے آنا جانا شروع کر دیا۔ کوئی پمفلٹ لکھنے کی ترغیب دیتا۔ کوئی پوسٹر لکھنے کی، کوئی نیا اخبار نکالنے کے لئے مدد چاہتا تو کوئی اپنے اخبار میں حمایت کرنے کا یقین دلاتا۔ شہزادی بیگم صاحبہ کسی کو کچھ جواب نہ دیتیں۔ سب کو صرف یہ کہہ کر ٹال دیا جاتا کہ غور کریں گے۔ میں جب کام سے فارغ ہو کر جاتا تو مغرب کے بعد ہر روز شہزادی بیگم صاحبہ کے ہاں بھی ضرور پہنچتا۔ شہزادی بیگم صاحبہ بتاتیں کہ کون صاحب تشریف لائے تھے۔ اور کیا کہتے تھے۔ میں مناسب رائے دے دیتا۔ کیونکہ ان خدمات پیش کرنے والوں کے تمام حالات سے خوب واقف تھا۔ یہ زمانہ بھی میرے اور میرے دوستوں کے لئے بہت امتحان کا تھا۔ اس سے پہلے میرے اور خواجہ حسن نظامی کے درمیان بہت گہرے دوستانہ تعلقات تھے۔ آپ نے نواب رام پور کو خوش کرنے کے لئے میرے خلاف لکھنے کی بسم اللہ اس اخبار ''عادل'' سے کی۔ جب خواجہ حسن نظامی نے میرے خلاف پہلا مضمون اس اخبار میں لکھا تو میں نے واحدی صاحب اور بھیا شیخ احسان الحق جو دونوں کے مشترکہ دوست تھے کی معرفت کہلا بھیجا کہ میرے خلاف بلا وجہ نواب رام پور کو خوش کرنے کے لئے نہ لکھیے۔ یہ وضع داری کے خلاف ہے۔ زبانی تو آپ نے واحدی صاحب اور بھیا احسان الحق سے وعدہ کیا، مگر مضامین کا سلسلہ جاری رہا۔ کیونکہ ان کی جیب ان کو مجبور کر رہی تھی کہ نواب رام پور کو اور خوش کرو۔ آخر میں نے واحدی صاحب سے کہا اب میں خواجہ صاحب کو ایسا سیدھا کروں گا جیسے (اس کے بعد پنجابی زبان میں کہا گیا جسے یہاں لکھنا مناسب نہیں۔) واحدی صاحب پنجابی زبان کو نہ سمجھ سکتے تھے۔ اور غیر معمولی اور غیر ضروری نیک تھے۔ آپ نے جب مجھے انتہائی غصہ کی حالت میں ٹیلی فون پر پنجابی کے زیادہ سخت اور زوردار

الفاظ کہتے سنا تو آپ نے کہا کیا فرمایا سردار صاحب کیا فرمایا میں سمجھا نہیں۔ میں نے پنجابی کے ان الفاظ کا اردو میں ترجمہ کیا۔ واحدی صاحب یہ سن کر سن ہو گئے۔ میں نے ٹیلی فون بند کر دیا اور سمجھ لیا کہ خواجہ حسن نظامی روپیہ کے لئے دوستوں کو بھی قربان کر سکتا ہے۔ چنانچہ اس کے بعد ان کے ساتھ تعلقات اچھے نہ ہو سکے۔ حالانکہ انہوں نے درجنوں بار تعلقات کو اچھا کرنے کی کوشش کی۔ ان تمام واقعات کا علم واحدی صاحب اور بھیا احسان الحق دونوں کو ہے، اور یہی وجہ ہے کہ خواجہ صاحب کی مخالفت کا ان دونوں پر کوئی اثر نہیں۔ اور میرے ان دونوں کے ساتھ ہمیشہ ہی گہرے اخلاص و دوستی کے تعلقات قائم رہے ہیں۔ چنانچہ بھیا نے تو دو سال ہوئے میرے جیل جانے پر میری غیر حاضری میں دفتر ریاست کا اور میرا ذاتی تمام انتظام بھی اپنے ذمہ لے لیا۔ اور اب تک دونوں کے ساتھ بھائیوں جیسے گہرے تعلقات ہیں۔ خواجہ حسن نظامی کے علاوہ اور بھی کئی دوست اس زمانہ میں ہمیشہ کے لئے علیحدہ ہو گئے۔ میرٹھ کے ایک جرنلسٹ ان واقعات سے پہلے جب بھی کبھی دہلی آتے تو ایڈیٹر ریاست کے مکان پر ٹھہرتے تھے۔ بہت گہرے مراسم تھے، اس کشمکش کو دیکھ کر ان کے منہ میں بھی پانی بھر آیا۔ خواجہ حسن نظامی کے پاس چلے گئے اور امداد چاہی۔ وہاں درویشوں کے پاس دوسروں کے لئے کیا رکھا تھا۔ ان کی تو اپنی جھولی میں بھی اپنے لئے کافی نہیں ہوتا۔ ناکام میرٹھ واپس چلے گئے۔ کچھ دنوں بعد پھر دفتر ریاست تشریف لائے۔ مجھے ان کے خواجہ حسن نظامی سے ملنے اور اپنی خدمات پیش کرنے کی اطلاعات مل چکی تھی۔ میں نے کہا تشریف لے جایئے اور آئندہ کبھی نہ آیئے۔ چنانچہ اس کے بعد ان حضرات کو ادھر رخ کرنے کا کبھی حوصلہ نہیں ہوا۔ اس طرح سے ہی کئی دوسرے دوستوں سے تعلقات منقطع ہو گئے۔ جن کے متعلق دیکھ لیا کہ یہ روپیہ کی خاطر دوستوں کو قربان کر سکتے ہیں۔

میں ایک روز شام کو شہزادی بیگم صاحبہ کے ہاں گیا۔ تو انہوں نے کہا کہ ایک

صاحب آئے تھے جو خواجہ حسن نظامی کے ہاں کلرک کا کام کرتے ہیں۔ کہتے تھے کہ اگر روپیہ دو تو خواجہ حسن نظامی کے ہاں کے کچھ کاغذات دیئے جا سکتے ہیں۔ جو رام پور سے آئے ہیں۔ چونکہ آپ سے مشورہ کرنا تھا۔ اس لئے اس شخص کو کل آنے کے لئے کہہ دیا ہے۔ میں نے کہا کل جب وہ شخص آئے تو اس سے کہنا، پہلے کاغذات دکھاؤ ،پھر روپیہ کا فیصلہ ہو سکتا ہے۔ اگلے روز اس کلرک سے یہی کہا گیا۔ تیسرے روز وہ شخص کاغذات کا ایک چھوٹا سا بنڈل لے کر آیا۔ اس سے کہا گیا کہ دو روز بعد جواب دیا جائے گا۔ میں اس روز جب بیگم صاحبہ کے ہاں گیا تو آپ نے بغیر اس بنڈل کو کھولے یہ کاغذات مجھے دیکھنے کو کہا ہے۔ میں کاغذات لے کر دفتر چلا گیا۔ بنڈل کھولا تو اس میں زیادہ تر حسن نظامی کے لکھے ہوئے مضامین کے ردی مسودے تھے۔ جن سے ہمیں کوئی دل چسپی نہ تھی۔ کام کے جو کاغذات ملے ان میں تین چار بہت اہم تھے ۔ایک خط مسعود صاحب (میرا خیال ہے یہی نام تھا۔) اس زمانہ میں ریاست میں اس خط کا بلاک چھپا تھا۔) ریونیو منسٹر رام پور کا، ایک وہاں کے پبلٹی آفیسر کا اور ایک کسی اور صاحب کا۔ ان خطوط میں لکھا گیا تھا کہ شہزادی بیگم کے خلاف اخبارات میں اور پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ پر اپنا اثر استعمال کرتے ہوئے خوب پراپا گنڈہ کرو۔ تاکہ یہ خاتون خوب ذلیل و رسوا ہوں۔ ان خطوط کے علاوہ اخباری نقطۂ نگاہ سے چند مضامین کے مسودے بہت اہم تھے۔ جو خواجہ صاحب نے اپنے اخبار میں چھپنے کے لئے حیدر آباد سے بھیجے تھے۔ اور جن میں آپ نے بار بار خود کو ''حضرت خواجہ صاحب'' ''حضرت خواجہ صاحب'' لکھا تھا۔ یعنی حسن نظامی کو خود اپنے نام کے ساتھ ''حضرت خواجہ صاحب'' لکھتے ہوئے شرم محسوس نہ ہوئی۔ حالانکہ کسی ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی سے بھی یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ اپنے نام کے ساتھ لالہ، بابو یا سردار وغیرہ لکھے۔ میں نے جب یہ کاغذات دیکھے تو ایسا محسوس کرتا تھا کہ گویا ایک نعمت ہاتھ آ گئی ہے۔ اور اس سے خواجہ حسن نظامی کی پبلک میں موت واقع کی جا سکے گی۔ میں بار بار ان خطوں اور

مسودوں کو دیکھتا رہا۔ اور رات بھر مجھے نیند نہ آئی۔ (میری فطرت یہ ہے کہ جب تک کسی کام کے متعلق قطعی فیصلہ نہ کرلوں، یا پروگرام تیار نہ ہو جائے یا کام ختم نہ کرلیا جائے میں سو نہیں سکتا۔) نصف گھنٹہ کے قریب ان کاغذات کو دیکھتا رہا اور کھانا بھی کھاتا رہا۔ بے چینی سی محسوس کرتا رہا، پھر سوچتا رہا کہ کون ایسا شخص ہے جو مسعود صاحب کے خط سے واقف ہوگا۔ چند منٹ سوچنے کے بعد مکان سے نیچے اترا۔ دفتر کی پچھلی طرف موٹر گیراج تھا۔ وہاں سے کار نکالی اور نئی دہلی خان بہادر مولوی محمد مظہر صاحب جو دہلی آنے سے پہلے یوپی میں ملازم تھے۔ ہندوستان کے مشہور مفتی مولانا محمد اشرف تھانوی کے حقیقی چھوٹے بھائی تھے اور بعد میں ریاست حیدر آباد میں ایک بہت بڑے عہدے پر تھے۔ کے مکان پر گیا۔ رات کے ساڑھے دس بج چکے تھے۔ مگر وہ ابھی ایک دوست کے ساتھ بیٹھک میں بیٹھے پان کھا رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر حیران رہ گئے۔ فرمانے لگے، اس وقت کیسے تشریف لائے خیریت تو ہے۔ میں نے کہا، سلام دہقانی خالی از مطلب نیست۔ کیا آپ مسعود صاحب کو جانتے ہیں جو پہلے یوپی میں ڈپٹی کلکٹر تھے۔ اور آج کل رام پور میں ہیں۔ آپ نے فرمایا بہت اچھی طرح سے۔ میں نے جیب سے مسعود صاحب والا خط نکالا اور پوچھا کہ کیا آپ یہ خط پہچانتے ہیں۔ آپ نے خط دیکھ کر فرمایا کہ آپ اتنے زیادہ واقف نہیں ہیں۔ مگر یہ صاحب جو ساتھ بیٹھے تھے۔ ان کی طرف اشارہ کرکے) کئی برس تک مسعود صاحب کے ساتھ مراد آباد میں اکٹھے رہے ہیں۔ اور ان کے گہرے دوست ہیں۔ خط جب ان کو دیا گیا اور انہوں نے دیکھتے ہی فوراً کہا کہ یہ خط مسعود صاحب کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ مظہر صاحب نے پوچھا کہ کیا معاملہ ہے۔ میں نے کہا معمولی بات ہے۔ پوچھنا تھا کہ یہ خط کس کا ہے۔ میں واپس چلا آیا۔ نیند کسے آتی، دفتر پہنچا میز پر بیٹھا، اسکیم تیار کی کہ ان کو کب اور کس طرح شائع کیا جائے۔ لیڈر لکھا اور تمام پروگرام تیار کرنے کے بعد سو گیا۔ صبح اٹھتے ہی ان خطوط کو فوٹو گرافر کے پاس اس تاکید سے ایک آدمی کے ہاتھ بھیجا کہ جب

وہ فوٹو لے چکے تو اصل خط احتیاط کے ساتھ واپس لے آئے۔ شام کو بیگم صاحبہ کے پاس گیا اور ان سے کہا کہ پانچ چھ خط کام کے ہیں۔ باقی تمام واپس کر دیجیے۔ اور کہا کہ ان کو پانچ یا چھ خطوط کا ایک یا دو سو روپیہ دے دیا جائے۔ چنانچہ اگلے روز جب خط لانے والا خط لایا تو اس کو دو سو روپے دے دیئے گئے۔

ان خطوط کے بلاک بنے۔ بلاکوں کا چربہ لیا گیا۔ اور ریاست میں ان چربوں کے ساتھ لیڈر شائع ہوا۔ اس پرچہ کا شائع ہونا تھا کہ خواجہ حسن نظامی کے کیمپ میں زلزلہ آ گیا۔ انتہائی گھبراہٹ، بھاگ دوڑ کہ اب کیا ہو؟ خواجہ اینڈ کو کی کانفرنس، مشورے۔ خواجہ حسن نظامی کو جو لوگ ذاتی اعتبار سے جانتے ہیں، ان کو علم تھا کہ یہ حضرت عقل اور ہوشیاری کے اعتبار سے ہمیشہ دوسروں کے رحم پر رہے ہیں۔ ان کی اوپر کی منزل کا حصہ (دماغ) بالکل ٹو لیٹ (خالی) رہتا ہے۔ ان کے مشیروں نے رائے دی کہ پولیس افسروں کے ساتھ مل کر تھانہ میں رپورٹ درج کرا دیجیے۔ اور کاغذات چوری کرانے کے جرم میں دیوان سنگھ کو قید کرا دیجیے۔ تعزیرات ہند کی فلاں دفعہ کے مطابق چوری کا مال لینا بھی جرم ہے۔ چنانچہ دیوان سنگھ فوراً قید ہو جائے گا۔ چنانچہ آپ مع اپنے حواریوں کے پولیس افسروں کے پاس پہنچے۔ راقم الحروف نے بھی اطلاعوں کے لئے اپنا ایک آدمی ان کے کیمپ میں چھوڑ رکھا تھا۔ اس نے ٹیلی فون کیا یہ سکیم ہے۔ چوری کا مقدمہ ہو گا اور دفتر ریاست کی تلاشی ہو گی۔ میں نے ٹیلی فون پر اس اطلاع کو پاتے ہی فوراً تمام کاغذات اور بلاک ایک اٹاچی کیس میں بند کیے، تالہ لگایا اور نئی دہلی ایک دوست کے ہاں گیا۔ وہ دوست اپنے خسر کے ہاں رہتے تھے اور ان کے خسر ہوم ڈیپارٹمنٹ کے ایک بہت بڑے عہدہ پر تھے۔ میں نے اس دوست کا اٹاچی کیس دیا اور کہا کہ اس میں کچھ ضروری کاغذات ہیں۔ ان کو اپنے ہاں رکھ چھوڑیئے۔ اس دوست نے کہا رکھ لیے جائیں گے بہت معمولی بات ہے اور اگر زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے تو آپ اپنے خسر کے ہاتھ دفتر بھیج دیتے ہیں۔ وہاں وہ کانفیڈنشل کا

غذات کی الماری میں رکھ سکتے ہیں ۔ چنانچہ کاغذات گورنمنٹ آف انڈیا کے ہوم ڈیپارٹمنٹ کے کانفیڈینشل الماری میں پہنچ گئے ۔ جہاں سے دو ہفتہ کے بعد واپس منگائے گئے ۔اٹاچی کیس اپنے دوست کے پاس چھوڑ کر میں واپس آیا اور دفتر میں کام میں مصروف تھا کہ پولیس کی جمعیت کے آٹھ ،دس آدمی ،ایک سب انسپکٹر ،خواجہ حسن نظامی کے سالے ابن عربی ۔ایک اخبار نویس جوان دنوں خواجہ حسن نظامی کے دفتر میں کام کرتے تھے ۔(اور اب خواجہ حسن نظامی کو قابل نفرت اور قابل رحم سمجھتے ہیں ۔)اور متعدد دوسرے لوگ تلاشی کے لئے تشریف لائے ،میں بے فکر تھا تلاشی ہوئی ،ایک ایک کونہ چھان مارا گیا۔کوئی کسی طرف تلاشی میں مصروف تھا۔کوئی کسی طرف ۔ چنانچہ ان میں سے ایک صاحب نے دور سے آواز دی کہ دیکھو دری کے نیچے سے خواجہ صاحب کی تحریر نکل آئی ہے ۔ہم لوگ وہاں گئے تو ان کے ہاتھ میں کاغذ کا ایک پرزہ تھا ۔جو خواجہ حسن نظامی کے کسی مضمون کے مسودے کی ایک سلپ تھی ۔ میں نے سب انسپکٹر کو بتایا کہ یہ کاغذ اس شخص نے خود اپنی جیب سے نکال کر رکھا ہے۔اگر میں نے رکھا ہوتا تو اصل کاغذات بھی یہاں ہوتے جن کی آپ کو تلاش ہے ۔سب انسپکٹر کو بھی اس شخص کی اس حرکت پر افسوس ہوا ،کیونکہ یہ پرزہ بالکل بے معنی تھا۔ دراصل یہ لوگ بے ایمانی کرنا چاہتے تھے لیکن ان کے اندر بے ایمانی کرنے کی بھی صلاحیت نہ تھی ۔ اگر اس طرح سے کوئی شخص رکھنا چاہتے تھے تو کوئی پستول یا کوکین وغیرہ رکھواتے ۔ ایک کاغذ کا پرزہ وہ بھی بے ضرر ۔یعنی ساری رات روتے رہے ،مرا ایک بھی نہیں ۔ تلاشی ختم ہوئی کچھ نہ نکلا ،ریاست کے جس پرچہ میں بلاک چھپا ہوا تھا ۔پولیس وہ پرچہ لے کر چلی گئی ۔خواجہ حسن نظامی نے بہت کوشش کی کہ اس پرچہ کو چوری کا ثبوت سمجھ کر ایڈیٹر ریاست کو گرفتار کیا جائے ،مگر بے چارہ نہ قانون کو سمجھتا تھا اور نہ ہی خدا نے شئے لطیف عطا کی تھی ۔

مگر بے چارہ نہ قانون کو سمجھتا تھا اور نہ ہی خدا نے شئے لطیف عطا کی تھی ۔ مقدمہ

کیسے چلتا جب کہ چوری کا مال ہی نہ پکڑا گیا۔ کیونکہ کسی چوری شدہ شے کا فوٹو چوری قرار نہیں دیا جا سکتا۔ جس طرح فرار شدہ مجرم کا فوٹو قابل تعزیر نہیں، بلکہ خود فرار ہونے والا مجرم قابل گرفت ہے۔ یہ لوگ ٹھنڈے ہو کر اور اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ چنانچہ اس کے بعد ریاست میں یہ بلاک چھپے اور ان پر تفصیل کے ساتھ بحث ہوئی۔ خواجہ حسن نظامی کے پریشان مشیروں کی پھر کانفرنس ہوئی۔ ایک صاحب نے آپ کو رائے دی کہ اپنی پبلک پوزیشن صاف کرنے کے لئے یہ اعلان کر دو کہ یہ خطوط جعلی تھے۔ رام پور کے لوگوں کے لکھے ہوئے نہیں تھے۔ تا کہ لوگ ریاست کے پراپا گنڈہ پر یقین نہ کریں۔ خواجہ حسن نظامی لوگوں کی رائے قبول کرنے کے اعتبار سے بہت احمق واقع ہوئے ہیں۔ آپ نے کچھ نہ سوچا، جھٹ سے اخبار میں اعلان کرا دیا۔ کہ یہ خطوط جعلی تھے، رام پور کے منسٹروں کے لکھے ہوئے نہیں تھے۔ خواجہ حسن نظامی کا یہ اعلان شائع ہونا تھا کہ ہمارے ہاتھ اور مضبوط ہو گئے۔ ہم نے چیلنج کیا کہ خواجہ حسن نظامی میدان میں آئے اور بتائے کہ اصل پوزیشن کیا ہے۔ یہ خطوط جعلی ہیں یا اصلی کیونکہ صرف دو صورتیں ہی ممکن ہیں یا تو یہ خطوط جعلی ہیں یا اصلی۔ اگر یہ خط جعلی ہیں تو اس نے پولیس میں چوری کی جھوٹی رپورٹ دی، کیونکہ جعلی خطوط کا چوری سے کیا تعلق۔ اس کا تعلق تو جعل سازی سے تھا۔ اور اگر چوری کی یہ رپورٹ درست تھی اور خواجہ حسن نظامی نے یہ رپورٹ پولیس میں ایمان داری کے ساتھ درج کرائی تھی۔ یعنی خط چوری ہوئے تھے، تو پھر یہ خط جعلی کیسے ہو سکتے ہیں۔ اس چیلنج کو پڑھ کر خواجہ حسن نظامی کے چھکے چھوٹ گئے۔ کیا جواب دیتے۔ اس زہر کو اپنی ماں کا میٹھا دودھ سمجھ کر پی گئے۔ اور قطعی خاموش ہو گئے، گویا آپ کی زبان میں گنگ تھا۔ اس کے بعد آپ نے اس مسلہ پر پھر کبھی کچھ نہیں فرمایا۔

چیلنج شائع ہوا۔ دفتر ریاست اطلاع پہنچی کہ نواب رام پور کے خسر صاحب زادہ عبدالصمد جو بعد میں ریاست کشمیر میں ہوم منسٹر مقرر ہوئے دہلی آئے ہیں۔ اور میڈن

ہوٹل میں مقیم ہیں۔ اس زمانہ میں مسٹر محمد محسن سابق ایڈیٹر روزنامہ اودھ اخبار لکھنو دہلی میں تھے۔ اور دفتر ریاست میں تشریف لایا کرتے تھے۔ صاحبزادہ صاحب کے دوست تھے۔ میں نے ان سے کہا، کہ میڈن ہوٹل جا کر پتا تو کرو کہ صاحب زادہ صاحب پر اس چیلنج کا کیا اثر ہے؟۔ وہ گئے، صاحب زادہ صاحب سے ملے، اور اس چیلنج اخبار ریاست اور خواجہ حسن نظامی کا ذکر چھیڑ دیا۔ تو صاحب زادہ صاحب نے اپنی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر محسن صاحب سے کہا۔

> محسن صاحب کیا پوچھتے ہو نواب صاحب غلط راستے پر جا رہے ہیں۔ کسی کی نہیں سنتے۔ خواجہ حسن نظامی جیسے غیر ذمہ دارانہ دوستوں کی وجہ سے رام پور کی مٹی پلید ہو رہی ہے۔ ذمہ دار منسٹروں نے حسن نظامی جیسے غیر ذمہ دار شخص کو خطوط لکھنے کی حماقت کی ہے۔ میں تو ایسے معاملات میں دخل نہیں دیتا۔ خدا ان کو عقل دے۔

یہ خطوط اب بھی ایڈیٹر ریاست کے پاس موجود ہیں۔ جن کی حیثیت اوراق پارینہ سے زیادہ نہیں ہے۔ جب کبھی پچھلے خطوط کا چھانٹتا ہوں، اور ریاست رام پور کے فائل میں ان کے خطوط اور شہزادی بیگم صاحبہ کے خطوط ہیں، جس میں آپ نے لکھا ہے کہ آپ ایڈیٹر ریاست کی اپنے بھائیوں کی طرح عزت و قدر کرتی ہیں، کو دیکھتا ہوں تو گنگناتے ہوئے یہ شعر زبان پر آجاتا ہے۔

گاہے گاہے باز خواں ایں دفتر پارینہ را
تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را

ایڈیٹر ''ریاست'' پر کوکین کا مقدمہ

ایڈیٹر ''ریاست'' لاہور کے ایک روزانہ اردو اخبار پینتھ کو ایڈٹ کرتا تھا۔ اس اخبار میں دبے الفاظ کے ساتھ پٹیالہ کے سردار لال سنگھ کے قتل کا ذکر ہوا۔ اس سے پہلے کبھی کسی اخبار میں کبھی بھی مرحوم راجہ پٹیالہ کے خلاف ایسا الزام شائع نہیں ہوا تھا۔ اس مضمون کا شائع ہونا تھا کہ پٹیالہ کے کیمپ میں زلزلہ آ گیا۔ سر دیا کشن کول وزیر اعظم پٹیالہ لاہور تشریف لائے۔ اور یہ مضمون ڈاکٹر گوکل چند نارنگ بیرسٹر (جو بعد میں پنجاب کے منسٹر بنے) اور اب سر گوکل چند ہیں۔ کو دکھا کر چند قانونی مشورے کیے۔ اس مضمون میں دبے الفاظ میں اشارۃً قتل کا ذکر تھا۔ صاف الفاظ میں نہ تھا۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ ڈاکٹر نارنگ نے کیا رائے دی۔ اتفاق سے اس وقت ڈاکٹر نارنگ کے پاس لالہ دینا ناتھ مرحوم ایڈیٹر ہندوستان جو ڈاکٹر صاحب کے بہت گہرے دوست تھے۔ بیٹھے تھے۔ ان کو معلوم ہوا کہ سر دیا کشن کول اس مضمون پر مقدمہ چلانے کا مشورہ لے رہے ہیں۔ تو آپ سیدھے دفتر پینتھ میں تشریف لائے اور فرمایا کہ سر دیا کشن کول ڈاکٹر نارنگ سے مشورہ لینے کے لئے پٹیالہ سے تشریف لائے ہیں، اور مقدمہ چلایا جائے گا۔ راقم الحروف کا یہ زندگی بھر معمول رہا ہے کہ اس وقت تک کسی معاملہ کو اخبار میں شروع نہیں کرتا، جب تک ہاتھ مضبوط نہ ہوں، اور میں قدم اٹھانے کے بعد ڈر، خوف، بزدلی، خوف یا دھمکی کے ذریعے قدم پیچھے اٹھانا بزدلی سمجھتا ہوں۔ لالہ دینا ناتھ باتیں کرتے اور مجھے قدم پھونک پھونک کر رکھنے کی تلقین کرتے رہے۔ میں سنتا رہا۔ لالہ جی کے جانے کے بعد میں تھوڑی دیر غور کرتا رہا۔ پھر ایک لیڈر لکھا جو بہت زوردار تھا۔ اس لیڈر میں مرحوم راجہ پٹیالہ پر کھلے اور صاف الفاظ میں لال سنگھ کو قتل کرنے کا الزام لگایا۔ اور چیلنج کیا گیا کہ اگر مہاراجہ پٹیالہ میں غیرت ہے تو مجھ پر اس الزام میں مقدمہ چلایا جائے۔ میں ثابت کرنے کے لئے تیار ہوں کہ قتل کی ذمہ داری مہاراجہ پٹیالہ کی گردن پر ہے۔ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ پٹیالہ کی کیا حالت ہوگی؟

۔جس صورت میں کہ اشارہ اور دبے الفاظ سے ہی گھبراہٹ پیدا ہو رہی تھی۔لیڈر کے بعد راقم الحروف نے اخبار ''پینتھ'' میں ہر روز اس الزام کے سلسلہ میں لکھنا شروع کیا ۔اور کئی روز تک مضامین کا یہ سلسلہ جاری رہا۔اس واقعہ سے قریباً ڈیڑھ ماہ بعد کا ذکر ہے کہ میں شام کو کچھ سامان خریدنے بازار گیا ہوا تھا۔جب واپس آیا تو دیکھا کہ دفتر ''پینتھ'' کے سامنے ایک اکسائز انسپکٹر،ایک سب انسپکٹر پولیس اور ایک درجن کے قریب اکسائز اور پولیس ڈیپارٹمنٹ کے ملازم اور گواہ کھڑے ہیں۔میں نے پہنچتے ہی پوچھا کہ فرمائیے کیا حکم ہے؟۔انہوں نے بتایا کہ کوکین رکھنے کے الزام میں تلاشی ہوگی۔پولیس کو اطلاع ملی ہے کہ دیوان سنگھ کوکین فروشی کرتا ہے۔

تلاشی ہوئی۔تلاشی میں میری میز پر جو کاغذات والا ڈسپیچ بکس تھا۔اس میں سے نارتھ ویسٹرن ریلوے کے دو ٹائم ٹیبل نکلے۔ایک ٹائم ٹیبل جس پر میرا نام لکھا تھا اور میرا ذاتی تھا۔دوسرا جس کے لفافہ میں جو ٹائم ٹیبل کے ساتھ پچھلے حصہ میں ریلوے کے نقشہ کے لئے ہوتا ہے۔کوکین کی ایک چھوٹی سی پڑیا اور ایک کارڈ تھا۔جو گوجرانوالہ سے دیوان سنگھ ایڈیٹر پینتھ کے نام بھیجا گیا تھا اور جس میں لکھا گیا تھا کہ کوکین بھیجی جا رہی ہے۔روپیہ جلدی بھیج دو۔اس کارڈ کے لکھنے والے کا نام گوربخش سنگھ تھا۔(غالباً یہی نام تھا) مجھے ٹھیک سے یاد نہیں،تلاشی میں کوکین اور یہ خط نکل آیا ،میں حیران تھا کہ یہ اس بکس میں کیوں کر آ گیا۔اس خط اور کوکین نکلنے کے بعد مجھے کوتوالی انارکلی لے جایا گیا۔وہاں ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس چودھری رام چند تھے۔ میری گرفتاری کی خبر اخبارات اور دوستوں کے حلقہ میں پہنچی تو اخبارات کے ایڈیٹر حیران تھے۔کئی دوستوں نے کوتوالی پہنچ کر ضمانت کی کوشش کی۔اور باوجود اس بات کے کہ جرم قابل ضمانت تھا۔پولیس والوں نے ضمانت نہ لی اور مجھے رات کو حوالات میں بند کر دیا گیا۔

اگلے روز صبح بھی میرے دوست،احباب،اخبارات کے ایڈیٹر اور عزیز بھی

ضمانت کے لئے کوشش کرتے رہے، مگر پولیس والوں نے کوئی بات نہ سنی۔ دوپہر کو پولیس مجھے لالہ شنکر لال مجسٹریٹ کے گھر پر گوالمنڈی ریمانڈ کے لئے لے گئی۔ وہاں کئی اخبارات کے ایڈیٹر، دوست اور رشتہ دار موجود تھے۔ ان لوگوں نے بتایا کہ رات کو اور صبح کو ضمانت کی کوشش کی گئی، مگر کسی نے پرواہ نہیں کی۔ مجسٹریٹ نے فوراً ضمانت پر چھوڑنے کا حکم دے دیا۔ اور آپ پولیس والوں پر ناراض ہوئے۔ اور پوچھا کہ جس صورت میں جرم قابل ضمانت تھا۔ ضمانت کیوں نہ لی گئی۔ پولیس کے جو لوگ ساتھ آئے تھے، کوئی جواب نہ دے سکے۔ صرف یہی کہا کہ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ صاحب ہی جواب دے سکتے ہیں کہ ضمانت کیوں نہ لی گئی۔ ان کو کچھ علم نہیں۔ کہ کیوں ضمانت نہ لی گئی۔

کوکین کا مقدمہ چلا۔ راقم الحروف نے ڈاکٹر گوکل چند نارنگ کو وکیل کیا۔ ڈاکٹر صاحب لاہور کے فاضل ترین وکلا میں سے تھے۔ اور لاہور ہائی کورٹ میں پریکٹس کرتے تھے۔ چھوٹی عدالتوں میں نہ جاتے تھے۔ آپ نے کافی فیس طلب کی جو ادا کر دی گئی۔ مقدمہ کی کاروائی شروع ہوئی اور مسل کو غور کے ساتھ دیکھا گیا تو معلوم ہوا کہ کوکین کے ساتھ جو کارڈ رکھا ہوا ملا، اس پر جو عبارت درج ہے۔ اس میں کارڈ لکھنے کا مقام گوجرانوالہ درج ہے۔ مگر کارڈ کی روانگی کی مہر نصف لگی ہوئی ہے۔ جس سے شہر کا نام نہیں پڑھا جاتا۔ مگر ڈاک خانے سے ڈسپیچ کا وقت صبح آٹھ بجے ہے۔ دوسری مہر لاہور پہنچنے کی تھی۔ جس پر وہی تاریخ جو ڈسپیچ کی تھی اور وقت نو بجے کا تھا۔ گویا کہ یہ کارڈ مہروں کے مطابق (اگر گوجرانوالہ سے چلا ہے) تو گوجرانوالہ کے ڈاک خانے سے آٹھ بجے کے بعد چلا اور نو بجے لاہور کے ڈاک خانے پہنچا۔ اس کارڈ کو دیکھ کر ہم سب لوگ حیران تھے۔ چنانچہ ڈاکٹر نارنگ نے مجسٹریٹ کو توجہ دلائی کہ صبح آٹھ بجے کوئی ٹرین گوجرانوالہ سے لاہور نہیں آتی اور اگر آئے بھی تو ٹرین جلدی سے جلدی دو گھنٹہ میں لاہور پہنچ سکتی ہے۔ پھر یہ کارڈ کس طرح اور کس ذریعہ سے آٹھ بجے

گوجرانوالہ کے ڈاک خانہ سے روانہ ہو کر لاہور کے ڈاک خانہ پہنچ گیا۔ استغاثہ کی یہ جعل سازی صاف ظاہر تھی۔ اس کارڈ کے دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ لاہور کے ڈاک خانہ میں کسی مہر لگانے والے کا پانچ دس روپے دے کر دونوں مہریں لگوالی گئیں اور جلدی میں وہی مہریں لگ گئیں جو وقت اور تاریخ کی تیار رکھی تھیں۔ چنانچہ اس مقدمہ میں ٹھاکر للت چند مجسٹریٹ جو بعد میں پنجاب کے مختلف اضلاع میں ڈپٹی کمشنر اور ریاست جے پور میں ریونیو منسٹر رہے۔ نے راقم الحروف کو بری کرتے ہوئے لکھا کہ یہ مقدمہ ایک سازش کا نتیجہ ہے۔ جس کی تہہ میں ریاست پٹیالہ کا روپیہ ہے۔ اور بلاشبہ جعل سازی کی گئی ہے۔

میں بری ہو گیا۔ اخبار ہفتہ بند ہو چکا تھا۔ میں ریاست نابھ میں چلا گیا۔ جہاں راجہ کی معزولی کے بعد نظر بند کر دیا گیا۔ نابھ میں تین ماہ کے قریب پولیس کی نگرانی میں نظر بند رہا۔ کسی کو مجھ سے ملنے اور بات کرنے کی اجازت نہ تھی۔ میرے دوستوں نے نابھ کی گرفتاری اور نظر بندی کو وائسرائے تک پہنچایا۔ لارڈ ریڈنگ وائسرائے تھے۔ انہوں نے کاغذات طلب کیے، کوئی الزام نہ تھا۔ آپ کے حکم سے تین ماہ نظر بندی کے بعد رہائی ہوئی۔ جب میں رہا ہو کر لاہور پہنچا تو معلوم ہوا کہ میری نظر بندی کے زمانے میں گورنمنٹ آف انڈیا کے حکم سے میرے کوکین کے مقدمے کی تحقیق ہوئی۔ تحقیقات کا کام خان بہادر عبدالعزیز سپرنٹنڈنٹ پولیس (جو بعد میں پنجاب میں ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس مقرر ہوئے) کے سپرد کیا گیا۔ خان بہادر عبدالعزیز نے گورنمنٹ آف انڈیا کو من وعن اصل حالات کی رپورٹ دی۔ اس رپورٹ کے بعد لاہور پولیس وا کسائز ڈیپارٹمنٹ کے متعدد افسروں کے گھروں کی تلاشی ہوئی۔ تلاشی میں کوکین کا سراغ نکل آیا۔ اور ان افسروں میں سے بعض پر مقدمہ قائم ہوا۔ اور بعض موقوف کیے گئے اور بعض کی تبدیلیاں کی گئیں۔

مقدمہ کے دوران میں ہی معلوم ہو گیا تھا کہ کوکین کے رکھنے اور مقدمہ بنانے میں

مہاراجہ پٹیالہ کا پچاس ہزار کے قریب روپیہ صرف ہوا تھا۔ کوکین والا ٹائم ٹیبل رکھنے کے لیے دفتر پینتھر کے ایک کلرک کی خدمات دو سو روپیہ میں حاصل کی گئیں۔ یہ مقدمہ میرے اندر قوت ارادی اور مصائب کو برداشت کرنے کی سپرٹ کو زیادہ کرنے کا بڑا باعث ہوا۔ اور میرا خیال ہے کہ ہر مصیبت انسان کو زیادہ مضبوط کرنے کا باعث بنتی ہے۔

عورت اور سنگار

ریاست کا دفتر اجمیری دروازے کے باہر تھا۔ سردار گوپال سنگھ ممبر پنجاب اسمبلی (جو آج کل پنجاب اسمبلی میں اپوزیشن کے لیڈر ہیں۔) اور او، ای، بی کا خطاب بھی حاصل کر چکے ہیں۔ اپنی امریکن بیوی مسز آرس گوپال سنگھ کے ساتھ تشریف لائے۔ اور غالبا تین ماہ کے قریب بطور مہمان رہے۔ امریکن اور انگلش عورتوں کی سوسائٹی بہت پر لطف ہوتی ہے۔ اگر ان کے ساتھ بے تکلفی کے مگر بہن بھائیوں جیسے تعلقات ہوں۔ اور ان تعلقات میں بد نیتی کا کوئی شائبہ تک نہ ہو۔ یہ عورتیں لطیف مذاق سے بہت محظوظ ہوتی ہیں۔ ان میاں بیوی کی سوسائٹی میں زندگی بھر نہیں بھول سکا۔ اور شاید یہ تین ماہ میری زندگی کا بہترین حصہ تھا۔ اوپر کی منزل میں میرے پرائیویٹ دفتر کے ساتھ والے کمرہ میں یہ مقیم تھے۔ اور میرے پرائیویٹ دفتر میں ہی میری خواب گاہ تھی۔ تاکہ جب میں کام سے فارغ ہو جاؤں تو سو جاؤں۔ اور جب جاگوں تو فورا کام شروع کر دوں۔ چنانچہ رات کو جب ہم کام سے فارغ ہوتے تو یہ میاں بیوی میرے کمرے میں آ جاتے۔ میں تھکاوٹ کے باعث پلنگ پر لیٹ جاتا اور یہ کرسیوں پر بیٹھ جاتے۔ اس طرح رات کا بارہ ایک بج جاتا۔ اور بار ہا ایسا ہوا کہ سردار گوپال سنگھ میرٹھ وغیرہ دہلی سے باہر چلے جاتے، رات کو بھی واپس نہیں آتے اور مسز گوپال سنگھ اسی طرح حسب معمول رات کو بارہ ایک بجے تک میرے پاس بیٹھی باتیں کرتی رہتیں۔ اور ایسا محسوس ہوتا کہ ایک بہن تنہائی میں اپنے بھائی کے پاس بیٹھی باتیں کر رہی ہے۔ مسز گوپال خوبصورت تھیں، اکیس، بائیس سال کی عمر، امریکن سرخ و سپید اور پھر جوان لڑکیوں کا بناؤ سنگار۔ دن میں کئی بار ساڑھیاں بدلتیں اور پھر اپنی خوب صورتی کو آئینہ میں دیکھتیں۔ ایک روز ہم شام کو موٹر میں سیر کو جانے والے تھے کہ مسز گوپال سنگھ نے بناؤ سنگھار کر کے بہت خوب صورت ساڑھی پہنی۔ اور بار بار قد آدم آئینہ کے سامنے کبھی سیدھی کھڑی ہو کر، کبھی ایک طرف کا حصہ اور کبھی دوسری

طرف کا دیکھتیں۔ میں نے مذاق سے کہا آپ کا حسن قدرتی طور پر ہی دہلی کے لوگوں کے لئے کافی خطرہ کا باعث ہے۔ اس قدر بناؤ سنگھار اور ساڑھی کی کیا ضرورت تھی۔ پھر آپ کے میاں دن بھر آپ کے پاس رہتے ہیں جن کو سنگھار دکھانے کی ضرورت ہے۔ اب باہر جاتے وقت کیوں یہ حسن کا زرہ بکتر پہن لیا۔ کیا شہر کے لئے قتل عام کا حکم جاری ہوگا۔ سردار گوپال سنگھ اور ان کی بیوی دونوں مسکرا دیئے۔ مسکرانے کے بعد مسز گوپال سنگھ نے بناؤ سنگھار کے فلسفہ پر بحث شروع کر دی۔ اور جو کچھ کہا میں اس کو اس کے بعد کبھی نہیں بھول سکا۔ آپ نے فرمایا جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اس بناؤ سنگھار کا باعث کریکٹر کی کمزوری ہے۔ وہ غلطی پر ہیں۔ عورت بناؤ سنگھار کسی کو خوش کرنے کے لئے نہیں کرتی، بلکہ انسانی فطرت ہے کہ انسان جب اپنے آپ کو خوب صورت دیکھتا ہے تو خوش ہوتا ہے۔ اور یہ خوشی صرف عورتوں تک محدود نہیں، مرد، عورتیں اور بچے بھی اس سے مسرت اور حظ اٹھاتے ہیں۔ مرد آئینہ کے سامنے کالر ٹائی لگاتا ہے۔ بالوں کو سنوار کر ٹوپی پہنتا ہے۔ یا بنا بنا کر پگڑی پہنتا ہے۔ تو کیا وہ اپنی ٹائی، کالر یا پگڑی عورتوں کو دکھانے یا محبت کی دعوت دینے کے لئے پہنتا ہے۔ آپ ایک بچہ کو لیجیے۔ اس کو نہلا دھلا کر اچھے خوب صورت کپڑے پہنایئے، پھر دیکھیے وہ کس قدر خوش ہوتا ہے۔ اس قدر خوش کہ وہ دوسرے میلے کچیلے بچوں سے بات کرنا بھی پسند نہیں کرتا۔ عورت اگر بناؤ سنگھار کرتی ہے تو صرف اپنی ذات کو خوش کرنے کے لئے۔ کیونکہ عورت ہونے کے باعث اسے فطرتاً زیادہ خوبصورتی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور جب وہ آئینہ کے سامنے یا دوسرے لوگوں کی نگاہوں میں اپنے آپ کو بہت حسین محسوس کرتی ہے تو وہ انتہائی مسرور ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ برے خیالات کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

مسز گوپال سنگھ کے اس جواب نے میری آنکھیں کھول دیں۔ اس سے پہلے میں ہر اس عورت کو بدچلن سمجھتا تھا جو بناؤ سنگھار کرنے کے بعد بازار میں اپنے حسن کی

لہریں چھنکتی ہوئی گزرتی ہے۔ مگر اب محسوس ہوتا ہے کہ میرا یہ خیال غلط تھا۔ اس نمائش حسن کا بدچلنی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ عورت مرد کے مقابلے میں فطرتاً زیادہ داد پسند ہے۔ اور وہ چاہتی ہے کہ اس کا شوہر، اس کے بچے، اس کی سہیلیاں اس کے رشتے دار اور دوسرے لوگ اگر زبان سے نہیں تو کم از کم اپنے دل میں ضرور اس کے حسن کی داد دیں۔ اور اس کے حسن کی کشش کو محسوس کریں۔ چنانچہ اس کے ثبوت میں ایسے سینکڑوں واقعات پیش کیے جاسکتے ہیں، کہ کوئی حسین عورت بناؤ سنگار کے بعد لوگوں سے داد حسن لیتے ہوئے مسکرا دی۔ بعض بے وقوفوں نے اس نمائش حسن کو دعوت محبت سمجھ لیا۔ اور اس کے دل کو ٹٹولنے کے لئے اس نے مذاق کیا تو اس عورت نے اس عاشق کی جوتوں سے مرمت کردی۔

میں اپنے تجربہ کی بنا پر یہ کہہ سکتا ہوں کہ جو لوگ عورت کی فطرت سے ناواقف ہوتے ہوئے اس کے بناؤ سنگھار اور اس کے نمائش حسن کو بدچلنی سمجھتے ہیں۔ غلطی پر ہیں اور جو عورت یہ سمجھتی ہے کہ وہ بناؤ سنگھار صرف اپنے شوہر کو خوش کرنے کے لئے کرتی ہے۔ اور اس کا اپنی ذات یا لوگوں سے خراج تحسین وصول کرنے سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ مکاری کا ثبوت دیتے ہوئے اپنے شوہر کو بے وقوف بناتی ہے۔ کیونکہ عورت فطرتاً یہ چاہتی ہے کہ دنیا اس کو حسین سمجھے۔ اس کی فطرت کے ساتھ بدچلنی یا بدمعاشی کا کوئی تعلق نہیں اور عورت کے بناؤ سنگھار کو بدچلنی سمجھنا عورت کے ساتھ بہت بڑا ظلم ہے۔

بد دل ملازم دشمن سے بدتر ہے

مرحوم راجہ دیواس سینئر فطرت کے لحاظ سے صحیح معنوں میں مرہٹہ تھے ۔ دشمن کے سامنے نہ جھکنا اور خودداری پر جان دینے کو تیار رہنا آپ کا کریکٹر تھا۔ اس کریکٹر کے باعث آپ زندگی بھر پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے معتوب رہے۔ اور گورنمنٹ ہمیشہ اس کوشش میں رہی کہ آپ کو معزول کیا جائے ۔ چنانچہ آپ جب پولیٹیکل مصائب میں گھرے ہوئے تھے تو آپ کا ایک پرائیویٹ ملازم ایڈیٹر ''ریاست'' کے پاس پیغام لایا۔ اور کہا کہ مہاراجہ ملنا چاہتے ہیں ۔ میں اس شخص کے ساتھ دیواس گیا۔ برسات کا موسم تھا۔ گیسٹ ہاؤس بہت اچھی جگہ پر ہے۔ سامنے چھوٹے چھوٹے پہاڑ نظر آتے ہیں ۔ سنٹرل انڈیا کی برسات ایسا دل کش منظر سوائے منصوری، شملہ وغیرہ پہاڑوں کے شمالی ہندوستان میں کم نصیب ہوتا ہے ۔ اس گیسٹ ہاؤس میں تین روز رہا ۔ مہاراجہ سے دن میں کئی کئی بار ملتا، مشورہ ہوتا۔ پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کی مخالفت کا کیا علاج ہے؟ ۔

گیسٹ ہاؤس کے کمرے میں میرے پلنگ کے پاس میرا کوٹ لٹک رہا تھا۔ میں خوش گوار موسم سے لطف اندوز ہونے کے لئے باہر صحن میں ٹہل رہا تھا۔ اور ایک گھنٹہ کے قریب ٹہلتا رہا۔ اتنے میں مہاراجہ کا موٹر مجھے لینے کے لئے آیا۔ میں کوٹ پہننے کے لئے کمرے کے اندر گیا۔ کوٹ پہنا اور پاکٹ بک کو کوٹ میں سے نکال کر اس میں اپنے وزیٹنگ کارڈ رکھنے لگا۔ تو دیکھا کہ دس روپے کا نوٹ غائب ہے۔ جو وقت بے وقت کے لئے ہمیشہ اس پاکٹ بک میں پڑا رہتا تھا۔ جب اس نوٹ کو غائب دیکھا تو مجھے بڑا غصہ آیا۔ مجھ میں کمزوری ہے کہ جب میرے گھر یا دفتر میں چوری ہوئی ہو یا کوئی جھوٹ بولے تو میں صبر نہیں کرسکتا۔ چوری کرنے اور جھوٹ بولنے والے ملازم کو پیٹنا شروع کر دیتا ہوں ۔ اور پیٹنے کے بعد اکثر نکال دیتا ہوں۔ اور دس روپے کے نوٹ کو بھی غائب دیکھ کر میں خاموش نہ رہ سکا۔ گیسٹ ہاؤس کے انچارج کو بلایا اور کہا

ابھی دو تین گھنٹہ کے اندر جیب میں سے دس کا نوٹ غائب ہو گیا ہے۔ میری اس شکایت کو سن کر گیسٹ ہاؤس کے انچارج نے کہا

سرکار کیا عرض کروں، اس سے پہلے بھی کئی مہمانوں کی جیب سے روپیہ نکل چکا ہے۔ ان ملازموں کو چھ چھ ماہ تک تنخواہیں نہیں ملتیں۔ یہ لوگ کھائیں آخر کہاں سے؟۔ میں کوشش کرتا ہوں کہ بد دیانتی نہ کریں مگر باز نہیں آتے۔ کھانے پینے کے سامان سے بھی چوری کرتے ہیں اور جو مہمان آتا ہے۔ ان کی جیب میں سے بھی روپیہ نکال لیتے ہیں۔ ان کو خیال نہیں آتا کہ اس طرح ریاست کی اور مہاراجہ کی بدنامی ہوتی ہے۔

دس روپیہ کی رقم بہت معمولی تھی۔ میں نے تو اس کا کوئی خیال نہ کیا۔ نہ ریاست کے کسی افسر سے ذکر کرنا مناسب سمجھا۔ مگر اس سپر نٹنڈنٹ گیسٹ ہاؤس کے الفاظ ہمیشہ میرے کانوں میں گونجتے رہے۔

''چھ چھ ماہ تک تنخواہیں نہیں ملتیں''

''یہ لوگ کھائیں آخر کہاں سے''

ان الفاظ کا اثر یہ ہوا کہ میں نے اس کے بعد ہمیشہ یہ کوشش کی کہ ملازم بددل نہ ہوں۔ ان کو پیٹ بھرنے کے لئے کافی اور وقت پر تنخواہ دی جائے۔ اگر کبھی مجبوری کے باعث دیر ہوتی رہی۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ دفتر ریاست کے ملازم یہاں سے جانے کے بعد پھر اسی کوشش میں رہتے ہیں کہ وہ دفتر ریاست کی ملازمت کریں۔ اور اب ریاست کے اس نئے دور میں تو فیصلہ کیا گیا ہے۔ اور اب تک اس پر عمل کیا جا رہا ہے۔ کہ ملازموں کو وقت پر اور کافی تنخواہ دی جائے۔ تا کہ ملازم کو

خود ملازمت کی خواہش ہو نہ کہ ملازم سے ملازمت نہ چھوڑنے کی درخواست کی جائے۔

میری رائے یہ ہے کہ معمولی تنخواہ پر نکمے دس ملازموں کی جگہ اچھے محنتی اور کام کرنے والے پانچ ملازم زیادہ تنخواہ پر رکھنا اچھا ہے۔ اور کوشش کرنی چاہیئے کہ ملازم خوش اور مطمئن رہیں اور ان کو وقت پر تنخواہ ملتی رہے۔ غیر مطمئن اور بد دل ملازم کو کسی صورت میں نہ رکھا جائے۔ کیونکہ وہ دشمنوں کی طرح نقصان کا باعث ہوتا ہے۔
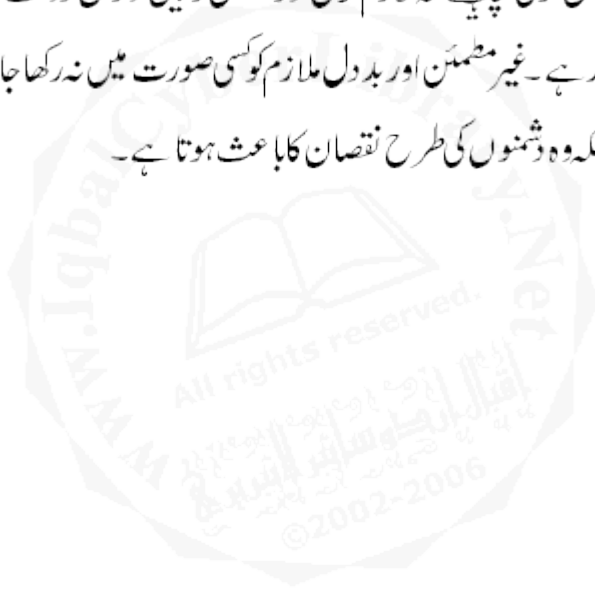
''ریاست'' سر جان تھامپسن اور والیان ریاست

جب ''ریاست'' میں والیان ریاست کو سختی کے ساتھ بے نقاب کیا جا رہا تھا اور سر جان تھامپسن گورنمنٹ آف انڈیا کے پولیٹیکل سیکرٹری تھے۔ تو سر جان نے تمام ریاستوں کو ایک سرکولر بھیجا۔ جس میں لکھا کہ ریاست کے نمائندے اور نامہ نگار ریاستوں میں پھر کر حالات معلوم کرنے کی کوشش میں رہتے ہیں۔ اور خطرہ ہے کہ یہ لوگ کوئی ایسی کانفیڈینشل خط و کتابت حاصل نہ کر لیں جو والیان ریاست اور پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے درمیان ہو۔ بہت احتیاط کی جائے۔

اس سرکولر کی اطلاع مجھے ایک ریاست کے وزیر اعظم نے دی جو میرا گہرا دوست تھا۔ اس اطلاع کے بعد میرے ذہن پر یہ اثر رہا کہ سر جان تھامپسن بھی ریاست کے خلاف ہیں۔

سر جان تھامپسن کے پولیٹیکل سیکرٹری کے عہدہ سے علیحدہ ہونے کی داستان بھی بڑی عجیب اور دل چسپ ہے۔ آپ نہایت شریف، غیر معمولی دیانت دار، بہت لائق، انصاف پسند قوت ارادی کے مضبوط اور ایک مدبر سویلین تھے۔ جب آپ مارشل لاء کے بعد چیف سیکرٹری پنجاب گورنمنٹ کے عہدہ سے تبدیل کر کے پولیٹیکل سیکرٹری گورنمنٹ ہند مقرر ہوئے اور آپ نے ریاستوں کے حالات دیکھے تو آپ کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ اور آپ کو حیرت ہوئی کہ اس زمانہ میں بھی ریاستوں کے اندر ایسے ناقابل برداشت مظالم ہو رہے ہیں۔ چنانچہ اس حیرت کا نتیجہ یہ تھا کہ آپ دل سے والیان ریاست کے خلاف ہو گئے۔ یہ جذبات ہی مہاراجہ نابھ اور مہاراجہ اندور وغیرہ کو گدیوں سے علیحدہ کرنے اور نظام دکن کو تاریخی خط لکھنے کا باعث ہو گئے۔ اور یہ واقعہ ہے کہ اگر آپ پانچ سال اور پولیٹیکل سیکرٹری رہتے تو مرحوم مہاراجہ پٹیالہ، مہاراجہ الور اور جام صاحب نوانگر نے بیس بیس لاکھ روپے چندہ دیا۔

سر جان تھامپسن چیف کمشنر مقرر ہوئے اور دہلی آئے تو ایڈیٹر ''ریاست'' کے

ذہن پر اس سرکولر لیٹر (جو آپ نے ریاست) کے متعلق والیان ریاست کو بھیجا تھا۔
کے باعث یہ اثر تھا کہ سر جان تھامپسن ریاست کے خلاف ہیں۔ یہ بہت مضبوط قوت
ارادی کے انسان ہیں اگر دشمن ہوئے تو بہت نقصان پہنچائیں گے۔ چنانچہ دو تین ہفتہ
ایڈیٹر ریاست سوچتا رہا کہ سر جان کے ریاست کے متعلق خیالات کا کیوں کر پتا کیا
جائے۔ آخر ایک شرارت سوجھی۔ ایک دوست مسٹر پلے ایڈیٹر پرنسلی انڈیا دیہ اخبار بھی
ریاستوں کے متعلق تھا۔ آج کل کھنڈوہ سی، پی سے نکلتا ہے۔ اس زمانہ میں دہلی سے
نکلتا تھا اور اس کو سمجھا بجھا کر بھیجا کہ وہ سر جان تھامپسن سے ملنے جائے۔ اور باتوں
باتوں میں ایڈیٹر ریاست کا ذکر اس انداز سے کرے کہ مہاراجہ پٹیالہ کے ایکسٹرا
اڈیشن وارنٹوں کی مخالفت کر کے سر جان تھامپسن نے اخبار ''ریاست'' کی بہت امداد
کی۔ تاکہ آپ کے ذہن میں ریاست کے متعلق جو جذبات ہوں۔ وہ ان کو اپنی زبان
سے اگل دیں۔ مسٹر گوپال پلے نے میری ہدایت کے مطابق عمل کیا۔ وہ سر جان سے
ملے تو انہوں نے اس طریقہ سے ہی ریاست کا ذکر کیا۔ سر جان تھامپسن نے ریاست
کا ذکر سنتے ہی مسٹر پلے سے پوچھا کہ دیوان سنگھ آج کل کہاں ہیں۔ مسٹر پلے نے
جواب دیا کہ یہیں دہلی میں ہیں۔ سر جان نے کہا ریاست اخبار بہت اچھا ہے۔ آپ
اسے پسند کرتے ہیں اور اگر دیوان سنگھ کہیں ملے تو اس سے کہا جائے کہ وہ کسی روز
آپ سے ملنے کے لئے آئے۔

مسٹر پلے سر جان سے ملنے کے بعد سیدھے دفتر ریاست میں گئے اور انہوں نے
حالات بتائے۔ تو معلوم ہوا کہ سر جان نہ صرف ریاست کے خلاف نہیں ہیں، بلکہ اس
کے مداح ہیں، اور آپ ایڈیٹر ریاست سے ملنا چاہتے ہیں۔

اس واقعہ کے دو ہفتہ بعد ایڈیٹر ریاست سر جان سے ملنے کے لئے چیف کمشنر کی
کوٹھی گیا۔ اس سے پہلے چیف کمشنر کی کوٹھی پر جانے کا کبھی اتفاق نہ ہوا تھا۔ وہاں کوٹھی
کے احاطہ میں ہی لکڑی کا ایک برآمدہ بنا ہوا تھا۔ جس میں دس پندرہ کرسیاں تھیں۔ ان

کرسیوں پر رائے بہادر، خان بہادر، خطاب یافتہ آنریری مجسٹریٹ اور میونسپل کمشنر وغیرہ بیٹھے تھے۔ میری ان میں سے کسی سے بھی واقفیت نہ تھی۔ کیونکہ میں بغیر کام کسی سے نہیں ملتا اور نہ ہی پارٹیوں میں جاتا ہوں۔ دفتر، گھر اور موٹر کی سیر کے علاوہ کسی سے کوئی تعلق نہ رکھتا تھا۔ اور دوستوں کا حلقہ بھی کوشش کر کے زندگی بھر محدود رکھا۔ میں ایک کونہ میں ایک ہریجن کے طور سے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور چپڑاسی میرا وزیٹنگ کارڈ مجھ سے لے گیا۔ دوسروں کے وزیٹنگ کارڈ پہلے جا چکے تھے۔ اور ایک صاحب چیف کمشنر کے پاس کمرہ کے اندر ملاقات کر رہے تھے۔ مجھے وزیٹنگ کارڈ بھیجے دو منٹ ہوئے تھے کہ ملاقاتی کی ملاقات ختم ہوگئی۔ اور چپڑاسی نے آکر کہا چلیے صاحب بلاتے ہیں۔ میں ملاقات کے لئے کھڑا ہوا تو خطاب یافتہ آنریری مجسٹریٹ اور میونسپل کمشنر مجھے تعجب سے دیکھنے لگے۔ کہ یہ شخص سب سے پیچھے ابھی آیا ہے۔ اور سب سے پہلے بلا لیا گیا ہے۔ یہ معاملہ کیا ہے۔ انلوگوں کے چہرے دیکھ کر میں بھی خفیف سی ندامت محسوس کر رہا تھا کہ یہ لوگ دل میں خیال کرتے ہوں گے کہ شاید میں بھی اندرونی طور سے سرکاری یا نیم سرکاری آدمی ہوں۔ بہرحال میں چیف کمشنر سے ملنے گیا۔ سر جان کھڑے ہو گئے۔ ہاتھ ملایا۔ رسمی گفتگو کے بعد باتیں شروع ہوئیں، تو آپ نے فرمایا کہ جب آپ پولیٹیکل سیکرٹری تھے تو ریاست کو باقاعدہ پڑھتے تھے۔ اور آپ ریاست اور ریاست کی پالیسی کو بہت ہی پسند کرتے ہیں۔ سر جان پانچ سال تک پولیٹیکل سیکرٹری رہے۔ آپ کو ریاستوں سے بھی بہت دلچسپی تھی۔ مختلف ریاستوں اور والیان ریاستوں کے متعلق پوچھتے رہے۔ کہ فلاں کا کیا حال ہے۔ اور فلاں ریاست میں کیا کیا ظلم ہوتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ یہ ملاقات مختصر سی تھی۔ شاید نصف گھنٹہ کے قریب باتیں کرنے کے بعد یہ کہہ کر میں کھڑا ہو گیا کہ آپ کا بہت وقت ضائع ہو گیا ہے۔ اس پر سر جان نے کہا کہ انہیں مجھ سے مل کر بہت خوشی ہوئی اور آئندہ بھی میں مہینہ میں ایک بار ضرور ملا کروں۔

میں چیف کمشنر سے ملنے کی ضرورت نہ سمجھتا تھا۔ کیونکہ مجھے افسروں کی دوستی کی ضرورت نہ تھی۔ میں یہ چاہتا تھا کہ یہ بلاوجہ دشمن ہو کر نقصان بھی نہ پہنچائیں۔ اور اس غرض کے لئے ایک دفعہ ملنا کافی سمجھتا تھا۔ چنانچہ اس ملاقات سے مجھے یقین ہو گیا کہ سر جان میرے خلاف نہیں ہیں بلکہ میرے معترف ہیں۔ پس میں نے سر جان سے ملنے کی ضرورت نہ سمجھی۔ اور ڈیڑھ ماہ کے قریب عرصہ ہو گیا تو ایک روز شام کو سر جان نے چپڑاسیوں سے کہا کہ دیوان سنگھ ایڈیٹر ''ریاست'' کو اطلاع کر دی جائے کہ وہ صبح ساڑھے نو بجے آپ سے مل جائیں۔ اگلے روز چپڑاسی نے نو بجے کے قریب ٹیلیفون کیا کہ چیف کمشنر ملاقات کے لئے بلاتے ہیں۔ اس زمانہ میں لالہ شیو نرائن بھٹناگر ایڈیٹر وطن اور ایڈیٹر ''ریاست'' کے درمیان بہت مذاق ہوا کرتا تھا۔ اور ہم ایک دوسرے کو آواز بدل کر یا کسی دوسرے شخص سے ٹیلیفون کرا کر بے وقوف بنایا کرتے تھے۔ مثلاً دوسرے آدمی کی طرف سے یہ کہنا کہ فلاں ریاست کے وزیر اعظم آئے ہوئے ہیں اور میڈن ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں اور ملنے کے لئے بلاتے ہیں۔ اور جب وہاں جاتے تو پتا چلتا کہ فلاں صاحب وہاں آئے ہی نہیں۔ بعد میں ٹیلیفون پر بتاتے کہ بیوقوف بنایا تھا۔ اس چپڑاسی کا خلاف توقع یہ کہنا کہ چیف کمشنر صاحب بلاتے ہیں۔ میں نے سمجھا کہ یہ شرارت لالہ شیو نرائن بھٹناگر کی ہے۔ تاکہ میں کام چھوڑ کر چیف کمشنر کی کوٹھی جاؤں اور شرمندہ ہو کر واپس آؤں۔ میں نے چپڑاسی کو جواب دیا کہ میں نہیں آتا۔ چپڑاسی حیران کہ لوگ تو خط لکھ لکھ کر ملاقاتوں کے لئے درخواستیں کرتے ہیں۔ یہ شخص کہتا ہے کہ میں چیف کمشنر سے ملنا نہیں چاہتا۔ اس نے پھر کہا کہ تھامپسن صاحب چیف کمشنر آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ آپ ساڑھے نو بجے چیف کمشنر صاحب کی کوٹھی پہنچ جائیے۔ میں نے پھر جواب دیا کہ میں نہیں آتا۔ اس نے پھر کہا کہ وہ چیف کمشنر کو کیا جواب دے۔ میں نے غصہ میں کہا کہہ دو میں چیف کمشنر کے باپ کا نوکر نہیں ہوں، میں نہیں آتا۔ یہ کہہ کر میں نے غصہ سے ٹیلیفون بند

کر دیا۔ کیونکہ کام کر رہا تھا۔ اور ٹیلی فون کام میں مخل ہوا۔ ادھر تو چپڑاسی نے سر جان سے یہی الفاظ کہے کہ دیوان سنگھ کہتا ہے کہ میں چیف کمشنر کے باپ کا نوکر نہیں ہوں ، کہہ دو کہ نہیں آتا۔ ادھر اس ٹیلی فون کے پانچ منٹ بعد چیف کمشنر کا دوسرا چپڑاسی آیا۔ اس کے خود آنے کا مقصد یہ تھا کہ یہ بطور انعام یا دستور ایک یا دو روپیہ وصول کرنا چاہتا تھا۔ اس نے بتایا کہ کل چیف کمشنر نے چپڑاسیوں سے کہا تھا کہ دفتر ریاست اطلاع کر دی جائے ۔ کہ ایڈیٹر ''ریاست'' ساڑھے نو بجے مل جائیں ۔ اس چپڑاسی کے کہنے سے علم ہوا کہ لالہ شیو نرائن نے مذاق نہ کیا تھا۔ بلکہ فی الحقیقت سر جان تھامپسن نے بلایا ہے ۔ میں نے فوراً کپڑے پہنے اور سر جان تھامپسن (چیف کمشنر) کی کوٹھی پہنچا۔ وزیٹنگ کارڈ بھیجا۔ سر جان نے بلایا، اندر گیا تو سر جان کی پیشانی پر ناراضگی کی شکن تھی ۔ مگر اخلاق کا ثبوت دیتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے ہاتھ ملایا۔ تو میں نے فوراً کہا کہ سب سے پہلے میں اس ندامت کا اقرار کرتا ہوں کہ میں نے آپ کے چپڑاسی کو غیر مناسب اور سخت الفاظ میں جواب دیا۔ جس کی وجہ غلط فہمی تھی ۔ لالہ شیو نرائن بھٹناگر کئی بار آواز بدل کر دھوکا دے چکے ہیں ۔ اور میں بھی ان کو بے وقوف بنا چکا ہوں ۔ میں نے سمجھا کہ یہ ٹیلی فون بھی لالہ شیو نرائن نے مذاق کے طور پر کیا ہے ۔ کیونکہ آپ کے ٹیلی فون کی کوئی توقع نہ تھی ۔ اب چپڑاسی سے معلوم ہوا کہ آپ نے فی الحقیقت مجھے بلایا ہے ۔ مجھے اس واقعہ کا بہت افسوس ہے ۔ سر جان تھامپسن قہقہہ مار کر ہنس پڑے ۔ اور آپ نے کہا کہ آپ حیران تھے کہ جس صورت میں ایڈیٹر ریاست کو آپ سے کچھ شکایت نہیں ۔ ایسا سخت اور خلاف اخلاق جواب کیوں دیا؟ ۔ اور چونکہ آپ سے ملنے کو جی چاہتا تھا۔ اس لئے آپ نے آنے کے لئے پیغام بھیجا۔ سر جان تھامپسن سے ایک گھنٹہ کے قریب باتیں ہوئیں ، باتیں یہی کہ فلاں ریاست کا کیا حال ہے؟ ۔ فلاں مہاراجہ نے جو قتل کیا اس میں کون کون شامل تھا۔ ریاست کے فلاں مضمون میں بہت جرأت دکھائی ۔ ریاستیں ختم ہو جائیں تو اچھا ہے ۔ سر جان مجھ سے ریاستوں کے متعلق

سوال کرتے۔ اور والیان ریاست کے مظالم مزے لے لے کر پوچھتے۔ کیونکہ وہ فطرتاً نوابوں اور مہاراجاؤں کے دشمن تھے۔ اور ریاست میں ان مظالم کو بے نقاب کیا جاتا تھا۔ میں نے بہت کوشش کی کہ یہ خود بھی کھلیں اور واقعات کا اظہار کریں۔ مگر اپنی ذمہ داری کو محسوس کرتے ہوئے نہ کھلتے تھے۔ کیونکہ میں جرنلسٹ تھا۔ ان کو خیال تھا کہ زبان سے بات نکلی اور اخبار میں چھپی۔ باتیں کر کے میں چلا آیا۔ آتے ہوئے آپ نے پھر تاکید کی کہ میں دس پندرہ روز بعد ان سے مل جایا کروں۔ آپ نے یہ بھی کہا کہ اخبار ان کو باقاعدہ بھیجا جائے۔ ہر ہفتہ پڑھنا چاہتے ہیں۔ یہ اردو فارسی بہت اچھی طرح جانتے تھے۔ اور ان زبانوں کے آپ نے امتحان پاس کیے تھے۔

اس کے بعد میں سر جان تھامپسن سے کبھی کبھی ملتا تھا۔ ایک بار والیان ریاست اور میرے مقدمات کے متعلق باتیں ہو رہی تھیں، تو میں نے کہا کہ آپ کو بھی تو والیان ریاست نے ہی پولیٹیکل سیکرٹری شپ سے علیحدہ کرایا۔ آپ نے تعجب سے پوچھا، وہ کیوں کر؟۔ میں نے کہا پٹیالہ، الور اور نوانگر نے ساٹھ لاکھ روپیہ جمع کیا۔ اتنا روپیہ فلاں شخص نے دیا۔ اتنا روپیہ فلاں شخص درمیان میں کھا گیا۔ سر جان نے کہا اس میں کوئی شک نہیں کہ والیان ریاست میں چھوٹے سے لے کر نظام تک آپ کے خلاف ہیں۔ کیونکہ ان لوگوں کی مطلق العنانی نے آپ کو نقصان پہنچایا ہے۔ اور کئی نوابوں اور مہاراجاؤں کے اختیارات کم کیے۔ مگر ان لوگوں کے اندر اتنی قوت کہاں کہ پولیٹیکل سیکرٹری کو تبدیل کرا سکیں۔ میں نے کہا انڈیا آفس میں آپ کا کوئی گہرا دوست ہے۔ میں نے کہا ان سے یہ تمام حالات لکھ پوچھیے کہ یہ واقعات غلط تو نہیں۔ آپ نے کہا بہت اچھا۔ چنانچہ آپ نے ہوائی ڈاک کے ذریعے اپنے اس دوست کو کانفیڈنشل خط لکھا۔ جس کا دو ہفتہ بعد جواب آ گیا کہ جو کچھ لکھا ہے۔ لفظ بہ لفظ سچ ہے۔ اس خط کے پہنچنے کے بعد سر جان نے پھر ٹیلی فون کر کے مجھے بلایا اور کہا کہ لندن سے جواب آ گیا ہے۔ وہ واقعات بالکل سچ تھے۔ اس جواب کے بعد تو سر جان ریاست کی

اطلاعات پر بہت اعتماد کرتے تھے۔ اور والیان ریاست کے اور زیادہ دشمن ہو گئے۔ چنانچہ آپ نے ایک روز باتوں میں کہا۔

> سردار صاحب! اب شاید زندگی میں موقع نہ مل سکے۔ مگر میری خواہش ہے کہ ایک بار پھر مجھے والیان ریاست پر اختیار حاصل ہوں تو میں صرف پانچ سال کے اندر ان میں سے نصف کو ختم کردوں۔ یہ لوگ اس قابل نہیں کہ پبلک ان کے رحم پر چھوڑی جائے۔

سر جان تھامپسن نے پٹیالہ اور بھوپال وغیرہ کے مقدمات میں میری بہت امداد کی۔ یہ والیان ریاست جب بھی مجھ پر وار کرتے تو اس وار کو ناکام بنانے میں آپ میرے لئے کھڑے ہو جاتے۔ کیونکہ میں ان کے صوبہ میں تھا۔ اور ان کی مرضی کے خلاف کوئی والی ریاست مجھے نقصان نہیں پہنچا سکتا تھا۔

سر جان تھامپسن بہت لائق، منصف مزاج اور مدبر تھے۔ میرا تو خیال ہے کہ شاید آج تک کوئی پولیٹیکل سیکرٹری آپ کے پایہ کا نہ تھا۔ مارشل لاء کے زمانہ میں آپ پنجاب کے چیف سیکرٹری تھے۔ اور پبلک میں مارشل لا کے خلاف آئین اور سخت کاروائیوں کی ذمہ داری آپ کی گردن پر بھی بیان کی جاتی ہے۔ مگر جو لوگ اصل حالات سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ سر مائیکل اوڈوائر جیسا خودسر شخص کسی سیکرٹری کے ہاتھوں میں کبھی بھی نہیں رہا۔ بلکہ اس نے اپنی زندگی میں سیکرٹریوں کو ہمیشہ ایک کلرک ہی سمجھا۔ اور جو کرتا اپنی مرضی سے اور سر جان قطعی بے قصور اور سر مائیکل اوڈوائر کے حکم کی تعمیل کرنے والے تھے۔

سر جان تھامپسن انتقال کر چکے ہیں۔ وہ اس وقت دنیا میں موجود نہیں ہیں۔ ریٹائر ہونے کے بعد بھی ان کی خط و کتابت کا سلسلہ ایڈیٹر ریاست کے ساتھ جاری رہا۔ اور جب کبھی دہلی کا کوئی شخص لندن جاتا اور آپ سے ملتا تو آپ ریاست اور ایڈیٹر ریاست کا حال ضرور پوچھتے۔

یہ مضمون بہت طویل ہوگیا۔ عنقریب سر جان تھامپسن کے بارے میں وہ واقعات لکھوں گا، جن کو میں زندگی میں بھول نہیں سکا۔ اور جو ریاست کو موت کے منہ سے بچانے کا باعث ہوئے۔ اور اس بات کا اقرار کرنا پڑتا ہے کہ اس زمانہ میں اگر سر جان تھامپسن دہلی کے چیف کمشنر نہ ہوتے یا آپ والیان ریاست کی مطلق العنانی کو نفرت اور حقارت کی نظر سے نہ دیکھتے تو ریاست کو شاید ایسی مصائب کا مقابلہ کرنا پڑتا۔ جو اس کے لئے قابل برداشت نہ ہوتیں۔

جرنلزم کی چاٹ اور عشق

میں نے ریاست میں نا قابل فراموش کے تحت جو اپنے حالات شائع کیے ہیں۔ وہ پبلک میں نہ صرف دل چسپی سے پڑھے گئے، بلکہ ان کا اثر بھی ہوا۔ چنانچہ دو درجن کے قریب نوجوانوں نے خط لکھے کہ وہ دہلی آ کر اس طرح ہی ادنیٰ سے ادنیٰ کام کرتے ہوئے جرنلزم سیکھنا چاہتے ہیں۔ جس طرح ایڈیٹر ریاست سید جالب کے پاس ہمدم میں کام کرنے کے لئے لکھنو گیا۔ چنانچہ ایک سکھ لڑکا تو مردان سرحد سے بغیر خط و کتابت کے آن بھی پہنچا۔ ان تمام نوجوانوں میں ایک بھی ایسا نہ تھا کہ جو جرنلزم کے لئے فٹ ہوتا، کیونکہ اس پیشہ کے لئے اخبارات، رسائل، لٹریچر کی چاٹ و عشق ہونا ضروری ہے۔ اور ان لوگوں میں شوق تھا۔ تو صرف یہ کہ وہ بلندی پر پہنچیں اور آئندہ ایڈیٹر بن سکیں۔ مجھے افسوس ہے کہ ان نوجوانوں میں سے میں کسی کے لئے بھی مفید نہیں ہو سکا۔ اور آج وہ واقعات بتاتا ہوں کہ جن کے پڑھنے سے اندازہ ہو سکے گا کہ کسی کام میں کام یاب ہونے کے لئے اس کام کا عشق ہونا کتنا ضروری ہے۔

میری تعلیم کچھ نہ تھی۔ پانچویں جماعت پاس کر کے میں خالصہ ہائی سکول گوجرانوالہ میں چھٹی جماعت میں داخل ہوا۔ سکول میں تین روز گیا تو ماسٹر نے فیس کا مطالبہ کیا۔ دو روز تو یہ کہہ کر جاتا رہا کہ فیس لا دوں گا۔ اس کے بعد نہیں گیا۔ کیونکہ حالات اس قابل ہی نہ تھے کہ فیس دے سکتا۔ آخر مجبوراً اسکول چھوڑنا پڑا۔ اس کے بعد اسکول میں پڑھنے کا زندگی میں اتفاق نہیں ہوا۔ یعنی میری تعلیم پانچویں جماعت تک ہی رہی اور اب اگر کوئی صاحب تعلیم کے متعلق پوچھتے ہیں تو میں ان کو بتاتا ہوں کہ پانچویں جماعت پاس کی ہے۔ اور چھٹی میں چار پانچ روز پڑھا ہوں۔ تو وہ اس پر یقین نہیں کرتے، بلکہ مذاق سمجھتے ہیں۔ اور بار بار یقین دلانے پر بھی میری سچائی کے قائل نہیں ہوتے۔

تعلیم کی کیفیت تو یہ تھی کہ مگر مطالعہ کے شوق کی حالت یہ ہے کہ فیروزپور کے سول

ہسپتال میں کمپاونڈر تھا۔ چھ روپے ماہوار تنخواہ تھی۔عمر سولہ یا سترہ برس کی تھی مگر رسالہ زمانہ" کانپور کا خریدار تھا۔اور رسالہ "مخزن دہلی" لوگوں سے لے کر پڑھا کرتا تھا۔ اس سے پہلے کا واقعہ مجھے یاد نہیں کہ میں نے کبھی کوئی ادبی رسالہ دیکھا ہو۔یعنی میری ادبی چاٹ کا سلسلہ سولہ، سترہ برس کی عمر سے شروع ہوتا ہے۔اس کے بعد میں ابوہر کے ہسپتال میں رہا۔وہاں بھی ادبی رسالے پڑھا کرتا تھا۔اور پڑھنے کی کیفیت یہ تھی کہ ایک ایک مضمون، ایک ایک شعر ایک ایک سطر کو بار بار پڑھتا تھا۔چنانچہ اپنی بے وقوفی کا ایک واقعہ بتاتا ہوں کہ ایک روز ابوہر میں ہی خیال آیا کہ اگر میں اردو لٹریچر میں کمال حاصل کرنا چاہتا ہوں تو ان رسائل کو پڑھنے کی کیا ضرورت ہے؟۔صرف ایک کتاب یعنی اردو کی کوئی لغات ہی کیوں نہ یاد کرلوں۔تاکہ کوئی لفظ بھی ایسا نہ رہے ،جس سے میں واقف نہ ہوں۔اس خبط کو پورا کرنے کے لئے میں نے چھ آنے میں کریم الغات کی ایک جلد خریدی اور الف کی تختی سے الفاظ شروع کیے۔ان الفاظ کو یاد کرتا تھا۔یاد نہ ہوتے تھے۔یاد ہوتے اور آگے چلتا تو پیچھے کے بھول جاتے تھے۔آخر کئی روز کی اس کشمکش کے بعد اپنی بے وقوفی کو محسوس کیا۔اور ڈاکٹر آف لغات کی ڈگری کے خیال کو ترک کیا۔کیونکہ یہ طریقہ غلط ،ناقابل عمل اور لاحاصل تھا۔

ابوہر کے بعد میں پھر فیروز کے ہسپتال میں آگیا۔وہاں چھ ماہ کے قریب رہا کہ موگا کے ہسپتال میں تبدیل کردیا گیا۔مگر رسائل اور کتابوں کا پڑھنا جاری ہی رہا۔موگا میں مجھے پہلے نو روپے اور بعد میں بارہ روپے تنخواہ ملتی تھی۔اس زمانہ میں میرے پاس ادیب الہ آباد جس کو نوبت رائے صاحب نظر ایڈٹ کرتے تھے۔اور زمانہ کانپور جس کے ایڈیٹر منشی دیا نرائن نگم تھے۔آیا کرتے تھے۔ان کے علاوہ روزنامہ اخبار عام کا بھی خریدار تھا۔کیونکہ اس زمانہ میں تمام ہندوستان میں صرف وہی روزنامہ اخبار تھا۔اور اس کا چندہ بارہ روپیہ سالانہ تھا۔میری مالی پوزیشن اور وسائل ایک سے زیادہ روزنامہ اخبار خریدنے کی اجازت نہ دیتے تھے۔دوسرے اخبارات، رسائل اور کتابیں لوگوں

سے لے کر پڑھتا تھا۔ اور شاید ہی اردو کی کوئی کتاب یا اخبار ایسا نہ تھا جسے میں نے اس زمانہ میں نہ پڑھا ہو۔

اس زمانہ میں خیالات محدود، ذریعہ معاش محدود، پوزیشن محدود، معلومات محدود، اور دوستوں کے تعلقات کا حلقہ محدود۔ چنانچہ خیالات کے محدود ہونے کی تو یہ حالت تھی کہ جب اخبار عام آتا، اور اس پر پتہ کی اپنے نام کی چٹ دیکھتا تو ایک مسرت سی محسوس ہوتی کہ میرا نام بھی چھپا ہوا ہے۔

موگا میں ایک علم دوست شخص پنڈت وشودت وکیل تھے۔ اچھے مضمون لکھنے والے، اردو لٹریچر میں دل چسپی۔ آریہ سماج کے لیڈر اور آریہ سماجی رسالہ ''آریہ مسافر کے ایڈیٹر'' یہ آریہ مسافر شائع تو شاید آگرہ یا لاہور سے ہوتا تھا۔ مگر پنڈت جی اس کو موگا میں ایڈٹ کرتے تھے۔ اور وہاں سے ہی مضمون بھیجتے تھے۔ پنڈت وشنودت میرے لٹریری شوق کو دیکھ کر مجھ پر بڑی مہربانی فرماتے۔ اپنے بچوں یا چھوٹے بھائیوں کی طرح سمجھتے تھے۔ اور میں کتابیں اور رسائل ان سے بھی بڑی تعداد میں پڑھنے کے لئے لے لیتا۔

اخبار ''عام'' اور رسائل ہسپتال کی ڈاک سے آتے۔ کیونکہ ایک چپڑاسی روزانہ صبح ڈاک خانہ سے ڈاک لایا کرتا تھا۔ یہ ڈاک ڈاکٹر متھرا داس کے ہاتھوں میں جاتی۔ اور وہ جس کسی کا کوئی خط یا اخبار ہوتا اس کو دے دیتے۔ میرے رسائل اور اخبار کو دیکھ کر وہ پیشانی پر شکن ڈالتے۔ اور میری اس فضول خرچی کو برا سمجھتے۔ مگر منہ سے کچھ نہ کہتے۔ کیونکہ میں نہ صرف ان کا ماتحت تھا۔ بلکہ ان کے مجھ پر بہت احسانات تھے۔ خاندانی تعلقات کے باعث میرے بزرگ تھے۔ ان کا حق حاصل تھا کہ میری اور میرے کریکٹر کی نگرانی کرتے۔

جب اخبار عام میرے نام جاری ہوا۔ تو ڈاکٹر صاحب نے سمجھا کہ شاید ایک روپیہ دے کر یہ ادبی عیاشی کی گئی ہوگی۔ انہوں نے درگزر کیا۔ مگر اخبار دیکھ کر ان کی

پیشانی کے شکن ظاہر کرتے تھے کہ وہ میری اس فضول خرچی کو پسند نہیں کرتے۔ چنانچہ ایک ماہ کے بعد ان کو یہ احساس ہوا کہ میں نے ایک ماہ سے زیادہ کے لئے چندہ بھیج دیا ہے۔ تو وہ بہت ناراض ہوئے۔ اور کہا نو روپے ماہوار تنخواہ اور روزانہ اخبار کی خریداری۔ اس فضول خرچی پر تمہیں شرم آنی چاہیئے۔ اس ڈانٹ کے بعد میں نے ان سے تو کہا کہ بند کردوں گا۔ مگر شام کو ڈاک خانہ پہنچا۔ وہاں پوسٹ ماسٹر اور چٹھی رساں سے ملا۔ اور ان سے کہا کہ میرے نام کوئی خط یا اخبار ڈاکٹر صاحب کی ڈاک سے نہ بھیجا جائے۔ اور چٹھی رساں کے ہاتھ میرے کوارٹر میں بھیجا جائے۔ جہاں میری رہائش تھی۔ چنانچہ اخبار عام اور رسائل میرے کوارٹر میں مجھے ملنے لگے۔ اور ڈاکٹر صاحب نے سمجھا کہ میں اب فضول خرچ نہیں رہا۔ شریف ہوگیا ہوں۔

ایک ڈیڑھ ماہ تک میں اخبار ''عام'' ڈاکٹر صاحب سے پوشیدہ پڑھتا رہا۔ ایک روز پہلا چٹھی رساں بیمار ہوگیا۔ اور اس کی جگہ دوسرا چٹھی رساں اخبار دینے آیا۔ تو اس کم بخت نے اخبار میرے ہاتھوں میں دے دیا۔ جب کہ میں ڈاکٹر صاحب کے پاس کھڑا آوٹ ڈوڑ مریضوں کا رجسٹر دیکھ رہا تھا۔ اخبار دیکھ کر ڈاکٹر صاحب سمجھ گئے کہ ان کو دھوکا دیا گیا ہے۔ اخبار **مسلسل** آرہا ہے۔ اور یہ فضول خرچی **مسلسل** جاری ہے۔ ڈاکٹر صاحب پھر ناراض ہوئے۔ میں نے پھر وعدہ کیا کہ اخبار بند کردوں گا۔

چنانچہ سوچتا رہا کہ اب کیا کیا جائے۔ آخر اس نتیجہ پر پہنچا کہ ہسپتال سے دور کسی شخص کے نام اخبار جاری کرا دیا جائے۔ اور میں وہاں سے منگا کر پڑھا کروں۔ چنانچہ اخبار موگا کے قصبہ میں حکیم محمد عمر صاحب مرحوم (جو میرے بھائیوں کی طرح دوست، دیو سماجی خیالات کے، خدا کے منکر مگر بہت بلند کریکٹر اور مخلص تھے کے نام جاری کرا دیا گیا۔ اخبار ان کے نام پہنچتا۔ ہر روز پتہ کی چھپی ہوئی چٹ دیکھنے کی مسرت اور خود کھولنے کے لطف سے محروم ہوگیا۔ اخبار پہنچتے ہی حکیم صاحب اس کو کھولتے، پڑھتے اور میں رات کو کام سے فارغ ہو کر ان کے گھر جاتا اور کھلا ہوا اور

پڑھا ہوا اخبار دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا۔ گویا گرم گرم پراٹھوں سے محروم ہو کر اب ان کی جگہ باسی روٹی کھانے پر مجبور ہوں۔ مگر کیا کرتا، اس گناہ کو جاری رکھنے کا اور کیا طریقہ تھا؟۔ کیونکہ اخبارات اور رسائل کے متعلق اس وقت میرے چسکے اور عشق کی وہی کیفیت تھی جو آج جوش ملیح آبادی اور اختر شیرانی کی سکاچ وہسکی کے متعلق ہے۔ چنانچہ میں جب تک موگا میں رہا۔ میرے نام کے اخبارات تو حکیم محمد عمر کے نام آتے رہے۔ اور رسائل میرے کوارٹر میں میرے نام۔ میرے موگا میں تین سال قیام کے دوران پنڈت وشنودت میری بہت رہنمائی کرتے رہے۔ رسائل، اخبارات اور کتابیں دیتے۔ اور انہوں نے اس بات کا کئی بار اس زمانہ میں مجھ سے اظہار کیا کہ میں ایڈیٹر بننا چاہتا ہوں۔ میں یہ سنتا اور شرما کر سر جھکا لیتا اور منہ سے کہتا کہ نہیں میں صرف دلچسپی کے لئے پڑھتا ہوں۔ آہ وہ اخلاص و محبت کے لوگ اب اس دنیا میں نہیں۔ اور زمانہ دن بدن خود غرض ہوتا جا رہا ہے۔

میری اخبار بینی اور اخبار نویسی کی زندگی میں مجھے کامیاب بنانے کے لئے ایک اور بات نے بڑا پارٹ ادا کیا۔ میں پانچویں جماعت تک پڑھا، پنجاب کا رہنے والا سکھ، اردو زبان کے جاننے کا جن میں سوال ہی نہیں۔ زندگی بھر محنت کر کے زبان کو سیکھا۔ پنجاب کے متعدد روزانہ، ہفتہ وار اخبار کو ایڈٹ کرتا رہا۔ اور دہلی جیسے اردو کے مرکز سے ایسا کامیاب اخبار اردو زبان میں جاری کیا کہ جس کی نظیر بھی اردو جرنلزم میں نہیں مل سکتی۔ مگر ایمان داری کے ساتھ اقرار کرتا ہوں کہ میں اب بھی اپنے آپ کو نا لائق سمجھتا ہوں۔ اور جب کبھی دوستوں میں ذکر آتا ہے تو مذاقاً یہی کہتا رہا کہ بارہ برس دہلی میں رہے۔ مگر بھاڑ ہی جھونکتے رہے۔ میرا خیال ہے کہ میرے ذہن کی یہ کیفیت کہ اپنے آپ کو طالب علم سمجھنا اپنی کامیابی کو کامیابی قرار نہ دینا اور کوشش میں دن رات مصروف رہنا نہ ہوتی اور میں اپنے آپ کو لائق سمجھتا تو آج اخبار ریاست چلانے کی بجائے کسی ہسپتال میں بوتلیں دھونے کا کام کرتا۔ جو لوگ کامیاب ہونا چاہتے ہیں

۔وہ کبھی اپنے آپ کو اس فن میں کامل نہ سمجھیں۔ہمیشہ نالائق تصور کرتے ہوئے اور زیادہ سیکھنے کی کوشش کریں۔اور ایسا عشق پیدا کریں جیسا کہ لٹریچر اور اخبارات کے ساتھ ایڈیٹر ریاست نے زندگی بھر کے لئے رکھا۔

دوستوں کے لئے قربانی کرو

ریاست بھوپال نے ایڈیٹر ''ریاست'' پر ایک مقدمہ توہین کا دہلی میں بھی کیا تھا۔ یہ مقدمہ ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ مسٹر پول کی عدالت میں تھا۔ مسٹر پول اینگلو انیڈین تھے۔ جو ہندوستان کی آزادی کے انگریزوں سے زیادہ دشمن تھے۔ ادھر ملزم ایک اخبار نویس (جو گورنمنٹ کی نظروں میں دس نمبری بدمعاشوں سے زیادہ خطرناک اور بدچلن) (میں بدچلن اس لئے لکھ رہا ہوں) کیونکہ گورنمنٹ کے احکام میں عام طور پر یہی لکھا جاتا ہے۔ (کہ فلاں پولیٹیکل ورکر کا چال چلن قابل اعتراض رہا۔) اور خان عبدالرحمان ایڈوکیٹ (جو آج کل سر عبدالرحمٰن جج ہائی کورٹ لاہور ہیں) نواب بھوپال کے وکیل جو مسٹر پول کے دوست تھے۔ چنانچہ اس مقدمہ میں میرے لئے عام طور پر یہ خطرہ محسوس کیا جا رہا تھا۔ اور مختلف قسم کی افواہیں بھی پبلک میں مسٹر پول کے متعلق مشہور تھیں۔ جن پر میں نے کبھی یقین نہ کیا مگر محسوس کیا کہ میں جب عدالت میں جاتا ہوں تو مسٹر پول کا چہرہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ ایڈیٹر ''ریاست'' کے خلاف ہیں۔ یا کم از کم وہ ایڈیٹر ''ریاست'' کو باوجود اس کے مجرم ثابت نہ ہونے کے (ہر مجسٹریٹ کا اخلاقاً فرض ہونا چاہیئے کہ جب تک مجرم ملزم ثابت نہ ہوئے اس کو بے گناہ سمجھے) ہمدردی کا مستحق نہیں سمجھتا۔ میں سوچتا اس مجسٹریٹ کا کیا کرنا چاہیئے۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا اور مسٹر پول کا رویہ دن بدن میرے خلاف ہوتا چلا جا رہا تھا۔

ان حالات سے پہلے سر جان تھامپسن چیف کمشنر دہلی دوست ہو چکے تھے۔ میں ان کے پاس گیا اور کہا کہ مجھے مسٹر پول سے انصاف کی امید نہیں ہے۔ اور شہر میں مسٹر پول کے متعلق مختلف افواہیں ہیں۔ سر جان غیر معمولی دیانت دار تھے۔ ان کی زندگی میں ایک بھی مثال ایسی نہیں ملتی کہ انہوں نے کسی ریاست یا پبلک سے ایک پیسہ بھی لیا ہو۔ اور آپ اس بات کے ہمیشہ خواہاں رہے کہ ان کے ماتحت بھی دیانت دار ہوں۔ سر جان نے جواب دیا کہ مسٹر پول دیانت دار آدمی ہیں، کوئی فکر نہ کرو۔ میں نے اس

کے جواب میں کہا کہ میں مسٹر پول پر کوئی الزام نہیں لگا رہا کیونکہ جب تک ثبوت نہ ہو الزام لگانا گناہ ہے۔مگر مسٹر پول ریلوے گارڈ کلاس کے آدمی ہیں۔ پہلے کلرک تھے۔ پھر ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں سپرنٹنڈنٹ ہو گئے۔ گورنر کے دفتر میں جا پہنچے۔ وہاں سے مجسٹریٹ ہو گئے۔آہستہ آہستہ اب ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ہیں۔ دنیا میں ہر شخص کی قیمت ہوتی ہے۔اور کم ہی انسان ایسے ہوتے ہیں، جو کسی قیمت پر خریدے نہ جا سکیں۔میں ان پر الزام تو نہیں لگاتا، مگر بے فکر بھی نہیں ہوں۔سر جان نے وعدہ کیا کہ وہ اس بات کا خیال رکھیں گے کہ میرے ساتھ ناانصافی نہ ہو۔ چنانچہ سر جان نے اگلے روز ہی مسٹر پول کو بلا کر فہمائش کی کہ نواب بھوپال چاہے کتنی بڑی پوزیشن کے ہوں مگر ایڈیٹر ’’ریاست‘‘ کے ساتھ بے انصافی نہ ہو۔

ادھر تو سر جان تھامپسن نے مسٹر پول سے کہا۔ ادھر ایک روز مرحوم خان بہادر تصدق حسین ملے۔انہوں نے پوچھا کہ مقدمہ کا کیا حال ہے۔تو میں نے بتایا کہ مسٹر پول کا رویہ ایسا ہے جیسا قمار بازوں اور چوروں کے ساتھ ہوتا ہے۔خان بہادر بہت مخلص، بہت بلند اور دوستوں کے لئے جان قربان کر دینے والے انسان تھے۔آپ نے مجھ سے تو کچھ نہ کہا۔مگر دو دن کے بعد مجھے ٹیلی فون کیا کہ میں آج رات کا کھانا ان کے ساتھ کھاؤں۔ چنانچہ میں رات کو ان کے ہاں کھانے پر گیا تو دیکھا کہ وہاں ڈنر کے لئے قریباً ایک درجن معزز مہمان موجود ہیں۔جن میں چند ممبران اسمبلی اور مسٹر پول بھی ہیں۔خان بہادر نے میرے پہنچتے ہی میرا مسٹر پول سے تعارف کرایا کہ آپ مسٹر پول ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ دہلی اور آپ سردار دیوان سنگھ ایڈیٹر ’’ریاست‘‘ میرے گہرے اور مخلص دوست ہیں اور مجھے حقیقی بھائیوں کی طرح عزیز ہیں۔مسٹر پول اور ایڈیٹر ’’ریاست‘‘ نے دستور کے مطابق ہاتھ ملایا۔

سر جان تھامپسن اور خان بہادر تصدق حسین کے ان دو واقعات کا اثر یہ ہوا کہ پہلے تو مسٹر پول ایڈیٹر ’’ریاست‘‘ کو ایسا سمجھتے تھے جیسے سناتن دھرمی حضرات اچھوتوں

اور ہریجنوں کو۔ اب ایڈیٹر ''ریاست'' جب عدالت میں جاتا تو پہنچتے ہی مسٹر پول فرماتے۔ ہیلو سردار دیوان سنگھ کیا حال ہے۔ آج موسم تو بہت اچھا ہے۔ دہلی میں پنجاب کے مقابلہ میں موسم بہت اچھا ہوتا ہے۔ اس سال سردی بھی بہت پڑے گی وغیرہ۔ ایڈیٹر ''ریاست'' اس اخلاقی سلوک کا مسکرا کر مسٹر پول کو جواب دیتا۔ اور جب وکیلوں کے ساتھ بار روم میں جا کر بیٹھتا تو میں، مسٹر توکلی ایڈوکیٹ اور سردار بھگوان سنگھ بیرسٹر ہم تینوں کانا پھوسی کرتے ہوئے کہتے کہ سر جان تصدق کا تیر نشانہ پر بیٹھا ہے۔ اب دیکھیں گے کہ بھوپال کس طرح مسٹر پول کو ہاتھوں میں لیتا ہے۔ اس مخالف کو بھی ہم نے سیدھا کرلیا ہے۔ مقابلہ کا لطف اب آئے گا۔

بے چارے بھوپال والوں کو اس کا کچھ علم نہ تھا کہ اس کانٹے کے بدلنے کا باعث کیا ہے؟ یہ اسی زعم میں تھے کہ مسٹر پول کا اخلاق صرف ظاہری اطوار سے ہے۔ اور ہر مجسٹریٹ جب کسی ملزم کو سزا دینا چاہتا ہے۔ تو وہ اس سے مسکرا مسکرا کر باتیں کرتا ہے۔ تاکہ یہ اسے مخالف نہ سمجھے اور مقدمہ تبدیل نہ کرالے۔ ورنہ اندرونی طور سے وہ بھوپال کا ہمدرد ہے۔ اتنے میں مسٹر پول تو قائم مقام ڈپٹی کمشنر ہو گئے اور ان کی جگہ مسٹر ایسر ان کی جگہ ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ہو گئے۔ مسٹر ایسر اپنی جرات اور دیانت داری کے لئے بڑی شہرت رکھتے تھے۔ آپ نے شملہ میں ایک بہت بڑے فوجی افسر کو ایک قلی مارنے پر کئی برس قید کی سزا دی تھی۔ آپ دہلی میں پچھلے تمام افسروں کی جگہ نمایاں افسر تھے۔ بھوپال والے مسٹر ایسر کے نام سے بہت بدکے۔ انہوں نے چاہا کہ مسٹر پول اس مقدمہ کو اپنے ساتھ ہی اپنے نئے عہدہ یعنی ڈپٹی کمشنر کی عدالت میں لے جائیں۔ چنانچہ انہوں نے مسٹر پول کو عدالت میں یہ درخواست دی کہ چونکہ آپ مقدمہ کے تمام حالات سے واقف ہیں۔ اس لیے مقدمہ نئے اے ڈی ایم مسٹر ایسر کی عدالت میں نہ رہے۔ اور آپ سنیں، جب مقدمہ پیش ہوا تو میری طرف سے مسٹر توکلی اور سردار بہادر بھگوان سنگھ تھے۔ اور نواب بھوپال کی طرف سے

خان بہادر عبدالرحمن ۔مقدمہ کے مستغیث خواجہ محمد اکرم انسپکٹر جنرل پولیس کی پوری وردی پہنے عدالت میں تشریف فرما تھے ۔اوران لوگوں کو پورا یقین تھا کہ مسٹر پول یہ مقدمہ خود ہی اپنی عدالت میں رکھیں گے ۔مگران لوگوں کے چھکے چھوٹ گئے ۔جب مسٹر پول نے اس درخواست کا فیصلہ کرتے ہوئے لکھا کہ یہ مسل بھوت کی طرح ان کے پیچھے پیچھے کیوں پھرتی رہے۔اورکیوں مسٹر ایسر اس مقدمہ کا فیصلہ نہ کریں۔

بھوپال کے نمائندے مسٹر ایسر کی زبردست قوت ارادی اورقوت فیصلہ سے گھبراتے تھے،اورہم چاہتے تھے کہ آپ ہی فیصلہ کریں ۔کیونکہ ہمارے لئے وہی مجسٹریٹ مفید ہوسکتا تھا جونواب بھوپال تو کیا نظام دکن کی بھی پرواہ نہ کرے ۔چنانچہ مقدمہ شروع ہوا تو بھوپال والوں نے مقدمہ تبدیل کرنے کی درخواست دی اور مقدمہ تبدیل کرنے کی وجہ یہ لکھی کہ مسٹر ایسر اور دیوان سنگھ کے گہرے دوستانہ تعلقات ہیں ۔حالانکہ واقعہ یہ تھا کہ میں مسٹر ایسر سے کبھی بھی عدالت سے باہر نہ ملا تھا ۔ تعلقات کا تو سوال ہی کیا ہے؟۔بھوپال کے نمائندوں نے اپنے اس الزام کی تائید میں مسٹر ایسر کے ایک موقوف شدہ موٹر ڈرائیور کا بیان شامل کیا۔جس نے کہا کہ اس نے دیوان سنگھ کو ایک دفعہ مسٹر ایسر کے مکان پر دیکھا تھا۔بھوپال والوں کی اس درخواست کا بھی وہی حشر ہوا۔جس کی وہ مستحق تھی ۔یعنی خارج ہوگئی ۔اورمقدمہ مسٹر ایسر کی عدالت ہی میں رہا۔نواب بھوپال کی طرف سے چوالیس گواہ پیش ہوئے ،جن میں اکثر دفتر ریاست کے موقوف شدہ یا خرید کردہ غدار ملازم تھے۔

یہ مقدمہ کئی اعتبار سے بہت دل چسپ ہے ۔نواب بھوپال کی طرف سے ایک دستاویز پیش کی گئی ۔ جوجعلی تھی ۔اور ہماری اطلاع کے مطابق یہ جعل سازی چاندنی چوک کے ایک کمرہ میں نواب بھوپال کے نمائندوں کی نگرانی میں بدایون کے ایک جعل ساز نے تیار کی ۔ یہ دستاویز ثابت کرتی تھی کہ نواب بھوپال کے خلاف دیوان سنگھ نے ایک پمفلٹ لکھوایا ۔یعنی دیوان سنگھ کا اس میں ہاتھ ہے ۔ بھوپال کے

نمائندے اس دستاویز کو لے کر مختلف ہینڈ رائٹنگ اکسپرٹوں کے پاس گئے ۔ اگر بھوپال والے اپنی پوزیشن کو بتائے بغیر غیر جانب داری کی رائے لیتے تو ہینڈ رائٹنگ اکسپرٹ ان کو بتاتے کہ یہ جعلی ہے ۔ یہ لوگ جہاں بھی گئے ۔ انہوں نے اپنی حماقت کا ثبوت دیتے ہوئے بتایا کہ نواب بھوپال کے نمائندہ ہیں ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سب نے اپنی شہادت کے لالچ میں یہی کہا کہ یہ دیوان سنگھ کی تحریر ثابت ہوسکتی ہے ۔ چنانچہ ایک ایکسپرٹ نے پرائیویٹ طور سے انہیں بتایا کہ بھوپال کے نمائندے جب ان کے پاس گئے اور دستاویز دیکھی تو معلوم ہوا کہ یہ ادنیٰ قسم کی فورجری یعنی جعل سازی ہے ۔ اور ہر شخص آسانی سے اس جعل سازی کی خامیوں کو معلوم کرسکتا ہے ۔ مگر اس نے اس خیال سے کہ یہ بڑی مرغی ہے ہاتھوں سے نکل نہ جائے ۔ اس نے کہا کہ بہت اچھی دستاویز ہے ۔ اور یہ ثابت کیا جاسکتا ہے کہ یہ دیوان سنگھ کے ہاتھوں کی لکھی ہوئی ہے ۔ چنانچہ اس طرح سے ایک ایک ہینڈ ایکسپرٹ نے پانچ پانچ ، دس ، دس ہزار روپیہ فیس اور شہادت کے خرچہ کا بھوپال کے خزانہ سے وصول کیا ۔ اور عدالت نے آخر ان ہینڈ اکسپرٹوں کے خلاف بھی بہت سخت الفاظ کے ساتھ ریمارک پاس کیے ۔ اور ان کی شہادت کو ناقابل قبول قرار دیا ۔ بھوپال کے یہ لوگ اس دستاویز کو عدالت میں پیش کرنے کی حماقت تو کر بیٹھے ۔ مگر یہ ان کے لئے ناقابل برداشت مصائب کا سبب بنی ۔

بھوپال والوں نے دفتر ''ریاست'' کے متعدد آدمی خرید کر ان کو غدار اور نمک حرام بنایا ۔ یہ ان لوگوں سے میرے متعلق اطلاعیں لیتے ۔ اور ان کو گواہوں کے طور پر پیش کرتے ۔ میں ان لوگوں کے حالات معلوم کرنے کے لئے خواجہ محمد اکرم انسپکٹر جنرل پولیس جو ان تمام مقدمات کے انچارج تھے ۔ کے دفتر کے ایک ماتحت کو جس کا ان مقدمات سے تعلق تھا ۔ تقریباً ایک سو روپیہ ماہوار دیا کرتا تھا ۔ اور یہ شخص مجھے دہلی اور بھوپال کی ہر دوسرے تیسرے روز اطلاعیں دیا کرتا تھا ۔ اس سے مجھے معلوم ہوتا رہتا

کہ میرے دفتر کا کون کون آدمی خرید لیا گیا ۔ میرا کون کون دوست خواجہ محمد اکرم سے ملا اور اس نے اپنی خدمات پیش کیں ۔ اور کون کون لوگ روپیہ کے لالچ میں دوست ہوتے ہوئے دشمن ہونے کے لئے تیار تھے ۔ چنانچہ پنجاب کے ایک لنگڑے جرنلسٹ لاہور سے آئے میرے پاس ٹھہرے ہوئے تھے ۔ اور مجھ سے پوشیدہ خواجہ محمد اکرم سے ملے ۔ اور کہا کہ دیوان سنگھ کے مقابلہ میں ہر خدمت کے لئے تیار ہے ۔ یہاں تک کہ گواہی بھی دیں گے ۔ یہاں تک کہ گواہی بھی دیں گے ۔ بھوپال والوں کا میرا وہ انفارمر تمام کاموں سے فارغ ہو کر رات کو گیارہ بجے سبزی منڈی کے برف خانہ کے پاس پہنچ جاتا ۔ میں اپنے گھر سے موٹر میں وہاں پہنچتا ۔ برف خانہ کے پاس پہاڑی پر ہم گھنٹہ آدھا گھنٹہ بیٹھتے ۔ اور وہ مجھے دن بھر کے تمام حالات بتاتا ۔ گواہوں کی شہادت جو اگلے روز ہوتی ۔ اس کی ایک کاربن کاپی دیتا اور بارہ بجے واپس چلا جاتا ۔ اس شخص نے ہی مجھے ایک روز ملاقات میں بتایا کہ فلاں جرنلسٹ جن کی ٹانگ ٹوٹی ہوئی ہے اور لکڑی کے سہارے چلتے ہیں ۔ کارونیشن ہوٹل میں انسپکٹر جنرل پولیس بھوپال سے ملنے کے لئے آئے ہیں ۔ اور انہوں نے اپنی خدمات پیش کیں ۔ مگر چونکہ ان کے پاس کوئی خاص اطلاع نہ تھی ۔ اور مفید نہ ہو سکتے تھے ۔ اس لئے ان کو خریدا نہیں گیا ۔ اور واپس کر دیا گیا ۔ چنانچہ اگلے روز ان لنگڑے جرنلسٹ صاحب (جو میرے مکان پر ہی بطور مہمان تشریف فرما تھے ۔) سے درخواست کی گئی کہ آپ یہاں سے تشریف لے جائیے ۔ آپ نے پوچھا کہ کیا وجہ ہے ۔ جو یہ سلوک کیا جا رہا ہے ۔ تو ان سے کہا گیا کوئی وجہ نہیں ۔ آپ سے خوف محسوس ہوتا ہے کہ آپ کوئی غداری نہ کر بیٹھیں ۔ اس لنگڑے جرنلسٹ کی طرح لاہور کے متعدد اخبار نویس بھی بھوپال والوں کے پاس پہنچے اور خدمات پیش کیں ۔ مگر ان کی خدمات قبول نہ کی گئیں ۔ کیونکہ ان کے پاس دیوان سنگھ کو نقصان پہنچانے کے لئے کوئی مواد نہ تھا ۔

بھوپال کے اس شخص نے ہی مجھے اطلاع دی کہ بھوپال والے یہ کوشش کر رہے

ہیں کہ گورنمنٹ آف انڈیا کا ہینڈ رائٹنگ اکسپرٹ بھی دستاویز کے متعلق یہ فتویٰ دے کہ یہ جعلی نہیں ہے۔ اور دیوان سنگھ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے۔ اور یہ دستاویز پولیٹیکل ایجنٹ بھوپال کی معرفت گورنمنٹ آف انڈیا کے ہینڈ رائٹنگ اکسپرٹ کو بھیجی جائے۔ تاکہ ڈائرکٹ بھیجنے کی صورت میں جانب داری کا شبہ نہ ہو۔ اس اطلاع سے میں بہت پریشان تھا کہ اگر گورنمنٹ آف انڈیا کے ہینڈ رائٹنگ اکسپرٹ نے بھی یہ کہہ دیا کہ یہ جعلی نہیں، دیوان سنگھ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریر ہے۔ تو اس کا نتیجہ ہمارے لئے بہت نقصان کا باعث ہوگا۔ اور عدالت کو ماننا پڑے گا کہ یہ دستاویز دیوان سنگھ کی لکھی ہوئی ہے۔ اور وہ مجرم ہے۔ میں کئی روز سوچتا رہا کہ اس مشکل کو کیوں کر حل کیا جائے۔ آخر رات کو خیال آیا کہ اس سرکاری ہینڈ رائٹنگ کے بڑے افسر سے ملنا چاہیئے۔ تاکہ اس معاملہ میں کوئی بد دیانتی نہ ہو۔ اس محکمہ کے سب سے بڑے افسر سر ڈیوڈ پیٹری تھے۔ سر ڈیوڈ پیٹر ایک غیر معمولی قابلیت کے افسر تھے۔ غیر معمولی دیانت دار، نہایت نیک اور انصاف پسند۔ چنانچہ اپنی ان ہی صفات کے باعث آپ بعد میں فیڈرل پبلک سروس کمیشن کے پریذیڈنٹ ہوئے (یہ فیڈرل پبلک سروس کمیشن بڑے بڑے عہدوں مثلاً آل انڈیا) سروس کے لیے امیدواروں کا انتخاب کرتا ہے۔ میں نے دن کے دس بجے کے بعد سر ڈیوڈ پیٹر کو ٹیلی فون کیا۔ کہ میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔ آپ نے جواب دیا کہ لنچ کے بعد دوپہر دو بجے ان کے دفتر میں ملوں۔ میں نے کہا کہ میں آپ کے گھر ملنا چاہتا ہوں، کیونکہ آپ کے دفتر کے خلاف شکایات ہیں۔ جہاں ایک ایک ہزار روپیہ ماہوار تنخواہ پانے والی ایک درجن سے زیادہ آدمی ہیں۔ میں نے جب یہ کہا کہ فی الحقیقت آپ کے دفتر کے خلاف شکایت ہے تو انہوں نے شام کو سات بجے اپنی کوٹھی پر آنے کو کہا۔ جو نئی دہلی میں اکبر روڈ پر تھی۔ میں سات بجے وہاں پہنچ گیا۔ سر ڈیوڈ کی کوٹھی کے باہر دو آدمی وردی میں اور دو سفید کپڑوں میں پہرہ دے رہے تھے۔ اور چاروں کے پاس سائیکل اور ریوالور تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ میں صاحب سے

ملنے آیا ہوں۔انہوں نے کہا کسی کو کوٹھی میں جانے کی اجازت نہیں۔ میں نے کہا بہرا کو بلا دو جو صاحب کے پاس میرا وزیٹنگ کارڈ لے جائے۔ان میں سے ایک شخص کوٹھی کے اندر گیا۔بہرا کو بلا لایا۔وہ میرا کارڈ اندر لے گیا۔سر ڈیوڈ نے کوٹھی کے اندر لے آنے کے لئے کہا۔ میں گیا باتیں ہوئیں۔ میں نے کہا بھوپال والوں نے جعل سازی کی ہے۔اور اس جعلی دستاویز کی بنا پر وہ مجھے پھنسانا چاہتے ہیں۔اور اس کوشش میں ہیں کہ آپ کے ماتحت جو گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے ہینڈ رائٹنگ اکسپرٹ ہیں۔ وہ بھی یہ فتویٰ دیں کہ یہ جعلی دستاویز اصلی ہے اور دیوان سنگھ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے۔میرے اس الزام پر سر ڈیوڈ حیران رہ گئے اور آپ نے کہا کہ یہ ممکن نہیں کہ ان کے دفتر کا کوئی آدمی رشوت لے یا بد دیانت ہو۔ میں نے کہا میں تو دنیا میں بہت کم آدمیوں کو دیانت دار سمجھتا ہوں۔ ہر شخص کی ایک قیمت ہوتی ہے۔آپ تین ہزار تنخواہ پاتے ہیں۔آپ کو تین لاکھ دیا جائے تو شاید آپ بھی بد دیانت ثابت ہوں۔ وائسرائے بائیس ہزار روپے ماہوار تنخواہ پاتے ہیں۔اور وائسرائے کو ایک کروڑ روپیہ رشوت دی جائے تو شاید وائسرائے بھی دیانت داری چھوڑ دیں۔اس طرح یہ سو دو سو روپیہ کا سوال نہیں۔نواب بھوپال کے خزانہ کے ہزارہا روپیہ کا سوال ہے۔ میں الزام نہیں لگاتا۔صرف احتیاطاً کہہ رہا ہوں کہ آپ کے دفتر میں جھوٹ کو سچا اور سچ کو جھوٹ نہ بنایا جائے۔کیونکہ اس مقدمہ میں نواب بھوپال کی عزت کا سوال ہے۔ایسا نہ ہو کہ کوئی شخص دس، بیس یا پچاس ہزار روپیہ لے کر اس جعلی دستاویز کو اصلی میرے ہاتھ کی لکھی ہوئی بتائے۔سر ڈیوڈ نے کہا اگر یہ دستاویز اصلی ہوئی تو آپ کے دفتر سے اس کے اصلی ہونے کا فتویٰ دیا جائے گا۔ میں نے کہا کہ میں چیلنج کرتا ہوں کہ آپ اس دستاویز کے متعلق ایمان داری کے ساتھ وہی فیصلہ کیجیے۔جیسی یہ فی الحقیقت ہے اور یہ انتظام کر دیجیے کہ نہ نواب بھوپال کا اثر استعمال ہو اور نہ میری کوئی رعایت۔سر ڈیوڈ نے اس کو منظور کر لیا۔

سر ڈیوڈ پیٹر نے اگلے روز اپنے دفتر میں حکم دیا کہ کوئی دستاویز ہینڈ رائٹنگ کے متعلق ان کے دفتر میں بھوپال سے آئے تو اس لفافہ کو کوئی شخص نہ کھولے اور بند کا بند ان کو دیا جائے۔

فارن منسٹر بھوپال نے دستاویز پولیٹیکل ایجنٹ بھوپال کو بھیجی۔ پولیٹیکل ایجنٹ نے سیکرٹری پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کو اور پولیٹیکل سیکرٹری نے سر ڈیوڈ کے دفتر میں گورنمنٹ آف انڈیا کے ہینڈ رائٹنگ اکسپرٹ کو بھیجی۔ یہ تحریر اصلی ہے یا جعلی۔ جب یہ تحریر سر ڈیوڈ کے دفتر میں پہنچی تو بند لفافہ سر ڈیوڈ کے سامنے پیش کیا گیا۔ آپ یہ لفافہ لے کر خود ہینڈ رائٹنگ اکسپرٹ کی لیبارٹری میں گئے۔ وہاں خود موجود رہے۔ اور مسٹر سٹاف سینئر ہینڈ رائٹنگ اکسپرٹ، مسٹر ہاجن اسسٹنٹ ہینڈ رائٹنگ اکسپرٹ، اور دوسرے اس فن سے واقف اشخاص سے کہا کہ بہت احتیاط سے معلوم کیا جائے کہ یہ تحریر اصلی ہے یا جعلی۔ سر ڈیوڈ وہاں کافی عرصہ موجود رہے۔ ان کی موجودگی میں دستاویز کے فوٹو لیے گئے اور دوسرے سائنٹیفک عمل ہوئے۔ آخر سب نے کہا کہ یہ دستاویز قطعی طور پر جعلی ہے۔ اور جعل سازی بھی کسی ادنیٰ قسم کے جعل ساز نے کی ہے۔ جو اس فن سے واقف نہیں۔ سر ڈیوڈ حیران رہ گئے۔ کہ اتنی بڑی ریاست کی طرف سے جعلی دستاویزات پیش کی گئی۔ سر ڈیوڈ پیٹری نے فوراً واٹسن پولیٹیکل سیکرٹری گورنمنٹ آف انڈیا کو ٹیلی فون کیا۔ پولیٹیکل سیکرٹری نے کہا فوراً تمام ہینڈ رائٹنگ اکسپرٹوں کے بیانات قلم بند کیے جائیں۔ چنانچہ ان کے بیان لیے گئے اور دستاویز یہ لکھ کر فارن منسٹر کو واپس بھوپال بھیج دی گئی کہ یہ جعلی ہے۔ اس دستاویز کے پہنچنے پر میرے اس اطلاع دینے والے مخبر نے جو انسپکٹر جنرل بھوپال کے دفتر میں ملازم تھا۔ اطلاع دی کہ دستاویز واپس آ گئی ہیں۔ اور اس کے متعلق جعلی ہونے کا فتویٰ صادر کیا گیا ہے۔ اور بھوپال والوں نے فیصلہ کیا ہے کہ گورنمنٹ آف انڈیا ہینڈ رائٹنگ اکسپرٹ کی اس رائے کو راز میں رکھا جائے اور یہ راز کسی پر ظاہر نہ کیا جائے۔ عدالت کو نہ بتایا جائے۔ اور صرف

دوسرے کرایہ کے غیر سرکاری ہینڈ رائٹنگ اکسپرٹوں کی رائے لی جائے۔ اور شہادت عدالت میں پیش کی جائے۔

ہم ہر شخص کے متعلق اطلاعیں حاصل کرتے رہتے تھے۔ ہمیں اطلاع ملی کہ ایک ماہ تک گورنمنٹ آف انڈیا کے سینئر ہینڈ رائٹنگ اکسپرٹ ایک سال کی طویل رخصت پر ولایت جانے والے ہیں۔ اور چونکہ انہوں نے اس دستاویز کے جعلی ہونے کی بطور سینئر ہینڈ رائٹنگ اکسپرٹ تصدیق کی ہے۔ یہ اگر ولایت چلے گئے اور ان کی غیر حاضری میں مقدمہ کا فیصلہ ہوا تو ان کی شہادت نہ ہو سکے گی۔ سردار بہادر بھگوان سنگھ اور مسٹر توکلی نے مل کر یہ فیصلہ کیا کہ عدالت میں درخواست دے کر مسٹر سٹاٹ کی شہادت کرائی جائے۔ چنانچہ دو چار روز کے بعد مقدمہ کی عدالت میں پیشی تھی۔ ہم نے ایک درخواست دی کہ گو استغاثہ کی تمام شہادتیں ختم نہیں ہوئیں۔ مگر مسٹر سٹاٹ جس نے بھوپال والوں کی درخواست پر اس دستاویز کا معائنہ کیا ہے۔ کہ شہادت لی جائے، کیونکہ وہ طویل رخصت پر ولایت جا رہے ہیں۔ اور مقدمہ کے ختم ہونے سے پہلے ولایت سے نہ آسکیں گے۔ ہمارے اس درخواست دینے سے پہلے بھوپال کو میرے سر ڈیوڈ سے ملنے کا قطعی علم نہ تھا۔ اور وہ یہ یقین کیے ہوئے تھے کہ ملزم یا ملزم کے وکیلوں کو مسٹر سٹاٹ کی رائے کا کوئی علم نہیں۔ اس رائے کو وہ ہضم کر جائیں گے۔ اور عدالت سے اسے پوشیدہ رکھا جائے گا۔ تاکہ اس رائے سے نئی مصیبت پیدا نہ ہو۔ چنانچہ جب یہ درخواست دی گئی۔ تو مجسٹریٹ نے اس درخواست کو پڑھا اور پڑھنے کے بعد اسے خان بہادر عبدالرحمن کو دیا۔ اس کے متعلق آپ کو کیا جواب دیا ہے۔ اس لمحہ سے پہلے بھوپال کے وکیل اور انسپکٹر جنرل پولیس ہماری کوششوں سے بالکل بے خبر اور تاریکی میں تھے۔ اس درخواست کو دیکھ کر خان بہادر عبدالرحمٰن بھی حیران ہوئے ۔اور خواجہ محمد اکرم انسپکٹر جنرل پولیس بھوپال جو مقدمہ کے انچارج تھے کی تو پیشانی پر پسینہ ہی آ گیا۔ اب ہم تو کہہ رہے تھے کہ مسٹر سٹاٹ کی شہادت بھوپال کے گواہ کے

طور پر ہو۔ کیونکہ اس نے بھوپال کی درخواست پر دستاویز کا معائنہ کیا۔ اور بھوپال والوں نے کہا کہ وہ مسٹر سٹاٹ کی شہادت کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے۔ اور اس کو پیش کرنا نہیں چاہیئے۔ یہ واقعہ عدالت میں ایک بہت بڑی سنسنی پیدا کرنے کا باعث ہوا۔ اور مجسٹریٹ کی آنکھیں بھی کھل گئیں کہ بھوپال کی درخواست پر دستاویز کا معائنہ کیا ہے۔ اور اس نے بھی اس کو جعلی قرار دیا۔ چنانچہ آخر مسٹر سٹاٹ کے نام مجسٹریٹ نے عدالت کی طرف سے سمن جاری کیے۔ مسٹر سٹاٹ عدالت میں پیش ہوئی۔ آپ کی شہادت ہوئی اور آپ نے اقرار کیا کہ یہ دستاویز جو نواب بھوپال کے نمائندوں نے پیش کی ہے۔ بالکل جعلی ہے۔ سو فی صدی جعلی ہے۔ چنانچہ بھوپال کے چوالیس گواہوں اور اس اکسپرٹ کی شہادت کے بعد اس مقدمہ میں مسٹر ایسر نے فیصلہ دیا کہ یہ دستاویز جعلی ہے۔ اور اخبار ریاست اور اس کے ایڈیٹر کو کچلنے اور پھنسانے کے لئے دی گئی ہے۔ اور جھوٹے مقدمہ کی سازش کی گئی ہے۔ اس فیصلہ سے بھوپال والوں کی جو حالت ہوئی۔ ظاہر ہے اپیل کی گئی۔ ظاہر ہے اپیل کی گئی جو ہائی کورٹ میں خارج ہوئی اور ایڈیٹر ریاست بری نہیں بلکہ ڈسچارج ہوا۔

اس مقدمہ کے فیصلہ تک ایڈیٹر ''ریاست'' کا مسٹر ایسر سے کوئی تعلق نہ تھا۔ کبھی بھی مسٹر ایسر سے ایڈیٹر ''ریاست'' کو پرائیویٹ طور سے ملنے یا گھر جانے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔

مقدمہ کے فیصلہ کے بعد مسٹر ایسر بیمار ہو گئے۔ آپ کی انتڑیوں میں زخم تھا اور خون بہہ رہا تھا۔ آپ ہندوراؤ ہسپتال جہاں انگریز افسروں وغیرہ کا علاج ہوتا ہے۔ داخل کیے گئے۔ آپ کی زندگی کی کوئی امید نہ تھی۔ مجھے جب یہ حالت معلوم ہوئی تو میں بطور ہمدردی آپ کے گھر گیا۔ آپ کی میم صاحبہ پریشانی کی حالت میں گھر میں مغموم تھیں، جب میں نے پوچھا کہ کیا حالت ہے، تو آپ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور آپ نے کہا خدا رحم کرے۔ حالت بہت نازک ہے۔ کسی کو مسٹر ایسر کے پاس

جانے کی اجازت نہیں اور نہ ہی کہا جا سکتا ہے کہ کیا ہوگا؟۔اور آپ خود بھی صرف چند منٹ کے لئے اپنے شوہر کو دیکھنے جاتی ہیں۔اس سے زیادہ وہاں ٹھہرنے اور بات چیت کرنے کی اجازت نہیں۔یہ پہلا موقع تھا کہ میں مسٹر ایسر کے مکان پر گیا۔

مسٹر ایسر کچھ اچھے ہو گئے اور ڈاکٹروں نے کہا کہ وہ انگلینڈ جا کر وہاں آپریشن کروائیں۔چنانچہ اس بیماری اور کمزوری کی حالت میں ہی آپ ولایت گئے۔وہاں ہسپتال میں داخل ہوئے اور کئی ماہ تک علاج کراتے رہے۔ان کی غیر حاضری میں بھی میں کبھی کبھی مسٹر ایسر کی حالت دریافت کرنے ان کے گھر جاتا رہا۔ایک روز میں نے باتوں باتوں میں مسز ایسر سے پوچھا کہ اس بیماری میں روپیہ تو کافی خرچ ہوا ہوگا ۔مسز ایسر نے معمولی طور سے ہاں کہہ دی۔مگر میں نے محسوس کیا کہ ان کے کئی بچے ہیں جو اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔رشوت نہ کھانے والا دیانت دار شخص، پوزیشن کا قائم رکھنا، کوٹھی، موٹر، ملازم اور اس پر بیماری کی یہ مصیبت اور انگلینڈ کا خرچ، میں سوچتا رہا کہ یہ بے چارے کیا کرتے ہوں گے۔چنانچہ مجھے معلوم ہوا کہ رخصت کی نصف تنخواہ تو میم صاحبہ اپنے پاس رکھتی ہیں اور باقی نصف علاج کے لئے بھیج دیتی ہیں۔

میں یہ حالات سن کر واپس آ گیا، مگر رات کو بھی بے چینی محسوس کرتا رہا۔رات کو بھی یہی خیال رہا کہ اگر ولایت میں مسٹر ایسر کے پاس خرچ کے لئے کافی روپیہ نہ ہوا تو وہ کیا کریں گے؟۔ایسے نیک آدمی کے لئے ایسی مصیبت۔اور اگر خدانخواستہ مسٹر ایسر نہ رہے تو ان کے بیوی بچوں کا کیا ہوگا؟۔ان لوگوں کو کس جرم میں سزا ملے گی۔کیا نیک لوگوں کے لئے صرف مصائب ہی ہیں۔ان ہی خیالات میں سو گیا۔صبح اٹھا تو رات کے خیالات کا اثر باقی تھا۔

میری فطرت ہے کہ جب تک کسی مشکل کا کوئی حل نہ سوچ لوں، مجھے بے چینی سی رہتی ہے اور کام نہیں کر سکتا۔نو بجے لوگ آئے میں نے ایک خط لندن کی ایک ایڈورٹائزنگ فرم ڈی جے کیمر اینڈ کو لکھوایا کہ ہمارے حساب میں ایک سو پونڈ مسٹر

ایس آف دہلی کی معرفت تھامس کک اینڈ کمپنی لندن بھیج دیا جائے۔ مسٹر ایسر اس وقت ہسپتال میں بیمار پڑے تھے۔ اور اتفاق کی بات کہ آپ کے پاس صرف پانچ پونڈ تھے۔ اور سوچ رہے تھے کہ کسی دوست سے قرض لیں، مسٹر ایسر کو خیال بھی نہ تھا کہ دیوان سنگھ کا بھیجا ہوا چیک آپ کے پاس آئے گا۔ ہسپتال میں ہی بستر پر آپ کو یہ چیک ملا۔

مسٹر ایسر غالباً چار ماہ کے بعد انگلینڈ سے واپس آئے۔ آپ کا آپریشن ہوا اور آپ اچھے ہو گئے۔ جب دہلی پہنچے تو میں خیریت پوچھنے دوسرے تیسرے روز گیا۔ خیریت پوچھی باتیں ہوئیں تو آپ نے امپیریل بنک دہلی کا میرے نام ایک ہزار تین سو روپیہ کا چیک دیا اور کہا کہ آپ کے دل میں ایڈیٹر ''ریاست'' کے جذبات اور اخلاص کی انتہائی قدر ہے۔ مگر آپ یہ روپیہ نہیں لے سکتے۔ کیونکہ ایڈیٹر ''ریاست'' کا مقدمہ آپ نے کیا اور اسے اپنے ضمیر پر ایک بوجھ سمجھتے ہیں۔ میں نے بہت کہا اور بار بار عرض کی کہ یہ بیماری کی حالت میں ایک دوستانہ نذر تھی۔ اس کو قبول کیجیے۔ مقدمہ ختم ہوئے ایک عرصہ گزر چکا ہے۔ اور اس کا ہائی کورٹ میں بھی فیصلہ ہو گیا ہے۔ اب احسان یا معاوضہ کا سوال ہی کیا۔ مگر آپ نہیں مانے اور آپ نے چیک دے دیا۔ جو بنک سے کیش کرا لیا گیا۔

اس مقدمہ کے کچھ عرصہ بعد اس مقدمہ کا بھی آخری فیصلہ ناگ پور ہائی کورٹ سے ہوا۔ جو نواب بھوپال نے ہوشنگ آباد میں چلا رکھا تھا۔ اور دہلی کے مقدمہ میں جعل سازی کے سارے انتظامات مکمل تھے کہ بھوپال کے نمائندوں پر جعل سازی کے جرم میں فوج داری اور ایک لاکھ روپیہ ہرجانہ کا دیوانی مقدمہ دائر کیا جائے۔ مگر صرف اس خیال سے ان دونوں مقدمات کا ارادہ ترک کر دیا گیا کہ چونکہ مسٹر ایسر کو ایک سو پونڈ ان کی بیماری میں ایڈیٹر ''ریاست'' نے بھیجا تھا۔ اگر مقدمہ چلا تو شاید اس مقدمہ میں بے قصور، معصوم اور نیک سیرت مسٹر ایسر کا نام بھی زیر بحث آئے۔ آپ پر

کوئی غلط الزام لگایا جائے۔ اور آپ کی شہرت کے لئے ایڈیٹر ''ریاست'' نقصان کا باعث ہو۔

مسٹر ایسر کے روپیہ واپس کرنے کے بعد میرے اور مسٹر ایسر کے تعلقات فی الحقیقت گہرے دوستانہ ہو گئے۔ اور یہ تعلقات میرے لئے نقصان کا باعث بھی ہوئے۔ چنانچہ ناظرین کو یاد ہوگا کہ نوٹوں کا مقدمہ پنجاب ہائی کورٹ کے چیف جسٹس سر ڈگلس ینگ نے مسٹر ایسر کو غیر معمولی دیانت دار اور قوت ارادی کا مضبوط اور انصاف پسند مجسٹریٹ سمجھ کر آپ کی عدالت میں بھیجا اور لکھا کہ مسٹر ایسر ہی اس کا فیصلہ کریں۔ مگر مسٹر ایسر کا ضمیر اس بات کی اجازت نہ دیتا تھا۔ آپ نے اس حکم کی پشت پر ہی یہ لکھ کر حکم واپس کر دیا کہ دیوان سنگھ کے ساتھ آپ کے ذاتی تعلقات ہیں۔ اس لئے آپ مقدمہ سننا نہیں چاہتے۔ چنانچہ اگر ایک سو پونڈ کا چیک مسٹر ایسر کو بیماری کی حالت میں نہ بھیجا ہوتا۔ جو آپ نے واپس بھی کر دیا تھا۔ تو نوٹوں کا یہ مقدمہ بھی مسٹر ایسر جیسے انصاف پسند اور مضبوط قوت ارادی کے مضبوط مجسٹریٹ کے ہاتھوں فیصل ہوتا۔ اور جعل سازی کے بھوپال کے مقدمہ میں بھوپال کے نمائندوں میں سے کوئی نہ کوئی آج جیل میں ہوتا۔ اس کے علاوہ ایڈیٹر ''ریاست'' ایک کافی رقم بطور ہر جانہ کے بھوپال کے خزانہ سے وصول کر لیتا۔

ان تمام واقعات کے بعد اگر ایڈیٹر ''ریاست'' کے دل کی اصلی آواز معلوم کی جائے تو یہ ایمان داری کے ساتھ کہنے کے لئے تیار ہے کہ مسٹر ایسر کی بیماری کی حالت میں ایک سو پونڈ بھیجنے کے لئے لندن خط لکھتے وقت میرے دل کو جو مسرت اور شادمانی ہوئی۔ اس پر درجنوں دشمنوں کی جعل سازیوں کو معاف اور لاکھوں روپیہ قربان کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ مستحق دوستوں اور مستحق لوگوں کی خدمت کرتے وقت جو مسرت آپ کو ملی اور جو لطف حاصل ہوا۔ وہ شاید صوفیوں کے مراقبہ میں اور ہندوؤں کے انہد شبد (یعنی دل کا خدا سے ہم کلام ہونا) میں بھی میسر نہیں۔ اور میرا ذاتی تجربہ ہے کہ میں

جب تک دوستوں اور مستحق لوگوں کی خدمت کرتا رہا۔ میرے پاس روپیہ بہت آیا۔ جب کبھی میں نے دوستوں کی مدد سے ہاتھ کھینچا افلاس میں مبتلا ہو گیا۔ اور اب بھی ریاست کے موجودہ نئے دور میں اس غیر معمولی کام یابی کا سب سے بڑا باعث دوستوں اور دوسرے مستحق لوگوں کی دعائیں ہی ہیں۔

ایڈیٹر ''ریاست'' کی عدالتی قماربازی

اس سے پہلے ریاست میں دہلی والے مقدمہ نواب بھوپال بنام ایڈیٹر ''ریاست'' کے حالات مسٹر ایسر کے فیصلہ تک لکھے گئے تھے۔ان حالات نے ریاست کر اڑھائی صفحات کی جگہ لے لی۔حالانکہ اس ناقابل فراموش کالم کے لئے مقتسل طور سے جگہ صرف دو کالم وقف تھی۔اب اس مقدمہ کی اپیل کے حالات درج کیے جاتے ہیں، جو دل چسپ ہیں۔

مسٹر ایسر کے فیصلہ کے خلاف نواب بھوپال کی طرف سے سیشن جج دہلی کی عدالت میں نگرانی دائر کی گئی۔جس کا مقصد یہ تھا کہ استغاثہ کے چوالیس گواہوں کے گزرنے کے بعد دیوان سنگھ کے خلاف فرد جرم لگنی چاہیئے۔ہمارے وکیل کہتے تھے کہ جس صورت میں نواب بھوپال کے منتخب کردہ گورنمنٹ آف انڈیا کے سرکاری ہینڈ رائٹنگ اکسپرٹ کی شہادت بھی موجود ہے۔کہ نواب بھوپال کی طرف سے جعلی کاغذات عدالت میں پیش کیے گئے۔اور استغاثہ کے گواہ بھی دیوان سنگھ کے خلاف کوئی الزام ثابت نہیں کر سکے۔اس لئے قانونا دیوان سنگھ کو ڈسچارج ہونا چاہیئے۔فرد جرم کی ضرورت نہیں۔یہ مقدمہ مسٹر بیکٹ آئی سی ،ایس سیشن جج کی عدالت میں تھا۔مسٹر ایسر کی عدالت میں تو بھوپال کی طرف سے مقدمہ کے انچارج وکیل خان بہادر عبد الرحمٰن تھے۔مگر مسٹر بیکٹ کی عدالت کے لئے انہوں نے ایک انگریزی مسٹر کارڈن نوڈ بیرسٹر بہت کافی فیس پر وکیل کرلیا۔یہ مسٹر کارڈن نوڈ بیرسٹر کئی برس تک مسٹر بیکٹ سیشن جج کے ساتھ ایک ہی کوٹھی میں مقیم رہے۔جب کہ مسٹر بیکٹ لاہور میں رجسٹرار ہائی کورٹ یا لیگل ریمبرنسر تھے۔اور مسٹر بیکٹ کے گہرے دوست تھے۔مسٹر کارڈن نوڈ کا وکیل ہونا ہمارے دل میں شبہات پیدا ہونے کا باعث ہونا چاہیئے تھا۔مگر آپ کا مسٹر بیکٹ کی عدالت میں وکیل مقرر ہونا خلاف قانون نہ تھا۔ہم کیا کر سکتے تھے۔ خاموش رہے۔مسٹر بیکٹ پر کوئی الزام لگانا غیر مناسب تھا۔چنانچہ مقدمہ عدالت میں

پیش ہوا اور مسٹر کارڈن نوڈ مسٹر بیکٹ کی عدالت میں آئے تو مسٹر بیکٹ نے عدالت میں ہی کہا کہ مسٹر کارڈن نوڈ آپ کے دوست ہیں۔ اور چاہتے ہیں کہ رات کو مسٹر کارڈن نوڈ کو اپنے ہاں ڈنر پر بلائیں۔ کسی پارٹی کو کوئی اعتراض تو نہیں، جہاں تک ہمارے شبہات کا تعلق تھا۔ مسٹر بیکٹ کا مسٹر کارڈن نوڈ کو اپنی کوٹھی پر دعوت دینا نہلے پر دہلے کے مترادف تھا۔ ہمارے شبہات میں اور زیادہ اضافہ ہوا۔ مگر مقدمہ عدالت میں پیش تھا۔ سیشن جج پر الزام کیوں کر لگاتے۔ ہم نے بھی بد دلی کے ساتھ کہہ دیا کہ مسٹر کارڈن نوڈ کے آپ کے ہاں ڈنر پر جانے میں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔

مسٹر کارڈن نوڈ مسٹر بیکٹ کے ہاں ڈنر پر گئے۔ مقدمہ اس کے بعد بھی کئی روز تک رہا۔ بحث ہوئی۔ بحث کے بعد مسٹر بیکٹ نے مقدمہ کا فیصلہ ایڈیٹر ریاست کے خلاف دے دیا۔ اور فیصلہ میں لکھا کہ دیوان سنگھ پر فرد جرم چارج شیٹ لگائی جائے۔ اور پھر دیوان سنگھ کی طرف سے صفائی پیش ہو کر مقدمہ کا فیصلہ ہو۔

مسٹر بیکٹ کے اس فیصلے کے خلاف ہم ہائی کورٹ گئے۔ وہاں نگرانی داخل کی گئی۔ رجسٹرار نے یہ مقدمہ بخشی سر ٹیک چند جج ہائی کورٹ کی عدالت میں سماعت کے لئے بھیج دیا۔ اس زمانہ میں ہائی کارٹ کے مستقل چیف جج سر شادی لال ایک قانونی کمیشن کے سلسلہ میں ولایت گئے ہوئے تھے۔ اور قائم مقام چیف جسٹس ایک انگریز سر ایلن براڈوے تھے، جن کے متعلق ہمارے پاس اطلاع تھی کہ وہ بھی مسٹر کارڈن نوڈ کے دوست ہیں۔ مگر ہم کیا پرواہ کرتے، جس صورت میں کہ مقدمہ بخشی ٹیک چند کی عدالت میں لگ چکا تھا۔ تو ان لوگوں نے کوشش کر کے مقدمہ سر ایلن براڈوے کی عدالت میں لگوا لیا۔ اور عدالت کی اس تبدیلی کا حکم خود سر ایلن براڈوے نے بطور قائم مقام چیف جسٹس دیا۔ چیف جسٹس کا حکم ہائی کورٹ میں خدائی حکم کی حیثیت رکھتا ہے۔ کیونکہ اس کے بعد اپیل کے لئے کوئی گنجائش ہی نہیں۔ اور ہر ملزم چاہے وہ دل میں کیا کچھ سمجھتا ہو۔ اس حکم کے سامنے سر جھکانے کے لئے مجبور ہے۔ دہلی میں اپیل

ہوئی تو مسٹر بیکٹ سیشن جج کے ذاتی دوست مسٹر کارڈن نوڈ اور اب ہائی کورٹ میں آئے تو مقدمہ بخشی ٹیک چند کی عدالت سے سرایلن براڈوے اپنی عدالت میں لے گئے۔ اور مسٹر کارڈن نوڈ مسٹر ایلن کے دوست، ہم کیا کر سکتے تھے۔ بہت سوچا اس بیماری کا علاج سمجھ میں نہ آتا تھا۔ آخر مجبور ہو کر ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ مقدمہ انگریز جج کی عدالت میں ہو گا۔ استغاثہ کے وکیل انگریز۔ اس لئے اس انگریزیت کے اثر کو کچھ نرم کرنے کے لئے ہم بھی کوئی انگریز وکیل کر لیں۔ تاکہ مسٹر کارڈن نوڈ کا اگر صرف بطور انگریز اگر اثر ممکن ہو۔ میں مسٹر کارڈن نوڈ پر کوئی الزام نہیں لگا رہا ہوں۔ صرف اپنے شکوک وشبہات اور دلی کیفیت بیان کر رہا ہوں۔ تو وہ اثر ایک حد تک زائل ہو سکے۔ اس زمانہ میں انگریز وکیلوں میں سب سے زیادہ لائق وکیل مسٹر پٹ مین ستر سال کے ضعیف، مگر بہت محنتی، بہت لائق اور بار ایسوسی ایشن کے صدر تھے۔ آپ پنجاب کے سازش وغیرہ کے بڑے مقدمات میں بطور سرکاری وکیل یا ملزموں کے وکیل کی حیثیت سے پیروی کر چکے تھے۔ اور غالباً جج ہائی کورٹ بھی رہے۔ مسٹر پٹ مین اس زمانہ میں فلیٹی ہوٹل کی اوپر کی منزل کے کمروں میں مستقل رہائش رکھتے تھے۔ ایڈیٹر ریاست اور سردار بہادر بھگوان سنگھ فلیٹی ہوٹل پہنچے۔ مسٹر پٹ مین سے ملے۔ مسٹر پٹ مین کی فیس پانچ سو روپیہ روزانہ تھی۔ آپ نے پوچھا کہ مقدمہ کیا ہے تو کہا گیا توہین کا ہے۔ اور اس کی ہائی کورٹ میں نگرانی ہے۔۔ مسٹر پٹ مین نے پوچھا ایک دو گھنٹہ کا کام ہے اور چند منٹ مسل دیکھنے پر صرف ہوں گے۔ آپ نے فرمایا پانچ سو روپیہ فیس ہو گی۔ ہم نے کہا بہت اچھا۔ پانچ سو روپیہ فیس اور پچاس روپے منشیانہ ہم نے نذر کیا اور یہ وعدہ کر کے چلے آئے کہ شام تک مسل کی نقل بھیج دیں گے۔ سردار بہادر بھگوان سنگھ (بیرسٹر اجمیر) جو مسٹر توکلی کے ساتھ میرے وکیل تھے۔ مقدمہ کی مسل کے کیڑے ہیں۔ شاید تمام ہندوستان میں کوئی وکیل بھی اتنا محتاط، دور اندیش اور محنتی نہ ہو گا۔ یہ غیر ممکن تھا کہ ایک کاغذ کا پرزہ بھی عدالت کی مسل میں ہو اور اس کی

مصدقہ نقل ہمارے پاس موجود نہ ہو۔ اس مقدمہ کی مسل بھی ایک ہزار صفحات سے زیادہ ضخیم تھی۔ کیونکہ مقدمہ کی کاروائی، چوالیس گواہوں کے بیانات اور ایک ایک گواہ پر کئی کئی ہفتے جرح۔ شام کو ہم نے مسل مکمل نقل۔ مسٹر پٹ مین کو بھیج دی۔ تاکہ وہ پانچ سات روز میں اطمینان کے ساتھ معائنہ کرلیں۔ اور ہم دہلی چلے آئے۔ کیونکہ مقدمہ کی پیشی میں چند روز باقی تھے۔

دہلی پہنچ کر ایڈیٹر ریاست سرایلین براڈوے کی عدالت سے بے فکر نہ تھا۔ سوچتا رہا کہ کیا کرنا چاہیئے آخر میں نے اپنی پوری قوت ارادی کے ساتھ فیصلہ کیا۔ کہ نتیجہ چاہے کچھ ہو اور چاہے توہین عدالت کے جرم میں بھی سزا ہو جائے۔ جب سرایلین براڈوے کی عدالت میں جاوں گا۔ تو مقدمہ کی کارروائی شروع ہونے سے پہلے علانیہ طور سے عدالت کو مخاطب کرتے ہوئے کہوں گا۔ کہ چونکہ سر ایلین براڈوے نے خود ہی مقدمہ جسٹس بخشی ٹیک چند کی عدالت سے منتقل کرلیا ہے۔ مجھے اس عدالت کے انصاف پر بھروسہ نہیں۔ میں عدالت سے درخواست کرتا ہوں۔ کہ مقدمہ کسی دوسرے جج ہائی کورٹ کے پاس بھیجا جائے۔ اور اگر یہ عدالت کو منظور نہیں تو میں عدم تعاون کرتا ہوں۔ عدالت جو چاہے مقدمہ کا فیصلہ دے۔ میں مقدمہ کی کارروائی میں حصہ نہ لوں گا اور میں اس توہین عدالت کے جرم کی سزا بھگتنے کے لیے بھی تیار ہوں۔

میں نے یہ قدم اٹھانے کا فیصلہ کرلیا۔ حالانکہ میں جانتا تھا کہ ہائی کورٹ توہین عدالت کی بڑی سخت سزا دے سکتی ہے۔ ناظرین کو یاد ہوگا کہ مرحوم لالہ ہرکشن لال کو چیف جسٹس ہائی کورٹ لاہور نے توہین عدالت کے جرم میں عمر قید کی سزا دی تھی۔

ابھی مقدمہ کی پیشی میں ایک ہفتہ کے قریب تھا خوش نصیبی سمجھیے یا حسن اتفاق کہ صبح کو میں نے سٹیٹس مین دیکھا۔ اس میں ایسوسی ایٹیڈ پریس کا ایک تار تھا کہ لندن کے اس قانونی کمیشن کا کام خلاف توقع جلدی ختم ہو چکا ہے۔ جس میں سر شادی لال چیف جسٹس ممبر تھے۔ اور سر شادی لال جہاز کے ذریعہ آج بمبئی پہنچ گئے۔ اور شام کو

فرنٹیر میل میں پنجاب روانہ ہو رہے ہیں ۔ اس خبر کو پڑھتے ہی ذہن میں مختلف خیال آنا شروع ہو گئے کہ اب کیا کرنا چاہیئے ۔ سر شادی لال واپس آ گئے ہیں ۔ مقدمہ ایلن براڈوے کی عدالت سے باہر نکلوایا جا سکتا ہے یا نہیں ۔ وغیرہ، میں اس سے پہلے لکھ چکا ہوں کہ جب بھی کوئی مشکل پیش آئے مجھے اس وقت تک بے چینی رہتی ہے ۔ جب تک اس کا حل نہ نکال لوں ۔ اور اس حل کا پروگرام نہ تیار کر لوں ۔ اس حالت میں مجھ سے نہ کوئی کام ہو سکتا ہے ۔ اور نہ میں کوئی مضمون لکھ سکتا ہوں ۔ جب کوئی حل تجویز کر لوں اور اس حل کا پروگرام بنا لوں تو پھر قطعی طور پر مطمئن ہو کر کام شروع کر دیتا ہوں ۔ میں نے اس خبر کو صبح چھ بجے کے قریب پڑھا ۔ دوپہر کے دو بجے تک بے چین رہا اور سوچتا رہا ۔ کہ کیا کرنا چاہیئے ۔ آخر فیصلہ کیا کہ تمام حالات کے متعلق سر شادی لال کو اطلاع بھیجی جائے ۔ چنانچہ میں نے سر شادی لال کو ایک خط لکھا جس میں مقدمہ کی تفصیل کے ساتھ حالات تھے ۔ مسٹر ایسر کا فیصلہ، چوالیس گواہوں کے بیان ۔ گورنمنٹ ہند کے ہینڈ رائیٹنگ اکسپرٹ کی گواہی ۔ مسٹر بیکٹ کی عدالت میں مسٹر کارڈن نوڈ کا وکیل مقرر رہونا ۔ عدالت میں ڈنر کا ذکر ۔ ہائی کورٹ میں مقدمہ بخشی ٹیک چند کی عدالت میں جانا ۔ اور وہاں سے مقدمہ بطور چیف جسٹس مسٹر ایلن براڈوے کا اپنی عدالت میں منگانا وغیرہ اور ساتھ یہ بھی لکھا کہ پیشی کے روز توہین عدالت کی پرواہ نہ کرتے ۔ اور عدالت کو مخاطب کرتے ہوئے جسٹس ایلن پر علانیہ جانب داری کا الزام لگاؤں گا ۔ اور کہوں گا کہ اس عدالت یا ہائی کورٹ سے مجھے انصاف کی توقع نہیں ۔ یہ خط غالباً سولہ صفحوں کا تھا اور ریاست کے فارموں پر تھا ۔ میں نے خط کو لکھنے کے بعد پڑھا، بند کیا ۔ اس کی پشت پر ٹکٹ لگائے اور آدمی کے ہاتھ ساڑھے تین بجے کے قریب رجسٹری کے لئے ڈاک خانہ بھیج دیا ۔ رجسٹری کی رسید آ گئی ۔ یعنی جس شام کو اور جس فرنٹیر میل سے سر شادی لال دہلی سے گزرے ۔ اسی شام کو اور اسی فرنٹیر میل میں میری رجسٹری لاہور گئی ۔ سر شادی لال آٹھ، نو بجے کے قریب پہنچے ۔ اور دوپہر کو

بارہ بجے یہ رجسٹری خط ان کے ہاتھوں میں پہنچ گیا۔

جسٹس سر شادی لال نے اگلے روز چیف جسٹس کے عہدہ کا چارج سر ایلن براڈ سے لے لیا۔ چارج لینے کے بعد آپ نے ڈپٹی رجسٹرار جو انگریز تھا اور جو مقدمات کو عدالتوں کے سپرد اور تبدیل کرنے کا ذمہ دار تھا۔ میں اس ڈپٹی رجسٹرار کا نام بھول گیا ہوں، کو اپنے پاس بلایا۔ اور اس مقدمہ کے متعلق عدالت کی تبدیلی کے واقعات دریافت کیے۔ ڈپٹی رجسٹرار نے تمام حالات یعنی یہ مقدمہ بخشی ٹیک چند کی عدالت میں لگا اور بعد میں سر ایلن کے حکم سے سر ایلن براڈوے کی عدالت میں گیا۔ وغیرہ بتائے۔ یہ واقعات سننے کے بعد سر شادی لال نے حکم دیا کہ مسل ان کے پاس بھیجی جائے۔ وہ مسل کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ اور دیکھنے کے بعد مسل پر حکم لکھا کہ مقدمہ سر ایلن براڈوے کی عدالت سے پھر جسٹس بخشی ٹیک چند کی عدالت میں منتقل کر دیا جائے۔ چنانچہ مسل بخشی ٹیک چند کی عدالت میں بھیج دی گئی۔

مقدمہ کی پیشی سے دو روز پہلے میں، مسٹر توکلی اور سردار بہادر بھگوان سنگھ لاہور پہنچ گئے۔ امپیریل ہوٹل میں مقیم ہوئے۔ مسٹر پٹ مین سے ملے تو مسٹر پٹ مین نے کہا کہ ان کو علم نہ تھا کہ مسل ایک ہزار صفحوں سے زیادہ ضخیم ہے۔ اور اس کا معائنہ کرتے ہوئے ان کے سات روز صرف ہوئے۔ اگر یہ معلوم ہوتا کہ مسل اس قدر ضخیم ہے تو آپ کم از کم پانچ ہزار محنتانہ طلب کرتے۔ کہاں پانچ سو، اور کہاں پانچ ہزار، ہم حیران رہ گئے۔ کہ ان کے اس اعتراض کا کیا جواب دیا جائے۔ ایڈیٹر ریاست اپنی تمام زندگی وکیلوں اور ڈاکٹروں کے متعلق بہت محتاط رہا ہے۔ اور ہمیشہ یہ خیال رکھا کہ ان کو غیر مطمئن نہ ہونا چاہیئے۔ اور چاہے کتنے گہرے تعلقات ہوں، ان کو ہمیشہ فیس دی جائے۔ (سوائے مسٹر توکلی کے جو فیس قبول نہیں کرتے) اور کرتے ہیں تو کبھی وہ بھی برائے نام۔ اور کوئی ڈگری ہو تو اپنے پاس سے اس ڈگری کا روپیہ بھی ادا کر دیتے ہیں۔ چنانچہ اب بھی ان کا میرے ذمہ ڈیڑھ ہزار کے قریب روپیہ باقی ہے۔ جو آپ نے

ایک عدالت میں آپ نے میری جگہ ادا کیا۔ خدا کرے کہ میں جلد ان کو روپیہ ادا کر سکوں۔ گو انہوں نے نہ صرف کبھی تقاضا کیا بلکہ ہمیشہ ہی یہ کہا کہ وہ روپیہ نہ لیں گے۔ مگر میں یہ کہتا ہوں کہ نہیں میں لازمی طور سے واپس کروں گا۔ مجھے خیال آیا کہ مسٹر پٹ مین پانچ سو روپیہ سے مطمئن نہیں، شاید وہ ہمارے کیس میں دل چسپی نہ لیں۔ ان کو اور فیس جو طلب کریں نذر کی جائے۔ چنانچہ ایڈیٹر ریاست نے کہا آپ اور کم از کم کیا چاہتے ہیں۔ تا کہ وہ ادا کیا جا سکے۔ مسٹر پٹ مین بہت بلند انسان تھے۔ ان کا کریکٹر ملاحظہ ہو۔ آپ نے فرمایا، دیوان سنگھ یہ سوال زبان اور کریکٹر کا ہے۔ میری غلطی تھی کہ میں نے مسل دیکھے بغیر آپ سے پانچ سو روپیہ فیس لی۔ اب جب کہ میں مقدمہ کی فیس لے چکا ہوں تو میرا ایمان ہے کہ میں لالچ نہ کروں۔ اور اس فیس میں ہی پوری محنت اور کوشش سے تیاری کروں۔ آپ اب اگر مجھے ایک لاکھ روپے بھی دیں تو میں ایک پیسہ نہ لوں۔

کیسے بلند کریکٹر لوگ تھے۔ مسٹر پٹ مین کا اب انتقال ہو چکا ہے۔ اب وہ اس دنیا میں موجود نہیں، مگر جب بھی ان کا خیال آتا ہے۔ تو عزت و احترام کے ساتھ دل کی نگاہیں جھک جاتی ہیں۔ مسٹر پٹ مین نے مزید کوئی فیس قبول نہ کی۔

مسٹر پٹ مین سے فارغ ہو کر ہم لوگ رجسٹرار کے دفتر میں گئے، تا کہ معلوم کریں کہ میرے اس خط کا کیا نتیجہ نکلا۔ جو میں نے سر شادی لال کو بذریعہ رجسٹری بھیجا تھا۔ وہاں کے کلرکوں سے معلوم ہوا کہ چیف جسٹس مسٹر شادی لال نے مسل طلب کی اور مسلسل تین روز تک اس کا معائنہ کرتے رہے۔ اور حکم دیا کہ مقدمہ پھر بخشی ٹیک چند کی عدالت میں جائے۔ یہ سن کر ہم مطمئن ہو گئے اور مسٹر پٹ مین کو اطلاع دی کہ مقدمہ بخشی ٹیک چند کی عدالت میں ہو گا۔

تیسرے روز پیشی تھی، بھوپال والوں کو یا مسٹر کارڈن نوڈ کو مقدمہ کی اس تبدیلی کا کوئی علم نہ تھا۔ نو بجے کے قریب ہم لوگ ہائی کورٹ کی عدالت میں پہنچے۔ رجسٹرار کے دفتر

کے برآمدے میں کھڑے تھے کہ بھوپال کے انسپکٹر جنرل پولیس خواجہ محمد اکرم صاحب اپنی پوری وردی کے ساتھ خان عبدالرحمٰن ترکی ٹوپی اور سوٹ پہنے ہوئے اور مسٹر کارڈن نوڈ فاتحانہ انداز میں مسکراتے ہوئے ہمارے پاس سے گزرے۔ اس لمحہ تک ان بے چاروں کو نہ تو اس خط کا علم تھا جو میں نے سرشادی لال کو لکھا تھا۔ اور نہ یہ خبر تھی کہ حالات چوپٹ ہو چکے ہیں۔ اور مقدمہ چیف جسٹس کے حکم سے سرایلین براڈوے کی عدالت سے بخشی ٹیک چند کی عدالت میں منتقل ہو چکا ہے۔ ہائی کورٹ کے وکیلوں کا قاعدہ ہے کہ جب وہ ہائی کورٹ میں پہنچتے ہیں تو ایک چکر رجسٹرار کے دفتر کا ضرور لگاتے ہیں۔ تاکہ مقدمہ کے حالات معلوم ہو سکیں۔ یہ لوگ بھی رجسٹرار کے دفتر گئے تو ان کو معلوم ہوا کہ مقدمہ بخشی ٹیک چند کی عدالت میں ہے۔ مسٹر کارڈن نوڈ بہت ریز طبیعت کے انگریز تھے۔ آپ بہت غصہ میں آئے اور فوراً سرایلین براڈوے کی عدالت میں پہنچے۔ سرایلین ابھی عدالت میں نہ آئے تھے۔ اپنے پرائیویٹ چیمبر میں تشریف رکھتے تھے۔ ان سے ملے اور کہا کہ اس طرح مقدمہ آپ کی عدالت میں تبدیل ہو چکا ہے۔ سرایلین براڈوے کو بھی خبر نہ تھی۔ کیونکہ دس بجے مقدمہ ان کی عدالت میں پیش ہونا تھا۔ اور وہ مقدمہ سننے کی تیاریاں فرما چکے تھے۔ آپ پر بھی بہت جوش اور غصہ کی کیفیت طاری ہوئی۔ ڈپٹی رجسٹرار کو طلب فرمایا۔ اس سے حالات پوچھے۔ اور حالات پوچھنے کے بعد آپ نے ڈپٹی رجسٹرار سرشادی لال کے پاس کہلوا بھیجا کہ سرایلین نے یہ مقدمہ بطور چیف جسٹس اپنی عدالت میں منتقل کیا ہے۔ سرشادی لال کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اس مقدمہ کو ان کی عدالت سے منتقل کریں۔ اور مقدمہ کا پھر بخشی ٹیک چند کی عدالت میں جانا سرایلین کی توہین ہے۔ ڈپٹی رجسٹرار یہ پیغام لے کر چیف جسٹس سرشادی لال کے پرائیویٹ چیمبر میں پہنچے۔ پیغام دیا تو سرشادی لال نے ڈپٹی رجسٹرار کی معرفت سرایلین کو جواب دیا کہ اگر بطور چیف جسٹس سرایلین یہ مقدمہ اپنی عدالت میں لے گئے ہیں تو میں بھی بطور چیف جسٹس ہی پھر حکم دیتا ہوں کہ

مقدمہ سر ایلین کی عدالت میں نہ رہے ۔اس کی سماعت بخشی ٹیک چند کی عدالت میں ہو ۔اور یہ سر ایلین کے فائدے کے لئے ہے کہ وہ اس مقدمہ کو نہ سنیں ۔ورنہ دیوان سنگھ سر ایلین کی عدالت میں کہے گا کہ اس کو اس عدالت سے انصاف کی امید نہیں ہے ۔اور مقدمہ اس طرح بخشی ٹیک چند کی عدالت سے تبدیل کیا گیا ہے ۔جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ سر ایلین براڈوے اور لاہور ہائی کورٹ دونوں کی تمام ہندوستان کے اخبارات اور پبلک میں مٹی پلید ہوگی ۔

سر شادی لال کا یہ جواب سن کر سر ایلین براڈوے کے ہوش ٹھکانے آگئے ۔مقدمہ بخشی ٹیک چند کی عدالت میں رہا ۔تھوڑے وقفہ کے بعد ہم لوگ بخشی ٹیک چند کی عدالت میں پہنچے ۔مقدمہ شروع ہوا ۔نواب بھوپال کی طرف سے مسٹر کارڈن نوڈ ،خان عبدالرحمٰن وغیرہ وکیل تھے ۔اور ایڈیٹر ریاست کی طرف مسٹر پٹ میں ،سردار بہادر بھگوان سنگھ اور مسٹر توکلی ،تین روز بحث ہوئی ۔تین روز کی کاروائی کے بعد جسٹس بخشی ٹیک چند نے ایڈیٹر ریاست کی نگرانی منظور کرتے ہوئے مسٹر ایسر کا وہ فیصلہ بحال رکھا ،جس میں مسٹر ایسر نے لکھا تھا کہ مقدمہ جھوٹا اور بے بنیاد ہے ۔اور نواب بھوپال کے نمائندوں نے نواب بھوپال کی طرف سے دیوان سنگھ کو نقصان پہنچانے اور اخبار ریاست کو کچلنے کے لئے مقدمہ کی سازش اور جعلی دستاویز عدالت میں پیش کیں ۔

انگریزی زبان کے ایک مشہور مصنف نے اپنی ایک کتاب میں

لکھا ہے کہ:

کامیاب لوگوں کی زندگی دنیا میں قمار بازی کی حیثیت رکھتی ہے ۔

جس میں انتہائی نفع اور انتہائی نقصان دونوں ممکن ہیں ۔

انگریزی کے اس مصنف کے قول کے مطابق ایڈیٹر ریاست کی تو تمام زندگی قمار بازی ہی میں گزری ہے ۔چاہے یہ سیاسی تھی یا عداتی ۔اور اس قمار بازی میں قدم قدم

پر خطرہ کو لبیک کہا۔ اس سے فائدے بھی پہنچے اور نقصان بھی۔ چنانچہ اگر سر شادی لال کو خط لکھنے اور سر ایلن براڈوے کی عدالت میں عدم تعاون کرنے کے فیصلہ کی عدالتی قمار بازی نہ کی جاتی اور ایڈیٹر ''ریاست'' خطرہ میں نہ کودتا تو یہ مقدمہ بخشی سر ٹیک چند کے ہاتھوں فیصل نہ ہوتا۔ اور یہ سر ایلن براڈوے کی عدالت میں رہتا، جس کا نہ معلوم نتیجہ کیا ہوتا۔ جو لوگ دنیا میں کامیابی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ وہ جگہ جگہ قمار بازی کا ثبوت دیں۔ اور اپنے لئے خطرات برداشت کریں۔ کیونکہ گو ان قمار بازیوں میں نقصان کا بھی خدشہ ہے۔ مگر کامیابی بھی صرف قمار بازی اور خطرات کو لبیک کہنے میں ہی ہے۔ اور وہ لوگ زندگی میں ہمیشہ ناکام و نامراد رہیں گے جو خطرات کو لبیک کہنے کی جرات نہیں رکھتے۔

گناہوں کی سزا

ایڈیٹر ''ریاست'' نہ تو خدا پر یقین رکھتا ہے اور نہ خدا سے منکر ہے۔ اور نہ اس نے کبھی یہ معلوم کرنے کی کوشش کی ہے کہ خدا ہے یا نہیں۔ یا اس دنیا کو چلانے والا خدا ہی ہے۔ یا کوئی اور قدرت۔ مگر وہ تین باتوں کا قائل ضرور ہے۔ (۱) جوتش یعنی ستاروں کی گردش کا اثر انسانوں پر (۲) پچھلا اور آئندہ جنم یعنی مسئلہ تناسخ (۳) دعا یا بددعا کا اثر یعنی اس کے خیال، یقین اور تجربہ میں ستاروں کا اثر ہوتا ہے۔ جو جوتش کے ذریعہ معلوم کیا جا سکتا ہے۔ اس جوتش کے ذریعہ ہی انسان معلوم کرسکتا ہے کہ وہ پچھلے جنم میں کیا تھا؟ کون تھا اور کہاں کا رہنے والا تھا؟ اور آئندہ جنم کہاں ہوگا۔ اور دعاؤں اور بددعاؤں کا اثر لازمی ہے۔ چاہے وہ کسی صورت میں اور کب ہو؟ چنانچہ گناہوں کی سزا میں وہ ایک واقعہ لکھتا ہے۔

مرحوم لالہ رام رچھپال سنگھ شیدا سابق ایڈیٹر ''ہندوستان'' لاہور بہت مخلص اور محبت کے بزرگ و دوست نواز شخصیت تھے۔ اور ایڈیٹر ''ریاست'' پر ہمیشہ کرم فرماتے تھے۔ یہاں تک کہ اپنے بال بچوں کی خواہش کی پرواہ نہ کرتے ہوئے بھی دہلی آتے اور ایڈیٹر ''ریاست'' کے ہاں چھ چھ ماہ قیام کرتے۔ اور ان کے صاحبزادگان کو ہمیشہ یہ شکایت رہتی کہ آپ اتنے عرصہ تک بڑھاپے میں خاندان کے ممبروں سے دور دہلی میں رہتے ہیں۔ جب شیدا صاحب یہاں تشریف رکھتے تو میں شام کو ہر روز ان کی موٹر میں سیر کے لئے دہلی، نئی دہلی اور قرب و جوار کی سڑکوں پر سیر کے لئے لے جاتا تھا۔ اور کبھی کبھی مہینہ میں ایک ادھ بار ہم دو چار گھنٹہ کے لئے دہلی سے دور میرٹھ وغیرہ بھی چلے جاتے۔ ایک روز شام کا وقت تھا۔ میں شیدا صاحب سردار بھگوان سنگھ لونگو والیہ سیکرٹری پنجاب سٹیٹس پیپلز کانفرنس مسٹر محمد یوسف جمالی اور لالہ امیر چند کھنہ شام کے وقت چائے پی رہے تھے کہ فیصلہ ہوا کہ آج میرٹھ سیر کے لئے چلیں۔ چنانچہ ہم پانچوں کار میں میرٹھ کے لئے روانہ ہوگئے۔ میرٹھ کے راستہ میں جب بڑی نہر کے

دوسری طرف پہنچے تو کسی نے کہا کہ جنگل کی تازہ ہوا کا لطف لینے کے لئے تھوڑی دیر سڑک کے کنارے بیٹھا جائے، جہاں چند درخت اور ایک گڑھا تھا۔ ہم نصف گھنٹہ کے قریب بیٹھے تھے کہ پاس کی جھاڑیوں سے ایک خرگوش نکلا۔ ایڈیٹر ''ریاست'' نے جب اس خرگوش کو دیکھا تو اس نے دفعتاً شیدا صاحب کی لکڑی جو کافی موٹی تھی۔ اٹھا کر اس خرگوش کے ماری۔ لکڑی خرگوش کو لگی اور خرگوش لنگڑاتا ہوا۔ یا اس کی کوئی ہڈی ٹوٹ گئی یا یہ مر گیا۔

اس کے بعد ہم لوگ میرٹھ گئے۔ وہاں ایک کانگرسی دوست مل گئے۔ شیدا صاحب کو گانا سننے کا بہت شوق تھا۔ اور آپ اکثر راگوں اور راگنیوں سے واقف تھے۔ ان کانگرسی دوست کے ساتھ ہم بازار گئے۔ سیر کرتے رہے اور ایک جگہ گانا سنا۔ گانا سننے کے بعد اس کانگرسی دوست کے ہاں کھانا کھایا۔ اور رات کو گیارہ بجے کے قریب موٹر ہی میں واپس دہلی کے لئے روانہ ہوئے۔ سردی کا زمانہ تھا۔ اور غالباً نومبر یا دسمبر کا مہینہ تھا۔ سڑکوں پر موٹروں بیل گاڑیوں کی آمد و رفت کم تھی۔ میں موٹر کو پینتالیس میل کی رفتار سے چلا رہا تھا۔ کیونکہ چالیس میل کا سفر تھا اور خیال تھا کہ گھر جا کر آرام کریں۔ موٹر تیز رفتاری کے ساتھ جا رہی تھی کہ میں نے دیکھا کہ سڑک کے بائیں طرف ایک بیل گاڑی جا رہی ہے۔ چونکہ وہ بیل گاڑی سڑک کے بائیں طرف تھی۔ اس لئے میں نے رفتار کم نہ کی۔ مگر جس وقت موٹر بیل گاڑی کے قریب پہنچی تو تیز روشنی کو دیکھ کر بیل چونک اٹھے اور وہ گاڑی چلانے والے سے بے قابو ہو کر داہنی یعنی سڑک کے درمیان کی طرف مڑے۔ اب اس وقت میں اگر موٹر کو روکتا نہیں تو وہ سیدھی جا کر بیل گاڑی کو لگتی۔ چنانچہ میں نے فوراً بریکوں کو زور سے دبایا۔ موٹر بہت تیز رفتاری سے جا رہی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بیل گاڑی تو بچ گئی مگر کار یک لخت کھڑے ہونے کے باعث سڑک سے پھسل گئی۔ جس کو سکڈ ہونا کہتے ہیں۔ کار کو سخت دھکا لگا۔ شیدا صاحب اچھل کر زمین پر گرے اور ان کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔ میرے دماغ پر چوٹ آئی۔ اور میں

بے ہوش ہو گیا۔ موٹر کے دروازے ٹوٹ گئے۔ اور ہم جا تو رہے تھے شمال سے جنوب کی طرف۔ مگر سلکڈ ہونے کے باعث موٹر کا رخ شمال کی طرف پھر گیا۔ چنانچہ لالہ امیر چند یوسف اور سردار بھگوان سنگھ نے مجھے بے ہوشی ہی کی حالت میں ہی موٹر کے نیچے سے نکالا۔ شیدا صاحب شدت درد سے بہت بے چین تھے۔ اور دیکھا گیا کہ ہم بالکل اسی جگہ اس وقت۔ اس حالت میں پڑے تھے۔ جہاں سے میرٹھ جاتے ہوئے گڑھے اور درختوں کے پاس بیٹھے تھے۔ اور جہاں میں نے شیدا صاحب کی لکڑی کے ساتھ خرگوش زخمی کیا تھا۔ ہم لوگ اسی بے بسی کی حالت میں نصف گھنٹہ تک وہاں ہی رہے۔ اتنے میں میرٹھ کی طرف سے ایک موٹر آتی دکھائی دی، یوسف صاحب نے سڑک پر کھڑے ہو کر موٹر کو روکنے کا اشارہ کیا۔ موٹر رک گئی۔ اس موٹر میں پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے ایک صاحب مسٹر ہریش چندر تھے۔ ان کو جب معلوم ہوا کہ میری موٹر ہے اور میں بے ہوش پڑا ہوں۔ تو انہوں نے مجھے اپنی موٹر میں ڈالا۔ میری موٹر کے دروازے اگرچہ ٹوٹ گئے تھے۔ مگر انجن وغیرہ درست حالت میں تھا۔ اور موٹر چل سکتی تھی۔

شیدا صاحب کو میری موٹر میں ڈالا گیا، جسے یوسف صاحب نے چلانا شروع کیا۔ آہستہ آہستہ دونوں موٹریں دہلی پہنچیں۔ شیدا صاحب کو تو موٹر سول ہسپتال لے گئی۔ جہاں ان کا فریکچر سیٹ کیا گیا۔ اور آپ دو ماہ کے قریب ہسپتال میں رہے۔ مجھے ہریش چندر جی میرے مکان پر لے آئے۔ مکان پر پہنچ کر مجھے چارپائی پر ڈالا گیا۔ اور ڈاکٹر بیری کو ٹیلی فون کیا۔ رات کو دو تین بجے کے قریب ڈاکٹر صاحب آئے۔ میں بے ہوش تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ کنکشن آف برین (دماغی حادثہ ہے) ہے۔ میں بھی دو ماہ تک چارپائی پر پڑا رہا اور علاج کراتا رہا۔ دو ماہ کے بعد ہم دونوں اچھے ہوئے۔ اس کے بعد شیدا صاحب اکثر کہا کرتے تھے۔ بے گناہ خرگوش کو دیوان سنگھ نے میری لاٹھی سے مارا تھا اور زخمی کیا تھا۔ اس لئے دونوں کو سزا ملی۔

اب سوال یہ ہے کہ اگر خرگوش کو مارنا یا زخمی کرنا گناہ نہیں، اور یہ حادثہ بھی اتفاقاً ہوا ۔تو اس کی کیا وجہ ہے کہ حادثہ عین اس جگہ ہوا جہاں ہم لوگ چند گھنٹے بیٹھے تھے اور جہان خرگوش زخمی ہوا تھا۔

ایڈیٹر ریاست کا ایمان ہے کہ ہر گناہ کی سزا ملتی ہے، چاہے وہ اس جہاں میں ملے یا دوسرے جہان میں ۔چاہے اس جنم میں ملے یا اگلے جنم میں فوراً ملے یا دیر میں ملے۔ چند ماہ یا چند سال بعد مگر ملتی ضرور ہے ۔مگر یہ ہو نہیں سکتا کہ انسانوں اور جانوروں (جن میں دکھ یا سکھ محسوس) کرنے کا احساس ہو۔ کی دعاؤں یا بددعاؤں کا اثر نہ ہو۔ اگر ہم کوئی گناہ کرتے ہیں ۔ایڈیٹر ریاست کے خیال میں گناہ صرف وہ ہے جو کسی کا دل دکھانے یا کسی کا حق غصب کرنے کی ذیل میں آئے تو اس کی سزا کے لئے ہمیں تیار رہنا چاہیئے۔

ریاستی رعایا اور اہل کاروں کی وفا شعاری

میں ریاست نابھ میں ملازم تھا۔ اور دو سو روپیہ ماہوار تنخواہ ملتی تھی۔ مہاراجہ کے دل میں نہ صرف میرے جرنلسٹ ہونے کی عزت تھی۔ بلکہ وہ ایک حد تک مجھے خیر خواہ بھی سمجھتا تھا۔ اور دوست بھی سمجھتے تھے۔ اس زمانہ میں مہاراجہ پر سیاسی بادلوں کی گھٹائیں چھا رہی تھیں۔ پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کا عتاب اور مہاراجہ پٹیالہ دشمن، جو چاہتے تھے کہ مہاراجہ نابھ سے انتقام لیں۔ پبلک غیر مطمئن، کیونکہ پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ اور دوسرے جھگڑوں کے باعث ریاست کی ایڈمنسٹریشن میں دل چسپی نہیں لیتے تھے۔ یہ تمام حالات مہاراجہ کے لئے بہت پریشانی کا باعث تھے۔ ایک روز مہاراجہ کو اطلاع ملی کہ جسٹس سٹوارٹ (جو نابھ اور پٹیالہ کے جھگڑوں کے متعلق تحقیقات کرنے کے لئے انبالہ میں جج مقرر ہوئے تھے۔) اس رپورٹ پر راجہ کو گدی سے معزول کرنا چاہتے تھے۔ یہ رپورٹ مہاراجہ کے لئے مزید پریشانی کا باعث ہوئی۔ ایک روز مہاراجہ کو اطلاع ملی اور اس نے اپنے پرائیویٹ سیکرٹری، فارن منسٹر، ہوم منسٹر اور دوسرے پرانے خاندانی اہلکاروں کو مشورہ کرکے طلب کیا۔ ریاستوں کے یہ لوگ جاہل، سازشی، نالائق اور پرانے ٹائپ کے سازشی۔ سیاسی جھگڑوں کو نپٹانے کے بالکل اہل نہ تھے۔ ان میں سے جن لوگوں کو پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے افسروں سے ذاتی واقفیت تھی۔ انہوں نے تو مشورہ دیا کہ پولیٹیکل ایجنٹ کے پاؤں پکڑ لیے جائیں۔ دوسرے جو تھے انہوں نے کہا سرکار آپ مہاراجہ ہیں، خودمختار ہیں، آپ کو کون ہاتھ لگا سکتا ہے۔ پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے ایجنٹوں کی حیثیت کیا ہے؟۔ اینٹ کا جواب پتھر سے دیجیئے۔ گورنمنٹ کا حوصلہ نہ ہوگا کہ آپ کی طرف نظر اٹھا کر بھی دیکھے۔ یہ مشورے ہو رہے تھے کہ اتنے میں اکالی لیڈروں اور ایک تعلیم یافتہ سادھو سنت تیجا سنگھ ایم، اے (جو مہاراجہ کے دوست تھے) کو علم ہوا۔ یہ لوگ حالات معلوم کرنے کے لئے نابھ پہنچے۔ ان لوگوں نے بھی مہاراجہ کو مشورہ دیا کہ گورنمنٹ کی پرواہ نہ کی جائے

۔تمام سکھ قوم آپ کے لئے مر مٹے گی۔ ان دو پارٹیوں (ایک گورنمنٹ سے صلح کرنے اور دوسری گورنمنٹ کی پرواہ نہ کرنے کا مشورہ دینے والی) کے درمیان مہاراجہ کوئی فیصلہ نہ کر سکتے تھے۔ صبح گورنمنٹ سے صلح کرنے کے حق میں ہیں تو شام کو اس کے خلاف مہاراجہ کئی روز تک اس ذہنی کش مکش میں مبتلا رہے۔ آخر ان تمام لوگوں پر آپ کے سابق اتالیق سردار بہادر بھائی کاہن سنگھ کی رائے غالب آئی کہ پولیٹیکل ایجنٹ کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا جائے۔ ان کے مشورہ سے کرنل منچن ایجنٹ گورنر جنرل پنجاب سٹیٹس کو ملنے کے لئے خط لکھا گیا۔ کرنل منچن اس وقت کسولی میں مقیم تھے۔ ان کا جواب آیا کہ فلاں دن کسولی میں مل سکتے ہو۔ اس جواب کے آنے کے بعد اکالی لیڈروں کا مشورہ پھر غالب آ گیا۔ مہاراجہ نے پھر چاہا کہ وہ کرنل منچن سے نہ ملیں۔ اس کے بعد بھائی کاہن سنگھ نے پھر کہا کہ وقت مقرر کر کے نہ ملنا اور زیادہ مصائب کا باعث ہوگا۔ مہاراجہ نے پھر ارادہ بدل دیا۔ آخر مہاراجہ ملاقات کے لئے مع اپنے پرائیویٹ سیکرٹری اور چند ساتھیوں کے موٹر میں کسولی تشریف لے گئے۔ کسولی جب پہنچے اور ملاقات ہوئی تو کرنل منچن نے بغیر کچھ سنے سب سے پہلے یہی کہا کہ آپ بطور ایجنٹ گورنر جنرل ریاست ہائے پنجاب مہاراجہ کو مطلع کرتے ہیں کہ یا تو گدی سے خود بخود دست بردار ہو جاؤ یا ریاست نابھ ہی نہیں بلکہ پنجاب بھی ہمیشہ کے لئے چھوڑ دو۔ اور معزولی کے زمانہ میں آپ کو ریاست نابھ سے دس فیصدی بطور الاؤنس ملے گا اور اگر یہ منظور نہیں تو کھلی عدالت میں معمولی ملزموں کی طرح مقدمہ چلوانے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ اس عدالت میں جو جرائم آپ کے ثابت ہوں گے۔ ان کی آپ کو معمولی ملزموں کی طرح سزا دی جائے گی۔ چاہے وہ قتل کے الزام میں پھانسی کی سزا ہی کیوں نہ ہو۔ مہاراجہ نابھ اس وقت تک حالات کو کوئی زیادہ اہمیت نہ دیتے تھے۔ ان کو خیال بھی نہ تھا کہ ایجنٹ گورنر جنرل یہ کہے گا۔ چنانچہ ایجنٹ گورنر جنرل کے یہ کہنے پر بھی آپ نے یہ سمجھا کہ کرنل منچن صرف دھمکی دے رہے ہیں اور خوف زدہ کرنا چاہتے ہیں

۔ورنہ گورنمنٹ ایسا نہ کرے گی۔مہاراجہ نے کہا آپ کے لئے ایسا کہنا مناسب نہیں۔ میں تو آپ کے ساتھ دوستانہ تعلقات کے لئے ہاتھ بڑھانے آیا ہوں۔کرنل منچن نے کہا کہ وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں گورنمنٹ کی اتھارٹی سے کہہ رہے ہیں۔مذاق نہیں کر رہے۔اگر چاہو تو سر جان تھامپسن پولیٹیکل سیکرٹری سے ٹیلی فون پر بات کرلو۔چنانچہ کسولی سے سر جان تھامپسن کا ٹیلی کا شملہ میں فون نمبر ملایا گیا۔اور سر جان سے بات ہوئی۔سر جان نے کہا کرنل منچن جو کہہ رہے ہیں وہ لارڈ ریڈنگ وائسرائے کے حکم سے کہہ رہے ہیں۔اس میں کوئی فرق نہیں ہر جان سے بات کرکے مہاراجہ کو یقین ہوا کہ حالات بالکل بدل چکے ہیں۔اور تباہی بالکل قریب ہے۔چنانچہ مہاراجہ کے دماغ پر اس گفتگو کا بہت برا اثر ہوا۔اور نابھ واپس آتے ہوئے ہمراہی اہل کاروں نے محسوس کیا کہ مہاراجہ اپنے دماغی توازن سے محروم ہو چکے ہیں۔

نابھ پہنچنے کے بعد شہر میں ماتی گھٹائیں چھا گئیں۔چاروں طرف حسرتیں برس رہی تھیں۔اہل کاروں کے پھر مشورے شروع ہوئے۔کچھ لوگ اس بات کے حق میں کہ گورنمنٹ کی دست برداری کو لبیک کہا جائے۔اور کچھ لوگ یہ چاہتے تھے کہ گورنمنٹ کی پرواہ نہ کی جائے۔چنانچہ کسولی جانے سے پہلے تو راجہ کی رائے دن میں دو بار بدلتی تھی۔یعنی صبح کچھ اور شام کچھ۔اب ایک ایک گھنٹہ کے بعد بدلنی شروع ہوگئی۔یعنی اگر اب مہاراجہ دست برداری کے لئے تیار ہیں تو ایک گھنٹہ بعد اس کے خلاف اور مقدمہ چلوانے کے حق میں۔پھر ایک ادھ گھنٹہ بعد دست برداری کے لئے تیار۔ کرنل منچن نے چند یوم کی مہلت دی تھی۔مہاراجہ کسی فیصلہ پر نہ پہنچ سکے۔یہ مہلت ختم ہونے والی تھی۔ریمانڈ آنے شروع ہوگئے۔تو آخر کرنل منچن کو خط لکھا گیا اور مہاراجہ نے شرائط قبول کرلیں۔یہ خط مہاراجہ کے انگریز موٹر گیراج سپرنٹنڈنٹ مسٹر اوگریڈی ممبر پارلیمنٹ کے بھائی تھے۔کو دیا گیا کہ وہ موٹر میں کسولی جاکر کرنل منچن کو دے دیں۔مسٹر اوگریڈی شام کو نابھ سے روانہ ہوئے اور مہاراجہ کے خیال میں پھر تبدیلی پیدا

ہوئی۔ چنانچہ رات کو ایک تیز رفتار موٹر میں دو اہل کار انبالہ چھاؤنی بھیجے گئے کہ وہ اوگریڈی کو مع خط واپس لے آئیں۔ یہ لوگ انبالہ چھاؤنی پہنچے اور اوگریڈی سے ہوٹل میں ملے اور اس سے کہا کہ کسولی جلدی چلے جاؤ کہ مبادا کوئی اور شخص نہ آ جائے۔ اوگریڈی صبح سورج نکلنے سے پہلے انبالہ چھاؤنی سے چلا اور تین چار گھنٹہ میں کسولی پہنچ گیا۔ اس نے مہاراجہ کے ہاتھ کا لکھا ہوا دست برداری کا اقرار نامہ کرنل منچن کے حوالہ کر دیا۔ کرنل منچن نابھ کے لمحہ لمحہ کے حالات سے واقف تھے۔ اور مہاراجہ کے بعض معتمد ترین اہل کاران کے ساتھ ملے ہوئے تھے۔ وہ اس خط کے انتظار میں تیار بیٹھے تھے۔ خط کے پہنچتے ہی انہوں نے انبالہ چھاؤنی کے فوجی افسروں سے فوج تیار کرنے کے لئے ٹیلی فون پر کہا۔ شملہ پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کو ٹیلی فون کر کے مسٹر اوگلوی جو بعد میں گورنمنٹ آف انڈیا کے ڈیفنس سیکرٹری تھے۔ کو انبالہ بھیجنے کے لئے کہا۔ انبالہ پہنچنے کے بعد کرنل منچن مع مسٹر اوگلوی اور گورکھا انگریزی پلٹن کے پٹیالہ پہنچے۔ وہاں تھوڑی دیر قیام کیا اور مشورے ہوئے۔ اور یہ تمام قافلہ رات کو چار بجے نابھ پہنچ گیا۔ نابھ پہنچنے کے بعد گورکھا اور انگریزی پلٹن شہر کے دروازوں پر، قلعہ پر، خزانہ پر، بارود خانہ پر، نابھ کی ریاستی پلٹن کی بارکوں پر اور ہیرا محل جہاں مہاراجہ رہتے تھے۔ کے ارد گرد تعینات کر دی گئی۔ کیونکہ کرنل منچن کو راجہ نابھ کے بعض غدار اہل کاروں نے اطلاع دی تھی کہ اکالی بہت بڑی تعداد میں نابھ جمع ہو چکے ہیں۔ جگہ جگہ انگریز اور گورکھا فوج مقرر کرنے کے بعد کرنل منچن مع مسٹر اوگلوی اور مع ایک فوجی افسر کے ہیرا محل کے باہر ایک پھاٹک پر گئے۔ اور پہرہ والے سپاہیوں سے کہا کہ آپ پولیٹیکل ایجنٹ ہیں۔ مہاراجہ سے ملنے کے لئے محل میں جانا چاہتے ہیں۔ پہرہ والے نے جواب دیا کہ جب تک مہاراجہ کا حکم نہ ہو، اندر آنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ چنانچہ اس پہرہ والے نے مہاراجہ کے اے ڈی سی ڈاکٹر وریام سنگھ کو بلایا اور اے ڈی سی محل کے اندر گیا اور اطلاع ملی کہ کرنل منچن آئے ہیں۔ مہاراجہ نے کہا لے آؤ۔ کرنل منچن مہاراجہ

کے پاس پہنچے تو کہا نابھ چھوڑنے کے لئے تیار ہو جائیے۔

میں اس روز صبح چھ بجے کے قریب اپنے مکان میں ضروریات سے فارغ ہوا ہی تھا کہ ایک آدمی جو میرے پڑوس میں رہتا تھا۔ گھبرایا ہوا آیا اور بولا کہ شہر کے دروازوں پر انگریزی فوج کا پہرہ ہے۔ اور شہر میں گورکھا فوج بندوقوں کے ساتھ گشت لگا رہی ہے۔ یہ خبر میرے لئے بالکل خلاف توقع تھی۔ میں نے فوراً کپڑے پہنے اور حالات معلوم کرنے کے لئے بازار میں گیا تو دیکھا کہ جگہ جگہ لوگ اکٹھے ہو رہے ہیں۔ اور تعجب اور پریشانی کی حالت میں ہیں۔ میں سوچتا تھا کہ اصل حالات کا کس سے پتا لوں۔ ایک دوست کے ہاں گیا تو معلوم ہوا کہ کرنل منچن آٹھ بجے قلعہ میں ایک شاہی دربار کر رہے ہیں۔ جہاں گورنمنٹ کا اعلان سنایا جائے گا اور حکم دیا گیا ہے کہ ہر سرکاری آدمی وہاں موجود ہو۔ اور ہیرا محل میں کسی کو بھی جانے کی اجازت نہیں۔ میں حیران تھا کہ یہ کیا ہو گیا۔ اپنے مکان پر واپس آیا۔ اتنے میں ایک بنگالی دوست مسٹر ہری پرشاد سور (جو نابھ سیکرٹریٹ میں اسٹنٹ سیکرٹری تھے۔) آئے۔ وہ بھی پریشان تھے کہ اب کیا ہو گا؟۔ میں نے کہا جہاں ملاح تباہ ہوا۔ وہاں کشتی کی سواریاں بھی غرق ہوں گی۔ مہاراجہ کی ذاتی دوستی اور مہربانی کے باعث ہم لوگ یہاں تھے۔ اب یہاں سے چلے جائیں گے۔ ایک دو اور دوست بھی آئے۔ چونکہ حکم تھا، اس لئے ہم قلعہ میں پہنچے۔ وہاں ریاست کے تمام ملازم موجود تھے اور دربار ہال میں کرسیاں بچھا دی گئی تھیں۔ ہر شخص کا چہرہ اداس اور اترا ہوا تھا۔ کرنل منچن مسٹر اوگلوی کے ساتھ دربار میں آئے اور آتے ہی کہا کہ مہاراجہ نابھ گدی سے دست بردار ہو چکے ہیں۔ کوئی شخص آئندہ مہاراجہ کو ریاست کا حکمران نہ سمجھے۔ اور جو شخص آئندہ مہاراجہ کا وفا شعار ہو گا۔ یا ان کے ساتھ تعلق رکھے گا۔ اسے سخت سزا دی جائے گی۔ اس دربار میں ہی اہل کاروں سے پتا چلا کہ مہاراجہ نو بجے نابھ سے ہمیشہ کے لئے بذریعہ موٹر روانہ ہو جائیں گے۔

قلعہ سے نکلنے کے بعد میں پریشان تھا کہ اب کیا کرنا چاہیئے، پولیٹیکل ایجنٹ نے حکم دیا تھا کہ کوئی شخص ہیرا محل نہیں جا سکتا۔ میں مہاراجہ کے صرف ذاتی تعلقات کی بنا پر نابھ میں آیا۔ اور ملازم ہوا تھا۔ میرے سوا مہاراجہ کا کسی سے کوئی تعلق نہ تھا۔ مہاراجہ اس حالت میں جلاوطن کیے جا رہے تھے۔ کس قدر کمینہ پن اور فرض ناشناسی ہوگی کہ میں ان کی روانگی کے وقت بطور ہمدردی ہیرا محل بھی نہ جاؤں۔ میں قلعہ سے اپنے گھر کو چلا۔ اور میرا ذہن ان خیالات میں غرق اور پولیٹیکل ایجنٹ کے حکم اور مہاراجہ کو الوداع کہنے کی فرض شناسی کی کش مکش میں مبتلا تھا۔ میں اس پریشانی اور آنسوؤں سے ڈبڈباتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ اپنے مکان کے قریب جو ہیرا محل کے راستہ میں تھا۔ پہنچا تو میرے پاؤں نے گھر چلنے سے انکار کر دیا۔ میں سیدھا ہیرا محل جانے کو مجبور ہو گیا۔ محل کے باہر پھاٹک پر پہنچا تو سب سے پہلے پہرہ والے نے بندوق پر ہاتھ رکھ کر حسب دستور سیلوٹ کہا (ریاست میں دستور تھا کہ پہرہ دار ہر بڑی تنخواہ والے کو سیلوٹ کرتے تھے۔) پھر کہا اندر جانے کی اجازت نہیں۔ میں نے کہا میں ضروری کام سے جا رہا ہوں اور مجھے محل میں سے آدمی بھیج کر طلب کیا گیا ہے۔ میرے اس جواب پر پہرہ والے نے مجھے اندر جانے کی اجازت دے دی۔ میں اندر چلا گیا۔ تمام محل حسرت اور اداسی کا مرکز بنا ہوا تھا۔ ہر شخص غم زدہ اور مستقبل سے ناآشنا جیسے کشتی بھنور میں ہو۔ اور نہ کہا جا سکتا ہو کہ نتیجہ کیا ہوگا؟۔ ہیرا محل کے نیچے مہارانی کے بڑے بھائی سردار بلبیر سنگھ، سردار گوردیال سنگھ پرائیویٹ سیکرٹری، مہاراجہ کے ٹائپسٹ بابو فتح سنگھ اور مہاراجہ کے کچھ ذاتی ملازم کھڑے تھے۔ میں بھی غم زدہ حالت میں ان کے پاس کھڑا ہو گیا۔ مجھ سے پہلے کرنل منچن اور مسٹر اوگلوی وغیرہ محل کے اوپر مہاراجہ کے پاس پہنچ چکے تھے۔ مجھے وہاں پہنچے ہوئے پندرہ بیس منٹ ہوئے ہوں گے کہ اوپر سے پہلے مہارانی اور بچے اور بعد میں مہاراجہ کرنل منچن اور مسٹر اوگلوی وغیرہ انگریزوں کے ساتھ نیچے اترے۔ دو رولز رائس موٹر گاڑیاں تیار کھڑی تھیں۔ ایک سیاہ رنگ کی

دوسری سفید رنگ کی۔ پہلے مہارانی اور بچے اترے اور وہ سفید رنگ کی گاڑی میں سوار ہوئے۔ اس کے بعد مہاراجہ سیاہ رنگ کی گاڑی میں سوار ہوئے۔ تو کرنل منچن نے ایک انگریز انسپکٹر پولیس کو مہاراجہ والی گاڑی میں ڈرائیور کے ساتھ بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ یہ انگریز موٹر میں ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گیا۔ اور یہ گاڑی بھی مہارانی والی گاڑی کے بعد روانہ ہوگئی۔ یہ منظر کس قدر دردناک تھا۔ نابھ کا حکمران اپنی ریاست کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر جلاوطن ہو رہا ہے۔ مگر اس کے سینکڑوں خاندانی اہل کاروں، بڑی بڑی تنخواہ پانے والوں ملازموں، وزراء اور ساتھ مر مٹنے کا دم بھرنے والے نمک خواروں میں سے کوئی بھی ایسا نہ تھا کہ جو اس کو الوداع کہنے کے لئے ہیر امحل پہنچتا۔ یا کم از کم راستہ میں سڑک پر ہی الوداع کہتا۔

مہاراجہ کے جانے کے بعد ہیر امحل کے ملازموں سے جو حالات معلوم ہوئے۔ ان میں ایک دل چسپ واقعہ یہ بھی ہے کہ مہاراجہ جب کسولی سے واپس آئے اور ان کو اپنی معزولی کا یقین ہوگیا۔ تو انہوں نے اپنی نج کی تمام فائلیں اپنے دوستوں کے پچھلے تمام خطوط اور راز کے تمام کاغذات الماریوں کو خالی کر کے سب کو ہیر امحل کی سب سے اوپر والی چھت پر منگائے۔ اور ان کو آگ لگا دی۔ ان کاغذات کو ضائع کرنے کا مقصد یہ تھا کہ یہ کسی دوسرے کے ہاتھ نہ چلے جائیں۔ کیونکہ مہاراجہ انتہائی نیشنلسٹ تھے۔ اور ان کاغذات میں خط و کتابت کی وہ تمام فائلیں تھیں۔ جو ہندوستان کے نیشنلسٹ لیڈروں کے ساتھ مختلف موضوعات پر آپ کے ساتھ ہوئیں۔ کاغذوں کا یہ ڈھیر پندرہ بیس من ہوگا۔ جب یہ ڈھیر جل کر خاک ہوگیا اور اس کی راکھ کو اٹھایا جا رہا تھا۔ تو اس میں سے سونے کے کئی ہزار پونڈ یعنی گنیاں ملیں۔ ان گنیوں کو دیکھ کر خیال آیا کہ ان کاغذات میں کئی لاکھ روپے کے کرنسی نوٹ بھی جل گئے۔ اور یہ گنیاں اور نوٹ ٹکہ نابھ (موجودہ راجہ نابھ) کے پیدا ہونے پر رعایا کے لوگوں اور مہاراجہ کے دوستوں نے تمام ہندوستان سے بطور نذر بھیجے تھے۔ اور مہاراجہ نے بطور یادگار ان کو اسی طرح

خطوط کے ساتھ یادگار کے طور پر رکھ دیا تھا۔

مہاراجہ کی معزولی اور جلاوطنی کے بعد اب میرے سامنے سوال یہ تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیئے۔ مہاراجہ کے ملازموں اور اہل کاروں میں سے نوے فی صد لوگ مہاراجہ کے دشمن ہو گئے تھے۔ ان میں ہر شخص اس کوشش میں تھا کہ مہاراجہ کے بعد مہاراجہ کے ساتھ زیادہ سے زیادہ غداری کرے۔ تاکہ انگریز ایڈمنسٹراوگلوی کا منظور نظر ہو۔ پانچ چھ روز ان کو دیکھتا رہا۔ اور حیران تھا کہ وہ لوگ جو ایک ہفتہ پہلے مہاراجہ کے خوشامدی تھے۔ آج سب سے بڑے دشمن ہو رہے ہیں۔ کسی کا نہ کوئی ضمیر تھا اور نہ ایمان۔ چند لوگ جو فی الحقیقت مہاراجہ کے وفا شعار تھے۔ گھروں میں خاموش بیٹھ گئے۔ میرے لئے نابھ میں رہنا کیوں کر مناسب اور ممکن تھا۔ جب کہ میں صرف مہاراجہ کے باعث نابھ میں آیا تھا اور اب مہاراجہ ہی جلاوطن ہو گئے۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں؟۔ اور کدھر جاؤں۔ چنانچہ میں نے فیصلہ کیا کہ نابھ سے چلا جاؤں۔ سب سے پہلے ڈیرہ دون پہنچوں۔ مہاراجہ مصیبت میں ہیں اگر میری ان کو ضرورت ہے اور میں ان کے لئے مفید ہوسکوں تو ان کے پاس رہوں۔ ورنہ لاہور جا کر کسی اخبار میں ملازمت کر لوں۔ اپنی روانگی کے دن میں اپنے دوستوں سے ملنے گیا۔ دوستوں سے ملنے کے بعد سردار بہادر بھائی کاہن سنگھ جو مہاراجہ کے اتالیق رہ چکے تھے۔ سکھوں میں بڑی پوزیشن کے لیڈر، کئی کتابوں کے مصنف اور ادبی ذوق کے بزرگ تھے۔ سے بھی ملنے گیا۔ بھائی صاحب مجھ پر بھی بہت مہربانی فرماتے تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ میں آج رات جا رہا ہوں۔ پھر نہ معلوم زندگی میں کہاں ملنے کا اتفاق ہو؟۔ بھائی صاحب نے پوچھا کہاں جاؤ گے۔ میں نے کہا شاید لاہور کے کسی ادبی اخبار میں ملازمت اختیار کرلوں۔ بھائی صاحب نے مشورہ دیا کہ میں جاؤں تو استعفیٰ دے کر۔ بغیر استعفیٰ کے نہ جاؤں۔ تاکہ جانے کے بعد کوئی کاروائی میرے خلاف نہ ہو سکے۔ بھائی کاہن سنگھ بہت اچھے سیاست دان تھے۔ میں نے ان کے مشورہ پر عمل کیا۔ گھر پر آیا اور فل

اسکیپ کاغذ پر استعفیٰ لکھا۔ اور استعفیٰ لکھ کر شام کو مسٹر اوگلوی کے پاس پہنچا۔ مسٹر اوگلوی اس وقت دوسرے انگریزوں کے ساتھ گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ جب میں پہنچا تو وہ موٹر میں سوار ہوکر ہواخوری کے لئے باہر جانے والے تھے۔ میں نے وزیٹنگ کارڈ بھیجا۔ مجھے اندر بلالیا۔ میں نے جاتے ہی استعفیٰ دیا۔ انہوں نے کہا ملازمت کیوں چھوڑتے ہو؟ ۔ میں نے کہا میں یہاں صرف مہاراجہ کے ذاتی تعلقات کے باعث آیا تھا۔ اب مہاراجہ یہاں سے چلے گئے ہیں۔ میرا کسی سے کوئی تعلق نہیں ۔ نہ کسی سے کوئی واسطہ ہے۔ مسٹر اوگلوی نے کہا کہ نہیں نابھ کو اب اچھے اور لائق ملازموں کی ضرورت ہے۔ میں استعفیٰ نہ دوں۔ میں نے کہا کہ میں مہاراجہ کے چلے جانے کے بعد ملازمت کرنا غیرت اور حمیت کے خلاف اور ذلت سمجھتا ہوں۔ اس لئے میرا استعفیٰ منظور کرلیا جائے۔ مسٹر اوگلوی نے مجھے پھر سمجھایا اور جب میں نہ مانا تو آپ نے میرا استعفیٰ رکھ لیا اور کہا کہ دو ہفتہ کی رخصت منظور کی جاتی ہے۔ دو ہفتہ کے بعد اگر آپ چاہیں گے تو آپ کا استعفیٰ منظور کرلیا جائے گا۔ رخصت کی اس منظوری کے بعد میں واپس گھر آیا۔ گھر میں فرنیچر وغیرہ سامان بہت کافی تھا۔

مجھے یہی معلوم نہ تھا کہ کہاں جاؤں گا۔ سامان کہاں لے جاتا۔ ضروری اور مختصر سا سامان اپنے ساتھ لیا باقی سامان اسی مکان میں بند کرکے ایک دوست پنڈت دیو نانک کے سپرد کیا۔ اور رات کی گاڑی پر سوار ہوکر اگلے روز ڈیرہ دون مہاراجہ کے پاس پہنچا۔ مہاراجہ سے ملا اور کہا کہ اگر آپ کو میری ضرورت ہو اور میں مفید ہوسکوں تو تنخواہ کا کوئی سوال نہیں۔ بغیر تنخواہ کے جب تک آپ چاہئیں گے آپ کے پاس رہوں گا۔ اور اگر آپ میرا یہاں رہنا مناسب نہ سمجھیں تو میں لاہور چلا جاؤں گا اور کسی اخبار میں ملازمت کرلوں گا۔ مہاراجہ نے کہا اس معزولی کے خلاف اکالی ایجی ٹیشن شروع ہوچکی ہے۔ اگر میں مہاراجہ کے پاس رہا تو گورنمنٹ شاید یہ خیال کرے کہ اکالیوں اور مہاراجہ کے درمیان میں ایجی ٹیشن پیدا کرنے کا ایک ذریعہ ہوں۔ اس لیے دو تین ماہ کے

لئے اپنے گھر چلا جاؤں اور دو تین ماہ بعد پھر ڈیرہ دون آ کر مہاراجہ کے پاس رہوں۔ اس پروگرام کے فیصلہ کے بعد مجھے مہاراجہ نے ایک ضروری پیغام دے کر نظام دکن کے پاس حیدر آباد بھیجا۔ وہاں میں مہاراجہ کے خسر سردار پریم سنگھ جو وہاں نظام گورنمنٹ کے ملٹری سیکرٹری تھے سے ملا۔ دو تین روز وہاں، نظام دکن سے کیا امید تھی؟ ۔ وہ تو خود سہمے بیٹھے تھے۔ واپس ڈیرہ دون پہنچا۔ وہاں دو تین روز رہا۔ اور پہلے نابھ جانے اور وہاں سے گھر کا سامان مال گاڑی میں اپنے وطن حافظ آباد بھجوانے اور پھر خود وطن جانے کا پروگرام بنا لیا۔ مہاراجہ نے کہا کہ میں نابھ نہ جاؤں، شاید وہاں گرفتاری ہو جائے۔ میں نے کہا میری گرفتاری کیوں کر ممکن ہے جب کہ میرا کسی معاملہ سے تعلق ہی نہیں تھا۔ مہاراجہ کے کہنے کا میں نے خیال نہ کیا۔ ڈیرہ دون سے سوار ہو کر رات کو نابھ پہنچا۔ مکان پر پہنچا۔ صبح دو تین آدمیوں کو ساتھ لگا کر سامان بندھوانا شروع کر دیا۔ اس عرصہ میں جوں جوں دوستوں کو آنے کا علم ہوا، ملنے کے لئے آتے رہے ۔ نو بجے کے قریب سردار گوردیال سنگھ جو مہاراجہ کے پرائیویٹ سیکرٹری تھے۔ اور برٹش گورنمنٹ کے زمانہ میں وہاں ہوم ممبر تھے سے ملا۔ بارہ بجے کے قریب دوسرے دوستوں سے باتیں کر رہا تھا کہ نیچے باہر سے کسی نے آواز دی۔ نیچے جھانک کر دیکھا تو نیچے سپرنٹنڈنٹ پولیس مع دو سب انسپکٹروں اور کئی کانسٹیبلوں کے ساتھ موجود ہیں۔ مجھے نیچے آنے کے لئے کہا۔ میں نیچے گیا تو انہوں نے بتایا کہ مجھے مسٹر اوگلوی کے حکم پر گرفتار کیا گیا ہے۔ گرفتار کرنے کے بعد یہ لوگ مجھے لے گئے اور کئی ماہ بغیر مقدمہ رکھا گیا۔ میرے دوستوں نے وائسرائے پر اپنا اثر استعمال کیا۔ اور وائسرائے لارڈ ریڈنگ کے حکم سے بے گناہ سمجھ کر چھوڑ دیا گیا۔

ان حالات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ریاستوں کی رعایا اور وہاں کے سرکاری ملازم اور اہل کار چونکہ شخصی حکومت کے باعث مطمئن نہ تھے۔ ان کو والیان ریاست کے ہمدرد اور جان نثار کہنا ایک غلطی تھا۔

خودکشی کرنا بزدلی نہیں

حیدرآباد دکن اور ڈیرہ دون سے واپس آنے کے بعد جب نابھ میں میری گرفتاری ہوئی تو پولیس مجھے وہاں کی ایک نیم سرکاری بلڈنگ سرائے شادیات میں لے گئی۔ یہ بلڈنگ کئی لاکھ روپیہ کے مصارف سے بنائی گئی تھی۔اس کے لیے نصف روپیہ تو مہاراجہ نابھ نے دیا تھا۔اور نصف پبلک کے ذریعے چندہ سے جمع کیا گیا تھا۔ اس میں بہت وسیع ہال اور متعدد چھوٹے چھوٹے کاٹیج نما رہائشی کمرے ہیں۔جن کے ساتھ غسل خانے اور باورچی خانے بھی ہیں۔ یہ عمارت ریاست کی سرکاری اور پبلک دونوں قسم کی ضروریات کے لئے استعمال ہوتی ہے۔یعنی سرکار کے مہمان بھی اس میں ٹھہرتے ہیں اور پبلک وغیرہ میں کسی کی شادی وغیرہ ہو تو براتیں بھی اس میں قیام کرتی ہیں۔ چنانچہ مسٹر پرشوتم داس ٹنڈن (ممبر پارلیمنٹ) نابھ میں ملازم تھے۔تو اس بلڈنگ ہی میں رہتے تھے۔مسٹر ایس رنگا آئر بھی طویل مدت تک اس میں رہے۔ اور میں بھی جب ملازم ہوا تھا تو دو ماہ کے قریب اسی بلڈنگ میں سرکاری مہمان کے طور پر رہا تھا۔ جب میری گرفتاری ہوئی تو لالہ نتھو رام جو انگریزی علاقہ میں سب انسپکٹر پولیس تھے۔اور نابھ کے اس انقلاب کے فوراً بعد ریاست نابھ کے انسپکٹر جنرل پولیس مقرر کیے گئے۔(جو بعد میں رائے بہادر اور دہلی میں سٹی مجسٹریٹ تھے۔) کا دفتر اور رہائش بھی اسی بلڈنگ میں ہی تھی۔ چنانچہ پولیس نے مجھے لالہ نتھو رام کے سامنے پیش کیا۔تو آپ نے بتایا کہ میں ایڈمنسٹریٹر کے حکم سے گرفتار کیا گیا ہوں۔میں نے الزام اور دفعہ پوچھی تو جواب ملا۔ کچھ نہیں بتایا جا سکتا۔ چنانچہ پولیس مجھے اس بلڈنگ کے کونے کے ایک کاٹیج میں مجھے لے گئی۔ میرا بستر منگا لیا گیا۔اور چار کانسٹیبل اور ایک ہیڈ کانسٹیبل کا پہرہ لگا دیا گیا۔ کہ نہ تو میں اس نظر بندی سے باہر جاؤں اور نہ ہی کوئی مجھ سے ملنے آئے۔

ریاستی پولیس کے کانسٹیبل جن کی تمام زندگی ہی غلامی میں گزری۔شاید آٹھ

،دس ،دس روپیہ ماہوار تنخواہ پاتے تھے۔ یہ لوگ لگائے گئے تھے مجھ پر پہرہ کے لئے۔ مگر ان لوگوں کی ہمدردی میرے ساتھ تھی۔ بے چارے اس کوشش میں رہتے کہ میں خوش رہوں۔ یہ لوگ شہر میں درپردہ میرے پیغام لاتے اور لے جاتے تھے۔ چنانچہ اس نظر بندی اور کڑی نگرانی میں ہی میرے اور مہاراجہ نابھ کے درمیان میرا پیغام رسانی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اور ایک آدمی مقرر کر لیا گیا کہ جو نابھ سے ڈیرہ دون جائے اور ڈیرہ دون سے نابھ آئے۔ میں مہاراجہ نابھ کو اس نظر بندی میں ہی مہاراجہ کو تفصیل کے ساتھ نابھ کے تمام حالات کی اطلاعیں اس حراست یا نظر بندی سے ہی بھیجتا رہتا۔ کہ نئی برٹش ایڈمنسٹریشن مہاراجہ کے خلاف کیا کر رہی ہے۔ میں اس بلڈنگ میں تین ماہ کے قریب رہا۔ چند روز مجھے ذہنی کوفت سی محسوس ہوئی۔ ایک سمکھ کانسٹیبل نے رائے دی کہ میں سکھنی صاحب (گورو گرنتھ صاحب کے ایک حصہ کا) پاٹھ کروں۔ چند روز سکھمنی پڑھتا رہا۔ مگر پاٹھ کرنے کو میرا جی نہ چاہا۔ ایک تو اس کی یہ وجہ تھی کہ میں نے زندگی بھر عبادت نہ کی تھی اور نہ کبھی پاٹھ کیا تھا۔ دوسرے اصولاً بھی کسی پاٹھ منتر یا کلام کو بار بار پڑھنا لاحاصل سمجھتا ہوں۔ وقت کو گزارنے کے لئے میں نے ہندی پڑھنا شروع کی۔ مکان پر میرے پاس ایک نہایت خوبصورت سپینل نسل کی لمبے کانوں والی سیاہ رنگ کی کتیا تھی۔ جس کا نام رانی تھا۔ میری گرفتاری کے بعد یہ رانی میرے مکان کے سامنے ایک گھر میں رہتی تھی۔ میں نے کانسٹیبل بھیج کر اس کو اپنے پاس منگا لیا۔ سپینیل نسل کے کتے فطرتاً بہت محبت کرنے والے جانور ہیں۔ اس رانی کو نہلانے ،کھانا کھلانے اور کھیلنے میں کافی وقت صرف ہو جاتا۔ اس طرح تاش اور کانسٹیبلوں کے ساتھ گپ بازی میں میرا وقت اچھی طرح گزرتا رہا۔

مجھے اس بلڈنگ میں گرفتار یا نظر بند ہوئے پندرہ روز ہوئے تھے کہ مہاراجہ کا ایک نفر یعنی ذاتی ملازم بھان سنگھ گرفتار کیا گیا۔ اور اس کو میرے کمروں کے قریب ہی اس بلڈنگ کے ایک کمرہ میں رکھا گیا۔ میں نے پتا لیا تو معلوم ہوا کہ اس نے مہاراجہ کے

خلاف سخت بیان دیا ہے۔اور اپنے اس بیان میں مہاراجہ کے خلاف سخت الزام لگائے ہیں۔میں نے اس بھان سنگھ کے ساتھ پیغام بازی شروع کر دی۔اور موقعہ دیکھ کر کبھی کبھی اس سے بات بھی کر لیتا ۔کیونکہ اس کے اور میرے کمروں کے درمیان چند کمروں کا فاصلہ تھا۔میں نے ایک روز اس سے پوچھا کہ کیا یہ سچ ہے کہ تم نے مہاراجہ کے خلاف بیان دیا ہے ۔اس نے کہا ہاں ۔میں نے کہا تم نے یہ غداری کیوں کی؟۔ اس نے بتایا کہ پولیس نے اسے بہت پیٹا تھا۔ چنانچہ پانچ سات روز کی گفتگو اور میرے سمجھانے کے بعد یہ اپنے بیان کی تردید پر آمادہ ہو گیا۔اس نے مہاراجہ کے نام ایک خط لکھا کہ اس نے جو بیان ایڈمنسٹریٹر کو دیا ہے ۔وہ بے بنیاد اور غلط ہے ۔اور اس سے یہ جھوٹا بیان جبراً لیا گیا ہے۔یہ خط میں نے اس سے لے کر ڈیرہ دون مہاراجہ کے پاس بھیج دیا۔

میں نے اس نظر بندی یا قید کی حالت میں لالہ نتھو رام سے کئی بار پوچھا کہ میری نظر بندی کی وجہ کیا ہے؟۔کوئی جواب نہ ملتا۔آخر ایک روز مجھے لالہ نتھو رام نے بلا بھیجا۔ میں ان کے پاس گیا تو انہوں نے کہا کہ مجھ پر الزام یہ ہے کہ میں نے مہاراجہ نابھ کے ساتھ مل کر مہاراجہ پٹیالہ کے خلاف بغاوت کی ۔اس الزام میں مہاراجہ پٹیالہ نے میرے وارنٹ گرفتاری جاری کیے ہیں ۔ ریاست پٹیالہ ایکسٹرا اڈیشن ایکٹ کے مطابق میرے نابھ سے بھیجے جانے کا مطالبہ کر رہی ہے ۔اور معاملہ ایجنٹ گورنر جنرل پنجاب کے زیر غور ہے۔

لالہ نتھو رام کے منہ سے یہ الفاظ سن کر مجھے احساس ہوا کہ معاملہ معمولی نہیں جیسا کہ میں سمجھتا تھا۔اگر پٹیالہ کے حوالہ کیا گیا تو زندگی بھر باہر نکلنا ممکن نہیں ہے۔

لالہ نتھو رام کے منہ سے یہ اطلاع سن کر میں اپنی نظر بندی کے کمرے میں واپس آ گیا۔بہت سخت بے چین تھا کہ کیا کرنا چاہیئے ۔میری فطرت ہے کہ جب تک کسی مشکل کام کے متعلق پروگرام نہ بنا لوں ۔ نہ کھا سکتا ہوں اور نہ ہی سو سکتا ہوں ۔

پروگرام تیار کرنے کے بعد مستقبل سے بے پرواہ ہوجاتا ہوں۔ میں رات کو سو بھی نہ سکا۔ اور نہ کھایا پیا۔ سامنے موت نظر آرہی تھی۔ اور موت ہی نہیں، بلکہ موت سے ہزار گنا زیادہ ہیبت ناک پٹیالہ جیل کے عذاب کا خوف تھا۔ میں نے سوچنے کے بعد فیصلہ کیا کہ اس نظر بندی سے فرار ہو جانا چاہیئے۔

اور اگر فرار نہ ہوسکوں تو پٹیالہ کو حوالہ کیے جانے سے پہلے اپنی زندگی ختم کرلوں۔ میں اصولاً خودکشی کو بزدلی نہیں سمجھتا، بلکہ بہت بڑی بہادر سمجھتا ہوں۔ کیونکہ موت جیسی خوف ناک شے سے بغل گیر ہونا بزدلی نہیں بہادری ہے۔ چنانچہ میں نے کانسٹیبلوں میں سے ایک کانسٹیبل چھوٹا سنگھ کو اپنے راز میں لیا۔ اور اس سے کہا کہ میرے سر میں درد ہے۔ میں تھوڑی سی افیون کھانا چاہتا ہوں۔ چھوٹا سنگھ بازار سے ایک پیسہ کی افیون لے آیا۔ دو دو دن کے بعد میں نے کئی بار پھر منگائی۔ اس طرح جب یہ افیون ایک انسان کو ہلاک کرنے کے لئے کافی ہوگئی تو میں نے اس کو کپڑے کے ایک ٹکڑے میں باندھ کر اپنے تکیے کے نیچے رکھا۔ اور تکیہ سی لیا۔ افیون کو اس طرح رکھنے کا علم میرے سوا کسی کو نہ تھا۔

حراست سے فرار ہونے کے متعلق میں نے چھوٹا سنگھ کو راز میں لیا اور اس سے مشورہ کیا تو چھوٹا سنگھ نے کہا کہ رات کو جب اس کا پہرہ ہو تو وہ دونوں بھاگ چلیں گے۔ جن کمروں میں ہم تھے۔ ان کے ساتھ ہی ایک زینہ تھا۔ یہ زینہ بند کر دیا گیا تھا۔ اس کے اندر ایک تالہ لگا ہوا تھا کہ کوئی آجا نہ سکے۔ اور مدت سے اس راستہ کی کبھی کوئی صفائی نہ ہوئی تھی۔ کیونکہ اس راستہ سے نہ کوئی آتا تھا اور نہ جاتا تھا۔ چھوٹا سنگھ دوسرے کانسٹیبلوں سے پوشیدہ اس زینہ تک گیا۔ اس کا تالا توڑا اور ایک رسی باہر کی طرف لگا دی۔ جب ہم فرار ہوں تو اسی رسی کو توڑ کر اندر سے دروازہ کھول کیا جائے۔ چھوٹا سنگھ کے ساتھ فراری کا پروگرام تیار کیا تو اس نے کہا نابھ سے جانے کے لئے وہ ایک تیز رفتار اونٹ کا انتظام کرسکتا ہے۔ میں نے کہا کیا کسی صورت سے موٹر کا انتظام

نہیں ہو سکتا۔ چھوٹا سنگھ نے اپنی بے بسی کا اظہار کیا۔ میں نے اس سے مشورہ کیا کہ کیا فراری کے پانچ سات روز تک وہ کسی کے ہاں ٹھہر سکتا ہے۔ اس نے کہا اس کا انتظام ہو سکتا ہے۔ ہم ابھی یہ پروگرام بنا ہی رہے تھے کہ وائسرائے نے رہا ہونے کا حکم دے دیا۔ ورنہ حراست سے فرار ہونے کے خدشہ سے بھی پہلے میں نے خودکشی کو لبیک کہنا تھا۔ چاہے اس کا نتیجہ کچھ ہی کیوں نہ ہوتا۔

افیون رکھنے کے بعد میں نے ایڈمنسٹریٹر کو خط لکھا۔ جس میں لکھا کہ مہاراجہ پٹیالہ میرے دشمن ہیں۔ برٹش گورنمنٹ کی یہ بے انصافی ہوگی اگر مجھے مہاراجہ پٹیالہ کے حوالہ کیا گیا۔ اگر گورنمنٹ یہ سمجھتی ہے کہ میں نے مہاراجہ نابھ کے ساتھ مل کر فی الحقیقت مہاراجہ پٹیالہ کے خلاف بغاوت کی ہے تو اس جرم کی جو زیادہ سے زیادہ سزا ہو۔ بغیر مقدمہ کے ہی اس سزا کو بھگتنے کے لئے تیار ہوں۔ مگر مجھے برٹش علاقے کے کسی جیل میں رکھا جائے۔ اور اگر میرا میرے دشمن مہاراجہ پٹیالہ کے حوالہ کرنا ضروری ہے تو میں پھر چیلنج کرتا ہوں کہ آپ میری لاش تو مہاراجہ پٹیالہ کے حوالہ کر سکتے ہیں۔ مگر زندہ دیوان سنگھ کو نہیں۔ کیونکہ موت کے تکلیف کے مقابلہ پر پٹیالہ جیل کا عذاب ہزار گنا زیادہ تکلیف دہ ہوگا۔

ایڈمنسٹریٹر کو یہ خط لکھنے کے بعد میں نے مہاراجہ نابھ کو تمام حالات لکھے اور ساتھ ہی یہ بھی لکھ بھیجا کہ اب شاید آپ سے اس جنم میں ملاقات نہ ہو۔ کیونکہ اگر پٹیالہ جیل بھیجا گیا تو پٹیالہ حدود میں پہنچنے سے پہلے دیوان سنگھ اس دنیا میں نہ ہوگا۔ میرے اس خط کو پڑھ کر مہاراجہ کے آنسو نکل آئے۔ اور انہوں نے اپنے دوست ممبران اسمبلی کو خط لکھے۔ کہ دیوان سنگھ پر اس طرح ظلم ہو رہا ہے۔ انہوں نے وائسرائے کو لکھا کہ راؤ بہادر چودھری لال چند آف رہتک (جو بعد میں پنجاب کے منسٹر اور ممبر پنجاب سروس کمشنر مقرر ہوئے) میرے بہت مخلص اور مہربان تھے۔ اور سر جان تھامپسن پولیٹیکل سیکرٹری کے گہرے دوست تھے۔ ان کو پیغام بھیجا اور تمام حالات بتائے۔ یہ سر جان

تھامپسن سے ملے اور دہلی میں کئی ایک دوست سرکاری ملازم تھے۔ ان کی معرفت کوشش کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آخر لارڈ ریڈنگ نے میرے اور نابھ کے نصف درجن کے قریب دوسرے اصحاب (جن پر بھی مہاراجہ نابھ کے ساتھ مل کر مہاراجہ پٹیالہ کے خلاف سیڈیشن پھیلانے یا بغاوت کرنے کا الزام تھا۔ کی فائل پر حکم لکھا کہ اگر دیوان سنگھ اور ان دوسرے لوگوں نے مہاراجہ پٹیالہ کے خلاف سیڈیشن میں حصہ لیا ہے تو اپنے آقا مہاراجہ نابھ کے حکم سے۔ اور ان کا یہ فعل اپنے آقا کی وفا شعاری سے قابل تعریف تھا۔ ان کا کوئی قصور نہیں لہذا فوراً رہا کیا جائے۔ لارڈ ریڈنگ نے یہ حکم جہاز میں لکھا جب کہ آپ برما کے دورہ سے واپس ہندوستان آرہے تھے۔ (اس زمانہ میں برما ہندوستان سے الگ نہ ہوا تھا۔) اور برما بطور ایک صوبہ کے وائسرائے کے ماتحت تھا۔ میرا ایک آدمی اطلاعوں کے لئے دہلی میں موجود تھا۔ وائسرائے جب دورہ سے دہلی آئے تو اس کو ایک کلرک سے معلوم ہو گیا کہ وائسرائے نے یہ فیصلہ کیا ہے۔ وائسرائے کے پہنچنے کے چار روز بعد مجھے یہ اطلاع نابھ میں پہنچی اور میں مطمئن ہو گیا۔

اس اطلاع کے پہنچنے کے ایک ہفتہ بعد ایک سب انسپکٹر پولیس میرے پاس پہنچا اور اس نے کہا کہ لالہ نتھو رام کے پاس چلیے۔ وہ بلاتے ہیں۔ میں نے چھوٹا سنگھ کانسٹیبل سے کہا کہ میرا بستر سامان وغیرہ باندھ کر رکھو۔ سب انسپکٹر کو حالات کا کچھ علم نہ تھا۔ وہ حیران کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ اس نے کہا کہ کچھ دریافت کرنے کے لئے بلایا گیا ہوں۔ ابھی تو پھر واپس آنا ہے۔ بستر وغیرہ کیوں بندھوا رہے ہو۔ میں نے جواب دیا، آپ کو علم نہیں مجھے پتا ہے کہ آج میری رہائی ہوگی۔ چنانچہ سب انسپکٹر مجھے لالہ نتھو رام کے پاس لے گئے۔ اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا، اور کرسی پر بیٹھنے کے لئے کہا اور آپ نے نہایت ہمدردی کے لہجہ میں کہا (جس طرح پولیس یا جیل کے افسر کسی ملزم کو رہا کرتے وقت ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں تا کہ یہ بعد میں مخالفت نہ کرے) فرمایا سردار صاحب آپ نے بہت تکلیف اٹھائی مگر کیا کیا جائے، میرا فرض ایسا تھا، میں

نے تو ایڈمنسٹریٹر کے حکم کی تعمیل کی، جو آپ کو اتنا عرصہ نظر بند رکھا۔ ورنہ آپ کی تو میرے دل میں بہت عزت ہے۔ اب گورنمنٹ کے حکم سے آپ کو رہا کیا جاتا ہے۔ میں نے جواب دیا۔ دنیا میں ہر شخص کو فرض ادا کرنا چاہیئے۔ معمولی بات ہے آپ اس کا کچھ خیال نہ کیجیئے۔ اس کے بعد لالہ نتھو رام نے پوچھا کہ اب رہائی کے بعد آپ کا کیا پروگرام ہے؟۔ میں نے جواب دیا نابھ آنے سے پہلے کاغذ سیاہ کر کے روٹی کماتا تھا۔ اور اب بھی کاغذ سیاہ کر کے روٹی کماؤں گا۔ لالہ نتھو رام نے کہا کہ دوستانہ رائے ہے کہ اب کسی ایجی ٹیشن میں حصہ نہ لیجیئے۔ آپ نے بہت تکلیف اٹھائی ہے۔ میں نے جواب دیا، بدنصیبی یا خوش نصیبی سے خدا نے رزق ہی ایجی ٹیشن میں لکھا ہے۔ تو کیا کریں، ایجی ٹیشن نہ کریں تو روٹی کہاں سے کھائیں۔ جرنلزم نام ہی ایجی ٹیشن کرنے کا ہے۔ لالہ نتھو رام نے کہا آپ صرف دوستانہ رائے دے رہے ہیں۔ میں نے جواب دیا افسوس ہے کہ میں آپ کی دوستانہ رائے قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔ چنانچہ لالہ نتھو رام نے مجھے سرکاری حکم سنایا کہ میں آئندہ کبھی ریاست نابھ میں داخل نہ ہوں۔ آپ نے پولیس کی ایک گارد طلب کی۔ یہ گارد مجھے ریلوے اسٹیشن لے گئی۔ میرا سامان بستر وغیرہ ریلوے اسٹیشن پہنچا دیا گیا۔ اور یہ گارد اس وقت تک ریلوے اسٹیشن پر موجود ہی رہی۔ جب تک کہ میں گاڑی پر سوار نہ ہو گیا۔ اور گاڑی چل نہ پڑی۔ گاڑی میں سوار ہونے کے بعد میں اگلے روز ڈیرہ دون پہنچا۔ مہاراجہ سے ملاقات کی۔ تمام حالات بیان کیے اور دس روز کے قریب مہاراجہ کے پاس رہا۔

ریاستوں کے مظالم اور برٹش حکام

”ریاست کو جاری ہوئے دو برس کے قریب ہو چکے تھے۔میرے پاس نالہ گڑھ سے بذریعہ رجسٹری ایک خط پہنچا۔ جو بارہ یا سولہ صفحوں کا تھا۔اس خط میں رانی نالہ گڑھ (موجودہ راجہ نالہ گڑھ جو حال میں پٹیالہ یونین میں منسٹر تھے۔) کی والدہ کے مصائب کا ذکر تھا۔ کہ وہ قید کی زندگی بسر کر رہی ہیں اور انتہائی تکلیف میں ہیں۔اور وہاں کا وزیر جو گورنمنٹ کا بھیجا ہوا سرکاری افسر تھا۔نہ صرف رانی کو بہت تنگ کر رہا تھا۔ بلکہ ریاست نالہ گڑھ کو بھی لوٹ رہا تھا۔اور پبلک بے حد پریشان ہے۔اس خط میں وزیر پر بہت سخت اور سنگین الزام لگائے گئے تھے۔اس خط کے ملنے پر میں سوچتا رہا کہ کیا کرنا چاہیئے۔کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔اگر ان الزامات کو شائع کرتا ہوں تو مقدمہ ہونے کا خوف ہے۔کیونکہ الزامات چاہے سچ ہوں۔ان کی سچائی کا ثبوت موجود نہیں تھے۔صرف یہ خط الزامات کو عدالت میں ثابت کرنے کے لئے کافی نہ تھا۔چاہے کتنی بھی ذمہ دار شخصیت کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا۔

میں چند روز سوچتا رہا۔اس کے بعد ایک اور خط ملا۔جس میں پہلے سے زیادہ تفصیل کے ساتھ حالات درج تھے۔اور کچھ اعداد و شمار دینے کے علاوہ لکھا تھا کہ رانی نالہ گڑھ کی زندگی خطرہ میں ہے۔کیونکہ راجہ نالہ گڑھ رانی کے خلاف ہے۔اور وزیر راجہ کے ساتھ مل گیا ہے۔اور کسی شخص کو بھی اجازت نہیں کہ وہ رانی سے مل سکے۔

اس خط کو پڑھنے کے بعد میں غور کرتا رہا کہ مجھے کیا کرنا چاہیئے۔جب ان حالات کے درست ہونے کے متعلق میری تسلی ہو گئی تو میں نے فیصلہ کیا کہ ریاست نالہ گڑھ کے مسلہ کو ہاتھ میں لینا چاہیئے۔اور اس وقت تک نہیں چھوڑنا چاہیئے۔جب تک وہاں کے مظالم کا خاتمہ نہ ہو۔میں نے ان خطوط میں سے الزامات کی ایک فہرست تیار کی۔اور اس فہرست کو ٹائپ کرایا۔اس ٹائپ شدہ فہرست کو لے کر میں شملہ گیا۔سوامی راما نند اس زمانہ میں کانگرس کے مشہور ورکر تھے۔اور شملہ کی ریاستوں کی پبلک میں بے

داری پیدا کرنے میں مصروف تھے۔ ان سے ملا۔ ان کی معرفت ریاست کے دوسرے لوگوں سے بات چیت کی۔ معلوم ہوا کہ ثبوت گو نہ ہوں مگر الزامات سب درست ہیں۔ جب ان الزامات کے متعلق مجھے تسلی ہو گئی تو میں ڈپٹی کمشنر (جو ریاست شملہ کا سپرنٹنڈنٹ بھی تھا۔) اور جس کے ماتحت ریاست نالہ گڑھ تھی کے دفتر میں گیا۔ وہاں معلوم ہوا کہ ڈپٹی کمشنر نام مجھے غالباً یاد نہیں۔ ان کا نام مسٹر ویکفیلڈ تھا) موجود ہیں۔ میں نے وزیٹنگ کارڈ بھیجا۔ ڈپٹی کمشنر نے اندر بلا لیا۔ میں نے سب سے پہلے پوچھا کہ ریاستوں کے متعلق گورنمنٹ کی کیا پوزیشن ہے۔ کیا حکام جیسا کہ وہ بیان کرتے ہیں۔ فی الحقیقت یہ چاہتے ہیں کہ ریاست کی بدانتظامی، رشوت اور مظالم بند ہوں۔ یا آپ کا اصل مقصد یہ ہے کہ ریاست کے مظالم اور بدانتظامی جاری رہے۔ میری یہ بات سن کر ڈپٹی کمشنر مسکرا دیا اور کہا کہ گورنمنٹ فی الحقیقت یہ چاہتی ہے کہ ریاستوں کی اصلاح ہو۔ ڈپٹی کمشنر کے یہ کہنے پر میں نے اپنی جیب سے نالہ گڑھ کے متعلق الزامات کی ٹائپ شدہ فہرست نکالی اور دے کر کہا کہ آپ مجھ پر یا کسی دوسرے شخص پر اعتبار نہ کیجیے۔ کسی دوسرے صوبہ سے یا اس صوبہ سے کوئی دیانتدار مگر ہوشیار شخص ہو جسے اس صوبہ میں کوئی نہ جانتا ہو بھیج دیجیے اور معلوم کیجیے کہ تمام کے تمام الزامات درست ہیں یا نہیں، اور اگر آپ کی تسلی ہو جائے کہ یہ الزامات سب کے سب درست ہیں تو آپ کا فرض ہے کہ اس ریاست کے اصلاح کے لئے قدم اٹھائیے۔ ڈپٹی کمشنر نے ان الزامات کی تحقیق کا وعدہ کیا اور میں واپس دہلی چلا گیا۔

دہلی پہنچے مجھے تین ہفتے ہوئے تھے کہ اس ڈپٹی کمشنر کا تار میرے پاس پہنچا کہ میں فلاں تاریخ سوموار کے دن گیارہ بجے دوپہر ان سے ملوں۔ میں سنیچر کی رات کو دہلی سے روانہ ہوا تو اتوار کی دوپہر کو شملہ پہنچا۔ وہاں لالہ ٹھاکر داس کے پنجاب ہوٹل میں قیام کیا اس روز سوامی رامانند وغیرہ دوستوں سے ملا۔ سوموار کو گیارہ بجے ڈپٹی کمشنر کے دفتر پہنچا۔ وزیٹنگ کارڈ بھیجا اور ملا تو ڈپٹی کمشنر نے بتایا کہ آپ نے گورنمنٹ ہند کے

انٹیلی جینس ڈیپارٹمنٹ کو لکھ کر وہاں سے ایک دیانتدار افسر کو بلایا تھا۔ اس کو تحقیقات کے لئے نالہ گڑھ بھیجا اور وہ وہاں بغیر کسی کو بتائے ایک ہفتہ کے قریب رہا۔ اس نے رپورٹ کی ہے کہ الزامات تمام کے تمام درست ہیں اس رپورٹ کو گورنر پنجاب کے پاس بھیجا گیا۔ وہاں سے حکم آیا ہے کہ اس وزیر کو معطل کر کے اس کے خلاف رشوت اور تغلب وغیرہ کے مقدمات چلائے جائیں۔ چنانچہ گورنمنٹ اس کو معطل کر کے اس پر مقدمہ چلانا چاہتی ہے۔ ان الزامات کے متعلق ثبوت دیا جائے جو مقدمہ میں بطور شہادت کام آسکے۔

ڈپٹی کمشنر کے اس انکشاف کو سن کر میں مطمئن تھا۔ مگر حیران کہ کیا کروں، اخبار کی مصروفیت۔ ایک دن کی فرصت نہیں، شملہ بھی بڑی دقت سے آیا تھا۔ میں نے ڈپٹی کمشنر سے کہا کیا آپ کا ضمیر مطمئن ہے؟۔ کہ یہ الزامات درست ہیں۔ ڈپٹی کمشنر نے بتایا کہ ہاں یہ الزامات درست ہیں۔ اور گورنمنٹ مقدمہ چلانے کے لئے ثبوت چاہتی ہے۔ میں نے کہا کہ اگر آپ کو الزامات کے درست ہونے کے متعلق یقین ہے تو میرا مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ آپ اس وزیر کا نالہ گڑھ سے تبدیل کر دیجئے۔ تا کہ رانی نالہ گڑھ اور وہاں کے عوام کے مصائب کا خاتمہ ہو۔ ڈپٹی کمشنر نے بار بار کہا کہ گورنمنٹ صرف تبدیل کرنے پر مطمئن نہیں مقدمہ چلانا چاہتی ہے۔ اور اس کے لئے ثبوت کی ضرورت ہے جو عدالت میں پیش ہو سکے۔ میں نے اپنی بے بسی کا اظہار کر دیا۔ اور کہا کہ نہ تو اس وقت میرے پاس کوئی ثبوت ہے اور نہ اتنا وقت ہے کہ نالہ گڑھ جا کر ثبوت مہیا کر سکوں۔ میرا جو فرض تھا۔ میں نے ادا کر دیا میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتا۔

اس ملاقات کے ایک ہفتہ کے اندر ہی معلوم ہو گیا کہ یہ وزیر جو گورنمنٹ کی ملازمت میں تھا اور بطور لینٹ آفیسر تھا۔ تنزل کر کے نالہ گڑھ سے واپس برٹش کے علاقہ میں بھیج دیا گیا ہے۔ اور نالہ گڑھ کی پبلک اور رانی کو اس سے چھٹکارا مل گیا ہے۔

میرا تجربہ ہے کہ اگر کوئی اخبار نویس ذاتی لالچ اور خوف سے بلند ہو کر ظلم کو دور کرنے کے لئے قدم اٹھائے تو گورنمنٹ کے انصاف پسند حکام بھی اس ظلم کو دور کرنے میں اس کی مدد کرتے ہیں۔ انگریز قوم انگریز اور ہندوستانی کے درمیان انصاف نہ کرتی تھی۔ مگر ہندوستانی اور ہندوستانی کے درمیان انصاف ضرور کرتی تھی۔ بشرطیکہ ہندوستانی ہی انصاف کی راہ میں روڑے اٹکانے کا باعث نہ ہوتے۔

اگروال ذہنیت

دہلی میں جب روزانہ ''رعیت'' جاری تھا تو دیو بند کے لالہ اوگرسین تشریف لائے ۔پہلے آپ کی بزازی کی دکان تھی اور آپ نے اپنا کاروبار بند کر دیا تھا۔آپ نے ''رعیت'' نے اشتہار دیا کہ آپ بہت تجربہ کار بزنس مین ہیں اور اگر کوئی آپ کے بزنس میں شریک ہونا چاہتا ہے تو روپیہ لگائیں ۔اشتہار کے نیچے چونکہ معرفت دفتر رعیت تھا۔اس لئے آپ اپنے خطوط لینے کے لئے دفتر ''رعیت'' تشریف لایا کرتے تھے ۔جب کبھی آتے صبح آئیں یا شام کو یا دوپہر کو دیکھتے کہ ایڈیٹر ریاست مصروف ہے۔آپ کچھ دیر بیٹھ کر باتیں بھی کرتے۔دس بارہ روز آتے رہے۔تو آپ نے فرمایا سردار صاحب کیوں اخبار میں وقت ضائع کر رہے ہو۔آپ اس قدر محنتی ہو۔اگر آپ میرے ساتھ بمبئی چلو تو وہاں تجارت کی جائے ۔میرے پاس بہت تجربہ اور روپیہ ہے ۔آپ شامل ہو جایئے۔ہم بمبئی میں لاکھوں روپیہ پیدا کریں گے ۔

لالہ صاحب کے اس خیال کی میں نے پرواہ نہ کی ۔کیونکہ اگر روپیہ پیدا کرنے کا سوال ہوتا تو میں نے تین چار سو کی میڈیکل پریکٹس چھوڑ کر جرنلزم کیوں اختیار کی ۔ لالہ صاحب اس کے بعد کبھی کبھی ملتے رہے ۔کیونکہ بے کار تھے ۔وقت گزارنے کے لئے ان کو کسی باتیں کرنے والے کی ضرورت ہوتی ۔اور میں بھی زیادہ محنت کے باعث تھک جاتا ۔تو لالہ جی کے ساتھ گپ بازی میں چند منٹ یا نصف گھنٹہ گزارنا ایک تفریح سمجھتا۔کچھ روز کے بعد خواجہ حسن نظامی نے کہا۔آپ ''رعیت'' کے لئے زیادہ گھاٹا برداشت نہیں کر سکتے ۔اس لیے اخبار بند کر دی اجائے ۔اس اخبار کی پوزیشن یہ تھی کہ اڑھائی سو روپیہ تو میں نے دیا تھا اور باقی خواجہ صاحب نے ۔اور فیصلہ یہ تھا کہ پورا ایک صفحہ تو خواجہ صاحب کی کتابوں کا اشتہار بغیر اجرت چھپے اور ایڈیٹر ریاست اپنے خرچ کے لئے ایک روپیہ روز لیں ۔اس کے بعد اگر نقصان ہو تو خواجہ صاحب پورا کریں اور اگر نفع ہو تو دونوں برابر کے شریک ۔خواجہ صاحب اس وقت

تک چھ سو روپیہ کا گھاٹا کھا چکے تھے۔ فیصلہ یہ ہوا کہ اخبار بند نہ کیا جائے کسی دوسرے کو دے دیا جائے۔ تاکہ ایڈیٹر ''ریاست'' اس میں کام بھی کرتا رہے اور اخبار بھی چلتا رہے۔ رعیت پہلے شیام لال گورو گھنٹال نے لیا۔ وہ شاید ایک ہفتہ بھی نہ چلا سکے۔ پھر واحدی صاحب نے اور پھر بھیا احسان الحق صاحب نے اور آخر میں اس اخبار کو بند کر دیا گیا۔ رعیت کے بند ہونے پر اب پھر یہ سوال پیدا ہوا کہ میرا مستقبل کیا ہو؟۔ لالہ اوگرسین ملا کرتے تھے۔ آپ سے فیصلہ ہوا کہ دونوں تجارت کے لئے بمبئی چلیں۔ میرے پاس چونکہ نہ سرمایا تھا۔ اور نہ میں بمبئی کی تجارت سے واقف تھا۔ میں نے کہا اور لالہ اوگرسین اس سے متفق ہو گئے۔ کہ میرا حصہ نہ ہو۔ ڈیڑھ سو روپیہ تنخواہ لوں۔ اور ان کے ساتھ بمبئی چلوں، ہم لوگ بمبئی آ گئے۔ وہاں موچی سٹریٹ میں ایک کمرہ دفتر کے لئے کرایہ پر لیا۔ لالہ اوگرسین بہت ہوشیار آدمی تھے۔ ایک بڑا گدا، بڑے بڑے تکیے، تھوڑا سا فرنیچر، گدے کے لئے سفید چادریں بہی کھاتہ کی کتابیں اور لوہے کی ایک الماری یعنی آہنی سیف لی۔ یہ سامان خریدا گیا، تاکہ ہم سیٹھ بچ سکیں۔ دکان کا نام سیٹھ اگرسین اینڈ کمپنی رکھا۔ اس نام کے فارم چھاپے گئے اور ٹیلی گرافک ایڈریس بھی ڈاک خانہ میں رجسٹرڈ کرا لیا گیا۔

دکان کا سامان وغیرہ ٹھیک ہونے کے بعد ہم نے لاہور سے ایک ڈائریکٹری منگائی۔ جس میں پنجاب کی تمام منڈیوں کے آڑھتیوں اور دکان داروں کے پتے تھے۔ ان پتوں پر میں نے خط بھیجنے اور سرکولیٹر بھیجنے شروع کیے۔ کہ یہ دکان بہت قابل اعتماد ہے اگر کوئی صاحب بمبئی سے کچھ منگانا چاہئیں تو ہم بہت کم آڑھت پر یہاں سے سامان بھیجتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ایک ہزار کے قریب سرکولیٹر بھیجے تھے کہ آرڈر آنے شروع ہوئے۔ کوئی شخص مصر کی کھجوریں منگا رہا ہے۔ کوئی بزازی اور کوئی کچھ، اور کوئی اپنا غلہ اور دوسرا سامان بمبئی میں فروخت کرنا چاہتا ہے۔ میں کام تو بہت محنت سے کرتا رہا۔ مگر میں نے محسوس کیا کہ مجھے اس کام میں کوئی دل چسپی نہیں ہے۔

پنجاب سے ایک شخص نے خط لکھا کہ وہ بمبئی سے سرخ اور سبز کیلا منگانا چاہتا ہے۔ اس خط کو دیکھ کر ہمیں خیال ہوا کہ بمبئی کا کیلا تمام ہندوستان کو جاتا ہے۔ کیوں نہ ہم یہ بزنس بھی شروع کر دیں۔ چنانچہ مشورہ کے بعد میں اس بزنس کے لئے بسین گیا۔ جہاں یہ کیلا پیدا ہوتا ہے۔اور اس کی مارکیٹ ہے۔وہاں معلوم ہوا کہ یہاں صرف دو پنجابی خاندان ہیں، جن کے ہاتھ میں یہ بزنس ہے۔اور یہ لوگ تمام ہندوستان میں کیلا سپلائی کرتے ہیں۔ یہ دیکھ کر میری آنکھیں کھل گئیں کہ صرف دو دکانیں اور اتنا بڑا بزنس۔ہم یہاں دکان کھول کر لاکھوں روپیہ پیدا کر سکیں گے۔مزید واقفیت کے لئے میں ان پنجابیوں کی دکان پر گیا۔پنجاب کے اندر ایک پنجابی چاہے دوسرے پنجابی کا دشمن ہی کیوں نہ ہو۔مگر پردیس میں پنجابی پنجابی کی بہت خاطر تواضع کرتے ہیں۔یہ لوگ بہت اخلاص کے ساتھ پیش آئے۔کھانا کھلایا۔ مجھے اپنے گھر لے گئے اور میں رات کو ان کے گھر ہی رہا۔ان کو کچھ پتہ نہیں کہ میں کس مقصد کے لئے بسین آیا ہوں۔ان کا خیال تھا کہ بمبئی سیر و تفریح کے لئے آیا اور بسین بھی چلا آیا۔رات کو جب کھانا کھا چکے تو باتیں شروع ہوئیں۔تو میں نے پوچھا اس کی وجہ کیا ہے؟۔کہ یہاں اتنی بڑی مارکیٹ میں آپ کے خاندان کی صرف دو دکانیں ہیں۔اور دوسرے لوگ کاروبار نہیں کرتے۔میرے اس سوال کو سن کر میزبان نے فخر سے جواب دیا کہ پچھلے پندرہ بیس برس میں سینکڑوں لوگوں نے یہاں آ کر کاروبار شروع کیا۔مگر سب دیوالیہ نکال کر چلے گئے۔اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ جب کوئی نئی دکان کھلتی ہے تو ہم فوراً مارکیٹ کو چڑھا دیتے ہیں۔یعنی زیادہ قیمت پر کیلا خرید کر دس اور کو کم قیمت پر بھیج دیتے ہیں۔اور پندرہ بیس یا پچاس ہزار کا گھاٹا برداشت کر لیتے ہیں۔نئے کاروبار والے کو بھی مجبوراً ہمارا مقابلہ کرنے کے لئے زیادہ قیمت پر مال خرید کر کم قیمت پر بھیجنا پڑتا ہے۔ہمارے لئے تو گھاٹا کوئی مشکل نہیں، ہمارے لئے کئی کئی لاکھ روپیہ پیدا کیا ہوا موجود ہے۔مگر نئے کاروبار کرنے والا شخص اپنا دس بیس ہزار روپیہ تباہ کر کے

اس کاروبار کے میدان سے باہر نکل جاتا ہے۔ اور اس کے میدان سے نکلنے کے بعد ہم پھر ارزاں قیمت پر سامان خرید کر گراں قیمت پر فروخت کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ دو تین ماہ میں گھاٹا پورا کر لیا جاتا ہے۔ ان باتوں کے سننے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ یہ کاروبار کرنا خطرہ سے خالی نہیں۔ میں واپس بمبئی پہنچا۔ لالہ اوگرسین سے تمام حالات بیان کیے۔ لالہ اوگرسین اس کاروبار میں دس بارہ ہزار روپیہ تک تو لگانے کے لئے تیار تھے۔ گھاٹے کے لئے، اور وہ بھی اس سے کافی اور زیادہ روپیہ کیوں کر لگاتے۔ چنانچہ ہماری یہ اسکیم شروع نہ ہو سکی اور ہم نے کیلے کے بزنس کا ارادہ ترک کر دیا۔

میں لالہ اوگرسین کے پاس چار ماہ رہا۔ کاروبار چل نکلا۔ میری رہائش دھوبی تلاؤ کے قریب سندھیوں کے ایک ہوٹل میں تھی۔ جہاں میں پچھتر روپے ماہوار کھانے اور رہائش کے دیتا تھا۔

چار ماہ گزر گئے، مگر اس کام میں میرا جی نہ لگتا تھا۔ اس کے علاوہ میں نے محسوس کیا کہ لالہ اوگرسین میرا ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار کچھ بار محسوس کرتے ہیں۔ مہاراجہ نابھ کے ساتھ اس سے پہلے سردار دول سنگھ کویشر کے ذریعہ تعارف ہو چکا تھا۔ میں نے مہاراجہ کو خط لکھا کہ رعیت کے بند ہونے کے بعد بمبئی آ گیا ہوں۔ اور یہاں ملازم ہوں۔ مگر میں یہاں رہنا نہیں چاہتا۔ اگر آپ ملازمت دیں تو میں آپ کے پاس نابھ آنے کے لئے تیار ہوں۔ میں نے اس خط میں اپنا پتا معرفت پوسٹ ماسٹر بمبئی لکھا۔ کیونکہ اپنے تمام خطوط اسی پتا پر منگایا کرتا تھا۔ دس بارہ روز کے بعد مہاراجہ کا خط آ گیا کہ میں ڈیرہ دون پہنچ جاؤں۔ یہ خط سردار گورودیال سنگھ پرائیویٹ سیکرٹری کے ہاتھ کا لکھا ہوا شملہ سے آیا تھا۔ کیونکہ سردار اس وقت شملہ میں تھے۔

اس خط کو دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ میں بمبئی سے جاؤں تو کیوں کر، حساب کیا تو لالہ اوگرسین کے ذمہ میرا ڈیڑھ سو روپیہ سے زیادہ نکلتا تھا۔ اور اگر لالہ اوگرسین مجھے یہ روپیہ دے دیتے اور خوشی کے ساتھ میرا استعفیٰ منظور کر

لیتے تو بہت اچھا تھا۔ مگر لالہ جی بنیئے تھے۔ میں ان کی ذہنیت سے بہت اچھی طرح واقف ہو چکا تھا۔ کہ وہ مفت تو دوزخ میں بھی جانے کے لئے تیار ہو جاتے، مگر روپیہ خرچ کر کے بہشت میں جانا بھی محال تھا۔ میں نے سوچا کہ اگر میں نے اصل حالات لالہ جی کو بتائے تو یہ میرا بقایا ڈیڑھ سو روپیہ ضبط کر لیں گے اور نابھ جانے کے لئے میرے پاس ایک پیسہ نہیں تو کیا کروں، سوچتا رہا۔ آخر لالہ جی سے کہا کہ اگر ہم سے ایک شخص پنجاب جا کر منڈیوں کے چکر لگا آئے اور وہاں خود دکان داروں سے ملے تو بمبئی سے مال منگانے والے بہت سے گاہک پیدا ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ اس طریقہ سے میں نے لالہ جی سے ڈیڑھ سو روپیہ اخراجات کے نام پر حاصل کیا اور پنجاب جانے کی منظوری حاصل کی۔ لالہ جی بہت ہوشیار آدمی تھے۔ انہوں نے مجھ سے یہ تحریر لکھوائی کہ یہ ڈیڑھ سو روپیہ بطور امانت ہوگا، میں ہر روز اپنے کام کی رپورٹ بھیجوں گا، اگر میں واپس نہ آؤں تو اس روپیہ کو تنخواہ کا بقایا نہیں، بلکہ امانت میں خیانت سمجھا جائے گا۔ تاکہ فوجداری مقدمہ قائم کیا جا سکے۔ میں ہر قیمت پر نابھ جانے اور اپنی قسمت آزمانے کے لئے تیار تھا۔ ڈیڑھ سو روپیہ لے کر فرنٹیر میل میں سوار ہوا۔ اس زمانہ میں فرنٹیر میل بھٹنڈہ کے راستہ لاہور جاتی تھی۔ بمبئی سے سوار ہو کر بھٹنڈہ پہنچا۔ وہاں ایک دوست لالہ ہنس راج وکیل تھے۔ ان کے مکان پر گیا۔ میرے پاس کافی کپڑے نہ تھے۔ بازار سے لٹھا خرید کر چھ قمیضیں اور چھ پاجامے بنوائے اور ایک رضائی بنوائی، جب کپڑے تیار ہو گئے تو بھٹنڈہ کے راستے راجپور، انبالہ سے ہوتا ہوا ڈیرہ دون پہنچا۔ ڈیرہ دون ریلوے اسٹیشن کے قریب سکھوں کے ایک معمولی سے ہوٹل میں چار آنہ روز پر ایک کمرہ کرایہ پر لیا۔ اور کپڑے بدل کر مہاراجہ نابھ کی کوٹھی ایسٹ کینال روڈ گیا۔ وہاں سردار گورو دیال سنگھ پرائیویٹ سیکرٹری سے ملا۔ سردار گورو دیال سنگھ بہت بااخلاق شخص تھے۔ والیان ریاست سے ملنا بے حد مصیبت تھا۔ گیارہ روز اسی ہوٹل میں رہا۔ ہر روز مہاراجہ کی کوٹھی پر ان سے ملنے کی توقع پر جاتا۔ وہاں سے کبھی تو

جواب ملتا کہ مہاراجہ کی طبیعت اچھی نہیں۔ کبھی غسل خانے میں ہیں، کبھی مہمان آئے ہوئے ہیں۔ کبھی فرصت کم ہے۔ کبھی کھانے پر بیٹھے ہیں۔ کبھی آرام فرما رہے ہیں۔ جواب سن کر واپس چلا آتا کبھی جی اکتاتا تو بازار چلا جاتا۔ وہاں وقت نہ کٹتا تو کسی پارک میں چلا جاتا۔ ایک دن اتوار کو دیکھا کہ عیسائیوں کے سکول کے لڑکے گرجے جا رہے ہیں۔ ان کے پیچھے گرجے جا کر کچھ دیر پادری کا وعظ سنا۔ چنانچہ بہت مشکل کے ساتھ دس روز کٹے اور گیارھویں دن حاضری نصیب ہوئی۔ سیاسی اور دوسرے مختلف موضوع پر باتیں ہوئیں یہ انٹرویو غالباً ڈیڑھ گھنٹہ کا تھا۔ انٹرویو کے بعد واپس چلا گیا۔ اگلے روز گیا تو سردار گورو دیال سنگھ نے بتایا کہ مہاراجہ نے مجھے ملازمت دے دی ہے۔ میں نابھ چلا جاؤں۔ وہاں ہوم ممبر کے پاس حکم بھیج دیا جائے گا۔ اور مہاراجہ مع اسٹاف کے کنسرو کے جنگل میں شیر کے شکار کے لئے جا رہے ہیں۔ پندرہ بیس روز بعد نابھ پہنچ جائیں گے۔

پہلے تو جب کبھی نابھ جاتا تو دستور کے مطابق مجھے رخصتانہ ایک یا دو سو روپیہ دیا جاتا۔ اب چونکہ میں ملازم ہو گیا تھا۔ اس لئے مجھے رخصتانہ نہ ملا۔ یہ حکم سن کر میں ہوٹل گیا اور بستر اور ٹرنک لیا اور اسٹیشن آیا۔ گاڑی پر سوار ہو کر نابھ پہنچا تو میرے پاس اس وقت گیارہ روپے کے قریب تھے۔ ڈیڑھ سو روپیہ میں سے باقی تمام کا تمام کپڑوں اور سفر میں خرچ ہو گیا تھا۔

نابھ میں میرے ایک چچا (میرے والد کے حقیقی چچا زاد بھائی) سردار صاحب ڈاکٹر سیوا سنگھ رہتے تھے۔ یہ گورنمنٹ کے خطاب یافتہ اور کئی لاکھ روپیہ کی جائیداد کے مالک تھے۔ یہ اس وقت ریاست نابھ میں پنشن پر تھے۔ اور پہلے مرحوم راجہ سر ہیرا سنگھ (موجودہ مہاراجہ نابھ کے دادا) کے میڈیکل ایڈوائزر رہتے تھے۔ میرے چچا خرچ کرنے کے اعتبار سے بالکل میرے مخالف اور ضد تھے۔ یعنی میں تو روپیہ اگر پاس ہو تو جب تک خرچ نہ کر لوں رات کو سو نہیں سکتا تھا۔ اور ان کے ہاں دال کے ساتھ آلو صرف

اس وقت ٹپکتے تھے جب کوئی مہمان آئے۔ میرے لئے ان کے ہاں جا کر قیام کرنا طبیعت پر ایک قسم کا جبر تھا۔ مگر کیا کرتا۔ جیب میں صرف گیارہ روپے تھے۔ اور دوسرا کوئی واقف نہ تھا۔ دل پر جبر کر کے ان چچا کے مکان پر پہنچا۔ تانگہ سے سامان اتروا کر ان کے گھر کے اندر گیا تو آپ صحن میں بیٹھے تھے۔ آپ کی نظر کمزور تھی۔ دور سے دیکھا تو پوچھا کون ہے۔ میں نے کہا دیوان سنگھ ہوں۔ قریب جا کر ان کے پاؤں کو چھوا کیونکہ بزرگ آدمی تھے۔ بہت محبت سے پیش آئے۔ پرانے زمانے کے لوگوں میں چاہے ہزار نقائص ہوں۔ مگر اخلاص۔ محبت اور وضع داری کے اعتبار سے فرشتہ تھے۔ ان کے گھر میں کھانا پکانے پر ایک برہمن عورت کئی برس سے ملازم تھی۔ اس کو آلو کی سبزی پکانے کا حکم ملا۔ میں ایک ماہ کے قریب ان چچا کے ہاں مہمان رہا۔ جب تک کہ مہاراجہ شکار سے واپس نابھ نہیں پہنچ گئے۔ مہاراجہ کے پہنچنے پر میں سرکاری مہمان کی حیثیت سے نیم سرکاری بلڈنگ سرائے شادیات کے ایک کاٹیج میں چلا گیا۔ ڈاکٹر سیوا سنگھ کے کاٹیج کے حالات جو میں ایک ماہ قیام کے دوران دیکھے بہت دلچسپ ہیں۔ جنہیں پھر کبھی لکھوں گا۔

نابھ جب پہنچا تو میں نے اپنے وطن کے عزیزوں کے علاوہ اپنے دوستوں اور لالہ دینا ناتھ مرحوم ایڈیٹر اخبار ہندوستان کو بھی لکھا کہ میں ملازم ہو گیا ہوں۔ لالہ اوگر سین کو علم تھا کہ لالہ دینا ناتھ اور لالہ شام لعل کپور ایڈیٹر ''گورو گھنٹال' میرے دوستوں میں سے ہیں۔ لالہ نے ایک ہفتہ انتظار کیا، جب میری طرف سے کوئی اطلاع نہ پہنچی تو انہوں نے لالہ دینا ناتھ کو خط لکھا کہ دیوان سنگھ ڈیڑھ سو روپیہ بطور ایڈوانس کے لے کر پنجاب کے دورہ پر گیا تھا۔ اب تک اس کی کوئی اطلاع نہیں اور امانت میں خیانت کے جرم میں پولیس کو اطلاع دی جا رہی ہے۔ تاکہ دیوان سنگھ گرفتار ہو کر واپس بمبئی لایا جائے۔ اور اس پر فوجداری مقدمہ قائم ہو۔ میں نے جب لالہ دینا ناتھ کو اپنے ملازم ہونے کی اطلاع دی، تو انہوں نے اس جواب میں میرے ملازم ہونے کی خوشی کے

اظہار کے ساتھ لالہ اوگرسین کا یہ خط بھی بھیجا۔جس میں مجھ پر امانت میں خیانت کا الزام اور پولیس کو اطلاع دینے کی دھمکی دی تھی۔اور لالہ دینا ناتھ نے لکھا کہ آپ کے ایڈیٹر ریاست ہونے کی وجہ سے بہت عزت تھی۔اور توقع نہ تھی کہ ایڈیٹر ریاست اس قدر پست کریکٹر کا ہوگا۔اور یہ حالات اور ایڈیٹر ریاست کی بد دیانتی کے واقعات سن کر آپ کو بے حد صدمہ ہوا ہے۔لالہ دینا ناتھ کے خط جس میں لالہ اوگراسین کا خط ملفوف تھا،کو دیکھ کر مجھے نہ صرف بہت تکلیف ہوئی، بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ میرے ہوش اڑ گئے۔کیونکہ میں ایک طرف تو لالہ دینا ناتھ کی نظروں میں ذلیل ہوا اور دوسرے یہ خوف کہ میں بمبئی میں لالہ لالہ اوگرسین کو تحریر دے آیا ہوں اور اگر لالہ لالہ اوگرسین نے پولیس کو اطلاع دے دی اور وہاں سے وارنٹ جاری ہو گئے اور میں نابھ میں گرفتار ہو گیا تو نہ صرف ملازمت جاتی رہے گی بلکہ لوگ کہیں گے کہ اچھا معتبر اور شریف آدمی تھا،جس کو راجہ نے دوست سمجھ کر ملازم رکھا۔ان خطوط کو دیکھ کر میں بہت پریشان ہوا۔رات کو نیند نہ آئی۔سوچتا رہا کہ کیا کروں کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔آخر اس پریشانی میں بھٹنڈہ لالہ ہنس راج وکیل کو خط لکھا کہ فورا نابھ پہنچو۔لالہ ہنس راج خط ملتے ہی فورا نابھ پہنچ گئے۔ان سے تمام حالات بیان کیے تو انہوں نے کہا فکر کی کوئی بات نہیں۔آپ نے لالہ اوگرسین کے نام اپنی طرف سے ایک نوٹس لکھا۔جس میں لکھا کہ لالہ اوگرسین نے جو خط لالہ دینا ناتھ کو لکھا ہے۔وہ سراسر واقعات کے خلاف اور توہین آمیز ہے۔ان کے موکل نے جو ڈیڑھ سو روپیہ لیا ہے۔وہ اس نے اپنی تنخواہ میں وضع کرلیا ہے۔اور وہ اب لالہ جی کی ملازمت کرنا نہیں چاہتا۔اور وہ ریاست نابھ میں سرکاری ملازم ہو گیا ہے۔اور چونکہ لالہ جی نے ان کے موکل پر غلط الزام لگایا ہے۔اور توہین کی ہے اس لئے وہ ایک ہفتہ کے اندر دس ہزار روپیہ بطور ہرجانہ ادا کریں اور معافی مانگیں۔ورنہ دیوانی اور فوجداری مقدمات قائم کیے جائیں گے۔

اس نوٹس کے پہنچنے کے بعد لالہ اوگرسین کا خط میرے نام آیا جس

کا مفہوم یہ تھا۔

"پیارے دیوان سنگھ جی آپ میرے چھوٹے بھائی کے برابر ہیں ۔ یہ سن کر مجھے بہت خوشی ہوئی کہ آپ نابھ میں سرکاری ملازم ہو گئے ہیں ۔ میں نے تو لالہ دینا ناتھ کو ویسے ہی لکھ دیا تھا کہ ڈیڑھ سو روپے کاٹ کر آپ کے میرے ذمے صرف پندرہ روپے اور نکلتے ہیں۔ آپ لکھیے تو میں وہ بھی بھیج دوں ، میں آپ کا نیاز مند ہوں ۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو لکھنا تا کہ بھیج دوں اب آپ نابھ میں سرکاری ملازم ہو گئے ہیں ۔ ہمارا بھی خیال رکھیے ۔ اگر ہو سکے تو وہاں سے کوئی بڑا سرکاری آرڈر بھجوانا ۔ میرے گھر سے اور میرا چھوٹا بھائی آپ کو رام رام کہتے ہیں ۔ میری چھوٹی لڑکی کانتا آپ کو بہت یاد کرتی ہے۔

آپ کا داس: اوگرسین

میرے نوٹس پہنچنے پر نہ معلوم لالہ اوگرسین کا کیا حال ہوا ۔ مگر ان کا یہ جواب ملنے پر میں مطمئن ہو گیا کہ اب لالہ صاحب کوئی کاروائی نہ کریں گے ۔ لالہ اوگرسین میرے بمبئی آنے کے بعد شاید تین چار سال وہاں رہے اس کے بعد وہ اپنے وطن واپس آ گئے ۔ آج کل میرٹھ میں رہتے ہیں اور جب کبھی دہلی آتے ہیں تو ضرور ملتے ہیں، بلکہ اس نیاز مند کے مکان پر ہی قیام فرماتے ہیں ۔ اب نئے دور میں ریاست نکلنے والا تھا، اور انہوں نے اخبار میں پڑھا کہ میں رہا ہو کر دہلی پہنچ گیا ہوں ۔ تو آپ دہلی آئے ، تلاش کرنے پر بہت دقت کے ساتھ آپ کو موجودہ مکان ملا ۔ جب ملے تو اخلاص و محبت کے باعث ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور آپ نے چاہا اور بار بار کہا کہ اخبار جاری کرنے کے لئے روپیہ کی ضرورت ہو تو لے لوں ۔ مگر ایک تو ضرورت

نہ تھی۔ دوسرے یہ خیال بھی تھا کہ آپ بطور قرض روپیہ دیں گے۔
دوستانہ امداد کے طور پر نہیں۔اس لئے شکریہ کے ساتھ انکار کر دیا۔

لالہ اگرسین کے دل میں میرے لئے بہت عزت واحترام ہے۔
اور جب ملتے ہیں اور میں لوگوں سے ان کا تعارف کراتا ہوں تو یہی کہ
یہ میرے سابق آقا ہیں کہ جن کے پاس میں نے ملازمت کی ہے۔

نفرت اور محبت کے اسباب

میں ملازم ہو کر جب ڈیرہ دون سے نابھ پہنچا اور اپنے چچا سردار صاحب ڈاکٹر سیوا سنگھ کے ہاں مقیم ہوا تو پہلے روز میری خاطر تواضع ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب نہایت شفقت اور محبت کے ساتھ پیش آئے۔ ہر نامی ملازم کو دال کے ساتھ میرے لیے سپیشل آرڈر یعنی آلو پکانے کا حکم بھی دیا گیا۔

ڈاکٹر صاحب اس زمانہ میں پنشن پر تھے۔ اور ریاستوں میں انسان چاہے کتنا ضعیف ہو جائے۔ اس کو مرتے دم تک ملازم رہنے کا حق حاصل ہے۔ اور اگر اس کو پنشن پر ریٹائر کر دیا جائے تو اس کے اپنے خیال میں اور دوسروں کی نگاہوں میں سرکار کا معتوب سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ والیء ریاست اگر خوش ہوں تو وہ لوگ بھی ملازمت میں رہتے ہیں جو چارپائی سے نہ اٹھ سکتے ہوں۔ میرے چچا مہاراجہ ہیرا سنگھ مرحوم نظر بند مہاراجہ کے والد اور موجودہ مہاراجہ نابھ کے دادا کے میڈیکل ایڈوائزر تھے۔ اور جب مہاراجہ ہیرا سنگھ کا انتقال ہوا تو نابھ کی دوسری تبدیلیوں کے ساتھ ڈاکٹر سیوا سنگھ کو بھی ریٹائر کر دیا گیا۔ جہاں تک میرا خیال ہے کہ آپ کے ریٹائر ہونے کا باعث یہ تھا کہ مہاراجہ نے گدی پر بیٹھتے ہی ریاست کی ایڈمنسٹریشن کی اصلاح کرنی چاہی۔ اور دوسری تبدیلیوں کے ساتھ بڑی عمر کے ملازموں کو پنشن دے کر نوجوان اور مستعد لوگوں کو ملازم رکھا۔ مگر میرے چچا میرے ریٹائر ہونے کو یہی سمجھتے رہے کہ مہاراجہ آپ کے خلاف ہیں اور آپ معتوب ہیں۔ جس روز میں پہنچا اور کھانا کھانے کے بعد باتیں ہوئیں تو چچا نے دریافت کیا کہ میں کہاں سے آیا ہوں اور نابھ آنے کا مقصد کیا ہے؟۔ میں نے بتایا کہ میں ڈیرہ دون سے آیا ہوں اور مہاراجہ نے مجھے ملازمت دے دی ہے۔ یہ سن کر ڈاکٹر صاحب کو یقین نہ آیا اور انہوں نے نہایت حیرانی کے ساتھ پوچھا کہ کیا یہ سچ ہے۔ کیونکہ ریاستوں میں ملازمت کا ملنا بہت مشکل تھا۔ والیان ریاست سے ملنا تو کجا ان کی کوٹھیوں اور محلوں کے قریب جانا بھی خوش

نصیبی میں داخل ہے۔ پھر دیوان سنگھ کی مہاراجہ تک رسائی کیوں کر ہوئی اور ملازمت کیسے ملی۔ان کے دریافت کرنے پر میں نے بتایا کہ میں مختلف اخباروں میں ایڈیٹر اور سب ایڈیٹر کام کرتا رہا۔اور مہاراجہ میرے مضامین کو پسند کرتے تھے۔اس ذریعہ سے تعلقات ہوئے اور اب جب کہ میں نے ان سے ملازمت کے لئے کہا تو مہاراجہ نے مہربانی کی۔ڈاکٹر صاحب اپنے آپ کو راجہ کا معتوب سمجھتے تھے۔اور مہاراجہ کے خلاف تھے۔ یہ سن کر آپ مہاراجہ پر برس پڑے اور غصہ، طعنہ زنی اور نفرت سے کہا،اس مہاراجہ کو اخبارات پڑھنے کے سوا دوسرا کوئی اور کام نہیں ہے۔دن رات یا تو کتابیں پڑھتے ہیں یا اخبارات گورنمنٹ کے خلاف جو لیڈر ہو ان سے ملتا ہے۔رعایا تباہ ہو رہی ہے۔رعیت کو کوئی پوچھنے والا نہیں۔اس کا باپ بہت اچھا آدمی تھا۔ہم نے اس کا زمانہ دیکھا ہے۔ہر روز لوگوں کے حالات سنتا تھا۔یہ کسی سے نہیں ملتا۔اس کی دوستی ہے تو گورنمنٹ کے خلاف بغاوت کرنے والے لیڈروں سے۔یہ کسی دن گدی سے اتر جائے گا۔گورنمنٹ کا مقابلہ کون کرسکتا ہے۔اس بےوقوف کو کون سمجھائے کہ یہ غلط راستہ پر چل رہا ہے۔پولیٹیکل ایجنٹ اس کے خلاف ہیں۔ہمیں کبھی پوچھتا تک نہیں، جب سے پینشن لی ہے۔گھر میں پڑے ہیں۔بڑے مہاراجہ کتنے اچھے تھے ،ہم نے لاکھوں روپے پیدا کیے وغیرہ۔میں یہ سب باتیں سنتا رہا۔اور میں نے محسوس کیا کہ ڈاکٹر صاحب نہ صرف مہاراجہ کے خلاف بہت سخت بغض کے جذبات رکھتے ہیں۔بلکہ یہ سن کر کہ میرے مہاراجہ کے ساتھ تعلقات ہیں۔مجھے بھی کچھ نیم حاسدانہ نظروں سے دیکھتے ہیں۔

ڈیرہ دون میں جب سردار گورودیال نے مجھ سے زبانی کہا کہ مہاراجہ نے آپ کو ملازمت دے دی ہے تو آپ نے کہا تھا کہ آپ ایک دو روز میں ہی ہوم ممبر اور اکونٹنٹ جنرل کے نام میری ملازمت کے متعلق حکم بھیج دیں گے۔مگر ریاستوں کی گاڑی کے پرزے بہت آہستہ چلتے ہیں۔سردار گورودیال سنگھ مصروفیت کے باعث یہ

حکم بھیجنا بھول گئے۔اور دو تین روز کے بعد کنسرو کے جنگلات میں مہاراجہ کے ساتھ شیر کے شکار کے لئے چلے گئے۔یعنی میں نابھ میں بحکم راجہ ملازم تو ہوں مگر میری تقرری کا کوئی حکم نہیں ہے۔اور نہ کسی کو علم ہے۔ڈاکٹر سیوا سنگھ کو میرے کہنے کے باوجود یقین نہ آتا تھا کہ میں نابھ میں ملازم ہو گیا ہوں۔کیونکہ وہ سمجھتے کہ ریاستوں میں ملازم ہونا اور کسی مہاراجہ یا نواب تک رسائی حاصل کرنا بہت مشکل کام ہے۔اور پچھلے جنم میں اچھے کرموں کے باعث ہی ممکن ہے۔وہ کئی روز تک یہی سمجھتے رہے کہ میں شاید غلط بیانی کر کے ان کے پاس کچھ روز گزارنے آیا ہوں۔دراصل ملازم نہیں ہوا ہوں۔چنانچہ آپ دن میں ایک ادھ بار یہ ضرور کہہ دیتے کہ انسان کو جھوٹ نہیں بولنا چاہیئے، کسی کو دھوکا نہیں دینا چاہیئے۔اور فضول وقت بے کار رہ کر نہیں گزارنا چاہیئے۔اور اگر کم تنخواہ پر ہی اگر ملازمت مل جائے تو کر لینی چاہیئے۔اس تمام نصیحت کا مقصد یہ تھا کہ میں گھر میں پڑا اپنا وقت ضائع نہ کروں اور کہیں ملازمت کر لوں۔

ڈاکٹر سیوا سنگھ بے چارے غیر ضروری طور پر کفایت شعار تھے۔اور مہمانوں کی صورتیں دیکھنا ان کے لئے مسرت اور خوشی کا باعث نہ تھا۔اور میں محسوس کرتا تھا کہ گو یہ چچا ہیں، مگر ان کے گھر رہنا اور ان پر بار بننا مناسب نہیں۔مگر کرتا کیا وہ گیارہ روپے بھی خرچ ہو گئے جو نابھ آتے وقت میری جیب میں تھے۔نابھ میں کوئی ایسی دوسری جگہ نہ تھی۔جہاں میں رہتا۔ادھر ڈاکٹر صاحب کی نصیحتوں کا سلسلہ زیادہ تیزی سے چل رہا تھا۔جب بھی ان کے سامنے جاتا تو یہی فرماتے کہ انسان کو جھوٹ نہیں بولنا چاہیئے۔وقت کی قدر کرنی چاہیئے۔بے کار نہیں بیٹھنا چاہیئے۔میں پریشان تھا کہ کیا کروں، کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔آخر مجبور ہو کر میں نے یہ فیصلہ کیا کہ ڈاکٹر صاحب کی نظروں سے جتنا بھی دور رہ سکوں رہوں۔میں صبح ان کے جاگنے سے پہلے بیدار ہوتا، کوئی کتاب لے کر شہر سے باہر کسی ریل کی پٹری کے ساتھ کئی میل دور نکل جاتا۔کسی کنوئیں یا نہر پر غسل کرتا۔کوئی کتاب پڑھتا اور جب دوپہر بارہ بجے ڈاکٹر

صاحب کے گھر پہنچتا۔ گھر میں کھانے کے لئے بیٹھتا تو ڈاکٹر صاحب وہی نصیحتیں شروع کر دیتے۔ میں بے غیرت اور ڈھیٹ لوگوں کی طرح یہ نصیحتیں سنتا۔ کھانا کھانے کے بعد گھر سے نکلتا اور گھر سے باہر کھیتوں یا ریل کی پٹڑی پر بیٹھتا۔ رات کو آٹھ بجے واپس آتا، کھانا کھاتا، نصیحتیں سنتا اور سو جاتا۔ یہ دن میرے لئے بہت تکلیف کے تھے مگر کرتا بھی کیا مہاراجہ آتے۔ تنخواہ ملے تو کوئی مکان لے کر رہوں۔

کئی دن گزرنے کے بعد ڈاکٹر صاحب اپنی پنشن لینے خزانہ میں چلے گئے۔ خزانہ کے قریب اکوٹنٹ جنرل کا دفتر تھا۔ اکوٹنٹ جنرل سے پوچھا کہ کیا آپ کے پاس دیوان سنگھ نامی کسی آدمی کا تقرر نامہ کے متعلق مہاراجہ کا حکم پہنچا ہے۔ اکوٹنٹ جنرل نے اپنے ماتحتوں سے پوچھا، جواب ملا، کوئی حکم نہیں پہنچا۔ اب تو آپ کو پورا یقین ہوگیا کہ میں ان کو دھوکا دے کر ان کے مکان میں مقیم ہوں اور ملازم نہیں ہوا۔ بلکہ چار سو بیسی کی جا رہی ہے۔ میں رات نو بجے حسب معمول باہر سے واپس کھانے کے وقت پہنچا تو آپ بہت غصہ میں تھے۔ دیکھتے ہی برس پڑے کہ بغیر کام کے زندگی کے دن گزارتے شرم محسوس نہیں ہوتی۔ آج کل کے زمانے میں جھوٹ بولنے کو تو کوئی عیب ہی نہیں سمجھا جاتا۔ آپ نے اکوٹنٹ جنرل سے پوچھا ہے۔ میں فی الحقیقت ملازم نہیں ہوں اور دھوکا سے ان کے مکان میں مقیم ہوں۔ میں نے بنوں اپنے چچا زاد بھائی سے خط لکھ کر پچیس روپے منگائے جو وہاں پولیس سب انسپکٹر تھے۔ ان پچیس روپیہ میں نہ مکان کرایہ پر مل سکتا تھا اور نہ ہی کھانا پکانے کے لئے ملازم رکھ سکتا تھا۔ یہ اخراجات کے لئے ناکافی تھے۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب کے گھر رہنے اور وقت گزارنے کے لئے مجبور تھا۔ مہاراجہ کے انتظار کا ایک ایک دن ایک ایک سال کا محسوس ہو رہا تھا۔ اور ڈاکٹر صاحب کی نصیحتوں میں بھی دن بدن اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ میں اس زندگی سے بہت تنگ آ چکا تھا۔ اور کئی دفعہ خیال آیا کہ نابھ سے چلا جاؤں۔ مگر اس توقع پر کہ مہاراجہ آج آتے ہیں کل آتے ہیں نہ جا سکا۔

میں ڈاکٹر صاحب کے مکان پر غالباً ایک ماہ رہا۔ ایک دن صبح کے وقت شہر میں توپوں کی آواز سنائی دی۔ یہ توپیں مہاراجہ کے نابھ واپس پہنچنے کی سلامی تھی۔ میری روزانہ زندگی اور ڈاکٹر صاحب کی نصیحتیں ناقابل برداشت حد تک پہنچ چکی تھیں۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ مہاراجہ نابھ واپس آ گئے ہیں تو میں نے مہاراجہ کو ایک خط بذریعہ رجسٹری بھیجا، جس کا مفہوم یہ تھا کہ

''یور ہائینس!''

ڈیرہ دون میں سردار گورو دیال سنگھ پرائیویٹ سیکرٹری نے مجھے بتایا تھا کہ میں ملازم ہو گیا ہوں اور ملازمت کے متعلق حکم ہوم ممبر اور اکوٹنٹ جنرل کو ایک دو روز میں بھیج دیا جائے گا۔ مگر اب تک کوئی حکم نہیں پہنچا۔ میں یہاں نابھ میں سردار صاحب ڈاکٹر سیوا سنگھ کے مکان پر مقیم ہوں۔ کیونکہ میرے پاس خرچ کے لئے ایک پیسہ نہیں اور نہ ہی رہنے کے لئے دوسری جگہ ہے۔ میں اس موجودہ زندگی سے نہایت تنگ آ چکا ہوں، کیونکہ ڈاکٹر صاحب کو مہمانوں کی منحوس صورت دیکھنا گوارا نہیں، گو وہ میرے چچا ہیں۔ یہ خط آپ کو کل پہنچ جائے گا۔ اور میں پرسوں شام تک انتظار کروں گا۔ اگر پرسوں شام تک جناب کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا۔ اور میری ملازمت کا حکم اکوٹنٹ جنرل کو نہ پہنچا، تو میں پرسوں رات کی گاڑی سے لاہور پہنچ جاؤں گا۔ میرے لئے اب مزید عرصہ انتظار کرنا ممکن نہیں۔

اس خط کو میں نے بذریعہ رجسٹری بھیجا اور لفافہ پر سنل بھی لکھ دیا۔ تا کہ مہاراجہ کے ہاتھوں میں پہنچ جائے۔ خط بھیجنے کے بعد میں نے لاہور جانے کی تیاری شروع کر دی۔ کیونکہ میں نے خیال کیا کہ مہاراجہ بڑے آدمی ہیں۔ اس خط کا جواب جلدی کیا دیں گے۔ میرے لئے اب مزید عرصہ تک نابھ میں رہنا ممکن نہیں۔ اگر مہاراجہ چاہیں گے تو میں لاہور سے پھر آ جاؤں گا۔

یہ خط مہاراجہ کو اگلے روز پہنچ گیا۔ آپ نے خط پڑھتے ہی سردار زورا سنگھ ہاؤس

ہوم منسٹر کو طلب فرمایا۔ اور کہا کہ ڈاکٹر سیوا سنگھ کے مکان پر دیوان سنگھ ٹھہرا ہوا ہے۔ اس کے پاس جائیے۔ سرکاری مکان کا رہنے کے لئے انتظام کر دیجیئے۔ سرکاری ملازمت دیجیئے، جتنا روپیہ درکار ہو وہ دیجیئے۔ اور بطور سرکاری مہمان ہر قسم کی سہولت بہم پہنچایئے۔ کوئی تکلیف نہ ہو۔ اس حکم کے ملتے ہی سردار زورا سنگھ ڈاکٹر سیوا سنگھ کے مکان پر پہنچے، میں حسب معمول گھر پر نہ تھا۔ دورہ پر تھا۔ یعنی ریل کی پٹڑی کے ساتھ ساتھ جا کر شہر سے کئی میل دور بیٹھا تھا۔ سردار زورا سنگھ نے ڈاکٹر صاحب کے مکان پر پہنچ کر ملازم کو آواز دی۔ ملازم باہر آیا۔ اس نے ڈاکٹر صاحب کو اطلاع دی کہ سردار زورا سنگھ آئے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے سردار صاحب کو اندر بلایا۔ خیر و عافیت پوچھنے کے بعد سردار زورا سنگھ نے ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ آپ کے ہاں جو سردار دیوان سنگھ رہتے ہیں۔ مہاراجہ نے حکم دیا ہے کہ ان کے لئے سرکاری کوٹھی، سرکاری مہمان داری، روپیہ اور جس شے کی ضرورت ہو انتظام کر دیا جائے۔ ڈاکٹر صاحب کا ایک ملازم جیون سنگھ جو پہلے فوج میں تھا اور فوج سے ریٹائر ہونے کے بعد ڈاکٹر صاحب کی جائیداد کا کرایہ وغیرہ وصول کرنے پر ملازم ہو گیا تھا۔ پاس کھڑا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے جب سردار زورا سنگھ کے منہ سے یہ سنا تو بہت حیران ہوئے ان کو خیال ہوا کہ شاید جیون سنگھ ریاستوں کا معاملہ ہے۔ ان کی مخبری کرتا ہو۔ جو اس کو روپیہ اور کوٹھی دینے کا حکم دیا ہے۔ جیون سنگھ پریشان کہ مہاراجہ نے بغیر کسی درخواست کے اتنی مہربانی کیوں کی؟۔ حیرانی کی اس فضا کو دیکھ کر سردار زورا سنگھ حیران کہ معاملہ کیا ہے؟۔

مہاراجہ نے حکم کیوں دیا اور کس لئے دیا؟۔ چنانچہ سردار زورا سنگھ نے ڈاکٹر صاحب سے پوچھا کہ کیا یہی سردار جیون سنگھ ہیں جو آپ کے ہاں بطور مہمان ٹھہرے ہوئے ہیں۔ یہ سننے کے بعد ڈاکٹر صاحب کو خیال آیا کہ یہ حکم دیوان سنگھ کے متعلق ہے جو نئے سرکاری ملازم ہوئے ہیں۔ میں نام بھول گیا تھا یہ یقین ہو جانے کے بعد کہ مہاراجہ نے یہ حکم دیوان سنگھ کے متعلق دیا ہے اور دیوان سنگھ دراصل ملازم ہو گیا ہے

اور اس کے فی الحقیقت مہاراجہ کے ساتھ تعلقات ہیں آپ نے سردار زور سنگھ کو جواب دیا کہ آپ مہاراجہ صاحب سے کہیے کہ دیوان سنگھ ڈاکٹر صاحب کا حقیقی بھتیجا ہے۔ کوئی بیگانہ نہیں۔ اس کا اپنا گھر ہے اور وہ بہت آرام سے ہے۔ اس کو کسی چیز کی ضرورت نہیں آپ کا دیا ہوا سب کچھ موجود ہے۔ کوئی کمی نہیں وہ جو کچھ چاہے یہاں سے اپنے گھر سے لے جا سکتا ہے۔ ہم حضور کے قدیمی نمک خوار ہیں اور شکر گزار ہیں کہ سرکار نے ہمارے خاندان کے ایک ممبر کو سرکاری خدمت کا موقع دیا۔ ہماری تو خواہش ہے کہ ہمارے خاندان کا بچہ بچہ حضور کی وفاشعاری کے ساتھ خدمت انجام دے۔ یہ سن کر سردار زوورا سنگھ اپنے گھر چلے گئے۔

میں حسب معمول آٹھ بجے کے قریب واپس پہنچا۔ ڈاکٹر صاحب میرا انتظار فرما رہے تھے جب میں نے صحن میں قدم رکھا تو انہوں نے میرے پاؤں کی آہٹ سنی تو آ نے کمرہ کے اندر سے آواز دے کر پوچھا۔ کون ہے۔ میں نے بھیگی اور سہی ہوئی بلی کی طرح آہستہ سے جواب دیا۔ جی میں ہوں ڈاکٹر صاحب نے شفقت کے ساتھ مجھے اپنے پاس اندر بلا لیا۔ ڈاکٹر صاحب کے گھر میں بیٹھنے کے لیے سرکنڈے کے چھ سات مونڈھے تھے۔ جن پر ہرنوں کی کھالیں منڈھی ہوئی تھیں۔ ایک مونڈھے پر بیٹھنے کے لیے مجھے حکم ملا۔ میں بیٹھ گیا تو آپ نے ہرنامی ملازمہ کو آواز دی۔ ہرنامی کا کے کے لیے کھانا لاؤ نابھہ پٹیالہ اور جیند کی ریاستوں میں والیان ریاست کے لڑکوں اور عزیزوں کو تو کنور صاحب کہتے ہیں اور اہلکاروں اور افسروں کے لڑکوں اور چھوٹی عمر کے رشتہ داروں کو کاکا جی کہتے ہیں۔ ہرنامی جب کھانا لائی میں مونڈھے پر بیٹھ اور آگے تپائی رکھ کر کھانا کھا رہا تھا کہ ہرنامی کو حکم ملا کہ آئندہ دونوں وقت دال کے ساتھ آلو یا کوئی سبزی بھی بنائی جائے۔ جیون سنگھ ملازم کو حکم دیا گیا کہ کل صبح اوپر کے چوبارے میں ایک پلنگ بچھا دیا جائے اور ایک چھوٹا تخت پوش رکھ دیا جائے۔ گودام کے کمرہ میں سے پانی کے لیے ٹب نکال کر وہاں پہنچا دیا جائے اور کوئی ملنے والا آئے

تو اس کے لیے ایک کرسیت اور ایک مونڈھا بھی وہاں رکھ دیا جائے گویا کہ سیاسی قیدیوں کو سی کلاس میں سے یک لخت اے کلام میں رکھنے کا حکم دیا گیا۔ میں حیران کہ ڈاکٹر صاحب آج بہت ہی مہربانی فرما رہے ہیں۔ وجہ کیا ہے۔ میں نے سنا تھا کہ ڈاکٹر سیوا سنگھ جب تعلیم حاصل کرتے تھے تو میرے والد مرحوم اس زمانہ میں ڈاکٹر تھے۔ اور ان کے زور دینے پر ہی ڈاکٹر سیوا سنگھ کو ڈاکٹری پڑھنے کے لیے داخل کیا گیا تھا اور میرے والد نے آپ کی اکثر مالی امداد بھی کی تھی۔ شاید پرانے زمانہ کے تعلقات اور والد مرحوم کے احسان کا احساس ہوا ہے یا ویسے ہی ان کو خیال آیا ہے یا خاندانی محبت کے باعث مہربانی فرما رہے ہیں میں نے کہا آپ تکلیف کیوں کرتے ہیں میں تو غالباً کل رات واپس لاہور جا رہا ہوں۔ اتنے روز تک تو میری ملازمت کا حکم جاری نہیں ہوا۔ اب کیا توقع ہے میرے الفاظ سننے کے بعد ڈاکٹر صاحب نے انکشاف کیا کہ سردار زورا سنگھ ہوم لولیڈر منسٹر شام کو آئے تھے اور مہاراجہ نے رہائش کے لیے کوٹھی ملازم سرکاری مہمان داری اور روپیہ دینے کا حکم صادر فرمایا ہے اور آپ نے سردار زورا سنگھ سے کہہ دیا ہے کہ دیوان سنگھ آپ کا بھتیجا ہے اپنا گھر بار چھوڑ کر باہر نہیں رہ سکتا اور اسے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔

میں یہ سن کر سمجھ سکا کہ ڈاکٹر صاحب آج کیوں فرما رہے ہیں۔ میں متفکر تھا کہ مہاراجہ نے کیا حکم دیا ہے میں نے پوچھا کہ سردار زورا سنگھ کا مکان کہاں ہے۔ اس پر ڈاکٹر صاحب بہت غصہ کی حالت میں بولے کہ جو کہنا تھا سردار زورا سنگھ سے کہہ دیا ان سے ملنے کی ضرورت نہیں۔

میں صبر کیوں کرتا ڈاکٹر صاحب کا ملازم جیون سنگھ میرے ساتھ بہت اخلاص سے پیش آتا تھا اور میری بہت عزت کرتا تھا۔ (بلکہ وہ ڈاکٹر صاحب سے پوشیدہ مجھے کھانے کے لیے آم کا اچار بھی دیا کرتا تھا۔ جو دال کے ساتھ ایک ایکسٹرا ڈش کی حیثیت رکھتا ہے) میں نے اس سے اشارہ سے باہر چلنے کو کہا اور اس کے باہر جانے

کے بعد میں بھی پیشاب کے بہانہ سے اٹھا باہر گیا اور باہر جا کر میں نے جیون سنگھ سے سردار زورا سنگھ کے آنے اور بت چیت کے تمام حالات پوچھے ۔ حالات معلوم کرنے کے بعد میں نے دریافت کیا کہ سردار زورا سنگھ کہاں رہتے ہیں ۔ جیون سنگھ نے بتایا کہ ریلوے سٹیشن کے پاس منڈی ہے اس منڈی میں ان کی اپنی ذاتی بلڈنگ ہے ۔ اس بلڈنگ کے اوپر کے حصہ میں رہتے ہیں ۔ ڈاکٹر صاحب نے مکان سے سردار زورا سنگھ کا مکان ایک میل کے فاصلے پر تھا ۔ میری جیب میں ٹانگہ ے لیے پیسے نہ تھے میں پیدل چلا گیا ۔ سردار صاحب کے مکان پر جا کر آواز دی ۔ سردار صحب کا ملازم نیچے آیا اس نے نام پوچھا میں نے کہا ڈاکٹر سیوا سنگھ کے مکان سے دیوان سنگھ ۔ ملازم نے اطلاع دی تو سردار زورا سنگھ نیچے ائے ۔ آپ نے ہاتھ جوڑ کر سکھوں کی طرح ست سری اکال کہا میں نے بھی اسی طرح جواب دیا ۔ میں نے کہا میں شکرگزار ہوں کہ آپ تشریف لائے تھے بے وقت آپ کو تکلیف اس لیے دی تھی کہ کہیں آپ مجھ سے ملے بغیر وہ بات مہاراجہ کو نہ کہہ دیں جو ڈاکٹر صاحب نے آپ سے کہا ہے ۔ سردار زورا سنگھ نے کہا کہ ذمہ داری کا سوال تھا آپ مجھ سے ملے بغیر مہاراجہ سے کچھ نہ کہتے اور آپ صبح مجھ سے ملنے کے لیے ڈاکٹر صاحب کے ہاں پھر آنے والے تھے سردار زورا سنگھ کے ساتھ فیصلہ کیا کہ آپ کل صبح آٹھ بجے تشریف لائیں گے میں ان کا انتظار کروں گا ۔ سردار زورا سنگھ سے ملنے کے بعد میں واپس آیا ڈاکٹر صاحب میرے انتظار میں تھے کہ کہاں چلا گیا آپ نے پوچھا کہاں تھے تو میں ں ے کہا کہ کھانا کھانے کے بعد چہل قدمی کرنے چلا گیا تھا ۔ ڈاکٹر صاحب نے مزید مہربانی فرماتے ہوئے ہرنامی کو حکم دیا کہ کاکا کے لیے ایک گلاس دودھ لاؤ ۔ پورے ایک مہینے میں شاید یہ پہلا موقع تھا کہ مجھے کاکا جی کا لقب نصیب ہونے کے بعد ایک گلاس دودھ بھی ملا تھا ۔ اگلے روز میں صبح حسب معمول جاگا مگر آج دورہ ملتوی تھا ضروری حاجات سے فارغ ہو کر پھر رضائی اوڑھ کر لیٹ گیا ساڑھے سات بجے کے قریب نہا دھو کر فارغ ہوا ۔ کپڑے

پہنے اور گھر سے باہر نکل کر گلی میں سردار زورا سنگھ کا انتظار کرنے لگا۔ دماغ میں مختلف خیالات تھے۔ رات کو سردار زورا سنگھ نے کہا تھا کہ مہاراجہ نے رہائش کے لیے ایک کوٹھی دینے کا حکم فرمایا ہے مگر میرے پاس ایک بستر اور یک ٹرنک ہے جس کوٹھی میں جا کر رہوں گا وہ لوگ کیا خیال کریں گے۔ کہ یہ نئے اہلکار کہاں سے تشریف لے آئے ہیں ح جن کا اثاث البیت صرف ایک بسترہ اور ایک ٹرنک ہے۔ اس ایک بسترہ اور ایک ٹرنک کو ڈرائنگ روم میں رکھوں گا بیڈ روم میں ڈرائنگ روم میں یا سٹور روم میں۔ ملازم لوگ کیا کہیں گے۔ اسی خیال میں غرق تھا کہ سامنے سے سردار زورا سنگھ دو سفید گھوڑوں والی سرکاری فٹنی میں آتے ہوئے دکھائی دیے میں آ گئے بڑھا گاڑی کھڑی ہوگئی۔ سردار صاحب نے نیچے اتر کر ہاتھ ہلایا پھر پاس بٹھا لیا اور کوچوان کو حکم دیا کہ چلو گیسٹ ہاؤس والی سڑک پر۔ سردار زورا سنگھ نے کہا کہ پہلے گیسٹ ہاؤس کی طرف چلتے ہیں۔ وہاں کئی ایک سرکاری کوٹھیاں ہیں آپ ان میں سے جو پسند کیجیے اس میں آپ کے قیام کا انتظام کروا دیا جائے۔ میں نے جواب دیا کہ میں تنہا بیوی وغیرہ کے بغیر ہوں اور میری زندگی بھی بالکل سادہ ہے میں اپنے ساتھ بالکل مختصر سامان رکھتا ہوں۔ کوٹھی کیا کروں گا۔ میرے لیے تو اگر تم دو تین کمروں والے چھوٹے سے مکان کا انتظام ہو جائے تو کافی ہے۔ اس پر سردار زورا سنگھ مجھے نابھہ کی سرائے شادیات (یہ وسیع بلڈنگ کئی لاکھ روپے کی لاگت سے تیار ہوئی تھی نصف روپیہ ریاست نابھ نے دیا تھا اور اس میں براتیں بھی ٹھہرتی تھیں اور اس میں وسیع ہال کی ایک کاٹیج کا دکھایا جسے میں نے پسند کیا۔ ایک چھوٹا سا سونے کا کمرہ۔ ایک چھوٹا سا ڈرائنگ روم اور غسل خانہ باورچی خانہ وغیرہ صاف ستھرے کمرے سردار صاحب نے اس کو فرنش کرنے کا حکم دیا۔ سرکاری باورچی اور ایک ملازم کا انتظام ہو گیا۔ سرکاری رسد یعنی سامان خوراک کے روز بھیجنے کے لیے ایک چٹ بھیج دی گئی۔ یہ تمام انتظام ہو جانے کے بعد سردار زورا سنگھ نے پوچھا کتنا روپیہ نقد چاہیے۔ میری جیب میں ایک

پیسہ نہ تھا۔مگر نیا اہلکار پرانے ریاستی اہلکار سے اپنے افلاس کا اظہار کیونکر کرتا ہے۔میں نے بے نیازی کے ساتھ جواب دیا کہ نہیں روپے کی ضرورت نہیں۔آپ تکلیف نہ کیجیے سردار صاحب واپس چلے گئے میں ڈاکٹر صاحب کے مکان پر آگیا۔میرے آنے سے پہلے ڈاکٹر صاحب کے مکان کا اوپر کا چوبارہ بھی میرے لیے فرنش ہو چکا تھا۔ اس چوبارہ میں ایک پلنگ ایک تخت پوش ایک کرسی ایک مونڈھا ایک چھوٹی میز اور غسل کے لیے ایک ٹب پہنچ گیا تھا۔میں حیران کہ ڈاکٹر صاحب کی اس مہربانی سے کیونکر انکار کیا جائے۔جرات نہ ہوتی تھی۔ڈیڑھ دو گھنٹہ کے قریب سوچتا رہا۔آخر کیا کرتا مجبور تھا۔کھانا کھانے کے بعد نہایت عاجزی کے ساتھ عرض کیا کہ سردار زورا سنگھ ملے تھے۔انہوں نے مہاراجہ کے حکم کے باعث مشورہ دیا ہے کہ میں ضرور دوسری جگہ رہوں۔چنانچہ انہوں نے سرائے شادیات کی بلڈنگ کے اوپر کی ایک کاٹیج میں میرے لیے انتظام کر دیا ہے میں اب وہاں جاؤں گا۔یہ سنتے ہی ڈاکٹر صاحب بے حد خفا ہوئے۔بزرگانہ نصیحتیں شروع ہوئیں۔کہ گھر کا مکان چھوڑ کر دوسری جگہ جانا بدنامی کا باعث ہے۔یہاں کوئی تکلیف نہ ہوگی سامان چوبارہ میں پہنچ چکا ہے۔بھتیجا کی پوزیشن بیٹے کے برابر ہوتی ہے۔لوگ کیا کہیں گے۔خاندان کے لوگوں میں اتفاق ہو تو اس میں برکت ہوتی ہے۔وغیرہ وغیرہ۔میں سنتا رہا۔دو گھنٹہ تک یہ کشمکش جاری رہی۔ڈاکٹر صاحب مجھے جانے نہ دیتے تھے۔میں جانا چاہتا تھا۔دو گھنٹہ کی کش مکش کے بعد یہ فیصلہ ہوا اور مجھے اس شرط پر جانے کی اجازت ملی کہ میں گو رہوں تو سرائے شادیات کی کاٹیج میں مگر کھانا دونوں وقت ڈاکٹر صاحب کے ہاں کھاؤں۔ چنانچہ میں نے جیون سنگھ کو مزدور لینے کے لیے بھیجا۔مزدور سے سامان اٹھوا کر جیون سنگھ کے ساتھ سامان سرائے شادیات بھجوایا۔اس کے بعد خود وہاں گیا۔میرے جانے سے پہلے اس کاٹیج میں دریاں بچھ چکی تھیں۔برتن وغیرہ پہنچ چکے تھے میزوں پر چمنیاں صاف کر کے لیمپ رکھے گئے تھے کھانے کا سامان آٹا سبزی گوشت دال گھی وغیرہ پہنچ

چکا تھا۔ اور ایک باورچی اور ملازم موجود تھے۔ ڈاکٹر صاحب کے مکان سے روانہ ہونے سے پہلے میں نے ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ اگر ممکن ہو تو پچاس روپے قرض دے دیجیے اور دیتے ہوئے کہا بیٹا یہ گھر تمہارا اپنا ہے اگر تم چاہو تو ہزار روپیہ لے سکتے ہو۔ پچاس کا کیا سوال ہے روپیہ لینے کے بعد میں شادیات سرائے چلا گیا۔ میری تقرری کا حکم اس روز سے جاری ہوا جس روز میں ڈیرہ دون مہاراجہ سے ملا تھا۔ اس سرائے شادیات میں تین ماہ کے قریب بطور سرکاری مہمان رہا پھر میں نے یہاں رہنا مناسب نہ سمجھا۔ کرایہ پر مکان لے کر اس میں چلا گیا۔ یہاں نابھی میں اڑھائی تین سال کے قریب رہا میری موجودگی ہی میں وہاں انقلاب برپا ہوا اور مہاراجہ گدی سے دست بردار ہوئے۔ مہاراجہ کی دست برداری کے بعد برٹش ایڈمنسٹریشن نے مجھے گرفتار کر لیا۔ تو پھر اسی سرائے شادیات کی بلڈنگ کی کاٹیج میں مجھے تین ماہ نظر بند رکھا گیا۔ اور جب رہائی ہوئی تو میرا ریاست نابھ میں داخلہ بند کر دیا گیا۔ کئی بار وہاں کی گورنمنٹ کو لکھا کہ مجھے نابھ آنے کی اجازت دی جائے تاکہ میں ان لوگوں سے مل سکوں جن کے ساتھ دل کو تعلق رہا۔ مگر نابھ گورنمنٹ نے یا تو جواب نہ دیا اگر دیا تو یہی کہ اجازت نہیں دی جا سکتی۔ مگر دل میں یہ خواہش ضرور ہے کہ اگر کبھی نابھ گیا تو اس سرائے شادیات کی بلڈنگ کو ضرور دیکھوں گا جہاں شروع میں بطور مہمان اور آخر میں بطور قیدی رہا۔

ان تمام واقعات سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ حالات غیر موافق ہوں تو عزیز و اقارب بھی نفرت کرتے ہیں اور حالات موافق ہوں تو یہ نفرت محبت میں بدل جاتی ہے۔

☆☆☆

نسل اور صحبت کا اثر

دہلی میں میرے ایک دوست محمد یوسف صاحب تھے جو خواجہ حسن نظامی اور ان کے دوستوں میں بھی عزیز سمجھے جاتے تھے ۔ان یوسف صاحب کو مالیر کوٹلہ کی ایک حسین طوائف شریفن سے عشق ہو گیا ۔اس شریفن کا پہلے تعلق نواب صاحب مالیر کوٹلہ کے ساتھ تھا ۔یوسف صاحب خوبصورت ہیں ۔شریفن کو بھی یوسف صاحب سے بے حد محبت ہو گئی بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اس محبت کے سلسلہ میں شریفن نے ہی پہلے قدم اٹھایا۔

یوسف صاحب اور شریفن کا تعلق پہلے تو راز میں رہا۔اور شریفن کی والدہ کو اور اس کے بھائیوں کو کوئی علم نہ ہوا۔ان تعلقات کے بڑھنے پر جب شریفن کے خاندان کے لوگوں کو علم ہوا تو انہوں نے اس کی سخت مخالفت کی اور قدم قدم پر مخل ہونا چاہا ۔کیونکہ یہ لوگ نوابوں اور مہاراجوں کے متلاشی تھے یوسف صاحب کے ذرائع آمدنی محدود تھے ۔اور وہ مالی اعتبار سے شریفن کے گھر والوں کی خواہش پوری نہ کر سکتے تھے آخر کش مکش شروع ہوئی ۔شریفن اور یوسف صاحب آپس میں تعلقات قائم رکھنا چاہتے تھے ۔مگر شریفن کے والدین قدم قدم پر مخل ہوتے ۔یہ تعلقات کچھ عرصہ تک تو در پردہ جاری رہے آخر یوسف صاحب کے لیے مشکلات پیدا ہوئیں اور آپ نے چاہا کہ آپ کی شریفن کے ساتھ شادی ہو جائے شادی کے لیے آپ نے مشورہ کیا تو ایڈیٹر ''ریاست'' نے کہا کہ شریفن کے خاندان کے لوگوں کو سمجھا کر ان کو بھی شادی پر آمادہ کر لینا چاہیے ۔چنانچہ مشورہ کے بعد ایڈیٹر ''ریاست'' نے شریفن کی والدہ جو ریٹائرڈ طوائف تھیں بلو بھیجا جب وہ آئیں تو ہم لوگ کناٹ پلیس کی گھاٹ پر جا بیٹھے ۔یوسف صاحب نے عزت و احترام یا خوشامد کے باعث اپنا سلک کا کوٹ اتار کر اماں جی کے لیے گھاس پر بچھا دیا ۔باتیں شروع ہوئیں میں نے محبت کے فلسفہ پر ایک طرح کا وعظ شروع کیا ۔کہ محبت خدا ہے اور خدا محبت ۔رسول اللہ بھی محبت کو پسند

کرتے تھے اور تمام نبیوں اوتاروں اور گوروؤں نے محبت کے درجہ کو بہت بلند قرار دیا ہے۔ محبت سے روح پاک ہوتی ہے اور اس شادی کو شادی نہیں سمجھنا چاہیے جس کی تہہ میں محبت نہ ہو وغیرہ۔ آخر میں کہا کہ چونکہ یوسف صاحب اور شریفن کی آپس میں محبت ہے اس لیے ان دونوں کی شادی ہو جائے تو اچھا ہے۔ تاکہ شریفن حرام کی زندگی کو چھوڑ کر ایمان وراحت کی زندگی بسر کرے۔ شریفن کی والدہ کو میں نصف گھنٹہ کے قریب سمجھاتا رہا اور وہ میرا منہ دیکھتی رہیں اور خاموشی کے ساتھ سنتی رہیں میں جب اپنی تمام نصیحتوں کا ذخیرہ ختم کر چکا تو شریفن کی والدہ نے پنجابی زبان میں چونکہ یہ مالیر کوٹلہ کی تھیں جواب دیا جس کا ترجمہ یہ تھا:

سردار جی! آپ کس خیال میں پھر رہے ہیں۔ ہمارے گھروں میں تو محبت کو بڑا عیب سمجھا جاتا ہے۔ ہماری بچیاں جب پیدا ہوتی ہیں تو ان کے کانوں میں کہا جاتا ہے کہ آئندہ زندگی میں جو دل چاہے کرنا مگر محبت کسی سے نہ کرنا۔ جب ی بڑی ہوتی ہیں تو ایک ہی سبق دیا جاتا ہے کہ محبت محبت کہنے والے لوگ خود غرض اور بدمعاش ہیں جن کا متصد یہ ہے کہ یہ شریف لڑکیوں کو گھروں سے باہر نکال کر لے جائیں اور برباد کر دیں۔ ہمارے دل سے پوچھو تو ہم کہتے ہیں کہ اگر لڑکی نے کسی آشنا یا دوست سے محبت کرنی ہوتی تو بہتر ہے کہ وہ مر جائے اور ہم اس کے جنازہ کو بھی کندھا نہ دیں میں تو سنتی تھی کہ اخبار والے بہت شریف آدمی ہوتے ہیں آپ کہاں کے شریف ہیں جو لوگوں کی لڑکیوں کو برباد کرنے پر تلے بیٹھے ہیں۔ ہمارا گھر تباہ ہو جائے گا تو آپ کے ہاتھ کیا آئے گا۔

شریفن کی والدہ کا جواب سن کر میں دنگ رہ گیا۔ اس سے کیا کہتا۔ میں نے سمجھ لیا کہ ان تلوں میں تیل نہیں۔ ہم وہاں سے اٹھے۔ شریفن کی والدہ کو بر شاہ بولا پر اس کے مکان کے قریب چھوڑا اور ہم دونوں واپس دفتر ''ریاست'' میں پہنچے۔ دیر تک مشورہ ہوتا رہا کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ آخر فیصلہ ہوا کہ شریفن بالغ ہے وہ خود چاہتی

ہے کہ اس کی شادی ہو۔ اس لیے اس کی ماں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے نکاح کرلیا جائے۔

شریفن کی والدہ اوراس کے بھائی شریفن کی بہت حفاظت کرتے تھے۔ کہ یوسف اس کو کہیں نکال کر نہ لے جائیں۔ اس کو اکیلے کبھی نہ جانے دیتے ہمیشہ ساتھ جاتے میں نے شریفن کے بڑے بھائی محمد عمر کو پیغام بھیجا کہ وہ شام کو شریفن کے ساتھ آ کر مجھ سے مل جائے یوسف کے ساتھ مشورہ کرنا ہے۔ محمد عمر شریفن کو ساتھ لے کر چھ بجے کے قریب میرے مکان پر آ گیا۔ یوسف موجود تھے۔ کچھ دیر تک تو ہم باتیں کرتے رہے اس کے بعد یوسف نے صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ کہ ایک ضروری معاملہ کا پتہ لینا ہے (اس زمانہ میں نواب بھوپال بنام ایڈیٹر ریاست کا مقدمہ چل رہا تھا) بھوپال کے دو افسر آج شام کسی گاڑی دہلی سے جائیں گے اور معلوم کرنا ہے کہ وہ کس گاڑی پر سوار ہوتے ہیں۔ اور کہاں جائیں گے۔ یوسف صاحب نے بناوٹی تشویش کا اظہار کیا کہ کس طرح پتہ لینا چاہیے۔ محمد عمر پنجاب کا رہنے والا مستعد آدمی تھا ہماری تشویش کو دیکھ کر کہنے لگا۔

''کس بات کی تشویش ہے مجھے بتاؤ میں پتہ لاتا ہوں''۔

محمد عمر کو میں نے ایک روپیہ ٹانگہ کے لیے دیا اور کہا کہ دو شخص ہیں دونوں نے اچکن اور ہیٹ پہن رکھی ہے۔ تم ریلوے سٹیشن پر سیکنڈ کلاس کے بکنگ آفس کے پاس جا کر کھڑے ہو جانا جب یہ دونوں آئیں تو پلیٹ فارم پر چلے جانا اور دیکھنا کہ کس گاڑی میں بیٹھے ہیں اور جب تک کہ رات کو جانے والی تمام گاڑیاں چلی نہ جائیں ان کی نگرانی کرنا کہ ان سے کون کون ملتا ہے۔ محمد عمر اس وقت کے مطابق سٹیشن چلا گیا اور سیکنڈ کلاس کے بکنگ آفس کے پاس رات کو دس بجے تک کھڑا رہا۔ جب تمام گاڑیاں نکل گئیں تو یہ بچا واپس آیا اور آ کر اس نے بتایا کہ اس نے خوب نگرانی کی اچکن اور ہیٹ والے بھوپال کے کوئی آدمی کسی گاڑی پر سوار نہیں ہوئے۔ بھوپال کے آدمی

کہاں آنے والے تھے اس بچارے کو تو صرف اس لیے ریلوے سٹیشن بھیجا تھا کہ دو اڑھائی گھنٹہ میں ہمیں شادی کا موقع مل جائے۔

محمد عمر کے جانے سے پہلے تمام انتظام ہو چکا تھا۔اس کے جانے کے بعد دہلی کے تحصیلدار امیر حسین رائے صاحب لالہ گوپال داس ریٹائرڈ ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر و آنریری مجسٹریٹ مسٹر برج بہار تو کلی ایڈووکیٹ اور دو تین اصحاب آ گئے قاضی صاحب تشریف لے آئے بتاشے چھوہارے اور مٹھائی منگائی گئی۔ریاست پریس کے فورمین استاد تصدق حسین نے لڑکی کے ولی کے فرائض ادا کیے اور تصدق حسین پہلے تو ہچکچائے مگر جب ان سے کہا گیا کہ یہ ثواب کا کام ہے تو آمادہ ہو گئے حق مہر لکھا گیا نکاح نامہ تیار ہوا اور اس پر تحصیلدار صاحب آنریری مجسٹریٹ اور وکیل صاحبان اور ایڈیٹر ریاست کے بطور گواہوں کے دستخط ہوئے قاضی صاحب نے شریفن بی بی سے قبول ہے وغیرہ پوچھا شریفن بی بی نے بھی ہاں قبول ہے کہا نکاح ہوا چھوہارے بتاشے اور مٹھائی لڑکی والوں اور برات میں تقسیم ہوئی اور یہ تمام کارروائی نو بجے سے پہلے ختم کر دی گئی۔

دس بجے مسٹر محمد عمر صاحب تشریف لائے تو اس سے پہلے لڑکی والے اور برات والے چھوہارے اور مٹھائی کھا کر روانہ ہو چکے تھے۔کمرہ میں صرف دلہن یعنی شریفن اور دولہا یعنی یوسف صاحب اور ایک گواہ یعنی ایڈیٹر ریاست بیٹھا تھا۔اور پاس پھولوں کے دو تین ہار پڑے تھے۔جو دولہا اور دولہن کو شادی کے وقت پہنائے گئے تھے۔محمد عمر بیچارے کو کیا علم کے اس کے سٹیشن سے واپس آنے سے پہلے بقول اس کی والدہ کے ان کا گھر برباد ہو چکا ہے۔اور یوسف صاحب کا گھر آباد ہو چکا ہے۔محمد عمر کے آنے پر شریفن اپنے بھائی محمد عمر پر برس پڑیں کہ اتنی دیر سے اس کا انتظار کیا جا رہا ہے اماں گھر میں ناراض ہوتی ہوں گی کہاں چلا گیا تھا اور اس نے سٹیشن پر اتنی دیر کیوں لگائی۔محمد عمر اگرچہ عمر میں شریفن سے کافی بڑا تھا۔مگر طوائفوں میں چھوٹی عمر کی لڑکیاں

بھی بڑے عمر کے بھائی اور ماں باپ کو ڈانٹ لیتی ہیں۔کیونکہ وہ جانتی ہیں خہ یہ تمام لوگ ٹکڑ گدا اور ان کے رحم پر ہیں۔محمد عمر بیچارے نے اس ڈانٹ کا صرف یہی جواب دیا کہ اگر کام پورے طور پر نہ کر کے آتا تو سردار صاحب یعنی دیوان سنگھ ناراض ہوتے۔اب میں اگر حکم کی پورے طور پر تعمیل یعنی بھوپال کے لوگوں کی اچھی طرح سے نگرانی کر کے آیا ہوں تو تم ڈانٹتی ہو۔اس کے بعد شریفن اور اس کا بھائی تو اپنے گھر چلے گئے اور یوسف صاحب اپنے گھر۔

اس شادی کا علم سوائے قاضی صاحب دولہا دلہن یا گواہوں اور براتیوں کے کسی دوسرے کو نہ تھا۔اس وقت تک شریفن کی والدہ اپنی لڑکی کے مجبور کر کے صرف اس حد تک آمادہ تھی کہ اس کا تعلق یوسف سے بھی رہے۔اور وہ ہمیشہ کے ذریعہ امراء کے طبقہ سے روپیہ بھی پیدا کرتی رہے۔مگر شادی کے بعد نئے جھگڑے شروع ہوئے۔شریفن نے دوسرے لوگوں کے ہاں جانا یا ان سے بات تک کرنا چھوڑ دیا۔اس کی والدہ اور اس کے بھائی مجبور کرتے ہیں مگر یہ نہیں مانتیں نواب صاحب مالیر کوٹلہ کے پیغام آتے ہیں کہ مالیر کوٹلہ آؤ۔مگر شریفن دہلی چھوڑنا نہیں چاہتی۔اور نواب صاحب کی پروا کرنے کے لیے تیار نہیں دوسرے لوگ آتے ہیں تو ان کے سامنے نہیں ہوتیں ایک دو ماہ کے جھگڑے کا یہ سلسلہ جاری رہا آخر شریفن نے اپنی والدہ سے کہہ دیا۔کہ چونکہ اس کا نکاح یوسف کے ساتھ ہو چکا ہے اس لیے وہ کسی دوسرے آدمی کے ساتھ تعلق نہیں رکھیں گی۔اس کو وہ حرام سمجھتی ہیں اور اگر ان لوگوں نے تنگ کیا تو وہ گانا بھی چھوڑ دیں گی اور یوسف کے گھر جا کر پردہ میں بیٹھ جائیں گی۔شریفن کے اس انکشاف کو سن کر شریفن کی ماں اور بھائی سر پیٹ کر بیٹھ گئے۔ان کو اب پتہ چلا کہ ان کا گھر تباہ ہو گیا ہے۔اور وہ لٹ چکے ہیں۔ان لوگوں کی نگاہ میں سب سے بڑا مجرم دیوان سنگھ تھا جس نے نکاح کا انتظام کیا۔ہر روز شکوے ہر روز شکایتیں کبھی یہ کہ شریفن نے روپیہ کمانا چھوڑ دیا ہے۔کھائیں کہاں سے نواب صاحب مالیر کوٹلہ اتنے

سو روپیہ ماہوار دیتے تھے اب پیسہ کی آمدنی نہیں برباد ہو گئے ۔ کہاں جائیں کیا کریں ۔ یوسف صاحب کی آمدنی کم ہے ۔ ہمارے اخراجات پورے نہیں ہوتے ۔ جب ان شکایات کا سلسلہ بہت تیز ہو گیا تو یوسف صاحب شریفن کو لے کر اپنے گھر چلے گئے ۔ اور انہوں نے اپنی بیوی کو پردہ میں بٹھا دیا اور شادی کے دو تین سال کے اندر دو لڑکیاں بھی پیدا ہو گئیں یوسف صاحب کی آمدنی محدود تھی دو تین سال تو ان کے اچھے گزرے مگر بچوں کے ہونے کے بعد شریفن کی محبت قدرتی طور پر اپنے شوہر کی طرف سے بچوں کی طرف منتقل ہو گئی ۔ وہ پہلے تو ساتھ مرنے کا دم بھرتی تھیں ۔ اب شکایت ہے کہ فلاں بچے کے لیے ریشمی فراک نہیں آیا اور فلاں بچے کے لیے جوتا اور ٹوپی نہیں ۔ ان شکایتوں نے سنجیدہ صورت اختیار کر لی ۔ ادھر شریفن کی ماں کو جب یہ معلوم ہوا کہ شریفن مطمئن نہیں ۔ اس نے پھر اپنی بیٹی پر ڈورے ڈالنے شروع کر دیے ۔ وہ جب شریفن سے ملتیں یہی کہتیں کہ نواب صاحب نے دو سو روپیہ کی ساڑھیاں لے دی تھیں فلاں راجہ صاحب نے جڑاؤ گلوبند دے دیا تھا اور فلاں سیٹھ صاحب نے موٹر دینے کا وعدہ کیا تھا ۔ ان باتوں کا ذکر شریفن کی آنکھوں سے آنسو نکال دیتا ۔ کیونکہ اگر اچھے دن دیکھے ہوں تو پھر برے دنوں کا مقابلہ کرنا بہت مصیبت ہوتا ہے ۔ شریفن خاندانی طوائف تھی ۔ اس نے بچپن ہی سے دیکھا تھا کہ ان کے آنکھ کے اشارے پر کیونکر بڑے سے بڑے نواب راجے اور امیر ڈانس کرتے ہیں ۔ ایک متوسط درجہ کے گھر میں رہ کر معمولی گزارہ پر کیونکر مطمئن ہوتی نتیجہ یہ ہوا کہ دن رات جھگڑے رہنے لگے اور پھر اپنے والدین کے ہاں چلی گئی ۔ اسکے چلے جانے کے بعد یوسف صاحب نے بہت کوشش کی کہ واپس آ جائے اور گھریلو زندگی بسر کرے مگر یہ اپنے والدین کے ہاتھوں میں تھی ۔ یوسف صاحب کو قدرتی طور پر صدمہ ہوا ۔ آپ نے اپنی بیوی اور اس کی والدہ پر مقدمہ دائر کر دیا ۔ یہ مقدمہ بھی کچھ عرصہ چلتا رہا ۔ آخر یوسف صاحب کو مشورہ دیا گیا کہ جس صورت میں شریفن پھر اپنی ماں اور

بھائیوں کے پاس غالباً مالیر کوٹلہ میں رہتی ہے۔اس نے اپنا آبائی پیشہ چھوڑ دیا ہے اس کی چھوٹی بہنیں اس کے بعد پیشہ کرتی رہیں جس سے ان کو کافی آمدنی تھی۔اب نہیں کہا جا سکتا کہ ان کی آمدنی کی کیا صورت ہے۔یوسف صاحب سے اب باتوں باتوں میں کبھی شریفن کا ذکر آجائے تو ان کی پیشانی پر بل پڑ جاتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ اب ان کے دل میں محبت کی جگہ انتقام اور انتقام کے بعد نفرت پیدا ہو چکی ہے۔ اور وہ شریفن کا نام سننا بھی پسند نہیں کرتے۔

اوپر کے ان واقعات سے طوائفوں کی فطرت کا اندازہ ہوتا ہے جب کہ طوائف محبت کے جذبات سے مغلوب ہو تو اپنی طوائفیت کو عارضی طور پر بھول جاتی ہے۔مگر اس کے بعد جب محبت کے یہ جذبات کم ہوں گے چاہے اس کی وجہ محبت کا بچوں میں منتقل ہونا ہی کیوں نہ ہو۔ہر عورت کی فطرت ہے کہ اس کی سگائی کے دن سے لے کر بچہ ہونے تک اس کی محبت کا مرکز سو فیصدی اس کا شوہر ہوتا ہے۔بچہ ہونے کے بعد یہ محبت دو حصوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔دسواں حصہ اس کے شوہر کے لیے وقف رہتا ہے۔باقی نوے فیصدی بچہ پیدا ہوتے ہی بچہ میں منتقل ہو جاتا ہے۔اور جو لوگ اولاد ہونے کے بعد اپنی بیویوں سے محبت کے کم ہونے کی شکایت کرتے ہیں وہ محبت کے فلسفہ سے نا آشنا ہونے کا ثبوت دیتے ہیں۔کیونکہ عورت فطرتاً مجبور ہے کہ اس کی محبت بچہ پیدا ہونے کے بعد فوراً بچہ میں منتقل ہو جائے۔تو یہ زیادہ طویل عرصہ تک گھریلو زندگی بسر نہیں کر سکتیں۔اور اگر کرتی بھی ہیں تو ان کو ان کے عاشقوں اور مرنیوالوں کی یاد ہمیشہ تڑپاتی ہے۔

بھوپال اور خیر پور میرس کے مرحوم منسٹر خان بہادر سر اسرحسن بہت تجربہ کار اور وضعدار بزرگ تھے ایڈیٹر ''ریاست'' کو اپنا عزیز سمجھتے تھے اور جب بھی دہلی آتے ان سے کئی کئی گھنٹے باتیں کرنے کا اتفاق ہوتا۔ایک بار آپ نے فرمایا کہ انسان گھوڑا کتا اور بلی خریدتا ہے تو خریدنے سے پہلے دیکھتا ہے کہ یہ کس نسل کا ہے۔دوغلہ تو نہیں یعنی

گھوڑا ہے تو کیا خالص عربی ہے کتا ہے تو کیا خالص سپینل یا فاکس ٹیریر ہے اور کیا بلی خالص پرشین ہے ۔ اگر جانوروں کے متعلق یہ احتیاط ہے تو انسانوں کے ساتھ دوستی رشتہ داری یا تعلقات قائم کرتے ہوئے کیوں نہ نسل یا خاندان دیکھا جائے ۔ سر اسرار حسن خاں صاحب کے اس خیال کی تائید میں ایڈیٹر ''ریاست'' کا بھی یہی تجربہ ہے کہ انسان جس خاندان میں پیدا ہویا جس فضا میں اس کی پرورش ہو اس کا انسان پر بہت بڑا اثر ہوتا ہے ۔ اول تو یہ کریکٹر بدلتا نہیں اور اگر بدلتا ہے تو اس شخص سے طویل عرصہ تک مسلسل بہت بڑی کوشش اور ضمیر کے ساتھ بار بار جدوجہد کرنے کے بعد دنیا کے کاروبار میں یہ دیکھ لینا چاہیے کہ جس کے ساتھ واسطہ پڑے گا اس کا پچھلا کریکٹر کیا ہے اور اگر کریکٹر میں کمزوریاں ہیں تو کیا ان کی اصلاح ممکن ہے ۔

راز داری اور کامیابی

دہلی سے روزانہ ''رعیت'' جاری ہونے سے کچھ عرصہ پہلے میں ریاست حیدر آباد دیا

۔راستہ میں چندر و ناندیر جہاں کہ گورو گوبند صاحب کا وصال ہوا اور جہاں ہندوستان

کے ایک سب سے بڑے شاعر شجاع اور محب الوطن کا مزار بھی ہے۔ٹھہرا۔ناندیڑ میں

گورو گوبند سنگھ اور شہنشاہ عالمگیر اورنگ زیب کی خط و کتابت کے متعلق مجھے کچھ ایسے

حالات معلوم ہوئے جو سکھ تاریخ میں درج نہ تھے۔(یہ حالات حیدر آباد سے واپسی پر

پمفلٹ کی صورت میں اور امرتسر سے روزانہ اردو اکالی کے گورو گوبند نمبر میں شائع

ہوئے ناندیڑ سے میں حیدر آباد گیا اور وہاں سے واپسی پر اورنگ آباد اتر کر اس گوردوارہ

میں گیا جو بھائی دیا سنگھ (گورو گوبند سنگھ کے زمانہ کے مشاہیر میں سے ایک بزرگ)

کے نام سے مشہور ہے۔اور جہاں بھائی دیا سنگھ اس وقت مقیم ہوئے جب وہ

گورو گوبند سنگھ کا خط (ظفر نامہ) لے کر اورنگ آباد اورنگ زیب کے پاس پہنچے۔

اس گوردوارہ میں گرنتھ صاحب کے سامنے ایک روپیہ بطور نذر رکھ کر میں نے ماتھا ٹیکا

(سجدہ کیا) اس گوردوارہ کا سفید ریش بوڑھا سکھ مہنت اور اس کی بیوی بھی وہاں موجود

تھے۔میں جب بیٹھ گیا تو اس مہنت اور میرے درمیان یہ گفتگو ہوئی۔

مہنت: آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟

میں: میں حیدر آباد سے آیا ہوں۔

مہنت: کہاں کے رہنے والے ہو؟

میں: میں پنجاب کا رہنے والا ہوں۔

مہنت: کون سا ضلع؟

میں: گوجرانوالہ۔

مہنت: کون سی تحصیل؟

میں: حافظ آباد۔

مہنت: کون سا گاؤں؟

میں: حافظ آباد خاص۔

مہنت: آپ کون سکھ ہیں؟

میں: کھتری کھنہ۔

مہنت: آپ کا مکان حافظ آباد میں کس طرف ہے۔

میں: جس گلی کے سرے پر ٹھا کر دوارہ اور لالہ جوتی رام کپور کا مکان ہے۔

مہنت: کیا آپ سردار میوہ سنگھ کے لڑکے ہیں؟

میں: نہیں نہیں میں ڈاکٹر ندھان سنگھ کا لڑکا ہوں۔ سردار میوہ سنگھ میرے چچا ہیں۔

مہنت: کیا آپ کا نام کرتار سنگھ ہے؟

میں: نہیں میں کرتار سنگھ کا چھوٹا بھائی ہوں۔ میرا نام دیوان سنگھ ہے۔

میرے اس کہنے کے بعد ایک خاموشی سی طاری ہوئی۔ اور میں نے محسوس کیا کہ اس بوڑھے سفید ریش سکھ مہنت کی آنکھیں کچھ تر سی ہوگئی ہیں میں حیران کہ یہاں ہزارہا میل دور یہ کون شخص ہے جو ہمارے گھر کے تمام لوگوں کو جانتا ہے کیونکہ اس نے ایک ایک کا نام لے کر پوچھا کہ فلاں کیسے ہیں اور فلاں کی صحت کیسی ہے۔ میں نے ان سے سوال کیا کہ آپ کس طرح ہم لوگوں کو جانتے ہیں۔ انہوں نے جواب دیا کہ بہت برس ہوئے ایک بار حافظ آباد جانے کا اتفاق ہوا تھا۔

یہ باتیں جب ہو چکیں تو مہنت صاحب اپنی بیوی کو اندر لے گئے۔ ان کے کان میں کچھ کہا۔ اس کے بعد ان کی بیوی نے میرے لیے بازار سے مٹھائی منگوائی سنگترے وغیرہ پھل ان کے گھر میں موجود تھے۔ انہوں نے میرے سامنے رکھا میں محسوس کر رہا تھا۔ کہ میرا ان کے گھر آنا ان کے لیے باعث مسرت ہے۔ ان بزرگوں نے بہت کوشش کی۔ کہ میں دو چار روز ان کے ہاں مہمان رہوں مگر میرا بستر ہ اور ٹرنک ایک ریٹائرڈ سکھ صوبیدار کے ہاں پڑا تھا جو مجھے ناندیڑ ملے تھے۔ اور جنہوں نے مجھے

اورنگ آباد آنے کی دعوت دی تھی ۔ ان کے ہاں سے میں صوبیدار کے ہاں پہنچا۔ وہاں کھانا کھایا اور انہوں نے میرے لیے مرغ پکا رکھا تھا۔ یہ مرغ بہت مرغن تھا۔ میں نے کھانا کھاتے ہوئے محسوس کیا کہ انہوں نے گھی بہت زیادہ ڈال دیا ہے۔ تو انہوں نے مجھے ایک کٹوری چربی کی دکھائی ۔ جو مرغ پکاتے ہوئے انوں نے پکانے والے برتن میں سے نکالی تھی وار کہا کہ گھی کا تو ایک قطرہ بھی نہں ڈالا۔ بلکہ یہ چربی اس مرغ کی ہے جو پکتے پکتے نکال لی گئی ۔ میں حیران کیونکہ میری زندگی میں یہ سننے کا پہلا موقع تھا۔ کہ مرغ میں سے بھی چربی نکالی جاتی ہے۔ میری حیرانی دیکھ کر صوبیدار صاحب نے بتایا کہ ان کے ہاں پانچ بھینسیں ہیں ۔ یہ رات کو بھینس کے دودھ میں چنے کی دال بھگو دیتے ہیں اور صبح جب دودھ والی دال ان مرغوں کو کھلاتے ہیں اور ایسی دال پر ہی ان کی ہمیشہ پرورش کی جاتی ہے ۔ جس کے باعث یہ بہت فربہ اور چربی والے ہین ۔ چنانچہ میں نے ان مرغوں کو دیکھا تو حیران رہ گیا ۔ اتنے فربہ مرغے میں ں ے اس سے پہلے کبھی نہ دیکھے تھے ۔ اور کبھی سنا بھی نہ تھا کہ بغیر گھی کے مرغ پکایا جائے ۔ اور اس کے پکتے پکتے ایک کٹوری چربی کی نکال لی جائے ۔

اورنگ آباد میں ایک رات رہا ۔ اگلی صبح روانہ ہوا تو مہنت صاحب ملنے کے لیے تشریف لائے ۔ میں پنجاب آیا حافظ آباد پہنچا تو اپنے چچا سردار میوہ سنگھ کو بتایا کہ اورنگ آباد میں اس طرح مہنت صاحب سب کے متعلق پوچھتے تھے ۔ میں نے حلیہ بیان کیا تو خیال ہوا کہ اورنگ آباد والے مہنت صاحب ہمارے ایک رشتہ دار ہیں ۔ جنہوں نے میری پرورش سے پہلے حافظ آباد میں ایک عورت کا قتل کیا تھا ۔ قتل کرنے کے بعد بھاگ گئے تھے ۔ ریاست حیدر آباد پہنچے ۔ اس قتل کے واقعہ کا انہوں نے اپنی زندگی میں کبھی کسی سے ذکر نہ کیا ۔ اور رحدر آباد میں ۃ ی مقیم ہو گئے جب وہ قتل کرنے کے بعد حیدر آباد سے بھاگے تو نوجوان تھے اور جب میں نے اورنگ آباد ان کو دیکھا تو وہ سفید ریش بوڑھے تھے ۔ میرے تمام حالات بیان کرنے کے بعد میرے چچا

سردار میوہ سنگھ نے اورنگ آباد مہنت صاحب کو خط لکھا تو ان کا جواب آیا کہ ہاں وہ فی الحقیقت میں ہی ہوں۔

یہ مہنت صاحب غالباً انتقال کر چکے ہیں کیونکہ اس وقت بھی کافی بوڑھے تھے اس واقعہ سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اگر یہ مہنت صاحب اس قتل کے متعلق راز نہ رکھتے تو گرفتار کیے جا کر سالہا سال پہلے پھانسی پر چڑھ چکے ہوتے۔ مگر چونکہ انہوں نے راز رکھا اور آپ نے کسی دوست یا تعلق والے بلکہ اورنگ آباد والی بیوی اور بچوں سے بھی کبھی ذکر نہ کیا اور زندہ رہے اور اپنی طبعی عمر تک پہنچے۔

اس واقعہ کے ساتھ اس قسم کا ہی ایک اور واقعہ سنیئے جو راز نہ رکھنے کے متعلق ہے۔

سنہ ۱۹۴۰ء میں جب میں دہلی جیل میں تھا تو اس وقت سپیشل کلاس والی کاٹیج کے سامنے کی کوٹھڑیوں میں دہلی کا ایک شخص موہن قتل کے الزام میں گرفتار تھا۔ اس موہن سنگھ نے دہلی میں قتل کیا تو قتل کرنے کے بعد ہی دہلی سے بھاگ کر ناگ پور چلا گیا۔ ناگپور پہنچ کر اس نے پان سگریٹ کی دکان جاری کر لی اور زندگی گزارنے لگا۔ دہلی میں پولیس نے اس کے وارنٹ نکال دیے مگر پولیس کو معلوم نہ ہو سکا کہ یہ کہاں ہے۔

یہ موہن عیاش طبیعت کا آدمی تھا اور شراب پیتا تھا۔ انسان جہاں بھی ہو وہاں کے لوگوں کے ساتھ تعلقات ہو جاتے ہیں موہن کو بھی ناگپور میں کئی لوگوں کے ساتھ واقفیت ہو گئی اور اس کے کئی دوست ہم نوالہ و ہم پیالہ بھی ہو گئے۔ ان دوستوں میں سے ایک شخص اس کا گہرا اور راز دار دوست ہو گیا۔ دونوں اکٹھے شراب پیتے اور اکٹھے ہی عیاشی کرتے۔ چنانچہ ایک روز موہن نے اعتماد کرتے ہوئے اس دوست کو بتا دیا کہ وہ دہلی کا رہنے والا ہے وہاں اس نے ایک قتل کیا تھا اور اب وارنٹ نکلے ہوئے ہیں۔ یہ بتانے کے بعد بھی دوستی کا سلسلہ جاری رہا اور چھ ماہ کے قریب گزر گئے اس کے بعد ان دونوں دوستوں کے درمیان اختلاف پیدا ہوا اور یہ اختلاف بڑھتے بڑھتے دشمنی کی حد تک پہنچ گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس شخص نے پولیس والوں کو جا کر یہ کہہ دیا کہ

موہن ایک قتل کے سلسلہ میں مفرور ہے اوراس کے وارنٹ نکلے ہوئے ہیں۔پولیس نے یہ سنتے ہی رجسٹر میں رپورٹ درج کی اوراس کے دستخط کرائے۔اور دستخط کرانے کے بعد موہن کی دکان پر پہنچ کرا سے گرفتار کرلیا۔تھانہ میں لا ر دفعہ ۱۰۹ (آوارہ گردی) کے مطابق اس کوحوالات میں بند کر دیا۔اوردہلی پولیس کوتار دے دیا کہ کیا موہن نام کا کوئی شخص قتل کے الزام میں دہلی سے مفرور ہے۔دہلی سے جواب گیا کہ ہاں ہے چنانچہ موہن رپ دفعہ ۱۰۹ کی بجائے دفعہ ۳۰۲ (قتل) لگا کراور پاؤں میں بیڑیاں پہنا کرا سے جیل لایا گیااورقتل کے الزام میں اس پرسیشن کورٹ میں مقدمہ چلا اس موہن کا مقدمہ چل رہا تھا کہ میں جیل سے رہا ہوگیا۔مجھے علم نہیں کہ اس مقدمہ میں موہن کو پھانسی ہوئی یا عمر قید یا بری ہوا مگر ان تمام واقعات سے یہ ثابت ہے کہ اس پر قتل کے الزم میں گرفتار ہونے اور مقدمہ چلنے کا باعث اس کا راز نہ رکھنا تھا۔اوراگر یہ ناگپور میں اس دوست پر اپنا راز ظہر نہ کرتا تو اس پر یہ مصائب نازل نہ ہوتیں۔

اوپر کے ان دو واقعات سے راز رکھنے اور راز کے افشا کرنے کے نتائج ظاہر ہیں۔یہ پوزیشن تو جرائم کے متعلق ہے مگر غور سے دیکھا جائے تو سیاسی معاملات زندگی کی ہر روز کے واقعت اور تجارت وغیرہ ہر کامیابی کے لیے انسان کوراز کی ضرورت ہے۔اور وہ لوگ بہت بے وقوف اور عاقبت نا اندیش ہیں جو اپنا راز غیر ذمہ دار لوگوں کو بتائیں اور یہ توقع کریں کہ وہ ان کی ہدایت کے مطابق ان کا راز کسی دوسرے پر ظاہر نہ کریں۔اور راز افشا ہونے پر راز کے افشا کرنے کی شکایت یا گلہ کریں۔چنانچہ میرا تو خیال یہ ہے کہ کسی اہم راز کو غیر مناسب اور غیر ذمہ دار لوگوں پر ظاہر کرنا بالکل ایسا ہے جیسے اپنے گلے میں رسی ڈال کر دوسرے کے ہاتھوں میں دے دی جائے اور پھر التجا کی جائے کہ اس رسی کو نہ کھینچے۔گلا گھٹ کر مر جاؤں گا۔

☆☆☆

روحانیت کا تجربہ

اب تو کئی برس سے وقت نہیں ملا۔ مگر پہلے میرا یہ معمول تھا کہ چھ سات جون کے قریب جب دہلی میں گرمی کا زیادہ زور ہوتا تو میں دو ہفتہ کے لیے بمبئی چلا جاتا۔ بمبئی میں ہمیشہ آٹھ اور بارہ جون کے درمیان مون سون کی ہوائیں شروع ہو جاتی ہیں۔ اور موسم بہت پر فضا ہو جاتا ہے۔ دہلی میں بارش ۲۰ جون کے قریب شروع ہوتی ہے اور بارش کے پہلے کے دو ہفتے دہلی میں حشر سے کم نہیں ہوتے۔ چنانچہ میں بمبئی پہنچ کر جون کے آخری ہفتہ کا منتظر رہاتا۔ جب یہاں سے بارش کے متعلق تار پہنچتا تو وہاں سے روانہ ہو جاتا۔ بمبئی کے یہ دو ہفتے بہت دلچسپیوں میں گزرتے۔ چودھری عبدالغنی جنرل سیکرٹری آل انڈیا خلافت کمیٹی (جنہن کے مہاتما گاندھی نے یاروواجیل میں اردو پڑھی اور جن کا لندن میں انتقال ہوا گیا تھا) اور مرحوم مولانا عرفان (فنانشیل سیکرٹری خلافت کمیٹی) کا زیادہ وقت میرے ساتھ گزرتا۔ آہ ان دنوں دوستوں کا اخلاص اور محبت میں کبھی نہ بھولوں گا۔

میں دہلی سے روانہ ہوا۔ جب گاڑی کلیان کے سٹیشن پہنچی تو میں نے ٹائمز آف انڈیا کا پرچہ اس روز کی تازہ خبریں پڑھنے کے لیے خریدا۔ خبریں دس پندرہ منٹ میں ختم ہو گئیں میں سامان باندھ چکا تھا۔ اور ساتھ کی کتابیں بکس میں بند تھیں۔ پڑھنے کے لیے صرف ٹائمز آف انڈیا کا پرچہ ہی تھا۔ خبریں پڑھنے کے بعد میں نے اشتہارات دیکھنے شروع کیے تو ایک اشتہار تھا جس کا ترجمہ یہ ہے:

روحانی تحریر

آئندہ اور پچھلے حالات روح کے ذریعہ کاغذ پر لکھے جاتے ہیں۔ مردہ اشخاص سے بھی بات چیت کی جا سکتی ہے۔ محمود بے مصری

یہ اشتہار میرے لیے کشش کا باعث ہوا۔ کیونکہ مجھے شروع ہی سے روحوں کے

متعلق واقفیت حاصل کرنے کا ایک خبط سا تھا۔ میں بمبئی کے وکٹوریہ ٹرمینس پہنچا اور دفتر ''ریاست'' بمبئی کے مینجر مسٹر ہربنس لال موجود تھے میں نے یہ اشتہار کاٹ کر ان کو دیا اور کہا کہ کسی وقت ان کے پاس جا کر میری ملاقات کے لیے وقت مقرر کر لیجیے ۔مسٹر ہربنس لال اسی روز مسٹر محمود بے کے پاس پہنچے اور جب ملاقات کے لیے پوچھا تو مسٹر محمود بہت خوش ہوئے ۔ وہ اخبار ''ریاست'' سے واقف تھے اور مقدمہ نواب بھوپال بنام ایڈیٹر ''ریاست'' کو دلچسپی کے ساتھ پڑھا کرتے تھے ۔آپ نے اگلے روز شام کا وقت مقرر کیا اور کہا کہ ایڈیٹر صاحب ''ریاست'' کو شام کو چائے بھی ان کے ساتھ پیے۔

میں اگلے روز شام کو مسٹر محمود بے کے پاس پہنچا۔ انہوں نے تکلف کے ساتھ چائے کا انتظام کیا تھا اور وہ ایک خوبصورت یورپین لڑکی (جو ان کی سیکرٹری تھیں) کے ساتھ بیٹھے میرا انتظار کر رہے تھے ۔ میں جب پہنچا تو آپ نے میرا گرم جوشی کے ساتھ خیر مقدم کیا۔ ہم تینوں نے بیٹھ کر چائے پی ۔مقدمہ اور اخبار کے متعلق باتیں ہوتی رہیں ۔ جب ہم چائے پی چکے تو میں نے کہا کہ اب میں اصل مقصد بیان کرتا ہوں ۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ کی روحانی تحریر کو دیکھوں جس کا آپ نے اخبار میں اشتہار دیا ہے ۔مسٹر محمود بے نے بیرا کو آواز دی چائے کی میز خالی کر دی گئی ۔اور آپ نے میرے ہاتھ کو ایک بالکل کورا کاغذ دیا۔اور کہا کہ بغیر ان کو دکھائے اس کاغذ پر تین یا پانچ سوالات لکھ لیے جائیں اور لکھنے کے بعد اس کاغذ کو تہ کر دیا جائے ۔مسٹر محمود بے نے یہ کہہ کر اپنی سیکرٹری کے ساتھ دوسرے کمرے میں چلے گئے میں نے تنہائی میں پنسل کے ساتھ یہ سوالات لکھے:

۱۔آج دہلی میں بارش ہوئی یا نہیں؟

۲۔آج امریکہ میں گندم کا نرخ کیا ہے؟

۳۔مقدمہ میں جیتوں گا یا ہاروں گا؟

ان سوالات کو لکھ کر میں نے کاغذ کو بند کیا اور مسٹر محمود بے کو آواز دی کہ آ جایئے۔ مسٹر محمود بے آ کر میز کی دوسری طرف بیٹھ گئے ارو مجھ سے کہا کہ تہہ شدہ کاغذ کو پنسل کے ساتھ اپنے ہاتھ میں رکھ لوں میں نے ایسا کیا مسٹر بے مجھ سے دور بیٹھے اور منہ میں کچھ پڑھتے رہے۔ پانچ سات منٹ پڑھنے کے بعد آپ نے مجھ سے کہا کہ میں تہہ شدہ کاغذ کھولوں میں نے جب کاغذ کھولا تو اس میں ہر سوال کے آگے جواب لکھا تھا۔

۱۔ آج دہلی میں بارش نہیں ہوئی۔

۲۔ امریکہ میں گیہوں کا نرخ چار روپیہ من ہے۔

۳۔ میں مقدمہ جیتوں گا۔

ی جوابات پنسل سے ہر سوال کے آگے لکھے تھے اور اس قسم کی تحریر تھی جیسے لکھنے والے کے ہاتھوں میں رعشہ ہو اور لکھتے ہوئے ہاتھ کانپتے ہوں۔

میں ان جوابات کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ کورا کاغذ لیا خود سوالات لکھے کاغذ میرے ہاتھ میں رہا مسٹر محمود بے مجھ سے چھوئے تک نہیں۔ یہ جوابات کون لکھ گیا۔ مسٹر محمود بے نے مجھے بے وقوف بنالیا۔ یا فی الحقیقت مسٹر محمود بے ایک روحانی بزرگ ہیں۔ کیا یہ جواب روح نے لکھے اور اگر محمود بے فی الحقیقت روحانی بزرگ ہیں تو ان کے پاس یہ خوبصورت لڑکی کیوں۔ کیا روحانیت میں کمال حاصل کرنے کے لیے خوبصورت لڑکی کا ہونا ضروری ہے۔ ذہن میں مختلف خیالات تھے۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ معاملہ کیا ہے۔ میں خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں۔ آخر میں نے مسٹر محمود بے سے کہا کہ آپ نے کمال کر دیا۔ میں ان واقعات کو دیکھ کر یہی کہہ سکتا ہوں کہ اگر آپ روحانی بزرگ ہیں اور یہ تحریر آپ کے حکم سے روح نے لکھی ہے تو میرے دل میں آپ کے لیے بہت بڑی عزت ہونی چاہیے کیونکہ روحانی بزرگ ہیں اور اگر یہ روح کا کام ہے صرف ہتھکنڈے کا کام ہے تو میرے دل میں آپ کے لیے اس عزت (جو آپ کے روحانی بزرگ ہونے کا باعث میرے دل میں ہونی چاہیے) سے کئی سو گنا زیادہ قدر ہے ہ

آپ نے مجھ جیسے اپنے آپ کو بہت ہوشیار سمجھنے والے کو بھی بے وقوف بنا دیا اور آپ کے اس کمال کے سامنے مجھے سجدہ کرنا چاہیے۔

مسٹر محمود بے اور ان کی سیکرٹری کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ اور دونوں نے میری بے تکلفی اور صاف بیانی کی داد دی۔ مسٹر محمود بے نے میرے کہنے پر جواب دیا کہ یہ روح کا کام ہے ہتھکنڈے کا نہیں۔ میں مسٹر محمود بے کے اس جواب سے مطمئن نہ تھا اور سمجھتا تھا کہ اس راز کا کیوں کر پتہ لیا جائے۔ میں نے مسٹر محمود بے کو اپنے ہوٹل میں ڈنر پر آنے کو کہا۔ وہ ایک روز بعد رات کو آئے کھانے کے ساتھ انہوں نے وہسکی پی۔ کھانے کے بعد ہم سیر کے لیے موٹر میں گئے پھر ان کو میں ان کے مکان پر چھوڑ کر واپس آ گیا۔

مسٹر محمود بے کی باتوں سے مجھے معلوم ہوا کہ یہ اپنی اس روحانیت سے چار پانچ ہزار روپیہ ماہوار پیدا کر لیتے ہیں۔ قیمتی موٹر بیرے خانسامے اور دوسرے اخراجات طبعاً فیاض ہیں جس کا نتیجہ یہ کہ ہمیشہ مقروض۔ میں ان سے باتیں کرتا تھا اور سوچتا تھا کہ اس سے پہلے تو ہمیشہ یہی سنتا تھا کہ روحانیت میں نہ کھاؤ نہ پیو۔ راتوں کو جاگتے رہو۔ اب تکلیف اٹھاؤ گے تو بہشت میں مزے لوگے اور زندگی کی کوئی قیمت نہیں وغیرہ کی باتیں ضروری ہیں۔ مگر اب پتا چلا کہ روحانیت میں اچھا کھانا قیمتی شراب پینا یورپین لڑکیاں بطور سیکرٹری رکھنا سینما دیکھنا اور زندگی کو پرلطف بسر کرنا ممکن ہے اور ایسی صورت میں روحانیت کا سودا مہنگا نہیں۔

میں بمبئی میں دو ہفتے رہا۔ اس عرصہ میں قریب قریب ہر روز مسٹر محمود بے سے ملا اور ''روحانیت'' پر تبادلہ خیالات ہوتا رہا۔ مسٹر محمود بے نے یہ خواہش ظاہر کی کہ چونکہ میں پراپاگنڈا اور اشتہارات کے فن سے واقف ہوں ان کے ساتھ امریکہ چلوں۔ امریکن لوگ مشرقی روحانیت کے بہت دلدادہ ہیں۔ اس سے پہلے سوامی رام تیرتھ اور دوسرے کئی سوامی وہاں روحانیت کی دھاک بٹھا چکے ہیں۔ اگر ہم چھ ماہ بھی وہاں

رہیں تو روح کے ساتھ کاغذ پر لکھ کر ہم لاکھوں روپیہ پیدا کر لیں گے۔ میں مسٹر محمود بے کی اس سکیم سے بالکل متفق تھا۔ چونکہ نواب بھوپال والا مقدمہ عدالت میں تھا اور میرے لیے امریکہ جانا ناممکن تھا یہ سکیم عملی صورت اختیار نہ کر سکی۔

مسٹر محمود بے نے مجھ سے یہ وعدہ کیا کہ وہ کاغذ پر روح کے ساتھ لکھا مجھے دو ہفتے میں سکھا سکتے ہیں اور میں کبھی دو ہفتے ان کے پاس رہوں مگر مقدمات اور اخبار کی مصروفیت کے باعث موقع نہ ملا۔ اس کے بعد مسٹر محمود بے تین چار بار دہلی آئے۔ ان کا قیام امپیریل ہوٹل نئی دہلی میں ہوا کرتا۔ ان کے پاس ہمیشہ معتقدوں کا جمگھٹا سا لگا رہتا اور معتقدوں میں راجے اور مہاراجے بھی ہوتے چنانچہ ایک بار مرحوم مہاراجہ پٹیالہ نے آپ کو پٹیالہ طلب کیا اور بیس ہزار روپیہ دیا۔ مقصد یہ تھا کہ محمود بے روحانیت کے ذریعہ معلوم کر کے بتائیں کہ ان کے ولی عہد (موجودہ مہاراجہ پٹیالہ) ان کے خلاف ہیں یا نہیں۔ اور ایک بار نواب صاحب بہاولپور کی دعوت پر یہ بتانے کے لیے بہاولپور گئے کہ ان کے علاقہ کے ریگستانوں میں کہاں کہاں سونا اور پٹرول موجود ہے

۔

مسٹر محمود بے سے ملے ہوئے مجھے کئی برس ہو گئے۔ کیونکہ مقدمات اور کاروبار کی مصروفیت کے باعث بمبئی جانے کا عرصہ سے اتفاق ہی نہیں ہوا۔ مجھے معلوم نہیں کہ مسٹر محمود بے آج کل بمبئی میں ہیں یا اپنے وطن مصر کو واپس چلے گئے۔ مگر آپ کے دوستانہ اخلاص کو میں کبھی نہیں بھول سکتا اور ان کی ''روحانیت'' کا اتنا ہی قائل ہوں جتنا خواجہ حسن نظامی کی ''روحانیت'' کا یعنی جب تک دنیا میں بیوقوف موجود رہیں گے ایسی شخصیتیں اپنی ''روحانیت'' کے ذریعہ لوگوں کے جیب خالی کرتی رہیں گی۔

☆☆☆

بغیر نیت کے جرائم

میری عمر سولہ برس تھی جب میں موگا کے ہسپتال میں اپرینٹس کمپونڈر تھا۔اس زمانہ میں کوئی تنخواہ نہ لیتا تھا۔ان پیڈ اپرینٹس تھا۔ چھ ماہ تک کام سیکھتا رہا۔اس زمانہ کا ایک واقعہ یاد ہے ہسپتال میں رہائش اختیار کرنے والے انڈور بیماروں کو ڈاکٹر صاحب جب دونوں وقت دیکھا کرتے تھے تاکہ اگر کسی کو تکلیف ہو تو وہ رفع کی جائے ۔ایک روز شام کو ڈاکٹر صاحب مع کمپونڈروں کے بیماروں کو دیکھ رہے تھے کہ معلوم ہوا کہ ایک ضعیف بوڑھی عورت دن بھر بے چین رہی اور درد سے چلاتی رہی کیونکہ اس کی ناک میں کیڑے تھے اور وہ کیڑے اس کو کاٹتے تھے ۔ڈاکٹر صاحب نے کمپونڈروں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔اس عورت کو نصب ڈرائم لائیکوار مارفیا افیون کا جوہر دیا جائے تاکہ رات کو یہ سو سکے اور افیون کے نشہ میں تکلیف کم محسوس کرے ۔سب بیماروں کو دیکھنے کے بعد ڈسپنسنگ روم میں گیا اور نصف ڈرام لائیکوار مارفیا لے کر اس عورت کو پلا دیا ۔اگلے روز جب ہم بیماروں کو دیکھنے گئے تو اس بوڑھی عورت کے قریب کی چارپائیوں پر پڑی ہوئی بیمار عورتوں نے بتایا کہ یہ دن بھر تکلیف سے ہائے ہائے کرتی رہی ۔ڈاکٹر صاحب نے پوچھا کہ کیا رات کو اسے نیند نہیں آئی ۔عورتوں نے جواب دیا کہ رات کو بھی نیند نہیں آئی ڈاکٹر صاحب نے کمپونڈروں کو پوچھا کہ رات کو مارفیا دیا گیا تھا؟ میں نے جواب دیا کہ نصف ڈرام دیا تھا۔ڈاکٹر نے حکم دیا کہ چونکہ رات کو نصب ڈرام مارفیا کے ساتھ اس کو نیند نہیں آئی آج اس کو ایک ڈرام مارفیا دیا جائے ۔ہم سب نے یہ حکم سن لیا بیماروں کو دیکھنے سے فارغ ہو کر میں ڈسپنسنگ روم گیا اور ایک ڈرام مارفیا لے کر اس عورت کو پلا آیا ۔میرے جانے کے بعد انچارج ڈسپنسر روم میں گیا اور ڈاکٹر صاحب کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے یہ بھی ڈرام لائیکوار مارفیا لے کر اس عورت کو پلا آیا۔

عورت بیچاری دیہات کی رہنے والی تھی اس کو کیا معلوم کہ دوائی کتنی بار دی جاتی ہے اس نے اس ڈسپنسر کو نہیں بتایا کہ پہلے بھی دوائی دی جا چکی ہے ۔یہ ڈسپنسر بھی دوائی

پلا کر اپنے کوارٹر میں چلا گیا۔ہم لوگ جب صبح اٹھے اور ہسپتال میں گئے تو معلوم ہوا کہ بڑھیا رات کو مر گئی ۔ڈاکٹر صاحب تشریف لائے ان کو خیال ہوا کہ موت کا باعث مارفیا کا زہر ہے ان کو احساس ہوا کہ میں ناتجربہ کار ہوں شاید مارفیا کے ناپنے میں غلطی کی ہو گی ۔پوچھا کہ رات کو کتنا مارفیا دیا گیا۔ میں اور انچارج ڈسپنسر دونوں موجود تھے ۔دونوں نے جواب دیا کہ ایک ڈرام اور جب دونوں جواب دینے کے بعد ایک دوسرے کو دیکھنے لگ گئے یعنی میں کہتا تھا کہ میں نے دیا اور ڈسپنسر کہتا تھا کہ اس نے دیا ۔گویا کہ بغیر جرم کی نیت سے دونوں ہی اس موت کے ذمہ دار تھے۔

ہندوستان کے ہسپتالوں میں غلطیوں کے ساتھ ایسی موتیں ہر روز ہوتی رہتی ہیں اول تو شاید ایسی موتوں کے جرائم کے لیے تعزیرات ہند میں کوئی سزا ہی مقرر نہیں ۔اگر سزا ہو بھی تو سرکاری ملازموں کو چاہیے کہ وہ کتنی بھی ادنیٰ حیثیت کے ہوں کون پوچھتا ہے۔ہم دونوں نے کسی کو کچھ نہیں کہا مگر بغیر نیت کے کیے گئے اس جرم کا بوجھ اب تک ضمیر پر موجود ہے۔

کئی برس کی بات ہے ''ریاست'' کا دفتر اجمیری دروازہ کے باہر تھا۔ایک رانی کا خط ملا کہ وہ مظلوم ہے۔اس کی ریاست میں ملنا ممکن نہیں ۔وہ ہردوار جا رہی ہے ہردوار میں اس کے فلاں ملازم کی معرفت ملوں ۔وہ اس ظلم کی داستان بتانا چاہتی ہے۔ جو اس کے شوہر کے ہاتھوں کیا جا رہا ہے ۔اس خط کے ملنے کے بعد میں اپنی کار میں یہاں سے رڑکی گیا۔رڑکی سے نہر کے کنارے ہردوار پہنچا۔میرے ساتھ موٹر ڈرائیور کیہر سنگھ تھا۔ہم لوگ ہردوار بنگلہ میں ٹھہرے اور میں نے وہاں سے رانی کے ملازم کو پیغام بھیجا کہ میں پہنچ گیا ہوں ڈاک بنگلہ میں مقیم ہوں رانہ صاحبہ جہاں کہیں وہیں آ جاؤں ۔رانی صاحبہ نے انتظام کر رکھا تھا ایک دھرم شالہ میں ان سے ملا۔تین چار گھنٹے کے قریب باتیں ہوتی رہیں ۔یہاں سے فارغ ہونے کے بعد میں نے کیہر سنگھ سے کہا کہ اب ہم ہردوار آ گئے ہیں ڈیرہ دون میں مہارانی نابھی اور ان کے والد اور

بھائی ہیں ان سے بھی مل سکیں گے۔ چنانچہ ہم ہردوار سے سیدھے جنگل کے راستہ سے ڈیرہ دون روانہ ہوئے۔ ہردوار اور ڈیرہ دون کے درمیان سڑک اس زمانہ میں اچھی نہ تھی۔ راستہ میں بغیر پلیوں کے کئی چھوٹی چھوٹی ندیاں تھیں اور بعض جگہ راستہ ناہموار بھی تھا۔ (اب ملٹری نے فوجی ضروریات کے باعث یہ سڑک بہت اچھی بنا دی ہے) میں اور کہیر سنگھ جا رہے تھے کہیر سنگھ موٹر چلا رہا تھا اور میں پچھلی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ ڈیرہ دون پہنچنے سے غالباً تین چار میل پہلے موٹر تیزی سے جا رہی تھی۔ سڑک پر کھڑا ہوا ایک بچہ جو سات آٹھ سال کی عمر کا ہوگا موٹر کے دیکھنے کے شوق میں تیزی کے ساتھ موٹر کے سامنے آ گیا اور موٹر اس پر سے گزر گئی۔ اس بچہ کے والدین قریب ہی جھونپڑیوں میں مقیم تھے۔ جب بچہ موٹر کے نیچے آیا تو میں نے کہیر سنگھ سے کہا کہ موٹر فوراً کھڑی کرو مگر کہیر سنگھ نے میرے اس کہنے کی کوئی پرواہ نہ کی اور اس نے موٹر کو اور تیز کر دیا۔ میں نے کہا موٹر کھڑی کرو۔ تم دیکھیں کہ اگر بچہ کی حالت خراب ہے تو ہسپتال لے چلیں مگر کہیر سنگھ نے میرے کہنے کی کوئی پرواہ نہ کی۔ گویا وہ میرے حکم کی تعمیل کا پابند نہیں تھا۔ چند منٹ بعد ہم ڈیرہ دون پہنچے تو کہیر سنگھ نے کہا کہ اگر وہ موٹر وہاں کھڑی کرتا تو اس بچہ کے والدین جو جھونپڑیوں میں مقیم تھے اور خانہ بدوش قبیلہ کے تھے غصہ میں شاید ہم دونوں کو قتل کر دیتے۔ اور اگر یہ بھی نہ ہوتا تو وہ مقدمہ چلوانے اور قید ہونے کے لیے تیار نہیں۔ اس واقعہ کے باعث میں اتنا پریشان تھا کہ بار بار خیال آیا کہ نامعلوم وہ بچہ مر گیا یا زندہ رہا گو میرا قصور نہ تھا بچہ خود ہی دوڑ کر موٹر کے سامنے آ گیا۔ مگر ہمارا موٹر کھڑا کر کے اس بچہ کو نہ دیکھنا اور اس کو ہسپتال میں نہ لے جانا کتنا بڑا اخلاقی جرم تھا۔ مجھے اس قدر ذہنی کوفت تھی کہ میں نے مہاراجہ نابھہ اور ان کے والد وغیرہ سے ملنے کا خیال ترک کر دیا ڈیرہ دون میں پٹرول لیا اور ہم سہارن پور والی سڑک کے راستہ واپس دہلی روانہ ہو گئے۔ ڈیرہ دون اور دہلی کے درمیان میں نے کچھ نہ کھایا۔ دہلی پہنچ کر دو راتیں نیند نہ آئی اور اب بھی کئی بار یہ خیال آتا ہے کہ گو اس میں

میرا کوئی قصور نہ تھا اور نہ جرم کرنے کی میری نیت ہی تھی ۔ مگر کہیر سنگھ کے جرم یں شریک ہوں اور نہ معلوم مجھے اس جرم کی کیا سزا ملے۔

میں مانسہ (ریاست پٹیالہ) میں میڈیکل پریکٹس کرتا تھا۔ مجھے معلوم ہوا کہ آب و ہوا خشک ہونے کے باعث سندھ میں لوگ کثرت کے ساتھ موتیا بند (کیٹریکٹ) میں مبتلا ہیں ۔ میں اس سے پہلے موتیا بند کے کثر ررت کے ساتھ اپریشن کر چکا تھا۔ اور اس فن میں مجھے بہت کامیابی حاصل ہوئی تھی ۔ میں نے فیصلہ کیا کہ سندھ میں جا کر وہاں لوگوں کی آنکھوں کے اوپریشن کیے جائیں ۔ چنانچہ میں نے مانسہ کے ایک لڑکے کا اب اس کا نام یاد نہیں رہا یہ وہاں کی سنگھ سبھا کے سیکرٹری سردار سندر سنگھ کا بیٹا تھا ساتھ لیا یہ لڑکا بہت ہوشیار اور مستعد تھا۔ ہم لوگ بھٹنڈہ اور سماسٹہ کے راستے جب خان پور پہنچے تو وہاں ایک سکھ بابو مل گئے جو ریلوے سٹیشن پر بجلی کے کام کے انچارج تھے ۔ یہ واقف تھے بہت تپاک سے ملے ۔ اور چونکہ شام کا وقت تھا انہوں نے ہمارے کھانے کے لیے مچھلی انڈے سبزی اور روٹی وغیرہ خریدی ۔ اتنے میں گاڑی چلنے والی تھی تو انہوں نے انٹر کلاس میں (جہاں ہم دونوں بیٹھے تھے جگہ تنگ ہے کھانا کھانے میں تکلیف ہوگی ۔ سیکنڈ کلاس کوپے خالی ہے اس میں بیٹھ کر کھانا کھا لیجیے اور اگلے سٹیشن پر اتر کر پھر انٹر کلاس میں چلے جائیے ۔ ریلوے کے بابو اپنے محکمہ کو اپنے باپ کی ملکیت سمجھتے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ نہ صرف ان کو بغیر ٹکٹ سفر کرنے کا حق حاصل ہے بلکہ ان کے دوستوں اور رشتہ داروں کا ٹکٹ لینا بھی فضول خرچی ہے ۔ یہ سکھ بابو ہمیں سیکنڈ کلاس کے کوپے میں لے گئے اور وہاں کھانا رکھا تو گاڑی چل پڑی ۔ گاڑی کے چلنے پر میں نے اور اس لڑکے نے کھانا کھا لیا یہ گاڑی کراچی میل تھی اور کئی سٹیشنوں کے بعد ٹھہرتی تھی ۔ ہم کھانا کھا چکے اور اگلے سٹیشن کا انتظار کہ جہاں گاڑی ٹھہرے اور ہم واپس اپنے انٹر کلاس میں چلے جائیں ۔ تو راستہ میں یک لخت گاڑی ٹھہر گئی ۔ اس وقت کچھ اندھیرا سا ہو چکا تھا گاڑی کے ٹھہرنے کے بعد ٹرین کا

ڈرائیور اور گارڈ گاڑی سے نیچے اترے اور انہوں نے دیکھنا شروع کیا کہ کون سے ڈبے کا ویکیم خراب ہے چنانچہ وہ دیکھتے دیکھتے اس سیکنڈ کلاس والی گاڑی میں آ گئے تو معلوم ہوا کہ اس ڈبہ میں خرابی ہے تو ان کو شبہ ہوا (کہ شاید زنجیر ہم نے کھینچا ہے۔ چنانچہ گارڈ کے ہم کو ٹکٹ دکھانے کے لیے کہا ٹکٹ دکھایا تو وہ انٹر کلاس کا تھا اس شبہ میں اور اضافہ ہوا۔ اور اس نے کہا کہ انٹر کا ٹکٹ ہے یہاں کیوں آئے میں نے اصل واقعہ بیان کر دیا اور کہا کہ وہاں جگہ تنگ تھی کھانا کھانے کے لیے یہاں چلے آئے۔ یہ جواب تسلی بخش نہ تھا۔ کیونکہ قانون اس کی اجازت نہ دیتا تھا کہ اینگلو انڈین گارڈ کو اس کا پورا شبہ ہو گیا کہ ہم لوگ کسی بدمعاشی کی نیت سے یہاں آئے ہیں اور اس غرض کے لیے تاریکی و تنہائی میں بیٹھے ہیں ہم لوگ اتر کر انٹر کلاس میں چلے گئے مگر پریشان کہ نہ معلوم کیا الزام لگایا جائے اور پولیس کے حوالہ کیے جائیں۔ حالانکہ قصور تھا تو صرف اتنا کہ یہ ریلوے کے سکھ بابو نے اپنے حوصلہ کا غلط استعمال کرتے ہوئے ہمیں سیکنڈ کلاس میں بیٹھ کر کھانا کھانے کے لیے کہا اور ہم نے بے وقوفی کے باعث ایسا کیا۔

ہم روہڑی سٹیشن پر اترے تو گارڈ ہمیں پولیس کو دینا چاہتا تھا۔ ہم اس کی خوشامدیں کر رہے تھے۔ آخر اس نے ہم سے خان پور اور روہڑی کے درمیان انٹر کلاس سے زائد سیکنڈ کلاس کا کرایہ بغیر رسید دیے وصول کیا اور بقول پنجابی کہاوت کے ہمارا لالہ موسیٰ کا یہ سفر ختم ہوا۔

ان واقعات سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ انسان اپنی زندگی میں ایسے جرائم کرتا ہے جن کو کرنے کی اس کی نیت نہیں ہوتی۔ مگر چونکہ جرائم آخر جرائم ہیں۔ انسان کو ان جرائم کی سزا بھگتنی پڑتی ہے۔ چاہے وہ سزا قانونی عدالت کے ذریعہ ملے یا قدرت اس کو کسی دوسرے ذریعے سے دے۔ اور صرف اس بات سے چھٹکارا نہیں ہو سکتا کہ اس کی نیت جرم کرنے کی تھی یا نہیں کیونکہ جرم کرنا مجرم کے جرم پر چشم پوشی کرنا جرم میں حصہ لینا۔ جرم کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کرنا یا جرم کو بے نقاب کرنا اخلاقاً سب ہی جرائم ہیں۔

ریاست اور افغان گورنمنٹ

’’ریاست‘‘ کو جاری ہوئے دو برس ہوئے تھے۔ لالہ لاجپت رائے اپنی آخری عمر میں مسٹر ساورکر اور مسٹر جناح کی طرح حریت پرستی وطنیت اور ملک کی آزادی کی راہ چھوڑ کر فرقہ پرستی کی لعنت اختیار کر چکے تھے اور ان کا ہر قدم ہندو سبھا کی حمایت کرتے ہوئے مسلمانوں کے خلاف اٹھتا تھا۔ آپ نے اخبارات میں ایک بیان دیا جس میں ارشاد تھا۔ کہ ہندوستان اور افغانستان کے حملہ سے بے فکر نہیں ہو سکتا اور صوبہ سرحد کو آئینی اصلاحات نہ ملنی چاہئیں۔ کیونکہ اگر نئی اصلاحات کے مطابق صوبہ سرحد کی گورنمنٹ میں مسلمانوں کی اکثریت ہوئی تو ہندو وہاں خطرہ میں ہوں گے اور افغانستان ہندوستان پر آسانی سے حملہ کر سکے گا۔ لالہ لاجپت رائے کا یہ بیان پڑھ کر مجھے لالہ جی کے اگروال ازم پر غصہ آ گیا اور میں نے ’’ریاست‘‘ میں آپ کے اس بیان کے خلاف ایک سخت نوٹ لکھا کہ اگر صوبہ سرحد کے ہندو اس قدر ہی بزدل اور کمزور ہیں کہ وہ افغانستان کے حملہ کو ڈیفنڈ نہیں کر سکتے تو ان کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ صوبہ سرحد چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے مدراس کو چلے جائیں مگر صوبہ سرحد کو صرف اس جرم میں سیاسی اصلاحات نہ دی جائیں کہ وہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے اس صوبہ کے ساتھ ظلم اور بے انصافی ہوگی۔ اور لالہ لاجپت رائے کا افغانستان کے خوف سے صوبہ سرحد کی اصلاحات کی مخالفت کرنا ان کی بزدلی اور بنیا پن ہے جس کے ساتھ کوئی بہادر شخص متفق نہیں ہو سکتا۔

’’ریاست‘‘ اس زمانہ میں افغانستان جاتا تھا اور وہاں کے دفتر خارجہ میں بہت دلچسپی کے ساتھ پڑھا جاتا۔ دفتر خارجیہ کی باگ ڈور امان اللہ کے خسر اور ملکہ ثریا کے والد سردار محمود طرزی کے ہاتھ میں تھی۔ اس نوٹ کو شائع ہوئے دو ماہ کے قریب ہوا تھا۔ کہ ایک روز قونصل جنرل افغانستان کے دفتر سے ٹیلی فون آیا کہ سردار اکبر خان قونصل جنرل ملنا چاہتے ہیں۔ میں نے جواب دیا کہ جب فرمایئے آ جاؤں ٹیلی فون

کرنے والے نے مجھے ٹھیک سے یاد نہیں میرا خیال ہے کہ ٹیلی فون کرنے والے غالباً منشی محمد فاضل سرکاتب یعنی سیکرٹری تھے' کہا کہ قونصل جنرل صاحب خود تشریف لانا چاہتے ہیں۔ دفتر ''ریاست'' کس جگہ پر ہے۔ میں نے جواب دیا کہ پریڈ گراؤنڈ کے سامنے ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد سردار اکبر خاں تشریف لائے اور آپ نے فرمایا کہ ''ریاست' میں افغانستان اور لالہ لاجپت رائے کے متعلق جو نوٹ شائع ہوا ہے آپ اس سلسلہ میں تشریف لائے ہیں شکریہ ادا کرنے کے لیے میں ں ے کہا کہ مجھے فرماتے ہیں وہاں آ جاتا۔ آپ نے جواب دیا نہیں افغان گورنمنٹ کے حکم سے آیا ہوں۔ کابل سے خط آیا ہے کہ شکریہ ادا کیا جائے۔ شکریہ ادا کرنے کے لیے دوسرے کے مکان پر ہی جانا چاہیے۔ اس لیے ضروری تھا کہ میں خود آتا۔ آپ تھوڑی دیر کے بیٹھے اس کے بعد آپ نے خواہش ظاہر کی کہ اگلے روز افغانستان کے قونصل خانہ پہنچا ۔اس زمانہ میں قونصل خانہ انڈرہل لین کی ایک دومنزلہ عمارت میں تھا۔ میں گیا تو سردار اکبر خاں منتظر تھے ہم بیٹھے چائے پیتے اور باتیں کرتے رہے۔ سردار اکبر خاں نے ہندوستان اور افغانستان کے تعلقات پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ قرآن کی قسم افغان لوگ بات بات میں قسم کھاتے ہیں افغانستان کبھی یہ نہیں چاہتا کہ وہ ہندوستان پر حملہ کرے۔ ہندوستانیوں کو افغان اپنا بھائی سمجھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ جس طرح افغانستان آزاد ہے ہندوستان بھی آزاد ہو۔ لالہ لاجپت رائے جیسے لیڈر بلاوجہ افغانیوں کو ہوا سمجھتے ہیں حالانکہ افغان گورنمنٹ کی ہمدردی ہندوستان کے ساتھ ہے۔ وغیرہ۔ سردار اکبر خاں نے خواہش ظاہر کی کہ میں کبھی ان سے ملتا رہوں اور سوچ کر یہ بتاؤں کہ کیا صورت اختیار کی جائے کہ ہندوستان کے ہندوؤں کے دل سے افغانوں کے متعلق جو ہوا بیٹھا ہوا ہے نکل جائے۔

اس ملاقات کے بعد میرے تعلقات افغان گورنمنٹ کے ساتھ بہت گہرے دوستانہ ہو گئے۔ اور میں ہفتہ عشرہ کے بعد سردار اکبر خاں سے ملتا چنانچہ ایک روز میں

وہاں بیٹھا قونصل جنرل سے باتیں کر رہا تھا کہ اچانک ہیمفرے صاحب جو افغانستان میں برٹش قونصل تھے اور ہندوستان میں آئے تھے سردار اکبر خاں سے ملنے کے لیے آ گئے سردار اکبر خاں نے میرا تعارف کرایا تو مسٹر ہیمفرے نے کہا کہ آپ ''ریاست'' کو اچھی طرح جانتے ہیں اور اسے پسند بھی کرتے ہیں۔

کچھ روز بعد میں سردار اکبر خاں کو رائے دی کہ ہندوستانیوں کے دل سے افغانستان کا ہوا نکالنے کی بہترین ترکیب یہ ہے کہ یہاں سے سات آٹھ جرنلسٹوں کا ایک ڈیپوٹیشن جس میں دو ہندو دو مسلمان اور دو سکھ اور ایک انگریز مسٹر ہارنیمین ہوں افغانستان مدعو کیا جائے۔ ان لوگوں خو اجازت دی جائے کہ یہ اپنی مرضی کے مطابق جہاں چاہیں جا کر افغانستان اور افغانستان کے ہندو باشندوں کے حالات اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔ اور پھر واپس آ کر ایک مشترکہ بیان دیں کہ وہاں کی پبلک کی عموماً اور ہندو رعایا کی خصوصاً کیا حالت ہے اس مشترکہ بیان کا بہت اثر ہو گا۔ سردار اکبر خاں نے میری اس تجویز کو بہت پسند کیا۔ اور آپ نے سردار محمود طرزی کو لکھا۔ سردار محمود طرزی نے بھی اس خیال کو بہت پسند کیا۔ چنانچہ افغان گورنمنٹ کی طرف سے گورنمنٹ آف انڈیا کو اس ڈیپوٹیشن کی اجازت کے لیے لکھا گیا تو گورنمنٹ ہند نے اس کی منظوری دینے سے اس دلیل کے ساتھ انکار کر دیا کہ یہ سیاسی پراپیگنڈہ ہے۔ اور بین الاقوامی قانون وافغانستان و ہندوستان کی گورنمنٹوں کے تعلقات کے اعث ایسا ڈیپوٹیشن جانا مناسب نہیں۔ اس انکار کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ تجویز رد کر دی گئی۔ اور اس کا سردار اکبر خاں وافغان گورنمنٹ کو افسوس ہوا۔

افغان قونصل خانہ پر سی آئی ڈی کے لوگ نگرانی کرتے تھے اور میرا یقین ہے د تمام قونصل خانوں کی نگرانی ہوتی ہے۔ نگرانی کرنے والے سی آئی ڈی کے لوگوں نے میری آمدورفت کی گورنمنٹ کو رپورٹ کی نتیجہ یہ ہوا کہ گورنمنٹ آف انڈیا کے فارن آفس کے حکم سے دفتر ''ریاست'' کی نگرانی شروع ہو گئی۔ اس نگرانی کا لوکل گورنمنٹ سے کوئی تعلق

نہ تھا۔ لوکل گورنمنٹ صرف فارن آفس کے حکم سے اپنے آدمی نگرانی کے لیے تعینات کرتی ہے۔ چنانچہ اس نگرانی کے متعلق میں نے اپنے ذرائع سے معلوم کیا تو پتہ چلا کہ گورنمنٹ کے سرکاری کاغذات میں یہ رپورٹ کی گئی ہ کہ دیوان سنگھ روس سے روپیہ لے کر بالشویکوں کا پراپیگنڈہ کرتا ہے۔ اور اس تعلق کے درمیان افغان گورنمنٹ اور قونصل جنرل افغانستان ایک کڑی ہیں۔ گورنمنٹ آف انڈیا کی اس بے وقوفی کا مجھے جب علم ہوا تو میں حیران ہو گیا کیونکہ روس کے ساتھ میرا نہ کبھی کوئی تعلق تھا اور نہ اب ہے۔

سردار اکبر خاں کے ہندوستان سے تبدیل ہونے کے بعد دہلی میں افغان قونصل جنرل سید قاسم مقرر ہوئے جو کنگ امان اللہ کے ہم زلف اور ملکہ ثریا کی چھوٹی بہن کے شوہر تھے۔ سید قاسم کے بھی ایڈیٹر ریاست کے ساتھ تعلقات بہت گہرے ہو گئے۔ چنانچہ مہاراجہ پٹیالہ نے جب ایڈیٹر ریاست کے خلاف ایک جھوٹا مقدمہ بنا کر اکسٹراڈکشن ایکٹ کے مطابق وارنٹ جاری کیے اور دفتر ''ریاست'' کی تلاشی ہوئی تو سید قاسم کو اس کا بہت افسوس ہوا اور آپ کی خواہش تھی کہ گورنمنٹ آف انڈیا کے فارن سیکرٹری (جو آپ کا دوست تھا) کا اثر استعمال کریں۔ مگر میں آپ کی اس رائے سے متفق نہ ہوا۔ اور میں نے کہا کہ فارن سیکرٹری کو کہنا زیادہ نقصان کا باعث ہو گا۔ گورنمنٹ پہلے ہی میرے اور افغان گورنمت کے تعلقات کو پسند نہیں کرتی۔ اگر سفارش کی گئی تو فارن آفس کو یہ یقین ہو جائے گا کہ یہ تعلقات بہت گہرے ہیں۔ برٹش لوگ سب کچھ بھول سکتے ہیں مگر کسی شخص کا اینٹی برٹش ہونا نہیں بھول سکتے۔ فارن سیکرٹری پر اس کا برا اثر ہو گا اور ممکن ہے کہ زیادہ نقصان پہنچے۔ چنانچہ یہ ارادہ ترک کر دیا گیا۔ اس تجویز پر عمل نہ کرنے کے بعد سید قاسم نے ایڈیٹر ''ریاست'' سے یہ کہا کہ اگر میں چاہوں تو سید قاسم اپنے پشاور کے ٹریڈ ایجنٹ (مجھے نام یاد نہیں رہا غالباً سردار عبدالحکیم تھے) کی معرفت سرحدی قبائل کے ذریعہ مجھے افغانستان لے جائیں گے اور وہاں افغان گورنمنٹ میرے لیے زیادہ سے زیادہ آرام و سہولت اور میری

رہائش و اخراجات کا ہمیشہ کے لیے انتظام کر دے گی ۔ چنانچہ میں گورنمنٹ آف انڈیا مہاراجہ پٹیالہ کے ایکسٹراڈکشن کے وارنٹوں کی تعمیل سے انکار نہ کرتی تو میں اپنی آئندہ زندگی جن مقامات پر گزارتا...... ان میں سے ایک جگہ افغانستان بھی تھی اور یہ ممکن تھا کہ میں آج افغانستان میں ہوتا ۔

ایڈیٹر ''ریاست'' اور افغانستان کے تعلقات میں ایک اور دلچسپ واقعہ ہے کہ مہاراجہ نابھ جب ڈیرہ دون میں جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہے تھے اور گورنمنٹ ہند کے سلوک اور مہاراجہ پٹیالہ کی مخالفت سے پریشان تھے تو میں نے مہاراجہ سے کہا کہ وہ اگر چاہیں تو افغانستان میں جا کر اپنی زندگی آرام و راحت سے گزار سکتے ہیں ۔ میں افغان گورنمنٹ سے اس کے متعلق انتظام کر سکتا ہوں ۔ میں نے یہ بھی کہا کہ میں ان کے ساتھ چلوں گا ۔ اور ہم آئندہ زندگی افغانستان یا اور کسی آزاد ملک میں گزار دیں گے ۔ چنانچہ اس کے متعلق میں نے سید قاسم سے بات چیت بھی کی مگر مہاراجہ نابھ کسی خطرہ کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہ تھے انہوں نے جواب دیا کہ وہ مہارانی اور بچوں کو چھوڑ کر نہیں جا سکتے ۔

کنگ امان اللہ کی گورنمنٹ اور میرے تعلقات بہت دوستانہ اور گہرے ہو چکے تھے ۔ ان تعلقات ہی میں امان اللہ افغانستان چھوڑ کر اٹلی چلے گئے اس کے بعد میرے تعلقات اس گورنمنٹ کے ساتھ منقطع ہو گئے حالانکہ اس گورنمنٹ کے نمائندے ہمیشہ اخلاص و محبت کے ساتھ ملتے رہے ۔ مگر میری وضعداری کی سپرٹ نے اجازت نہ دی کہ میں کنگ امان اللہ کے جانے کے بعد آپ کے مخالفوں کے ساتھ تعلقات جاری رکھ سکوں ۔ میں اسے ابن الوقتی سمجھتا تھا ۔ ایڈیٹر ''ریاست'' کنگ امان اللہ کا شکر گزار ہے کہ آپ نے اپنی جلاوطنی کے زمانہ میں بھی ایڈیٹر ''ریاست'' کو یاد رکھا اور مسٹر چمن لال جرنلسٹ اور مسٹر دلیپ سنگھ وغیرہ اصحاب جب کبھی آپ سے اٹلی میں ملے تو آپ ایڈیٹر ''ریاست'' کی خیریت پوچھتے رہے ۔

پبلک آواز واقعات کی بنیادوں پر

میری زندگی کا تجربہ ہے کہ اگر کسی شخص کے متعلق لوگوں کی ایک ہی رائے ہو تو وہ رائے بے بنیاد نہیں ہوتی ۔ اس میں کچھ نہ کچھ سچائی ضرور ہوتی ہے ۔ مثلاً اگر مہاتما گاندھی کو عام لوگ نیک اور مہاتما کہتے ہیں تو گاندھی فی الحقیقت نیک تھے اور اگر خواجہ حسن نظامی کو پبلک مکار سمجھتی ہے تو یہ آواز خالی از صداقت نہیں ہو سکتی ۔ کیونکہ پبلک رائے تب ہی قائم ہوتی ہے جب لوگوں کو ان واقعات کے دیکھنے کا اتفاق ہو ۔

جب ''ریاست'' کو جاری ہوئے ایک یا ڈیڑھ سال کا عرصہ ہوا اور کام زیادہ ہو گیا تو ایک سب ایڈیٹر کی ضرورت محسوس ہوئی ۔ ریاست میں اشتہار دیا گیا ۔ اس اشتہار کے جواب میں جو درخواستیں آئیں ان میں ایک درخواست پیارے لال شاکر میرٹھی کی بھی تھی ۔ یہ حضرت پہلے رسالہ ''زمانہ'' کانپور میں کام کرتے رہے پھر ادیب الہ آباد کے ایڈیٹر مقرر رہوئے اور وہاں سے علیحدہ ہوئے تو آپ نے اپنا رسالہ ''العصر'' جاری کیا ۔ جو شاید ایک یا دو سال جاری رہا ۔ اپنی درخواست میں شاکر صاحب نے اپنے تجربہ کے سلسلہ میں یہ تمام کچھ لکھا ۔ کہ آپ کہاں کہاں کام کرتے رہے ۔ شاکر صاحب کی درخواست آنے پر راقم الحروف نے منشی دیا نرائن صاحب نگم ایڈیٹر ''زمانہ'' (جو ایڈیٹر ''ریاست'' کے بہت مہربان دوست اور ''ریاست'' کے معترف تھے سے خط لکھ کر دریافت کیا کہ شاکر صاحب آپ کے ہاں کام کرتے رہے ہیں کیسے آدمی ہیں ۔ دیا نران کا جواب آیا کہ شاکر صاحب دوسروں کی نظمیں چوری کر کے اپنے نام سے شائع کرنے کو گناہ نہیں سمجھتے ۔ اخبار یا رسالہ کو ترتیب اچھی دے سکتے ہیں اور ویسے بھی چوری کرنے کی ان کو عادت ہے ۔ کوئی شے بھی دفتر میں دیکھیں اسے چوری کر لیتے ہیں اور بہتر ہے کہ ان کو ملازم نہ رکھا جائے ۔ ایڈیٹر ریاست منشی دیا نرائن کے اس خط کو دیکھ کر حیران رہ گیا ۔ کہ ایک شخص شاعر ہے ۔ ادبی رسائل کا ایڈیٹر رہا ہے ۔ اور کافی عمر کا آدمی ہے ۔ یہ کیونکہ اسے چوری کر لیتے ہیں اور بہتر ہے کہ ان کو ملازم نہ رکھا

جائے۔ یہ کیونکر ممکن ہے کہ وہ چوری جیسے ادنیٰ فعل کا بھی مرتکب ہو۔ چنانچہ اس خیال سے کہ شاید نگم صاحب کو شاکر صاحب کے متعلق غلط فہمی پیدا ہوئی ہے۔ آپ کو بطور ایڈیٹر بلا لیا گیا۔ اردو اخبارات میں سب ایڈیٹر کا کام عام طور پر انگریزی یا ہندی وغیرہ رسائل یا اخبارات سے ترجمہ ہوتا ہے یا اگر کبھی ایڈیٹر غیر حاضر ہو تو ایڈیٹوریل وغیرہ کے حصہ کو بھی پورا کر لیا جائے۔ چنانچہ شاکر صاحب کے ذمہ بھی دوسرے سب ایڈیٹروں کی طرح یہی کام تھا۔ کہ وہ ترجمہ کریں اور باہر سے آئے ہوئے افسانوں یا مضامین وغیرہ کی غلطیاں درست کر کے ان کو ترتیب دی جائے۔ شاکر صاحب نے دفتر ''ریاست'' میں کام شروع ہی کیا تھا۔ کہ دفتر میں چوری کا سلسلہ شروع ہوا۔ کبھی پنسلیں غائب کبھی بنیں اڑ گئیں۔ کبھی ٹکٹ چوری ہو گئے اور کبھی جیب سے پیسے نکل گئے۔ ان چوریوں پر ہمیشہ ہی چپڑاسیوں سے باز پرس کی جاتی اور خیال بھی نہ آتا کہ شاکر صاحب مہربانی فرماتے ہوں گے ان ادنیٰ چوریوں کا سلسلہ جاری تھا کہ ایک روز شاکر صاحب نے فرمایا کہ ان کی ایک بھتیجی جو لیڈی ہارڈنگ میڈیکل کالج کی نرسنگ کلاس میں پڑھتی ہیں کالج سے گھر آئی ہوئی ہیں۔ وہ کھانا بہت اچھا پکاتی ہیں۔ میں کھانا وہاں کھاؤں۔ چنانچہ میں کھانے پر ان کے گھر گیا ابھی کھانا بھی نہ کھایا تھا کہ باتیں ہو رہی تھیں کہ میری نگاہ وہاں پر ایک ڈبیہ پر پڑی جس میں سنہری رنگ کے کاغذ کو لگانے کے کلپ پڑے تھے۔ (ایڈیٹر ''ریاست'' کو شروع ہی سے سٹیشنری کا بہت شوق ہے۔ دفتر ''ریاست'' کی سٹیشنری ولایت سے چھپوائی جاتی تھی اور یہ کلپ کلکتہ کی ایک فرم سے منگائے گئے تھے۔) اس ڈبی کا دیکھ کر یقین آیا کہ منشی دیا نرائن صاحب نگم کی رائے درست تھی اور ان کی رائے کی پروا نہ کرنا غلطی تھی۔

کھانا کھانے کے بعد ایڈیٹر ''ریاست'' واپس دفتر میں آ گیا رات کو سوچتا رہا کہ شاکر صاحب کو کس طریقہ سے پکڑا جائے۔ اگلے روز جب دفتر کے لوگ آ گئے تو ایڈیٹر ''ریاست'' نے اوپر کی منزل میں اپنی میز پر دو پیسہ والے دو روپیہ کے ٹکٹ گن

کر رکھ دیے اور خود نیچے آ کر دفتر میں کام شروع کر دیا۔ دفتر میں بیٹھے پانچ سات منٹ ہوئے تو شاکر صاحب سے کہا کہ اوپر کے کمرہ میں پنسل میز پر پڑی ہے وہ لا دیجیے شاکر صاحب پنسل لینے گئے اور پنسل لے کر واپس آ گئے ۔ تو ایڈیٹر ''ریاست'' فوراً اوپر گیا اور دو پیسہ والے ٹکٹ جو گن کر وہاں رکھ آیا تھا ان کو دیکھا تو ان میں سے نصف کے قریب غائب تھے ۔ شاکر صاحب کو اوپر بلایا اور کہا کہ مہربانی فرما کر وہ ٹکٹ رکھ دو جو چوری کیے ہیں شاکر صاحب کے ہوش اڑ گئے ۔ ایڈیٹر ''ریاست'' نے آپ کے جیب میں ہاتھ ڈال کر ٹکٹ نکال لیے ۔ اگر چپڑاسی ہوتا تو دستور کے مطابق اس چپڑاسی کی اچھی خاصی مرمت کی جاتی مگر تعلیم یافتہ تھے عیسائی ہونے کے باعث بوٹ سوٹ پہنے ہوئے یہی کہا کہ بہت ہی کمینہ شخص ہو ۔ اگر ضرورت ہو تو ٹکٹ مانگ لیتے ۔ شاکر صاحب کی اس وقت جو حالت ہوئی اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ۔ چنانچہ ان کو اس شرط اور قسم کھانے پر معاف کر دیا گیا کہ آئندہ چوری نہ کریں گے ۔

شاکر صاحب اس کے بعد کئی برس تک دفتر ''ریاست'' میں رہے پچھتر روپیہ ماہوار تنخواہ پاتے تھے اور بطور الاؤنس پانچ چھ روپیہ ماہوار کا ادنیٰ سامان چوری کر کے لے جاتے تھے ۔

نواب بھوپال نے جب ایڈیٹر ''ریاست'' پر ہوشنگ آباد (سی پی) میں مقدمہ دائر کیا تو دفتر ''ریاست'' کے متعدد ملازم خرید گئے ان سے وعدے کیے گئے کہ جو تنخواہ دفتر ''ریاست'' میں پاتے ہیں اس سے زیادہ تنخواہ ان کو ریاست بھوپال میں ملے گی اور کچھ روپیہ نقد بھی دیا گیا ۔ روپیہ کے لالچ سے خریدے گئے ان لوگوں میں مسٹر پیارے لال صاحب شاکر میرٹھی سابق ایڈیٹر ادیب و العصر بھی تھے آپ نے لالچ میں آ کر بطور سرکاری گواہ شہادت بھی دی ۔

شاکر صاحب نے جب غداری کی اور بطور سرکاری گواہ عدالت میں تشریف لائے تو آپ مسٹر برج بہاری توکلی ایڈووکیٹ نے جرح کی ۔ مسٹر توکلی کو جرح کرنے

میں کمال حاصل ہے۔ کالیستھ ہونے کے باعث ذہین بھی بہت ہیں اور قدرت نے آ
پ کو قوت گویائی کی نعمت بھی فراخ دلی سے عطا کی ہے۔ جرح میں آپ نے شاکر
صاحب سے بچپن سے لے کر اب تک اس زمانے تک کے تمام حالات دریافت کیے
تو شاکر صاحب نے مجسٹریٹ کے سامنے حلف لیتے ہوئے اقرار کیا کہ آپ دوبار
عدالتوں سے چوری کے جرم میں ایک ایک سال کی سزا بھی پا چکے ہیں۔ ان واقعات
کے لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ کسی شخص کے متعلق متعدد اصحاب یا اہل الرائے حضرات کے
تجربہ کے بعد جو رائے ہو اس رائے کو نظر انداز نہ کرنا چاہیے۔ کیونکہ یہ رائے بے بنیاد
نہیں ہوتی۔ اس میں کچھ نہ کچھ سچائی ضرور ہوتی ہے۔

☆☆☆

ایڈیٹر ''ریاست'' کی نیک چلنی اور بدچلنی

دفتر ''ریاست'' دریا گنج کی کوٹھی نمبر ۱۵ میں تھا۔ اس کوٹھی میں بہت بڑے بڑے آٹھ کمرے تھے اور باہر سڑک کی طرف موٹر کے لیے گیرج تھا۔ میرے پاس اس زمانہ میں موٹر نہ تھی۔ ایک سکھ ٹیکسی ڈرائیور بھائی لہنا سنگھ کے ساتھ مستقل انتظام تھا۔ کہ جب ضرورت ہو ارزاں نرخ پر اس کی گاڑی منگالیا کروں۔ چونکہ یہ گیرج خالی رہتا اس میں ردی اخبارات وغیرہ رکھ دیے جاتے۔

مرحوم مہاراجہ پٹیالہ نے جب اپنی ریاست میں میرے خلاف ایک جھوٹا مقدمہ بنا کر اس دفتر کی تلاشی لی اور تلاشی کے دو تین ہفتہ کے بعد جب اس گیرج کو کھولا گیا تو دیکھا کہ اہر سے تالہ تو بدستور لگا ہوا ہے۔ مگر اندر کچھ ردی کاغذات جلے ہوئے ہیں۔ ان جلے ہوئے کاغذات کو دیکھ کر خیال آیا کہ شاید پٹیالہ والوں کی شرارت ہو۔ انہوں نے دفتر کو آگ لگانے کی کوشش کی ہو یا کسی نے جلتا ہوا سگریٹ پھینکا ہو اور یہ سگریٹ دروازہ کے نیچے سے جہاں تھوڑی سی جگہ خالی تھی۔ اتفاق سے اندر چلا گیا ہو۔ میں کسی نتیجہ پر نہ پہنچ سکا اور اسے معمولی بات سمجھ کر اس کی پروا نہ کی۔

اس واقعہ کو گزرے ہوئے ابھی دو ہفتے ہوئے تھے۔ کہ میں ایک روز دوپہر کو ریلوے سٹیشن گیا وہاں ویلر بک سٹال سے انگریزی کے رسائل خریدے تھے جب بک سٹال پہنچا تو دیکھا کہ وہاں پٹیالہ کے سپرنٹنڈنٹ سی آئی ڈی مسٹر فضل کریم خاں اور وہاں کے پبلک پراسیکیوٹر (جو سکھ تھے مجھے اب نام یاد نہیں رہا) کھڑے اخبارات دیکھ رہے ہیں۔ اور پڑھنے میں مصروف تھے۔ انہوں نے مجھے نہیں دیکھا کہ میں ان کو غور سے دیکھتا رہا۔ کہ میں غلطی تو نہیں کر رہا۔ یہ فضل کریم ہی ہیں جو تلاشی کے لیے پٹیالہ سے تشریف لائے تھے جب میری تسلی ہوگئی کہ یہی حضرت ہیں تو میں ان کے سامنے کی طرف آ گیا اور کہا خاں صاحب! آداب عرض خاں صاحب نے اس کا جواب اخلاق سے دیتے ہوئے کہا۔ آداب عرض ہے۔ اس کے بعد میں نے پوچھا فرمایئے

خاں صاحب آج پٹیالہ سے کس مار پر آئے ہیں۔ کیا تلاشی لوگے یا گرفتاری کروگے۔ خان صاحب کچھ جھینپ گئے اور آپ نے جواب دیا کہ نہیں سردار صاحب ہم آپ کے دشمن تو نہیں نہ ہماری کوئی ذاتی عداوت ہے۔ سرکاری ملازم ہیں سرکار کے حکم سے تلاشی لینے آئے تھے ایسے واقعات ہوتے ہی رہتے ہیں۔ آج تو ڈاکٹر شراف کو آنکھیں دکھانے کے لیے آیا تھا آنکھوں میں تکلیف ہے''۔

اتنی بات کرنے اور رسائل خریدنے کے بعد میں سٹیشن سے باہر آ گیا مگر بہت متفکر کہ پٹیالہ کے یہ دونوں افسر دہلی میں کیوں آئے ہیں۔ کیا کوئی نیا مقدمہ قائم کیا۔ کیا نئی تلاشی ہوگی۔ کیا وارنٹ ان کے پاس ہیں۔ کیا گیرج میں آگ پٹیالہ والوں نے لگائی۔ دریا گنج کوٹھی پر گرفتاری کے لیے پولیس موجود تو نہیں ان خیالات میں غرق تھا کہ کیا کرنا چاہیے۔ دفتر جاؤں یا نہ جاؤں۔ ممکن ہے وہاں پولیس گرفتاری کے لیے موجود ہو

میں نے اپنے دفتر جانا مناسب نہ سمجھا۔ سیدھا سوامی رامانند جی کے دفتر میں پہنچا۔ سوامی جی اس زمانہ میں سوامی شردھانند جی کے دست راست اور دلت ادھار سبھا اور کانگرس وغیرہ کی کئی سوسائٹیوں کی روح رواں تھے ان کا دفتر ''تیج'' کے سامنے تھا۔ وہاں پہنچ کر میں نے ان کے ہاں سے اپنے دفتر ٹیلی فون کیا اور پوچھا کہ کیا وہاں پولیس وغیرہ تو نہیں اور کوئی خاص بات تو نہیں ہوئی۔ وہاں سے معلوم ہوا کہ کوئی خاص بات نہیں۔ سوامی جی سے میں مشورہ کرتا رہا کہ کس طرح معلوم کیا جائے کہ مسٹر فضل کریم پٹیالہ سے اب کیوں آئے ہیں۔ ہم کسی نتیجہ پر نہ پہنچ سکے۔ اس کے بعد میں نے مختلف ہوٹلوں میں ٹیلی فون کیا۔ کہ کیا کوئی صاحب پٹیالہ کے مسٹر فضل کریم خاں وہاں ٹھہرے ہوئے ہیں تمام ہوٹلوں سے پوچھنے کے بعد معلوم ہوا کہ رائل ہوٹل کے کمرہ نمبر ۶ میں ٹھہرے ہیں اور ہوٹل سے باہر گئے ہیں۔ اس وقت وہاں موجود نہیں ہیں۔ یہ معلوم نہ ہوسکا کہ ان کے دہلی آنے کا مقصد کیا ہے۔

میں بہت سوچتا رہا کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ کئی جگہ ٹیلی فون کیا مگر کہیں سے کچھ پتا نہ چل

سکا۔آخر مجھے ایک شرارت سوجھی میں نے سوچا کہ اگر یہ لوگ میری گرفتاری کے لیے آئے ہیں تو یا تلاشی لیں گے تو یقیناً یہ خود کچھ نہیں کر سکتے۔ جو کچھ کریں گے لازمی طور پر مقامی گورنمنٹ اور مقامی پولیس کی معرفت ہوگا۔اور اس کا علم سپر نٹنڈنٹ پولیس سی آئی ڈی کو ہونا چاہیے۔میں نے فیصلہ کیا کہ سپر نٹنڈنٹ پولیس سی آئی ڈی سے ملوں اس سے طریقہ کے ساتھ بات چیت کی جائے اور اس کی باتوں سے معلوم کرلیا جائے ک پوزیشن کیا ہے۔اگر تو اس نے مسٹر فضل کریم کے دہلی آنے کی اطلاع کو تعجب سے سنا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ مقامی پولیس کو کچھ علم نہیں۔اور فضل کریم صاحب اپنے کسی پرائیویٹ کام کے لیے یہاں آئے ہیں اور اگر باتوں میں اس کے چہرہ سے یہ معلوم ہوا کہ فضل کریم صاحب کے آنے کا اس کو علم ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ پٹیالہ لے لوگ میرے ہی متعلق آئے ہیں اور کوئی نہ کوئی کارروائی میرے خلاف ہوگی ۔اس زمانہ میں سی آئی ڈی کے سپر نٹنڈنٹ مسٹر مارگن تھے۔میں نے ان کو ٹیلی فون کیا ۔انہوں نے کہا کہ اگر ضروری معاملہ ہو تو ابھی آجاؤ۔اس وقت چار پانچ بج چکے تھے۔ اور وہ اپنی کوٹھی میں تھے۔میں نے بھائی لہنا سنگھ کو ٹیکسی لانے کے لیے ٹیلی فون کیا۔ ٹیکسی آئی تو میں مسٹر مارگن کی کوٹھی پہنچا مسٹر مارگن میرا انتظار کر رہے تھے۔وزیٹنگ کارڈ اندر بھیجا تو وہ خود ہی برآمدہ میں نکل آئے گڈ ایوننگ ہوئی تو مجھے تشویش میں دیکھتے ہوئے انہوں نے کھڑے کھڑے فوراً بات چیت شروع کر دی جو یہ تھی:

مسٹر مارگن: کیا بات ہے کیا کوئی نئی مشکل یا مصیبت پیش آئی۔

میں: جب تک کوئی مشکل یا مصیبت نہ ہو آپ کے پاس آتا ہی کون ہے اور آنے کی کسی کو ضرورت ہی کیا ہے۔

مسٹر مارگن: بتائیے کیا معاملہ ہے؟

میں: مجھے سب سے پہلے یہ بتائیے کہ کیا میں برٹش ہوں یا آپ پٹیالہ کی رعایا۔

مسٹر مارگن یہ سن کر مسکرا دیے اور کہا آپ برٹش رعایا ہیں بتائیے کیا معاملہ ہے۔

میں :پٹیالہ کا اسپر نٹنڈنٹ پولیس سی آئی ڈی مسٹر فضل کریم جو تلاشی کے وقت آیا تھا اب پھر دہلی میں کیوں آیا ہے۔ اس کا یہاں آنے کا کیا مقصد ہے۔ یہ لوگ میرا پیچھا کیوں کر رہے ہیں۔ اگر میں پٹیالہ کی رعایا نہیں تو ان کو حق حاصل ہے کہ یہ مجھے اس طرح برٹش علاقہ میں تنگ کریں۔

برٹش رعایا اور پٹیالہ کی رعایا کے میرے یہ الفاظ سنتے ہی مسٹر مارگن آگ بگولہ ہو گئے۔ ان کی پیشانی پر شکن تھے اور غصہ سے سرخ ہو گئے اور پوچھا کہ کیا یہ سچ ہے کہ فضل کریم دہلی میں ہے۔ میں نے جواب دیا کہ میں نے اپنی آنکھوں سے ان کو سٹیشن پر دیکھا اور وہ چھ نمبر کے کمرہ رائل ہوٹل میں ٹھہرے ہیں مسٹر مارگن غصہ سے سرخ ہو رہے تھے آپ نے کہا۔

ویل دیوان سنگھ تم جاؤ اپنے گھر میں آرام کرو۔ ہم کبھی پٹیالہ کو اجازت نہیں دے سکتا کہ وہ دہلی میں کوئی بدمعاشی کرے ہم کبھی پٹیالہ کے کسی افسر کو یہاں نہ آنے دے گا۔ ہمارا فرض ہے کہ برٹش سجیکٹ کو پروٹیکٹ کرے پٹیالہ تمہاری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتا۔ اگر فضل کریم دہلی میں ہے تو ہم ابھی پتہ لے گا۔ اور اس کو ہلی میں رہنے کبھی نہ دے گا۔ ریاستیں برٹش علاقہ میں بدمعاشی نہیں کر سکتیں۔ ہم تمہاری حفاظت کا ذمہ دار ہے''۔

اس جواب سے میں سمجھ گیا اور مجھے اطمینان ہوا کہ فضل کریم صاحب میرے متعلق دہلی میں ں ہیں آئے کیونکہ اگر آتے تو مقامی گورنمنٹ اور مقامی پولیس کو علم ہوتا۔ مسٹر مارگن سے باتیں اور انکا جوش ظاہر کر رہا تھا کہ ان کو فضل کریم کے آنے کا کچھ علم نہیں۔ میں اطمینان کے ساتھ اپنے مکان پر چلا گیا۔ وہاں سے سوامی رامانند جی کو تمام حالات ٹیلی فون پر بتائے اور مجھے یقین ہو گیا کہ فضل کریم اپنے کسی کام آئے ہوں گے ان کے آنے کا میرے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔

رات کو میں آرام سے سویا۔ صبح جاگا اور غسل کرنے کے بعد چائے پی رہا تھا تو

سردار کرم سنگھ انسپکٹر پولیس سی آئی ڈی تشریف لائے۔انہوں نے ست سری اکال کہا بیٹھے میں نے چائے پیش کی۔انہوں نے چائے کی پیالی پیتے ہوئے پوچھا کہ کیا رات کو کوئی خاص بات تو نہیں ہوئی میں نے کہا نہیں کوئی خاص بات تو نہیں ہوئی۔ انہوں نے بتایا کہ جب میں مسٹر مارگن سے مل کر ان کی کوٹھی سے چلا آیا تو مسٹر مارگن نے حکیم اکرام الحق ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس سی آئی ڈی کو فون کر کے طلب کیا۔اور کہا کہ وہ فوراً رائل ہوٹل جائیں اور اگر فضل کریم وہاں ہوں تو ان کو حکم دیا جائے اور انتظام کیا جائے کہ وہ پہلی گاڑی سے دہلی چھوڑ دیں اور اگر وہ دہلی نہ چھوڑیں گے تو ان کو حوالات میں دے دیا جائے گا۔۔اور اس حکم کی تعمیل کرنے کے بعد ان کی رپورٹ کی جائے چنانچہ حکیم اکرام الحق نے فضل کریم صاحب کو سپرنٹنڈنٹ پولیس سی آئی ڈی کا حکم سنایا فضل کریم نے بہت واویلا کیا۔کہ ان کو کیوں دہلی سے نکالا جا رہا ہے۔وہ ڈاکٹر شراف کے پاس آنکھوں کا علاج کرانے آئے ہیں حکیم صاحب نے کہا کہ علاج کرانا ہے تو لاہور جائیے دہلی کبھی مت آیئے۔اور پہلی گاڑی میں پٹیالہ چلے جایئے اور اگر آپ نہ گئے تو آپ کو حوالات میں دے دیا جائے گا۔چنانچہ فضل کریم صاحب کا بستر ہ اور سامان بندھوایا گیا اور حکیم صاحب ان کو ریلوے سٹیشن لے گئے فرنٹئر میل کے جانے میں ابھی کئی گھنٹے باقی تھے ریلوے سٹیشن پہنچ کر ریلوے کے تھانہ سے حکیم اکرام الحق نے پولیس لائن میں ٹیلی فون کر کے ایک سب انسپکٹر منگایا۔اس سب انسپکٹر کو ہدایت کی گئی کہ جب تک فضل کریم صاحب گاڑی میں نہ بیٹھ جائیں اور گاڑی روانہ نہ ہو جائے۔وہ فضل کریم صاحب کے ساتھ رہے۔ان کو گاڑی پر چڑھا کر سپرنٹنڈنٹ سی آئی ڈی کوٹھی جانے اور فضل کریم صاحب کی روانگی کی رپورٹ کرے کیونکہ مسٹر مارگن نے یہی حکم دیا تھا۔چنانچہ سب انسپکٹر نے رات کو دس بجے کے بعد مسٹر مارگن کو اطلاع دی کہ فضل کریم صاحب دہلی سے تشریف لے گئے ہیں۔

سردار کرم سنگھ نے بتایا کہ ان کی بھی رات کو ڈیوٹی لگائی گئی تھی کہ وہ اپنے آدمیوں

کی معرفت نگرانی کریں چنانچہ ان کے دوسپاہی رات بھر دفتر ''ریاست'' کا پہرہ دیتے رہے۔

مسٹر فضل کریم کا دہلی آنے کا یہ واقعہ اس کے بعد میں نے معمولی سمجھا مگر دہلی کی مقامی گورنمنٹ نے پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کو لکھا۔ پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ نے مہاراجہ پٹیالہ کو تنبیہ کی کہ اگر پٹیالہ کے آدمیوں کے ہاتھ برطانوی علاقہ میں یا برطانوی رعایا دیوان سنگھ کے خلاف کوئی بات ہوئی تو مہاراجہ خود ذمہ دار ہوں گے۔ اس کے دو ہفتہ بعد ڈپٹی کمشنر کا ایک خط مجھے ملا جس میں لکھا تھا کہ میں فوراً ریوالور کے لیے درخواست کروں۔ خط ملنے کے بعد میں میسر الہی بخش اینڈ کو بندوق سازاں کی دکان پر گیا وہاں ایک خوبصورت ریوالور کا انتخاب کیا اس کا نمبر لیا۔ درخواست میں اس نمبر کو درج کیا۔ اور درخواست بھیجی۔ تین چار روز کے اندر اس درخواست کی منظوری آ گئی اور میں نے ریوالور خرید لیا۔

اس ریوالور کا شروع شروع میں تو شوق تھا۔ جب کبھی سفر میں جاتا تو ساتھ لے جاتا۔ بعد میں یہ ہمیشہ ہی لوہے کی الماری میں بند پڑا رہتا۔ جہاں سے چوری ہو گیا۔ چوری ہونے پر اس کی تحقیقات شروع ہوئی تو پولیس کو معلوم ہوا کہ دفتر کے ایک شخص نے چوری کر کے اس کو ایک دوسرے شخص کے پاس اسی روپیہ میں فروخت کیا ہے۔ پولیس نے اس شخص کو اس خیال سے گرفتار نہ کیا اور انتظار کیا۔ کہ شاید آگے فروخت ہو اور پھر کسی انارکسٹ کا سراغ لگ سکے۔ پولیس کے اس انتظار ہی میں خریدنے والے شخص کو پولیس کے پیچھا کرنے کا علم ہو گیا اور وہ دہلی سے روپوش ہو گیا۔ پھر کچھ پتہ نہیں چل سکا۔ اس ریوالور کا کیا ہوا اور کہاں گیا۔

ریوالور کے سلسلہ میں ایک دلچسپ لطیفہ کا بیان کرنا بھی ازلطف نہ ہوگا۔ بھوپال کا مقدمہ چل رہا تھا۔ کئی والیان ریاست دشمن تھے۔ میں ہوشنگ آباد پیشی پر جانے کے لیے سامان بندھوا رہا تھا۔ تو میرے پاس لالہ رام رچھپال سنگھ شیدا ایڈیٹر ''ہندوستان''

لاہور اور مسٹر پوتھن جوزف ایڈیٹر دکن ہیرلڈ جو اس زمانہ میں ''ہندوستان'' کو ایڈٹ کرتے تھے بیٹھے تھے۔ لالہ رام رچھپال سنگھ صاحب نے بزرگانہ محبت کے جذبات میں نصیحت کرتے ہوئے کہا کہ اپنے ساتھ ریوالور بھی رکھ لو۔ تمہارے دشمن بہت ہیں جب کبھی باہر جایا کرو تو ریوالور اپنے ساتھ رکھا کرو۔ یہ سن کر مسٹر جوزف نے کہا شیدا صاحب دیوان سنگھ اگر کبھی مارا جائے گا تو کسی والی ریاست کے ہاتھوں نہیں مارا جائے گا۔ یہ جب بھی مارا جائے گا تو دیوانی یعنی سول عدالتوں کے قرقی کونے والے بیلفوں کے ہاتھوں مارا جائے گا۔

یعنی دیوان سنگھ والیان ریاست کے مقدمات اور ان کے حملوں کے مقابلہ کرنے کے لیے کافی ہے۔ اس کے لیے مصیبت تو مالی پریشانیوں کی ہے کیونکہ روپیہ صرف کرنے کی اس کی عادت بدل نہیں سکتی۔ زندگی بھر اس کی یہ پریشانیاں کبھی کم نہ ہوں گی۔ اس کے خلاف قرضہ کے دیوانی مقدمات اور قرقیاں ہوتی رہیں گی۔ اور یہ ان پریشانیوں میں ہی ختم ہو جائے گا۔

ریوالور کے چوری ہونے کے بعد تحقیقات کے سلسلہ میں پولیس میرا لائسنس لے گئی۔ اس کے بعد اس نے پھر دوبارہ ریوالور کا لائسنس مجھے نہیں دیا۔ حالانکہ میرا کوئی قصور نہ تھا۔ اور ریوالور فی الحقیقت چوری ہوا جس کا پولیس کو بھی علم ہے۔

ریوالور چوری ہونے کے عرصہ بعد ایک سال محکمہ انکم ٹیکس نے مجھ پر زیادہ انکم ٹیکس لگا دیا۔ میں نے انکم ٹیکس کی لالہ امیر چند کھنہ انکم ٹیکس ایکسپرٹ سے شکایت کی انہوں نے ٹیکس کم کرانے کی کوشش کی مگر کامیابی نہ ہوئی تو لالہ امیر چند نے کہا کہ اتنے زیادہ انکم ٹیکس کی صورت میں بندوق کا لائسنس کیوں نہ لوں کیونکہ گورنمنٹ بندوق کا لائسنس دیتے وقت زیادہ تر انکم ٹیکس ہی کو دیکھتی ہے۔ میں نے ان کی رائے سے درخواست لکھ کر بھیج دی۔ جو چند دن میں منظور ہو گئی۔ میں نے بمبئی کی ایک فرم سے اشتہارات کی اجرت میں ایک چھوٹی سی بندوق خرید لی۔ یہ بندوق میرے پاس کئی

برس تک رہی اور جب ۱۹۴۲ء میں گرفتار کیا جا کر کانگرسیوں کے ساتھ نظر بند کیا گیا تو میں جیل میں ہونے کے باعث اس سال لائسنس کی تجدید نہ کرا سکا۔ دہلی آیا اور لائسنس کو تجدید کرانے کے لیے ڈپٹی کمشنر کے پاس بھیجا تو اس نے لائسنس تجدید نہ کرانے کے قصور میں یہ لائسنس ضبط کر لیا۔ حالانکہ میں جیل میں تھا۔ وہاں خط و کتابت تک کی ممانعت تھی۔ لائسنس کیوں کر تجدید کراتا بندوق کا لائسنس ضبط ہونے کے بعد پولیس کا ایک کانسٹیبل ڈپٹی کمشنر کا حکم لے کر بندوق لینے کے لیے میرے پاس آیا تو اس کے پاس جو کاغذات ضبطی کے متعلق تھے۔ میں نے وہ لکھے اور ان پر لکھا تھا ''دیوان سنگھ کا چال چلن اس قابل نہیں کہ اسے لائسنس عطا فرمایا جائے اس لیے ضبط کیا جاتا ہے'' یہ چال چلن کے الفاظ پڑھ کر میں نے برا محسوس نہیں کیا۔ کیونکہ گورنمنٹ کے کاغذات میں ہندوستان کے تمام پولیٹیکل لیڈر اور ورکرز مع مہاتما گاندھی بد چلن تھے۔

ان واقعات سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ہندوستان کے دفتری حکومت کے سایہ میں اس ملک میں کاغذات کی خانہ پری کیوں کر ہوتی تھی اور سرکاری کتابوں میں نیک چلنی اور بد چلنی کے کیا معنی تھے۔

اخبار نویس مصیبت زدہ لوگوں کے لیے

مرحوم مہاراجہ نابھ اور آپ کی فیملی کے ساتھ ایڈیٹر ''ریاست'' کے بہت گہرے تعلقات تھے اور شاید اس کی وجہ ی ہو کہ میں ان لوگوں کا ہمیشہ مخلص رہا۔ میں نے کبھی ان کی خوشامد نہ کی اور سچی بات ان کے منہ پر کہہ دیا کرتا۔

چنانچہ یہ دلچسپ کیفیت ہے کہ مہاراجہ اور مہارانی ارو مہاراجہ کی بہن (مہارانی دھول پور) کے درمیان انتہائی عداوت کے دنوں میں بھی میرے تینوں کے ساتھ گہرے تعلقات تھے۔ یہ تینوں مجھ پر اعتماد کرتے اور تینوں ہی مجھے ایسا سمجھتے کہ جیسے میں ان کی فیملی کا ایک ممبر ہوں۔ مہاراجہ مصوری پہاڑ پر تھے آپ نے مجھے دہلی سے بلایا اور کئی روز تک واپس نہ آنے دیا ہر روز مشورہ ہوتا کہ ایک روز مہراجہ نے افسوس کے لہجہ میں شکایت کی۔ کہ فلاں ممبر اسمبلی نے اتنے ہزار روپیہ کھا گیا مگر اس نے کچھ نہ کیا۔ فلاں لیڈر ایک لاکھ روپیہ چاٹ گیا مگر اس نے وائسرائے تک سے نہ کہا کہ فلاں بیرسٹر یا ایڈووکیٹ اتنے لاکھ اڑا گیا مگر نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ تمام لوگ روپیہ لوٹنے والے لالچی ہیں اور کوئی خیر خواہ یا ہمدرد نہیں۔

مہاراجہ نے یہ کہا تو افسوس کے لہجہ میں مگر میں مسکرا دیا۔ مہاراجہ نے پوچھا کہ مسکراء یکیوں ہو۔ میں نے جواب دیا کہ سرکار! یہ لوگ صرف آپ کے مخلص یا ہمدرد ہو کر بغیر لالچ کے آ کی خدمت کریں تو کیوں۔ کیا آپ مہاتما گاندھی ہیں جو دنیا کے لیے تکلیفیں اٹھا رہے ہیں اور ان لوگوں کا فرض ہے کہ وہ بغیر غرض کے آپ کے لیے تکلیف اٹھائیں اور کیا خود آپ کا ان للوں سے تعلق بغیر غرض کے ہے۔ اور اگر آپ نابھ میں اپنی گدی پر ہوتے اور آپ کو کوئی سیاسی تکلیف نہ ہتی تو کیا پھر بھی آپ ان پولیٹکل لیڈروں اور ممبران اسمبلی کو روپیہ دیتے۔ آپ اگر ان لوگوں کو روپیہ دیتے ہیں تو اپنی غرض کے لیے اور یہ لوگ آپ کے ساتھ ہیں تو اپنی غرض کے لیے۔ آپ کا لیڈروں کے لالچ اور غرض کی شکایت کرنا لاحاصل ہے۔ مہاراجہ میرے ان الفاظ کو سن کر خوش

نہ ہوئے اور ان کی پیشانی کے بل ظاہر کرتے تھے کہ وہ اس صاف بیانی کو سننا نہ چاہتے تھے چند لمحہ تک تو سکون کی کیفیت طاری رہی اس کے بعد محسوس کیا گیا کہ میں نے جو کچھ کہا وہ صداقت ہے دونوں اطراف غرض کی غلام ہیں۔

اس واقعہ سے چند روز بعد مسٹر ہارنیمین ایڈیٹر بمبئی سینٹینل بمبئی سے مہاراجہ کی دعوت پر مصوری آئے اور ان کا قیام تو وہاں ہیکمن ہوٹل کے ایک کمرہ میں تھا۔ مگر زیادہ تر وقت ان کا بھی مہاراجہ کے پاس گزرتا۔ میں ہر روز صبح نو بجے مسٹر ہارنیمین سے باتیں کرنے ان کے ہوٹل پر جایا کرتا۔ دو تین گھنٹہ ان کے ساتھ باتیں ہوتیں۔ ایک روز مسٹر ہارنیمین س مہاراجہ نابھ کی مصائب کا ذکر چل پڑا۔ تو مسٹر ہارنیمین نے جو الفاظ کہے وہ اب تک میرے ذہن میں محفوظ ہیں آپ نے فرمایا:

''ویل مسٹر دیوان سنگھ! اخبار نویس دنیا میں صرف ان لوگوں کا ساتھ دینے کے لیے پیدا ہوئے ہیں جو مصائب میں ہوں۔ ان لوگوں سے ہمارا کوئی تعلق نہیں جو خوشی و آرام میں ہوں۔ مہاراجہ نابھ مصیبت میں ہیں۔ اس لیے ہمارا فرض ہے کہ ہم ان کا ساتھ دیں اور مہاراجہ نابھ جب گدی پر واپس چلے جائیں اور آرام میں ہوں تو ان سے کوئی تعلق نہ رکھیں۔

مسٹر ہارنیمین کے یہ الفاظ نہ صرف میرے لیے دلچسپی اور روح کو ایک ناقابل لذت بیان لذت دینے کا باعث ہوئے۔ بلکہ اب جب کبھی کسی کو مصیبت میں دیکھتا ہوں تو میرے ذہن میں بے اختیار ان کے الفاظ کی گونج پیدا ہو جاتی ہے۔

ان واقعات کے عرصہ میں مہاراجہ نابھ کوڈھائی کنال (مدراس) میں نظر بند تھے اور مہاراجہ اور مہارانی (موجودہ مہاراجہ کی والدہ) کے درمیان سخت عداوت تھی اور میاں بیوی کے درمیان خط و کتابت تک کا بھی کوئی تعلق نہ تھا۔ کہ مہارانی اپنے شوہر کی اجازت کے بغیر ایجنٹ گورنر جنرل ریاست ہائے پنجاب سے مل گئیں اور انہوں نے آپس میں فیصلہ کر لیا کہ مہارانی نابالغ مہاراجہ اور دوسرے بچوں کے ساتھ لے کر نابھ

چی جائیں۔نابھ جانے سے پہلے مہارانی بچوں کو لے کر ڈیرہ دون سے دہلی آئیں۔ یہاں علی پور روڈ پر نابھ ہاؤس میں مقیم ہوئیں یہاں پہنچنے پر مہارانی کے بھائی سردار رنبیر سنگھ نے ایڈیٹر ''ریاست'' کو ٹیلی فون کیا۔ کہ مہارانہ صاحبہ نابھ ہاؤس میں تشریف فرما ہیں۔اور میں ان سے ملنے کے لیے پہنچ جاؤں۔ میں کار میں گیا مہارانی اور بچوں سے ملا۔ بہت دیر تک باتیں ہوئیں تو مہارانی نے اپنا خیال ظاہر کیا۔ کہ آپ نابھ جارہی ہیں اس کے متعلق میری کیا رائے ہے تو میں نے جواب دیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ نابھ میں برسر اقتدار ہوں گی۔ ریاست نابھ آپ کے ہاتھوں میں ہو گی۔ پولیٹکل ڈیپارٹمنٹ آپ کی مدد پر ہوگا۔اور آپ آرام وراحت کے ساتھ زندگی بسر کریں گی۔مگر میری رائے میں بغیر شوہر کی مرضی کے شوہر کے خلاف ہوتے ہوئے نابھ جانا آپ کے لیے عزت کا باعث ہو گا میں اس کے حق میں نہیں ہوں کہ آپ مہاراجہ کو زیادہ ناراض کریں۔اور لوگوں میں بھی ذلیل ورسوا ہوں۔مہارانی نے کہا کہ مہاراجہ کی تکالیف کے کم ہونے کا ذریعہ بھی صرف یہی ہے کہ وہ پولیٹکل ڈیپارٹمنٹ کے ساتھ اچھے تعلقات کر کے نابھ چلی جائیں اور پھر وہاں پہنچنے کے بعد اپنے شوہر کے لیے کوشش کریں۔ میں ن ے جواب دیا کہ یہ صرف بہانہ سازی ہے۔ یہ کوئی جواب نہیں جو کسی معقولیت پسند شخص کو مطمئن کر سکے۔

مہارانی کا اس کے بعد شاید چار پانچ روز دہلی میں قیام رہا میں ہر روز ملتا رہا۔ اس عرصہ میں آپ نے بہت کوشش کی کہ میں ان کے ساتھ نابھ چند روز کے لیے چلوں۔ مہارانی مجھے ساتھ لے جانے کے لیے گہری چال تھی۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ اگر میں آپ کے ساتھ نابھ چلا گیا تو ایک تو اس کے بعد میں مہارانی کے نابھ جانے کی مخالفت اخبار میں نہ کروں گا۔ کیونکہ خود ان کے اقدام میں شریک ہوں گا۔ دوسری ان کی غرض یہ تھی کہ میرے ان کے ستھ نابھ جانے کی صورت میں مہاراجہ میرے بھی خلاف ہو جائیں گے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دیوان سنگھ ہمیشہ مہارانی کا ساتھ دے گا۔ اور

مہاراجہ سے تعلقات منقطع ہو جائیں گے۔ میں نے مہارانی کو جواب دیا کہ میں ایک تو اصولاً اس کے خلاف ہوں کہ آپ اپنے شوہر کی خواہش کے خلاف نابھ جائیں۔ دوسرے ریاست نابھ میں میرا سرکاری طور پر داخلہ بند ہے۔ میں وہاں نہیں جا سکتا۔ تیسرے میں اس بات کا قائل نہیں ہوں کہ مہاراجہ جیسے دوست سے غداری کر کے میں آپ کے ساتھ مل جاؤں گو آپ کو بھی اپنا دوست سمجھتا ہوں۔ میرے لیے بہتر راستہ یہ ہے کہ میں آپ کے ان پرائیویٹ معاملات اور جھگڑوں سے بالکل الگ رہوں۔ اور کسی کا ساتھ نہ دوں مہارانی نے پھر زور دیا اور کہا کہ نابھ میں داخلہ کی ممانعت کے متعلق آپ ابھی ایجنٹ گورنر جنرل ریاست ہائے پنجاب سے بذریعہ تار اجازت منگا دیتی ہیں مگر میں نے پھر بھی انکار کر دیا۔

مہارانی جس روز نابھ جانے والی تھیں۔ موٹریں گیارہ بجے کے قریب یہاں سے روانہ ہوئیں۔ اور پروگرام یہ تھا کہ موٹریں راجپورہ تک جائیں اور وہاں سے شاہی داخلہ کیونکہ نابالغ مہاراجہ اور ان کی والدہ اور مہاراجہ کے بھائی بہنیں کئی برس بعد اپنی ریاست میں واپس جا رہے تھے کے لیے ریلوے سٹیشن کی سپیشل ٹرین نابھ جائے۔ میں اس روز نو بجے کے قریب مہارانی اور بچوں سے ملنے کے لیے نابھ ہاؤس پہنچا اور ایک گھنٹہ تک ان لوگوں سے باتیں کرتا رہا۔ اور دس بجے واپس آیا۔ جب واپس آنے لگا تو مہارانی اور نابالغ مہاراجہ (جن کو میں اس روز تک محبت اور وضعداری سے مجبور ہو کر ٹکہ صاحب یعنی ولی عہد ہی کہا کرتا تھا کیونکہ ضمیر گوارا نہ کرتا تھا کہ ان کے باپ کی زندگی میں ان کو مہاراجہ کہوں) مجھے رخصت کرنے کے لیے کمرہ کے اندر سے باہر برآمدہ میں آئے۔ برآمدہ سے جب میں باہر نکلنے لگا تو میں نے مہارانی کو تو ہاتھ جوڑ کر ست سری اکال کہا اور نوجوان مہاراجہ کے گلابی رخساروں کو پیار کے ساتھ ہاتھوں سے چھوا اور ہاتھ ملاتے ہوئے کہا ”ٹکہ صاحب گڈ بائی اب تو شاید ہم زندگی میں کبھی آپ سے نہ مل سکیں گے“ میرے یہ الفاظ سن کر مہارانی چونک پڑیں اور آپ نے

گھبراتے ہوئے کہا کیوں کیوں دیوان سنگھ جی آپ نے یہ کیا کہا۔

میں نے جواب دیا مہارانی صاحبہ! میں دنیا کی حالت سے واقف ہوں۔ اب آپ لوگ آرام سے اپنے گھر جا رہے ہیں۔ میرا آپ لوگوں کے ساتھ تعلق صرف اس وقت تک تھا جب تک کہ آپ لوگ تکلیف میں تھے۔ اب اس کے بعد آپ سے کیا واسطہ۔ مہارانی نے فوراً جوش کے ساتھ کہا کہ نہیں نہیں دیوان سنگھ جی آپ کو کبھی ایسا خیال نہ کرنا چاہیے۔ آپ کے اور ہم لوگوں کے تعلقات فیملی تعلقات ہیں۔ یہ ممکن ہی کیوں ہے کہ ہم لوگ زندگی میں کبھی جدا ہو سکیں۔ آپ کبھی ایسا خیال نہ کیجیے اور کبھی ایسی بات منہ سے نہ نکالیے۔

میں رخصت ہو کر اپنی کار میں واپس اپنے دفتر آ گیا۔ واپس آتے ہوئے کار چلا رہا تھا مگر ذہن مسٹر ہار نیمین کے ان الفاظ کو دہرا رہا تھا جو آپ نے ہیکمن ہوٹل مصوری میں کہے تھے۔

''اخبار نویس دنیا میں صرف ان لوگوں کا ساتھ دینے کے لیے آئے ہیں جو مصائب میں ہوں ان لوگوں سے ہمارا کیا تعلق جو خوشی و آرام میں ہوں''۔

اس کے بعد میں نے نہ تو کبھی مہارانی یا موجودہ مہاراجہ کو کوئی خط لکھا اور نہ ملنے کی کوشش کی۔ نہ ان دونوں کی طرف سے مجھے کوئی خط ملا۔ یہ کئی بار دہلی آئے۔ اور نہ انہوں نے کبھی مجھ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی میں انبالہ جیل میں نظر بند تھا جب مرحوم مہاراجہ نابھ کا کوڈائی کنال میں انتقال ہوا۔

ستمبر ۱۹۴۳ء میں مجھے نظر بندی سے رہائی ملی اور دہلی جیل سے مسٹر موتھن جوزف ایڈیٹر ''ڈان'' کے مکان پر پہنچا۔ اور پہلے روز رہائی کی اطلاع کے متعلق جب اپنے دوستوں عزیزوں اور رشتہ داروں کو خط لکھے تو ان خطوط میں ایک خط مہاراجہ نابھ کو بھی لکھا جس میں ان کے والد کے انتقال کے متعلق اظہار افسوس کیا گیا تھا اس خط کا جواب اب تک میرے پاس کوئی نہیں آیا۔ اور نہ شاید کبھی آئے۔ کیونکہ اخبار نویس کے جواب کی بھی صرف ان لوگوں سے توقع کر سکتے ہیں جو مصاحب میں ہوں ان لوگوں سے ان کا کیا تعلق جو آرام و راحت میں ہوں۔

غلط تشخیص اور غلط علاج

میرے وطن حافظ آباد میں ایک درزی امام الدین تھے ۔ میں نے جب ہوش سنبھالا تو وہ ہمارے گھر کے کپڑے سیا کرتے تھے ۔اور اگر میں غلطی نہیں کرتا تو میری پیدائش سے پہلے میرے والد کے کپڑے بھی شاید وہی سیتے تھے ۔ بہت اچھا زمانہ تھا ہندو مسلمان کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔ان امام الدین کو ہمارے گھر میں کسی نے نام سے کبھی نہ پکارا تھا۔ ہر شخص عزت کے ساتھ ان کو مخاطب کرتا ۔ چنانچہ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب وہ کبھی ہمارے گھر سینے کے لیے کپڑے لینے یا سینے کے بعد کپڑے دینے آتے تو میں ان کو پنجابی زبان میں چاچا (یعنی چچا) کہتا اور ان کی غیر حاضری میں بھی جب ان کا نام لیتا تو میں امام الدین کے ساتھ چاچا ضرور کہتا ۔ یعنی میں چاچا امام الدین کے ہاں گیا ۔یا چاچا امام الدین سے ملا۔ ہمارے خاندان کے تمام لوگ آپ کے ساتھ اس طرح ہی عزت و محبت کا سلوک کرتے اور یہ سلوک صرف امام الدین تک ہی محدود نہ تھا ۔ ہمارے گھر میں صاء کرنے کے لیے ایک بھنگن روشن بی بی آیا کرتی مجھے یاد ہے کہ اس کو بھی ہمیشہ چاچی (چچی) کہہ کر پکارتا ۔اس کی ایک لڑکی مجھ سے ساتھ آٹھ سال بڑی تھی اسے بھی میں ہمیشہ بہن کہہ کر مخاطب کرتا ۔کیونکہ تمام گھر بھر میں یہی دستور تھا۔اور میرے حقیقی بھائی بہن چچا زاعد بھائی اور عزیز دوسروں کے ساتھ اس طرح ہی پیش آتے ۔

میری عمر پندرہ سال کی تھی ۔ جب میں تلاش روزگار کے لیے وطن سے چلا گیا ۔ اور اس کے بعد اگر کبھی وہاں گیا تو چند روز کے لیے بلکہ اکثر ایسا ہوا کہ پانچ چھ سال کے بعد جانے کا اتفاق ہوا تو صرف ایک یا دو روز کے لیے چنانچہ چچا امام الدین سے ملے بھی سالہا سال ہو گئے مگر ان لوگوں کے اخلاص اور محبت کا اب تک ذہن پر اثر ہے اور جب کبھی ان کا خیال آتا ہے تو اس اخلاص ی یاد سے آنکھیں تر ہو جاتی ہیں ۔

کئی برس کی بات ہے کہ چچا امام الدین کا نواسہ جس کی عمر دس سال کی ہو گی کھانسی

میں مبتلا ہو گیا اور کچھ عرصہ کے بعد اس کو بخار کی بھی شکایت ہوئی ۔ کھانسی اور بخار دونوں کا ایک جگہ جمع ہونا ہندوستان کے نالائق حکیموں کے خیال سے سو فیصدی تپ دق ہے ۔ امام الدین اس بچہ کو جس حکیم کے پاس لے جائیں وہ کھانسی اور بخار سن کر نبض دیکھے اور تپ دق کا نسخہ لکھ دے ۔ یہ بچہ دو برس تک اس تپ دق میں مبتلا رہا ۔ تمام حکیموں کے فتوے کی صورت میں بچہ کے والدین کی تشویش کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے ۔ امام الدین صاحب اس وقت تو بہت ضعیف تھے نہ معلوم اب زندہ ہیں یا انتقال فرما چکے ہیں ۔ ان کو علم تھا کہ میں دہلی میں ہوں اور ''ریاست'' اخبار بہت شاندار نکل رہا ہے ۔ انہوں نے یہ بھی سنا کہ دہلی لائق حکیموں کا مرکز ہے ان کو بھی خیال ہوا کہ دیوان سنگھ کا ان حکیموں پر اثر ہو گا ۔ یہ بچہ دہلی کے حکیموں کو دکھایا جائے شاید اس کے تپ دق کا علاج ہو سکے اور لڑکا بچ جائے امام الدین صاحب نے اپنے داماد یعنی اس بچہ کے باپ کے ساتھ اپنے نواسہ کو بھیجا ۔ اور ساتھ مجھے خط لکھا کہ یہ بچہ دو سال کے عرصہ میں تپ دق میں مبتلا ہے ۔ اس کو کھانسی اور بخار ہے تمام حکیموں نے جواب دے دیا ۔ اسے دہلی کے حکیموں میں سے کسی لائق حکیم کو دکھایا جائے تاکہ اس کا علاج ہو شاید یہ بچ جائے ۔

یہ بچہ اپنے باپ کے ساتھ جب آیا اور میں نے اس خط کو پڑھا تو مجھے بچپن کا زمانہ یاد آ گیا جب امام الدین ہمارے دکھ سکھ میں شریک تھے ہمارے ہاں شادی ہوتی تو یہ کئی کئی روز تک ہمارے ہاں بیٹھ کر کپڑے سیتے ۔ اور اگر کوئی موت ہو جاتی تو یہ اس طرح ہی روتے جیسے ان کے گھر کا کوئی عزیز مر گیا ہے ۔ میں نے ایک کمرہ میں امام الدین کے داماد اور نواسہ کی رہائش کا انتظام کیا ۔ مرحوم حکیم محمد احمد خاں (مرحوم حکیم اجمل خاں کے بھتیجے) کے ساتھ میرے حقیقی بھائیوں جیسے تعلقات تھے آہ ایسے مخلص بے ریا اور محبت کے لوگ دنیا سے اٹھ گئے اور اب ان کا نعم البدل کہیں نظر نہیں آتا ۔ میں نے فیصلہ کیا کہ بچے کو ایک روز بعد حکیم کو دکھاؤں گا ۔ شام کو میں کام سے فارغ ہوا

تو میں نے امام الدین کے داماد کو اس غرض سے اپنے پاس بلایا کہ اس سے حافظ آباد کے تازہ حالات معلوم کروں یہ باتیں کرنے کے لیے اپنے بچہ کے ساتھ میرے پاس آیا تو باتوں باتوں میں اس نے بتایا کہ بچہ کے متعلق تمام حکیموں نے مایوسی کا اظہار کیا ہے اور یہ دو سال سے بیمار ہے۔اور اس کی زندگی کی گھر والوں کو کوئی امید نہیں کیونکہ اسے تپ دق ہے۔

دو سال کی طویل بیماری اور تپ دق سن کر میں نے جب بچہ کی طرف دیکھا تو اس کے رخساروں پر سرخی تھی۔اور بچپن کے باعث وہ سکون کے ساتھ نہ بیٹھ سکتا تھا۔اس کا ذہن شرارتوں اور کھیلوں کی تلاش میں تھا۔چنانچہ وہ چاہتا تھا کہ ہمارے پاس بیٹھنے کے بجائے کھیلنے کے لیے نیچے چلا جائے میں نے اس کی کیفیت کو دیکھا تو سوچنے لگا کہ یہ کس قسم کا تپ دق ہے کہ جس میں دو سال تک مبتلا رہنے کے بعد بھی بچہ کے چہرہ پر سرخی ہے۔اور اس کی بچپن کی شرارت میں کمی نہیں ہوئی میں تین چار برس تک میڈیکل پریکٹس کرتا رہا اور میں کامیاب پریکٹیشنروں میں سے تھا۔اس سے پہلے موگا ہسپتال میں رہا۔اور اب بھی ادویات کے ساتھ دلچسپی کے متعلق پوچھا کہ اس کو تکلیف کیا ہے تو بچہ کے باپ نے بتایا کہ تپ دق ہے میں نے پھر پوچھا اور کہا کہ تپ دق تو بیماری ہے اس کو تکلیف کیا ہے۔اس نے بتایا کہ دن بھر اور رات بھر کھانستا ہے اور رات کو اسے بخار بھی ہوتا ہے۔میں حیران کہ یہ تپدق کس قسم کا ہے جو دو سال تک رہا مگر بچہ کا ہرہ پر سرخی اور رونق ہے کیونکہ تپ دق کا دو چار ماہ ہی میں اگر علاج نہ کیا جائے تو موت کے قریب لے جاتا ہے۔مجھے خیال ہوا۔کہ شاید اس کا گلا خراب ہو اور گلے کی خرابی کے باعث یہ کھانستا ہو اور بخار ہو جاتا ہو۔میں نے اس کو منہ کھولنے کے لیے کہا اس نے منہ کھولا تو میں نے دیکھا کہ اس کے گلے کے دونوں طرف لوکاٹ کے برابر گلینڈ بڑھے ہوئے ہیں اور تمام منہ غلیظ ہے۔یعنی کبھی صاف نہیں کیا گیا۔مجھے یقین ہو گیا کہ یہی اس کی بیماری کا باعث ہے۔

اس واقعہ کے ایک عرصہ پہلے کئی برس تک میرا گلا خراب تھا اور سور تھروٹ کے باعث میں آرام سے سو بھی نہ سکتا تھا۔ اس زمانہ میں چاندنی چوک کے سرے پر ایک تھروٹ اکسپرٹ ڈاکٹر قریشی تھے۔ (میرا خیال ہے کہ یہ صاحب بعد میں غالباً ریاست رام پور میں چیف میڈیکل آفیسر تھے) میں نے ان کو دکھایا تو انہوں نے مجھے ناک اور گلے کے سپرے کے ساتھ استعمال کرنے کے لیے دو فیصدی طاقت کا نیوسل دول سلیوشن بتایا۔ میں نے اس لوشن کا استعمال کیا تو میرا گلا جو کئی برس سے خراب تھا۔ دو تین دن ہی میں بالکل اچھا ہو گیا یہ لوشن اور سپرے میرے پاس ہمیشہ موجود رہتا تھا۔ میں نے کئی درجن دوستوں کو یہ نسخہ بتا چکا تھا۔ اور کوئی طلب کرتا تو مع سپرٹ اس کو بھی دے دیتا۔ اور اگلے روز نیا خرید یتا۔ میں نے دوا سپرے میں ڈال کر اسے لگائی اور ناک کے ذریعے ناک اور گلے کے درمیان کے حصہ میں پہنچائی۔ صبح پھر اسی طرح سپرے کیا اور غرارہ کے لیے میں نے اسے مرکوزون اور لسٹرین دیا۔ جو میں غرارہ کے لیے ہمیشہ خود استعمال کرتا ہوں دو دن کے بعد میں نے دیکھا کہ اس کا گلا بہت حد تک اچھا ہو چکا تھا۔ میں نے حال پوچھا تو اس نے بتایا کہ اب اس کو کھانسی کی شکایت نہیں اور بخار بھی نہیں ہوتا۔ اور کوئی تکلیف باقی نہیں۔

تین چار روز میں نے اس بچہ کو خود سپرے کیا۔ جب بچہ بالکل اچھا ہو گی تو میں نے ایک شیشی سلیوشن ای سپرے اور ایک مرکوزون اور ایک شیشی لسٹرین دی تفصیل کے ساتھ سپرے دوائی کا لگانا بتایا اور غراروں کے متعلق سمجھایا۔ اور کہا تپ دق نہ تھا گلا خراب تھا اب بچہ اچھا ہو گیا ہے یہ ادویات لے کر واپس تشریف لے جایئے۔۔ یہ سب کچھ سمجھنے کے بعد اس نے سوال کیا کہ حکیم صاحب کو کب دکھاؤ گے۔ میں نے پوچھا کہ بچہ اب بالکل اچھا ہے یا نہیں۔ اس نے جواب دیا کہ ہاں بالکل اچھا ہے نہ کھانسی ہے نہ بخار رات کو آرام سے سوتا ہے۔ اور کوئی شکایت نہیں اس نے جواب دیا کہ ہاں اچھا ہے نہ کھانسی ہے نہ بخار رات کو آرام سے سوتا ہے۔ اور کوئی شکایت نہیں

۔میں نے کہا کہ جب بالکل اچھا ہے تو پھر حکیم صاحب کو دکھانے کی کیا ضرورت ہے
۔میری تمام دلائل سننے کے بعد اس نے پھر کہا کہ حکیم صاحب کو تو ضرور دکھا دیجیے۔
میں نے بہت کہا کہ جب بچہ بالکل اچھا ہے تو اب دکھانے سے کیا فائدہ یہ نہیں مانا۔
بہت مایوسی محسوس کر رہا تھا۔آخر مجبوراً مجھے بھی اس جہالت کا ساتھ دینا پڑا۔ میں ان باپ بیٹے کو موٹر میں حکیم صاحب کی خدمت میں لے گیا تمام حالات بتائے اور عرض کیا کہ اس طرح سے علاج کیا اب بچہ بالکل اچھا ہے مگر ان کی خواہش تھی کہ آپ کی خدمت میں ضرور حاضر ہوں۔حکیم صاحب تمام حالات سن کر مسکرا دیے اور آپ نے نسخہ لکھ دیا۔شربت شہتوت ایک تولہ اور فلاں معجون دن میں تین بار۔

اس واقعہ سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ ہندوستان کے لوگوں میں حکیموں اور ویدوں کے متعلق کتنا کورانہ اعتقاد ہے۔اور پبلک کس طرح سے غلط تشخیص و غلط علاج کا شکار ہو کر نئی ایجادات اور سائنس سے فائدہ نہ اٹھاتے ہوئے تباہ ہو رہی ہے۔

ریاست نابھ کا پراسرار بکس

ریاست نابھ میں ایک صاحب پنڈت آسا سنگھ مہاراجہ کے اے ڈی سی تھے بڑے منکسر المزاج تھے بات رکتے تو ہاتھ جوڑ کر نگاہیں نیچی کر کے خوشامدانہ طریقہ سے۔مہاراجہ ان کی خوشامدوں کے باعث ان سے بہت خوش تھے۔ان کے والد بھی پہلے اس ریاست میں ملازم تھے اور پنڈت آسا سنگھ نے بھی ایک ادنیٰ حیثیت سے اے ڈی سی تک ترقی کی تھی۔اس لیے ان کو خاندانی اور فطرتاً وفا شعار سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ مجھے یاد ہے مہاراجہ نے اپنے ایک دوست سردار بہادر سرجگن سنگھ آف لدھیانہ جو اس زمانہ میں ممبر پنجاب کونسل تھے کو ایک زبانی پیغام بھیجا۔جو لکھ کر نہ بھیجنا چاہتے تھے تو اس پیغام کو پہنچانے والے پنڈت آسا سنگھ تھے مہاراجہ نے جو تعارفی خط پنڈت آسا سنگھ کو دیا اس میں لکھا کہ پنڈت آسا سنگھ میرے معتمد نمائندہ ہیں یہ جو کچھ کہیں گے وہ میری طرف سے اور سچ سمجھا جائے گا۔پنڈت آسا سنگھ کا نابھ میں کافی عروج تھا۔ریاستوں میں تو حکمران کے ہاتھ دھلانے اور کھانا کھلانے والوں سے بھی ان کو سگ حضوری سمجھ کر لوگ ڈرتے تھے۔پنڈت آسا سنگھ اے ڈی سی تھے اور ان سے تو وزرا بھی خوف کھاتے تھے اور بہت عزت سے پیش آتے۔

چیمبر آف پرنس کا اجلاس دہلی میں ہو رہا تھا مہاراجہ یہاں لڈلو کیسل روڈ کی ایک کوٹھی میں مقیم تھے۔اس کوٹھی کے میدان میں پرائیویٹ سیکرٹری اے ڈی سی اور دوسرے ملازمین حضوری کے لیے خیمے نصب تھے سردار بہادر بھاء کاہن سنگھ ووڈلینڈ میں مقیم تھے۔اور راقم السطور کو بھی تار دے کر نابھ سے دہلی بلوایا گیا تھا۔جو بعض افسروں کے ساتھ ایک ہوٹل میں مجھے ٹھیک سے یاد نہیں غالباً مہاراجہ ہوٹل تھا جو ناولٹی سینما کے پاس ہے میں مقیم تھا۔

پولیٹکل ڈیپارٹمنٹ کے افسر اور ان کا ڈیپارٹمنٹ مہاراجہ کا ان کے گدی پر بیٹھنے کے دن سے ہی دشمن تھا۔اس مخالفت کے باوجود مہاراجہ سرکاری خط و کتابت میں

پولیٹکل ڈیپارٹمنٹ کو جو جواب دیتے وہ پولیٹکل ڈیپارٹمنٹ کے افسروں کے لیے خوش گوار نہ ہوتا۔ان ایسے جوابات میں سے مثال کے طور پر ایک واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ ایجنٹ گورنر جنرل ریاست ہائے پنجاب نے گورنمنٹ ہند کی ہدایت کے مطابق پنجاب کی تمام ریاستوں سے دریافت کیا۔ کہ ان کی ریاست میں سرکاری ملازمین اور ریاست کے لوگوں کے پاس کتنی بندوقیں کتنی تلواریں اور کتنی برچھیاں ہیں ۔ کتنے بھالے اور کتنے دوسرے ہتھیار ہیں کیونکہ گورنمنٹ ہند کے تمام ہندوستان میں اسلحہ شمار کرنا چاہتی تھی ۔ گورنمنٹ کے اس سرکولر کے جواب میں ہندوستان کی ہر ریاست نے مطلوبہ اطلاع بہم پہنچائی مگر مہاراجہ نابھ نے جواب میں لکھا کہ آپ معاہدہ کی کون سی دفعہ کے مطابق پوچھ رہے ہیں اور ایسا پوچھنے کا آپ کو کیا حق ہے ۔ اس قسم کے جوابات حالات کو پیچیدہ سے پیچیدہ تر بناتے چلے گئے ۔ اور مہاراجہ یہ معلوم کرنے کی فکر میں رہتے کہ گورنمنٹ ان کے متعلق کیا کچھ کر رہی ہے ۔ چنانچہ مہاراجہ نے پولیٹکل ڈیپارٹمنٹ کے دفتر سے اپنے متعلق تمام حالات معلوم کرنے کے لیے پولیٹکل ڈیپارٹمنٹ کے دفتر سے اپنے متعلق تمام حالات معلوم متعدد بڑے افسروں اور کلرکوں کو کرایہ پر خرید لیا ۔ ان کو ہزار ہا روپیہ ماہوار دیا جاتا تھا ۔ اور یہ لوگ تمام اس خط و کتابت کی نقلیں اور کاغذات لکڑی کے ایک بکس میں رکھتے تھے اور مہاراجہ جہاں سفر کرتے یہ بکس اپنے ساتھ پنڈت آسا سنگھ کی تحویل میں لے جاتے ۔ چنانچہ اس زمانہ میں یہ بکس بھی مہاراجہ کے ساتھ تھا جو پنڈت آسا سنگھ کی تحویل میں آپ کے خیمہ میں رہتا۔

والیان ریاست طوائفوں اور روزانہ اخبارات کے ایڈیٹروں کی زندگی کا پروگرام دوسرے لوگوں سے بالکل مختلف ہوتا ہے ۔ دنیا سوتی ہے تو یہ جاگتے ہیں ۔ دنیا جاگتی ہے تو یہ سوتے ہیں ۔ مہاراجہ نابھ بھی دوسرے والیان ریاست کی طرح صبح دس بجے جاگتے تھے بارہ بجے چائے پیتے ۔ دو بجے ناشتہ کرتے شام کو چھ بجے لنچ رات کو دس

بجے شام کی چائے اور رات کو دو بجے ڈنر کھانے کے بعد تین بجے بیڈروم میں جاتے آپ ایاک روز رات کو دو بجے سو گئے تو چار بجے پنڈت آسا سنگھ نے خزانچی جو کیمپ کے ساتھ تھا سے دو ہزار روپیہ اخراجات کے نام پر لیا اور کہا کہ آپ مہاراجہ کے ایک ضروری کام سے گوالیار جا رہے ہیں چنانچہ آپ نے ٹانگہ منگایا اس ٹانگہ میں لکڑی کا بکس رکھوایا جس میں پولیٹکل ڈیپارٹمنٹ سے حاصل کی ہوئی نقلیں اور رشوت دے کر حاصل کیے ہوئے کاغذات تھے آپ کی روانگی سے پہلے پٹیالہ کی تیز رفتار موٹریں بھیاس کوٹھی سے کچھ فاصلہ پر موجود تھیں ۔ یہ بکس ایک موٹر میں رکھا گیا ۔ پنڈت جی بھی بیٹھ گئے اور یہ موٹریں پٹیالہ کے لیے روانہ ہوئیں ۔ تیز موٹر دہلی سے پٹیالہ چار گھنٹہ میں پہنچا سکتی ہے ۔ پنڈت آسا سنگھ مع کاغذات آٹھ بجے صبح کے قریب پٹیالہ پہنچ گئے ۔ دس بجے کے قریب مہاراجہ نیند سے بیدار ہوئے ا ور ضروری حاجات سے فارغ ہوئے تو پنڈت آسا سنگھ کو طلب فرمایا کیونکہ یہ معمول تھا کہ بیدار ہونے کے بعد مہاراجہ کا یہ معتمد ترین اے ڈی سی ہر روز مہاراجہ کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا ۔ ملازم پنڈت آسا سنگھ کو بلانے کے لیے گیا تو پنڈت جی اپنے خیمہ میں نہ تھے ۔ دوسرے خیموں میں تلاش کیا وہاں بھی نہ ملے مہاراجہ کو رپورٹ ہوئی کہ موجود نہیں ہیں مہاراجہ نے سمجھا کہ شاید یہیں کہیں ہوں گے ۔ گیارہ بج گئے پنڈت آسا سنگھ پھر طلب کیے گئے ور وہ پھر نہ ملے تو پرائیویٹ سیکرٹری کو بلایا گیا ۔ پرائیویٹ سیکرٹری سردار گورو دیال سنگھ تھے ۔ انہوں ں ے سٹاف کے دوسرے لوگوں سے دریافت کیا تو خزانچی نے بتایا کہ صبح چار بجے دو ہزار روپیہ لے کر گوالیار گئے ہیں اور انہوں نے اپنے ساتھ ایک بکس بھی ٹانگہ میں رکھوالیا تھا پنڈت جی کے خیمہ میں جا کر بکس دیکھا گیا تو وہ بھی غائب تھا ۔ اب تشویش ہوئی ۔ مہاراجہ نے تو پنڈت جی کو کہیں بھیجا نہیں ۔ پنڈت جی گئے کہاں ۔ مہاراجہ کی موٹریں پنڈت جی کو تلاش کرنے کے لیے نکلیں ۔ کوئی ریلوے سٹیشن کوئی ووڈ لینڈ ہوٹل میں کوئی دوسرے ہوٹلوں میں گوالیار ایکسپریس جوابی تار دیا گیا وہاں سے

لاعلمی کا جواب آیا۔ کئی گھنٹہ تک تشویش و ہیجان کہ پنڈت جی گئے کہاں۔ آخر کئی گھنٹے مشورہ کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ پولیس رپورٹ کی جائے۔ چنانچہ دو ہزار روپیہ اور سرکاری سامان لے کر بھاگ جانے کی رپورٹ تھانہ میں لکھی گئی مگر تفتیش ہو تو کہاں اور کون کرے پندت آسا سنگھ پٹیالہ پہنچنے کے بعد پر پنڈت جی کو چالیس ہزار روپیہ نقد انعام دیا گیا اور آپ کو وہاں نائب تحصیلدار بھی مقرر کیا گیا۔ جو شاید بعد میں وہاں ترقی کر کے تحصیلدار بھی ہوئے۔

پنڈت آسا سنگھ والے بکس کو سر دیا کشن کول وزیر اعظم پٹیالہ دہلی لائے اور یہ بکس سر جان تھامپسن پولیٹکل سیکرٹری گورنمنٹ ہند کو دیا گیا۔ سر جان نے تمام کاغذات دیکھے۔ کاغذات دیکھنے کے بعد آپ نے ان کاغذات کو لارڈ ریڈنگ وائسرائے کے پاس لیے گئے۔ لارڈ ریڈنگ نے تمام کاغذات کو دیکھا۔ تو وہ اس خط و کتابت کی نقلیں تھیں جو مہاراجہ نابھ کے متعلق وائسرائے اور پولیٹکل سیکرٹری گورنمنٹ ہند یا پولیٹکل سیکرٹری گورنمنٹ ہند اور ایجنٹ گورنر جنرل ریاست ہائے پنجاب کے درمیان ہوئی تھیں۔ اور قطعی کانفڈینشل تھیں۔ لارڈ ریڈنگ نے ان کاغذات کو حیرانی کے ساتھ اپنے ہاتھ کی انگلی دانتوں میں لے لی اور سر جان تھامپسن کو مہاراجہ کے متعلق حکم دیتے ہوئے کہا:

''اس شخص کے ہاتھوں سے گورنمنٹ ہند کا کانفیڈنشل ریکارڈ بھی محفوظ نہیں اس شخص کو لازمی طور پر ختم کیا جائے اور گدی سے اتار دیا جائے''۔

اس واقعہ سے پہلے نابھ اور پٹیالہ کے درمیان مقدمہ بازی جاری تھی۔ لکھنو چیف کورٹ کے ایک جج سٹورٹ انبالہ میں مقدمات کی سماعت کر رہے تھے۔ نابھ کی طرف سے مسٹر ایڈرلی نارٹن سر علی امام، مسٹر حسن امام اور سردار بہادر بھگوان سنگھ جو آج کل اجمیر میں وکالت کرتے ہیں۔ وغیرہ اور پٹیالہ کی طرف سے کلکتہ کے مسٹر سین اور نصف درجن دوسرے بڑے بڑے وکلا مجھے نام یاد نہیں ہیں میرا خیال ہے کہ شاید ڈاکٹر

سپرو بھی تھے پیروی کر رہے تھے۔ وکیلوں کی فیس اور دوسرے اخراجات کے لیے کرنسی نوٹوں سے بھری ہوئی لاریاں نابھ اور پٹیالہ لائی جاتیں شاید ہی کوئی گواہ ایسا ہوگا جس کو دس ہزار روپیہ سے کم رشوت دی جاتی۔ بعض گواہوں کو تو ہاں کی جگہ صرف نہ کہنے کے لیے پچیس پچیس اور پچاس پچاس ہزار روپیہ رشوت دی گئی۔ نابھ اور پٹیالہ کی رعایا کا پسینہ بہا کر پیدا کیا ہوا روپیہ مقدمہ کے نام پر وکیلوں اور گواہوں کے جیب میں گیا اور ابھی جسٹس سٹوارٹ کا فیصلہ نہ ہوا تھا کہ مہاراجہ نابھ کو گورنمنٹ ہند نے نوٹس بھیج دیا۔ کہ یا تو گدی سے خود بخود دست بردار ہو جاؤ ورنہ جرائم کے لی اسی طرح ہی کھلی عدالت میں مقدمہ چلا کر سزا دیجائے گی جس طرح عام ملزموں کو دی جاتی ہے۔ مہاراجہ دست بردار ہوگ ء پولیٹکل ڈیپارٹمنٹ کے ان ملازموں پر راز افشا کرنے وغیرہ کے جرم پر مقدمہ چلایا گیا۔ جنہوں نے اپنے دفتر کے کاغذات کی نقلیں مہاراجہ کو سپلائی کی تھیں اور اس مقدمہ میں سردار گوردیال سنگھ پرائیویٹ سیکرٹری مہاراجہ نابھ اور فارن منسٹر ریاست نابھ وغیرہ بطور سرکاری گواہ پیش ہوئے۔ جنہوں نے بیان دیا کہ وہ ان لوگوں سے کاغذات لے جا کر نابھ وغیرہ کو دیتے رہے ملزموں کو دو دو تین تین سال قید سخت کی سزائیں ہوئیں اور ملازمت سے برطرف کر دیے گئے۔

ان واقعات کے کئی برس بعد جب مہارانی موجودہ مہاراجہ اور اپنے دوسرے بچوں کو لے کر واپس اپنی ریاست نابھ میں چلی گئی تو ایک روز پنڈت آسا سنگھ ایڈیٹر ''ریاست'' سے ملنے کے لیے دفتر میں تشریف لائے ان بچاروں کو یہ وہم تھا کہ انہوں نے کسی سے سنا تھا کہ مہارانی نابھ پر دیوان سنگھ کا بہت بڑا اثر ہے اور دیوان سنگھ جو مشورہ دے مہارانی اس مشورہ کو قبول کر لیتی ہیں۔ پنڈت آسا سنگھ جب تشریف لائے تو وہی انکسار اور وہی ریاستیوں کا ساہاتھ جوڑ جوڑ کر باتیں کرنا۔ دعا سلام کے بعد باتیں شروع ہوئیں تو آپ نے خواہش ظاہر کی کہ مہارانی چونکہ اب نابھ واپس چلی گئی ہیں اور وہ وہاں برسر اقتدار ہوں گی اور مہارانی کے دل میں ایڈیٹر ''ریاست''

ک لیے بہت عزت ہے۔مہارانی سے ایڈیٹر ’’ریاست‘ یہ کہے کہ پنڈت آسا سنگھ نابھ کے شاہی خاندان کے بدستور وفا شعار ہیں اور انہوں نے غداری نہ کی تھی صرف غلط فہمی ہوئی جو دور ہو جانی چاہیے۔میں نے پنڈت آسا سنگھ سے جب یہ سنا تو حیران رہ گیا۔کہ دنیا میں کتنے بڑے ہونق لوگ موجود ہیں۔جو اپنے ذہن کو دھوکہ دیتے ہوئے خود بے وقوف بنتے ہیں اور دوسروں کو بھی بے وقوف سمجھتے ہیں۔میں نے پنڈت جی سیکہا کہ پنڈت جی میرا مہارانی پر فی الحقیقت کوئی اثر نہیں اور اگر اثر ہوتا بھی تو میں آپ کے متعلق کچھ کہنے کے لیے تیار نہ تھا۔کیونکہ میں آپ کے تمام حالات سے واقف ہوں اور مہارانی خود واقف ہے۔یہ کیوں کر ممکن ہے کہ دونوں ہی اپنے ذہن کو دھوکہ دے کر یہ سمجھ لیں خہ آپ نے مہاراجہ کے ساتھ غداری نہ کی۔آپ کا ہم دونوں کو بے وقوف سمجھنا اسبات کی دلیل ہے کہ آپ اپنے ذہن کو دھوکہ دے رہے ہیں۔میری رائے ہے کہ آ کبھی بھی یہ کوشش نہ کیجیے کہ آپ درست فہی کو غلط فہمی بتا کر اس کو رفع کرنے کی کوشش کریں اور اس میں کامیابی ممکن نہیں۔آپ نے جو کچھ کیا اس کی سزا یہی کافی ہے کہ پٹیالہ کے لوگ بھی آپ کو غدار سمجھتے ہوئے آپ سے نفرت کرتے ہیں اور آپ کے دوستوں کے دل میں بھی آپ کے لیے عزت نہیں۔

مجھے نہیں علم کہ پنڈت آصا سنگھ آج کل ریاست پٹیالہ میں ملازم ہیں یا نہیں اور زندہ ہیں یا مر چکے ہیں مگر پر اسرار بکس کا یہ واقعہ ریاست نابھ اور ریاست پٹیالہ دونوں کی تاریخ میں اہمیت رکھتا ہے جس کے باعث وائسرائے نے مہاراجہ کو گدی سے اتارنے کا قطعی فیصلہ کرلیا۔

☆☆☆

مارشل لاء کا زمانہ

میں جب لاہور میں لالہ شام چند کپور کے روزانہ اخبار میں کام کرتا تھا اس کے علاوہ کچھ وقت ہفتہ وار ''ہندو'' جس کو ایک پنڈت جی نکالتے تھے۔ یہ پنڈت جی آج کل غالباً ہردوار میں ایک سنیاسی کے طور پر زندگی بسر کرتے ہیں اوراب بھی کبھی کبھی اخبار نکال لیتے ہیں۔ اورایک دوسرے اخبار میں بھی کچھ وقت دیتا تھا تا کہ میرا گزارہ چل سکے۔ لاہور میں اطلاع پہنچی کہ مہاتما گاندھی بمبئی سے پنجاب آتے ہوئے ریلوے سٹیشن پلول پلول دہلی کے قریب ہے اور یہاں سے ضلع گوڑگانواں (پنجاب کا علاقہ شروع ہوتا ہے) پر گرفتار کر لیے گئے۔ مہاتما گاندھی کی گرفتاری کی خبر آگ کی طرح تمام صوبہ میں پھیل گئی۔ لاہور شہر میں تمام دکانیں بند پانچپانچ سات سات ہزار کا مجمع جگہ جگہ۔ بازار کا تمام کاروبار معطل ارومہاتما گاندی زندہ باد کے نعرے۔ مجھے اطلاع ملی کہ شاہی مسجد میں مہاتما گاندھی کی گرفتاری کے خلاف اظہار ناراضی ک لیے جلسہ ہوگا میں بھی اخبار کے لیے رپورٹ لینے کے لیے شاہی مسجد میں گیا اور جس جگہ تقریریں ہو‌ونی تھیں۔ اس کے بالکل قریب بیٹھ گیا۔ تقریریں شروع ہوئیں ہندوؤں اور مسلمانوں کے لیڈروں نے ہندو مسلم اتحاد مہاتما گاندھی کی گرفتاری اور انگریزوں کے مظالم پر تقریریں کیں میں نے کاغذ پنسل کی سلپوں کی کاپی پنسل سے اخبار کے لیے نوٹ یئے شروع کیے۔ تو قریب بیٹھے ہوئے ایک شخص نے مجھے مشکوک نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا یہ کیا لکھ رہے ہو۔ میں نے کہا کہ اخبار کے لیے کچھ تقریر لکھ رہا ہوں۔ یہ شخص میرا جواب سن کر خاموش ہو گیا مگر اس کا چہرہ اور اس کی نگاہوں سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ میرے جواب سے مطمئن نہیں اور مجھے غالباً سی آئی ڈی کا آدمی سمجھتا ہے۔ میں نے خیال کیا کہ اس وقت پبلک راج ہے اور ہر شخص لیدر اور خودمختار ہے لوگ جوش اور غصہ میں کہیں ایسا نہ ہو شبہ ہی شبہ میں مجھ پر کوئی حملہ کر دے۔ میں نے سلپوں کی کاپی اور پنسل اپنی جیب میں ڈال دی۔ اور تقریریں سننے لگا۔ تا کہ

بعد میں اپنی یادداشت س یان کے نوٹ لے لوں۔

ہندوؤں اور مسلمانوں کے لیڈر تقریریں کر رہے تھے کہ مجھے کچھ غیرت سی محسوس ہوئی کہ ان تقریروں کے کرنے والوں میں ایک بھی سکھ نہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ سکھ اس قومی تحریک (جس کو لوگ ملکی بغاوت سمجھتے تھے) میں حصہ نہیں لے رہے۔ میرے بالکل قریب ماسٹر موتا سنگھ بی اے یہ بزرگ جنگ سے پہلے پندرہ برس تک جیل میں رہے اور جنگ شروع ہوتے ہی پھر گرفتار کر لیے گئے۔ تقریر کرنے کے اعتبار سے میرا خیال ہے کہ ملک میں کم آدمی ان کا مقابلہ کر سکتے ہیں بیٹھے تھے میرے دوست تھے میں نے ان سے کہا ماسٹر جی آپ سکھوں کے نمائندہ کے طور پر تقریر کیجیے۔ سکھوں کی طرف سے اس تحریک میں شامل نہ ہونا شرمناک ہے ماسٹر جی نے انکار کیا اور کہا کہ آپ شام کی گاڑی پر سوار ہو کر اگلی صبح بھسوڑ (ریاست پٹیالہ) جہاں کہ آپ ہائی سکول کے ہیڈ ماسٹر تھے ضرور پہنچنا چاہتے ہیں کیونکہ ضروری کام ہے۔ میں نے ان کے اس بہانہ کو کسر نفسی سمجھا اور پھر زور دیا کہ ماسٹر جی نے پھر انکار کر دیا۔ تو مجھ سے رہا نہ گیا۔ ایک دوسرے صاحب تقریر ختم کر چکے تو میں نے کھڑے ہو کر اعلان کیا کہ اب سکھوں کی طرف سے ماسٹر موتا سنگھ تقریر کریں گے۔ اس اعلان کے بعد ماسٹر جی کو مجبوراً اٹھنا پڑا۔ پنجاب کے ہندو اور مسلمان بھی ماسٹر جی کے نام سے اور ان کی جیلوں کی زندگی سے واقف تھے اللہ اکبر مہاتما گاندھی کی جے اور ماسٹر موتا سنگھ زندہ باد کے نعرے بلند ہوئے۔ ماسٹر جی نے تقریر کی آپ کی تقریر دوسرے تمام مقررین سے زیادہ سخت اور پر اثر تھی۔ مجھے اب تک یاد ہے کہ آپ نے فرمایا تھا:

"ظلم برداشت کرنا خود ظلم کی تبلیغ کرنا ہے"۔

ماسٹر جی کی تقریر کے بعد دو تین اصحاب کی تقریریں ہوئیں اور ہم لوگوں نے دیکھا کہ ہمارے قریب ہی ایک آدمی کے ہاتھ میں پنسل ہے اور کچھ لوگ اس بری طرح مارتے ہوئے سی آئی ڈی کا آدمی کہہ رہے ہیں۔ مجھے فوراً خیال آیا کہ یہ بیچارہ بھی

میری طرح کوئی رپورٹر ہوگا۔ میں فوراً اٹھا اور مارنے والے لوگوں اور مار کھانے والے کے درمیان کھڑا ہو گیا تا کہ اس کو بچایا جا سکے میں نے ہاتھ پھیلا دیے تھے کہ اس کو چوٹ نہ پہنچے۔ لوگوں کا حملہ میرے ہاتھوں پر ہوا۔ ار میرے ہاتھو کی انگلیاں بھی زخمی ہو گئیں۔ میرے ساتھ تقریریں کرنے والے کسی لیڈر بھی اس شخص کو بچانے میں مصروف تھے۔ چنانچہ ہماری درخواست پر مجمع خاموش ہو گیا۔ اور یہ شخص جلسہ سے نکال دیا گیا۔ اس کے بعد ایک اور شخص نے تقریر کی تھی کہ بعض لوگ دور سے ایک فوج وردی پہنے ہوئے شخص کو اٹھا لا رہے ہیں اور اللہ اکبر کے نعرے بلند ہو رہے ہیں مجمع میں شور پیدا ہو گیا۔ دریافت کیا گیا کہ معاملہ کیا ہے تو لوگوں نے بتایا کہ جالندھر چھاؤنی میں بغاوت ہو گئی ہے۔ اور یہ فوج نوجوان وہاں سے دس بارہ گوروں کو قتل کر کے بھاگ آیا ہے۔ اسی خوشی میں لوگوں نے اس کو اٹھا لیا۔ اور نعرے بلند ہو رہے ہیں۔ تقریریں کرنے والے بعض لیڈر پریشان تھے کہ کہاں مہاتما گاندھی کا عدم تشدد اور کہاں عوام کی یہ سپرٹ ملک کا کیا حال ہو گا۔ مگر ان لیڈروں کی کون سنتا تھا۔ لوگ بے قابو ہو رہے تھے۔ اس فوجی کے آنے کے بعد جلسہ منتشر ہو گیا۔ جب ہم لوگ جلسہ سے شہر کی طرف جانے لگے تو دیکھا کہ گھوڑوں پر پولیس سوار دروازہ کے باہر پہنچ چکے ہیں۔ جو دروازہ شاہی مسجد سے شہر کو جاتا ہے۔ لوگ آہستہ آہستہ اس دروازہ سے نکل گئے پولیس والوں نے کچھ نہیں کہا۔

میں مجمع کے ساتھ ساتھ شہر کی طرف گیا تو ایک چوک میں جہاں ایک قبر...... جسے غالباً نوگزہ کی قبر کہتے ہیں پولیس بندوقیں لیے موجود تھی مجمع پولیس کو دیکھ کر رک گیا۔ پولیس کے ساتھ ایک انگریز سب انسپکٹر بھی تھا اس نے مجمع سے کہا کہ اپنے اپنے گھروں کو چلے جاؤ ایک جگہ جمع نہ ہو مگر لوگ صرف خود تماشہ نہ تھے تماشائی بھی تھے۔ لوگ نہ گئے تو اس پولیس افسر کے حکم سے پولیس نے بندوقیں چلا دیں۔ ایک دو اشخاص مر گئے تین چار زخمی ہوئے تو لوگ اپنے گھروں کو چلے گئے اور چوک صاف ہو

گیا۔ میں یہ سب اپنی آنکھوں سے ایک بند دوکان کے برآمدہ میں کھڑا دیکھ رہا تھا۔

رات کو میں لالہ بانکے دیال ایڈیٹر ''جھنگ سیال'' کے مکان پر بھائی دروازہ سویا کرتا تھا کیونکہ سونے سے زیادہ دلچسپی موجودہ حالاات کے متعلق باتیں اور بحث کرنے میں تھی۔ اس واقعہ سے اگلے روز یا ایک دو روز بعد مجھے ٹھیک طرح یاد نہیں۔ صبح میں حلات کا پتہ لینے شہر گیا تو معلوم ہوا کہ شاہی مسجد میں جو شخص پٹا تھا اور جس کو بچاتے ہوئے میرے ہاتھ کی انگلیوں میں چوٹ آئی تھی وہ علی گوہر انسپکٹر پولیس سی آئی ڈی تھا جو جلسہ میں سرکاری رپورٹر کے طور پر گیا تھا میں لال دینا ناتھ ایڈیٹر ''دیش'' کے مکان پر پہنچا تو وہاں معلوم ہوا کہ مارشل لاء نافذ ہو چکا ہے۔ وررات کو ڈاکتر گوکل چند نارنگ پنڈت رام بھج دت چودھری اور لالہ ہرکشن لال وغیرہ تمام لیڈر ملک معظم کے خلاف جنگ کرنے کے جرم میں گرفتار کیے گئے ہیں۔ لالہ دینا ناتھ کے ہاں سے میں گوالمنڈی کی طرف گیا تو وہاں ایک دوست ملے۔ انہوں نے کہا ساٹھ گرفتاریاں ہو چکی ہیں وہاں سے میں سردار سردول سنگھ کولیشر کیمکان پر پہنچا تو ان کے آدمی نے بتایا کہ سردار صاحب کو کل ہی علم ہو گیا تھا کہ ان کی گرفتاری کے وارنٹ جاری ہو چکے ہیں۔ اس لیے وہ لاہور سے باہر کسی نامعلوم جگہ پر چلے گئے ہیں اور وہ جاتے ہوئے ءمیرے دیوان سنگھ کے لیے پیغام چھوڑ گئے ہیں کہ میں بھی فوراًلاہور سے کسی پوشیدہ جگہ چلا جاؤں سر مائیکل اڈوائر نے جن اڑھائی سو اشخاص کے وارنٹ جاری کیے ہیں ان میں میرا نام بھی شامل ہ۔ کیونکہ میں نے شاہی مسجد میں ماسٹر موتا سنگھ کا تعارف کرایا تھا۔ سردار سردول سنگھ کے مکان سے واپس میں دینا ناتھ کے ہاں پھر مشورہ لینے کے لیے آیا تو معلوم ہوا کہ اس وقت تک سوا سو کے قریب گرفتاریاں ہو چکی ہیں۔ وہاں سے لالہ دینا ناتھ کے مکان پر پہنچا۔ حالات بتائے مشورہ کیا تو لالہ بانکے دیال نے کہا کہ اب شہر میں مت جاؤ۔ فوراًلاہور سے بارہ کسی مقام پر چلے جاؤ اور دیر مت کرو۔ تا کہ ایسا نہ ہو گرفتاری ہو جائے۔ میں وہاں سے سیدھا دریائے راوی

کی طرف پیدل چل دیا۔ کیونکہ مارشل لاء کے باعث تمام لوگوں کی آمدورفت اجازت ممنوع قرار دی گئی تھی اور تانگے وغیرہ چلنے صبح سے ہی بند ہو چکے تھے۔ اس وقت میرے جیب میں صرف دو روپیہ تھے۔ اور میرے لیے ممکن ہی نہ تھا کہ میں دوبارہ شہر میں جا کر کسی سے روپیہ کا انتظام کرتا۔

میں جب دریائے راوی کے پل پر پہنچا تو دیکھا کہ وہاں مسلح پولیس کا پہرہ ہے اور کسی شخص کو لاہور سے باہر جانے کی اجازت نہیں۔ مجھے بھی پولیس نے روک دیا اور کہا کہ واپس شہر کو جاؤ۔ پل پر سے گزرنے کی ممانعت ہے پولیس کے یہ سپاہی مسلمان تھے میں نے ان سے کہا کہ میں ایک ضروری کام کے سلسلہ میں صرف شاہدرہ تک جا رہا ہوں۔ وہاں میرے عزیزوں میں ایک صاحب بیمار ہیں دوائی کا انتظام کرنا ہے آپ مہربانی فرما کر مجھے جانے دیجیے میں دوائی کا انتظام کر کے ابھی واپس آجاؤں گا۔ دوسرے سپاہیوں نے تو میری اس درخواست کی پروانہ کی مگر ایک شخص بہت نیک تھا اس نے اپنے ہمراہیوں سے مخاطب ہو کر کہا یار کیا اندھیر آجائے گا جانے دو بیمار کے لیے دوائی لے جانا چاہتا ہے۔ یہ کونسا کوئی لیڈر ہے کہ بھاگ رہا ہے۔ اس شخص کی سفارش پر اس کے ہمراہیوں نے مجھ سے کہا کہ اچھا سردار جی جلدی چلے جاؤ۔ کوئی افسر نہ دیکھ لے۔ ورنہ ہماری بے عزتی کرے گا۔ میں جلدی جلدی چلا گیا۔ پل پار کرنے کے بعد گوجرانوالہ کو روانہ ہوا۔ سڑک پر پیدل چل رہا تھا۔ پہلے اتنا زیادہ چلنے کا کبھی اتفاق نہ ہوا تھا۔ بہت مشکل کے ساتھ چلا جاتا۔ صبح نو بجے کے قریب لاہور سے چلا تھا رات کو دس بجے کے قریب تیس میل کا فاصلہ طے کر کے کامونکے پہنچا۔ راستہ میں کچھ نہ کھایا۔ دو ایک جگہ پانی پیا۔ پاؤں میں کثرت سے چھالے پڑ گئے تھے ۔ چلا نہ جاتا تھا۔ جب کامونکے پہنچا تو خیال آیا کہ ایک صاحب میرے معترف ہیں لاہور میں کئی بار مل چکے ہیں۔ ان کے ہاں جانا چاہیے۔ ان کا نام یاد نہ تھا۔ کیونکہ یہ زندگی کا معمول تھا۔ کہ اگر کوئی شخص ملنے کے لیے بھی آئے تو کبھی نام نہیں پوچھتا۔ اور

کوشش ہوتی ہے کہ یہ صاحب پھر دوبارہ ملنے کے لیے تشریف نہ لائیں کیونکہ میں نے
ہمیشہ چاہا کہ دوستوں کا حلقہ بہت ہی محدود رہے اور جو ہوں وہ بہت مخلص اور گہرے
دوست ہوں۔رام رام جے رام کرنے والے دوست نہ ہی ہوں تو اچھا ہے مجھے اتنا یاد
تھا کہ ان کے والد انجینیر تھے۔میں نے ایک شخص سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ دوسری
طرف تھانہ کے قریب ان کا مکان ہے میں وہاں پہنچا تو گھر کے لوگ سوئے ہوئے
تھے میں نے دروازہ کھٹکھٹایا تو مالک مکان اوپر کی منزل سے نیچے اترے (میرا خیال
ہے کہ ان کا نام غالباً رگھبیر سنگھ تھا) انہوں نے دروازہ کھولا ان کے ہاتھ میں لالٹین تھی
۔روشنی سامنے کر کے مجھے دیکھا تو حیران رہ گئے۔کہ میں ہوں۔مجھے اوپر لے گئے۔
پنجاب کے لوگ بہت متواضع ہوتے ہیں۔سب سے پہلے انہوں نے کھانے کے
متعلق پوچھا میں دن بھر کی تھکاوٹ اور بھوک سے بے حال ہو رہا تھا۔جب دیکھا کہ
یہ لوگ سو رہے ہیں تو غیرت نے گوارا نہ کیا۔کہ کھانے کی ان کو تکلیف دوں۔میں نے
اپنے دل پر جبر کرتے ہوئے لاپروائی سے کہا کہ میں کھانا کھا چکا ہوں۔کوئی خیال نہ
کیجیے۔میرا یہ جواب سن کر یہ مطمئن ہو گئے۔باتیں شروع ہوئیں انہوں نے پوچھا کہ
اس وقت کہاں سے آئے۔میں نے تمام حالات بتائے اور انہوں نے کہا کہ یہاں
کاموںکے کے قریب ہی اس ریلوے ٹیلی گراف کے تار کٹ گئے ہیں ارو پولیس
تحقیقات کر رہی ہے کہ اور ان سے بھی کئی بار پوچھا گیا ہے۔اب رات کا وقت ہے
ابھی تم آئے ہو۔اسوقت کہنا مناسب نہیں کہ ابھی چلے جاؤ۔رات تو آرام کرلو لیکن صبح
ہی روشنی ہونے سے پہلے یہاں سے روانہ ہو جاؤ میں نے کہا بہت اچھا۔مگر مجھے پانچ
سات روپے قرض دے دیجیے۔میرے پاس صرف دو روپے ہیں تاکہ اپنے وطن
حافظ آباد پہنچ جاؤں جہاں جانا ہوگا حافظ آباد مشورہ کر کے وہاں جاؤں گا۔انہوں نے
مجھے سات روپے اسی وقت دے دیے اور میں سو گیا بہت تھکا ہوا تھا گہری نیند آئی۔
سردار صاحب نے چار بجے کا الارم لگا دیا تھا چار بجے ان کے ٹائم پیس نے گھنٹی بجائی تو

آپ جاگے۔ آپ نے مجھے جگایا اور فرمایا کہ تشریف لے جایئے۔ انہوں نے مجھے مشورہ دیا کہ میں گوجراں والہ کے راستہ سے حافظ آباد نہ جاؤں کیونکہ گوجرانوالہ میں اکثر گرفتاریاں ہو چکی ہیں۔ ریلوے سٹیشن وغیرہ جلا دیا گیا ہے۔ میں کاموں کے سے سیدھا قلعہ دیدار سنگھ جاؤں اور وہاں سے حافظ آباد۔ رات کے چار بجے تھے۔ تاریکی اور راستہ سے ناواقف تھا۔ یہ حضرت دو فرلانگ کے قریب گاؤں سے باہر میرے ساتھ آئے اور ایک راستہ دکھا کر کہا کہ اس راستہ پر چلے جایئے۔۔

تھکاوٹ اور آبلوں کے باعث میرے پاؤں لڑکھڑا رہے تھے۔ چلا نہ جاتا تھا نیند کا غلبہ تھا۔ تھوڑی دور گیا تو ایک چھوٹی نہر کا پل تھا نہر ٹوٹی ہوئی تھی۔ اور راستہ پانی سے بھرا ہوا تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ چاہے گرفتاری ہو یا نہ ہو میں اس وقت آگے نہ جاؤں گا...... نہر کے پل پر جو چھوٹی سی پختہ دیوار تھی میں اس پر سو گیا اور اس وقت آنکھ کھلی جب آفتاب کی کرنیں کھیتوں کو منور کر رہی تھیں۔ میں اٹھا نہر کے کنارہ پر ضروری حاجت سے فارغ ہوا۔ مہ ہاتھ دھویا اور پانچ دس منٹ کھیتوں کا منظر دیکھا اسنے میں ایک شخص آتا ہوا نظر پڑا۔ تو اس سے قلعہ دیدار سنگھ کو راستہ کون سا جاتا ہ۔ اس نے راستہ بتایا وہاں سے چل پڑا۔ قلعہ دیدار سنگھ اور کاموں کے کے درمیان ایک چھوٹا سا گاؤں تھا اس گاؤں میں گیا۔ اپریل کا مہینہ تھا اور فصل کی کٹائی ہو رہی تھی۔ تمام لوگ کھیتوں میں تھے اس گاؤں کے ایک گھر میں ایک بوڑھی مسلمان عورت بیٹھی تھی۔ میں نے پوچھا کہ پینے کے لیے پانی مل سکے گا۔ اس خاتون نے نہایت اخلاص اور محبت کے ساتھ جواب یدا کہ یہاں تم کے تمام گھر مسلمانوں کے ہیں کوئی گھر ہندو کا نہیں میں نے کہا کہ میں مسلمانوں کے ہاں کا پانی پی لوں گا۔ اس خاتون نے مجھے اندر سے چارپائی نکال کر دی۔ میں بیٹھ گیا۔ یہ اندر سے مٹکے کا ٹھنڈا پانی پینے کے لیے لائی تو اس کو خیال آیا کہ اگر یہ سکھ مسلمانوں کے ہاں سے پانی پی لیتا ہے تو شاید چھاچھ بھی پی لے۔ اس نے پوچھا کہ بیٹا اگر تم پانی پی سکتے ہو تو کیا لسی (چھاچھ) نہیں پی سکتے۔ میں

نے کہا پی لوں گا۔ پنجاب میں چھاچھ کا بہت رواج ہے۔ اور شاید ہی کوئی شخص ہو جو
دن میں کئی بار دہی کی لسی چھاچھ نہ پیتا ہو۔ یہ بیچاری میرے لیے مکھن ڈال کر چھاچھ
لے آئی۔ میں نے چھاچھ پی لی تو یہ میرے پاس دوسری چارپائی پر بیٹھ گئی۔ اور اس
نے باتیں شروع کیں۔ مجھ سے پوچھا کہ کہاں سے آرہے ہو اور کہاں جاؤ گے۔ میں
نے کہا لاہور سے آرہا ہوں اور حافظ آباد جاؤں گا۔ سواری نہ ملی تھی۔ اس لیے کاموکی
سے سیدھا قلعہ دیدار سنگھ کے راستہ جاؤں گا۔ اس نے پوچھا کہ سنا ہے کہ مہاتما گاندھی
پکڑ لیے گئے ہیں اور ہندو مسلمان ایک ہو گئے ہیں اس نے پھر پوچھا کہ کیا میں اس
لیے ہی مسلمانوں کے ہاں سے پانی پی لیتا ہوں۔ میں نے کہا نہیں میں تو کئی برس سے
مسلمانوں کے ہاں سے پی لیتا ہوں۔ اس کے بعد یہ خاتون تھوڑی دیر کے لیے
خاموش ہو گئی اور سوچتی رہی پھر مجھ سے سوال کیا۔ جب ہندو مسلمان ایک ہو گئے ہیں
تو کیا اب ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان شادی بیاہ بھی ہوا کرے گا۔ یہ سوال سن
کر میں مسکرا دیا۔ کیا جواب دیتا میں نے ٹال دیا۔ اور کہا کہ ابھی ہندو مسلمان اس حد
تک ایک نہیں ہوئے۔ آئندہ جا کر ایسا کریں گے۔ میرا جی نہ چاہتا تھا کہ میں ارسفر
کرتا مگر میں مجبور تھا روانہ ہونے لگا تو اس ضعیف خاتون نے کہا کہ بیٹا تھوڑی دیر
آرام کر لو۔ کھانا کھا کے چلے جانا میری خواہش تھی۔ کہ یہ مجھے ایسا ہی کہتی میں نے نیم
دلی کے ساتھ انکار کرتے ہوئے اس کے دوبارہ کہنے پر ہاں کر لی۔ اس چارپائی پر سو
گیا۔ اتنے میں خاتون نے کھانا تیار کر لیا بینگن کی سبزی اور گھر کے گھی کے پراٹھے دہی
مکھن اور لسی چالیس گھنٹہ سے کچھ کھایا نہ تھا اس خاتون کی اخلاص و محبت کی دعوت
میں وہ لطف آیا کہ جو اس کے بعد مہاراجوں اور نوابوں کے دستر خوان پر بھی کبھی نصیب
نہیں ہوا۔ کھانا کھانے کے بعد میں ایک گھنٹہ کے قریب پھر سو گیا۔ جاگنے کے بعد
وہاں سے چلنے لگا تو میں نے چاہا کہ اس خاتون کے پوتے کو جو وہاں کھیل رہا تھا دو
روپیہ دوں مگر اس خاتون نے لینے سے انکار کر دیا۔ اور کہا بیٹا اگر ہم غریب آدمی ہیں

مگر ہم روٹیاں فروخت نہیں کرتے۔ ہماری خوش نصیبی ہے کہ تم جیسا مہمان ہمارے گھر آیا ہے۔ اگر اس طرف آنے کا کبھی اتفاق ہو تو ہمارے گھر ضرور آنا اس خاتون کی اخلاص و محبت کے یہ الفاظ سن کر میری آنکھوں میں احسان شناسی کے آنسو بھر آئے۔ پنجاب تو شہروں کے اندر بھی لوگ مہمانوں کو کھانا کھلانا اور خاطر تواضع کرنا اپنی خوش نصیبی سمجھتے ہیں۔ گاؤں کی یہ خاتون کیونکر دو روپیہ لے سکتی تھی۔ اس نے بچہ سے روپیہ لے کر میرے حوالے کر دیئے میں نے بہت کوشش کی مگر اس نے پھر انکار کر دیا۔ میں نے بھی محسوس کیا کہ کھانے کا معاوضہ لینا ہی اپنی توہین سمجھے گی اس گاؤں سے چل کر میں ایک دوسرے گاؤں میں پہنچا اس وقت شام کے پانچ چھ بج چکے تھے مجھے اس گاؤں کا نام ٹھیک سے یاد نہیں رہا۔ غالباً قلعہ صوبھا سنگھ ہے۔ اس گاؤں میں چند پختہ دو منزلہ عمارتیں بھی ہیں جو وہاں کے درزیوں کی ہیں۔ یہ درزی کسی بڑے شہر میں فوجی ٹھیکہ دار ہیں اور لاکھوں روپیہ کے مالک اور تعلیم یافتہ ہیں۔ اس گاؤں میں پہنچا اور آرام کرنے کے لیے درخت کے نیچے بیٹھا تو ان درزیوں میں سے ایک صاحب نے مجھے دیکھ لیا۔ وہ میرے پاس آئے اور پوچھا کہ کہاں سے آئے اور کہاں جاؤ گے۔ میں نے کہا لاہور سے آ رہا ہوں اور حافظ آباد جاؤں گا۔ یہ مجھے اپنے گھر لے گئے چائے تیار کی۔ گھر کے دوسرے لوگوں سے تعارف کرایا۔ بڑی خاطر تواضع سے پیش آئے جب چائے پی چکے تو ان لوگوں نے اپنا گھر کا تانگہ میری سواری کے لیے تیار کرایا۔ تاکہ یہ تانگہ مجھے قلعہ دیدار سنگھ چھوڑ آئے۔ یہ تانگہ مجھے قلعہ دیدار سنگھ چھوڑ گیا۔ وہاں کرائے کے تانگے حافظ آباد جا رہے تھے۔ ایک تانگہ میں بیٹھ کر میں حافظ آباد کے لیے روانہ ہوا اور وہاں کو رات گیارہ بجے پہنچا۔

حافظ آباد پہنچ کر میں نے کسی کو نہیں بتایا کہ میں کیوں آیا اور کیا ہوا۔ خاموشی کے ساتھ چند روز گزار دیے۔ اتنے میں سر مائیکل اوڈوائیر بھی گورنری کا چارج دے کر چلے گئے۔ سر ایڈورڈ میکلیگن گورنر مقرر ہو چکے تھے تحقیقاتی کمیٹیاں قائم ہو گئی تھیں اور

اوڈوائیر نے جو کچھ کیا حکومت اس پر نادم تھی۔ میں لاہور واپس آیا تو معلوم ہوا کہ وہ لوگ گرفتار کیے گئے جو گرفتار ہو سکے اور جو لوگ ادھر ادھر ہو گئے پولیس نے ان کا پیچھا نہ کیا تھا۔ وہ گرفتار نہ ہوئے۔

پولیس کے نہلے پر پبلک کا دہلہ

مارشل لاء کے اعلان سے پہلے پنجاب کے ہر شہر اور قصبہ میں جوش و خروش پیدا ہو رہا تھا کہیں ریلوے کے تار کاٹے جا رہے تھے تو کہیں سرکاری عمارتیں جل رہی تھیں۔ کہیں بنک لوٹے جا رہے تھے اور کہیں انگریزوں اور سرکاری ملازموں پر حملے ہو رہے تھے۔ ان دنوں فوج کے ایک انگریز لیفٹیننٹ ٹائم غالباً یہی نام تھا یا ٹاٹن لائلپور سے وزیر آباد کو جا رہے تھے۔ راستہ میں جب گاڑی حافظ آباد کے سٹیشن پر رکی تو لوگوں نے دیکھا کہ اس گاڑی میں ایک انگریز بیٹھا ہے انگریز کا دیکھنا ہی ان دنوں پبلک کے جوش اور مستقبل سے لاپرواہ ہونے کے لیے کافی ہو سکتا تھا۔ لوگ اس انگریز کو دیکھ کر آگ بگولا ہو گئے اور ہجوم نے اس پر حملہ کر دیا۔ کوئی باقاعدہ آرگنائزڈ تحریک تو تھی نہیں۔ ایک قسم کا سیاسی ابال تھا لوگوں نے اس انگریز کی جوتوں تھپڑوں چھڑیوں اور مکوں وغیرہ سے پیٹا۔ ریلوے ڈرائیور اور گارڈ نے جب یہ کیفیت دیکھی تو انہوں نے ریلوے ٹرین کو قبل از وقت چلا دیا۔ تا کہ یہ انگریز بچ جائے۔ چنانچہ گاڑی کے جلدی چلے جانے کے باعث اس انگریز کی جان بچ گئی۔ ورنہ یہ غیر ممکن تھا کہ اس کو حافظ آباد کے سٹیشن پر ہلاک کر دیا جاتا۔

اس واقعہ کے بعد پنجاب میں مارشل لاء جاری ہو گیا۔ گرفتاریاں مقدمات اور سزائیں پولیس نے لیفٹیننٹ ٹائم کو پیٹنے کے جرم میں حافظ آباد میں گرفتاریاں شروع کیں ملزموں کی شناخت کرنے کے لیے ٹائم صاحب حافظ آباد تشریف لائے پولیس نے منادی کے ذریعے حکم دیا کہ شہر کا ہر فرد لڑکا ہو یا جوان یا بوڑھا۔ جو بھی ہے تحصیل کے سامنے حاضر ہو تمام لوگوں کو ایک لائن میں کھڑا کر دیا گیا اور لیفٹیننٹ ٹائم نے ملزمان کو پہچاننا شروع کر دیا۔ ان کے ساتھ پولیس تھی اور پولیس اپنی کارگزاری دکھانے کے لیے بہت مستعد تھی۔ جن لوگوں پر پولیس نے لیفٹیننٹ ٹائم یا سرکاری گواہوں نے جو اس بات کے لیے کھڑے ہوئے تھے کہ وہ موقعہ واردات یعنی

ریلوے سٹیشن پر اس وقت موجود تھے جب کہ لیفٹیننٹ کو پیٹا گیا ہاتھ رکھا۔ وہ لوگ چاہے بے گناہ تھے یا گنہ گار۔ ملک معظم جارج پنجم کے خلاف اعلان جنگ اور علم بغاوت بلند کرنے کے جرم میں گرفتار کیے گئے۔ ان گرفتار ہونے والوں میں میرے ایک چچا زاد بھائی ہوشیار سنگھ یہ آج کل امرتسر میں ہوشیار سنگھ اینڈ کمپنی اور جنرل انک ورکس وغیرہ کے نام پر کاروبار کرتے ہیں اور کافی کامیاب بھی ہیں بھی تھے۔ جن کو پولیس نے اس جرم میں گرفتار کیا۔ حالانکہ واقعہ ی تھا کہ یہ لڑکا خالصہ کالج امرتسر کی بی ایس سی کی کلاس میں پڑھتا ہے۔ جب سیاسی بے چینی شروع ہوئی اور امرتسر میں سرکاری عمارتیں اور بنک پبلک وٗنے جوجلائیں تو میرے چچا سردار میوہ سنگھ ہوشیار سنگھ کے والد نے ہوشیار سنگھ کو احتیاطاً حافظ آباد بلا لیا۔ اس کا لیفٹیننٹ ٹامم کو پیٹنے سے کوئی تعلق نہ تھا مگر اس روز یہ حافظ آباد میں ضرور موجود تھا اور واردات کے وقت اپنے گھر پر تھا یعنی اس واقعہ کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔

ہوشیار سنگھ نوجوان اور ہونہار لڑکا تھا۔ گورا رنگ بہت خوبصورت کالج ہر کا طالب علم اور کالج کے پروفیسر اس کو بہت عزیز سمجھتے تھے۔ گھر میں بھی اس کے لیے ہر شخص کے دل میں محبت تھی۔ اندازہ ہو سکتا ہے کہ جب اس کو ملک جارج پنجم کے خلاف جنگ میں حصہ لینے یا بغاوت کرنے کے جرم میں جس کی سزا عمر قید یا پھانسی سے کم کوئی دوسری سزا نہ تھی گرفتار کیا گیا تو اسکے والدین اور گھر والوں کی کیا حالت ہوگی۔ مگر کیا ہوسکتا تھا قانون اور انصاف صرف مجرموں اور گنہ گاروں کو سزا دینے کے لیے ہی نہیں تھا۔ ہندوستان میں اس ذریعہ سے ہر روز درجنوں سینکڑوں اور ہزارہا بے گناہ لوگ پھانسیوں پر چڑھائے اور جیلوں میں جارہے تھے۔

ہوشیار سنگھ چند روز تو حافظ آباد تھانے کی حوالات میں رہا۔ اس کے بعد دوسرے درجنوں ملزموں کے ساتھ لاہور بورسٹل جیل میں بھیجا گیا۔ ادھر اس کے بھائی اس کے والد اور گھر کے دوسرے لوگ بھی مقدمہ کی پیروی کے لیے لاہور پہنچے اس زمانہ میں

رائے بہادر لالہ بدری داس لاہور کے بہترین وکلا میں سے بھی چونکہ آپ رائے بہادر بھی تھے۔ اہل مقدمات کو یہ خیال ہوسکتا تھا کہ شاید ان کی رائے بہادری کا عدالت پر بھی کچھ اثر پڑے۔ چنانچہ رائے بہادر صاحب کو بہت کافی فیس دے کر وکیل مقرر کیا گیا۔ اور مقدمہ ایک ٹربیونل کے سپرد ہوا جس کا ایک انگریز جج پریذیڈنٹ اور دو ہندوستانی ممبر تھے ار یہ ٹربیونل اس لیے مقرر کیا گیا تھا کہ اس ٹربیونل کا فیصلہ آخری فیصلہ ہوگا۔ اس کے فیصلہ کے بعد ہائی کورٹ وغیرہ میں کوئی اپیل نہ کی جاسکے گی۔

مقدمہ کی تیاریاں شروع ہوئیں یرے چچا ان کے صاحب زادے اور میں نے وکیل صاحب کے ہاں چکر کاٹنے شروع کیے۔ ایک روز ہم لوگ رائے بہادر بدری داس کے پاس بیٹھے ان کو مقدمہ کے واقعات سمجھا رہے تھے کہ میرے چچا نے کہا:

''رائے بہادر صاحب ہم لوگ بہت مصیبت میں ہیں۔ میرا لڑکا واقعہ کے وقت سٹیشن پر موجود نہ تھا پولیس نے بڑے بڑے لوگوں کے لڑکوں کو صرف رشوت لینے کی غرض سے گرفتار کیا ہے گرفتار ہونے والوں میں بہت سے بے گناہ لوگ ہیں الزام بہت سخت لگایا گیا ہے۔ آپ زیادہ سے زیادہ کوشش کیجیے۔ اگر لڑکے کو سزا ہوگئی تو ہم تباہ و برباد ہوجائیں گے''۔

رائے بہادر بدری داس نے میرے چچا کے یہ دردناک الفاظ سننے کے بعد جواب دیا:

''سردار صاحب لڑکا گنہ گار ہے یا بے گناہ یہ کوئی سوال نہیں۔ یہ عدالتیں ہیں اور عدالتی ہی نہیں مارشل لا کی عدالتیں ہیں۔ یہاں جھوٹ اور بے ایمانی کی دوڑ ہے۔ اگر آپ پولیس سے زیادہ جھوٹ بنا سکتے ہیں تو لڑکا چھوٹ جائے گا۔ اور اگر آپ پولیس سے زیادہ جھوٹ نہیں بنا سکتے جو پولیس کے جھوٹ کو کاٹ سکے تو یقیناً لڑکے کو سزا ہوگی۔ اور شاید لڑکے کو پھانسی مل جائے۔ یہاں انصاف اور قانون کا کوئی سوال نہیں۔ جھوٹ کی دوڑ کا سوال ہے جو زیادہ جھوٹ بنا سکے گا کامیاب ہوگا آپ ہوں یا پولیس ہو۔''

رائے بہادر کے یہ الفاظ سن کر یہ سوال پیدا ہوا کہ مقدمہ کا ڈیفنس کیا ہو۔ فوجداری

مقدمہ میں یہ ڈیفنس قطعی لچر اور بے معنی معلوم ہوتا ہے کہ ملزم شریف ہے خانانی ہے یا بڑے لوگوں کا رشتہ دار ہے۔فوجداری مقدمہ میں تو صرف وہی ڈیفنس کارآمد ہوسکتا ہے کہ جو جرم کی ڈائریکٹ تردید کرے۔ چنانچہ مشورہ کے بعد فیصلہ کیا گیا کہ ڈیفنس صرف یہ ہونا چاہیے کہ ملزم واقعہ کے روز حافظ آباد میں نہ تھا بلکہ یہاں سے سینکڑوں میل دور تھا۔ جہاں سے اس کا اس روز حافظ آباد پہنچ کر مجرم کرنا ممکن ہی نہیں تھا۔

اب سوال یہ پیدا ہوا کہ حافظ آباد میں ملزم کی عدم موجودگی کیوں کر ثابت کی جائے۔اس مسئلہ پر غور ہوا کہ کہاں گہرے تعلقات ہیں جہاں سے کہ ڈاک خانہ کی مہر پوسٹ کارڈ پر لگوائی جاسکتی ہ۔ یہ فیصلہ کرن یکے بعد ہم نے ایک مضمون تیار کیا جو ہوشیار سنگھ کی طرف سے پوسٹ کارڈ پر لکھا جائے ہم نے بورسٹل جیل کے ایک وارڈر کی معرفت ہوشیار سنگھ کو وہ مضمون اور ایک سادہ پوسٹ کارڈ لکھنے کے لیے جیل کے اندر بھیجا۔اس پوسٹ کارڈ پر ہوشیار سنگھ نے لکھا کہ وہ کارڈ لکھنے کے روز یعنی ٹائہم کے واقعہ کے دن لدھیانہ میں ۃے۔ابھی لدھیانہ دو تین روز اور رہے گا۔اس کے بعد سانگلہ جہاں کہ ایک دوست کے نام خط لکھا گیا ہے آئے گا اور پھر حافظ آباد آئے گا۔ ہوشیار سنگھ نے یہ کارڈ دیکھ کر ہمیں جیل سے باہر جیل کے وارڈر کے ذریعہ بھیج دیا۔ہم میں سے ایک شخص اس خط کو لے کر پہلے لدھیانہ گیا وہاں کے ڈاک خانہ کے مہر لگانے والے کو پانچ روپیہ دے کر اس روز کی ویسٹیج کی تاریخ کی مہر لگوائی۔جس روز ٹائم کے ساتھ واقعہ ہوا تھا۔پھر یہ خط سانگلا لایا گیا۔اسی طرح ہی وہاں کے ڈاک خانہ کے مہر لگانے والے کو پانچ روپے دے کر واقعہ سے دوسرے روز کی تاریخ کی مہر لگوائی جس کا مطلب یہ تھا کہ ہوشیار سنگھ نے واقعہ کے روز یہ پوسٹ کارڈ لدھیانہ سے لکھا اور واقعہ کے اگلے روز یہ کارڈ سانگلہ ضلع گوجرانوالہ پہنچا۔

مقدمہ شروع ہوا پولیس کے سرکاری گواہوں کی شہادتیں ہوئیں کہ واقعہ کے روز انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ دوسرے لوگوں کے ساتھ ہوشیار سنگھ بھی لیفٹیننٹ

کو مار رہا تھا۔ پولیس کا مقدمہ بہت مضبوط رہا اور فرد جرم بھی لگ گئی۔ مگر جب ڈیفنس شروع ہوا تو لدھیانہ کے ہمارے گواہ پیش ہوئے جنہوں نے یہ کہا کہ واقعہ کے روز ہوشیار سنگھ لدھیانہ میں تھا۔ سانگلہ کے گواہ پیش ہوئے کہ واقعہ ے اگلے روز یہ پوسٹ کارڈ بذریعہ ڈاک ملا تھا۔ جو ایک روز پہلے ہوشیار سنگھ نے لدھیانہ سے پوسٹ کیا۔ ہوشیار سنگھ کے ہاتھ کا لکھا ہوا پوسٹ کارڈ اور اس کی مہروں کو دیکھ کر ٹریبونل اور اس کے یوروپین جج کو یقین ہو گیا کہ ہوشیار سنگھ واقعہ کے روز حافظ آباد میں نہیں تھا لدھیانہ میں تھا۔ چنانچہ ہوشیار سنگھ باعزت بری کر دیا گیا کیونکہ ہندوستان مجسٹریٹ تو اپنے ڈپٹی کمشنر کے اشارہ پر تھے اپنے حقیقی بھائی کو بے گناہ ہوتے ہوئے بھی اس کو قید کر سکتے تھے تاکہ صاحب بہادر ناراض نہ ہو جائیں مگر یورپین ججوں کے اندر پھر بھی ضمیر تھا۔ اروہ اپنے ضمیر کے مقابلے پر کسی بے گناہ کو سزا دیتے ہوئے کئ بار اپنے دماغ اور دل سے مشورہ کرتے تھے۔

اس سلسلہ میں یہ بتا دینا بھی اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ اسطرح کوئی دوسرے صاحب مقدمہ میں عدم موجودگی ثابت کرنے کے لیے ایسے کارڈ بنوانے کی اب حماقت نہ کریں۔ کیونکہ اس واقعہ کے بعد کئی ہائیکورٹوں کے فیصلے ایسے خطوط کے متعلق صادر ہو چکے ہیں۔ جنمیں ایسے خطوط یا پوسٹ کارڈوں کو قابل یقین قرار نہیں دیا جا سکتا۔

ہوشیار سنگھ کے مقدمہ کے واقعات سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ پولیس کیونکر جھوٹے مقدمے تیار کرتی ہے اور اس جھوٹ کو کاٹنے کے لیے کیوں کر پبلک کو مجبوراً پولیس سے زیادہ جھوٹ بنانا پڑتا ہے کیونکہ قانون چاہے کتنا بھی اچھا ہو۔ قانون کو استعمال کرنے کا طریقہ اس قدر پیچیدہ ہے کہ اور قابل اعتراض ہے کہ مقدمہ میں قدم قدم پر جھوٹ بولنے جھوٹ بنانے جھوٹ تصنیف کرنے اور جھوٹے حلفیہ بیان دینے کی ضرورت ہے۔ اور عدالتیں جھوٹ بے ایمانی اور ظلم کا سب سے بڑا مرکز ہیں۔

☆☆☆

والیان ریاست کا پرسٹیج

مرحوم رائے بہادر سردار نرائن سنگھ ٹھیکہ دار دہلی سیلف میڈ بزرگ تھے۔آپ کی زندگی چھ روپیہ ماہوار کے ایک فوجی سپاہی سے شروع ہوئی اور جب آپ نے انتقال فرمایا تو آپ کی جائیداد کے کرایہ وغیرہ کی آمدنی آٹھ لاکھ روپیہ سالانہ تھی۔ان رائے بہادر کے صاحبزادہ سردار بہادر رنجیت سنگھ نے چند سال ہوئے گورنمنٹ کو بائیس لاکھ روپیہ انکم ٹیکس ادا کیا ہے۔

رائے بہادر نرائن سنگھ ریاست پٹیالہ کے رہنے والے تھے۔چونکہ ریاست میں مرحوم مہاراجہ پٹیالہ کے مظالم کو بے نقاب کیا جاتا تھا اور رائے بہادر نرائن سنگھ ان تمام حالات سے واقف تھے آپ ''ریاست'' کو بے حد پسند کرتے تھے۔ اور ایڈیٹر ''ریاست'' کے بہت بڑے مداحوں میں سے تھے۔میں ایک رز منصوری جارہا تھا کہ ڈیرہ دون جانے والی گاڑی میں سامان رکھا تو رائے بہادر بھی اسی خانہ میں آ گئے۔کیونکہ دونوں کے لیے ایک ہی کمرہ میں جگہ ریزرو تھی۔گاڑی میں بستر ے بچھا کر ہم بیٹھ گئے تو رائے بہادر نے اخبار ''ریاست'' کی تعریف شروع کی۔ اور پچھلے متعدد مضامین کے متعلق اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا۔اس کے بعد آپ نے بتایا کہ پٹیالہ کے سردار بہادر جنرل بخشیش سنگھ کے وہاں کی فوج میں جنرل تھے۔انگریزی گورنمنٹ کے متعدد خطابات اور بہادری کے تمغے حاصل ہو چکے تھے۔اور آپ کو پٹیالہ میں بہت عروج حاصل تھا۔مگر چونکہ مہاراجہ ذاتی طور پر آپ سے ناراض ہو گئے اس لیے ایک جھوٹا مقدمہ بنا کر جیل میں ڈال دیے گئے۔ اور یہ فوجی جرنیل جیل کے قیدیوں کی وردی پہنے جیل کی کوٹھڑی میں جیل کی روٹی کھا رہا ہے۔اور قید ہے رائے بہادر یہ تمام حالات سناتے رہے اور میں سنتا رہا۔اس کے بعد ہم سو گئے۔صبح جب جاگے تو ہردوار کا اسٹیشن تھا۔ ہردوار اور ڈیرہ دون کے درمیان ہم لوگوں نے ہاتھ منہ دھویا کپڑے بدلے اور ڈیرہ دون پہنچنے پر رائے بہادر اپنی کوٹھی چلے گئے اور میں موٹر میں بیٹھ کر

منصوری روانہ ہو گیا۔

میں منصوری سے جب واپس آیا تو جنرل بخشیش سنگھ کا مسئلہ میرے ذہن میں کھٹک رہا تھا۔ دہلی پہنچنے پر میں نے ''ریاست'' میں ایک بہت سخت لیڈر لکھا جس میں جنرل بخشیش سنگھ کے واقعات درج تھے اور کمانڈر انچیف ہند کی توجہ دلاتے ہوئے گورنمنٹ ہند سے کہا گیا تھا کہ سردار بہادری کا خطاب اور فوجی شجاعت کی تمغوں کی موجوگی میں جنرل بخشیش کا پٹیالہ جیل میں رہنا اس خطاب اور بہادری تمغوں کی سخت توہین ہے۔ اور گورنمنٹ کا فرض ہے کہ وہ جنرل بخشیش سنگھ کے جرائم کی تحقیقات کرے اور اگر بخشیش سنگھ مجرم ہے تو ان کا خطاب اور تمغے ضبط کر لیے جائیں اور اگر بے گناہ ہیں تو ان کو پٹیالہ جیل سے نکالا جائے کیونکہ ایک بے گناہ جنرل کا بلاوجہ قید کیا جانا برٹش گورنمنٹ کے لیے رسوائی و ذلت کا جب اور فوجیوں میں بد دلی پیدا کرنے کا باعث ہے۔

اس مضمون کے شائع ہونے کے بعد دہلی کی مقامی گورنمنٹ کی سرکاری پریس برانچ نے اس مضمون کا ترجمہ سیکرٹری گورنمنٹ ہند کو بھیجا (عبدالرحمٰن سپرنٹنڈنٹ پریس برانچ دہلی نے ایک بار ایڈیٹر ''ریاست'' کو بتایا تھا کہ جس روز ''ریاست'' شائع ہوا انکے دفتر کے لیے مصیبت ہوتی ہے کیونکہ ان کے لیے حکم ہے کہ ریاستوں کے متلعق تمام مضامین کا ترجمہ کر کے متعلقہ افسروں اور پولیٹکل ایجنٹوں کو بھیجا جائے)۔

رائے بہادر نرائن سنگھ انگریزی بالکل نہ جانتے تھے۔ اور اردو بھی معمولی طور پر مگر آپ وائسرائے اور بڑے سے بڑے انگریز سے ملتے اور بہت بے تکلفی کے ساتھ بات چیت کرتے۔ یہ مضمون جب آپ نے دیکھا تو آپ اس مضمون والے پرچہ کو لے کر شملہ گئے۔ وہاں ہندوستان کے کمانڈر انچیف سر ولیم برڈوڈ سے ملے اور سر ولیم برڈوڈ کو ''ریاست'' کا پرچہ دیتے ہوئے کہا کہ اس مضمون کو پڑھیے آپ کے خطابوں اور تمغوں کی کس قدر مٹی پلید ہو رہی ہے۔ گورنمنٹ یا تو یہ خطاب ارو تمغے بخشیش سنگھ

سے واپس لیے اور یا بخشیش سنگھ کو جیل سے نکالا جائے ورنہ گورنمنٹ کی بہت سخت بدنامی ہے۔

رائے بہادر نرائن سنگھ جب انگریزوں سے بات چیت کرتے تو بالکل اس طرح بے تکلفی کے ساتھ ان کو دوست سمجھتے ہوئے جیسے ایک جاٹ دوسرے جاٹ سے بات چیت کرتا ہے۔ اور انگریز اس بے تکلفی میں اخلاص محسوس کرتے ہوئے رائے بہادر صاحب کی بہت عزت کرتے۔ سر ولیم برڈ وڈ ویسے بھی ہندوستانیوں کے بہت دوست اور وضعدار افسر تھے۔ ان کی تمام زندگی ہندوستان میں گزری اور ان کلرکوں اور ملازموں ے بیمار ہونے پر ان کے گھروں میں جاتے جو بیس برس پہلے ان کے ماتحت تھے۔ سر ولیم نے رائے بہادر سے کہا۔ کہ اس مضمون کو وہ پہلے بھی دیکھ چکے ہیں ملٹری سیکرٹری نے ان کا ترجمہ بھیجا تھا۔ اور وہ اس معاملہ پر وائسرائے کی توجہ دلائیں گے۔

اس مضمون کو شائع ہوئے ایک ماہ ہو گیا تھا کہ مرحوم مہاراج پٹیالہ ایک روز جیل میں گئے۔ جیل کا معائنہ کیا۔ تمام قیدیوں کی پریڈ دیکھی۔ پریڈ دیکھنے کے بعد آپ نے ساٹھ قیدیوں کی رہاء کا اعلان کیا۔ ان ساٹھ قیدیوں میں سردار بخشیش سنگھ بھی تھے۔

رائے بہادر نرائن سنگھ جب ڈیرہ دون سے واپس دہلی آئے تو آپ نے فرمایا۔ کہ آپ سر ولیم برڈ وڈ سے ملے تھے۔ سر ولیم نے وائسرائے کو تمام حالات لکھے۔ وائسرائے نے پولیٹکل سیکرٹری کو کہا کہ مہاراجہ بخشیش سنگھ کی رہائی کے لیے لکھا جائے چنانچہ پولیٹکل سیکرٹری کا حکم جب مہاراجہ پٹیالہ کے پاس پہنچا تو مہاراجہ جنرل بخشش سنگھ کو رہا کرنے کے لیے مجبور تھے اس مجبوری ک باعث ہی مہاراجہ پٹیالہ جیل دیکھنے گئے۔ اور سردار بخشیش سنگھ کے ساتھ ساٹھ دوسرے عام قیدیوں کو رہا کرنے کا باعث یہ تھا کہ مہاراجہ کا پرسٹیج قائم رہے اور ان کی رعایا یہ سمجھے کہ مہاراجہ نے اپنی دریا دلی کے باعث ساٹھ قیدیوں کو رہا کرنے کا حکم دیا ہے اور اتفاق سے ان ساٹھ میں جنرل بخشیش سنگھ بھی رہا ہو گئے۔

عادت اور قوت ارادی پر اثر

لاہور کے ایک روزانہ اخبار میں سب ایڈیٹر تھا۔ اس زمانہ مرے پاس ایک دوسرے سکھ جرنلسٹ آیا کرتے۔ ان کی تعلیم بی اے تک تھی اچھے خاندان سے تھے مگر کثرت سے شراب پینے کے باعث ان کے ضمیر اور ان کی قوت ارادی بالکل مردہ ہو چکی تھی۔ اور شراب حاصل کرنے کے لیے کوئی جرم ایسا نہ تھا جس پر یہ آمادہ نہ ہو سکتے ہوں۔ چنانچہ شراب کی کثرت کا ان کے اعصاب، پر بھی اثر تھا اور یہ زیادہ محنت کرنے کے قابل بھی نہ رہے تھے۔

میرے پاس کئی رز آتے رہے اور ملتے رہے۔ انہوں نے بتایا کہ یہ بے حد تکلیف میں ہیں۔ کوئی شخص ان کا اعتبار نہیں کرتا۔ دوستوں کی نظروں میں گر چکے ہیں گھر والوں کے لیے بار ہیں اور معمولی اخراجات بھی پورے نہیں کر سکتے۔ ان کو کیا کرنا چاہیے۔

ان کے حالات پر میں کئی روز ہمدردی کے ساتھ غور کرتا رہا۔ مگر میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کرنا چاہیے۔ ادھر ان کی یہ حالت تھی کہ کھانے کے لیے روٹی نہ ملے مگر شراب ضرور ہو۔ دوستوں سے ایک ایک دو دو روپیہ قرض لے کر شراب کی طلب پوری کرتے۔ میری عمر اٹھارہ انیس برس کی تھی اور میری فیروزپور کے سکھوں کے حلقہ میں آمدورفت تھی تو ایک حد تک میرے دماغ میں بھی مذہبی دیوانگی تھی۔ اور بغیر سکھوں کے دوسرے تمام مذاہب کو برا سمجھتا تھا حالانکہ نہ سکھ ازم سے واقفیت تھی نہ اسلام سے اور نہ ہندو ازم سے یہ اثر صرف صحبت کا تھا جب ملنے والے سکھوں کو ہندوؤں اور مسلمانوں کے خلاف باتیں کرتے دیکھتا تو خود بھی ان کے ساتھ شریک ہو جاتا۔ اور بحث میں حصہ لیتا۔ مگر اس کے بعد یہ مذہبی دیوانگی دن بدن کم ہوتی چلی گئی جب یہ صاحب لاہور میں آیا کرتے تھے تو اس وقت میں ذہنی اعتبار سے ہندوؤں مسلمانوں عیسائیوں اور سکھوں میں کوئی فرق نہ سمجھتا تھا۔ میں نے ان سے کہا کہ گو آپ بیاری حد سے گزر چکی ہے اور جو شخص قوت ارادی سے اس قدر محروم ہو چکا ہو اس کی اصلاح

قریب قریب ناممکن ہے۔مگر پھر بھی کوشش کرنی چاہیے میرے خیال میں سکھوں میں کوئی ایسی سوسائٹی موجود نہیں جو آپ جیسے گزرے گئے شخص کی اصلاح کا بار لے سکے ۔مری تو رائے ہے کہ آپ عیسائی ہو جائیے ممکن ہے پادری لوگ آپ کی اصلاح کر سکیں ارو آپ کی زندگی بدل جائے ۔مرے منہ سے یہ الفاظ سن کر یہ صاحب حیران ہوء یکہ میں کیا کہہ رہا ہوں ۔میں نے ان کو یقین دلایا کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں سنجید گی اور ایمانداری سے کہہ رہا ہوں۔

میری رائے سن کر یہ چلے گئے اور تین چار روز کے بعد پھر واپس آئے تو پھر اسی مسئلہ پر گفتگو ہوئی میں نے ان سے صاف کہا کہ آپ کی بیماری غالباًلاعلاج حد تک پہنچ چکی ہے اور اب آپ شاید ہی اصلاح ہو سکے ۔اور اگر اصلاح ہوئی بھی تو آپ کو قوت ارادی پیدا کرنے کے لیے اپنے دل و دماغ کے ساتھ بہت ہی کشمکش کرنی پڑے گی ۔ آپ سوچ لیجیے ۔کہ کیا کرنا چاہیے ۔کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد انہوں نے محسوس کیا اور چاہا کہ یہ عیسائی ہو جائیں ۔ انہوں ے خواہش ظاہر کی کہ میں ان کے عیسائی مذہب تبدیل کرنے کا انتظام کروں ۔مگر میں کسی کو جانتا نہ تھا۔نہ عیسائیوں کے حلقہ سے واقفیت تھی ۔ انہوں نے پھر زور دیا کہ میں انتظام کروں کیونکہ یہ اس معاملہ میں کچھ شرم سی محسوس کرتے تھے ۔

میں عیسائیوں کے حلقہ سے بالکل ناآشنا تھا۔مگر اخبارات میں ڈاکٹر دتہ (میرا خیال ہے یہ نام تھا اگر میں غلطی نہیں کرتا) پروفیسر فورمین کرسچین کالج کا نام کئی بار پڑھا تھا۔ میں نے اس جرنلسٹ کو اپنے ساتھ لیا اور ہم ڈاکٹر دتہ کے مکان کی تلاش میں نکلے ۔ ایک دو جگہ س یدریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ آپ اس سڑک پر رہتے ہیں جو نیلا گنبد سے میو ہسپتال کو جاتی ہے ۔یا اس کے قریب دوسری سڑک ہے ہم لوگ تلاش کرتے کرتے ڈاکٹر دتہ کی کوٹھی پر پہنچے ۔مجھے اب تک اچھی طرح یاد ہے کہ یہ کوٹھی سطح سڑک سے کافی بلند تھی اوراس کے صحن میں پھولوں کے گملے لگے تھے شام کا وقت تھا اور ڈاکٹر

دتہ برآمدے میں بیٹھے تھے۔کوٹھی کے باہر کے دروازہ کے پاس ان کا ملازم تھا۔اس ملازم کو میں نے اپنا وزیٹنگ کارڈ دیا۔جس پر لکھا تھا دیوان سنگھ ایڈیٹر روزانہ اخبار فلاں ۔میرا کارڈ جب ڈاکٹر دتہ کے پاس گیا تو انہوں نے بلا لیا۔ہم برآمدہ میں ڈاکٹر صاحب کے پاس پہنچے ڈاکتر صاحب بڑے تپاک سے ملے۔جرنلسٹ ہونے کا ایک بہت بڑا فائدہ یہ ہے کہ کوئی شخص ملنے سے انکار نہیں کرتا اور ملنے والے ہر شخص عزت کے ساتھ پیش آتا ہے۔ہم لوگ جب بیٹھے تو خیر خیریت دریافت کرنے کے تبادلہ کے بعد میں نے کہا کہ ڈاکٹر صاحب میں ان صاحب کو لایا ہوں۔آپ سےکوئی بات چھپانا نہیں چاہتا۔یہ صاحب سکھ ہیں بی اے ہیں جرنلسٹ ہیں۔بڑے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔مگر شراب پیتے ہیں رنڈی بازی کرتے ہیں سگریٹ کے کش لگاتے ہیں اور کبھی کبھی قمار بازی بھی تفریحاً کر لیتے ہیں۔فاقہ کش ہیں۔ان کا ضمیر اور قوت ارادی بالکل مردہ ہو چکے ہیں۔یہ عیسائی ہونا چاہتے ہیں۔ان کو عیسائی کر لیجیے شاید ان کی اصلاح ہو جائے۔ڈاکتر دتہ میرے یہ الفاظ سن کر حیران ہو گئے۔کہ ایک سکھ دوسرے سکھ کر عیسائی کرنے کے لیے لایا ہے۔میرا خیال ہے کہ ڈاکٹر دتہ صاحب نے سمجھا کہ یہ یا تو مذاق کر رہا ہے یا کوئی دھوکہ فریب ہے آپ نے جواب یدا کہ آپ سکھ ہیں اور ایک سکھ کو عیسائی کرنے کے لیے لائے ہیں یہ معاملہ کیا ہے۔میں نے پھر سنجیدگی سے کہا کہ ان کے جو عیوب میں نے بتائے ہیں وہ فی الحقیقت وہ ان میں موجود ہیں اور میں نے آپ کو تاریکی میں رکھنا مناسب نہیں سمجھا۔تا کہ بعد میں آپ کو علم ہو تو ہم کو شرمندہ نہ ہونا پڑے۔یہ صاحب میرے پاس آئے تھے کہ ان کو موجودہ قابل نفرت زندگی کے بدلنے کے لیے کیا کرنا چاہیے میں نے ان کو ایمانداری کے ساتھ رائے دی کہ عیسائی ہو جاؤ شاید عیسائیوں کے پادریوں کی نیکی کا ان پر اثر ہو۔اور ان کی زندگی بدل سکے ہم تھوڑی دیر باتیں کرتے رہے۔اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ ہم لوگ پھر کسی روز ان سے ملیں گے۔یہ پادریوں سے مشورہ لینا چاہتے ہیں۔میں نے

کہا کہ میرا کام تو ختم ہو چکا اب میں آپ کے پاس آنے کی ضرورت نہیں سمجھتا ل۔ اب یہ سردار صاحب خود ہی آئیں گے۔۔

میں اس کے بعد ڈاکٹر دتہ سے کبھی نہیں ملا۔کئی ماہ کے بعد یہ سکھ جرنلسٹ پھر ملے ارو انہوں نے بتایا کہ یہ ڈاکٹر دتہ کے ہاں گئے تھے ڈاکٹر صاحب نے ان کو ایک پادری کے سپرد کیا اور پادری نے ان کو منٹگمری میں رکھا۔وہاں چند روز ان کی نگرانی کے بعد ان کو دوسرے یورپین پادری کے پاس منصوری پہاڑ پر بھیجا۔یہ منصوری میں پادری کے گھر پر غالباً دو ماہ رہے۔پادری صاحب ان کے تمام اخراجات برداشت کرتے تھے۔ایک روز پادری صاحب نے صبح کے روز دیکھا کہ سردار صاحب کے کمرہ میں شراب کی خالی بوتل پڑی ہوئی ہے۔اس لیے ان کو بہت ملامت کی۔اس کے بعد ایک رات پادری صاحب کے اس کمرہ میں شور پیدا ہوا۔جہاں کہ ان کی نوجوان لڑکیاں سوئی ہوئی تھیں۔پادری صاحب اس کمرہ میں پہنچے تو دیکھا کہ سردار صاحب شراب میں بدمست شرمندہ حالت میں کھڑے ہیں اور پادری صاحب کی نیک دل لڑکی ان کو برا بھلا کہہ رہی ہے۔صبح پادری صاحب نے ان کو لاہور کا کرایہ دیا اور واپس کر دیا جس کا مطلب یہ تھا کہ یسوع مسیح کی تعلیم کا بھ آپ جسے پختہ ارادہ نوجوان کے پاس کوئی اثر نہیں ہو سکتا۔لاہور آنے کے بدان کی وہی کفییت تھی جو لاہور سے منٹگمری جانے سے پہلے تھی یعنی شراب قمار بازی' تاش اور رنڈی بازی قرضہ ارو دوستوں سے ایک ایک دو دو روپیہ طلب کرنا۔

میرا جیلوں کا اور جیلوں سے باہر کا تجربہ ہے کہ جب انسان کو چوری شراب' ڈاکہ' دھوکہ بازی' یا کسی قسم کی عادت پڑ جائے تو یہ خطرناک فطرت کا حصہ بن جاتی ہے۔ اس عادت کا جانا بے حد مشکل ہے اور وقت طلب ہے اور اس میں اگر تبدیلی ممکن ہے تو کئی برس مسلسل دن رات اپنے ذہن کے ساتھ جنگ کرنے کے بعد اور وہ بھی اگر انسان کی قسمت اچھی ہو۔

معقولیت باعث اطمینان

میں جب نابھ میں سرکاری ملازم تھا وہاں مجھے دوسو روپیہ ماہوار تنخواہ ملتی تھی ۔تو میری سگائی ضلع گوجرانوالہ کے ایک گاؤں میں سردار ہرنام سنگھ کی لڑکی سے ہوگئی ۔ ہندوستان میں عموماً اور ملازمت پیشہ لوگوں میں خصوصاً تجارت یا صنعت وحرفت میں کوئی قدر نہیں اگر کوئی شخص تجارت یا صنعت سے ایک ہزار روپیہ بھی ماہوار کماتا ہے تو اس کو معمولی شخص سمجھا جاتا ہے ۔مگر اس شخص کی زیادہ قدر ہے جو پچاس روپیہ ماہوار سرکاری ملازم ہے ۔اس ملازمت کے ساتھ اگر بیس روپیہ ماہوار بھی رشوت سے مزید آمدنی ہو تو بیس روپیہ سو روپیہ کے برابر سمجھے جاتے ہیں ۔چنانچہ جب کوئی شخص اپنی لڑکی کا رشتہ کرنا چاہے تو وہ سب سے پہلے پوچھے گا ۔تنخواہ کیا ہے اور اوپر سے آمدنی (یعنی رشوت) کتنی ہے اگر لڑکے والوں نے پچاس روپیہ تنخواہ اور بیس روپیہ ماہوار بالائی آمدانی بتائی تو لڑکی والوں کی باچھیں کھل جاتی ہیں اور فوراً رشتہ کر دیا جاتا ہے ۔چاہے شادی کے بعد میاں بیوی فاقہ کشی کریں کیوں نہ کریں ۔ اور ان کی تمام زندگی مصائب کا شکار ہی کیوں نہ ہو ۔نابھ میں دوسو روپیہ ماہوار تنخواہ پاتا تھا ۔ریاست کی سرکاری ملازمت ریاستوں کی لوٹ مشہور ہے ۔ بالائی آمدنی (یعنی رشوت) کے پوچھنے کا سوال ہی نہ تھا ۔ ہر شخص اندازہ کر سکتا تھا کہ اگر دوسو روپیہ ماہوار تنخواہ ہے تو ریاست کی ملازمت میں اوپر کی آمدنی چار یا پانچ سو روپیہ ماہوار سے کم کیا ہوگی ۔ چنانچہ سردار ہرنام سنگھ نے اپنی لڑکی کا رشتہ میرے ساتھ کر دیا ۔اور شادی کی تیاریاں شروع ہوئیں ۔

اس رشتہ کو چند ماہ ہوئے تھے کہ مہاراجہ نابھ پر مصائب کے بادل چھا گئے اور وہ گدی سے اتار دیے گئے مہاراجہ کے گدی سے اتار دیے جانے کے بعد انگریزوں ایڈمنسٹریٹر آ گیا ۔ میں نے استعفا دیا تو اس نے منظور نہ کیا ۔آخر بغیر استعفا ہی میں ن ابھ چھوڑنے والا تھا کہ گرفتار کیا جا کر پولیس کے پہرہ میں نظر بند کر دیا گیا ۔ تین ماہ

کے قریب ہی میں نابھ میں اسیری کی حالت میں رہا۔ وہاں سے جب چھوڑا گیا تو روزانہ اردو اخبار ''اکالی'' کو ایڈٹ کرنے امرت سر چلا گیا۔ وہاں کچھ عرصہ اس اخبار کو ایڈٹ کرتا رہا۔ اس کے بعد اپنے وطن حافظ آباد آ گیا۔ وہاں بالکل بے کار تھا۔ نہ کوئی پروگرام نہ ملازمت نہ کوئی ذریعہ معاش۔

سردار ہرنام سنگھ کی صاحبزادی سے میرا رشتہ ہوا بہت شریف آدمی تھے۔ ان کے گاؤں کے تمام لوگ محب الوطن تھے۔ جتنے لوگ کانگرس کی تحریک میں اس گاؤں میں سے قید ہوئے شاید پنجاب کے کسی دوسرے گاؤں سے نہ ہوتے۔ اور اگر میں غلطی نہیں کرتا تو پنجاب میں صرف اس گاؤں نے ہی سرکاری مالیہ نہ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ اور قومی حلقوں میں اس گاؤں کو پنجاب کا باردولی کہا جاتا تھا۔ سردار ہرنام سنگھ نے جب میرے متعلق سنا کہ میں نابھ کی ملازمت سے علیحدہ کر دیا گیا ہوں اور بیکار ہوں تو وہ حافظ آباد آئے اور میرے چچا بھگوان سنگھ سے ملے اور انہوں نے میری بے کاری کے متعلق کچھ تشویش کا اظہار کیا۔ قدرتی طور پر ان کو تشویش ہونی چاہیے تھی۔ کیونکہ نہیں کہا جا سکتا کہ میں آئندہ کب برسر کار ہوں گا۔ اور کہاں ملازمت ملے۔ میرے چچا نے بالکل اسی طرح ہی غلط امیدیں دلاتے ہوئے جس طرح عام لوگ ایسے موقع پر دیا کرتے ہیں۔ سردار ہرنام سنگھ سے کہا کہ فلاں فلاں جگہ ملازمت کے لیے کوشش ہو رہی ہے۔ آپ فکر نہ کیجیے۔ جلد ہی ملازمت مل جائے گی۔ چند روز کی بات ہے۔ دیوان سنگھ ملازمت کی کیا کمی ہے اس کے تعلقات بڑے بڑے لوگوں کے ساتھ ہیں وغیرہ وغیرہ۔

سردار ہرنام سنگھ اور میرے چچا کی گفتگو کا علم مجھے سردار ہرنام سنگھ کے حافظ آباد سے واپس جانے کے بعد اگلے روز ہوا۔ میں نے جب تمام حالات سنے تو میں سوچتا رہا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے سردار ہرنام سنگھ ایک بے حد شریف اور نیک شخص بہت اچھا معزز خاندان ان کی لڑکی جوان شادی کے قابل۔ میں بیکار اور میرا مستقبل تاریک۔

کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ کہ میں آئندہ زندگی میں کیا کروں اور کب کروں۔ معقولیت کے ساتھ دیکھا جائے تو سردار ہرنام سنگھ نے میرے برسرکار ہونے کے لیے غیر معین عرصہ تک انتظار نہ کرنا چاہیے۔ ادھر تو یہ خیال دوسری طرف یہ احساس کہ اگر یہ رشتہ ٹوٹ گیا تو رشتہ داری اور برادری کے لوگ مذاق اڑائیں گے اور کہیں گے کہ بیکاری کے باعث شادی نہ ہو سکی۔ میں رات کو کئی گھنٹے سوچتا رہا۔ کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ آخر میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے معقولیت اور انصاف کا ساتھ دینا چاہیے۔ اپنی خود غرضی کے باعث سردار ہرنام سنگھ کو غلط امیدوں اور توقعات میں رکھنا مناسب نہیں۔ چنانچہ اگلے روز میں نے سردار ہرنام سنگھ کو ایک رجسٹری خط بھیجا (رجسٹری کے ذریعہ بھیجنے کا مقصد یہ تھا کہ یہ ان تک پہنچ جائے) جسمیں لکھا کہ میں بیکار ہوں ملازمت سے علیحدہ ہو چکا ہوں میرا مستقبل تاریک ہے نہیں کہا جا سکتا کہ آئندہ میرا ذریعہ معاش کیا ہو۔ اور میں کب برسرکار ہو سکوں آپ کا انتظار کرنا مناسب نہیں۔ میرے دل میں آپ کی شرافت اوراخلاق اور بزرگی کی بے حد عزت و قدر ہے۔ میری رائے ہے کہ آپ اپنی صاحب زادی کی شادی کسی اور جگہ کر دیجیے اس خط کے بھیجنے کے بعد میں نے ایسی راحت محسوس کی کہ جیسی ایک فرض کو ادا کرنے کے بعد انسان محسوس کرتا ہے۔

میرے خط لکھنے کے بعد سردار ہرنام سنگھ نے اپنی لڑکی کی شادی شیخوپورہ کی ایک فیملی میں کر دی۔

میں حافظ آباد غالباً پانچ چھ ماہ بیکار رہا۔ یہ عرصہ میں نے حافظ آباد سے دو میل کے فاصلہ پر ایک باغ میں بسر کیا۔ یہ باغ میرے عزیز دوست اور چچا زاد بھائی سردار حاکم سنگھ کپور کا تھا اس باغ میں ایک خیمہ لگا لیا گیا۔ میں شہر بہت کم جاتا۔ اور دوست اکثر شام کو وہاں ہی پہنچ جاتے۔ چنانچہ اکثر ایسا ہوتا کہ شام کو آٹھ آٹھ دس دس دوستوں کی وہاں ہی دعوت ہوتی۔ اور شاید ہی کوئی شام ہوتی جب کہ ہم چار پانچ دوستوں نے مل کر کھانا نہ کھایا ہو۔

پانچ چھ ماہ گزرنے کے بعد میں نے دہلی آکر یہاں سے ''ریاست'' جاری کیا''ریاست'' کوشروع ہی سے کامیابی نصیب ہوئی۔ رز بروز اشتہارات اشاعت اور آمدنی میں اضافہ ہوتا گیا میرے معترف اور قدردان اصحاب کا حلقہ بہت وسیع ہو گیا۔ ریاست کو چند ماہ میں کافی شہرت نصیب ہوئی اور اس کا کامیابی کی اطلاع سردار ہرنام سنگھ کو بھی ملتی رہی۔

پنجاب کے قریب قریب ہر قصبہ کے پاس تالاب ہیں۔ یہ تالاب نہر کے پانی سےبھرے رہتے ہیں اوران تالابوں پر لوگ نہاتے ہیں ارو کپڑے دھوتے ہیں۔ اور ان کا پانی مال مویشی کے پینے یا انہیں نہلانے وغیرہ کے کام بھی آتا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ میں خود بھی حافظ آباد کے تالاب پر بچپن میں ں ہانے اوراپنے کپڑے دھونے جایا کرتا تھا۔ اور تالاب کی سیڑھیاں مردوں اور عورتوں سے بھری رہتی تھیں۔ جو نہانے اوراپنے کپڑے دھونے کے لیے وہاں جایا کرتے تھے۔

گورو نانک کی پیدائش شیخوپورہ کے ضلع میں ننکانہ صاحب کے مقام پر ہوئی۔ کاتک کی پورنماشی یعنی گورونانک کے یوم ولادت کو اس مقام پر لاکھوں زائرین جاتے ہیں۔ چنانچہ حافظ آباد سے بھی دس دس بارہ بارہ بیل گاڑیوں کا قافلہ ننکانہ صاحب جایا کرتا تھا۔ ان گاڑیوں میں سے کسی میں مرد بھرے ہوتے اور کسی میں عورتیں اور بچے۔ یہ قافلہ آٹھ یا دس میل کے بعد مختلف مقامات پر قیام کرتے ہوئے جاتا اور قافلہ کے لوگ گوروصاحب کے شبد پڑھتے ہوئے جاتے۔

''ریاست'' کو جاری ہوئے دو تین سال ہوئے تھے کہ حافظ آباد سے ننکانہ صاحب کے لیے ایک قافلہ روانہ ہوا۔ اس قافلہ میں میری بعض دوسری رشتہ دار خواتین کے ساتھ میری والدہ اور میری ممانی بھی تھیں یہ قافلہ سفر کرتے ہوئے شیخوپورہ پہنچا۔ اور چونکہ بیلوں کو پانی پلانے وغیرہ کا سوال تھا۔ اس قافلہ کا قیام وہاں کے تالاب کے کنارے ہوا۔ گاڑیوں سے بیل کھول دیے گئے تاکہ ان کو چارہ دیا جا سکے

اور لوگ آرام کر لیں ۔عورتیں اور مرد الگ ٹولیوں کی صورت میں درختوں کے سایہ کے نیچے تالاب کے کنارے بیٹھ گئے ۔ جہاں عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں وہاں قریب ہی شیخوپورہ کی عورتیں تالاب کے پر نہانے اور کپڑے دھونے کے لیے آئی ہوئی تھیں ۔ جب عورتوں نے عورتوں کو دیکھا تو شیخوپورہ کی عورتیں حافظ آباد کی عورتوں کے پاس آ گئیں ۔اصولاً اور عملاً دو عورتیں بھی ایک جگہ جمع ہو جائیں تو وہاں ایک کانفرنس کا منظر ہوتا ہے ۔اتنی عورتیں خاموش کہاں رہ سکتی تھیں ۔ان کی آپس میں باتیں شروع ہوئیں ۔تم کہاں کی رہنے والی ہو ۔تمہارے میکے کہاں ہیں ۔تمہاری سسرال کہاں ہے تمہارا شوہر کیا کرتا ہے اور تمہارے بچے کتنے ہیں وغیرہ وغیرہ اتفاق سمجھیے یا پچھلے جنم کے تعلقات کے باعث اس زندگی میں ملنا جلنا (میں اس بات کا قائل ہوں کہ جن لوگوں کے ساتھ اس زندگی میں تعلقات ہوئے ان کے ساتھ پچھلے جنم میں بھی تعلقات تھے چاہے کسی صورت میں بھی تھے ۔اور آئندہ جنم میں بھی ہوں گے ۔اس کا میرے پاس قطعی ثبوت موجود ہے جو میں آئندہ کبھی بتاؤں گا میری والدہ اور میری ممانی کے پاس ایک لڑکی آ بیٹھی جس سے یہ باتیں شروع ہوئیں ۔

میری والدہ: بیٹی !تم کہاں کی رہنے والی ہو ۔

لڑکی: میں یہاں شیخوپورہ کی رہنے والی ہوں ۔

میری والدہ: تمہارے میکے شیخوپورہ میں ہیں یا تم یہاں بیاہی گئیں ۔

لڑکی :میری شادی یہاں ہوئی ہے ۔میرے میکے تو گوبند پورہ میں ہیں ۔

میری والدہ: میرے لڑکے کی شادی بھی گوبند پورہ میں ہونے والی تھی مگر وہ رشتہ ٹوٹ گیا تھا ۔

لڑکی: گوبند پورہ میں کس کے گھر رشتہ ہوا تھا ۔

میری والدہ: وہاں ایک سردار ہرنام سنگھ ہیں ۔ان کی لڑکی سے رشتہ ہوا تھا ۔

لڑکی: آپ کہاں کے رہنے والے ہیں ۔

میری والدہ: ہم حافظ آباد کے رہنے والے ہیں۔

لڑکی: آپ کون ہوتے ہیں۔

میری والدہ: ہم کھتری کھنے ہیں۔

لڑکی: آپ کا لڑکا کیا کام کرتا ہے؟

میری والدہ: پہلے ریاست نابھ میں ملازم تھا اب دہلی سے ''ریاست'' اخبار نکال رہا ہے۔

لڑکی یہ جواب سن کر کچھ حیران سی ہوگئی۔ اور خاموش ہوگئی اسکی آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور میری والدہ نے پوچھا کہ بیٹی کیا بات ہے تم خاموش کیوں ہوگئیں۔ لڑکی پھر بھی خاموش رہی اور اس نے کوئی جواب نہ دیا آخر میری والدہ نے اور میری ممانی نے پھر زور دے کر پوچھا کہ کیا بات ہے تم خاموش ہوگئیں تو لڑکی نے بتایا کہ وہ ہی سردار ہرنام سنگھ کی بیٹی ہے اور اس کی سگائی ہی حافظ آباد میں ہوئی تھی۔

اس لڑکی کی اس کیفیت کو سن کر میری والدہ نے کہا بیٹی جہاں سنجوگ ہوں وہاں ہی شادی ہوتی ہے۔ اگر تمہاری قسمت میں ہمارے گھر آنا لکھا ہوتا تو تم آتیں ایسا نہ لکھا تھا اس کے بعد اور باتیں ہوتی رہیں اور کچھ دیر کے بعد قافلہ ننکانہ صاحب کی طرف روانہ ہوا اور وہ لڑکی اپنے گھر چلی گئی۔

ان حالات کے لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ اگر انسان خود غرضی سے بلند ہو کر معقولیت کے ساتھ کسی مسئلہ پر غور کرے اور پھر انصاف کا خیال کرتے ہوئے قدم اٹھائے یہ قدم چاہے پیچھے ہی لے جانا پڑے تو انسان کا ضمیر نقصان اٹھانے کی صورت میں بھی فائدہ بھی اٹھایا جائے۔ جیسا کہ چوری ڈاکہ یا رشوت میں لوگ اٹھاتے ہیں۔ تو روپیہ اور دولت یا دوسرے سامان راحت موجود ہوتے ہوئے بھی ذہن عذاب محسوس کرتا ہے اور صبر سکون اور اطمینان نصیب نہیں ہوتا۔

☆☆☆

قانون اور فرض

میں اپنی زندگی میں پندرہ بار گرفتار کیا گیا اور اتنی ہی بار میرے خلاف مقدمات چلائے گئے۔ ان مقدمات کے سلسلہ میں مجھے آٹھ جیلوں میں رہنے کا اتفاق ہوا اور وہاں کے حالات کو غور کے ساتھ مطالعہ کرنے کا موقعہ ملا۔ یہ آٹھ جیل تھے ہشنگ آباد۱۔ ناگپور۲۔ دہلی۳۔ گوڑ گاؤں۴۔ ملتان۵۔ اولڈ سنٹرل انبالہ۶۔ فیروز پور۷۔ اور لاہور سنٹرل جیل ۸۔ جیل کی زندگی کے متعلق میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اگر کوئی شخص انسانی فطرت اور انسان کی ذہنی کیفیت کا مطالعہ کرنا چاہے تو جیل سے زیادہ بہتر اور کوئی دوسری جگہ نہیں بلکہ میرا تو یہ خیال ہے کہ اگر انسان اپنے آپ کو بلند کرنا چاہے تو جیل بہترین ذریعہ ہے۔ اور پستی کی طرف جانا چاہے تو انسان کی گراوٹ کے لیے جیل سے زیادہ بدتر کوئی مقام نہیں کیونکہ جیل میں اپنی اور دوسروں کی حالت پر غور کرنے کے لیے بہت کافی اور بہت زیادہ مواقع ملتے ہیں۔ ان جیلوں کے متعلق درجنوں دلچسپ واقعات مجھے یاد ہیں جن سے انسان سبق حاصل کرسکتا ہے۔ میں آج کا ایک واقعہ کا ذکر کرتا ہوں۔ سنیچر کا دن اور دسمبر کا مہینہ تھا۔ ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ دہلی نے میری ضمانت نامنظور کی اور حکم دیا کہ میں دہلی جیل میں بھیجا جاؤں اور وہاں میرے ساتھ سپیشل کلاس کے قیدیوں کا سلوک کیا جائے۔ سب انسپکٹر مجھے لے کر جیل گیا اور وہاں دروازہ پر دربان کے حوالہ کرکے واپس چلا آیا دربان نے نام ولدیت وغیرہ پوچھا اور یہ لکھنے کے بعد اس نے ایک نمبر دار (جیل میں طویل عرصہ تک رہنے کے بعد قیدی کو نمبر دار بنا دیا جاتا ہے۔ یہ نمبر دار کوئی کام نہیں کرتے۔ دوسرے قیدیوں سے کام لیتے ہیں)۔ سے کاہ کہ اس نئے قیدی کو جیل کے اندر داخل کرو۔ میں جیل کے اندر گیا تو وہاں وسیع میدان میں ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ جیل میز کرسی لگائے بیٹھے تھے۔ سامنے بہت سے قیدی اپنے ہاتھوں سے اپنا ٹکٹ (یعنی اعمال نامہ جس پر قیدی کا نام پتہ قیدی کی معیاد کام چال چلن اور مشقت وغیرہ لکھی جاتی ہے۔) لیے تھے

ایک نمبردار ڈپٹی صاحب کے قریب تولیہ نما کپڑے کے ساتھ اس طرح مکھیاں اڑا رہا تھا جس طرح ہنومان سری رام چندر جی کے پیچھے کھڑے ہو کر چنور کرتا ہے۔ سردی کا موسم تھا۔ دسمبر کا مہینہ' شام کا وقت اور مکھی کا کہیں نشان تک نہیں۔ مگر چونکہ جیل میں افسروں کو بغیر تنخواہ کے ملازم ملتے ہیں اس لیے گرمی ہو یا سردی ہر افسر کے ساتھ مکھیاں اور مچھر اڑانے والا ایک نمبردار ضرور ہوتا ہے۔ جو مکھیاں نہ ہونے کی صورت میں بھی بطور خوشامد کپڑا ہلاتا رہتا ہے۔

مجھے علم نہ تھا کہ اب کہاں جانا ہے اور کیا کرنا ہے۔ میں ڈپٹی صاحب کے قریب گیا اور کہا کہ:

''میں ابھی باہر سے آیا ہوں اور جیل کے اندر داخل کیا گیا ہوں میرے لیے کیا حکم ہے۔''

اس وقت میں نے سیاہ سرج کا گرم کوٹ اور واسکٹ پہنی ہوئی تھی۔ کوٹ کے بٹن کھلے ہوئے تھے میرے ہاتھوں کے انگوٹھے واسکٹ کے بازوؤں والی جگہ یعنی (کندھوں کے قریب) سے واسکٹ کے اندر تھے اور ہاتھ باہر (جب انسان سوچ رہا ہو تو وہ سوچنے کی صورت میں اکثر ہاتھوں کے ذریعہ اس طرح واسکٹ کا سہارا لیتا ہے۔) دوسرے لوگ ہاتھ باندھ کر کھڑے تھے میری یہ بے تکلفی ڈپٹی صاحب کو پسند نہ آئی آپ نے فرمایا:

''انسانوں کی طرح کھڑے ہو''۔

میں نے اپنے ہاتھوں کے انگوٹھے واسکٹ میں سے نکال دیے۔ ڈپٹی صاحب نے پوچھا کون ہو اور کب آئے ہو۔ میں نے جواب دیا۔ ایک ملزم ہوں اور ابھی آیا ہوں اور مجسٹریٹ نے سپیشل کلاس میں رکھنے کا حکم دیا۔ آپ نے قریب کھڑے نمبرداروں میں سے ایک کو حکم دیا کہ اس قیدی کا وارنٹ لاؤ۔ نمبردار اور دربان کے پاس جا کر وہ وارنٹ لایا جو پولیس نے میرے ساتھ بھیجا تھا۔ ڈپٹی صاحب نے دیکھا

کہ اس پر سپیشل کلاس نہ لکھی تھی ۔ جب آپ یہ وارنٹ دیکھ چکے تو آپ نے حقارت سے اور مسکراہٹ کے ساتھ مجھے دیکھا جس کا مطلب تھا کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں اور جیل کے حکام کو دھوکا دینے کی کوشش کر رہا ہوں ۔مگر جیل کے حکام کافی ہوشیار ہیں جو دھوکہ میں نہیں آسکتے ۔بس مسکراہٹ اور حقارت کے ساتھ دیکھنے کے بعد آپ نے نمبردار کو حکم دیا کہ اس قیدی کو چالیس چکی کی طرف لے جاؤ ۔چالیس چکی وہ جگہ ہے جہاں کہ چالیس کوٹھڑیاں قیدیوں کو تنہائی میں رکھنے کے لیے ہیں اور ہر کوٹھڑی میں پیسنے کے لیے چکی موجود ہے ۔نمبردار مجھے ان کوٹھڑیوں کی طرف لے گیا اور جاتے ہوئے اس نے کپڑا گودام کے انچارج نمبردار کو پیغام بھیجا کہ ایک نئے قیدی کے لیے کمبل اور تپڑی بھیج دو ۔ہمیں جب کوٹھڑیوں کے پاس پہنچا تو ایک کوٹھڑی کی طرف اشارہ کر کے مجھے بتایا گیا کہ اس کوٹھڑی میں رہو گے مجھے وہاں پہنچے دو تین منٹ ہوئے تھے کہ کپڑے کے گودام کا نمبردار میرے لیے تین پھٹے ہوئے پرانے گندے اور میلے گندے کمبل اور ایک مونج کی تپڑی اور یہ تپڑی نیچے بچھانے کا ایک قسم کا فرش ہوتا ہے جو چھ فٹ لمبا اور تین فٹ چوڑا تیار کیا جاتا ہے اور اسے ہر قیدی کو نیچے بچھانے کے لیے دیا جاتا ہے لے کر آیا ۔یہ سکھ تھا ۔اس نے مجھے دیکھا اور سوچتا رہا کہ میں کون ہوں مجھے غور سے دیکھتا رہا ۔پھر اس نے پوچھا کہ کہاں کے رہنے والے ہو ۔ میں نے جواب دیا کہ میں دہلی میں رہتا ہوں ۔اس کے بعد وہ پھر سوچتا رہا تو سوچنے کے بعد اس نے پوچھا کیا آپ سردار دیوان سنگھ اخبار ''ریاست'' والے تو نہیں میں نے کہا ہاں میرا نام دیوان سنگھ ہی ہے یہ بیچارے حیران ہوئے کہ میں کیوں جیل میں آیا ۔پھر انہوں نے بتایا کہ وہ لائلپور کے ایک زمیندار سردار نرائن سنگھ کے کئی برس سے ریاستوں میں بیداری پیدا کرنے کے لیے کام کرتے رہے ہیں پنجاب ریاستی پرجا منڈل کو کام کرنے کے لیے روپیہ کی ضرورت تھی انہوں نے ایک ڈاکو تو ریاست جیند میں اور دوسرا انگریزی علاقہ میں ڈالا ۔تا کہ روپیہ حاصل کر کے پرجا منڈل کے کام پر

صرف کریں ڈاکہ ڈالنے کے کچھ عرصہ بعد پولیس نے گرفتار کرلیا۔ سات سال کے لیے قید کردیے گئے۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ قید ہونے سے ایک سال پہلے پنجاب ریاستی پرجامنڈل کے سیکرٹری سردار بھگوان سنگھ لونگووالیہ کے ساتھ مجھ سے ملنے کے لیے دفتر ''ریاست'' میں بھی آئے تھے۔

میں ان کو پہچان نہ سکا اور ذہن پر زور دینے کے بعد بھی مجھے یاد نہ آیا۔ کہ یہ کب ملے تھے۔ انہوں نے جو واقعات اور سردار بھگوان سنگھ کے ساتھ آنے کے حالات بتائے ان سے یقین آ گیا کہ سردار نرائن سنگھ نیک دل اور قومی ورکر ہیں۔ آپ ان میلے اور گندے کمبلوں کو لے کر پھر واپس کپڑا گودام میں گئے۔ وہاں سے آپ نے تین اچھے کمبل اور ایک نئی تپڑی انتخاب کی۔ اور پھر واپس میرے پاس پہنچے اور یہ سامان آپ نے میری کوٹھڑی میں رکھ دیا۔ سامان رکھنے کے بعد آپ نے کھانے کے لیے پوچھا میں نے انکار کیا۔ اس کے بعد وہ واپس چلے گئے جیل کے اندر وہ اس سے زیادہ میرے ساتھ بہتر سلوک یا ہمدردی کا ثبوت دے بھی کیا سکتے تھے۔

چند منٹ کے بعد کوٹھڑیوں کے نمبردار نے مجھے ایک کوٹھڑی کے اندر جانے کے لیے کہا اور باہر سے تالا لگا دیا۔ میں کوٹھڑی کے اندر جا کر بیٹھ گیا۔ کمبلوں کو دیکھا تو وہ بالکل ایسے تھے جیسے دیہات میں سردیوں کے زمانہ میں رات کو گائے بھینس وغیرہ جانوروں پر ڈالے جاتے ہیں مجھے بہت کراہت ہوئی کمبلوں میں میں نے کھڈی (جیل میں کھڈی اس اونچی جگہ کو کہتے ہیں جو قیدی کے سونے کے لیے کوٹھڑی میں بنائی جاتی ہے) پر ایک طرف رکھ دیا۔ اور فیصلہ کیا کہ ان گندے اور میلے کمبلوں کو کبھی استعمال نہیں کروں گا۔ اور گرم کوٹ اور واسکٹ پہنے ہی سو جاؤں گا۔ میں کھڈی پر بیٹھ گیا۔ سوچتا رہا کہ مقدمہ کے متعلق مجھے آئندہ کیا کرنا چاہیے۔ اگر کئی برس کے لیے قید ہو گیا تو اخبار کا انجام کیا ہوگا۔ دو تین گھنٹے تک سوچتا رہا۔ تپڑی بچھی ہوئی تھی۔ پھر اس پر لیٹ گیا۔ جب رات کو دس بجے سردی محسوس ہوئی تو میں نے سوچا کمبلوں کو پاؤں

پر کیوں نہ ڈال لوں ۔ میں نے بوٹ نہیں کھولے تھے ۔ پہنے ہی لیٹ گیا تھا ۔ کمبلوں کے ایک حصہ کو پاؤں پر ڈال لیا ۔ تا کہ پاؤں تو گرم رہیں لیٹنے کے تھوڑی دیر بعد مجھے کچھ نیند سی آ گئی گھنٹہ دو گھنٹہ کے بعد زیادہ سردی ہو گئی مجبور تھا میں نے کمبلوں کو سرکا کر گھٹنوں تک کر لیا ۔ اور اس کے بعد سردی اور بڑھی تو ذرا اور اونچے چنانچہ صبح جب پانچ بجے میری آنکھ کھلی تو کمبل آہستہ آہستہ میرے کندھوں تک پہنچ چکے تھے ۔ اور جن کمبلوں کو دیکھ کر شام کے وقت کراہت محسوس ہو رہی تھی صبح پانچ بجے وہ کمبل میرے اوپر تھے ۔ اور انسان کی قوت ارادی کمزور ہو تو ضروریات کے باعث انسان گھٹنے ٹیک دیتا ہے ۔ آنکھ کھلنے پر سوچتا رہا ۔ کہ اگر کمبلوں کی یہی کیفیت مہاتما گاندھی کے ساتھ پیش آتی اور مہاتما گاندھی ان کمبلوں کو استعمال میں نہ لانا چاہتے تو وہ اپنی مضبوط قوت ارادی کے باعث جان دے دیتے اور کمبل استعمال نہ کرتے ۔ مگر یہاں دیوان سنگھ ہے ۔ شام کو ان کمبلوں سے نفرت تھی قوت ارادی کے کمزور ہونے کے باعث اب ان میں لپٹا پڑا ہے ۔

صبح روشنی ہوتے ہی نمبردار نے دروازہ کھولا اس نمبردار کا نام نتھو تھا اور ایک قتل کے مقدمہ میں سات سال کے لیے آیا ہوا تھا ۔ اس کے پانچ سال گزر چکے تھے اور دو سال باقی تھے ۔ یہ جیل کے افسروں کا گرگا تھا اور تمام قیدیوں کو اس سے شکایت تھی کہ یہ افسروں کے کہنے پر قیدیوں سے برا سلوک کرتا ہے ۔

دہلی شہر میں تو کم آدمی ہیں جو مجھے پہچان سکتے ہیں ۔ حالانہ اخبار اور میرے نام سے ہر پڑھا لکھا شخص واقف ہے کیونکہ جب کبھی میں پبلک جلسوں جلوسوں یا میٹنگوں میں ں ہیں جاتا موٹر سے دفتر اور موٹر میں ہی سے دفتر سے گھر ۔ شہر یا نئی دہلی میں جانا ہوتا تو موٹر میں ۔ مجھے جیل میں کون جانتا تھا ۔ نتھو نمبردار نے مجھے بھی چوروں ڈاکوؤں اور دوسرے مجرموں کی طرح ایک قیدی سمجھا ۔ اس نے مجھے اس کوٹھڑی کی صفائی کرنے کے لیے کہا ۔ میں نے اسے کہا کہ بتا دو کہ کس طرح کروں ۔ س طرح ہی آئندہ

کر دیا کروں گا۔ اس روز اتوار تھا اور جیل میں قیدیوں کی چھٹی تھی اور جب چھٹی ہو تو تمام قیدی جیل کی صفائی کرتے ہیں۔ زمین کو پوتا جاتا ہے تاکہ مٹی بیٹھی رہے۔ اس نے مجھے اس کوٹھڑی کے کچھ حصہ کو پوت کر بتایا کہ اس طرح پوت دو میں نے کوٹھڑی کے باقی حصہ کو پوت دیا۔ کیونکہ میں اس اصول کے حق میں ہوں اور ہمیشہ اس کا پابند رہا کہ جیل کے اندر وہ سب کام کیا جائے جو جیل کے قوانین کے مطابق قیدی کو کرنا چاہئیں۔ میں اس کو ایک فرض سمجھتا ہوں کہ کوٹھڑی پوتنے کے بعد میں نے نل پر ہاتھ دھوئے پھر پاخانہ گیا۔ ہاتھ صاف کیے۔ بہت فرسوں سے کبھی مٹی سے ہاتھ صاف نہ کیے تھے ہمیشہ صابن سے کرتا تھا۔ بلکہ گھر میں باورچی کے لیے یہ سخت پابندی تھی کہ وہ برتنوں کو کبھی مٹی سے صاف نہ کرے ہمیشہ صابن سے کرے مگر جیل میں صابن کہاں۔ میں آج سی کلاس کا قیدی تھا مجھے اس طرح ہی زندگی بسر کرنی چاہیے۔ جیسے دوسرے عام قیدی کرتے ہیں۔ میں نے مٹی سے ہاتھوں کو صاف کیا۔ ایک طرف دھوپ میں جا کر کھڑا ہو گیا اور دوسرے قیدیوں کو دیکھتا رہا۔ کہ وہ اپنی جیل کی زندگی میں کیونکر بسر کرتے ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد قیدیوں میں بھنے ہوئے چنے تقسیم ہوئے۔ قیدی وہ کھاتے رہے۔ اتوار کی چھٹی کے باعث خوش فعلیاں ہو رہی تھیں اظہار محبت میں ایک دوسرے کو گندی گالیاں دی جا رہی تھیں۔ بعض قیدی ان میں ایسے تھے جو کئی کئی برس سے جیل کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ اور بعض ایسے رنگروٹ تھے جو پہلی بار آئے تھے۔ دس بجے کے قریب ان میں کھانا تقسیم ہوا گلی سڑی پکی ہوئی سبزی اور دو دو روٹیاں نتھو نمبردار اور ایک دوسرے ایک دو قیدیوں نے مجھے بھی روٹی اور سبزی کھانے کے لیے کہا مگر میں بھوک محسوس نہ کر رہا تھا۔ انکار کر دیا چائے کے لیے جی چاہتا تھا مگر وہاں چائے کہاں قیدیوں کے حالات دیکھتا رہا۔ گیارہ بجے کے قریب نتھو نے آواز دی کہ تمام قیدی اپنی اپنی کوٹھڑیوں میں چلے جائیں میں بھی کوٹھڑی میں گیا تو نتھو نے باہر سے حسب دستور تالا لگا دیا کیونکہ جیل کے قواعد کے مطابق قیدیوں کو اتوار کے روز

دوپہر کے وقت بند کر دیا جاتا ہے اس کوٹھڑی کے متعلق یہ بتا دینا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ یہ کوٹھڑی جو مغرب کی طرف ایک چھوڑ کر آخر میں ہے ان تین چار کوٹھڑیوں میں سے ایک ہے جس میں لارڈ ہارڈنگ پر بمب پھینکنے والی دہلی شازش کیس کے وہ ملزمان رہے جن کو بعد میں پھانسی ملی۔ یہ مجھے لالہ ہنسنت سہائے نے بتایا جو خود اس مقدمہ میں ملزم تھے وہ کوٹ واسکٹ اتار کر کوٹھڑی کے صحن میں بیٹھ گیا۔ اور آئندہ کے متعلق سوچنے لگا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ سوچتے ہوئے میں نے فیصلہ کیا کہ اخبار کو کسی معاوضہ کے ڈاکٹر اشرف (جو کمیونسٹ پارٹی کے لیڈر ہیں اور میری اس گرفتاری کے چند روز پہلے مجاز صاحب کے ساتھ ملنے کے لیے دفتر ''ریاست'' میں تشریف لائے تھے) کے سپرد کر دیا جائے اور اس قسم کی ایک تحریر ڈاکٹر صاحب کو دے دی جائے کہ میں یہ اخبار ان کو بغیر کسی معاوضہ کے دیتا ہوں۔ میں سوچ ہی رہا تھا کہ نتھو نمبر دار آیا اس نے تالا کھولا اور کہا کہ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ جیل سردار گھونندن سنگھ تشریف فرما تھا ے اور ان کے پاس دفتر ''ریاست'' کے مسٹر ظفر احمد میرا بستر ا کپڑے اور سامان اور کھانا لیے بیٹھے تھے۔ میں جب پہنچا تو ڈپٹی صاحب کھڑے ہو گئے آپ نے مصافحہ کیا اور کہا:

''سردار صاحب میں بہت سخت نادم اور شرمندہ ہوں مجھے کل شام کو معلوم نہ تھا کہ آپ کون ہیں میں نے آپ سے جو الفاظ کل شام کہے ان کے لیے معافی چاہتا ہوں اور فی الحقیقت مجھے سخت افسوس ہے اور میں نادم ہوں''۔

میں نے کہا آپ اس کا کوئی خیال نہ کیجیے۔ آپ کا کیا قصور ہے۔ آپ کو علم نہ تھا۔ کہ میں کون ہوں بالکل معمولی بات ہے اور آپ نے بھی کیا کوئی غیر مناسب بات نہ تھی۔ ڈپٹ صحب سے مجھے معلوم ہوا کہ تھوڑی دیر پہللے کسی دوسرے کام کے لیے انہوں نے مسٹر لوئیس ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ (جو جیل کے سپرنٹنڈنٹ بھی تھے) کو ٹیلی فون کیا تو اس وقت مسٹر لوئیس نے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کو تاکید کی کہ ایڈیٹر

''ریاست'' دجوکل شام جی بھیجا گیا ہے وہ سپیشل کلاس میں رہیں گے۔ بڑی پوزیشن کے آدمی ہیں ان کو کوئی تکلیف نہ ہو۔

ظفر صاحب نے مجھے بتایا کہ کل شام کو ہی جب دفتر کے لوگوں نے سنا کہ مجھے جیل بھیج دیا گیا ہے تو وہ میرہ بستر اکھانا اورت سامان لے کر جیل آئے تھے مگر کسی نے ان کی پروانہیں کی۔ظفر صاحب کا یہ بیان سن کر ڈپٹی صاحب نے پھر معافی چاہی۔ میں نے پھر ان سے کہا کہ معمولی بات ہے آپ خیال نہ کیجیے۔اس بات چیت کے بعد میں نے ڈاکٹر شوکت کے نام ڈاکٹر شوکت اللہ انصاری کی کوٹھی کے پتہ پر خط لکھا جس میں اخبار ریاست بغیر کسی معاوضہ کے دینے پر رضامندی کا اظہار کیا گیا تھا اور لکھا تھا کہ جیل آ کر اس کے متعلق تحریر لکھوالی جائے یہ خط میں نے ڈپٹی صاحب کے حوالے کیا۔مگر پولیس نے اسے روک لیا۔ڈاکٹر اشرف صاحب کے پاس نہیں بھیجا۔وہ اب تک مقدمہ کی مثل میں موجود ہے اب ڈپٹی صاحب نے ایک نمبر دار کو بلایا اور حکم دیا کہ میرے لیے وہاں انتظام کیا جائے جہاں سپیشل کلاس کے لوگ رکھے جاتے ہیں۔ یہ جگہ بہت اچھی صاف ستھری اور روشن اور ہوادار ہے یہاں چارپائی میز اور چھوٹی الماری وغیرہ سامان بھیج دیا گیا۔میرا سامان غسل کپڑے' اور بستر وغیرہ جو ظفر صاحب لائے تھے وہ بھی وہاں پہنچ گیا۔ان کمروں میں مجھ سے پہلے وہاں احراری لیڈر عبدالقیوم صاحب کانپوری بھی مقیم تھے۔

تین چار سال ہوئے میں نے ایک فلم دیکھی تھی۔س میں ایک جگہ فلم ایکٹر کہتا ہے ''دنیا جھکتی ہے جھکانے والا چاہیے''جیلوں میں عالم قیدیوں کے ساتھ جو سلوک کیا جاتا ہے انسانیت اس کی اجازت نہیں دیتی۔مگر جیل کے حکام اکبار نویسوں اور پولیٹکل لیڈروں کے ساتھ جو خوشامد اور چاپلوسی فرضی محبت اور دلداری کا سلوک کرتے ہیں اس کی مثال سسرال کے گھر کے بغیر انسان کو کسی دوسری جگہ نہیں مل سکتی۔چنانچہ اس بار میں دہلی جیل میں پانچ ماہ کے قریب رہا کھانا دونوں وقت گھر سے آتا کتابیں کاغذ' قلم'

دوات، لکھنا پڑھنا اخبارات سب سہولتیں دوسرے لوگوں کو تو اپنی بیرک یا کوٹھڑی میں سے نکلنے کی اجازت بھی نہیں ہوتی تھی۔ یہاں تک کہ میرے ساتھ رہنے والے ایک یورپین مسٹر واٹسن اپنے کمرہ سے نہ نکل سکتے تھے مگر میں تمام جیل میں پھر آتا۔ دوپہر کو گھنٹہ دو گھنٹہ غلہ گودام کے انچارج سردار جاگیر سنگھ (جو آج کل دہلی جیل میں اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ ہیں اور غیر معمولی طور پر دیانت دار اور شریف ہیں) کے پاس چلا جاتا اور جس قیدی سے چاہتا بات چیت کرتا۔ مگر مجھے کوئی نہ روکتا۔ اس رعایت کی وجہ صرف یہ تھی کہ یہ لوگ محسوس کرتے تھے کہ جیل سے رہا ہونے کے بعد میں جیل کی خرابیوں کو بے نقاب کر سکتا ہوں اور بے نقاب کرنا ان کے لیے مصائب و مشکلات کا باعث ہوگا۔

میں جیل میں ہی تھا۔ کہ وہاں قتل کے سلسلہ میں تین سادہ لوح دیہاتی اجاٹ جیل میں آئے۔ ایک اٹھارہ سال کا لڑکا جس نے چار پانچ ماہ کے بچہ کو زیور کے لالچ میں قتل کر دیا تھا اور دو بڑی عمر کے جاٹ جن کے تعلق پولیس نے لڑکے سے بیان دلوا لیا کہ یہ دونوں بھی قتل میں شریک تھے اس قتل کے اصل اور صحیح واقعات یہ ہیں کہ دہلی کے ایک گاؤں میں چار پانچ برس کا ایک بچہ کھیل رہا تھا اور اس نے پانچ سات روپے کے چاندی کے زیورات پہنے ہوئے تھے۔ بچہ جب گلی میں اکیلا تھا تو ایک اٹھارہ سالہ جاٹ نوجوان اس بچہ کو اپنے گھر جہاں وہ اکیلا رہتا تھا لے گیا۔ اس نے بچے کا زیور اتار لیا۔ بچہ جب رونے لگا تو اس نے بچہ کا گلا گھونٹ کر اسے ہلاک کر دیا۔ یہ نوجوان ملزم بہت بے وقوف اور رہوتق کلاس کا دیہاتی تھا۔ بچہ کو ہلاک کرنے کے بعد اس نے بچہ کی لاش کو اپنے گھر کی دیوار کے ایک بہت بڑے سوراخ میں رکھ دیا اور اوپر سے اینٹیں چن دیں۔ مقتول بچہ جب گھر نہ پہنچا تو اس کی ماں تلاش کرنے کے لیے گلی میں نکلی ادھر ادھر دیکھا کوئی پتہ نہ چلا تشویش ہوئی لوگ جمع ہو گئے تو ایک شخص نے بتایا کہ کچھ عرصہ پہلے اسنے نوجوان جاٹ کو بچہ کے پاس کھڑا دیکھا تھا۔ چنانچہ گاؤں کے

لوگوں نے جب نوجوان جاٹ کو دھمکایا اور دو چار تھپڑ مارے تو ملزم نے بتا دیا کہ اس نے زیور کے لالچ میں بچہ کو ہلاک کیا ہے اور لاش فلاں جگہ پر رکھ دی ہے۔ پولیس نے لاش نکال لی پولیس کو اطلاع ہوئی پولیس آ گئی۔ ہر گاؤں اور قصبہ میں کچھ لوگ پولیس کے ایجنٹ ہوتے ہیں جو پولیس اور ملزموں کے درمیان رشوت کے سودے کراتے ہیں۔ جھوٹے گواہ تیار کرتے ہیں۔ خود شہادتیں دیتے ہیں۔ مخبریاں کرتے ہیں اور پولیس ان کے تمام جرائم پر پردہ پوشی کرتی ہے۔ اس گاؤں کے پولیس کے ایجنٹ کی دو جاٹوں (جو اصلی ملزمان کے ساتھ گرفتار ہو کر جیل میں آئے) سے عداوت تھی۔ پولیس کے اس ایجنٹ نے پولیس کے ساتھ مل کر اصلی ملزم سے بچہ کے زیورات لیے اور گاؤں کے باہر فرضی ملزموں کے کھیت میں دفن کر دیے۔ ادھر نوجوان ملزم تو پہلے ہی پر لیس نے مارا اور دھمکایا۔ جب یہ پولیس کے اشارہ پر بیان دینے کے لیے تیار ہو گیا تو اس کی خاطر تواضع شروع ہوئی اس کو جلیبیاں اور لڈو کھلائے گئے۔ اور اس سے کہا گیا کہ اگر وہ عدالت میں یہ بیان دے دے کہ اس نے دونوں فرضی ملزموں کے کہنے پر قتل کیا ہے۔ فرضی ملزم تو سزا پا جائیں گے مگر یہ خود بچ جائے گا۔ کیونکہ اگر کسی دوسرے کے کہنے پر جرم کیا جائے تو جرم کرنے والے کو سزا نہیں ملتی۔ ترغیب دینے والے ہی کو ملتی ہے۔ چنانچہ اس نوجوان ہونق نے پولیس کے کہنے پر یقین کر لیا اور اس نے بیان دے دیا۔ کہ دونوں فرضی ملزموں نے اس سے جرم کرنے کے لیے کہا دونوں ملزموں کے کہنے پر اس نے بچے کو ہلاک کیا۔ دونوں ملزم زیور لے گئے اور انہوں نے اپنے اپنے کھیت میں زیور دفن کر دیا۔ چانچہ اس بیان کے مطابق کھیت میں سے گواہوں کے سامنے زیور نکالا گیا شہادتیں تیار کی گئیں اور دونوں بے گناہ غریب اور معصوم اور سادہ لوح جاٹ جن کو جرم کا کچھ علم نہیں تھا بھی اصلی نوجوان ملزم کے ساتھ گرفتار کیے جا کر جیل بھیج دیے گئے۔ جیل میں جب یہ لوگ پہنچے تو جیل کے حکام نے پولیس کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے نوجوان ملزم کو تو جیل کے شمال کی جانب آخری کوٹھڑی میں رکھا اور

دونوں فرضی ملزموں کو جنوب کی طرف کی کوٹھڑیوں میں۔ تاکہ یہ لوگ آپس میں مل کر نوجوان ملزم کے بیان دینے کا باعث نہ ہوں۔ اور مقدمہ کامیاب ہو سکے یہ تمام حالات مجھے دونوں فرضی ملزموں نے بتائے۔ میں نے ان پر مختلف سوالات بھی کیے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ یہ جھوٹ تو نہیں بول رہے۔ مجھے اطمینان ہو گیا کہ یہ سچ بول رہے ہیں۔ یہ لوگ بہت تشویش میں تھے۔ بے گناہ قتل کا مقدمہ جس میں پھانسی کی سزا دی جا سکتی ہے قانون اور مقدمہ سے ناواقفیت۔ کریں تو کیا۔ سوائے تشویش میں گھلنے اور رات کو نہ سونے کے اور کر بھی کیا سکتے ہیں۔ میں اگلے روز صبح نوجوان جاٹ ملزم کی کوٹھڑیوں کی طرف گیا تو اس کے ساتھ تپاک کے ساتھ ہمدردی کرتے ہوئے پیش آیا۔ تاکہ یہ اصل حالات بتا دے۔ یہ سادہ لوح بے وقوف تو تھا اس سے جب میں ں ے ایک دو باتیں ہمدردی کے ساتھ کیں تو اس نے سب حالات من وعن بتا دیے جو اوپر بیان کیے گئے ہیں کہ یہ کس طرح پرلیس اور پولیس کے ایجنٹ کے کہنے پر اس نے جھوٹا بیان دیا۔ بے گناہوں کو پھنسایا اور اسے جلیبیاں اور لڈو کھلائے گئے وغیرہ اور اس ے باتیں کر کے میں اپنے کمرے میں واپس آیا تو کچھ بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ کیونکہ قانوناً پوزیشن یہ ہے کہ اگر ایک ملزم اپنے جرم کا اقرار کرتے ہوئے اپنے ہمراہی ملزموں کا نام بھی لیتا ہے تو ہمراہی ملزم چاہے قطعی بے گناہ ہوں وہ بھی مجرم سمجھے جائیں گے کیونکہ ایک مجسٹریٹ یا جج اس ملزم کے تمام کے تمام بیان پر یقین کرنے کے لیے مجبور ہے (مجھ پر پندرہ کے قریب مقدمات قائم ہوئے جہاں تک فوجداری مقدمات کے ڈیفنس کا سوال ہے معمولی وکیوں سے زیادہ میں مقدمات کی نوعیت سمجھتا ہوں اور یہ دلچسپ کیفیت ہے کہ ہوشنگ آباد والے مقدمہ نواب آف بھوپال بنام ایڈیٹر ''ریاست'' میں چھ سال وکیلوں کی پروی کرنے کے بعد آخری بحث ایڈیٹر ''ریاست'' نے خود کی کیونکہ ایڈیٹر ''ریاست'' کے وکیل مصروفیت کے باعث اس روز نہ پہنچ سکے۔ ایڈیٹر ریاست نے اپنی طرف سے بحث خود کی اور نواب بھوپال کی طرف

سے بحث کرنے والے سر عبدالرحمن تھے۔ جو بعد میں پنجاب کے جج ہائیکورٹ ہوئے بحث کے بعد مجسٹریٹ مسٹر راڈرک نے کہا کہ سر دیوان سنگھ میں آپ کو مبارکباد دیتا ہوں کہ اس سے بہتر بحث کوئی وکیل بھی نہیں کرسکتا۔ میں اپنے کمرے میں پہنچا تو تمام حالات پر غور کرتا رہا اور سوچتا رہا کہ ہم لوگ اخبارات میں دعویٰ تو کرتے ہیں کہ دنیا سے مظالم کو ختم کرنے کی کوشش کا۔ مگر یہ ظلم سامنے ہو رہا ہے بے گناہ لوگ پھانسی پر چڑھیں گے۔ دن بھر آرام سے بیٹھ نہ سکا۔ کبھی دونوں بے گناہ ملزموں کے پاس جا کر باتیں کرتا کبھی واپس آ کر سوچتا کہ میں نے خیال کیا کہ سیشن جج جس کے پاس مقدمہ پیش ہونے والا ہے کو تمام حالات لکھ بھیجوں پھر خیال آیا کہ اس لکھنے کی قانون حیثیت کچھ بھی نہ ہوگی۔ رات بھر نیند نہ آئی سوچتا رہا کہ کیا قدم اٹھایا جائے صبح چار بجے چارپائی سے اٹھا پاخانہ گیا۔ ہاتھ منہ صاف کیے دودھ تیار کیا چائے بنائی اور چائے پی رہا تھا تو خیال آیا کہ جس طرح بھی ممکن ہو اصلی نوجوان ملزم کا بیان تبدیل ہو جانا چاہیے۔ بے گناہوں کو پھانسی کی رسی سے بچنے کی صرف یہی ایک صورت ہے۔ کہ اصلی ملزم اپنے بیان کو بدل دے۔

جب دن نکلا آٹھ بجے کا وقت ہوگا میں سیر کے بہانے ٹہلتے ٹہلتے نوجوان ملزم کے پاس پہنچا میں نے پوچھا کہ کیا حال ہے یہ بہت خوش تھا کیونکہ پولیس کے کہنے کے مطابق اس کو یقین تھا کہ قتل کرنے والے سزا نہیں پاسکتے۔ صرف قتل کی ترغیب دینے والے سزا پاتے ہیں۔ یہ بالکل بری ہو جائے گا۔ اور اس کے ہمراہی جاٹ پھانسی کی سزا پائیں گے۔ اس نے جواب دیا مزے میں ہوں یہ مجھے ہمدرد اور بے تعلق سمجھتا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ خدا کرے تم بری ہو جاؤ مگر تمہارے بری ہونے کی کوئی توقع نہیں۔ تم تو لازمی طور پر پھانسی پاؤ گے یہ حیران ہو کر پوچھنے لگا کہ یہ کس طرح ممکن ہے۔ میں نے کہا تم قانون سے واقف نہیں ہو۔ بے وقوف جاٹ ہو۔ پولیس کے چکر میں آ گئے تم اتنا تو سوچو کہ جو شخص قتل کرنے کا خود اقرار کرے کبھی بری ہو سکتا ہے

اور عدالت اس کو کبھی چھوڑ سکتی ہے۔ پولیس نے تو تمہیں بیوقوف بنایا ہے۔ میری بات سن کر یہ سوچنے لگا اتنے میں وہاں کا ایک پرانا قیدی جا رہا تھا میں نے اس کو اپنے پاس بلا لیا۔ اور اس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ یہ جاٹ کتنا گدھا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ قتل کا اقرار کرتے ہوئے یہ پھانسی سے بچ جائے گا پرانے قیدی بھی مقدمات کی نوعیت سے واقف ہوتے ہیں۔ اس نے جواب دیا کہ سردار صاحب جی ایسے بے وقوف ہی تو پھانسیوں پر لٹکتے ہیں۔ عدالتوں میں اقرار نہ کرنے والے تو سزا پا جاتے ہیں اور اقرار کرنے والا یا الو کا پٹھا بری ہو جائے گا ان لوگوں کی ایسی ہی حالت ہے یہ جاٹ پیدائشی بے وقوف ہوت ہیں اس پرانے قیدی کی رائے سن کر نوجوان جاٹ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور یہ میرے پاؤں پر گر پڑا۔ اور کہا خدا کے لیے مجھے بچاؤ میں مر جاؤں گا۔ میں نے اسے کہا کہ تمہارے بچنے کی صورت ہے تو صرف ایک ہی کہ تم جب سیشن کورٹ میں جاؤ تو زور زور سے رونا شروع کردو۔ اور سیشن جج سے کہو کہ تم بالکل بے گناہ ہو۔ پولیس کے کہنے پر تم نے جھوٹا بیان دیا ہے تم نے بچہ کو قتل نہیں کیا۔ اور تمہارا بیان مار مار کر لیا گیا ہے میری اس رائے کو سن کر پرانے قیدی نے کہا ہاں یہی صورت بہتر ہے سیشن میں جا کر اپنے بیان سے پھر جاؤ تب بچ سکو گے۔

یہ نوجوان جاٹ مجھے ہمدرد سمجھتا تھا۔ میری بات اس کے دل میں لگی اس نے وعدہ کیا کہ میں ں ے جیسا کہا ہے ویسا ہی وہ کرے گا۔ اس لڑکے نے مجھے بتایا کہ جب وہ پیشی پر جاتا ہے تو پولیس کے لوگ اس کو اپنے بیان پر پختہ رہنے کے لیے تاکید کرتے ہیں اور کبھی پکوڑے لے دیتے ہیں کبھی مٹائی اور اس سے کہتے ہیں کہ فیصلہ کے روز یہ بری ہو جائے گا۔

میں نے اس نوجوان جاٹ کے پاس ہر روز جانا شروع کر دیا اور اسے سمجھا دیا کہ جب پولیس اس کو مٹھائی وغیرہ دے اور بیان پر قائم رہنے کے لیے کہے تو یہ پولیس کو یہی کہتا رہے کہ وہ بیان پر قائم رہے گا تا کہ پولیس کو اس کے بیان بدلنے کا علم نہ ہو۔

چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا۔ پولیس یہی سمجھتی رہی کہ اقراری ملزم اپنے بیان پر قائم ہے یہ مجھے ہر پیشی کے حالات بتاتا رہا اور میں بھی اس کو ابھی طرح تاکید سے سمجھاتا رہا۔ آخر جب سیشن جج نے اس کا بیان لینا چاہا تو عدالت میں یہ زار زار رونے لگ گیا اور اس نے کہا حضور میں نے قتل نہیں کیا اور نہ مجھے قتل کا علم ہے کہ کس نے کیا پولیس نے مار مار کر مجھ سے جرم کا اقرار کرایا اور دوسرے بے گناہ لوگوں کے متعلق مجھ سے بیان لے لیا۔ نہ میں نے قتل کیا ہے نہ مجھ سے کسی نے قتل کرنے کو کہا۔ ہم تینوں بے گناہ ہیں پہلا بیان میں ں ے بالکل غلط اور پولیس کے کہنے پر دیا ہے۔

سیشن جج نے یہی بیان لکھ لیا پولیس اور سرکاری وکیل حیران ہو گیا کہ یہ کیا ہو گیا۔

اقراری بیان کی قانونا پوزیشن یہ ہے کہ اگر اقرار کے بعد ملزم اپنے بیان سے پھر جائے تو بعض حالتوں میں اس کا بیان اس کے خلاف استعمال ہوتا ہے۔ بعض حالتوں میں نہیں مگر ساتھی ملزموں کے خلاف تو یہ قطعی استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ اس مقدمہ میں چونکہ لاش ملزم کے گھر سے برآمد ہوئی سیشن نے اس کو تو عمر قید کی سزا دی مگر چونکہ اس نے اپنے اقراری بیان کی تردید کر دی دونوں بے گناہ ملزم بری کر دیے گئے
۔

اس قدمہ میں قانوناً تو شاید میں بھی ملزم کو ورغلانے اور اس کا بیان بدلوانے کا مجرم ہوں مگر جہاں تک اخلاقی فرض کا سوال ہے میں نے نہ صرف کوئی جرم نہیں کیا بلکہ میں مسرت اور فخر محسوس کرتا ہوں کہ میں نے دو بے گناہ انسانوں کو پھانسی کے تختہ سے بچا کر اپنا فرض ادا کیا۔ اور آئندہ زندگی میں بھی اگر کوئی ایسا موقع آیا تو جہاں کہ قانون اور فرض میں سے ایک کا انتخاب کرنا پڑا تو میں یقیناً فرض کو ہی انتخاب کروں گا قانون کی کبھی پروا نہ کروں گا۔ چاہے قانون کی پروا نہ کرنے کے جرم میں قابل تعزیر ہی کیوں نہ قرار دیا جاؤں۔

☆☆☆

ریاستوں کے جرائم اور ان کی سزائیں

ریاستوں میں ہر افسر اور اہل کار کا گھر خوشامدیوں کا مرکز ہوتا ہے۔ اور شاید ایک بھی افسر یا اہلکار ایسا نہ ہو گا جس کے ہاں ہر روز پانچ سات دس خوشامدی نہ آتے ہوں۔ یہ خوشامدی نہ کوئی اس افسر سے تنخواہ پاتے تھے نہ کوئی معاوضہ اور یہ اس بات میں ہی خوش رہتے کہ ان کا اس افسر سے تعلق ہے۔ کیونکہ اس تعلق کے باعث عام لوگوں پر خوشامدی کا کچھ رعب سا رہتا ہے۔

میں جب ریاست نابھ میں ملازم ہوا تو لوگوں کو یہ علم ہوا کہ مہارانہ نے مجھے ذاتی دوستانہ تعلقات کے باعث ملازمت دی ہے تو میرے ہاں بھی چند خوشامدیوں نے آنا شروع کیا۔ یہ لوگ دن میں ایک آدھ مرتبہ یا دوسرے تیسرے روز آتے۔ کوئی کام نہیں۔ کوئی بات نہیں۔ کوئی غرض نہیں صرف آئے سلام دعا کی۔ بیٹھے شہر کے حالات بتائے ارمیرے کام کی تعریف کی اپنا اور میرا وقت ضائع کیا اور چلے گئے۔ ان لوگوں میں مہاراجہ کے باورچی خانہ کا ایک سرکاری باورچی ہری سنگھ میرا خیال ہے یہی نام تھا اگر میں بھول نہیں گیا۔ بھی تھا جو دوسرے تیسرے روز میرے پاس آتا۔ مہاراجہ کے سارے حالت سناتا اور شہر کے متعلق واقعات بتاتا۔ یہ کھانا پکانے میں ماہر تھا۔ ہندوستانی و انگریزی ہر قسم کا کھانا بنا سکتا تھا۔ یہ کبھی کبھی میرے ہاں آ کر میرے لیے کھانے کی ایک آدھ اچھی ڈش بھی تیار کرتا چنانچہ میں نے اس سے فرنچ ٹوسٹ اور دو چار دوسرے انگریزی کھانے پکانا بھی سیکھ لیے۔ میں اس کا بہت لحاظ کرتا اور یہ میرا۔ کیونکہ یہ مہاراجہ کا باورچی تھا۔ مجھے خیال تھا کہ ایسے لوگ اگر خلاف ہوں تو مہاراجہ کے پاس بدگوئی کر کے مہاراجہ کو خلاف کر سکتے ہیں۔ اس کو یہ خیال کہ مہاراجہ سے میر اذاتی تعلق ہے شاید میں اس کی ترقی کے لیے مہاراجہ سے سفارش کروں اور اس کے لیے مفید ثابت ہوں۔

یہ میرے پاس کئی ماہ تک آتا رہا۔ اس کے بعد گرمیوں کے شروع ہونے پر مہارانہ

منصوری پہاڑ پر چلے گئے تو یہ بھی سٹاف کے ساتھ وہاں گیا۔ مہاراجہ منصوری میں عام طور پر سا میں آٹھ نو ماہ رہتے تھے یعنی مارچ میں چلے جاتے تھے اور اکتوبر یا نومبر میں واپس نابھ آتے جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ سرکاری سٹاف کے لوب اتنا طویل عرصہ اپنے وطن اور بال بچوں سے دور رہ کر تنگ آ جاتے۔ اور کسی کو رخصت ملتی یا سرکاری کام کے لیے نابھ آتا تو وہ اسے غنیمت سمجھتا۔ مصوری میں مہاراجہ کے باورچی خانہ میں سے ایک چمچہ ارو کھانا کھانے کا ایک کانٹا گم ہو گیا۔ اس چمچہ اور کانٹا کے گم ہونے کے متعلق مہاراجہ نے ایک ضر (پنجاب کی سکھ ریاستوں میں ذاتی خدمت کرنے والے ایک بیرہ بوائے یا ملازم کو ھر کہتے ہیں) نے مہاراہ سے شکایت کی کہ ایک چمچہ اور ایک کانٹا گم ہے اور اس کوکش ہے کہ اس چمچہ ار کانٹا کی چوری ہری سنگھ باورچی نے کی ہے نفر کا یہ کہنا تھا۔ کہ مہاراجہ غصہ اور جوش میں آ گئے سرکاری سامان چوری مہاراجہ کے پاس رہنے والا سرکاری ملازم کرے منصوری انگریزی پولیس رپورٹ کوتے اور پولیس اس چوری کے متعلق تحقیقات کرتی۔ مگر مہاراجہ کو کیونکہ یہ گوارا نہ تھا کہ انگریزی پولیس نابھ کے شاہی محل میں آ کر تحقیقات کرے۔ یہ تو ہتک تھی۔ آخر کچھ دیر سوچنے کے بعد مہاراجہ نے سردار کاہلا سنگھ انسپکٹر جنرل پولیس نابھ کے نام ایک خط لکھا جس میں تحریر تھا۔ کہ اس خط کو لانے والے ہری سنگھ نے سرکاری سامان کی چوری کی ہے اس کو تا حک ثانی جیل میں بھیج دیا جائے۔ مہاراجہ نے یہ خط لفافے میں بند کیا اور لفافہ کی پشت پر سرخ لاکھ کے ساتھ مہریں لگائیں اور لفافہ تیار ہونے کے بعد ہری سنگھ کو طلب فرمایا اور حکم دیا کہ یہ خط لے کر فوراً نابھ چلے جاؤ ضروری کام ہے۔ ور یہ خط سردار کاہلا سنگھ انسپکٹر جنرل پولیس کو پہچاؤ۔ ہری سنگھ اس حکم کو سن کر بے حد خوش ہوا کیونکہ کئی ماہ بعد سرکاری خرچ پر نابھ جا رہا تھا۔ ایک دو روز وہاں اپنے وطن رہ کر بیوی بچوں سے ملے گا۔ اس نے لفافہ کو نہایت احتیاط کے ساتھ پہلے ایک کاغذ میں لپیٹا اور پھر اس کے کپڑے میں تا کہ میلا نہ ہو اور بحفاظت نابھ پہنچا سکے چنانچہ یہ منصوری سے اپنا ٹرنک

بستر ہ لے کر روانہ ہوا۔ ڈیرہ دون تک ڈانڈی اس زمانہ میں منصوری تک موٹریں ل ہ جاتی تھیں راجپورہ سے منصورہ تک ڈانڈی جاتی تھی جس کو چار یا چھ آدمی اٹھایا کر تے تھے ۔ میں گیا ڈیرہ دون سے ریل میں سوار ہو کر اگلے روز صبح نابھ پہنچ گیا ۔ نابھ ریلوے سٹیشن پر اتر تو پہلے سیدھا انسپکٹر جنرل پولیس سردار کاہلا سنگھ کے مکان پر گیا تا کہ سرکاری لفافہ کو پہلے وہاں پہنچادے اروپھر اپنے گھر جائے اور سرکاری کام میں حرج نہ ہو۔ کیونکہ مہاراجہ نے کہا تھا کہ یہ لفافہ ضروری ہے یہ بچارا سردار کاہلا سنگھ کے مکان پر پہنچا تو اس نے ملازم کے ذریعے سردار صاحب کی خدمت میں اپنے منصوری سے آنے اور ایک ضروری لفافہ لانے کی سزا دی ملازم نے سردار صاحب کو اطلاع دی تو سردار صاحب نے ہری سنگھ کو مکان کے اندر بلا لیا ۔ ہری سنگھ نہایت ادب کے ساتھ سردار صاحب کو خط دیا ۔ سردار نے خط کھولا اور پڑھا تو آپ نے اپنے ملازم سے کہا کہ باہر پہرہ پر پولیس کا سپاہی ہے سردار صاحب کے مکان پر پولیس کا دن رات پہرہ رہتا تھا۔ اس کو بلاؤ ملازم سپاہی کو بلا لایا جب سپاہی آیا تو سردار صٓحب نے سپاہی کو حک دیا کہ ہری سنگھ کو ہتھکڑی لگالو۔ ہری سنگھ پریشان کی معاملہ کیا ہے ۔ وہ قابل اعتماد سمجھا جا کر منصوری سے کانفڈینشل خط لایا ہے اور یہاں گرفتاری ہوگئی ۔ یہ غریب رونے لگا ۔ انسپکٹر جنرل پولیس نے داروغہ جیل کے نام روبکار لکھی ۔ کہ ملزم ہری سنگھ بحکم سری حضور مہاراجہ صٓحب مالوندر بہادر جیل بھیجا جاتا ہے اس کو تاحکم ثانی جیل میں قید رکھا جائے ۔ کنسٹیبل پولیس اس روبکار اور ہری سنگھ کو لے کر جیل گیا اور ہری سنگھ بجائے اپنے گھر میں اپنے بال بچوں کو ملنے کے داروغہ جیل کے سامنے پیش کیا گیا۔ جس نے کانٹا اور چمچہ کی چوری کے شاہی ملزم پر بغیر مقدمہ چلائے بغیر سزا' بغیر اپیل یا بغیر کسی قانونی مشورہ یا فیصلہ کے قیدیوں کے ڈربے میں داخل کر دیا۔ جہاں ک یہ بچارا اسی حالات میں اس روز تک قید رہا جب تک کہ مہاراجہ کی معزولی کے بعد انگریز ایڈمنسٹریٹر نابھ میں نہیں پہنچ گیا۔ اور اسی قسم کے بغیر کسی مقدمہ کے قید کیے گئے اسی کے قریب

دوسرے شاہی قیدی رہا کیے گئے۔

ہری سنگھ نے اپنی قید کے زمانہ میں میرے پاس کئی جیل سے پیغام بھیجا۔ جس میں اس نے گرنتھ صاحب کی قسمیں کھائیں کہ اس کو چھپے اور کاٹنے کا کچھ علم نہیں یہ بے گناہ ہے۔ اور اس کی رہائی کے لیے میں مہاراجہ سے سفارش کروں مگر میں بے بس تھا۔ مہاراجہ سے کوئی کیا کہہ سکتا تھا۔ جس صورت میں کہ تمام ریاست کا ایک ملازم یا ایک اہل کار بھی ایسا نہ تھا کہ جو اس اطمینان کے ساتھ رات کو سوتا ہو کہ اگلے روز جب سورج نکلے گا تو اس وقت وہ اپنے بستر پر ہی ہوگا جیل میں نہ ہوگا۔ یعنی ایک آدمی بھی تمام اپنے ملازموں میں ایسا نہ تھا چاہے وہ کتنا بھی بے گناہ اور معصوم کیوں نہ ہو جو اپنے آپ کو خطرہ نہ سمجھتا ہو۔

یہ تو ریاست نابھ کا ایک واقعہ ہے جس کا مجھے ذاتی علم ہے مگر ہندوستان کی چھ سو ریاستوں می شاید ہی کوئی ایسی ریاست ہوگی کہ جس میں اس قسم کے جھوٹے بے بنیاد اور بے معنی مقدمات نہ بنائے جاتے ہوں۔ اور سرکاری ملازم یا رعایا کے لوگ والئ ریاست کی ناراضی اور غصہ کا شکار ہوئے ہوں۔ تا حکم ثانی جیلوں میں نہ بھیج دیے جاتے ہوں ریاستوں کے ایسے حالات میں یہ خواہش کرنا کہ ریاستوں کی لعنت ہندوستان پر ہمیشہ قائم رہے انتہائی حماقت تھی اور اگر انسانوں کی سول لبرٹی کی دنیا میں کوئی حیثیت ہے تو ریاستوں کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا جانا ہی بہتر تھا۔

ریاستی جرنلزم

ریاست دیتا میں ایک صاحب شیر خاں بارہ یا پندرہ روپیہ ماہوار کے ملازم تھے اگر میں غلطی پر نہیں تو غالباً پولیس میں کنسٹیبل تھے ۔ آپ جب یہ دیکھتے کہ ہر ماہ دو چار ایڈیٹر صاحبان دیتا میں تشریف لاتے ہیں ۔ سرکاری مہمان خانہ میں ٹھہرتے ہیں ۔ اچھے سے اچھا کھانا کھاتے ۔ موٹر یا دو گھوڑوں کی گاڑی ان کی سیر کے لیے موجود رہتی ۔ دنیا کے بڑے بڑے سرکاری ملازم اگر وزیراعظم یا مہاراجہ سے ملنا چاہیں تو ملنے کے لیے راستہ میں دقتیں مگر یہ ایڈیٹر صاحبان جب دیتا آتے ہیں اور وزیراعظم یا مہاراجہ نے فوراً ان سے ملاقات کی ۔ اور دو چار یا پانچ روز سرکاری مہمان رہنے کے بعد جب ی ہو اپس جانے لگتے تو ان کو پچاس یا سو یا دو سو روپیہ بطور رخصتانہ دیا جاتا شیر خاں صاحب نے سوچا کہ اس بارہ پندرہ روپیہ ماہوار کی ملازمت میں کیا رکھا ہے ۔ ایڈیٹری کا پیشہ سب سے اچھا ہے جس کے خلاف چاہو لکھو ۔ ایڈیٹر صاحب کہلاؤ ۔ ریاستوں کے دورے کرو ۔ اچھا کھاؤ رخصتانے وصول کرو ۔ والیان ریاست اور حکام سے ملاقاتیں ۔ سینماؤں ک پاس مفت دعوتوں اور تقریبوں میں شمولیت اور عزت و وقار ۔ آپ نے ملازمت چھوڑ دی اور دیتا سے سولہ میل کے فاصلے پر جھانسی تشریف لے گئے سنٹرل انڈیا کے رہنے والے تھے ۔ ہندی جانتے تھے ۔ آپ نے ہندی زبان میں ایک اخبار مجھے ٹھیک نام یاد نہیں رہا غالباً اس اخبار کا نام ریاستی سنسار...... یا ریاستی پرجا تھا ۔ کا ڈکلیریشن کلکٹر جھانسی کی عدالت میں داخل کر دیا اور اخبار نکال لیا ۔ اخبار نکالنے کے علاوہ آپ نے کھدر پہن لیا ۔ جھانسی میں کانگرس قائم ہو چکی تھی مسلمانوں کی کانگرس میں بالکل وہی پوزیشن تھی جو پاکستان کے حق میں بیانات دین والے کسی ہندو یا ہندوستان کی مکمل آزادی کے حق میں مضمون لکھنے والے ایک انگریز کی ہو سکتی تھی ۔ جھانسی کے کانگرسیوں نے بھی ان کے مسلمان ہونے کے باعث ان کا کانگرس میں آنا غنیمت سمجھا ۔ چنانچہ آپ نے شیر خاں پولیس کانسٹیبل دیتا نہ تھے بلکہ مسٹر شیر

خاں ایڈیٹر ''ریاستی سنسار'' وممبر کانگرس کمیٹی جھانسی تھے۔

مسٹر شیر خاں نے اخبار نکالنے کے بعد ریاستوں کے حق میں اور خلاف لکھنا شروع کر دیا۔ اور گو اخبار ہفتہ وار تھا مگر ایڈیٹر صاحب کو ریاستوں کے دورے پر بھی جانا ہوتا تھا۔ اس لیے اخبار کبھی کبھی نکلتا۔ آپ کا کام اچھا چل نکلا۔ تمام اخراجات نکالنے کے بعد آپ اس کاروبار میں اتنا بچا لیتے جتنی ایک سینئر گریڈ کے انسپکٹر پولیس کو تنخواہ ملتی ہے۔ یعنی ان کی آمدنی دیتا کی ملازمت سے کہیں زیادہ تھی۔

شیر خاں صاحب ریاستوں کا دورہ کرتے بیکانیر تشریف لے گئے مرحوم مہاراجہ بیکانیر کا دور تھا مہاراجہ بہت بڑے مطلق العنان جو سوائے انگریزوں کے کسی کو انسان ہی نہ سمجھیں اور کھدر کے ہر تار میں بغاوت کی بو محسوس کریں۔ آپ جب بیکانیر پہنچے تو پولیس نے ایک کھدر پوش کو گاندھی ٹوپی پہنے دیکھا تو آپ کو بغیر کچھ دریافت یا تحقیقت کے گرفتار کر لیا گیا اور حوالات میں بند کر دیا گیا یعنی آپ ریاستوں کے دورہ میں بھی سرکاری مہمان ہوا کرتے تھے اور اب بھی سرکاری مہمان فرق صرف یہ ہے کہ پہلے سرکاری گیسٹ ہاؤس میں مگر اب حوالات میں۔ حوالات میں بند کر دینے کے بعد پولیس نے حکام کو رپورٹ کی کہ ایک گاندھی ٹوپی والے کھدر پوش کر گرفتار کیا گیا ہے۔ جو اپنا نام شیر خاں اور اپنے آپ کو جھانسی کے کسی اخبار کا ایڈیٹر بتاتا ہے۔ یہ رپورٹ تحقیقات کے لیے جھانسی پولیس کے پاس گئی۔ وہاں سے دس بارہ روز میں جواب آیا کہ شیر خاں صاحب معمولی اور بے ضرر قسم کے آدمی ہیں۔ پیشہ کے لحاظ سے یہ ریاستوں کا دورہ کر کے گداگری کرتا ہے۔ اس کو نہ کوئی اہمیت حاصل ہے اور یہ خطرناک آدمی ہے۔ اس جاب آنے کے بعد بیکانیر پولیس نے شیر خاں صاحب کو چھوڑ دیا اور زبانی یہ حکم دیا کہ فوراً ریاست بیکانیر سے چلے جاؤ۔ چنانچہ آپ بیکانیر سے واپس دہلی تشیرف لائے یہاں سرائے احمد پائی میں ٹھہرے اور منہ ہاتھ دھونے کے بعد دوپہر کو دفتر ''ریاست'' میں پہنچے تاکہ ریاست بیکانیر کے ظلم اور زیادتی کے خلاف

ایجی ٹیشن پیدا کی جائے یہ بزرگ جب ایڈیٹر ریاست سے ملے تو ایڈیٹر ریاست نے تمام حالات معلوم کرنے کے بعد یہ محسوس کیا کہ یہ بے وقوف کلاس کے سادہ لوح مگر اچھے آدمی ہیں۔ پانچ سات روز ان کے ساتھ دلچسپی رہے تو کوئی حرج نہیں۔ تفریح کا وقت گزارنے کے اعتبار سے مفید ہوں گے۔ تمام حالات سننے کے بعد آپ سے درخواست کی کہ اس وقت تو کام زیادہ ہے آپ شام کو تشریف لائیے۔ چائے بھی یہاں پیجیے اور باتیں بھی کریں گے۔ اس زمانہ میں دن بھر کام کرنے کے بعد ایڈیٹر ''ریاست'' نے شام کا وقت تفریح کے لیے وقف کر رکھا تھا۔ چائے پر دو تین دوست آ گئے چائے کے بعد موٹر میں سینما یا سیر کے لیے چلے گئے۔ واپس آنے کے بعد دوستوں کے ساتھ ہی کھانا کھایا اور سو گئے۔ یعنی شام کو چھ بجے سے نو دس بجے تک رات تک گپ بازی اور سیر و تفریح ہوتی شیر خاں صاحب شام کو چھ بجے تشریف لائے تو اس وقت ایڈیٹر ''ریاست'' ایک دوست مسٹر محمد یوسف کے ساتھ بیٹھے تھے۔ یوسف صاحب اس زمانہ میں قریب قریب ہر روز شام کو آیا کرتے۔ شیر خاں صاحب تشریف لائے تو میں نے انٹروڈیوس کرایا۔ مسٹر شیر خاں صاحب ایڈیٹر ریاستی سنسار جھانسی اور میرے دوست مسٹر محمد یوسف۔ شیر خاں صاحب بیٹھ گئے۔ چائے آئی چائے پی رہے تھے تو باتیں شروع ہوئیں۔ مسٹر شیر خاں صاحب نے یوسف صاحب سے پوچھا کہ آپ کہاں رہتے ہیں اور کیا کام کرتے ہیں یوسف ابھی جواب نہ دے سکے تھے کہ میں نے شرارتاً بات کاٹ کر کہا۔ اوہ مجھے افسوس ہے میں پورے طور پر تعارف نہ کرا سکا۔ بھول گیا۔ آپ کا نام خاں صاحب مسٹر محمد یوسف ہے اور آپ ولی عہد جونا گڑھ کے پرائیویٹ سیکرٹری ہیں ولی عہد صاحب کے ساتھ دہلی تشریف لائے ہیں۔ میرے بہت گہرے دوست ہیں اور میڈن ہوٹل میں ولی عہد صاحب کے ساتھ تشریف فرما ہیں۔ اور آپ مسٹر شیر خاں صاحب ہیں جھانسی کے مشہور اخبار ریاستی سنسار کے ایڈیٹر ہیں۔ جھانسی کانگرس کے لیڈر ہیں اور آپ کا اخبار تمام سنٹرل انڈیا میں اور

راجپوتانہ میں بہت باثر سمجھا جاتا ہے۔اس اخبار میں ریاستوں کے متعلق ہی مضامین ہوتے ہیں۔ابھی حال ہی میں آپ بیکانیر گئے تھے وہاں سے واپس تشریف لائے ہیں اور اب اپنے ہیڈ کوارٹر یعنی جھانسی تشریف لے جائیں گے۔یوسف صاحب غیر معمولی ذہین آدمی ہیں۔فوراً سمجھ گئے کہ ان حضرت کو بے وقوف بنایا جارہا ہے۔تاکہ وقت صریحاً اچھا گزر جائے آپ فوراً اٹھ اور آپ نے شیر خاں صاحب کے ساتھ نہایت گرم جوشی سے مصافحہ کیا اور کہا کہ آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔اس کے بعد ہم لوگ چائے پیتے رہے۔جب چائے پی چکے تو شیر خاں نے ایڈیٹر "ریاست" سے کان میں کہا کہ ذرا دوسرے کمرے میں چلیے کچھ پرائیویٹ بات کرنی ہے میں شیر خاں صاحب کو لے کر برآمدہ میں آ گیا آپ نے فرمایا:

"خاں صاحب مسٹر یوسف تو آپ کے گہرے دوست ہیں۔آ کا اشارہ ہی کافی ہو گا۔ار آپ ان سے کہہ دیں کہ یہ کچھ روپیہ مجھے دے دیں میں بہت پریشان ہوں۔اس وقت میرے پاس صرف چھ روپیہ ہیں میں جھانسی جاؤں تو میرے پاس کوئی پیسہ نہ ہو گا۔جانے کے بعد اخبار کا پرچہ نکالنا ہے جو جھانسی س لے کر چلا تھا سفر میں تمام خرچ ہو گیا۔بیکانیر سے ایک پیسہ نہ ملا۔بلکہ تکلیف مفت کی ہوئی آپ کا احسان ہو گا ک اگر آان سے کچھ روپیہ لے دیں گے اور سفارش کریں گے"۔

میں نے جواب دیا۔

"شیر خاں صاحب یہ رایاستوں کے لوگ بہت سے ایمان ہیں۔شرافت کے ساتھ ایک پیسہ نہیں دیتے۔ان سے طریقہ کے ساتھ لیا جا سکتا ہے یہ میرے دوست ہیں میں ان کے خلاف کچھ نہیں لکھ سکتا۔ولی عہد جونا گرھ کے یہ پرائیویٹ سیکرٹری ہیں مگر ولی عہد کو طوائفوں کی چاٹ لگا رہے ہیں۔پرسوں یہ ولی عہد کو ایک طوائف کے ہاں لے گئے تھے وہاں اڑھائی ہزار روپیہ اڑا دیا۔مگر ایڈیٹروں کے لیے تو ان کے پاس ایک پیسہ بھی نہیں خیر دیکھیے سوچیں گے۔کہ کیا کرنا چاہیے میں پوری کوشش کروں

گا‘‘۔

طوائف کے ہاں جان یکا نام سن کر یہ اچھل پڑے اور کہا۔

’’اس طوائف کا نام کیا ہے مجھے بتائیے میں ایک پمفلٹ لکھتا ہوں اور دیکھتا ہوں کہ یہ کس طرح روپیہ نہیں دیتے۔ ان لوگوں کے پاس رنڈی کے لیے ہزار ہا روپیہ ہے مگر اخبارات کے ایڈیٹروں کے لیے ایک پیسہ نہیں‘‘۔

اس زمانہ چاوڑی بازار کی طوائفوں میں سے ایک طوائف ہما کی بہت شہرت تھی۔ یہ خوبصورت بھی تھی اور گاتی بھی اچھا تھی۔ اس لیے والیان ریاست کے ہاں بھی اس کا آنا جانا تھا۔ میں نے اسی کا نام لے دیا۔ کانفیڈنشل گفتگو کے بعد ہم لوگ پھر کمرہ میں چلے آئے۔ یوسف صاحب سگریٹ پی رہے تھے۔ جب ہم بیٹھ گئے تو میں نے سلسلہ کلام پھر شروع کیا اور یوسف صاحب جن کو میں نے اب یوسف صاحب نہیں بلکہ خاں صاحب کہنا شروع کیا ہے کہا:

’’خان صاحب مسٹر شیر خاں کا اخبار بہت باا‌ثر ہے۔ ہندی زبان میں ہے اور تمام سنٹرل انڈیا راجپوتانہ اور سی پی میں پڑھا جاتا ہے۔ دیکھیے آپ طوائفوں کے ہاں اتنا روپیہ برباد کرتے ہیں پرسوں رات کو ڈھائی ہزار روپیہ ہما طوائف کے ہاں خرچ کر آئے۔ آپ مہربانی فرما کر ولی عہد سے کہیے کہ وہ شیر خاں صاحب کو بھی کچھ دیں۔ شیر خاں صاحب اپنے اخبار میں آپ کی ریاست کی تعریف کریں گے۔ ولی عہد اور آپ کا فوٹو چھاپ دیں گے اور یہ ہمیشہ آپ کا پراپگنڈہ کریں گے‘‘۔

مسٹر یوسف ایسے ڈراموں میں پارٹ کرنا خوب جانتے ہیں۔ آپ نے میری بات سن کر جواب دیا:

’’ہم اردو و ہندی اخبارات کی کوئی پروا نہیں کرتے۔ ان اخبارات کی قیمت ہی کیا ہے یہ خلاف لکھیں تو ہمیں کوئی پروا نہیں۔ حق میں لکھیں تو ہم خیال نہیں کرتے۔ ہم تو ان ایسے چھوٹے اخبارات کو گداگر سمجھتے ہیں۔ ہمارے ہاں جونا گڑھ

میں اگر بمبئی کرانیکل کا جھانسی کے اخبارات کیا حیثیت ہے میں ولی عہد بہادر سے سفارش نہیں کر سکتا''۔

مسٹر یوسف کے منہ سے جھانسی کے اخبارات کی توہین کے الفاظ کا نکلنا تھا کہ شیر خاں صاحب جوش میں آ گئے اور آپ نے ذرا زیادہ بلند آواز میں کہا:

''میں ایڈیٹروں کی توہین نہیں سن سکتا۔ آپ لوگ والیان ریاست کو بد معاشی سکھاتے ہیں۔ آ نے دہلی کے چاوڑی بازار میں ہزار ہا روپیہ ناجائز صرف کیے۔ یہ روپیہ ریاستوں کی پبلک کا تھا۔ آ کو کوئی حق نہیں تھا کہ روپیہ اس طرح برباد کرتے۔ میں اپنے اخبار میں تو پھر لکھوں گا۔ آپ کو کل ہی بتاؤں گا۔ کہ آپ دہلی میں کیا کر رہے ہیں۔ میں ابھی ایک پمفلٹ لکھتا ہوں آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ ایڈیٹروں کے قلم میں کتنا زور ہے۔ میں نے مہاراجہ گوالیار کو سیدھا کر دیا۔ مہاراجہ دیتا میرے اخبار سے خوف کھاتے ہیں۔ آپ کی حیثیت ہی کیا ہے''۔

شیر خاں صاحب کے اس غصہ کو دیکھ کر میں اور یوسف صاحب بصد مشکل اپنی ہنسی ضبط کر سکے۔ اور اس ڈراما کو زیادہ دلچسپ بنانے کے لیے میں نے کہا کہ میری پوزیشن بے حد نازک ہے خاں صاحب آپ بھی میرے دوست ہیں اور شیر خاں صاحب آپ بھی میری برادری کے جرنلسٹ ہیں میرے مکان پر آپ لوگوں کا جھگڑا ہونا مناسب نہیں خدا کے لے تو تو میں میں نہ کیجیے۔ بہتر تو یہ ہے کہ خاں صاحب آپ شیر خاں صاحب کی روپیہ سے امداد کیجیے۔ یہ جرنلسٹ ہیں آپ کی ہمیشہ تعریف کریں گے۔ ان کا اخبار بہت با اثر ہے اور یہ یوپی کی کانگرس کے لیڈر بھی ہیں۔ آپ کے لیے مفید ہوں گے مسٹر یوسف نے پھر وہی کہنا شروع کیا۔ کہ آپ اخبارات کی پروا نہیں کرتے۔ اخبارات کے ایڈیٹروں سے طوائفیں اچھی ہیں طوائفوں میں کچھ تو کریکٹر ہے مگر اردو ہندی اخبارات کے ایڈیٹر تو انسانی کریکٹر سے بھی محروم ہیں۔ آج حق میں لکھتے ہیں تو کل خلاف پرسوں پھر حق میں لکھتے ہیں تو اگلے روز پھر خلاف جب

کافی دیر جھگڑا ہوتا رہا تو میں نے کہا کہ اچھا آج تو اس میٹنگ کو ختم کیا جائے۔ کل شام کو فیصلہ کریں گے۔ میں نے یوسف صاحب اور شیر خاں صاحب دونوں سے درخواست کی کہ کل شام کو پھر چائے پر تشریف لائیے تاکہ ٹھنڈے دل کے ساتھ بات چیت کی جا سکے۔

شیر خاں صاحب تو سرائے احمد پائی چلے گئے۔ میں اور یوسف صاحب موٹر میں سیر کرنے کے لیے نئی دہلی گئے۔ راستہ میں شیر خاں صاحب کی بے وقوفی کا ذکر رہا۔ کیونکہ جونا گڑھ کے ولی عہد بیچارے تو ابھی نابالغ بچے ہیں اور شاید کسی سکول میں پڑھتے ہوں گے اور یوسف صاحب کا جونا گڑھ سے کوئی تعلق نہیں مگر ایڈیٹر صاحب جس ریاستی سنسار پمفلٹ اور اخبار میں لکھنے کے لیے آستینیں چڑھا رہے ہیں۔

اگلے روز شام کو شیر خاں صاحب اور یوسف صاحب چائے پر پھر تشریف لائے شیر خاں صاحب نے مجھے کمرہ سے باہر لے جا کر بتایا کہ وہ تمام رات جاگتے رہے۔ رات رات میں آپ نے ولی عہد جونا گڑھ کے خلاف ہندی میں ایک پمفلٹ لکھا یہ پمفلٹ صبح ختم ہوا۔ تو یہ ایک پریس میں گئے وہاں سے دو روپیہ پیشگی دے کر اس پمفلٹ کو کمپوز کرنے کے لیے دے آئے ہیں۔ دو دن میں پروف مل جائے گا۔ ان سے بات کرنے کے بعد میں اور شیر خاں صاحب کمرہ کے اندر آ گئے۔ چائے لائی گئی اور باتیں شروع ہوئیں تو میں نے یوسف صاحب سے پوچھا فرمائیے ولی عہد صاحب اچھے ہیں۔ کیا پروگرام رہا۔ اس کے جواب میں آپ نے کہا کہ ہاں اچھے ہیں رات کو سینما گئے تھے مہاراجہ پٹیالہ آئے ہوئے ہیں ان کے ہاں ڈنر تھا۔ وہاں رقص کی محفل گرم تھی۔ نصف درجن کے قریب طوائفیں تھی رات کو مہاراجہ پٹیالہ کے ہاں ہی ایک بج گیا۔ آج جوہری آئے ہوئے تھے اڑھائی لاکھ روپیہ کے قریب قیمت کے جواہرات خریدے ہیں۔ ولی عہد صاحب کچھ کمزوری کی شکایت ہے حکیم محمد احمد خاں صاحب تشریف لائے تھے انہوں نے مقوی باہ کی ادویات دی ہیں۔ دو ہزار روپیہ تو حکیم

صاحب کی فیس کا دیا اور ڈیڑھ ہزار روپیہ کا نسخہ تیار ہو گا۔ اس میں سونا موتی اور جواہرات ڈالے جائیں گے۔ ولی عہد کے ساتھ ان کی بیوی بھی ہیں ان کے لیے کپڑا خرید اگیا لیلا رام دکان کا بل بائیس ہزار روپیہ کا تھا۔ ایک ایک ساڑھی کا دو دو ہزار روپیہ لگایا گیا تھا۔ وغیرہ۔

جوں جوں یوسف صاحب اخراجات بتا رہے تھے شیر خاں صاحب کا خون کھول رہا تھا۔ جب یوسف صاحب پچھلے دن کی تمام کارگزاری بتا چکے تو میں نے یوسف صاحب سے کہا کہ آپ اتنا روپیہ ضائع کرتے ہیں۔ آپ کے پاس اخبارات کے ایڈیٹروں کے لیے کچھ نہیں۔ مجھے افسوس ہے ہ میرے مکان پر آپ لوگوں کا تعارف ہوا۔ آپ ہیں کہ شیر خاں صاحب کے لیے آپ کے جیب میں کچھ نہیں اور ادھر شیر خاں صاحب ہیں کہ آپ نے رات بھر جاگ کر آپ کے ولی عہد کے خلاف پمفلٹ لکھا جو پریس میں چھپنے کے لیے دے دیا گیا ہے۔ اگر یہ پمفلٹ چھپ گیا تو کتنی بدنامی ہو گی نواب صاحب جونا گڑھ میرے متعلق کیا خیال کریں گے کہ میں نے تعارف کرایا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔ میری پوزیشن بے حد نازک ہے ۔ یوسف صاحب نے کچھ تیز ہو کر کہا۔ کہ ایک بار نہیں ہزار بار پمفلٹ چھپیں ہم پروا نہیں کرتے۔ اگر پمفلٹ چھپ گیا تو پولیٹکل ڈیپارٹمنٹ کی معرفت اس کو ضبط کر لیا جائے گا۔ اور پمفلٹ لکھنے والے کو جیل بھیج دیا جائے گا۔ نواب صاحب بہادر جونا گڑھ کا پولیٹکل ڈیپارٹمنٹ پر کافی اثر ہے۔ چائے پی جا رہی تھی۔ یوسف صاحب تیزی سے جواب دیتے جا رہے تھے۔ شیر خاں صاحب غصہ میں آنکھیں سرخ کیے اپنے چہرہ سے انتقام لینے اور رسید ھا کر دینے کا اظہار کر رہے تھے اور میں اپنی ہنسی کو سختی سے ضبط کیے ہوئے ہاتھ جوڑ کر دونوں کو خاموش رہنے کے لیے اور ٹھنڈے دل سے بات چیت کرنے کی درخواست کر رہا تھا۔ آخر بہت کوشش کے بعد جب فضا کچھ پر سکون ہوئی۔ تو یوسف صاحب نے دریافت کیا۔ کہ شیر خاں صاحب کتنا روپیہ چاہتے

ہیں۔ میں نے کہا آپ جانیے یا یہ۔ میں اس معاملہ میں دخل نہیں دیتا۔ آپ خود ہی آپس میں فیصلہ کر لیجیے۔ اس پر شیر خاں صاحب نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ کہ میں جو فیصلہ کروں ان کو منظور ہو گا۔ میں نے جواب دیا کہ اس معاملہ میں کوئی دخل نہیں دیتا۔ میرے انکار کرنے پر شیر خاں صاحب مجھے لے کر باہر گئے۔ اور پوچھا کہ کتنا روپیہ کہا جائے میں نے پہلے تو دخل نہ دینے کا بہانہ کرتے ہوئے انکار کیا۔ مگر جب انہوں نے بھی میری رائے پوچھی تو میں نے کہا کہ پچیس ہزار روپیہ طلب کرو تو یہ پانچ ہزار تک آئیں گے۔ اور میں ان سے کہوں گا کہ پانچ ہزار دے دیں۔ شیر خاں صاحب بہت خوش ہوئے۔ ان کو سو سو روپیہ کے پچاس نوٹ نظر آ رہے تھے۔ ہم لوگ پھر اندر آ گئے تو میں نے یوسف صاحب سے کہا کہ شیر خاں صاحب اس شرط پر پمفلٹ نہ لکھیں گے کہ اگر ان کو پچیس ہزار روپیہ دیا جائے۔ پچیس ہزار کا نام سن کر یوسف صاحب پھر تیز ہوئے۔ اور کہا کہ گٹر پریس کی قیمت پچیس ہزار روپیہ ہو سکتی ہے۔ جونا گڑھ میں تو درجنوں ایسے ایڈیٹر دھکے کھاتے پھرتے ہیں۔ ان کو پچاس یا زیادہ سے زیادہ ایک سو روپیہ دیا جاتا ہے۔ اور آپ شیر خاں صاحب کو بطور خیرات زیادہ سے زیادہ پچاس روپیہ دے سکتے ہیں اس سے زیادہ نہیں۔ شیر خاں صاحب پانچ ہزار کے خواب دیکھ رہے تھے کہ پچاس روپیہ سن کر پھر تیز ہوئے۔ ادھر یوسف صاحب نے بھی تیزی دکھائی میں نے دونوں سے ہاتھ جوڑ رہا ہوں۔ کہ خدا کے لیے میرے مکان پر تو تو میں میں نہ کرو۔ میری پوزیشن بہت نازک ہے۔ چنانچہ یہ شام بھی ان کے آپس کے جھگڑے میں اور میرے صلح کرانے میں صرف ہوئی اور دو گھنٹہ کے بعد یہ ڈرامہ یہ کہہ کر ختم ہوا کہ اگلے روز پھر بات چیت کی جائے گی مسٹر شیر خاں اپنی سرائے میں تشریف لے گئے اور میں یوسف صاحب کے ساتھ موٹر میں سیر کے لیے چلا گیا۔

اگلے روز شام کو شیر خاں صاحب پھر تشریف لائے۔ پمفلٹ کا پروف ان کے پا

س تھا۔ یوسف صاحب ابھی نہ آئے تھے۔ ان کے آنے سے پہلے باتیں ہوئیں تو میں نے ان کو تاکید کی کہ پچیس ہزار روپیہ ہی طلب کریں اور اس پر اڑے رہیں۔ تو خاں صاحب پانچ ہزار تک آئیں گے۔ اور پمفلٹ کو دیکھ کر ان کے حواس اڑ جائیں گے۔ شیر خاں صاحب میری تجویز پر بہت خوش ہوئے۔ اتنے میں یوسف صاحب بھی آ گئے اور چائے منگائی گئی۔ چائے پیتے ہوئے پھر باتیں شروع ہوئیں تو میں نے اپنی ہنسی بہت مشکل کے ساتھ ضبط کرتے ہوئے کہا کیا عرض کیا جائے۔ مجھے ایسی مشکل کے ساتھ زندگی بھر کبھی واسطہ نہیں پڑا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔ بہت پریشان ہوں شیر خاں صاحب ہیں کہ ان کا پمفلٹ کا پروف بھی تیار ہو گیا ہے۔ اور یہ چھپنے کے لیے پریس میں دے آئے ہیں۔ یہ کہتے ہوئے میں نے شیر خاں صاحب سے کہا کہ وہ پروف تو دکھائیے۔ شیر خاں صاحب نے فخر حوصلہ اور فاتحانہ انداز میں اپنے جیب سے پروف نکالا۔ یوسف صاحب بھی بہت مشکل کے ساتھ اپنی ہنسی ضبط کر سکے۔ اور پروف کو دیکھ کر نفرت اور حقارت سے کہا کہ وہ ایسے پمفلٹوں کی پرواہ نہیں کرتے۔ چنانچہ پھر وہی پہلے سے دوسرے دن والا منظر تو تو میں میں تیزی ایک دوسرے پر الزامات ادھر پچیس ہزار کا مطالبہ ادھر پچاس روپیہ یا صرف ایک سو روپیہ۔ میں دونوں سے ہاتھ جوڑ رہا ہوں اور یوسف صاحب سے رقم بڑھانے کی منتیں کر رہا ہوں۔ آخر یوسف صاحب بصد مشکل میری سفارش پر پانچ سو روپیہ تک پہنچے۔ شیر خاں صاحب بار بار مجھے کمرہ سے باہر لے جاتے ہیں اور مشورہ لیتے ہیں۔ کہ پانچ سو روپیہ قبول کر لیں یا نہیں میں نے اپنی ہنسی کو نہایت مشکل کے ساتھ ضبط کرتے ہوئے ان سے کہا۔ کہ پچیس ہزار سے ایک کم پر بات نہ کیجیے۔ پمفلٹ کو دیکھ کر ان کا اندر سے تو پیشاب خطا ہو رہا ہے۔ صرف ظاہرا طور پر حوصلہ دکھا رہے ہیں۔ ہم لوگ پھر اندر آئے پھر جھگڑا شروع ہوا وہی تو تو میں میں یوسف صاحب کہتے ہیں۔ کہ وہ اخبارات کی پروا نہیں کرتے۔ شیر خاں صاحب سیدھا کرنے کی دھمکی دیتے ہیں۔ میں دونوں کی

خوشامد کرتا ہوں۔ اور اپنی نازک پوزیشن بیان کرتے ہوئے درخواستوں پر درخواستیں کرتا ہوں۔ کہ دوستانہ مصالحت کر لیجیے۔ یہ شام بھی اسی طرح پر لطف صحبت میں بسر ہوئی اور پھر اگلے روز بات چیت کا فیصلہ ہوا۔

چار پانچ روز یہ کیفیت رہی تو آخر یوسف صاحب نے ایک پیسہ دینے سے انکار کر دیا اور کہا کہ کر لو جو کرنا ہے اور بہت غصہ میں کہا۔ کہ وہ اس تمام واقعہ کی اطلاع پولیس اور پولیٹکل ڈیپارٹمنٹ کو دیں گے۔ یوسف صاحب کے اس کہنے پر شیر خاں صاحب بہت نرم ہوئے۔ آخر مجھے یہ پھر باہر لے گئے اور کہا کہ اچھا پانچ سو روپیہ ہی دلوا دو۔ میں اپنی ہنسی ضبط نہ کر سکا۔ وہ میری ہنسی کو دیکھ کر حیران رہ گئے کہ آخر کیا معاملہ ہے۔ ہم لوگ اندر آئے میری ہنسی کو دیکھ کر یوسف صاحب بھی اپنی ہنسی ضبط نہ کر سکے اور شیر خاں صاحب حیران کی معاملہ کیا ہے۔ جو دونوں ہنس رہے ہیں۔ جب ہنسی ضبط نہ ہو سکی تو آپ نے بار بار ہنسی کا سبب پوچھا۔ تو آخر ان کو اصل واقعہ بتایا۔ کہ نہ تو یوسف صاحب ولی عہد جونا گڑھ کے پرائیویٹ سیکرٹری ہیں نہ ولی عہد ہی دہلی میں ہیں وہ بیچارے تو نابالغ ہیں کسی سکول میں پڑھتے ہیں صرف تفریح کے لیے یہ ڈرامہ کھیلا گیا۔ شیر خاں صاحب کو ایک تو پانچ ہزار روپیہ سے پانچ سو روپے کے جانے کا صدمہ اور دوسرے اپنی بے وقوفی پر ندامت میں نے اس کیفیت پر پردہ ڈالنے کے لیے یہ موضوع بدل دیا اور ادھر ادھر کی باتیں شروع کیں۔ لطائف سنائے۔ جب فضا کچھ بدل گئی تو شیر خاں صاحب نے بتایا کہ جب وہ دہلی تشریف لائے تھے تو ان کے پاس چھ روپیہ موجود تھے اور ان کا خیال تھا کہ وہ چھ روپے میں جھانسی تک پہنچ جائیں گے۔ اس چھ روپیہ کی رقم میں سے دو روپیہ تو پریس والوں کو کمپوزنگ کے لیے دے دیا باقی چار روپیہ کھانے پر صرف ہو گئے۔ اب ان کے پاس نہ تو سرائے والے کو دینے کے لیے کچھ ہے اور نہ وہ جھانسی پہنچنے کے لیے کرایہ چنانچہ ان کو آٹھ روپیہ نذر کیے گئے۔ تو وہ سرائے کا حساب صاف کر کے جھانسی پہنچے۔ اس ڈراما میں میرا خیال ہے کہ ہم

دونوں بلکہ تینوں یوسف صاحب بھی گھاٹے میں نہ رہے۔ شیر خاں صاحب پانچ روز تک ہزار ہا روپیہ کے خیال سے خوش ہوتے رہے۔ میں نے صرف آٹھ روپیہ خرچ کر کے ایسی تفریح حاصل کی جو ہزار ہا روپیہ صرف کرنے پر بھی میسر نہیں ہوتی۔ اور جواب تک نا قابل فراموش ہے۔ اور یوسف صاحب مفت مُں مزے لیتے رہے۔ شیر خاں صاحب کا اس کے بعد کبھی نیاز حاصل نہیں ہوا۔ عرصہ ہوا سنا تھا کہ آپ نے مہاراجہ گوالیار کے خلاف اور ریاست گوالیار کے خلاف کئی مضامین لکھے۔ اس سیٹھ سے بات چیت ہو رہی تھی کہ آپ ریاست گوالیار میں مزید گفت وشنید کے لیے چلے گئے۔ ریاست گوالیار کی پولیس آپ کے خلاف تھی اس نے آپ کو گرفتار کر لیا۔ سیٹھ صاحب نے توہین کا مقدمہ چلایا آپ دو سال کے لیے بند ہوئے اور گوالیار جیل میں رہے۔

اخبار نویس ہوے

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اخبار نویسوں کی زندگی قابل رشک ہے اور دنیا ان کے لیے آنکھیں بچھائے بیٹھی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر کوئی پارٹی جلسہ یا میٹنگ ہو تو اخبار نویسوں کو دعوت دی جاتی ہے اور ان کو عزت اور احترام کے ساتھ قریب بٹھایا جاتا ہے۔ تاکہ یہ لوگ اپنے اخبار میں اس پارٹی یا جلسہ کی تعریف لکھیں۔ اور تصاویر چھاپیں اور سینما کے پاس بھی مفت دے جاتے ہیں مگر ذیل کے واقعات سے اندازہ ہو سکے گا کہ اخبار نویس اکثر ایک ہوا کی حیثیت رکھتے ہیں۔ خصوصاً اس صورت میں جب کہ اخبار نویس کو صاف گو، بے لاگ، نڈر اور خطرہ برداشت کرنے والا یقین کیا جائے۔

ایڈیٹر ''ریاست'' جعلی نوٹوں کے الزام میں لاہور سے سنٹرل جیل میں بھیجا گیا تو جیل میں داخل ہونے کے بعد اسے سب سے پہلے جیل کے دفتر میں لایا گیا۔ تاکہ نام پتہ حلیہ وغیرہ لکھا جائے جیل کے ایک اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ نے نام وغیرہ لکھنا شروع کیا۔ وہ پولیس سے آئے ہوئے میرے وارنٹوں کو بھی دیکھتا جاتا اور نام ولدیت اور سکونت بھی پوچھتا جاتا تھا جب وہ تعزیرات ہند کی لگائی گئی دفعہ والے خانے پر پہنچا تو اس خانہ میں چار دفعات تھیں۔ نوٹ بنانے کا سامان رکھنا۔ نوٹ بنانا اور نوٹ چلانا اور نوٹ قبضہ میں رکھنا اس اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ کو کچھ پتا نہ تھا کہ میں کون ہوں۔ اور معلوم ہوتا تھا کہ اس نے کبھی اخبارات بھی نہیں پڑھے۔ کیونکہ اخبارات پڑھتا تو اس کو مقدمہ کی کیفیت کا علم ہوتا۔ مقدمہ کی تفصیلات اخبارات میں چھپتی رہی تھیں۔ جب اس نے یہ دفعات دیکھیں تو اس نے مسکراتے ہوئے طنزاً کہا۔ اوہو! آپ کرنسی نوٹ بنانے کے جرم میں تشریف لائے ہیں۔ سنایئے سردار جی! کتنے نوٹ آپ نے بنائے؟ میں اس کم بخت کو کیا جواب دیتا۔ اور اگر کچھ کہتا بھی تو یہ میرا اعتبار کیوں کرتا میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا کہ اگر بنائے ہیں تو دو چار دس روپیہ مالیت کے نہ

بنائے ہوں گے یقیناً لاکھوں روپیہ کے بنائے ہوں گے ۔ جو بناتا ہے لاکھوں روپیہ کے بناتا ہے ۔ میرا یہ جواب سن کر میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ شرمندہ ہوا یا حیران ۔ بہر حال میرے منہ کی طرف دیکھنے لگا ۔ کیونکہ اس کو توقع تھی کہ دوسرے تمام ملزموں کی طرح میں بھی اس سے کہتا ہوں کہ نہیں حضور میں نے کہاں بنائے ہیں مجھے ویسے ہی رشتہ داروں نے پھنسا دیا ہے وغیرہ وہ میرے چہرے کی طرف غور سے دیکھنے لگا کہ اتنے میں جیل کے ایک اور افسر آ گئے ۔ جن سے میں پہلے بھی مل چکا تھا ۔ اور جو میرے تمام حالات سے واقف تھے ۔ یہ آئے تو انہوں نے حیرانی افسوس اور اخلاص اور محبت کے مجموعی جذبات کے ساتھ مجھ سے مصافحہ کیا اور کہا کہ میں نے اخبارات میں آپ کے مقدمات کے فیصلہ کے متعلق پڑھا تھا ۔ مجھے بہت ہی افسوس ہے کہ اس افسر کا پرتپاک اور ہمدردی سے ملنا تھا کہ حلیہ لکھنے والا اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ کچھ حیران سا ہو گیا ۔ آپ نے دوسرے افسر سے پوچھا کہ یہ کون ہیں تو ان افسر نے کہا آپ کو علم نہیں آپ سردار دیوان سنگھ ایڈیٹر ”ریاست“ ہیں جن کے مقدمہ کا تمام ہندوستان میں چرچا ہے ۔ یہ سن کر حلیہ لکھنے والے اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ نے بھی کچھ ہمدردی کا اظہار کیا ۔

اس مقدمہ سے پہلے میں ہمیشہ جیل میں اے کلاس میں رکھا جاتا تھا ۔ مگر اس مقدمہ میں مجسٹریٹ دیوان سکھانند نے مجھے بی کلاس دی (یہ مجسٹریٹ ملتان کے رہنے والے تھے ۔ ان کے چھوٹے بھائی دیوان شرڈراما نویس میرے کئی برس کے دوست تھے ۔ اور مقدمہ کے دوران بھی دہلی میں دوسرے چوتھے روز ملا کرتے تھے ۔ اور یہ واقعہ پرلطف ہے کہ ہائیکورٹ نے جب اس مقدمہ میں مجھے بری کیا اور رہائی کورٹ نے کھلی بحث سنتے ہوئے کھلی عدالت میں دیوان سکھانند کے انصاف کی بھی دھجیاں اڑائیں تو ہائیکورٹ کے فیصلہ کے بعد دیوان سکھانند نے جب آپ کرسمس کی چھٹیوں میں لاہور تشریف لے گئے تو میرے ایک عزیز دوست کو جو پنجاب میں سب جج تھے میری باعزت رہائی پر مبارکباد دی ۔ نام اور حلیہ وغیرہ لکھنے کے بعد مجھے بی

کلاس کے انچارج کے سپرد کیا گیا (اے اور بی کلاس میں فرق صرف یہ ہے کہ اے کلاس میں قیدی جیسے کپڑے چاہے اپنی مرضی سے پہن سکتا ہے مگر بی کلاس میں کپڑے چاہے اپنے گھر سے سلوائے جائیں سفید کھدر کے ہونے چاہئیں) بی کلاس کے وارڈ میں پہنچ کر میرے لیے چارپائی تپائی اور الماری وغیرہ کا انتظام کیا گیا جو بی کلاس کے ہر قیدی کو دی جاتی ہے۔

جیل میں پہنچنے کے بعد دو یا تین روز ہوئے تھے کہ میری ڈیوٹی سپرنٹنڈنٹ نے جیل کے پریس میں لگائی۔ جیل میں ہر قیدی کو بشرطیکہ قید محض نہ ہو یا نظر بندی نہ ہو کام کرنا پڑتا ہے اور یہ کام اس کی پوزیشن کے مطابق دیا جاتا ہے میں پریس انچارج کے پاس گیا۔ پریس کے انچارج نے میری ڈیوٹی بطور کلرک ایک سیکشن میں لگائی۔ جہاں کپ پٹواریوں وغیرہ کے فارم چھپتے ہیں میرے جیل میں جانے کے بعد دو دن کے اندر تمام سرکاری ملازموں اور قیدیوں کو میرے جیل میں پہنچنے کا علم ہو چکا تھا۔ میں جب اس سکیشن میں پہنچا تو اس سیکشن کے انچارج (جو سرکاری ملازم تھے ان کا نام مجھے یاد نہیں رہا۔ لوگ ان کو شاہ جی کہتے تھے) نے میرے لیے ایک چھوٹا سا بنچ خالی کر دیا اور اس پر بوریا اور ایک چادر بچھوا دی اور کہا کہ تشریف رکھیے۔ کئی گھنٹہ میں وہاں بیٹھا رہا۔ تو میں نے عرض کیا۔ کہ کوئی کام بتائیے۔ اس کے جواب میں شاہ جی نے فرمایا "نہیں کوئی کام نہیں کام ہو رہا ہے۔ آپ آرام کیجیے" یہ تمام دن میرا اسی طرح بیٹھے گزر گیا۔ اگلے روز گیا تو پھر وہی کیفیت شاہ صاحب بہت تپاک سے ملے بہت خاطر کرتے۔ گرمیوں کا زمانہ تھا۔ دن میں کئی بار پانی کے لیے پوچھتے اگر میں کہتا ہاں تو میرے لیے برف کا پانی منگایا جاتا۔ کوئی کام نہیں دن بھر اس گدی دار بنچ پر بیٹھا رہتا۔ میں تنگ آ گیا کہ وقت کس طرح گزرے آخر تیسرے روز جب میں اس پریس میں کلرکی کرنے کے لیے گیا تو ساتھ ایک کتاب لے گیا۔ دن بھر یہ کتاب پڑھتا رہا۔ وہاں کے تمام لوگ مصروف ایک لمحہ کے لیے بھی آرام نہیں مگر میں اس گدی دار بنچ پر

مہنت بنا بیٹھا کتاب پڑھ رہا ہوں۔ تین چار روز گزرے تو میں نے ایک دوسرے قیدی کو جو اس سیکشن میں کام کرتا تھا راز میں لے لیا۔ اور پوچھا۔ کہ یہ شاہ صاحب مجھ سے کوئی کام کیوں نہیں کرواتے۔ ویسے بہت شریف ہیں۔ میری آسائش کا بہت خیال کرتے ہیں۔ بار بار ٹھنڈے پانی کے لیے پوچھتے ہیں بجلی کا پنکھا چل رہا ہے اور مجھے کوئی تکلیف نہیں مجھے کوئی کام نہیں بتایا جاتا۔ میرے اس پوچھنے پر اس قیدی نے بتایا۔

''شاہ صاحب آپ کو بہت بڑا خطرناک آدمی سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ آپ کو یہاں کے حالات کا علم ہو گیا اور آپ جیل سے چلے گئے تو اپنے اخبار میں ان کی کمزوریوں کو بے نقاب کریں گے۔ اور پھر شاید یہ موقوف ہو جائیں۔ اس لیے یہ نہیں چاہتے کہ آپ کو یہاں کے کسی راز کا علم ہو۔ اور یہ اسی کوشش میں ہیں کہ آپ کسی دوسرے سیکشن میں تبدیل کیا جائے''۔

یہ جواب سن کر میں حیران کہ کیا کروں۔ شاہ صاحب سے کچھ کہہ نہیں سکتا کیونکہ اس قیدی نے مجھ پر اعتماد کرتے ہوئے شاہ صاحب کے خیال سے آگاہ کیا۔ کتاب کہاں تک تمام دن پڑھتا رہوں بغیر کام کے وقت کا گزرنا مصیبت۔ اور جب شاہ صاحب سے کام کے لیے کہتا ہوں تو ارشاد ہوتا ہے کہ تشریف رکھیے آرام کیجیے کیا پیاس تو نہیں لگی''۔

ایک ہفتہ کے قریب اس سیکشن میں گزرا ہو گا۔ کہ شاہ صاحب نے پریس کے انچارج کو کانفڈنشل رپورٹ کی جس کا مطلب یہ تھا کہ دیوان سنگھ اس کے سیکشن میں فالتو رہے۔ کام تھوڑا ہے اور آدمی زیادہ ہیں۔ اس لیے دیوان سنگھ کو کسی دوسرے سیکشن میں تبدیل کر دیا جائے۔ اس کانفیڈنشل رپورٹ کا نتیجہ یہ نکلا کہ شاہ صاحب کے پاس حکم پہنچا دیوان سنگھ کو دوسرے سیکشن جہاں انگریزی کے نام چھپتے ہیں بھیج دیا جائے۔ چنانچہ میں دوسرے سیکشن میں بھیج دیا گیا۔ اس سیکشن میں پہنچا تو وہاں بھی بہت آو

بھگت ہوئی۔ ایک چھوٹی سی بنچ پر اسی طرح سے گدی بچھا دی گئی اور ارشاد ہوا کہ آرام کرو۔ میں اس آرام سے تنگ ہوں مگر کوئی کام نہیں دیا جاتا۔ تمام دن کتاب پڑھتے پڑھتے تنگ آ گیا جب کام کے لیے کہتا ہوں تو وہی ارشاد ہوتا ہے کہ آرام کیجیے۔ کوئی کام نہیں۔ آپ تو بہت اچھے اور لائق ہیں۔ آپ سے کام لیتے ہوئے شرم محسوس ہوتی ہے۔ گرمی ہے پانی پئیں گے۔ پیاس تو نہیں لگی۔ میں اس خاطر تواضع سے تنگ آ گیا۔ بغیر کام وقت نہیں گزرتا جب کام کے لیے کہتا ہوں تو انچارج صاحب مسکرا مسکرا کر باتیں کرتے ہیں اور میری دلچسپی کے لیے دوسری باتیں شروع کر دی جاتی ہیں۔

دس روز کے قریب میں اس سیکشن میں بھی جاتا رہا۔ اس عرصہ کے بعد اس سیکشن کے انچارج نے بھی رپورٹ کی۔ کہ اس کے سیکشن میں کام کم ہے ار آدمی زیادہ ہیں۔ نئے آدمی یعنی دیوان سنگھ کو دوسرے سیکشن میں بھیج دیا جائے۔ چنانچہ ان کی رپورٹ پر میں جلد سازوں کے سیکشن میں چلا گیا۔ جس روز مجھے اس سیکشن سے دوسرے سیکشن میں تبدیل کرنے کا حکم ہوا تو جمع کا دن تھا۔ اجمعہ کو میں صبح ہی جلد سازوں کے سیکشن میں بھیج دیا گیا۔ وہاں بھی میری خاطر تواضع کی گئی۔ انچارج صاحب نے بجلے کے نیچے میرے لیے گدی دار بنچ بچھوا دی۔ کتاب میرے ہاتھ میں تھی میں جب بیٹھا تو میں نے عرض کیا کہ کیا کام کروں۔ اس کے جواب میں سیکشن کے انچارج نے فرمایا:

''میرے دل میں آپ کے لیے بڑی عزت ہے۔ آپ نے تو ملک کے لیے بہت تکلیفیں برداشت کی ہیں اور زندگی بھر مصائب کا مقابلہ کیا۔ آپ کا تو نیاز حاصل کرنا ہی خوش نصیبی ہ۔ آپ آرام کیجیے اگر فرمائیے تو پڑھنے کے لیے میں آپ کو اور کتابیں دوں کیا ٹھنڈا پانی پیجیے گا۔ یہ انچارج بھی مسلمان تھے پریس میں مسلمان افسروں کو دو بجے جمعہ کی نماز کے لیے چھٹی ہو جایا کرتی تھی۔ اور پھر اس کے بعد وہ واپس دفتر نہیں آتے تھے یعنی اس روز ان کو آدھے دن کی چھٹی ہوتی تھی۔ دو بجے کے قریب یہ صاحب آداب عرض کہہ کر نماز پڑھنے کے لیے چلے گئے۔ اور آپ نے فرمایا کہ اب تو

کل نیاز حاصل ہوگا۔ سنیچر کو میری طبیعت ٹھیک نہ تھی اس لیے میں پریس میں نہیں گیا۔ اتوار کو پریس بند تھا۔ پیر یعنی سوموار کو سپرنٹنڈنٹ جیل تمام قیدیوں کو دیکھنے کے لیے ہر وارڈ میں تشریف لاتے ارو ہر قیدی کے پاس جاتے۔ تاکہ اگر کوئی تکلیف یا شکایت ہو تو بتائی جائے۔ سپرنٹنڈنٹ کے اس دورہ کو پریڈ کہا جاتا ہے سوموار کو صبح سپرنٹنڈنٹ جیل میجر شاہ (یہ بزرگ بہت شریف' دیانت دار' نیک اور مذہبی خیال کے بزرگ تھے۔ قادیان کی احمدی جماعت کے پیشوا کے عزیزوں میں سے تھے۔ قیدیوں کے بہت ہمدرد تھے مگر ان کی دماغی کیفیت کچھ ایسی تھی کہ جسے ومزیکل کہا جا سکتا ہے۔ یعنی خیال آ جائے تو قیدی کے لیے سب کچھ کر دیں اور خیال نہ آئے تو قیدی کی کسی خواہش کی پرواہ نہ کریں۔ یہ ہمیشہ ہی میرے احساس کا خیال کرتے رہے) "پریڈ" میں تشریف لائے تو میں نے ان سے کہا کہ اگر پریس کے بجائے میری ڈیوٹی اور کسی جگہ لگا دی جائے تو اچھا ہو۔ میجر شاہ نے فوراً حکم دیا کہ میں اپنی رہائش والی جگہ پر ہی رہوں۔ اور جو کام دینا ہو یہاں ہی دے دیا جائے۔

میں سوموار کو پریس میں نہ گیا اور اپنی رہائش والے وارڈ ہی میں رہا۔ مگر پریس کے دوسرے لوگوں سے معلوم ہوا...... کہ سوموار کو جب جلد سازی والے سیکشن کے انچارج نے سنا کہ میں اب پریس سے تبدیل کر دیا گیا ہوں تو اپنے ماتحت سے کہا:

"خدا کا شکر ہے کہ ایڈیٹر "ریاست" صاحب پریس سے چلے گئے۔ میں نے جمعہ کی نماز کے بعد دعا کی تھی کہ یا اللہ ایڈیٹر "ریاست" کو کسی دوسرے سیکشن میں بھیجا جائے۔ مجھے خطرہ تھا۔ کہ اگر یہاں کے تمام رازوں سے واقف ہو جاتا تو نہ معلوم میرے لیے کیا مصائب پیدا ہو جاتے۔ کیونکہ یہ شخص جس کے پیچھے پڑ جائے نہ صرف موقوف بلکہ قید کرانے تک جاتا ہے اور کئی بڑے سرکاری افسروں کے لیے مصیبت کا باعث ثابت ہو چکا ہے۔"

پریس سے آنے کے بعد میں کئی ماہ جیل میں رہا۔ وہاں میں نے کوئی کام نہیں کیا۔

کاغذات کے میرے ذمہ یہ کام تھا کہ میں کاغذ نتھی کرنے والے ٹیگ تیار کروں ۔
بطور آرٹ اور تفریح کے میں نے یہ کام سیکھ لیا۔ اور بہت اچھے ٹیگ بنالیتا تھا۔ مگر کام
دینے والا شخص جیسا کام لاتا تھا ویسا ہی بغیر کیے اٹھا لے جاتا تھا۔ مگر کاغذات پر درج
ہوتا تھا کہ میں نے بارہ سو ٹیگ تیار کیے جیل والوں کی اس مہربانی کو گو میں دل سے
ناپسند کرتا رہا۔ کیونکہ یہ لوگ مجھے ہوا سمجھتے ہوئے مجھ سے کام نہ لیتے ۔ مگر میں پھر بھی
ان کی اس مہربانی کا شکر گزار رہوں۔

☆☆☆

جرنلزم کا روشن پہلو

میرے چچا سردار میوہ سنگھ کھنہ کے داماد لالہ ہنس راج ہیں یہ گوجرانوالہ میں لوہے کا کاروبار کرتے ہیں ۔ ان کے کارخانے میں آئرن سیف لوہے کی الماریاں' لوہے کی کرسیاں اور لوہے کا دوسرا سامان تیار ہوتا تھا۔ لالہ ہنس راج اپنے کاروبار کے سلسلہ میں ریاست اندور گئے ۔ اور وہاں سے ایک سوداگر سے جو بوہرہ قوم میں سے تھے انہوں نے دو سو آہنی کرسیوں کا آرڈر لیا ۔ جب اس دورہ سے واپس ہوئے تو انہوں نے سوچا کہ اگر دو سو کرسیاں بذریعہ ریل بھیجی گئیں ان کی بلٹی بذریعہ وی پی کی گئی اور اس سوداگر نے یہ وی پی واپس کر دیا تو نتیجہ یہ ہو گا کہ یہ دو سو کرسیاں اندور سے پھر واپس گوجرانوالہ منگانی پڑیں گی ان کے بھیجنے اور واپس منگانے کا خرچ ادا کرنا پڑے گا اور کرسیاں الگ خراب ہوں گی ۔ اس لیے بہتر ہے کہ کرسیاں فی الحال صرف دس بھیجی جائیں ۔ تاکہ نقصان ہو تو زیادہ نہ ہو۔ جب دو سو کرسیوں کی قیمت وصول ہو جائے تو پھر ایک سو نوے کرسیاں بغیر وی پی معمولی بلٹی کے ذریعہ بھیج دی جائیں چنانچہ آپ نے دس کرسیاں اندور ریلوے سٹیشن کے لیے بلٹی کروا دیں ۔ اور دو سو کرسیوں کی قیمت کا وی پی اس سوداگر کے نام بھیج دیا ۔ اس سوداگر نے دو سو کرسیوں کا وی پی وصول کر لیا اور اس نے کرسیاں لینے کے لیے جب اندور ریلوے سٹیشن پر آدمی بھیجا تو وہاں دو سو کی جگہ دس کرسیاں تھیں چنانچہ اس سوداگر نے دس کرسیاں تو سٹیشن سے منگوا لیں ۔ اور فوراً ریاست اندور کی پولیس کو رپورٹ کی کہ اس کے ساتھ دھوکا ہوا ہے ۔ دس کرسیاں بھیج کر دو سو کرسیوں کی قیمت بذریعہ وی پی وصول کر لی گئی ہے ۔ اور ساتھ لالہ ہنس راج کو بھی لکھا کہ آپ پر فوجداری مقدمہ کیا گیا ہے کیونکہ آپ نے دھوکا کیا ہے۔

لالہ ہنس راج کی نیت گو خراب نہ تھی ۔ اور انہوں نے نقصان سے بچنے کے لیے ایسا کیا تھا مگر جہاں تک قانون کا سوال ہے مقدمہ صاف تھا اور جرم ثابت ۔ لالہ ہنس

راج کو جب مقدمہ کی اطلاع ہوئی تو وہ پریشان ہوئے اور اس سوچ میں پڑ گئے کہ اب بقایا ایک سو نوے کرسیاں بھی بھیجی جائیں یا نہیں انہوں نے وکیلوں سے مشورہ کیا۔ وکیلوں سے مشورے مقدمہ کو پیچدار بنانے کے حق میں ہوتے ہیں۔ ان کو بتایا گیا کہ اگر اب انہوں نے بقایا کرسیاں بھیجیں تو مستغیث کو جرم کا مزید ثبوت مل جائے گا۔ مقدمہ کے دوران میں کرسیاں اب نہ بھیجنی چاہئیں۔ چنانچہ لالہ ہنس راج نے وکیلوں کی اس رائے پر عمل کیا اور فیصلہ کیا کہ مقدمہ کے بعد کرسیاں بھیجی جائیں۔

ادھر اندور پولیس نے مقدمہ دھوکہ کے جرم میں اندراج رجسٹر کیا۔ قانون حوالگی یعنی ایکسٹراڈکشن ایکٹ کے ماتحت وارنٹ گرفتاری ایجنٹ گورنر جنرل ریاست ہائے سنٹرل انڈیا کو بھیجے گئے۔ ایجنٹ گورنر جنرل نے وارنٹوں پر تصدیق کر کے یہ وارنٹ پنجاب گورنمنٹ کو بھیجے۔ کہ ملزم کو گرفتار کر کے ریاست اندور کے حوالے کیا جائے۔ لالہ ہنس راج کے تعلقات گوجرانوالہ پولیس کے کئی اصحاب کے ساتھ ذاتی دوستانہ تھے۔ وارنٹ جب گوجرانوالہ پہنچے تو ان پر پولیس سے لکھوا دیا گیا کہ ملزم موجود نہیں اور کچھ پتہ نہیں کہ کہاں ہے۔ اس کے بعد وارنٹ پھر آئے پھر ایسا ہی لکھا گیا۔ اس عرصہ میں لالہ ہنس راج نے ہائی کورٹ میں درخواست کی کہ ان کو ریاست اندور کے حوالے نہ کیا جائے۔ ہائیکورٹ نے دخل دینے سے انکار کر دیا کیونکہ ایکسٹراڈکشن ایکٹ کے مطابق پولیٹکل ایجنٹوں کے اختیار میں تھا کہ وہ انگریزی علاقہ سے جس ملزم کو چاہیں منگا لیں کوئی عدالت اس میں دخل نہیں دے سکتی تھی۔

لالہ ہنس راج کے وارنٹ جب تین بار واپس چلے گئے تو ریاست اندور کے انسپکٹر جنرل پولیس نے محسوس کیا کہ وارنٹ گوجرانوالہ پولیس سے مل ملا کر واپس کیے جاتے ہیں۔ اس نے اپنا ایک سب انسپکٹر اس کام کے لیے مقرر کیا اور وارنٹ دستی دے کر مسلزم کی گرفتاری کے لیے گوجرانوالہ بھیجا۔ سب انسپکٹر جب گوجرانوالہ پہنچا تو وہاں ایک مزید حماقت ہوگئی۔ اس خیال سے کہ اندور پولیس کا کوئی شخص دوبارہ گوجرانوالہ نہ

آئے اس سب انسپکٹر کے پیچھے غنڈے لگا دیے گئے تاکہ وہ اسکو تنگ کریں ۔ ان غنڈوں نے سب انسپکٹر کو مارا بھی ۔ یہ سب انسپکٹر جب واپس اندور پہنچا تو اس نے سب انسپکٹر جنرل پولیس کو تمام حالات بتائے انسپکٹر جنرل پولیس کو قدرتی طور پر یہ حالات سن کر غصہ آنا چاہیے تھا ۔ اس نے تمام واقعہ کو رپورٹ ریاست کے اعلیٰ افسروں کو کی ۔ انہوں نے یہ رپورٹ ایجنٹ گورنر جنرل ریاست ہائے سنٹرل انڈیا کو بھیجی اور معاملہ نازک سے نازک تر صورت اختیار کرتا چلا گیا کیونکہ ریذیڈنسی نے محسوس کیا کہ نہ صرف اس کے حکم اور وارنٹوں کی تعمیل نہیں کی گئی بلکہ سب انسپکٹر کو مارا بھی گیا ۔ اور اس کی ہتک کی گئی ۔ چنانچہ ایجنٹ گورنر جنرل نے نہایت سختی کے ساتھ تمام واقعات کے متعلق پنجاب گورنمنٹ کو لکھا ۔

جب حالات یہاں تک نازک ہو گئے تو مسٹر ہنس راج نے فیصلہ کیا کہ وہ یا تو افغانستان چلا جائے یا نیپال کو تاکہ ریاست اندور میں وہاں کی پولیس کے انتقام کا شکار نہ ہو اس نے گوجرانوالہ سے ہمیشہ کے لیے جانے کی تیاری کر لی ۔ اس کے کئی بچے بیوی اور ضعیف والدہ گھر میں ایک کہرام سا پیدا ہو گیا ۔ ان حالات کی اطلاع جب ہنس راج نے اپنے خسر یعنی میرے چچا سردار میوہ سنگھ کو حافظ آباد بھیجی تو وہ بھی پریشانی کے عالم میں اپنے بیٹے سردار ہوشیار سنگھ کے ساتھ گوجرانوالہ پہنچے ۔ کوئی صورت نظر نہ آتی تھی ۔ کہ اس مصیبت سے چھٹکارا کیوں کر ہو ۔ صلاح مشورہ ہوتا رہا ۔ تو میرے چچا سردار میوہ سنگھ کو خیال آیا کہ دیوان سنگھ کا اخبار ریاستوں کے متعلق ہے ممکن ہے اس کا اندور میں کسی افسر سے کوئی تعلق ہو اور وہ مفید ہو سکے ۔ مشورہ کرنے کے بعد انہوں ں نے فیصلہ کیا کہ دیوان سنگھ سے ملنا چاہیے ۔ چنانچہ سردار ہوشیار سنگھ اور مسٹر ہنس راج دونوں ہی اسی شام گوجرانووالہ سے روانہ ہو کر دہلی ایڈیٹر ''ریاست]' کے پاس پہنچے ۔ یہاں پہنچ کر انہوں نے مجھے تمام حالات بتائے تو میں نے ان سے وعدہ کیا کہ جو کچھ بھی مجھ سے ہو سکے گا میں کروں گا ۔ اس زمانہ میں مرحوم لالہ دینا ناتھ

ایڈیٹر ''دیش'' و ''ہندوستان'' لاہور دہلی میں مقیم تھے۔ یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ وہ بھی تشریف لائے۔ وہ بہت جہاندیدہ اور تجربہ کار تھے۔ جب انہوں نے تمام حالات سنے تو وہ مجھے الگ لے گئے اور انہوں نے کہا کہ یہ رشتہ داری کا معاملہ ہے۔ اگر تو لالہ ہنس راج اس مقدمہ سے نکل گئے تو یہ رشتہ دار کہیں گے کہ معاملہ بالکل معمولی تھا۔ اور اگر ہنس راج جی کو نقصان پہنچا تو یہی کہیں گے کہ مقدمہ تو کچھ نہ تھا مگر دیوان سنگھ نے نقصان پہنچایا۔ یہ رشتہ دار ہمیشہ تاریک پہلو دیکھتے ہیں۔ حالت خطرناک ہے اور میں اس میں کوئی حصہ نہ لوں لالہ دینا ناتھ کی دلیل معقول تھی۔ ان کی رائے سننے کے بعد میں سوچنے لگا کہ کیا کرنا چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ لالہ ہنس راج کو نقصان پہنچے اور یہ لوگ مجھے نقصان پہنچانے کا ذمہ دار قرار دیں اور میں اس روز اسی کش مکش میں تھا کہ سوچتا رہا۔ کہ کیا کرنا چاہیے۔ ادھر لالہ ہنس راج اور سردار ہوشیار سنگھ دونوں بے چین ہنس راج جی کے مستقبل کا سوال کہ وہ آئندہ زندگی کے دن کہاں بسر کریں گے جہاں خہ گرفتار نہ کیے جاسکیں۔ بہت پریشانی میں جب میں نے ان کو پریشان دیکھا تو فیصلہ کیا کہ نتیجہ چاہیے کچھ بھی ہو مجھے قدم اٹھانا چاہیے چنانچہ میں نے یہ فیصلہ کیا کہ بعد اندور سرالیس این باپنا وزیراعظم کو تار بھیجا کہ میں اگلے روز بعد دوپہر اندور پہنچ رہا ہوں اور رات کو میں بی بی اینڈ سی آئی ایکسپریس میں لالہ ہنس راج اور سردار ہوشیار سنگھ دونوں کے ساتھ اندور روانہ ہو گیا۔ ہم تینوں اگلے روز بعد دوپہر اندور پہنچے۔ اندور سٹیشن پر ہمارے لیے سرکاری موٹر اور مہمان خانہ کے دو ملازم موجود تھے۔ ہم تینوں اس کار میں سوار ہو کر ایک کوٹی میں پہنچے جو کہ مہمان خانہ تھی۔ اس مہمان خانہ میں پہنچتے ہی گیسٹ ہاؤس کے انچارج مجھ سے ملے تو میں نے ان سے کہا کہ میں رات کو گاڑی سے واپس دہلی جانا چاہتا ہوں۔ آپ ابھی باپنا صاحب کے پاس چلے جائیے اور ان سے پوچھیے کہ میں ان سے کس وقت مل سکتا ہوں میں نے جب یہ کہا تو گیسٹ ہاؤس کا انچارج میرے منہ کی طرف حیرانی سے دیکھنے لگ گیا۔ اور اس نے کہا آپ اتنی جلدی

دیوان صاحب سے نہیں مل سکتے۔ اس سے پہلے لوگ آٹھ آٹھ دس دس دن سے منتظر بیٹھے ہیں ان کو موقع نہیں مل سکا یہ ممکن ہی نہیں کیونکہ آپ دو چار روز میں بھی مل سکیں۔

میں نے جب گیسٹ ہاؤس کے انچارج کا یہ جواب سنا تو میں نے اس سے کہا کہ اگر باپنا صاحب جلدی نہیں مل سکتے تو میں لازمی طور پر رات کو دو بجے کی گاڑی سے واپس دہلی چلا جاؤں گا۔ میرے کام کا ہرج ہوگا۔ بغیر باپنا صاحب کو اطلاع دیے واپس جانا مناسب نہیں آپ کا فرض ہے کہ آپ میرا یہ پیغام باپنا صاحب کو پہنچا دیں۔ ورنہ میں اگر رات کو چلا گیا تو اس کی ذمہ داری آپ پر ہوگی۔ ریاستوں کے ملازم غلام ابن غلام ان کے اندر جرات کی کمی۔ یہ بچارا کرے بھی تو کیا مجھے کچھ جواب نہیں دے سکتا۔ اور نہ اس میں جرات ہے کہ باپنا صاحب کو اطلاع دے اس نے اپنے افسر یعنی سپرنٹنڈنٹ محکمہ مہمان داری کو ٹیلی فون کیا۔ وہ تشریف لائے میں نے ان سے یہی کچھ کہا کہ میں رات کو دو بجے کی گاڑی سے واپس جانا چاہتا ہوں انہوں نے بتایا کہ وزیراعظم کی خدمت میں حاضر ہونا ایک ہفتہ سے پہلے ممکن نہ ہوگا۔ کیونکہ کئی روز سے لوگ منتظر بیٹھے ہیں۔ میں نے ان سے کہا کہ باپنا صاحب کو اطلاع کر دیجیے کہ اگر پھر بھی ان کا ملنا جلدی ممکن نہ ہوا تو میں واپس چلا جاؤں گا۔ میرے لیے زیادہ عرصہ تک ٹھہرنا ممکن نہ ہوگا۔ ان بچاروں مںں بھی زیادہ جرات نہ تھی مگر یہ مجبور تھے یہ سہمے ہوئے باپنا صاحب کے پاس اندور کلب میں گئے۔ باپنا صاحب وہاں ٹینس کھیل رہے تھے۔ سپرنٹنڈنٹ نے ڈرتے ڈرتے ہاتھ جوڑ کر وہ کچھ کہا جو میں نے انسے کہا تھا۔ باپنا صاحب نے سن کر کہا سردار دیوان سنگھ سے جا کر کہیے کہ وہ دہلی سے ابھی آئے ہیں تھکے ہوئے ہوں گے مجھے ملنے میں کوئی اعتراض نہٰں وہ ابھی آ کر مجھ سے مل سکتے ہیں مگر بہتر ہو کہ وہ آرام کریں میں صبح آٹھ بجے ان کے پاس کار بھیج دوں گا۔ وہ آٹھ بجے مجھ سے مل کر دو بجے بعد دوپہر کی گاڑی واپس تشریف لے جائیں۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب واپس تشریف لائے انہوں نے باپنا صاحب کا جواب سنایا تو میں

نے کہا کہ بہت بہتر میں صبح ان سے مل کر دوپہر کو واپس چلا جاؤں گا۔ رات کو ہم نے گیسٹ ہاؤس میں آرام کیا۔ ریاستوں کے مہمان خانے تمام ہندوستان میں مشہور تھے۔ اچھے سے اچھے کھانے ہاتھ باندھے ہوئے ملازم شاندار عمارت۔ بہترین قسم کا فرنیچر اور جو طلب کرو حاضر ہوشیار سنگھ مجھ سے عمر میں کم ہیں میں ان کے حقیقی بھائیوں کی طرح محبت کرتا ہوں رات کو میں نے سنجیدہ صورت بنا کر مذاقاً ہوشیار سنگھ سے پوچھا کہ دیکھو پانچ پانچ سو روپیہ کا ایک پلنگ ہے اور ہزار ہزار روپیہ کا صوفہ سیٹ۔ کئی ملازم کھانے پینے کا سامان بہت اعلیٰ شاندار عمات سواری کے لیے موٹر اگر اس تمام سامان کے ساتھ آپ کو دو تین دو روپیہ ماہوار جیب خرچ کے لیے دے دیا جائے تو اس کوٹھ میں کتنے عرصہ کے لیے تم نظر بند ہونے کے لیے تیار ہو۔ ہوشیار سنگھ سوچنے لگ گیا مگر اس نے محسوس کر لیا یک میں تفریحاً مذاق کر رہا ہوں۔ اس نے جواب دیا کہ فی الحال چھ ماہ کا ایگریمنٹ تو ریاست اندور کے ساتھ کرنے کو تیار ہوں۔ چھ ماہ کے بعد اس ایگریمنٹ میں مزید تجدید کر دی جائے گی۔

اگلے روز ہم صبح جاگے اور سات بجے تک غسل کر کے اور کپڑے پہن کر تیار ہو گئے۔ پونے آٹھ بجے باپنا صاحب کی موٹر آئی اس میں ہم تینوں آپ کی کوٹھی میں پہنچے یہ کوٹھی دو منزل تھی۔ ایک ویٹنگ روم نیچے ایک اوپر نیچے کے ویٹنگ روم میں ایک درجن سے زیادہ لوگ بہت اچھے اچھے درباری چوغے پہنے اور مختلف قسم کی پگڑیاں پہنے ملنے کے منتظر تھے۔ ہم بھ ان میں جا کر بیٹھ گئے میں نے اپ: نا وزیٹنگ کارڈ چوب دار کو دیا۔ وہ وزیٹنگ کارڈ لے کر اوپر گیا اوپر کے چوب دار نے یہ کارڈ باپنا صاحب کی میز پر رکھا۔ جہاں کہ اور کئی کارڈ رکھے تھے باپنا صاحب نے جب کارڈ دیکھا تو چوب دار کو حکم دیا کہ ایک صاحب سردار دیوان سنگھ پنجابی ہیں ان کو لے آؤ۔ یہ چوب دار نیچے کے ویٹنگ روم میں آیا اور اس نے مجھے اپنے ساتھ لے جانے کے بعد اوپر کے ویٹنگ روم میں بٹھا دیا۔ اور باپنا صاحب کو اطلاع کی کہ اوپر کے ویٹنگ روم

میں آگئے ہیں میں اوپر کے ویٹنگ روم میں اپنے ساتھ ہنس راج کو بھی لے گیا تھا۔
باپنا صاحب نے جب چوبدار سے میرے اوپر کے ویٹنگ روم میں آنے کے متعلق سنا تو کہا کہ بلاؤ۔ میں نے ہنس راج جی سے کہا کہ آپ یہاں ہی بیٹھی جب تک میں آپ کو بلا نہ بھیجوں میں باپنا صاحب کے کمرے میں گیا۔ باپنا صاحب اخلاقاً کھڑے ہو گئے مصافحہ کیا۔ بیٹھ گئے باتیں شروع ہوئیں دہلی کا کیا حال ہے صحت کیسی ہے موسم کیسا ہے وغیرہ۔ جب چند منٹ رسمی گفتگو ہو چکی تو میں ں ے کہا کہ سلام دہقانی خالی از مطلب نیست کے مصداق میں ایک غرض کے لیے آیا ہوں۔ اگر آپ اجازت دیجیے تو میرے ساتھ ایک اور صاحب باہر بیٹھے ہیں ان کو بھی بلا لوں۔ آپ نے کہا ضرور ضرور آپ نے گھنٹی بجائی اور چوب دار حاضر ہوا تو اسے حکم دیا کہ جو صاحب اوپر کے ویٹنگ روم میں تشریف رکھتے ہیں اور سردار صاحب کے ساتھ آئے ہیں نا کو لے آؤ۔ ہنسراج صاحب ھی باپنا صاحب کے کمرہ میں اندر آ گئے۔ باپنا صاحب سے ہاتھ ملایا اور وہ بیٹھ گئے۔ میں نے اب ذکر شروع کیا کہ یہ صاحب لالہ ہنس راج ہیں اور میرے چچا کے داماد ہیں یہ وہی صاحب ہیں جن کے خلاف آپ کی ریاست میں دھوکا کا مقدمہ چل رہا ہے اور جنہوں نے نے آپ کے سب انسپکٹر کی توہین کی ہے اور اسے مارا میں نے تمام کے تمام حالات من وعن سچ سچ بتانے کے بعد کہال کہ یہ آپ کے حوالہ ہیں۔ ان کو یا تو جیل بھیج دیجیے۔ یا میرے ساتھ واپس دہلی۔ دونوں میں سے جو صورت پسند ہو کیجیے مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ انہوں ں ے آپ کو ریذیڈنٹ کے وارنٹوں کے سپرد تو نہ کیا مگر میں ان کو آپ کے سپرد کرتا ہوں۔

باپنا صاحب ریاستوں کے وزرا میں سے غیر معمولی شریف اور نیک دل شخصیت تھے۔ ان کی شرافت ان کی زندگی میں کئی بار ان کے لیے مہنگی ثابت ہوئی۔ مگر ان کے شعار اور کریکٹر میں تبدیلی نہیں ہوئی۔

ان کو مقدمہ کے تمام حالات کا علم تھا۔ کیونکہ ان ے ذریعہ ہی سے وارنٹ کئی بار

ریذیڈنٹ کے پاس گئے تھے اور آئے آپ نے فرمایا کہ ہنس راج جی کو فوراً ریلوے سٹیشن پر انگریزی جورسڈکشن میں بھیج دیا جائے تا کہ ریاست کی حدود میں ریاست کا کوئی پولیس شخص شرارت نہ کر سکے۔ ہنسراج جی کو موٹر میں ریلوے سٹیشن بھیج دیا گیا۔ اس کے بعد آپنے میونسپلٹی کے پریذیڈنٹ کو فون کر کے طلب فرمایا (یہ صاحب بیرسٹر تھے اور نا کا نام غالباً عزیز خاں یا عبدالعزیز خاں تھا) اوران کو سمجھایا کہ کیا کرنا چاہیے مین اور پریذیڈنٹ میونسپل کمیٹی موٹر میں ان بوہروں ے پاس گئے جنہوں نے مقدمہ دائر کیا تھا۔ پریذیڈنٹ نے ان کو وزیر اعظم صاحب کا پیغام یا۔ بوہرے دبنیا قسم کے سوداگر ہوتے ہیں جو ایک ایک پیسہ کا خیال رکھیں۔ انہوں ں ے بتایا کہ مقدمہ میں ان کا ڈیڑھ سو روپیہ خرچ آچکا ہے میں نے کہا اس کا خیال نہ کیجیے یہ ڈیڑھ سو روپیہ میں دوں گا (بات چیت کرنے کے بعد ہم دونوں بوہرہ مستغیث کو لے کر ہائیکورٹ گئے وہاں مستغیث کی طرف سے درخواست لکھی گئی۔ کہ مقدمہ قابل راضی نامہ ہے اور یہ مقدمہ واپس لینا چاہتے ہیں۔ اس درخواست کو لے کر ہم چیف جسٹس کے پاس گئے۔ وہ ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ کیونکہ باپنا صاحب نے ان کو بھی کہہ دیا تھا۔ چنانچہ مستغیث کی درخواست پر چیف جسٹس صاحب نے حکم دیا کہ چونکہ ملزم اور مستغیث میں صلح ہو چکی ہے اور مستغیث مقدمہ واپس لینا چاہتا ہے عدالت کو اس میں کوئی اعتراض نہیں ملزم مقدمہ میں ڈسچارج کیا جائیے۔ اور ایجنٹ گورنر ریاست ہائے سنٹرل انڈیا کو وارنٹوں کے منسوخ کرنے کے لیے لکھا جائے یہ تمام کارروائی بارہ بجے سے پہلے پہلے ختم ہوگئی اور میں نے ڈیڑھ سو روپیہ کا خرچہ بوہرہ سوداگر کو دینا چہاا اور بہت زور لگایا مگر پریذیڈنٹ میونسپلٹی نے نہ دینے دیا۔ کارر ائی ختم ہونے کے بعد میں باپنا صاحب کی خدمت میں شکریہ ادا کرنے کے لیے حاضر ہوا وہ مقدمہ کے ختم ہونے پر بہت خوش ہوئے۔ میں نے ان سے دوستانہ التجا کے ساتھ درخواست کی کہ بوہرہ کے سوداگر کا خرچہ مجھے دینے کی اجازت دی جائے یہ روپیہ ہمارا نہ دینا ہمارے لیے

انتہائی غیر مناسب ہے۔ مگر باپنا صاحب نہ مانے اور آپ نے کہا کہ سردار دیوان سنگھ دوست اور مہمان ہیں یہ ممکن نہیں کہ کسی صورت میں ایسا ہوگا۔ یہ روپیہ وہ خود اپنی جیب سے دینا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ میں نے پھر التجا کی مگر انہوں نے پھر انکار کر دیا۔ اور دوسری باتیں شروع کر دیں۔

باپنا صاحب سے رخصت ہو کر میں ہوشیار سنگھ جی کے ساتھ موٹر میں ریلوے سٹیشن گیا۔ وہاں سے ہنس راج جی کو ساتھ لیا۔ ہم تینوں گیسٹ ہاؤس میں پہنچے وہاں لنچ کھایا سامان بندھوایا گیسٹ ہاؤس کے ملازموں کو دس روپیہ بطور انعام دیے اور ہم موٹر میں بیٹھ کر ریلوے سٹیشن پہنچے تھوڑی دیر کے بعد رتلام جانے والی گاڑی آئی اور ہم اس میں سوار ہو کر دہلی واپس آئے۔

لاہور جیل کے واقعات بتائے گئے تھے کہ جرنلسٹوں کو کیونکر ہوا سمجھا جاتا ہے۔ اندر کے اس واقعہ سے اندازہ ہو سکے گا کہ جرنلسٹوں کو بعض ایسی سہولتیں بھی حاصل ہیں جو دوسرے کم لوگوں کو حاصل ہوں گی۔

گورنمنٹ کی کاغذی مشینری

مہاراجہ نابھ جب معزول ہونے کے بعد ڈیرہ دون میں مقیم ہوئے تو آپ کے ملازموں نے ایک روز دیکھا کہ سردار حضور سنگھ ڈھلوں (جو پٹیالہ میں مختلف عہدوں پر فائز رہے ایک زمانہ میں انسپکٹر جنرل پولیس بھی تھے اور بعد میں منسٹر بھی ہو گئے۔ ڈیرہ دون آئے ہیں اور چنانچہ یہ بھی دیکھا گیا کہ آپ ایسٹ کینال روڈ پر جہاں مہاراجہ نابھ کی کوٹھی تھی کی سڑک پر اکثر موٹر سائیکل پر آتے جاتے ہیں۔ والیان ریاست ذہنی اعتبار سے عام طور پر وہ میں مبتلا ہوتے ہیں۔ اور مہاراجہ نابھ کا ذہن بھی ایسا ہی ہے آپ نے جب سردار حضورا سنگھ کے متعلق ملازموں سے ایسٹ کینال روڈ کی سڑک پر موٹر سائیکل پر آنے جانے کے متعلق سنا تو آپ کو شک ہوا کہ پٹیالہ کے لوگ کوئی نئی شرارت کرنے والے ہیں۔ آپ نے مجھے ڈیرہ دون سے ٹیلی فون پر کہا۔ کہ میں فوراً ڈیرہ دون پہنچ جاؤں ضروری کام ہے۔ میں رات کی گاڑی سے دہلی سے سوار ہوا اور صبح ڈیرہ دون پہنچا۔ مہاراجہ سے ملا تو آپ نے سردار حضورا سنگھ کا ڈیرہ دون کی سڑکوں پر موٹر سائیکل پر پھرنے کا واقع سنایا۔ مہاراجہ بے حد تشویش میں تھے۔ کہ شاید مہاراجہ پٹیالہ کوئی نئی شرارت کرنے والے ہیں میں نے مہاراجہ سے کہا کہ ڈیرہ دون ہمارا خریدا ہوا نہیں ہے کہ یہاں پٹیالہ کا کوئی شخص بھی نہ آسکے۔ پر فضا مقام ہے۔ اکثر لوگ آب و ہوا کے لیے آتے ہیں۔ ہمیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ مگر میرے اس جواب سے مہاراجہ کی تسلی نہ ہوئی۔ آپ گھبرائے ہوئے تھے اور آپ نے چاہا کہ میں ان کے پاس کچھ روز رہوں۔ میں تین چار روز ڈیرہ دون میں رہا۔ مگر ادھر اخبار کے کام کی فکر کہ غیر حاضری کے باعث اچھی طرح سے نہ ایڈٹ ہوگا اور نہ انتظام قابل اطمینان ہو سکے گا۔ میں نے چاہا کہ واپس دہلی چلا جاؤں۔ آخر مہاراجہ سے فیصلہ ہوا کہ میں چند ہفتے تک ہفتہ میں دو تین دن دہلی میں رہا کروں گا اور تین چار روز ڈیرہ دون میں رہوں گا۔

میں جب دہلی پہنچا تو اگلے روز رائے بہادر لالہ بھگوان داس کپور سپرنٹنڈنٹ پولیس سی آئی ڈی ملنے کے لیے تشریف لائے۔ یہ بزرگ میرے ہم وطن ہیں اور دور کے رشتہ دار یا برادری میں سے بھی ہیں۔ یہ گورنمنٹ آف انڈیا کے ڈائریکٹر جنرل سی آئی ڈی کے ماتحت سپرنٹنڈنٹ پولیس تھے آپ کا ہیڈ کوارٹر لاہور میں تھا۔ پندرہ روز لاہور میں تشریف رکھتے تھے اور پندرہ روز دہلی میں۔ ان کے والد رائے بہادر لالہ لال کپور بھی پولیس میں ایک بڑے افسر تھے۔ یعنی رائے بہادر بھگوان داس پولیس کے محکمہ میں ہونے کے اعتبار سے دو آتشہ تھے۔ آپ جب دہلی میں تشریف لاتے تو کبھ کبھی ملنے کے لیے آیا کرتے۔

رائے بہادر پولیس سے خاندانی تعلق ہونے کے باعث گورنمنٹ کے بہت بڑے وفا شعاروں میں سے تھے۔ اور آپ نے اور آپ کے والد مرحوم نے ہندوستان کی آزادی کی سپرٹ کو کچلنے کے لیے اعتبار سے گورتمنٹ کی بہت بڑی خدمات انجام دی تھیں۔ آپ کے والد سنہ ۱۹۰۶ء کی تحریک میں جبکہ لالہ لاجپت رائے کو مانڈلے بھیجا گیا۔ پنجاب گورنمنٹ کے دست راست تھے۔ اور رائے بہادر بھگوان داس نے تو لالہ لاجپت رائے اور لالہ ہردیال کا امریکہ تک پیچھا کیا اور یہاں ہندوستان میں ہارڈنگ بمب کیس سے لے کر ارون بمب کیس اور اسکے بعد تک کی تفتیشوں میں نمایاں حصہ لیا۔ مگر میرا خیال ہے کہ آپ کی پولیس کی برادری کے بھی بعض اصحاب میرے اس خیال سے متفق ہیں کہ آپ ذہنی اعتبار سے کوئی زیادہ ہوشیار لوگوں میں سے نہ تھے۔ آپ جب ملنے کے لیے تشریف لاتے اور چائے پی رہے تھے تو آپ نے فرمایا۔ کہ انہوں نے دو تین بار ٹیلی فون کیا میں دہلی میں موجود نہ تھا اور میں کہاں گیا ہوا تھا میں نے جواب دیا کہ ڈیرہ دون کے مہاراجہ سے ملنے کے لیے گیا تھا
۔

پولیس والوں کی یہ فطرت ہے کہ یہ ہر بات کو کرید تے ہیں۔ کہ شاید اس میں سے

بھی کوئی مواد مل جائے یہ اگر کسی برات میں جائیں گے تو وہاں بھی لوگوں کو غور سے سیکھیں گے۔ کہ اس برات میں کوئی مفرور ملزم تو نہیں کسی گوردوارہ اور دھرم شالہ میں جائیں گے تو وہاں عبادت کرنے والوں پر بھی ان ک نگاہ ہوگی۔ کہ کوئی انارکسٹ تو موجود نہیں جس کو گرفتار کیا جائے۔ میں رائے بہادر کی ذہنیت سے واقف تھا آپ نے جب میرے منہ سے مہاراجہ نابھ اور ڈیرہ دون سنا تو سوالات شروع کر دیے۔ کیوں گئے تھے کیا کام تھا۔ مہاراجہ کی صحت کیسی ہے وغیرہ وغیرہ۔ میں نے ان سوالات کو غنیمت سمجھا اور سوچا کہ ان سے فائدہ اٹھانا چاہیے یہ لوگ دوسروں کو بے وقوف سمجھ کر اپنا کام نکالتے ہیں۔ ان کو بے وقوف سمجھ کر کام نکالا جائے تو کیا حرج ہے۔ رائے بہادر اور میرے درمیان یہ باتیں ہوئیں۔

رائے بہادر: ڈیرہ دون کیوں گئے تھے۔

میں: مہاراجہ کا ٹیلی فون آیا تھا کہ آ کر مل جاؤ۔

رائے بہادر: کیا کوئی ضروری کام تھا۔

میں: کیا ضروری کام تھا ان لوگوں کے آپس میں جھگڑے ہیں مجھے خواہ مخواہ وقت ضائع کرنا پڑتا ہے۔

رائے بہادر: کیوں کیا بات تھی کیا جھگڑا ہے؟

میں: کچھ بات نہیں یہی پٹیالہ نابھ کے جھگڑے ہمارا ان لوگوں سے کیا واسطہ۔ رائے بہادر صاحب چھوڑیے ان قصوں کو آپ چائے پیجیے کتنے چمچے شکر کے ڈالوں۔

رائے بہادر: ایک چمچہ کافی ہوگا۔ میں شکر بہت کم پیتا ہوں۔ کیا نابھ پٹیالہ کا کوئی نیا جھگڑا پیدا ہو گیا۔

میں: جی نہیں وہ پٹیالہ والے شرارتیں کرتے ہیں۔ ڈیرہ دون میں حضورا سنگھ ڈھلوں بیس پچیس غنڈوں کے ساتھ آیا ہوا ہے۔ موٹر سائیکل پر مہاراجہ نابھ کی کوٹھی کے چکر لگاتا ہے۔ مہاراجہ نے مشورہ کے لیے بلایا تھا۔

رائے بہادر: پھر مہاراجہ نے کیا کیا کریں گے۔

میں : (اپنی بے تعلقی اور لاپرواہی کا اظہار کرتے ہوئے) جی چھوڑیے رائے بہادر صاحب ان لوگوں کو۔ یہ قصے تو چلتے ہی رہیں گے۔ آپ چائے پیجیے یہ فرنچ ٹوسٹ ٹھنڈے ہو رہے ہیں۔ کھائیے۔

رائے بہادر کو ایسی اہم خبر ملے اور وہ صبر کریں یہ کس طرح ممکن تھا۔ ان کے دل میں تو کچھ کچھ ہو رہا تھا۔ یہ بچارے چائے کیا دلچپسی سے پیتے۔ انہوں ں ے میرے کہنے سے ایک فرنچ ٹوسٹ کھایا اور پھر باتیں شروع ہو گئیں۔ مگر میں لاپروائی کا اظہار کر رہا ہوں۔ تا کہ رائے بہادر یہ نہ سمجھ لیں کہ میں ان کو سنا کر کہہ رہا ہوں۔ اور میرے کہنے میں کوئی غرض پوشیدہ ہے۔ رائے بہادر نے تھوڑی دیر کے بعد پھر پلٹا کھایا اور پوچھا۔

رائے بہادر: مہاراجہ نے کیا سوچ اہے کیا فی الحقیقت پٹیالہ کے لوگ ڈیرہ دون میں موجود ہیں۔

میں: مہاراجہ نے تو پرواہ نہیں کی۔ وہ ان چھوٹی چھوٹی باتوں کی کیا پروا کرتے ہیں۔ ہاں ڈیرہ دون کے اکالیو ں کو ان واقعات کا علم ہو گیا۔ انہوں ں ے امرت سر شرومنی گوردوارہ پر بندھک کمیٹی کو اطلاع کر دی اور اب معلوم ہوا تھا کہ شرومنی گوردوارہ کمیٹی اکالی دل کے پانچ سو آدمی ڈیرہ دون بھیج رہی ہے۔ جو مہاراجہ کی کوٹھی کے ارد گرد او رایسٹ کینال روڈ پر پہرہ دیں گے۔ تا کہ پٹیالہ والے کوئی شرارت نہ کر سکیں۔

میرا یہ کہنا تھا کہ رائے بہادر کا چہرہ دلچپسی اور حیرانی کا مرکز بن گیا۔ رائے بہادر نے پوچھا کہ امرت سر سے اکالی کب ڈیرہ دون پہنچ رہے ہیں۔ میں نے پھر بے اعتنائی غیر دلچپسی اور لاپروائی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ چھوڑیے رائے بہادر صاحب ان باتوں کو۔ یہ لوگ کریں جیسا کرنا چاہتے ہیں۔ ہم اپنا وقت ان لوگوں پر کیوں ضائع

کریں۔فرمایئے حافظ آباد میں تو سب خیریت ہے آپ کب وہاں گئے تھے۔

رائے بہادر کو صبر کہاں انہوں نے اور کریدنا چاہا۔میں نے پھر لاپروائی کا اظہار کرتے ہوئے دوسری باتیں شروع کردیں۔اوراگر دوسری باتیں شروع نہ کرتا تو ڈیرہ دون کی بات ہی کون سی تھی جوان سے کہتا چائے کے بعد رائے بہادر دفتر ''ریاست'' سے سیدھے اپنے افسر ڈیوڈ پیٹری ڈائریکٹر جنرل سی آئی ڈی کی کوٹھی پہنچے۔وہاں تمام واقعات بیان کردیے۔ان سنسنی خیز ارو اہم واقعات کے متلق سر ڈیوڈ پیڑی نے پولیٹکل سیکرٹری گورنمنٹ ہند کو ٹیلی فون کیا اور کہا کہ معتبر ذریعہ سے معلوم ہوا ہے کہ پانچ سو اکالیوں کا جتھا مہاراجہ نابھ کی کوٹھی کا پہرہ دینے کے لیے امرت سر سے روانہ ہورہا ہے۔اور پنجاب میں سکھوں کے اندر سخت ایجی ٹیشن پیدا ہونے کا احتمال ہے۔ پولیٹکل سیکرٹری نے فوراً بذریعہ تار مہاراجہ پٹیالہ سے جواب طلب کیا اور کہا کہ سردار حضورا سنگھ پٹیالہ کے دوسرے آدمیوں کو فوراً ڈیرہ دون سے واپس بلا لیا جائے۔ مہاراجہ پٹیالہ نے جواب دیا کہ پٹیالہ سے انہوں نے کوئی آدمی نہیں بھیجے۔سردار حضورا سنگھ پرائیویٹ حیثیت سے ڈیرہ دون گئے ہیں اور ان کو بذریعہ تار واپس آنے کے لیے حکم دے دیا گیا ہے۔چنانچہ یہ احکام بذریعہ تار جاری ہوئے اور اگلے روز سردار حضورا سنگھ واپس پٹیالہ چلے گئے۔

میں تین روز کے بعد پھر ڈیرہ دون گیا۔مہاراجہ کو رائے بہادر بھگوان داس کی ملاقات کا واقعہ بتایا مہاراجہ کے ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ گئے۔مہاراجہ نے بتایا کہ سردار حضورا سنگھ ڈیرہ دون سے پٹیالہ واپس چلے گئے ہیں

اس واقعہ سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ گورنمنٹ کی کاغذی مشینری کیونکر چلتی ہے اس مشینری کے باعث جہاں ہر روگ بے گناہ لوگ قید او رنظر بند ہوتے ہیں وہاں اس مشینری کو بھی اگر بے وقوف بنایا جائے تو اس سے کیا کام لیا جاسکتا ہے۔

☆☆☆

ریاستوں کی عدالتیں اور مجسٹریٹ

نواب صاحب بہاول پور کی دادی نے عید کے روز اپنی پوتی یعنی نواب صاحب کی بہن کو عیدی کے طور پر ایک پنا دیا۔ نواب صاحب کی بہن نے یہ پنا اپنے شوہر ان کا نام مجھے یاد نہیں رہا۔ یہ بہاولپور کی پلٹن میں میجر ہیں اور ان کو محبت سے میجر بلا کہتے ہیں کو دیا۔ اس پنا کی قیمت تین چار لاکھ روپیہ کے قریب تھی۔ میجر بلا نے یہ پنا بہاول پور کے ایک مقامی جوہری کو دکھایا اور پوچھا کہ کیا قیمت ہے۔ تو اس جوہری نے اس کی قیمت سولہ ہزار بتائی اس کے بعد یہ پنا بہاولپور کے قریب ملتان کے ایک جوہری کو دکھایا گیا تو اس نے بھی یہی سولہ سترہ ہزار روپیہ قیمت بتائی۔ میجر بلا تجربہ کار نوجوان تھے۔ انہوں نے اس پنا کو فروخت کر دینا چاہا تو کچھ دن بات چیت کرنے کے بعد یہ چار جوہریوں کے پاس جن میں دو بہاول پور اور دو ملتان کے تھے انیس ہزار روپیہ میں فروخت کر دیا۔ اور اس سودے کا علم نہ تو نواب صاحب آف بہاول پور کو ہوا نہ ان کی ہمشیرہ کو اور نہ ان کی دادی کو۔

یہ چاروں جوہری اس پنا کو لے کر دہلی آئے۔ انہوں نے یہاں کے جوہریوں کو دکھایا۔ جوہری لوگ دوسرے کی جیب کاٹنے کے اعتبار سے بہت ہوشیار ہوتے ہیں۔ بڑے سے بڑا جوہر شناس کو بھی بے وقوف بنا لیتے ہیں۔ اور والیان ریاست کے جیب میں سے دہلی کے جوہری ہر سال لاکھوں روپیہ حاصل کرتے ہیں۔ دہلی کے ان جوہریوں نے اس پنا کی قیمت چالیس پچاس ہزار روپیہ تک لگائی اس کے بعد ملتان اور بہاول پور کے جوہری پنا کو لے کر بمبئی گئے۔ وہاں کے جوہریوں کو دکھایا گیا تو اس سے کچھ زیادہ رقم بتائی گئی۔ آخر یہ پنہ جے پور کے کروڑ پتی جوہری لالہ سندر لال جو بمبئی میں سندر لال اینڈ کو کے نام سے جواہرات کا کاروبار کرتے ہیں یہ پنا پچھتر ہزار روپیہ میں فروخت کیا گیا۔

پنا بمبئی میں فروخت ہوا تھا۔ کہ ملتان کے جوہریوں میں سے ایک نے جو کافی

حصہ نہ ملنے یا کسی دوسری وجہ سے اپنے ہمراہیوں سے بددل ہو گیا تھا ایک خط کے ذریعہ نواب صاحب بہاول پور کو تمام واقعہ کی اطلاع دے دی۔ نواب صاحب نے اپنے بہنوئی سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ واقعہ درست ہے۔ ایک تو قیمتی ٹے کا کوڑیوں کے مول فروخت ہونا اور دوسرے پرسٹیج کا سوال نواب صاحب کو اس کا بے حد افسوس ہوا۔

نواب صاحب کے حکم سے بہاول پور پولیس نے مقدمہ درج رجسٹر کیا۔ مقدمہ درج ہون کے بعد جوہریوں پر دھوکہ اور امانت میں خیانت وغیرہ کا مقدمہ قائم کیا گیا ۔اور کاغذات ایجنٹ گورنر جنرل ریاست ہائے پنجاب کو اس درخواست کے ساتھ بھیجے گئے کہ تا فیصلہ مقدمہ پنا کو فوراً قبضہ میں کر لیا جائے تا کہ ملزم اس کو خرد برد نہ کر سکیں ۔ایجنٹ گورنر ریاست ہائے پنجاب نے بمبئی پولیس کو تفصیل کے ساتھ بذریعہ تار حکم دیا اور بمبئی پولیس نے لالہ سندر لال کے ہاں پہنچ کر پنا جو اس وقت پچھتر ہزار روپیہ میں فروخت ہو چکا تھا اپنے قبضہ میں کر لیا۔ اس حکم کے پہنچنے سے پہلے چاروں جوہری روپیہ لے کر بمبئی سے روانہ ہو چکے تھے۔ ایجنٹ گورنر جنرل کا حکم دہلی اور لاہور پولیس کو بھی پہنچ چکا تھا۔ یہ جوہری روپیہ لے کر جب لاہور سٹیشن پر پہنچے تو پنجاب ریلوے پولیس نے ان کو مع روپیہ کے گرفتار کر لیا۔ اس گرفتاری کے بعد ان سے روپیہ لے کر لاہور کے سرکاری خزانہ میں جمع کرا دیا گیا۔ اور جب ملزموں کو مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیا گیا تو ان سے ضمانتیں لے کر ان کو رہا کر دیا گیا۔

ریاستوں کے مظالم برطانوی علاقہ میں کافی شہرت رکھتے ہیں۔ اور لوگ جانتے تھے کہ ریاستوں کی حدود میں اگر سرکار مستغیث یا مدعی ہو تو نہ دلیل کا سوال ہے اور نہ وکیل کا اور نہ اپیل کا۔ ان جوہریوں نے جب یہ سنا کہ ان کے خلاف ریاست بہاول پور میں مقدمہ درج کیا گیا ہے اور ایجنٹ گورنر نے وارنٹ گرفتاری جاری کیے ہیں تو ان بیچاروں کے ہوش اڑ گئے۔ اور انہوں نے محسوس کیا کہ اگر اس نے ان کو ریاست

بہاولپور کے حوالہ کردیا تو نہ معلوم کتنے برس تک یہ وہاں جیل میں رکھے جائیں گے ۔ ان لوگوں نے لاہور میں اپنا وکیل مسٹر پی این کول بیرسٹر کو مقرر کیا۔

یہ لوگ بے حد پریشان تھے۔تو ان کو خیال آیا کہ ایڈیٹر ''ریاست'' ریاستوں کے معاملات اور ایکسٹرا ڈکشن وغیرہ سے واقف ہے۔اس سے رائے اور امداد لینی چاہیے ۔ یہ لوگ دہلی آئے اور ایڈیٹر ''ریاست'' س ملے انہوں نے تمام حالات سنائے مجھے بہت افسوس ہوا کیونکہ گو سودا کرتے وقت انہوں نے چوروں کے کپڑے اور لاٹھیوں کے گز کے مصداق تین چار لاکھ روپیہ کا پنا انیس ہزار میں اڑا لیا ۔مگر غور کیا جائے تو انہوں نے یہ تجارت کی تھی ۔دھوکہ یا امانت میں خیانت کا جرم نہ کیا تھا۔میں نے ان سے کہا کہ میں اخبار میں لکھ کر ان کی ہر امداد کرنے کے لیے تیار ہوں مگر اس کا نتیجہ کچھ نہ نکلے گا ۔کیونکہ مقدمہ عدالت میں ہے ۔اگر مقدمہ کے لیے ریذیڈنٹ نے ان کو بہاول پور کے حوالے کردیا تو پھر یہ بہاول پور کے حکام کے رحم و کرم پر ہوں گے ۔وہ جو چاہیں کریں ۔اور نہیں کہا جا سکتا۔ کہ نتیجہ کیا ہو۔ہاں اگر مقدمہ برطانوی علاقہ میں ہو تو قانونی اعتبار سے مقدمہ نہ ہونے کے برابر ہے ۔اور وہ قطعی بری ہو جائیں گے ۔ مگر برطانوی علاقہ میں مقدمہ کا ہونا ممکن نہیں ۔ میں نے ان کو اس مقدمہ کے تمام روشن پہلو اور تاریک پہلو بتا دیے ۔اسکے بعد انہوں نے خواہش ظاہر کی کہ چونکہ میں نواب صاحب بہاولپور کو ذاتی طور سے جانتا ہوں اس لیے ان سے سفارش کروں کہ میں نے ان سے کہا کہ ویسے سفارش کرنا تو بے معنی ہو گا اور نہ ایسی سفارش کا کوئی اثر ہو سکتا ہے ۔اگر یہ پوزیشن ہو کہ لالہ سندر لال اپنا پچھتر ہزار روپیہ واپس لے لیں اور انیس ہزار جو آپ نے میجر بلا کو دیا وہ نواب صاحب بہاول پور آپ کو دے دیں اور نواب صاحب کو پنا واپس مل جائے تو یہ تینوں کے لیے مفید ہو گا۔اور اس تجویز پر نواب صاحب سے مقدمہ واپس لینے کی سفارش کی جا سکتی ہے ۔اور میرا خیال ہے کہ نواب صاحب کو اس تجویز سے متفق ہونے سے انکار نہ کرنا چاہیے ۔میری یہ تجویز ان لوگوں

نے پسند کی کیونکہ ان کو ریاستی جیل خانہ نظر آرہا تھا اور بہت خوف زدہ تھے۔ اس تجویز کے مطابق نہ تو جیل جانے کا سوال تھا نہ انیس ہزار روپیہ کے مارے جانے کا۔ نواب صاحب آف بہاولپور میں بھی کئی کمزوریاں ہوں گی اور کوئی انسان کمزوریوں سے بلند نہیں۔ مگر طبیعت کے اعتبار سے نواب صاحب نہایت اچھے نہایت مخلص اور بہت فیاض اور بے ریا والی ریاست ہیں۔ اور ان سے ملنے اور باتیں کرنے والا شخص ایک کشش محسوس کرتا ہے۔ گرمیوں کا زمانہ تھا اور نواب صاحب اس وقت پالم پور ضلع کانگڑہ پہاڑ پر تھے۔ میں نے ان کو تمام حالات اور وہ تمام بات چیت جو میرے اور ملزموں کے درمیان ہوئی تھی لکھی۔ میرے اس خط کے ملنے پر نواب صاحب کا تار آیا۔ میں ان سے پالم پور میں ملوں چنانچہ میں پالم پور گیا۔ وہاں بات چیت ہوئی تو نواب صاحب نے اس تجویز کو پسند کیا کیونکہ وہ خود نہ چاہتے تھے کہ ملزم قید ہوں۔ اس مرحلہ کے طے ہونے کے بعد میں لالہ سندرداس لال سے دہلی میں ملا۔ اور کئی روز کی بات چیت کے بعد میں نے سندر لال جی کو نواب صاحب سے ملانے کے لیے پالم پور لے گیا۔ تاکہ نواب صاحب لالہ جی کی بھی تسلی کر دیں۔ کیونکہ وہ بھی امانت میں خیانت کا مال لینے کے ملزم گردانے جا سکتے تھے۔ چنانچہ اس ملاقات کے بعد لالہ سندر لال نے چیف پریذیڈنسی مجسٹریٹ بمبئی کو جس کے قبضہ میں بمبئی پولیس نے یہ پنا رکھا ہوا تھا لکھ دیا کہ پنا نواب صاحب بہاول پور کو واپس کر دیا جائے ان کو کوئی اعتراض نہیں۔

یہ تمام مرحلے طے ہونے کے بعد اب باقی مسئلہ بہاول پور مقدمہ کا واپس لینے کا تھا اور یہ تب ہی ممکن تھا کہ ملزم بہاول پور کی عدالت میں حاضر ہوتے۔ بیان ہوتے۔ ان کا انیس ہزار روپیہ ان کو واپس ملتا۔ عدالت ان کو ڈسچارج کرتی اور ریذیڈنٹ کے جاری کیے ہوئے ایکسٹرڈیشن وارنٹ منسوخ ہوتے۔ چنانچہ باوجود اس بات کے کہ نواب صاحب سے فیصلہ ہو چکا ہے ملزم بہاولپور جاتے ہوئے گھبراتے تھے اور خوف زدہ تھے۔ میں درمیان میں پڑ کر ذمہ داری لے چکا تھا انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں

بہاول پور مچل کر مقدمہ کی کارروائی بھی اپنے سامنے ختم کرا دوں ۔ چنانچہ میں ان چاروں ملزموں کو لے کر اور ان کے وکیل کے ساتھ بہاول پور گیا۔ تمام راستہ یہ لوگ پریشان رہے۔ کہ ریاستوں کا معاملہ ہے وہاں جا رہے ہیں ۔ والیان ریاست اور ان کے اہل کاروں کا کیا اعتبار۔ ایسا نہ ہو کہ جیل میں ڈال دیے جائیں ۔ میں نے روانہ ہونے سے پہلے بہاولپور بہادر کرنل مقبول حسین قریشی کو تار دے دیا کہ ہم لوگ جب بہاول پور سٹیشن پہنچے تو کاریں ہمارے لیے موجود تھیں ۔ گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرے وہاں کے افسروں کو ہمارے پہنچنے کی اطلاع مل چکی تھی۔ غسل کرنے اور کپڑے بدلنے کے بعد میں قافلے کو لے کر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی عدالت میں گیا ۔ تاکہ قانونی کارروائی ختم ہو ۔ ہم وہاں جا کر بیٹھے تھے کہ پولیس کے چار کانسٹیبل اور ایک سب انسپکٹر ہتھکڑیاں لے کر ملزموں کو ہتھکڑیاں لگانے کے لے آ گئے ہم لوگوں نے جب ہتھکڑیوں کو دیکھا تو نہ صرف ملزموں کے ہوش اڑ گئے بلکہ میں بھی شرم اور ندامت کے باعث پانی پانی ہو گیا ۔ کیونکہ ملزموں کی آنکھیں بتا رہی تھں کہ یہ لوگ مجھے غدار اور بے ایمان سمجھتے ہیں اور ان کو یقین ہے کہ میں نے دھوکہ دے کر ان کو پکڑوایا ہے ۔ میں نے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سے کہا کہ یہ وعدہ خلاری ہو رہی ہ ۔ نواب صاحب نے مجھ سے ذاتی طور پر کہا تھا کہ ملزموں کو بہاول پور میں کوئی تکلیف نہ ہو گی ان کو عدالت میں پیش کر دیا جائے اور مقدمہ واپس لے لیا جائے ۔ ایسا کرنا ریاست بہاولپور کے لیے شرمناک ہے ۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے کوئی تسلی بخش جواب نہ دیا۔ میں نے غصہ اور جوش میں آ کر بلند آواز سے کہا ۔ کہ اچھا اگر یہ ملزم جیل میں گئے تو جیل سے باہر رہنا میں اپنے لیے بھی کمینہ پن سمجھتا ہوں اور یقیناً ان کے ساتھ جیل جاؤں گا۔ میرے اس چیلنج پر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے اندر کچھ انسانیت پیدا ہوئی اور اس نے محسوس کیا کہ معاملہ بہت زیادہ بگڑ جائے گا۔ اس پر اس نے کہا کہ چونکہ ملزموں کے خلاف وارنٹ جاری ہوئے تھے اور ملزم عدالت میں ہیں ۔ عدالت کا فرض ہے کہ وہ ان کو حراست

میں لے میں نے کہا آپ تھوڑی دیر انتظار کیجیے۔ ان کو ہتھکڑیاں نہ لگایئے میں ابھی منسٹروں سے مل کر انتظام کرتا ہوں۔ چنانچہ میں عدالت سے باہر وہ موٹر کھڑی تھی جس میں ہم لوگ گیسٹ ہاؤس سے آئے تھے۔ میں اس موٹر میں بیٹھ کر منسٹر لالہ اودھوداس کے پاس پہنچا۔ اول تو ان سے ملنے کے لیے ہی کئی منٹ مجھے برآمدہ میں انتظار کرنا پڑا۔ اور جب ملے تو بوڑھے آدمی نتھو خاں کا مقبرہ نہ دعا نہ بدعا۔ یعنی نہ ہاں کرتے نہ نہیں نہ کوئی تسلی بخش جواب ریاستی اہل کاروں والی چال بازیاں اور چالاکیاں۔ نواب صاحب کا حکم نہیں آیا۔ پالم پور سے کوئی تحریری اطلاع نہیں آئی۔ پولیس کے اختیار میں ہے۔ مجسٹریٹ سے کہیے مجبور ہوں یہ ہے اور وہ ہے۔

انہوں نے کوئی تشفی بخش جواب نہ دیا اور میں بے حد پریشان کہ نواب صاحب پالم پور میں ہیں۔ یہاں کے منسٹروں کی حالت یہ ہے کہ کروں تو کیا اور جاؤں تو کدھر۔ یہاں سے کرنل قریشی کے ہاں گیا وہ مکان پر موجود نہ تھے۔ پھر آغا محمد اکرم انسپکٹر جنرل کے مکان پر گیا یہ برٹش پولیس کے ریٹائرڈ تھے۔ سی پی میں سپرنٹنڈنٹ پولیس رہ چکے تھے۔ ان سے ملا تمام حالات بیان کیے تو ان کو بے حد افسوس ہوا۔ یہ فوراً میرے ساتھ عدالت میں آئے مجسٹریٹ سے پوچھا تو مجسٹریٹ نے وہی قانون بازی شروع کی کہ آپ وارنٹوں کی تعمیل کرا رہے ہیں۔ اس پر آغا صاحب نے اپنے سب انسپکٹر کو شہر بھیج کر دو شاہوکاروں کو بلایا اور ان سے کہا کہ یہ ان چاروں ملزموں کی پانچ پانچ سو روپیہ کی ضمانت عدالت میں داخل کرا دیں چنانچہ ضمانت نامے لکھے گئے اور داخل ہوئے۔ اس کے بعد آغا صاحب نے اپنے سامنے تمام کارروائی جو ہونی چاہیے تھی۔ کرائی اور ملزم ڈسچارج کیے گئے۔

ملزموں کے ڈسچارج ہونے کے بعد ہم لوگ واپس گیسٹ ہاؤس میں آئے پنا اس سے پہلے بہاول پور کے خزانہ میں پہنچ چکا تھا۔ ملزموں کا روپیہ ملزموں کو ملا۔ اور میں رات کی گاڑی سے سوار ہو کر دہلی آیا۔ دہلی پہنچنے کے بعد میں نے بہاول پور کا

ہتھکڑیوں کا واقعہ اور تمام حالات نواب صاحب کو لکھے۔ نواب صاحب کو حالات معلوم کر کے بے حد افسوس ہوا۔ مگر کیا ہو سکتا تھا۔ ریاستوں کے مجسٹریٹوں کے اندر شۓ لطیف اور انسانیت کے پیدا ہونے کے لیے ابھی نصف صدی کی اور ضرورت تھی اچھا ہوا کہ آغا محمد اکرم نے ملزموں کی ضمانت کا انتظام کر دیا۔ ورنہ یہ ممکن نہ تھا کہ ملزم تو جیل میں جاتے اور میں جس کے وعدہ اور بھروسہ پر وہ بہاول پور کی حدود میں داخل ہوئے باہر رہتا۔

☆☆☆

غدار نا قابل معافی ہیں

جس زمانہ نواب بھوپال کے ساتھ میرے مقدمات چل رہے تھے دفتر ”ریاست“ میں ایک چپڑاسی مبارک حسین تھا۔ اس زمانہ چپڑاسیوں کی تنخواہ عام طور پر پندرہ روپیہ ماہوار تھی۔ مگر یہ مبارک حسین تیس روپیہ ماہوار تنخواہ پاتا تھا۔ اور اس کا دوسرا تمام خرچ یعنی کپڑے کھانے وغیرہ کا بھی میرے ذمہ تھا کیونکہ یہ قابل اعتماد تھا۔ میرے گھر کے لیے سامان کی خرید و فروخت بھی یہی کرتا۔ میری والدہ کو بھی اس بچوں سے زیادہ عزیز سمجھتیں۔ قابل اعتماد ہونے کے باعث یہ مرے خطوط مرحوم مہاراجہ نابھ کے پاس ڈیرہ دون لے جایا کرتا اور ان کے جواب لاتا۔ گویا کہ یہ ہمارے ہاں ایک فیملی ممبر کی سی حیثیت رکھتا تھا۔ چنانچہ اس کی جب شادی ہوئی تو اس کی شادی کے اخراجات کے لیے تین سو روپیہ میں نے اور تین سو روپیہ مرحوم مہاراجہ نابھ نے بھی دیا۔

نواب بھوپال بنام ایڈیٹر ”ریاست“ کے مقدمات کے دوران بھوپال والوں نے لالچ دے کر دفتر ”ریاست“ کے آدمی توڑنے شروع کیے۔ ان آدمیوں کو ان کی شہادت وغیرہ کے لیے ضرورت تھی۔ چنانچہ بھوپال والوں نے دفتر ”ریاست“ کے جن لوگوں کے ضمیر خریدے۔ ان میں ایک یہ مبارک حسین چپڑاسی بھی تھا۔ اس کو پانچ سو روپیہ تو پیشگی دیا گیا۔ اور اس سے وعدہ لیا گیا کہ اگر اس نے ایڈیٹر ”ریاست“ سے غداری کرتے ہوئے نواب بھوپال کی خدمات انجام دیں تو وہ ان مقدمات کے بعد بھوپال میں اچھی جگہ سرکاری ملازم مقرر کر دیا جائے گا۔

بھوپال والوں کی اطلاعیں حاصل کرنے کے لیے بھوپال کے ایک سب انسپکٹر پولیس جو مقدمات کے فائلوں کا انچارج تھا اور جس کے بعد میں بھوپال والوں نے وارنٹ جاری کر دیے اور وہ بھاگ گیا تھا۔ کو میں ایک سو روپیہ ماہوار کے قریب دیتا تھا۔ تاکہ یہ مجھے مقدمہ کے تمام حالات کی اطلاعیں دیتا رہے۔ مبارک حسین کو خریدے ہوئے ابھی چند روز ہوئے تھے کہ اس سب انسپکٹر پولیس نے مجھے بھوپال سے آ کر

اطلاع دی کہ دفتر ''ریاست'' کا چپراسی مبارک حسین بھی پانچ سو روپیہ دے کر خرید لیا گیا ہے۔ اور اس کی معرفت وہ ردی کاغذات حاصل کیے جا رہے ہیں جو ایڈیٹر ''ریاست'' کے ہاتھ سے لکھے ہوئے ہوں تا کہ ان کو دیکھ کر اور ان کی امداد سے جعل سازی تیار کی جا سکے۔ اس اطلاع کے ملنے پر میں نے مبارک حسین پر اعتبار کرنا چھوڑ دیا۔ اور دفتر میں بھی تاکید کر دی کہ اس کی نگرانی کی جائے۔ جب اس کی نگرانی ہونے لگی اور اعتبار نہ کیا جا رہا تھا تو اس نے محسوس کر لیا کہ مجھے اس کی غداری کا علم ہو گیا ہے۔ چنانچہ یہ دفتر سے غائب ہو گیا اور بعد میں اعلانیہ طور پر بھوپال والوں سے مل گیا اور اس نے ایڈیٹر ''ریاست'' کے خلاف عدالت میں شہادت بھی دی۔ گو اس کی شہادت کی ذرہ بھر بھی قیمت نہ تھی کیونکہ اس پر جو جرح کی گئی وہ بھوپال والوں کے لیے مہنگی ثابت ہوئی۔

مبارک حسین امروہہ کا رہنے والا تھا اور وہاں کے سیدوں کے خاندان میں سے تھا۔ امروہہ کے سیدوں کو اپنے نسب کے متعلق بہت فخر ہے اور میرا تجربہ ہے کہ جب کبھی کوئی اخلاقی کمزوری یا جرم کرنے لگیں تو ان کا ضمیر ان کو ملامت کرتا ہے۔ اور ایک شخص دوسرے کو طعنہ دیتے ہوئے کہتا ہے کہ تم ایسے ہو امروہہ کے سادات میں سے ہوتے ہوئے تمہیں شرم محسوس نہیں ہوتی۔ چنانچہ اس غداری کے بعد مبارک حسین اپنے رشتہ داروں اور ہم وطنوں کی نظروں میں گر گیا۔ یہ دہلی میں جب تک رہا اپنے گھر سے باہر نہ نکلتا۔ لوگوں کے سامنے آتے ہوئے شرم محسوس کرتا۔ امروہہ گیا تو وہاں بھی اس ندامت نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا۔ کیونکہ امروہہ کے لوگوں کو اس کے حالات کا جو علم ہو چکا تھا۔ آخر یہ مستقل طور پر اپنی سسرال چلا گیا۔ جہاں آج کل غالباً سائیکلوں کی مرمت کی دکان کرتا ہے۔

مقدمہ کا فیصلہ ہوئے کئی برس ہو چکے تھے۔ مبارک حسین کا مجھے کبھی خیال نہ آیا چند برس ہوئے اس کا ایک خط پہنچا جس کا مفہوم یہ تھا:

''میں نے آپ کا نمک کھایا اور نمک حرامی کی ۔ مجھے آپ کی ملازمت کی ضرورت نہیں اور نہ میں یہ خط کسی غرض کے لیے لکھ رہا ہوں ۔ کیونہ میں یہاں اپنے لیے گزارہ کے لیے کافی پیدا کر رہا ہوں ۔میرے اس خط لکھنے کی غرض یہ ہے کہ جب میں آپ کے ہاں سے آیا ہوں بے چینی محسوس کرتا ہوں ۔ مجھے رات کو اچھی طرح سے نیند بھی نہیں آتی ۔میری ایک خواہش ہے کہ آپ مجھ کو معاف کر دیں تا کہ میری روح کو تسکین نصیب ہو اور مرنے کے بعد بھی مجھے عذاب برداشت نہ کرنا پڑے''۔

غداروں کو معاف کرنے کے اعتبار سے میں بے حد سخت ہوں ۔اور اسے چاہے بے رحمی ہی کیوں نہ کہیے مگر یہ واقعہ ہے کہ مجھے غداروں سے اتنی ہی نفرت ہے جتنی کسی شخص کو گندگی کے ایک ڈھیر یا ڈلاؤ سے ہو سکتی ہے میں نے اس خط کا کوئی جواب نہ دیا ۔ایک ہفتہ بعد پھر اس کا خط آیا جس کا مفہوم یہ تھا:

''میں نے آپ کی خدمت میں خط لکھا تھا۔ مجھے اب تک اس خط کا جواب نہیں ملا میں ذہنی کوفت میں مبتلا ہوں ۔ مجھے رات کو نیند نہیں آتی ۔ نہ معلوم مرنے کے بعد میری کیا حالت ہو۔خدا کے لیے مجھے معاف کر دو ۔ میں نے آپ سے غداری کر کے بہت بڑا گناہ کیا۔میری آپ سے صرف یہی درخواست ہے کہ مجھے معاف کر دو اور اگر آپ مجھے کسی صورت میں بھی معاف نہ کر سکیں تو میری طرف سے والدہ صاحبہ کی خدمت میں درخواست دے دیجیے وہ مجھے معاف کر دیں ۔شاید میری روح کو تسکین نصیب ہو ۔وہ مجھے اپنے بچوں کی طرح سمجھتی تھیں میں نے غداری کر کے بہت بڑا گناہ کیا ہے''۔

میں نے اس خط کے بعد مبارک حسین کو جو جواب دیا وہ یہ تھا:

''آپ کے دو خط ملے ۔ میں دنیا میں سب کچھ معاف کر سکتا ہوں مگر غداری معاف نہیں کر سکتا۔ ورنہ تمہاری غداری کو معاف کرنے کے لیے والدہ سے کہہ سکتا ہوں ۔میری خواہش ہے کہ تمہیں غداری کی سزا قدرت کی طرف سے ملے ۔وہ چاہے اس دنیا میں ہو یا دوسری دنیا میں ۔ اور یقیناً ملے گی ۔ کیونکہ میرا ایمان ہے کہ خدا

غداروں کو کبھی معاف نہیں کرتا۔آپ آئندہ مجھے کبھی خط نہ لکھیے‘‘۔

مبارک حسین کے متعلق میرا یہ رویہ رحم دل لوگوں کے حلقہ میں سنگ دلی اور بے رحمی قرار دیا جائے گا۔مگر واقعہ یہی ہے جو میں نے لکھااور غداری کے متعلق میرے جذبات یہی ہیں جن کا میں نے اظہار کیااور اس کی وجہ یہ ہے کہ بچپن میں میری والدہ نے بہت کوشش کی کہ میرے خیالات مذہبی ہوں میری عمر بہت چھوٹی تھی جب کہ مجھے سردیوں میں بھی سورج نکلنے سے پہلے غسل کرنے پر مجبور کیا جاتا۔جپ جی صاحب وغیرہ کا پاٹھ کرتا اور گوردوارہ جاتا۔تو کھانا دیا جاتا ورنہ نہیں بہت چھوٹی عمر میں ہی سنتوں سادھوؤں اور مہاتماؤں کے ہاں جا کر کتھا وغیرہ سننے کے لیے تاکید ہوتی اور مذہبی کتابوں کے مطالعہ پر زور دیا جاتا۔مذہبی اعتبار سے میرا ذہن بائیس برس کی عمر تک تو ان اثرات کو قبول کرتا رہا مگر اس کے بعد خیالات میں انقلاب سا پیدا ہو گیا اور اب کو کیفیت ہے وہ کوئی راز نہیں۔اس کا اظہار ’’ریاست‘‘ کے صفحات سے ظاہر ہے۔ مگر بچپن میں بھائی گورداس (یہ سکھوں میں گرو صاحب کے بعد سب سے زیادہ قابل احترام شخصیت ہیں) کے کلام میں سے چند اشعار پڑھے تھے جو اب تک ذہن میں تازہ ہیں مبارک حسین کو جو جواب دیا گیا وہ بھی ان اشعار کے اثرات کا نتیجہ ہے ان اشعار کا ترجمہ یہ ہے:

’’ایک بھنگن مرے ہوئے کتے کے گوشت کو مردہ انسان کی کھوپڑی میں ڈال کر لیے جارہی تھی یہ گوشت شراب میں پکایا گیا تھا۔اس میں سے گندی بو آرہی تھی اور اسے ایک ایسے گندے کپڑے سے ڈھانپا ہوا تھا جو عورت کے حیض کے خون میں آلودہ تھا۔اس کیفیت کو دیکھ کر ایک شخص نے بھنگن سے سوال کیا کہ کتا پلید اور مردہ انسان کی کھوپڑی قابل نفرت ہے شراب پلید عورت کے حیض کا کپڑا پلید جس سے کوئی چھونا بھی پسند نہ کرے۔اس سے بدبو آرہی ہےل پھر اس کھوپڑی رپ نقاب کیوں ڈال رکھا ہے۔اس کو چھپانے سے کیا فائدہ تو بھنگن نے جواب دیا کہ یہ تمام اشیا

انتہائی گندی اور قابل نفرت ہیں مگر غدار کی نگاہ ان سے بھی بری ہے۔ان اشیاہ کو میں ڈھانپ کر اس لیے لے جا رہی ہوں کہ کسی غدار کی بری نظر لگنے سے اور زیادہ خراب ہو جائیں گی''۔

غداروں کے متعلق میرے دلی جذبات کا اظہار ایک اور واقعہ سے بھی ہوتا ہے کہ ابھی حال ہی کا ذکر ہے کہ ''ریاست'' کے ایک نا قابل فراموش کالم میں ایک جگہ مسٹر پیارے لال شاکر میرٹھی کا ذکر آ گیا تھا جو''ریاست'' میں مترجم تھے اور بعد میں مبارک حسین کی طرح نواب بھوپال کے روپیہ سے خرید لیے گئے۔اس مضمون کو دیکھ کر میرے دوست نیاز فتح پوری ایڈیٹر''نگار'' لکھنو کا خط ایڈیٹر''ریاست'' کے نام پہنچا جس میں آپ نے لکھا کہ پیارے لال صاحب شاکر آج کل بہت مصیبت میں ہیں ۔لکھنو میں ایک دوست کے مکان میں رہتے ہیں بیمار اور قابل رحم ہیں اور یہ ہمدردی کے مستحق ہیں ان کے متعلق آئندہ کچھ نہ لکھا جائے اور معاف کر دیا جائے اس خط کا جواب ایڈیٹر''ریاست'' نے نیاز صاحب کو بہت مختصر دیا جو یہ تھا:

''غدار مستحق ہیں کہ ان کے مرنے کے بعد ان کی قبر کو بھی ٹھوکر لگائی جائے''۔

میرے یہ جذبات شاید بعض لوگوں کے حلقوں میں ناپسند کیے گئے ہوں مگر واقعہ یہی ہے کہ مجھے غداروں سے بہت سخت نفرت ہے اور کوئی غدار کسی فرد واحد کے ساتھ غداری کرے یا ملک وقوم کے ساتھ میرے خیال میں وہ اس بات کا مستحق ہے کہ اس کی زندگی مصائب ومشکلات میں بسر ہو مرنے کے بعد اس کو دوزخ یا عذاب نصیب ہو۔اور لوگ اس کے مرنے کے بعد اس کی قبر کو ٹھوکریں لگائیں۔

☆☆☆

سی آئی ڈی کے معتبر رپورٹر

کرسمس کا زمانہ کلکتہ میں بہت پر رونق ہوتا ہے ۔ اور لوگ دور دور سے آتے ہیں چند برس پہلے میں بھی کرسمس کے دنوں کلکتہ گیا ۔ ایک بار کلکتہ گیا تو وہاں میجسٹک ہوٹل میں ٹھہرا ۔ یہ ہوٹل اخبار ''سٹیس مین'' کے دفتر کے قریب تھا ۔ اور اس کے مالک مہاشہ کرشن ایڈیٹر ''پرتاب'' کے داماد تھے میں نے ہوٹل کی کتاب میں اپنا نام و پتہ لکھا ۔ تو ہوٹل کے مالک کو معلوم ہو گیا کہ میں فلاں شخص ہوں ۔ مگر میری کوئی بات چیت نہ ہوئی ۔ کیونہ میں بغیر ضرورت کے بلاوجہ کسی سے بات چیت نہیں کرتا ۔ اکثر ایسا ہوا کہ ریل کے طویل سفر میں بھی ہمراہیوں سے کبھی نہ پوچھا کہ کہاں جاؤ گے اور نہ بتایا ۔ کہ میں کون ہوں اور پڑوسیوں کے متعلق کئی کئی برس تک علم نہ ہوا ۔ کہ یہ کون ہیں اور کیا کرتے ہیں ۔

میں جب کبھی بمبئی کلکتہ یا کسی دوسرے بڑے شہر میں جاؤں تو میں اپنے جانے کی اطلاع سوائے ایک آدھ گہرے دوست کے کسی کو نہیں دیتا ۔ کیونکہ اطلاع ہونے کی صورت میں سیر تفریح اور بزنس میں رکاوٹ ہوتی ہے ۔ عام دوستوں سے اس روز ملتا ہوں ۔ جب واپس جانے کے لیے تیار ہو جاؤں ۔ میں اس سفر میں کلکتہ میں ایک ہفتہ کے قریب ٹھہرا ۔ سیر و تفریح میں بھی بہت مصروف رہا ۔ اور بزنس کے لیے بھی بڑی بڑی فرموں کے مالکان سے ملا ۔ جب وہاں سے روان ہونے میں دو دن باقی تھے تو عنایت صاحب مرحوم ایڈیٹر اخبار ''چونچ'' کو معلوم ہوا کہ میں کلکتہ میں ہوں ۔ عنایت صاحب فلمی اخبار نکالتے تھے اور بہت دلچسپ آدمی تھے ۔ اور آپ کا زیادہ تر وقت طوائفوں اور فلم ایکٹرسوں کے ہاں گزرتا تھا آپ صبح کے وقت ملنے کے لیے تشریف لائے بہت دیر تک باتیں ہوئیں اس زمانہ میں فلم ایکٹریس مس کجن کو بہت عروج حاصل تھا ۔ آپ مجھ سے مل کر گئے تو مس کجن کے ہاں پہنچے اور آپ نے مس کجن کو بتایا کہ دیوان سنگھ کلکتہ میں ہے اور میجسٹک ہوٹل میں مقیم ہے ۔

میں دوپہر کے وقت اپنے کمرہ میں لیٹا ہوا تھا تو ہوٹل کے دفتر کا چپڑاسی آیا کہ کوئی صاحب ٹیلی فون پر بلاتے ہیں میں ٹیلی فون پر گیا اور پوچھا کہ کون صاحب ہیں تو جواب ملا کہ میں مس کجن ہوں۔ عنایت صاحب ایڈیٹر چونچ سے معلوم ہوا کہ آپ کلکتہ میں آئے ہوئے ہیں آپ مہربانی فرما کر شام کو میرے ہاں چائے پر آئیے۔ میں نے جواب دیا کہ ایک دو دن میں واپس جا رہا ہوں کام بہت زیادہ ہے اس لیے حاضر نہ ہو سکوں گا معافی چاہتا ہوں اور آپ کا شکر گزار ہوں۔ اس پر مس کجن نے کہا کہ نہیں چاہے کچھ ہو آپ تشریف ضرور لائیے میں نے پھر کہا کہ میں نہ آ سکوں گا۔ آپ نے پھر اصرار کیا اور کہا کہ میں ہوٹل ہی میں رہوں میں شام کو چار بجے وہ اپنی کار لینے کے لیے بھیجیں گی۔ یہ کہہ کر آپ نے ٹیلی فون بند کر دیا۔

شام کو چار بجے مس کجن کی موٹر میں عنایت صاحب تشریف لائے اور میں ان کے ساتھ مس کجن کے ہاں گیا۔ دو تین اور اصحاب بھی موجود تھے چائے پر باتیں ہوتی رہیں۔ مس کجن نے اپنے گانے کے گراموفون پر ریکارڈ سنائے اور جو اس نے بھرے گئے تھے۔ جب رخصت ہونے لگا تو مس کجن نے کہا کہ رات کو دس بجے تھیٹر میں آئیے جہاں کہ وہ کام کرتی ہیں۔ وہ اپنا کام دکھانا چاہتی ہیں میں نے کہا میں نہ آ سکوں گا۔ مگر آپ نے عنایت صاحب سے کہا کہ لازمی طور پر لے آئیے۔

اس روز میں کچھ تو دوستوں سے مل چکا تھا کیونکہ کلکتہ سے واپس دہلی جانے والا تھا۔ ہوٹل واپس پہنچنے کے بعد مس کجن کی کار تو چھوڑ دیا ایک ٹیکسی لی اور سردار سمپورن سنگھ انسپکٹر پولیس کے مکان پہنچا۔ یہ میرے ہم وطن اور رشتہ میں بھتیجے ہوتے تھے۔ چند منٹ ان سے باتیں کیں اور ان کے بچوں کو کچھ دے کر دوسرے دوستوں سے ملنے گیا۔ دوستوں سے ملنے کے بعد مارکیٹ گیا وہاں سے کچھ سامان اور ایک درجن چھوٹے طوطے خریدے (یہ طوطے چڑیوں کے سائز اور مختلف رنگوں کے بہت خوبصورت ہوتے ہیں اور غالباً جاپان سے آتے ہیں) سامان خریدنے کے بعد واپس ہوٹل پہنچا۔

کھانا کھایا دس بجے کے قریب ماسٹر عنایت صاحب تشریف لائے اور ان کے ساتھ تھیٹر گیا۔ (یہ تھیٹر غالباً ایک رائے بہادر کا تھا جس میں مس کجن ڈیڑھ ہزار روپیہ ماہوار پر ملازم تھیں۔ اور چونکہ رائے بہادر صاحب ان پر بہت مہربان تھے۔ ان کی پوزیشن تھیٹر میں ایک ڈکیٹٹر کی سی تھی۔ یعنی جو چاہتیں کرتیں) ہم لوگ تھیٹر میں پہنچے وہاں رائے بہادر صاحب ملے راؤ راجہ سیکر بھی تشریف فرما تھے۔ رات کو دو بجے تک تھیٹر دیکھا اور دیکھنے کے بعد ہوٹل پہنچا اور کپڑے بدل کر لیتا تھا۔ کہ نیند آ گئی ابھی آنکھ لگے دس پندرہ منٹ ہی ہوئے تھے کہ میرے کمرہ کے دروازہ کو کسی نے کھٹکھٹایا۔ میں نے سمجھا کہ ہوٹل ہے کسی شخص نے غلطی سے اس کمرہ کو کسی دوسرے کا کمرہ سمجھ لیا ہوگا۔ میں نے آواز دی۔ آغلط کمرہ کھٹک کھٹا رہے ہیں اس کے بعد پھر دروازہ کھٹکھٹایا گیا۔ میں نے خیال کیا کہ رات کو کوئی مسافر شراب پیے آیا ہے اور جو میرے کہنے کے باوجود پھر کھت کھٹایا گیا تو میں نے ڈانٹ کر کہا کون ہے چلے جاؤ یہاں سے۔ میرے اس ڈانٹنے کے بعد کوئی جواب نہ آیا مگر دروازہ پھر کھٹکھٹایا گیا۔ مجھے بے حد غصہ آیا میں اٹھا اور دروازہ کھولا تا کہ رات کے اڑھائی بجے دروازہ کھٹکھٹانے والے کو دیکھوں کہ وہ کون ہے اور کیوں ایسا کر رہا ہے۔ جب دروازہ کھولا تو دیکھا کہ ایک پولیس انسپکٹر اور اس کے ساتھ چھ سب انسپکٹر اور کنسٹیبل وردیوں میں موجود تھے۔ انسپکٹر نے پوچھا کہ آپ کا نام سردار دیوان سنگھ ہے۔ میں نے جواب دیا کہ ہاں میرے اس کہنے پر یہ لوگ کمرہ کے اندر آ گئے اور انسپکٹر نے کہا کہ تلاشی لینی ہے اور آپ کو گرفتار کرنا ہے۔ میں نے اطمینان کے ساتھ بہت اچھا پہلے تلاشی لے لیجیے۔

ان لوگوں نے میرے سامان کی تلاشی لینی شروع کی۔ ہر چیز اور کاغذ کو غور کے ساتھ دیکھتے اور پڑھتے رہے۔ ان کے ساتھ ایک سکھ بزرگ بھی تھے جو غالباً ہیڈ کنسٹیبل ہوں گے۔ یہ اس لیے تھے کہ اگر کوئی گورمکھی کا خط وغیرہ ہو تو پڑھ سکیں۔ جب انہوں نے میرے اٹاچی کیس کی تلاشی لی تو اس میں انہوں نے ریوالور دیکھا۔

ریوالور کو دیکھتے ہی ان کی باچھیں کھل گئیں جیسے کوئی گم شدہ چیز مل گئی ہو۔ خوشی کے ساتھ ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ ریوالور کو انہوں نے لیا تو اس میں سے گولیاں نکال کر علیحدہ کیں یہ چھ گولی کا ریوالور تھا۔ ریوالور پر قبضہ کرنے کے بعد انسپکٹر نے مجھ سے انٹروگیشن شروع کیا یہ ریوالور کہاں سے لیا میں نے کہا دہلی سے۔

کس سے لیا۔

الٰہی بخش اینڈ سنز سے۔

یہ الٰہی بخش اینڈ سنز کون ہیں۔

سوداگران بندوق۔

تو کیا یہ ناجائز ریوالور بھی فروخت کرتے ہیں۔

نہیں۔

تو پھر یہ ریوالور انہوں نے آپ کو کیوں دیا۔

لائسنس کے باعث

اوہ! ہمیں اب یہ بھرا دیتے ہو کہ لائسنس کے ساتھ لائسنس کہاں ہے؟

میں نے اس اٹاچی کیس کے اوپر کے حصہ میں سے ریوالور کا لائسنس نکال کر ان کو دیا انہوں نے لائسنس دیکھا کبھی اسے اوپر دیکھتے ہیں کبھی نیچے کبھی دستخطوں کو کبھی مہر کو ۔ جب انہوں نے اس لائسنس کو اچھی طرح سے دیکھ لیا تو اس کے بعد یہ لوگ بہت مایوسی سی محسوس کر رہے تھے ۔ گویا کہ ہاتھ آیا شکار ہاتھ سے نکل گیا۔ ان لوگوں نے سامان اچھی طرح سے دیکھا۔ جب اور کوئی شے نہ نکلی تو مجھے گرفتار کر کے اپنے ساتھ ایک تھانہ میں لے گئے ۔ وہاں انہوں نے روزنامچہ میں رپورٹ درج کی کہ تلاشی لی گئی تلاشی میں ایک ریوالور اور ایک لائسنس نکلا جو قبضہ میں لے لیا گیا ہے یہ لائسنس غالباً جعلی ہے۔ اور ملزم کو صبح کمشنر بہادر پولیس کے پیش کیا جائے گا۔ اس وقت رات کے چار بجے ہوں گے سردیوں کا زمانہ دسمبر کا مہینہ آٹھ بجے سورج نکلا اور میں دس بجے

تک تھانہ کے دفتر کے اسی کمرہ کے اندر ایک پولیس کنسٹیبل کی نگرانی میں بیٹھا رہا۔ دس بجے یہ لوگ مجھے سی آئی ڈی (جس کو کلکتہ میں سپیشل برانچ کہتے ہیں) کے دفتر لے گئے۔ وہاں مجھے ایک برآمدہ میں کرسی پر بٹھا دیا گیا اور میں انتظار کرنے لگا کہ اب کمشنر پولیس کے سامنے پیش کیا جاؤں گا۔ اس سپیشل برانچ کے متعلق معلوم ہوا کہ یہ وہی دفتر ہے جس کو بنگال کے انارکسٹوں کے متعلق سپیشل حقوق حاصل ہیں۔ یعنی کمشنر پولیس جس شخص کو چاہے پندرہ روز کے لیے بغیر کسی مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیے یا ریمانڈ لیے اپنے قبضہ میں جہاں چاہے رکھ سکتا ہے۔ وہاں کے کنسٹیبلوں سے جو میری نگرانی پر تھے باتوں باتوں میں یہ معلوم ہوا کہ تمام بنگال میں انارکسٹوں کے معاملات میں اس دفتر کے ہاتھ میں ہیں اور اس کا سٹاف تمام بنگال میں ایک جال کی طرح پھیلا ہوا ہے کیونکہ بنگال میں انارکسٹ کافی تعداد میں ہیں۔

مجھے معلوم ہوا کہ پولیس کمشنر تو انگریز ہے جو دوسرے صوبجات کے انسپکٹر جنرل پولیس کے عہدہ کے برابر سمجھا جاتا ہے۔ اور ڈپٹی کمشنر پولیس ایک ہندوستانی عیسائی ہیں جن کا نام مسٹر بزجی تھا اور یہ اس سپیشل برانچ کی اوپر کی منزل میں ہی رہتے تھے۔ میں دس بجے سے چار بجے شام تک اس سپیشل پولیس کے دفتر کے برآمدہ میں ایک کرسی پر بیٹھا رہا۔ میرے کسی دوست کو میرے متعلق کوئی علم نہ تھا۔ کہ کیا ہوا اور میں کہاں ہوں۔ بیٹھا بیٹھا تنگ آ گیا نہ کوئی بات کرنے والا۔ نہ کوئی اخبار کتاب جس سے وقت کٹے۔

چار بجے ڈپٹی کمشنر پولیس اپنے دوسرے کاموں سے فارغ ہو کر دفتر میں تشریف لائے تو مجھے ان کے سامنے پیش کیا گیا اور انٹیروگیشن یعنی گفت وشنید کا سلسلہ شروع ہوا جو یہ تھا:

آپ کا نام۔

دیوان سنگھ۔

کہاں رہتے ہیں۔

دہلی میں۔

کلکتہ کب آئے۔

ایک ہفتہ ہوا۔

کیوں آئے۔

کرسمس دیکھنے اور بزنس کے متعلق لوگوں سے ملنے۔

آپ بمبئی کیوں نہیں گئے کلکتہ کیوں آئے۔

کیونکہ کرسمس کے دنوں میں کلکتہ میں بہت رونق ہوتی ہے۔

کیا آپ کو کبھی سزا ہوئی۔

میرا خیال ہے کبھی نہیں ہوئی۔

کیا آپ کبھی گرفتار کیے گئے۔

درجنوں بار۔

(حیران ہوکر) درجنوں بار کس الزام میں۔

مختلف الزامات میں۔

وہ الزامات کیا تھے۔

کوکین' امانت میں خیانت' پریس پروٹیکشن ایکٹ' بغاوت' توہین' مار پیٹ کرنا اور موٹر کو تیز چلانا وغیرہ۔

خوب یہ گرفتاریاں کب ہوئیں۔

پچھلے کئی برس میں۔

کلکتہ میں کس کس سے ملے۔

سردار نرنجن سنگھ طالب ایڈیٹر ''دیش درپن'' سرایس سرما ایم ایل اے ایڈیٹر ''دپ'' عنایت صاحب ایڈیٹر ''چونچ'' سردار کپور سنگھ بڑی سوداگر موٹر مسٹر دینا

ناتھ آف وشوامتر سردار سمپورن سنگھ انسپکٹر پولیس اور مس کجن وغیرہ سے۔

آپ مس کجن سے کیوں ملے۔

اس نے چائے پر بلایا تھا۔

(مسکراتے ہوئے) خوب۔ ایڈیٹروں کی چائے پارٹی فلم ایکٹرسوں کے ہاں ضرور ہوتی ہے۔

(میں مسکراتے ہوئے) آپ کا شکر گزار ہوں کہ میری گرفتاری ہوٹل میں ہوئی۔ اگر مس کجن کے ہاں آپ گرفتار کرتے تو آج اخبارات میں شائع ہوتا کہ ایڈیٹر ''ریاست'' مس کجن کے ہاں پکڑا گیا۔

یہ سن کر ڈپٹی کمشنر نے قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔

اس قہقہہ کے بعد میں نے سنجیدگی کے ساتھ ڈپٹی کمشنر سے پوچھا کہ اگر کوئی ہرج نہ ہو تو ی بتائیے کہ میری گرفتاری کیوں ہوئی اور اس کا سبب کیا ہے۔

مہاراجہ پٹیالہ کرسمس کے باعث کلکتہ آئے ہیں اور یہاں ہیں ہماری اطلاع ہے کہ آپ ان کو قتل کرنا چاہتے ہیں اور آپ بہت بڑے انارکسٹ ہیں۔

یہ سن کر میں مسکرا دیا اور کہا کہ آپ لوگوں کے ذرائع واقفیت بلا شبہ بہت وسیع ہیں اور قابل اعتماد ہیں۔ میرے یہ الفاظ سن کر ڈپٹی کمشنر صاحب کچھ تھوڑے جھینپ سے گئے۔ اور پھر باتیں شروع ہوئیں آپ نے کہا ریوالور کب لیا۔

چند برس ہوئے۔

کیا یہ لائسنس جعلی ہے یا اصلی۔

آپ دیکھ لیجیے کہ اصلی ہے یا جعلی۔

ہاں ہم نے دہلی سے پوچھا ہے۔ ابھی تک وہاں سے جواب نہیں آیا۔ معلوم تو ہوتا ہے کہ جعلی نہیں کیونکہ کسی شخص کو جعلی لائسنس رکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ جب کہ ناجائز ریوالور رکھنے والا ریوالور کو چھپا کر پوشیدہ رکھ سکتا ہے۔ آپ کا سردار سمپورن سنگھ

پولیس انسپکٹر سے کیا تعلق ہے۔

وہ میرے رشتہ میں بھتیجے ہوتے ہیں۔

اس پر آپ نے سردار سمپورن سنگھ کے ساتھ ٹیلی فون پر بات چیت کی جو یہ تھی۔

کیا آپ دہلی کے سردار دیوان سنگھ ایڈیٹر ''ریاست'' کو جانتے ہیں۔

ہاں اچھی طرح سے وہ رشتہ میں میرے چچا ہوتے ہیں۔کل مجھ سے ملنے کے لیے بھی آئے تھے آج وہ چلے گئے کیونکہ انہوں نے سٹیشن پر اپنے لیے سیٹ ریزرو کروائی تھی۔

کیا وہ آج جانے والے تھے۔

ہاں وہ کل مجھ سے کہتے تھے کہ آج جائیں گے۔انہوں نے مجھے تین بجے والی گاڑی میں ایک برتھ ریزرو کروائی تھی۔

وہ گرفتار ہیں اور یہاں سپیشل برانچ میں ہیں۔

گرفتار ہیں کس جرم میں؟

ان پر الزام ہے کہ وہ مہاراجہ پٹیالہ کو قتل کرنے کے لیے کلکتہ آئے ہیں۔

کیا ان کی تلاشی میں بھی کچھ نکلا۔

ہاں ایک ریوالور۔

(حیرانی کے ساتھ) ریوالور بغیر لائسنس کے ریوالور۔

ریوالور کا لائسنس بھی ساتھ ہے۔

اگر ریوالور کا لائسنس بھی ساتھ ہے تو یہ تو سردار دیوان سنگھ کے کریڈٹ کی بات ہے کہ وہ قابل اعتماد سمجھے جاتے۔

ہاں یہ ٹھیک ہے مگر ہمارے آدمی نے جو پنجاب کا سکھ ہے اور ہمارے محکمہ میں ملازم ہے اطلاع دی تھی کہ سردار دیوان سنگھ مہاراجہ پٹیالہ کے پرانے دشمن ہیں اور مہاراجہ کو قتل کرنے کے لیے کلکتہ آئے ہیں۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیا معاملہ ہے آپ فوراً موٹر میں میرے پاس آئیں۔

ڈپٹی کمشنر کا یہ ٹیلی فون سن کر سردار سمپورن سنگھ سپیشل برانچ میں پہنچے۔ وہاں ان سے ڈپٹی کمشنر کی وہی باتیں ہوئیں جو ٹیلی فون پر ہوئی تھیں۔ اس کے بعد ڈپٹی کمشنر مجھ سے مخاطب ہوئے۔

آپ کو ریوالور کا لائسنس کیوں ملا۔

مہاراجہ پٹیالہ وغیرہ متعدد والیان ریاست دشمن ہیں۔ اور خیال تھا کہ یہ لوگ شاید نقصان پہنچائیں۔ آپ نے اگر دہلی جانے کے لیے اپنی برتھ ریزرو کروائی تھی تو کیا آپ کے پاس وہ ٹکٹ موجود ہے جو آٹھ آنہ ریزرویشن فیس دے کر لیا جاتا ہے۔

ہاں (میں نے اپنی پاکٹ بک میں سے وہ ٹکٹ نکال کر دکھایا) یہ ٹکٹ ہے۔

ڈپٹی کمشنر نے دیکھا تو ان کو یقین ہو گیا کہ ان کے سی آئی ڈی کے برخوردار نے جو اطلاع اپنے محکمہ کو دی تھی وہ غلط تھی۔ اس ڈپٹی کمشنر نے افسوس کا اظہار کیا۔ کہ خواہ مخواہ تکلیف ہوئی میں نے کہا کہ معمولی بات ہے۔ ہم لوگ تکلیفوں کے لیے ہی پیدا ہوئے ہیں۔ ہمارے لیے یہ کوئی نئی اور غیر متوقع بات نہیں۔ جب تک زندگی ہے تکلیفیں ہمارا ساتھ دیں گی۔

اس گفتگو کے بعد کمشنر پولیس نے فیصلہ کیا کہ میں سردار سمپورن سنگھ کے ساتھ ہوٹل میں جاؤں اور وہاں سے سامان لے کر سردار سمپورن سنگھ مجھے اپنے تھانہ میں لے جائیں۔ وہاں اپنے پاس رات کو رکھیں کیونکہ دہلی کے لیے میل شام کو چار بجے نکلتی ہے۔ اگلے روز وہ مجھے سٹیشن پر لے جائیں اور گاڑی میں بٹھانے کے بعد ڈپٹی کمشنر کو رپورٹ کریں کہ دیوان سنگھ کلکتہ سے چلا گیا ہے۔ چنانچہ سردار سمپورن سنگھ سرکاری موٹر میں میرے ساتھ آئے۔ خریدے گئے طوطوں کے لیے دن بھر انہ دانہ پانی مجھے بہت تکلیف ہوئی۔ ان کو دانا اور پانی ڈالا۔ سامان باندھا اور اسی گاڑی میں ہم لوگ مع سامان سردار سمپورن سنگھ کے گھر گئے۔ ان کا مکان ان کے تھانہ کے اوپر تھا۔ سردار

سمپورن سنگھ نے میری یعنی ملزم کی آمد کی رپورٹ تھانہ کے روزنامچہ میں لکھی کہ میں ڈپٹی کمشنر پولیس کے ہاں سے اس تھانہ میں گرفتاری کی حالت میں لایا گیا ہوں ملزم کو رات بھر رکھا اور کل جا کر دوپہر کی گاڑی میں سوار کرایا جائے گا۔رپورٹ لکھنے کے بعد ہم نے کھانا کھای۔ا کھانا کھانے کے بعد ہم لوگ موٹر میں سیر کے لیے گئے ۔دو تین گھنٹہ سیر کرتے رہے واپس آئے بستر ہ تیار تھا۔میں سو گیا صبح غسل وغیرہ سے فارغ ہوا چائے پی سدرنجن سنگھ وغیرہ دوستوں کو رات ہی کو علم ہو گیا تھا کہ میں گرفتار کیا گیا تھا ۔ارو رہا ہو کر سردار سمپورن سنگھ کے تھانہ میں ہوں ۔یعنی چچا جان برخوردار بھتیجہ کی حراست میں ہیں ۔یہ دوست یہاں ملنے آئے دو تین بجے تک یہاں دوستوں کی محفل گرم رہی ۔تین بجے میں اپنے دوستوں اور اپنے سامان کے ساتھ سردار سمپورن سنگھ کی حراست میں ہی سٹیشن آیا اور گاڑی میں سوار ہوا۔اور سردار سمپورن سنگھ نے اپنے افسروں کے حکم کی تعمیل کرنے کے عدسپیشل پولیس میں رپورٹ کی ہو گی کہ ملزم دیوان سنگھ ان کی موجودگی میں ریل میں سوار ہو کر دہلی چلا گیا ہے اور اب مہاراجہ پٹیالہ کو کلکتہ میں کوئی خطرہ نہیں۔

علامہ مشرقی کی گرفتاری اور رہائی

میں دہلی جیل میں تھا رات کا وقت تھا۔ کہ بڑے دروازہ کی طرف اس وارڈ کی طرف جو جیل کے جنوب مغربی کونہ میں ہے ۔ کچھ آدمی جاتے آتے معلوم ہوئے ۔ میں نے پہرہ والے ایک نمبر دار سے پوچھا کہ کیا معاملہ ہے آج یہ گڑبڑ کیسی ہے ۔تو اس نمبر دار نے جا کر پتہ لیا اور واپس آ کر بتایا کہ کوئی بڑا لیڈر جیل میں لایا گیا ہے اس نمبر دار کو کچھ معلوم نہ ہو سکا کہ کون ہے میں معلوم کرنے کا خواہش مند تھا۔ کہ کون ہے مگر رات کو کچھ پتہ نہ چل سکا۔صبح اٹھتے ہی جب اس کمرے کا جس میں ہم لوگ تھے دروازہ کھلا تو میں نے وارڈ سے پوچھا اس وارڈ نے بتایا کہ خاکساروں کے لیڈر علامہ مشرقی صاحب گرفتار کیے جا کر جیل میں لائے گئے ہیں ۔جیل کے اندر بھی ان پر سخت پہرہ ہے کہ کوئی شخص ان سے بات چیت نہ کرے ۔تا کہ یہ اپنے مقلدین کو جیل سے باہر کوئی پیغام نہ بھیج سکیں ۔ کچھ دیر کے بعد معلوم ہوا کہ جیل سے باہر خیمے نصب ہو چکے ہیں اور پولیس جیل کی دیوار سے باہر پہرہ دے رہی ہے ۔تا کہ اگر خاکسار جیل پر حملہ کریں تو ان کو روکا جا سکے ۔

میں نے دوپہر کے وقت بھنگیوں کے نمبر دار کو بلایا اور اس کی معرفت چونکہ علامہ مشرقی کے پاس صرف بھنگی ہی صفائی کے لیے جا سکتے تھے ۔علامہ کو پیغام بھیجا کہ کوئی خدمت ہو تو بتائیے میں یہاں ہوں اس لیے ایک طرح سے میرا فرض ہے کہ میں بطور میزبان آپ کی خدمت انجام دوں ۔علامہ کا جواب شکریہ کی صورت میں پہنچا ۔اس وایوا وسی (وایوا وسی اس امتحان کو کہتے ہیں جو بغیر پرچوں اور کتابوں کے صرف زبانی سوالات پوچھ کر کیا جاتا ہے ۔انڈین سول سروس کے امتحان میں اکثر لڑکے وایوا وسی کے امتحان میں فیل ہو جاتے ہیں کیونکہ انہوں نے کتابوں کی رٹ لگائی ہوتی ہے عام واقفیت نہیں ہوتی ۔اور مختلف قسم کے سیاسی اور غیر سیاسی سوالات کا جواب نہیں دے سکتے) کی مہمانی اور میزبانی کے علاوہ جیل میں کوئی خدمت انجام بھی کیا دی جا سکتی ہے

۔ کیونکہ ہم دونوں ہی سرکاری مہمان تھے میں مولانا سے مل نہ سکا کیونکہ ان کے پاس سوائے دو تین خدمت گزار قیدیوں اور بھنگی کے کسی دوسرے قیدی کو بھی جانے کی اجازت نہ تھی۔ مگر آپ کے حالات سے دلچسپی تھی۔ میں یہ حالات معلوم کرتا رہا جس روز لاہور میں خاکساروں پر فائر ہوا اور غالباً بیس کے قریب خاکسار مارے گئے اور بہت ہی گرفتاریاں ہوئیں اسی رات کو مولانا کو قرول باغ دہلی سے گرفتار کیے جا کر دہلی جیل میں لائے گئے تھے چنانچہ ان کی گرفتاری کے چند گھنٹہ بعد یعنی اگلی صبح کو جو اخبارات آئے ان میں مولانا کی گرفتاری اور لاہور کے فائرنگ کی تفصیلات تھیں۔

میں علامہ مشرقی سے آج تک کبھی نہ مل سکا تھا۔ کیونکہ کسی لیڈر سے بھی میں نے کبھی ملنے کی کوشش یا خواہش نہ کی تھی۔ اور صرف ان لیڈروں سے واقفیت ہے جن کے ساتھ گہرے ذاتی تعلقات ہیں جیل میں میری خواہش تھی کہ آپ سے ملتا اور خاکسارازم کے متعلق باتیں ہوتیں مگر میں آپ سے مل نہ سکتا تھا۔ کیونکہ اس کی اجازت نہ تھی۔ میں آپ کے حالات معلوم کرنے میں مسلسل دلچسپی لیتا رہا دوپہر کو گودام کے قیدی کلرک سردار پیارا سنگھ (یہ صاحب پہلے پوسٹ ماسٹر تھے اور ترن تارن کے رہنے والے تے ایک مقدمہ میں قید ہو گئے تھے) سے معلوم ہوا کہ علامہ مشرقی نے اپنی خوراک اور ضروریات کے لیے ایک طویل فہرست پنسل سے لکھ کر بھیجی ہے۔ جس میں چاول گوشت مچھلی انڈے مرغی تمباکو اعلیٰ خالص گھی اور مصالحہ وغیرہ بیس کے قریب اشیاء ہیں۔ مولانا نے منظوری تو سوا روپیہ روزانہ کی ہے مگر یہ انڈنٹ کافی رقم کا ہے جیل والے مولانا کا مذاق اڑا رہے ہیں کہ کل تو لاہور میں فائرنگ ہوا۔ خاکساروں کا ابھی تک پوسٹ مارٹم بھی نہیں ہوا اور جو خاکسار گرفتار ہیں ان کے گھروں میں ماتم ہو رہا ہوگا۔ مگر یہ علامہ قورمہ، پلاؤ اور مچھلی کے کباب اڑانے کی فکر میں ہیں میں نے سردار پیارا سنگھ سے کہا کہ وہ فہرست مجھے دکھایئے۔ اس فہرست کے نہ تو جیل میں کسی ریکارڈ میں رکھنے کی ضرورت تھی اور نہ یہ کوئی سرکاری دستاویز تھی۔

سردار پیارا سنگھ نے علامہ مشرقی کے ہاتھ کی پنسل سے لکھی ہوئی یہ فہرست مجھے لادی اور میں اس فہرست کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔اور مجھے خیال آیا کہ اگر یہی واقعات مہاتما گاندھی کے ساتھ پیش آتے تو وہ آج یقیناً مرن برت نہیں تو تین ہفتوں کا فاقہ ضرور شروع کردیتے۔

اس فہرست کے پہنچنے کے دو گھنٹہ بعد سردار پیارا سنگھ ایک اور سلپ لائے جو مولانا نے سخت الفاظ کے ساتھ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ جیل کو بھیجی اور جس میں تحکمانہ لہجہ میں شکایت کی گئی تھی کہ سامان اب تک کیوں نہیں پہنچا۔اس کے بعد شام کو ایک اور سلپ پہنچی جس میں دوسری اشیاء کے علاوہ کاغذ پنسل کا بھی مطالبہ کیا گیا تھا۔یہ سلپیں سردار پیارا سنگھ میرے پاس ہی چھوڑ گئے کیونکہ ان کے لیے یہ بے معنی پرزے تھے۔مگر میں نے ان کو بطور تبرک کے احتیاط سے اپنی کتابوں میں رکھ لیا۔جو اب بھی میرے پاس موجود ہیں اور شاید پچاس ساٹھ یا سو سال کے بعد یہ ایک تاریخی حیثیت احاصل کر سکیں۔

مولانا بچارے کو تو علم ہی نہیں مگر ان کی ان تحریروں کو دیکھ کر جیل کے افسران ان کا مذاق اڑتے تھے۔اور میں جب اس مذاق کے متعلق سنتا تو مجھے بے حد افسوس ہوتا کیونکہ میرا خیال تھا کہ اگر پنجاب میں سے سر سکندر حیات کی بیوروکریسی ختم کی جاسکتی ہے تو پنجاب کے زمیندار سسٹم پر چوٹ لگائی جاسکتی ہے۔تو صرف خاکساروں کے ذریعہ۔کیونکہ احراریوں کے اثر و اقتدار ختم ہو چکا تھا۔مسلم لیگ میں کوئی جان نہیں تھی اور مسلم لیگی خود خان بہادروں اور خان صاحبوں کا ایک مجموعہ تھے۔چنانچہ میں اسی لیے خاکسار تحریک کی ہمیشہ حوصلہ افزائی کرتا اور ان کے حق میں لکھتا اور میری اس خدمت یا تعریف کے باعث خاکساروں نے میری سلامی مقرر کی تھی۔یعنی جب میں ان کے کیمپ میں جاؤں تو یہ میری سلامی دیں۔مگر جب علامہ مشرقی کا ذہنی افلاس اور ان کی حرکات دیکھیں تو مجھے یقین ہو گیا کہ علامہ کی رہنمائی میں خاکسار تحریک کا

مستقبل بہت تاریک ہے۔ان حالات کو دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ علامہ کا کانگرس گورنمنٹوں کے زمانہ میں یو پی گورنمنٹ سے معافی مانگنا اور رہائی حاصل کرنا تعجب انگیز نہ تھا۔ اور ایسا کمزور بزدل لالچی اور عاقبت نا اندیش لیڈر گورنمنٹ کے ہاتھوں ہر وقت مارا جا سکتا ہے۔

مولانا چند روز ہی میں جیل میں رہے ان کے حالات کا بغور مطالعہ کرتا رہا اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ مولانا کسی تحریک کے آرگنائزر کرنے میں یقیناً ایک لاجواب شخصیت ہیں مگر اس تحریک کو چلانا اور مشکلات کا مقابلہ کرنا ان کے بس کا روگ نہیں۔ مولانا کے متعلق جیل کے ان حالات کے بعد آ کی دہلی جیل سے روانگی بے حد دلچسپ ہے۔

سہ پہر کا وقت تھا۔جیل کے دروازہ کے باہر اور جیل کی دیوار کے ساتھ ساتھ مسلح پولیس کا پہرہ تھا تا کہ کوئی شخص جیل پر حملہ نہ کر سکے جیل کے سپرنٹنڈنٹ مسٹر لوئیس (جو دہلی میں ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ بھی تھے) جیل میں تشریف لائے۔ان کے ساتھ شہر کے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس متعدد انسپکٹر اور سب انسپکٹر اور موٹریں تھیں۔ان لوگوں کا مقصد یہ تھا کہ علامہ کو ریل میں سوار کر را کا دیلیو جیل (صوبہ مدراس لے جائیں جہاں آپ نظر بند رکھے جائیں گے۔مسٹر لوئیس جب ان کو جیل سے روانہ کرنے کے لیے جیل میں آئے تو بہت پریشان تھے۔کیونکہ جیل سے کچھ فاصلہ پر خاکسار چکر لگا رہے تھے۔شہر میں خاکساروں کا اجتماع تھا۔خاکسار عدم تشدد پر یقین نہیں رکھتے۔ بلکہ علانیہ تشدد کے حق میں ہیں مسٹر لوئیس اور ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس کو یہ فکر لاحق کہ جب وہ علامہ کو جیل سے باہر نکالیں گے اگر علامہ نے دروازہ پر ہی جانے سے انکار کر دیا یا موٹر سے چھلانگ لگا دی اور خاکساروں اور پولیس کے درمیان تصادم ہو گیا تو بہت بدنامی ہو گی اور شاید لاہور کی طرح یہاں بھی فائرنگ ہو یہ افسر اس تشویش میں تھے۔اور سوچ رہے تھے۔کہ علامہ کو کس طریقہ سے جیل سے نکال کر امن اور خیریت کے ساتھ گاڑی پر سوار کرایا جائے۔اس کے علاوہ یہ بھی خیالت ھا کہ

خاکساروں کو علم ہو گیا تو شاید ریلوے سٹیشن کے پلیٹ فارم یا ٹرین پر حملہ کردیں۔

اس زمانہ دہلی جیل میں ایک اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ مسٹر گنیش داس آنند بہت ہوشیار اور سمجھ دار افسر تھے۔ یہ اپنے ڈیپارٹمنٹ میں جیل مینول پر اتھارٹی سمجھے جاتے تھے۔ اور جب کبھی کسی افسر کو کوئی مشکل پیش آتی تو یہ ان سے مشورہ لیتا۔ ان کی قابلیت کے باعث مسٹر لوئیس ان پر بہت بھروسہ اور اعتماد کرتے تھے۔ جب مسٹر لوئیس کو لالہ گنیش داس نے پریشان دیکھا تو آپ نے مسٹر لوئیس سے کہا کہ فکر نہ کیجیے وہ خود سب انتظام کردیں گے۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ طریقہ سے کام ہونا چاہیے چنانچہ علامہ کی روانگی وغیرہ کا تمام کام لالہ گنیش داس کے سپرد کردیا گیا۔ آپ علامہ مشرقی کے پاس گئے اور جاتے ہی ایک سنسنی پیدا کرنے والی خبر سناتے ہوئے علامہ سے ذیل کی گفت گو کی:

لالہ گنیش داس: علامہ صاحب مبارک ہو۔

علامہ: کیوں کیا بات ہے۔

لالہ گنیش داس: آپ کی رہائی کا حکم ہو گیا ہے۔ مگر اس شرط پر کہ آپ صوبہ دہلی سے باہر نکل جائیں۔ اور کسی دوسرے کو اس کا علم نہ ہو۔ تاکہ یہاں صوبہ دہلی میں شور و شر نہ ہو۔ دہلی سے باہر آپ یو پی میں جائیے یا پنجاب میں جہاں بھی آپ کی مرضی ہو جائیے۔ دہلی کا چیف کمشنر صرف یہ چاہتا ہے کہ اس کے علاقہ میں کوئی گڑبڑ نہ ہو۔

علامہ: مجھے اس میں کوئی اعتراض نہیں میں چپ چاپ یہاں سے جانے کے لیے تیار ہوں۔

لالہ گنیش داس: گورنمنٹ چاہتی ہے کہ آپ پولیس کی نگرانی میں یہاں سے متھرا (جہاں کہ یو پی کا علاقہ ہے) تک جائیں اور وہاں سے جہاں چاہیں چلے جائیں۔

علامہ: میں تیار ہوں کسی کو اس کا علم نہ ہو گا اور میں خاموشی کے ساتھ چلا جاؤں گا۔

لالہ گنیش داس: میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں جیل سے باہر ایڈیشنل ڈسٹرکٹ

مجسٹریٹ صاحب تشریف رکھتے ہیں میں ان سے اس شرط کے قبول ہونے سے متعلق کہہ آؤں۔

لالہ گنیش داس یہ کہہ کر علامہ کے وارڈ سے باہر آ گئے۔ تھوڑی دیر ادھر ادھر گھوم پھر کر واپس گئے اور کہا کہ سب فیصلہ ہو گیا ہے سامان بندھوایئے چنانچہ دو قیدی لگا کر علامہ کا سامان بندھوایا گیا علامہ نے خوشی اور مسرت کے ساتھ خود اپنا سامان بندھوانے کی نگرانی کی۔ آپ نے حقہ اور تمبا کو کو احتیاط سے علیحدہ رکھا۔ تاکہ متھرا کے راستہ میں آپ کو دقت نہ ہو۔ کیونکہ مولانا ظفر علی کی طرح آپ بھی حقہ کے بہت شوقین تھے۔ سامان تیار ہو گیا۔ تو لالہ گنیش داس نے علامہ کو یقین دلانے کے لیے کان میں کہا کہ چونکہ لاہور میں بہت خاکسار مارے جا چکے ہیں اس لیے چند روز یوپی کے کسی مقام پر رہیے۔ فی الحال پنجاب میں نہ جایئے تو اچھا ہو۔ علامہ نے اس نیک رائے کا شکریہ ادا کیا اور آپ مع سامان متھر کے لیے روانہ ہوئے۔ جیل میں آپ کے استقبال یا روانگی کے پروسیشن میں شامل ہونے کے لیے مسٹر لوئیس سٹی ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس خان بہادر خواجہ (مجھے نام یاد نہیں رہا یہ بچارے دہلی میں بیمار ہو گئے تھے اور غالباً ان کا ارون ہسپتال میں ہی انتقال ہو گیا تھا) اور کئی انسپکٹر و سب انسپکٹر وغیرہ مع کار کے موجود تھے۔ علامہ مع سامان و حقہ کے موٹر میں بیٹھ گئے۔ ساتھ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس وغیرہ تھے آپ کو خاموشی سے نئی دہلی سٹیشن پر لایا گیا۔ جہاں مدراس جانے والی گرینڈ ٹرنک ایکسپریس منتظر تھی۔ ریلوے سٹیشن پر پہنچتے ہی آپ کو سیکنڈ کلاس کے ریزرو خانہ میں سوار کرایا گیا جو پولیس کو لے کر بڑے سٹیشن سے لایا تھا۔ دہلی پولیس کے افسروں نے علامہ کو خدا حافظ کہا اور گاڑی روانہ ہوئی۔

متھرا کے متعلق معلوم ہوا کہ وہاں پہنچنے سے پہلے ہی علامہ اسی خیال میں تھے کہ وہاں آپ آزاد کر دیے جائیں گے۔ گاڑی جب متھرا کے سٹیشن پر پہنچی تو آپ اپنا سامان سنبھالنے اور قلیوں سے سامان اٹھوانے کے لیے اپنی سیٹ سے اٹھے آپ کی

اس جلد بازی دیکھ کر ساتھ جانے والی پولیس کے قافلہ کے افسر نے آپ کو بتایا کہ حضرت متھرا آنہ اتر سکیں گے۔صوبہ مدراس کے دیلور جیل میں جائیں گے۔ جہاں آپ کوتا حکم ثانی نظر بند کیا جائے گا۔

علامہ مشرقی کے تمام حالات پر غور کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ کسی شے کو حاصل کرنا اور اس کا قائم رکھنا علیحدہ علیحدہ حیثیتیں ہیں یعنی بعض لوگ ایک شے کو حاصل کر سکتے ہیں مگر اس کو قائم نہیں رکھ سکتے۔بعض حاصل نہیں کر سکتے مگر اس کو قائم رکھ سکتے ہیں۔اور بعض حاصل بھی کر سکتے ہیں اور اس کو قائم بھی رکھ سکتے ہیں مثلاً مہاتما گاندھی کسی تحریک کو جاری بھی رکھ سکتے تھے اور اس کو قائم بھی خوب کر سکتے تھے۔ پنڈت جواہر لال نہرو غالباً کسی تحریک کو جاری نہیں کر سکتے مگر اس کو قائم خوب رکھ سکتے تھے۔ ماسٹر تارا سنگھ نئی تحریک جاری نہیں کر سکتے اس کو قائم رکھ سکتے ہیں مسٹر جناح تحریک جاری کر سکتے تھے اس کو قائم رکھنے کی ان میں صلاحیت بہت کم تھی۔مولانا محمد علی کسی تحریک کو جاری کرنے کی بھی قابلیت رکھتے تھے اور اس کو قائم رکھنے کی بھی بھائی پرمانند میں کسی تحریک کو جاری رکھنے کی قابلیت بالکل نہ تھی تحریک کو قائم ایک حد تک رکھ سکتے تھے۔مرحوم لالہ لاجپت رائے میں تحریک کو جاری رکھنے کی بہت بڑی قابلیت تھی مگر تحریک کو قائم نہ رکھ سکتے تھے۔اسی طرح علامہ مشرقی میں کسی تحریک کو آرگنائز کرنے اور اس کو جاری رکھنے کی بہت بڑی قابلیت موجود ہے مگر چونکہ آپ طبعاً بزدل اور کمزور ہیں اور یہ خطرات کو لبیک نہیں کہہ سکتے۔اس لیے آپ کسی تحریک کو کامیابی کے ساتھ چلا نہیں سکتے۔جس کا نتیجہ ہے کہ خاکسار تحریک موت کی ہچکیاں لے رہی ہے اور اگر یہ تحریک کسی ایسے لیڈر کے سپرد کی جاتی جو قربانی کر سکتا اور مہاتما گاندھی کی طرح موت کی پروانہ کرنے والا ہوتا تو اس مفید اور اچھی تحریک میں پھر زندگی پیدا کی جاسکتی تھی۔

☆☆☆

برٹش گورنمنٹ کی والیان ریاست کے متعلق مصلحتیں

کئی برس کا ذکر ہے کہ سنٹرل انڈیا اور راجپوتانہ کے علاقہ میں چمبل ندی کے قریب ایک مشہور ڈاکو ڈونر سنگھ رہتا تھا۔ یہ ڈونگر سنگھ ریاست گوالیار اور دھولپور کے درمیان کے جنگلات میں رہتا تھا اور گوالیار اور راجپوتانہ کی ریاستوں اور ضلع آگرہ کے جاگیرداروں اور ساہوکاروں کے ہاں ڈاکے ڈالتا اس نے اپنی زندگی میں ڈاکے ڈال کر لاکھوں روپیہ کمایا اور غریبوں اور مہاجنوں اور ضرورت مندوں کو لاکھوں روپیہ ہی خیرات میں دیا۔ جس جس علاقہ میں اس نے ڈاکے ڈالے وہاں کے امیر لوگ اس کا نام سن کر کانپ اٹھتے تھے۔ اور غریب لوگ اس کو دعائیں دیتے تھے۔

ریاستوں نے تو اس ڈونگر سنگھ کی گرفتاری کے لیے کوشش نہ کی۔ اور اگر کی تو برائے نام یعنی جب کبھی کوئی ڈاکہ پڑا۔ ڈاکہ کے دو چار روز بعد پولیس تفتیش و تحقیقات کے لیے ڈاکہ کے مقام پر پہنچ گئی۔ اور پڑوسیوں کے بیانات لے لیے۔ مگر آگرہ کے علاقہ میں لوگوں نے خوب واویلا کیا۔ تو گورنر یوپی نے ڈونگر سنگھ کی گرفتاری کے لیے ایک انگریز سپرنٹنڈنٹ پولیس مسٹر ینگ کو مقرر کیا یہ مسٹر ینگ غیر معمولی جفاکش افسر تھے۔ ریاست جے پور میں بھی انسپکٹر جنرل پولیس رہے اور بعد میں غالباً یوپی میں انسپکٹر جنرل پولیس تھے۔

جب مسٹر ینگ انگریزی پولیس کی ایک بڑی جمعیت کے ساتھ دھولپور اور گوالیار کے درمیانی علاقہ کی پہاڑیوں میں ڈونگر سنگھ کا تعاقب کر رہا تھا۔ تو ڈونگر سنگھ کا میرے پاس خط پہنچا کہ جو ہندی زبان میں تھا۔ یہ خط پرانے کاغذات میں اب بھی شاید کہیں پڑا ہوگا۔ اس میں ڈونگر سنگھ نے لکھا کہ راجپوتانہ کی ایک ریاست کا مہاراجہ جو اس کے ڈاکے ڈالنے میں امداد دیتا تھا اور اس سے ڈاکہ کے مال میں سے حصہ لیتا تھا۔ وہ اب مسٹر ینگ کی امداد کر کے اسے پکڑوانے کی فکر میں ہے۔ اور وہ یعنی ڈونگر سنگھ ایڈیٹر ''ریاست'' سے مل کر تمام حالات اور اصل واقعات بتانا چاہتا ہے۔ اسکے دل می

ایڈیٹر ''ریاست'' کی بہادری کے لیے بہت عزت ہ۔اور اس نے اخبار ''ریاست'' کی امداد کے لیے بیس ہزر روپیہ نقد اور کچھ جواہرات محفوظ رکھے ہیں اور جب کبھی ایڈیٹر ''ریاست'' سے ملے گا وہ یہ روپیہ اور جواہرات اس وقت خود اسے دے گا۔

میں اس خط کو دیکھ کر حیران تھا کہ ی خط کس نے بھیجا۔اس لفافہ پر مہر ریاست گوالیار کے ایک ڈاک خانہ کی تھی اور سمجھ میں نہ آتا تھا۔کہ اس خط لکھنے والے کو کیا جواب دوں تو کہاں۔ یہ خط بھی ڈونگر سنگھ کا لکھا ہوا تھا۔اس نے لکھا کہ اس کا لڑکا جھانسی کے سکول میں پڑھتا ہے اور اس نے اپنے لڑکے سے کہا ہے کہ وہ خود دفتر ''ریاست'' کے پاس جانے اور تمام حالات بتان کی جرات ہے اور نہ خود اس نے مناسب سمجھا کہ لڑکا جائے۔ کیونکہ لڑکا چھوٹی عمر کا ہے۔ایسا نہ ہو یہ بچہ کسی وجہ سے گرفتار ہو جائے تو پولیس کے دباؤ میں آ کر تمام حالات بتا دے۔ یہ خود دہلی آ کر بتائے گا۔

اس خط کے ایک ہفتہ بعد ایڈیٹر ''ریاست'' کو ایک ٹیلی فون آیا اور ٹیلی فون کرنے والے نے اپنا نام ڈونگر سنگھ ستایا۔اس کی بات چیت سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ بندھیل کھنڈ کا رہنے والا ہے کیونہ اس کی بات چیت میں بندھیل کھنڈی زبان جو جھانسی گوالیار ارو دیتا وغیرہ میں بولی جاتی ہے کے الفاظ زیادہ تھے۔اس نے پوچھا کہ یہ ملنا چاہتا ہے کہاں مل سکتا ہے۔میں نے کہا کہ آپ دفتر ''ریاست'' میں آ جائیے۔اسنے کہا کہ وہاں لوگ ہوں گے۔شاید اس کو کوئی پہچان لے۔اس لیے دفتر ''ریاست'' میں آنا مناسب نہیں سمجھتا۔میں نے کہا کہ آ رات کو آ سکتے ہیں تو اس نے جواب دیا کہ اس کی زندگی اور موت کا سوال ہے یہ کسی شخص پر اعتبار نہیں کرتا۔کیونکہ اس کی گرفتاری کا بہت بڑا انعام مقرر ہے اگر گرفتار ہو گیا تو پھانسی کی سزا کا سوال ہے۔کیونکہ اس نے اپنی زندگی میں کئی قتل کیے یہ قدم قدم پر محتاط ہے اور میں اس سے کہیں شہر سے باہر ملوں۔ چنانچہ بات چیت کے بعد فیصلہ ہوا کہ اگلے روز شام کے وقت میں دہلی دروزہ سے باہر جہاں

پولیس کی سپاہی ٹریفک کے لیے کھڑا ہوتا ہے پہنچ جاؤں ۔ پہچان کے لیے میرے ہاتھ میں اخبار ''ریاست'' کا پرچہ ہو اور ڈونگر سنگھ وقت مقررہ پر وہاں پہنچ جاۓ گا۔ وہاں سے ہم شہر سے باہر دور جا کر باتیں کریں گے ۔

میں اگلے روز وقت مقررہ پر اپنی کار میں دفتر ''ریاست'' سے روانہ ہوا چونکہ کئی والیان ریاست مخالف تھے خیال ہوا کہ کوئی سازش ہو میں نے ریوالور میں گولیاں بھر کر اور لاک لگا کر ریوالور اپنی جیب میں ڈال لیا ۔ اور ''ریاست'' کا پرچہ لے کر دہلی دروازہ سے باہر مقررہ جگہ پر پہنچ گیا۔

میں ایک گھنٹہ کے قریب وہاں کھڑا رہا اور ڈونگر سنگھ کا انتظار کرتا رہا مگر ڈونگر سنگھ نہ آیا ۔ مجھے بہت مایوسی ہوئی کیونکہ میں چاہتا تھا کہ اس مہاراجہ کے حالات معلوم کروں جو ڈاکوؤں سے حصہ لے کر خود ڈاکے ڈلواتا ہے ۔ مایوس ہو کر میں واپس دفتر میں چلا آیا ۔ رات کو سوچتا رہا کہ کیا معاملہ ہے ڈونگر سنگھ کیوں نہ پہنچا۔

اگلے روز دس بجے کے قریب ڈونگر سنگھ کا ٹیلی فون پھر آیا ۔ ڈونگر سنگھ نے اظہار ندامت رکھتے ہوۓ اپنی وعدہ شکنی کے لیے معافی چاہی اور کہا کہ جب وہ جاۓ مقررہ پر جانے کے لیے تیار ہوا تو خیال آیا کہ کہیں گرفتار نہ ہو جاۓ ۔ اس کو وہاں جانے کا حوصلہ نہ ہوا ۔ اس لیے نہیں آسکا ۔ اور وہ اپنے کسی عزیز سے عزیز پر بھی بھروسہ نہیں کرتا ۔ کیونکہ اس کو زندگی میں بہت لوگوں نے دھوکہ دیا ہے ۔ اور غداریاں کیں میں نے جواب دیا کہ اگر آپ کو مجھ پر اعتماد نہ تھا تو آپ خط ہی نہ لکھتے ۔ اور نہ ملنے کی کوشش کرتے ۔ اس بات چیت سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ دنیا میں کسی شخص کو بھی قابل اعتماد نہیں سمجھتا ۔ اور اس کو ہر وقت یہ خوف ہے کہ نہ معلوم کون شخص روپیہ کے لالچ میں اسے گرفتار کرا دے ۔ اور انعام حاصل کرے ٹیلی فون پر اس نے بتایا کہ یہ واپس دھولپور کے جنگلوں میں جا رہا ہے اور وہاں سے تمام حالات تفصیل کے ساتھ لکھے گا۔

اس ٹیلی فون کے دس پندرہ روز کے بعد ڈونگر سنگھ کا ایک طویل خط ہندی زبان میں ملا جس میں اس نے اپنے حصہ دار مہاراجہ کے تمام حالات لکھے اور تاریخ وار بتایا کہ اس نے کہاں کہاں ڈاکے ڈالے ہیں۔ کتنا کتنا روپیہ اس نے ڈاکہ میں پایا۔ کتنا اس مہاراجہ کو دیا۔ اور ڈاکے کے سامان میں سے کون کون سا سامان اس وقت مہاراجہ کے ہاں کس کس جگہ کام آرہا ہے۔ اس خط میں اس نے مجھے درخواست کی تھی کہ میں یہ تمام واقعات گورنمنٹ ہند تک پہنچادوں اور ان کو اپنے اخبار میں بھی لکھوں۔

اس خط کو پڑھ کر میں کئی روز سوچتا رہا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ ایک والی ریاست کا روپیہ کے لیے ڈاکے ڈلوانا حصہ لینا اس ڈاکو کو پناہ دینا۔ اور جب اس مہاراجہ پر شک کیا گیا تو اس مہاراجہ کا اس ڈاکو کے ساتھ غداری کر کے اس کو گرفتار کرانا میں امداد دینا کتنا بڑا ظلم اور بے ایمانی تھی۔

میں کئی روز سوچتا رہا سمجھ میں نہ آتا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ میں نے ''ریاست'' میں ان واقعات کے متعلق اس مہاراجہ کا نام لکھے بغیر نوٹ بھی لکھا کہ مگر وہ کافی نہ تھا۔ اگر نام لکھتا ہوں اور کھلے عام الفاظ میں الزام لگاتا ہوں تو ان واقعت کا میرے پاس ثبوت کیا ہے کہ کئی روز سوچنے کے بعد میں نے ہی فیصلہ کیا۔ کہ سپرنٹنڈنٹ پولیس آگرہ کی معرفت یوپی کے گورنر تک یہ معاملہ پہنچا دینا چاہیے۔ کیونکہ یہ ڈاکے زیادہ تر ضلع آگرہ میں ڈالے گئے تھے اور ڈونگر سنگھ کے خط کے مطابق واقعات کا ثبوت آگرہ سے مل سکتا تھا۔ میں نے سپرنٹنڈنٹ پولیس آگرہ کو لکھا کہ میں ملنا چاہتا ہوں۔ کہ اس کے جرائم میں ایک مہاراجہ بھی شریک ہے۔ اور اس نے اپنے خط میں اس کا ثبوت بھی دیا ہے سپرنٹنڈنٹ پولیس کا جواب آیا کہ میں اس سے فوراً ملوں مگر میں اس کے بعد بیمار ہو گیا۔ خیال تھا کہ نواب بھوپال والے مقدمے کے سلسلہ میں ہوشنگ آباد جاؤں تو میں آغرہ اتر اکر اس سپرنٹنڈنٹ پولیس سے بھی ملوں گا اور خط دکھاؤں گا۔ میں بیماری کے باعث کئی روز تک ہوشنگ آباد نہ جا سکا اتنے میں ڈونگر سنگھ کے بھائی (جس کا نام

غالباً بنی تھا) کا خط آیا جس میں لکھا تھا کہ ڈونگر سنگھ بیمار ہو کر چمبل ندی کے کنارے جنگل میں انتقال کر گیا ہے اور وہ آخری وقت بھی ایڈیٹر ''ریاست'' کو یاد کرتا رہا اور اس نے مرتے ہوئے کہا تھا کہ ایڈیٹر ''ریاست'' کو ہاتھ جوڑ کر جے رام جی کی لکھی جائے۔

ڈونگر سنگھ کے مرنے کے بعد اس خط کے مطابق تو گورنمنٹ کا تحقیقات کرنا اور مہاراجہ کو سزا دینا ممکن نہ تھا میں سپرنٹنڈنٹ پولیس سے ملنے کے لیے آگرہ نہیں گیا۔ کیونکہ اسے لاحاصل سمجھا۔ اس کے عرصہ بعد ایک بار ان واقعات کے متعلق خان بہادر تصدق حسین ڈپٹی ڈائریکٹر ان ٹیلی جنس بیورو گورنمنٹ ہند سے ایک ڈنر پر ذکر آیا تو تصدق حسین صاحب نے بتایا کہ تمام واقعات اور اس مہاراجہ کے خلاف لگائے گئے الزامات درست تھے اور یو پی پولیس کے اعلیٰ افسران کو اس کا علم تھا مگر گورنمنٹ مصلحتاً کچھ کرنا نہ چاہتی تھی کیونکہ ایک مہاراجہ کے خلاف اتنے بڑے الزام کے متعلق تحقیقات کا ہونا خود گورنمنٹ کے لیے بدنامی اور رسوائی کا باعث ہوتا ہے۔

پانی کا اثر طبائع پر

پروفیسر سراج الدین آزر دہلی میں انسپکٹر آف سکولز تھے ۔ بے تکلف پنجابی یو پی اور دہلی کے تصنع کے دشمن ۔ بے حد مخلص شعر و ادب کے دلدادہ ۔ نہ صرف اعلیٰ درجہ کے سخن فہم بلکہ سخن گو بھی اردو و فارسی دونوں سے دلچسپی ۔ ڈاکٹر اقبال کے دوستوں میں سے اور اردو زبان کے عاشق آپ کا کوئی دن ایسا نہ گزرتا جب کہ آپ انجمن ترقی اردو کے دفتر میں مولانا عبدالحق کے پاس چند گھنٹے نہ گزارتے پروفیسر آذر ایڈیٹر ''ریاست'' کے بھی کرم فرما اور گہرے دوستوں میں سے تھے اور باوجود اس بات کے کہ میں زیادہ مصروفیت کے باعث دوستوں کو اپنے ہاں بہت کم دعوت دیتا تھا کوئی مہینہ ایسا نہ گزرتا جب کہ آذر صاحب گپ بازی کے لیے اپنے ہاں ڈنر پر نہ بلاتے ۔ ایک روز آپ نے رات کو کھانے پر بلایا ۔ میں جب وہاں گیا تو وہاں ایک درجن کے قریب دوسرے اصحاب بھی موجود تھے ۔ جو سب کے سب پنجابی تھے ۔ آذر صاحب نے فرمایا کہ یہ مجلس خالص طور پر پنجابی اصحاب کی ہے ۔ سرسکندر حیات کی جو رسڈ کشن یعنی پنجاب سے باہر کے کسی شخص کو نہیں بلایا گیا ۔ اور بات چیت صرف پنجابی زبان میں ہوگی ۔

اس دعوت میں مختلف موضوع پر باتیں ہوتی رہیں ۔ پنجابی لطائف نے بھی بہت دلچسپی پیدا کر دی اور باتوں باتوں میں آذر صاحب نے سب سے مخاطب ہو کر سوال کیا کہ ہر شخص ایمانداری کے ساتھ بتائے کہ دہلی میں آ کر اس نے کیا کچھ حاصل کیا یعنی علمی مالی یا دوسرے اعتبار سے اس نے دہلی میں آ کر کیا فوائد حاصل کیے ۔

سب لوگوں نے بتانا شروع کیا ۔ کسی نے کہا کہ اس نے ایک لاکھ روپیہ پیدا کیا ۔ کسی نے بتایا کہ اس نے علمی اعتبار سے یہ مدراج طے کیے کسی نے ظاہر کیا کہ اس نے فلاں فلاں ترقی و پوزیشن حاصل کی جب میری باری آئی تو میں نے کہا ۔ کہ چونکہ آپ کو لوگ سچ بتا رہے ہیں ۔ اور سچ پوچھ رہے ہیں ۔ کہ اس لیے میں سچ عرض کرتا ہوں ۔

کہ دہلی میں آ کر میں مالی اعتبار سے میرے قرضہ میں تو کئی گنا اضافہ ہوا اور جب دہلی میں آیا تھا تو بے حد مخلص اور ایماندار تھا۔ مگر اب طبیعت میں کمینہ پن ارو خودغرضی پیدا ہوگئی ہے۔ چنانچہ پہلے اگر کوئی دوست سے ایک دو روز کے لیے بھی آ جاتا تو اس کو کئی ہفتے تک جانے ن دیا جاتا۔ مہمان کی خدمت گزری میں لطف اور حظ محسوس ہوتا ہے۔ کیء بار ایسا ہوا کہ چھ چھ ماہ اور ایک ایک سال تک دوست مستقل مہمان کی صورت میں مقیم رہے اور ایک دوسرے مسٹر محسن ایڈیٹر ''اودھ اخبار'' لکھنو میں جو بعد می ایسوی ایٹڈ پریس میں ملازم ہو کر دہلی تشریف لائے تھے۔ غالبًا دو سال تک بطور مہمان رہے۔ اور جب بھی وہ اپنے لیے مکان لیے کر جانا چاہتے تو ان کو روک لیا جاتا ۔ مگر اب کیفیت یہ ہے کہ اگر کوئی دوست دہلی میں تشریف لانے کی اطلاع دیتا ہے۔ یا رتار کے ذریعہ دیتاہ ہےتو میں سٹیشن نہیں پہنچتا تا کہ وہ کسی دوسری جگہ قیام کر لے۔ اگر وہ پھر کبھی آ جائے تو مہمان کی خدمت گزاری طبیعت پر ایک بارسی محسوس ہوتی ہے۔ اور اس فرق کی وجہ دہلی کا پانی اور دہلی کی فضا ہے جس کا اثر طبیعت پر ہوا گو یہ تمام دوست خود بھی دہلی ک فضا کے اس اثر کو اپنے اندر محسوس کرتے تھے۔ مگر تعجب کا اظہار کر رہ تھے۔ کیونکہ ان کا خیال تھا کہ میں اپنی اس کمزوری کا اقرار کرون گا۔ چنانچہ میں نے اس کے ثبوت میں تفصیل کے ساتھ ان کو ذیل کے وہ واقعات بتائے جن کا میری ذات سے تعلق تھا۔

میں جب مانسر (ریاست پٹیالہ) میں میڈیکل پریکٹس کرتا تھا تو اس زمانہ دہلی میں ایک شاعر منشی عبدالخالق رہتے تھے۔ ان سے خط و کتابت تھی۔ ان کے خط آیا کرتے تھے اور میں کبھی دہلی آؤں چھ ماہ تیک جب ان کے خط آتے رہے تو انہوں نے دہلی آنے کے لیے بار بار لھاتو میں ان سے ملنے کے لیے مانسر سے دہلی آیا ۔ میں دہلی اور دہلی کے لوگوں کے حالات سے قطعی ناواقف تھا۔ اور یہ خیال بھی نہ تھا کہ کوئی شخص کسی دوست کو بار بار لکھنے کے بعد ملنے جائے تو وہ دعوت دینے والے کے

مکان پر نہ ٹھہرے مین نے دہلی ریلوے سٹیشن پر اترنے کے بعد تانگے میں سامان رکھوایا اور بازار لال کنواں میں پہنچال واہس گلی چابک سواداں کے سرے پر تانگہ روالےس یہ کہہ کر کہ تانگہ کھڑا رکھنے کے لیے کہا۔ کہ میں ابھی آ کر سامان لے جاتا ہوں۔ میں گلی چابک سواراں کے اندر منشی عبدالخالق صاحب کے مکان پر پہنچا خلیق صاحب کو آواز دی۔ اپے دہلی آنے کی اطلاع میں پہلے دے چکا تھا۔ میری آواز سن کر خلیق صاحب مکان سے باہر نکلے ور بہت اخلاق اور تپاک سے ملے۔ خیر خیریت دریافت کرنے کے بعد آپ نے پوچھا کہ میرا قیام کہاں ہے۔ میں اس کا کیا جواب دیتا۔ یہ خیال بھی نہ کر سکتا تھا۔ کہ اگر کوئی شخص ڈیڑھ سو میل کا سفر کر کے ملنے آئے تو اس سے یہ پوچھا جائے گا کہ قیام کہاں ہے۔ کیونکہ پنجاب میں اگر کوئی شخص کسی سے ملنے جائے تو یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ ہوٹل میں قیام کرے۔ میزبان اس کو تو اپنی توہین سمجھتا ہے۔ اور تمام پنجاب میں ایک شخص بھی ایسا نہ ہوگا جو مہمانوں کو اپنے ہاں ٹھہرا کر لطف حظ اور اپنی عزت محسوس نہ کرتا ہو خلیق صاحب کا یہ سوال سن کر کہ میں جہاں ٹھہرا ہوا ہوں میں کچھ حیران سا ہو گیا اور میں نے کھسیانا سا ہو کر جواب یدا۔ کہ ایک ہوٹل میں ٹھہرا ہوں چنانچہ میں ان سے شام کو پھر ملنے کا وعدہ کر کے میں گلی میں سے باہر آیا۔ اور تانگہ والے سے کہا کہ کسی ہوٹل میں لے چلو۔ تانگے والا مجھے مہاراجہ ہوٹل میں ل گیا جہاں میں نے قیام کیا اور شام کو خلیق صاحب کا نیاز حاصل کرنے کے لیے پھر ان کے مکان پر آیا۔ وہ مجھے حکیم محمود علی خاں ماہر اکبر آبادی جو بعد میں دہلی میں آنریری مجسٹریٹ اور خطاب یافتہ خاں صاحب تھے کے مکان پر لے گئے۔ جہاں ہم کچھ دیر بیٹھے اور علی موضوع پر باتیں کرتے رہے میں دو تین دن دہلی رہ کر اور دہلی دیکھ کر واپس مانسہ چلا گیا۔

یہ کیفیت تو مہمان نوازی کے متعلق دہلی کی فضا کی ہے میں اس سے پہلے بتا چکا ہو کہ جب دہلی آیا تو مہمان نوازی کے اعتبار سے خالص طور پر پنجابی تھا اور دو دو چار

چار دن کے عارضی مہمان ے علاوہ چھ چھ ماہ اور سال سال تک رہنے والے مستقل مہمان بھی ہوا کرتے اور دوپہر کو لنچ پر اور رات کو ڈنر پر آٹھ آٹھ دس دس اصحاب ضرور ہوتے اگر کوئی مہمان جانا چاہتا تو اس مختلف طریقوں سے یعنی گاڑی جانے کا وقت غلط بتا کر یا گھڑی پیچھے کر کے روک لیا جاتا۔ اور اگر کوئی مہمان آ جاتا تو دل کو مسرت سی محسوس ہوتی۔ مگر دہلی کے پانی اور یہاں کی فضا کا اثر آہستہ آہستہ کیا ہوا۔ اس کے متعلق ایک واقعہ (جو آذر صاحب کی دعوت سے دو تین ہفتے پہلے پیش آیا تھا) بھی سن لیجیے۔

میں جب سے دلّی میں آیا ہوں۔ رائے بہادر متھرا داس میرے ہی ہاں قیام کرتے ہیں۔ یہ ڈاکٹر صاحب کا اخلاص احسان اور ذرہ نوازی ہے ورنہ دہلی میں بڑی بڑی پوزیشن کے ان کے سینکڑوں دوست ہیں ڈاکٹر صاحب جب بھی تشریف لاتے ہیں ایک دو روز پہلے ان کا تار آ جاتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ میں ان کے تمام دوستوں کو ٹیلی فون پر اطلاع دے دوں۔ تا کہ جو لوگ آنکھیں دکھانا چاہیں وہ میرے مکان یا ریلوے سٹیشن پر پہنچ جائیں۔ یہ ہمیشہ کا معمول تھا۔ ڈاکٹر صاحب کا دہلی تشریف لانے کے متعلق تار آیا تو میں دوسرے لوگوں کے علاوہ نئی دہلی پلازا سینما کے پروپرائٹر لالہ کدارناتھ ورما جو رائے بہادر ہیں اور ڈاکٹر صاحب کے قریبی رشتہ دار ہیں۔ کو بھی ٹیلی فون کیا کہ ڈاکٹر صاحب کل صبح فرنٹیر میل میں تشریف لا رہے ہیں۔ لالہ کدارناتھ نے ٹیلی فون پر جواب دی اکہ ان کے پلازا سینما کا اوپر کا حصہ بھی مکمل ہو چکا ہے۔ تمام کمرے فرنیچر سے آراستہ ہو چکے ہیں۔ اور ڈاکتر صاحب اس نئی بلڈنگ میں قیام کریں گے۔ میں نے کہا بہت اچھا اگلے روز میں صبح فرنٹیر میل کے آنے کے وقت ریلوے سٹیشن پر پہنچا تو وہاں لالہ امیر چند کھنہ، سیٹھ آنند راج سورانا لالہ کدارناتھ ورما وغیرہ ایک درجن کے قریب اصحاب اور تیس چالیس کے قریب آنکھوں والے مریض آنکھیں دکھانے کے لیے پلیٹ فارم پر موجود تھے۔ ڈاکٹر صاحب

گاڑی سے اترے تو سب سے پہلے آپ نے بیماروں کو دیکھا۔ پندرہ بیس منٹ ان ک پلیٹ فارم پر صرف ہوئے۔ اس کے بعد ہم سٹیشن سے باہر آئے تو ہمارے پہنچنے سے پہلے لالہ کدارناتھ ڈاکٹر صاحب کا سامان اپنی موٹر میں بندھوا چکے تھے۔ ڈاکٹر صاحب میری کار کے پاس سوار ہونے کے لیے پوچھے تو آپ نے پوچھا کہ کیا ابھی تک سامان نہیں بندھوایا۔ اس پر لالہ کدارناتھ نے کہا کہ سامان دوسری گاڑی میں بندھوا دیا گیا ہے۔ کیونکہ آپ پلازا سینما بلڈنگ میں قیام کریں گے وہاں نئے کمرے فرنیش کیے گئے ہیں لالہ کدارناتھ کی اس درخواست پر ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ نہیں آپ دیوان دگھ کے ہاں ہی ٹھہریں گے۔ اس پر لالاہ کدارناتھ نے پھر کہا اور ڈاکٹر صاحب نے پھر یہی جواب دیا چنانچہ لالہ کدارناتھ اور ڈاکٹر صاحب کے درمیان قیام کے متعلق پانچ چھ بار تکرار ہوئی۔ کدارناتھ صاحب ڈاکٹر صاحب کو اپنے ہاں لے جانا چاہتے تھے مگر ڈاکٹر صاحب میرے ہاں ہی ٹھہرے پر اصرار کرتے تھے میں اس عرصہ میں خاموش رہا اور دونوں کا اصرار سنتا رہا۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ان اثرات کے باعث جو دہلی میں میری طبیعت پر مہمان نوازی کے متعلق اثر انداز ہو چکے تھے میں چاہتا تھا کہ ڈاکٹر صاحب پلازا بلڈنگ میں ہی چلے جائیں۔ حالانکہ ڈاکٹر صاحب کے احسانات ان کا اخلاص ان کی محبت اور ذاتی تعلقات کا اب بعد میں جب خیال کرتا ہوں تو ان کمینہ جذبات پر شرم اور ندامت محسوس کرتا ہوں۔ جو اس وقت ان کی مہمان نوازی کے متعلق میرے ذہن میں پیدا ہوئے۔

آذر صاحب کے ہاں ڈنر پارٹی والے دوستوں کو میں نے دونوں واقعات بیان کرنے کے بعد بتایا۔ کہ اگر دہلی کی فضا مہمان نوازی کے خلاف ہے تو اس میں دہلی والوں کا قصور نہیں یہ پانی کا اثر ہے ہر دریا کے اندر مختلف اجزا ہوتے ہیں۔ اور ان اجزاء کا دل و دماغ اور قویٰ پر اثر ہوتا ہے۔ چنانچہ ہندوستان میں سب سے زیادہ مہمان نواز صوبہ سرحد کے لوگ ہیں۔ اس کے بعد پوٹھوہار (راولپنڈی، جہلم کا علاقہ)

کے لوگ ان سے کم گوجرانوالہ، لاہور اور امرتسر کے لوگ اور ان سے کم لدھیانہ اور انبالہ کے لوگ اس کے بعد نمایاں فرق شروع ہوتا ہے اور جہاں جہاں جمنا کا پانی سیراب کرتا ہے وہاں مہمان نوازی کے اعتبار سے بالکل ہی صفائی ہے۔ چنانچہ پنجاب کے صوبہ کے لوگوں میں شاید اس بات کا یقین نہ کیا جائیگا۔ کہ دہلی، لکھنو، الہ آباد اور بنارس وغیرہ میں پانی پلانے والے پانی کی قیمت پیسہ یا دو پیسہ لے لیتے ہیں حالانکہ پنجاب میں پانی کی قیمت لینا ایک گناہ اور پاپ سمجھا جاتا ہے اور پانی پلانے والا چاہے کتنا بھی غریب ہو پانی کی قیمت قبول نہیں کر سکتا۔

اگر اپنی کمزوری کا اظہار کرنا اس کمزوری کو رفع اور دل میں طہارت پیدا کرنے کا باعث ہو سکتا ہے تو میں یہ صاف الفاظ میں اقرار کرتا ہوں کہ جمنا کے پانی کے باعث میں اس خوبی سے محروم ہو چکا ہوں جو اخلاص اور مہمان نوازی کے متعلق مجھ میں چند برس پہلے موجود تھی اور میرا یقین ہے کہ اگر یوپی اور دہلی کے اصحاب بھی دس پندرہ یا بیس برس پنجاب یا صوبہ سرحد میں قیام کریں تو ان کے اندر مہمان نوازی کا وہ کریکٹر پیدا ہو جائے گا جو وہاں کے لوگوں میں موجود ہے کیونکہ اس کا سبب پانی کے وہ اجزاء ہیں جو پنجاب کے دریاؤں میں کثرت کے ساتھ موجود ہیں مگر جمنا اور یوپی کے دریا ان سے محروم ہیں۔

عزت مرنے کے بعد

عزت کا فلسفہ دوسرے تمام فلسفوں سے زیادہ عمیق اور گہرا ہے اور اگر اس فلسفہ پر غور کیا جائے تو انسانی فطرت کے بہت دلچسپ مظاہرے ہوتے ہیں چنانچہ انسان کے لیے عزت سے زیادہ دوسری کوئی شے عزیز نہیں اور عزت پر انسان روپیہ، مال و دولت، بیوی، بچے، بہن بھائی، صحت اور اپنی جان تک قربان کر دیتا ہے۔ مگر عزت سے محروم ہونا نہیں چاہتا۔ مثلاً عزت کے لیے ہر شخص روپیہ صرف کرتا ہے بے عزتی کے خوف سے اکثر ایسا ہوا کہ لوگوں نے اپنی بیوی، بچوں، بہن اور بھائی تک کو قتل کر دیا اور خود بھی اپنی جان پر کھیل گئے مگر رسوائی برداشت نہ کی۔ یعنی اس دنیا میں انسان کے لیے عزت سے زیادہ کوئی شے عزیز نہیں عزت پر سب کچھ قربان کیا جا سکتا ہے اور جو لوگ اپنی عزت کو اپنی ذاتی اغراض پر قربان کر دیں تو وہ انسان کہلانے کے مستحق نہیں اور جو لوگ اپنی عزت کو بھی حیدرآباد سندھ کے دیوان ویارام گدومل مرحوم کی طرح ایڈیٹر ''ریاست'' کو اپنی تمام زندگی میں صرف اس شخصیت کا علم ہو سکا جس نے غریبوں، ضرورت مندوں، محتاجوں اور مستحق لوگوں کے لئے اپنا سب کچھ دینے کے علاوہ اپنی عزت کو بھی قربان کر دیا۔ دوسروں پر بغیر غرض کے قربان کر دیں وہ انسان ہیں فرشتے بلکہ فرشتوں سے بھی بلند کہلائے جانے کے مستحق ہیں۔ کیونکہ نیک سے نیک اور پارسا سے پارسا شخص بھی نہیں چاہتا کہ وہ عزت حاصل نہ کرے یا ذلیل ہو۔

عزت کے متعلق اس مختصر تمہید کے بعد میں چند چشم دید واقعات بیان کرتا ہوں جن سے معلوم ہوگا کہ انسان زندگی میں تو کیا چاہتا ہے کہ مرنے کے بعد بھی وہ عزت حاصل کرے۔

میں دہلی جیل میں تھا۔ وہاں مجھے سوائے کتابوں کے پڑھنے یا مقدمہ کے حالات پر غور کرنے کے دوسرا کوئی کام نہ تھا جو شخص زندگی بھر اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے کام کرتا رہا ہو اس کے لئے یہ مصروفیت کافی نہ تھی میرا زیادہ وقت وہاں انسانی فطرت پر غور کرتے

گزرتا اور میں اس سلسلہ میں ہر قسم کے قیدیوں سے ملتا اور ان سے گھنٹوں باتیں کرتا چنانچہ وہاں مجھے قتل کے مجرموں سے بھی ملنے اور باتیں کرنے کا اتفاق ہوتا جو موت کے منتظر تھے۔

مولانا مظہر الدین ایڈیٹر الاخبار ''الامان'' کا قاتل بھی اس زمانہ دہلی جیل میں تھا۔اس کے لئے پھانسی کا حکم ہو چکا تھا اور اپیلیں وغیرہ خارج ہونے کے بعد وہ پھانسی کی رسی کا منتظر تھا۔میں اس سے اکثر ملا کرتا میں جب میں ملتا یہ مجھ سے یہی سوال کرتا کہ اس کے متعلق پبلک کا کیا خیال ہےکیا لوگ اس کے اس فعل کی تعریف کرتے ہیں یا نہیں اور اس کے حق میں نعرے بلند ہوتے ہیں یا نہیں میں اس کی دل داری کے خیال سے اسے جب یہ کہتا کہ لوگ اس کو بہت بہادر سمجھتے ہیں تو اس کا چہرہ خوشی کے باعث سرخ ہو جاتا جس روز اس کو پھانسی ملنے والی تھی اس سے ایک روز پہلے اس کی آخری ملاقات کے لئے اس کی ماں باپ اور عزیز و رشتہ دار آئے یہ لڑکا بیس بائیس برس کی عمر کا جوان گورے رنگ کا خوبصورت تھا جب بھی کسی کو جیل میں پھانسی ہو تو جیل کے تمام قیدی مغموم ہو جاتے ہیں اس لڑکے کی آخری ملاقات کے وقت تمام جیل میں کہرام مچا ہوا تھا ملاقات ہوئی مجرم اس کے والدین اور عزیز و اقارب چیخیں مار مار کر روئے چھوٹے چھوٹے بچے اپنی ماؤں کو روتا دیکھ کر چیخیں مار رہے تھے شاید ہی کوئی سنگ دل انسان ہو گا۔اس منظر کو دیکھ کر جس کی آنکھیں تر نہ تھیں جیل کے حکام بھی جو دن رات کی بے رحمی کے باعث ایک حد تک سنگ دل ہوتے ہیں اس دردناک منظر سے متاثر تھے قاتل کی پردہ میں رہنے والی ماں برقع میں تھی مگر اس کی دیوانگی اس کو بے پردہ کیے جا رہی تھی اور اس خاتون میں برقع کو سنبھالنے کی ہمت نہ تھی نصف گھنٹہ کے قریب کہرام کی یہ کیفیت رہی نہ ماں کوئی بات کر سکتی تھی نہ باپ ان میں ہمت نہ تھی منہ سے کوئی لفظ نکال سکیں دوسرے رشتہ دار پھانسی ملن والے سے باتیں کرتے تھے اور باتیں بھی یہ کہ تم آخری وقت مغرب کی طرف اپنا منہ رکھنا کلمہ کو نہ بھولنا لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ

کہنا رات کو نماز ضرور پڑھنا وغیرہ چنانچہ ان رشتہ داروں میں سے ایک نے پوچھا کہ کوئی وصیت کرنی ہو تو بتاؤ یا کوئی خواہش ہو تو اس کا اظہار کرو تا کہ پوری کی جائے تو قاتل نوجوان نے اپنی جس آخری خواہش کا اظہار کیا وہ یہ تھی کہ اس کے پھانسی ملنے کے بعد اس کی لاش کو جامع مسجد لے جانا وہاں نماز جنازہ پڑھنا اور جلوس نکالنا چنانچہ اس نوجوان کی خواہش کے مطابق ایسا ہی کیا گیا تھا گویا کہ اس نوجوان کی مرتے ہوئے آخری خواہش یہ تھی کہ اس کے مرنے کے بعد بھی لوگ اس کی عزت کریں۔

ایک دوسرا شخص قتل کا مجرم تھا یہ پیشہ ور غنڈہ تھا۔ اور اس نے ایک دوسرے شخص کو چاقو مار کر ہلاک کر دیا تھا اس کو بھی موت کی سزا دیئے جانے کا حکم ہو چکا تھا جس روز اس کو پھانسی دی جانے والی تھی اس سے ایک روز پہلے اس کے رشتہ دار بھی اس سے ملنے کے لئے آئے یہاں بھی وہی چیخوں کا منظر تھا جب یہ رو رہا تھا تو جیل کے ایک سپاہی نے اس سے نیم طنزیہ انداز میں گویا کہ تو چاقو مارتے وقت بہادر تھا اب پھانسی کے وقت روتا ہے کہا کہ حوصلہ کر رونے سے کیا حاصل اس سپاہی کے یہ نیم طنزیہ الفاظ سن کر اس نے فوراً سر اٹھایا اور فاتحانہ انداز میں (گو موت کو سامنے دیکھتے ہوئے اس کی قوت گویائی جواب دے رہی تھی اور اس کے منہ سے بات نہ نکلتی تھی) کہا نہیں نہیں نہیں میں گھبرایا نہیں نہیں میں حوصلہ میں ہوں یعنی یہ موت کو دیکھتے ہوئے زندگی میں ہی نیم مردہ ہو چکا تھا۔ منہ سے بات تک نہ نکلتی تھی مگر یہ چاہتا تھا کہ لوگوں پر اس کے غنڈہ پن جس کو یہ خود بہادری اور شجاعت سمجھتا تھا کے اثرات قائم رہیں چنانچہ اگلے روز اس کو پھانسی کی کوٹھڑی سے پھانسی گھر میں پھانسی پر چڑھانے کے لئے لے جایا جا رہا تھا تو اس کے چہرہ پر ایک فرضی اور بناوٹی مسکراہٹ سی تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ یہ بہادری کی موت مر رہا ہے اس کی شجاعت پر موت اثر انداز نہیں ہوئی اور لوگ اس کو مرنے کے بعد اس کو بہادر ہی سمجھیں گویا کہ اس کی بھی آخری خواہش یہی تھی کہ اس کے مرنے کے بعد بھی لوگ اس کی عزت کریں۔

مجھے اور بھی کئی ایسے واقعات یاد ہیں کہ لوگوں نے مرتے ہوئے اگر کسی خواہش کا اظہار کیا تو وہ صرف یہ تھی کہ ان کے مرنے کے بعد بھی ان کی عزت ہو چنانچہ ہماری زندگی کے ہر روز کے واقعات میں دیکھا جا رہا ہے کہ عزت ایک ایسی شے ہے جس پر زندگی میں سب کچھ قربان کر دیا جاتا ہے لوگ عزت کی موت مرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں اور ہر انسان کی خواہش ہوتی ہے کہ مرنے کے بعد بھی لوگ اس کی عزت کریں یعنی عزت ایک ایسی شے ہے جس کو انسان زندگی میں تو کیا مرنے کے بعد بھی چاہتا ہے۔

میں حیدر آباد سندھ کے دیوان دیا رام گدومل مرحوم پریذیڈنٹ آل انڈیا سوشل کانفرنس کے حالات عرض کروں گا جن کا پبلک پر ظاہر کرنے کا فخر سب سے پہلے ایڈیٹر ریاست کو حاصل ہوا یہ حالات لاہور کے اخبار ہندوستان میں شائع ہوئے جبکہ ایڈیٹر ریاست اس اخبار میں کام کرتا تھا ان حالات میں بتایا جائے گا کہ قربانی کے اس فرشتہ نے کیونکر ایک خاندان کی عزت کو بچانے کے لئے اپنی عزت کو قربان کر دیا اور دنیا میں سب سے اہم قربانی وہ ہے جو ذاتی اغراض سے بلند رہ کر دوسروں کے لئے کی جائے کیونکہ انسان فطرتاً عزت سے نہ اس دنیا میں محروم ہونا چاہتا ہے نہ اگلی دنیا میں۔

عزت کی قربانی

میں نے لکھا ہے کہ مجھے میری پچھلی زندگی میں سوائے دیوان دیا رام گدومل آف حیدرآباد (سندھ) کے کسی ایسے دوسرے شخص کا علم نہ ہو سکا جس نے دوسرے کے لیے اپنی عزت کو بھی قربان کر دیا ہو۔ میں ذیل میں دیوان دیا رام گدومل کی زندگی کا وہ واقعہ بیان کرتا ہوں جو مجھے آپ کے ساتھ کام کرنے والے مسٹر دیرومل بیگھر راج ایڈیٹر سندھی سکھر نے بتایا اور جس کی تصدیق بعد میں مرحوم راجہ نا بھا اور بمبئی کے بعض اصحاب نے بھی کی کہ اس واقعہ نے میرے کریکٹر پر بہت بڑا اثر کیا ہے میں دوسروں کے لیے اپنی عزت کو قربان کرنے کا اہل تو نہیں ہو سکا مگر یہ سچ ہے کہ دوسروں کی خدمت گزاری اور اس کو ظاہر نہ ہونے دینے کا احساس اگر مجھ میں موجود ہے تو اس کا باعث صرف یہ واقعہ ہے جو ہمیشہ ہی میری زندگی میں میرے لئے نصیب العین رہا۔ خدا کرے کہ ان حالات کو پڑھنے والے بھی وہی اثرات حاصل کریں جو مجھے نصیب ہوئے۔

دیوان دیا رام گدومل حیدرآباد سندھ کے ایک معزز خاندان میں سے تھے۔ آپ بمبئی پراونشل سول سروس کے جج تھے اور آپ کے صاحب زادگان حیدرآباد میں وکالت کرتے تھے دیوان دیا رام گدومل کی زندگی کا زیادہ حصہ سندھ اور بمبئی چونکہ اس زمانہ میں سندھ علیحدہ صوبہ نہ تھا بمبئی سے ملحق تھا کے اضلاع میں بطور سیشن جج گزرا۔ آپ ہزار روپیہ سے زیادہ تنخواہ پاتے تھے مگر آپ کا ذاتی خرچ چالیس پچاس روپے ماہوار سے زیادہ نہ تھا آپ کے پاس صرف ایک کوٹ تھا جو کئی برس تک آپ نے استعمال کیا اور اپنی تنخواہ کا تمام کا تمام روپیہ اور جدی جائیداد کی آمدنی کا ایک معقول حصہ آپ غریبوں محتاجوں یتیم بچوں اور بیواؤں کی خدمت میں صرف کرتے چنانچہ سندھ میں سینکڑوں کی تعداد میں ایسے لوگ موجود ہیں جن کے والدین چپڑاسی، مزدور، قلی، برتن صاف کرنے والے، گھروں کے ملازم اور ادنیٰ قسم کے لوگ تھے مگر یہ

دیوان دیا رام کے روپیہ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے بہت بڑے عہدوں پر پہنچے۔ دیوان صاحب ٹراولنگ یعنی سفری لائبریریوں اور بیوہ آشرموں کے بانی تھے اور آپ کے روپیہ سے سندھ میں بہت سی ٹراولنگ لائبریریاں موجود ہیں۔ جو گاؤں گاؤں پھر کر لوگوں کو کتابیں اور لکھنے پڑھنے کا سامان مفت تقسیم کرتی ہیں۔ اور درجنوں بیوہ آشرم، بیواؤں کی پناہ گاہ ہیں۔

دیوان دیا رام گدومل ملک کے بہت بڑے سوشل ریفارمر تھے آپ مرحوم مسٹر مالا باری کے ساتھیوں میں سے تھے اور آپ کے پرانے دوستوں میں سے مرحوم سر جوگندر سنگھ (ممبر انتظامیہ کونسل وائسرائے) وغیرہ کئی اصحاب تھے اگر میں غلطی نہیں کرتا تو سر جوگندر سنگھ نے اپنی ایک تصنیف دیوان دیا رام کے نام ڈیڈیکیٹ بھی کی تھی دیوان صاحب کئی بار آل انڈیا سوشل کانفرنس کے صدر منتخب ہوئے۔ اور آپ کی سندھ میں جو عزت تھی اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ حیدر آباد میں جب لوگوں کو یہ علم ہوتا کہ آپ اس بازار میں سے گزریں گے تو لوگ وقت سے پہلے انتظار میں کھڑے ہو جاتے اور آپ کو اس طرح ہی جھک کر نمسکار یا ڈنڈوت کیا جاتا جس طرح گوروں یا سنیاسیوں یا مہاتماؤں کو کیا جاتا ہے۔ مرحوم مہاراجہ نابھ نے مجھے بتایا کہ مہاراجہ جب نابھ کے ٹکہ (ولی عہد) اور وائسرائے کی کونسل (جو ان دنوں امپیریل کونسل کہلاتی تھی مہاراجہ نابھ وائسرائے کے نامزد ممبر تھے۔ مگر اس کونسل میں جاتے ہی آپ مسٹر گوکھلے کے ساتھ مخالف بنچوں پر جا بیٹھے اور آپ کا حب الوطنی کا یہ قدم آپ کے لئے زندگی بھر مصائب کا باعث ثابت ہوا) کے ممبر تھے۔ تو دیوان دیا رام گدومل کے درشن کرنے کے لئے نابھ سے احمد نگر (صوبہ بمبئی) گئے تھے۔ جہاں کہ دیوان صاحب ان دنوں سیشن جج تھے گویا کہ دیوان دیا رام گدومل کے لیے احترام و عزت غریبوں اور عام لوگوں سے لے کر والیان ریاست تک کے دلوں میں بھی تھی اور آپ تمام ملک میں احترام کی نظروں سے دیکھے جاتے۔

دیوان دیا رام گدومل کا ایک واقعہ دلچسپ ہے جو آپ کو لاہور میں پیش آیا لارڈ ہارڈنگ وائسرائے پر چاندنی چوک دہلی میں شاہی داخلہ کے وقت بمب پڑا تھا۔ پنجاب پولیس دن رات تفتیش میں مصروف تھی۔ مگر بمب پھینکنے والے کا کوئی پتہ نہ چلتا تھا ہر صوبہ میں تعلیم یافتہ پبلک ورکرز کو شبہ کی نظر سے دیکھا جاتا۔ دیوان دیا رام بمبئی سے کشمیر جارہے تھے آپ کا لباس سادھوؤں کی طرح سادہ تھا۔ آپ نے لاہور ریلوے پلیٹ فارم پر کسی شخص سے انگریزی میں بات چیت کی قریب ہی سی آئی ڈی کا ایک شخص کھڑا بات سن رہا تھا۔ سادھوؤں کے لباس میں انگریزی میں بات چیت کرنا پنجاب سی آئی ڈی کی نظروں میں شبہ پیدا کرنے کا باعث ہوا۔ آپ کو گرفتار کر کے ریلوے سٹیشن کی حوالاتمیں دے دیا گیا۔ آپ جب رات بھر حوالات میں بسر کر چکے تو اگلی صبح پولیس نے آپ سے انٹیروگیشن (گفت وشنید) شروع کی دیوان صاحب نے پوچھا کہ کس الزام میں گرفتار کیا ہے تو پولیس افسر نے بتایا کہ وائسرائے پر بمب مارنے کے شبہ میں دیوان صاحب مسکرا دیئے پولیس افسر نے کہا کہ اپنا حسب نسب بتاؤ اور کوئی ضمانت دینے والا ہو تو پیش کرو۔ تب جا سکتے ہو۔ اس پر دیوان صاحب نے کہا لارڈ ہارڈنگ آپ کو جانتے ہیں اور وہی ضمانت دیں گے چنانچہ پولیس نے وائسرائے کے پرائیویٹ سیکرٹری کو تار دیا۔ کہ ایک شخص سندھ کا رہنے والا دیا رام گدو مل اپنے آپ کو وائسرائے کا واقف بتاتا ہے۔ پرائیویٹ سیکرٹری نے لارڈ ہارڈنگ کو اس تار کے مضمون سے اطلاع دی تو وائسرائے نے جواب لکھوایا کہ مسٹر دیا رام گدومل ہندوستان کے چند نیک ترین اصحاب میں سے ہیں۔ انارکسٹ نہیں اور وائسرائے کے ذاتی دوست ہیں ان کو فوراً چھوڑ دیا جائے۔ چنانچہ اس تار کے پہنچنے کے بعد آپ کشمیر روانہ ہوئے۔

دیوان دیا رام گدومل جب زندگی بھر غریبوں اور ضرورت مندوں کی خدمت انجام دیتے رہے تو آپ کو خیال آیا کہ اگر امیر طبقہ کے نوجوانوں میں غریبوں کی خدمت کی

سپرٹ پیدا کی جائے تو امیر طبقہ کے نوجوان دوسرے ہزار ہا لوگوں کے لیے مفید ہو سکتے ہیں چنانچہ بمبئی میں آپ نے ایک اخلاقی آشرم کی بنیاد قائم کی جس میں صرف امیر طبقہ کے کئی سو نوجوان لڑکے اور لڑکیاں ہر روز دو گھنٹہ کے لئے آتے۔ ان لڑکوں اور لڑکیوں کو لیکچروں کے ذریعہ بتایا جاتا۔ کہ غریبوں کی خدمت کرنی چاہئے دوسروں کا دکھ اپنا دکھ سمجھنا انسان کا فرض ہے روپیہ کا صحیح استعمال یہ ہے کہ وہ ضرورت مندوں کے کام آئے اور اس شخص کا پیدا ہونا اور زندہ رہنا لا حاصل ہے جو صرف اپنے لیے زندہ ہے اور دوسروں کے کام نہیں آتا یہ آشرم کئی برس تک چلتا رہا اور اس کے ذریعہ بمبئی کے امیر گھرانوں کے نوجوانوں کے دلوں میں پبلک خدمت اور دوسروں کے دکھوں کو دور کرنے کی سپرٹ پیدا کی گئی۔

اس آشرم کو جاری ہوئے کئی برس ہو چکے تھے کہ ایک روز ایک نوجوان لڑکی جس کے والد بمبئی میں بڑے عہدہ پر سرکاری ملازم تھے اور جس کا والد بیرسٹری کر چکا تھا اور انڈین سول سروس کے امتحان کیلئے انگلستان میں تھا دیوان دیا رام گدومل کے پاس آئی اور تنہائی میں کہا کہ پتاجی آشرم کے تمام لڑکے اور لڑکیاں دیوان صاحب کو پتاجی کہہ کر مخاطب کیا کرتے تھے میں بہت دکھی ہوں مجھے ایک شخص کا ناجائز حمل ہے خاندان کی عزت کا سوال ہے میں چاہتی ہوں کہ خودکشی کر کے بھی خاندان کے ناموس کو بچاؤں آپ کی اپنے باپ کی طرح عزت کرتی ہوں۔ آپ مجھے رائے دیجئے کہ میں کیا کروں۔

دیوان دیا رام نے جب یہ سنا تو آپ کو حالات سن کر بہت افسوس ہوا آپ نے اس لڑکی کو رائے دی کہ جس شخص کا ناجائز حمل ہے اس سے شادی کر لی جائے۔

اس رائے کے بعد لڑکی نے چاہا کہ اسی شخص سے شادی کرے جس کا ناجائز حمل ہے مگر لڑکی براہمن خاندان سے تھی اور لڑکا بنیا خاندان سے سوسائٹی میں ایسی شادی معیوب تھی لڑکے نے شادی کرنے سے انکار کر دیا۔ اس انکار کے بعد لڑکی نے

حالات دیوان صاحب کو بتائے تو دیوان صاحب نے بھی کوشش کی کہ لڑکی کی شادی اس لڑکے سے ہو جائے کیونکہ لڑکا بھی اس آشرم میں آتا تھا دیوان صاحب کے کہنے کا لڑکے پر کوئی اثر نہ ہوا اور اس نے نہ صرف لڑکی کی شادی کی التجا قبول کرنے سے انکار کر دیا بلکہ آشرم میں آنا بھی چھوڑ دیا۔ اور اگر لڑکی اتفاق سے اس کو راستہ میں آتے جاتے کہیں ملتی تو یہ راستہ چھوڑ کر دوسری طرف ہو جاتا۔

یہ لڑکی کئی روز تک دیوان دیا رام سے مشورہ کرتی رہی اور دیوان صاحب نے یہ بھی کوشش کی کہ کوئی اور نوجوان اس لڑکی سے شادی کر لے مگر کامیابی نہ ہوئی۔ اور کوئی اچھی حیثیت کا لڑکا اس لڑکی سے اس حالت میں شادی کرنے کے لئے تیار نہ ہو سکا۔ ادھر جوں جوں دن زیادہ گزرتے لڑکی کو حمل کے ظاہر ہو جانے کا خوف آخر ایک روز لڑکی دیوان صاحب سے پھر تنہائی میں ملی اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اس نے دیوان صاحب سے کہا:

> ''پتا جی میں بہت دکھی ہوں میں نے حمل قرار پانے پر شروع میں حمل ضائع کرنے کی کوشش کی اس میں ناکام رہی اس کے بعد اس لڑکے سے شادی کرنی چاہی جس کا حمل تھا اس نے ٹھکرا دیا پھر چاہا کہ کوئی اور شخص پناہ میں لے مگر کوئی تیار نہ ہوا اب میرے لیے اپنے والدین اور خاندان کی عزت و ناموس کو بچانے کا صرف ایک ہی ذریعہ ہے کہ میں خودکشی کر کے اپنی جان کو ختم کرلوں اور میرے حمل کا کسی کو علم نہ ہو۔''

یہ کہتے ہوئے روتے روتے لڑکی کی ہچکی بندھ گئی دیوان صاحب لڑکیکی مصیبت کو دیکھ رہے تھے اور دکھی تھے مگر کچھ کر نہ سکتے تھے انہوں نے لڑکی سے کہا کہ ''بیٹی! خودکشی کرنا پاپ ہے خودکشی مت کرو اور جس طرح بھی ممکن ہو کسی نوجوان سے شادی کر لو'' لڑکی نے جواب دیا پتا جی نوجوان تو کیا اس حالت میں تو مجھے کوئی بوڑھا بھی پناہ

دینے کے لئے تیار نہیں مجھے اس مصیبت سے چھٹکارے کا سوائے خودکشی کے دوسرا کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔

دیوان دیا رام اس لڑکی کو غور سے دیکھ رہے تھے اور بیحد متفکر تھے۔ کہ اس نوجوان لڑکی کو مصیبت سے کیوں کر نجات ہو بہت دیر سوچتے رہے کوئی راستہ نظر نہ آتا تھا بہت غور کرنے کے بعد آخر آپ نے لڑکی کو مخاطب کرتے ہوئے کہ:

"بیٹی! اگر تم کو دنیا میں کوئی پناہ دے اور تمہیں بے عزتی سے بچانے کے لئے تیار نہیں تو میں تمہیں پناہ دینے اور بے عزتی سے بچانے کے لئے تیار ہوں میں تم سے شادی کرتا ہوں۔"

یہ کہنے کے بعد دیوان صاحب بمبئی سے چند میل کے فاصلہ پر باندرہ گئے وہاں آپ نے ایک ایسی کوٹھی کرایہ پر لی جو سمندر کے کنارے اور آبادی سے کچھ فاصلہ پر تھی کوٹھی کرایہ پر لینے کے بعد بمبئی واپس آئے۔ آشرم کے طلبا اور طالبات کو بلایا اور ان سے کہا کہ آج کے بعد یہ آشرم بند کیا جاتا ہے اس اعلان کے بعد لڑکے اور لڑکیاں اپنے گھروں کو چلے گئے۔ دیوان صاحب نے آشرم کو تالا لگایا اور اس لڑکی کو لے کر سکھوں کے گوردوارہ میں گئے آنند میرج (سکھ طریقہ شادی) ایکٹ کونسل میں پاس ہوئے چند ماہ ہوئے تھے۔ آپ نے گوردوارہ کے گرنتھی سے درخواست کی کہ آپ کی اس لڑکی سے شادی کرا دی جائے گرنتھی کیوں انکار کرتا کڑاہ پرشاد (حلوہ) تیار ہوا۔ راگیوں نے شبد پڑھے اور گرنتھی نے اس سترہ اٹھارہ سال کی نوجوان لڑکی اور ستر سال کے سفید ریش دیوان صاحب کے سفید لمبی داڑھی تھی بوڑھے کی شادی گوروگرنتھ صاحب کے سامنے کرا دی۔

دیوان صاحب اپنی نوجوان بیوی کو لے کر باندرہ اس کوٹھی میں چلے گئے جو آئندہ زندگی گزارنے کے لیے کرایہ پر لی گئی تھی میاں بیوی نے اس کوٹھی میں رہائش اختیار کی دیوان دیا رام آل انڈیا شہرت کے مالک تھے اور انڈین سوشل کانفرنس کے کئی برس

سے صدر اخبارات میں مضامین شائع ہوئے جن کے عنوانات تھے ''باپ کی بیٹی سے شادی''،''نفس پرستی کی انتہا سوشل کانفرنس کے صدر کی گراوٹ دیوان دیا رام گدومل کا ذلت آفرین فعل وغیرہ دیوان دیا رام گدومل کی مخالفت صرف اخبارات تک ہی محدود نہ رہی اسی سال آپ کو اپنی خاندانی جائیداد کی رجسٹری کرانے کے لئے حیدرآباد جانا پڑا تو جب آپ بازار میں سے گزرے لوگوں نے آپ پر اینٹیں پھینکیں اور یہ کہہ کر ماں بہن کی گالیاں دیں کہ اس نے حیدرآباد کو تمام دنیا میں رسوا و ذلیل کر دیا ہے۔

مسٹر ویرومل بیگھراج ایڈیٹر سندھی سکھر نے جب اس شادی کی اطلاع سنی تو ان کو بہت صدمہ ہوا کیونکہ دیوان صاحب ویرومل جی کے ساتھ بیس پچیس برس تک سندھ کے اندر سوشل اصلاح میں مصروف رہے تھے آپ نے شادی کی خبر سنتے ہی دیوان دیا رام کو باندرہ خط لکھا جس کے الفاظ یہ تھے:

''میں اخبارات میں پڑھ رہا ہوں اور لوگوں سے سن رہا ہوں کہ آپ نے اتنے بڑے سوشل لیڈر اور سوشل کانفرنس کے صدر ہوتے ہوئے اس بڑھاپے میں سترہ اٹھارہ برس کی لڑکی سے شادی کی۔ مجھے اس خبر پر یقین نہیں آتا کہ آپ اتنا بڑا پاپ کر سکتے ہیں آپ مہربانی فرما کر بواپسی ڈاک اصل حالات سے مطلع فرمائیے کیونکہ اگر یہ واقعہ سچ ہے تو میرا بھی بطور ایک پبلک ورکر اور اخبار نویس کے فرض ہے کہ میں آپ کی اس شیطنت کے خلاف لکھوں۔''

دیوان دیا رام نے اس طویل خط کا جواب ایک پوسٹ کارڈ پر دیا جس کے الفاظ یہ تھے:

''میں نے اپنا فرض ادا کیا آپ اپنا فرض ادا کیجئے۔''

اس جواب کے بعد دیوان دیا رام کے قدیمی دوست اور دیرینہ ساتھی مسٹر ویرومل بیگھراج (جو سندھ میں ہندو مہاسبھا کے صدر بھی تھے) نے اپنے اخبار سندھی میں

دیوان صاحب کے خلاف متعدد سخت مضامین لکھے۔

دیوان دیا رام کی بیوی کے بطن سے اس حمل کا نتیجہ ایک لڑکی پیدا ہو چکی تھی۔ دیوان صاحب شادی کے بعد دنیا سے بالکل الگ رہے۔ وہ اپنی بیوی اور بچی کے ساتھ سمندر کے کنارے اس کوٹھی میں تنہائی کی زندگی بسر کرتے رہے اور اس طرح دس سال گزر گئے۔ دنیا کو کچھ علم نہیں کہ کیا ہوا شادی کے دس سال کے بعد دیوان صاحب کی بیوی تپ دق میں مبتلا ہو گئیں کئی ماہ تک اس موذی مرض میں مبتلا رہیں اور جب زندگی کی کوئی امید نہ رہی تو اس کی والدہ اور والد اپنی بیٹی کی عیادت کے لئے بمبئی سے آئے یہ لوگ کئی روز تک باندرہ میں رہے ایک روز دیوان صاحب کی ''بیوی'' نے اپنی ماں سے تنہائی میں کہا:

''اماں! میں اب زندہ نہ رہوں گی۔ چند روز کی مہمان ہوں مگر ایک راز میں تم سے ظاہر کرنا چاہتی ہوں تا کہ اس راز کو لے کر اس دنیا سے رخصت نہ ہو جاؤں۔ وہ راز میں تمہیں بتاتی ہوں اور وہ راز یہ ہے کہ دیوان صاحب نے میرے ساتھ شادی میری عزت کو بچانے کے لئے کی مجھے ایک لڑکے کا ناجائز حمل تھا۔ اس لڑکے نے حمل کے بعد مجھ سے شادی تو کیا بات تک کرنے سے انکار کر دیا کوئی دوسرا بھی مجھے پناہ دینے کے لئے تیار نہ تھا میری عزت کو بچانے کے لئے دیوان صاحب نے اپنی آل انڈیا شہرت اور عزت کو میرے لئے قربان کر دیا مجھ سے کھلے طور پر شادی کر لی ورنہ دراصل حقیقت یہ ہے کہ میرے اور ان کے آج تک تعلقات باپ اور بیٹی کے ہیں دنیا مجھے ان کی بیوی سمجھتی ہے مگر میں ان کی ویسے ہی بیٹی ہوں جیسے شادی سے پہلے تھی۔''

اس راز کے اظہار کے بعد دیوان صاحب کی ''بیوی'' کا انتقال ہو گیا مرنے والی کی ماں نے یہ راز اپنے شوہر کو بتایا اس نے اپنے خاص دوستوں سے ذکر کیا وہاں سے

یہ راز مسٹر ویرومل بیگھ راج کے پاس پہنچا اور مسٹر ویرومل بیگھ راج سے ایڈیٹر ریاست کو یہ حالات معلوم ہوئے جن کی بعد میں بمبئی کے کئی اصحاب نے بھی تصدیق کی چنانچہ ایڈیٹر ریاست جس زمانہ بمبئی ایک فرم اگرسین اینڈ کمپنی میں ملازم تھا بمبئی سے باندرہ گیا تا کہ دیوان دیارام کے قدموں کو بوسہ دے کر اپنے لئے عاقبت میں جگہ بنائے مگر افسوس کہ دیوان صاحب اس روز باندرہ میں نہ تھے ان کا نیاز حاصل نہ ہو سکا۔ ایڈیٹر ریاست ناکام واپس بمبئی آ گیا اور چند روز کے بعد اسے بمبئی چھوڑنا پڑا کیونکہ اسے مہاراجہ نابھ نے اپنی ریاست میں بلا کر ملازمت دے دی۔

جو لوگ کسی پر تھوڑا سا احسان کر کے اس احسان کو جتاتے ہیں یا اس کا معاوضہ چاہتے ہیں اور یا جن کی پبلک خدمت کا کوئی مقصد ذاتی شہرت یا عزت حاصل کرنا ہے ان کے لیے دیوان دیارام گدومل کے یہ حالات آنکھیں کھولنے کا باعث ہونے چاہئیں کیونکہ اپنی ذات اپنے پیٹ یا اپنی عزت کے لئے کسی کے ساتھ احسان کرنا قابل تعریف فعل نہیں اس کی تہہ میں ذاتی اغراض پوشیدہ ہیں۔ انسان وہ ہے جو کسی غرض یا معاوضہ کے بغیر دوسروں کے کام آئے اور دیوان دیارام گدومل جیسے لوگ تو فرشتہ کہلانے کے مستحق ہیں جنھوں نے اپنی عزت و آبرو کو بھی بغیر کسی غرض کے دوسروں پر قربان کر دیا۔

والیان ریاست کا پرسٹیج

''ریاست'' کا دفتر دریا گنج میں تھا۔ اخبار کو جاری ہوئے تین برس ہو چکے تھے ریاست کے مضامین کی دھاک بیٹھ چکی تھی اور اس کے درجنوں دوست اور دشمن پیدا ہو چکے تھے میرے پاس مرحوم مہاراجہ انور کے سیکرٹری مسٹر ایس رنگا آئر آئے مسٹر آئر میرے پرانے دوست تھے ہم دونوں نابھ میں ملازم رہے تھے بلکہ اس ملازمت کے زمانے میں مسٹر آئر ایک عرصہ تک میرے مکان پر ہی رہے جب کہ ان کے بیوی بچے نابھ میں نہ تھے۔ مسٹر رنگا آئر سے ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں تو آپ نے کہا کہ چیمبر آف پرنس کے اجلاس کے باعث مہاراجہ الور دہلی میں ہیں اگر میں ان سے ملنا چاہوں تو وہ ملاقات کا انتظام کریں۔ میں نے جواب دیا کہ بغیر کام یا ضرورت کے کسی سے ملنا لا حاصل ہے میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو والیان ریاست کے درشن کرنے کو سعادت یا ثواب سمجھتے ہوں اس لئے ملنے کی ضرورت نہیں مسٹر رنگا آئر نے پھر زور دیا کہ مہاراجہ سے ملنا چاہئے بہت اچھے اور لائق آدمی ہیں میں نے پھر انکار کیا اور کہا کہ مہاراجہ انور کے مقابلہ پر ان کے سیکرٹری مسٹر رنگا آئر سے ملنا زیادہ اچھا ہے۔

میرے اس انکار کرنے پر مسٹر رنگا آئر نے پھر زور دیا تو میں نے محسوس کیا کہ ان کی دعوت علت سے خالی نہیں میں نے زور کے ساتھ پھر انکار کیا اور کہا کہ مجھے کسی والئی ریاست سے ملنے کی ضرورت نہیں ہاں اگر مہاراجہ الور کو ملنے کی خواہش ہو تو کوئی حرج نہیں۔ میں مل سکتا ہوں اس کے بعد مسٹر آئر نے مجھے راز میں کہا کہ مہاراجہ خود ملنا چاہتے ہیں اور انہوں نے اس غرض کے لئے ہی بھیجا ہے مگر وہ چاہتے ہیں کہ دیوان سنگھ کی طرف سے ملنے کی درخواست ہوتا کہ ان کے پرسٹیج پر برا اثر نہ پڑے کیونکہ وہ مہاراجہ ہیں مسٹر آئر کی اس رازداری کی بات کو سن کر میں ضبط نہ کر سکا میری ہنسی نکل گئی اور میں نے کہا کیا مہاراجہ عورت ہیں کہ محبت کی خواہش کا اظہار کرنا ان کی فطرت کے

خلاف ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ اظہار عشق میں دوسرے ہی قدم اٹھائیں اور انہوں نے آپ کو بطور سگنل بھیجا ہے اس طرح سے مذاق کی باتیں ہوتی رہیں تو مسٹر رنگا آئر نے کہا کہ مہاراجہ کو علم ہے کہ ایڈیٹر ریاست اور رنگا آئر دوست ہیں اور اگر ایڈیٹر ریاست نہ گیا تو مہاراجہ پر اثر یہ ہوگا کہ یا تو مسٹر رنگا آئر نے ایڈیٹر ریاست سے کہا نہیں یا اگر کہا ہے تو دیوان سنگھ پر مسٹر رنگا آئر کا اثر نہیں اور یہ دونوں صورتیں مسٹر رنگا آئر کے لئے مفید نہ ہوں گی۔ مسٹر رنگا آئر کے بار بار زور دینے کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ میں مہاراجہ سے ملنے کے لئے جاؤں اور مہاراجہ کو یہ علم بھی نہ ہو کہ مسٹر رنگا آئر نے راز میں مہاراجہ کی ملنے کی خواہش کا اظہار ایڈیٹر ''ریاست'' سے کر دیا ہے۔

مسٹر رنگا آئر واپس الور کیمپ میں چلے گئے یہ کیمپ ریاست الور کی خالی زمین پر تھا جو بکانیر ہاؤس کی پشت پر ہے میرا خیال ہے آج کل اس زمین پر سپلائی ڈیپارٹمنٹ کے عارضی دفاتر یا رہائشی مکانات ہیں مسٹر رنگا آئر اگلے روز وقت مقررہ کر کے پھر مجھے لینے کے لئے تشریف لائے میں ان کے ساتھ ریاست الور کی کار میں گیا کیمپ خیموں میں تھا مہاراجہ ایک بڑے خیمہ میں تھے اور اس بڑے خیمہ کے پاس ہی ایک چھوٹے خیمہ میں ویٹنگ روم تھا۔ میں جب مسٹر رنگا آئر کے ساتھ ویٹنگ روم والے خیمہ میں داخل ہوا تو وہاں مرحوم مولانا محمد علی تشریف فرما تھے۔ مرحوم مولانا ایڈیٹر'' ریاست'' پر بہت مہربانی فرماتے اور ایسا سلوک کرتے جیسا بزرگ اپنے عزیزوں کے ساتھ کرتے ہیں آپ بہت محبت اور تپاک سے ملے تھوڑی دیر کے بعد چوب دار مولانا کو لینے آیا مولانا مہاراجہ سے ملنے کے لئے تشریف لے گئے میں رنگا آئر سے باتیں کرتا رہا۔ مولانا ملاقات سے فارغ ہوئے تو میں مہاراجہ کے خیمہ میں گیا۔

مرحوم مہاراجہ الور اپنے دور کے وایان ریاست میں سب سے زیادہ لائق تھے اور آپ کو متعدد زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ بہت اعلیٰ درجہ کے مقرر اور سیاست دان مگر اعمال کے اعتبار سے سب سے بدتر نہ صرف آپ کی ایڈمنسٹریشن کی حالت بہت قابل

رحم تھی بلکہ آپ کے ذاتی حالات بھی انتہائی قابل نفرت تھے۔ میں جب مہاراجہ سے ملنے گیا۔تو آپ تپاک سے ملنے خیر خیریت پوچھنے کے بعد باتیں شروع ہوئیں تو مہاراجہ نے اپنا رعب قائم کرنے کے لئے سب سے پہلے ویدانت کا فلسفہ شروع کر دیا ۔پرماتما ایک ہے ہم سب اسی کا نور ہیں نہ پرماتما میں فرق ہے نہ آتما میں پرماتما غیر فانی ہے اور روح بھی غیر فانی ہے پرماتما کے بعد آتما ہے اور آتما کے بعد پرماتما وغیرہ میں ان کے ویدانت کے اس فلسفہ کو سنتا رہا۔مگر میری سمجھ میں خاک بھی نہ آیا۔ کہ یہ کیا کہہ رہے ہیں اور یہاں اس فلسفہ کے بیان کرنے کی ضرورت کیا ہے آخر اس تمام ویدانت بازی کا نچوڑ آپ نے یہ ظاہر کیا کہ والیان ریاست بھی ذی روح ہیں انسان ہیں ہندوستانی ہیں ایڈیٹر ''ریاست'' کے ہندوستانی بھائی ہیں گورنمنٹ والیان ریاست کی خیر خواہ نہیں نہ والیان ریاست گورنمنٹ کے خیر خواہ ہیں ۔انسان سب برابر کے ہیں اور ایڈیٹر ''ریاست'' والیان ریاست کے خلاف سخت مضامین نہ لکھے کیونکہ اس سے والیان ریاست کی روح کو تکلیف پہنچتی ہے۔

مہاراجہ جب ناصحانہ انداز میں اپنی تمام تقریر ختم کر چکے تو ایڈیٹر ریاست نے چند الفاظ میں عرض کیا کہ والیان ریاست اپنی رعایا پر اس قدر شرمناک مظالم کرتے ہیں کہ ایڈیٹر ریاست ان کو انسان ہی نہیں سمجھتا اور یہ لوگ اس سلوک کے مستحق ہیں کہ جو سلوک ادم خور درندوں کے ساتھ کیا جانا چاہئے۔

مہاراجہ کے لیے میرے یہ الفاظ غیر متوقع تھے کیونکہ ان کو یقین تھا کہ وہ اپنے ویدانت اور پرماتما و آتما کے فلسفہ کو بیان کر کے مجھ پر چھا جائیں گے اور میں حضور حضور کہہ کر آئندہ کے لئے توبہ کرلوں گا۔ان کو یہ خیال بھی نہ تھا کہ مجھ پر کوئی اثر نہ ہوگا کیونکہ وہ لوگوں کو اس طرح ہی اپنی باتوں سے قائل کرنے کے عادی تھے میرا یہ جواب سن کر حیرانی کی حالت میں میری طرف دیکھنے لگے آدمی بہت ہوشیار تھے۔آپ نے فوراً گفتگو کا پہلو بدل کر اور باتیں شروع کر دیں اخبار کا کیا حال ہے کتنا چھپتا ہے اس کا حلقہ

اثر تو بہت کافی وسیع ہے کبھی الور نہیں آئے وغیرہ معلوم ہوتا ہے مہاراجہ کا پروگرام یہ تھا کہ وہ مجھ سے ملیں گے مجھ پر اپنا رعب قائم کریں گے میں اپنے گزشتہ مضامین پر جو الور کے متعلق لکھے گئے اظہار ندامت و افسوس کروں گا آئندہ کے لئے ''نیک چلن'' رہنے کا یقین دلاؤں گا۔ مہاراجہ اس کے بعد پانچ، سات یا دس ہزار روپیہ بطور رخصتانہ یا امداد مجھے عطا فرمائیں گے۔ اور ریاست میں آئندہ مہاراجہ کی تعریفیں چھپا کریں گی۔

کچھ دیر گفتگو کے بعد مہاراجہ نے پوچھا کہ ریاست کی مالی حالت کیسی ہے میں نے جواب دیا کہ خدا کا شکر ہے کھانے کے لئے روٹی مل جاتی ہے مہاراجہ کے اس پوچھنے کا مقصد یہ تھا کہ میں مالی پریشانی کا اظہار کروں اور مہاراجہ امداد کرنے پر آمادہ ہوں۔ مہاراجہ کے لئے میرا یہ جواب بھی خلاف توقع تھا مالی حالت کے دریافت کرنے کے سلسلہ میں مجھے موقع مل گیا۔ میں نے عرض کیا کہ مجھے تو روپیہ کی ضرورت نہیں میں اپنی ضرورت سے زیادہ روپیہ پیدا کر لیتا ہوں۔ مگر ایک درخواست ہے آپ کے لکھنے پر رائے بہادر ڈاکٹر متھرا داس آپ کے گورا کی آنکھوں کا اوپریشن کرنے کے لئے الور گئے۔ آپ نے دس ہزار روپیہ فیس کا وعدہ کیا۔ اوپریشن ہوا۔ ڈاکٹر صاحب اس کے بعد متعدد بار پھر الور گئے۔ مگر آپ نے فیس نہ دی۔ ڈاکٹر صاحب کئی ہزار روپیہ ماہوار سکولوں اور کالجوں وغیرہ پبلک انسٹی ٹیوشنوں کو خیرات دیتے ہیں ایسے نیک شخص کی فیس ادا نہ کرنا مناسب نہیں۔ اگر آپ ان کی یہ فیس ادا کر دیجئے تو نہ صرف یہ انصاف ہوگا بلکہ اسے میں اپنی ذات پر بھی ایک احسان سمجھوں گا۔ کیونکہ ڈاکٹر صاحب میرے بزرگ اور محترم ہیں مہاراجہ کے لئے یہ صاف بیانی بھی خلاف توقع تھی کیونکہ یہ مہاراجہ پر نادہندگی کا الزام تھا آپ نے ٹالتے ہوئے کہا کہ آپ الور جائیں گے تو گوروجی سے پوچھ کر گوروجی جو رقم فرمائیں گے وہ بھیج دیں گے۔

اس ملاقات کے بعد میں مہاراجہ کے خیمہ سے باہر آیا۔ ریٹنگ روم میں مسٹر رنگا آئر میرا انتظار کر رہے تھے وہ مجھے چھوڑنے کے لئے دریا گنج دفتر ریاست میں آئے

راستہ میں انہوں نے پوچھا کہ کیا باتیں ہوئیں میں نے رنگا آئر سے کہا کہ اگر اس شخص سے میں نہ ملتا تو زیادہ اچھا تھا۔ مجھ پر جتنا برا اثر پہلے تھا اس میں کافی اوراضافہ ہوگیا۔

اگلے روز مسٹر رنگا آئر پھر آئے مہاراجہ نے ان کو اس غرض کے لئے بھیجا کہ ایک تو معلوم کریں کہ مجھ پر اس ملاقات کا کیا اثر ہوا اور میں مہاراجہ کی قابلیت کا قائل ہوا یا نہیں اور دوسرے اگر میں مالی امداد چاہتا ہوں تو اس کے متعلق بات چیت کی جائے۔ اثرات کے متعلق میں نے مسٹر رنگا آئر سے وہی کچھ کہا جو میں نے الور کیمپ سے واپسی کے وقت ان سے موٹر میں کہا تھا۔ مالی امداد کے متعلق میں نے مسٹر رنگا آئر سے کہا۔ کہ تم میرے دوست ہو۔ میں الور سے روپیہ لوں گا۔ تو پھر بھی اس شخص کو بے نقاب کرنے سے باز نہ آؤں گا۔ یہ شخص اپنی رعیت کے لئے بہت بڑی لعنت ہے۔ تمہاری پوزیشن نازک ہو جائیگی۔ تم مہاراجہ کو ٹال دو۔ چنانچہ مسٹر رنگا آئر میں یہ جرأت تو کہاں تھی کہ وہ مہاراجہ سے ان پر سے اثرات کا اظہار کرتے جو میرے ذہن پر مہاراجہ کے متعلق ہوئے۔ اگر اتنی جرأت ہوتی تو وہ ریاست الور میں ملازمت ہی کیوں کرتے۔ مالی امداد کے متعلق انہوں نے کہا کہ دیوان سنگھ کو آمدنی کافی ہے اس کو روپیہ کی ضرورت نہیں۔ اس نے مالی امداد لینے سے شکریہ کے ساتھ انکار کر دیا ہے۔

اس واقعہ کے بعد میرے دل میں مہاراجہ کے لیے نفرت کے جذبات زیادہ ہوتے چلے گئے۔ جوں جوں ''ریاست'' میں مضامین شائع ہوتے۔ الور کی رعایا کی طرف سے مواد اور زیادہ آتا۔ مہاراجہ کے بے اختیار ہونے تک ''ریاست'' میں مہاراجہ کے خلاف مہاراجہ کو بے نقاب کرنے کا سلسلہ جاری رہا۔ چنانچہ مہاراجہ نے بمبئی میں ایک بار جب کہ آپ کئی ماہ تک وہاں مقیم رہے اپنے اہل کاروں سے کہا۔ کہ آپ کی مصائب کا ایک بڑا سبب اخبار ''ریاست'' بھی ہے جس نے پبلک رائے کو آپ کے خلاف کر دیا اور جب گورنمنٹ نے آپ کے خلاف قدم اٹھایا تو پبلک رائے بھی آپ کے خلاف تھی۔

خاندانی وقار پر فخر نہ کرو

میرے جرنلزم کے پیشہ کو اختیار کرنے کے ابتدائی زمانہ کا ذکر ہے ۔میں ''خالصہ اخبار'' سے علیحدہ ہو چکا تھا اور لاہور کے متعدد چھوٹے چھوٹے اخبارات میں دو دو تین تین گھنٹہ کام کرتا تھا۔شام کو مرحوم لالہ بانکے دیال ایڈیٹر جھنگ سیال کے مکان پر چند اخبار نویس جمع ہوا کرتے ۔ان میں ہر روز شامل ہونے والوں میں مرحوم لالہ رام رچھپال سنگھ شیدا پنڈت رتن چند اموہن جو بعد میں پنجاب گورنمنٹ کے محکمہ انفرمیشن میں کام کرتے تھے ۔اور ایڈیٹر ریاست تھے دو تین غیر جرنلسٹ دوست بھی آتے جن کے لالہ بانکے دیال سے ذاتی دوستانہ تعلقات تھے ۔

اس زمانہ گورنمنٹ کی پالیسی میں کچھ تبدیلی ہوئی تھی اور حکومت نے محسوس کیا تھا ۔کہ اخبار نویسوں اور پبلک ورکرز کو جرائم پیشہ سمجھنا غلطی ہے ان لوگوں کے ساتھ کچھ تھوڑا بہت تعاون ہونا چاہئے اور اگر اخبار نویسوں میں سے کچھ کام کے آدمی مل جائیں تو ان کو گورنمنٹ کی ملازمت میں لے لیا جائے چنانچہ اس پالیسی کے تحت ہی مرحوم مسٹر عبدالعزیز جو لاہور میں ایک ہفتہ وار انگریزی اخبار کے ایڈیٹر تھے ۔سرکاری ملازمت میں لے لئے گئے تھے ۔

ایک روز ہم لوگ شام کے وقت جمع ہوئے اور مختلف موضوع پر گپ بازی ہو رہی تھی اور گورنمنٹ کی اخبارات اور جرنلسٹوں کے متعلق پالیسی کی تبدیلی کا ذکر آیا ۔تو لالہ بانکے دیال نے ایڈیٹر ''ریاست'' سے طنزاً کہا کہ تم دو دو تین تین گھنٹہ کئی اخبارات میں کام کرتے ہو کیوں نہ سرکاری ملازمت کر لو میں نے اس طنز کا فوراً جواب دیا بہت اچھا خیال ہے آیئے ہم دونوں سرکاری ملازم ہو جائیں میرے اس جواب کے بعد پنڈت رتن چند نے مذاقاً کہا کہ آیئے آپ دونوں کی جانب سے درخواست لکھ لی جائے ۔وہاں قلم دوات اور کاغذ موجود تھا ۔پہلے میری طرف سے درخواست لکھی جانے لگی پنڈت رتن چند نے کہا سب سے پہلے اپنے خاندانی حالات بتایئے کیونکہ ہر

درخواست میں ضروری ہے کہ خاندان کے حالات ہوں میں نے حالات بتانے شروع کئے میرے والد گورنمنٹ کی ملازمت میں ڈاکٹر تھے میرے چچا سردار سیوا سنگھ گورنمنٹ کے خطاب یافتہ ''سردار صاحب'' اور ریاست نابھ میں چیف میڈیکل آفیسر ہیں میرے چچا زاد بھائی ڈاکٹر امریک سنگھ گورنمنٹ کی ملازمت میں اسسٹنٹ سرجن ہیں۔ میرے ایک چچا زاد بھائی سردار گوربچن سنگھ وکیل ہیں اور ایک چچا سردار موہن سنگھ آنزیری مجسٹریٹ ہیں جب میں نے اتنا ہی بتایا تو پنڈت رتن چند نے کہا گویا کہ خاندان کے سب لوگ ہی اچھی جگہ پر ہیں صرف تم ہی بے وقوف اور بدنصیب ہو جو اخبارات کے دفاتر میں فاقہ کشی کرتے ہوئے دھکے کھا رہے ہو پنڈت رتن چند کے ان الفاظ پر تمام لوگ ہنس پڑے۔ اور ان لوگوں کی ہنسی کے ساتھ میں بھی کھسیانی حالت میں ہنس پڑا۔ کیونکہ گو دل میں تو میں اپنی ناکامی اور کمزوری پر شرمندہ تھا مگر ان کے ساتھ شامل ہو کر ہنسنے کے علاوہ دوسری مناسب صورت بھی کیا تھی۔

عام طور پر لوگ چھوٹے چھوٹے واقعات سے اثر نہیں لیتے۔ مگر میں بعض بہت چھوٹے واقعات سے بھی متاثر ہو جاتا ہوں اور پھر زندگی بھر یہ واقعہ میری اصلاح کا باعث ہوتا ہے۔ چنانچہ اس واقعہ کے بعد آج تک میں نے اپنے خاندان کے کسی بڑے شخص پر کبھی بھی فخر نہیں کیا اور میں محسوس کرتا ہوں کہ انسان وہی بڑا ہے جو خود اپنی قوت بازو سے بلند ہو۔

درخواستوں کے خاندانی وقار کے سلسلہ میں ایک صاحب نے جو ایک امریکن دفتر نئی دہلی میں اعلیٰ عہدہ پر ہیں مجھے بتایا کہ ان کے دفتر میں بھی جب کلرکی کی ملازمت کے لئے لوگ درخواست دیتے ہیں، تو ان میں یہی لکھا ہوتا ہے کہ درخواست کرنے والے کا باپ فلاں عہدہ پر ہے۔ چچا فلاں عہدہ پر، بھائی نے فوج میں یہ خدمت انجام دی اور بہنوئی پنشن پا رہے ہیں۔ ان ایسی درخواستوں کو دیکھ کر امریکن بیحد نفرت کرتے ہیں اور حیران ہوتے ہیں کہ ان واقعات سے ملازمت کا کیا تعلق۔

درخواست میں تو صرف یہ لکھا جانا چاہئے کہ درخواست دینے والے کی اہلیت کیا ہے اور وہ کیا کام کر سکتا ہے مگر درخواستوں میں خاندانی وقار کو اس طرح لکھا جاتا ہے۔ گویا کہ امریکن شادی کے لئے لڑکیاں تقسیم کر رہے ہیں اور جو شخص خاندانی وقار کے لحاظ سے بلند ہوگا۔ اس کو خوبصورت لڑکی دی جائے گی۔

اس واقعہ کو لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ جو لوگ اپنی ذاتی قابلیت اور کامیابی حاصل کرنے کی جگہ اپنے خاندان پر فخر کر کے کاہلی سستی اور بے ہمتی کا ثبوت دیتے ہیں وہ اپنے ذہن کو دھوکا دینے کا باعث ہیں وہ زمانہ چلا گیا اور یہ زمانہ اب کبھی واپس نہ آئے گا جب خاندان کو دیکھ کر حکومتیں پنشن مقرر کر دیتی تھیں یا لوگ لڑکیاں دیتے تھے اب تو بڑا وہی شخص ہے جو اپنی قوت بازو کے ذریعہ بلند ہو۔

☆☆☆☆☆☆

ظلم وزیادتی کو برداشت نہ کرو

جب ''ریاست'' جاری کیا گیا تو سب سے پہلے دفتر اور رہائش کے لئے مکان دہلی دروازہ کے بالکل قریب موجود تھانہ کہ عین سامنے کوچہ لال مسن میں تھا۔ یہ مکان چودھری بہت رام کا تھا۔ چودھری صاحب بہت شریف اور نیک بزرگ تھے۔ یہ محلّہ تمام کا تمام ہندوؤں کا تھا اور میرا خیال ہے کہ اگر کوئی مسلمان دوگنا کرایہ بھی دیتا۔ تو اسے مکان کرایہ پر نہ مل سکتا تھا۔ میں اس مکان کا کرایا اٹھائیس روپے ماہوار دیتا تھا۔ اور بارہ روپیہ ماہوار میں اس کا ایک حصہ میں نے ایک بابو صاحب کو دیا ہوا تھا۔ جو ریلوے میں گارڈ تھے یعنی یہ مکان میرے پاس صرف سولہ روپیہ ماہوار میں تھا اور اس میں دفتر ''ریاست'' اور میری رہائش دونوں کے لئے جگہ تھی۔

میں نے جب مکان کرایہ پر لیا تو چودھری بہت رام تو مجھے مکان دینے پر آمادہ تھے۔ مگر اس مکان کے قریب کے براہمن اور بنیے مجھے دیکھ کر ناک چڑھا رہے تھے اور انہوں نے چودھری بہت رام سے اس وقت جبکہ میں کرایہ پر لینے کے لئے مکان دیکھ رہا تھا۔ اشارۃً کہا کہ یہ مکان مجھے کرایہ پر نہ دیا جائے ان لوگوں کے پاس مجھے مکان نہ دیئے جانے کے حق میں اگر کوئی ذلیل تھی تو صرف یہ کہ میں پنجابی ہوں۔ اور سکھ ہوں اس زمانہ میں اور شاید اب بھی دہلی کے لوگ پنجابیوں کو ناپسند کرتے تھے۔ اور سکھوں سے تو اس قدر ہیبت زدہ تھے۔ جیسے پنجاب کے لوگ افغانستان کے پٹھانوں سے خوف کھاتے تھے۔ یعنی یہ پنڈت اور بنئے نہیں چاہتے تھے۔ کہ ان کے پڑوس میں کوئی ایسا پنجابی یا سکھ آباد ہو۔ جس پر ان کا رعب نہ رہے۔ چودھری بہت رام فطرتاً شریف اور نیک بزرگ تھے۔ اس کے علاوہ ان کو کرایہ سے غرض تھی۔ آپ نے ان بنیوں اور براہمنوں کی کانا پھوسی کا جواب یہ دیا کہ سکھ مسلمان نہیں ہوتے۔ یہ بھی ایک قسم کے ہندو ہیں اور مکان کرایہ پر لینے والا شریف آدمی معلوم ہوتا ہے۔ مکان دینے میں کوئی ہرج نہیں چنانچہ چودھری بہت رام نے مکان مجھے کرایہ پر دے دیا۔ اور ایک

ماہ کا کرایہ پیشگی لے کر چابی میرے حوالہ کی جب چابی میں لے رہا تھا۔ تو ان پڑوسیوں میں سے ایک نے نیم بددلی اور نیم اطمینان کے سے ملے جلے جذبات میں کہا کہ اچھا سردار جی! مکان لے لیجئے آپ ہندو ہیں کوئی ہرج نہیں مگر آپ نے پیاز اور گوشت نہ پکانا۔ کیونکہ یہ محلّہ براہمنوں اور بنیوں کا ہے۔ میں نے اس کا کچھ جواب نہ دیا اور صرف مسکرا دیا میری اس مسکراہٹ کے دو معنی تھے۔ لالہ جی تو یہ سمجھیں کہ میں نے آپ کی اس شرط کو خندہ پیشانی کے ساتھ قبول کر لیا ہے۔ میں نے دل میں یہ کہا کہ لالہ جی مجھے مکان میں اسباب لے آنے دو۔ پھر دیکھونگا کہ مجھے پیاز اور گوشت پکانے سے کون روکتا ہے۔

میں اب تو گوشت بہت کم کھاتا ہوں اور اسے گناہ بھی سمجھتا ہوں۔ کیونکہ انسان کا اپنی لذت کے لیے کسی جان دار کی جان لینا بے رحمی ہے۔ مگر میں نے اپنی زندگی میں گوشت کثرت کے ساتھ کھایا ہے بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ سالہا سال تک بلا ناغہ ہر روز کھاتا رہا۔ میں نے جب اس مکان میں رہائش اختیار کی تو ہمیشہ کی طرح میرے لئے وہاں بھی گوشت پکنا شروع ہوا۔ پانچ سات روز میں ہی پڑوسیوں کو مصالحہ کی خوشبو سے یہ احساس ہوا کہ میں شاید گوشت پکواتا ہوں۔ اور اگر گوشت نہیں تو میرے ہاں پیاز کا مصالحہ تو ضرور بھونا جاتا ہے۔ چنانچہ پھر کانا پھوسی شروع ہوئی۔ مگر کسی کو یہ جرأت نہ ہوئی۔ کہ وہ مجھ سے دریافت کرے اس طرح سے ہی دو تین ہفتے گزر گئے۔

میں جہاں بھی اور جس مکان میں بھی رہا ہوں۔ پڑوسیوں کے متعلق میری پوزیشن ہمیشہ ہی دلچسپ رہی۔ میں نے کسی پڑوسی کے متعلق کبھی کوئی دلچسپی نہیں لی۔ بلکہ یہ واقعہ ہے کہ پانچ پانچ سات سات سال تک رہنے کے باوجود مجھے علم نہیں ہوتا۔ کہ پڑوسیوں کا نام کیا ہے نہ ان کے ہاں کبھی جاتا ہوں اور نہ ان کے اپنے ہاں آنے کی حوصلہ افزائی کرتا ہوں۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ پڑوسیوں سے جتنا بے تعلق رہا جائے۔ انسان آرام میں رہتا ہے تعلقات ہونے پر پہلے دوستی ہوتی ہے۔ پھر یہ دوستی

عداوت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔اور تو تو میں میں تک نوبت پہنچتی ہے۔میں پڑوسیوں کے جھگڑوں اور ان کے حالات سے اس قدر بے تعلق رہتا ہوں۔کہ اگر میرے دروازے کے سامنے دو پڑوسی لڑ رہے ہوں۔تو میں اپنے کام میں مصروف رہتا ہوں۔ان کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔پڑوسیوں سے باوجود اس بے تعلقی کے یہ لطیفہ اور بھی دلچسپ ہے کہ پڑوسیوں کے تمام چھوٹے بچے مجھ سے بے حد مانوس ہو جاتے ہیں اور میں ان سے بہت بے تکلف ہو جاتا ہوں۔یہ جب بھی میرے ہاں آئیں ان کی خاطر اور ان سے محبت کا سلوک کرتا ہوں اور یہ اس بات کے منتظر رہتے ہیں کہ میں کب کام سے فارغ ہو جاؤں اور یہ میرے پاس آئیں۔

مجھے اس مکان میں رہتے ہوئے پانچ ہفتے ہوئے تھے تو میرے مکان کے سامنے والے پنڈت جی تشریف لائے اور میرے ساتھ ان کی یہ بات چیت ہوئی

پنڈت جی: سردار جی مزاج اچھے ہیں

میں: پنڈت جی آپ کی مہربانی ہے

پنڈت جی: سردار جی آپ پیاز کھاتے ہیں

میں: جی ہاں میں کھاتا ہوں

پنڈت جی: اور کیا گوشت بھی کھاتے ہیں

میں: جی ہاں، گوشت بھی کھاتا ہوں

پنڈت جی: تو کیا گوشت اور پیاز یہاں ہی پکاتے ہیں

میں: جی ہاں یہاں ہی پکاتا ہوں

پنڈت جی: یہ محلّہ ہندوؤں کا ہے آپ گوشت نہیں پکا سکتے۔

میں: پنڈت جی، میں پڑوسیوں کے احساس کا ہمیشہ احترام کرتا ہوں اور میرا یہ فرض ہے مگر اس صورت میں کہ میں گوشت اور پیاز اپنے گھر کے اندر پکاؤں اس میں آپ کا کیا ہرج ہے۔آپ کو اس سے برا نہ ماننا چاہئے۔

پنڈت جی: نہیں صاحب ہم تو محلّہ میں گوشت یا پیاز نہیں پکنے دیں گے۔

میں: میں تو گوشت ہر روز کھاتا ہوں لازمی طور پر پکواؤں گا۔ ہاں یہ وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کو کوئی تکلیف نہ ہوگی۔

پنڈت جی یہ بات چیت کر کے چلے گئے۔ میں ان سے مخاطب تو پہلے ہی کبھی نہ ہوا تھا۔ اس روز کے بعد تو صاحب سلامت بھی موقوف یہ کبھی گلی میں سے دکھائی بھی دیتے تو پیشانی پر بل ڈال کر دوسری طرف منہ پھیر لیتے۔ اس کے علاوہ آپ نے محلّہ کے دوسرے لوگوں کے پاس میری برائی شروع کی۔ مگر میں نے کوئی پروانہ کی کیونکہ چھوٹی چھوٹی باتوں سے اثر لینا صرف چھوٹے خیال کے لوگوں کا کام ہے۔ جو لوگ بلند ہونا چاہئیں انہیں چھوٹی باتوں سے بلند رہنا چاہئے۔

کئی دن گزر گئے پنڈت جی روز بروز زیادہ مخالف ہوتے چلے گئے۔ ہر جگہ میرے خلاف باتیں کرتے اور میں چونکہ ان کی مخالفت کے خلاف کوئی قدم نہ اٹھاتا۔ یہ مجھے کمزور سمجھتے ہیں میں نے نے ان کو ایک روز سمجھایا کہ انسان کو دنیا میں نہ تو کسی پر زیادتی کرنی چاہئے اور نہ ہی زیادتی برداشت کرنی چاہئے میں نے آپ کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی۔ مگر آپ خواہ مخواہ میری مخالفت کرتے ہیں آپ کے لیے یہ مناسب نہیں۔ پنڈت جی پر میری اس درخواست کا کوئی اثر نہ ہوا۔ اور آپ میری اس مخالفت میں اضافہ ہی کرتے چلے گئے۔ اور ان کو مخالفت کے لیے اور کوئی بات نہ ملتی تو بار پیاز اور گوشت کا نام لے کر ہی اپنے دل کی بھڑاس نکال لیتے۔

ایک روز میرے ہاں مرغی پکائی گئی اور مرغی کی کھال، پنجے اور انتڑیاں وغیرہ ابھی بھنگن اٹھا کر نہ لے گئی تھی کہ بلی ان میں سے ایک پنجہ اٹھا کر لے گئی۔ اور اس کم بخت نے پنڈت جی کی ڈیوڑھی میں لے جا کر اسے کھانا شروع کر دیا۔ پنڈت جی گھر پر نہ تھے باہر گئے ہوئے تھے واپس تشریف لائے تو بلی اپنے شکار میں مصروف تھی پنڈت جی کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا۔ محلّہ میں کوئی دوسرا شخص گوشت تو کیا پیاز بھی نہ کھاتا تھا

اس جرم کا مجرم ہو سکتا تھا تو صرف میں ہی پنڈت جی آگ بگولا صورت میں ڈیوڑھی سے باہر نکل آئے اور آپ نے اس طرح ہی واویلا شروع کیا۔ جیسے کوئی ڈاکہ پڑا ہو۔ گلی کے لوگ بھی تماشہ دیکھنے جمع ہو گئے پنڈت جی مجھ پر الزام لگ ارہے ہیں کہ میں نے ان کا جنم بھرشٹ کر دیا۔ ان کی ڈیوڑھی میں مرغی کا پنجہ آ گیا۔ میں اپنے متعلق شور سن کر باہر نکلا تو دیکھا کہ پنڈت جی چلا رہے ہیں اور مجھے برا بھلا کہہ رہے ہیں میں نے پنڈت جی سے کہا کہ میرا قصور نہیں بلی پنجہ اٹھا لے گئی۔ اگر فرض کیا کہ بلی کوئی مرا ہوا چوہا آپ کی ڈیوڑھی میں لے جاتی تو پھر کس کا قصور تھا مگر پنڈت جی نہیں مانتے تھے اور اس بات پر ضد کر رہے تھے کہ میرے ہاں پیاز اور گوشت کیوں آتا ہے میں نے آ کا کہا اچھا پنڈت جی! اگر آپ غیر معقولیت پر اتر آئے ہیں تو لیجئے اب آپ منہ سے ایک لفظ نکالئے میں آپ کا سر موری میں دے کر آپ کو مار مار کر دنبہ بنا دوں گا چنانچہ میں پنڈت جی کی مرمت کے لئے تیار ہو گیا اور ان کو پیٹنے والا ہی تھا کہ آپ نے اپنی بزدلی کا اظہار کرتے ہوئے جھٹ کہا:

''سردار جی! آپ تو خواہ مخواہ ناراض ہوتے ہیں میں نے آپ سے عرض کیا ہے کہ آپ ذرا احتیاط کیا کیجئے تا کہ بلی کسی ہڈی وغیرہ کو اٹھا نہ لائے۔ ہم تو آپ کے سیوک ہیں۔ آپ اپنے گھر میں جو چاہیں کریں آپ کو کون روکتا ہے۔'' اس کے بعد پنڈت جی ہمیشہ کے لئے سیدھے ہو گئے۔ گلی میں اگر ملتے تو فوراً نمستے کہتے ہوئے تپاک کے ساتھ پوچھتے مزاج کیسے ہیں اور سلام دعا کا سلسلہ میرے اس مکان کو چھوڑنے کے بعد بھی عرصہ تک قائم رہا۔

سکھوں کے گورو صاحب کا ایک شبد ہے جس کے معنی ہیں عارف اللہ وہ ہے جو کسی کو خوف دے اور نہ کسی کا خوف برداشت کرے اس اصول کے مطابق انسان کا فرض ہے کہ وہ کسی کے ساتھ زیادتی کرنے کو گناہ سمجھے اور اگر کوئی دوسرا زیادتی کرے تو اس زیادتی کو برداشت نہ کرے کیونکہ زیادتی برداشت کرنا بزدلی ہے اور بہادرو

بزدل انسان میں بھی یہی فرق ہے۔ بہادر شخص نہ تو کسی دوسرے پر ظلم کرتا ہے نہ خود ظلم برداشت کرتا ہے اور بزدل شخص ظلم اسی پر کرتا ہے جو ظلم برداشت کرے اور کمزور ہو اور اس پر ظلم نہیں کرتا جو بہادر ہو۔

☆☆☆☆

لائق سمجھنا ہی نالائقی کا ثبوت ہے

ایڈیٹر ''ریاست'' کی جرنلزم کی تمام زندگی میں شاید ہی کوئی دن ایسا گزرا ہوگا جس روز اس کے پاس پانچ سات مضامین، افسانے یا نظمیں ایسی نہ پہنچی ہوں جن کو ''ریاست'' میں شائع نہیں کیا جاسکتا تھا اور صرف ''ریاست'' کا ہی کیا سوال ہے دنیا کے ہر اخبار کے دفتر میں چھپنے والے مضامین سے زیادہ مواد ناقابل اشاعت پہنچتا ہے جو لکھنے والوں کو واپس کردیا جاتا ہے مگر ایک اخبار نویس کی حالت اس وقت قابل رحم ہوتی ہے جب مضمون نگار مضمون کے واپس پہنچنے کے بعد یہ دریافت کرے کہ مضمون شائع نہ کرنے کی وجہ کیا ہے۔ چنانچہ دفتر ''ریاست'' سے ایسے حضرات کو صرف یہی جواب دیا جاتا ہے کہ ہماری قابلیت بہت محدود ہے۔ آپ کے بلند مضمون کو سمجھنے کی ہم اہلیت نہیں رکھتے۔

انسان کی فطرت حق و صداقت اور معقولیت کی پروا نہیں کرتی۔ اور بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جو معقولیت کو اپنی فطرت پر غالب آنے دیں چنانچہ مضامین کے سلسلہ میں بھی یہ قدرتی امر ہے کہ اگر کسی مضمون نگار کا مضمون اخبار میں شائع ہو تو مضمون نگار کا خوش ہونا فطرتاً ضروری ہے اور اگر مضمون شائع نہ ہو اور واپس کر دیا جائے تو مضمون نگار یقیناً نا خوش ہی نہ ہوگا بلکہ اس کے دل میں اخبار کے لئے نفرت بھی پیدا ہو جائے گی اور مضمون نگار ایسا کرنے کے لئے انسانی فطرت کے باعث مجبور ہے کیونکہ جب وہ مضمون لکھتا ہے تو وہ سمجھتا ہے کہ مضمون بہت اچھا ہے اسے اخبار میں شائع ہونا چاہئے اور جب مضمون ناقابل اشاعت قرار دیا جا کر اس کے پاس واپس پہنچے تو اس کو یہی احساس ہوتا ہے کہ مضمون تو اچھا تھا ایڈیٹر نے اپنی نالائقی، قدر شناسی یا کسی اور وجہ سے واپس کر دیا۔ چنانچہ اگر مضمون لکھنے والے کو مضمون کے بلند اور بہتر ہونے کا یقین نہ ہوتا تو وہ مضمون کو بھیجتا ہی کیوں۔ یا اسے مضمون کی غلطیوں کا احساس ہوتا تو وہ بھیجنے سے پہلے اپنی غلطیوں کو درست کر لیتا۔

مضامین کے سلسلہ میں ذیل کا ایک واقعہ لکھتا ہوں جو زندگی بھر میری رہبری کا باعث ہوا اور جس کے بعد میں نے اپنے آپ کو ہمیشہ ہی رنگروٹ، نالائق یا ایک طالب علم سمجھا اور میرا یہی احساس میری جرنلزم کی زندگی میں کامیابی کا سب سے بڑا باعث ہے۔

لالہ شام لال کپور (ایڈیٹر ''گورو گھنٹال'') لاہور سے ایک روزانہ اردو اخبار ''بلیٹن'' نکالتے تھے آپ سنسنی پیدا کرنے والے مضامین میں بہت مشاق تھے اور اس اعتبار سے شاید اس زمانہ میں لاہور کا کوئی اخبار نویس آپ کا مقابلہ نہ کر سکتا تھا مگر علم و ادب، افسانہ یا نظم وغیرہ سے آپ کو کوئی مناسبت نہ تھی میں اس زمانہ میں لالہ شام لال کے اخبار میں روزانہ چند گھنٹے کام کرتا تھا اور کام سے فارغ ہونے کے بعد ہم دونوں شام کو سینما بھی جایا کرتے۔ ایک روز کام ختم کرنے کے بعد ہم سیر کے لئے جا رہے تھے تو ہمیں سامنے سے آتے ہوئے مہاشہ سدرشن (جن کی اس زمانہ میں بطور افسانہ نویس بہت بڑی شہرت تھی کئی کتابوں کے مصنف تھے اور آج کل بمبئی کی کسی فلم کمپنی میں بطور ڈرامانویس دو ہزار روپیہ ماہوار تنخواہ پاتے ہیں) ملے۔ نمستے نمستے ہونے کے بعد لالہ شام لال نے مہاشہ سدرشن سے کہا سدرشن صاحب! میں تو زندگی بھر یہی سمجھتا رہا کہ افسانہ لکھنا بہت مشکل کام ہے اور اس فن میں کمال حاصل کرنے کے لئے کئی برس کی ضرورت ہے مگر آپ حیران ہوں گے آج میں نے افسانہ لکھنے کی پہلی بار کوشش کی اور میں نے نصف گھنٹہ کے اندر بہت اچھا افسانہ لکھ لیا جو کل کے اخبار میں شائع ہوگا۔

مہاشہ سدرشن نے لالہ شام کے یہ الفاظ سن کر جو جواب دیا وہ یہ تھا:

''شام لال جی! آپ نے تو نصف گھنٹہ میں افسانہ لکھ لیا۔ مگر میں آپ سے کہتا ہوں کہ اگر آپ پانچ سات سال تک مسلسل افسانہ لکھتے رہیں تو پانچ سات برس کے بعد آپ کو معلوم ہوگا کہ افسانہ کہتے کسے ہیں آپ کو افسانہ لکھنا پھر بھی نہ آئے گا۔ یعنی افسانہ کو صرف سمجھنے کے لیے ہی پانچ سات برس کا عرصہ چاہئے لکھنا تو بہت بڑی بات

ہے۔‘‘

جو لوگ جرنلزم کا پیشہ اختیار کرنا چاہیں یا جن اصحاب کو مضمون نگاری یا افسانہ نویسی کا شوق ہو وہ اگر مہاشہ سدرشن کے ان الفاظ کو ذہن میں رکھیں تو ان کے لئے کامیابی حاصل کرنا مشکل نہیں کیونکہ دنیا میں کسی فن کو وہی شخص سیکھ سکتا ہے جو بطور طالب علم سیکھنے کی کوشش کرے اور اگر نالائق اور ناواقف ہوتے ہوئے اس نے اپنے آپ کو لائق اور بلند سمجھا تو اس نے اپنی ترقی کی راہیں محدود کر لیں۔

☆☆☆☆☆☆

ستاروں کے اثرات

یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب کہ جرنلزم کا پیشہ اختیار کئے مجھے تھوڑا عرصہ ہی ہوا تھا میں لاہور میں تھا مختلف اخبارات میں دو دو تین تین گھنٹے کام کرتا۔ مالی حالت اچھی نہ تھی اور اپنی زندگی کو انتہائی ناکام سمجھتے ہوئے کچھ مایوس سا تھا۔

میرا کچھ وقت مرحوم لالہ چھپال سنگھ شیدا اور مرحوم لالہ بانکے دیال کے ساتھ صرف ہوتا۔ ایک روز ان دونوں حضرات سے پنڈت راج نرائن ارمان کھٹ شاستری ملنے کے لئے آئے۔ اور باتیں ہو رہی تھیں تو پنڈت جی نے فرمایا کہ بھرگو سنگتا کا کچھ حصہ ان کے پاس موجود ہے یہ سن کر ان دونوں حضرات کے دل میں بھرگو سنگتا دیکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ اور اگلے روز ہم تینوں بھرگو سنگتا دیکھنے کے لئے پنڈت راج نرائن جی کے مکان پر گئے۔

بھرگو سنگتا کیا ہے۔ اس کے متعلق بعد میں جو معلومات مجھے حاصل ہوئیں وہ یہ ہیں کہ یہ نادر و نایاب کتاب علم جوتش کے موجد بھرگو رشی کی تصنیف ہے جسے ہزارہا برس ہوئے تصنیف کیا گیا۔ یہ کتاب کئی حصوں میں تقسیم ہے۔ ہر حصہ دو دریاؤں کے درمیانی حصہ کے لوگوں کے حالات کے متعلق ہے۔ یعنی ہر دوآبہ کے لیے علیحدہ جلد ہے۔ تمام کی تمام مکمل کتاب کا وزن کئی من بتایا جاتا ہے اور مختلف لوگوں کے پاس مختلف حصے ہیں اس کتاب کے کچھ حصے تو جرمنی کے پروفیسر میکس مولر (یہ بزرگ سنسکرت زبان کے بہت بڑے عالم تھے) ہندوستانی پنڈتوں سے خرید کر جرمنی لے گئے اور انہوں نے وہاں کے سرکاری کتب خانے میں رکھے بعض حصے ہندوستان میں چھپ بھی گئے مگر زیادہ تعداد ایسی ہے جو ابھی نہیں چھپی۔ اس کتاب میں دنیا میں پیدا ہو چکے، اب موجود اور آئندہ پیدا ہونے والے ہر انسان کا زائچہ اور زندگی کے حالات ہیں اور صرف اس زندگی کے حالات ہی نہیں بلکہ یہ بھی لکھا ہے کہ یہ انسان پچھلے جنم یعنی اب پیدا ہونے سے پہلے کی زندگی میں کہاں تھا اور مرنے کے بعد پھر کہاں پیدا ہوگا۔

ہم لوگ پنڈت جی کے پاس پہنچے نمسکار اور نمستے ہونے کے بعد باتیں شروع ہوئیں تو ہم لوگوں نے بھر گو سنگتا دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ پنڈت جی کے پاس ایک حصہ تھا۔ ہم لوگ اپنی کنڈلیاں یعنی زائچے ساتھ لے گئے تھے۔ سب سے پہلے میں نے اپنی کنڈلی پنڈت جی کو دی۔ انہوں نے بہت کافی وقت صرف کرکے میری کنڈلی کو بھر گو سنگتا کی ہزارہا کنڈلیوں میں سے ایک کے ساتھ ملائی۔ کنڈلی کے ملنے کے بعد اس کنڈلی کا جو پھل یعنی نتیجہ پنڈت جی نے پڑھا وہ مجھے اچھی طرح سے یاد ہے جو یہ تھا:

''یہ انسان اپنے باپ کے لیے بہت ہی نقصان کا باعث ہو حمل میں ہوگا تو والد کی صحت گرنی شروع ہوگی۔ پیدا ہونے کے بعد چھ ماہ کے اندر اس کا باپ انتقال کر جائے گا۔ اس انسان کو علم کچھ نہ ہو مگر بہت ہوشیار ہو۔ اٹھارہ برس کی عمر میں زمین ملے۔ سترہ برس کی عمر میں ایک لڑکی کے عشق میں مبتلا ہو اور بہت تکلیف اٹھائے اس لڑکی کے ساتھ اس انسان کا پچھلے جنم میں بھی تعلق تھا اس نے اس لڑکی کو پچھلے جنم میں تکلیف دی تھی یہ لڑکی پچھلے جنم کا بدلہ اس کے اس جنم میں لے گی جب کہ اس انسان کی عمر سترہ برس کی ہوگی یہ انسان پچھلے جنم میں بنارس کے ایک برہمن خاندان میں پیدا ہوا تھا اور آئندہ جنم میں بھی بنارس میں ہی پیدا ہوگا۔ یہ انسان بہت خوش نصیب اور خوش بخت ہے۔ زندگی میں لاکھوں انسانوں کے دماغوں پر حکومت کرے۔ چڑھنے کے لیے اسے سواری نصیب ہو۔ لاکھوں روپیہ پیدا کرے اور لاکھوں خرچ کرے۔ ہمیشہ مقروض رہے۔ زندگی بھر دشمنوں کا مقابلہ کرتا رہے اور ان کو نیچا دکھاتا رہے راجوں مہاراجوں کے لئے خوفناک ہو۔ اس کا رزق اس کے وطن سے مشرق کی طرف ہو۔ اسی برس کی عمر کے بعد یک لخت حرکت قلب کے بند ہونے کے باعث اس کی موت واقع ہو۔''

یہ مختصر حالات جب میں نے سنے تو میں حیران تھا کہ اس وقت تک کے گزر چکے
تمام واقعات درست ہیں مگر اس بات پر یقین نہ آتا تھا کہ میری آئندہ زندگی اس قدر
شاندار ہو گی ۔ کیونکہ میں اس وقت کی حالت سے بہت مایوس تھا چنانچہ گزر چکے
حالات یہ تھے میرے والد کا انتقال جب ہوا تو میری عمر صرف چالیس دن کی تھی علم
سکول میں صرف پانچویں جماعت تک حاصل کیا۔ اس کم تعلیم میں ہی لاہور کے
اخبارات کو ایڈٹ کر رہا تھا۔ اٹھارہ برس کی عمر تھی ۔ جب ہماری زمین تقسیم ہوئی اور
مجھے میرا حصہ ملا۔ سترہ برس کی عمر تھی جب کہ میں دھرم کوٹ (ضلع فیروزپور) میں تھا
اور مجھے ایک لڑکی سے محبت ہوئی میں نے اس لڑکی سے کبھی کوئی بات تک نہ کی مگر ایک
برس تک رات کو مجھے نیند نہ آتی اور بے چین رہتا اگر میری بات پر یقین کیا جائے تو
میں سچ کہتا ہوں کہ اس عمر میں مجھے عورت اور مرد کے تعلقات کا قطعی کوئی علم نہ تھا۔ اور
اپنے ہم عمروں میں اس اعتبار سے انتہائی بے وقوف اور ناواقف سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ
مجھے یاد ہے اس زمانہ میں جب باتیں کرتے ہوئے ایک صاحب سے حیض کا لفظ سنا تو
میں نے پوچھا۔ کہ حیض کسے کہتے ہیں تو میرے اس سوال کو سن کر میرا مذاق اڑایا گیا۔
اور ایک صاحب بابو نور محمد نے کہا کہ میں بہت ہی احمق ہوں دو سال تک اس لڑکی کے
عشق میں مبتلا رہا اس کے بعد اس لڑکی کا انتقال ہو گیا۔ اور مجھے بے حد صدمہ ہوا جب
میں نے اس کے انتقال کی خبر سنی تو میرے ہاتھوں میں کچھ سامان تھا جو ہاتھوں سے گر
گیا اور اب بھی جب کبھی اس لڑکی اور اس کے گھر کے لوگوں کا خیال کرتا ہوں تو ایک نا
قابل بیان کیفیت کے باعث جسم میں کچھ سنسنی سی پیدا ہوتی ہے ۔ یہ واقعات تو ایسے
تھے جو میری زندگی میں اس سے پہلے گزر چکے تھے اور چونکہ یہ واقعات میری زندگی
میں پیش آئے کوئی وجہ نہ تھی کہ آئندہ کے خوشگوار زمانہ کے متعلق بھی مجھے یقین نہ آتا۔
مگر جب اس طاقت کی حالت پر غور کرتا تو خیال آتا کہ بھر گو سنگتا کے کچھ حالات شاید
درست ہوں اور کچھ غلط کیونکہ یہ تصور میں بھی نہ آتا تھا کہ لاکھوں روپیہ پیدا کروں گا

اور پبلک میں اتنی شہرت ہوگی۔

پھر گوسنگتا سے یہ حالات معلوم کرنے کے بعد جوتش کے متعلق مجھے بہت دلچسپی ہو گئی۔ میں نے مختلف جوتشیوں سے اپنی جنم پتری اور ورش پھل بنوانے شروع کیے اور ہمیشہ تمام حالات ملتے رہے جن میں سے کچھ واقعات اور اپنے ذاتی تجربات بیان کرتا ہوں۔

میں نابھ میں ملازم تھا۔ مرحوم مہاراجہ نابھ مجھ پر بہت خوش اور مہربان تھے کیونکہ مرحوم مہاراجہ پٹیالہ نے مجھے لالہ شام لال کپور ایڈیٹر ''گوروگھنٹال'' کی معرفت چالیس ہزار روپیہ دینا چاہا۔ تاکہ میں مہاراجہ نابھ سے غداری کر کے نابھ سے چلا جاؤں مگر میں نے انکار کر دیا۔ مہاراجہ نابھ سے میں نے اس کا ذکر کرنا مناسب نہ سمجھا کیونکہ ان کی طبیعت مشکوک تھی۔ مجھے خیال ہوا کہ اگر میں نے ان سے ذکر کیا تو ان کو ممکن ہے میرے متعلق کوئی شبہ پیدا ہو مگر مہاراجہ کو دوسرے ذرائع سے اس کا علم ہو گیا تو میری تنخواہ دوگنی کر دی گئی اور مہاراجہ مجھے رہائش کے لئے ایک کوٹھی اور زمین دے کر اپنی رعایا بنانے کے متعلق سوچ رہے تھے اس حالت میں جب کہ مہاراجہ مجھ پر بہت خوش اور مہربان تھے ریاست کوچین کے ایک جوتشی کا لکھا ہوا میرا ورش پھل (سالنامہ) جو میں نے مسٹر رنگا آئر کی معرفت سے ان کے خسر کے ایک دوست جوتشی سے بنوایا تھا۔ دیکھا تو اس میں لکھا تھا کہ میں اس برس میں ملازمت سے موقوف کیا جا کر جیل میں قید کر دیا جاؤں۔ اس ورش پھل کے لکھے ہوئے حالات اور مہاراجہ کی مہربانی دونوں متضاد صورتیں تھیں اور یقین نہ آتا تھا کہ ایسا ہوگا۔ مگر اس ورش پھل کے آنے کے دو ماہ بعد مہاراجہ نابھ گدی سے اتر گئے۔ ایڈمنسٹریشن انگریزوں کے قبضہ میں چلی گئی اور میں نہ صرف موقوف کر دیا گیا بلکہ انگریز ایڈمنسٹریٹر مسٹر اوگلوی (جو بعد میں سیکرٹری ڈیفنس ڈیپارٹمنٹ گورنمنٹ ہند تھے) نے مجھے بغیر مقدمہ چلائے یا مجرم بتائے نابھ میں قید کر دیا اور ستاروں کا اثر ٹل نہ سکا۔

موجودہ مہاراجہ نابھ جب پیدا ہوئے تو ان کے والد مرحوم مہاراجہ نابھ نے بچہ کی جنم پتری تیار کرنے کے لئے کئی جوتشی بلائے۔ اس زمانہ میں نابھ میں وزیر اعظم مسٹر سنگاراؤ تھے ان کی معرفت بھی جنوبی ہندوستان سے ایک مشہور جوتشی دو سو روپیہ روزانہ فیس پر آئے اور نابھ میں ایک ماہ کے قریب ٹھہرے اس جوتشی نے مہاراجہ کو بتایا کہ یہ بچہ پیدا ہونے کے بعد اپنے باپ کی جگہ حاصل کریگا۔ یعنی نابھ کے تخت پر بیٹھے گا۔ مہاراجہ کو اس وقت تو اس کا یقین نہ آیا۔ بلکہ اس جوتشی کے متعلق مہاراجہ کے خیالات کچھ نفرت کے سے ہو گئے تھے۔ مگر مہاراجہ کی یہ نفرت بدنصیبی اور برے ستاروں کے اثرات کو کیونکر بدلتی۔ بچہ کی پیدائش کے بعد ہی برے دن شروع ہوئے اور یہ برخوردار ابھی دو تین برس کا ہی تھا کہ باپ گدی سے علیحدہ ہو گئے۔ اور اس جوتشی کے قول کے مطابق بیٹے نے باپ کی جگہ یعنی گدی پر قبضہ کر لیا۔

نواب بھوپال بنام ایڈیٹر ''ریاست'' کا ہوشنگ آباد والا مقدمہ چل رہا تھا۔ مجسٹریٹ نے ایڈیٹر ''ریاست'' کو تین سال قید کی سزا دی سیشن جج نے یہ سزا نو ماہ کر دی مقدمہ ہائی کورٹ میں گیا تو سزا موقوف ہو کر مقدمہ کو پھر نئے سرے سے شروع کرنے کا حکم ہوا۔ مقدمہ کے پھر دوبارہ شروع ہونے پر مجسٹریٹ نے نو ماہ کی سزا دی۔ تو اس کی اپیل ڈائریکٹ ہائی کورٹ میں ہوئی ہندوستان میں یہ پہلا موقعہ تھا کہ مجسٹریٹ کی اپیل ڈائریکٹ ہائی کورٹ میں گئی ایڈیٹر ریاست مع اپنے وکلاء مسٹر توکلی اور سردار بھگوان سنگھ اپیل کے سلسلہ میں ناگپور گئے ہوئے تھے مجھے معلوم ہوا کہ وہاں سیتا بلدی میں ایک مرہٹہ مسٹر گرگے جوتش میں بہت لائق ہیں۔ یہ پہلے اکونٹنٹ جنرل کے دفتر میں اعلیٰ عہدہ پر تھے ریٹائر ہونے کے بعد تفریحاً جوتش کا کام کرتے ہیں۔ ان کی شہرت سن کر میں ان سے ملنے گیا۔ میری جنم کنڈلی (زائچہ) میرے ساتھ تھی۔ ان کے مکان پر پہنچ کر میں نے وزیٹنگ کارڈ بھیجا تو لینے کے لیے باہر آ گئے مقدمہ کی کارروائی چھ سال سے اخبارات میں چھپ رہی تھی اور یہ اخبارات پڑھا کرتے تھے

بہت عزت کے ساتھ پیش آئے میں نے بتایا کہ آپ کی شہرت سن کر آیا ہوں۔ کنڈلی دکھانا چاہتا ہوں چنانچہ میں ان کو اپنی کنڈلی دے آیا۔ انہوں نے تین روز کے بعد آنے کے لئے کہا۔ میں تین روز کے بعد پھر گیا تو انہوں نے کہا:

"جس طرح بھی ممکن ہو۔ آپ 21 فروری تک مقدمہ کو لمبا لے جائیے۔ اگر یہ مقدمہ 20 فروری سے پہلے فیصلہ ہوا تو آپ لازمی طور پر قید ہو جائیں گے۔ گو قید میں آپ کے جسم یا آپ کی آتما (روح) کو کوئی تکلیف نہ ہو گی مگر آپ کی آزادی لازمی طور پر ایک جگہ محدود ہو جائے گی اور اگر اس مقدمہ کا فیصلہ 20 فروری کے بعد ہو تو دنیا کی کوئی طاقت آپ کو اس مقدمہ میں قید نہیں کر سکتی۔ آپ لازمی طور پر اس تاریخ کے بعد بری ہوں گے۔"

یہ واقعہ آخر نومبر کا ہے میں نے گرگے صاحب سے کہا کہ مقدمہ ہائی کورٹ میں ہے۔ چھ سال سے مقدمہ چل رہا ہے۔ پہلے کئی بار ہائی کورٹ میں پیشیاں ہوئیں۔ یہ آخری پیشی ہے کیونکہ ہائیکورٹ اس مقدمہ کو خود ختم کرنے کی کوشش میں ہے۔ تاریخ کے تبدیل یا مقدمہ کے ملتوی ہونے کی کوئی صورت نہیں، گرگے صاحب نے بتایا کہ اگر مقدمہ ملتوی نہیں ہو سکتا۔ تو پھر قید کا ہونا بھی ضروری ہے۔ مگر 20 فروری کے بعد میں جیل میں نہ رہ سکوں گا۔

پنڈت جی سے باتیں کر کے میں واپس چلا آیا۔ مقدمہ کی پیشی ہوئی تین روز تک بحث ہوتی رہی۔ میری طرف سے ڈاکٹر کدار (جو اسمبلی میں مخالف پارٹی کے لیڈر تھے اور یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے) مسٹر یوسف شریف جو سی پی کے منسٹر تھے، مسٹر بی بی توکلی ایڈووکیٹ دہلی اور سردار بہادر بھگوان سنگھ بیرسٹر اجمیر وغیرہ وکلاء تھے۔ اور نواب بھوپال کی طرف سے ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو۔ سر سی پی راما سوامی آئر (جو بعد میں گورنمنٹ ہند کے ممبر انتظامیہ کونسل اور وزیر اعظم ریاست ٹراونکور تھے) سر عبدالرحمن

جو جج لاہور ہائیکورٹ تھے وغیرہ تھے۔ججان میں ایک ہندوستانی مسٹر نیوگی اور ایک انگریز تھے۔عدالت نے فیصلہ کے متعلق کہا کہ پھر سنایا جائے گا۔میں واپس دہلی چلا آیا۔عدالت نے مجھے حکم دیا کہ میں 5 دسمبر کو ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ہوشنگ آباد کی عدالت میں حکم سننے کے لئے پہنچ جاؤں۔حکم وہاں بھیج دیا جائے گا۔

دہلی پہنچ کر میں اپنے کاروبار میں مصروف ہو گیا اور مجھے پورا یقین تھا۔کہ میں بری ہو جاؤں گا کیونکہ نواب بھوپال کے وکلاء کے پاس اس قانونی پوائنٹ کا کوئی جواب نہ تھا۔کہ اخبار دہلی میں چھپا اور شائع ہوا ار ہوشنگ آباد کی عدالت جس کی جورسڈکشن ضلع ہوشنگ آباد تک محدود ہے اور جس کی اشاعت کو نواب بھوپال ہوشنگ آباد کے علاقہ میں ثابت نہیں کر سکے۔ملزم کو دہلی میں کئے گئے جرم کے لئے سزا دے۔مگر مجھے 3 دسمبر کو دوپہر کے وقت ڈاکٹر کدار کا تار ملا۔کہ مجھے تین ماہ کی سزا ہوئی ہے اور میں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ہوشنگ آباد کی عدالت میں 5 دسمبر کو پہنچ جاؤں۔تار کے ملنے پر میں شام کو گرینڈ ٹرنک ایکسپریس میں سوار ہوا اگلے روز شام کو ناگپور پہنچا۔تاکہ کدار صاحب سے فیصلہ کے متعلق مزید واقفیت حاصل کروں۔وہاں ڈاکٹر کدار سے دو تین گھنٹہ باتیں کرنے کے بعد رات کو دس بجے سوار ہوا 5 دسمبر کی صبح ہوشنگ آباد پہنچا۔ڈاک بنگلہ میں جہاں ہمیشہ قیام ہوا کرتا تھا۔گیا غسل کیا کپڑے بدلے اور بریک فاسٹ کھا کر دس بجے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی عدالت میں حاضر ہو گیا۔ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ یورپین تھے۔بہت اخلاق سے پیش آئے انہوں نے کاغذات کی ضروری خانہ پری کی اور ایک سب انسپکٹر پولیس کے ساتھ مجھے ہوشنگ آباد جیل میں بھیج دیا۔

میں ہوشنگ آباد جیل میں غالباً دس روز رہا۔وہاں جیل کے سپرنٹنڈنٹ نے انسپکٹر جنرل جیل خانہ جات سی پی کو لکھا کہ دیوان سنگھ اے کلاس کا قیدی ہے۔اس چھوٹے جیل میں اے کلاس کے قیدیوں کے لئے معقول انتظام نہیں اس لئے اسے سنٹرل جیل ناگپور میں بھیجا جائے۔وہاں سے جواب آیا میں ناگپور گیا وہاں اس کمرہ اور احاطہ میں

مجھے رکھا گیا جہاں اس سے پہلے ڈاکٹر کھرے اور سی پی کے دوسرے لیڈر رہ چکے تھے اور جہاں میرے بعد حروں کے لیڈر پیر پگاڑو بھی قید رہے ۔ میں یہاں بہت آرام سے تھا جیل کے حکام دن میں کئی کئی بار آ کر میری ضروریات کے متعلق پوچھتے اور دوستانہ سپرٹ کا اظہار کرتے بلکہ اکثر شام کو میرے ہاں ہی چائے پیتے کئی روز گزرنے کے بعد مجھے خیال آیا کہ جب اس مقدمہ میں پہلی بار مجسٹریٹ نے تین سال کی سزا دی اور سزا کے سننے کے بعد میں ہوشنگ آباد جیل میں گیا تو ضمانت کے نہ ہونے تک ایک ہفتہ جیل میں رہا۔اس کے بعد جب سیشن جج نے مجھے نو ماہ کی سزا دی تو اس وقت بھی ہائی کورٹ سے ضمانت ہونے تک ایک ہفتہ رہا یعنی دو ہفتہ میں جیل میں پہلے رہ چکا ہوں ۔ یہ دو ہفتے میری موجودہ تین ماہ کی قید میں سے کیوں مجرا نہ دیئے جائیں میں نے اس اپنے خیال کو اگلے روز کرنل موڈی آئی ایم ایس سپرنٹنڈنٹ جیل پر ظاہر کیا تو کرنل موڈی نے کہا کہ چونکہ مقدمہ کی پہلی تمام کارروائی بحکم ہائیکورٹ رد اور نا قابل عمل قرار دی جا چکی ہے اس لئے اس کارروائی کے دوران میں بھگت چکی دو ہفتہ کی سزا قانوناً مجرا نہ دی جائے گی میں نے کرنل موڈی سے پھر کہا درخواست بھیج دو مگر اس میں کامیابی نہ ہوگی ۔ چنانچہ میں نے اسی روز درخواست لکھی کہ اس مقدمہ میں ہی گو ڈی نوو ٹرائیل یعنی نئی کارروائی ہوئی مگر میں اسی جرم میں دو ہفتہ سزا بھگت چکا ہوں ۔ان تین ماہ میں سے مجھے وہ دو ہفتہ مجرا دیئے جائیں ۔

یہ درخواست میں نے قانون کے مطابق ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ہوشنگ آباد کو بھیجی ۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے خود فیصلہ کرنا مناسب نہ سمجھا ۔ کہ شاید ملزم رہائی کے بعد ان دو ہفتوں کے عرصہ کے لئے حبس بیجا کا مقدمہ دائر کر دے ۔یا کوئی اور جھگڑا ہو۔اس نے ذمہ داری نہ لینے کے لئے میری یہ درخواست ہائی کورٹ کو بھیج دی ۔

شروع دسمبر میں میرے مقدمہ کا فیصلہ ہوتے ہی مقدمہ کے فیصلہ کی نقل گورنمنٹ ہند کے لاء ممبر اور پولیٹکل سیکرٹری کے پاس پہنچ چکی تھی ۔اور لاء ممبر نے فیصلہ کو دیکھ کر

اس پر ریمارک کیئے ۔ کہ جس جرم کے لئے ملزم کو سزا دی گئی اس میں ملزم کو سزا نہیں دی جا سکتی ۔ کیونکہ جرم مجسٹریٹ کی جورسڈکشن میں نہیں ہوا تھا۔ اس لئے ہائی کورٹ کا فیصلہ خلاف قانون ہے ۔ لاء ممبر کے یہ ریمارک ہائی کورٹ کے ججوں کی اطلاع کے لئے میری اس درخواست سے پہلے پہنچ چکے تھے۔ اور وہ اپنے غلط فیصلہ کو محسوس کر چکے تھے میری یہ درخواست جب پہنچی تو انہوں نے اس پر حکم لکھ دیا۔ کہ ملزم کو دو ہفتہ کا عرصہ تین ماہ کی سزا میں سے کم کر دیا جائے چنانچہ اس حکم کے مطابق میں 21 فروری کی صبح کو یعنی مسٹر گرگے جوتشی کے حساب کے مطابق ٹھیک اس روز جس دن میرے ستاروں میں تبدیلی ہوئی میں خلاف توقع اور خلاف قانون طور پر جیل سے رہا کر دیا گیا۔

جوتش کے متعلق ایک واقعہ اور دلچسپ ہے اور جس کا ثبوت شاید اب بھی نوٹوں والے میرے مقدمہ کی مثل سے مل سکے۔ نوٹوں کے مقدمہ میں جب میری تلاشی ہوئی تو تلاشی میں رائے صاحب گوپالداس ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ سی آئی ڈی نے وہ کاپی بھی دیکھی جس میں میرے ورش پھل کے ہر ماہ کے لئے علیحدہ علیحدہ آنے والے واقعات تاریخ وار درج تھے اس کاپی میں لکھا تھا کہ میں دسمبر میں پھر گرفتار کیا جاؤں گا۔ چنانچہ میری گرفتاری دسمبر میں ہی ہوئی تھی یہ کاپی پولیس اپنے ساتھ لے گئی تھی جس نے تلاشی کی برآمد شدہ اشیاء کے ساتھ اس کاپی کو بھی شامل مثل کیا اور میرا خیال ہے کہ اگر مثل تلف نہیں ہوئی تو یہ کاپی اب بھی مثل کے کاغذات کے ساتھ شامل ہے جس پر میری گرفتاری دسمبر میں لکھی ہے۔

میری جنم کنڈلی یعنی میرے زائچہ کو دیکھا جائے تو سورج پہلے گھر میں ہے جس کا اثر یہ ہے کہ جسم رعب دار، آنکھوں میں سرخ ڈورے، مشکلات پر غالب، لوگ مسخر ہوں اور محبت کریں ۔ مجھے کش مکش میں ہمیشہ فتح نصیب ہو۔ شخصیت با اثر ہو سورج کے علاوہ میرے دوسرے ستاروں کے اثرات یہ ہیں جس کے متعلق تمام جوتشی متفق ہیں ۔ میں زندگی بھر حکومت کی مخالفت کرتا رہوں گا۔ مجھ پر مقدمات قائم ہوں گے اور ہمیشہ

ہی ستارہ برہسپت مجھے بچاتا رہے گا۔ میں ہمیشہ فضول خرچ رہوں گا اور زندگی بھر کبھی بھی قرض نہ اتر سکے گا۔ حالانکہ لاکھوں روپیہ پیدا کروں گا میری صحت اچھی رہے گی روپیہ سے کبھی محبت نہ کروں گا بیوی سے تعلقات کشیدہ رہیں گے زندگی میں کئی ملازم غدار پیدا ہوں گے مگر کچھ نہ بگاڑ سکیں گے وہ خود نقصان اٹھائیں گے میں غیر ممالک کا سفر کروں گا اور مجھ سے محبت کرنے والے مخلص دوست میری زندگی میں بہت کثرت کے ساتھ ملیں گے۔ میری زائچہ میں چندرمان یعنی چاند ایسے خانہ میں ہے جس کا نتیجہ یہ ہونا چاہئے کہ میری شہرت دور تک پہنچے اور میری پوزیشن بڑے سے بڑے لوگوں یہاں تک کہ راجوں اور مہاراجوں کے لیے بھی قابل رشک ہو۔

میں آئندہ کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا۔ کہ کیا ہو اور ستاروں کے اثرات کیا صورت پیدا کریں مگر جہاں تک گزشتہ واقعات کا تعلق ہے ایک واقعہ بھی ایسا نہیں جو جوتش کے مطابق نہ ہو اور اس علم کے متعلق مجھے اتنا ہی یقین ہے جتنا دن کی روشنی کو دیکھ کر سورج نکلنے کا ہو سکتا ہے۔

جوتش کے ذریعہ حالات معلوم کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ پیدائش کا ٹھیک وقت جس میں ایک منٹ کا بھی فرق نہ ہو۔ تاریخ، دن اور مقام کا علم ہو اگر یہ معلوم نہ ہوں تو پھر درست حالات معلوم کرنے کا کوئی سوال نہیں۔ کیونکہ ٹھیک وقت کے معلوم نہ ہونے کے باعث کنڈلی غلط بنے گی اور کنڈلی کے غلط بننے کی صورت میں حالات کا غلط ہونا لازمی ہے۔

☆☆☆☆☆☆

کریکٹر کا بننا اور بگڑنا

ہندوستان کی آبادی میں ہر دس برس کے بعد کئی کروڑ نفوس کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس ملک میں بچے تو اس زیادتی کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں مگر بچوں کے کریکٹر کو بنانے یا بلند کرنے پر توجہ نہیں دی جاتی جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے ملک میں بہت اعلیٰ طبقہ کے خاندان کے بچوں کو چھوڑ کر چھوٹے اور درمیانہ خاندان کے بچوں کی یہ حالت ہے کہ یہ جھوٹ بولنا، دوسرے کی شے کا اٹھانا، گالی دینا اور بدچلنی وغیرہ کو عیب نہیں سمجھتے بلکہ غنڈہ پن کو بہادری اور شجاعت قرار دیا جاتا ہے۔ اور بچوں کی اس آوارگی میں فلم انڈسٹری نے اضافہ کیا۔ بازاروں میں دیکھئے یا گلی کوچوں میں بچے فحش اور عشقیہ فلمی گیت گاتے نظر آئیں گے اور ایک اہل الرائے بزرگ کے قول کے مطابق ہندوستان کی آئندہ نسل ملک کے لیے جیلوں کے موجودہ سزا یافتہ مجرموں سے زیادہ ذلت کا باعث ہوگی اور کسی بچے کے والدین کو خیال نہیں کہ اس کی اولاد کا انجام کیا ہوگا۔

انسانی کریکٹر کے بنانے یا بلند لے جانے کے لئے بچپن کی عمر بہت زیادہ موزوں ہے میں اپنی زندگی کے چند واقعات عرض کرتا ہوں جنہوں نے مجھے اچھا یا برا بنانے میں بہت حصہ لیا۔

میری عمر دس برس کی ہوگی۔ ہمارے گھر میں یہ معمول تھا کہ میری والدہ صبح تین چار بجے کے قریب جاگتیں ہماری گھر کی دیوار کے ساتھ ملا ہوا ایک مولوی صاحب کا مکان تھا مولوی صاحب تو میری پیدائش سے بہت پہلے انتقال کر چکے تھے۔ ان کے مکان میں ان کی ضعیف بوڑھی بیوہ، رہا کرتیں اور دلچسپی کے لئے اس بوڑھی خاتون نے کچھ بکریاں پالی ہوئی تھیں۔ اس خاتون کو ہم تمام لوگ بیوی یا ''بی بی'' کہا کرتے۔ اس کے اپنے ہاں کوئی اولاد نہ تھی۔ یہ بیچاری گلی محلّہ کے لوگوں کے بچوں سے محبت کر کے اپنے مامتا کے جذبات کی تسکین کر لیتیں۔ جو ایک ماں کے دل میں اپنے بچوں کے لئے ہوا کرتے ہیں۔ میں اور میری عمر کے دوسرے بچوں کا دن بھر میں کچھ وقت

ان بیوی کے گھر میں بسر ہوتا۔ کیونکہ بچے اس شخص سے فوراً مانوس ہو جاتے ہیں جو ان سے محبت کرے۔ یہ بوڑھی خاتون نماز روزہ کی بہت پابند تھیں اور علی الصباح تین چار بجے تہجد کی نماز بھی ضرور پڑھتیں۔

میری والدہ کا معمول تھا۔ یہ علی الصباح تین چار بجے جاگتیں تو ان بیوی صاحبہ کو آواز دیتیں کہ کیا جاگ گئیں۔ بیوی صاحبہ کا فوراً جواب آتا ''ہاں بیٹا! میں جاگ رہی ہوں'' اگر میری والدہ کو کبھی جاگنے میں دیر ہوتی تو بیوی کی پہلے آواز آتی اور والدہ اس کا جواب دیتیں کہ ہاں میں جاگ رہی ہوں۔

میری والدہ جاگنے کے بعد گھر میں جھاڑو دیتیں برتن وغیرہ صاف کرتیں اور یہ سب کچھ کرتے ہوئے وہ آہستہ آہستہ میراں بائی کا بھجن گنگنایا کرتیں جس کے الفاظ مجھے اب تک یاد ہیں:

''میرے تو من رام نام دوسرا نہ کوئی''

اگر میراں بائی کے یہ بھجن نہ ہوتے تو گرنتھ صاحب کے شبد ہوتے میں اس تمام کیفیت کو نیم خوابیدہ حالت میں سنا کرتا۔ یعنی نہ تو میں پورے طور سے سویا ہوتا اور نہ میں جاگتا۔

سورج نکلنے سے پہلے والدہ مجھے جگاتیں اور یہ مستقل اور ہمیشہ کے لیے میرا فرض قرار دیا گیا تھا کہ میں اس وقت گوردوارہ جاؤں۔ وہاں ہی رہٹ کے تازہ پانی سے غسل کروں۔ غسل کے بعد گوردوارہ میں گرنتھ صاحب کے سامنے متھا ٹیکوں یعنی سجدہ کروں۔ اور کچھ دیر پاٹھ سن کر پھر واپس آؤں۔ میرے واپس پہنچنے سے پہلے میرے لئے زرد رنگ کے نمکین چاول تیار ہوتے۔ یہ میرا ناشتہ تھا۔ ان چاولوں (یا جسے پلاؤ بھی کہا جاسکتا ہے) میں وہ لذت تھی جو اس کے بعد کبھی والیان ریاست کے دستر خوان پر بھی نصیب نہیں ہوئی۔

گرمیوں میں تو صبح گوردوارہ (ہمارے گھر سے یہ گوردوارہ نصف میل ہوگا) جانا

اور وہاں غسل کرنا زیادہ وقت کا باعث نہ تھا مگر سردیوں میں اسے میں ایک بہت بڑی مصیبت سمجھتا تھا مگر کیا کرتا جس روز میں گوردوارہ نہ جاؤں اور وہاں غسل نہ کروں مجھ ناشتہ نہ ملتا تھا اور والدہ کی ناراضگی الگ تھی میں کبھی کبھی طبیعت کے اچھا نہ ہونے یا سر میں درد کا بہانہ کر کے صبح کے اس غسل کی مصیبت سے نجات حاصل کر لیتا۔ مگر ایسا ہر روز ممکن نہ تھا۔

سردیوں کا زمانہ تھا میں حسب معمول سورج نکلنے سے پہلے جاگا۔ ہاتھ پاؤں سن ہوئے جاتے تھے قہر درویش پر جان درویش۔ گوردوارہ گیا۔ وہاں حسب معمول مردانہ میں سینکڑوں مرد اور زنانہ میں سینکڑوں عورتیں غسل کر رہی تھیں۔ مگر میرا نہانے کو جی نہ چاہا میں نے ہاتھ دھوئے منہ دھویا پاؤں دھوئے اور گوردوارہ کے اندر گرنتھ صاحب کی حاضری دے کر واپس آ گیا۔ انسان نے غسل کیا ہو تو فوراً معلوم ہو جاتا ہے کیونکہ جسم میں چستی اور تازگی سی پیدا ہو جاتی ہے میں جب گھر پہنچا تو والدہ نے مجھے دیکھتے ہی محسوس کیا کہ میں نے غسل نہیں کیا پوچھا کیا نہا آئے میں نے فوراً غیر ضروری چستی اور جرأت کا اظہار کرتے ہوئے جواب دیا جی ہاں والدہ نے میرے ہاتھ دیکھے پاؤں کی طرف دیکھا تو وہ دھلے ہوئے تھے گردن کے پاس کوٹ کے اندر ہاتھ ڈال کر دیکھا تو میرا جسم ویسے ہی تھا۔ جیسے بغیر غسل کے شخص کا ہو سکتا ہے۔ والدہ نے کہا کہ سچ بتاؤ جھوٹ مت بولو کیا نہا آئے میں نے پہلے سے زیادہ جوش اور جرأت کے ساتھ جواب دیا کہ ہاں نہایا ہوں میرا یہ کہنا تھا کہ والدہ نے مجھے پکڑ لیا اور پیٹنا شروع کیا۔ مجھے بہت مارا کیونکہ میرے دو جرم تھے ایک نہ نہانا اور دوسرے جھوٹ بولنا کچھ دیر پٹنے کے بعد میں نے اقرار کر لیا۔ کہ میں نہ نہایا تھا اور میں نے جھوٹ بولا ہے

۔

اس واقعہ کے بعد میں سالہا سال تک گوردوارہ جا کر وہاں غسل کرتا رہا اور بچپن کے غسل کی اس عادت کا نتیجہ یہ ہے کہ میں زندگی بھر ہمیشہ ہی ہر روز غسل کرتا رہا۔

پورے سال میں شاید ہی پانچ سات دن ایسے ہوتے ہوں جب کہ میں نے بیماری یا کسی دوسری وجہ سے غسل نہ کیا ہو اور کپڑے نہ بدلے ہوں۔ ورنہ سردی ہو گرمی ہو، سفر ہو، مصیبت میں ہوں یا راحت میں، میرے لئے غسل اور کپڑے بدلنے ایسے ہی ضروری ہیں جیسے کھانا۔ اور نہانا میری ایک فطرت سی بن چکی ہے میں کھانے کے بغیر رہ سکتا ہوں مگر غسل کے بغیر نہیں رہ سکتا اور اس کا سبب یہ ہے کہ بچپن میں ہر روز غسل کرنا میرے کریکٹر کی بناوٹ کے ساتھ ساتھ بطور عادت کے مجھے نصیب ہوا۔

میں موگا کے ہسپتال میں تھا۔ موگا عیسائیوں کا ایک بہت بڑا مرکز ہے۔ وہاں متعدد امریکن پادری رہتے تھے ایک پادری کی پشت پر کینسر ہوا۔ اس کا آپریشن ہوا تو وہ سرکاری ڈاک بنگلہ میں چلا گیا کیونکہ وہاں رہنے کے لیے جگہ اچھی تھی میں اس پادری کے زخم کی ڈریسنگ کے لئے ہر روز وہاں جاتا۔ ایک روز یہ امریکن پادری غسل خانہ میں تھا اور میں اس کے کمرے میں انتظار کر رہا تھا کہ میں نے اس کے میز پر پڑا ہوا۔۔۔۔۔۔ السٹرٹیڈ ووکلی آف انڈیا (میرا خیال ہے کہ اس زمانہ میں اس رسالہ کا نام ''ٹائمز آف انڈیا (السٹرٹیڈ ویکلی'' تھا) اٹھالیا اور اس میں سے تصاویر دیکھنا شروع کر دیں میں تصاویر دیکھ رہا تھا کہ یہ پادری غسل خانہ سے باہر آیا میرے ہاتھوں میں اپنا رسالہ دیکھ کر بہت برا منایا۔ مگر پادری لوگ بہت حلیم الطبع ہوتے ہیں میں عمر کے لحاظ سے بھی بچہ ہی تھا۔ اس نے نہایت نرمی کے لہجہ میں مجھ سے کہا:

> ''کسی شخص کی کتاب، اخبار، خطوط کاغذ یا کوئی دوسری شے بغیر مالک کے پوچھے یا بغیر اجازت کے اٹھانا بہت بڑی بد اخلاقی ہے یہ کبھی نہ ہونا چاہئے ہندوستان کے لوگ اس عیب کو محسوس نہیں کرتے۔
> ''

میں اس زمانہ میں بھی بہت ذکی الحس تھا۔ پادری کی اس شریفانہ تنبیہہ کو میں نے بہت محسوس کیا مگر کیا کر سکتا تھا۔ ایک تو میری غلطی تھی دوسرے اس زمانہ میں سفید رنگ

کے پادری انگریز حاکموں کی طرح سمجھے جاتے تھے۔ ڈریسنگ کر کے میں واپس آیا۔ بے حد نادم تھا۔ کہ میں نے ایسا کیوں کیا اس واقعہ کے بعد میری تمام زندگی میں شاید ایک واقعہ بھی ایسا نہیں کہ میں نے کسی عزیز سے عزیز دوست کی کتاب، اخبار یا دوسری کسی شے کو بغیر اجازت کے کبھی چھوا ہو اور اب جب ملنے والے اصحاب آتے ہیں اور بیٹھتے ہی میرے دفتر کے اخبارات اور رسائل کو بے تکلفی کے ساتھ اٹھا کر پڑھنا شروع کر دیتے ہیں میں بے حد کوفت محسوس کرتا ہوں دن میں ایک آدھ بار بعض اصحاب کے سامنے مجھے پادری کے ان الفاظ کو دہرانا بھی پڑتا ہے مگر یہ افسوس ناک ہے کہ ان اصحاب پر کوئی اثر نہیں ہوتا کیونکہ اگر انسان اپنے کریکٹر کو درست کرنا چاہے تو اس کے لئے قدم قدم پر نصیحت موجود ہے اور اگر اپنی کمزوریوں کو درست کرنا نہ چاہے یا اپنی غلطی ہی تسلیم نہ کرے تو اس کا کیا علاج ہے۔

میں چالیس روز کا تھا جب میرے والد کا انتقال ہوا۔ والد مرحوم تو بڑی پوزیشن کے تھے مگر میری پرورش ہوش سنبھالتے ہی افلاس میں ہوئی جب گھر میں کھانے کے لئے نہ ہو اور بچہ باپ کے سایہ سے محروم ہو جائے تو بچہ کو تربیت کون دے۔ میری والدہ مذہبی خیالات کی تھیں اس لیے مذہب سے متعلقہ یعنی غسل وغیرہ ایسی باتوں کا تو مجھ پر اثر ہوا۔ مگر کریکٹر کے دوسرے حصوں کے اعتبار سے میری تربیت نہ ہو سکی۔ چنانچہ بچپن میں میرے پاس رومال نہ ہوتا۔ رومال کے نہ رکھنے کی عادت آئندہ زندگی میں بھی نہ بدل سکی۔ سینکڑوں بار رومال خریدے۔ درجنوں رومال کپڑے کی الماریوں اور بکسوں میں پڑے رہتے۔ اور بار بار رومال نہ ہونے کے باعث ندامت اور شرمندگی اٹھانی پڑی۔ مگر کریکٹر کی یہ کمزوری جس کی بنیاد بچپن میں رکھی گئی اب تک دور نہیں ہو سکی چنانچہ مجھے یاد ہے چند برس ہوئے مرحوم مہاراجہ نابھ سے ملنے کے لئے کوڈائی کنال پہاڑ صوبہ مدراس پر گیا طویل سفر کی تکان اور گرمی سے سرد پہاڑ پر جانے اور آب وہوا کی تبدیلی کے باعث مجھے شدت کا زکام ہو گیا۔ میں مہاراجہ کے پاس بیٹھا

ہوا باتیں کر رہا تھا اور زکام کا اثر نمایاں تھا۔ مگر میرے پاس رومال نہ تھا۔ مہاراجہ نے میری اس حالت کو محسوس کیا اور آپ نے اپنے ایک خادم کو حکم دیا کہ ایک نیا رومال لائے۔ جب رومال آیا تو مہاراجہ نے مسکراتے ہوئے اور رومال دیتے ہوئے کہا یہ لیجئے رومال آپ کو زکام کی تکلیف ہے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مہاراجہ کے اس کہنے پر مجھے کتنی شرمندگی اٹھانی پڑی ہوگی۔ کیونکہ میں زکام میں مبتلا تھا ناک سے پانی بہہ رہا تھا اور میرے پاس رومال بھی نہ تھا۔ یعنی بچپن میں کریکٹر بنتے ہوئے جو کمزوری پیدا ہوگئی وہ اب تک موجود ہے اور بار ہا ندامت اٹھانے کے بعد یہ کمزوری رفع نہ ہوسکی۔ رومال کپڑے والی الماری یا بکس میں پڑے رہتے ہیں مگر جیب میں نہیں رکھے جاتے اور اگر کبھی جیب میں رکھ بھی لیا تو خیال ہی نہیں آتا کہ رومال جیب میں پڑا ہے۔

جو لوگ اپنے بچوں کے بچپن سے لاپروا ہو کر ان کے کریکٹر میں خوبیاں پیدا کرنے کی کوشش نہیں کرتے وہ والدین اپنے بچوں کے سب سے بڑے دشمن ہیں کیونکہ انسان کو بچپن کی تربیت سے جو خیالات حاصل ہوں گے وہ چاہے اچھے ہوں یا برے عمر بھر تبدیل نہ ہوسکیں گے بلکہ میں کہہ سکتا ہوں کہ بچپن کے زمانہ میں پیدا ہوچکی کریکٹر کی کمزوریوں کا دور ہونا ممکن ہی نہیں۔ جب تک قوت ارادی بہت ہی مضبوط نہ ہو۔ اور انسان ان کمزوریوں کو دور کرنے کے لئے اپنے دل و دماغ کے ساتھ کئی برس تک جنگ نہ کرے۔ اور جو لوگ قوت ارادی سے محروم ہیں۔ وہ مجبور ہیں کہ بچپن کے زمانہ میں پیدا ہوچکی کمزوریوں کا زندگی بھر شکار ہوتے رہیں۔

☆☆☆☆☆

انگریزوں کے کریکٹر کی بلندی

مجھے کتوں کے رکھنے کا بہت شوق ہے اور میں سب سے زیادہ کرسپینیل نسل کے کتے پسند کرتا ہوں کیونکہ یہ نسل اپنے مالک سے بہت محبت کرتی ہے میں نے ''سٹیس مین'' میں اشتہار دیکھا جو مس واربرٹن کی طرف سے پلوں کی فروخت کے متعلق تھا۔ مس واربرٹن (یہ خاتون پنجاب کے مشہور انسپکٹر جنرل پولیس مرحوم مسٹر واربرٹن کی صاحب زادی تھیں جنہوں نے پنجاب سے ٹھگی، ڈکیتی اور دوسرے جرائم کا خاتمہ کیا۔ ڈاکوؤں کے پاؤں میں پہنائی جانے والی بھاری وزن کی بیڑیاں اب بھی تھانوں اور جیلوں میں ''بارٹنی بیڑیاں'' کہلاتی ہیں اور ضلع شیخوپورہ میں ایک گاؤں بھی ان مسٹر واربرٹن کے نام پر واربرٹن آباد ہے) اس زمانہ میں کسولی میں مقیم تھیں۔ان سے خط و کتابت ہوئی تو انہوں نے بتایا کہ وہ فی پلہ ایک سو روپیہ میں دیں گی۔اور بچے بہت خوبصورت لمبے کانوں والے سیاہ رنگ کے ہیں میں نے ایک جوڑا دوسو روپیہ میں لینے کا فیصلہ کیا اور لکھا کہ پلوں کو لینے کے لئے میں اپنا آدمی کسولی بھیجوں گا۔اس فیصلہ کے بعد مس واربرٹن کا خط پہنچا کہ پلوں کا دادا کئی برس ہوئے پلوں کے باپ کے پیدا ہونے کے بعد دیوانہ ہوگیا تھا۔اور اگر مجھے کوئی شک ہو تو میں سودا فسخ کرسکتا ہوں۔ ان کو اس میں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔چنانچہ مجھے خیال ہوا کہ یہ پلے بھی بڑے ہوکر اپنے دادا کی طرح دیوانے نہ ہو جائیں میں نے ان پلوں کو لینے سے انکار کردیا۔

اس واقعہ کا اہم پہلو یہ ہے کہ سودا ہو چکا تھا اور اس بات کا کوئی ثبوت موجود نہ تھا۔ کہ پلوں کا دادا کبھی پاگل ہوا مگر انگریزوں کا کریکٹر دیکھئے اس خاتون نے کسی بات کو چھپانا گناہ سمجھا اور صاف لکھ دیا کہ پلوں کا دادا ہائڈروفوبیا یعنی دیوانگی میں مبتلا ہوا تھا۔ ان کی جگہ اگر کوئی ہندوستانی ہوتا تو کبھی یہ نہ لکھتا۔

''ریاست'' جب سے جاری ہوا ہے۔اس میں انگریزی امریکن اور ہندوستانی فرموں کے اشتہارات ہمیشہ ہی شائع ہوتے رہے۔مگر یہ کیفیت بے حد دلچسپ ہے

کہ ریاست کی پچھلی تمام زندگی میں ایک بھی ایسا واقعہ نہیں کہ کسی امریکن یا انگریزی فرم نے روپیہ مار لیا ہو اور ادا نہ کیا ہو بلکہ اکثر ایسا ہوا کہ دفتر ریاست نے غلطی سے بل کی رقم کم لکھ دی تو ان فرموں نے غلطی کو درست کر کے رقم پوری بھیج دی اس کے مقابلہ پر ہندوستانی فرموں میں شاید دو درجن سے زیادہ ایسی فرمیں نہ ہوں گی جنہوں نے روپیہ وقت پر خود ہی بھیج دیا ہو یا جن کی نیت روپیہ مارنے کی نہ ہو۔ باقی تمام فرمیں اس کوشش میں رہتی ہیں کہ اگر ممکن ہو تو روپیہ کم ادا کیا جائے یا مار لیا جائے۔ یہ حالت تو مشتہرین کی ہے ہندوستانی ایڈورٹائزنگ ایجنسیوں کی حالت اس سے بھی زیادہ بدتر ہے اور جہاں انگریزی ایڈورٹائزنگ ایجنسیوں میں سے آج تک کبھی کسی ایک نے بھی روپیہ نہیں مارا اور ایک ایک پائی ادا کرنا یہ اپنی ساکھ اور تجارتی کریکٹر کے لئے ضروری سمجھتی ہیں اور ''ریاست'' کے بند ہونے کے بعد بھی انہوں نے پورا روپیہ ادا کیا وہاں ہندوستانی ایڈورٹائزنگ ایجنسیوں کی حالت یہ ہے کہ ان میں سے پچھتر فیصدی تو ایسی ہیں جن کا سرمایہ، دفتر، فرنیچر، سٹاف یا بینک بیلنس وغیرہ اگر کچھ ہے تو وہ صرف ان کے نام کے چھپے ہوئے لیٹر فارم کی صورت میں گویا کہ فرضی نام کی ایک کمپنی کے لیٹر فارم چھپوائے اور کام شروع کر دیا۔ نہ ان کے پاس کوئی آرٹسٹ نہ بلاک بنانے کا سامان نہ اشتہار تیار کرنے کا تجربہ، اور بطور ایڈورٹائزنگ ایجنسی کے اگر ان کو اخبار سے پچاس فیصدی کمیشن ملا تو مشتہر کو بیس بائیس بلکہ بعض اوقات پچیس کا پچیس فیصدی کمیشن دے کر ان سے اشتہار لیا اور اخبار کو بھیج دیا۔ اور وہ کسر اخبار کا روپیہ کم ادا کر کے یا بالکل مار کر پوری کر لی۔ اور شاید ہندوستان کے ہزارہا اخبارات میں سے ایک اخبار بھی ایسا نہیں جو اس قسم کی ہندوستانی ایڈورٹائزنگ ایجنسیوں کی نادہندگی کا شکار نہ ہوا ہو۔ چنانچہ ایک ایڈورٹائزنگ ایجنسی کے ذمہ ہمارا 1942ء کا روپیہ تھا۔ اخبار بند ہوا تو اس ایجنسی نے خدا کا شکر ادا کیا کہ یہ روپیہ ہضم کر سکے گی مگر اس کی بدنصیبی کہ 1944ء میں اخبار جاری ہو گیا۔ اس کو 1942ء کے روپیہ کی

ادائیگی کے لئے درجنوں خطوط لکھے جواب ندارد رجسٹر نوٹس دیئے پھر بھی کوئی جواب نہیں اور آخر جب مسٹر رضا مرزا وکیل نے مقدمہ کی تیاری کر لی تو پروپرائٹر صاحب دہلی پہنچے اور وعدہ کیا کہ روپیہ ادا کریں گے مقدمہ نہ کیا جائے مگر یہ وعدہ صرف میعاد گزرنے تک کے لیے تھا چنانچہ آخر اس فرم سے تعلقات منقطع کر لئے گئے اور اب اس کی معرفت کوئی اشتہار شائع نہیں کیا جاتا ۔ ۔ ۔ ۔ گویا کہ انگریزی و امریکن ایڈورٹائزنگ ایجنسیاں جہاں اپنے مستقبل اور اپنی ساکھ کے خیال سے کسی کی ایک پائی رکھنا بھی اخلاقی اور تجارتی جرم سمجھتی ہیں ہندوستانی ایجنسیوں میں زیادہ ایسی ہیں جو اشتہارات کو بھی چار سو بیس کا ایک نیا میدان سمجھ کر اس پیشے میں داخل ہو گئیں اور جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اخبارات کسی ناواقف انگریزی یا امریکن ایجنسی کا بزنس تو آنکھیں بند کر کے چھاپ دیتے ہیں مگر کوئی ہندوستانی ایجنسی اشتہار بھیجے تو اعتماد کرتے ہوئے ہچکچاہٹ سی پیدا ہوتی ہے کیونکہ انگریزوں و امریکنوں میں کریکٹر ہے مگر ہم ہندوستانی تجارتی کریکٹر سے محروم ہیں۔

لندن سے ایک اخبار ''نیوز آف دی ورلڈ'' شائع ہوتا ہے۔اس اخبار کا بہت زیادہ حصہ لندن کی عدالتوں کے مقدمات سے پر ہوتا ہے۔اس اخبار کو اگر غور کے ساتھ دیکھا جائے تو سو مقدمات میں سے شاید دو تین بھی ایسے نہ ہوں گے جن میں ملزموں نے اپنے جرم کا اقرار نہ کر لیا ہو کیونکہ انگریز مجرم ہوتے ہوئے بھی جھوٹ بولنا اپنی اخلاقی موت سمجھتے ہیں اس کے مقابلہ پر ہندوستان کی عدالتوں میں ملزموں کو تو چھوڑیئے۔وہ تو اپنی جان کے بچانے کے لئے جھوٹ بولنا اپنا پیدائشی حق سمجھتے ہی ہیں یہاں تو گواہوں میں سے بھی پچانوے فیصدی لوگ ایسے ہیں جو ایمان سے کہتا ہوں سچ کہوں گا یا دھرم سے کہتا ہوں کہوں گا کہہ کر حلفیہ جھوٹ بولتے ہیں اور شہادت دینے سے پہلے جھوٹی گواہی دینے کی ٹریننگ لیتے ہیں گویا کہ انگریز ملزم ہونے کے بعد بھی جھوٹ نہیں بولتا مگر ہندوستانی بغیر ملزم ہوئے بھی جھوٹ بولتا ہے۔

آپ بازار میں سودا خرید نے جایئے ہندوستانی ایک روپیہ کہہ کر آہستہ آہستہ آٹھ آنے پر آجائیں گے اور انگریزی فرم میں دوسری بات کرنا بھی باعث شرم سمجھا جاتا ہے اور قدم قدم پر انگریزوں اور ہندوستانیوں کے کریکٹر کا فرق ظاہر ہوتا ہے۔

انگریزوں کے کریکٹر کی بلندی کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کے غیر قوم ہوتے ہوئے بھی ہم تجارتی اعتبار سے ان کی عزت کرتے ہیں۔ان کی ہر بنی ہوئی شے پر اعتماد کیا جاتا ہے۔اور دوگنی وسہ گنی قیمت پر بھی ان کا مال خرید تے ہیں کیونکہ یہ لوگ نہ جھوٹ بولتے ہیں اور نہ دھوکہ دیتے ہیں ان کے مقابلے پر ہم جو کچھ ہیں کاش کہ ہم اس پر شرم محسوس کریں کیونکہ ہمارا اعمال نامہ نہ صرف ہماری تجارت کے لئے نقصان کا باعث ہے بلکہ اخلاقی اعتبار سے بھی ہم اپنے ملک کی رسوائی و ذلت کا باعث ہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆

نفس کو دھوکہ

انگریزی میں ایک لفظ ہے ''اوور ایسٹی میشن'' اس لفظ کا اردو زبان میں ہم معنی لفظ باوجود تلاش کرنے کے بھی مجھے مل نہیں سکا۔ اس لفظ کے معنی ہیں اصل سے زیادہ اندازہ کرنا یا اپنے نفس کو دھوکہ دینا۔ مثلاً ایک شخص کمزور ہو مگر اپنے کو مضبوط سمجھے۔ نالائق ہو مگر لائق یقین کرے۔ یا مضمون نہ لکھ سکتا ہو مگر اپنے تئیں مضمون نویس سمجھے۔ میرا تجربہ ہے کہ میں نے اب تک جتنے ناکام لوگ دیکھے۔ ان کی ناکامی کا زیادہ سبب ان کا اپنے متعلق اوورایسٹی میٹ کرنا یا غلط اندازہ لگانا ہی تھا اور یہ اوور ایسٹی میشن انسان کو بالکل تباہ کر دیتا ہے اور اپنی عقل، قابلیت، دولت اور قوت کا صحیح اندازہ لگایا جائے یا اسے کم سمجھا جائے تو کامیابی کے لئے راہیں زیادہ فراخ ہوتی چلی جاتی ہیں۔

جب ''ریاست'' کو جاری ہوئے ایک سال ہوا اس کو دوسرے اخبارات کے مقابلہ پر بہت کافی کامیابی ہوئی اور اخبار کی اشاعت تیزی سے بڑھ رہی تھی تو اس کے لئے بڑی بڑی انگریزی فرموں کے اشتہارات لینے کی کوشش کی گئی۔ اس سے پہلے انگریزی فرموں کے اشتہارات اردو اخبارات میں نہ ہوتے تھے یا ہوتے تھے تو شاید زیادہ سے زیادہ دو چار وہ بھی ''پیسہ اخبار'' اور ''اخبار عام'' جیسے بہت پرانے اخبارات میں جن کو جاری ہوئے پچاس پچاس ساٹھ ساٹھ برس ہو چکے تھے اور اردو اخبارات میں یہ فخر ''ریاست'' کو ہی حاصل ہے کہ سب سے پہلے انگریزی اور بڑی فرموں سے اشتہارات حاصل کرنے کا سلسلہ اس نے ہی شروع کیا چنانچہ انگریزی فرموں کو یہ یقین دلانے کے لئے بہت محنت کی گئی کہ اردو ہندوستان کی قومی زبان ہے اور ملک کے ہر حصہ میں اس کو بولنے اور پڑھنے والے موجود ہیں۔

اشتہارات حاصل کرنے کے لئے پراپیگنڈہ شروع کیا گیا تو بعض فرموں کا جواب آیا کہ ''ریاست'' کو جاری ہوئے کتنے برس ہو چکے ہیں گویا کہ ان فرموں کی نظر میں ایک نیا اخبار چاہے دس ہزار چھپے۔ اس کی کوئی وقعت نہ تھی پرانا اخبار دو سو چھپنے

والا بھی ان کے خیال میں زیادہ قابل قدر تھا۔ ہم جب ان کو لکھتے کہ ایک سال ہوا جاری کیا گیا۔تو یہ انگریزی فرمیں پھر کوئی جواب ہی نہ دیتیں جب اس طرح بے نتیجہ کوشش سے ہم تنگ آ گئے تو یہ فیصلہ کیا گیا کہ کسی بہت پرانے اور بند ہو چکے اخبار کو برائے نام خرید اجائے تا کہ انگریزی فرموں کو جواب دیا جاسکے کہ یہ آج سے چالیس یا پچاس سال پہلے جاری کیا گیا تھا، اوراس کا یہ نام تھا چنانچہ کسی پرانے اخبار کی تلاش شروع ہوئی جو بند ہو چکا تھا۔

میں نے ملاواحدی صاحب ایڈیٹر نظام المشائخ سے بھی اس کا ذکر کیا اور خواہش ظاہر کی کہ کسی بہت پرانے اور بند ہو چکے اخبار کا انتظام کر دیا جائے اور اس مر چکے اخبار کے ورثاء کو پچاس ساٹھ روپے دے دیئے جائیں گے۔ ملاواحدی صاحب نے بتایا کہ پچاس ساٹھ برس ہوئے ان کے کوچہ چیلاں ہی سے ایک اخبار شائع ہوتا تھا اخبار نکالنے والے بہت برس ہوئے انتقال کر چکے ہیں اوران کے اولا دزینہ بھی کوئی نہیں صرف ایک نواسہ ہے ان سے بات چیت کی جائے گی چنانچہ دو روز کے بعد کا وقت مقرر ہوا میں بھی واحدی صاحب کے ہاں حاضر ہوا اور وہ صاحب بھی تشریف لائے میں نے ان حضرات سے تمام بات صاف صاف کہہ دی کہ ہمیں یہ دقت ہے اگر وہ ایک خط لکھ دیں کہ ان کے نانا کا اخبار پروا پرئٹر ''ریاست'' کے پاس فروخت کر دیا گیا ہے تو اس خط کے معاوضہ میں ان کو پچاس روپے دے دیئے جائیں گے۔ تا کہ ہم اس اخبار کا نام استعمال کرسکیں جس کو بند ہوئے پچاس برس ہو چکے ہیں ہماری اس درخواست کے جواب میں ان حضرات نے فرمایا کہ غور کر کے جواب دیں گے چنانچہ دوسرے روز انہوں نے جواب دینے کا وعدہ فرمایا:

میں دوسرے روز پھر واحدی صاحب کے ہاں گیا واحدی صاحب نے اپنا آدمی بھیج کر ان کو تشریف لانے کے لئے کہلوایا تو انہوں نے جواب دیا کہ وہ بہت مصروف ہیں آج نہیں آ سکتے میں اگلے روز پھر گیا پھر وہی جواب تیسرے روز پھر گیا پھر وہی

مصروفیت کا بہانہ ایک ہفتہ کے بعد میں پھر واحدی صاحب کے ہاں گیا اور پھر بلوا بھیجا تو آپ نے جواب دیا کہ طبیعت اچھی نہیں اس لئے نہیں آسکتے آخر واحدی صاحب نے دوبارہ آدمی بھیجا اور کہلوایا کہ دیوان سنگھ کئی بار آچکا ہے اگر آپ کو بات کرنی ہو تو دو منٹ کے لئے آیئے ورنہ اس کے بعد وہ نہ آئے گا۔ ہماری اس درخواست پر یہ حضرت تشریف لائے تشریف لانے پر بہت تکلف اور مخیرّانہ انداز کے ساتھ بات چیت شروع کی جس طرح کوئی مہاراجہ یا نواب کسی غلام کو دوامی جاگیر عطا کرنے والا ہو آپ نے مجھ سے فرمایا:

"نانا جان فرمایا کرتے تھے کہ جب ان کا اخبار جاری تھا تو یہ وائسرائے تک کے ہاں جاتا تھا اور پانچ چھ سو چھپتا تھا اور اس کی تمام ملک میں دھوم تھی ایسے بڑے اخبار کا معاوضہ کم از کم دس ہزار روپیہ ہونا چاہئے مگر چونکہ واحدی صاحب نے سفارش کی ہے اس لئے میں اس اخبار کی قیمت پانچ ہزار روپیہ قبول کرلوں گا۔"

پانچ ہزار روپیہ سن کر میں حیران ہو گیا کیونکہ میں نے تو "ریاست" جاری ہی ڈیڑھ ہزار روپیہ کے ساتھ کیا تھا اور وہ بھی یہ روپیہ ایک دوست کی معرفت ایک بنئے سے قرض لے کر میں نے جواب دیا کہ جناب میں تو زیادہ سے زیادہ ایک سو روپیہ دے سکتا ہوں کیونکہ نہ تو یہ اخبار جاری ہے نہ کوئی رجسٹر ہے نہ کوئی خریدار اور نہ کوئی اشتہار اخبار کو دفن ہوئے بھی پچاس برس ہو چکے یہ حضرت نہیں مانے اور میں واپس اپنے دفتر آ گیا۔

میں نے واپس آ کر سوچا کہ اگر میں پچاس برس کے دفن ہو چکے اخبار کا نام استعمال کروں تو یہ میرے لئے فخر کی بات نہ ہوگی اس کے علاوہ بند ہو چکے اخبار کا نام ریاست میں شامل کرنا قانوناً چاہے ناجائز نہ ہو مگر اخلاقاً یہ ایک قسم کا دھوکا ہے اور مجھے اس سے بلند رہنا چاہئے۔ چاہے اشتہارات حاصل کرنے میں مزید کچھ عرصہ لگ

جائے۔ چنانچہ میں نے فیصلہ کیا کہ ایسا نہ کروں گا اور یقین دلانے کے لئے کہ اس کی اشاعت اتنی ہے اور اشتہارات کے لئے یہ پرانے سے پرانے اخبارات سے اچھا ہے میں نے مشتہرین کو بھیجنے کے لئے خط کا پتا مضمون تیار کر لیا۔

اخبار فروخت کرنے والے حضرت دو ہفتہ تو میرا انتظار کرتے رہے کہ میں پہلے کی طرح پھر ان کی خوشامد کروں گا اور پانچ ہزار نہیں تو چار ہزار ہی دے دوں گا دو ہفتہ کے انتظار کے بعد جب ان کی خدمت میں کوئی حاضر نہ ہوا تو وہ واحدی صاحب کے پاس آئے اور فرمایا:

''اس معاملہ کا کیا ہوا اگر پانچ ہزار زیادہ رقم ہو تو چار ہزار ہی دلوا دیجئے۔''

واحدی صاحب نے یہ پیغام میرے پاس پہنچایا میں نے جواب دیا کہ مجھے ضرورت نہیں دو روز کے بعد یہ حضرت واحدی صاحب کے ہاں پھر آئے تین ہزار پر فروخت کرنے کے لئے آمادہ ہوئے۔ اب آپ نے مسلسل آنا شروع کیا تین ہزار سے دو ہزار دو ہزار سے ایک ہزار پھر پانچ سو چار سو تین سو آخر یہ پچاس روپیہ تک اتر آئے اور کہا کہ پچاس روپیہ لے کر ہی یہ اپنے نانا کی ''اخباری جائیداد'' فروخت کر دیں گے مگر یہاں تو یہ خیال ہی بدل چکا تھا گویا کہ پاس برس پہلے کے بند ہو چکے اخبار کی قیمت دس ہزار روپیہ سمجھنے والے اور اپنی اخباری جائیداد کی حیثیت کا اوور ایسٹی میٹ کرنے والے حضرت پچاس روپیہ بھی کھو بیٹھے۔

نواب بھوپال نے جب ایڈیٹر ''ریاست'' پر مقدمات دائر کئے تو اس کے ساتھ ہی مجھ پر پٹیالہ اور خیر پور میرس کی ریاستوں نے بھی میانوالی اور سکھر میں مقدمات دائر کر دیئے اس ایک ہی وقت میں مجھ پر چار مقدمات تھے۔ ایک ہوشنگ آباد میں دہلی سے چھ سو میل جنوب کی طرف ایک دہلی میں ایک میانوالی میں دہلی سے ساڑھے پانچ سو میل شمال کی طرف اور ایک سکھر سندھ میں دہلی سے چھ سو میل مغرب کی طرف ان مقدمات کا مقصد یہ تھا کہ میں پریشان ہو کر ہتھیار پھینک دوں میرے مقدمات کی

جب یہ حالت سردار سردول سنگھ کولیشر نے دیکھی اور محسوس کیا کہ ہر جگہ پیشیوں پر پہنچنا بھی مشکل ہو رہا ہے آپ نے رائے دی کہ میں اخبار کا پرنٹر، پبلشر اور ایڈیٹر کسی دوسرے کو مقرر کر دوں تاکہ والیان ریاست مجھ پر مقدمات نہ چلا سکیں اور جھوٹے و بے بنیاد مقدمات کا جواب اس صورت میں دیا جائے اس مشورہ کے بعد میں نے ریاست نابھ کے ایک شخص سردار دھرم سنگھ کو ریاست کا ایڈیٹر، پرنٹر، و پبلشر مقرر کر دیا ۔ یہ صاحب ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر چند ماہ رہے تھے تو ان کو خیال آیا یا کسی دوسرے نے پٹی پڑھائی کہ اخبار میں اگر کوئی اہم شخصیت ہوتی ہے تو وہ ایڈیٹر، پرنٹر پبلشر ہی ہوتا ہے اور یہ جو چاہے کر سکتا ہے چنانچہ آپ نے ایک روز فرمایا کہ ڈاک خانہ سے جو منی آرڈر آئیں گے ان پر یہ خود دستخط کریں گے جب مجھے معلوم ہوا کہ انہوں نے یہ کہا ہے تو میں حیران رہ گیا ان سے پوچھا تو انہوں نے کہا کہ ہاں کہا ہے اور یہ آئندہ تمام حساب کتاب بھی دیکھیں گے کیونکہ ایڈیٹر پرنٹر پبلشر ہیں میں نے ان کو سمجھایا کہ اپنی پوزیشن کا غلط اندازہ نہ لگائیے آپ دفتر میں ملازم ہیں میرے کہنے کا ان پر کوئی اثر نہ ہوا اور یہ مسلسل غلط فہمی میں مبتلا رہے ان کے اس ارادہ کو دیکھ کر میں نے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو لکھا کہ میں سردار دھرم سنگھ پرنٹر اور پبلشر کو موقوف کرتا ہوں ۔ ان کی جگہ پنڈت دیوناٹک داس کا ڈیکلریشن بطور پرنٹر و پبلشر منظور کیا جائے ۔ پنڈت دیوناٹک میرا خط اور پرنٹر پبلشر کا فارم خانہ پری کے بعد لے کر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی عدالت میں گئے ۔ قاعدہ کے مطابق اس ڈیکلریشن کو داخل کرنے میں چند منٹ صرف ہوتے ہیں ۔ پنڈت جی یہ داخل کرنے کے بعد واپس دفتر پہنچے میں نے سردار دھرم سنگھ کو بلایا اور ان کی بقایا تنخواہ دے کر کہا کہ رسید لکھ دیجیے اور تشریف لے جائیے ۔ آپ کی ضرورت نہیں ۔ سردار دھرم سنگھ اپنے ذہن میں اکاونٹ کی کتابوں، منی آرڈروں اور بینک کے چیکوں پر دستخط کرنے کے خواب دیکھ رہے تھے ۔ یہاں ملازمت سے ہی جواب مل گیا ۔ پریشان کہ یہ کیا ہو گیا ۔ اس کے بعد انہوں نے بہت خوشامد کی کہ پوری

نہیں تو نصف تنخواہ پر ہی رکھ لیا جائے۔ مگر میں نے ان کو جواب دے دیا کہ مفت بھی رکھنے کے لئے تیار نہیں۔ اس کے بعد یہ اپنے گاؤں چلے گئے۔ وہاں غالباً وہی ہل چلانے کا کام کرتے ہیں جو ایڈیٹر پرنٹر و پبلشر ہونے سے پہلے کرتے تھے۔ یہ سردار دھرم سنگھ بھی اوورایسٹی میشن کا شکار ہوئے ورنہ شاید زندگی بھر یہاں آرام سے رہتے۔

یہ واقعات تو دوسروں کے اوورایسٹی میشن کے متعلق ہیں میرے ذاتی اوورایسٹی میشن کا واقعہ بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا میں جب ریاست نابھ میں ملازمت کے سلسلہ میں مہاراجہ سے انٹرویو کے لئے گیا تو مہاراجہ نے مجھ سے بہت سے سوالات کئے ان سوالات میں ایک سوال یہ بھی تھا آپ کیا کام کرسکتے ہیں اس سوال کا میں نے فوراً جواب دیا ہر کام کرسکتا ہوں اور آپ کی ریاست کی ایڈمنسٹریشن کے ہر صیغہ کو کامیابی سے چلاسکتا ہوں میرے اس جواب پر مہاراجہ نے کہا تو کچھ نہیں مگر وہ مسکرا دیئے۔ مہاراجہ نے مجھے ایڈمنسٹریشن میں کوئی ذمہ داری کا اہم کام سپرد نہ کیا۔ مگر ملازمت دے دی میں اب جب کبھی مہاراجہ کی اس مسکراہٹ کا خیال کرتا ہوں تو اپنی بےوقوفی یا اپنے اوورایسٹیمیشن پر شرم سی محسوس ہوتی ہے کیونکہ میں نے کبھی کہیں بھی ایڈمنسٹریشن کے صیغہ میں تجربہ حاصل نہ کیا تھا اور نہ ایڈمنسٹریشن سے واقف تھا مگر میں نے اوورایسٹی میٹ کرتے ہوئے کہہ دیا کہ ایڈمنسٹریشن کے ہر صیغہ کو کامیابی کے ساتھ چلاسکتا ہوں۔

☆☆☆☆☆☆

قابل معافی گناہ

دہلی میں ایک صاحب منشی عبدالقدیر ہیں یہ پنجاب کے رہنے والے ہیں مگر ان کا خاندان پچاس برس سے دہلی میں مقیم ہے آپ کانگریسی خیالات کے بزرگ ہیں بے حد نیک، غیر معمولی دیانت دار، بہت مخلص، بے ریا اور بے غرض کارکن، چنانچہ پچھلے پندرہ بیس برس کے اندر کانگرس کے جو پمفلٹ، پوسٹر یا دوسرا لٹریچر جس کو گورنمنٹ نے باغیانہ قرار دیا۔ دہلی میں شائع ہوا اسے منشی عبدالقدیر نے شائع کیا کسی زمانہ کی بھی کوئی ایسی تحریک نہ تھی جس میں منشی جی کی تلاشی، گرفتاری یا نظر بندی نہ ہوئی ہو اور آپ اب تک غالباً اٹھارہ بار جیل یا حوالات میں گئے۔

دہلی پولیس منشی جی کی تلاشیوں اور گرفتاریوں سے عاجز آ گئی اور کبھی ایسا نہ ہوا۔ کہ آپ کے گھر سے کاغذ کا ایک پرزہ بھی پکڑا گیا ہو کیونکہ آپ ہمیشہ محتاط رہا کرتے اور ایک محدود حلقہ کے دوستوں کے سوا کسی پر اعتماد نہ کرتے۔ پولیس جب آپ کی ان سیاسی مصروفیات سے تنگ آ گئی تو کوشش جاری ہوئی کہ کسی دوسرے مقدمہ کی لپیٹ میں ہی آپ کو رکھ لیا جائے تا کہ دہلی میں ''باغیانہ'' لٹریچر کی اشاعت بند ہو۔

دہلی میں اخبار ''الامان'' کے ایڈیٹر مولانا مظہر الدین کا قتل ہو گیا مولانا مسلم لیگی تھے اور وطن پرست مسلمانوں کے حلقہ کی آپ کے ساتھ سخت عداوت تھی مولانا کو قتل کرنے والے دو نو مسلم نوجوان تھے جو مولانا کی پالیسی کو ناپسند کرتے تھے قتل کے وقت موقع پر تو ملزم گرفتار نہ ہوئے مگر چند روز کے بعد اتفاقاً گرفتار ہو گئے۔ ان کی گرفتاری کے ساتھ ہی پولیس نے منشی عبدالقدیر کو بھی گرفتار کر لیا حالانکہ منشی جی کا قتل کے ساتھ کوئی تعلق نہ تھا اور آپ عدم تشدد کے پابند تھے۔ اس قتل کے جرم میں جب منشی عبدالقدیر کی گرفتاری ہوئی تو دہلی کے کانگرسی اور قومی حلقوں میں ایک ہیجان سا پیدا ہو گیا کیونکہ کوئی شخص ایسا نہ تھا جو منشی جی کے حالات سے واقف اور ان کے اخلاص اور ان کی حب الوطنی کا مداح نہ ہو۔ منشی جی تو حوالات کے بعد جیل خانہ میں بھیج دیئے

گئے مگر ان کے دوست ان کے مقدمہ کے باعث بے حد پریشان تھے اور آپ کے ان پریشان دوستوں اور مداحوں میں سے ایک ایڈیٹر ''ریاست'' بھی تھا کیونکہ قتل کا الزام ،مقدمہ سنگین پولیس کی پوری کوشش اور منشی جی بے گناہ۔

میں ایک عرصہ تک سوچتا رہا کہ منشی جی کے متعلق کیا کرنا چاہئے کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا آخر یہ مقدمہ سیشن کورٹ میں چلا گیا کیونکہ قتل کے ملزموں کے مقدمہ کی سماعت کسی مجسٹریٹ کے ہاں نہیں ہو سکتی ۔مجسٹریٹ صرف ابتدائی کارروائی کرتا ہے۔مقدمہ جب سیشن میں گیا تو اس زمانہ میں سیشن جج مسٹر ایس ایس مونگیا تھے یہ سیشن جج غیر معمولی دیانت دار اور قانون میں ماہر تسلیم کیے جاتے تھے۔

مسٹر مونگیا جب دہلی میں پہلے روز آئے تھے تو ان کے مکان کا انتظام نہ ہوا تھا یہ لالہ دلیس راج پاہوہ سیشن جج کے دوست تھے ان کے مکان پر ٹھہرے لالہ دلیس راج پاہوہ رائے بہادر ڈاکٹر متھرا داس کے بھتیجے ہیں اور میرے دونوں کے ساتھ گہرے تعلقات ہیں بلکہ لالہ دلیس راج کی والدہ میری والدہ کو اپنی والدہ کی طرح سمجھتی ہیں میں اس زمانہ میں لالہ دلیس راج کے ہاں دوسرے تیسرے روز جایا کرتا۔مسٹر مونگیا سے بھی ملاقات ہوئی مسٹر مونگیا نے چار پانچ روز لالہ دلیس راج کے مکان پر قیام کیا۔ اس کے بعد ان کے لیے کوٹھی کا انتظام ہو گیا۔اور وہ راجپور روڈ کی ایک کوٹھی میں چلے گئے۔

مسٹر مونگیا کے لالہ دلیس راج کے ہاں سے چلے جانے کے بعد آپ سے ملنے کا مجھے بہت کم اتفاق ہوتا ۔کبھی لالہ دلیس راج کے ساتھ راجپور روڈ کی طرف سیر کے لئے جانے کا اتفاق ہوا تو چند منٹ کے لئے مسٹر مونگیا سے بھی مل لیے اس سے زیادہ کوئی تعلق نہ تھا اور نہ ملنے کا اتفاق ہوتا۔

مولانا مظہر الدین کے مقدمہ کی جب کئی پیشیاں مسٹر مونگیا کی عدالت میں ہو چکیں ۔سرکاری گواہوں کی شہادتوں کے بعد فرد جرم، ملزموں کا بیان اور صفائی کی

شہادت بھی ختم ہوگئی اور بحث ہونے والی تھی تو مجھے خیال آیا کہ اگر کچھ کرنا ہے تو جلدی کرنا چاہئے بعد میں کوشش لاحاصل ہوگی۔ میں لالہ دلیس راج کے ہاں بیٹھا لالہ دلیس راج اور ان کی بیوی سے باتیں کر رہا تھا۔ تو مسٹر مونگیا کا ذکر چل پڑا۔ لالہ دلیس راج نے بتایا کہ مسٹر مونگیا غیر معمولی دیانت دار اور جرأت مند سیشن جج ہیں میں نے کہا کہ میں نے بھی ان کی بہت تعریف سنی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ کبھی وہ یہاں آئیں تو ان سے باتیں کی جائیں۔ لالہ دلیس راج کو کیا انکار تھا۔ انہوں نے اگلے روز مجھے اور مسٹر مونگیا کو ڈنر پر آنے کے لئے دعوت دی۔ میں نے ملاقات کی نیت اور اپنے خیال کے متعلق لالہ دلیس راج سے بھی کوئی ذکر نہ کیا۔ کیونکہ وہ بھی بہت دیانت دار ہیں اس کے علاوہ مسٹر مونگیا ان کے افسر تھے میں اپنا خیال ظاہر کرتا تو شاید تمام کھیل ہی بگڑ جاتا اور وہ مجھے منشی عبدالقدیر کے متعلق ذکر کرنے سے روک دیتے۔ یا ہم دونوں کو بیک وقت کھانے پر ہی نہ بلاتے اور میری سکیم رہ جاتی مقررہ وقت پر میں اور مسٹر مونگیا لالہ دلیس راج کے مکان پر پہنچ گئے پہلے ڈرائنگ روم میں مختلف موضوع پر باتیں ہوئیں تو پھر ہم ڈائننگ روم میں گئے اور کھانا شروع ہوا۔ کھانے کی میز پر میں لالہ دلیس راج لالہ دلیس راج کی بیوی اور مسٹر مونگیا تھے۔ ہم کھانا کھا رہے تھے اور میں سوچ رہا تھا کہ منشی عبدالقدیر کے متعلق بات کس طرح شروع کروں کہ مسٹر مونگیا نے میرے ساتھ ہمدردی کے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

”سردار صاحب! سنا ہے آپ پر ریاستوں اور گورنمنٹ نے کئی مقدمے قائم کئے اور عدالتوں نے ان مقدمات کے متعلق متعلقہ پولیس افسروں اور روالیان ریاست کے خلاف سٹرکچر بھی پاس کئے۔“

مسٹر مونگیا کا یہ کہنا تھا کہ مجھے موقع مل گیا میں نے جواب میں کہا:

”مونگیا صاحب آپ تو مقدمات کے متعلق پولیس کو جانتے ہیں۔ کہ یہ کیوں کر جھوٹے مقدمات بناتی ہے۔ آپ کی عدالت میں تو اب تک ہزارہا جھوٹے مقدمات

پیش ہوئے ہوں گے۔ پولیس والوں کی عداوت ذاتی ہوتی ہے اور اس عداوت کی کسر نفسی مقدمات سے نکالتے ہیں میرے خلاف ایک درجن سے زیادہ مقدمات انگریزی علاقہ کی پولیس اور والیان ریاست نے چلائے مگر ان سب میں ان کو ندامت اٹھانی پڑی اور مجھ تک ہی کیا محدود ہے دن رات جھوٹے مقدمات بنائے جاتے ہیں اور بے گناہ جیل خانوں میں قید کر دیئے جاتے ہیں۔ ابھی حال میں دہلی میں ایک دلچسپ واقعہ ہو گیا۔ ایک صاحب منشی عبدالقدیر کانگرسی ہیں غیر معمولی طور پر شریف نیک اور دیانت دار، زندگی بھر کبھی ایک پیسہ کسی فنڈ سے نہ لیا اور نہ کسی عہدہ یا شہرت کا لالچ ان کو رہا۔ پولیس ان کی اب تک پندرہ سولہ بار تلاشی لے چکی ہے مگر منشی جی قابو میں نہ آئے اب پچھلے دنوں یہاں کے ایک اخبار نویس مولانا مظہر الدین کا قتل ہو گیا قتل کرنے والے اور لوگ تھے مگر منشی جی کو بھی دھر لیا گیا کیونکہ ان کو جیل بھیجنے کی دوسری کوئی صورت نہ تھی اور اب منشی جی کا مقدمہ غالباً کسی مجسٹریٹ کی عدالت میں چل رہا ہے اس طرح جھوٹے مقدمات بنائے جاتے ہیں۔"

میں نے اتنا کہا تھا کہ مسٹر مونگیا نے فرمایا:

"قتل کا یہ مقدمہ تو میری عدالت میں ہے اس پر آجکل بحث ہو رہی ہے۔"

مسٹر مونگیا کے یہ الفاظ سن کر میں نے فوراً کہا:

"اوہ! مجھے علم نہ تھا۔ کہ مقدمہ آپ کی عدالت میں ہے۔ جس صورت میں مقدمہ آپ کی عدالت میں ہے آپ سے تو اس کا ذکر بھی نہ کرنا چاہئے تھا۔"

چنانچہ میں نے فوراً دوسرے موضوع پر بات شروع کر دی اور کسی نے محسوس نہ کیا۔ کہ میری مسٹر مونگیا سے اس ملاقات کی غرض کیا تھی۔

اس واقعہ کے پانچ سات روز بعد مسٹر مونگیا نے اپنا فیصلہ سنایا ایک ملزم کو پھانسی کی سزا دی ایک عمر قید اور منشی عبدالقدیر کو باعزت بری کر دیا گیا۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ اگر منشی عبدالقدیر کے متعلق مسٹر مونگیا کو اصل حالات نہ بتاتا تو

وہ گواہوں کی شہادتوں کو دیکھ کر منشی جی کے متعلق کیا فیصلہ کرتے۔ مگر میں اپنے اس فعل پر شرمندہ نہیں ہوں اور میرا ضمیر مطمئن ہے کہ میں نے ایک بے گناہ اور بے قصور قومی ورکر کو پولیس کے جھوٹے مقدمہ سے نجات دلانے کی کوشش کی۔

اس واقعہ کا یہ تاریک پہلو ہے اور میرا مسٹر مونگیا سے یہ کہنا کہ مجھے اس مقدمہ کے ان کی عدالت میں ہونے کا علم نہیں، بلا شبہ جھوٹ تھا مگر سوال یہ ہے کہ کیا کسی بے گناہ کو بچانے کے لئے جھوٹ بولنا جائز یا نا مناسب ہے یا نہیں۔ اس مسئلہ پر اگر مہاتما گاندھی کی رائے لی جاتی تو وہ بلا شبہ فوراً جواب دیتے کہ نا جائز اور غیر مناسب ہے کیونکہ وہ کسی صورت میں جھوٹ بولنا جائز نہیں سمجھتے تھے مگر مجھ جیسے لوگ جو دن بھر میں نہ معلوم کتنی بار دانستہ اور نا دانستہ جھوٹ بولتے ہیں اگر کسی نیک کام یا کسی معصوم و بے گناہ کی زندگی کو بچانے کے لئے بلا کسی غرض کے جھوٹ بولیں تو میرا خیال ہے کہ یہ گناہ یا کمزوری قابل معافی قرار دی جانی چاہئے۔

☆☆☆☆☆☆

ریاستی وزراء کا اقبال وزوال

''ریاست'' کو جاری ہوئے دو برس ہوئے تھے کہ سر دیا کشن کول وزیر اعظم پٹیالہ اپنی ملازمت سے علیحدہ کر دیئے گئے ۔ آپ پٹیالہ میں ایک سازش کا شکار ہوئے ۔ جس میں کرنل امریک سنگھ ۔ مسٹر رفیق احمد خاں اور پٹیالہ کے چند اہلکار شریک تھے ۔ سر دیا کشن کول ریاستوں کے وزراء میں بہت لائق اور تجربہ کار تھے ۔ بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ آپ اپنے زمانہ میں شاید تمام ریاستوں میں لائق ترین وزیر تھے ۔ جو والئی ریاست اور رعایا دونوں کی نبض پہچانتے ہوں ۔

جب سر دیا کشن پٹیالہ سے چلے گئے تو پٹیالہ میں یہ عام خیال تھا کہ سر دیا کشن پھر واپس پٹیالہ آ جائیں گے کیونکہ آپ کا وائسرائے اور پولیٹکل ڈیپارٹمنٹ پر بہت کافی اثر تھا اور وائسرائے مہاراجہ پٹیالہ پر سر دیا کشن کے پھر واپس بلائے جانے کے لئے زور دیں گے اس خیال سے متاثر ہو کر کرنل امریک سنگھ اور مسٹر رفیق احمد خاں نے سوچا کہ کوئی ایسی صورت اختیار کرنی چاہئے کہ مہاراجہ پٹیالہ اور سر دیا کشن کے درمیان کشیدگی بہت زیادہ بڑھ جائے تا کہ ان دونوں کے تعلقات آئندہ کبھی اچھے ہو ہی نہ سکیں اور سر دیا کشن کا واپس پٹیالہ آنا ممکن نہ رہے ۔ چنانچہ اس سکیم کو عملی صورت دینے کے لئے اس پارٹی نے لاہور سے دو اخبار نویسوں کو بلایا ۔ ان کو پانچ پانچ سو روپیہ بطور پیشگی دیا گیا ۔ آئندہ کے لئے بہت شاندار وعدے کئے اور ہدایت کی کہ سر دیا کشن کول کی ذات کے خلاف اخبارات اور پوسٹروں کے ذریعہ پراپیگنڈہ کیا جائے ۔ تا کہ سر دیا کشن پبلک میں رسوا ہوں ۔ اس اسکیم کا مقصد یہ تھا کہ اگر سر دیا کشن خاموش رہے تو پبلک میں رسوا ہوں گے اور چونکہ یہ پراپیگنڈہ پٹیالہ کے روپیہ سے ہو رہا ہے ۔ اگر سر دیا کشن نے مہاراجہ پٹیالہ کے خلاف کوئی قدم اٹھایا تو یہ قدم مہاراجہ اور سر دیا کشن کے درمیان چیلنج کو اور زیادہ وسیع کرنے کا باعث ہوگا اور سر دیا کشن کا پھر پٹیالہ میں بطور وزیر اعظم آنا ممکن ہی نہ ہوگا ۔

سر دیا کشن کے خلاف لاہور میں جب مضامین اور پوسٹر بازی شروع ہوئی تو سر دیا کشن نے لاہور سے ایڈیٹر ''ریاست'' کے پاس دہلی پیغام بھیجا کہ میں لاہور آ کر ان سے مل لوں۔ سر دیا کشن سے ایڈیٹر ریاست کی اس سے پہلے واقفیت ہو چکی تھی اور سر دیا کشن نے اپنے بھائی راجہ ہری کشن کول (جو اس زمانہ میں جالندھر کے کمشنر تھے) کو بھی بتا دیا تھا کہ سر دیا کشن کول کے والد راجہ سورج کول اور ایڈیٹر'' کے والد دونوں گہرے دوست تھے اور دونوں میانوالی وغیرہ کئی اضلاع میں اکٹھے ملازم رہے (یہ واقعہ ایڈیٹر ''ریاست'' کی پیدائش سے پہلے کا ہے راجہ سورج کول میانوالی میں ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر تھے اور ایڈیٹر ''ریاست'' کے والد وہاں ڈاکٹر تھے)

میں جب لاہور گیا اور راجہ سر دیا کشن کول اور ان کے پھوپھی زاد بھائی پنڈت جیون لال مٹو سے ملا تو تمام حالات معلوم ہوئے ان لوگوں کی خواہش تھی کہ'' ریاست'' میں مہاراجہ پٹیالہ کے جاری کئے گئے پراپیگنڈہ کے خلاف لکھا جائے میں نے جب تمام حالات سنے تو میں نے ان لوگوں سے کہا کہ اخبار میں لکھنا تو کوئی مشکل نہیں اور شاید مہاراجہ پٹیالہ کو بہت بری طرح سے بے نقاب کیا جا سکتا ہے کیونکہ مہاراجہ کی کمزوریاں ہی اس قابل ہیں مگر میرے آپ کے ساتھ ذاتی تعلقات بھی ہیں اس لئے میں کوئی غلط رائے نہیں دے سکتا۔ آپ کا اس گندے پراپیگنڈے کے خلاف ایک لفظ لکھنا یا لکھوانا آپ کے لئے نقصان کا باعث ہوگا۔ بہتر یہ ہے کہ بغیر کچھ لکھے یا لکھوائے کسی دوسرے طریقہ سے اس پراپیگنڈے کو بند کیا جائے اور کوشش کی جائے کہ تعلقات مہاراجہ پٹیالہ سے اچھے ہو جائیں تا کہ کرنل امریک سنگھ اینڈ کو کی سکیم ناکام ہو۔ چنانچہ مشورہ کے بعد فیصلہ ہوا کہ اگلے ہفتہ چیمبر آف پرنس کا اجلاس ہونے والا ہے راجہ سر دیا کشن اجلاس کے موقعہ پر دہلی آ کر مہاراجہ پٹیالہ سے ملنے اور تعلقات اچھے کرنے کی کوشش کریں۔

میں دہلی واپس آ گیا اور چار پانچ روز کے بعد راجہ سر دیا کشن بھی دہلی تشریف لے

آئے یہاں ان کا قیام لالہ سری رام مصنف خمخانہ جاوید کی کوٹھی میں ہوا راجہ صاحب نے دہلی پہنچتے ہی اپنے پہنچنے کی مجھے ٹیلی فون پر اطلاع دی اور میں حالات سے باخبر رہنے اور مشورہ دینے کے لئے دن میں پانچ چھ بار ٹیلی فون پر بات کر لیا کرتا۔

راجہ سر دیا کشن کو دہلی میں پہنچے دو تین روز ہوئے تھے۔ دہلی میں والیان ریاست اور ان کے وزراء و سٹاف کے باعث (جو چیمبر آف پرنسس کے موقعہ پر آئے تھے) کافی رونق ہو گئی اس زمانہ میں مسٹر سی ایس رنگا آئر ممبر اسمبلی میرے مکان پر مقیم تھے میں نے کھانے پر باتوں باتوں میں ان سے ذکر کیا کہ یہ والیان ریاست اپنے روپیہ سے انگریزی علاقہ میں بری حرکتیں کرتے ہیں اور مہاراجہ پٹیالہ کے روپیہ سے راجہ سر دیا کشن کول کے خلاف لاہور میں ایسے گندے پوسٹر شائع کئے جا رہے ہیں جن کو کوئی شریف آدمی پڑھنا بھی گوارا نہیں کر سکتا۔ مسٹر رنگا آئر نے اسے تعجب کے ساتھ سنا اور کہا کہ آپ اسمبلی میں اس پوسٹر بازی کے متعلق سوالات دریافت کرنے کا نوٹس دیں گے اور گورنمنٹ سے پوچھیں گے کہ کیا یہ واقعہ ہے یا نہیں کہ مہاراجہ پٹیالہ کے روپیہ سے انگریزی علاقہ میں لاہور کے اندر انگریزی رعایا کے خلاف گندے پوسٹر چھپے اور شائع ہوئے۔ مسٹر رنگا آئر نے کھانا کھانے کے بعد ان سوالات کا مضمون تیار کیا اور جب سوالات ٹائپ کرا کر تیار کر لئے گئے تو میں نے کہا مسٹر شبرک ولیمز فارن منسٹر ریاست پٹیالہ بھی آج کل دہلی میں ہیں۔ سوالات دریافت کرنے کی ضرورت ہی نہ رہے اور سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے مسٹر رنگا آئر نے میری اس تجویز کو بہت پسند کیا مسٹر شبرک ولیمز گورنمنٹ آف انڈیا کے پبلسٹی افسر رہ چکے تھے اور مسٹر رنگا آئر کے دوست تھے۔ آپ نے اسی وقت ان کو ٹیلی فون کر کے اگلے روز صبح ملنے کا وقت مقرر کر لیا آپ ملنے کے لئے گئے تمام واقعات اور سوالات کے متعلق بتایا تو مسٹر شرک ولیمز بہت حیران ہوئے کیونکہ پوسٹر بازی ان کی لاعلمی میں کی جا رہی تھی ان کو یہ حالات سن کر بے حد افسوس ہوا اور آپ نے مسٹر رنگا آئر سے درخواست کی کہ سوالات

اسمبلی میں دریافت نہ کئے جائیں وہ مہاراجہ پٹیالہ سے بات کرکے اس گندے اور لچر پراپیگنڈہ کو فوراً بند کرادیں گے رنگا آئر نے واپس آ کر مجھے بتایا کہ ان کی مسٹر رشبرک ولیمز سے کیا بات چیت ہوئی۔

یہ بات تو صبح ہوئی شام کو پانچ بجے کے قریب قاضی سر عزیز الدین احمد وزیر اعظم ریاست دیتا ایڈیٹر ''ریاست'' سے ملنے کے لئے دفتر ریاست میں تشریف لائے اور باتیں ہوئیں تو میں نے ان کو بتایا کہ کس طرح کرنل امریک سنگھ وغیرہ راجہ سر دیا کشن کول کے خلاف پراپیگنڈہ کر رہے ہیں قاضی صاحب مہاراجہ پٹیالہ کے بہت گہرے دوست تھے یہ سب کچھ بتانے کے بعد میں نے شرارتاً کہا کہ میں اس معاملہ کو ریاست میں لے رہا ہوں اور میں مہاراجہ پٹیالہ کو بتاؤں گا کہ وہ کس طرح انگریزی علاقہ میں لوگوں کے خلاف گندگی پھیلا سکتے ہیں۔ قاضی صاحب بہت دوست نواز، نرم دل، نیک بزرگ تھے جب انہوں نے مجھ سے یہ سنا کہ میں مہاراجہ پٹیالہ کے خلاف ریاست میں سلسلہ مضامین شروع کر رہا ہوں تو آپ پریشان سے ہوئے اور آپ نے کہا ''نہیں نہیں سردار صاحب! آپ ایسا نہ کیجئے آپ کو معلوم نہیں کہ مہاراجہ پٹیالہ بہت اچھے آدمی ہیں۔ ان کو تو شاید اس پوسٹر بازی کا علم بھی نہ ہو اور یہ سب کچھ خود غرض لوگ ان کو اطلاع دیئے بغیر کر رہے ہوں میں ابھی مہاراجہ کے پاس جا کر دریافت کرتا ہوں کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ جو مہاراجہ کے شان کے شایاں نہیں۔''

قاضی صاحب کے ایسا کہنے پر میں نے جواب دیا ''قاضی صاحب آپ کوشش کر لیجئے اگر یہ شرمناک پوسٹر بازی بند نہ ہوئی تو میں پھر اس معاملہ کو ہاتھ میں ضرور لوں گا سر دیا کشن کول کی میں اپنے بزرگوں کی طرح عزت کرتا ہوں۔''

قاضی صاحب اس گفتگو کے بعد سیدھے گنگر وے تشریف لے گئے جہاں ریلوے سٹیشن پر مہاراجہ پٹیالہ کی سیلون کھڑی تھی مہاراجہ کو اطلاع ہوئی تو مہاراجہ نے قاضی کو فوراً بلوالیا خیر خیریت دریافت کرنے کے بعد قاضی صاحب نے مہاراجہ سے

کہا۔

''سرکار۔ حضور کی عزت موتیوں کی طرح صاف اور قیمتی ہے مجھے یہ سن کر بہت افسوس ہوا کہ حضور کے حکم سے سر دیا کشن کول کے خلاف گندہ پراپیگنڈہ کیا جا رہا ہے اور ان پوسٹروں کے جواب میں اب حضور کے خلاف لکھا جانے والا ہے۔ کتنے افسوس کی بات ہے۔ حضور کی شان ایسی باتوں سے بہت بلند ہونی چاہیئے۔''

قاضی صاحب نے جب یہ الفاظ کہے تو مہاراجہ کا رنگ غصہ کے باعث سرخ ہو گیا اور آپ نے چوب دار سے کہا بلاؤ امر یکے کو (مہاراجہ جب غصہ میں آتے اپنے ملازمین کو آدھے نام سے پکارتے مثلاً امر یک سنگھ کو امر یکے رفیق محمد کو رفیقے اور رنجن سنگھ کو رنجنے وغیرہ) چوبدار ساتھ والے سیلون سے کرنل امر یک سنگھ کو بلا لایا۔ اور کرنل صاحب جب آئے تو مہاراجہ ان پر برس پڑے اور گالیاں دے کر کہا کہ تم لوگ مجھے بے عزت کرانا چاہتے ہو تم کو شرم نہیں آتی۔ اگر دیا کشن نے میرے خلاف گندے پوسٹر نکلوائے تو اس کا ذمہ دار کون ہوگا اس پراپیگنڈہ کو فوراً بند کرو اگر بند نہ ہوا تو تمہیں جیل بھیج دیا جائے گا یہ سب ڈانٹ ڈپٹ قاضی صاحب کی موجودگی میں ہوئی قاضی صاحب نے واپس آ کر مجھے بتایا کہ ان کی موجودگی میں کیا کچھ ہوا۔

اس کے بعد اطلاع ملی کہ مسٹر رشبرک ولیمز رات کو مہاراجہ کے ساتھ ڈنر کھانے کے لئے آئے تو آپ نے کہا کہ پوسٹروں وغیرہ کے متعلق سنٹرل اسمبلی میں سوالات دریافت کئے جانے والے ہیں مہاراجہ ڈنر پر ہی کرنل امر یک سنگھ کو بلا کر پھر ناراض ہوئے اور حکم دیا کہ اس پراپیگنڈے کو فوراً بند کر دیا جائے۔

میں راجہ سر دیا کشن کو ٹیلیفون پر تمام حالات کی اطلاع دیتا رہتا تھا اگلے روز معلوم ہوا کہ لاہور کے پوسٹر شائع کرنے اور اخبارات میں لکھنے والے دونوں حضرات روپیہ کی مزید قسطیں وصول کرنے کے لئے دہلی کے رائل ہوٹل میں مقیم ہیں اور صبح وشام کرنل امر یک سنگھ کی زیارت کے لئے کنگز وے سٹیشن تشریف لے جاتے ہیں۔

چنانچہ یہ اس روز شام کو جب گئے تو کرنل امریک سنگھ نے ان سے کہا فوراً واپس لاہور چلے جایئے ہمیں پراپیگنڈہ کی ضرورت نہیں اور نہ ہم سے کبھی ملنے کے لئے تشریف لایئے یہ دونوں حضرات بڑی امیدوں سے آئے تھے اور شاید لاکھوں روپیہ کے خواب دیکھ رہے تھے حیران ہوئے کہ یہ کیا ہو گیا ان کو خیال بھی نہ ہو سکتا تھا کہ دیوان سنگھ نے ایسا کیا ہو گا۔

سر دیا کشن کول ان تمام حالات سے بے حد خوش ہوئے اور آپ نے لاہور جانے سے پہلے آخری روز ٹیلی فون پر فرمایا سردار صاحب! میں آپ کا احسان زندگی بھر نہیں بھول سکتا اور آپ کی قابلیت اور اخلاص کا پہلے سے ہزار گنا زیادہ مداح ہوں۔ اگر خدا نے موقع دیا تو میں آپ کے اس احسان کو اتارنے کی کوشش کروں گا میں نے ٹیلی فون پر ہی جواب دیا۔

"راجہ صاحب! میں آپ کی اپنے بزرگوں کی طرح عزت کرتا ہوں کیونکہ آپ کے اور میرے والد کے درمیان گہرے دوستانہ تعلقات تھے مجھے اس بات کا افسوس تھا کہ باوجود ان تعلقات کے میں نے پنجاب کے اخبارات میں جب کہ میں ان کو ایڈٹ کرتا تھا۔ پٹیالہ کو بے نقاب کرتے ہوئے آپ کے خلاف بھی بار ہا لکھا اب آپ پٹیالہ سے ریٹائر ہو چکے ہیں اور پرائیویٹ لائف میں ہیں اگر میں نے اس سلسلہ میں آپ کی کوئی خدمت کی تو میں نے اپنے گزشتہ گناہوں کو دھویا میں نے کوئی احسان نہیں کیا خدا کرے کہ میں آئندہ بھی پرائیویٹ حیثیت سے آپ کی کبھی کوئی خدمت کر سکوں۔"

سر دیا کشن کول نے اپنے دہلی کے اس قیام میں مہاراجہ پٹیالہ سے بھی مل کر غلط فہمی رفع کرنے کی کوشش کی مگر ان کی راہ میں مہاراجہ دھولپور مخل ہوئے۔ کیونکہ مہاراجہ دھولپور بھی سر دیا کشن کو پٹیالہ سے علیحدہ کرانے میں شریک تھے اس کے بعد کئی برس تک مہاراجہ پٹیالہ سر دیا کشن سے نہیں ملے والیان ریاست فطرتاً بہت خود غرض ہوتے

ہیں کئی برس کے بعد جب پبلک ایجی ٹیشن سے متاثر ہو کر وائسرائے نے مہاراجہ پٹیالہ کے خلاف فنڈز پر ک تحقیقاتی کمیشن مقرر کیا تو مہاراجہ پٹیالہ نے سر دیا کشن سے امداد کے لئے درخواست کی سر دیا کشن ریاستی قسم کے نمک حلال تھے آپ نے پچھلے تمام حالات اور مہاراجہ کی زیادتیوں کو بھول کر اس کمیشن میں پھر امداد دی اور اس امداد کے باعث ہی مہاراجہ کو کوئی سزا نہ ملی۔

اس واقعہ کے بعد سر دیا کشن کول کئی برس زندہ رہے۔ آپ سے کبھی ملنے کا اتفاق ہوتا تو بہت محبت سے پیش آتے اور میں بھی ان کی اپنے بزرگوں کی طرح عزت کرتا۔ مرحوم میں بھی ریاستی اہل کاروں جیسی کمزوریاں ہوں گی اور تھیں مگر آپ بہت خوبیوں کے انسان اور بہت مضبوط کریکٹر کے بزرگ تھے جس کے دشمن ہیں اسے کچلے بغیر آپ کو صبر نہ آتا اور جس کے دوست اس کے لئے آنکھیں بچھا دیتے بہت فیاض، بہت بہادر، بہت بڑے سیاست دان اور بہت ہی مخلص، مرحوم مہاراجہ نابھ راقم الحروف اور دوسرے دوستوں سے اکثر کہا کرتے تھے کہ مہاراجہ پٹیالہ کی خوش نصیبی ہے کہ ان کے پاس سر دیا کشن جیسا مشیر ہے اور میری بدنصیبی ہے کہ میرے پاس سر دیا کشن کے پلہ کا کوئی آدمی نہیں۔ چنانچہ مہاراجہ نابھ نے گدی سے دست برداری کے بعد بھی راجہ سر دیا کشن سے دوستانہ تعلقات پیدا کرنے چاہے اور مجھے منصوری وڈیرہ دون سے آپ کے پاس لاہور بھیجا مگر مہاراجہ سر دیا کشن نے مہاراجہ نابھ کی اس خواہش کو لبیک کہنا مناسب نہ سمجھا

☆☆☆☆☆☆

بھروسہ کا مستحق ہر شخص نہیں

کئی برس ہوئے بھگت سنگھ کی تحریک زوروں پر تھی۔ اور پنجاب کے کالجوں کا ہر طالب علم اپنے آپ کو انارکسٹ سمجھتا تھا۔ اور میرا یقین ہے کہ اگر مہاتما گاندھی اس زمانہ میں جرأت کے ساتھ اس تحریک کی علانیہ مذمت نہ کرتے تو یہ تحریک زیادہ زور پکڑتی۔ اس میں لوگ زیادہ شامل ہوتے زیادہ وارداتیں ہوتیں زیادہ مقدمات چلتے، زیادہ لوگ سرکاری گواہ بنتے اور زیادہ لوگوں کو پھانسیاں ملتیں۔ کیونکہ پنجاب کے لوگ فطرتاً کسی سازش کے اہل نہیں یہ لوگ جتنی جلدی کسی سازش میں شامل ہوتے ہیں اس سے زیادہ تیزی کے ساتھ سرکاری گواہ بننے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں چنانچہ پنجاب میں یہ مثل مشہور ہے کہ اگر وہاں کسی سازش میں بارہ ملزم ہوں تو تیرہ سرکاری گواہ بننے کے لئے تیار ہو سکتے ہیں (یعنی یہ بارہ کے بارہ ملزم تو سرکاری گواہ بننے کے لئے تیار ہوتے ہی ہیں ان کے قریب کے کسی پڑوسی کو سرکاری گواہوں کے بننے کی اطلاع ملے تو وہ بھی پولیس سے کہتا ہے کہ اسے سرکاری گواہ بنالیا جائے) پنجاب کے لوگوں کی اس فطرت کا نتیجہ ہے کہ یہاں کبھی بھی کوئی سازش کامیاب نہیں ہوئی اور پولیس کو سب کچھ پتہ چل جاتا ہے۔ حالانکہ بنگال میں کسی ایک سازش کا بھی کبھی انکشاف نہیں ہوا اور وہاں اگر کوئی انارکسٹ پکڑا گیا تو اس نے سازش کے انکشاف کے خوف سے سائنیڈ آف پوٹاش کا زہر کھا کر فوراً ہی اپنی زندگی ختم کرلی۔

لارڈ ارون کی ٹرین کے نیچے جب بم رکھا گیا تو اس سے چند ماہ پہلے پنجاب کے کچھ نوجوان دہشت انگیزی یا ازرزم پھیلانے کی نیت سے دہلی آئے اتنا بڑا اہم کام اور کالجوں سے نکلے ہوئے ناتجربہ کار نوجوان، کوئی رہبری کرنے والا نہیں جیب میں پیسے نہیں اور فاقہ کشی مگر حوصلے بلند اور قربانی کے جذبات۔ یہ لوگ جب دہلی آئے تو دہلی کے ایک صاحب میرے پاس تشریف لائے اور کہا کہ کچھ لوگ ایک اہم کام کے لئے پنجاب سے آئے ہیں اور بہت محبت الوطن ہیں، فاقہ کشی میں مبتلا ہیں دہلی

ے قریب بہادر گڑھ یا بہادر گڑھ کے قریب مقیم ہیں۔ان کے کھانے پینے کے لئے کچھ روپیہ چاہئے۔میں نے اس شخص کو ایک سو روپیہ دے دیا اور تاکید کی کہ آئندہ مجھ سے ان لوگوں کی کسی مصروفیت کے متعلق کوئی ذکر نہ کیا جائے یہ شخص میرے اس جواب پر حیران تھا اور اس نے پوچھا کہ میں اتنی غیر دلچسپی کا اظہار کیوں کر رہا ہوں حالانکہ دوسرے لوگ ایسے واقعات کو کرید کرید کر پوچھتے اور دلچسپی لیتے ہیں میں نے جواب دیا کہ میں جانتا ہوں کہ ایسی سازشوں کا کیا نتیجہ ہوتا ہے۔بارہ ملزم ہوں تو تیرہ سرکاری گواہ بن جاتے ہیں میں نے روپیہ دیا ہے تو ان کے کسی فعل کے لیے نہیں بلکہ ان کی حب الوطنی اور ان کی تنگ دستی سے متاثر ہو کر یہ صاحب روپیہ لے کر چلے گئے اس کے بعد یہ آٹھویں، دسویں یا پندرھویں دن تشریف لے آتے اور ایک یا دو سو روپیہ لے جاتے اور باوجود اس بات کے کہ میں کوئی بات سننا نہ چاہتا مگر ان کو صبر نہ آتا۔یہ کچھ نہ کچھ حالات سنا ہی جاتے۔

یہ صاحب ایک روز تشریف لائے اور کہا کہ یہ نوجوان ملنا چاہتے ہیں کیونکہ ان کے دل میں ایڈیٹر ''ریاست'' کے لئے بہت عزت واحترام ہے۔میں نے جواب دیا کہ میں ان کی عزت ومحبت کا شکر گزار ہوں مگر ملنا نہیں چاہتا۔کیونکہ میں محتاط ہوں نہ معلوم ان لوگوں میں سے کون کون اور کب سرکاری گواہ بنے اور کیا کیا بیان دے میں کسی صورت میں بھی ان سے کوئی تعلق رکھنا نہیں چاہتا میرے دل میں ان کے حب الوطنی کے جذبات کی قدر ہے میں زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتا ہوں کہ جب کبھی ان کو مالی مشکلات ہوں یہ کسی آدمی کو بھیج دیا کریں مجھ سے جو کچھ ممکن ہو سکے گا میں ان کی نذر کر دوں گا اس سے زیادہ کسی قسم کا تعلق رکھنا میرے بس کا کام نہیں اس کے بعد یہ صاحب اکثر آتے رہے اور روپیہ لے جاتے رہے۔ایک روز تشریف لائے تو انہوں نے کہا کہ کار کی ضرورت ہے میں اپنی کاروں میں نے پوچھا کیا ضرورت ہے تو انہوں نے کہا کہ وہ نوجوان کچھ کرنا چاہتے ہیں میں نے جواب دیا کہ میں اپنی کار نہیں دے

سکتا اور نہ ان کی مصروفیات کے متعلق کوئی بات سننا چاہتا ہوں اور مذاقاً کہا کہ اگر کار کی ہی ضرورت ہو تو ان میں سے کوئی صاحب کار چلا سکتے ہوں تو شام کو سینماؤں کے سامنے درجنوں کاریں لاوارث کھڑی ہوتی ہیں کسی ایک کار کو لے سکتے ہیں انارکزم کے مقابلہ پر چوری کون سا بڑا جرم ہے۔ انارکزم کے لیے تو پھانسی کی سزا ہے چوری کے لیے زیادہ سے زیادہ دو سال قید ہو گی اور پھر چوری بھی چوری کی نیت سے نہیں میرے اس مذاق کے بعد ان صاحب نے کار کے لیے پھر بار بار کہا مگر میں نے انکار کر دیا اور اپنے وہی الفاظ دہرائے کہ میں تم لوگوں کی مصروفیات کے متعلق نہ تو کوئی بات سننا چاہتا ہوں نہ کوئی حصہ لینا چاہتا ہوں کیونکہ میں جانتا ہوں کہ اگر تم لوگوں نے کچھ کیا تو نہ معلوم تم میں سے کون کون سرکاری گواہ بنے گا کیا کیا بیان دو گے اور کس کس کو پھانسی پر لٹکواؤ گے۔

ان واقعات کے بعد ایک روز صبح کا وقت تھا کہ غالباً دسمبر کا مہینہ بہت سخت سردی تھی اور چاروں طرف کہر ہی کہر تھی۔ ہاتھ کو ہاتھ نظر نہ آتا تھا میں صبح اٹھ کر غسل خانہ میں گیا واپس آیا تو مسٹر سری کرشن آف ایسوسی ایٹڈ پریس کا ٹیلیفون آیا کہ ابھی آدھا گھنٹہ ہوا پرانے قلعہ کے پاس لارڈ ارون کی ٹرین کو بم کے ذریعے اڑانے کی کوشش کی گئی مگر چونکہ کہر زیادہ تھی خوش قسمتی سے نشانہ درست نہ لگا اور وائسرائے بچ گئے مسٹر سری کرشن نے تو دوستانہ طور پر اطلاع دی اور جب بھی کوئی بہت اہم خبر ہوتی تو آپ ٹیلیفون پر مجھے بتا دیا کرتے مگر میرے لیے یہ خبر خلاف توقع نہ تھی میں سمجھ گیا کہ یہ پنجاب کے ان نوجوانوں کی مصروفیت کا ہی نتیجہ ہے۔

اس واقعہ کو کئی ماہ گزر گئے ان انارکسٹ لڑکوں میں سے کچھ تو گرفتار ہو چکے تھے اور کچھ ابھی گرفتار نہ ہوئے تھے۔ مجھے اس زمانہ میں سینما کا بہت شوق تھا۔ مفت کے مستقل پاس تھے اس زمانہ میں سینماؤں والے ایڈیٹران اخبارات کو مستقل پاس دیا کرتے تھے کہ جب بھی چاہو چلے آؤ۔ آج کل یہ لوگ صرف ایک شو کے لئے پاس

جاری کرتے ہیں جو دوبارہ استعمال نہیں ہوسکتا اور اگر پھر جانا ہو تو پھر نیا پاس حاصل کیا جاتا ہے۔ میں اب ایک عرصہ سے پاسوں سے سینما دیکھنا کچھ معیوب سا سمجھتا ہوں ٹکٹ خرید کر ہی سینما دیکھتا ہوں اور میری خواہش ہوتی ہے کہ میرے دفتر کا کوئی شخص بھی پاس لے کر سینما نہ دیکھے کیونکہ جس صورت میں کہ ہم فلم والوں سے اشتہارات کی اجرت لیتے ہیں کیا وجہ ہے کہ ان سے پاس طلب کئے جائیں میں کوئی فلم نہ چھوڑتا تھا بلکہ بعض فلموں کو تو دو دوبار دیکھتا میں فوارہ کے پاس میجسٹک سینما میں اوپر آخری اور کنارہ کی ایک کرسی پر بیٹھا فلم دیکھ رہا تھا تو میں نے محسوس کیا کہ باہر سے کوئی شخص آ کر میرے پاس کھڑا ہو گیا ہے میں نے اس شخص کو دیکھا تو یہ سردار کرم سنگھ انسپکٹر سی آئی ڈی (جو بعد میں سردار بہادر اور ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ ہو گئے تھے اور اب ریٹائر ہو چکے ہیں) تھے یہ چونکہ باہر روشنی میں سے آئے تھے سینما میں اندر پہنچے تو ان کو بیٹھے ہوئے لوگ نظر نہ آتے تھے۔ اور یہ وہاں بیٹھے لوگوں کو اپنی آنکھوں پر زور دے کر غور کے ساتھ ادھر ادھر دیکھ رہے تھے میں نے جب سردار کرم سنگھ کو دیکھا کہ یہ اندھیرے میں کچھ تلاش کر رہے ہیں تو میری ہنسی نکل گئی اور میں نے طنزاً کہا ''سردار جی کس شکار کی تلاش میں ہو'' سردار کرم سنگھ میرے واقف تھے اور واقفیت کی یہ صورت تھی کہ یہ میری تلاشیوں اور گرفتاریوں کے سلسلہ میں متعدد بار میرے مکان پر تشریف لا چکے تھے۔ اور اس کے بعد جب ملتے ست سری اکال ہو جاتا شکار کے الفاظ سن کر یہ میری ساتھ والی کرسی پر ہی بیٹھ گئے اور میرے طنز کا انہوں نے طنز میں ہی جواب دیا۔

''ٹھیک ہے شکار ہم کریں اور روپیہ تم دو۔''

میں نے کہا سردار جی میں آپ کے ان الفاظ کو سمجھ نہ سکا کہ روپیہ کس کو دیا اس پر سردار کرم سنگھ نے کہا ہمارے پاس ایک شخص کا بیان موجود ہے کہ وہ انارکسٹوں کے لئے آپ سے روپیہ لاتا رہا۔ جنہوں نے وائسرائے کی ٹرین کو اڑانے کی کوشش کی میں نے بات کو ہنسی میں ٹالتے ہوئے کہا کہ اگر پولیس کے گواہ ایسے ہی معتبر ہیں تو

گورنمنٹ کی تباہی میں کوئی شک نہیں ہم سینما بھی دیکھتے جا رہے تھے اور باتیں بھی کر رہے تھے۔ میں ظاہراُ طور پر ان کے گواہوں کا مذاق اڑا رہا تھا اور مصنوعی ہنسی کے ساتھ ان پر اس بات کا اظہار کر رہا تھا کہ میں قطعی بے خبر اور لاعلم ہوں مگر باتوں باتوں میں سردار صاحب کو کرید کرید کر پوچھتا تھا کہ مزید حالات کیا ہیں تا کہ مجھے معلوم ہو سکے کہ پولیس کے پاس میرے متعلق اور مواد کیا ہے۔ سردار کرم سنگھ سے معلوم ہوا کہ ان نوجوانوں کی جب گرفتاریاں شروع ہوئیں تو وہ حضرت بھی گرفتار ہوئے جو مجھ سے روپیہ لے جایا کرتے تھے گرفتار کئے جانے کے بعد یہ مسٹر پیل، سپرنٹنڈنٹ پولیس (یہ افسر یوپی پولیس میں سپرنٹنڈنٹ تھے وہاں سے وائسرائے کی ٹرین کو اڑانے والے سازش کے مقدمہ کی تحقیقات پر خاص طور سے لگائے گئے اور تحقیقات کے سلسلہ میں سپیشل ڈیوٹی پر کئی ماہ دہلی میں رہے) کے سامنے پیش کئے گئے تو مسٹر پیل نے پولیسانہ آنکھیں دکھاتے ہوئے ان سے کہا کہ ملزموں کے کٹہرہ میں آنا چاہتے ہو یا بطور سرکاری گواہ کے دونوں میں سے کس کو انتخاب کرتے ہو۔ مسٹر پیل کے یہ الفاظ سن کر یہ حضرات گھبرا گئے اور رو پڑے اور انہوں نے کہا کہ ان کو ملزم نہ بنایا جائے۔ یہ تباہ ہو جائیں گے اور سرکاری گواہ بھی نہ بنایا جائے سرکاری گواہ بننے کی صورت میں یہ آئندہ پبلک میں بھی کھڑے نہ ہوسکیں گے یہ تمام حالات من وعن راز میں بتا دیتے ہیں اور گرفتاریوں میں بھی امداد دیں گے۔ ان کو ملزموں یا گواہوں میں نہ رکھا جائے چنانچہ اس بات چیت کے بعد انہوں نے تیس صفحہ فل سکیپ سائز کے کاغذ پر اپنا بیان دیا ہے اور اس بیان میں یہ بھی لکھایا ہے کہ وہ ایڈیٹر ''ریاست'' سے ملزموں کے لیے روپیہ لاتا رہا جس سے ان کے کھانے پینے کے اخراجات چلتے تھے میں نے سردار کرم سنگھ سے جب یہ حالات سنے تو مجھے معلوم ہو گیا کہ معاملہ کہاں تک پہنچا ہے میں نے مزید کریدنے کے لئے تمام واقعات کا پھر مذاق اڑانے اور فرضی ہنسی ہنستے ہوئے پوچھا کہ اگر آپ کے پاس یہ بیان موجود ہے کہ ایڈیٹر ''ریاست'' نے ان انارکسٹوں کو

روپیہ دیا تو آپ نے ایڈیٹر ریاست کو گرفتار کیوں نہ کیا اس کے جواب میں سردار کرم سنگھ نے کہا کہ یہ شہادت کافی نہ تھی صرف ایک آدمی کی شہادت مقدمہ کی تکمیل کے لئے کافی نہیں ہوسکتی اس کے علاوہ اس شخص نے بتایا ہے کہ ایڈیٹر ریاست سوائے ذاتی اخراجات کے اور کوئی امداد دینے یا حصہ لینے کے لئے تیار نہ تھا اور اس نے انکار کر دیا تھا۔ یہ بیان گرفتاری یا مقدمہ چلانے کے لئے کافی نہ تھا۔

اس واقعہ کے بعد کا ذکر ہے رات کے بارہ بجے تھے اور میں ابھی کام کر رہا تھا ایک بنگالی نے نیچے کا دروازہ آ کر کھٹ کھٹایا ملازم نے دروازہ کھولا تو اس نے کہا وہ دیوان سنگھ سے ملنا چاہتا ہے ملازم میرے پاس اوپر آیا اور اس نے بتایا کہ ایک شخص ننگے سر جو مدارسی یا بنگالی معلوم ہوتا ہے ملنا چاہتا ہے میں نے کہا پوچھو نام کیا ہے وہ اس وقت کیوں ملنا چاہتا ہے اور کام کیا ہے؟ ملازم نے پوچھا تو اس نے کہا کہ وہ نام بتانا نہیں چاہتا مگر ایک بہت ضروری کام ہے وہ ملنے پر بتائے گا کہ کیا کام ہے اور کیا نام ہے اگر کوئی شخص اپنا نام بھی نہ بتائے تو میں ملنے سے انکار کر دیا کرتا ہوں اور اکثر ایسا ہوا کہ نہیں ملا۔ کیونکہ جو شخص اپنا نام بھی نہ بتائے اس کو حق حاصل نہیں کہ وہ دوسروں کا وقت ضائع کرے مگر چونکہ رات کے بارہ بجے تھے میں یہ سمجھا کہ شاید کسی ریاست سے کوئی شخص پوشیدہ طور پر آیا ہو اور وہاں کے مظالم بتانا چاہتا ہو میں نے اس کو بلا لیا اور پوچھا تو اس نے بتایا کہ یہ کلکتہ کا رہنے والا ایک انارکسٹ ہے پنجاب کے ببرا کالیوں سکھوں میں ببرا کالی تحریک شروع ہوئی تھی جس کا کام پولیس کے افسروں اور سرکاری گواہوں کو قتل کرنا تھا سے ملنے کے لئے امرتسر جا رہا ہے اس کے پاس اخراجات ختم ہو گئے ہیں اور اس کو سو روپیہ کی ضرورت ہے میں ایسے لوگوں کے متعلق بہت محتاط رہا ہوں اور ہر شخص کے متعلق یہ سوچ لیتا ہوں کہ اگر یہ سرکاری گواہ بنا تو مجھے کس حد تک نقصان پہنچا سکتا ہے میں نے اس پر سوال کیا کہ تم کو دیوان سنگھ کے متعلق علم کیوں کر ہوا کہ وہ اس مکان میں رہتا ہے اور وہ تمہیں روپیہ دے گا اس نے جواب دیا کہ کلکتہ میں وہ سردار

نرنجن سنگھ طالب جو مرحوم مہاراجہ نابھ کے پرائیویٹ سیکرٹری تھے جس پر مسٹر سبھاش چندر بوس سے تعلق رکھنے کا الزام تھا اور جو پانچ سال تک مختلف جیلوں میں رکھے جانے کے بعد رہا ہوئے سے ملا کرتا تھا اور ایڈیٹر ریاست کے متعلق وہاں اکثر ذکر آیا کرتا تھا میں نے پھر سوال کیا کہ کیا دہلی میں کسی شخص کو جانتے ہو اس نے جواب دیا کہ ہاں لالہ شنکر لال ٹراپیکل انشورنس والوں کو مسٹر آصف علی کو اور مولانا عارف ہسوی کو میں نے اس سے کہا کہ میں تمہیں جانتا نہیں کہ تم کون ہو آیا انارکسٹ ہو یا سی آئی ڈی کے ملازم ہو اگر تم انارکسٹ ہو تو مجھے تمہارے انارکزم سے کوئی تعلق نہیں میں بطور انسان کے ایک دوسرے ضرورت مند انسان کی امداد کر سکتا ہوں۔ یہ میرا فرض ہے اور میں ہمیشہ کرتا ہوں مگر اس خیال سے کہ یہ امداد غلط طریقہ پر ضائع نہ ہو آپ ان تینوں اصحاب میں سے کسی ایک کے پاس چلے جائیے اور مجھے ٹیلی فون کرا دیجئے کہ وہ آپ کو جانتے ہیں میں آپ کو روپیہ دے دوں گا مگر بغیر واقفیت کے نہیں دے سکتا۔ یہ بنگالی حضرت چلے گئے اس کے بعد نہ یہ واپس آئے اور نہ کوئی ٹیلی فون آیا۔ میرا یقین ہے کہ یہ شخص سی آئی ڈی کے لوگوں میں سے تھا یا سی آئی ڈی والوں کا بھیجا ہوا تھا۔

ان حالات کے لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ کسی ضرورت مند کو امداد دینے میں کوئی ہرج نہیں بلکہ یہ ہر انسان کا فرض ہے اور میں اسے خوش نصیب سمجھتا ہوں جس کا محنت سے پیدا کیا ہوا روپیہ دوسرے لوگوں کے کام آئے اس کے علاوہ میری رائے میں ہماری ہمدردی اور امداد کا ہر وہ شخص مستحق ہے جو محب الوطن ہے اور ملک کی خدمت کرتا ہے۔ مگر ہر چمکنے والی شے کو سونا سمجھنا احتیاط نہ کرنا ہر شخص پر بھروسہ کرتے ہوئے اس کے ساتھ شامل ہو جانا بالکل ایسا ہے جیسے اپنے گلے میں خود ہی پھانسی کی رسی ڈال لی جائے۔ چنانچہ میں اگر روپیہ لے جانے والے یا بنگالی پر زیادہ اعتماد کرتا اور بے تعلق نہ رہتا تو یہ غیر ممکن نہ تھا کہ مجھے بھی ملزموں کے ساتھ شامل کر لیا جاتا۔

میں جب فیروز پور جیل میں نظر بند تھا اور سنٹرل اسمبلی میں میری گرفتاری اور نظر

بندی کے متعلق سوالات دریافت کیۓ گۓ تو ہوم ممبر نے ایڈیٹر ریاست کی گرفتاری کی وجوہ بیان کرتے ہوۓ جواب دیا تھا کہ ایڈیٹر ریاست چونکہ فطرتاً اور عادتاً انقلاب پسند ہے اس لۓ اس کو نظر بند کیا گیا ہے میرا خیال ہے کہ ہوم ممبر کا اسمبلی میں یہ جواب غالباً پولیس کی اس قسم کی بنیادوں پر ہی تھا کیونکہ پولیس کے لیے مبالغہ آمیزی اور ایک پیسہ کو ایک روپیہ میں بدل دینا تو بائیں ہاتھ کا کرتب ہے مگر میری رائے ہے اور شروع سے یہ رائے ہے کہ انارکزم ہندوستان کی آزادی کے لۓ مفید نہیں اگر انارکزم کی سپرٹ ملک میں پیدا ہوتی تو گورنمنٹ اس کو آسانی کے ساتھ کچل سکتی تھی بے ہتھیار لوگوں کے لۓ آزادی حاصل کرنے کا ذریعہ صرف ایک ہی ہے اور وہ ہے عدم تشدد جسے مہاتما گاندھی نے اختیار کیا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

طوائف کی ناقابل تبدیل فطرت

ریاست اودے پور میں ایک جاگیر ناتھ دوارہ ہے جس کے جاگیر دار مہنت دامودرداس تھے یہ مہنت عمر میں پینتیس برس کے ہوں گے شادی شدہ ایک جوان لڑکی اور چار پانچ برس کا ایک لڑکا جسے جاگیر کے ولی عہد ہونے کا حق حاصل تھا۔ان کی اولادیں تھیں ناتھ دوارہ کی اس جاگیر یا گدی کی سالانہ آمدنی پندرہ سولہ لاکھ روپیہ کی ہے۔اس کے علاوہ کروڑوں روپے کے زیورات اور جواہرات موجود ہیں جو معتقدین نے اس گدی کو نذر کئے اور ہر سال ہزارہا کی تعداد میں زائرین اس گدی اور گدی کے وارث مہنت صاحب کی زیارت کے لئے ناتھ دوارہ پہنچتے ہیں۔

کئی برس ہوئے ناتھ دوارہ میں سالانہ مذہبی اتسو (تقریب) تھا ہزارہا کی تعداد میں زائرین جمع ہوئے کاٹھیاواڑ اور بمبئی تک سے لوگ آئے۔مہنت دامودرداس جی نے اس اتسو پر ٹھاکر جی کے سامنے رقص کرنے کے لئے حسب دستور مختلف مقامات سے کچھ طوائفیں بھی بلائیں۔ان طوائفوں میں دہلی کی ایک مشہور طوائف ہنسا بھی تھی ہنسا کی عمر اس وقت چالیس پینتالیس برس کی ہو گی یعنی مہنت دامودرداس جی سے آٹھ دس سال بڑی تھی۔طوائفیں اپنے شباب کو قائم رکھنے کے اعتبار سے بہت محتاط ہوتی ہیں مگر دھوئیں کے باعث سیاہ ہو چکی دیوار پر سفیدی کے جتنے بھی کوٹ چاہو کرلو۔سیاہی کا بالکل چھپنا ممکن نہیں یہ سیاہی ضرور ظاہر ہو گی چاہے مٹیالے یا ہلکے سرخی نما رنگ میں ہی کیوں نہ ہو ہنسا کے کافی "میک اپ" کرنے کی صورت میں بھی اس کے چہرہ کی جھریاں اس کے بڑھاپے کی بدگوئی کرنے سے باز نہ آتی تھیں۔

مہنت دامودرداس بہت ہی مخلص اور سادہ وسیدھے شخص تھے بلکہ ان کی سادگی بے وقوفی کی حد تک پہنچ چکی تھی۔انہوں نے جب ہنسا بائی کو دیکھا تو ان کے دل پر ہنسا بائی کا کچھ اثر سا ہوا۔اس اثر کو ہنسا بائی نے محسوس کیا تو اس نے اپنے طوائفانہ ہتھیاروں کو استعمال کرتے ہوئے دامودرداس جی کو مزید بے وقوف بنایا نتیجہ یہ ہوا کہ

ہنسا بائی مستقل طور پر ناتھ دوارہ میں ہی رکھ لی گئیں۔

ہنسا بائی جب ناتھ دوارہ میں مقیم ہوئی تو اس پر لوگوں میں چرچا ہوا۔ مہنت پر بد چلنی کے الزامات لگنے شروع ہوئے اور مہارانا اودے پور نے بھی اعتراض کیا تو مہنت صاحب کے عشق میں اس مخالفت کے باعث اور اضافہ ہوتا چلا گیا۔ کیونکہ عشق ومحبت کے معاملہ میں انسانی فطرت ہے کہ جوں جوں مخالفت اور رسوائی ہو انسان اور زیادہ مضبوطی کے ساتھ قدم جماتا ہے اور عزت ووقار کی قربانی پر نازاں ہوتا ہے آخر جب اس مخالفت نے بہت ہی زور پکڑا تو مہنت صاحب ہنسا بائی کے ایماء سے دہلی تشریف لے آئے۔ یہاں آپ نے پرتھوی راج روڈ پر ایک کوٹھی کرایہ پر لی ہنسا سے شادی کر لی اور ہنسا کے پچھلے تمام دوست آشنا، ملنے والے، میراثی، سارنگئے اور اس کے رشتہ دار دامودرداس پر مکھیوں کی طرح گر پڑے۔ ناتھ دوارہ کے روپیہ کو لوٹنے کی وسیع سازش ہوئی مہنت صاحب دہلی پہنچنے سے پہلے آٹھ دس لاکھ کے قریب ہنسا اور ہنسا کے والدین کو دے چکے تھے یہاں پہنچنے کے بعد کوشش یہ تھی کہ ناتھ دوارہ کے ٹھاکر صاحب کے کپڑے بھی اتار کر ٹھاکر صاحب کی مورتی کو بالکل ننگا کر دیا جائے۔ چنانچہ اس سازش میں مقامی سناتن دھرم کے ایک لیڈر بھی شامل تھے جن کا کام یہ تھا کہ یہ مہنت داموردداس اور ہنسا سے روپیہ لے کر ان دونوں کے تعلقات کو مذہبی اعتبار سے جائز و باعث سعادت قرار دیں۔

داموردداس جی کے دہلی پہنچنے پر ان کے متعلق یہاں موافق ومخالف دو گروہ پیدا ہو گئے۔ ان دونوں گروہوں کا مقصد یہ تھا کہ مہنت سے روپیہ حاصل کیا جائے۔ ایک گروہ اس بات کا مدعی کہ مہنت صاحب نے اچھا کیا کہ ایک طوائف سے شادی کی اور آپ ایک طوائف کو راہ راست پر لانے والے ریفارمر ہیں۔ دوسرا گروہ اس بات کا دعویدار کہ مہنت صاحب بد چلن ہیں۔ انہوں نے ناتھ دوارہ کی گدی کو پلید کیا اور ان کو گدی سے علیحدہ کر کے ان کی تمام جائیداد اور آمدنی بحق پبلک یا بحق ریاست اودے

پور ضبط کر لی جائے ان دونوں فریقوں کے ساتھ بعض اخبارات بھی شامل تھے دامودر داس کے حمایتی اور مخالف حضرات میں کئی اصحاب ایڈیٹر ''ریاست'' کے بھی دوست تھے۔

جب یہ مخالفت زوروں پر تھی اور مہنت دامودر داس بہت پریشان تھے تو ایک دوست جو جوہری تھے میرے پاس تشریف لائے انہوں نے کہا کہ مہنت دامودرداس مجھ سے ملنا چاہتے ہیں میں نے پوچھا کہ کیا کام ہے تو انہوں نے بتایا کہ کچھ مشورہ لینا چاہتے ہیں یہ صاحب ایک دوست کا پیغام بھی لائے جو دہلی میں بہت با اثر اور ایک بہت معزز خاندان کے رکن تھے میں نے ان سے شام کو آنے کا وعدہ کیا میں شام کو چھ بجے کے قریب پرتھوی راج روڈ پر مہنت صاحب کی کوٹھی گیا۔ مہنت صاحب منتظر تھے ۔ بہت بڑی کوٹھی سامنے اور پچھلی طرف بہت وسیع صحن، درجنوں کمرے، مہنت صاحب مہنت صاحب کی پہلی بیوی، پہلی بیوی سے جوان لڑکی، چھوٹا بچہ، ہنسا بائی، ہنسا کی ماں، بہنیں، رشتہ دار، میراثی، سارنگئے، استاد جی اور ملازم ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کاٹھیاواڑ کے کوئی بڑے والئ ریاست اپنے تمام خاندان اور سٹاف کے ساتھ مقیم ہیں میں جب پہنچا تو مہنت صاحب مجھے اپنے کمرہ میں لے گئے اس کے بعد ہنسا بھائی بھی وہیں آ گئیں اور باتیں شروع ہوئیں مہنت صاحب نے لوگوں کی مخالفت کا گلہ کرتے ہوئے کہا:

''سردار صاحب! دیکھئے کیا میں نے برا کام کیا ہے جو ایک طوائف کی زندگی سدھار دی۔''

میں نے لوک لاج کی پروا نہ کرتے ہوئے ایک ایسی مثال قائم کی جس کی کسی بڑے سے بڑے ریفارمر سے بھی توقع نہیں کی جا سکتی تھی مگر لوگ میری مخالفت کر رہے ہیں آپ ہی بتائیے کہ کیا یہ مخالفت جائز ہے مجھے ہنسا بائی جی سے پریم تھا میں نے شادی کر لی اب میری جاگیر کو ضبط کرانے کی کوشش ہو رہی ہے میں نے آپ کی

اور آپ کے اخبار کی بہت تعریف سنی ہے اس لئے آپ کو تکلیف دی کہ آپ سے مشورہ کروں۔

میں اس کے متعلق کیا جواب دیتا میں نے یہی کہا کہ اگر آپ لوگوں کے درمیان فی الحقیقت محبت ہے اور یہ عارضی جذبات کا نتیجہ نہیں تو آپ نے شادی کر کے اچھا کیا۔ اور چاہے آپ کو گدی سے الگ ہونا پڑے۔ آپ کو اس پر قائم رہنا چاہئے اور اگر آپ نے عارضی جذبات سے مغلوب ہو کر ایسا کیا تو اسے اصلاح نہیں کہا جا سکتا۔ آپ اپنی گدی کو بھی رسوا کرنے کا باعث ہوئے۔ مہنت صاحب نے پھر زور دے کر کہا کہ اس شادی کا باعث خالص طور پر محبت ہے ایک گھنٹہ کے قریب باتیں ہوتی رہیں ار میں واپس آنے والا تھا تو ہنسا بائی باتیں کرنے کے لئے مجھے اپنے کمرے میں لے گئی یہ کمرہ مہنت صاحب کی پہلی بیوی سے بالکل ملحقہ تھا مگر اس کمرہ کی آواز اس کمرہ میں نہ جا سکتی تھی ہنسا نے جب باتیں شروع کیں تو اسی طوائفانہ انداز سے جو اس کی فطرت تھی جسم کے ہر حصہ کو حرکت دینا۔ بات بات میں مسکرانا، تکلف، نمائش حسن اور سیمابیت وغیرہ اس کی باتوں کا مطلب یہ تھا کہ میں اس کے فلاں دوست کا دوست ہوں اور اس کے فلاں ملنے والے سے میرے تعلقات ہیں اور یہ مظلوم ہے اور ہمدردی کی مستحق ہے وغیرہ جب ہنسا یہ باتیں کر رہی تھی تو میں نے اس کے ذہن کی کیفیت معلوم کرنے اور تمام حالات کی درست وصحیح پوزیشن سمجھنے کے لئے اس سے سوال کیا۔

''تم نے اب تک اس الو سے کتنا روپیہ حاصل کیا اور کیا یہ گدھا تمہارے پنجہ سے نکل تو نہ جائے گا۔''

میرے اس سوال کا جو جواب ہنسا نے دیا اس نے میر جسم کے رونگٹے کھڑے کر دیئے اور وہ الفاظ مجھے اب تک یاد ہیں اس نے کہا۔

''کیا آپ مجھے اتنی بے وقوف سمجھتے ہیں کہ میں اس حرام زادہ کو اپنے چنگل سے

نکلنے دوں گی اس کا خیال تک بھی نہ کیجئے۔"

مہنت داموورداس تو اپنے آپ کو ریفارمر سمجھ رہے ہیں لاکھوں روپیہ اور وہ عزت جو کروڑوں روپیہ صرف کرنے پر بھی نہ مل سکے۔ اس طوائف کی نذر کر دی۔ گدی سے اترنے والے ہیں اور جگہ جگہ سے آپ کے خلاف بدچلن اور عیاش ہونے کے فتوے دیئے گئے مگر آپ نے پرواہ نہ کی تا کہ آپ "عشق و محبت" کی لاج رکھ سکیں مگر ادھر ہنسا طوائف جس کے لئے آپ نے یہ سب کچھ کیا آپ کو بے وقوف سمجھ کر گندی گالیوں کا نشانہ بنا رہی ہے۔

ہنسا سے باتیں کر کے میں واپس اپنے دفتر چلا آیا۔ دفتر پہنچ کر میں نے مہنت صاحب کو ایک خط لکھا کہ آپ کے عشق اور بے وقوفی میں کوئی فرق نہیں میری رائے ہے کہ آپ اگر اپنی عزت کی پروا نہیں کرتے تو کم از کم اپنی پہلی بیوی اور جوان لڑکی کی عزت کی پروا ضرور کیجئے جو میراثیوں اور سارنگئے استادوں کی فضا میں ہیں اور اس عشق بازی کو چھوڑ کر واپس ناتھ دوارہ چلے جایئے۔ مہنت صاحب نے نہ تو میرے اس خط کا کوئی جواب دیا نہ غالباً کوئی پروا کی اور شاید یہ خط آپ نے ہنسا کو ہی دے دیا ہو۔ یہ معاملہ ان کا پرائیویٹ تھا اس میں کسی اخبار کو دخل دینے کا حق حاصل نہ تھا۔ اس کے متعلق ریاست میں لکھنا مناسب نہ سمجھا صرف ایک نوٹ شائع ہوا کہ ناتھ دوارہ کے انتظام کے لیے ذمہ دار اور دیانت دار اصحاب کی کمیٹی بنائی جانی چاہئے تا کہ یہ مذہبی وقف تباہ نہ ہو۔

اس واقعہ کے چند ماہ بعد ریاست اودے پور کے حکم سے مہنت صاحب کو ناتھ دوارہ سے روپیہ ملنا قطعی بند ہو گیا۔ مہنت صاحب کے لئے تنگ دستی کے دن آ گئے جو روپیہ تھا ختم ہو چکا جواہرات اور زیورات نصف اور چوتھائی قیمت پر جوہریوں کی دکانوں میں پہنچ گئے قرض خواہوں نے بار بار آنا شروع کیا مہنت صاحب بیمار ہو گئے اچھی طرح سے علاج بھی نہ ہوا بیماری کی حالت میں ہی اودے پور گئے وہاں آپ کا

انتقال ہو گیا اور آپ کے انتقال کے بعد ہنسا بائی یعنی مہنتی صاحبہ نمبر 2 اودے پور سے واپس دہلی تشریف لائیں اور دہلی سے واپس اپنے خاندانی اڈہ پر یعنی اپنے وطن الموڑہ چلی گئیں۔

اس واقعہ سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ طوائفیں لوگوں کو کیوں کر الو بناتی ہیں نا واقف لوگ اپنی بے وقوفی کو کیوں کر عشق و محبت قرار دیتے ہیں اور طوائفوں کے لیے چاہے لاکھوں روپیہ کی قربانی کی جائے ان کی نگاہوں میں قربانی کرنے والے احمق اور بے وقوف ہی رہتے ہیں۔

خواب وخیال

میرے والد کا جب انتقال ہوا تو میری عمر صرف چالیس روز کی تھی اور مجھ سے بڑے ایک بھائی اور دو بہنیں تھیں ہندوؤں یا سکھوں میں عورت کے لئے بیوہ ہونا بہت بڑی مصیبت ہے اور جس صورت میں کہ چھوٹے چھوٹے بچے یتیم رہ جائیں یہ مصیبت نا قابل برداشت حد تک تکلیف دہ ہوتی ہے میری والدہ اس غم کے باعث دن رات روتی رہتیں ایک روز میری والدہ نے خواب میں میرے والد کو دیکھا والد نے کہا کہ رویا نہ کرو میں حافظ آباد کے قریب موضع جویاں کے ٹھٹھ میں فلاں شخص کے گھر فلاں تاریخ کو پیدا ہوں گا۔ وہاں صرف دو ماہ رہوں گا پھر میری مکتی (نجات) ہو جائیگی جو سامان جہلم جہاں میرے والد ڈاکٹر تھے سے لایا گیا ہے اس سامان میں ایک بڑا بکس ہے اس بکس کے اندر ایک چھوٹی صندوقچی ہے اس صندوقچی کے خانہ میں سو روپیہ کا ایک نوٹ اور پندرہ روپیہ کی ایک رسید پڑی ہے یہ رسید لالہ جوتی رام کپور کو دے کر پندرہ روپیہ منگا لیجئے۔

میری والدہ نے اس خواب کا ذکر میری دادی سے کیا دادی بھی خواب سن کر رونے لگ گئیں انہوں نے دادا سے کہا دادا بہت عبادت گزار سکھ تھے اور خوابوں پر یقین نہ رکھتے تھے انہوں نے کہا کہ خواب ہر شخص کو ہر روز آتے ہیں ان کا خیال نہ کرنا چاہئے میری والدہ نے سامان میں سے لکڑی کے بکس کو کھولا اس میں سے صندوقچی نکالی والدہ کو اس صندوقچی کا کوئی علم نہ تھا کیونکہ سامان کو جہلم سے لانے کا انتظام میرے چچا سردار بھگوان سنگھ نے کیا تھا۔ اس صندوقچی کو کھولا تو اس کے خانہ میں ایک سو کا نوٹ اور پندرہ روپیہ کی ایک رسید موجود تھی میری والدہ نے میرے بھائی کے ہاتھ یہ رسید لالہ جوتی رام پور کو بھیجی تو لالہ جوتی رام کپور نے میرے بھائی کو اس رسید کے پندرہ روپے دے دیئے۔ یہ رسید "سراج الاخبار" (جو اس زمانہ میں جہلم سے نکلتا تھا) کے دفتر کی تھی لالہ جوتی رام اس اخبار کے خریدار تھے میری والدہ کو نہ تو اخبار کا علم تھا نہ رسید کا اور نہ اس صندوقچی

کا مگر خواب کے مطابق تمام واقعات درست نکلے میری والدہ نے میری دادی کی معرفت دادا سے کہلوایا کہ جویاں کے ٹھٹھہ جا کر معلوم کرنا چاہیے کہ فلاں شخص کے ہاں کوئی لڑکا پیدا ہوا یا نہیں میرے دادا نے جانے یا آدمی بھیجنے سے انکار کر دیا۔

کئی ماہ گزر گئے تو میرے دادا ایک مقدمہ کی پیشی کیلئے گوجرانوالہ گئے۔ اس زمانہ میں نہ ریل تھی نہ تانگے تھے۔ لوگ گھوڑوں پر جایا کرتے۔ دادا بھی گھوڑے پر گوجرانوالہ گئے اور تین چار روز حافظ آباد سے غیر حاضر رہے۔ ان کی غیر حاضری میں میری والدہ نے میری دادی اور میرے چچا کو ساتھ لیا اور یہ تینوں جویاں کے ٹھٹھہ (جو حافظ آباد کے قریب ہی ہے) گئے۔ وہاں اس شخص کے گھر پہنچے جس کا نام خواب میں بتایا گیا تھا۔ تو وہاں کی عورتوں نے بتایا کہ ہاں فلاں تاریخ کو لڑکا پیدا ہوا۔ جو دو ماہ زندہ رہ کر مر گیا۔ میری والدہ وغیرہ یہ سن کر واپس آ گئے اور خواب کا ہر حصہ درست ثابت ہوا۔

مجھے اچھی طرح سے یاد ہے میں مانسہ (ریاست پٹیالہ) میں تھا۔ والدہ بھی وہاں تھیں۔ والدہ نے ایک روز صبح کہا کہ پرمیشور خیر کرے رات کو میں نے گور دیوی (میری ماموں زاد بہن) کو بری حالت میں دیکھا ہے اس کے بال کھلے ہیں اور رو رہی ہیں میں نے پوچھا کیا ہوا تو گور دیوی نے کہا کہ وہ بیوی ہو گئی ہے۔

اس خواب کے بعد تیسرے روز گجرات (جہاں کی یہ لڑکی بیاہی ہوئی تھی) سے خط پہنچا کہ گور دیوی کا شوہر انتقال کر گیا ہے۔ چنانچہ اس خط کے پہنچتے ہی والدہ ماتم پرسی کے لئے حافظ آباد روانہ ہو گئیں۔

میں نابھ میں قید تھا۔ مہاراجہ کی گدی سے دست برداری کے بعد انگریزی ایڈمنسٹریشن نے مجھے وہاں گرفتار کر لیا تھا۔ میں وہاں غالباً اڑھائی ماہ رہا۔ والدہ چونکہ میری گرفتاری کے باعث بہت غمگین تھیں۔ میری بڑی بہن میری والدہ کو اپنے پاس لاہور لے آئیں تاکہ غم غلط ہو سکے۔ میں نابھ سے کوئی خط بھی نہ لکھ سکتا تھا نہ مجھے خط مل سکتا تھا۔ ایک روز دوپہر کے وقت میری والدہ کی آنکھ لگ گئی تو وہ دفعتاً جاگیں اور

انہوں نے میری بہن سے پوچھا کہ ''دیوان سنگھ آگیا ہے''میری بہن نے کہا نہیں ابھی تو نہیں آیا والدہ نے کہا کہ ابھی دیکھا کہ دیوان سنگھ اس مکان سے باہر گلی میں آوازیں دے رہا ہے۔میری بہن نے تسلی دی اور کہا کہ چونکہ آپ کا خیال ہر وقت دیوان سنگھ کی طرف ہے۔اس لئے خواب دیکھا۔چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ میں ٹھیک اسی روز اور اسی وقت جب کہ والدہ نے خواب دیکھا نابھ سے رہا کی اگیا۔اور میں رہا ہونے کے بعد نابھ سے سیدھا ڈیرہ دون مہاراجہ سے ملنے چلا گیا۔ایک روز وہاں رہا اور تیسرے روز لاہور پہنچ گیا۔

میرے والد کے ایک چھوٹے بھائی سردار گورکھ سنگھ کی بیوی یعنی میری چچی تھیں ان کا نام مہری تھا یہ بیچاری جوانی کے عالم میں ہی بیوہ ہوگئیں۔ان کے بطن سے ایک لڑکا تھا جو بچپن میں ہی انتقال کر گیا ان کے سوتیلے بیٹوں کے ساتھ تعلقات کشیدہ تھے۔اس لئے یہ بیچاری اپنی زندگی کے دن گزارنے کے لئے مستقل طور پر اپنے میکے چلی گئیں۔اور اپنے بھائی کے پاس چنیوٹ رہتی تھیں۔چند سال کا ذکر ہے ایک روز میں دوپہر کو کام کر رہا تھا کہ مجھے دفعتہً اس چچی کا خیال آیا اور اگر میں غلطی نہیں کرتا تو اس سے پانچ سات سال پہلے تک مجھے اس بیچاری کا کبھی خیال تک نہ آیا تھا کیونکہ کئی برس سے نہ ان کو دیکھنے کا اتفاق ہوا نہ کوئی خط ملا۔اور نہ کبھی کوئی اطلاع آئی۔دوپہر کو کام کرتے ہوئے خلاف توقع اس بیچاری کا خیال آیا۔اور اس خیال میں ہی تھا تو سوچنے لگا کہ یہ بیچاری کہتی ہوں گی کہ اس کے سسرال والوں میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جس نے کبھی یہ بھی پوچھا ہو کہ یہ زندہ ہے یا مر گئیں۔سوچتے سوچتے میں نے فیصلہ کیا۔کہ اس چچی کو دوسو روپیہ بھیج دوں۔کیونکہ غور کیا جائے تو میرے لیے یہ ایسی ہی قابل عزت ہیں جیسے میری والدہ میں نے چپراسی سے منی آرڈر فارم منگایا اور منی آرڈر فارم لکھنے لگا تو خیال آیا کہ شاید وہ آجکل چنیوٹ نہ ہوں کسی اور جگہ ہوں اور پتہ درست بھی معلوم نہیں۔کیونکہ صرف اتنا یاد تھا کہ ان کے بھائی کا نام لالہ ہری چند کپور تھا۔اور یہ

کئی برس ہوئے چنیوٹ میں بزازی کی دکان کرتے تھے میں نے مناسب سمجھا کہ پہلے خط لکھ کر پتہ دریافت کر لینا چاہئے پھر منی آرڈر بھیجا جائے۔ چنانچہ میں نے لالہ ہری چند کپور بزاز چنیوٹ کے پتہ پر خط لکھا کہ چچی صاحبہ کہاں ہیں۔ ان کا پتہ کیا ہے؟ میں ان کو کچھ روپیہ بھیجنا چاہتا ہوں۔ اس خط کے لکھنے کے چھ سات روز بعد میرے پاس جواب پہنچا جس میں لکھا تھا کہ چچی ٹھیک اس روز اور اس وقت انتقال کر گئیں جس روز کہ میں منی آرڈر لکھنا چاہتا تھا اور میں نے چنیوٹ خط لکھا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اتنے برس کے بعد عین اس روز اور اس وقت اس چچی کا خیال کیوں آیا اور روحانیت کے ماہر اس کی وجہ کیا بیان کریں گے مگر میرا خیال ہے کہ شاید مرتے ہوئے اس بیچاری کو اپنے سسرال کے لوگوں کا بھی خیال آیا ہو اور ان لوگوں میں سے اس نے مجھے بھی یاد کیا ہو جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس یاد کا میرے ذہن پر بھی اثر ہوا۔

یہ چند واقعات خواب اور خیال کے متعلق ہیں جن کا ذاتی تجربہ ہوا۔ ان کے علاوہ میں نے جب کبھی خواب میں سانپ دیکھا تو چند روز کے بعد ہی دشمن کا مقابلہ کرنا پڑا اور اگر میں نے خواب میں سانپ کو ہلاک کر دیا تو دشمن کو شکست دی۔ اور سانپ بھاگ گیا۔ یا خواب میں سانپ نے مجھے کاٹ لیا تو دشمن نے مجھے نقصان پہنچایا۔ مجھے جب بھی کوئی تکلیف ہونے والی ہو۔ میرے خلاف کوئی سازش کی جا رہی ہو۔ دشمن مجھے نقصان پہنچانے کے لئے سوچ رہا ہو۔ یا میرے کسی عزیز دوست کو تکلیف ہو تو میں اپنے قلب پر ایک ناقابل بیان سا اثر محسوس کرتا ہوں جسے ڈیپریشن یا گھبراہٹ ہی کہنا چاہئے چنانچہ میں کہہ دیا کرتا ہوں کہ کوئی نئی مصیبت پیش آنے والی ہے اور میرا اندازہ ہمیشہ ہی درست ثابت ہوتا ہے۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ قبل از وقت محسوس کرنے یا خوابوں کے بعد میں درست ثابت ہونے کی اصلی وجہ کیا ہے اور اس میں روح کو دخل ہے یا نہیں۔ بہر حال میں اس کا ضرور قائل ہوں کہ کوئی ایسا ذریعہ ضرور موجود ہے جس کے باعث ہمارا ایک دوسرے کے ساتھ تعلق ہے اور پیش آنے والے واقعات کا جس کے باعث پہلے سے احساس ہو جاتا ہے۔

والیان ریاست کا انتقام اور ریاستی عدالتیں

مرحوم مہاراجہ گورچرن سنگھ آف نابھ (موجودہ مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے والد جو معزول و جلاوطن ہوئے اور جنہوں نے کوڈائی کنال (مدراس) میں چند سال ہوئے انتقال کیا) میں بہت سی خوبیاں اور بہت سی کمزوریاں تھیں۔ آپ بہت وطن پرست، برطانیہ کے سخت دشمن، علم دوست اور کٹ مرنے مگر پیچھے نہ ہٹنے والی شخصیت تھے اور کمزوریوں کے اعتبار سے ان میں بھی وہ تمام نقائص تھے جو والیان ریاست میں پائے جاتے تھے۔ چنانچہ آپ کی طبیعت میں انتقام کے جذبات بھی انتہائی صورت میں تھے اور آپ دشمن کو کبھی معاف نہ کرتے۔

جب آپ ابھی ولی عہد ہی تھے تو آپ کے پرائیویٹ سیکرٹری نابھ کے ایک رئیس سردار جنرل شیو دیو سنگھ مقرر ہوئے (جو پانچ چھ سال نابھ کے وزیراعظم رہے اور پٹیالہ یونین کے ایک منسٹر بھی تھے) جو مہاراجہ کے ولی عہدی کے زمانہ میں مہاراجہ کے ساتھ انگلستان بھی گئے۔ چنانچہ مہاراجہ نابھ اور ان جنرل سردار شیو دیو سنگھ کے تعلقات کی کشیدگی کی ابتداء انگلستان میں ہی ہوئی۔ جب کہ مہاراجہ آپ پر ناراض ہو گئے اور آپ کو واپس ہندوستان بھیج دیا گیا۔

مہاراجہ ہیرا سنگھ کا انتقال ہوا اور مہاراجہ گورچرن سنگھ گدی پر بیٹھے تو سردار شیو دیو سنگھ ملازمت سے علیحدہ کر دیئے گئے۔ مگر مہاراجہ کے انتقام کے جذبات بدستور مشتعل تھے۔ کچھ عرصہ کے بعد سردار شیو دیو سنگھ کے سوتیلے بھائی سردار جنگ سنگھ کی لڑکی کا دفعتہ انتقال ہو گیا۔ سردار جنگ سنگھ کو یہ شبہ ہوا یا اس نے مہاراجہ کے کہنے سے سردار شیو دیو سنگھ پر یہ غلط الزام لگایا۔ کہ اس لڑکی کے انتقال کی وجہ زہر دیا جانا تھا اور جائیداد کے جھگڑوں کے باعث سردار شیو دیو سنگھ نے ہی اس لڑکی کو زہر دلوایا۔ سردار جنگ سنگھ کا سردار شیو دیو سنگھ پر لگایا گیا یہ الزام مہاراجہ کے ہاتھوں میں انتقام لینے کے لئے نیا ہتھیار آ گیا۔ سردار شیو دیو سنگھ کو قتل کے الزام میں گرفتار کیا گیا۔ یو پی کے ایک ریٹائرڈ

سیشن جج پنڈت پتمبر جوشی کو اس مقدمہ کی سماعت کے لئے مقرر کیا گیا عدالت میں شہادتیں گزریں اور سردار شیو دیو سنگھ سردار جنگ سنگھ کی لڑکی کو زہر دینے اور ہلاک کرنے کے جرم میں عمر قید کر دیئے گئے۔

سردار شیو دیو سنگھ جب جیل میں بھیج دیئے گئے تو انہوں نے اس سے پہلے اور جیل جانے کے بعد بھی پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ گورنمنٹ ہند کے پاس مہاراجہ کے خلاف شکایتیں لکھ کر بھیجیں۔ مہاراجہ نے پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ گورنمنٹ ہند سے خبریں حاصل کرنے کے لئے ڈیپارٹمنٹ کے کلرکوں سے انتظام کر رکھا تھا اور ان کلرکوں کو اس کام کے لئے کافی روپیہ دیا جاتا تھا مہاراجہ کو ان کلرکوں کے ذریعہ علم ہوا کہ سردار شیو دیو سنگھ پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے پاس مہاراجہ کے خلاف شکایتیں لکھ کر بھیجتے ہیں چنانچہ یہ اطلاع سن کر مہاراجہ کے انتقام کی سپرٹ میں اور اضافہ ہوا اور مہاراجہ نے یہ فیصلہ کیا کہ سردار شیو دیو سنگھ کو مزید اذیتیں دی جائیں۔

سردار شیو دیو سنگھ کو ذہنی اذیت دینے کے لئے مہاراجہ نے اپنے دو نفروں (ریاستوں میں نفر مہاراجہ کے ان ملازموں کو کہتے ہیں جو مہاراجہ کے ذاتی کام مثلاً کھانا کھلانا، کپڑے بدلوانا، غسل کرانا وغیرہ خدمت انجام دیں) بیر سنگھ اور ایک دوسرے شخص کو مقرر کیا۔ کہ کسی نہ کسی طریقہ سے سردار شیو دیو سنگھ کی بیوی کو جو بھدوڑ (ریاست پٹیالہ) کی رہنے والی تھیں اور مہاراجہ پٹیالہ کے قریبی رشتہ داروں میں سے تھیں۔ نابھ لایا جائے تاکہ وہ اپنے شوہر کے خلاف ہو اور اسے اس کے شوہر کے خلاف بطور ٹول استعمال کیا جائے۔

سردار شیو دیو سنگھ کی بیوی بہت نیک خاتون تھیں اور اس خاتون کے والد سردار نانک سنگھ مرحوم رئیس اعظم بھدوڑ بھی غیر معمولی طور پر نیک شخصیت تھے۔ یہ بیچاری اپنے شوہر کے جیل جانے کے بعد اپنے میکے یعنی بھدوڑ آ گئی تھیں اور وہاں ہی مستقل طور پر مقیم تھیں۔ بیر سنگھ نفر اور اس کا ساتھی دونوں بھدوڑ پہنچے۔ اور انہوں نے اس

خاتون کو بہت لالچ دیئے کہ یہ نابھ چلے مگر اس خاتون نے جانے سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد بیر سنگھ اور اس کا ساتھی برنالہ جو بھڈور سے پانچ چھ میل کے فاصلہ پر ہے اور بھڈور کا ریلوے سٹیشن تھانہ بھی ہے کے تھانیدار عبدالعزیز کے پاس پہنچے اور خواہش ظاہر کی کہ اگر یہ سب انسپکٹر سردارنی شیو دیو سنگھ کے خلاف کوئی جھوٹا مقدمہ قائم کرے تو اس کو دس ہزار روپیہ معاوضہ دیا جائے گا۔ اس جھوٹے مقدمے کا مقصد یہ تھا کہ مقدمہ کے خوف سے سردارنی شیو دیو سنگھ نابھ چلی جائے گی ایک سب انسپکٹر پولیس کے لئے دس ہزار روپیہ کا لالچ کم نہ تھا اور پولیس کے لوگ جھوٹے مقدمے بنانے کے اعتبار سے کافی سنگدل ہوتے ہیں مگر چونکہ سردارنی شیو دیو سنگھ مہاراجہ پٹیالہ کی قریبی رشتہ دار تھیں اور عبدالعزیز ریاست پٹیالہ کے ملازم تھے اس لئے عبدالعزیز کو یہ حوصلہ نہ ہوا۔ کہ وہ رشوت لے کر سردارنی شیو دیو سنگھ پر جھوٹا مقدمہ قائم کرے۔

اس واقعہ کو دو تین ماہ گزر گئے اور بیر سنگھ وغیرہ دوسری کوششوں میں مصروف رہے مگر ان کو کامیابی نہ ہوئی اس کے بعد یہ لوگ کک اینڈ کیلوے کمپنی (یہ انگریزی کمپنی جواہرات زیورات اور قیمتی گھڑیوں وغیرہ کا بزنس کرتی تھی اور اس کا زیادہ کاروبار ریاستوں میں تھا) کے ہاں گئے اور کہا کہ بھدوڑ کے رئیس اعظم سردار نانک سنگھ مرحوم کی چھوٹی لڑکی کی شادی ہے اور اس شادی کے لیے زیورات وغیرہ سامان چاہئے کک اینڈ کیلوے کے مینجر نے جیسا کہ وہ عام طور پر کرتے تھے۔ اپنے ایک کلرک کو چالیس پچاس ہزار روپیہ کا سامان دے کر بیر سنگھ اور اس کے ساتھی کے ساتھ بھدوڑ بھیج دیا۔

یہ لوگ اس بابو کو بھدوڑ لے گئے۔ وہاں انہوں نے پہلے سے ایک مکان کرایہ پر لے رکھا تھا وہاں بابو کو ٹھہرایا۔ بہت خاطر تواضع کی۔ دو دن کے بعد انہوں نے سردار نانک سنگھ کا مکان گلی میں سے دکھایا اور کہا کہ یہ مکان سردارنی نانک سنگھ کا ہے سردارنی صاحبہ کے ہاں اس وقت بہت سے مہمان آئے ہوئے ہیں اور ان کو فرصت نہیں۔

سردارنی صاحبہ نے آپ کے کرایہ وغیرہ کے لئے ایک سو روپیہ دیا ہے۔ آپ واپس چلے جائیے جب پھر آپ کو تار دیا جائے تو آپ تشریف لائیے اور زیادہ سامان لائیے کیونکہ سامان کافی خریدا جائے گا بابو صاحب کو ایک سو روپیہ کرایہ کے طور پر مل گیا وہ واپس چلے گئے دس روز کے بعد کک اینڈ کیلوے کے پاس تار پہنچا کہ بابو کو پھر بھیجئے۔ کک اینڈ کیلوے نے اپنے بابو کے ہاتھ ایک لاکھ روپیہ سے زیادہ قیمت کا مال پھر روانہ کیا۔ بابو جی برنالہ کے ریلوے اسٹیشن پر اترے تو ریلوے سٹیشن پر بیر سنگھ اور اس کا ساتھی دو اونٹ لے کر موجود تھے گرمیوں کا زمانہ تھا چند گھنٹے یہ ریلوے سٹیشن پر ٹھہرے جب شام ہو گئی تو یہ اونٹوں پر روانہ ہوئے اونٹ جب برنالہ اور بھدوڑ کے درمیان جنگل میں پہنچے تو اونٹ بٹھا دیئے گئے بیر سنگھ اور اس کے ساتھی نے بابو جی کو رسیوں کے ساتھ ایک درخت کے ساتھ باندھ دیا اور زیورات والا بکس لے کر یہ دونوں اونٹوں پر نابھ روانہ ہو گئے۔ بابو جی کو جب درخت کے ساتھ بندھے ہوئے دو تین گھنٹے ہو گئے اور قریب سے کچھ لوگ گزرے تو بابو نے زور سے آوازیں دیں اور ان لوگوں نے آ کر بابو جی کی رسیاں کھولیں۔

بابو جی پیدل واپس برنالہ پہنچے ریلوے سٹیشن سے انہوں نے اپنے مالکان یعنی کک اینڈ کیلوے کو تار دیا کہ ڈاکہ پڑا ہے اور سامان لوٹ لیا گیا ہے۔ کک اینڈ کیلوے نے ایجنٹ گورنر جنرل ریاست ہائے پنجاب (اس زمانہ میں کرنل منچن اے جی جی تھے) کو تار دیا اور ایجنٹ گورنر جنرل نے ریاست پٹیالہ کو تار بھیجا چنانچہ دوسرے تیسرے روز پنجاب اور پٹیالہ دونوں جگہ کی پولیس تجربہ کار افسروں کے ساتھ تحقیقات کے لئے برنالہ پہنچ گئی بابو کے نشان دینے پر پولیس بھدوڑ سردارنی نانک سنگھ کے مکان پر پہنچی۔ ان خواتین نے بالکل لاعلمی کا اظہار کیا کیونکہ نہ تو ان بچاریوں کے ہاں کوئی شادی تھی اور نہ زیور خریدنے کا سوال تھا اور ان کو علم تک نہیں کہ ڈاکو کون تھے اور ڈاکہ کیوں پڑا۔

جب پولیس کو چار پانچ روز تحقیقات کرتے گزر گئے اور کوئی پتہ نہ چل سکا تو سب انسپکٹر عبدالعزیز کو خیال آیا کہ یہ کارروائی غالباً نابھ کے ان دو اشخاص کی ہے جو اسے دس ہزار روپیہ رشوت دے کر سردارنی شیو دیو سنگھ کے خلاف جھوٹا مقدمہ قائم کرانا چاہتے تھے اس نے ان لوگوں کی ملاقات وغیرہ کے تمام کے تمام حالات اور رشوت پیش کرنے کا واقعہ ایک خط کے ذریعہ سر دیا کشن کول وزیر اعظم پٹیالہ کو بھیجا۔ سر دیا کشن نے جب یہ خط دیکھا تو آپ نے عبدالعزیز کو تار دیا کہ فوراً پٹیالہ پہنچو۔ آپ نے عبدالعزیز سے تمام حالات سنے تو عبدالعزیز کو ترقی دے کر انسپکٹر پولیس بنا دیا گیا۔ اور صرف اس مقدمہ کی تحقیقات کے لئے سپیشل ڈیوٹی پر مقرر کیا۔

عبدالعزیز انسپکٹر ہونے کے بعد تحقیقات کے لئے نابھ پہنچا۔ اس کو ان دونوں ملزموں کا نام تک معلوم نہ تھا۔ ہاں یہ ان کو پہچان سکتا تھا۔ یہ منصوری (جہاں کہ مہاراجہ نابھ مقیم تھے) گیا تا کہ مہاراجہ کے ملازموں میں سے یہ ملزموں کو پہچان سکے مگر اس کو کامیابی نہ ہوئی۔ اس کے بعد یہ کئی روز تک نابھ میں چکر لگاتا رہا۔ مگر اسے کچھ پتہ نہ چل سکا۔ کیونکہ جب مہاراجہ نابھ کو ڈاکہ کا علم ہوا اور یہ پتہ چلا کہ پنجاب و پٹیالہ کی پولیس تحقیقات کر رہی ہے تو آپ نے ملزموں کی رہائش کا انتظام نابھ کے شاہی محلات ''پکا باغ'' کے اندر کر دیا تھا جہاں کوئی شخص نہ آ سکتا تھا نہ جا سکتا تھا۔

عبدالعزیز جب نابھ میں کئی روز پھرتا رہا اور اس نے مختلف جگہوں پر مختلف لوگوں کے فوٹو دیکھے تو وہ بیر سنگھ کا فوٹو ایک جگہ دیکھنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے فوٹو کے متعلق پوچھا تو معلوم ہوا کہ یہ مہاراجہ کے نفر بیر سنگھ کا ہے۔ یعنی اس فوٹو کے ذریعہ یہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ ڈاکہ ڈالنے والوں میں سے ایک شخص بیر سنگھ نفر ہے اب بیر سنگھ نفر کی تلاش جاری ہوئی مگر کامیابی نہ ہو سکی۔ کیونکہ بیر سنگھ تو شاہی محلات میں رکھا ہوا تھا۔

نابھ پولیس عبدالعزیز کی مصروفیات کی نگرانی کر رہی تھی مگر اس کے پاس عبدالعزیز کو نابھ سے نکالنے کا کوئی ذریعہ نہ تھا کیونکہ عبدالعزیز مقدمہ کی تحقیقات کے

لئے آئے ہوئے تھے اور ان کے پاس ملزموں کی گرفتاری کے لیے ایجنٹ گورنر جنرل ریاست ہائے پنجاب اور پٹیالہ فارن منسٹر دونوں کے دستخطی وارنٹ گرفتاری موجود تھے آخر نابھ پولیس نے عبدالعزیز کو پھنسانے کے لئے ایک سازش کی نابھ کے ایک سب انسپکٹر پولیس دولت سنگھ (یہ صاحب غالباً بعد میں ریاست نالہ گڑھ میں انسپکٹر یا سپرنٹنڈنٹ پولیس تھے) عبدالعزیز کے پاس گئے اور کہا کہ اگر عبدالعزیز پٹیالہ سے دولت سنگھ کو کافی روپیہ دلوا دیں اور یہ وعدہ کریں کہ پٹیالہ میں اچھی ملازمت بھی دیں گے تو دولت سنگھ بیر سنگھ کو گرفتار کرا دے گا۔ عبدالعزیز اس سازش کا شکار ہوئے آپ نے دولت سنگھ کو دو ہزار روپیہ بطور ایڈوانس دے دیا۔ تین ہزار روپیہ بیر سنگھ کی گرفتاری کے بعد دینے کا فیصلہ ہوا۔ اور یہ وعدہ بھی ہوا کہ گرفتاری کے بعد دولت سنگھ کو پٹیالہ میں انسپکٹر پولیس بنا دیا جائے گا۔ یہ فیصلہ ہونے کے تیسرے چوتھے روز دولت سنگھ عبدالعزیز کے پاس آئے اور کہا کہ ابھی چلئے بیر سنگھ ایک مکان کے اندر اس وقت موجود ہے اسے گرفتار کر لو۔ عبدالعزیز دولت سنگھ کے ساتھ ایک نیم طوائف (جو پرائیویٹ طور پر پیشہ کرتی تھی کیونکہ نابھ میں کسی طوائف کو پیشہ کرنے کی قانوناً اجازت نہ تھی) کے مکان پر گئے اور دولت سنگھ نے گلی میں سے مکان کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ اس مکان کے اندر بیر سنگھ موجود ہے گرفتار کر لو اور یہ کہتے ہوئے کہ دولت سنگھ کی مخبری کا کسی کو پتہ نہ چلے دولت سنگھ مکان دکھا کر چلا گیا۔ عبدالعزیز کی جیب میں اس وقت ایجنٹ گورنر جنرل ریاست ہائے پنجاب اور فارن منسٹر پٹیالہ کے دستخطی وارنٹ اور ایک ہتھکڑی تھی۔

اس نیم طوائف کا نام خیران تھا اور یہ نابھ پولیس کے ہاتھوں میں ٹول تھی۔ عبدالعزیز جب بر سنگھ کو گرفتار کرنے کے لیے خیران کے مکان کے اندر پہنچے تو نابھ پولیس کی سکیم کے مطابق عبدالعزیز کے اندر پہنچتے ہی خیران نے عبدالعزیز کو گریبان سے پکڑ لیا اور جوتے مارتی مارتی ان کو گھر سے باہر گلی میں لے آئی۔ گلی میں شور سن کر

پڑوس کے لوگ جمع ہو گئے۔لوگوں نے خیراں سے پوچھا کہ کیابات ہے خیراں نے کہا کہ یہ کوئی بدمعاش ہے جو زنا بالجبر کی نیت سے مکان کے اندر گھس آیا ایسے موقع پر پبلک سائیکالوجی کے اعتبار سے ہر شخص کی ہمدردی عورت کے ساتھ ہونا ضروری ہے خیران کی کفش کاری کے ساتھ ساتھ عام لوگوں نے بھی عبدالعزیز کو جوتے مارنے شروع کیے کوئی کہتا ''بدمعاش تو اس گلی میں آیا کیوں'' کوئی کہتا ''کیا تمہارے گھر میں بہن بیٹی نہیں''۔۔۔۔تم کو جیل خانہ میں بھجوانا چاہئے۔۔۔کتنی جرأت ہے دن کے وقت عورت کے گھر میں چلے جانا وغیرہ۔

نابھ پولیس نے تمام انتظام کر رکھا تھا۔جب بیچارے عبدالعزیز کو پیٹا جا رہا تھا تو قریب ہی سے پولیس آ گئی۔اس نے عبدالعزیز کو گرفتار کر لیا۔عدالت میں زیر جرم زنا بالجبر چالان ہوا۔شہادتیں گزریں اور مجسٹریٹ نے عبدالعزیز صاحب کو تین سال قید سخت کی سزا دی اور عبدالعزیز صاحب اس وقت جیل سے رہا ہوئے۔جب کہ مہاراجہ نابھ کی گدی سے دست برداری کے بعد انگریزوں نے نابھ ایڈمنسٹریشن پر قبضہ کیا۔

اس واقعہ کے بعد بیر سنگھ بڑودہ میں گرفتار ہوا۔اس گرفتاری کے حالات بہت دلچسپ ہیں اور کسی دوسری جگہ درج ہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆

ریاستوں کے جرائم

مہاراجہ نابھ کا نفر بیر سنگھ بھدوڑ کے قریب کک اینڈ کیلوے کے سامان پر ڈاکہ ڈالنے کے بعد نابھ کے سرکاری محلات میں رکھا گیا اور جب مہاراجہ اور کرنل منچن ایجنٹ گورنر جنرل ریاست ہائے پنجاب کے درمیان مہاراجہ کی گدی سے دست برداری کے متعلق خط و کتابت ہورہی تھی اور مہاراجہ کو یہ یقین ہوگیا۔ کہ آپ گدی سے علیحدہ کردیئے جائیں گے۔ تو سوال یہ پیدا ہوا کہ بیر سنگھ کے مسئلہ کا حل کیا ہو۔ کیونکہ بیر سنگھ گرفتار ہوتا ہے تو کک اینڈ کیلوے کے ڈاکہ کے متعلق اقراری بیان دے دیگا اور اس مقدمہ میں بھی مہاراجہ کا تعلق ثابت ہوگا اور اگر یہ گرفتار نہ ہوا تو اسے کہاں بھیجا جائے جہاں کہ یہ اپنی زندگی پوشیدہ طور پر بسر کرسکے۔ چنانچہ سوچنے کے بعد مہاراجہ نے اس کو پانچ سو روپیہ اخراجات کے لئے دیا اور کہا کہ یہ کسی دوسری ریاست میں چلا جائے۔ جہاں کہ یہ گرفتار نہ ہوسکے۔ اس کو موٹر میں بٹھا کر گوبند گڑھ ریلوے سٹیشن جو ریاست نابھ کی حدود میں تھا پر چھوڑا گیا جہاں سے یہ اپنے ماموں کے ساتھ بڑودہ پہنچ گیا۔ بڑودہ پہنچے ہوئے اس کو چند روز ہی ہوئے تھے کہ اس کے پاس روپیہ ختم ہوگیا۔ کیونکہ انسان اگر پردیس میں پوشیدہ طور پر رہنا چاہے تو اسے ایک روپیہ کی جگہ چار روپے صرف کرنے پڑتے ہیں اس نے اپنے ماموں کو مہاراجہ کے پاس پھر واپس نابھ بھیجا تا کہ یہ مہاراجہ سے اخراجات کے لئے مزید روپیہ لا سکے۔ اس وقت تک نہ تو برطانوی پولیس میں سے کسی شخص کو علم تھا کہ بیر سنگھ کہاں ہے نہ پٹیالہ کی پولیس کو۔ بیر سنگھ کا ماموں جب بڑودہ سے واپس نابھ پہنچا اور مہاراجہ سے روپیہ حاصل کرنے کے لیے ملا تو ان لوگوں کو اس شخص کی حرکات پر شبہ ہوا جو مہاراجہ پٹیالہ کے مخبر نابھ کے محلات میں تھے۔ ان لوگوں میں سے کسی نے مہاراجہ پٹیالہ کو اطلاع دی کہ بیر سنگھ کا ماموں نابھ میں ہے اور مہاراجہ سے ملا ہے۔ پٹیالہ والوں نے اس کی اطلاع برطانوی پولیس کے لوگوں کو دی جو پٹیالہ میں تھے۔ چنانچہ برطانوی پولیس کی سی آئی ڈی کے

لوگ نابھ میں بیر سنگھ کے ماموں کی نگرانی پر لگا دیئے گئے۔ بیر سنگھ کا ماموں روپیہ کے لیے چار پانچ روز نابھ میں رہا۔ اس کے بعد یہ روپیہ لے کر بڑودہ کو روانہ ہوا تو سی آئی ڈی کے لوگ بھی اس کے ساتھ تھے مگر اس کو ان کا کچھ علم نہ تھا۔

بیر سنگھ بڑودہ میں اپنے ماموں کے انتظار میں تھا اور جب اس کے ماموں کو بڑودہ سے گئے ہوئے کئی روز ہو گئے تو اس نے بےصبری کے عالم میں فرنٹیر میل کے وقت ریلوے سٹیشن پر بھی آنا شروع کر دیا۔ تاکہ یہ دیکھ سکے کہ اس کا ماماں آیا ہے یا نہیں جس روز اس کا ماموں بڑودہ سٹیشن پر فرنٹیر میل سے اترا۔ تو بیر سنگھ اس وقت بھی اپنے ماموں کے انتظار میں بڑودہ ریلوے سٹیشن کے پلیٹ فارم پر موجود تھا۔ اس کا ماموں گاڑی سے اترا اور بیر سنگھ سے ملا تو سی آئی ڈی کے ان لوگوں نے جو نابھ سے ساتھ آئے تھے۔ بیر سنگھ کو ریلوے کے پلیٹ فارم پر ہی گرفتار کر لیا اور اسے پٹیالہ لایا گیا تاکہ اس پر ڈاکے کا مقدمہ چلایا جائے۔ پٹیالہ پہنچ کر بیر سنگھ نے من وعن تمام حالات بتا دیئے اور مہاراجہ نابھ کے خلاف وہ بیان دے دیا جس کی برطانوی اور پٹیالہ پولیس کو ضرورت تھی بیر سنگھ پر مقدمہ چلا اور اس مقدمہ میں بیر سنگھ کو دس سال قید سخت کی سزا ہوئی۔

بیر سنگھ کا قصہ یہاں ہی ختم نہیں ہو جاتا ڈاکہ کے اس واقعہ سے ایک عرصہ پہلے بیر سنگھ بمبئی گیا تھا وہاں اس نے کسی دوسرے شخص کے ساتھ دھوکہ کیا تو اس شخص نے بیر سنگھ کے خلاف پولیس میں زیر دفعہ 420 کے مقدمہ میں پھر نئی زندگی پیدا کی اور چیف پریذیڈنسی مجسٹریٹ کی عدالت سے بیر سنگھ کو بمبئی بھیجے جانے کے وارنٹ حاصل کیے۔ بمبئی پولیس یہ وارنٹ لے کر پٹیالہ پہنچی پٹیالہ کے فارن منسٹر نے حسب قاعدہ حکم دیا کہ بمبئی کے مقدمہ کی کارروائی کے لیے بیر سنگھ کو بمبئی پولیس کے حوالے کر دیا جائے۔ یہ کاغذات پٹیالہ پولیس کے پاس گئے اور پٹیالہ پولیس نے بیر سنگھ کو پٹیالہ جیل سے حاصل کر کے بمبئی پولیس کے سپاہیوں کے حوالے کر دیا۔ مگر پٹیالہ پولیس کی حماقت سمجھے یا بیر سنگھ کی خوش نصیبی کہ جب بیر سنگھ کو بمبئی پولیس کے حوالے کیا گیا تو پٹیالہ

پولیس کا غذات حوالگی میں یہ لکھنا بھول گئی کہ ملزم دس برس کے لیے پٹیالہ میں قید کاٹ رہا ہے۔ بمبئی کے مقدمہ سے فارغ ہونے کے بعد اس کو قید کے ایام کاٹنے کے لئے واپس پٹیالہ بھیجا جائے۔

بمبئی کی پولیس بیر سنگھ کو لے کر بمبئی پہنچی۔ بیر سنگھ کو لے جانے والے کانسٹیبلوں نے اس کو بمبئی جیل کے حوالہ کیا۔ دو تین روز کے بعد اس کی پیشی چیف پریزیڈنسی مجسٹریٹ کی عدالت میں ہوئی۔ چیف پریزیڈنسی مجسٹریٹ نے مثل دیکھی اور پوچھا کیا جرم ہے تو ملزم اور سرکاری وکیل نے بتایا کہ 420 یعنی دھوکا۔۔۔۔ 420 کا جرم تعزیرات ہند کے مطابق قابل ضمانت ہے چیف پریزیڈنسی مجسٹریٹ نے حکم دیا کہ ملزم پانچ سو روپیہ کی ضمانت پر رہا کر دیا جائے۔ یہ حکم بیر سنگھ کی قسمت میں نئے باب کے اضافے کا باعث ہوا۔ اس نے بمبئی کے اپنے ایک پرانے دوست سے پانچ سو روپیہ کی ضمانت کے لیے کہا اس دوست نے پانچ سو روپیہ کی ضمانت دے دی اور بیر سنگھ جیل سے رہا کر دیا گیا۔ اس کے بعد اب تک بیر سنگھ کا نہ تو برطانوی پولیس کو کوئی سراغ لگ سکا نہ پٹیالہ کی پولیس کو اور بیر سنگھ مفرور ہے۔

کئی برس کی بات ہے مرحوم مہاراجہ نابھ زندہ تھے اور ایڈیٹر ''ریاست'' بھی ان کے پاس منصوری میں مقیم تھا۔ میں بازار میں سیر کے لئے گیا تو ایک شخص مجھ سے ملا۔ اس نے مہاراجہ کے نام ایک لفافہ دیا۔ اور کہا کہ وہ اگلے روز شام کو اسی مقام پر جواب کا انتظار کرے گا۔ مہاراجہ سے جواب لا دیا جائے۔ میں نے بیر سنگھ کو کبھی دیکھا نہ تھا نہ مجھے شبہ ہوا کہ یہ بیر سنگھ ہے اور نہ میں نے اس سے دریافت کرنے کی ضرورت سمجھی کہ یہ کون ہے۔ کیونکہ میں دوسروں کے معاملات میں بہت کم دخل دیا کرتا ہوں۔ میں نے یہ خط مہاراجہ کو دیا تو انہوں نے مجھے بتایا کہ یہ خط بیر سنگھ کا ہے اور منصوری میں ہے اور ملنا چاہتا ہے۔ مہاراجہ نے بیر سنگھ سے ملنے سے انکار کر دیا اور زبانی کہلوایا کہ وہ منصوری سے چلا جائے اور کبھی یہاں نہ آئے مہاراجہ اس سے ملنا نہیں چاہتے اگلے

روز میں نے بیر سنگھ کا یہی جواب دے دیا مجھے علم نہیں کہ اس کے بعد بیر سنگھ کہاں گیا وہ کہاں ہے اور اس کا کیا حشر ہوا۔

بیر سنگھ کے سلسلہ میں کک اینڈ کیلوے کے جواہرات کا قصہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں جب مہاراجہ گدی سے دست بردار ہوئے تو نابھ سے روانہ ہونے سے پہلے یہ مسئلہ بھی مہاراجہ کے سامنے کیلوے کے بابو سے بھدوڑ اور برنالہ کے درمیان بذریعہ ڈاکہ حاصل کیا۔ اتنے عرصہ تک یہ بکس ہیرا محل نابھ کے اندر مہاراجہ کے بیڈروم میں پڑا رہا۔ گدی سے دست بردار اور مہاراجہ کے نابھ سے ڈیرہ دون روانہ ہونے سے چار روز پہلے مہاراجہ نے یہ بکس ایک دوسرے نفر بھان سنگھ کو دیا اور کہا کہ اس بکس کو اسی حالت میں کسی دیا کنوئیں یا کسی ایسی جگہ پھینک دو جہاں سے یہ واپس حاصل نہ ہو سکے ۔صدمہ کے باعث مہاراجہ کے دماغ کا توازن اس وقت قائم نہ رہا تھا۔ بھان سنگھ نے مہاراجہ کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے یہ بکس مہاراجہ سے لے لیا اور یہ اسے اپنے کوارٹر میں لے گیا۔ بھان سنگھ چھوٹی حیثیت کا آدمی تھا۔اس نے اپنے کوارٹر کے اندر ہی اس بکس کے تالے کو توڑا۔تا کہ دیکھے کہ اس کے اندر کیا ہے جو مہاراجہ ضائع کرنا چاہتے ہیں بکس کو کھولنے کے بعد اس نے دیکھا کہ قیمتی جیولری ہے ۔اس نے سمجھا کہ مہاراجہ کا دماغ خراب ہو گیا ہے جو مہارانی کی جیولری کا بکس ضائع کرنے کے لئے اس نے دے دیا۔ ادھر تو مہاراجہ کا حکم جس کی تعمیل سے انکار کرنے کی وزراء میں بھی جرأت نہ تھی ۔ یہ بچارا نفر کیوں کر حکم کی تعمیل نہ کرتا۔ ادھر قیمتی جیولری کا بکس اس کا دل نہ چاہا کہ اس کو ضائع کرے۔ آخر اس کش مکش کے بعد اس نے سونے کی چوڑیوں اور سونے کے دوسرے سامان کو الگ کیا اور گھڑیوں، ہیروں اور موتیوں کے جڑاؤ سامان کو الگ اس نے سونے کے تمام سامان کو لوہا مار مار کر چور چور کیا اور ہیرا محل سے دور فاصلے پر ایک کنوئیں میں پھینکا قیمتی گھڑیوں اور جڑاؤ سامان کو اس نے پھر اس بکس میں بند کیا اور اس بکس کو کسی پوشیدہ مقام پر زمین کے اندر دفن کر دیا اور ہیرے کی ایک انگوٹھی جس

کی قیمت پانچ ہزار روپیہ تھی اس نے اپنے ہاتھ میں پہن لی۔

نابھ میں ایک صاحب مسٹر شام جی داس کپور جیولر تھے۔ بہت ملنسار، با اخلاق اور شریف ان کی دکان پر آٹھ دس کرسیاں پڑی رہتیں اور ریاست کے افسر اکثر ان کے ہاں آتے۔ یہ لالہ شام جی داس مہاراجہ کے طلب کرنے پر بھی جیولری کی خرید کے وقت اکثر ہیرا محل جاتے۔ اور تمام اہلکاران کو عزت کی نظر سے دیکھتے۔ مہاراجہ کی دست برداری کو غالباً ایک ہفتہ ہوا تھا کہ بھان سنگھ نفر اپنے ہاتھ کی انگلی میں قیمتی انگوٹھی پہنے ہوئے لالہ شام جی داس کی دکان پر گیا اور کچھ دیر وہاں بیٹھا لالہ شام جی داس نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ میں پانچ چھ ہزار کی قیمتی ہیرے کی انگوٹھی ہے۔ مگر یہ بھان سنگھ سے کچھ کہہ نہ سکے۔ مہاراجہ کی دست برداری کے بعد نابھ کے ایڈمنسٹریٹر مسٹر اوگلوی تھے (یہ مسٹر اوگلوی بعد میں ڈیفنس ڈیپارٹمنٹ گورنمنٹ آف انڈیا میں سیکرٹری تھی) جب مسٹر اوگلوی سرگودھا میں ڈپٹی کمشنر تھے تو یہ وہاں کے ایک ہیڈ کانسٹیبل پولیس نتھو رام پر بہت مہربان تھے مسٹر اوگلوی جب نابھ میں ایڈمنسٹریٹر ہوئے تو اس نتھو رام کو بھی اپنے ساتھ نابھ لے آئے اور وہاں آپ نے اس کو انسپکٹر جنرل پولیس مقرر کر دیا۔ یہی نتھو رام بعد میں انگریزی علاقہ کے اندر سب انسپکٹر پولیس مقرر رہوئے۔ پھر مسٹر اوگلوی کی کوشش سے پنجاب میں ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر بنائے گئے۔ مسٹر اوگلوی جب دہلی میں آئے تو ان کو یہاں دہلی میں سٹی مجسٹریٹ مقرر کرا دیا گیا دہلی میں لالہ نتھو رام رائے بہادر اور او بی ای وغیرہ ہوئے اور یہاں انہوں نے وار فنڈ اور قرضہ جنگ میں پبلک سے مختلف طریقے استعمال کرتے ہوئے لاکھوں روپیہ گورنمنٹ کی امداد کے لئے حاصل کیا۔ لالہ نتھو رام جب نابھ میں انسپکٹر جنرل پولیس مقرر رہوئے تو آپ وہاں اپنا دبدبہ قائم کرنے کے لیے سرگودھا کے علاقہ سے ساٹھ ستر مسلمان کانسٹیبل بھرتی کر کے لے گئے۔ اس علاقہ کے لوگ فوج اور پولیس کے لئے موزوں ترین ہیں۔ اپنی جان اور اپنے ضمیر کی پروا کم کرتے ہیں۔ لالہ نتھو رام نے نابھ میں برسر اقتدار کیونکہ

آپ مسٹر اوگلوی کے دست راست تھے ہونے پر شہر کے لوگوں نے خوشامد کے طور پر آپ کے پاس جانا شروع کیا ایک روز لالہ شام جی داس کپور جوہری بھی گئے تو آپ نے لالہ نتھو رام سے معزول مہاراجہ کی شکایت کرتے ہوئے کہا کہ مہاراجہ نے ریاست کو تباہ کر دیا۔ نفر لوگ وزراء پر حکومت کرتے تھے پبلک تو بھوکی مر رہی ہے مگر نفر مالا مال ہیں چنانچہ آپ نے مثال دیتے ہوئے باتوں باتوں میں کہا کہ بھان سنگھ نفر ان کے ہاں آیا تھا۔ اس کے ہاتھ کی انگلی میں پانچ چھ ہزار کی قیمتی انگوٹھی ہے۔ نہ معلوم مہاراجہ نے اس کو یہ انعام میں دی یا اس نے مہاراجہ کی چوری کی۔ بہر حال تیس روپیہ ماہوار تنخواہ پانے والے نفر کے پاس پانچ چھ ہزار روپیہ کی ہیرے کی انگوٹھی کا ہونا ظاہر کرتا ہے کہ نابھ میں مہاراجہ کے وقت کیونکہ چوروں کے کپڑے اور راٹھیوں کے گز تھے۔

لالہ نتھو رام نے جب یہ واقعہ سنا تو انہوں نے ایک کانسٹیبل کو بھیجا۔ کہ وہ بھان سنگھ نفر کے مکان پر جا کر اسے بلا لائے۔ یہ کانسٹیبل بھان سنگھ کو لانے کے لئے گیا تو بھان سنگھ اپنے پہلے اقتدار کو ابھی بھول نہ سکا تھا۔ نفروں سے وزرا تک خوف کھاتے تھے کہ کہیں یہ مہاراجہ سے شکایت نہ کر دیں۔ بھان سنگھ نے کانسٹیبل سے کہا کہ ”جاؤ جا کر کہہ دو نتھو رام سے میں نہیں آتا انسپکٹر جنرل پولیس کی حیثیت کیا ہے کہ وہ مجھے کانسٹیبل بھیج کر طلب کرے“ کانسٹیبل نے اسی طرح آ کر لالہ نتھو رام سے کہا لالہ نتھو رام نے اپنے ساتھ لائے ہوئے سرگودھا کے جوانوں میں سے دو جوانوں کو بھیجا کہ بھان سنگھ کو لے آؤ۔ اگر وہ آنے سے انکار کرے تو اسے وہاں ہی سے جوتے لگانا شروع کر دو۔ یہ لوگ گئے تو بھان سنگھ کو تھپڑ مار کر اور گردن سے پکڑ کر ساتھ لے آئے جب بھان سنگھ لالہ نتھو رام کے پاس پہنچا تو لالہ نتھو رام نے بغیر کچھ کہے دریافت کئے یا پوچھے حکم دیا کہ اس کو الٹا لٹا دو۔ سرگودھا کے جوانوں نے بھان سنگھ کو الٹا لٹا دیا۔ لالہ نتھو رام کے حکم سے اس کے چوتڑوں پر کفش کاری شروع ہوئی اور سرگودھا کے جوانوں نے گن کر

ایک سو جوتے لگائے بھان سنگھ چلا رہا تھا مگر کفش کاری جاری تھی جب ایک سو کی گنتی ختم ہوئی تو بھان سنگھ کو کھڑا کیا گیا اور لالہ نتھو رام نے کہا کہ اب بتاؤ تم نے آنے سے انکار کیوں کیا اس کے بعد لالہ نتھو رام نے پوچھا کہ وہ انگوٹھی کہاں ہے جو تم نے مہاراجہ کے ہاں سے چوری کی۔ اس گفتگو سے پہلے نہ تو لالہ نتھو رام کو علم کہ یہ انگوٹھی کک اینڈ کیلوے کے مال میں سے ہے۔ لالہ شام جی داس کپور کو کچھ پتہ کہ یہ انگوٹھی کہاں سے آئی۔ بھان سنگھ کفش کاری کے باعث خوف زدہ تھا اس نے انگوٹھی بھی اپنے گھر سے منگا دی اور تمام کا تمام واقعہ بتا دیا کہ مہاراجہ نے اس کو بکس دیا وہ بکس اس نے اپنے کوارٹر میں کھولا اور سامان فلاں کنوئیں میں پھینکا ہے بھان سنگھ کے بیان کے بعد کنوئیں کے اندر آدمی اتارے گئے اور وہاں سے سامان نکلوایا گیا تو لالہ نتھو رام کو یہ خیال ہوا کہ شاید یہ سامان کک اینڈ کیلوے کا ہو۔ چنانچہ کک اینڈ کیلوے کو تار دیا گیا۔ سامان کی شناخت کے لئے وہاں سے بابو جی تشریف لائے۔ انہوں نے سامان کو پہچانا تو سامان وہی تھا جو بیر سنگھ نے ڈاکہ ڈال کر بابو جی سے لیا تھا۔ بھان سنگھ حوالات بھیج دیا گیا۔ ایک طویل عرصہ تک بھان سنگھ حوالات میں رہا مہاراجہ چونکہ گدی سے دست بردار ہو چکے تھے اس لئے اس بکس کے متعلق مزید کارروائی نہ کی گئی جیولری کی قیمت جو غالباً ایک لاکھ پچیس ہزار روپیہ تھی نابھ کے سرکاری خزانہ سے بحکم ایڈمنسٹریٹر کک اینڈ کیلوے کو ادا کر دی گئی۔

☆☆☆☆☆☆☆

ہندوستانی ہوٹل

اخبار ''ریاست'' کے جاری کرنے سے پہلے جب دہلی سے خواجہ حسن نظامی اور میں نے مشترکہ طور پر ایک اخبار ''رعیت'' جاری کیا تو اخبار جاری ہونے سے کچھ عرصہ پیشتر میں کئی روز تک ڈفرن برج کے قریب ایک ہوٹل میں مقیم رہا۔ اس ہوٹل کے مالک ایک پنجابی کھتری تھے اور ہوٹل میں بیس پچیس کمرے ہوں گے۔

میری زندگی کا یہ معمول رہا ہے کہ میں رات کو نو دس بجے کے قریب سو جاتا ہوں علی الصباح چار بجے جاگ کر اور ضروریات سے فارغ ہو کر کام شروع کر دیتا ہوں اور دس گیارہ بجے تک سکون اور تنہائی میں اپنا کام ختم کر لیتا ہوں اسی عادت کے مطابق اس ہوٹل میں بھی یہی پروگرام رہا ایک روز تھکا ہوا ہوٹل میں واپس آیا۔ اور نو بجے رات کو کھانا کھا کر سو گیا۔ گیارہ بجے میں نے ساتھ والے کمرے میں کچھ شور سا سنا تو میری آنکھ کھل گئی دونوں کمروں کے درمیان ایک دروازہ تھا اور اس دروازہ میں بھی متعدد شیشے لگے ہوئے تھے یعنی اگر کوئی شخص آہستہ سے بات کرے تو وہ بھی سنائی دیتی تھی میں نے جب غور سے سنا تو معلوم ہوا کہ اس کمرے میں ایک مرد اور ایک عورت ہے اور مرد نے شراب پی ہوئی ہے یہ لوگ دہلی کی ''کرخن دار'' کلاس (جس کو پنجاب میں مہاجا گا جایا سینماؤں میں چار آنہ والی کلاس کہتے ہیں) میں سے ہیں اور عیش و عشرت میں مصروف ہیں۔ شراب کے نشہ میں ہی شور پیدا کیا جا رہا ہے اور بعض اوقات گندی گالیاں بھی دی جاتی ہیں میں دوسروں کے معاملات میں دخل نہیں دیا کرتا میں نے آنکھیں بند کر کے کوشش کی کہ پھر سو جاؤں مگر سو نہ سکا کیونکہ ان لوگوں کا شور جاری تھا آخر تنگ آ کر میں اپنے کمرے سے باہر نکلا اور ہوٹل کے دفتر کے کمرہ میں گیا وہاں ایک گائڈ سو رہا تھا۔ اس کو جگایا اس سے مینجر کو بلانے کے لئے کہا جو کہ ہوٹل کے ان کمروں میں سے ہی آخر کے کمروں میں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہتے تھے۔ مینجر تشریف لائے تو ان سے سب کیفیت بیان کی اور کہا کہ ابھی کوتوالی ٹیلی فون کے

ذریعہ اطلاع کرتا ہوں کہ تم ہوٹل میں عورتیں سپلائی کرتے ہو منیجر نے کہا کہ مسافر خود لے آیا ہوگا۔ چنانچہ منیجر اس کمرہ میں گیا اور مسافر کو آوازیں دیں مگر وہاں سے کوئی جواب نہ آیا ہماری باتوں کو سن کر ''کرخن دار'' بالکل خاموش ہو گئے اور صبح ہونے سے پہلے ہوٹل سے چلے گئے۔

میں معاملہ کی تہہ تک پہنچنے کے لئے ہمیشہ کوشش کیا کرتا ہوں اور جب تک تمام حالات کا علم نہ ہو جائے ایک قسم کی جستجو سی رہتی ہے اس واقعہ کے بعد میں غالباً آٹھ دس دن ہوٹل میں رہا ہوٹل کے ملازموں کی معرفت میں نے ہوٹل کے تمام حالات معلوم کر لئے تو پتہ چلا کہ ہوٹل کے مالک کو ہوٹل کے کرایہ سے زیادہ آمدنی دلالی کی ہے۔ ہوٹل میں قیام کرنے والے لوگ (خصوصاً پنجاب سے آنے والے حضرات) ہوٹل کے ملازموں کی معرفت عورتیں منگاتے ہیں یہ ملازم ان بے وقوف مسافروں کو مزید الو بنانے کے لئے کہہ دیتے ہیں کہ یہ عورت فلاں رائے بہادر کی بھتیجی ہیں اور فلاں خان بہادر کی نواسی ہیں اور اس کے شوہر گورنمنٹ ہند کے فلاں بڑے دفتر میں ملازم ہیں وغیرہ۔ مگر دراصل یہ عورتیں بہت ادنیٰ درجہ کی پہاڑ کی رہنے والی ہندو یا دہلی کی آتشک اور سوزاک زدہ مسلمان طوائفیں ہوتی ہیں جو ہوٹل میں قیام کرنے والے عیاش لوگوں کو زندگی بھر کے لئے خطرناک سرٹیفکیٹ بھی دے دیتی ہیں۔

میں اسی ہوٹل میں مقیم تھا وہاں سامان فروخت کرنے والے لوگ بھی آیا کرتے کیونکہ مسافروں کے پاس یہ زیادہ قیمت پر اپنا سامان فروخت کر سکتے تھے ایک روز میں دوپہر کے وقت کھانا کھا کر قیلولہ کر رہا تھا کہ کمرے کے دروازے پر ایک شخص آیا۔ اس کے پاس چھپکلی کی قسم کے متعدد زندہ جانور تھے اس نے کہا کہ ''سانڈے کا تیل ہے اگر چاہو تو زندہ سانڈے میں سے ابھی تیل نکال کر دوں گا۔'' میں نے اس سے پہلے کبھی سانڈے کو نہ دیکھا تھا اور نہ سانڈے کے تیل کی خصوصیات سے واقف تھا میں نے پوچھا کہ یہ سانڈے کا تیل کس کام آتا ہے اس نے میرے سوال کا جو جواب

دیا وہ یہ تھا:

"سانڈے کا تیل نامردی، کمزوری اور سستی کو دور کرتا ہے۔ یہ جانور جنگل میں ملتا ہے ہم لوگ پکڑ کر لاتے ہیں اور اس کا تیل نکالتے ہیں۔ یہ تیل دہلی سے دور دور جاتا ہے آپ کی (چونکہ میں سکھ تھا) قوم کے سردار سندر سنگھ مجیٹھیہ۔ سردار جوگیندر سنگھ اور رائے بہادر بوٹا سنگھ بھی متعدد بار ہم سے یہ تیل لے گئے اور انہوں نے بار بار منگایا۔ آپ بھی لیجئے بہت کام کی چیز ہے۔ آپ ہمیشہ یاد رکھیں گے"

رائے بہادر بوٹا سنگھ سے تو میں واقف نہ تھا مگر سردار سر سندر سنگھ مجیٹھیہ اور سردار سر جوگیندر سنگھ (جو وائسرائے کی انتظامیہ کونسل کے ممبر تھے) سے مل چکا تھا اور ان دونوں بزرگوں کی نیک دلی بلند کریکٹر، شرافت اور اخلاق کی بلندی سے واقف تھا۔ ان کا نام سانڈے کے تیل کی خصوصیات کے ساتھ سن کر مجھے بے حد غصہ آیا۔ میں جب غصہ کی حالت میں ہوں تو گالیاں اور جسمانی سزا دینے کے لئے بھی بے قابو سا ہو جاتا ہوں۔ (یہ بہت بڑی کمزوری ہے اور اسے بد اخلاقی بھی قرار دیا جا سکتا ہے جس کا مجھے بعد میں ہمیشہ ہی افسوس ہوتا ہے) میں نے اس شخص کو ماں بہن کی گالیاں دینی شروع کیں اور کہا کہ کمینہ کتے! تو چند پیسوں کے لالچ میں نیک اور فرشتہ خصلت لوگوں کو رسوا کرتا ہے اور ان بیچاروں کا جرم صرف یہ ہے کہ یہ لوگ ملک میں مشہور شخصیت ہیں اور تمہارے جیسے کتے بھی ان کے نام سے واقف ہیں میری گالیوں کو سن کر اس شخص نے کوئی جواب نہ دیا اور یہ بھیگی بلی کی طرح ہوٹل سے چلا گیا۔

اس ہوٹل کے واقعہ کے چند ماہ پہلے کی بات ہے میں دہلی میں آیا میرے ساتھ مانسہ ریاست پٹیالہ کے ٹھیکیدار سردار بختاور سنگھ بھی تھے (یہ صاحب غالباً آج کل رام پورہ (ریاست پٹیالہ) میں رہتے ہیں ہم لوگ ریلوے سٹیشن کے قریب سرائے میں پہنچے سردیوں کا زمانہ تھا جب سونے والے تھے تو سردار بختاور سنگھ نے کہا کہ ان کو رات

کے وقت دودھ پینے کی عادت ہے۔ دودھ پینے کے لئے بازار جارہے ہیں ابھی واپس آتے ہیں جب بختاور سنگھ دود پینے کے لئے چلے گئے تو مجھے اکیلا دیکھ کر سرائے کے ایک ملازم کو جرأت ہوئی۔ وہ آیا اور اس نے کہا کہ کوئی خدمت ہو تو بتایئے میں نے جواب دیا کہ ایک لوٹا پانی کا بھر کر کرسی پر رکھ دیجیے وہ پانی لے آیا تو اس نے پھر کہا کوئی اور خدمت ہو تو بتایئے جب اس نے دوبارہ یہی کہا تو مجھے خیال آیا کہ یہ جو اتنی خاطر تواضع کر رہا ہے اور بار بار پوچھتا ہے یہ علت سے خالی نہیں اور اس کی ہمدردی کی تہہ میں کوئی اور بات ہے میں نے پوچھا کیا خدمت؟ میں سمجھا نہیں اس پر اس نے کہا کہ اگر کسی عورت کی ضرورت ہو تو لا دوں بڑے بڑے خان بہادروں اور رائے بہادروں کی لڑکیاں لا سکتا ہوں۔ اس کی اس پیش کش کو سن کر مجھے شرارت سوجھی میں نے جواب دیا کہ میں تو اس کام سے نفرت کرتا ہوں اور تھکا ہوا ہوں۔ اب سو جاؤں گا ۔ یہ میرے ساتھ جو سردار جی ہیں پٹیالہ کے رہنے والے بہت بڑے عیاش ہیں یہ اس مقصد کے لیے ہی دہلی آئے ہیں۔ بازار سے ابھی واپس آ رہے ہیں ان سے پوچھ لو اور ان کے لئے انتظام کر دو۔ میں یہ کہہ کر اور کروٹ لے کر دوسری طرف منہ کر کے سو گیا۔ سردار بختاور سنگھ مذہبی خیال کی شخصیت تھے۔ اس زمانہ میں سنگھ سبھا کی تحریکوں میں حصہ لیتے اور دن میں کئی جپ جی صاحب جاپ صاحب اور رہ راس کا پاٹھ کرتے اور گوردوارہ ہر روز با قاعدہ جاتے جب یہ واپس آئے تو ہوٹل کے ملازم نے ان سے صاف الفاظ میں وہی کچھ کہا جو مجھے کہا تھا یہ سن کر سردار بختاور سنگھ کو بہت غصہ آیا اور انہوں نے اس کو بہت گالیاں دیں، میں خاموشی کے ساتھ سنتا رہا تو سردار بختاور سنگھ نے (اپنے خیال میں) مجھے جگا کر اس سرائے کی دلالی پر توجہ دلائی اور بتایا کہ ملازم نے ان سے کیا کہا میں نے اپنی ہنسی کو ضبط کرتے ہوئے کہا سردار صاحب دہلی کے ہوٹلوں والے ایسے ہی بدمعاش ہیں۔ اور یہاں آنے والے بھی ایسے ہی لوگ ہوتے ہیں ان بیچاروں کو کیا علم کہ آپ دن رات پاٹھ کرتے ہیں اور گوردوارہ

میں جاتے ہیں اس کے بعد ہم سو گئے اور اگلے روز واپس مانسہ چلے گئے۔

ایک ریاست کی بیگم صاحبہ کا خط میرے پاس پہنچا کہ وہ اپنی ریاست سے بمبئی جا رہی ہیں میں بمبئی میں ان سے ملوں وہ اپنے حالات بیان کرنا چاہتی ہیں یہ ملاقات قطعی راز میں رہے اور کسی کو اس کا علم نہ ہو۔ اس خط کے ملنے پر میں بمبئی گیا۔ وہاں کرافرڈ مارکیٹ کے قریب ایک بڑے ہندوستانی ہوٹل میں مقیم ہوا۔ ہوٹل میں پہنچنے کے بعد میں نے اس ذریعہ سے اس خاتون تک اطلاع پہنچائی جو ذریعہ اس نے بتایا تھا بیگم صاحبہ نے جواب میں کہا کہ وہ خود اس ہوٹل میں پہنچ جائیں گی چنانچہ اگلے روز یہ خاتون اپنی رولز رائس موٹر میں (اس زمانہ میں رولز رائس پچاس ساٹھ ہزار روپیہ میں ملتی تھی اب تو یقیناً اس کی قیمت ڈیڑھ لاکھ روپیہ سے کم نہ ہو گی) اکیلی تشریف لائیں کیونکہ وہ میری اور اپنی ملاقات کو کسی پر ظاہر نہ کرنا چاہتی تھیں میں جس کمرے میں ٹھہرا ہوا تھا اس کا اور دوسرے کمروں کا برآمدہ ایک ہی تھا جس طرح ہوٹلوں کے متعدد کمروں کا ایک ہی برآمدہ ہوتا ہے جب یہ خاتون میرے کمرے میں تشریف لے آئیں تو میں نے محسوس کیا کہ دوسرے کمروں کے مسافر جب برآمدہ میں سے گزرتے ہیں تو اس خاتون کو جس کا لباس بہت قیمتی تھا اور جو بے حد حسین تھیں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے ہیں اور بعض کم بختوں نے تو اسی طرح سے برآمدے میں چکر لگانے شروع کر دیئے ہیں جس طرح جنسی فاقہ کش لوگ ریلوے پلیٹ فارموں پر زنانہ ڈبوں کے سامنے ٹہلنا شروع کر دیتے ہیں اور گاڑی میں بیٹھی خواتین کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے ہیں جب میں نے یہ کیفیت دیکھی تو میں نے کمرے کے سامنے کا دروازہ بند کر دیا اور پچھلے دروازے کھول دیے تاکہ یہ خاتون آوارہ لوگوں کی بری نظروں سے محفوظ رہیں۔ ہم ڈیڑھ گھنٹہ کے قریب باتیں کرتے رہے تو اس کے بعد بیگم صاحبہ اپنی کار میں واپس تشریف لے گئیں جہاں کہ ان کے شوہر مقیم تھے جب یہ خاتون چلی گئیں تو نصف گھنٹہ کے بعد ہوٹل کا بیرا چار روپیہ کا ایک بل لے آیا۔ میں

حیران کہ چار روپیہ کا بل کیسا ہے۔ اس پر صرف چار روپیہ لکھا تھا کسی شے کا نام نہ تھا میں نے پوچھا یہ بل کس چیز کا ہے تو بیرا نے بے تکلفی سے کہا ''جو صاحب بائی جی کو بلائیں چاہے وہ بائی جی کو خود لائیں یا ہماری معرفت بلائیں ہم چار روپیہ چارج کرتے ہیں۔'' میں سمجھ گیا کہ یہ چار روپیہ دلالی کی فیس ہے۔ بل کو اور بیرا کو لے کر میں ہوٹل کے مینجر کے کمرے میں گیا اور مینجر سے پوچھا کہ یہ چار روپیہ دلالی کی فیس ہے بل کو اور بیرا کو لے کر میں ہوٹل کے مینجر کے کمرے میں گیا اور مینجر سے پوچھا کہ یہ چار روپیہ کا بل کیسا ہے۔ مینجر نے بھی بیرا والے الفاظ دہرائے مجھے بہت غصہ آیا۔ دل چاہتا تھا کہ اس مینجر کا منہ پھیر دوں مگر میں نے سنجیدگی کے ساتھ پوچھا ''تم نے بائی جی کو خود دیکھا'' مینجر نے کہا ہاں میں نے خود دیکھا میں نے کہا وہ موٹر میں آئی تھیں مینجر نے جواب دیا ہاں سیاہ رنگ کی بہت خوبصورت اور بڑی موٹر تھی میں نے پھر سوال کیا اگر یہ بائی جی بد معاشی کے لیے آئیں تو اس نے مجھ سے کتنے روپیہ لیے ہوں گے اس نے سر کھجاتے اور کھسیانا صورت بناتے ہوئے کہا مجھے کیا علم پچاس ساٹھ تو لیے ہوں گے مجھ سے نہ رہا گیا میں نے کہا کمینے اور ذلیل شخص جو عورت ہزار ڈیڑھ ہزار روپیہ کی قیمتی ساڑھی پہنے پچاس ہزار روپیہ کی موٹر میں آئی تمہارے خیال میں وہ بد معاشی کی غرض سے آئی ہو گی اور تمہارے ہوٹل میں کسی شریف عورت کا آنا ممکن ہی نہیں۔ میں نے جب مینجر کو برا بھلا کہا تو وہ بہت شرمندہ اور نادم ہوا اور اس نے اپنی غلطی کی معافی چاہی ۔

یہ چند واقعات ہندوستانی ہوٹلوں اور سراؤں کے متعلق ہیں اور میرا ذاتی تجربہ ہے کہ ہندوستانی ہوٹلوں میں سو میں سے پچانوے ہوٹل بد چلنی اور بد معاشی کے اڈے ہیں۔ ان میں کھانا نہایت ردی اور بد مزہ پکتا ہے کیونکہ دلالی کی آمدنی کے مقابلے پر یہ لوگ اچھا کھانا پکانے پر توجہ نہیں دیتے ان کے غسل خانے گندے اور ملازم لاپروا اور گستاخ۔ مگر ان کے مقابلے پر انگریزی ہوٹلوں میں سے شاید ایک ہوٹل بھی آپ کو

ایسا نہ ملے گا جو عورتیں سپلائی کرنے کا کمینہ کام کرتا ہو۔ ان ہوٹلوں میں بھی بد چلنی ہوتی ہے مگر وہاں جو شخص چاہے کسی عورت کو بطور ایک دوست کے اپنے کمرے میں لا سکتا ہے نہ ساتھ کے کمرے والوں کو کوئی دلچسپی نہ مالک ہوٹل کو کوئی اعتراض۔ نہ کسی کو آنے کا خیال نہ جانے کی فکر۔ فرش، غسل خانے اور کمرے صاف، ملازم چست اور فرماں بردار اور کھانا لذیذ اور زود ہضم۔ چنانچہ میں اب کئی برس سے سوائے مجبوری کے کبھی کسی ہندوستانی ہوٹل میں نہیں ٹھہرتا اور اگر کسی ہندوستانی ہوٹل میں کبھی ٹھہرتا ہوں تو اس صورت میں جب کہ کسی انگریزی ہوٹل میں جگہ نہ ملے۔

☆☆☆☆☆☆☆
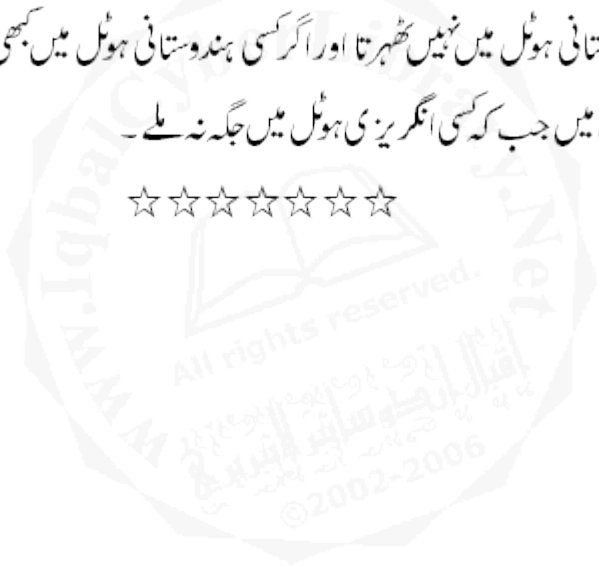
مرحوم مہاراجہ نابھ کی گرفتاری

مرحوم مہاراجہ گورچون سنگھ 1963ء میں اختیارات سے محروم کر دیئے گئے اور دست برداری میں جو شرائط تھیں ان کے مطابق مہاراجہ دریائے جمنا سے مغرب کی طرف یعنی پنجاب میں نہ جا سکتے تھے آپ کو ہز ہائی نس مہاراجہ کا خطاب اور توپوں کی سلامی کا حق دیا گیا تھا اور آپ کے لیے پچیس ہزار روپیہ ماہوار یعنی تین لاکھ روپیہ سالانہ پنشن یا الاؤنس مقرر کیا گیا تھا۔ اس کے بعد آپ 1928ء میں الہ آباد کے مقام پر گرفتار کیے گئے۔ آپ کی گرفتاری کے حالات یہ ہیں:

گورنمنٹ ہند کے پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ نے مہاراجہ کو الہ آباد میں گرفتار کرنے اور کوڈائی کنال (مدراس) میں نظر بند کرنے کی وجہ کچھ بھی ظاہر کی ہو مگر دراصل اس کا سبب گورنمنٹ کا آپ کے خلاف ہونا تھا۔ چنانچہ کاغذات میں اس گرفتاری اور آپ کے خطاب چھین لیے جانے اور الاؤنس کم کرنے کی وجہ جو بتائی گئی۔ وہ یہ تھی کہ مہاراجہ نے امرت سر کے ایک گورمکھی ہفتہ وار اخبار میں اپنے نام سے ایک مضمون لکھا۔ اس مضمون میں مہاراجہ پٹیالہ پر الزام لگایا گیا تھا کہ مہاراجہ پٹیالہ نے وائسرائے کو خوش کرنے کے لیے کسی جنگل سے ایک شیر منگایا۔ یہ شیر پٹیالہ کے قریب چھوڑ دیا گیا تا کہ وائسرائے اس کا شکار کریں اور خوش ہوں اور یہ شیر پٹیالہ کے قریب کی پبلک کے لیے خطرہ کا باعث ہوسکتا تھا اس مضمون کو مہاراجہ پٹیالہ کے خلاف اخباری پراپیگنڈہ قرار دیا گیا اور ظاہراً طور پر اس مضمون کی بنیادوں پر ہی گرفتاری و کوڈائی کنال میں نظر بندی کی عمارت تعمیر کی گئی۔

گورنمنٹ نے جب مہاراجہ کو گرفتار کر کے کوڈائی کنال میں نظر بند کرنے کا فیصلہ کیا تو یہ کام یو پی کے ایک سپرنٹنڈنٹ پولیس مسٹر پیل (یہ وہی مسٹر پیل ہیں جو لارڈ ارون کی ٹرین کو بم کے ذریعہ اڑا دینے والی سازش کے مقدمہ کے انچارج تھے اور دہلی میں اس مقدمہ کی پیروی کرتے رہے) کے سپرد کیا گیا۔ گورنمنٹ نے پہلے فیصلہ

کی اکہ مہاراجہ کو ڈیرہ دون میں گرفتار کیا جائے۔ پھر یہ خیال بدل دیا گیا۔ کیونکہ وہاں مہاراجہ کی بیوی اور بچے تھے تاکہ ایجی ٹیشن نہ ہو۔ اس کے بعد فیصلہ ہوا کہ آپ کو اس وقت گرفتار کیا جائے جب آپ ڈیرہ دون سے باہر ہوں۔ چنانچہ مہاراجہ دہلی آئے۔ آپ کے اس سفر کا مقصد وائسرائے سے ملنا تھا۔ آپ یہاں سوس ہوٹل میں مقیم ہوئے تو آپ کی گرفتاری کا مکمل انتظام کر دیا۔ ہوٹل کے اردگرد کئی درجن سی آئی ڈی کے لوگ منڈلاتے رہے اور ریلوے سٹیشن پر کمانڈر انچیف کی سپیشل آپ کو لے جانے کے لیے تیار رکھی گئی تھی کہ گورنمنٹ کو علم ہوا کہ آپ قانونی مشورہ کے لیے الہ آباد جا رہے ہیں چنانچہ یہ اطلاع ملتے ہی دہلی میں گرفتاری کا ارادہ بھی بدل دیا گیا اور یہ انتظار کیا جانے لگا کہ آپ الہ آباد جائیں اور وہاں گرفتاری ہو تاکہ دہلی میں بھی ایجی ٹیشن پیدا نہ ہو۔ جہاں اسمبلی اور کونسل آف سٹیٹ کا مرکز تھا۔ مہاراجہ دہلی سے الہ آباد کے لیے روانہ ہوئے تو اس گاڑی کے بعد جو گاڑی الہ آباد کو جاتی تھی اس میں مسٹر پیل مسٹر اوکانر ڈپٹی انسپکٹر پولیس سی آئی ڈی یو پی اور سردار بہادر کشن سنگھ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کے علاوہ متعدد اور افسر بھی تھے۔ یہ لوگ مہاراجہ کے پیچھے پیچھے الہ آباد پہنچے اور کمانڈر انچیف کی سپیشل کے لیے الہ آباد کے قریب ایک ریلوے سٹیشن فتح پور ہسوہ ٹھہرنے کا انتظام کیا گیا تاکہ الہ آباد میں اس گرفتاری کا شبہ یا علم نہ ہو۔

مہاراجہ نابھ دو روز الہ آباد کے ایک ہوٹل میں مقیم رہے سردار بہادر کشن سنگھ ریلوے سٹیشن کے ویٹنگ روم میں ٹھہرے اور انتظار کیا جانے لگا۔ کہ مہاراجہ کب الہ آباد سے روانہ ہوں اور ریلوے سٹیشن پر یا راستہ میں آپ کی گرفتاری کی جائے مہاراجہ کے الہ آباد میں قیام کے دو روز بعد دہلی جانے والی گاڑی میں جگہ ریزرو ہو چکی تھی اور رات کو دس بجے مہاراجہ کے سیکرٹری (مسٹر بھارگو) اور ملازم سامان لے کر ریلوے سٹیشن پہنچ گئے اور سردار بہادر کشن سنگھ تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد ریلوے سٹیشن کو کلب میں دی جہاں کہ یہ موجود تھے یہ افسر یعنی مسٹر اوکانر ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس مسٹر

پیل سپرنٹنڈنٹ پولیس مسٹر پیرس سپرنٹنڈنٹ پولیس اورمسٹر راجرس اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس کے علاوہ ساٹھ کے قریب انسپکٹر، سب انسپکٹر، ہیڈ کانسٹیبل، کانسٹیبل ریلوے سٹیشن پر پہنچ گئے۔ مہاراجہ موٹر میں ساڑھے دس بجے ریلوے سٹیشن پہنچے اورآپ پلیٹ فارم پر جب پل کے پاس کھڑے تھے تو یہ افسر آپ کے پاس آئے اورمسٹر او کانر نے مہاراجہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

''آپ کو میں بحکم گورنمنٹ ہند گرفتار کرتا ہوں۔''

ان افسروں کا خیال تھا کہ شاید مہاراجہ اس خبر کو سن کر تشدد استعمال کریں یا خودکشی کی کوشش کی جائے اس لیے یہ لوگ بہت محتاط تھے۔ مہاراجہ نے پوچھا کس جرم میں گرفتار کیا گیا ہوں۔ تو اس کے جواب میں مسٹر او کانر نے کہا:

''یہ تو پولیٹکل ڈیپارٹمنٹ کو علم ہے ہمیں صرف آپ کی گرفتاری کا حکم ہے۔''

اس حکم کو سنانے کے بعد یہ افسر مہاراجہ کو ساتھ لے کر واپس کلب میں آئے اس وقت مہاراجہ کے ملازموں سے کہا گیا کہ مہاراجہ کے ساتھ دو ملازم جا سکتے ہیں جو جانا چاہے وہ بتائے ان ملازموں میں سے سب نے مہاراجہ کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ صرف ایک نوجوان کشمیرا سنگھ آپ کے ساتھ جانے پر آمادہ ہوا۔ مہاراجہ کو کلب کے ایک کمرے میں پہرے کے اندر بٹھا دیا گیا اور دوسرے کمرے میں مشورہ ہوا کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ مسٹر او کانر نے کہا کہ مہاراجہ اور پولیس ایک لاری میں فتح پور ہسوہ جائے۔ مہاراجہ کو وہاں تھانہ میں بند کر دیا جائے اور پھر صبح کو ڈائی کنال (مدراس) کے لیے روانگی ہو اس پر سردار بہادر کشن سنگھ نے کہا کہ یہ بہت بڑا غلط قدم ہو گا مہاراجہ کی پوزیشن ایک رولنگ پرنس کی تھی اور آپ 1818ء کے ریگولیشن کے مطابق نظر بند کیے جا رہے ہیں۔ کوئی بات بھی مہاراجہ کی شان کے خلاف ہوئی تو گورنمنٹ اس پر اعتراض کرے گی اور ایجی ٹیشن پیدا ہو گی۔ چنانچہ مشورہ کے بعد مسٹر راجرس اور سردار بہادر کشن سنگھ سٹیشن ماسٹر الہ آباد کے پاس پہنچے اس سے ایک فسٹ کلاس کمپارٹمنٹ کا

انتظام کیا گیا۔ یہ کمپارٹمنٹ فتح پور ہسوہ جانے والی مال گاڑی کے ساتھ لگانے کا انتظام کیا گیا۔ مہاراجہ مع افسروں کے ریلوے سٹیشن آئے اور مہاراجہ کو اس میں بٹھا کر یہ کمپارٹمنٹ مال گاڑی کے ساتھ لگا دیا گیا۔ الہ آباد سے فتح پور ہسوہ ستر میل کے قریب ہے جب گاڑی روانہ ہوئی تو چلتی گاڑی میں مہاراجہ کی تلاشی لی گئی۔ مہاراجہ نے اپنا پستول خود ہی دے دیا جب گاڑی فتح پور ہسوہ پہنچی۔ وہاں کمانڈر انچیف کی اسپیشل انتظار میں کھڑی تھی۔ مہاراجہ اس میں بیٹھے اور مہاراجہ کے ساتھ پولیس کے چھوٹے افسروں اور کانسٹیبلوں کے علاوہ مسٹر پیل اور سردار بہادر کشن سنگھ تو کوڈائی کنال تک گئے۔ باقی بڑے افسر یعنی مسٹر اوکانر وغیرہ فتح پور ہسوہ سے واپس الہ آباد چلے گئے۔ فتح پور ہسوہ کے سٹیشن پر اس وقت پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کا ایک نوجوان انگریز افسر بھی دہلی سے پہنچ گیا تھا جس نے مہاراجہ کو گورنمنٹ کا حکم دے دیا۔ یہ سپیشل فتح پور ہسوہ سے کانپور کانپور سے جھانسی جھانسی سے منماڑ منماڑ سے ڈھونڈ اور ڈھونڈ سے مدراس گئی کیونکہ اس زمانہ میں گرینڈ ٹرنک ایکسپریس والی لائن نہ تھی۔

یہ حالات ایڈیٹر ''ریاست'' کو مختلف ذرائع سے معلوم ہوئے۔ مہاراجہ نابھ نے کوڈائی کنال میں ایک واقعہ بیان کیا۔ جس کی سردار بہادر کشن سنگھ نے بھی تصدیق کی مہاراجہ جب مدراس جا رہے تھے تو راستہ میں سردار بہادر کشن سنگھ نے حکام کے اشارے پر مہاراجہ کی ذہنی کیفیت معلوم کرنے کے لیے یا ویسے ہی باتوں باتوں میں پوچھا آپ کی اس گرفتاری اور نظر بندی کے بعد مہارانی نابھ کیا پوزیشن اختیار کرینگی وہ ڈیرہ دون میں رہیں گی۔ نابھ جائیں گی یا آپ کے پاس کوڈائی کنال آئیں گی اس کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے۔ مہاراجہ نے سردار بہادر کشن سنگھ کو جو جواب دیا وہ یہ تھا:

> ''سردار صاحب! میں اس سوال کا جواب تب دے سکتا تھا۔ اگر میری بیوی دیہات کے رہنے والے کسی جاٹ کی لڑکی اور غیر تعلیم یافتہ ہوتی یا میری ماں زندہ ہوتی تو میں بتاتا کہ میری ماں میری گرفتاری

کے بعد کیا کرے گی۔ مہارانی ولایت کی تعلیم یافتہ ہے۔ میں کیا کہہ سکتا ہوں کہ یہ کیا کرے گی اس کا جو دل چاہے گا کرے گی۔‘‘

مہاراجہ نابھ نے یا تو سردار بہادر کشن سنگھ کے اس سوال سے متاثر ہوکر یا ویسے احتیاط کے طور پر ہی مجھے اور سردار سردول سنگھ کویشر کو ایکسپریس تار دیئے۔ جن میں لکھا کہ آپ میری بیوی اور بچوں کی ڈیرہ دون میں حفاظت کیجئے یہ تار سردار بہادر کشن سنگھ کو بھیجنے کے لیے دیئے گئے۔ انہوں نے مسٹر پیل کو دکھا کر یہ تار ریلوے سٹیشن بینا کے تار گھر کو دیئے۔ ایڈیٹر ’’ریاست‘‘ کے نام کا تار چند گھنٹوں میں دہلی پہنچ گیا۔ اس تار کے مضمون کو نہ تو سردار بہادر کشن سنگھ سمجھ سکے نہ مسٹر پیل۔ اس تار کا اصل مطلب یہ تھا کہ مہارانی نابھ اور بچے پولیٹکل ڈیپارٹمنٹ اور مہاراجہ پٹیالہ سے کوئی تعلق پیدا کر کے ان کے ہاتھوں میں ٹول ثابت نہ ہوں۔ محتاط رہو۔ میں تار کا مطلب فوراً سمجھ گیا اور اسی شام کو ڈیرہ دون روانہ ہو گیا۔ میں جب ڈیرہ دون میں مہاراجہ کی کوٹھی اندر روڈ پہنچا تو وہاں نقشہ بدلا ہوا پایا۔ سر جیمس فٹز پٹرک ڈیرہ دون میں مقیم ہیں میرے جانے سے پہلے وہ ولی عہد نابھ (موجودہ مہاراجہ) کو خریطہ پیش کر چکے ہیں جس کا مطلب یہ تھا کہ تم آج سے نابھ کے حکمران اور مہاراجہ ہو۔ مہاراجہ کے ملازم مستعدی اور تیزی سے سامان باندھنے میں مصروف ہیں۔ لکڑی کے کئی بکس تو سامان رکھ کر بند بھی کیے جا چکے ہیں اور سر جیمس فٹز پٹرک کے ساتھ نابھ جانے۔ وہاں شاہی داخلہ ہونے اور مستقل طور پر قیام کرنے کی تیاریاں ہو رہی ہیں میرے جانے کے تھوڑی دیر بعد سردار سردول سنگھ بھی وہاں پہنچ گئے۔ ہم نے سوچا کہ اب کیا کرنا چاہئے آخر مہارانی سے جب باتیں ہوئیں تو ہم نے صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ شوہر کے گرفتار ہونے کے بعد آپ کا نابھ جانا اور پولیٹکل ڈیپارٹمنٹ کے ہاتھوں میں کھیلنا نہ صرف غیر مناسب ہے بلکہ آپ کی ذلت و رسوائی کا باعث بھی ہوگا۔ کیونکہ سکھوں میں ایجی ٹیشن ہوگی اور جہاں لوگ مہاراجہ کے حق میں ہوں گے وہاں آپ کو اپنے شوہر کا غدار سمجھتے ہوئے

گالیاں دی جائیں گی۔ ہمارے اس کہنے پر مہارانی کے خیال میں تبدیلی پیدا ہوئی۔ سامان کا باندھنا بند کر دیا گیا اور اس کے بعد مہارانی باوجود پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے زور دینے کے کئی برس تک نابھ نہ گئیں اور نہ آپ نے بچوں کو نابھ بھیجا ہاں یہ بھی سچ ہے کہ آپ کوڈائی کنال اپنے شوہر کے پاس نہیں گئیں۔ بلکہ میاں بیوی کے تعلقات زیادہ کبیدہ ہوتے چلے گئے۔

☆☆☆☆☆☆

مرہٹوں کا بڑھاپے میں جوش

مرحوم پروفیسر بھینکار (فرگوسن لا کالج پونا) انڈین سٹیٹس پیپلز کانفرنس کے بانیوں میں سے تھے اور آپ کانسٹی ٹیوشن لاء کے اعتبار سے ہندوستان میں ایک اتھارٹی تسلیم کیے جاتے تھے میرے جب ان سے دوستانہ تعلقات ہوئے تو آپ کی عمر ستر برس سے زیادہ تھی آپ اپنے عزیزوں کی طرح مجھ سے محبت کرتے جب کبھی پنجاب یا دہلی آتے ۔تو دفتر ''ریاست'' میں ضرور تشریف لاتے اور مختلف موضوع پر گھنٹوں باتیں ہوتیں ۔اس عمر میں بھی آپ کے اندر جوانوں جیسا جوش زندگی تھا اور آپ صحیح معانی میں مرہٹہ تھے۔

مرحوم مہاراجہ پٹیالہ کے خلاف جب انڈین سٹیٹس پیپلز پانفرنس نے ایجی ٹیشن جاری کی اور پٹیالہ کے واقعات کے متعلق تحقیقاتی کمیشن مقرر کیا گیا تو اس تحقیقاتی کمیشن کے ایک ممبر آپ بھی تھے یہ تحقیقاتی کمیشن لوگوں کی شہادتیں لینے کے لیے لاہور پہنچا۔پرانی انارکلی کی ایک بلڈنگ میں اس کمیشن کا اجلاس شروع ہوا۔ریاست پٹیالہ کے سینکڑوں لوگ شہادتیں اور بیانات دینے کے لیے آئے جن میں عورتیں بھی تھیں اور ان لوگوں میں زیادہ تر سکھ تھے ۔جن کی کمر میں اڑھائی اڑھائی فٹ کی لمبی کرپانیں لٹک رہی تھیں ۔جب شہادتیں ہو رہی تھیں تو کوئی شخص یہ بیان دیتا تھا کہ مہاراجہ پٹیالہ اس کی بیٹی کو اغواء کر کے لے گیا۔کوئی یہ شہادت دیتا۔کہ اس کی بہن کو مہاراجہ نے جبراً اپنے محلات میں رکھ چھوڑا ہے ۔کوئی کہتا کہ اس کی بیوی کے ساتھ مہاراجہ نے زنا بالجبر کیا وغیرہ ۔جب یہ شہادتیں ہو رہی تھیں تو ان شہادتوں کو سن کر پروفیسر بھینکار کا چہرہ غصہ کے باعث سرخ ہو گیا۔آپ برداشت نہ کر سکے اور آپ نے شہادت دینے والے لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

''مہاراجہ پٹیالہ نے تو خیر وہ کچھ کیا جس کی کسی شریف انسان سے توقع نہیں مگر تم لوگوں جیسا کمینہ، بے عزت اور بے حیا بھی میں نے دنیا

میں کوئی نہیں دیکھا۔ تم لوگوں کو کمر میں کرپانیں لٹکائے ہوئے شرم محسوس نہیں ہوتی۔ کہ تمہاری بہنیں، بیٹیاں اور بیویاں تو مہاراجہ پٹیالہ نکال لے گیا اور تم کرپانیں کمر میں لٹکائے بے غیرتوں کی طرح زندہ پھر رہے ہو۔ تم مر کیوں نہیں جاتے تمہارے جیسے بے حیا لوگ اس دنیا میں کیوں موجود ہیں اور تمہیں کرپانیں لٹکاتے ہوئے شرم محسوس نہیں ہوتی۔''

پروفیسر بھینکار کے ان الفاظ سے کمرے کے اندر ایک سناٹا سا چھا گیا۔ کرپانیں لٹکائے ہوئے سکھوں کے چہرے ندامت کے باعث پانی پانی ہو گئے اور ہر شخص اس بہادر مرہٹہ کے الفاظ سے متاثر تھا۔

پروفیسر ابھینکار نواب بھوپال بنام ایڈیٹر ''ریاست'' کے مقدمہ پرنس پروٹیکشن ایکٹ کی پیروی کے لیے چند بار ہوشنگ آباد بھی گئے۔ آپ مہاراشٹر اور سی پی میں بہت عزت و احترام کی نظروں سے دیکھے جاتے تھے۔ ہوشنگ آباد کے وکلاء نے آپ کو ایک ٹی پارٹی بھی دی۔ جس میں مقامی وکلاء، مجسٹریٹ اور جج وغیرہ شامل ہوئے۔ ایڈیٹر ''سیاست'' نے بہت کوشش کی کہ آپ فیس قبول کریں مگر آپ نے ریلوے کا کرایہ تک نہ لیا۔

ہوشنگ آباد کا ایک واقعہ بھی بہت دلچسپ اور آپ کی غیرت وحمیت اور سچائی کا مظہر ہے۔ ہم لوگ ڈاک بنگلہ میں مقیم تھے۔ صبح کا وقت تھا اور آپ کے ساتھ مسٹر بی بی توکلی سردار بہادر بھگوان سنگھ اور ہوشنگ آباد کے دوسرے مقامی وکلاء مقدمہ کی تیاری میں مصروف تھے تو اخبار فروخت کرنے والا لڑکا ''ٹائمز آف انڈیا'' دے گیا۔ پروفیسر ابھینکار نے ''ٹائمز آف انڈیا'' دیکھنا شروع کیا تو ایک خبر تھی کہ مہاتما گاندھی نے تمام کانگرس کمیٹیوں کو ایک سرکولیٹر بھیجا ہے جس میں یہ تاکید کی گئی ہے کہ کوئی کانگرس کمیٹی نیلا ناگنی (یہ امریکن یا انگلش نوعمر خاتون کچھ عرصہ مہاتما گاندھی کے آشرم سیوا گرام

میں رہی وہاں اس کا ناجائز تعلق دہلی کے ایک شخص سے جو وہاں مقیم تھا۔ اور جب مہاتما گاندھی نے اس خاتون اسے باز پرس کی تو اس نے اپنے جرم کا اقرار کرلیا) کو پناہ یا امداد نہ دے۔ پروفیسر ابھینکار نے جب اس خبر کو پڑھا تو غصہ کے باعث آپ کا رنگ سرخ ہو گیا۔ آپ کرسی پر بیٹھ نہ سکے اور کھڑے ہو گئے آپ کے ہاتھوں میں اخبار تھا۔ آپ نے کھڑے ہو کر غصہ کی حالت میں کہا:

> ”کس قدر ظلم ہے کہ ایک نوجوان لڑکی نے جذبات سے مجبور ہو کر ایک غلطی کر دی تو اس کو نہ صرف آشرم سے نکال دیا گیا بلکہ اب سرکولر بھیجا گیا ہے کہ اس کو کوئی شخص امداد یا پروٹیکشن نہ دے۔ کیونکہ اس بیچاری نے اپنے عشق و محبت کا جرم کا اقرار کرلیا مگر اس فاحشہ لیڈر رانی کو کوئی نہیں پوچھتا۔ جس نے اپنی جوانی میں ایک بھی پولیٹیکل لیڈر نہ چھوڑا تھا۔ زندگی بھر بد چلن رہی۔ بدچلنی پھیلاتی رہی اور سب لوگوں میں پردھان بنی پھرتی ہے کیونکہ اس نے بدچلنی کا کبھی اقرار نہیں کیا۔“

ہم لوگ پروفیسر ابھینکار کے یہ الفاظ سن کر حیران بھی تھے اور آپ کی سچائی و جرأت کی داد بھی دے رہے تھے۔

ان دو واقعات سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ مرہٹے جو ایک مارشل یعنی فوجی خصوصیات کی قوم ہے بڑھاپے میں بھی کس قدر غیور، جوشیلے اور حق پسند ہیں۔ اور ایک سو سال کی غلامی کے بعد بھی ان کے اندر وہ حمیت موجود ہے جو اڑھائی تین سو سال پہلے سیواجی مرہٹہ میں تھی۔

☆☆☆☆☆☆☆

وضعداریاں

مرحوم قاضی صاحب سر عزیز الدین احمد وزیر اعظم دتیا میں جہاں اور درجنوں خوبیاں تھیں وہاں وضعداری کے اعتبار سے بھی وہ بہت ہی قابل احترام شخصیت تھے جب کسی شہر میں جاتے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ اپنے پرانے ملنے والے دوستوں کے ہاں نہ پہنچتے اور اگر کسی وجہ سے نہ جا سکتے تو خط لکھ کر معافی نہ چاہتے۔

قاضی صاحب مرحوم دہلی میں ہمیشہ سیسل ہوٹل میں قیام کرتے اور شاید اس ہوٹل کی تاریخ میں یہ واقعہ اپنی قسم کا واحد واقعہ ہے کہ قاضی صاحب تیس برس کے طویل عرصہ میں جب کبھی دہلی آئے اس ہوٹل میں ہی مقیم ہوئے اور کسی بھی دوسرے ہوٹل میں نہ ٹھہرے اس ہوٹل کی مالکہ ایک انگریز خاتون تھیں اس خاتون کے دل میں بھی قاضی صاحب کے لیے بہت عزت تھی اگر کمرے خالی نہ ہوں تو یہ خاتون وائسرائے کے تو کمرہ دینے سے انکار کر سکتی تھیں مگر یہ ممکن نہ تھا کہ قاضی صاحب کو ان کے پہنچنے پر یہ کہہ دیتیں کہ کوئی کمرہ خالی نہیں ہے۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ اگر کبھی ہوٹل کا کوئی کمرہ خالی نہ ہوا اور قاضی صاحب تشریف لے آئے تو اس بیچاری نے اپنا ذاتی کمرہ قاضی صاحب کے لیے خالی کر دیا اور خود کسی سٹور روم وغیرہ میں ایک دو دن قیام کر لیا۔ مگر قاضی صاحب کو جواب نہ دیا۔ قاضی صاحب سے راقم الحروف نے کئی بار کہا کہ نئی دہلی میں امپریل ہوٹل بہت اچھا ہوٹل ہے اس کی فضا بہت اچھی ہے اور سوسائٹی کے اعتبار سے بھی اعلیٰ طبقہ کے لوگوں کا مرکز ہے وہاں ٹھہرا کیجیے تو قاضی صاحب نے ہمیشہ ہی یہ جواب دیا کہ اتنے برس سے سیسل ہوٹل میں ٹھہرتا ہوں۔ وضعداری اس میں ہی ہے کہ زندگی میں جب کبھی دہلی آؤں۔ اسی ہوٹل میں ہی ٹھہروں۔

دہلی میں ایک حجام تھا جس کا میں نام بھول گیا ہوں اس کو "رائل باربر" کہا جاتا تھا اس حجام نے درجنوں بادشاہوں، درجنوں وائسراؤں، کمانڈر انچیفوں، گورنروں اور والیان ریاست کی حجامت بنائی۔ چنانچہ لارڈ کرزن اور لارڈ کچنر کے بعد کے تمام

وائسروں اور کمانڈر انچیفوں کے اس کے پاس سٹرٹیفکیٹ دیتے افغانستان کے کنگ حبیب اللہ اور امان اللہ کے علاوہ بہت سے ممالک کے ان بادشاہوں کی بھی اس نے حجامت بنائی جو ہندوستان میں آئے اور یہاں وائسرائے ہوس میں بطور مہمان مقیم ہوئے۔اور جب جارج پنجم کا دربار ہوا تو یہ شخص بھی سرکاری طور پر انگلستان میں مدعو کیا گیا اور وہاں اس نے کنگ جارج پنجم، کنگ ایڈورڈ (جو گدی سے دست بردار ہوئے) کی بھی حجامت بنائی قاضی صاحب مرحوم جب کبھی دہلی آتے یہ حجام ان کی حجامت کے لیے ہر روز صبح پانچ بجے سیسل ہوٹل میں پہنچ جاتا قاضی صاحب اس کو حجامت کی اجرت پانچ روپیہ روزانہ دیتے اور یہ شخص بھی منتظر رہتا کہ قاضی صاحب کب تشریف لائیں اور یہ سیسل ہوٹل جانا شروع کرے چنانچہ یہ حجام اگر کبھی راقم الحروف کو راستہ میں مل جاتا تو خیریت پوچھنے کے بعد یہی سوال کرتا کہ قاضی صاحب کب تشریف لارہے ہیں ایک روز میں بھی قاضی صاحب سے ملنے کے لیے صبح پانچ بجے سیسل ہوٹل گیا (قاضی صاحب سے ملنے کا بہترین وقت یہی تھا کیونکہ سکون سے باتیں کرسکتے تھے ورنہ سورج نکلنے کے بعد تو ان سے ملنے والوں کا ایک میلہ سا لگا رہتا تھا) تو یہ حجام قاضی صاحب کی حجامت بنا رہا تھا حجامت سے فارغ ہوا تو قاضی صاحب نے اسے اپنے ملازم سے پانچ روپیہ دلوادیئے جب حجام پانچ روپیہ لے کر چلا گیا اور قاضی صاحب ہاتھ منہ دھونے کے لیے غسل خانے میں تھے تو قاضی صاحب کے ایک ملازم نے قاضی صاحب کی فضول خرچی کا شکوہ کرتے ہوئے مجھ سے کہا کہ دوسرے نائی تو دو چار آنہ میں حجامت بنادیتے ہیں یہ شخص قاضی صاحب سے ہر روز پانچ روپیہ لے جاتا ہے۔قاضی صاحب نے اس ملازم کو مجھ سے باتیں کرتے ہوئے دیکھا تو میں مسکرادیا میرے مسکرانے پر قاضی صاحب نے پوچھا کہ کیا بات ہے میں نے جواب دیا کہ آپ کی فضول خرچی کا ذکر ہے کہ دوسرے حجام تو دو چار آنے شیو کا لیتے ہیں آپ پانچ روپیہ دیتے ہیں قاضی صاحب نے کہا سردار صاحب! یہ شخص ہیں

پچیس برس سے حجامت بنا رہا ہے اب تک تو میں اس وضعداری کو نبھائے جا رہا ہوں خدا کرے زندگی تک نبھائے چلا جاؤں۔ ہر شخص اپنی قسمت کا لیتا ہے کون کسی کو دیتا ہے اور کون کسی سے لیتا ہے نہ معلوم خدا ان لوگوں کے لیے ہی مجھے دیتا ہو۔

بھیا شیخ احسان الحق میرٹھ کی بھیا فیملی میں سے ہیں۔ یہ وہی فیملی ہے جو یو پی کے بہت بڑے رؤسا میں سے ہیں اور جس نے غدر 1857ء کے بعد برٹش گورنمنٹ کو کئی لاکھ روپیہ دے کر جامع مسجد دہلی واپس لی بھیا احسان کی وضعداری کے قصے بہت دلچسپ ہیں اور اس وضعداری کے باعث آپ نے اپنی زندگی میں لاکھوں روپیہ دوستوں پر صرف کیا بھیا ایک روز دفتر ''ریاست'' میں بیٹھے تھے تو راقم الحروف نے دیکھا کہ آپ کی ایک انگلی میں سیاہی مائل رنگ کا ایک چھلا پڑا ہے۔ یہ چھلا تنگ ہے اور انگلی موٹی ہے ایڈیٹر ریاست نے مذاقاً کہا کہ بھیا اگر چھلا پہننے کا ہی شوق ہے تو اس چھلے کو نکال دیجیے اور اس سے بڑا اچھا بازار سے خرید کر پہن لیجیے تاکہ انگلی کو تکلیف نہ ہو۔ بھیا نے اس کا کوئی جواب نہ دیا اور خاموش رہے لیکن ان کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں میں نے پوچھا کیا بات ہے آپ نے پھر بھی کچھ جواب نہ دیا جب زیادہ پوچھا تو آپ نے فرمایا ''پچیس تیس برس ہوئے بواسیر کی شکایت ہو گئی تھی بیوی نے بواسیر کا یہ چھلا کہیں سے منگا کر اپنے ہاتھ سے پہنا دیا۔ اس کے دو چار برس بعد بیوی بیمار ہو گئیں دماغ پر دیوانگی کا اثر ہے پہچان بھی نہیں سکتیں اور نہ کوئی بات کر سکتی ہیں اب اس چھلے کو اتارنے کو جی نہیں چاہتا محبت کے جذبات کے ساتھ بیوی نے پہنایا تھا اسے جدا کرنا گوارا نہیں'' بھیا احسان نے یہ کہا اور ان کی آنکھیں اور زیادہ ڈبڈبا آئیں۔

آج سے پچیس تیس یا چالیس برس پہلے تو عام لوگوں میں بھی وضعداری تھی اور یہ اپنی بات کا پاس کرتے تھے اب تو ہزارہا لوگوں میں سے شاید ایک آدھ ایسا نکل آئے جو اپنی وضع پر قائم ہو اور جس کو اپنی زبان یا اپنے شعار کا خیال ہو پندرہ برس کا عرصہ ہوا دہلی کی ایک نامور طوائف کا تعلق یہاں کے ایک ہندو رئیس سے تھا یہ رئیس زیور، کپڑا

اور دوسرے تمام اخراجات کے علاوہ اس طوائف کو پانچ سو روپیہ ماہوار (جو آج کے دو ہزار روپیہ کے برابر سمجھنا چاہئے) دیتا تھا اور یہ طوائف امیرانہ زندگی گزارتی تھی اس طوائف نے اپنی عمر کے درمیانی حصہ میں ایک پروفیسر سے شادی کر لی اور اپنی زندگی کو قطعی بدل دینے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ اس طوائف نے اپنے نکاح کے بعد جو سب سے پہلا کام کیا وہ یہ تھا کہ اس نے اپنا تمام زیور، کپڑا اور دوسرا سامان جمع کر کے ایک گاڑی میں رکھوایا اور اس رئیس کے ہاں واپس بھیج دیا اور ساتھ کہلا بھیجا کہ یہ تمام دیا تھا اب میں نے اپنی زندگی بدل لی ہے نہ اس سامان پر میرا کوئی حق ہے اور نہ میں اسے اپنے پاس رکھنا چاہتی ہوں یہ رئیس بہت فیاض اور فراخ دل تھے انہوں نے بہت کوشش کی کہ اس سامان کو یہ طوائف رکھ لے تا کہ اس کی آئندہ زندگی میں اس کے یا اس کے شوہر اور بچوں کے کام آئے مگر اس طوائف نے انکار کر دیا اور پھر کہلا بھیجا کہ جس صورت میں میرا اب آپ سے کوئی تعلق نہ ہوگا یہ وضعداری کے خلاف ہے کہ میں آپ کے دیے ہوئے سامان کو رکھوں یا استعمال کروں۔

موری درواہ کے ڈفرن برج کے بالکل قریب ایک صاحب لالہ رام چندر رہتے تھے۔ یہ وہی بزرگ تھے۔ جنہوں نے 1904ء کے دہلی دربار کے موقع پر دہلی میں سب سے پہلے موٹر منگائی تھی اور اس موٹر کو دیکھنے کے لیے والیان ریاست تک آئے تھے۔

1906ء میں لالہ رام چندر کے مرحوم سر اسرار حسن خاں (سابق ہوم منسٹر ریاست بھوپال و وزیر اعظم ریاست خیر پور) سے دوستانہ تعلقات ہو گئے اس زمانہ سے مرحوم سر اسرار حسن خاں جب کبھی دہلی آتے تو لالہ رام چندر جی کے ہاں قیام کرتے لالہ رام چندر اور سر اسرار حسن خاں کا انتقال ہوئے بہت برس ہو گئے سر اسرار حسن خاں جب تک زندہ رہے لالہ رام چندر کے ہاں اسی مکان میں قیام فرمایا کرتے سر اسرار حسن خاں کے عروج کو دیکھ کر درجنوں اصحاب نے اپنی بڑی بڑی کوٹھیاں پیش کیں اور کوشش کی کہ آپ ان کے ہاں قیام کریں مگر آپ نے ہمیشہ ہی انکار کیا اور

ایک بار راقم الحروف سے کہا ’’دوستوں کی جھونپڑی میں بھی وہ لطف ہے جو بڑے بڑے محلات میں بھی میسر نہیں اگر میں اس مکان میں قیام کرنا چھوڑ دوں تو یہ میری وضعداری اور دوستی کے شعار کے خلاف ہے۔‘‘

ان چند واقعات سے اندازہ کیجئے کہ آج سے چوتھائی صدی پہلے کے لوگ بھی کتنے وضعدار اور بامروت تھے اور اب ہماری حالت کیا ہے۔

☆☆☆☆☆

ریاستوں کی رعایا کا احساس کمتری

انگریزی علاقہ کے رہنے والے لوگ جو کبھی ریاستوں میں نہیں گئے وہ ریاستوں کی رعایا کے احساس کمتری (جس کو والیان ریاست وفا شعاری قرار دیتے تھے) کا اندازہ نہیں لگا سکتے اور ریاستوں کے لوگ والئ ریاست کو دل سے چاہے کتنی نفرت کرتے اور مظالم سے نالاں تھے مگر اس طوائف کی طرح جو کسی گندے میلے بدبودار اور معمر سیٹھ کو خوش کرنے کے لئے اپنے چہرے پر فرضی مسکراہٹ لاتی ہوئی سیٹھ صاحب سے اظہار محبت کرتی ہے ریاستوں کی پبلک بھی اپنے حکمران کی وفا شعاری کا مصنوعی طور پر دم بھرتی اور احساس کمتری کا یہ اثر صرف والیان ریاست کی اپنی رعایا پر ہی نہیں تھا بلکہ وہ لوگ بھی اس مرض میں مبتلا ہو جاتے جو ریاستوں کی عارضی طور پر ملازمت اختیار کرتے۔

ایڈیٹر ''ریاست'' جب نابھ میں ملازم ہوا تو ملازمت سے پہلے وہ اپنے آپ کو بطور ایک اخبار نویس کے بہت ہی انڈی پنڈنٹ سمجھتا تھا اور وائسرائے تک کی پروانہ کرنے کا دم بھرتا تھا مگر ریاست نابھ کی ملازمت اختیار کرنے کے بعد یہ آہستہ آہستہ خودداری سے محروم ہو گیا۔ خودداری کی جگہ احساس کمتری نے لے لی مہاراجہ نابھ کو مبرا عن الخطا اور ان داتا سمجھا جانے لگا اگر مہاراجہ کبھی ملنے کے لیے طلب کرتے تو ایسا محسوس ہوتا جیسے کوئی بہت بڑی عزت یا خطاب بخش دیا گیا اور اگر دوسرے لوگوں کو طلب کرنے کے بعد ایڈیٹر ''ریاست'' کو یاد نہ فرمایا جاتا تو ایسا محسوس ہوتا جیسے کسی نے بہت بڑی توہین کر دی ہے اور یہ احساس کمتری مجھ تک ہی محدود نہ تھا۔ اس میں وہاں کا ہر منسٹر، ہر افسر، ہر اہل کار، ہر ملازم اور ہر باشندہ مبتلا تھا اور صرف احساس کمتری ہی نہیں بلکہ حالت یہ تھی کہ اگر کسی سے مہاراجہ خوش تو ان کی تمام رعایا اس سے خوش اور اگر مہاراجہ ناراض تو ان کی تمام رعایا اس کی دشمن چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ اگر میں کبھی مہاراجہ سے ملنے کے لیے ہیرا محل گیا۔ مہاراجہ بہت خوش ہوئے اور بہت تپاک

سے ملے اور میں واپسی کے وقت اپنے گھر پیدل آیا (میرا مکان ہیرا محل سے دو فرلانگ کے قریب ہوگا) تو راستہ میں لوگوں نے میرے پیدل آنے سے اندازہ کرلیا کہ مہاراجہ ناراض ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ لوگ دیکھ کر منہ پھیر لیتے اور کوئی سلام تک نہ کرتا اور اگر میں ہیرا محل کسی اپنے کام یا پرائیویٹ سیکرٹری سے ملنے کے لیے جاتا۔ مہاراجہ کو میرے وہاں آنے کا علم تک بھی نہ ہوتا۔ واپسی کے وقت کوئی سرکاری موٹر اتفاق سے شہر کی طرف آ رہی ہوتی اور میں اس موٹر میں اپنے مکان تک بیٹھ جاتا تو لوگوں کو یہ احساس ہوتا کہ مہاراجہ بے حد خوش ہیں جو موٹر میں واپس گھر بھیجا تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ راستہ میں جو ملتا جھک جھک کر اور مسکرا مسکرا کر (گویا کہ یہ بھی میرے لیے خدا کا شکرانہ ادا کر رہے ہیں) سلام کرتا اس زمانہ میں ریاست نابھ میں سوائے سرکاری موٹروں کے کسی شخص کے پاس موٹر نہ تھی حالانکہ وہاں درجنوں جاگیردار موٹریں رکھ سکتے تھے موٹروں کی عدم موجودگی کا باعث لوگوں کا یہ احساس کمتری تھا کہ اگر موٹر خرید لی گئی تو سواری کے اعتبار سے یہ مہاراجہ کی برابری اور مقابلہ سمجھا جائے گا چنانچہ اگر میں غلطی نہیں کرتا۔۔۔ تو احساس کمتری کی حالت یہ تھی کہ لوگ اس زمانہ میں گھوڑا گاڑی رکھنا بھی تکبر، غرور اور سرکار کی برابری کرنا سمجھتے تھے۔

اس زمانہ میں نابھ میں دو یا تین تعلیم یافتہ اصحاب کا آپس میں ملنا بھی ایک قسم کی سازش قرار دیا جاتا تھا اور پبلک میں یہ احساس تھا کہ مہاراجہ کی مشکوک طبیعت لوگوں میں آپس میں ملنا گوارا نہیں کرتی۔ چنانچہ اگر ایک تعلیم یافتہ شخص کسی دوسرے تعلیم یافتہ سے ملتا تو چوروں کی طرح چھپ چھپ کر جس زمانہ میں ایڈیٹر ''ریاست'' نابھ میں تھا۔ اس زمانہ میں مسٹر ایس رنگا آئر (جو پہلے اخبار ''لیڈر'' الہ آباد میں تھے اور بعد میں ''رائز ویکلی'' دہلی کو ایڈیٹ کرتے رہے) ایک بنگالی مسٹر ہری پشادسور جو وہاں اسسٹنٹ سیکرٹری تھے اور مسٹر ہری رام سرکاری وکیل (جو بعد میں نابھ میں جج ہائیکورٹ تھے) ایڈیٹر ''ریاست'' کے دوستوں میں سے تھے ہم چاروں شام کے

وقت نابھ سے دوتین میل دور سیر کے لیے نکل جاتے یہ وقت گپ بازی میں اچھا گزر جاتا اور ہم ہمیشہ اس سڑک پر جاتے جہاں مہاراجہ جانا پسند نہ کرتے تا کہ مہاراجہ ہم چاروں کو ایک جگہ اکٹھے نہ دیکھ لیں۔

ایک روز کا واقعہ ہے کہ ہم سیر کے لیے گئے اور واپسی کے وقت حسب معمول کچھ اندھیرا سا ہو گیا تو ہم نے دیکھا کہ ایک موٹر بہت تیز روشنی کے ساتھ اسی سڑک پر آ رہی ہے۔ ہمیں فوراً احساس ہوا کہ یہ کار مہاراجہ کی ہے اور مہاراجہ ہم چاروں کو اکٹھے سیر کرتے دیکھ کر نا خوش ہوں گے۔ چنانچہ ہم نے فیصلہ کیا کہ سڑک سے ایک طرف دور چلے جائیں تا کہ مہاراجہ ہمیں دیکھ نہ سکیں موٹر تیزی کے ساتھ آ رہی تھی ہم نے مناسب یہی سمجھا کہ بھاگ کر سڑک سے دور فاصلے پر چلے جائیں تاریکی کافی تھی ہم دوڑ رہے تھے۔ تاریکی میں کچھ نظر نہ آتا تھا نتیجہ یہ ہوا کہ دوڑتے ہوئے مسٹر رنگا آئر ٹھوکر کھا کر گر پڑے اور ان کے گھٹنوں کو بہت سخت چوٹ آئی اتنے میں موٹر نکل گئی مسٹر رنگا آئر تو تکلیف کے باعث سی سی کر رہے تھے اور ہم تینوں کے لیے اپنی ہنسی ضبط کرنا مشکل تھا گو اس ہنسی میں ہمدردی کے جذبات بھی تھے۔ جب مسٹر رنگا آئر اپنے کپڑے جھاڑ کر کچھ لنگڑاتے ہوئے ہمارے ساتھ واپس آ رہے تھے تو میں نے ان سے مذاقاً کہا "ارے کم بخت میں تو اردو اخبار کو ایڈٹ کرتا رہا اور اردو اخبارات کے لیے میدان تنگ ہے اس لیے یہاں دھکے کھا رہا ہوں انگریزی کے اخبارات تو ملک میں بہت کافی ہیں تم نے یہاں آنے کی جھک کیوں ماری۔"

مہاراجہ کی موٹر کے سلسلہ میں لوگوں کے لیے یہ بہت دقت تھی کہ اگر کوئی شخص موٹر کو دور سے دیکھ کر ہاتھ باندھے ہوئے ادب سے کھڑا نہ ہو اور مہاراجہ اس موٹر کے اندر موجود ہوں تو یہ مہاراجہ کی بے ادبی اور توہین سمجھی جاتی تھی۔ اور اگر مہاراجہ کی موٹر کو آتے دیکھ کر وہ ہاتھ باندھے ادب سے کھڑا ہو گیا اور قریب آ کر معلوم ہوا کہ موٹر میں مہاراجہ موجود نہیں ہیں۔ صرف ڈرائیور خالی کار کو لیے جا رہا ہے تو ادب سے ہاتھ

باندھے کھڑے ہونے کا ڈرائیور نے مذاق اڑایا۔ چنانچہ ایک بار رات کا وقت تھا میں سیر سے واپس آ رہا تھا تو سامنے سے موٹر آ گئی ۔ میں بھی احساس کمتری کے باعث دوسری کی طرح ہاتھ باندھ کر ادب سے کھڑا ہو گیا۔ جب موٹر قریب آئی تو موٹر کھڑی ہو گئی میں نے دیکھا کہ گاڑی تو مہاراجہ کی ہے مگر اس میں اگلی سیٹ پر مہاراجہ کے پرائیویٹ سیکرٹری سردار بہادر گوردیال سنگھ بیٹھے ہیں سردار گوردیال سنگھ بہت اچھی طبیعت کی شخصیت تھے اور ایڈیٹر ''ریاست'' کے مخلص دوست تھے۔ آپ نے کار کے کھڑا ہونے پر بتایا کہ کار میں صرف وہ ہیں۔ مہاراجہ نہیں ہیں جس کا مطلب یہ تھا کہ میرا ہاتھ باندھے کھڑا ہونا غلط فہمی کا باعث ہے۔ سردار گوردیال سنگھ کے اس ارشاد پر میں نے جو جواب دیا وہ یہ تھا:

> ''ریاست نابھ میں مہاراجہ صاحب کو ٹھاکروں کی پوزیشن حاصل ہے اور مہاراجہ کی موٹر کو ٹھاکر دوارہ کی ٹھاکر دوارہ میں گو ٹھاکر نہ ہوں پھر بھی لوگوں کا فرض ہے کہ وہ ٹھاکر دوارہ کو سجدہ کریں۔''

میرے یہ الفاظ سن کر سردار گوردیال سنگھ قہقہہ مار کر ہنس پڑے اور پھر دوسری باتیں شروع ہو گئیں۔

احساس کمتری صرف نابھ کے لوگوں میں ہی موجود نہ تھا بلکہ اس وبا سے ہندوستان کی کوئی ریاست بھی خالی نہ تھی اور احساس کمتری کی لعنت سے ریاستوں کو پاک کرنے کی صرف ایک ہی صورت تھی کہ والیان ریاست کا اقتدار و اثر ختم کر کے ریاستوں میں پبلک کی ذمہ دار حکومتیں قائم کی جاتیں۔

☆☆☆☆☆☆

شہرت باعث راحت نہیں

جس طرح شادی نہ ہونے کی صورت میں انسان کے دل میں انتہائی خواہش ہوتی ہے کہ اس کی شادی ہو اور جب شادی ہو جائے تو شادی ہونے کا اسے بار بار افسوس ہوتا ہے۔ اس طرح ہی شہرت حاصل کرنے کی بھی کیفیت ہے۔ انسان جب تک شہرت حاصل نہ کرے۔ قدرتی طور پر اس کے دل میں خواہش ہوتی ہے کہ لوگوں میں اس کی شہرت ہو اور لوگ اس کو جانیں مگر لوگ جب اسے جانتے ہوں اور اس کی شہرت ہو جائے تو اسے رہ رہ کر افسوس ہوتا ہے کہ لوگ اسے کیوں جانتے ہیں اور وہ گمنامی کی زندگی بسر کیوں نہیں کر رہا۔ کیونکہ پبلک میں شہر ہونے کی صورت میں اس کی زندگی کا ہر کام۔ ہر فعل اور ہر قدم چاہے وہ کتنا ہی پرائیویٹ اور نجی حیثیت رکھتا ہو۔ پبلک کی نظروں میں قابل تنقید قرار دیا جاتا ہے اور شہرت نہ ہونے کی صورت میں چاہے انسان کوئی برے سے برا فعل کرے وہ قابل تعزیر نہیں سمجھا جاتا۔

اخبارات کے دفاتر میں پبلک کی طرف سے جو خطوط آتے ہیں وہ ورائٹی کے اعتبار سے بہت کافی مواد کے حامل ہوتے ہیں اور ان کا وہ حصہ تو بہت ہی دلچسپ ہوتا ہے جس میں مضامین یا نظمیں بھیجنے والے اصحاب اپنے نام کے ساتھ خود ہی ''عالی جناب''، ''مایہ ناز ادیب'' ''شاعر بے مثال، ''خطیب ہند''، ''شاعر انقلاب''، ''جناب حضرت'' اور ''آفتاب سخن'' وغیرہ لکھ دیتے ہیں تاکہ یہ القابات اس طرح سے ہی شائع ہو جائیں اور پبلک میں ان کو شہرت نصیب ہو کیونکہ ان بچاروں کو علم نہیں کہ شہرت یافتہ ہونے کی صورت میں انسان کے لیے کتنی بڑی مصیبت ہے اور گمنامی میں کتنی راحت اور آرام ہے۔

یہ درست ہے کہ ایڈیٹر ''ریاست'' کو بھی پبلک میں آنے سے پہلے شہرت کی خواہش تھی مگر یہ واقعہ ہے کہ اگر یہ خواہش تھی تو یقیناً یہ بہت ہی محدود تھی اور راقم السطور نے جرنلزم کا پیشہ اختیار کرنے کے بعد تو یہ ہمیشہ ہی کوشش کی کہ یہ عام لوگوں کی نظروں

سے دور رہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ’’ریاست‘‘ کو پڑھنے اور اس کا اعتراف کرنے والوں کا حلقہ تو بہت کافی وسیع ہے مگر ایڈیٹر ’’ریاست‘‘ سے ملنے والوں کا حلقہ بہت ہی محدود ہے اور ایڈیٹر ’’ریاست‘‘ اگر کبھی بازار میں جائے تو گنتی کے صرف چند لوگ ہوں گے جن کو اس سے ملنے یا کبھی دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ چنانچہ یہ کیفیت بے حد دلچسپ ہے کہ اگست 1942ء میں ایڈیٹر ’’ریاست‘‘ جب کانگرسی حضرات کے ساتھ گرفتار ہو کر دہلی جیل گیا تو وہاں دہلی کے ساٹھ کے قریب پولیٹیکل قیدیوں میں سے ’’ریاست‘‘ سے تو تمام ہی واقف تھے مگر ایڈیٹر ’’ریاست‘‘ کو ذاتی طور پر جاننے والے شاید چار یا پانچ سے زیادہ اصحاب نہ تھے اور یہی کیفیت ملتان جیل میں تھی۔ وہاں چھ سو کے قریب پولیٹیکل نظر بند تھے مگر ایڈیٹر ’’ریاست‘‘ سے ذاتی طور پر واقف۔ شاید ایک درجن سے زیادہ اصحاب نہ ہوں گے اور افسوس ہوتا تھا جب ان میں سے اکثر نئے اصحاب اخلاص و محبت کا اظہار کرنے کے لیے ملنے آتے کیونکہ تعلقات کو محدود رکھنے کی وہاں کوئی صورت ممکن نہ تھی اور ذہنی اعتبار سے میرے لیے وہی شہرت کافی باعث کوفت تھی۔ جو اس سے پہلے مجھے بطور ایک اخبار نویس کے حاصل ہو چکی تھی۔

مجھے اچھی طرح سے یاد ہے سنٹرل اسمبلی کے میرے ایک دوست کو گانا سننے کا بہت شوق تھا۔ آپ اسمبلی کے سیشن کے لیے دہلی آئے اور یہاں کام کی زیادتی کے باعث ان کا جی تفریح اور گانا سننے کے لیے چاہا تو آپ شہرت کے باعث دہلی کے کسی طوائف کے ہاں جا نہ سکتے۔ اور نہ یہ ممکن ہوتا کہ وہ کسی طوائف کو اپنے ہاں بلا سکیں (اب گورنمنٹ کی مہربانی سے اچھی سے اچھی طوائف کا گانا ریڈیو پر گھر میں ہی سنا جا سکتا ہے) تو بیچارے لوگوں کی نظروں سے بچ کر میرٹھ جاتے اور وہاں اپنا گانا سننے کا ’’ٹھرک‘‘ پورا کر آتے۔ ان کی اس مہنگی تفریح کا ایک بار ذکر آیا تو آپ نے ایڈیٹر ’’ریاست‘‘ سے کہا کہ میرٹھ جا کر گانا سننا مہنگی تفریح ہے مگر اس صورت میں کہ یہ تفریح دہلی میں ہو زیادہ مہنگی ثابت ہوگی۔ کیونکہ یہاں اکثر لوگ مجھے جانتے ہیں۔ لوگوں

میں یہ چرچا ہوگا کہ میں ممبر اسمبلی ہوتے ہوئے طوائفوں کے ہاں جاتا ہوں۔ حالانکہ میں زندگی میں کبھی بھی کسی طوائف کے ہاں بدچلنی کی نیت سے نہیں گیا اور میری تفریح صرف موسیقی تک ہی محدود ہے۔ یعنی ان صاحب کے لیے ممبر اسمبلی ہونے کی شہرت وبال جان تھی۔ حالانکہ یہ شہرت ان لوگوں کے لیے باعث کشش و رغبت ہے جو اسے حاصل نہیں کر سکے۔

ایک رانی صاحبہ نے شہرت کے سلسلے میں راقم الحروف سے بہت دلچسپ بات کہی آپ نے فرمایا کہ عورتوں میں بے معنی باتیں کرنے کی بہت عادت ہے اور جب ملیں تو یہ سوال عام طور پر پوچھتی ہیں ''تمہارے شوہر کیا کام کرتے ہیں'' ''تمہارے میکے کہاں ہیں'' ''خدا کے فضل سے تمہارے کتنے بچے ہیں'' ''تمہارے شوہر کیا تنخواہ پاتے ہیں'' وغیرہ ان ایسے سوالات کا کیا جواب دیا جائے اگر آپ یہ کہیں کہ آپ فلاں ریاست کی رانی ہیں تو مزید سوالات کی وہ بوچھاڑ جو کئی ہفتوں تک ختم نہ ہو۔ چنانچہ آپ پچھلے چند برس سے اپنے شوہر کے متعلق تو صرف یہی جواب دے دیا کرتیں کہ ''میرے پتی فوج میں ملازم ہیں اور لڑائی پر گئے ہوئے ہیں کچھ پتہ نہیں کہ کب واپس آئیں۔''

اس خاتون نے کہیں جانا ہو تو سیکنڈ کلاس میں سفر کرتی ہیں تاکہ لوگ ان کو رانی نہ سمجھیں کیونکہ رانی ہونے کی شہرت بھی ان کے لیے کافی مصیبت کا باعث ہو سکتی ہے اور لوگ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگتے ہیں۔

ایڈیٹر ''ریاست'' بھی جب سفر میں ہو تو وہ کبھی یہ نہیں بتاتا کہ وہ کون ہے؟ کہاں سے آیا اور کہاں جا رہا ہے۔ اور اگر کوئی سوال کرے تو جواب بے اعتنائی کے ساتھ صرف یہ ہوتا ہے میں گوجرانوالہ کے ضلع کے ایک گاؤں کا رہنے والا ہوں اور اپنا ذاتی کاروبار کرتا ہوں'' تاکہ ہم سفر مزید سوالات دریافت نہ کریں کیونکہ اگر یہ معلوم ہو جائے کہ میرا اخبار ''ریاست'' سے تعلق ہے تو سوالات شروع ہو جاتے ہیں ''کیا ہٹلر

فی الحقیقت مر گیا یا زندہ ہے۔ ''سوبھاش بابو کب تک ظاہر ہو جائیں گے'' فلاں مہاراجہ کے کتنی بیویاں ہیں، ''نظام دکن کے پاس کتنا روپیہ ہو گا؟'' مسٹر جناح انگریزوں سے ملے ہوئے تھے یا نہیں۔ وغیرہ یہ لوگ اپنی معلومات کو وسیع کرنے کے لیے صرف سوالات کرنا جانتے ہیں۔ یہ نہیں سوچتے کہ نہ تو اخبارات کے ایڈیٹروں کے ساتھ ہٹلر کی خط و کتابت ہے نہ سوبھاش چندر بوش کبھی ان سے بذریعہ وائرلیس بات کرتے ہیں۔ نہ یہ نظام کے خزانہ کے خزانچی ہیں اور نہ ان لوگوں کی بیویاں شمار کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ تمام بے معنی سوالات صرف اس جرم میں کیے جاتے ہیں کہ اخبارات کی لوگوں میں شہرت ہے اور لوگ ایڈیٹروں کے نام سے واقف ہیں۔

اگر شہرت کے نتائج پر غور کیا جائے تو شاید ہندوستان میں سب سے زیادہ مصیبت میں شخصیت مہاتما گاندھی کی تھی۔ جن بچاروں کے پاس چوبیس گھنٹوں میں ایک لمحہ بھی ایسا نہیں تھا جو ان کا اپنا ذاتی کہا جا سکے اور جو اگر سفر اختیار کرتے تو چاہے یہ بیمار ہوتے اور ان کی زندگی ہی خطرہ میں کیوں نہ ہوتی یہ ہو نہیں سکتا تھا کہ رات کے وقت بھی لوگ ان کے درشن کے لیے ریلوے سٹیشنوں پر جمع نہ ہوتے اور ان کی نیند میں مخل ہو کر ان کے لیے وبال جان ثابت نہ ہوتے۔

جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ شہرت انسان کے لیے باعث راحت اور سرمایہ اطمینان و مسرت ہے وہ غلطی پر ہیں شہرت میں صرف اس وقت تک ہی کشش ہے جب تک کہ یہ حاصل نہیں ہوتی۔ اور جب شہرت حاصل ہو جائے تو انسان کو افسوس ہوتا ہے کہ لوگ اس کو جانتے کیوں ہیں اور وہ گمنامی کی زندگی کیوں بسر نہیں کر رہا۔ مگر یہ افسوس لا حاصل ہوتا ہے شہرت کا داغ مٹانے سے کہاں مٹے اور اس وقت تک تو اس کے مٹنے کا سوال ہی نہیں جب تک کہ انسان پبلک لائف میں ہو اور اس کے دیئے گئے بیانات یا لکھے گئے مضامین پبلک میں آ رہے ہوں۔

☆☆☆☆☆

تجارتی ہتھکنڈے

روزانہ ’’رعیت‘‘ (جو میں نے اور خواجہ حسن نظامی نے دہلی سے جاری کیا تھا) نقصان کے باعث بند کر دیا گیا تو میں دیو بند کے ایک بنئے لالہ اوگرسین کے ساتھ بمبئی چلا گیا۔ جہاں لالہ جی نے اوگرسین اینڈ کمپنی کے نام سے آڑھت کا کاروبار جاری کیا۔ میں ان کے پاس ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار پر ملازم تھا۔ لالہ اوگرسین تجارتی ذہنیت کے بزرگ تھے۔ آپ نے بمبئی میں جب سبز کیلا بہت کثرت کے ساتھ فروخت ہوتے دیکھا تو آپ نے کیلا فروخت کرنیوالوں سے کچھ معلومات حاصل کیں کہ یہ کیلا کہاں پیدا ہوتا ہے۔ کہاں اس کی مارکیٹ ہے اور کہاں کہاں جاتا ہے۔ تا کہ اس کاروبار کو جاری کر سکیں۔ یہ معلومات حاصل کرنے کے بعد آپ نے مجھے بمبئی سے کچھ فاصلے پر بسین بھیجا۔ یہ بسین مغربی ہندوستان میں کیلے کی سب سے بڑی منڈی ہے۔ اس علاقہ میں ہی سبز کیلا (جسے بمبئی کا کیلا کہا جاتا ہے) پیدا ہوتا ہے اور تمام ہندوستان میں فروخت کے لیے جاتا ہے۔

میں بسین ریلوے سٹیشن پہنچا وہاں سے تانگہ میں سوار ہو کر شہر گیا۔ جہاں کہ کیلے کی مارکیٹ ہے اس مارکیٹ میں جانے کے بعد معلوم ہوا کہ کیلے کی بھری ہوئی درجنوں گاڑیاں ہر روز شمالی اور وسطی ہندوستان کو جاتی ہیں اور تمام کی تمام مارکیٹ پنجاب کے تین چار اصحاب کے ہاتھوں میں ہے جو ایک ہی خاندان میں سے ہیں۔ کوئی دوسرا شخص یہ کاروبار نہیں کرتا۔ اور ان اصحاب نے اس تجارت سے لاکھوں روپیہ پیدا کیے ہیں۔

میں یہ معلومات حاصل کرنے کے بعد سیدھا ان پنجابیوں کی دکان پر گیا۔ ان لوگوں نے مجھے پنجابی دیکھا تو بہت تپاک سے ملے۔ چند منٹ دکان پر بات چیت کرنے کے بعد اپنے گھر لے گئے۔ کھانا کھلایا پوچھا کہ بسین کس طرح آئے۔ میں نے جواب دیا کہ سنا تھا یہاں کیلا کثرت کے ساتھ پیدا ہوتا ہے۔ پنجاب سے بمبئی آیا

تھا۔ سیر کے لیے یہاں آ گیا۔ کھانا کھانے کے بعد میں پھر ان کے ساتھ ان کی دکان پر واپس آ گیا اور باتیں شروع ہوئیں تو انہوں نے بتایا کہ یہ تمام ایک ہی خاندان سے ہیں۔ بیس برس سے بمبئی میں کاروبار کرتے ہیں۔ تمام مارکیٹ ان کے ہاتھوں میں ہے اور اب تک لاکھوں روپیہ پیدا کر چکے ہیں۔ ان کے یہ بتانے کے بعد میں نے ان سے سوال کیا کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ یہ کاروبار تمام کا تمام آپ کے ہاتھوں میں ہے اور کوئی گجراتی، پارسی یا مرہٹہ یہ کام نہیں کرتا۔ میرے اس سوال پر ان چاروں بھائیوں میں سے ایک نے بہت فخر کے ساتھ اپنی ہوشیاری اور قابلیت کا اظہار کرتے ہوئے کہا:

> ''ہم کسی بیوپاری کو یہاں قدم جمانے نہیں دیتے۔ اگر کوئی شخص یہاں کیلے کا کاروبار کرتا ہے تو ہم مارکیٹ میں سے فوراً گراں نرخ پر کیلا خریدنا شروع کر دیتے ہیں اور ارزاں نرخوں پر دساور میں فروخت کرتے ہیں۔ ہم دو ار ماہ میں دس پندرہ یا بیس ہزار روپیہ کا نقصان اٹھاتے ہیں اور وہ نیا بیوپاری بھی ہمارے ساتھ اتنا ہی نقصان اٹھاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نیا بیوپاری اپنا دس پندرہ یا بیس ہزار روپیہ سرمایہ نقصان میں دے کر یہاں سے بھاگ جاتا ہے اس کے جانے کے بعد ہم مارکیٹ میں قیمت پھر کم کر دیتے ہیں اور جو نقصان ہوا تھا وہ دو چار ماہ میں پھر پورا کر لیا جاتا ہے۔ چنانچہ پچھلے بیس برس سے ہم نے کسی کو موقع نہیں دیا کہ وہ یہاں جم کر کاروبار کر سکے۔''

میں نے اس ملاقات میں ان سے باتوں باتوں میں تمام راز دریافت کر لیے کہ یہ کس نرخ پر مال خریدتے ہیں کس نرخ پر دساور بھیجتے ہیں۔ ان کا مال کس کس جگہ جاتا ہے اور ان کی ماہوار کتنی آمدنی ہے میں تمام معلومات حاصل کرنے کے بعد بمبئی واپس پہنچا۔ سیٹھ اوگرسین کو تمام حالات بتائے۔ سیٹھ صاحب یہ کاروبار کرنا چاہتے تھے۔ مگر

ان میں یہ اہمیت نہ تھی یا وہ تجارتی اعتبار سے اس نقصان کو برداشت کرنا نہ چاہتے تھے ۔ جو کیلے کے ان پنجابی سوداگروں کے تجارتی ہتھکنڈوں کے مقابلہ میں ان کو برداشت کرنا پڑتا ۔ چنانچہ سیٹھ اگرسین نے کیلے کا کاروبار کرنے کا ارادہ ملتوی کر دیا ۔

اگر تجارتی دنیا پر غور کیا جائے تو تجارت نام ہی ہتھکنڈوں کا ہے ۔ تجارتی رقیبوں کو گرانا ۔ خود آگے بڑھنا اور ایک روپیہ کے چار روپیہ بنانا وغیرہ ۔ یہ سب ہتھکنڈے ، جھوٹ ، فریب اور بے ایمانی تجارتی اعتبار سے ناجائز اور رقابیت سمجھی جاتی ہے اور اس بدعت میں ہر تاجر مبتلا ہے ۔ جو انتہائی افسوس ناک ہے ۔

☆☆☆☆☆☆
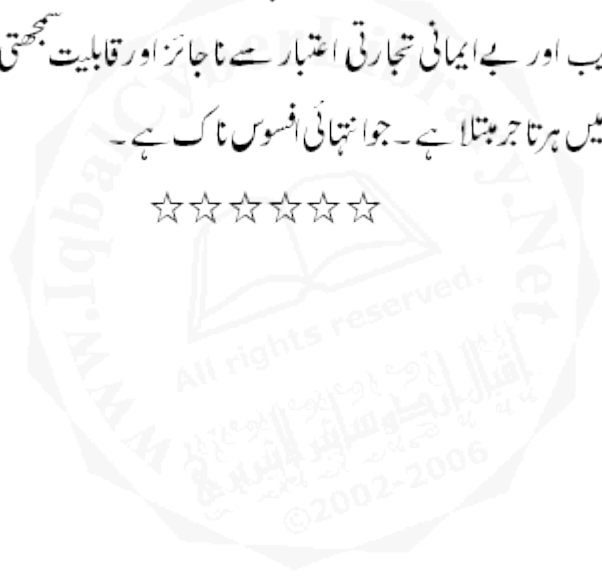
مہاتما گاندھی سے ملنے کی آرزو

اخبار ''ریاست'' کو جاری ہوئے ایک یا ڈیڑھ سال کا عرصہ ہوا تھا کہ مہاتما گاندھی نے مرحوم مولانا محمد علی کے مکان کوچہ چیلاں دریا گنج پر اکیس روز کا فاقہ شروع کیا۔ اس فاقہ کے شروع ہونے سے چند روز پہلے اور فاقہ شروع ہونے کے بعد چند روز تک مرحوم مولانا مہاتما جی کو سیر کے لیے شام کے وقت موٹر پر لے جاتے۔ مرحوم مولانا محمد علی ایڈیٹر ''ریاست'' پر بہت کرم فرماتے اور نہ صرف آپ کے دل میں ''ریاست'' کی پالیسی کی قدر تھی ذاتی اعتبار سے بھی وہ میرے ساتھ ایسا سلوک کرتے جیسا کہ بزرگ اپنے عزیزوں کے ساتھ کرتے ہیں۔ ایک روز میں دہلی دروازہ کی طرف سے (جہاں کہ میرا رہائشی مکان تھا) شہر کی طرف پیدل آ رہا تھا اور مولانا موٹر میں مہاتما جی کے ساتھ سیر کے لیے شہر کی طرف سے دہلی دروازہ کی طرف جا رہے تھے۔ مولانا نے جب مجھے دیکھا تو آپ نے ڈرائیور کو اپنی موٹر کھڑی کرنے کے لیے کہا۔ جب موٹر کھڑی ہوئی تو میں نے سمجھا کہ شاید اپنی کسی ضرورت کی وجہ سے گاڑی کھڑی کی ہوگی میں نے توجہ نہیں دی۔ کیونکہ موٹر اپنی بائیں طرف کو جا رہی تھی اور میں موٹر کے داہنی طرف پٹڑی پر تھا۔ گاڑی کھڑے ہوتے ہی مولانا نے مجھے آواز دی میں نے محسوس کیا کہ مولانا نے مجھ سے بات کرنے کے لیے ہی گاڑی کھڑی کی ہے۔ میں تیز قدمی کے ساتھ موٹر کے قریب پہنچا اور مولانا اور مہاتما جی کو سلام کیا تو مولانا نے تعارف کراتے ہوئے مہاتما جی سے کہا ''یہی دیوان سنگھ صاحب ایڈیٹر ''ریاست'' ہیں جن کے متعلق میں نے آپ سے ذکر کیا تھا۔'' اس تعارف کے بعد مہاتما جی نے اپنے خاص گاندھیانہ انداز میں ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا کہ ''مولانا صاحب نے آپ کی اور آپ کے اخبار کی بہت تعریف کی ہے میں آپ سے مل کر بہت خوش ہوا۔ آپ اچھے ہیں؟'' میں نے اس کے جواب میں کہا ''آپ کی مہربانی ہے'' اس واقعہ کے بعد آج تک مجھے مہاتما گاندھی سے ملنے یا ہم کلام ہونے کا کبھی

موقع نہیں ملا۔ہاں لاہور کانگرس کے دنوں میں دو تین روز مہاتما جی کو دیکھنے کا اتفاق ضرور ہوا۔

اخبارات کے ایڈیٹر خبریں حاصل کرنے یا اپنے تعلقات کو بڑھانے کے لیے دوسرے عام لوگوں کے مقابلے پر بہت مستعد ہوتے ہیں اور بغیر ضرورت کے بھی ہر جگہ گھس جاتے ہیں مگر راقم الحروف طبعاً اور فطرتاً اس کی قطعی طور پر ضد ہے۔ چنانچہ شاید یہ حیرانی کے ساتھ سنا جائے گا کہ میں مرکزی گورنمنٹ کے موجودہ منسٹروں سے بھی سوائے دو تین کے کسی سے کبھی نہیں ملا۔

ہر سال دہلی میں لیڈروں کے دو چار پروسیشن نکلتے ہیں اور بڑے بڑے جلسے ہوتے ہیں۔ میں کبھی کسی جلسے یا جلوس کو دیکھنے کے لیے نہیں گیا۔ مجھے یہ بھی علم نہیں کہ دہلی کانگرس کمیٹی کا دفتر کہاں ہے اور اگر میں بتا دوں کہ میں آخری بار دہلی میں سکھوں کے کسی گوردوارہ میں کب گیا تو شاید اکالی میرے سکھ نہ ہونے کا فتویٰ ہی صادر کر دیں۔ یہ سب کچھ اس لیے نہیں کہ میں طبعاً متکبر یا مغرور ہوں۔ تکبر اور غرور کو تو میں کمینہ پن سمجھتا ہوں۔ یہ صرف اس لیے ہے کہ میں بغیر کام کے کسی شخص سے ملنا اس کا وقت ضائع کرنا مناسب نہیں سمجھتا۔ جلسوں اور جلوسوں میں شامل ان لوگوں کو ہونا چاہیے جو زندہ باد کے نعرے لگانے والے ہوں یا نعرے لگوا کر خوش ہوں اور گوردواروں یا عبادت گاہوں میں جانے اور عبادت کرنے کے متعلق میرا نظریہ عام لوگوں سے بالکل مختلف ہے۔

باوجود درشن کرنے اور درشن کرانے والوں سے طبعاً اس قدر اختلافات کے کئی برس سے یہ آرزو تھی کہ میں مہاتما گاندھی کے قریب دو تین ہفتہ قیام کروں۔ ان کی زندگی کا گہری نظر سے مطالعہ کروں اور اگر ممکن ہو تو اپنے کریکٹر کے لیے ان سے کچھ حاصل کروں۔ کیونکہ میرا یقین ہے کہ حق و صداقت کے اعتبار سے موجودہ دور تو کیا پچھلے سو برس سے بھی مہاتما گاندھی جیسی شخصیت پیدا نہیں ہوئی۔

راجپوتانہ کے قومی ورکر مسٹر رام نرائن جی چودھری کئی برس تک مہاتما گاندھی کے پاس رہے وہ سیوا گرام آشرم میں اکثر آتے جاتے اور کئی کئی ماہ قیام کرتے۔ چودھری صاحب ایڈیٹر ''ریاست'' کے گہرے دوستوں میں سے ہیں آپ جب کبھی دہلی تشریف لاتے اور ایڈیٹر ''ریاست'' سے ملتے تو جتنی دیر ایڈیٹر ''ریاست'' سے ملتے مہاتما گاندھی کے کریکٹر، خصوصیات اور حالات کا ہی ذکر ہوتا۔ ایڈیٹر ریاست نے 1939ء کے آخر میں چودھری صاحب سے خواہش ظاہر کی کہ جب چودھری صاحب سیوا گرام آشرم میں موجود ہوں تو ایڈیٹر ''ریاست'' آئے اور وہاں دو ہفتہ قیام کرے۔ چودھری صاحب نے اس خواہش کو سن کر پسندیدگی کا اظہار کیا اور کہا کہ آپ مہاتما گاندھی سے مل کر تاریخ مقرر کریں گے۔ چودھری صاحب نے سیوا گرام آشرم میں پہنچ کر مہاتما گاندھی سے ذکر کیا تو مہاتما جی اور چودھری صاحب کے درمیان ایڈیٹر ''ریاست'' کے متعلق یہ بات چیت ہوئی۔

مہاتما گاندھی: یہ ایڈیٹر ''ریاست'' کیسا آدمی ہے۔ میں نے سنا ہے کئی راجوں اور نوابوں نے اس پر مقدمے چلائے مگر اس نے کبھی پرواہ نہیں کی۔

چودھری صاحب: یہ بہت اچھا آدمی ہے بڑا بے خوف، نڈر اور بہادر ہے جو جی چاہتا ہے کرتا ہے کسی کی پرواہ نہیں کرتا اور سینٹی مینٹل سا آدمی ہے۔ اگر وہ یہاں آیا اور اس کو یہ آشرم پسند آ گیا تو شاید یہ یہیں سے اپنے دفتر کو خط لکھ دے کہ اخبار بند کر دو اور یہ یہاں ہی ہمیشہ کے لیے رہ جائے۔ دہلی واپس ہی نہ جائے۔

مہاتما گاندھی: ایسے آدمی سے تو ضرور ملنا چاہئے۔ آپ لکھ بھیجئے کہ جگہ کی قلت ہے۔ نئی جگہ تیار ہو رہی ہے۔ دو ہفتہ میں تیار ہو جائے گی۔ اس وقت آجائیں تاکہ ان کو رہائش کی تکلیف نہ ہو۔

رام نرائن جی چودھری نے مجھے خط لکھا کہ دو ہفتہ تک نئے کمرے تیار ہو جائیں گے۔ اس وقت آجائیے۔ مہاتما جی سے پوچھ لیا ہے اب فوراً آنے کی صورت میں

رہائش کی تکلیف ہوگی۔ میں نے چودھری صاحب کو اس خط کا جواب لکھا کہ آپ مہاتما جی سے عرض کیجئے کہ میں سیوا گرام آشرم میں ایک بھکشو (گداگر یا طالب علم) کی حیثیت سے آؤں گا۔ میرے آرام کا کیا سوال ہے میں تو کسی جھونپڑی کے برآمدہ کو ہی شاہی محل سے کم نہ سمجھوں گا یا میں رام نرائن کے کمرہ میں ہی ایک کونہ میں بستر ا بچھا لوں گا۔ مجھے آرام و راحت کی کوئی پروانہیں میرے اس خط کے جواب میں چودھری صاحب کا پھر خط آیا اور یہ فیصلہ ہوا کہ میں ہفتہ تک سیوا گرام آشرم میں پہنچ جاؤں اور جب تک وہاں قیام کروں گا چودھری صاحب بھی وہاں موجود رہیں گے۔

میں سیوا گرام جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا اور دفتر کے انتظام کے لیے دفتر والوں کو ہدایتیں دے رہا تھا کہ میری روانگی سے تین روز پہلے نوٹوں کے مقدمے میں میری گرفتاری ہوگئی اور میں ضمانت نامنظور ہونے کے باعث جیل بھیج دیا گیا۔ اس مقدمہ میں دو سال سے زیادہ عرصے تک مصروف رہا اور سیوا گرام آشرم نہ جا سکا۔ میری اس گرفتاری کے موقعہ پر بھی مہاتما گاندھی اور رام نرائن جی کے درمیان جو بات چیت ہوئی وہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ چودھری جی نے مجھے بتایا کہ مہاتما گاندھی نے میری گرفتاری کے ایک دو روز بعد ''ٹائمز آف انڈیا'' میں میری گرفتاری کی خبر پڑھی اور اس خبر کو پڑھتے ہی آپ نے رام نرائن جی کو ان کے کمرے سے طلب فرمایا۔ مہاتما جی اس وقت جسم پر مالش کرا رہے تھے۔ جب رام نرائن جی آئے۔ تو مہاتما جی نے رام نرائن جی کو ٹائمز آف انڈیا کا پرچہ دیتے ہوئے کہا:

''رام نرائن جی! آپ نے یہ خبر پڑھی آپ کے دوست دیوان سنگھ ایڈیٹر'' ریاست'' جعلی نوٹوں کے مقدمے میں گرفتار ہو گئے۔''

رام نرائن جی نے اخبار لے کر اس خبر کو پڑھا تو پڑھنے کے بعد مسکراتے ہوئے کہا:

''یہ خلاف توقع نہیں میرا تو خیال ہے کہ دیوان سنگھ سے دنیا کے ہر کام کی توقع کی جا سکتی ہے وہ کام چاہے کتنا ہی اچھا ہو یا برا ہو کیونکہ وہ ایک غیر معمولی آدمی ہے۔''

رام نرائن جی کے ان الفاظ کو سن کر مہاتما جی نے کہا کہ

''ایسے آدمی سے تو ضرور ملنا چاہئے مگر اب تو وہ مقدمہ کے باعث شاید نہ آسکیں۔
''

ایڈیٹر ''ریاست'' 1941ء کے دسمبر میں نوٹوں کے مقدمہ میں رہا ہوا اور جب کاروبار پر دو چار ماہ توجہ دی اور دفتر کے حالات درست ہوئے تو پھر یہ خواہش پیدا ہوئی کہ سیوا گرام آشرم چلنا چاہئے۔ چنانچہ رام نرائن جی دہلی تشریف لائے تو پھر ان سے اس خواہش کا اظہار کیا گیا۔ رام نرائن جی اس وقت ڈاری فارم کی ٹریننگ کے لیے سیوا گرام آشرم سے بنگلور جانے والے تھے اور میں چاہتا تھا کہ سیوا گرام آشرم میں چونکہ میں اجنبی ہوں گا۔ اس لیے میرا رام نرائن جی کی موجودگی میں ہی جانا مناسب ہوگا۔ رام نرائن جی نے مہاتما جی سے سیوا گرام آشرم میں پہنچ کر پھر بات چیت کی کہ دیوان سنگھ کب وہاں آئے۔ آخر فیصلہ ہوا کہ رام نرائن جی اگست 1942ء کے شروع میں بنگلور سے واپس سیوا گرام آشرم پہنچ جائیں گے اور مہاتما گاندھی آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے بمبئی کے اجلاس سے فارغ ہو کر اگست کے دوسرے ہفتے واپس سیوا گرام آجائیں گے میں اس وقت سیوا گرام پہنچ جاؤں۔ چنانچہ میں نے پھر تیاری شروع کی تو اطلاع آئی کہ مہاتما جی 8 اگست 1942ء کو دوسرے تمام کانگرسی لیڈروں اور کارکنوں کے ساتھ بمبئی میں گرفتار کر لئے گئے مہاتما جی کی اس گرفتاری سے مجھے بہت مایوسی ہوئی کیونکہ میں چاہتا تھا کہ دو تین ہفتہ سیوا گرام آشرم میں قیام کروں۔ آپ کی اس گرفتاری سے دس روز بعد یعنی 18 اگست کو میں بھی گرفتار کر کے دہلی اور پنجاب کے کانگرسی حضرات کے ساتھ جیل میں نظر بند کر دیا گیا۔ وہاں سے ستمبر 1943ء کو رہا کیا گیا تو سوال ذریعہ معاش اور آئندہ زندگی کے گزارنے کا تھا۔ چنانچہ ''ریاست'' جو میری نظر بندی کے زمانہ میں بند ہو چکا تھا کو پھر جاری کرنے کی جدوجہد میں مصروف ہو گیا۔ ادھر مہاتما گاندھی نئی گورنمنٹ کے قیام اور ملک کے

فسادات میں مصروف تھے اور نہیں کہا جا سکتا تھا کہ ان کو کب فرصت ہو اور مجھے میری دیرینہ خواہش کے پورا کرنے کا موقعہ ملے مگر میرا یقین تھا کہ مہاتما گاندھی جیسی موجودہ دور کی مقدس ترین شخصیت کے پاس قیام اور وہاں سے کچھ حاصل کرنے کا اتفاق تب ہی ہو گا جب ستاروں کے اعتبار سے قسمت میں کسی بڑے مہاں پرش سے فائدہ حاصل کرنا لکھا ہو گا۔

☆☆☆☆☆☆☆

غلط فہمی سے بچنے کی ضرورت

رائے بہادر ڈاکٹر متھرا داس بطور ایک ماہر چشم یا آئی سرجن کے جو شہرت تمام ہندوستان میں رکھتے ہیں وہ تو ان کی طبی خدمات کے باعث ہے جو انہوں نے خدا کی مخلوق کی اپنی زندگی میں ادا کیں مگر ذاتی کریکٹر کے اعتبار سے وہ اس سے بھی زیادہ عزت کے مستحق ہیں اور اگر یہ مبالغہ نہ سمجھا جائے اور میری ذاتی معلومات پر یقین کیا جائے تو میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ اگر مہاتما نہیں ایک انتہائی بلند انسان تو ضرور سمجھے جانے چاہئیں کیونکہ وہ ان لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے اپنی زندگی میں سوائے اپنی بیوی کے دنیا کی ہر عورت کو اپنی ماں، بہن یا بیٹی سمجھا اور شراب کا ایک قطرہ بھی کبھی منہ کے قریب تک نہ آنے دیا اور اپنی تمام عمر گناہوں کے اعتبار سے نہ صرف خدا سے ڈرتے رہے بلکہ کہنا چاہئے کہ خدا سے قدم قدم پر بدکتے بھی رہے۔

میں موگا میں ان کے ماتحت کام کرتا تھا اور موگا ہسپتال آنکھوں کے آپریشنوں کے لیے ہندوستان کے علاوہ غیر ممالک میں بھی شہرت حاصل کر چکا تھا اور آنکھوں کے آپریشن سیکھنے کے لیے بہت سے ڈاکٹر بھی ہندوستان کے دوسرے صوبہ جات کے علاوہ غیر ممالک سے وہاں آتے اور کئی کئی روز قیام کرتے۔ اس زمانہ میں جو ڈاکٹر وہاں کام سیکھنے کے لیے آئے ان میں ایک لیڈی ڈاکٹر ہیرا دیوی بھی تھیں۔ میرا خیال ہے یہ خاتون بعد میں ریاست کپورتھلہ میں ملازم ہوئیں اور میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ آج کل کہاں ہیں لیڈی ڈاکٹر ہیرا دیوی عمر میں جوان، تعلیم یافتہ لڑکیوں کی طرح صاف ستھری اور خوش پوش تھیں اور وہ موگا کے ہسپتال میں کئی روز تک ڈاکٹر صاحب سے آنکھوں کے آپریشن کا کام سیکھتی رہیں۔ یہ خاتون نیک اور اچھے گھرانہ کی تھیں ان کا قیام ڈاکٹر صاحب کے گھر پر ہی زنانہ میں ہوا۔ جہاں کہ ڈاکٹر صاحب کی پہلی بیوی رہا کرتیں اور مردانہ میں دوسرے مرد ڈاکٹر رہتے جو وہاں کام سیکھنے کے لیے آئے ہوئے تھے۔

ڈاکٹر متھرا داس کی پہلی بیوی (یعنی ڈاکٹر صاحب کے صاحب زادہ کرنل تیرتھ رام آئی ایم ایس کی حقیقی والدہ) بہت نیک خاتون تھیں۔ غیر معمولی شریف اور پرانے زمانہ کی ان عورتوں میں سے جو کسی مرد کی کسی غیر عورت کے ساتھ مسکراہٹ کو بھی برداشت نہ کر سکیں اور کسی غیر مرد اور غیر عورت کا آپس میں بات کرنا (وہ بات چاہے سیاسیات، لٹریچر یا روحانیت کے متعلق ہی کیوں نہ ہو) بھی بد چلنی سمجھیں ڈاکٹر ہیرا دیوی کا مسلسل کئی روز تک ڈاکٹر صاحب کے ہاں قیام کرنا۔ ڈاکٹر صاحب کے ساتھ آپریشن کرانا۔ آپریشن دیکھنا، کئی کئی گھنٹہ تک ڈاکٹر صاحب کے ساتھ بیماروں کو دیکھنا اور ڈاکٹر صاحب کا اس خاتون کی سہولت کا خیال رکھنا۔ ڈاکٹر صاحب کی بیوی کو بہت ناگوار گزرا اور ڈاکٹر ہیرا دیوی کو وہاں قیام کرتے جتنا زیادہ عرصہ گزرتا گیا۔ ڈاکٹر صاحب کی بیوی کے دل میں شکوک پیدا ہوتے چلے گئے اور ان شکوک کی زیادتی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ڈاکٹر صاحب کی بیوی کو یہ وہم ہوگیا کہ ڈاکٹر صاحب اس خاتون سے شادی کرنے والے ہیں اور شادی کی غرض سے ہی یہ خاتون اس گھر میں مقیم ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کی بیوی منہ سے کچھ کہہ نہ سکتیں۔ کیونکہ اگر کچھ کہتیں تو اس الزام کے ثبوت میں ان کے پاس کوئی دلیل نہ تھی اور الزام کی بنیادی غلط فہمی اور وہم پر قائم تھی اس غلط فہمی اور وہم کا نتیجہ یہ ہوا کہ ڈاکٹر صاحب کی بیوی نے کھانا چھوڑ دیا۔ ہر وقت اداس رہتیں اور جب وہ سوکن کے آنے کا خیال کرتیں تو اکثر رو پڑتیں چنانچہ مجھے اچھی طرح سے یاد ہے میری والدہ کو جب اس غلط فہمی کا علم ہوا اور میری والدہ نے ڈاکٹر صاحب کی بیوی کو سمجھایا کہ وہ وہم میں مبتلا نہ ہوں اور کھانا کھا لیں تو ڈاکٹر صاحب کی بیوی نے میری والدہ (جن کو ڈاکٹر صاحب اور ان کی بیوی دونوں ہی اپنی حقیقی ماں کی طرح عزت کرتے تھے) سے کہا۔

''ماسی جی میں کھانا کیا کھاؤں، مجھ سے تو میری تمام زندگی کے لیے روٹی چھینی جا رہی ہے۔ میں تو تباہ ہو جاؤں گی۔ اس سے تو میرا مر

جانا ہی اچھا ہے۔ میرے بچوں کا کیا ہوگا اگر میرے شوہر نے دوسری شادی کرلی میں تو برباد ہو جاؤں گی۔''

میری والدہ نے اس غلط فہمی کو دور کرنے کی بہت کوشش کی کیونکہ وہ ڈاکٹر صاحب کے حالات اور فطرت سے ڈاکٹر صاحب کے بچپن سے ہی واقف تھیں مگر یہ غلط فہمی رفع نہ ہوسکی۔ کیونکہ ایک عورت سب کچھ برداشت اور قربان کرسکتی ہے مگر اس کا اس کے شوہر کی محبت سے محروم ہونا ممکن نہیں۔ چاہے محبت سے محروم ہونا غلط فہمی اور وہم کی بنیادوں پر ہی کیوں نہ ہو۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ڈاکٹر صاحب کی بیوی اس غم میں ہی بخار میں مبتلا ہوگئیں اور یہ بخار نمونیا کی صورت میں تبدیل ہوا۔

اس زمانہ نہ پنسلین ایجاد ہوئی تھی نہ ایم بی 293 تھی۔ نمونیا کے بیماروں کی دوا صرف برانڈی اور معمولی ادویات تھی۔ یہ نیک اور فرشتہ خصلت خاتون نمونیا میں دو چار روز مبتلا رہ کر انتقال کر گئیں۔ اور موت کی دراصل وجہ صرف غلط فہمی تھی۔ چنانچہ میرا یقین ہے کہ اگر اس خاتون کے احساس کا خیال کرتے ہوئے (اور یہ جتاتے ہوئے بھی کہ یہ احساس بے بنیاد ہے) غلط فہمی پیدا نہ ہونے دی جاتی تو یہ خاتون نوعمری میں اپنی زندگی سے محروم نہ ہوتیں۔ یہ حالات تو اس خاتون کے ہیں جن کو میں آج تک بھول نہیں سکا۔ مگر ان کے صاحبزادے تیرتھ رام پاہوہ کے وہ آنسو تو میرے لیے آئندہ زندگی میں شاید کبھی بھی قابل فراموش نہ ہوں گے جب کہ تیرتھ رام دہلی آئے میرے ہاں مقیم تھے ہم گرمیوں کے زمانہ میں چھت پر لیٹے ہوئے رات کو باتیں کر رہے تھے اور اوپر کے حالات جب میں نے تیرتھ رام جی کو سنائے تو تیرتھ رام اپنی ماں (جب تیرتھ رام کی ماں کا انتقال ہوا تو تیرتھ رام کی عمر پانچ سال کی تھی) کو یاد کر کے زار زار رونے لگ گئے اور روتے روتے ان کی ہچکی بندھ گئی۔

غلط فہمی سے بچنے کے سلسلے میں مجھے ایک اور واقعہ یاد آ گیا میں ریاست نابھ میں ملازم تھا مہاراجہ منصوری پہاڑ پر مقیم تھے اور میں وہاں بھی وہاں تھا۔ مرحوم سردار بہادر

سردار گوردیال سنگھ پرائیویٹ سیکرٹری سے ہر روز باتیں ہوا کرتیں۔ایک دن منصوری کے پر فضا پہاڑ کا ذکر آ گیا تو سردار صاحب نے کہا ''آپ منصوری کو اچھا سمجھتے ہیں او رمنصوری فی الحقیقت اچھا پہاڑ ہے مگر میں تو اس پہاڑ کے قیام سے تنگ آ چکا ہوں مہاراجہ سال بھر میں نو ماہ یہاں رہتے ہیں یہ نو ماہ ہم لوگوں کو بیوی بچوں سے الگ رہنا پڑتا ہے اور صرف تین ماہ جب کہ سردی زیادہ ہوتی ہے تو ہم لوگ نابھ جاتے ہیں اور بیوی بچوں کے ساتھ رہتے ہیں۔''

میں نے سردار صاحب سے کہا کہ ''منصوری میں ریاست نابھ کی درجنوں کوٹھیاں ہیں جو اکثر خالی رہتی ہیں آپ ان کوٹھیوں میں سے ایک کوٹھی لے کر اپنی بیوی اور بچوں کو یہاں منگا لیا کیجئے یا اگر ان کوٹھیوں میں سے آپ کوئی کوٹھی بغیر کرایہ کے لینا پسند نہ کریں تو کوئی دوسری کوٹھی کرایہ پر لے سکتے ہیں آپ نو ماہ بغیر بیوی بچوں کے کیوں تکلیف اٹھاتے ہیں' میرے اس سوال پر سردار گوردیال سنگھ نے جو جواب دیا وہ مجھے اب تک یاد ہے آپ نے کہا۔

سردار صاحب ہم لوگوں کو صرف نیک رہنے کی ہی ضرورت نہیں۔ نیک ہوتے ہوئے بھی غلط فہمی سے اپنے آپ کو بچانے کی ضرورت ہے۔اگر میں اپنی بیوی اور بچوں کو یہاں منصوری لے آیا کروں یہ میں جانتا ہوں کہ مہاراجہ میری بیوی یا میری کسی عزیز عورت کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھیں گے مگر اس غلط فہمی کا کیا علاج ہے میرے بیوی بچوں کے یہاں آنے پر اگر نابھ کے لوگوں میں یہ غلط فہمی پیدا ہو جائے کہ مہاراجہ کا میری بیوی سے بھی کوئی تعلق ہے اور اس لیے ہی میری بیوی منصوری گئیں میں غلط فہمی سے بچنے کے لیے اپنی بیوی بچوں کو کبھی منصوری نہیں لاتا۔اور پچھلے بیس برس سے اس طرح ہی تکلیف اٹھا رہا ہوں۔

سردار گوردیال سنگھ جب تک زندہ رہے پبلک کی غلط فہمی سے بچنے کے لیے ہمیشہ اکیلے ہی منصوری وغیرہ گئے اور آپ کبھی اپنی بیوی کو وہاں نہ لے گئے جہاں کہ مہاراجہ

متیم ہوتے۔

اوپر کے واقعات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انسان کو صرف نیک ہونے کی ضرورت ہی نہیں بلکہ غلط فہمی سے اپنی ذات کو بچانے کے لیے بھی بہت احتیاط کی ضرورت ہے چنانچہ مہاتما گاندھی جیسے مقدس شخص بھی جب رات کو سوتے تھے تو پبلک کی غلط فہمی سے بچنے کے لیے کبھی اکیلے نہیں سوتے تھے ان کی چارپائی کے پاس متعدد دوسرے اصحاب کی چارپائیاں ہوتی تھیں تا کہ کسی شخص کو غلط بیانی اور غلط فہمی کا موقع نہ دیا جائے۔

☆☆☆☆☆☆

اختتام--------------------حصہ اول

ایک روایت کی موت

دیوان سنگھ مفتوں ایک چھوٹے قد کا انسان جو مرورِ ایام کے ساتھ جھک گیا ہو۔ ایسے خدوخال کا مالک تھا۔ جس سے قوتِ ارادی، ناقابلِ تسخیر حوصلہ اور صاف وشفاف شخصیت کی جھلک ٹپکتی تھی۔ چوبیس جنوری ۱۹۷۵ء پچاسی برس کی عمر میں اس دارِفانی سے کوچ کر گیا۔ اور اپنے پیچھے ہندوپاک میں اپنے سچے بہی خواہوں کو سوگوار چھوڑ گیا۔ وہ اتنا عظیم انسان تھا، جس نے مخالفت اور نامساعد حالات کی طوفانی لہروں کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔ اور ہمیشہ اس طوفان سے اپنی بہدارانہ قوتِ ارادی کی بدولت بچ نکلنے میں کامیاب ہوگیا۔ اور دوسروں کے لئے ایک مثال قائم کر گیا۔ ہندوستان کی آزادی کے حصول کی جدوجہد کے ابھرتے ہوئے تاریخی دور میں اس نے خود کو اس تحریک کے اس پہلو سے روشناس کرایا۔ جسے بڑے بڑے قومی رہنماؤں نے جو غیر ملکی برطانوی نظامِ حکومت کے خلاف برسرِپیکار تھے۔ ثانوی حیثیت دے دی تھی۔ دیوان سنگھ اور اس کے ساتھیوں نے اس نظامِ حکومت کی بنیادوں کو گرانے کی طرف توجہ مبذول کر دی۔ یہ جاگیردارانہ نظام تھا۔ جس کے سرداروں کے مسحور کن ظاہری لبادے کے نیچے صدیوں پرانے محنت کشوں کے مصائب اور چیتھڑے پوشیدہ تھے۔ اور جنہوں نے ان کی جہالت اور بے چارگی کا بے رحمی کے ساتھ فائدہ اٹھایا تھا۔

وہ ایک صحیح معنوں میں ایک ایسا بہادر انسان تھا، کہ جن پر وہ حملہ کرتا تھا، وہ اپنے کھلے ہوئے پنجوں اور برہنہ دانتوں کے ساتھ دیکھ کر اسے غراتے رہتے تھے، لیکن اس نے کبھی ان کی پرواہ نہیں کی، اور اس جوابی حملہ کا اس نے بیس سال سے زائد عرصہ تک مردانہ وار مقابلہ کیا۔ اور اس عرصہ میں اس نے لاکھوں ہم وطنوں کے دل جیت لیے۔

اس کے ساتھ انگریز آقاؤں کے دل میں بھی عزت کا ایک مقام بنالیا۔ اور وہ مجبور تھے کہ وہ اپنے اس دشمن کی عظمت کا اقرار کریں۔

اس مردِ مجاہد کے کارنامے پہلی جنگِ عظیم کے اختتام کے قریب شروع

ہوئے۔اس وقت ہندوستان کی آزادی کی لہر تمام اطراف میں پھیل گئی تھی۔اور اس نے عوامی شکل اختیار کر لی تھی۔اگر چہ اس نے لاتعداد ہندوستانیوں کی طرح غربت میں پرورش پائی اور ابتدائی تعلیم کے بعد آگے اپنی تعلیم جاری نہ رکھ سکا۔پھر بھی اس نے اپنی شخصیت اور کردار کے بل بوتے پر اپنی بقاء کو قائم رکھنے کی کوشش کی۔وہ اعلیٰ درجہ کا ایمان دار انسان تھا۔اس کے اندر پڑھنے اور سننے والوں کے دل موہ لینے کی کشش موجود تھی۔ان صفات کی بنا پر وہ ایک عظیم ادیب اور صحافی بن کر ابھرا۔چند معجزات رونما ہوئے اور یہ غریب آدمی معتمد علیہ اور ہندوستان کے بڑے بڑے شہزادوں کا رقیب بن گیا۔دیکھتے ہی دیکھتے پنجاب کا یہ کم تعلیم یافتہ پنجاب کے ایک مغربی علاقے کے ایک قصبہ کا باسی اردو اسلوب بیان کا مانا ہوا مصنف بن گیا۔اس کی شہرت کا باعث اس کا اسلوب بیان ہی نہیں تھا، بلکہ طرز تحریر اور مخصوص طریقہ بیان بھی تھا۔

اس کی تحریروں میں یہ خوبی بھی موجود ہوتی تھی کہ زبان عام فہم ہوتی تھی۔اسے بویاں یا پیپس سے تشبیہ دے سکتے ہیں۔اس کی تحریروں کا موازنہ ڈکنز کی تحریروں سے کر سکتے ہیں۔وہ ایک بغیر اتالیق کے غیر معمولی ذہین تھا۔یہ ایک بھید تھا جو تجزیہ کی کھلم کھلا دعوت دیتا تھا۔اس کی شخصیت میں اتنی کشش تھی کہ وہ پڑھنے والوں کی توجہ اپنی طرف کھینچ لیتی تھی۔اس کی تحریریں جادو کا اثر رکھتی تھیں۔یہاں تک کہ مولانا ابو الکلام آزاد جیسی شخصیت جو ادبی دنیا میں منجھے ہوئے عالم فاضل مانے جاتے تھے۔اس کی اردو خودنوشت سوانح حیات ''نا قابل فراموش'' کو پڑھ کر داد دیئے بغیر نہ رہ سکے۔اس کی دوسری کتاب ''جذبات مشرق'' جو ہندوستان کی پرانی عوامی نظموں سے چنے ہوئے عشقیہ اشعار کا مجموعہ ہے، بھی کم دل چسپ نہیں۔یہ دو کتابیں اردو ادب میں سنگ میل کا درجہ رکھتی ہیں۔جن کے شہہ پارے وہ اپنے ''اخبار'' ریاست میں بیس تیس سال قبل چھاپتے رہے۔اس جس کے کالم میں اس نے بدعنوان شاہانہ نظام کے

خلاف ہفتہ بہ ہفتہ ایک طویل جنگ لڑی۔

اس کے جنگ لڑنے کے انداز سے اگر اندازہ لگایا جائے تو ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ''دیوان سنگھ مفتوں'' ایک ایسا انسان تھا، جس کی فطرت عظیم اور شاہانہ تھی۔ وہ بہادر جنگ جوؤں کی طرح جو نیک کام کے لئے لڑتے ہیں۔ کے اعلیٰ اخلاق اور رحم کے اوصاف سے متصف تھے۔ اس نے طاقت ور دشمن کو للکارا۔ اور ان کے حملوں کا بہادری کے ساتھ مقابلہ کیا۔ اور اصولی جنگ لڑی۔ ''نا قابل فراموش'' کے چند اقتباسات اس حقیقت پر روشنی ڈالتے ہیں کہ جنگ کے دوران اگر اس کے دشمن نے رحم کی اپیل کی تو اس نے فوراً تلوار نیام میں ڈال لی۔ حالانکہ دشمن مغلوب اس کے قدموں میں پڑا تھا۔ اس کی تحریر میں دل موہ لینے والا جادو تھا۔ جب وہ ہیجان خیز ذاتی حملے کرتا تھا، تو میکالی اور فروڈ کے ڈراموں کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔ اس کا بہادروں جیسا حوصلہ ایمان داری، اور انسانیت اس کے سٹائل کی ترجمانی کرتے تھے۔ یہ چند صفات چند غیر معمولی ذہین لوگوں میں ہی پائی جاتی ہیں۔ جو اس کی تحریروں میں ملتی ہیں۔

بیماری نے اس کو فعال زندگی سے گوشہ تنہائی میں بیٹھنے پر مجبور کر دیا۔ لیکن پھر بھی اس کی یاد دلوں سے محو نہیں ہوئی۔ حکومت کے کارندے اور نجی ادارے اس کے بڑھاپے کا سہارا بننے کے لئے حرکت میں آ گئے۔ گورنمنٹ پنجاب نے ادبی انعام سے نوازا۔ پٹیالہ کی پنجابی یونیورسٹی نے اس کی خدمات کو سراہتے ہوئے فیلوشپ کے علاوہ تنخواہ بھی مقرر کر دی۔ یہ مثالیں اس کی مقبولیت کی نشان دہی کرتی ہیں۔ مگر پھر بھی یہ نوازشات اور انعامات اس کی دو ادبی خدمات اور ایک ہفتہ وار اخبار اس کے حقوق کے تحفظ کے لئے لڑائی اور ہندوستان میں صحافت کے اعلیٰ معیار کو مقرر کرنے کے پیش نظر ناکافی تھے۔ حالانکہ اس مرد دلیر کی زندگی کے آخری سال بڑھاپے کے زبوں حالی اور بیماری کے خلاف لڑنے میں صرف ہو گئے۔ پھر بھی اس کے طنز و مزاح نے نہ دشمن

کو نہ دوست کو، حتیٰ کہ اپنے آپ کو بھی معاف نہیں کیا۔ اس کی تحریر اور خطوط میں ایسے شہہ پارے ملتے ہیں۔ یہ وہ عظیم انسان تھا۔ جس نے اپنی پوری زندگی سے محبت کی، اب صاحب فراش تھا۔ مگر اس کا دل و دماغ زندہ تھا۔ اور غالب جو ایک صدی پہلے دہلی میں اس طرح زندگی بسر کرتا تھا۔ جو بڑھاپے کی وجہ سے کمزور ہو گیا تھا۔ اور جس کی انگلیوں میں کپکپی تھی۔ اس کی موت کی خبر متوقع تھی۔ جب اس کی موت کی خبر نشر کی گئی تو لوگ رو دیئے۔ اس اخبار کے ایڈیٹر کی حیثیت سے ایک خلا پیدا ہو گیا، جسے اس کی محبت اور جوش محبت ملتا تھا۔

خدا کرے اس کے کارنامے کی یاد آنے والی نسلوں کے دلوں میں بطور ایک قومی ورثہ کے محفوظ رہے۔

آپ کے زیر مطالعہ یہ کتاب ''سیف وقلم'' ''ناقابل فراموش'' کتاب کا دوسرا حصہ ہے۔ یہ آپ بیتی کی اس قسم سے تعلق رکھتی ہے جسے انگریزی میں (Memoirs) کہتے ہیں اور جسے اردو میں سرگزشت کہنا چاہیئے۔ اس میں تاریخ، ترتیب اور واقعہ کا زیادہ لحاظ نہیں رکھا جاتا۔ بس جو بات جس طرح اور جب یاد آ جائے ،بیان کر دی جائے۔ آپ یہ کتاب پڑھتے وقت کا زمانہ اور حالات پیش نظر رکھیں ۔اس کتاب کے واقعات تو کافی عرصہ پہلے کے ہیں، مگر سردار دیوان سنگھ مفتوں نے ۱۹۶۲ء۔۱۹۶۱ء میں انہیں تحریری شکل دی۔

یہ ہر دو کتابیں آپ کو دعوت فکر دیتی ہیں۔ انہیں پڑھ کر آپ اپنی زندگی میں تبدیلی لا سکتے ہیں۔ اپنے کریکٹر کو بلند اور ضمیر کو بیدار کر سکتے ہیں۔ اس کے مطالعہ سے آپ پر واضع ہوگا، کہ مقصد حیات کیا ہے؟

(نواز چودھری)

دیوان سنگھ مفتوں

(از حضرت جوش ملیح آبادی)

سیر چشم، کوتاہ قامت، بلند حوصلہ، مہمان نواز، شیر دل، دوست پرور، دشمن قاتل، سلطان شکار، گدا نواز، بدترین دشمن اور بہترین دوست۔

جب وہ "ریاست نکالتے تھے" تو ہز میجسٹی کے قلعوں اور ہز ہائینسوں کے ایوانوں میں زلزلے ڈالتے تھے۔ والیان ریاست کی نیندیں حرام کر دی تھیں۔ ان کے قلم سے بڑے بڑے فرمانروا کانپتے تھے۔ ان کے نام سے۔

دہلی کا واقعہ ہے، ایک روز سرِ شام، ایک ریاست کے وزیر اعظم میرے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ کہ دیوان سنگھ آ گئے۔ انہیں دیکھتے ہی وزیر اعظم صاحب کا رنگ فق ہو گیا۔ اور جب گلاس بھر کر میں نے ان کے سامنے کیا تو انہوں نے دیوان سنگھ کی جانب اشارہ کیا، کہ ان کے سامنے نہیں پیوں گا۔ دیوان سنگھ نے ان کو اشارہ کرتے ہوئے دیکھ کر مجھ سے کہا، جوش صاحب، پرائم منسٹر صاحب سے کہہ دیجیے کہ وہ شوق سے پیئں۔ میں ان کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں لکھوں گا۔ یہ والئی ملک نہیں ہیں۔ میں تو فقط والیان ملک پر حملہ آور ہوتا ہوں۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ میں انسان کا نہیں سور کا شکار کھیلتا ہوں۔

ان کی سلطان شکاری کے واقعات سے تو ہندوستان اب تک گونج رہا ہے۔ اب ان کی گدا نوازی کا بھی ایک واقعہ جو ان کے دوست نے مجھے سنایا تھا، سن لیجیے۔ انہوں نے بیان کیا تھا، کہ کسی والئی ریاست کے متعلق ایک ایسی دستاویز ان کے ہاتھ لگ گئی تھی، جس میں ان کے حرامی ہونے کا ثبوت تھا۔ اس دستاویز کے زور پر وہ اس والئی ریاست سے غالباً ساٹھ ستر ہزار روپیہ حاصل کر کے گھر واپس آئے اور نوٹوں کے بنڈل بڑی بے پرواہی سے میز کی دراز میں ٹھونس کر وہ مجھ سے باتیں کر

رہے تھے۔ کہ ان کے ایک شکستہ حال دوست آگئے۔اور کھڑے کھڑے کہا سردار صاحب میں ہمیشہ کے واسطے آپ سے رخصت ہونے کو آیا ہوں۔ مجھ سے گلے مل لیجیئے ۔وہ کھڑے ہوکران سے گلے ملےاور زبردستی بٹھا کر کہا، میر صاحب یہ ہمیشہ کے واسطے رخصت ہونے کے کیا معنی ہیں۔؟میر صاحب نے کہا کہ ''میرے پاس وقت کم ہے۔''بس اتنا کہوں گا کہ کربلا معلی جارہاہوں اوراب جیتے جی واپس نہیں آؤں گا۔ اچھاخدا حافظ یہ کہہ کرمیر صاحب اٹھ کھڑے ہوئے اور جیسے ہی زینے کی طرف جانے لگے۔ دیوان سنگھ نے بڑھ کران کوروک لیااور کہا جب تک آپ اس کی وجہ نہیں بتائیں گے ۔بھگوان قسم میں آپ کو جانے نہ دوں گا۔ یہ سن کرمیر صاحب کی آنکھوں میں آنسو آگئے ۔اور کہاسردار صاحب یہ نہ پوچھیے اور مجھے جانے دیجیئے ۔ دیوان سنگھ ان کو کھینچ کر کمرے میں لے آئے اور کہا، جب تک آپ اس کی وجہ نہیں بتائیں گے، میں قسم کھا چکا ہوں۔ آپ کو جانے نہیں دوں گا۔ یہ سن کر میر صاحب کی آنکھوں میں آنسو آگئے ۔اور کہاسردارصاحب میں اس قدر مقروض ہوگیا ہوں کہ اب یہ بات ناممکن ہو گئی ہے کہ میں قرضہ ادا کرسکوں۔ اس لئے جارہاہوں، کہ کربلا معلی میں زندگی کے باقی دن گزاردوں۔اچھااب جانے دیجیئے ۔وقت کم ہے۔دیوان سنگھ نے ان کا دامن پکڑ کر پوچھا کہ آپ پر کس قدر قرضہ ہے؟ ۔میر صاحب نے کہا پندرہ ہزار۔

دیوان سنگھ نے کہابس؟ ۔صرف ایک منٹ اور یہ کہہ کرانہوں نے گن کر بیس ہزار کے نوٹ میر صاحب کی جیب میں زبردستی ٹھونس دیئے ۔میر صاحب کی آنکھوں سے آنسو برسنے لگے۔اور دیوان سنگھ نے ہاتھ جوڑ کران کے سامنے سر جھکا دیا۔کوئی اس دور میں ایسا دوست پرور اور کیا کوئی آج کا ارب پتی بھی اس دریا دلی کی جرات کرسکتا ہے؟۔

''ریاست'' کے دور میں انہوں نے بے حد کمایا، لیکن کبھی اپنے پاس کچھ نہیں رکھا، کھایا پیا اور کھلا دیا۔

اس لئے ان پر تو نگری اور مفلسی کے دورے پڑا کرتے تھے۔لیکن اگر مفلسی میں کوئی دوست یا مہمان آجاتا تو اپنے گھر کی چیزیں فروخت کر کے اس کی دعوت کیا کرتے تھے۔اور جب کوئی ان کی مفلسی کو بھانپ کر دعوت کرنے سے روکتا تھا تو وہ لڑ پڑتے تھے۔

مجاز نے ایک دن مجھ سے آکر کہا۔کل تو سردار جی نے کمال ہی کر دیا۔میں شام کو ان کے وہاں پہنچا۔انہوں نے ملازم سے کہا، بارہ درجن سوڈے کی بوتلیں لے آ۔ محلے میں ان کا بڑا بھرم تھا۔تھوڑی ہی دیر میں بارہ درجن بوتلیں آگئیں۔انہوں نے ایک درجن بوتلیں رکھ کر نوکر کو حکم دیا کہ فلاں دکان پر جا کر ان کو فروخت کر دے اور ان کو فروخت کر کے جو روپیہ ہاتھ آئے، اس کی ایک وسکی کی بوتل اور کچھ کھانے کا سامان لے آئے۔یہ تھی ان کی مہمان نوازی کی شان۔

یہ غالباً ۱۹۴۷ء کی بات ہے۔جب میں دہلی سے ''کلیم'' نکال رہا تھا۔اور معاش اور معاشقے کے اعتبار سے وہ میرا بے حد پراگندہ حالی اور پریشانی کا دور تھا۔اس پر طرہ یہ کہ میری بیٹی کی شادی سر پر آچکی تھی۔کہ وہ ایک روز شام کے وقت میرے گھر تشریف لائے۔برانڈی کی بوتل وہ ساتھ لائے تھے۔(وہ برانڈی کو وسکی پر ترجیح دیا کرتے تھے۔)

جب دور ختم ہو گیا تو انہوں نے کہا میں بھابھی سے بات کرنا چاہتا ہوں۔میں نے سخاوت سے کہا سردار صاحب کو اوپر لے جاؤ۔میری بیوی اس وقت پردے کی پابند، لیکن ان سے کانا پردہ کرتی تھی۔وہ میری بیوی سے باتیں کر کے نیچے آئے اور دو منٹ میں رخصت ہو گئے۔میں جب اوپر گیا تو بیوی نے مجھ سے کہا سردار صاحب یہ نوٹوں کا بنڈل دے گئے ہیں۔وہ کہتے تھے یہ رقم انہوں نے اپنے دوست نواب بہاول پور سے خط لکھ کر منگائی ہے۔دیکھی آپ نے دیوان سنگھ کی شرافت اور دوستی۔

ایک زمانے میں جب کہ وہ رفیق احمد قدوائی کے خلاف بڑے سخت مضامین لکھ

رہے تھے۔ان کی مالی حالت بے حد خراب تھی۔میں ان کے افلاس کا اندازہ کر کے ،سیدھا قدوائی صاحب کے پاس گیا اور ان سے کہا قدوائی صاحب آپ منسٹر نہیں حاتم دوراں ہیں۔آپ کی دوست نوازی کے ڈنکے پٹے ہوئے ہیں۔لیکن دوست نوازی کوئی بڑا وصف نہیں، ہلاکو، نیرو، چنگیز اور یزید بھی اپنے دوستوں کو نوازتے تھے۔البتہ دشمن نوازی ایک ایسا وصف ہے جو انسان کو نبوت کی سطح تک لے جاتا ہے۔آپ ہلاکو وغیرہ کی سطح پر قانع رہیں گے یا پیمبری کی سطح پر پہنچنا چاہیں گے۔انہوں نے مسکرا کر کہا، پہلیاں کیوں بجھوا رہے ہو۔آپ جو مدعا ہوا سے کھل کر کہیئے۔میں نے کہا دیوان سنگھ آج کل سخت پریشان ہے۔

انھوں نے یہ سنتے ہی گھنٹی بجائی، سیکرٹری آیا، اس کے کان میں کچھ کہا۔وہ چلا گیا اور پانچ منٹ کے بعد وہ چیک لے آیا۔چیک پر قدوائی صاحب نے دستخط کر دیئے۔اور کہا یہ چیک جا کر دیوان سنگھ کو دے آیئے۔وہ دس ہزار کا چیک لے کر میں ان کے پاس گیا۔انہوں نے کہا چلیے ابھی اس کو کیش کروا لیتے ہیں۔چیک کیش ہوگئی تو وہ اس پر اصرار کرنے لگے کہ آدھی رقم آپ لے لیں۔میں نے انکار کیا تو لڑنے لگے۔اور میں وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔

میں کہہ چکا ہوں کہ وہ بدترین دشمن ہیں۔اس کا بھی ایک واقعہ سن لیجیے۔میں پاکستان سے دہلی گیا۔ان کے وہاں ٹھہرا ہوا تھا۔ایک صبح کو جب میں باہر جانے لگا تو پوچھا کہاں جارہے ہیں۔میں نے جواب دیا ساغر سے ملنے۔

ساغر کا نام سنتے ہی وہ اچھل پڑے۔دوڑ کر میرا ہاتھ پکڑ لیا اور کہنے لگے کہ میں آپ کو ایک ایسے منافق کے پاس جانے کی اجازت ہرگز نہیں دوں گا۔جس کو آپ نے پنڈت جی سے کہہ کر ریڈیو میں نوکر رکھوایا تھا۔اور اس کا بدلہ اس نے یہ دیا کہ جب سے آپ پاکستان چلے گئے ہیں۔وہ آپ کے خلاف زہر اگلتا پھرتا ہے۔میں نے کہا سردار صاحب میں نے ساغر کو نوکر نہیں رکھوایا۔ساغر نے خود پنڈت جی سے

اپنی ملازمت کا وعدہ لے لیا تھا۔انہوں نے کہا مجھے معلوم ہے لیکن جب کیسکر نے پنڈت جی کو دھوکہ دے کر اس کا پتا کاٹنا چاہا تھا تو اس وقت آپ ہی تھے، جس نے کیسکر کا پردہ چاک کر کے اس کو نوکری دلوائی تھی۔ میں نے کہا سردار صاحب' ساغر برا آدمی نہیں ہے' اگر اس نے میرے پاکستان جانے کے بعد' میرے خلاف آواز بلند کی تھی تو اس کا مقصد یہ تھا' کہ وہ بے چارا حکومت ہند پر اپنی وفاداری کا سکہ جما رہا تھا' اور یہ کوئی ایسی بری بات نہیں' کہ میں اتنے پرانے دوست سے قطع تعلق کر لوں۔ سن سن کر' دیوان سنگھ نے' مارے غصے کے کانپتے ہوئے کہا' آپ آدمی نہیں ''دیوتا'' ہیں۔ لفظ دیوتا کو اس قدر' دانت پیس کر' ادا کیا تھا' گویا وہ کوئی موٹی سی گالی دے رہے ہیں۔ اور جب میں خاموش ہو گیا تو انہوں نے کہا جوش صاحب میں تو جب تک دشمن کا خون نہ چوس لوں مجھ کو چین نہیں آتا۔ میرے نزدیک دشمن کا مار ڈالنا ہی سب سے بڑا دھرم ہے۔

ہزار حیف ہندوستان کی ناقدر شناسی پر کہ وہ اب اپنا رسالہ بند کر کے ڈیرہ دون چلے گئے ہیں' اور دو سو رپلی پنشن پر' زندگی بسر کر رہے ہیں۔

جب ان کی اداسی پر نگاہ کرتا ہوں' دل سے خون کی بوندیں ٹپکنے لگتی ہیں۔ ہائے دیوان سنگھ کا سا بے نظیر انسان' اور اس قدر پریشان ...... وائے برکوری ہندوستان!

☆☆☆

دیوان سنگھ مفتوں

(از سعادت حسن منٹو)

لغت میں مفتوں کا مطلب عاشق بیان کیا گیا ہے۔اب ذرا اس عاشق زار کا حلیہ ملاحظہ فرمایئے۔ناٹا قد‘بھدا جسم‘ابھری ہوئی توند‘وزنی سر جس پر چھدرے کھچڑی بال‘ جس کیس کہلانے کے ہرگز مستحق نہیں۔اکٹھے کیے جائیں تو بمشکل کسی کٹر برہمن کی چوٹی بنے:۔گہرا سانولا رنگ چھوٹی سی گھسی پٹی داڑھی‘ جو شاید کسی زمانے میں داڑھیوں کی لاج رکھتی ہو۔آنکھیں بڑی نہ چھوٹی مگر بلا کی تیز اور مضطرب۔

بحیثیت مجموعی یہ عاشق زار‘سردار دیوان سنگھ مفتوں ایڈیٹر ہفتہ وار ''ریاست'' دہلی ۔کسی زمانے میں راجاؤں‘مہاراجاؤں اور نوابوں کا دشمن‘ان کے راز فاش کرنے والا مداری‘صحافت میں ایک نئے خام مگر زوردار انداز تحریر کا مالک‘دوستوں کا دوست بلکہ خادم اور دشمنوں کا ظالم ترین دشمن‘مچلن ٹائر کا اشتہار معلوم ہوتا ہے۔فرق صرف اتنا ہے کہ اس اشتہار میں جو ٹائروں کی بنی ہوئی انسان نما شکل ہے اس کے جوڑوں میں درد نہیں ہوتا‘مگر دیوان سنگھ مفتوں گنٹھیا کا مریض ہے۔اس کا بند بند اور جوڑ جوڑ درد کرتا ہے۔آپ اس کے میز پر قلم دوات کے ساتھ کروشن سالٹ کی بوتل ہر وقت دیکھ سکتے ہیں۔یہ قلم دان کا ایسا جزو بن کے رہ گئی ہے۔کہ بعض اوقات آپ کو ایسا معلوم ہوگا کہ دیوان سنگھ اپنا قلم روشنائی میں ڈبونے کے بدلے کروشن سالٹ میں ڈبوتا ہے اور اس سے لکھتا ہے۔

جس طرح دیوان سنگھ مفتوں کی کوئی کل سیدھی نہیں اسی طرح اس کی تحریر کا کوئی جملہ سیدھا نہیں ہوتا۔ادب کا وہ جانے کب سے خون کر رہا ہے‘لیکن صحافت میں اس کا وہی رتبہ ہے جو بمبے سنٹینل کے ایڈیٹر آنجہانی جی۔بی ہارنیمین کا تھا۔بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ اسے بالشت بھر اونچا ہے۔

ہارٹیمین صرف پولیس سے ٹکر لیتا رہا دیوان سنگھ نے اپنی پہلوانی کے دم خم کئی اکھاڑوں میں دکھائے۔ بڑی بڑی ریاستوں سے پنجہ لڑایا۔ اکالیوں سے متصادم ہوا۔ ماسٹر تارا سنگھ اور سردار کھڑک سنگھ سے تلوار بازی کی۔ مسلم لیگ سے چونکھی لڑا۔ پولیس کو تگنی کا ناچ نچایا۔ خواجہ گیسو دراز حضرت حسن نظامی سے چہلیں کیں۔ تیس سے اوپر کچھ مقدمے چلوائے اور ہر بار سرخرو رہا۔ لاکھوں بلکہ کروڑوں کمائے' اور اڑا ڈالے۔ مفلسی کے زمانہ میں اگر کوئی دوست آیا تو چٹکیوں میں چار سو بیس کر کے روپیہ حاصل کیا' اور اس کی تواضع پر خرچ کر دیا۔ جیبیں لبالب بھری ہونے پر موٹر کی ہیڈ لائٹس میں ننگی عورتوں کا رقص دیکھا اور اپنے دوستوں کو دکھایا۔ آپ کم پی اپنے یاروں کو جی بھر کے پلائی۔

دیوان سنگھ مفتوں اکائی نہیں دہائی' سینکڑہ' ہزار ہے۔ دس ہزار ہے' بلکہ لاکھ ہے' وہ ایک عجائب گھر ہے جس میں سینکڑوں بلکہ ہزاروں نادر دستاویزات مقفل پڑی ہیں۔ وہ ایک بنک ہے جس کے لیجروں میں کروڑوں کا حساب درج ہے۔ وہ اسکاٹ لینڈ یارڈ ہے جس میں لاکھوں جرائم پیشہ انسانوں کے خفیہ حالات موجود ہیں۔

اگر وہ امریکہ میں ہوتا تو وہ وہاں کا سب سے بڑا ''گینگسٹر'' ہوتا۔ کئی اخبار اس کے تابع ہوتے۔ بڑے بڑے یہودی سرمایہ دار اس کے ایک اشارے پر ناچتے۔ وہ رابن ہڈ کا بھی باپ ہوتا۔ مفلسوں کے لیے اس کی تجوریاں ہر وقت کھلی ہوتیں۔

آپ مفتوں کو دیکھیے گا تو اسے معمولی سا پڑھا لکھا ادھیڑ عمر سمجھ سکیں گے۔ لیکن وہ بہت پڑھا لکھا ہے۔ ایک دن میں نے انہیں ریاست کے خوبصورت پیازی رنگ کے کارڈوں پر دستخط کرتے دیکھا۔ کارڈوں کی دو تین ڈھیریاں لگی ہوئی تھیں۔ میں نے ایک کارڈ اٹھا کر ٹائپ] شدہ عبارت پڑھی۔ بیرونی ملک کی کسی فرم سے فہرست بھیجنے کی درخواست کی گئی تھی۔ سب کارڈ اسی مضمون کے تھے۔ مجھے بہت حیرت ہوئی' کہ اتنی فہرستیں منگوا کر سردار صاحب کیا کریں گے۔ میں نے پوچھا مفتوں صاحب کیا

آپ کوئی سٹور کھولنے والے ہیں؟

سر کو سکھوں کے مخصوص انداز میں ایک طرف جھٹکا دے کر مفتوں خوب ہنسا۔نہیں منٹو صاحب میں یہ فہرستیں منگا رہا ہوں کہ مجھے ان کے مطالعے کا شوق ہے۔

میری حیرت میں اور اضافہ ہو گیا۔آپ مطالعہ فرمائیں گے فہرستوں کا‘ حاصل کیا ہو گا؟

معلومات...... میں اپنی معلومات میں اسی طرح اضافہ کیا کرتا ہوں۔

آپ کی جو بات ہے نرالی ہے۔

ڈنلپ کمپنی کیا بناتی ہے؟ ایک دم مجھ سے سوال کیا گیا۔

میں نے جھٹ سے جواب دیا ٹائر۔

اس پر مجھے بتایا گیا کہ ڈنلپ کمپنی صرف ٹائر ٹیوب ہی نہیں بناتی اور ہزار ہا چیزیں بناتی ہے۔گاف بال ربڑ کے گدے گدیاں‘ ربڑ کے سپرنگ‘ نلکیاں‘ ہوز پائپ اور خدا معلوم کیا کیا۔

جب فہرستیں آتی ہیں تو وہ ہر ایک کا بغور مطالعہ کرتے ہیں۔اسی لیے میں نے کہا کہ سردار دیوان سنگھ مفتوں بہت پڑھا لکھا آدمی ہے۔وہ تمام فہرستیں پڑھتا ہے۔جب بیکار ہو جاتی ہیں تو محلے کے بچوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔کہ وہ تصویریں دیکھیں اور خوش ہوں۔بچوں سے اسے بہت پیار ہے۔

بیرونی ممالک کے کارخانوں کی فہرستیں پڑھ پڑھ کر وہ اپنے پرچے کے زوردار اداریے لکھتا ہے۔’’ناقابل فراموش‘‘ کا ناقابل فراموش کالم لکھتا ہے۔ سوالوں کے ’’دلچسپ‘‘ جواب دیتا ہے۔اور فصاحت و بلاغت کا ہر جگہ خون کرتا ہے۔

بہت بدخط ہے۔جس طرح وہ آپ ٹیڑھا میڑھا ہے اسی طرح اس کے قلم سے نکلے حروف ٹیڑھے میڑھے ہیں۔مجھے حیرت ہے کہ کاتب اس کا لکھا ہوا کیسے پڑھتا ہے؟ مجھے جب بھی اس کا خط آیا مین نے اندازاً اس کا مطلب نکالا۔دوسری مرتب غور

سے ''ڈی سائز'' کرنے کی کوشش کی تو معلوم ہوا کہ میں نے پہلی نظر میں جو مطلب اخذ کیا تھا بالکل غلط تھا۔ تیسری دفعہ پڑھا تو حروف اپنی صحیح شکل اختیار کرنے لگے چوتھے مرحلے پر بالآخر عبارت مکمل طور پر روشن ہوئی۔

دیوان سنگھ مفتوں بہت محتاط آدمی ہے۔ محاورہ ہے۔ دودھ کا جلا چھاچھ پھونک پھونک کر پیتا ہے چھاچھ کے علاوہ وہ پانی بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے کاتب کو ہدایت ہے کہ جب اس کی لکھی ہوئی سلیپیں کاغذ پر منتقل ہو جائیں تو فوراً واپس کر دی جائیں۔ کتابت شدہ سطور میں اغلاط لگانے کے بعد وہ میز پر پڑی ہوئی کالی صندوقچی کھولے گا' اور اس میں تمام سلپس ڈال کر اس کو مقفل کر دے گا۔ اور جب پرچہ چھپ کر آ جائے گا تو اپنی تحریروں کو تلف کر دے گا۔ معلوم نہیں یہ احتیاط کیوں برتی جاتی ہے۔

اس کی ساری ڈاک ایک تھیلے میں مقفل ہو کر آتی ہے۔ اسے کھول کر وہ ایک اور خط اور ایک ایک اخبار نکالے گا۔ اور ترتیب وار میز پر رکھتا جائے گا۔ لفافہ کھول کر خط نکالنے کے بعد ہو لفافہ ردی کی ٹوکری میں نہیں پھینکتا۔ بلکہ خط کے ساتھ پن لگا کر نتھی کر دیتا ہے۔ اسی طرح ہی وہ رسالوں اور اخباروں کے ریپر بھی ضائع نہیں کرتا۔ میں نے اس طرز عمل کے متعلق پوچھا تو جواب ملا احتیاط ہر حال میں اچھی ہوتی ہے ہو سکتا ہے کہ میں کسی اخبار یا رسالے کے خلاف مقدمہ کرنا چاہوں اب قانون یہ ہے کہ اگر لاہور کے کسی اخبار نے میرے خلاف لکھا ہے اور ریپر جس پر میرا نام اور پتہ موجود ہے میں پیش نہیں کر سکتا تو مقدمہ صرف لاہور ہی میں چل سکتا ہے۔ بصورت دیگر اس بات کا ثبوت یہ ہوگا کہ میری بے عزتی یہاں دہلی میں ہوئی ہے۔ جہاں مجھے یہ پرچہ ارسال کیا گیا ہے اس لیے میں یہاں دہلی کی عدالت میں دعویٰ دائر کر سکتا ہوں۔

دیوان سنگھ مفتوں پر جو آخری مقدمہ (غالباً تیسواں) چلا بہت خطرناک تھا۔ وہ اور ایک بنگالی بلاک میکر جعلی نوٹ بنانے کے الزام میں ماخوذ تھے۔ میں ان دنوں

بمبئی میں تھا ایک دن مجھے مصور ویکلی کی معرفت ایک ٹائپ کیا ہوا خط ملا جس پر کوئی دستخط نہیں تھے۔ ٹائپ میں دیوان سنگھ مفتوں لکھا تھا۔ مجھ پر درخواست کی گئی تھی کہ میں گواہ کے طور پر پیش ہوں۔

عرصہ ہوا میں دہلی گیا تھا اور انکی خدمت مین حاضر ہوا تھا۔ میں دفتر پہنچا تو وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ بہت بڑا میز تھا۔ جس کے دونوں طرف ریڈیو پڑے تھے۔ قلمدان کے پاس کروشن سالٹ کی دو بوتلیں تھیں ایک کونے میں پردے کے پیچھے صوفہ نما چیز تھی جس پر غالباً دیوان صاحب استراحت فرماتے ہوں گے۔ سب الماریاں کھلی تھیں۔

میں نے یہ اور دوسری تفصیلات "مصور" میں ایک مضمون کی صورت میں شائع کی تھیں۔ اور کہا تھا کہ اگر اس کمرے میں چھوٹا سا کمپارٹمنٹ بنا دیا جاتا جس میں کموڈ ہوتا تو یہ کمرہ کسی ریل کا بہت بڑا ڈبہ دکھائی دیتا۔

دیوان صاحب نے ی مضمون سنبھال کے رکھا ہوا تھا۔ جب پولیس نے چھاپہ مار کر اس کمرے کی الماری سے ایک کتاب مین رکھے ہوئے سوسو کے چھ غالباً نوٹ نکالے اور سردار صاحب کی گرفتاری عمل میں آئی تو انہوں نے مجھے صفائی کے گواہوں میں رکھ لیا۔ اس مضمون سے اور میری گواہی سے یہ ثابت کرنا مطلوب تھا کہ ان کے دفتر میں کوئی بھی شخص بے روک ٹوک آ جا سکتا ہے۔

میرا خیال ہے کہ میں دہلی میں دیوان صاحب سے اپنی اس ملاقات کے بارے میں بھی کچھ لکھ دوں کہ یہ خاصی دلچسپ تھی۔

دیر تک انتظار کرنے کے بعد جب وہ نہ آئے تو میں چلا گیا۔ شام کو آیا تو وہ دفتر میں موجود تھے۔ مچلن ٹائر کا اشتہار کرسی رپ بیٹھا تھا سر پر چھوٹی سی سفید پگڑی۔ قلم انگلیوں میں دبائے کچھ لکھ رہے تھے۔ چشمے کے شیشوں کے پیچھے آنکھیں ایک عجیب انداز میں اوپر کر کے مجھے دیکھا' اور یوں اچھلے جیسے ربڑ کی ٹھوس گیند اچھلتی ہے۔ مجھ

سے ''گھٹ گھٹ کر جپھیاں پائیں'' یعنی بڑی گرمجوشی سے بغل گیر ہوئے۔ اور کہا کہ مجھے معلوم ہوا تھا کہ آپ آئے ہوئے ہیں۔ میں ایک ضروری کام سے باہر گیا ہوا تھا۔

مجھے بیٹھنے کو کہا میں نے حالات پوچھے۔ ادھر ادھر کی باتیں شروع کیں۔ مگر میں محسوس کر رہا تھا کہ وہ مجھ سے متوجہ تو ضرور ہیں لیکن ان کا دماغ کچھ اور سوچ رہا ہے۔ باتیں کرتے کرتے انہوں نے ٹیلی فون کا رسیور اٹھایا' اور نمبر ملا کر دوسرے سرے والے سے کہا میں سندر لال بول رہا ہوں نئی دہلی سے لالہ...... ہیں؟ کہاں گئے ہیں؟ اچھا۔

آپ کا دفتر پرانی دہلی میں تھا۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ سندر لال نہیں بول رہا تھا دیوان سنگھ بول رہا تھا۔ دوران گفتگو آپ نے کئی مرتبہ اسی طرح مختلف نمبر ملائے اور جعلی ناموں سے لالہ کے متعلق پوچھا کہ وہ کہاں ہیں؟ معلوم نہیں کیا چار سو بیسی تھی۔ لیکن مجھے اتنا یقین تھا کہ اسالے کی شامت آ گئی ہے یا عنقریب آنے والی ہے۔

ٹیلی فون کے ذریعے جب کچھ پتا نہ چلا تو انہوں نے سولھویں مرتبہ مجھے بیئر کی دعوت دینے کے بعد اپنے ایک خاص آدمی (غالباً سردار وریام سنگھ) کو آواز دے کر بلایا۔ اس کے کان میں ہولے سے کچھ کہا اور رخصت کر دیا۔ پھر مجھ سے مخاطب ہوئے ہاں منٹو صاحب! بیئر منگواؤں آپ کے لیے؟

میں نے جھنجھلا کر کہا سردار صاحب! زبانی جمع خرچ آپ نے آخر سیکھ ہی لیا دہلی والوں سے۔ منگوائیے منگواتے کیوں نہیں؟

یہ سن کر دیوان صاحب خوب کھل کر ہنسے۔ اور ہالیان یو۔ پی کو بے نقط سنانے لگے۔ انسانوں کی اس قسم سے ان کو خدا واسطے کا بیر ہے۔ چنانچہ جب بھی انہیں اپنے دفتر میں کسی ملازم ک ضرورت ہوتی ہے تو اشتہار میں یہ بات خاص طور پر لکھی ہوتی ہے کہ صرف پنجابی درخواست بھیجیں۔ لیکن عجیب بات ہے کہ آپ احسان بھیا کو اپنا بہترین دوست یقین کرتے ہیں۔ ان کے دل میں یو۔ پی۔ کے اس باشندے کا بہت

احترام ہے۔

ایک مرتبہ دیوان صاحب کو اپنی موٹر ایک تنگ بازار سے گزارنا تھ۔ میں ان کے ساتھ ہی تھا۔ موٹر مڑی تو سڑک کے بیچوں بیچ چارپائیاں بچھی دیکھیں۔ آپ آگ بگولا ہو گئے لگے دہلی والوں اور ان کی ہشت پشت کو بے نقط سنانے۔ کم بختو! تمہارے اسلاف تمہارے آباؤ اجداد نے بھی اسی طرح چارپائیوں پر دن رات سو سو کر اپنی سلطنت کا بیڑہ غرق کر دیا اب تمہارے پاس کیا رہ گیا ہے جس کا بیڑہ غرق کرو گے؟ تمہارا بیڑہ غرق کرے۔

ایک لڑکے نے چارپائی اٹھانے کی کوشش کی مگر اس سے نہ اٹھی۔ دیوان صاحب موٹر سے باہر نکلے اور چارپائی کو اٹھا کر پھینک دیا۔ برخوردار! تم سے نہ اٹھتی اپنی کمریا دیکھو' تمہارے والد بزرگوار یقیناً تم سے بھی زیادہ نازک ہوں گے۔ ان سے تو پاخانے جاتے وقت لوٹا بھی نہ اٹھایا جاتا ہوگا۔

اس پر بہت سے لوگ جمع ہو گئے۔ انہوں نے کرخنداروں کی زبان میں مین واہی تباہی بکنا شروع کیا۔ مگر دیوان صاحب نے جیسے کچھ سنا ہی نہیں۔ موٹر میں آرام سے بیٹھے اور چلانا شروع کر دی۔

سردار صاحب کو پنجابی بہت پسند ہے۔ شاید اس لیے وہ ایک زمانے سے دہلی میں قیام پذیر ہیں۔ ورنہ یہ حقیقت ان کی نظروں سے اوجھل نہیں کہ صرف پنجابی ہونا اچھے انسان کی دلیل نہیں وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر بھی یہ نہیں کہہ سکتے کہ اپنے دفتر کی ملازمت کے سلسلہ مین پنجابی کی قید لگا کر انہوں نے ہمیشہ فائدہ اٹھایا کیونکہ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ جتنا نقصان انہیں پنجابیوں نے پہنچایا اس کا عشر عشیر یو پی کے رہنے والوں نے نہیں پہنچایا۔

اب میں انکے آخری اور خطرناک مقدمے کی طرف لوٹتا ہوں۔ میں دہلی گیا سردار صاحب ضمانت پر رہا تھے۔ کہ ان کو تنگ کرنے کے لیے ان کے مقدمے کی سماعت

دہلی سے بہت دور گوڑاؤں کی ایک عدالت میں ہو رہی ہے۔ ہم موٹر میں گئے۔ وکیل نے مجھے سمجھا دیا کہ مجھے کیا کہنا ہے۔ چنانچہ میری گواہی دس منٹ کے اندر اندر ختم ہو گئی۔

سردار صاحب کو اپنا تحریری بیان پیش کرنا تھا۔ جب حوالات میں تھے تو آپ نے اس کے نوٹ لے لیے تھے۔ اب یہ چھوٹے ٹائپ میں غالباً چالیس پچاس صفحات پر پھیلا ہوا تھا۔ میں نے اسے جستہ جستہ دیکھا تھا۔ اور میرا ذہن فرانس کے مشہور مصنف ایمیلی روزا کے شہرہ آفاق مضمون Lacuse کی طرف منتقل ہو گیا۔

دیوان سنگھ مفتوں کا یہ بیان ملزم کا صفائی بیان نہیں تھا بلکہ فرد جرم تھی حکومت اور اس کے کارندوں کے خلاف۔ آخر میں انہوں نے اپنے مقدمات کی فہرست بھی لگا رکھی تھی۔ ہر صفحے پر مختلف خاکے بنا کر واضح کیا گیا تھا کہ کونسا مقدمہ کب چلا کس کی ایما پر چلا کس کی عدالت میں چلا اور اس کا کیا فیصلہ ہوا؟

غالباً بتیس مقدمے تھے۔ ان میں سے اکتیس میں وہ باعزت طور پر بری ہوئے تھے۔ صرف ایک مقدمہ تھا بہت بڑا اور بہت مشہور مقدمہ (جو نواب بھوپال نے ان پر چلایا تھا) جس میں ان کو شاید صرف اس عرصے کی سزائے قید دی گئی تھی، جو انہوں نے حوالات میں گزارہ تھا۔)

سردار صاحب نے فاضل جج کے یہ الفاظ خاص طور پر اپنے بیان میں بیان کیے ہوئے تھے کہ میں سردار دیوان سنگھ مفتوں ایڈیٹر "ریاست" دہلی کی ہمت کی داد دیتا ہوں کہ جو اپنے محدود ذرائع کے باوجود طویل عرصے تک ایک شہزادے کا تندہی کے ساتھ مقابلہ کرتا رہا۔

نواب بھوپال سے سردار دیوان دنگھ واقعہ بہت دلیری اور ثابت قدمی سے لڑا۔ لیکن اس جنگ میں اس کا دیوالہ پٹ گیا۔ جو جمع پونجی تھی سب پانی کی طرح بہہ گئی کوئی اور ہوتا تو اس کی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کمر ٹوٹ جاتی۔ مگر مفتوں نے حوصلہ نہ ہارا۔ اور

جوں توں اپنا پیارا پرچہ ریاست شائع کرتا رہا۔

اس نے بڑے بڑے آدمیوں سے مقابلہ کیا۔ اور فتح حاصل کی۔ لیکن اپنی زندگی میں ایک آدمی سے شکست کھائی کس سے؟ خواجہ حسن نظامی سے۔

سردار صاحب نے ایک دن زچ پچ ہو کر مجھ سے کہا میں نے بڑی بڑی قطب صاحب کی لاٹھیوں کو جھکا دیا، مگر یہ کمبخت حسن نظامی مجھ سے نہیں جھکایا جا سکا۔ منٹو صاحب! میں نے اس شخص کے خلاف اتنا لکھا اتنا لکھا ہے کہ اگر ریاست کے وہ تمام پرچے جس میں یہ مضامین چھپتے رہے ہیں اس پر رکھ دیے جائیں تو انکے وزن ہی سے اس کا کچومر نکل جائے۔ مگر الٹا میرا کچومر نکل گیا۔ میں نے اس کے خلاف اس قدر زیادہ اس لیے لکھا کہ میں چاہتا تاھ کہ وہ بھنا کر قانون کو پکارے۔ کھلی عدالت میں مقدمہ پیش ہو وہاں اس کا ڈھول کا پول کھول کر رکھ دوں۔ مگر وہ بڑا اکائیاں ہے۔ اس نے مجھے کبھی ایسا موقع نہیں دیا اور نہ دے گا۔

یہ عجیب بات ہے کہ کسی زمانے میں سردار دیوان سنگھ مفتوں اور خواجہ حسن نظامی میں گاڑھی چھنتی تھی۔ معلوم نہیں کس بات پر وہ ایک دوسرے سے الگ ہو گئے۔

میں پھر مقدمے کی طرف آتا ہوں گوڑ گاؤں کی عدالت نے ان کو غالباً دو دفعات کے تحت بارہ بارہ برس کی قید بامشقت کی دو سزائیں دیں۔ سردار صاحب نے گوڑ گئوں میں ہی مجھ سے کہہ دیا تھا کہ یہاں کا مجسٹریٹ مجھے کڑی سے کڑی سزا دے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ لیکن انہوں نے مجھے تسلی دی کہ متفکر ہونے کی ضرورت نہیں ہائیکورٹ میں صاف بری ہو جاؤں گا۔ یہ بھی صحیح ثابت ہوا۔

ہائیکورٹ نے انہیں باعزت طور پر بری کر دیا۔

سردار صاحب نے مجھے گوڑ گاؤں میں کہا تھا کہ وہ کچھ عرصہ پہلے شملہ میں تھے۔ وہاں ایک پارٹی تھی جس میں سر ڈگلس ینگ (اس زمانے کے چیف جسٹس) بھی تھے۔ وہ اس کے خلاف بہت کچھ لکھ چکے تھے۔ سردار صاحب کو حیرت ہوئی کہ جب

سر ڈگلس ینگ نے ان سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ بہر حال ان دونوں کی ملاقات ہوئی، اور چیف جسٹس نے ان کے قلم کی توانائی کی بہ تعریف کی اور کہا میں ایسے آدمیوں کا دوست ہوں اگر کبھی تمہارے کام آ سکا تو یقین ماننا کہ میں تمہاری مدد ضرور کروں گا۔

جہاں تک میں سمجھتا ہوں سر ڈگلس ینگ کے اس وعدے کو سر دان دیوان سنگھ مفتوں کی بریت میں کافی دخل ہونا چاہیے۔

مقدمہ دیر تک چلا۔ دیوان صاحب جیل میں تھے۔ اس مقدمے کی روداد بڑی دلچسپ تھی۔ استغاثے کی طرف سے یہ کہانی پیش کی گئی تھی کہ دیوان سنگھ مفتوں نے کچھ جعلی نوٹ چلانے کی خاطر اپنے دوست جیون لال مٹو کو ایک لفافے میں لاہور بھیجے تھے جو راستے ہی میں پولیس نے اپنے قبضے میں لے لیا۔ لفافے پر ایک ٹائپ کیا ہوا خط بھی تھا۔ یہ ثابت کرنے کے لیے کہ یہ خط دیوان صاحب نے اپنے دفتر کے ٹائپ رائٹر پر تیار کیا تھا عدالت میں اسے بھی پیش کیا گیا۔

خط میں حرف ''او'' اور ''پی'' کے پیٹ کثرت استعمال کی وجہ سے بھر گئے تھے۔

ہائیکورٹ میں جب پیش کردہ ٹائپ رائٹر کی تحریر کا نمونہ لیا گیا تو ''او'' اور ''پی'' کے پیٹ بالکل صاف تھے۔ اس کے علاوہ جب صفائی کی طرف سے یہ استفسار کیا گیا کہ لفافہ جو کہ بقول استغاثہ دیوان سنگھ مفوں نے جیون ال مٹو کو بھجا تھا اس پر دہلی کے ڈاک خانے کی مہر گیارہ جنوری کی تاریخ بتاتی ہے اور لاہور کے ڈاک خانے کی مہر ظاہر کرتی ہے کہ لفافہ پندرہ جنوری کو ڈلیور ہوا گیارہ تاریخ کا چلا ہوا لفافہ مکتوب الیہ کو زیادہ سے زیادہ تیرہ تاریخ کو مل جانا چاہیے تھا۔ (تاریخیں غلط ہیں اصل تاریخیں مجھ کو یاد نہیں رہیں) تین دن یہ لفافہ کہاں بھٹکتا رہا؟

یہ سوال اٹھنا تھا کہ ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ استغالہ اس کا کوئی معقول جواب نہ دے سکا۔ اور آئیں بائیں شائیں کرتا رہا۔ یہ نکتہ ملزم کو شک کا فائدہ بخشنے کے لیے کافی تھ۔ چنانچہ دہلی میں (ان دنوں میں آل انڈیا ریڈیو میں ملازم تھا) اخباروں میں یہ خبر

دیکھی کہ سردار دیوان سنگھ مفتوں ایڈیٹر ''ریاست'' دہلی، جعلی نوٹ بنانے کے مقدمے سے صاف بری کر دیے گئے ہیں۔

دوسرے دن صبح آٹھ بجے کے قریب حسن بلڈنگز نکلسن روڈ کے فلیٹ نمبر نو (میں یہاں رہتا تھا) کے دروازے پر دستک ہوئی۔ میری بیوی نے دروازہ کھولا۔ معلوم ہوا کہ دیوان سنگھ صاحب ہیں۔ میں نے دوڑ کر ان کا استقبال کیا۔ انہوں نے مجھے بازوؤں میں لے لیا اور گھٹ گھٹ کے جپھیاں پائیں''۔

پیشتر اس کے کہ میں انہیں مبارک باد دیتا۔ انہوں نے مجھ سے کہا ''سبحان اللہ لطف آ گیا''۔

میں نے ان سے پوچھا کس بات کا؟

آپ نے جواب دیا میں نے جیل میں آپ کی کتاب ''منٹو کے افسانے'' پڑھی۔ اس کا انتساب خوب تھا۔ اخبار دین و دنیا کے نام جس میں میرے خلاف سب سے زیادہ گالیاں چھپیں۔ میں آج صبح دہلی آیا ہوں۔ سوچا سب سے پہلے چل کر منٹو صاحب کو داد دینی چاہیے۔

اس سے مجھ پر ثابت ہوا کہ شئے لطیف ان مین بدرجہ اتم موجود ہے۔

ٹائپ رائیٹر میں ''او'' اور ''بی'' کی کیز کیسے تبدیل ہوئیں لفافہ اتنی دیر کے بعد کیوں ڈلیور ہوا؟ یہ ایک راز ہے جو سدا راز رہے گا۔ جب میں نے ان سے اس بارے میں پوچھا تو وہ یہ کہہ کر ٹال گئے ک منٹو صاحب یہ ہاتھ کی صفائی ہے۔

ہاتھ کی صفائی ہو یا پاؤں کی استغاثے کی طبیعت یقیناً صاف ہو گئی تھی۔

دیوان صاحب کو مجھ سے پیار ہے۔ مولانا چراغ حسن حسرت کا وہ احترام کرتے ہیں ہم دونوں دہلی میں تھے۔ ان کو جب بھی فرصت ہوتی ہمیں ڈھونڈ نکالتے اور کسی دور دراز خاموش مقام پر لے جاتے۔ وہاں ہم سب بیٹھ کے پیتے گپیں لڑاتے۔ پھر وہ ہم دونوں کو گھر چھوڑ جاتے۔ ایسی نشستوں میں کوئی سیاسی یا ادبی بات نہیں ہوتی تھی

ایک لطیفہ سنیے جو انہوں نے مجھے خود سنایا۔ انتہائی مفلسی کے دن تھے کہ ان کا ایک دوست آن وارد ہوا۔ پہلے تو وہ بہت سٹپٹائے کہ جیب میں ایک دھیلا بھی نہیں ہے لیکن فوراً ان کو ایک ترکیب سوجھی۔ بارہ لیمن کی بوتلیں منگوائیں۔ دو دوست کو پلائیں دو خود پئیں۔ باقی آٹھ غسل خانے میں خالی کر دیں۔ اور نوکر سے کہا کہ جاؤ یہ بارہ بوتلیں بیچ آؤ۔ جنگ کا زمانہ تھا گولی والی بوتلیں اچھے دام لے آیا۔ چنانچہ دوست کو رات کا کھانا کھلانے کا مسئلہ حل ہو گیا۔ دوسرے تیسرے روز انہوں نے دکاندار کو بارہ بوتلوں کی قیمت ادا کر دی۔

ایک زمانہ آیا کہ وہ آل انڈیا ریڈیو کے جانی دشمن ہو گئے۔ بس پھر کیا تھا۔ ہر پروگرام سنتے۔ ایک رجسٹر تھا۔ جس میں کئی خانے بنے تھے۔ اس میں درج تھا کہ ریڈیو کے کس افسر کا کس گانے والی سے ٹانکا ہے (یہ لفظ ان کی خاص الخاص ایجاد ہے) ہے۔

اگر کوئی گانے والی کسی وجہ سے پروگرام میں شریک نہ ہو سکتی اور اس کی جگہ کسی اور سے گوایا جاتا تو ان کو فوراً معلوم ہو جاتا کہ کس افسر کی مہربانی ہوئی ہے۔

بہت دیر تک وہ ذوالفقار بخاری کے خلاف لکھتے رہے۔ آخر جگل کشور (حل احمد سلمان ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل ریڈیو پاکستان) پر پل پڑے۔ جگل کشور پہلے کلکتہ میں تھے۔ دہلی تبدیل ہو کر آئے تو ان کی ایک بنگالن نے محبت نامے بھیجنے شروع کیے۔ جگل کو حیرت تھی کہ یہ خط میرے پاس نہیں پہنچے مفتوں کو ملتے ہیں۔ یہ بھی غالباً ہاتھ کی صفائی تھی۔ بہر حال میں نے منت خوشامد کر کے جگل صاحب کی گلو خلاصی کرائی اور ان سے درخواست کی کہ بنگالن کے خطوط واپس دے دیجیے۔ آپ نے مسکرا کر کہا میں اتنا بے وقوف نہیں۔ اگر آپ کا دوست یہ خط پڑھنا چاہتا ہے تو میں نقل کرا کر اس کو بھجوا دوں گا۔

میں نے زیادہ زور دینا مناسب نہ سمجھا۔

دہلی میں ایک شخص جو امرتسر کا یعنی میرا ہم شہر تھا۔ سخت پریشانی کے عالم میں میرے پاس آیا۔ اس کا چھوٹا بھائی ایک لڑکی کو بھگا کر دہلی لے آیا تھا۔ اس کے وارنٹ گرفتاری جاری ہو چکے تھے۔ وہ اس معاملے کو سلجھانے کے لیے میری مدد چاہتا تھا۔ میں اسے دیوان صاحب کے پاس لے گیا۔ انہوں نے سارا ماجرا سن کر حکم دیا اغوا کرنے والے اور مغویہ کو میرے پاس لاؤ۔

دوسرے دن دیوان صاحب سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے مجھ سے کہا وہ لوگ آ گئے تھے میں نے سب ٹھیک کر دیا ہے۔ سب ٹھیک کر ہی دیا ہو گا۔ ورنہ وہ شخص میرے پاس دوبارہ ضرور آتا۔

دیوان سنگھ کی معلومات کے ذرائع بہت وسیع ہیں۔ پاکستان میں کسی فرشتے کو بھی معلوم نہیں تھا کہ قائداعظم زیارت میں خطرناک طور پر علیل ہیں۔ لیکن ریاست میں اس مضمون کا ایک نوٹ گو بہت ہی دل آزار ہے دو ہفتے پہلے شائع ہو چکا تھا کہ جس میں دیوان صاحب نے اپنے مخصوص انداز ظالمانہ میں لکھا تھا کہ قائداعظم محمد علی جناح بستر مرگ پر ہیں لیکن میری دعا ہے کہ زندہ رہیں اور پاکستان کو......

اب ریاستیں نہیں رہیں راجے ہیں نہ مہاراجے جوان کے دل پسند کھلونے تھے۔ مگر سردار صاحب نے یقیناً اور کھلونے چن لیے ہوں گے۔ راجہ نہیں ہو گا کوئی وزیر ہو گا۔ مہارانی نہیں ہو گی تو کسی بڑے سرمایہ دار کی کھل کھیلنے والی دھرم پتنی ہو گی۔ مفتوں کا جنوں کیسے فارغ بیٹھ سکتا ہے؟

لوگ اسے دغاباز بلیک میلر چور اچکا کہتے تھے۔ مگر وہ اپنے پہلو میں انسانیت دوست دل رکھتا تھا۔ پچھلے فسادات کی بات ہے اس نے جتنے مسلمانوں کو خونخوار سکھوں اور ہندوؤں سے بچایا تھا جتنی مسلمان عورتوں اور ان کے بچوں کو پناہ دی تھی ان کے دل سے اس کے لیے جو دعائیں نکلی ہوں گی میرا خیال ہے کہ اس کی مغفرت کے لیے کافی ہوں گی۔

پچھلے دنوں میں سخت بیمار تھا۔ میو ہسپتال کے اے وارڈ میں مجھ پر نیم بیہوشی اور بیہوشی دس پندرہ روز تک طاری رہی۔ میری بیوی اور بہن نے مجھے بتایا کہ اس عالم میں بار بار میں سردار دیوان سنگھ مفتوں کو یاد کرتا تھا۔ میں یہ سمجھتا تھا کہ دہلی میں ہوں ریاست کا دفتر کچھ دور ہے۔ اور وہاں ٹیلی فون کیا جا سکتا ہے۔ میں ان سے کہتا جاؤ ٹیلی فون کرو اور دیوان صاحب سے کہو کہ منٹو بلا رہا ہے۔ اس کو بہت ضروری کام ہے۔

وہ سمجھاتے تھے کہ تم لاہور میں ہو۔ مگر میں بضد تھا کہ نہیں میں دہلی میں ہوں تم جاؤ...... اور دیوان صاحب کو ٹیلی فون کرو۔ وہ فوراً آ جائیں گے۔

گو ان دنوں میں عالم برزخ میں تھا۔ ہونے نہ ہونے کے درمیان معلق تھا۔ میرا دماغ دھند میں لپٹا ہوا تھا مگر مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جہاں میرا بستر تھا۔ اس سے کچھ فاصلے پر ایک دروازہ تھا۔ اس کے آگے ایک بہت بڑا ہال جس میں دو یورپین بچے پنگ پانگ کھیلتے رہتے تھے۔ اس کو طے کر جایئے تو باہر پلازہ سینما (دہلی) کا گیٹ آ جاتا۔ مگر افسوس کہ ہر وقت بند رہتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ میں بار بار لوگوں سے درخواست کرتا کہ وہ ٹیلی فون کر کے سردار دیوان سنگھ مفتوں کو بلائیں۔ مجھے کون سا ضروری کام تھا؟ اس کے متعلق مجھے کچھ معلوم نہیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ میرے قریب قریب ماؤف دماغ میں صرف دیوان سنگھ صاحب کی یاد کیسے باقی رہی؟

دیوان سنگھ مفتوں

(از چراغ حسن حسرت)

آج سے کچھ عرصہ پہلے یہ عام دستور تھا کہ کسی اخبار نویس کے کمالات بیان کرنے بیٹھتے تھے تو کہتے تھے کہ اتنی دفعہ جیل گیا ہے۔اتنی بار اخبار کی ضمانت ضبط کرائی ہے۔ پولیس والے تو الگ رہے ڈپٹی کمشنروں کو خاطر میں نہیں لاتا۔ جب لکھنے پہ آتا ہے بڑے بڑوں کا کچا چٹھا کھول کر رکھ دیتا ہے۔دیوان سنگھ مفتوں کو اخبار نویسی کے اس معیار پر پرکھیے جب بھی پورا اترتا ہے۔یعنی اس پر آج تک پندرہ یا سولہ مقدمے بن چکے ہیں۔تین بار جیل گیا ہے۔قرقیوں اور ضبطیوں کا حساب مجھے یاد نہیں۔باقی رہا لکھنے کا قصہ تو ظالم نے کیا کیا نہیں لکھا؟ اور کس کس کے خلاف نہیں لکھا؟

دیوان سنگھ نے ساری عمر اخبار نویسی ک اور بھی بہت سے پاپڑ بیلے ہیں۔مہاراجہ نابھ کا مصاحب رہا ہے۔موٹر ڈرائیوری کی ہے۔مدت تک ایک ڈاکٹر کے ہاں کمپونڈر بھی رہا ہے غالباً یہی وجہ ہے کہ وہ حکیم صاحب کی گولیوں کو مانتا ہے۔ٹنکچر آیوڈین کا قائل ہے کروشن سالٹ کا نام آتے ہی اس کی گردن عقیدت سے جھک جاتی ہے۔لیکن سدھمکر دھوج ہو یا لبوب کبیر دونوں کو خاطر میں نہیں لاتا۔بنفشہ اور ''خیساندہ جوشاندہ صاف کردہ'' قسم کے معمولی خیساندوں اور جوشاندوں کا ذکر کیا ہے' میں نے اسے ایارج فیقرا اور دواء مسک سے مرعوب ہوتے نہیں دیکھا۔طب کا نام آیا اور اس نے ہوالشافی کہہ کے زبان کھولی۔اور جب تک کروشن سالٹ کا قائل نہیں کرلیا پیچھا نہیں چھوڑا۔

یہ عجیب بات ہے کہ اسے دیسی طریقہ علاج سے چڑ ہے۔لیکن جوتش پر ایمان رکھتا ہے۔رمل اور جفر کو بھی مانتا ہے۔اور سچ پوچھیے تو جوتشیوں کو اس کی زندگی میں اس نے ہمیشہ وکیل کی قانونی نکتہ آرائیوں پر جوتشی کے مشورہ کو اہمیت دے۔وکیل کہتا ہے مسل

بنواؤ جوتشی کہتا ہے مسل کا زائچہ بنواؤ۔ مسل نکلوائی گئی یا نہیں لیکن مسل کا زائچہ ضرور بن گیا۔ اسے خود بھی نجوم میں شدبد ہے۔ پھر ای صاحب جوڑے نجومی ہی نہیں۔ بلکہ اچھے خاصے اخبار نویس بھی ہیں برسوں ''ریاست'' میں ریاست کے ساتھ ساتھ جوتش بھی لڑاتے رہے ہیں۔ بعض خاص خاص مقدموں کے زمانہ میں تو دیوان سنگھ سے ان کی گاڑھی چھنتی رہی ہے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ دفتر کا کام رکا پڑا ہے اور یہ دونوں آمنے سامنے بیٹھے ہیں۔ سنگھلرک تلا بکھان رہے ہیں۔ لیکن ایسا بہت کم ہوا ہے کیونکہ دیوان سنگھ کو دفتر کا کام بڑا خیال ہے۔ اچھی خاصی عمر ہونے کو آئی ہے۔ ساٹھ کے پیٹے میں ہوگا۔ داڑھی کے بال صرف خضاب کی برکت سے سیاہ ہیں۔ لیکن صبح سے کام کرنے بیٹھا ہے تو چراغ ہی جلا دیے۔ سی عالم میں کوئی ملنے آ گیا تو یہ کیفیت نظر آئی ہے کہ ایک ہاتھ سے مصافحہ کر رہا ہے اور دوسرے ہاتھ سے پاجامہ سنبھال رہا ہے۔ بھاری بھرکم جسم ہے توند بڑھی ہوئی ہے۔ پاجامہ تو خیر توند کی برکت سے ہی اپنی جگہ پر نہیں رہا۔ نہ جانے پگڑی کے پیچ بار بار کیوں کھل جاتے ہیں۔ پگڑی اتارتا ہے باندھتا ہے پھر اتارتا ہے اور باندھتا ہے۔ اور بعض اوقات تو یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک ہاتھ سے پاجامہ سنبھالے ہوئے ہے اور دوسرے ہاتھ سے پگڑی۔ اس حالت میں مصافحہ کی گنجائش کیسے نکلے؟

اس کی آنکھیں بڑی بڑی اور روشن ہیں۔ لیکن باتیں کرتے وقت انہیں بار بار جھپکتا ہے۔ اکثر اوقات یہ ہوتا ہے کہ باتیں کرتے کرتے کچھ اور سوچنا شروع کر دیا' اور گفتگو کا سلسلہ بیچ میں سے ٹوٹ گیا ہے۔ یہ مرض تھوڑا تھوڑا مجھے بھی ہے۔ اس لیے کبھی کبھی یہ بھی ہوا ہے کہ دونوں کا ذہن تھوڑی دیر کے لیے غیر حاضر ہو گیا ہے پھر جو سلسلہ گفتگو چھیڑنا چاہا تو دونوں کو یاد نہیں کہ موضوع کیا تھا؟

اگر اس کی حیثیت گفتگو میں سامع کی ہے تو یقین کیجیے آپ نے جو کچھ کہا ہے وہ اس نے نہیں سنا یا سنا ہے تو پورا نہیں سنا۔ وہ آپ کے سامنے بیٹھا ہے لیکن اس کا ذہن

پٹیالہ الور اور شملہ کی سیر کر رہا ہے۔ ہاں اگر آپ نے اس کے ڈھب کی کوئی بات کہی ہے تو ذہن کو ایک جھٹکے کے ساتھ شملہ کی بلندی سے زمین پر لے آتا ہے اور مسکرا کے کہتا ہے کہ کیا فرما رہے تھے آپ؟ میں نے نہیں سنا۔ آج تک انے پورا فلم نہیں دیکھا۔ یا تو فلم دیکھتے دیکھتے سو جاتا ہے یا پھر ذہن کو پٹیالہ اور بھوپال کی سیر کرانے کے لیے بے عنان چھوڑ دیتا ہے۔ کام کرتے کرتے تھک جاتا ہے تو دوستوں سے کہتا ہے کہ بھئی تھکا ہوا ہوں لیکن نیند نہیں آتی آؤ ذرا سینما ہو آئیں۔ تم فلم دیکھ لینا میں گھڑی دو گھڑی سو لوں گا۔

اس پراگندہ خیالی کے ساتھ ساتھ اس کی زندگی میں بڑی ترتیب ہے۔ جو کام کیا ہے ہمیشہ سلیقہ سے کیا ہے۔ دفتر کا بہت سا کام خود کرتا ہے۔ مضمون بھی لکھتا ہے انتظام بھی کرتا ہے ڈاک خود کھولتا ہے۔ ایک ایک خط دیکھتا ہے۔ اہم خطوط کو صندوقچے میں بند کر کے تالا لگاتا ہے۔ تالا کھولتا ہے۔ ایک آدھ خط کو پھر دیکھتا ہے۔ اور بند کر دیتا ہے۔ والیان ریاست کے متعلق اس نے الگ الگ فائلیں بنا رکھی ہیں۔ جن میں ان کے اور اہلکاروں کے متعلق ہر قسم کی معلومات جمع کر دی گئی ہیں۔ ہز ہائی نس کی کتنی بیویاں ہیں؟ خواصوں میں کون کون منظور نظر ہیں؟ کتنی طوائفوں سے ان کا تعلق رہا ہے۔ ہنا کب گئی کب آئی؟ لیلا کس کے توسط سے دربار میں پہنچی۔ اور اسے کتنا روپیہ ملا؟ محل میں کیا کیا سازشیں چل رہی ہیں' اور بڑی رانی کس فکر میں ہیں؟ مہاراج کمار کو زہر دینے کی جو سازش ہوئی تھی اس میں کس کس کا ہاتھ ہے؟ چھوٹی رانی نے پردے کی اوٹ سے نوجوان پرائیویٹ سیکرٹری کو دیکھ کے کیا کہا تھا؟ اور پھر یہ بات بڑی رانی تک کیسے پہنچی؟ غرض دیوان سنگھ والیان ریاست کے عشرت کدوں پر آسیب کی طرح چھایا ہوا تھا۔ وہ ان کے اور ان کے وابستگان دامن کے دلوں کی دھڑکنوں تک کو پہنچتا ہے۔ ان پر ہنستا ہے قہقہے لگاتا ہے اور حیران ہو ہو کے اپنے آپ سے پوچھتا ہے۔ یہ فرسودہ نظام کب تک چلے گا؟ ان راجاؤں اور نوابوں سے دنیا کو کب

نجات ملے گی۔

''ریاست'' کے نکلنے سے پہلے بھی اخباروں میں ریاستوں کے حالات چھپتے رہتے تھے۔ بلکہ والیان ریاست کے چندہ کی شرح ہی الگ مقرر تھی۔ اور کچھ اخبار نویس تو ایسے تھے جنکی روٹی ریاستوں ہی کے طفیل چلتی تھی یعنی کسی ریاست سے تعلق پیدا کر کے والی ریاست اوراس کے اہلکاروں کی تعریف میں مضمون چھاپنے شروع کر دیے اور جتنا اخبار چھپا سارا ریاست میں بھیج دیا گیا۔ سال میں دو مرتبہ یعنی رئیس کی سالگرہ یا کسی اور تقریب پر خود بھی ہو آئے۔ ڈاک بنگلے میں ٹھہرائے گئے۔ مہمانیاں ہوئیں۔ اخبار کے چندے کے نام سے جو کچھ ملا وہ تو ان کا حق ہی تھا چلتے وقت دو چار سو روپے اور مل گئے۔ ان چھٹ بھیا قسم کے ریاستی اخبار نویسوں کا آخری اجتماع پٹیالہ میں ہوا تھا۔ مہاراجہ پٹیالہ نے انہیں دو وقت کا کھانا کھلایا۔ چلتے وقت پندرہ روپے فی کس کے حساب سے نذر کیے۔ اور ساتھ ہی کہہ دیا کہ خبردار آئندہ اس طرف کا رخ نہ کرنا ورنہ پندرہ روپے بھی نہیں ملیں گے۔

دیوان سنگھ اس گروہ میں کبھی شریک نہ ہوا۔ ''ریاست'' نکالنے سے پہلے مہاراجہ نابھ کا ملازم تھا بلکہ یہ اخبار ہی مہاراجہ نابھ نے نکلوایا تھا۔ پہلے پہل اس کے حملوں کا رخ زیادہ پٹیالہ کی طرف ہی رہا۔ پھر آہستہ آہستہ سارے والیان ریاست لپیٹ میں آ گئے۔ انہوں نے سوچا تھا کہ اخبار نویس کی بساط ہی کیا ہے۔ دو سو نہ سہی چار سو ہی لیکن جب دیکھا کہ دو چار سو چھوڑ ہزار دو ہزار بھی اس بلا سے مخلصی نصیب نہیں ہوتی تو دوسرے حربے آزمائے۔ انہیں بھی بیکار پایا تو تھک ہار کر بیٹھ گئے۔ اور یہ فرض کر لیا کہ دیوان سنگھ تو روئیں تن ہے سونے چاندی سے تو شاید نرم ہو جائے لیکن کوئی دوسرا حربہ کارگر نہیں ہوتا۔ آخر نواب بھوپال سے مقابلہ کرنا پڑا۔ تو اس روئیں تن کا طلسم کچھ ٹوٹا۔ کہتے ہیں نواب صاحب نے اس مقدمہ پر دس لاکھ خرچ کر دیے۔ دیوان سنگھ نے بھی اپنی بساط سے زیادہ صرف کیا یعنی کوئی سوا لاکھ کے ماتھے گئے اس مقدمہ میں

کچھ لوگوں نے ایک اور اشقلہ چھوڑا کہ دیوان سنگھ سکھ ہے اور نواب مسلمان۔ مسلمان اخباروں کو نواب کا ساتھ دینا چاہیے لیکن یہ وار خالی گیا۔

دیوان سنگھ سکھ تو ضرور ہے لیکن مذہبی تعصب کی چھاؤں تک اس پر نہیں پڑی۔ اکالیوں سے ہمیشہ اس کی ٹھنی رہی ہے۔ اور تارا سنگھ سے مقدمہ بازی بھی ہوتی رہی ہے۔......شہید گنج کے جھگڑے میں اس نے مسلمانوں کا ساتھ دیا۔ یہ تو خیر پرانی باتیں ہیں۔ ڈاکٹر قریشی کو قتل کرنے کے جرم میں پھانسی کی سزا کا حکم سنایا گیا تو دیوان سنگھ نے صاف لکھدیا کہ بچارہ ڈاکٹر بے گناہ ہے۔ سیاسیات میں وہ ہمیشہ گاندھی جی کا پیرو کار رہا ہے۔ اکالیوں اور ہندو مہا سبھائیوں سے اسے چڑ ہے۔ مسلم لیگ کا بھی مخالف ہے۔ لیکن کسی جماعت کو حلق کا داروغہ نہیں بننے دیا۔ جو جی میں آتا یہ بے تکلفی سے لکھ ڈالتا ہے۔ اور اس کی پرواہ نہیں کرتا کہ کوئی کیا کہے گا۔ دوستی اور دشمنی کے آداب خوب جانتا ہے۔ دوست کی خاطر سب کچھ کر گزرتا ہے لیکن دشمن کو بھی معاف نہیں کرتا۔ خواجہ حسن نظامی سے ہم نے دوستی کا زمانہ دیکھا اور دشمنی کا بھی۔ خواجہ کا دوست تھا تو حاضر و غائب انہیں کی تعریفیں ہوتی تھیں۔ اخبار میں مناقب چھپ رہے ہیں نج کی صحبتوں میں ان کی ثنا خوانی ہو رہی ہے۔ پھر جو ٹھن گئی تو ٹھن گئی لم سے ایسے ایسے کچوکے دیئے کہ خدا کی پناہ۔ خواجہ بھی کوئی ایسے ویسے نہ تھے۔ کہ دب جاتے۔ انہوں نے بھی خوب خوب مقابلہ کیا۔ لیکن دیوان سنگھ سے پیش نہ گئی۔ اب تو زمانے نے وہ ورق ہی الٹ دیا۔ نہ وہ دلی رہی۔ نہ وہ خواجہ حسن نظامی لیکن دیوان سنگھ اب بھی وضع نبھائے چلا جاتا ہے

پولیس والوں سے اسے سخت دشمنی تھی۔ اخبار میں ہمیشہ ان کے خلاف لکھتا رہا ہے پولیس کیا یسے ایسے کارنامے اسے یاد ہیں جو چھپ جائیں تو ضخامت میں طلسم ہوش ربا سے کچھ کم نہ ہوں گے۔ اور ایک پولیس پر کیا موقوف ہے۔ والیان ریاست کی زندگی کے ایسے ایسے واقعات یاد ہیں جو شاید کسی کو بھی معلوم نہ ہوں۔ لیکن ان میں کچھ گفتنی

ہیں کچھ ناگفتنی۔ ناقابل فراموش کے عنوان سے ریاست میں اس نے ایک مضامین کا سلسلہ شروع کیا تھا جو کتابی صورت میں چھپ گی ہے۔ لیکن اس قسم کی داستانوں کا جو ذخیرہ اس کے سینے میں محفوظ ہے یہ اس کا سواں بلکہ ہزارواں حصہ بھی نہیں۔ اور اس کا سب سے دلچسپ حصہ تو وہ ہے جو قید تحریر میں نہیں آسکتا۔

دیوان سنگھ کا علم کتابی نہیں۔ بلکہ اس نے گھوم پھر کے علم حاصل کیا ہے۔ اس نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ ہر طبقے او گروہ کے لوگوں سے ملا ہے ان کے دکھ سکھ میں شریک رہا ہے۔ انکے دل کی دھڑکن سنی ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے دل کو بھی دھڑکتے پایا ہے۔ وہ کبھی ہندوستان سے باہر نہیں گیا۔ لیکن کبھی کبھی اسے دیکھ کر میں نے ہمیشہ محسوس کیا ہے کہ اس نے ملکوں ملکوں کی سیر کی ہے اور زمانے کی رنگا رنگی دیکھی ہے۔ وہ اپنی عمر ساٹھ اکسٹھ برس بتاتا ہے لیکن یقین نہیں آتا۔ مجھے تو وہ دو ڈھائی ہزار برس پرانا بڈھا معلوم ہوتا ہے جو فرعانہ مصر کے زمانہ میں آئی سس دیوی کا سردار کاہن تھا۔ مصر کے بازاروں میں اس کی سواری نکلتی تھی تو لوگ راستہ چھوڑ کے سڑک کے کنارے کھڑے ہو جاتے تھے۔ فرعون اس سے ڈرتا تھا۔ کیونکہ شبستان شہی کے بہت بڑے رازا سے معلوم تھے۔ اور پھر وہ جادوگر بھی تھا۔ تاہ دیوتا کے مندر میں جادو کی جو کتاب ہے اس کے تمام اسرار پر اسے پورا پورا عبور حاصل تھا۔ لیکن وہ دیوی دیوتاؤں پر ہنستا تھا۔ اس کے توہمات پر ہنستا تھا۔ فرعون پر ہنستا تھا۔ ملکہ پر ہنستا تھا۔ نوبہ اس کے اس سیاہ فام پر ہنستا تھا۔ جس سے مصر کی ملکہ ملوث تھی۔ وہ روما میں بھی رہا ہے۔ گلیڈیٹروں میں بھی اور شاہی مشیروں میں بھی۔ ملکہ اس پر اعتماد کرتی تھی۔ حالا کہ روما والے صرف کلاڈیس پر ہنستے تھے۔ وہ پاٹلی پتر میں اشوک کے قریب ایک شراب فروش کے ہاں مدتوں رہا ہے اجین میں اس نے کالی داس کا کلام سن کر اسے بارہا داد دی ہے۔ اس نے بکرماجیت اور بھوج دونوں کی مصاحبت کی ہے۔ غرض وہ زمانے کے ساتھ ساتھ ایک پر اسرار سایے کی طرح چلا آیا ہے اور نہ جانے کب تک

یونہی چلا جائے گا۔

دیوان سنگھ ریاستوں اور ان کے حکمرانوں کا سخت مخالف ہے۔لیکن اس نے اپنی زندگی میں کبھی انلوگوں کے انداز پر ڈھالی ہے۔اسے پر اسرار بننے کا بڑا شوق ہے۔ آپ بیٹھے اس سے باتیں کر رہے ہیں۔ایک شخص آتا ہے اور اس کے کان میں کچھ کہہ کے چلا جاتا ہے۔وہ صندوقچہ کھولتا ہے ایک کاغذ نکالتا ہے۔اسے دیکھتا ہے اور بند کر دیتا ہے پھر صندوقچہ کھولتا ہے۔دوسرا کاغذ نکالتا ہے۔اسے پڑھتا ہے اور اسے بند کر دیتا ہے اپنے بیوی بچوں سے ہمیشہ ان بن رہی ہے۔لیکن شام کو محلے ٹولے کے بچے جمع ہوتے ہیں۔دربار لگتا ہے انعامات تقسیم ہوتے ہیں۔کسی کو تصویر کسی کو شوخ رنگ کاغذ کسی کو دونی کسی کو چونی۔خوب کماتا ہے بے حساب خرچ کرتا ہے لیکن ریاستوں کے عام دستور کے مطابق عملہ کی تنخواہ ہمیشہ اس کے ذمے چڑھی رہتی ہے۔ایک دفعہ میرے شناسا ایک منشی جی جو اس کے ہاں کتابت کرتے ہیں تنخواہ مانگنے آئے جواب ملا نالش کر دو عدالت سے قسطیں مقرر ہو جائیں گی۔روپیہ آسانی سے ادا ہو جائے گا۔منشی جی نے نالش کر دی۔کام بھی کرتے رہے مقدمہ بھی چلتا رہا قسطیں مقرر ہو گئیں اور ادا بھی کر دی گئیں۔لیکن مدعی اور مدعا علیہ میں کبھی کوئی بدمزگی نہیں ہوئی۔وہی دیوان سنگھ اور وہی منشی جی۔آخر دیوان سنگھ تو والئی ریاست ہے۔یہ نہ کرے تو اور کیا کرے؟

کبھی کبھی کام سے اکتا کے کہتا ہے کوئی خدا کا بندہ یہ اخبار خرید لے تو میں جنوبی ہند چلا جاؤں۔ایک چھوٹی سی کٹیا ہو اور زندگی اطمینان سے بسر ہوتی چلی جائے۔

☆☆☆

دیوان سنگھ مفتوں سے انٹرویو

سوال:: آپ نے اخبار ''ریاست'' نکالتیوقت دہلی کو کیوں منتخب کیا؟

جواب: اخبار ''ریاست'' کو دہلی سے جاری کرنے کے دو وجوہ تھے۔ایک یہ کہ پنجاب کے مقابلہ پر دہلی میں میدان وسیع تھا۔یعنی دہلی میں بہت کم اخبارات جاری تھے اور دوسرا ریاستوں میں مظالم کے خلاف آواز پیدا کرنے والا کوئی خبار ہندوستان میں نہ تھا۔ میں ریاست نابھ کی ملازمت کے باعث ریاستوں کے ننگ انسانیت مظالم سے واقف ہو چکا تھا' اور ریاستوں کے متعلق اطلاعات حاصل کرنے کے اعتبار سے مرکزی گورنمنٹ کے قریب رہنا ہی مفید تھا۔

سوال:: جنرل ازم کے اعتبار سے آپ کے استاد کون ہیں؟

جواب: میں خود ہی استاد ہوں اور خود ہی شاگرد......اور اگر کسی کی تقلید کرنا شاگرد ہونا قرار دیا جا سکتا ہے تو میں بلا خوف و تردید کہہ سکتا ہوں کہ میرے استاد مولانا ابوالکلام آزاد تھے.....جن کے لٹریچر کو پڑھ کر میں نے بہت کچھ حاصل کیا اور میری یہ رائے ہے کہ جس مصنف کا لٹریچر پڑھا جائے اس مصنف کے کریکٹر کا ذہن پر اثر ہوتا ہے۔مولانا ابوالکلام آزاد کے لٹریچر کے علاوہ اردو اور مصنفین کی تصانیف سے بھی میں نے بہت کچھ حاصل کیا۔

سوال: اردو جرنلزم میں آپ سب سے بلند پوزیشن کس کی تسلیم کرتے ہیں؟

جواب: زور قلم کے اعتبار سے مولانا ابوالکلام آزاد کی ادبی اعتبار سے مولانا عبدالماجد دریا آبادی کی' وسیع معلومات کے اعتبار سے سید جالب دہلوی ایڈیٹر ''ہمدم'' لکھنو کی اور تجارتی اعتبار سے لالہ دینا ناتھ ایڈیٹر ''دیش'' و ''ہمالہ'' کی۔

سوال: آپ کو اپنے آبائی وطن حافظ آباد پاکستان سے محبت ہے کہ نہیں؟

''جواب: بالکل نہیں جس کے دو وجوہ ہیں۔ایک یہ کہ میں حافظ اباد میں بہت کم رہا اور تمام زندگی کی دوسری شہروں میں ہی گزری اور دوسرے یہ کہ میں فطرتاً ساری

دنیا کو ہی اپنا وطن سمجھتا ہوں اور دنیا کے کسی ملک کو بھی غیر سمجھنا گناہ سا محسوس کرتا ہوں۔

سوال: جوتش کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟[

جواب: میں ستاروں کے اثرات کا قطعی قائل ہوں اور میری رائے میں ستاروں کے اثرات کے سامنے انسان قطعی بے بس ہے مثلاً عورت کے ستارے اچھے ہوں تو وہ حسینہ پیدا ہوتی ہے جسے ہر شخص چاہتا ہے۔ستارے برے ہوں تو بدصورت پیدا ہوتی ہے۔جس سے ہر شخص نفرت کرتا ہے۔مردوں میں اگر ستارے اچھے ہوں تو مرد خوبصورت مستعد، محنتی اور خوش کلام ہوتا ہے۔اور اگر ستارے برے ہوں تو وہ پیدائشی طور پر کاہل، سست بد دماغ چڑ چڑا اور بدصورت پیدا ہوتا ہے۔جس سے ہر شخص نفرت کرتا ہے۔

سوال: کیا آپ کو کبھی عشق بازی کا بھی اتفاق ہوا؟

جواب: اس سوال کا پبلک لائف سے کوئی تعلق نہیں ہے اس لیے اس کا جواب دینا مناسب نہیں سمجھتا۔

سوال: کیا آپ نے اخبار ''ریاست'' کی زندگی میں ریاستوں س کبھی روپیہ لیا ہے؟

جواب: میں نے کئی والیان ریاست دوستوں سے اخبار ریاست کے لیے بطور امداد روپیہ حاصل کیا ہے۔اور یہ تمام رپیہ اخبار ''ریاست'' کو بہتر بنانے پر صرف ہوا ہے۔کیونکہ میں اصولاً اس کے خلاف نہیں ہوں۔بشرطیکہ وہ روپیہ اپنی ذات پر صرف نہ کیا جائے جیسا کہ مہاتما گاندھی اور کانگریسی لیڈروں نے کروڑوں روپیہ والیان ریاست سیٹھوں امراء اور ساہوکاروں سے حاصل کرکے آزادی کی راہ میں صرف کیا۔

سوال: مہاتما گاندھی مولانا ابوالکلام آزاد اور پنڈت جواہر لال نہرو کے متعلق آپ کے تاثرات کیا ہیں؟

جواب: مہاتما گاندھی کو میں آزادی کے اعتبار سے ہندوستان کا نجات دہندہ اور کریکٹر کی بلندی کے اعتبار سے ایک اوتار سمجھتا ہوں۔ پنڈت جواہر لال نہرو بین الاقوامی اعتبار سے اس دنیا کی سب سے بڑی شخصیت ہیں۔ ہندوستان کو بلند لے جانے کے اعتبار سے ان کا نعم البدل کوئی نظر نہیں آتا۔ اگر یہ دنیا میں موجود نہ ہوتے تو اب تک تیسری عالمگیر جنگ شروع ہوگئی ہوتی۔ یہ فطرتاً ایک ڈکٹیٹر ہیں اور چونک ان کی پرورش امیر گھران میں ہوئی اس لیے ڈکٹیٹری کے اعتبار سے ایک ناکام ترین شخصیت ہیں۔ ان کا ہندوستان کے موجودہ لیڈروں کی بددیانتیوں کو نظر انداز کرنا بہت بڑا جرم ہے۔ جس کا خمیازہ مستقبل میں ہندوستان کو بھگتنا پڑے گا۔ میری رائے میں اگر یہ غریبوں کے گھر میں پیدا ہو کر ہندوستان کے ڈکٹیٹر ہوتے اور دوسروں کے جرائم کو نظر انداز کرنے کی ان میں کمزوری ہوتی تو آج ہندوستان کو بہت ہی بلند مقام حاصل ہو چکا ہوتا۔ مولانا ابوالکلام آزاد علمی اور ادبی لحاظ سے ایک ملہم سیاسی اعتبار سے ایک چٹان اور خودداری کے لحاظ سے گوشہ نشین درویش اور بے نیازی کے اعتبار سے ایک فرشتہ تھے میری رائے میں ایسے لوگوں کو دنیا بہت کم پیدا کرتی ہے۔

سوال: پاکستان کے مستقبل کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب: اگر بعض ملاؤں کی رائے کے مطابق مذہب اور سیاست کو ہم آغوش کرنے کی کوشش کی گئی تو پاکستان کے لیے ناقابل برداشت مصائب پیدا ہوں گے۔ کیونکہ دنیا کے مستقبل میں کسی بھی مذہبی حکومت کے لیے کوئی گنجائش نہیں اور اگر کوئی ملک ترقی کر سکتا ہے یا زندہ رہ سکتا ہے تو صرف اقتصادی بنیادوں کو مضبوط رکھنے کی صورت میں۔

سوال: خدا کے وجود کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب: میں نے اس مسئلہ پر کبھی غور نہیں کیا۔ اور یہ فیصلہ کر چکا ہوں کہ نہ کبھی آئندہ کروں گا۔ جب کبھی خدا کے وجود یا عدم وجود کے متعلق ذہن میں خیال پیدا ہوتا

ہے تو مرحوم اکبر الہ آبادی کا یہ شعر گنگنا لیا کرتا ہوں:

ذہن میں جو گھر گیا' لا انتہا کیونکر ہوا
جو سمجھ میں آ گیا' پھر وہ خدا کیونکر ہوا

سوال: روپیہ جمع کرنے کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب: روپیہ جمع کرنے کے متعلق میں حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کا مقلد ہوں جو رات کو اپنے باورچی خانہ میں آٹا دال یا نمک بھی نہ رکھتے تھے۔ آپ کے متعلق ایک مشہور واقعہ تھا۔ کہ باورچی نے ایک روز بچا ہوا نمک رکھ لیا اور اسے اگلے روز استعمال کیا تو تمام کھانا کڑوا ہو گیا تھا۔

سوال: مذہب کے متعلق آپ کے تاثرات کیا ہیں؟

جواب: میں بیس فیصدی سکھ ہوں کیونکہ میرے سر پر بال اور منہ پر داڑھی ہے۔ میں بیس فیصدی مسلمان ہوں کیونکہ رسول اللہؐ کے قول افضل الجہاد کلمتہ الحق میں حق و صداقت کی آواز بلند کرتے ہوئے لذت محسوس کرتا ہوں۔ میں بیس فیصدی عیسائی ہوں کیونکہ حضرت مسیح کا مصلوب ہونا دنیا کے لیے بہت بڑی قربانی سمجھتا ہوں اور اس ربانی کے متعلق عزت و احترام کے جذبات کو قائم رکھنے کے لیے حضرت مسیح کے بت کو اپنی میز کے سامنے رکھتا ہوں۔ میں بیس فیصدی ہندو ہوں کیونکہ شری کرشن اور گیتا کا پرستار ہوں۔ میں بیس فیصدی احمدی ہوں کیونکہ میرے ایمان اور یقین کے مطابق آئندہ بھی نئے اوتار اور پیغمبر پیدا ہوں گے۔

سوال: موسیقی کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے۔ اور کون سے راگ آپ زیادہ پسند کرتے ہیں؟

جواب: موسیقی کو میں آب حیات سمجھتا ہوں۔ اور رات کو بارہ بجے اور صبح چھ بجے سے پہلے کے تمام راگوں اور راگنیوں سے مجھے رغبت ہے مثلاً سوہنی' جوگیا' کا تگڑ' اور بھیروں وغیرہ۔

سوال: محبت کے اعتبار سے عورت اور مرد میں کیا فرق ہے؟

جواب: محبت کے اعتبار سے میں عورت کو ایک دیوی سمجھتا ہوں۔ جو اپنے نسوانی گلینڈز (غدودوں) کے باعث محبت کرنے پر فطرتاً مجبور ہے۔ وہ بغیر محبت کے زندہ نہیں رہ سکتی اور محبت کی راہ میں مرنا ایک کھیل سمجھتی ہے۔ اور مرد کو میں محبت کے اعتبار سے ایک فطرتاً ایک ابن الوقت قرار دیتا ہوں' جس کا دل ہر حسینہ کو دیکھ کر بدل سکتا ہے۔

سوال: ہندوستان میں رشوت ستانی کی کیا پوزیشن ہے؟

جواب: انگریزوں کے ہندوستان سے جانے کے بعد پچھلے چودہ پندرہ برس میں زرعی صنعتی اور اقتصادی اعتبار سے ہندوستان نے خوب ترقی کی ہے اس کی مثال دنیا کے کسی ملک کی پچھلی تاریخ میں نہیں مل سکتی۔ کیونکہ کوئی قصبہ کوئی تحصیل اور کوئی ضلع ایسا نہیں جہاں صنعتی ادارے قائم نہ کیے گئے ہوں۔ میرا یقین ہے کہ آئندہ پانچ سال کے بعد ہندوستان کو کسی غیر ملک سے ایک پیسہ کی چیز بھی نہ منگانی پڑے گی۔ ہندوستان کی اس ترقی سے جو شخص یا پارٹی انکار کرتی ہے وہ اپنے منہ کو گندہ کرنے کا باعث ہے مگر اس کے مقابلہ پر پچھلے چودہ پندرہ برس میں بد دیانتی خویش پروری' رشوت ستانی اور پرمٹ بازی کے اعتبار سے ہندوستان میں جو گراوٹ پیدا ہو چکی ہے۔ ہندو مائی تھالوجی اور گیتا کے ایک شلوک کے مطابق اسے دور کرنے کے لیے اگر سری کرشن بھی آ جائیں تو ہندوستان کی اس گراوٹ کو وہ اپنی پوری کوششوں کے باوجود ایک سو برس میں بھی دور نہیں کر سکتے۔

سوال: کیا کانگرس کو ہندوستان میں قائم اور جاری رہنا چاہیے؟

جواب: میری رائے میں کانگرس کو جتنی جلدی ہو سکے ختم کر دیا جائے۔ کیونکہ کانگریسی وزراء میں سے نوے فیصدی کسی نہ کسی صورت میں بد دیانتی میں مبتلا ہیں۔ اور اگر آج مہاتما گاندھی زندہ ہوتے تو وہ بھی یقیناً آج سے بہت عرصہ پہلے

ہندوستان میں کانگریس کی ارتھی دیکھ چک ہوتے۔

سوال: سکھوں کا مستقبل کیا ہوگا؟

جواب: سکھوں کا مستقبل انتہائی تاریک ہے۔اور میری قطعی رائے ہے کہ آئندہ پچاس برس کے بعد موجودہ صورت میں ایک سکھ بھی نہ ملے گا۔جس کا ثبوت یہ ہے کہ خالصہ کالجوں میں نوے فیصد طلبا کسی نہ کسی صورت میں داڑھیوں کو مختصر کرنے کی کوشش میں مصروف رہتے ہیں۔انہوں نے اپنے اس مقصد کی تکمیل کے لیے مختلف طریقے ایجاد کیے ہیں اور سکھوں کا نوجوان طبقہ بالوں سے بیزار ہے۔چنانچہ اس دلیل کی تائید میں ان اکالی لیڈروں کو پیش کیا جا سکتا ہے جو خود تو اکالی تحریک کے لیڈر تھے مگر ان کی اولاد سر اور داڑھی کے بالوں سے قطعی محروم ہے۔یعنی وہ لوگ سکھ ازم کی دھارمک پابندیوں کو بالکل ترک کر چکے ہیں۔

سوال: ہندوستان کے صوبجات کے موجودہ منسٹروں کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب: ہندوستان کے بعض صوبجات کی منسٹریوں کی بددیانتیوں خویش پروریوں' پرمٹ بزیوں اور بے انصافیوں کو دیکھتے ہوئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پنڈت نہرو نے ان صوبجات کی منسٹریوں کو اوپر بیان کردہ بدقماشیوں کا بالکل اسی طرح کا ہی پرمٹ دے رکھا ہے جس طرح شہر کی میونسپل کمیٹی کا سیکرٹری کسی طوائف کو عصمت فروشی کا لائسنس عطا کرے۔یعنی پنڈت جواہر لعل نہرو نے ان صوبجات کو اور میونسپل کمیٹیوں نے طوائفوں کو بدقماشیوں کے لیے لائسنس دے رکھے ہیں۔یہ جو چاہیں کریں اور ان کی بداعمالیوں میں کوئی مداخلت نہ کر سکے۔

سوال: ہندوستان میں مسلمانوں کا مستقبل کیا ہے؟

جواب: ہندوستان میں مسلمانوں کا مستقبل انتہائی تاریک ہے۔اور یہ بہت بڑی غلطی تھی کہ تبادلہ مکمل آبادی طور پر نہ ہوا۔میرے رائے میں ہندوستان کے مسلمانوں

کو اپنے مستقبل کی تاریکی مٹانے کی صرف ایک ہی صورت ہے کہ وہ کمیونزم کو اختیار کریں اور مذہبی اعتبار سے نہیں بلکہ اقتصادی اعتبار سے ملکی تحریروں میں حصہ لیں۔

سوال: ماسٹر تارا سنگھ کے پنجابی صوبہ کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب: میری رائے میں پنجابی صوبہ کی تحریک ہندوستان کو ناقابل تلافی نقصان پہنچانے اور سکھوں کو بالکل ہی ختم کر دینے کا باعث ہوگی۔ اگر یہ تحریک کسی حد تک کامیاب بھی ثابت ہوئی تو ہندوستان کے ہندو سکھوں کے ایسے ہی دشمن ہوں گے جیسے روسی کمیونسٹ امریکن سرمایہ داروں کے دشمن ہیں۔

سوال: ہندوستان کی پبلک کی موجودہ بددیانتی کا سبب کیا ہے؟

جواب: میری رائے میں اس کی ذمہ داری پنڈت جواہر لال نہرو پر ہے۔ جنہوں نے نہ صرف بددیانت وزراء کی بدتماشیوں کو نظر انداز کیا بلکہ اپنی ناواقفیت کے باعث بعض غیر مستحق لوگوں کی ناجائز تعریف کر کے ان کی حوصلہ افزائی بھی کی۔ چنانچہ اس سلسلہ میں ایک تازہ ترین مثال پیش کی جا سکتی ہے۔ دہلی کے ایک گمنام اور بے حیثیت اردو ہفتہ وار اخبار نے اپنی جوبلی منائی۔ پنڈت جواہر لعل نہرو نے اس جوبلی میں شرکت کی اور اپنی تقریر میں اس اخبار کو ایک مشنری اخبار ہونے کا سرٹیفکیٹ دیا' اور لطف یہ ہے کہ اخبار کے مالک اور ایڈیٹر زندگی بھر سکھوں کو انگریزوں کی وفاداری کا سبق دیتے رہے ہیں۔ ان کے اخبار کا نام ہی لائل گزٹ تھا۔ یہ اخبار اس وقت چند سو سے زیادہ نہیں چھپتا تھا۔ اور اس کا مقصد ہی جھوٹ بول کر دھوکہ دے کر اور جعلسازیوں کے ذریعے اشتہار حاصل کرنا ہے۔ جس کے تحریری ثبوت پریس کمیشن کی فائلوں میں موجود ہیں۔

سوال: کیا اخبار ''ریاست'' کو بند کر کے آپ کو افسوس ہے؟

جواب: اخبار ''ریاست'' کو بند کرنے کا عام پبلک کو تو بہت افسوس ہے' مگر مجھے قطعی افسوس نہیں۔ کیونکہ میں ایسا محسوس کرتا ہوں جیسے کسی بہت بڑے بوجھ سے

نجات ملی ہو۔ جہاں تک پبلک کا سوال ہے اخبار ''ریاست'' کی کمی کو بہت وسیع حلقے نے محسوس کیا۔ مگر اس افسوس کی حیثیت بالکل وہی ہے جیسے جنازہ میں شریک ہونے والے تو بہت ہیں مگر بیماری میں امداد کے لیے علاج کرنے والا کوئی نہیں ملتا۔

کریکٹر کی بلندیاں

انگریزی زبان کی کہاوت ہے‘ جس کے معنی یہ ہیں کہ روپیہ گیا تو کچھ نہ گیا‘ صحت کو گئی تو کچھ گیا‘ اور کریکٹر گیا تو بہت کچھ گیا۔ یعنی کریکٹر کے مقابلہ میں روپیہ اور صحت کی کوئی حیثیت نہیں اور اس انسان کو انسان قرار نہیں دیا جا سکتا جو کریکٹر سے محروم ہو‘ دنیا میں صرف ان ہی لوگوں کی پرستش کی گئی جو کریکٹر کے اعتبار سے بلند تھے۔ موجودہ دور کے چند لوگوں کا کریکٹر ملاحظہ کیجیے:

مدھیہ پردیش (ہندوستان) کے سابق وزیر اعلیٰ ڈاکٹر کیلاش نرائن کاٹجو ذات اور نسل کے اعتبار سے کشمیری پنڈت ہیں۔ جن کا خاندان الہ آباد (یو۔ پی) میں مقیم ہے۔ ان کے عزیز اور رشتہ دار ہندوستان کے اکثر صوبوں میں رہتے ہیں کیونکہ پنڈت اور کاستھ آبادی کے اعتبار سے کم ہونے کے باوجود کم تعداد ہونے کے قریب قریب ہر صوبہ میں پھیلے ہوئے ہیں اور ذہنی اعتبار سے یہ دونوں ہی دوسروں کے مقابلہ پر زیادہ لائق اور ذہین ہیں۔ پنڈت کیلاش نرائن کاٹجو سیاست میں آنے سے پہلے الہ آباد میں ایک کامیاب ترین وکیل تھے۔ جن کی ماہوار آمدنی کئی ہزار روپیہ تھی سیاست میں آنے کے بعد آپ ہندوستان کی مرکزی پارلیمنٹ کے ممبر ہوئے‘ پھر ہوم منسٹر اور بعد میں بنگال کے گورنر مقرر کیے گئے۔ مسٹر کاٹجو بنگال کے گورنر تھے کہ آپ اپنی کسی سرکاری کام کے سلسلے میں دہلی تشریف لائے اور دہلی میں اپنی بہن کو دیکھنے پانی پت تشریف لے گئے۔ کیونکہ تبادل آبادی کے سلسلہ میں آپ کی بہن کا خاندان پانی پت میں مقیم ہوا۔ آپ پانی پت میں اپنی بہن سے باتیں کر رہے تھے تو بہن نے اپنے بھائی سے کہا۔

”میرا داماد (یعنی ڈاکٹر کاٹجو کی بھانجی کا شوہر) تعلیم حاصل کرنے کے بعد اب تک بیکار ہے اور اسے ملازمت نہیں مل سکی۔ آپ بنگال کے گورنر ہیں آپ اپنے ہاں بنگال میں یا کسی صوبے کے گورنر سے سفارش کر کے اس لڑکے کو کوئی اچھی سی ملازمت

دلوا دیجیے‘تا کہ اس کا مستقبل شاندار ہو“۔

ڈاکٹر کاٹجو نے جب اپنی بہن سے یہ سنا تو خاموش ہو گئے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد آپ نے پچیس ہزار کا ایک چیک لکھا اور یہ چیک اپنی بہن کو دیتے ہوئے کہا:

”میں کسی سے سفارش تو نہیں کر سکتا پچیس ہزار کا چیک اپنے داماد کو دے دیں تا کہ وہ کوئی کاروبار کر لے“۔

یعنی ڈاکٹر کاٹجو کا کریکٹر اس قدر بلند ہے کہ وہ اپنے کسی عزیز ترین رشتہ دار کی سفارش کرنا بھی معیوب سمجھتے ہیں حالانکہ دوسرے لیڈروں کے سیاست میں آنے کا تمام مقصد ہی یہ ہے کہ خود روپیہ پیدا کریں اور عزیز و اقارب دوستوں کو مالا مال کر دیں۔

ڈاکٹر کاٹجو کا دوسرا واقعہ بھی دلچسپ ہے۔حضرت جوش ملیح آبادی میں یہ بت بڑی کمزوری یا صفت موجود ہے کہ کوئی شخص ان کو کسی بڑے افسر کے پاس سفارش کے لیے لے جا سکتا ہے یہ انکار نہیں کرتے۔اور ان لوگوں نے بھی ان کے ذریعے ہندوستان کے وزراء سے کام لیے جو چند روز پہلے تک جوش صاحب کے مخالفین میں سے تھے۔ اور انہیں نقصان پہنچانے کی کوشش میں رہے۔ایک صاحب جوش صاحب کے پاس آئے اور آپ سے چاہا کہ ڈاکٹر کاٹجو ہوم منسٹر مرکزی گورنمنٹ ہندوستان سے ان کی سفارش کر دیں۔جوش صاحب میں انکار کرنے کی جرات ہی نہ تھی۔آپ انکو لے کر ڈاکٹر کاٹجو کی کوٹھی میں پہنچے‘اور ان کی کاٹجو صاحب سے سفارش کر دی۔ہندوستان کے وزراء میں جوش صاحب بہت عزت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔جب آپ نے کاٹجو صاحب سے اپنے ساتھی کی سفارش کی تو ڈاکٹر کاٹجو نے کہا:

”جوش صاحب آپ جو کچھ کر رہے ہیں اس کو درست اور سچ یقین کرتا ہوں‘اور میں خود بھی تحقیقات کروں گا۔تحقیقات کے بعد اگر آپ کا ساتھی ہمدردی کا مستحق ہوا۔ تو میں آپ کی خواہش کے مطابق ہی حکم دوں گا۔مگر میں درخواست کرتا ہوں کہ آپ

آئندہ کبھی بھی میرے پاس کسی کی سفارش نہ کیجیے''۔

یہ واقعہ خود جوش صاحب نے مجھے سنایا۔ یعنی جہاں تک خویش پروری اور سفارش کا تعلق ہے ڈاکٹر کاٹجو بہت بلند کریکٹر میں سے ہیں۔ کریکٹر کی یہ بلندی ان کے لیے ہندوستان کے نئے انتخابات میں بہت مہنگی ثابت ہوئی' اور یہ ناکام ہوئے۔ کیونکہ اگر یہ ووٹروں کے کام نہ آئیں۔ تو ووٹر ان کو کیوں ووٹ دیں' جب کہ ووٹ کے معنی ہیں ووٹر کی نگاہ میں سودے بازی ہو۔

ماسٹر تارا سنگھ کی زندگی کا کافی حصہ تنگدستی میں بسر ہوا۔ اور یہ واقعہ ہے کہ راشن کنٹرول کے زمانہ میں آپ اپنے گھر کے راشن کارڈوں کو بھی مالی مشکلات کے باعث استعمال نہ کر سکتے تھے۔ ان مالی مشکلات کے زمانہ کا ہی ایک واقعہ ہے۔ مرحوم مہاراجہ پٹیالہ کے خلاف سٹیٹس پیپلز کانفرنس نے ایجی ٹیشن جاری کر رکھی تھی اور ماسٹر تارا سنگھ اس ایجی ٹیشن کے پنجاب میں لیڈر تھے۔ مہاراجہ کے لیے جب بڑی مشکلات پیدا ہوئیں تو مہاراجہ کا ایک معتمد ماسٹر تارا سنگھ کے پاس مہاراجہ کا دستخط شدہ چیک کورا لے کر پہنچا اور مہاراجہ کی طرف سے پیغام دیا کہ آپ جتنے لاکھ چاہیں اس چیک پر لکھ کر یہ روپیہ امپیریل بنک سے وصول کر لیں اور مہاراجہ کی مخالفت چھوڑ دیں۔ ماسٹر تارا سنگھ اس چیک کو دیکھ کر اور پیغام کو سن کر مسکرا دیے۔ اور آپ نے چیک وصول کرنے یا مہاراجہ کی مخالفت ترک کرنے سے انکار کر دیا۔ حالانکہ اس روز بھی ماسٹر تارا سنگھ کے گھر میں کھانا پکانے کے لیے آٹا اور دال وغیرہ کچھ نہ تھا۔ اپنے دماغی توازن سے محروم ہیں۔ توازن کی یہ محرومی چاہے آپ کی زندگی بھر کی سیاسی خلش کا ہی نتیجہ ہو۔ مگر آپ کے بلند کردار سے کون انکار کر سکتا ہے۔ اور یہ بلند کردار ان لوگوں کی سمجھ میں آنا ممکن ہی نہیں جن لوگوں کی زندگی کا مقصد صرف روپیہ اور اقتدار حاصل کرنا ہو۔

انقلاب پسند درشن بہاری بوس نے جب اپنے ہمراہی انقلاب پسندوں کے ساتھ سازش کر کے لارڈ ہارڈنگ پر چاندنی چوک میں دہلی میں بم پھینکا تو ایک عرصہ

گورنمنٹ اس سازش کے ممبروں کا پتہ لگانے میں ناکام رہی اور دہلی کے بازاروں میں آدم قد پوسٹر چسپاں کیے گئے کہ جن میں سازش کا پتا بتانے والے کے لیے ایک لاکھ روپیہ نقد انعام دینے کا اعلان تھا۔ پنجاب کانگرس کے لیڈر لالہ پنڈی داس کا بیان ہے، کہ بم مارنے کی سازش والوں میں سے ایک صاحب واقعہ کے بعد کئی روز تک دہلی میں ہی رہے۔ مگر ان کے پاس کھانے کے لیے ہی کچھ تھا نہ جیب میں ایک پیسہ اور نہ رہائش کے لیے کوئی جگہ۔ یہ صاحب دن بھر چلتے رہتے، اور جب تھک جاتے تو کسی دوکان پر تھوڑی دیر کے لیے بیٹھ جاتے۔ تا کہ پولیس ان کو مشتبہ سمجھ کر گرفتار نہ کر لے۔ تین چار روز تک کھانے کے لیے کچھ نہ ملا؛ تو ان کے پیٹ میں درد شروع ہوا۔ اب حالت یہ تھی کہ پیٹ میں درد معدہ خالی تھکاوٹ اور چلے جارہے ہیں اور نگاہ ہیں تو پوسٹروں پر ایک لاکھ روپے کا انعام کے جلی حروف۔ یعنی اگر آپ اس سازش کا پولیس کو پتہ بتادیں اور وعدہ معاف گواہ بن جائیں تو ایک لاکھ روپے لے کر زندگی مزے سے گزار سکتے ہیں۔ اور آپ کو فاقہ اور پیٹ کے درد اور دن بھر چلنے سے بھی فوراً ہی نجات مل سکتی ہے۔ مگر اس کا کیا علاج کہ بلند لوگ اپنے کریکٹر پر ایک لاکھ تو کیا ایک کروڑ بلکہ ایک ارب روپیہ بھی تھوک سکتے ہیں۔ آہ انگریزوں کے جانے کے بعد بھی ہندوستان اور پاکستان میں انگریز پرستوں نے اقتدار حاصل کرلیا۔ اور ان کے باعث دونوں ملکوں کی سیاسی فضا گندی ہوگئی۔ آج بھی انقلاب پسند ہمارے لیے ناقابل فراموش ہیں۔ مگر زمانہ آئے گا کہ جب ہماری آئندہ نسلیں آزادی حاصل کرنے والے انقلاب پسندوں کو فراموش کرنے کی مجرم نہ ہوں گی۔ گو اس وقت دنیا میں ہم نہ ہوں گے۔

سر مائیکل اوڈاوئیر گورنر پنجاب کے زمانہ میں پنجاب کے چیف سیکرٹری سر جان تھامپسن تھے۔ پنجاب کی پبلک مارشل لاء کی سختیوں کی ذمہ دار سر جان کو بھی قرار دیتی ہے مگر جہاں تک اصل واقعات کا تعلق ہے۔ سر مائیکل اوڈوائیر ایسا خود سر حکمران تھا

کہ وہ کسی کی سننے والا نہ تھا۔ اور جو چاہتا کرتا۔ سر جان تھامپسن پنجاب کی چیف سیکرٹری شپ سے علیحدہ کیے گئے تو آپ گورنمنٹ ہند کے پولیٹیکل سیکرٹری مقرر ہوئے جن کے ماتحت ہندوستان کی چھ سو ریاستیں تھیں۔ سر جان تھامپسن کے پولیٹیکل سیکرٹری ہونے کا زمانہ میں ہی مہاراجہ اندور کے ملازموں ح کے ہاتھوں بمبئی میں مسٹر باوالکا کا قتل ہوا۔ اس قتل کے بعد سر جان اور لارڈ ریڈنگ وائسرائے نے فیصلہ کیا کہ یا تو مہاراجہ اندور گدی سے الگ ہوں اور اگر یہ الگ نہ ہوں تو ان پر قتل کرانے کے جرم میں مقدمہ چلایا جائے چنانچہ جب یہ شرائط گونمنٹ ہند کی طرف سے مہاراجہ اندور کو پیش کی گئیں تو مہاراجہ کے ہوش اڑ گئے اور کوشش کی گ ءکہ سر جان تھامپسن ایک کروڑ روپیہ تک رشوت قبول کر لیں گے۔ مگر سر جان تھامپسن اس پیش کش کو ٹھکرا دیا۔ ایک کروڑ کے معنی ایک سو لاکھ روپیہ۔ ہندوستان اور پاکستان ہی نہیں دنیا کے دوسرے ممالک میں بھی کتنے حکمران وزیر یا سیکرٹری ایسے ہوں گے جو ایک کروڑ روپیہ کو اپنے کریکٹر پر قربان کر سکتے ہیں۔ ایک کروڑ روپیہ ان کے خاندان کی پشت ہائے پشت کے لیے کافی ہو سکتا ہے۔

مرحوم مولانا اشرف علی تھانوی کے خاندان کے کئی ممبروں کے ساتھ راقم الحروف کے گہرے تعلقات ہیں۔ اور مولانا مرحوم کے حقیقی چھوٹے بھائی مظہر صاحب کے ساتھ تو راقم الحروف کے بھائیوں جیسے تعلقات تھے۔ مظہر صاحب اور اس خاندان کے دوسرے ممبروں سے مولانا مرحوم کے جو حالات معلوم ہوئے ان میں سے تو یہ یقین ہوتا ہے کہ مرحوم بہت ہی بلند لوگوں میں سے تھے۔ اور موجودہ دور میں بہت کم لوگ مذہبی اعتبار سے ان کی عملی زندگی کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ چنانچہ آپ کے مذہبی کریکٹر کی بلندی کے سلسلہ کا ایک دلچسپ واقعہ ہے مرحوم کی دو بیویاں تھیں۔ اور اسلام میں حکم ہے کہ اپنی بیویوں کے ساتھ مساوی سلوک کرو۔ مولانا کو ان کے ایک معتقد نے یا مرید نے تپائی استعمال کے لیے ایک مربع گز کپڑا نذر کیا۔ مولانا کو یہ کپڑا

دیا گیا تو آپ نے درمیان سے پھاڑ کر اس کے دو ٹکڑے کر دیے۔ اور ایک ایک ٹکڑا دونوں بیویوں کو دے دیا گیا۔ یہ ٹکڑے جب بیویوں کو دیے گئے تو ایک بیوی نے کہا‘ ’’آپ نے کپڑے کا ستیاناس کر دیا ہے۔ اگر نہ پھاڑتے تو تپائی پر بچھانے کے کام آتا۔ اب یہ چھوٹا سا ٹکڑا کس کام آئے گا؟‘‘

بیوی کا یہ اعتراض سن کر مولانا نے جواب دیا:

’’میں کیا کروں اسلام میں حکم ہے‘ اپنی بیویوں کے ساتھ مساوی سلوک کرو۔ اگر پورا کپڑا ایک بیوی کو دیا جاتا اور دوسری کو نہ دیا جاتا تو کیا یہ میرا انصاف تھا؟ یہ ٹکڑا تم دونوں کے کام آئے یا نہ آئے مجھے تو اسلام کے مطابق دونوں بیویوں سے مساوی سلوک کرنا ہی چاہیے تھا‘‘۔

مولانا اشرف علی کی زندگی کے اس قسم کے سینکڑوں نہیں ہزارہا واقعات ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ اپنے مذہبی شعار یا ذاتی کریکٹر کے مقابلے ہر ہر شے کو قربان کر سکتے تھے۔ چنانچہ آپ نے اپنے آموں کے باغ کو آموں کے پھل آن اور پکنے سے پہلے ہی ٹھیکہ پر نہ دیا۔ کیونکہ کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ پھل لگے یا نہ لگے۔ اور اگر پھل لگے تو اس کی مقدار کیا ہو۔ بغیر پھل دیکھے اور پکے آپ اپنے باغ کا ٹھیکہ پر دینا قماربازی سمجھتے تھے۔

مولانا حسرت موہانی کے ساتھ راقم الحروف کے کئی برس تک تعلقات رہے اور آپ کی یہ وضع داری تھی کہ مرکزی اسمبلی میں شرکت کے لیے دہلی تشریف لاتے تو دفتر ریاست کو بھی اپنے قدموں سے ہم آغوش ہونے کا فخر بخشتے۔ اس طویل عرصہ میں ہمیشہ ہی دکھا گیا کہ آپ کی عینک پر بوسیدگی کے باعث لکیریں پڑی ہیں ٹوپی زیادہ استعمال کے باعث میلی ہے اور اگر کہیں جانا ہوتا تو تانگہ میں دوسرے مسافروں کے ساتھ ایک دو آنہ دے کر بیٹھتے یعنی کبھی سالم تانگہ نہ لیتے۔ اور کسی کے زیر بار احسان نہ ہوتے۔ ورنہ جس صورت میں انگریزوں سے کانگرس مسلم لیگ اور سوراجیہ پارٹی

کے سینکڑوں ممبروں نے سرکاری کمشنوں کی ممبری اور دوسرے ذریعہ سے ہزار ہا روپیہ ماہوار حاصل کیا۔ کیا حسرت موہانی جیسے پیدائشی انقلاب پسند کے لیے انگریزوں کے ہاتھوں اپنی سیاسی حرمت کو فروخت کرنا مشکل تھا۔ کیا وہ بھی موٹروں میں سواری کرتے ہوئے اسمبلی کے دوسرے ممبروں کی طرح فلک نما ہوٹلوں میں قیام نہ کر سکتے تھے؟ مگر سوال تو کریکٹر کی بلندی کا ہے۔ وہ لوگ اپنے ضمیر کو کیونکر نیلام کرا سکتے تھے۔ جنھوں نے اپنے ضمیر اور کریکٹر پر دنیا کی ہر شے قربان کرنے کا فیصلہ کر لیا ہو۔

روپیہ کی پیشکش نہ ہوتے ہوئے ہر شخص دیانت دار ہے صحت سے محروم ہوئے ہوئے ہر شخص عابد ہے اور با اختیار ہوتے ہوئے کوئی بھی ظالم نہیں۔ مگر ان لوگوں کی قبریں اور سمادھیاں بھی زیارت اور پرستش کے قابل ہیں جنھوں نے اپنے کریکٹر پر اپنا سب کچھ قربان کر دیا اور جن کے کردار کی بلندی پر روپیہ، صحت اور حکومت اثر انداز نہ ہو سکی۔

☆☆☆

حاکم کی اگاڑی

ہندوستان میں یہ کہاوت مشہور ہے کہ "حاکم کی اگاڑی اور گھوڑے کی پچھاڑی سے ہمیشہ بچنا چاہیے"۔ اس کہاوت کا مطلب یہ ہے کہ حاکم کے سامنے کبھی نہ جاؤ کیونکہ نہ معلوم سامنے جانے والے پر حاکم کا اعتاب ہی نازل ہو جائے۔ اور گھوڑے کی پچھاڑی یعنی اس کے پیچھے کی طرف' قریب نہ جانا چاہیے۔ شاید یہ دولتی مار دے۔ کیونکہ گھوڑا جب کسی پر حملہ کرتا ہے' تو اپنی پچھلی ٹانگوں سے زور لگاتا ہے۔ حاکم کی اگاڑی کے متعلق چند واقعات سنیے۔

ریاست پٹیالہ میں ایک صاحب سرداد گہل سنگھ مجسٹریٹ تھے۔ یہ سردار گہل سنگھ بہت فاضل' شریف' بہت نیک اور بہت دیانتدار ہونے کے علاوہ سکھ تاریخ کے معلق ایک اتھارٹی تھے۔ کیونکہ آپ کی ابتدائی زندگی میں مرحوم مسٹر میکالیف کی مشہور ضخیم تصنیف "سکھ ریلجن" میں آپ کی محنت کا بھی بڑا حصہ ہے اور مسٹر میکالیف کی سفارش سے ہی آپ ریاست پٹیالہ میں ملازم ہوئے۔ مرحوم مہاراجہ پٹیالہ نے ایک بار سردار گہل سنگھ کو طلب فرمایا اور اپنی اس خواہش کا اظہار کیا کہ سردار گہل سنگھ مہاراجہ کے پرائیویٹ سیکرٹری کا عہدہ قبول کر لیں۔ مہاراجہ کی اس خواہش کو سن کر سردار گہل سنگھ نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر نہایت انکساری کے ساتھ عرض کی کہ "حضور مجھے پرائیویٹ سیکرٹری مقرر نہ کیا جائے"۔ مہاراجہ نے یہ جواب سن کر حیرت محسوس کی' کہ ہر سال پچاس لاکھ روپیہ کے قریب پرائیویٹ سیکرٹری کے ہاتھوں سے موتی باغ پٹیالہ میں صرف ہوتا ہے۔ بڑے سے بڑا عہدہ دار' یہاں تک کہ وزراء بھی پرائیویٹ سیکرٹری سے خوف کھاتے ہیں' اور اس کا لحاظ کرتے ہیں۔ کیونکہ پرائیویٹ سیکرٹری دن رات مہاراجہ کے پاس رہنے کے باعث ہر شخص کے لیے مفید اور نقصان کا باعث ہو سکتا ہے۔ اور ہر بڑے سے بڑا اہلکار اس کوشش میں رہتا ہے کہ وہ پرائیویٹ سیکرٹری مقرر ہو۔ اور یہ سردار گہل سنگھ ہیں کہ اس عہدہ کو قبول کرنے سے انکار کر رہے ہیں۔

مہاراجہ نے جب سردار گہل سنگھ سے اس انکار کی وجہ پوچھی تو آپ نے پھر دونوں ہاتھ جوڑ کر عرض کی۔

''حضور پرائیویٹ سیکرٹری ہونے کی صورت میں مجھے دن رات حضور کی خدمت میں حاضر رہنا پڑے گا۔ حضور کے ہر حکم کی تعمیل کرنی ہوگی۔ انسان سے غلطی اور خطا ممکن ہے اور میں نہیں چاہتا کہ مجھ سے کوئی غلطی یا خطا ہو' اور اس غلطی یا خطا پر حضور کا مجھ پر عتاب نازل ہو' اور مجھے تا حکم ثانی جیل میں قید کر لیا جائے' جیسا کہ اس سے پہلے حضور کے قریب رہنے والے کئی عہدہ دار اور ملازم جیل بھیج دیے گئے''۔

چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ سردار گہل سنگھ نے پرائیویٹ سیکرٹری کا عہدہ قبول نہ کیا' اور پھر آپ واپس برنالہ میں ہی بطور مجسٹریٹ بھیج دیے گئے۔ کیونکہ یہ قطعی ممکن تھا' کہ ''حاکم کی اگاڑی'' یعنی مہاراجہ کے سامنے اور ساتھ رہنے کے باعث کب مہاراجہ کا عتاب نازل ہوتا' اور آپ جیل بھیج دیے جاتے۔

بہت برس ہوئے میں پہاڑ کی سیر کے لیے ریاست چمبہ گیا' کیونکہ یہ علاقہ اپنے قدرتی اعتبار سے بہت پرکشش ہے۔ اس ریاست کے علاقہ میں ایک مقام کھجیار اس کی چھوٹی سی جھیل تو بہت ہی پر فضا جگہ پر واقع ہے۔ چمبہ اس زمانے میں راجہ کی حکمرانی میں تھا۔ میں وہاں ڈاک بنگلہ میں ٹھہرا' جس کا کرایہ میں دو یا تین روپیہ روزانہ دیتا اور کھانے کی قیمت اس بنگلہ کے انچارج کو الگ ادا کر دی جاتی۔ صبح ناشتہ کے بعد سیر کے لیے چلا جاتا اور رات کو کھانے کے وقت واپس آتا۔ دن رات ادھر ادھر گھومتا ہوئے دریائے راوی کے کنارے پتھروں پر جا بیٹھتا۔ ایک روز دوپہر کو میں چمبہ شہر کے میدان (جسے غالباً چوگان کہا جاتا ہے) میں پہنچا تو دیکھا کہ وہاں ایک سو کے قریب دیہاتی بیٹھے تمباکو بیڑی پیتے اور آپس میں باتیں کرنے میں مصروف ہیں۔ اس وقت میرے ساتھ وہاں کے ایک لوکل سکول ماسٹر تھے۔ میں نے ان ماسٹر صاحب سے پوچھا کہ یہ لوگ کون ہیں؟ تو انہوں نے بتایا کہ یہ دیہاتی ہیں بیگار میں

پکڑے گئے ہیں اور بغیر ایک پیسہ دیے ان سے سرکاری کام لیا جاتا ہے۔ جب تک کہ ان سے کام نہ لیا جائے یہ اپنے گھروں کو نہیں جا سکتے۔ ان مین سے ہی مزدوروں کا ٹھیکہ دار مسافروں کو مزدور سپلائی کرتا ہے کیونکہ اس وقت چمبہ میں نہ تو موٹر جا سکتی ہے اور نہ بیل گاڑی۔ اور ڈلہوزی تک لوگ صرف گھوڑے پر ہی آتے اور جاتے تھے۔ اور سامان لے کر جانے کا کام ان بیگار میں پکڑے گئے لوگوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ورنہ اس سے پہلے بیگار کے حالات صرف کانوں کے سننے تک محدود تھے۔ میں نے ماسٹر صاحب سے جب یہ حالات سنے تو میں نے زیادہ دلچسپی محسوس کی اور بیگار میں پکڑے گئے اندیہاتی پہاڑیوں سے خود باتیں شروع کر دیں۔ تو معلوم ہوا کہ ان میں سے زیادہ لوگ چمبہ سے دس بیس یا پچاس میل دور پانگی کے علاقہ سے ہیں۔ یہ لوگ نمک اور تیل وغیرہ میں سودا سلف لینے چمبہ آئے تو ان کو دو چار روز کے لیے روک لیا گیا۔ کیونکہ ان بے چاروں کا قصور یہ تھا کہ یہ چمب کے بازار سے سودا خرید رہے تھے۔ کہ اتنے میں تحصیل کا ایک ملازم وہاں آ گیا جو دیہاتیوں کو بیگار میں پکڑنے پر مقرر تھا۔ اور اس نے ان کو بیگار میں پکڑے گئے دوسرے لوگوں کے پاس جا بٹھایا۔ یعنی یہ بے چارے بھی حاکم کی اگاڑی کا شکار ہوئے۔ کیونکہ اگر یہ تحصیل کے بیگار افسر کے سامنے نہ آتے تو یہ بیگار میں نہ پکڑے جاتے اور سودا لے کر اپنے گھروں کو چلے جاتے۔

راجہ سر دیا کشن کول ریاستی وزراء کی صف میں پہلی قطار میں تھے۔ آپ سالہا سال تک ریاست پٹیالہ کے وزیر اعظم رہے۔ اس سے پہلے مہاراجہ سر پرتاب سنگھ آف کشمیر کے پرائیویٹ سیکرٹری اور متعدد دوسری ریاستوں کے وزیر اعظم رہے۔ اور یہ واقعہ ہے کہ آپ جہاں بھی رہے وہاں کے والی ریاست کو اپنے ہاتھوں میں اس طرح ہی ناچ نچاتے رہے۔ جس طرح سپیرا کوبرا سانپ کو بین کے اشارے پر نچاتا ہوئے اپنے ہاتھوں کو سانپ کے کاٹنے سے محفوظ رکھتا ہے۔ چنانچہ آپ کے متعلق یہ دلچسپ

واقعہ ہے' کہ کشمیر میں سالہا سال تک مہاراجہ سر پرتاب سنگھ کے پرائیویٹ سیکرٹری رہنے کے بعد آپ کشمیر سے ریاست بدر کیے گئے۔ اور پٹیال میں بھی مہاراجہ پٹیالہ نے آپ کے وارنٹ جاری کر دیے۔ ہندوستان کے وائسرائے لارڈ ریڈنگ کو مداخلت کرنا پڑی۔ راجہ سر دیا کشن کول کے پٹیالہ سے چلے جانے کے بعد راجہ صاحب اور راقم الحروف کے درمیان بہت گہرے دوستانہ تعلقات قائم ہو گئے تھے۔ چنانچہ ایک بار لاہور میں راجہ صاحب سے ملاقات ہوئی' اور والیان ریاست کے مظالم اور ان کے ہاتھوں سے راجہ صاحب کے ہمیشہ محفوظ رہنے کے سلسلہ میں باتیں ہو رہی تھیں تو باتوں باتوں میں آپ نے فرمایا:

''سردار صاحب آپ کی اور میری دونوں کی پوزیشن ایک سپیرے کی سی ہے' جو زہریلے سانپوں کو اپنے ہاتھوں سے کھلاتا ہے اور خود محفوظ رہتا ہے۔ میری زندگی ریاستوں کا سیکرٹری اور وزیر اعظم ہوئے صرف ہوئی اور میں نے ان کی بیش بہا خدمات انجام دیں۔ مگر پھر بھی ان مین سے اکثر مجھے انتہائی نقصان پہنچانے کی کوشش ک۔ کیونکہ یہ قریب رہنے کے باعث کسی بھی وقت ناراض ہو سکتے تھے۔ اور آپ کے خلاف بھی انہوں نے بہت کوششیں کیں مگر یہ اپنے ناپاک ارادوں میں کامیاب نہ ہوئے''۔

یعنی اگر مہاراجہ کشمیر اور مہاراجہ پٹیالہ وغیرہ نے راجہ سر دیا کشن کول کو کچلنے کی کوشش کی' تو اس کی وجہ تھی ''حاکم کی اگاڑی'' تھی۔ کیونکہ یہ ہر وقت ان والیان ریاست کے ساتھ رہے اور والیان ریاست کسی بھی وقت کسی بات پر ناراض ہو سکتے تھے۔

ریاست چھترکاری کے وزیر میر علی عباس نے راقم الحروف کو اپنا ایک واقعہ سنایا:

میر صاحب مہاراجہ چھترکاری کے پرائیویٹ سیکرٹری تھے' اور مہاراجہ کا مسوری میں قیام تھا جہاں کہ مہاراجہ کی ایک داشتہ طوائف لالی بھی آپ کے ساتھ تھی۔ ایک روز مہاراجہ لالی پر بہت خوش تھے تو لالی کی غیر حاضری میں مہاراجہ نے میر صاحب سے کہا

''میر صاحب لالی بہت ہی شریف اور وفا شعار ہے'' یہ سن کر میر صاحب نے جواب دیا ''ہاں حضور لالی تو بہت ہی مخلص اور بے ریا ہے'' اس واقعہ کے بیس روز بعد مہاراجہ کسی وجہ سے لالی سے ناراض ہو گئے تو مہاراجہ نے میر صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا ''میر صاحب لالی بہت چالاک اور عیار قسم کی عورت ہے'' میر صاحب نے جواب دیا ''ہاں حضور یہ سو فیصدی خودغرض طوائف ہے'' مہاراجہ نے جب میر صاحب کا یہ جواب سنا تو آپ نے میر صاحب سے کہا 'میر صاحب آپ بھی عجیب انسان ہیں۔ اس روز کہتے تھے کہ لالی مخلص اور بے ریا ہے۔ اور اب آپ کہتے ہیں کہ یہ سو فیصدی طوائف ہے'' مہاراجہ کا یہ ارشاد سن کر میرے صاحب نے ہاتھ باندھے عرض کیا۔

''سرکار آپ کا حکم بجا ہے مگر سوال یہ ہے کہ اگر میں نے حضور کی ملازمت کرنی ہے تو کس طرح حضور کے ارشاد کی تردید کرنے کی جرات کر سکتا ہوں۔ میں تو حضور کے ہر حکم کی تعمیل کروں گا۔ چاہے وہ درست ہو یا غلط اور آپ کے ہر خیال کی تائید کروں گا چاہے میں اس خیال کو ناپسند کروں''۔

مہاراجہ چرکاری میر علی عباس کا یہ جواب سن کر مسکرا دیے۔ کیونکہ حاکم کی اگاڑی سے بچنے کی صورت بھی یہی تھی۔ کہ میر صاحب مہاراجہ کی ہاں میں ہاں ملاتے رہیں اور مہاراجہ کو ناراض ہونے کا موقع ہی نہ دیتے۔

ریاست نابھ میں ایک صاحب سردار بہادر گوردیال سنگھ ولٹ (پنجاب ہائیکورٹ کے جج مسٹر ولٹ کے والد) مہاراجہ کے پرائیویٹ سیکرٹری تھے۔ ان کے متعلق یہ واقعہ بہت دلچسپ اور حیرت انگیز ہے کہ آپ غالباً بیس برس تک مہاراجہ کے پرائیویٹ سیکرٹری رہے اور دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں اٹھارہ گھنٹے مہاراجہ کے قریب رہتے مگر کبھی بھی ایسا نہ ہوا کہ مہاراجہ ان پر ناراض ہوں۔ نابھ کے لوگ تو سردار بہادر کو گراموفون کہتے۔ یعنی جو مہاراجہ نے کہا' وہ آپ نے آگے کہہ دیا اور جو کسی نے مہاراجہ کے لیے کہا وہ مہاراجہ سے جا کہا۔ اور آپ کوئی کمی بیشی نہ کرتے۔ مگر

میں آپ کو دیوتا سمجھتا تھا۔ ان کے دیوتا ہونے کا سب سے بڑا اور نا قابل تردید ثبوت یہ تھا کہ آپ نے بیس برس تک دن رات ایک والیے ریاست کے قریب رہتے ہوئے بھی اس مہاراجہ کو کبھی شکایت کا موقع نہ دیا۔ ورنہ عام طور پر والیے ریاست اپنے قریب کے ملازموں پر دن میں کئی بار خوش ہوتے' اور کئی بار ان ملازموں پر عتاب نازل ہوتا اور ''حاکم کی اگاڑی'' سے بچنا آسان نہ تھا۔

☆☆☆

فیاضی اور فطرت کا تعلق

انسان کے فیاض یا کفایت شعار ہونے کا تعلق اس کی فطرت سے ہے اور اس کی فطرت کا اندازہ اس کے بچپن کے زمانہ سے ہی کیا جاسکتا ہے۔ اور اس کا تعلق روپیہ کے کم یا زیادہ ہونے سے قطعی نہیں۔ یعنی ایک غریب اور مفلس شخص بھی فیاض ہوسکتا ہے' اور ایک کروڑپتی کا بھی کفایت شعار اور کنجوس ہونا ممکن ہے جو ایک پیسہ صرف نہ کرتا ہو۔

موجودہ مہاراجہ پٹیالہ کے بچپن کا زمانہ تھا۔ کہ آپ ایک پارسی اتالیق کرنال مستری کی تحویل میں تھے۔ یہ کرنل مستری دن رات مہاراجہ (جو اس زمانہ میں ولی عہد تھے) کی نگرانی کرتے۔ ایک روز کرنل مستری ان مہاراجہ کو کرکٹ کھلا رہے تھے کہ تو دیکھا کہ کرکٹ کے سامان میں ایک گیند پڑی ہے جو پھٹ چکی ہے۔ کرنل مستری نے جب یہ گیند دیکھی تو آپ نے ملازم کو حکم دیا کہ اس گیند کو پھینک دیا جائے اور اس کی جگہ نئی گیند رکھ دی جائے۔ یہ مہاراجہ قریب ہی کھڑے تھے اور ان کی عمر بارہ تیرہ برس کی تھی آپ نے کرنل مستری سے کہا۔

''کرنل صاحب اس گیند کو پھینکیے نہیں موچی سے سلوا لیجیے یہ کوئی روز اور کام دے گی''

کرنل مستری نے نوجوان ولی عہد کے منہ سے یہ الفاظ سنے تو وہ بہت حیران ہوئے۔ کیونکہ ایک فیاض شخص کے منہ سے ان الفاظ کا نکلنا ان کی توقع کے خلاف تھا۔

اس ولی عہد کے والد یعنی مرحوم راجہ پٹیالہ کو کرنل مستری نے جب ولی عہد کا یہ واقعہ سنایا تو مرحوم مہاراجہ کو بہت صدمہ ہوا۔ انہوں نے محسوس کیا کہ یہ برخوردار فطرتاً فیاض نہیں اور کسی ریاست کے حکمران کے لیے فیاض نہ ہونا ایک بہت بڑی کمزوری ہے جو اس کے لیے مہنگی ثابت ہوا کرتی ہے۔ کیونکہ مرحوم مہاراجہ پٹیالہ جیسا فیاض شخص والیان ریاست کے حلقہ میں پیدا ہی نہ ہوا تھا۔ جس نے اپنی زندگی میں کروڑوں روپیہ صرف

کیا۔ مرحوم کے ستاروں کا ہی اثر تھا کہ آپ جب تک زندہ رہے خزانہ میں روپیہ کی کبھی کمی نہیں ہوئی۔ اور موجوہ مہاراجہ کے ستاروں کے اثرات سمجھیے کہ آپ فطرتاً بے حد کفایت شعار ہیں اور کسی دوسرے کا کیا سوالے آپ کے بھائی بہنیں اور قریبی عزیز بھی آپ کی کفایت شعاریوں سے نالاں ہیں۔

مرحوم مہاراج نابھ (جو محبّ الوطن تھے اور جو اپنی محبّ الوطنی کے بعد گدی سے محروم کر دیے گئے اور کوڈائی کنال مدراس میں نظر بند کر دیے گئے) کا بچپن کا زمانہ تھا آپ دسمبر کے مہینہ میں مرغابیوں کے شکار کے لیے گئے۔ ایک جھیل کے کنارے پر آپ نے مرغابیوں پر بندوق چلائی تو مرغابیاں بندوق کے چھروں سے زخمی ہو کر جھیل میں جا گریں۔ مہاراجہ جو اس وقت ولی عہد تھے نے جب مرغابیوں کو پانی میں گرتے دیکھا تو آپ نے قریب ہی کھڑے ہوئے ایک دیہاتی لڑکے کو جو گاؤں کا رہنے والا تھا کہا کہ وہ جھیل کے پانی میں جا کر زخمی مرغابیاں لے آئے۔ اس دیہاتی لڑکے نے اپنا پاجامہ اتار دیا' اور جھیل میں جا کر یہ مرغابیاں لے آیا' تو ولی عہد نے خوش ہو کر لڑکے کو اپنی جیب سے بطور انعام دوونی دی۔ ولی عہد مرغابیاں لے کر اپنے ملازموں کے ساتھ محلات میں واپس آ گئے۔ مرغابیاں ولی عہد کے والد یعنی مرحوم مہاراجہ ہیرا سنگھ کے سامنے پیش کی گئیں۔ ملازموں نے تمام کیفیت بیان کرتے ہوئے یہ بھی بتایا کہ ولی عہد بہادر نے جھیل سے مرغابیاں لانے والے لڑکے کو دوونی دی تو مہاراجہ کو بہت صدمہ ہوا۔ اور آپ کے منہ سے بے اختیار صورت یہ الفاظ نکل گئے۔

''یہ ٹکہ صاحب اگر نابھ کی گدی پر بیٹھے بھی تو یہ اپنی کنجوسی کے باعث گدی پر نہ رہ سکیں گے''۔

چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ ولی عہد مہاراجہ ہونے کے باوجود بھی غیر ضروری طور پر کفائت شعار تھے۔ یہ فیاض نہ تھے یہ مقدمہ بازی اور جھگڑوں پر تو بہت روپیہ صرف

کرتے اور ضد میں آ کر انہوں ں ے لاکھوں روپیہ وکیلوں اور لیڈروں کو دیا۔ مگر فیاضہو نے کے باعث یہ کسی کو ایک روپیہ نہ دیتے اور ن کے مصائب میں ان کی کنایت شعاری کا بھی ایک بہت بڑا حصہ تھا۔ کیونکہ ان کا کوئی رشتہ دار عزیز یا ملازم ان سے مطمئن نہ تھا۔

متحدہ بنگال کے وزیراعلیٰ مولوی فضل الحق فطرتاً بہت بڑے فیاض ہیں۔ آپ زندگی بھر مقروض رہے حالانکہ شباب کے زمانہ میں آپ بہت بڑے اور کامیاب وکلا میں سے تھے۔ اور آپ ہمیشہ مقروض رہنے کے باعث انکی فیاضیاں ہی تھیں۔ اگر کوئی ضرورت مند آپ کے پاس امداد کے لیے آتا اور آپ کے پاس روپیہ نہ ہوتا تو آپ بنئے سے قرض لے کر بھی اس ضرورت مند کی امداد کرتے۔ اور اگر بنیے سے بھی قرض نہ ملتا تو بہت کافی سود پر پٹھانوں سے روپیہ قرض لے کر ضرورت مند کی امداد کی جاتی۔ مولوی صاحب کے متعلق ایک دلچسپ واقعہ ہے کہ ایک ضرورت مند کو دوسو روپیہ کی ضرورت تھی۔ وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نے اپنا چپڑاسی بھیج کر اس بنیے سے دوسو روپیہ قرض طلب کیا جس سے لین دین تھا۔ مولوی صاحب پہلا قرضہ ہی واپس ادا نہ کر سکے تھے۔ بنیے نے مزید قرضہ دینے سے انکار کر دیا تو آپ نے چپڑاسی بھیج کر قرضہ کا کاروبار کرنے والے ایک پٹھان کو بلایا اور اس سے دوسو روپیہ قرض طلب کیا۔ پٹھان نے مولوی صاحب کے ساتھ سود کی رعایت کرتے ہوئے ایک آنہ فی روپیہ ماہوار یعنی دوسو روپیہ چکلے لیے ساڑھے بارہ سو روپے وصول کر کے لے جاتا۔ کیونکہ مولوی صاحب بنگال کے وزیراعلیٰ تھے اور آپ کی تنخواہ ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو خزانہ سے آتی مولوی صاحب چار پانچ ماہ تو ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو سود ادا کرتے رہے۔ اس کے بعد آپ سود ادا نہ کر سکے۔ کیونکہ جو تنخواہ آتی اسے دوسرے قرض خواہ یا ضرورت مند لے جاتے۔ جو کئی روز پہلے سے ہی مہینہ کی پہلی تاریخ کے منتظر رہا کرتے۔ پٹھان کو جب چار پانچ ماہ کا سود ادا نہ کیا گیا تو اس نے مولوی صاحب کو

عاجز کرنا شروع کر دیا۔ آخر مولوی صاحب نے اگلے ماہ کی پہلی تاریخ کو اصل معہ سود ادا کرنے کا پختہ وعدہ کیا۔ اور پٹھان اس ماہ کی پلی تاریخ کو دوپہر کے تین بجے وزیر اعلیٰ کی کوٹھی پر حاضر ہوا تا کہ اپنا روپیہ وصول کرے۔ اس کے آنے سے پہلے مولوی صاحب دوسو روپیہ اور پانچ ماہ کی سود کی رقم محفوظ رکھے ہوئے تھے اپ نے پٹھان کو یہ رقم ادا کر دی اور پٹھان روپیہ لے کر چلا گیا۔ اس وقت کوٹھی کے برآمدہ میں بیس لوگ ملاقات کرنے والے بیٹھے ہوئے تھے پٹھان کمرہ سے نکلا تو نئے ملاقاتی کو چپڑاسی نے اندر بھیجا۔ یہ ملاقاتی ایک طالب علم تھا۔ اس نے مولوی صاحب سے ملاقات کرتے ہوئے کہا کہ یہ امتحان میں کامیاب ہو چکا ہے اور اب بی اے میں داخلہ لے گا مگر اس کے پاس نہ تو فیس ادا کرنے کے لیے روپیہ ہے اور نہ کتابیں خریدنے کے لیے رقم۔ اس کو فیس اور کتابوں کے لیے دوسو روپیہ کی ضرورت ہے۔ مولوی صاحب کے پاس اس وقت ایک پیسہ بھی نہیں تھا۔ بہت پریشان ہوئے کہ اس طالب علم کو دوسو روپیہ کہاں سے دیا جائے۔ آپ کو فوراً ایک خیال آیا آپ نے گھنٹی کا بٹن دبا کر چپڑاسی کو بلایا اور ہدایت کی کہ بھاگ کر جائے اور اس پٹھان کو پھر واپس لائے۔ چپڑاسی بھاگ کر پٹھانوں کے اڈہ پر گیا اور اس پٹھان کو بلا لایا۔ یہ پٹھان مولوی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے پٹھان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"خاں صاحب دیکھو ہم نے تمہارا پچھلا روپیہ ادا کر دیا اب ہمارے ذمہ سود بھی تمہارا باقی نہیں۔ اب ہمیں نئے حساب میں دوسو روپیہ پھر قرضہ دو"۔

پٹھان کو کیا انکار تھا۔ کیونکہ اسے اصل اور سود کا ایک ایک پیسہ مل چکا تھا۔ اس نے اپنی جیب میں سے دوسو روپیہ نکال کر مولوی صاحب کے سامنے رکھا اور اس روپیہ کو مولوی صاحب نے اس طالب علم کو فیس اور کتابوں کے لیے دے دیا۔ مولوی فضل الحق کے ایک دوست کا بیان ہے کہ امتحان کے بعد سینکڑوں طلبہ ہر سال مولوی صاحب کی خدمت میں کتابوں کی قیمت اور فیس کے لیے حاضر ہوتے تھے اور کوئی بھی

مایوس واپس نہ لوٹتا۔ جس کی وجہ مولوی صاحب کی فیاضانہ فطرت تھی۔

ہوشیار پور کے رہنے والے ایک صاحب رائے بہادر سیٹھ جودہامل کوٹھیالہ تھے جن کا ابھی حال ہی میں چند ماہ ہوئے انتقال ہا۔ آپ جنگلات کے ٹھیکے لیا کرتے تھے اور آپ فطرتاً فیاض تھے۔ چنانچہ یہ واقعہ ہیکہ کوئی شخص بھی آپ کے پاس جاتا اور کہتا کہ اس کی لڑکی کی شادی ہے اور اخراجات کے لیے اس کے پاس روپیہ نہیں تو آپ اسے پانچ سو روپیہ دے دیتے۔ اس طرح اپنی لڑکیوں کی شادی کے لیے روپیہ کی درخواست کرنے والے ہر ماہ درجنوں کی تعداد میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ اور کوئی شخص خالی نہ جاتا۔ سیٹھ جودہامل تعلیم یافتہ نہ تھے۔ اور مذہبی خیال کی سیدھی سادھی شخصیت تھے۔ آپ نے اپنی زندگی مین درجنوں مندر تعمیر کرائے اور دو لاکھ روپیہ کی لاگت سے چند برس ہوئے کانگڑہ کے علاقہ میں تپدق کا سینی ٹوریم بھی جاری کیا جس کی رسم افتتاح ہندوستان کے صدر ڈاکٹر راجندر پرشاد نے ادا کی۔

مرحوم مسٹر رفیع احمد قدوائی وزیر گورنمنٹ ہند کی فیاضیوں کے قصوں پر تو ایک کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ آپ نے اپنی زندگی میں لاکھوں نہیں شاید کروڑوں روپیہ سرمایہ داروں سے حاصل کر کے غریبوں ضرورت مندوں اور سیاسی کام کرنے والوں کو دیا مگر خود ہمیشہ مقروض رہے۔ چنانچہ جب آ کا انتقال ہوا تو آپ پنجاب نیشنل بنک کے مقروض تھے اور یہ قرضہ پچھتر ہزار روپیہ تھا۔ راقم الحروف کے بھی مرحوم قدوائی صاحب کے ساتھ نیازمندانہ تعلقات تھے۔ آپ سے ملاات کا وقت سورج کے طلوع ہونے سے پہلے ہوا کرتا تھا کیونک آپ رات کو تین چار بجے بیدار ہوتے اور کام شروع کر دیتے۔ راقم الحروف جب کبھی آپ کی ملاقات کے لیے آپ کی کوٹھی میں حاضر ہوا تو دیکھا کہ میرے پہنچنے سے پہلے پندرہ بیس یا پچیس لوگ ڈرائنگ روم میں موجود ہیں۔ ان میں سے کوئی تو کھدر پوش کانگرسی ہے کوئی مغربی یوپی کا داڑھی والا مولوی کوئی پتلون پہنے کالج کا طالب علم اور کوئی ممبر پارلیمنٹ۔ ان سب کا مقصد

صرف ایک ہی ہوتا کہ وہ قدوائی صاحب سے مالی امداد حاصل کرے کیونکہ آپ کسی کو بھی خالی نہ جانے دیتے۔ اور اگر روپیہ موجود نہ ہوتا پوسٹ ڈیٹ چیک دے دیتے۔

قدوائی صاحب کے ہزارہا دلچسپ واقعات میں سے صرف ایک واقعہ سن لیں۔

لکھنو کا اخبار "نیشنل ہیرلڈ" مالی مشکلات میں مبتلا تھا۔ اس اخبار کا مینجر قدوائی صاحب کی ملاقات کے لیے دہلی پہنچا اور آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس نے بتایا کہ اخبار کے سٹاف کی تین ماہ سے تنخواہیں نہیں دی گئیں۔ اور مالی مشکلات ہیں۔ قدوائی صاحب بہت کم گو تھے آپ نے پوچھا فی الحال کتنے روپے کی ضرورت ہے مینجر نے بتایا کہ ساٹھ ہزار کی۔ اس کے جواب میں آپ نے صرف ہاں کہا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ روپیہ بھیج دیا جائے گا۔ کیونکہ اگر روپیہ موجود نہ ہوا تو آپ صرف اس واقعہ کے چار روز بعد قدوائی صاحب کا ملازم دفتر ہیرلڈ پہنچا اور اس مینجر کو لفافہ دیا جس میں ساٹھ ہزار روپیہ کے کرنسی نوٹ تھے قدوائی صاحب کے انتقال کے بعد راقم الحروف آپ کے گاؤں مسولی گیا تھا۔ وہاں اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ آپ کے گھر کی دیوار غیر مکمل صورت میں کھڑی ہے۔ اور فرنیچر کی روئی بوسیدگی کے باعث نظر آ رہی ہے۔ یہ حالت تو ان کے گھر کی تھی۔ مگر آپ کے لیے عزت و احترام کے جذبات کی حالت یہ کہ اس تمام علاقہ بارہ بنک کے دیہات کے لوگ قدوائی صاحب کے مزار پر منتیں ماننے آتے ہیں اور پھول چڑھائے جاتے ہیں۔ کیونکہ قدوائی صاحب ایک درویش تھے۔ اور ایک درویش یا سنیاسی کی صفت یہی ہوتی ہے کہ اسکا جو کچھ ہو وہ دوسروں کے لیے ہو۔ اور اس کا ذاتی کچھ نہ ہو۔

مرحوم مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی جب دہلی میں سرکاری ملازم تھے تو آپ کو عربی زبان کے ایک سرکاری رسالہ کو ایڈٹ کرنے کے معاوضہ میں آٹھ سو روپیہ ماہوار تنخواہ ملتی تھی۔ اور آپ ریڈیو سٹیشن سے روزانہ دو گھنٹہ کے عربی پروگرام میں کام کرنے کے معاوضہ میں پانچ سو روپیہ ماہوار تنخواہ پاتے تھے۔ اور یہ واقعہ دلچسپ ہے کہ آپ ہر

ماہ کی پہلی تاریخ کو جب تنخواہ لیتے دونوں دفتروں میں جاتے تو واپس آتے ہوئے ڈاک خانہ سے دس بارہ منی آرڈر فارم لیتے آتے اور یہ فارم پر کرکے اسی روز مستحق اور ضرورت مند یتیموں اور بیواؤں کو کچھ روپیہ بھیج دیتے۔ یہ سلسلہ کئی برس جاری رہا' کیونکہ آپ رسول اللہؐ کی خواہش (رسول اللہؐ نے ایک بار خدا سے دعا کی تھی کہ یا اللہ مجھے غریبوں کی صفوں میں رکھنا' اور مرنے کے بعد بھی مسکینوں ہی میں جگہ دینا) کے مطابق غریب اور تنگدست رہنا زیادہ پسند کرتے تھے۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ مرحوم مولانا مہینہ ختم ہونے سے پہلے ہی نادار ہو جاتے جب آپ نے مولانا ابوالکلام آزاد کے انتقال کے بعد ملازمت چھوڑ دی تو آپ کے پاس اپنے بیٹے کے پاس کلکتہ جانے کے لیے کرایہ بھی نہیں تھا۔ مولانا عبدالرزاق کے یہ حالات ثابت کرتے ہیں کہ ایک فیاض شخص کم آمدنی ہوتے ہوئے بھی اپنی فطرت سے مجبور ہو کر روپیہ سے محبت نہیں کرتا اور اس کے پاس جو کچھ ہو وہ ضرورت مندوں کو دے دیا کرتا ہے۔

فیاضی نہ امیری پر منحصر ہے نہ غریبی پر۔ ایک امیر شخص کروڑوں روپیہ رکھتے ہوئے بھی کمینہ اور کنجوس ہو سکتا ہے۔ یہ اگر کبھی فیاض بھی ثابت ہوتا ہے تو صرف اس وقت جب کہ ایک روپیہ دیے ہوئے دس روپیہ آنے کی توقع رکھتا ہو جیسا کہ ہندوستان' اور پاکستان کے انڈسٹریلسٹ پرمٹوں اور ٹھیکوں کی توقع پر وزراء کو پبلک فنڈوں میں روپیہ دیا کرتے ہیں۔ اور اگر ایک غریب شخص فیاض ہو تو وہ اپنی دو روٹیوں میں سے ایک روٹی دوسرے فاقہ کش کو دے دے گا کیونکہ وہ اپنی فطرت سے مجبور ہے وہ کمینہ اور خود غرض نہیں ہو سکتا۔

☆☆☆

من دہ دیدم کہ سگے پیش سگے سرخم کرد

مرحوم ڈاکٹر سرمحمد اقبال نے ایک جگہ اپنے کلام میں فرمایا ہے

من نہ دیدم کہ سگے پیش سگے سر خم کرد

یعنی میں نے اپنی زندگی میں کبھی یہ نہ دیکھا کہ ایک کتے نے دوسرے کتے کے سامنے اپنا خم کا ہو۔یعنی شکست قبول کی ہو۔یا لڑنے سے باز آیا ہو۔ڈاکٹر اقبال کا یہ قول نہ صرف کتوں بلکہ انسانوں پر بھی صادق آتا ہے۔اور اسے فطرت کے مطابق ہی قرار دیا جاسکتا ہے۔جس کی چند مثالیں یہ ہیں:

آج سے نصف صدی پہلے اردو اخبارات میں لاہور کے ”پیسہ اخبار“ کو بہت عروج نصب ہوا۔جس کے سٹاف میں مرحوم سید جالب اور لالہ دینا ناتھ بھی کام کرتے تھے ۔اس زمانہ میں لاہور سے ایک روزانہ اخبار ”وطن“ جاری تھا۔جس کے ایڈیٹر مولوی انشاءاللہ تھے۔ یہ دونوں اخبارات پبلک کے اخلاق کو بلند کرنے کے مدعی تھے۔مگر دنوں ہی ایک دوسرے پر اتہام لگاتے ہوئے دشنام طرازی میں مصروف رہتے۔ ”پیسہ اخبار“ میں تو ”وطن“ والوں کو ”وطن فروش“ لکھا جاتا اور ”وطن“ میں مولوی محبوب عالم ایڈیٹر ”پیسہ اخبار“ کو پیسہ کا پوت بتایا جاتا۔

”وطن“ اور ”پیسہ اخبار“ کی یہ جنگ زرگری ابھی جاری تھی کہ لالہ دینا ناتھ نے ”پیسہ اخبار“ چھوڑ کر اپنا اخبار ”ہندوستان“ جاری کر دیا، مولانا ظفر علی خاں حیدر آباد (دکن) کی ملازمت سے مستعفی ہو کر پنجاب چلے آئے اور آپ کے والد کے اخبار ”زمیندار“ کو ایڈٹ کرنا شروع کیا یہ زمانہ ”ہندوستان“ اور ”زمیندار“ دونوں کے انتہائی عروج کا تھا۔ دونوں کے عروج کا نتیجہ یہ وہا کہ دونوں کو ایک دوسرے پر غلیظ حملے کرتے اتہام لگاتے اور اس دشنام طرازی کو اخبارات کی اشاعت وسیع کرنے کا ذریعہ قرار دیا جاتا۔

اس زمانہ ہی میں ایک سکھ سردار امر سنگھ نے لاہور سے ایک ہفتہ وار اخبار لائل گزٹ جای کیا۔جس کی زندگی کا مقصد پنتھ کے نام پر انگریزوں کی مدح و تعریف تھی

اور ''لائل گزٹ'' کے معنی ہی وفا شعاری کا سبق دینے والا تھا۔ اس اخبار کو جاری ہوئے دو برس ہو چکے تھے۔ کہ سکھوں کے وطن پرست حلقوں نے ایک ہفتہ وار اخبار ''خالصہ اخبا'' جاری کیا جس کے لیے روپیہ وایک سردار ہرچند سنگھ نے دیا اور پالیسی ماسٹر تارا سنگھ کی پارٹی کے لوگوں کے ہاتھ میں تھی۔ جو اس زمانہ میں ایک سکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ اس خالصہ اخبار کا جاری ہونا تھا کہ لائل گزٹ میں اس کے خلاف جہاد شروع ہوا۔ اس کو کچلنے کی کوشش کی گئی۔ دشنام طرازیاں ہوا کرتیں۔ اور دونوں کے درمیان مقدمہ بازی بھی جاری ہوئی۔

اس زمانہ کے بعد لاہور سے ایک اچھا ہفتہ وار ''پرکاش' مہاشہ کرشن نے جاری کیا جو آریہ سماج کی ماس پارٹی کا نمائندہ تھا۔ اس کے مقابلہ رپ آریہ سماج کی ماس پارٹی نے آریہ گزٹ جاریکیا یہ دونوں اخبارات بھی عرصہ ک جوت پیرازی میں مصروف رہے۔ بعد میں مہاشہ کرشن نے تو ''پرتاب'' اور لالہ خوشحال چند جی نے ''ملاپ''] جاری کیے۔ جن کے درمیان اب تک تجارتی رقابت جاری ہے۔ اور جب کبھی موقع ملے یہ ایک دوسرے پر الزام اور اتہام لگاتے ہی رہتے ہیں۔

آج سے پچاس ساٹھ برس پہلے ہندوستان کی ریاست کی باگ ڈور مسٹر مرحوم بال گنگا دھر تلک کے ہاتھوں میں تھی۔ جن کے شاگردوں میں چپن چندر پال اور لالہ لاجپت رائے تو پہلی قطار کے لوگوں میں سے تھے۔ دوسری اور تیسری قطار میں ہزارہا لیڈر اور ورکر کھڑے تھے۔ جن میں سے بعض تو اپنی زندگی تک اس میدان میں قائم رہے اور بعض زمانہ کا مقابلہ نہ کرتے ہوئے الگ ہو گئے۔ بال بال اور لال (یعنی بال گنگا دھر تلک چپن چندر پال اور لالہ لاجپت رائے) کا عروج قائم رہا۔ کہ مہاتما گاندھی امریکہ سے واپس اپنے وطن ہندوستان آ گئے۔ گاندھی جی فطرتاً غلامی کے دشمن تھے۔ آپ نے واپس ہندوستان آ کر سچائی نیکی اور قدوسیت کے سایہ میں عدم تشدد اور عدم تعاون کا جھنڈا بلند کیا' تو مذہب پرست ہندوستان کے لوگ تیزی کے ساتھ اس جھنڈے کے

نیچے جمع ہونا شروع ہو گئے۔ اور جب مہاتما جی کو عروج نصیب ہو رہا تھا تو تلک پرست حلقوں میں دبے الفاظ سے آپ کی مخالفت شروع ہوئی کیونکہ تلک آزادی کی راہ میں تشدد کا جائز قرار دیتے تھے۔ اور مہاتما گاندھی کے نظریہ کے مطابق تشدد حرام تھا۔ یہ کشمکش دبے الفاظ میں جاری تھی اور ابھی اس کشمکش کے شعلے بلند نہ ہوئے تھے۔ کہ مسٹر تلک انتقال کر گئے اور مہاتما گاندھی کے خلاف پیدا ہونے والی تحریک بھی ان کی موت کے ساتھ ہی ختم ہو گئی۔ چنانچہ ایک بڑے اہل الرائے نے خوب کہا کہ اگر مسٹر تلک زندہ رہتے تو تلک گاندھی جنگ ہندوستان کی پچھلی تمام جنگوں سے آگے نکل جاتی۔

مرحوم مہاراجہ پٹالہ اور مرحوم مہاراجہ نابھ کی کشمکش کا سبب بھی صرف لیڈری تھی مہاراجہ پٹیالہ چاہتے تھے کہ سکھوں کے وہ لیڈر رہوں تا کہ وہ اس لیڈر کے نام پر برٹش گورنمنٹ سے زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کر سکیں۔ اور مہاراجہ نابھ بھی چاہتے تھے کہ وہ سکھوں کے لیڈر رہوں تا کہ پبلک ان کے ساتھ ہو۔

اورنگ زیب نے اگر چہ اپنے باپ شاہ جہاں کو قید کیا تو صرف ملک گیری کی خاطر۔ اورنگ زیب ہی کا کیا سوال ہے راقم الحروف نے ایک بھی مہاراجہ یا نواب ایسا نہ دیکھا جو اپنے ولی عہد کے خلاف نہ تھا اور ایک بھی ولی عہد ایسا نہ تھا جو اپنے باپ کے جلدی مر جانے کی دعائیں نہ کرتا تا کہ وہ خود اپنی ریاست کی حکومت حاصل کر سکے۔

پنجاب کے وزراء میں مسٹر سچر کو اقتدار نصیب ہوا تو اسے گرانے کے لیے ڈاکٹر بھارگو پیدا ہوئے۔ ڈاکٹر بھارگو وزیر اعلیٰ ہوئے تو سردار کیروں میدان میں آ گئے۔ لالہ جگت نرائن اقتدار کی سیڑھیاں چڑھ رہے تھے کہ تو اس سیڑھی کو سردار کیروں نے کھینچ لیا۔ گیانی گورمکھ سنگھ مقبول ہو رہے تھے تو دربارا سنگھ میدان میں آ گئے اور دربارا سنگھ جواہر لولعل کے قریب جا رہے تھے تو اب انکی ٹنگ کو پیچھے سے کھینچا جا رہا ہے۔ کیونکہ یہ سگان سیاست کسی دوسرے کے آگے اپنی گردن خم کرنے کے لیے تیار نہیں۔

ماسٹر تارا سنگھ پچھلے چالیس پینتالیس برس سے سکھوں کے برسر اقتدار لیڈر رہے

اور آپ اس اقتداری دور کے یہ دلچسپ واقعات ہیں کہ آپ نے اس عرصہ میں درجنوں نئے لیڈر پیدا کیے اور درجنوں ہی کو میدان پبلک سے نکال دیا۔ اور اب دیکھیے ماسٹر تارا سنگھ اور سنت فتح سنگھ کی سیاسی جنگ کا نتیجہ کیا ہو' کیونکہ دونوں ہی اپنے ہاتھوں میں مذہبی جھنڈا لیے سیاسی جنگ کے میدان میں ہیں۔

روس اور امریکہ اپنے ہزار ہا میل لمبے ار ہزار ہا میل چوڑے علاقوں پر قبضہ میں رکھتے ہوئے بھی ایک دوسرے کو ختم کرنے کے لیے نئی نئی اقسام کے تباہ کن ہتھیار تیار کر رہے ہیں۔ کیونکہ سیاسی لیڈر نہ تو صبر کر سکتے ہیں اور نہ یہ کسی دوسرے کے سامنے اپنی گردن جھکا سکتے ہیں۔

یو پی کے سمپورنا نند اور گپتا کے کیروں اور سچر آندھرا کے ریڈی بنام ریڈی اور مدھیہ پردیش کی وزارت کی اقتداری جنگیں آج کوئی راز نہیں' اور ان سے ہر شخص واقف ہے۔ مگر پنڈت نہرو کی ذہانت کی داد دینی چاہیے کہ ایسی اقتداری جنگوں کو نپٹانے کے لیے آپ نے ایک نیا گورنری کا نسخہ ایجاد کیا ہے۔ یعنی ان جھگڑوں کو ختم کرنے کے لیے دونوں پارٹیوں میں سے ایک پارٹی کو بطور لقمہ گورنری دے دی جاتی ہے اور جھگڑا ختم کر لیا جاتا ہے۔

پاکستان میں مسٹر جناح اور نوابزادہ لیاقت علی خاں کے انتقال کے بعد اقتدار کی جنگ شروع ہوئی اور مسٹر غلام محمد' خواجہ ناظم الدین' مسٹر محمد علی سہروردی مسٹر بوگرہ اور دوسرے لیڈروں نے ایک دوسرے کو گرانے کے لیے قدم اٹھائے اور اکی تو مثال ہی نہیں مل سکیتی کہ ادھر وزیر اعظم دورہ پر جا رہے ہیں اور ادھر ان کی معزولی کے وارنٹ جاری کر دیے گئے۔ اس کے بعد پاکستان کے صدر مسٹر سکندر مرزا کی جرنیلی بھی میدان میں رہ گئی اور آپ گرفتار کر کے جلاوطن کر دیے گئے۔ کیونکہ سیاسی میدان میں جو کچھ بھی ہو وہ جائز قرار دیا جاتا ہے۔

حضرت جوش ملیح آبادی کو ہندوستان میں نہ روپیہ کی کمی تھی نہ عزت کی اور ااپ

نے غلط قدم اٹھایا یا درست۔ لیکن اپنی چلی کشتی کو جلا کر پاکستان چلے گئے۔ مگر پاکستان میں ان کے پہنچتے ہی شعراء کے حلقہ میں ان کی جو مخالفت ہوئی اسے بلند لوگوں میں قابل تعریف قرار نہیں دیا جا سکتا۔

پاکستان کو قائم ہوئے آج پندرہ برس کا عرصہ ہوا اور پندرہ برس ہی سے ہندوستان اور پاکستان کی حکومتوں کے درمیان کشیدگی جاری ہے۔ اس کشیدگی کو دور کرنے کے لیے نہ تو پاکستان کی گورنمنٹ کچھ سننے کو تیار ہے نہ ہندوستان کی گورنمنٹ۔ حالانکہ دونوں حکومتوں کے لیڈر یہ جانتے ہیں کہ اگر اس کشیدگی میں مزید اضافہ ہوا اور اس کشیدگی نے جنگ کی صورت اختیار کی تو پھر دنوں ممالک کے بڑے بڑے شہر اور ان شہروں کی آبادی ملبہ کا ڈھیر ہوگی۔ امریکہ اور روس کے عطا کیے گئے ہوائی جہازوں کے ذریعہ بمباریوں پر تو یہ کا بھی کوئی اثر نہ پڑے گا۔ اور چاہے ہلاک ہونے والوں کو دفنانے کے لیے گورکن بھی نہ مل سکیں۔

شیعہ سنی، احمدی، غیر احمدی، احراری، مسلم لیگی، آریہ سماجی، سناتن دھرمی، ہندو، مسلمان، اکالی، کانگرسی، جن سنگھی، ہندو سبھائی، مراٹھی، گجراتی اور بہاری بنگالی کشیدگیاں بھی اگر بڑے سگان سیاست کی طینتیاں قرار نہ دی جائیں تو کیا ان کشیدگیوں کے کتوروں (پلوں) کی خوش فعلیاں قرار نہ دیا جانا چاہیے۔

لوہے کو لوہا کاٹتا ہے اور ہیرے کو ہیرا کاٹتا ہے۔ کے مصداق نہ صرف کتے کو کتا کاٹتا ہے بلکہ سگان سیاست بھی ایک دوسرے کو کاٹنے میں مصروف رہا کرتے ہیں۔ اور غور کے ساتھ دیکھا جائے تو نہ تو یہ کسی کے ہیں اور نہ کوئی ان کا ہے۔ اگر یہ کبھی ایک دوسرے کے ہمدرد ہوئے بھی تو صرف اغراض کے لیے۔ اور جب تک دنیا قائم ہے ڈاکٹر اقبال کے قول منہ دیدم کے سگے سر خم کردہ کے مطابق سگان اغراض کے ذہن اغراض و مفاد سے پاک نہیں ہو سکتے۔ اور یہ سلسلہ ہمیشہ ہی جاری رہے گا۔

☆☆☆

قومی تاریخ کا ایک فراموش شدہ ورق

پنجاب میں برطانیہ کے ایک وفا شعار خاندان کے ایک صاحب ڈاکٹر صاحب (دتا مل ڈھینگرہ تھے جو امرتسر کے رہنے والے تھے۔ان ڈاکٹر صاحب دتا مل ڈھینگرہ کے تین لڑکے تھے جن کے نام یہ ہیں:

۱۔مسٹر چمن لال ڈھینگرہ جو کئی برس تک ریاست پٹیالہ میں ہوم منسٹر رہے۔

۲۔ڈاکٹر بہاری لال ڈھینگرہ جو کئی برس تک ریاست جنید میں وزیر اعظم رہے۔

۳۔مسٹر مدن لال ڈھینگرہ جنہوں نے لندن میں سر کرزن وایلی کو قتل کیا اور جن کو پھانسی کی سزا ملی۔

مسٹر مدن لال ڈھینگرہ کے حالات یہ ہیں:

بہت برس ہوئے لندن میں انگریزوں کے ہاتھوں سے ہندوستان کو آزاد کرانے کی تحریک شروع ہوئی ۔ اس زمانہ میں مہاتما گاندھی کو کوئی خاص شہرت نصیب تھی نہ ہندوستان یا انگلستان کی پبلک عدم تشدد یا عدم تعاون سے واقف تھی۔لندن میں جاری ہو چکی اس تحریک میں انگریزوں کو ہلاک کرنا بھی شامل تھا۔اس تحریک کی لیڈر ایک پارسی خاتون میڈم کاما تھی جس کا ہیڈ کوارٹر فرانس میں تھا۔اس تحریک کی در پردہ طور پر مسٹر سارواکر بھی رہنمائی کرتے تھے جو لندن سے ہندوستان آتے ہوئے جہاز میں سے سمندر میں کود کر فرانس کے علاقہ میں چلے گئے۔فرانس کی گورنمنٹ نے ان کو گرفتار کر کے پھر برطانوی جہاز کے سپرد کر دیا۔یہ ہندوستان لائے گئے اور عمر قید کے لیے جیل بھیج دیے گئے۔اس تحریک سے ہمدردی رکھنے والا قریب قریب ہر وہ ہندوستانی طالب علم بھی تھا جو ہندوستان سے اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان میں مقیم تھا۔چنانچہ یہ واقعہ بہت ہی دلچسپ ہے کہ اس تحریک میں حصہ لینے یا اس تحریک سے ہمدردی رکھنے والوں میں دو طلبا بھی شامل تھے جن کے خاندانوں کے ممبروں کی زندگیاں ہی برٹش گورنمنٹ کی خدمات کے لیے وقف تھیں۔مثلاً مرحوم سر سکندر حیات خاں (وزیر اعظم پنجاب) اور مسٹر رفیق خاں (بخشی

ولی محمد خاں وزیر ریاست نابھ کے صاحبزادہ) جو ہندوستان پہنچتے ہی نابھ میں نظر بند کیے گئے اور بعد میں ریاست پٹیالہ میں ایک وزیر مقرر ہوئے۔ مسٹر رفیق محمد خاں راقم الحروف کے گہرے دوستوں میں سے تھے۔ اور یہ مضمون ان اطلاعات کی بنیادوں پر ہی لکھا جا رہا تھا جن کو رفیق محمد خاں صاحب نے راقم الحروف کو نابھ میں بتائے۔

ہندوستان کے طلبا کی انگریزوں کو ہندوستان کے تشدد کے ذریعہ نکالنے اور انقلاب پیدا کرنے کی اس تحریک کا جب برٹش گورنمنٹ اور گورنمنٹ ہند کو علم ہوا تو دونوں گورنمنٹوں کے مشورہ سے پالیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے ایک ریٹائرڈ افسر سر کرزن وایلی (یہ صاحب راجپوتانہ میں پولیٹیکل ایجنٹ رہ چکے تھے اور ریاست کوٹہ (راجپوتانہ) میں ان کے نام کی ان کی یاد میں ایک لائبریری بھی قائم ہے جسے بہت برس ہوئے راقم الحروف نے دیکھا تھا) کو ہندوستانی طلباء کا ایڈوائزر مقرر کیا گیا۔ ان سر کرزن وایلی کے عہدہ کا نام تو ایجوکیشنل ایڈوائزر تھا۔ مگر آپ کے ذمہ یہ کام تھا کہ آپ طلباء کی اس تحریک اور تحریک چلانے والے اور اس کے ممبروں کا پتہ چلائیں اور اس تحریک کو نیست و نابود کیا جائے چنانچہ سر کرزن وایلی کی درخواست اور مشورہ سے گورنمنٹ ہند نے اس زمانہ کے سی آئی ڈی کے ڈائریکٹر جنرل چارلس کلیولینڈ کے ذریع دہلی کے ایک نوجوان طالب علم جن کا نام لکھنا مناسب نہیں اور جو بعد میں دہی کے ایک بڑے پولیٹیکل لیڈر رہتے کو تین سو روپیہ ماہوار الاؤنس پر بیرسٹری کی تعلیم حاصل کرنے کے بہانے لندن بھیجا تا کہ یہ نوجوان لندن کے ہندوستانی طلبا سے رابطہ قائم کرے اور ان میں مل جائے اور حالات معلوم کر کے گورنمنٹ ہند کو اطلاعات دے۔ چنانچہ یہ نوجوان لندن میں بیرسٹری کی تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ انقلاب پسند طلباء کے خلاف رپورٹیں گورنمنٹ ہند کو بھیجتا رہا ...... اس کے رپورٹیں بھیجنے کا سلسلہ اس کے واپس آنے کے بعد بھی جاری رہا' اور اس کی رپورٹوں پر ہی مرحوم مولانا محمد علی گرفتار کر کے مہرولی بعد میں بیتول اور چھندواڑہ وغیرہ میں نظر بند کیے گئے۔

سر کرزن وایلی جب لندن میں ہندوستانی طلبا کی نگرانی پر مقرر ہوئے تو آپ

نے طلبا پر سختی شروع کی۔ ان پر پابندیاں عاید کیں اور طلبا کو تنگ کرنا شروع کیا۔ تا کہ یہ طلبا میڈم کاما یا مسٹر ساروا کر وغیرہ کے ساتھ کوئی تعلق نہ رکھیں۔ انقلاب پسند طلباء نے ان سختیوں اور نگرانی کو محسوس کا اور انھوں نے فیصلہ کیا کہ سر کرزن کو ہلاک کیا جائے۔ چنانچہ سر کرزن کو ہلاک کرنے کا کام مسٹر مدن لال ڈھینگرہ کے سپرد کر دیا گیا۔ ایک روز جبکہ سر کرزن وایلی چند طلبا کو اپنے ساتھ لیے ایک تھیٹر میں گئے (اس زمانہ میں سینما کا وجود نہ تھا۔ تفریح کے لیے صرف تھیٹر ہوتے تھے اور اول درجہ کی سیٹیں سٹیج کے قریب ہوا کرتیں...... سر کرزن تو پلی قطار میں سٹیج کے قریب صوفہ پر بیٹھے اور طلباء کو ان کے بالکل پیچھے ساتھ والی قطار میں سیٹیں دی گئیں۔ مدن لال ڈھینگرہ بالکل ہی سر کرزن وایلی کے پیچھے بیٹھے۔ چنانچہ تھیٹر میں جب کھیل شروع ہوا تو مدن لال ڈھینگرہ نے اپنی جیب سے پستول نکال کر سر کرزن کی پشت پر فائر کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سر کرزن وایلی فوراً ہی ہلاک ہو گئے۔ مدن لال کو پولیس نے گرفتار کیا۔ ان پر قتل کے الزام میں مقدمہ چلا اور اس نوجوان محب وطن کو پھانسی کی سزا دی گئی۔

یہ واقعہ تعجب انگیز اور شرمناک بھی ہے کہ مسٹر مدن لال ڈھینگرہ نے جب سر کرزن کو ہلاک کیا تو ہندوستان کی اکثر سا سائٹیوں اور سبھاؤں نے معہ ڈاکٹر صاحب دتہ مل ڈھینگرہ اور اس فعل کی مذمت کی' اور مدن لال ڈھینگرہ کے خلاف ملامت کے ریزولوشن پاس کے گئے اور بیانات دیے گئے۔

سر سکندر حیات کے متعلق پوزیشن یہ تھی کہ انڈیا آف لندن نے جب گورنمنٹ ہند اور پنجاب گورنمنٹ کو تحریک میں شامل شدہ طلبا کی فہرست بھیجی تو اس فہرست میں سکندر حیات کا نام بھی شامل تھا۔ سکندر حیات کا خاندان برطانیہ کی وفا شعاری کے لیے تمام پنجاب میں اہمیت رکھتا تھا۔ پنجاب کے لیفٹیننٹ گورنر نے سکندر حیات کے والد کو بتا کر بلایا کہ ان کا بیٹا اس تحریک میں شامل ہے۔ یہ سن کر باپ نے اپنے بیٹے کو لندن تار بھیجا کہ فوراً ہندوستان چلے آئیں۔ سکندر حیات اس تار کے ملنے کے بعد

ہندوستان واپس آئے۔ بمبئی میں ان کے سامان کی تلاشی لی گئی تو اس سامان میں ایسی کئی کتابیں تھیں جن کے مصنف انقلاب پسند تھے۔ سکندر حیات اپنے گاؤں پہنچے باپ نے ملامت کی۔ کچھ عرصہ بیکار رہے تو بعد میں آپ کے نائب تحصیلداری کے امیدوار ہوئے۔ اس کے بعد آپ کے خیالات قطعی طور پر بدل گئے اور آپ کا جب انتقال ہوا تو آپ سر سکندر حیات وزیر اعلیٰ پنجاب تھے۔

رفیق محمد خاں کے متعلق یہ حالات تھے کہ آپ کے والد بخش ولی محمد خاں نے بھی اپنے بیٹے کو تار دے کر واپس ہندوستان بلا لیا۔ بمبئی میں ان کی بھی تلاشی لی گئی تو ان کے اسباب میں بھی سیاسی اور انقلاب پسند سے تعلق رکھنے والا لٹریچر ملا۔ بمبئی سے آپ نابھ پہنچے تو یہ اپنے مکان میں نظر بند کیے گئے کئی برس تک یہ اپنے مکان میں نظر بند رہے۔ اور گھر سے باہر بازار میں بھی نہ جا سکتے تھے۔ راقم الحروف نے ان کو ان کے مکان ہی میں ملا کرتا۔ بعد میں ان کو شہر کے دوسرے حصوں میں جانے کی اجازت مل گئی مگر شہر سے باہر نہ جا سکتے تھے۔ نابھ اور پٹیالہ کے جھگڑے کے زمانہ میں یہ پٹیالہ چلے گئے۔ اور وہاں زیر تعلیم مقرر ہوئے۔ کئی برس پٹیالہ میں وزیر رہے اور ایک روز جب کہ آپ نارنول (جو اس زمانہ میں پٹیالہ کے علاقہ میں تھا) دورہ پر گئے تو آپ کا انتقال ہو گیا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ آپ کو زہر دیا گیا اور بعض یہ یقین کرتے ہیں کہ آپ دل کے دورہ میں مبتلا تھے۔ اور موت کی وجہ دل کا بند ہونا تھا۔

حضرت مسیح نے کہا ہے کہ "فتح و کامیابی ان کے ہاتھوں میں ہوگی جو میدان میں آخری وقت تک موجود رہیں گے" ہندوستان میں ہزارہا لوگ سیاسی میدان میں آئے اور ان میں سے سر سکندر حیات اور مسٹر رفیق محمد خاں کی طرح ہزارہا ہی اس میدان میں نکل گئے اور بقول ابن مریم کامیابی تو مدتا لال ڈھینگرہ جیسے لوگوں کی قسمت میں ہی لکھی ہے: جو اپنی زندگی کے آخری لمحوں تک اپنے شعار پر قائم رہے اور یہی لوگ ہیں جن پر آئندہ نسلیں فخر کریں گی۔

☆☆☆

دہی یا آب حیات

۱۹۰۴ء میں ضلع فیروز پور میں انگریز کرنل ریڈی سول سرجن تھے۔ یہ اس زمانہ مین اپنے سول سرجن کے فرائض ادا کرنے کے علاوہ پرائیویٹ طور پر جراثیم کے متعلق بھی تحقیقات کرتے رہتے۔ حالانہ آج سے پچاس ساٹھ سال پہلے نہ تو جراثیم کے متعلق تحقیقات کا کسی ڈاکٹر کو شوق تھا اور نہ جراثیم کش ادویات مثلاً ڈی ڈی ٹ پر الپٹو مائسین وغیرہ ایجاد ہوئی تھیں۔ چنانچہ کرنل ریڈی جراثیم کے متعلق تحقیقات کے شوق کے باعث ہی بعد میں تمام ہندوستن کے چیف ملیریا میڈیکل آفیسر مقرر کیے گئے تا کہ آپ ہندوستان میں سے مچھروں کے ذریعے پیدا ہونے والے ملیریا کے جراثیم کو کم یا ان کو بالکل ختم کرسکیں۔ اور آپ نے ہندوستان میں سے ملیریا کو ختم کرنے کی کوششیں تمام صوبہ جات میں سرکاری طور پر جاری کیں۔

کرنل ریڈی جب فیروز پور میں سول سرجن تھے تو آپ کو معلوم ہوا کہ حکیم اور وید پیچش کا علاج دہی اور چاول بتاتے ہیں۔ اور اس خوراک سے مریض اچھے ہو جاتے ہیں دہی اور چاولوں سے پیچش کے مریضوں کا اچھا ہونا آپ کے لیے تعجب کا باعث تھا کیونکہ دہی کھانے کا یورپ اور امریکہ میں رواج نہیں اور ایلوپیتھی کی کتابوں میں دہی کا کہیں نام ونشان نہیں نظر آتا۔ چنانچہ اس دہی اور چاولوں کے مسئلہ پر آپ کئی روز سوچتے رہے۔ آپ نے اس طریقہ علاج کی خود تحقیقات کرنے کے لیے پیش کے جراثیم کو شیشے کی پلیٹ میں پھیلا کر خوردبین کے نیچے رکھا۔ اور ان جراثیم پر دہی کی لسی کا ایک قطرہ ڈال دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پیچش کے جراثیم فوراً ہی تمام کے تمام ہلاک ہ گئے۔ اور چاولوں کے متعلق آپ اس نتیجہ پر پہنچے کہ چونکہ چاولوں میں سٹارچ ہے اور یہ سٹارچ انتڑیوں کے زخموں (جو پیچش کے باعث انتڑیوں میں پیدا ہو جاتے ہیں) کو لبری کیٹ کر کے مندمل کرنے کا باعث ہوتا ہے۔ ان دونوں یعنی دہی اور چاولوں کا مرکب پیچش کے لیے مفید ہے۔ چنانچہ آپ نے اپنی اس نئی دریافت کے متعلق رسائل

میڈیکل میں ایک مضمون لکھا جس کا نتیجہ یہ یہ کہ اب ہسپتالوں مں بھی ڈاکٹر پیچش کے مریضوں کو دہی چاول کھانے کی تلقین کرتے ہیں۔

آٹھ یا دس برس کا عرصہ ہوا ہے کہ ایک اخبار نویس نے ٹرکی کے ایک معمر ترین شخص (جس کی عمر ایک سو پچیس برس کی تھی) سے انٹرویو کیا۔ اس انٹرویو میں پوچھا گیا کہ س کی عمر کی طوالت کا باعث کیا ہے تو اس نے جواب دیا تھا کہ یہ ہر روز صبح و شام دونوں وقت پنیر اور دہی کھاتا ہے۔ یہ اپنی تمام زندگی دہی پنیر اور دہ کی لسی استعمال کرتا رہا ہے۔ اس انٹرویو میں اس معمر شخص نے یہ بھی بتایا کہ اس کے بیٹے بیٹیوں پوتے پوتیوں اور نواسے نوسیوں کی اور ان کی اولاد کی تعداد سینکڑوں میں ہے۔

''ریاست'' کے جاری ہونے کے ایک برس بعد میری والدہ بھی دہلی آ گئیں۔ ان کو دہلی آئے ایک ماہ کا عرصہ ہوا تاھ کہ رات کو انہیں چکر آنے شروع ہوئے اور یہ ایسا محسوس کرتیں کہ کوئی ان کو چارپائی سے گرا رہا ہے۔ صبح کو والدہ نے رات کی یہ کیفیت بیان کی کہ میں تو بےحد متفکر ہوا کہ چارپائی سے گرانے والا کون ہوسکتا ہے؟ میں ضعیف الاعتقاد نہیں ہوں مگر پھر بھی میں نے ایک پڑوسی کو بلا کر پوچھا کہ کیا اس مکان میں رہنے والے پہلے کرایہ داروں نے کبھی اس مکان میں بھوت یا جن ہونے کی شکایت تو نہیں کی تھی؟ اس پڑوسی نے کسی ایسی شکایت سے انکار کیا۔ اس کے بعد میں نے اپنے ایک دوست ڈاکٹر محمد عمر (یہ ڈاکٹر صاحب پنشنر تھے۔ عمر بھر فوج میں بطور ڈاکٹر ملازمت کرتے رہے اور خواجہ حسن نظمی کے بھی گہرے دوستوں میں سے تھے) کو بلوایا۔ انہوں نے والدہ کو دیھکا تو دل کی کمزوری اور دماغی ضعف بتایا۔ چنانچہ انہوں نے مقوی دل و دماغ دوائی دی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چکروں میں بہت اضافہ ہو گیا کیونکہ غلط تشخیص تھی اور غلط دوائی دی گئی۔ میں بہت پریشان تھا ایک روز ملنے کے لیے ڈاکٹر نورنگ سنگھا آ گئے۔ یہ ڈاکٹر اس زمانہ میں دھرم کوٹ (ضلع فیروزپور) میں پلیگ ڈیوٹی پر متعین تھے۔ جس زمانہ میں وہاں کے ہسپتال میں کمپوڈر تھا طویل عرصہ گزرنے کے

بعد بھی میں نے دہلی میں اخبار جاری کیا اور یہ ڈاکٹر صاحب کئی اضلاع میں تبدیل ہونے کے بعد دہلی کے ایک ہسپتال میں آگئے تھے اور کبھی کبھی ملنے تشریف لایا کرتے تھے۔
ان ڈاکٹر صاحب سے میں نے والدہ کی بیماری کا ذکر کیا۔ اور آپ نے والدہ کو دیکھا تو بتایا کہ یورک ایسڈ کی خون میں زیادتی ہے۔ جس کے باعث چکر آتے ہیں۔ آپ نے کرشچن سالٹ (کرشچن سالٹ خون یا جوڑوں میں سے یورک ایسڈ کو نکالنے کے اعتبار سے ایک بہترین دوائی ہے۔) تجویز کیا۔ چنانچہ میں نے بازار سے کرشچن سالٹ کی ایک شیشی منگوائی اس کا ایک چمچہ گرم پانی میں حل کر کے دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دو گھنٹہ بعد دست آئے اور دستوں کے آنے کے بعد چکروں کا بالکل ہی خاتمہ ہو گیا۔ والدہ اچھی ہونے کے بعد اپنے وطن حافظ آباد (ضلع گوجرانوالہ) چلی گئیں، جہاں ان کی صحت بالکل اچھی رہتی۔ اس کے بعد جب دہلی میں آتیں تو چکر شروع ہو جاتے اور دہلی میں ان چکروں سے اس وقت نجات ہوتی جب کرشچن سالٹ دیا جاتا۔ چنانچہ یہ بات بہت دلچسپ ہے کہ یہ جب دہلی آتیں تو چکر شروع ہو جاتے۔ اور جب حافظ آباد جاتیں تو ان کی صحت بالکل اچھی رہتی۔ اس کے بعد میں نے تین چار ڈاکٹروں کو ایک ہی وقت میں بلا کر والدہ کو دکھایا تاکہ دہلی میں چکر آنے اور حافظ آباد میں صحت کے اچھے رہنے کا سبب معلوم کیا جا سکے تو ڈاکٹر اس نتیجہ پر پہنچے کہ چونکہ والدہ حافظ آباد میں دن میں کئی بار لسی پیتی ہیں۔ لسی یورک ایسڈ کو جسم سے خارج کرنے کے اعتبار سے بہترین شے ہے۔ حافظ آباد میں لسی پینے کے باعث خون سے یورک ایسڈ خارج ہوتا رہتا ہے۔ اس لیے وہاں چکر نہیں آتے۔ اور دہلی میں چونکہ لسی نہیں پی جاتی اس لیے یورک ایسڈ جسم سے خارج نہیں ہوتا۔ اور یہاں چکر آتے ہیں۔ یعنی یورک ایسڈ کو جسم میں سے خارج کرنے کے اعتبار سے دہی کی لسی انتہائی مفید ہے۔

یورک ایسڈ کی پوزیشن یہ ہے کہ یہ اڑد کی دال آلو اور گوشت وغیرہ میں کافی مقدار میں پایا جاتا ہے۔ گائے اور سور کے گوشت میں تو یہ بہت زیادہ ہوتا ہے۔ سبزیوں میں

یا تو بالکل نہیں ہوتا اور یا بہت کم ہوتا ہے۔ دودھ اور مکھن اور گھی میں بالکل نہیں ہوتا۔ اس یورک ایسڈ کے خون میں داخل ہونے کے باعث انسان سستی اور مستعدی سے محروم ہو جاتا ہے اور اگر یہ زیادہ عرصہ تک خون میں شامل رہے تو پھر یہ پہلے چھوٹے جوڑوں میں اور بعد میں بڑے جوڑوں میں داخل ہو کر نقرس (گوٹ) اور آرتھرائٹیس پیدا کرتا ہے۔ پنجاب میں رہنے والے لوگوں کے چست' محنتی اور مستعد ہونے کی وجہ صرف یہ ہے کہ یہ دہی اور لسی کا استعمال کرتے ہیں۔

چونکہ دہی خون میں سے یورک ایسڈ نکالنے کا بہترین ذریعہ ہے اس لیے پنجاب کے لوگ سست اور کاہل نہیں ہوتے۔ دوسرے صوبہ جات کے لوگوں کے کم ہمت ہونے کام چور اور سست ہونے کی صرف یہ وجہ ہے کہ وہ دہی یا لسی کا استعمال نہیں کرتے۔ یورک ایسڈ کے متعلق ایک بات اور یاد رکھنے کے قابل ہے کہ وہ یہ کہ اگر کھٹا دہی استعمال کیا جائے تو وہ یورک ایسڈ کو خون میں سے نکال دے گ۔ مگر دہی کے کھٹا ہونے کے باعث اس میں لیک ٹک ایسڈ پیدا ہوتا ہے جو خود جوڑوں میں درد پیدا کرتا ہے۔ اس لیے دہی صرف اس صورت میں استعمال کرنا چاہیے کہ جب کہ اس میں کھٹائی پیدا نہ ہو بلکہ یہ زیادہ جمی ہوئی نہ ہو اور پتلی ہو جسے میٹھی دہی کہا جاتا ہے۔

میں نے جب دہلی سے خواجہ حسن نظامی مرحوم کی معیت میں روزانہ اخبار ''رعیت'' جاری کا تو اس زمانہ میں دہلی کے تمام شہر میں صرف ایک دکان ایسی تھی۔ جہاں دہی مل سکتی تھی۔ (دہی کو بعد علاقوں میں تذکر میں بولتے ہیں اور بعض علاقوں میں تانیث میں) اور یہ کمبخت حلوائی بھی دہی کو ایک مٹکے میں جماتا ہے اور مٹکے میں سے یہ گلاس کے ذریعے فروخت کرت ہے۔ اس کے بعد پنجاب کے ٹھیکیداران کا سٹاف اور مزدور وغیرہ بہت بڑی تعداد میں نئی دہلی کی عمارتوں کی تعمیر کے سلسلہ میں جب دہلی آ گئے تو دہلی میں دہی اور لسی کی کئی دکانیں جاری ہو گئیں۔ اس کے بعد ۱۹۴۷ء میں جب دہلی میں لاکھوں کی تعداد میں پنجابی پہنچے تو ان کے ساتھ پنجاب سے دہی اور لسی فروخت

کرنے والے حلوائی بھی کافی تعداد میں آ گئے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب دہلی میں کوئی بازار یا محلّہ ایسا نہیں جہاں دہی اور لسی فروخت کرنے والے حلوائی نہ ملتے ہوں۔ کیونکہ ایک پنجابی کھانے کے بغیر تو زندہ رہ سکتا ہے مگر اس کے لیے دہی اور لسی کے بغیر زندہ رہنا ممکن نہیں، اور دہلی کے اصلی باشندے اس سے قطعی محروم تھے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں ایک واقعہ بہت دلچسپ ہے جو مجھ سے مرحوم مسٹر رام رچھپال سنگھ صاحب کے شیدا صاحبزادہ مسٹر رام سروپ نے بتایا۔ مسٹر رام سروپ اور ان کے ایک دوست ۱۹۴۷ء میں ایک پنجابی حلوائی کی نئی دکان پر لسی پینے گئے۔ اس کے ساتھ والی دکان ایک دہلی کے بنیے کی تھی۔ رام سروپ صاحب اور ان کے دوست لسی پینے گئے تو انہوں نے حلوائی سے کہا کہ ڈیڑھ ڈیڑھ پاؤ دہی کی دو جگہ لسی بنا دو حلوائی نے ڈیڑھ ڈیڑھ پاؤ کی دو جگہ لسی بنائی اور اسے تین پاؤ کے لمبے گلاس میں بھر دیا۔ تو ان گاہکوں نے اسے پیا۔ یہ واقعہ پڑوس کی دکان والا بنیا معہ اپنے ایک بنیے ساتھی کے دیکھ رہا تھا۔ اس نے لسی کے گلاسوں کو پیتے ہوئے دیکھ کر اپنے ساتھ بنیے سے کہا۔ یہ پنجابی انسان ہیں یا حیوان۔ کھڑے کھڑے سیر بھر کا لسی کا گلاس پی گئے۔ یہ کیفیت تو دہلی میں ۱۹۴۷ء سے پہلے کی تھی۔ اور اب حالت یہ ہے کہ دہلی کا کوئی بازار یا محلّہ ایسا نہیں جہاں صبح پانچ چھ بجے سے رات کے نو دس بجے تک دہی اور لسی فروخت نہ ہو رہی ہو۔ اور شاید ہی کوئی ایسا بدنصیب پنجابی ہو گا جو ہر روز دہی اور لسی نہ پیتا ہو۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ محنت چستی، پھرتیلا پن اور مستعدی میں ہندوستان کے کسی دوسرے صوبہ کے لوگ پنجابیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ پنجاب کی اس دہی اور لسی کی کیفیت کے ساتھ یہ واقعہ بھی دلچسپ ہے کہ ایران اور افغانستان میں گو دہی اور لسی کا رواج نہیں مگر وہاں کا ہر شخص ہر روز ہی پنیر کھاتا ہے چونکہ پنیر بھی دہی ہی سے تیار ہوتا ہے اس لیے ان ممالک کے لوگوں کی صحت قابلِ رشک ہے۔

تبادلہ آبادی کے بعد تو حالات بدل گئے مگر اس سے پہلے پنجاب کے ہر شہر قصبہ اور

گاؤں کی کیفیت یہ تھی کہ اکثر لوگوں کے گھروں میں گائے اور بھینس وغیرہ دودھ دینے والے جانور ہوتے تھے۔اور ہر گھر میں دن بھر دہی اور لسی موجود رہتی تھی۔اور جن کے ہاں جانور نہ ہوتے تھے وہ پڑوسیوں کے ہاں سے بے تکلف طور پر دہی اور لسی لے آتے۔اور جانوروں والے گھر میں لوگ خوشی اور مسرت کے ساتھ پڑوسیوں کو دہی اور لسی دیتے۔مگر جب بھی کوئی پڑوسی کسی کو لسی دیتا۔تو اس میں تھوڑا سا مکھن ضرور ڈال دیا جاتا۔بغیر مکھن ڈالے خالی لسی دینا کمینہ پن سمجھا جاتا تھا۔اور بغیر مکھن کے لسی کو رنڈی لسی (یعنی بیوہ لسی) قرار دیا جاتا تھا۔دہی اور لسی کا یہ دور سال کے ہر موسم میں ہر ماہ اور ہر روز جاری رہتا۔جو لسی رات کو بچ جاتی وہ جانوروں کو پلا دی جاتی۔جس کے باعث نہ صرف انسان بلکہ دودھ دینے والے جانور بھی صحت مند ہوتے۔

راقم الحروف کی صحت ہمیشہ اچھی رہی۔اور اب بھی میرے ہم عمر دوست میری صحت کو قابل رشک قرار دیتے ہیں۔جس کی وجہ یہ ہے کہ میں کھانا بہت کم کھاتا ہوں زیادہ کھانا صحت کے اعتبار سے گناہ سمجھتا ہوں۔میں دوپہر کو تو صرف دو یا تین انڈے اور دو ٹوسٹ کھاتا ہوں اور رات کو کھانے کے ساتھ لازمی طور پر نصف سیر دہی یا اس کی لسی پی جاتا ہوں۔جس کا نتیجہ یہ ہے کہ میں چوبیس گھنٹے میں سے اٹھارہ گھنٹے کام کرتے ہوئے بھی تھکاوٹ محسوس نہیں کرتا۔اور میری رائے میں جو لوگ صحت کے ساتھ طول عمر چاہتے ہوں۔وہ لازمی طور پر ہر روز زیادہ سے زیادہ دہی کھائیں اور لسی پئیں۔دہی اور لسی ہر موسم میں مفید ہے (بعض بیوقوف لوگ دہی اور لسی کا برسات کے موسم میں پینا نقصان دہ سمجھتے ہیں جس کی وجہ صرف یہ ہے کہ برسات میں زیادہ جاگ لگانے کے باعث دہی کھٹی ہو جاتی ہے۔اور دہی کی یہ کھٹائی یعنی لیک ٹک ایسڈ جوڑوں میں تکلیف دیتا ہے)بشرطیکہ یہ کھٹی نہ ہو یا دوسرے الفاظ میں یہ پتلی اور "نیم پختہ" ہو اور میں تو صحت کے لیے اسے آبِ حیات ہی قرار دیتا ہوں۔

☆☆☆

خرسواری اور خر برداری

بہت برس ہوئے انگریزوں کے زمانہ میں انڈین سول سروس کے ایک ممبر سر جیمس فٹز پیٹرک پولیٹکل ڈیپارٹمنٹ سے ملحق تھے۔ یہ پہلے سنٹرل انڈیا کی ریاستوں میں پولیٹکل ایجنٹ رہے۔ ان کے مرحوم خان بہادر قاضی سر عزیز الدین احمد وزیر اعظم دیتا کے ساتھ گہرے دوستانہ تعلقات تھے اس زمانہ میں ریاست بہاول پور اور گورنمنٹ ہند کے درمیان ایک معاہدہ جس کے مطابق گورنمنٹ آف انڈیا اپنے افسروں میں سے تین نام پیش کرتی اور ان تینمیں سے نواب بہاول پور ایک افسر بطور فنانس منسٹر منتخب کر لیتے۔ اور تین اصحاب کے نام نواب بہاول پور پیش کرتے۔ ان تینوں میں سے ایک شخص بطور وزیر اعظم بہاول پور پولیٹکل ڈیپارٹمنٹ منتخب کر لیتا کیونکہ ریاست بہاول پور نہروں کے سلسلہ میں گورنمنٹ ہند کی دس کروڑ روپیہ کی مقروض تھی۔

گورنمنٹ ہند کے پولیٹکل ڈیپارٹمنٹ نے بہاول پور کے فنانس منسٹر کے عہدہ کے لیے تین نام پیش کیے۔ ان تین میں سے ایک نام سر جیمس فٹز پیٹرک کا تھا۔ یہ نام جب نواب صاحب کے پاس پہنچے تو خیال ہوا کہ سر جیمس فٹز پیٹرک کو منتخب کر لیں۔ اور قاضی سر عزیز الدین کی معرفت سر جیمس سے بات چیت کی جائے تاکہ ی بعد میں نواب صاحب کے ساتھ تعاون کی سپرٹ قائم رکھیں۔ نواب صاحب کو یہ علم تھا کہ راقم الحروف کے اور قاضی صاحب کے گہرے دوستانہ تعلقات ہیں۔ نواب صاحب نے اپنے فارن منسٹر میجر مولوی شمس الدین اور ایک دوسرے صاحب کو میرے پاس بھیجا تاکہ میں ان کا قاضی صاحب سے تعارف کرا دوں اور ان کو تمام حالات سمجھا دیے جائیں۔ میں میجر صاحب اور ان کے ہمراہی کو ساتھ لے کر دیتا گیا۔ اور ان کا تعارف کرا کر اسی روز واپس آ گیا۔ قاضی صاحب تمام حالات سننے کے بعد تو گاؤں (سنٹرل انڈیا' جہاں سر جیمس پولیٹکل ایجنٹ تھے) گئے آپ نے سر جیمس سے تمام

حالات بیان کیے تو سر جیمس نے باتوں میں پوچھا کہ نواب صاحب بہاولپور نے کیونکر ان کے پاس آدمی بھیجے؟ تو قاضی صاحب نے بتایا کہ دیوان سنگھ اور نواب صاحب کے تعلقات ہیں اور دیوان صاحب میرا (یعنی قاضی صاحب) کا دوست ہے۔ ان تعلقات کے باعث بہاولپور کے دونوں وزراء ان کے پاس دیتا آئے ہیں۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میرا سر جیمس فٹز پیٹرک سے تعارف ہوا۔ گو وہ اس سے پہلے مجھے بطور ایڈیٹر ریاست جانتے تھے۔ مگر نہ تو میں کبھی ان سے ملا اور نہ ان کو یہ علم تھا کہ میرے قاضی صاحب سے مراسم ہیں۔

سر جیمس فٹز پیٹرک بہاول پور میں فنانس منسٹر مقرر ہو گئے۔ ان کی تقرری کے چند ماہ بعد چیمبر آف پرنس کے اجلاس کے سلسلہ میں سر جیمس اور قاضی صاحب دونوں دہلی آئے۔ یہ دونوں ایک ہفتہ کے قریب دہلی میں مقیم رہے اور دونوں کا سیل ہوٹل میں قیام تھا۔ قاضی صاحب جب کبھی دہلی جاتے تو میں صبح پانچ بجے اور شام کو چار بجے ان کو ملنے ضرور جاتا۔ اور شام کو یہ میری کار میں سیر کے لیے بھی اکثر جاتے۔

یہ سلسلہ ہر روز جاری رہتا جتنے دن بھی قاجی صاحب دہلی میں رہتے۔ ان دنوں ایک روز میں شام کو قاضی صاحب سے ملنے گیا تو قاضی صاحب کے کمرے میں سر جیمس بیٹھے تھے۔ میں نے جب قاضی صاحب کو اپنے آنے کی اطلاع کرائی تو آپ نے مجھے بھی اندر ہی بلا لیا اور میرا سر جیمس سے تعارف کرایا۔ سر جیمس نے رسمی طور پر خندہ پیشانی سے ہاتھ ملایا۔ اور کہا کہ میرے ملنے سے ان کو بہت خوشی ہوئی۔ تھوڑی دیر تک ہم تینوں بیٹھے رہے اور اس کے بعد سر جیمس اپنے کمرے میں چلے گئے سر جیمس نے جاتے ہوئے مجھ سے کہا کہ میں اگر کبھی بہاول پور آؤں تت آپ سے ضرور ملوں۔ میں نے وعدہ کر لیا مگر واقعہ یہ ہے کہ ان کی بہاول پور کی ملازمت کے زمانہ میں مجھے ایک بار بہاول پور جانے کا اتفاق ہوا مگر میں سر جیمس سے نہ مل سکا۔

اس واقعہ کے غالباً دو برس بعد سر جیمس فٹز پیٹرک ریاست ہائے پنجاب کے ایجنٹ

گورنر مقرر ہوئے۔ ان کا ہیڈ کوارٹر لاہور میں تھا۔ وہاں ان کی رہائش اور ان کا دفتر میاں میر والی نہر کے پاس کئی ایکڑ زمین پر تھا۔ کیونکہ ان کی پوزیشن ایک گورنر کے برابر تھی، جن کے ماتحت پنجاب اور سندھ کی تیرہ ریاستوں کے نواب اور مہاراجے تھے۔ اور یہ جو چاہتے ان ریاستوں میں کراتے تھے۔

ان کے ایجنٹ گورنر جنرل ریاست ہائے پنجاب مقرر ہونے کے بعد ان سے پھر ایک بار قاضی صاحب کے ساتھ ہی دہلی میں ملنے کا اتفاق ہوا۔ جب کہ آپ علی پور روڈ کے نابھ ہاؤس میں مع اپنی بیوی یعنی لیڈی فٹز پیٹرک کے مقیم تھے، اور چیمبر آف پرنس کے اجلاس کے سلسلہ میں آئے ہوئے تھے۔ اس موقع پر میں ان سے ملا تو انہوں نے شکایت کی کہ میں بہاول پور گیا اور ان سے نہ ملا انہوں نے تاکید کی کہ میں آئندہ جب کبھی لاہور جاؤں تو ان سے ضرور ملوں۔ لیڈی فٹز پیٹرک سے جب تعارف ہوا اور باتیں ہوئیں تو ملوم ہوا کہ یہ خاتون جو غیر معمولی طور پر رحمدل اور نیک ہیں ان کے ہاں کوئی اولاد نہیں۔ یہ کتوں بلیوں اور دوسرے جانوروں سے محبت کرتی ہیں۔ انہوں نے طوطے بھی پال رکھے ہیں۔ یہ سری کرشن کی پرستار ہیں۔ اور گیتا کے ترجمے پڑھا کرتی ہیں۔ چنانچہ اس ملاقات میں لیڈی فٹز پیٹرک نے بھی تاکید کی کہ میں جب بھی لاہور آؤں تو ان سے ضرور ملوں

تبادلہ آزادی سے پہلے میں ہر ماہ ایک روز کے لیے لاہور جایا کرتا تھا۔ تا کہ دوستوں سے ملاقات ہو جائے اور کسی بڑی فرم سے اشتہار کا کانٹریکٹ بھی کر لیا جائے۔ میں وہاں برگنزہ ہوٹل میں قیام کرتا، جو ریلوے سٹیشن کے قریب ہے۔ میں ایک روز لاہور گیا تو دس بجے کے قریب مین نے سر جیمس کو فون کیا کہ میں کب مل سکتا ہوں؟ انہوں نے جواب دیا کہ جب بھی چاہو آ جاؤ۔ میں نے کہا ابھی آتا ہوں تو انہوں نے کہا بہت اچھا۔ میں نے سٹیشن سے ٹیکسی منگوائی اور ایجنٹ گورنر جنرل کی کوٹھی پہنچا جو بہت شاندار اور بارعب عمارت تھی۔ بڑے دروازہ کے قریب ہی سیکرٹری کا دفتر

تھا۔ ایجنٹ گورنر جنرل کا سیکرٹری بھی انڈین سول سروس کا ایک جونیئر ممبر ہوا کرتا۔ میں نے اس سیکرٹری کو اپنا وزیٹنگ کارڈ بھیجا تو اس نے مجھے اپنے کمرہ میں بلا لیا اور اس کے درمیان یہ بات چیت ہوئی۔

سیکرٹری: آپ کیا چاہتے ہیں؟

میں: میں سر جیمس فٹز پیٹرک سے ملنا چاہتا ہوں۔

سیکرٹری: کیا آپ کے پاس ملاقات کی منظوری کا کوئی خط پہنچا ہے؟

میں: نہیں میں نے نہ تو کوئی خط لکھا اور نہ منظوری کا کوئی جواب میرے پاس پہنچا۔

سیکرٹری: بغیر منظوری کے آپ ایجنٹ گورنر جنرل سے ملاقات نہیں کر سکتے۔ آپ ملاقات کے لیے درخوست بھیجیے۔ اگر ملاقات کی منظوری آپ کے پاس پہنچے تو پھر ملاقات کے لیے آیئے۔

میں: میں نے سر جیمس کو ٹیلی فون کیا تھا' اور انہوں نے ٹیلیفون پر مجھے کہا کہ میں ان سے مل جاؤں۔

میرا یہ جواب سن کر سیکرٹری نے مشتبہ نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ گویا کہ میں اسے دھوکہ دے رہا ہوں' اور جھوٹ بول رہا ہوں۔ کیونکہ ملاقاتیں عام طور پر درخواست کے آنے پر منظور یا نامنظور کی جاتی ہیں۔ اس نے کچھ پس وپیش کرتے ہوئے سر جیمس کے کمرے میں ٹیلی فون کیا اور کہا کہ ایک شخص دیوان سنگھ ایڈیٹر ''ریاست'' آیا ہے اور وہ کہتا ہے کہ آپ نے ٹیلی فون پر اسے ملاقات کی منظوری دی ہے۔ سر جیمس نے جواب دیا ہاں میں ملوں گا۔ چوبدار کے ساتھ ان کو میرے کمرے میں بھیج دو۔ میں چوبدار کے ساتھ سر جیمس کے مرے میں گیا جو کچھ فاصلہ پر بڑی بلڈنگ میں تھا۔ میں کمرہ کے اندر گیا تو سر جیمس بڑے تپاک اور بے تکلفی سے ملے۔ لیڈی فٹز پیٹرک بھی وہاں بیٹھی تھیں۔ لیڈی فٹز پیٹرک نے پوچھا کہ آپ کی فیملی (کتے بلیاں اور طوطوں

) کا کیا حال ہے؟ میرا یہ بے تکلف سوال سن کر میاں بیوی دونوں ہنس پڑے۔ نصف گھنٹہ کے قریب میری ان سے باتیں ہوئیں' اور باتیں یہی والیان ریاست کے مظالم اور قاضی صاحب وغیرہ کی خیر خیریت۔ نصف گھنٹہ کے بعد میں واپس آ گیا۔ اور اس کے بعد میں جب کبھی لاہور جاتا تو ٹیلیفون کر کے سر جیمس سے اکثر ملتا' اور سر جیمس بھی میرے بہت بے تکلف دوست بن گئے۔

ان ملاقاتوں کے عرصہ بعد میں لاہور آ گیا۔ ان سے ملا تو میں نے دیکھا کہ وہ چند روز کے بعد ریٹائر ہو کر لندن جانے والے ہیں اور ان کے ملازم ان کا سامان بکسوں میں بند کر رہے ہیں۔ میں اس سامان کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ یہ سامان بڑے بڑے لکڑی کے بکسوں میں بھرا جا رہا تھا۔ اور سامان میں بڑے بڑے غالیچے بھی تھے جو والیان ریاست نے ان کو بطور تحفے دیے۔ میں ان سے ملا اور باتیں ہوئیں تو میں نے افسوس کا اظہار کیا۔ کہ وہ ہندوستان سے جا رہے ہیں اور اب شاید ان سے ملاقات بھی نہ ہو۔ میرے اس اظہار افسوس پر آپ نے بتایا کہ مہاراجی بیکانیر نے ان کو بطور وزیر اعظم بیکانیر پانچ ہزار روپیہ ماہوار پر رکھنا چاہا مگر آپ نے انکار کر دیا۔ جب میں نے ان سے یہ سنا کہ آپ نے بیکانیر کے وزیر اعظم کے عہدہ سے انکار کر دیا ہے تو میں نے کہا کہ آپ کی غلطی ہے اب آپ چار ہزار روپیہ ماہوار تنخواہ پاتے ہیں کیا حرج تھا آپ پانچ ہزار ماہوار بیکانیر چلے جاتے۔ میرے اس کہنے پر آپ نے جو جواب دیا وہ مجھے اچھی طرح یاد ہے آپ نے فرمایا:

''سردار دیوان سنگھ میں نے اپنی ملازمت کا تمام حصہ گدھوں (والیان ریاست) کو ہانکتے اور ان کی سواری کرتے گزار دیا۔ اب میرے لیے یہ کیسے ممکن ہے کہ میں ایک گدھے کو اٹھاتا پھروں اور یہ گدھا میری سواری کرے مجھ سے یہ نہ ہو سکے گا''۔

پولیٹکل ڈیپارٹمنٹ کے انگریز افسر گو بدچلن اور ظالم والیان ریاست کی ان کے وفا شعار ہونے کے باعث امداد کرتے تھے۔ مگر وہ فی الحقیقت والیان ریاست کو گدھا

سمجھتے ہوئے اپنے دل سے نفرت کرتے تھے۔ اور اب جب کبھی میں سنتا ہوں کہ انڈین سول سروس کا فلاں لائق اور تجربہ کار افسر فلاں صوبہ میں بطور سیکرٹری یا چیف سیکرٹری مقرر کیا گیا ہے تو مجھے سر جیمس فٹز پیٹرک یاد آ جاتے ہیں۔ یہ واقعہ اور ان کا جواب یاد آ جاتے ہین۔ کیونکہ صوبہ جات کے وزراء کی تو عام طور پر حالت یہ ہے کہ ان میں سے نوے فی صد نالائق کرپٹ ان پڑھ اور خود غرض ہین۔ جن کا مقصد اسمبلی کے ذریعہ وزارت حاصل کر کے لاکھوں روپیہ پیدا کرنا ہے، اور یہ الیکشن میں رشوتوں کے ذریعہ ایک لاکھ روپیہ خرچ کر کے دس لاکھ روپیہ پیدا کرنے کا پلان بناتے ہیں اور انڈین سول سروس کے لائق ممبروں کو ان کے ہر نا جائز حکم کی تعمیل کرنی پڑتی ہے۔ گویا انگریزوں کے زمانہ میں تو انڈین سول سروس کے لائق ممبران گدھوں کو جیلوں میں بھیجتے تھے۔ اور اب یہ بیچارے ان گدھوں کے سامنے جھکنے پر مجبور ہیں۔ اور انڈین سول سروس کے ہر ممبر کی خواہش ہوتی ہے کہ مرکزی گورنمنٹ میں رہے۔ اس کی خدمات صوبہ کے سپرد نہ کی جائیں۔

عورت اور لاٹھی

ایک کہاوت ہے کہ ''عورت اور لاٹھی اس کی جس کے قبضہ میں ہو'' یعنی عورت جس کے قبضہ میں ہو وہ اس کے زیر اثر ہوا کرتی ہے۔ اور لاٹھی جس کے ہاتھوں میں ہو اسے وہ جیسے چاہے استعمال کرے۔ عورت کے زیر اثر ہونے کے سلسلہ میں چند واقعات سنیے:

تبادلہ آبادی سے پہلے کی بات ہے بٹھنڈہ میں ایک مسلمان سکول ماسٹر وہاں ملازم تھے۔ اس سکول ماسٹر کے بالکل سامنے بنیوں کا ایک گھر تھا۔ اس بنیے کی ایک جوان لڑکی تھی۔ جس کی ابھی شادی نہیں ہوئی تھی۔ اس سکول ماسٹر اور بنیے کی لڑکی میں محبت کے تعلقات پیدا ہو گئے اور لڑکی کبھی کبھی موقع ملنے پر رات کو ماسٹر کے ہاں آ جایا کرتی۔ کچھ عرصہ تو یہ سلسلہ راز میں رہا۔ مگر بعد میں لڑکی کے والدین کو پتہ چل گیا تو لڑکی پر پابندیاں عاید کر دی گئیں۔ یعنی نہ تو ماسٹر کے کان کے سامنے کھڑکی کبھی کھلے اور نہ لڑکی کبھی گھر کے دروازے سے باہر جائے۔ لڑکی پر لگائی گئی یہ پابندیاں کچھ روز جاری رہیں۔ مگر ہندی کے مشہور شاعر بہاری کے قول کے مطابق سیلاب اور شباب کی تباہ کاریوں کو آج تک روکنے والا کوئی پیدا نہ ہوا۔ لڑکی نے موقع ملنے پر ماسٹر کو کہلوایا کہ ماسٹر جی اسے گھر سے نکال کر لے جائیں۔ چنانچہ ایک روز پروگرام کے مطابق رات کو ماسٹر جی اس لڑکی کو لے جا کر سمہ سٹہ جانے والی ٹرین پر سوار ہو گئے۔ سمہ سٹہ کے قریب بہاول پور پہنچے۔ وہاں تھانہ میں لڑکی سے یہ بیان دلوایا کہ وہ بالغ ہے اور اپنی مرضی سے گھر سے آئی ہے۔ یعنی ماسٹر جی نے اس کا اغوا نہیں کیا۔ اس کے بعد وہ ایک مولوی صاحب کے ہاتھوں مشرف بہ اسلام ہوئی۔ ان مولوی صاحب ہی نے ان دونوں کا نکاح پڑھوایا۔ میاں بیوی دونوں نے بہاول پور میں سکونت اختیار کی اور ماسٹر جی نے اپنی ملازمت کے لیے محکمہ تعلیم میں کوشش شروع کر دی۔

لڑکی اور ماسٹر جی کے بٹھنڈہ سے رات کو روانہ ہونے کے بعد جب صبح ہوئی تو

لڑکی کی ماں نے دیکھا کہ لڑکی اپنی چارپائی پر موجود نہیں ہے۔ مکان کا باہر کا دروازہ دیکھا گیا تو وہ کھلا تھا...... معلوم کیا تو پتہ چلا کہ ماسٹر جی بھی غائب ہیں۔ یہ حالت دیکھ کر لالہ جی کا گھر ایک ماتم کدہ بن گیا۔ لوگوں نے بطور ہمدردی آنا شروع کیا۔ ہندو مہا سبھا ٹائپ بعض لوگوں نے اسے ہندو مسلم کا سوال بنانا چاہا۔ اور تھانہ میں رپورٹ لکھوائی کہ ماسٹر لڑکی کو اغوا کر کے لے گیا ہے۔ اور لڑکی اپنے ساتھ کئی ہزار روپیہ کا زیور بھی لے گئی ہے۔ حالانکہ ایک پیسہ کا زیور بھی اپنے ساتھ نہ لے گئی تھی۔ تھانہ کا اسسٹنٹ سب انسپکٹر تفتیش پر مقرر ہوا۔ لڑکی اور ماسٹر جی کے وارنٹ گرفتاری جاری ہوئے۔ کچھ روز کے بعد پولیس کو جب پتا چلا تو ملزم بہاولپور میں ہے تو یہ اسسٹنٹ سب انسپکٹر لڑکی اور ماسٹر کے وارنٹ گرفتاری لے کر بہاول پور پہنچا وہاں اسنے دونوں کو گرفتار کرلیا۔ چونکہ پٹیالہ اور بہاول پور الگ الگ ریاستیں تھیں قانون حوالگی (ایکسٹراڈیشن ایکٹ) کے مطابق یہ مسئلہ بہاول پور مجسٹریٹ کے سامنے پیش ہوا۔ کہ اس جوڑے کو پٹیالہ پولیس کے حوالے کر دیا جائے یا نہیں۔ بہاول پور کے مسلمان حکام تو اس کوشش مین تھے کہ ان کو پٹیالہ کے حوالے نہ کیا جائے۔ لڑکی بالغ اور شادی شدہ ہے۔ مگر ہندو حکام چاہتے تھے کہ ماسٹر کو پٹیالہ پولیس کے حوالے کر دیا جائے پانچ سات روز میں یہ کشمکش جار رہی تو ریاست بہاول پور کے فارن ڈیپارٹمنٹ (وزارت خارجہ) نے فیصلہ کیا کہ ملزموں کو پٹیالہ پولیس کے حوالے کر دیا جائے۔ اچنانچہ اس حکم کے مطابق پٹیالہ کا اسٹنٹ سب انسپکٹر پولیس لڑکی اور ماسٹر کو گرفتاری کی حالت میں ٹھنڈہ لایا۔ راستہ میں لڑکی ماسٹر کو یقین دلاتی رہ کہ وہ کوئی فکر نہ کرے۔ وہ عدالت میں بیان دے گی کہ وہ بالغ ہے وہ اپنی مرضی سے بہاول پور گئی تھی اور اس نے اپنی مرضی سے اسلام قبول کرنے کے بعد نکاح کیا ہے۔ ماسٹر جی اس بیان سے مطمئن تھے اور ان کو یقین تھا کہ لڑکی کے بیان کے بعد وہ رہا ہو کر واپس بہاول پور آجائیں گے اور میاں بیوی وہاں مزے کی زندگی گزاریں گے۔

اسسٹنٹ سب انسپکٹر دونوں ملزموں کو اپنے ساتھ ڈھونڈ لایا اور اس نے مجسٹریٹ کے سامنے ان کو پیش کیا۔ ماسٹر کو تا فیصلہ مقدمہ بغیر ضمانت جیل بھیج دیا گیا اور لڑکی کو اس کے والدین کی تحویل میں دے دیا۔ حالانکہ لڑکی نے رو رو کر عدالت سے التجا کی کہ وہ اپنے والدین کے گھر نہیں جانا چاہتی۔ چاہے اسے بھی جیل بھیج دیا جائے۔ عدالت نے لڑکی کی درخواست کی کوئی پروانہ کی اور اپنے حکم میں لکھ کر لڑکی کو اس کے والدین کے حوالے کر دیا کہ چونکہ یہ امر فیصلہ طلب ہے کہ لڑکی بالغ ہے یا نابالغ اور لڑکی کو محفوظ رکھنے کی اور کوئی جگہ نہیں لڑکی کو اپنے والدین کے پروٹیکشن میں رہنا چاہیے

ماسٹر جی اس حکم کے بعد جیل کو روانہ ہوئے اور لڑکی والدین کے ساتھ بھیجی گئی۔ عدالت نے مقدمہ کی سماعت کے لیے تاریخ مقرر کر دی۔ چنانچہ اگلی پیشی پر استغاثہ کے گواہوں کی شہادت شروع ہوئی۔ سب سے پہلے اسسٹنٹ سب انسپکٹر نے گواہی دی۔ پھر پڑوس کے گواہ پیش ہوئے اور پھر لڑکی کو بطور گواہ پیش کیا گیا۔ ماسٹر جی لڑکی کے اس بیان سے پہلے مطمئن تھے اور ان کو یقین تھا کہ لڑکی ان کے حق میں بیان دے گی۔ اور اپنی مرضی سے بہاول پور جانے اور وہاں خود ہی بغیر کسی جبر کے اسلام قبول کر کے نکاح کرنے کا اقرار کرے گی۔ مگر حالات قطعی بدل چکے تھے لڑکی کے والدین کے ہاں جانے کے بعد جب لڑکی کی ماں نے رو رو کر لڑکی سے محبت کا اظہار کیا اور خاندان کی عزت تباہ ہونے پر توجہ دلائی تو لڑکی اپنی ماں کے زیر اثر آ چکی تھی اس نے پولیس اور سرکاری وکیل کی مرضی کے مطابق عدالت میں بیان دیا کہ یہ اپنے گھر کا دروازہ بند کرنے کے لیے مکان کی اوپر کی منزل سے نیچے آئی تھی کہ ماسٹر نے اسے پکڑ لیا۔ اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا تا کہ یہ شور نہ کرے۔ اسے چاقو دکھا کر کہا گیا کہ اسے ہلاک کر دیا جائے گا اور اسے خوفزدہ اور نیم بیہوشی کی حالت میں ہی برقعہ میں لپیٹ کر ریلوے سٹیشن میں بہاول پور لے جایا گیا۔ جہاں اس سے تھانہ میں رپورٹ لکھوائی اور بغیر اس کی مرضی کے مولوی کے سامنے نکاح پڑھوایا گیا۔ ماسٹر صاحب لڑکی کے

اس بیانسے پہلے مطمئن اور خوش تھے ۔اور ان کا ذہن اپنی دلہن کو واپس بہاول پور لے جانے اور آرام اور خوشی اور مسرت کی زندگی بسر کرنے کی سکیمیں بنا رہا تھا۔ اس نے جب لڑک کا یہ بیانسنا تو وہ حیران رہ گیا کیونکہ اصل میں اس نے لڑکی کا اغوا نہ کیا حتا۔ بلکہ لڑکی ماسٹر کو اغوا کر کے بہاول پور لے جانے کی مجرم تھی ۔ کیونکہ اس نے ماسٹر کو مجبور کیا تھا کہ وہ اس کو کسی دوسرے شہر میں لے جائے جہاں کہ دونوں آزادی کے ساتھ عیش وعشرت کی زندگی بسر کریں ۔اور ماسٹر اگر مجرم تھا تو صرف بیوقوفی اور حماقت کے جرم کا جس نے ایک الھڑ اور نا تجربہ کار لڑکی کی زبان پر اعتبار کیا۔ لڑکی کے بیان کے بعد ایک دو اور شہادتیں ہوئیں اور ان شہادتوں کے بعد ماسٹر جی پر فرد جرم لگایا گیا۔ ڈیفنس شروع ہوا تو ماسٹر نے عدالت جرم کے متعلق سوالات کیے ۔جن کے جواب میں ماسٹر نے مغموم اور افسردہ حالت میں صرف یہ کہا کہ جس صورت مں کہ لڑکی ہی یہ کہتی ہے کہ اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر اور چاقو دکھا کر میں اسے بہاول پور لے گیا تو میرا ڈیفنس کیا ہوسکتا ہے ۔میرا کوئی ڈیفنس نہیں عدالت جو چاہے فیصلہ کرے ۔ ماسٹر کے اس بیانکے بعد عدالت نے لڑکی کے اغوا کرنے کے جرم میں تین برس قید سخت کی سزا دی۔ چنانچہ اگر لڑکی پروٹیکشن کے لیے اپنے والدی کی تحویل میں نہ دی جاتی اور اپنی والدہ کے زیر اثر نہ رہتی تو وہ یقیناً ماسٹر کی مرضی کے مطابق جواب دیتی ۔اور ماسٹر بری ہو جاتا۔ مگر عورت اور لاٹھی اس کی جس کے قبضہ میں ہو ۔کے مصداق لڑکی نے تو اپنے والدین کی خواہش کے مطابق ہی بیان دینا تھا جن کے زیر اثر تھی ۔

چند برس ہوئے نئی دہلی کے ایک سکھ انجنئر کی لڑکی کو ایک ماسٹر جی گھر پر پڑھاتے تھے ۔ ماسٹر جی لڑکی کو ایک الگ کمرے میں سبق دیتے تھے تا کہ لڑکی کی تعلیم میں کوئی مخل نہ ہو۔ ماسٹر جی جوان تھے اور لڑکی بہت خوبصورت تھی ۔ ماسٹر جی کی اس ٹیوشن کے ساتھساتھ عشق کے دیوتا نے بھی اپنا سبق دینا شروع کر دیا۔ دونوں کے درمیان زندگی ہمیشہ مل کر گزارنے کا عہد ہوا۔ ایک روز صبح لڑکی اپنی سہیلی سے ملنے کے بہانہ

سے گھر سے روانہ ہوئی۔ اور پروگرام کے مطابق ماسٹر صاحب کے پاس پہنچی۔ دونوں تھانہ حوض قاضی میں پہنچے۔ وہاں لڑکی نے تھانہ میں رپورٹ لکھوائی کہ وہ بالغ ہے اور اپنی مرضی سے گھر سے آئی ہے۔ اور اسے کوئی اغوا کر کے نہیں لایا۔ اس رپورٹ کے بعد دونوں ٹرین پر سوار ہوئے اور میرٹھ پہنچے۔ وہاں ایک معمولی ہوٹل میں دونوں نے قیام کیا اور اگلے روز رات کے نو بجے والے شو میں سینما دیکھنے گئے۔ کیوں آج کل ہنی مون کے سلسلہ میں سینما بھی ایک لازمی پروگرام ہوتا ہے۔ ادھر جب لڑکی شام تک گھر واپس نہ آئی تو لڑکی کی ماں یعنی انجینئر صاحب کی بیوی نے اپنا ملازم لڑکی کی سہیلی کے گھر بھیجا تو معلوم ہوا کہ لڑکی وہاں نہیں گئی۔ ماں نے جب یہ سنا تو اس کے ہوش اڑ گئے۔ انجینئر کو پتہ چلا تو وہ پریشان ہوا۔ آخر انجینئر صاحب نے اپنے رازدار ٹھیکیدار کو بلوایا اور تمام حالات بیان کیے۔ ٹھیکیدار اپنی اپنی موٹروں میں لڑکی کی تلاش میں بھاگے اور کوئی آگرہ گیا اور کوئی انبالہ کوئی علی گڑھ اور کوئی میرٹھ۔ ان تمام شہروں کی سرائیں دھرم شالائیں اور ہوٹل چھان مارے گئے۔ آخر ایک ٹھیکیدار کو میرٹھ کے اس ہوٹل کے مینجر سے پتہ چلا کہ ایک جوڑا وہاں مقیم ہے۔ اور وہ سینما میں کھانا کھانے کے بعد گیا ہے۔ ٹھیکیدار صاحب سینماؤں میں تلاش کرنے لگے۔ تو ایک سینما میں لڑکی ماسٹر کے ساتھ فلم دیکھ رہی تھی۔ دونوں کو کار میں لایا گیا۔ لڑکی نے اپنے گھر جانے سے انکار کر دیا۔ مگر اس سے یہ وعدہ کیا گیا کہ اس کے والدین کو مجبور کر کے اس کی شادی ماسٹر سے کر دی جائے گی لڑکی گھر پہنچی۔ وہاں کہرام کا منظر تھا اور دو روز سے چولہے میں آگ نہیں جلی تھی۔ اب مسئلہ یہ درپیش تھا کہ ماسٹر پر اغوا کا مقدمہ درج کیا جائے یا نہیں۔ دوستوں نے انجینئر صاحب کو مشورہ دیا کہ مقدمہ کی صورت میں لڑکی کی شہادت ہو گی۔ اخبارات میں مقدمہ کی کارروائی چھپے گی اور مزید مٹی پلید ہو گی۔ اس خیال سے ماسٹر پر مقدمہ کرنے کا خیال چھوڑ دیا گیا۔ لڑکی نے جب اپنی ماں کو زار زار روتے ہوئے دیکھا اور اپنے گھر کے دوسرے لوگوں اور باپ کو بدحال

پایا تو اس کی عشق بازی کے جذبات پر اوس پڑ گئی۔ وہ ماسٹر کے خلاف ہر بیان دینے پر تھی مگر اس کی ضرورت ہی نہ رہی۔ کیونکہ ماسٹر پر مقدمہ چلانے کا خیال چھوڑ دیا گیا تھا۔ اس کے بعد انجینئر صاحب کے سامنے لڑکی کی شادی کا سوال تھا۔ بڑے گھروں کی اگر لڑکی کی بدنامی ہو جائے تو کسی بڑے گھر کا لڑکا اس سے شادی کرنے پر تیار نہیں ہو سکتا۔ انجینئر صاحب بہت مالدار تھے کسی معمولی شخص سے رشتہ کیسے کرتے آخر تلاش کے بعد فیروزپور کے ساتھ ایک سکھ وکیل مل گئے جو کچھ تو آزاد خیال تھے ار کچھ لالچی۔ یہ پچاس ہزار روپیہ نقد معاوضہ لے کر لڑکی سے شادی کرنے پر تیار ہو گئے۔ اور شادی ہو گئی۔ راقم الحروف نے لڑکی کو دیکھا ہے اور اس کے شوہر سے بھی دوستانہ تعلقات ہیں۔ بلکہ اس شادی کے طے کرانے میں بھی راقم الحروف نے کوشش کی تھی۔ اس سلسلہ کا یہ واقعہ دلچسپ ہے کہ شادی کے بعد لڑکی بہت ہی نیک اور شریف ثابت ہوئی کیونکہ وہ فطرتاً نیک تھی اور وہ صرف زمانہ شباب کی کمزوری کا شکار ہوئی۔ شادی کے بعد وہ کسی عزیز مرد کے سامنے نہ آتی تھی۔ اور نہ کسی سے بات کرتی۔ میرا یقین ہے کہ گھر سے چلے جانے کے بعد اگر وہ اپنے والدین کے زیر ار ہو کر اپنی غلطی کا دل سے اعتراف نہ کرتی اور چند روز بھی ماسٹر کے زیر اثر رہتی تو اس کی زندگی بالکل تباہ ہو جاتی۔ اور نہ معلوم آج اس کی کیا حالت ہوتی۔ کیونکہ ماسٹر کی تنخواہ چالیس پچاس روپیہ ماہوار سے زیادہ نہ تھی۔ جہاں زیادہ دولت کا ایک جگہ جمع ہونا فتنہ پردازی کا باعث ہوا کرتا ہے وہاں افلاس بھی انسان کو گناہوں کی طرف لے جاتا ہے۔

ہندی کے مشہور شاعر تلسی نے رامائن میں لکھا ہے:

پشو شودر اور ناری

تینوں تاڑن کے ادھ کاری

یعنی چوپائے ادنیٰ درجہ کے شودر مثلاً بھنگی اور چمار وغیرہ اور ناری یعنی عورت تینوں کو ڈانٹ ڈپٹ کر ہی سیدھے راستہ پر رکھ سکتی ہے۔ مگر میں تلسی کے اس قول سے

متفق نہیں ہوں اور میری ایمانداری سے یہ رائے ہے کہ عورت ایثار اور قربانی کے اعتبا
ر سے مرد کے مقابلہ مں بہت ہی بلند اور قابل پرستش ہے۔ہاں عورت میں ایک کمزور
ی ضرور ہے۔وہ کسی صورت میں بھی انڈی پینڈنٹ نہیں رہ سکتی۔وہ فطرتاً زیر اثر رہنا
پسند کرتی ہے۔چاہے بطور بیٹی کے ماں باپ کے زیر اثر ہو شباب میں اپنے شوہر کے
زیر اثر یا بڑھاپے میں اپنی اولاد کے زیر اثر اور یہ جس کے بھی زیر اثر ہو اس کی رائے پر
عمل کرتی ہے۔

☆☆☆

لکشمی اور سرسوتی میں عداوت

ہندو دیومالا کے مطابق لکشمی (دولت کی دیوی) اور سرسوتی (علم کی دیوی) دونوں بہنیں ہیں اور ان دونوں میں عداوت ہے۔ نہ تو دونوں ایک جگہ جمع ہو سکتی ہیں اور نہ ایک دوسرے کو برداشت کر سکتی ہیں۔ یعنی جہاں لکشمی (دولت کی دیوی) ہو گی وہاں سرسوتی (علم کی دیوی) نہ جائے گی اور جہاں سرسوتی قدم رکھے گی وہاں سے لکشمی چلی جائے گی۔ علم اور دولت کا اتحاد نہیں ہو سکتا۔ یہ دونوں متضاد ہیں۔ چنانچہ پچھلی تاریخ گواہ ہے کہ علم و ادب کے پرستار ہمیشہ ہی فاقہ کش رہے اور دولت مند علم و ادب کے کبھی قریب بھی نہ آئے بلکہ میرا ذاتی تجربہ یہ بھی ہے کہ جب کبھی کسی علم و ادب سے دلچسپی والے ہاتھ میں اگر کبھی دولت آ گئی تو اس کی علم و ادب سے دلچسپیاں ختم ہو جائیں گی اچھی کتابیں اچھے مضامین اچھی نظمیں اور اچھے خیالات صرف اس زمانہ میں ہی لکھے گئے یا قلم بند ہوئے جب فاقہ اور تنگدستی تھی اور دولت کے ملنے پر لکھنے والوں نے دوسری دلچسپیاں اختیار کر لیں۔ مثلاً عیاشی' لیڈری اور تجارت وغیرہ۔ بلکہ میں تو اس کا بھی دعویدار ہوں کہ علماء اور ادیبوں کو چھوڑ کر ایک درویش اور ولی اللہ کی بھی اس وقت تک ہی خدا کے قریب رہ سکتا ہے جب تک کہ وہ دولت سے دور رہے۔ اور اس کی درویشی کو اس وقت سے زوال نصیب ہونا شروع ہو جائے گا جب اس کے درویش خانہ میں روپیہ اور دولت کی آمد ہو گی۔ لکشمی اور سرسوتی کی عداوت کے سلسلہ میں چند واقعات سنیئے۔:

سوامی رام تیرتھ ان لوگوں میں سے تھے جن کو مائیں کبھی کبھی ہی پیدا کرتی ہیں۔ آپ مرالی والا (خاص گوجرانوالہ) کے رہنے والے تھے ایم اے پاس کرنے کے بعد کالج میں پروفیسر ہوئے ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ امریکہ اور دوسرے ممالک میں بھی آپ کو شہرت نصیب ہوئی۔ علم اور روحانیت کے اعتبار سے آپ نے بہت اونچا اور بلند جھنڈا نصب کیا۔ آپ آغاز کے زمانہ میں لاہور کے مشہور رئیس سرمایہ دار ارو

کروڑ پتی رائے بہادر مسٹر رام سرن داس کے لڑکے کے ٹیوٹر تھے اور آپ کو وہاں سے پچیس روپیہ ماہوار تنخواہ ملتی تھی۔ ایک بار سوامی رام تیرتھ نے چاہا کہ آپ ہردوار جا کر وہاں سے صاحب کمال مہاتماؤں سے ملیں۔ ار آپ نے رائے بہادر سے ہردوار جانے کے لیے دو ماہ کی تنخواہ پیشگی دینے کی درخواست کی مگر رائے بہادر نے انکار کر دیا۔ کیونکہ سرمایہ داروں کی تجوریوں میں علم و ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے کچھ نہیں ہوا کرتا۔

مرحوم مولانا ابوالکلام آزاد کی پوزیشن ہندوستانیوں کے آزاد ہونے کے بعد تمام لیڈروں میں بلند ترین تھی۔ کیونکہ ہندوستان کے وزیر اعظم پنڈت نہرو فی الحقیقت آپ کی جیب میں تھے۔ یعنی بغیر مولانا کی رائے کے پنڈت جی کسی قسم کا کوئی قدم نہ اٹھاتے۔ اور س صورت میں کہ ہندوستان کے بعض صوبجات کے موجودہ وزراء اس وقت کروڑ پتی ہیں۔ اور ان کے عزیز و اقارب بھی لاکھوں میں کھیل رہے ہیں۔ مولانا اگر چاہتے تو اپنے اقتدار کے زمانہ میں سینکڑوں نہیں اربوں روپیہ حاصل کر سکتے تھے۔ کیونکہ سیاسی قمار بازی میں تو تاش کے پتوں کی جگہ کرنسی نوٹوں کی گڈیاں حرکت کیا کرتی ہیں مگر یہ واقعہ دلچسپ ہے کہ مولانا کے انتقال کے بعد ان کے عزیز اور قریبی رشتہ دار مولانا کی چھوڑی ہوئی جائیداد میں سے حصہ لینے کے لیے نئی دہلی پہنچے تو وہاں کرنسی نوٹوں اور چیک بکوں کی جگہ وہ کاغذات تھے جن کے مطابق مولانا مرحوم کی خریدی ہوئی موٹر کی سات اقساط کا روپیہ باقی تھا۔ جو موٹر کمپنی کو ابھی ادا نہ ہوا تھا۔ مرحوم مولانا کے پرائیویٹ سیکرٹری محمد اجمل خاں صاحب نے یہ واقعہ جب راقم الحروف کو سنایا تو میں رات کو دیر تک اس مسئلہ پر غور کرتا رہا اور غور کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا کہ اگر مولانا مقروض نہ ہوتے اور ان کے پاس بھی بعض وزراء کی طرح پرمٹوں سے حاصل کیا ہوا لاکھوں یا کروڑوں روپیہ ہوتا تو مولانا ابوالکلام ابوالکلام نہ ہوتے وہ بھی کوئی شریمان جی ہوتے اور ان کے جنازہ میں لاکھوں انسانوں کے

شریک ہونے کا سوال ہی نہ تھا۔ اچھا ہوا ابو الکلام (علم کے باپ) ابوالکلام ہی رہے۔اورانہوں نے صرف سرسوتی سے ہی محبت ک انہوں نے لکشمی کوقریب بھی نہ پھٹکنے دیا۔

کئی برس کی بات ہے جب جون کے مہینہ دہلی میں سخت گرمی ہوتی اور بمبئی میں برسات کا موسم بہت ہی پرفضا ہوتا ہے۔ بمبئی میں تھا تو ایک فلم کمپنی کی دعوت پر فلم کی شوٹنگ دیکھنے کے لیے بمبئی ٹاکیز کے سٹوڈیو (میرا خیال ہے یہی سٹوڈیو تھا) میں گیا تو وہاں کسی نے بتایا کہ مشہور افسانہ نگار منشی پریم چند اس اسٹوڈیو میں ہی مقیم ہیں۔اور فلمی ڈرامے لکھتے ہیں۔ میں منشی جی سے ملنے ان کے کمرے میں گیا جو بڑے دروازے کے بالکل قریب تھا۔منشی جی کو دیکھا کہ وہ اپنے میز پر کام کر رہے ہس۔مگر مایوس و دلگیر ہیں۔باتیں ہوئیں اور حالات پوچھے تو معلوم ہوا کہ مالی مشکلات ان کو بمبئی کھینچ لائیں مگر بمبئی کی فلمی لائن ان کے لیے موزوں ثابت نہیں ہوئی۔یعنی ان کو اپنا مستقبل وہاں تاریک نظر آرہا ہے۔افسانہ اور فلمی ڈرامے دونوں مختلف لائنیں ہیں۔یعنی ایک افسنہ نویس کے لیے یہ ضروری نہیں کہ وہ فلمی ڈرامے میں بھی کامیاب ہو سکے۔ان کے معمولی لباس اور بددلی دیکھکر مجھے بہت ہی افسوس ہوا۔ ہندوستان کا وہ افسانہ نویس جسے اردو زبان میں افسانہ نویسی کا گرو دیو کہنا چاہیے افلاس اور تنگدستی کا قابل رحم تک شکار۔اس کے کچھ عرصہ بعد منشی پریم چند کا انتقال ہوگیا اور رلوگوں نے ان کی یادگار میں میموریل یادگاریں اور راکیڈمیاں بنانے کی تجاویز پیش کین۔اور روپیہ جمع ہونا شروع ہوا۔یعنی منشی پریم چند نے جب تک زندگی میں سرسوتی (علم کی دیوی) کا ساتھ دیا لکشمی (دولت کی دیوی) ان کے قریب نہ آئی۔اور جب انہوں نے اپنی زندگی کے ساتھ ہی سرسوتی کا ساتھ بھی چھوڑ دیا تو لکشمی نے پر پرزے نکالنے شروع کر دیے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے ک ان کے زندگی میں فاقہ اور تنگدستی کے شکار ہونے اور مرنے کے بعد ان کی یادگاریں قائم ہونے کو دیکھ کر میں نے پنجابی زبان کے ایک

شاعر کی ایک نظم کا مصرع لکھا:

دل چاہو اندا اے مورہ کھا مریئے

(دنیا کی ناقدر شناسی کو دیکھ کر جی چاہتا ہے کہ زہر کھا کر مر جائیں تاکہ زندگی میں نہیں تو مرنے کے بعد ہی لوگ قدر کریں)۔

حضرت جوش ملیح آبادی میں ایک بہت بڑی صفت یا ایک بہت بڑا نقص یہ بھی تھا کہ آپ جب کبھی کسی مشاعرہ میں شرکت کریں تو دنیا کی تعریف اور مذمت سے بے نیاز ہو کر اپنے دلی خیالات کا اظہار کر دیتے ہیں۔ جس کی وجہ شاید شراب سے پیدا ہونے والی جسارت یا جرات ہی ہو۔ آپ حیدر آباد میں ملازم تھے کہ ایک مشاعرہ میں آپ نے نظام دکن کی سرمایہ کاری اور کنجوسی پر چوٹ کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نظام کے حکم سے ریاست حیدر آباد کی حدود سے نکال دیے گئے۔ اور دہلی آ گئے۔ دہلی آ کر آپ نے ایک ماہوار ادبی رسالہ ''کلیم'' جاری کیا۔ ایک رسالہ کا جاری کرنا اور اسے زندہ رکھنا جوش صاحب کے بس میں نہ تھا۔ ''کلیم'' چند ماہ جاری رہا تو مالی پریشانیوں کے باعث اسے بند کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اور یہ فیصلہ مجھ سے مشورہ کر کے میرے مکان پر ہی ہوا۔ کیونکہ میں نے اسے بند کر دینے کی رائے دی تھی۔ اس وقت جوش صاحب کے ساتھ میرے اور ان کے مشترکہ دوست مجاز لکھنوی بھی تھے۔ کلیم کو جب بند کر دینے کا فیصلہ ہوا تو مجاز نے جوش صاحب سے ہا کہ اگر آپ اسے بند کرنا ہی چاہتے ہیں تو یہ رسالہ ان کو (یعنی مجاز صاحب) کو دے دیں تاکہ وہ اسے چلائیں۔ مجاز کا یہ مطالبہ سن کر جوش صاحب نے جو جواب دیا وہ مجھے اب تک یاد ہے آپ نے فرمایا ''مجاز تم ایسے نہیں ہو کہ رسالہ جاری کر کے روپیہ پیدا کرو۔ تمہیں بھی یہ بند کرنا پڑے گا۔ اچھا اگر تم چاہتے ہو تو اسے لے لو'' گویا ک رسالہ کا جاری رکھنا علم و ادب کی خدمت یعنی سرسوتی (علم کی دیوی) کی پوجا ہے اور اس ذریعہ سے روپیہ پیدا کرنا لکشمی (دولت کی دیوی) کی پرستش۔ اور جس صورت میں کہ یہ دونوں ایک دوسری کی دشمن

ہیں مجاز جیسا علم وادب کا پرستار اس رسالہ سے روپیہ کیونکر پیدا کرسکتا تھا۔

مرحوم مہاراجہ نابھ بہت بڑے علم دوست تھے۔ آپ دوسری زبانوں کے علاوہ اردو اور ہندی لٹریچر کے عاشق تھے۔ حضرت اکبرالہ آبادی اور ہندی کے شعراء کے کلام کو مزہ لے لے کر پڑھا کرتے تھے۔ آپ جب گدی سے علیحدہ کیے گئے تو گدی سے علیحدہ کیے جانے کے اسباب پر مختلف لوگوں کی مختلف آرائیں تھیں۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ چونکہ آپ نے انے محل کی تمام چھپکلیاں مروادی تھیں) (چھپکلیاں ایک معصوم مخلوق ہے جو اپنا پیٹ مکھیوں اور مچھروں سے بھرتی ہے) ان کے مروانے کا اثر ہوا۔ بعض ایک فقیر کی بددا کا اثر قرار دیتے تھے۔ جو آپ کے محل کے قریب مجذوب حالت میں ننگا رہا کرتا تھا۔ اور جسے وہاں سے چلے جانے کو کہا گیا۔ وار بعض اسے مظلوم لوگوں پر کیے گئے مظالم کا نتیجہ قرار دیتے تھے۔ مگر جب مہاراجہ الور بھی گدی سے الگ کیے گئے تو باتوں باتوں میں ایک علمی شخصیت نے راقم الحروف سے خوب کہا مہاراجہ نابھ اور مہاراجہ الور دونوں کے گدی سے الگ کیے جانے کی وجہ ضرور یہ ہے کہ یہ دونوں ادب نواز دونوں علم پرست اردونوں سخن شناس دونوں عالم اور فاضل اور دونوں سرسوتی (علم کی دیوی) کے پجاری تھے۔ لکشمی (دولت کی دیوی) یہ برداشت نہیں کرسکی کہ نابھ اور الور کے خزانہ کی چابیاں سرسوتی کے ان پجاریوں کے قبضہ میں رہتیں۔

مرحوم خواجہ حسن نظامی نے علم وادب کے اعتبار سے اردو زبان میں ایک نئی راہ قائم کی۔ اور آپ مذہبی اور روحانی اعتبار سے تعلیم یافتہ حلقوں میں بھی انتہائی عزت و احترام کی نظروں سے دیکھے جاتے تھے۔ آپ کی یہ بلند پوزیشن اس وقت تک قائم رہتی جب تک کہ آپ کے گھر میں لکشمی)(دولت کی دیوی) نے قدم نہ رکھا۔ آپ صرف سرسوتی (علم کی دیوی) کے ہی پرستار تھے۔ مگر جب آپ نے ریاستوں کے دورے کر کے نوابوں اور مہاراجوں کے ہاں جانا شروع کیا اور نوٹوں کی گڈیوں نے

آپ کے درویش خانے میں جگہ حاصل کی تو آپ کی شہرت کو زوال پہنچنا شروع ہوا اور مولانا محمد علی کی مخالفت کا جو نتیجہ ہوا اس کا ذکر نہ ہی کرنا بہتر ہے۔

چنانچہ ایک اہل الرائے کے قول کے مطابق اگر خواجہ حسن نظامی اپنے درویش خانہ میں لکشمی (دولت کی دیوی) کو جگہ نہ دیتے اور والیان ریاست اور انگریز حکام کی کوٹھیوں سے دور رہتے ہوئے اپنی دلچسپیوں کو صرف سرسوتی (علم کی دیوی) کی دربار داری تک ہی محدود رکھتے تو آپ کے مرتبہ کا شاید کوئی مصنف مقابلہ کرسکتا۔

روپیہ اور علم دونوں کی متضاد پوزیشن کے متعلق ہندی زبان کے ایک شاعر اودھو نے خوب کہا ہے:

اودھو   کو   من   کی   گت   نیاری

مورکھ   مورکھ   راج   کرت   ہیں

پنڈت   پھرت   بھکاری

اگر حق و صداقت کا اظہار دلوں میں طہارت پیدا کرنے کا باعث ہوا کرتا ہے تو راقم الحروف اس کا ایمانداری کے ساتھ اقرار کرتا ہے۔ کہ میری پچھلی تمام زندگی میں اچھے مضامین اور اچھے ایڈیٹوریل صرف اس وقت لکھے گئے جب جیب میں ایک پیسہ نہ تھا اور تنگدستی اور بدحالی تھی اس وقت لکھنے کو کبھی جی نہ چاہا جب میز کے خانہ میں روپے ہوتے۔ اور روپیہ کی موجودگی میں جب ذہن کو مجبور کرنے پر بھی طبیعت لکھنے پر آمادہ نہ ہوتی تو رسول اللہ کا وہ قول یاد آجاتا جس میں آپ نے خدا سے دعا کی تھی کہ یا اللہ مجھے غریبوں کی صف میں رکھنا اور مرنے کے بعد بھی مجھے غریبوں میں جگہ دینا''۔

حضرت مسیح کا یہ قول جلی حروف میں لکھ کر اپنے سامنے رکھنا چاہیے جس میں آپ نے فرمایا ہے ''سوئی کے ناکہ میں سے اونٹ کا گزرنا ممکن ہے مگر ایک سرمایہ دار کا بہشت میں داخل ہونا ممکن نہیں۔ کیونکہ لکشمی نہ صرف سرسوتی کی دشمن ہے بلکہ یہ انسان کی نجات کے راستہ میں بھی بہت بڑی رکاوٹ کا باعث ہوا کرتی ہے۔ یہ

درست ہے کہ فاقہ اور تنگدستی ان میں گراوٹ پیدا کرتی ہے اور کم لوگ ایسے ہوا کرتے ہیں جو مالی مشکلات کی صورت میں بھی اپنے کریکٹر اور کردار کو بلند رکھ سکتے ہیں۔ مگر روپیہ دولت اور سرمایہ داری کا جمع ہونا تو انسان کو نہ دین کا رکھتا ہے۔ نہ دنیا کا۔ اس کا وجود انسانیت کی ہلاکت کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ سرسوتی کے پجاریوں کے لیے مناسب یہ ہے کہ وہ لکشمی سے کوئی تعلق نہ رکھتے ہوئے اس سے دور رہیں۔

☆☆☆

نگلہ(بدعہد)

ایک دلچسپ کہاوت ہے کہ ایک عورت ایک مرد سے شادی کرنا چاہتی تھی مگر مرد اس کے لیے تیار نہ تھا۔وہ عورت کو مسلسل ٹالتا رہا اس شخص نے ٹالتے ہوئے عورت سے بار بار کہا' کہ وہ کسی دوسرے شخص سے شادی کرے۔مگر عورت اپنے ارادے پر مضبوطی سے قائم رہی اور آخر جب ی نہ ہی مانی' تو ان دونوں کے درمیان مندرجیہ ذیل بات چیت ہوئی:

مرد: میں بدچلن ہوں ایک بدچلن شخص سے شادی مت کرو۔

عورت: مجھے کوئی اعتراض نہیں میں پھر بھی تم سے شادی کروں گی۔

مرد: میں قمار باز ہوں۔

عورت: مجھے کوئی اعتراض نہیں۔

مرد: میں شرابی ہوں۔

عورت: میں تمہارے شراب پینے کو بھی معاف کردوں گی۔

مرد: میں چور ہوں۔

عورت: کوئی حرج نہیں۔

مرد: میں ڈاکو ہوں۔

عورت: مجھے قبول ہے۔

مرد: میں نگلہ(بدعہد)ہوں۔

عورت: میں تم سے شادی نہ کروں گی۔کیونکہ ایک نگلہ (بدعہد) ایک بدمعاش' چور' قمار باز' شرابی اور ڈاکو سے بھی برا ہے۔کیونکہ نگلہ کی زبان کا اعتبار نہیں کیا جاسکتا دوسروں سب کا کیا جاسکتا ہے۔

اگر غور کیا جائے تو اس کہاوت کے مطابق فی الحقیقت ایک نگلہ (بدعہد) ایک بدمعاش' بدچلن' قمار باز' شرابی' چور اور ڈاکو سے بھی برا ہے اگر وہ بدعہد نہیں ہیں' اور

اپنی زبان کے پابند ہیں۔ چنانچہ عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ جرائم پیشہ لوگوں کی اکثریت اپنی زبان کی پابند ہوتی ہے۔ اور جب یہ کوئی عہد کریں تو یہ اپنے وعدے سے منحرف نہیں ہوا کرتے۔

مذہبی اعتبار سے زبان اور وعدہ کی پابندی کو بڑی اہمیت دی گئی یہ چنانچہ ہندی زبان کے مشہور شاعر تلسی کا قول ہے:

رگھو کل ریت یہی چلی آئی ..... پران جائیں پر بچن نہ جائی۔

(رگھو رام چندر، کل خاندان ریت دستور یا شعار، پران زندگی، بچن عہد)

یعنی سری رام چندر جی کے خاندان کا یہ دستور اور شعار رہا ہے کہ زندگی چلی جائے تو کوئی حرج نہیں مگر زبان سے کیا ہوا عہد ضرور پورا ہونا چاہیے۔

پہلی عالمگیر جنگ شروع ہونے سے پہلے برطانیہ اور جرمنی میں یہ معاہدہ تھا کہ جرمنی بیلجیم کی طرف فوجی قدم نہ اٹھائے گا، تاکہ فرانس اور برطانیہ اس کے حملہ سے محفوظ رہیں۔ مگر جرمنی کی فوجوں نے بلجیم کی طرف کوچ کیا۔ تو برطانیہ کے متعینہ سفیر برلن وزیر خارجہ جرمنی کے پاس پہنچے، اور جرمنی اور برطانیہ کے معاہدہ کی نقل دکھاتے ہوئے جرمنی کی فوجوں کے بلجیم کی طرف قدم بڑھنے پر اعتراض کیا۔ اس اعتراض کے جواب میں وزیر خارجہ جرمنی نے کہا ''ایسے معاہدے سکریپ آف پیپر یعنی (ردی کاغذ کے ٹکڑے) ہیں'' چنانچہ جرمنی کییہ عہد شکنی تھی جس کا نتیجہ پہلی عالمگیر جنگ کی صورت میں طاہر ہوا۔ دنیا کے کئی ممالک اس جنگ میں شامل ہوئے لاکھوں انسان اور اربوں نہیں کھربوں روپیہ تباہ ہوا۔ اور جرمن قوم کو وہ دن دیکھنا نصیب ہوا جس کا خیال کرتے ہوئے بھی دنیا کے لوگ کانپ اٹھتے ہیں کیونکہ دنیا کے طاقتور ترین بادشاہ قیصر ولیم کو اپنا ملک چھوڑ کر ہالینڈ میں پناہ لینی پڑی۔ اور اسے اپنی قبر کے لیے ملک مں دو گز زمین بھی نصیب نہ ہوئی۔

پاکستان کے قائم ہونے کے سلسلے میں پاکستان کی نئی گورنمنٹ کے سامنے سب

سے اہم سوال شروع کے مصارف کا تھا۔ اور جب بات چیت ہوئی تو کانگرس لیڈروں نے وعدہ کیا کہ شروع کے اخراجات کے لیے ہندوستان پاکستان کو پچاس کروڑ روپیہ دے گا۔ پاکستان قائم ہونے کے بعد فسادات شروع ہوئے۔ پاکستان کے علاقہ کے ہندوؤں اور سکھوں کو ہندوستان کے علاقہ میں آنا پڑا۔ تو ہندوستانی پبلک نے جوش اور غصہ کے جذبات میں گورنمنٹ ہند سے مطالبہ کیا کہ پچاس کروڑ روپیہ پاکستان کو نہ دیا جائے۔ پریس پلیٹ فارم سے روپیہ نہ دینے کے حق میں زوردار آواز پیدا کی گئی۔ مگر مہاتما گاندھی نے فیصلہ کیا کہ حالات چاہے کچھ بھی ہیں ہندوستان کو وعدہ شکنی کا مجرم نہ ہونا چاہیے۔ اور پاکستان کو پچاس کروڑ روپیہ ضرور دیا جائے۔ چنانچہ روپیہ مہاتما جی کے حکم سے ادا کیا گیا۔ کیونکہ بڑے لوگ کسی قیمت پر بھی عہد شکنی کے مجرم نہیں ہوا کرتے۔

موجودہ مہاراجہ نابھ شری پرتاب سنگھ اور ان کی والدہ کے باہمی تعلقات کشیدہ ہیں۔ ان مہاراج اور حقیقی بھائیوں کے درمیان مقدمہ بازی بھی ہو رہی ہے۔ مہاراجہ کی والدہ راجکماری امرت کور ہیلتھ گورنمنٹ کے پاس گئیں اور اپنے بیٹے کی خلاف شکایتوں کے سلسلہ میں اہ بھی کہا کہ ان کے دوسرے بچوں (یعنی مہاراجہ کے بھائیوں) کی رہائش کے لیے جگہ نہیں ہے اور ان کو ڈیرہ دون کی ایک کوٹھی دی گئی ہے جہاں یہ اپنے بچوں کے ساتھ رہ سکیں۔ راجکماری نے یہ تمام واقعات پنڈت جواہر لال نہرو سے بیان کیے۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے یہ مسئلہ مولانا ابوالکلام آزاد کے سپرد کیا۔ مولانا مرحوم نے مہاراجہ کو طلب فرمایا اور نصیحت کی کہ وہ اپنی والدہ کے مطالبات پر لبیک کہتے ہوئے ڈیرہ دون کی کوٹھی انہی کو دے دیں۔ مہاراجہ نے مولانا سے کوٹھی دینے کا وعدہ کیا۔ جب یہ واپس نئی دہلی سے دھولپور ہاؤس (جہاں مہاراجہ مقیم تھے) پہنچے اور ان کی بیوی یعنی مہارانی نے حالات سنے تو اس خاتون نے ڈیرہ دون کی کوٹھی دینے کی مخالفت کی اور کہا کہ وہ مولانا سے خود بات چیت کریں گی۔ چنانچہ یہ

میاں بیوی مولانا کی کوٹھی پہنچے۔ انہوں نے پرائیویٹ سیکرٹری محمد اجمل خاں کی معرفت مولانا کو اطلاع کرائی اور ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ مولانا نے پوچھا کہ یہ میاں بیوی کیا چاہتے ہیں؟ محمد اجمل خاں نے بتایا کہ مہاراجہ کی بیوی ڈیرہ دون کی کوٹھی راج ماتا کو دینے کے حق میں نہیں اور اس بارے میں خود بات چیت کرنا چاہتی ہیں۔ مولانا نے یہ سنا تو اجمل خاں سے کہا ''انسے کہہ دو کہ میں ایسے لوگوں سے ملنا پسند نہیں کرتا جن کو اپنی زبان کا پاس نہ ہو۔ اور جو اپنے وعدہ پر قائم نہ رہیں'' چنانچہ مہاراجہ اور ان کی بیوی نے بہت کوشش کی کہ مولانا بات سن لیں مگر مولانا نے قطعی انکار کر دیا۔ یہ واقعہ جب مولانا نے خود راقم الحروف کو سنایا تو اس واقعہ کو بیان کرنے کے بعد آپ نے یہ بھی کہا ''جو لوگ اپنی زبان اور وعدہ کے پابند نہ ہوں ان کو تو شکل بھی نہ دیکھنی چاہیے''۔

ریاست نابھ اور پٹیالہ کے جھگڑے چل رہے تھے۔ تو مہاراجہ پٹیالہ یا پٹیالہ کے بعض وزراء کے ایماء سے ریاست پٹیالہ کی حدود میں قلعہ بہادر گڑھ کے اندر بم تیار کیے گئے۔ ان بموں کے تیار کرنے کا مقصد یہ تھا کہ ریاست نابھ کی حدود میں کسی مکان میں رکھے جائیں۔ اور پھر پولیٹکل ڈیپارٹمنٹ کو اطلاع دے کر پکڑوا دیے جائیں۔ تاکہ مہاراجہ نابھ گدی سے علیحدہ کیے جا سکیں۔ چنانچہ قلعہ بہادر گڑھ کے تیار شدہ یہ بم ریاست نابھ کی حدود میں ایک نہنگ کے ہاں زمین میں دبوء گئے۔ اور اس کے بعد پولیٹکل ڈیپارٹمنٹ کو اطلاع دی گئی۔ کہ مہاراجہ نے یہ بم پٹیالہ اور راجہ سر دیا کشن وزیر اعظم پٹیالہ اور پر برٹش بڑی شخصیتوں وک ہلاک کرانے کے لیے تیار کرائے ہیں اور ریاست نابھ کی حدود میں فلاں گاؤں کے فلاں گھر میں یہ رکھے ہوئے ہیں۔ پولیٹکل ڈیپارٹمنٹ کے پاس جب یہ اطلاع پہنچی تو اڈیپارٹمنٹ کے افسروں میں تعجب اور مسرت کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ تعجب اس لیے کہ ایک والی ریاست کو بم سازی کا کارخانہ جاری کرنے کی جرات ہوئی' اور مسرت اس لیے کہ اب مہاراجہ

نابھ کو گدی سے علیحدہ کیا جاسکے گا۔ کیونکہ پولیٹکل ڈیپارٹمنٹ ایک عرصہ سے مہاراجہ کو کچلنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ گورنمنٹ آف انڈیا کے حکم سیاسی اہم واقعہ کی تحقیقات کے لیے پنجاب کے ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس سی آئی ڈی مسٹر آئس مونگر مقرر ہوئے۔ یہ افسر بہت دیانتدار بہت لائق اور قوت ارادی کا بہت مضبوط تھا۔ اس نے جب تمام حالات کا جائزہ لیا تو یہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ یہ مہاراجہ نابھ کے خلاف ایک سازش ہے۔ مگر یہ کچھ نہ کرسکا۔ کیونکہ اس کو علم تھا کہ پولیٹکل ڈیپارٹمنٹ مہاراجہ پٹیالہ کے حق میں ہے اور اس ڈیپارٹمنٹ کے افسر مہاراجہ نابھ کو کچلنا چاہتے ہیں پٹیالہ والوں نے مسٹر آئس مونگر سے درخواست کی کہ وہ گورنمنٹ کی طرف سے بم بنانے والوں کے سرغنہ اور پیشہ ور ڈاکو نجلا سنگھ کو جو مفرور ہے بطور سرکاری گواہ معافی دے دیں۔ تو نجلا سنگھ)(جو اس وقت بہادر گڑھ ریاست پٹیالہ کے قلعہ میں رکھا ہوا تھا) حاضر ہو کر مہاراجہ نابھ کے خلاف بیان دے سکتا ہے مسٹر آئس مونگر نے پٹیالہ کی یہ درخواست قبول کرنے سے انکار کردیا۔ کیونکہ وہ اس نتیجہ پر پہنچ چکے تھے کہ مہاراجہ نابھ اس معاملہ میں بے قصور ہیں۔ پٹیالہ والوں نے پھر پولیٹکل ڈیپارٹمنٹ اور مسٹر آئس مونگر پر زور دی کہ نجلا سنگھ کو معافی دے دی جائے مگر مسٹر آئس مونگر تیار نہ ہوئے۔ کیونکہ وہ یہ چاہتے تھے کہ نجلا سنگھ گرفتار ہو سکے تو گرفتاری کے بعد نہ صرف اس بم سازی بلکہ اس کے پچھلے ڈاکوں کے متعلق بھی حالات دریافت کر کے اس سے سچا بیان لیا جائے۔ اور اگر انہوں نے نجلا سنگھ کو معافی دے دی اور معاف کردینے کا وعدہ کرلیا تو پھر یہ بطور ایک انگریز کے وعدہ شکنی نہ کرسکیں گے۔ کیونکہ برٹش قوم کا انفرادی کریکٹر ہے کہ وہ اپنی زبان کی سختی سے پابندی کرتی ہے۔ چنانچہ جب ان پر نجلا سنگھ کو معاف کردینے اور وعدہ معاف گواہ بنانے کے لیے پٹیالہ والوں نے بار بار زور دیا تو انہوں نے فرمایا:

’’میں ڈاکوؤں اور چوروں کو چوہوں سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔ اور میں نے

ایسے سینکڑوں چوہے گرفتار کر کے جیلوں میں بھیجے ہیں۔ بجلا سنگھ کب تک مفرور رہ سکتا ہے۔؟ آخر یہ گرفتار ہوگا اور اپنے جرائم کی سزا پائے گا۔ میں نہ تو اس کو معافی دے سکتا ہوں اور نہ معاف کر دینے کے بعد اپنے وعدے سے منحرف ہو سکتا ہوں میں چونکہ اپنی زبان کا بطور ایک انگلش مین کے پابند ہونا اپنا فرض سمجھتا ہوں لہذا اس کو معافی نہیں دے سکتا"۔

زبان کی پابندی کے اعتبار سے اس واقعہ سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ برٹش قوم کس قدر بلند ہے اور کیا یہ فرشتہ یا دیوتا کہلانے کی مستحق نہیں۔

ہندوستان کے آزاد ہونے سے پہلے جب بنگال بم سازی کا مرکز تھا تو کلکتہ کے ایک کالج کی لڑکی نے بنگال کے انسپکٹر جنرل پولیس کو پستول کی گولی سے ہلاک کر دیا۔ اور یہ لڑکی فرار ہو گئی۔ کئی برس یہ لڑکی فرار رہی اور پولیس اس کو گرفتار نہ کر سکی۔ اس کے بعد جب مہاتما گاندھی کی عدم تعاون اور عدم تشدد کی تحریک ملک میں جاری ہوئی تو یہ لڑکی ایک روز واردہا آشرم میں مہاتما جی کے پاس پہنچی۔ اس نے مہاتما سے علیحدگی میں بات چیت کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ مہاتما جی نے اس سے تنہائی میں باتیں کرنے کا وعدہ کر لیا۔ اور وہ اس بات چیت کا کسی سے ذکر نہ کریں گے۔ بات چیت میں اس نے بتایا کہ انسپکٹر جنرل پولیس بنگال کا قتل اس کے ہاتھوں ہوا تھا۔ اور مہاتما جی کا اس کے مستقبل کے بارے میں کیا مشورہ ہے۔ مہاتما جی نے اپنے شعار اور اپنے عدم تشدد کے کریکٹر کے مطابق یہی رائے دی کہ وہ اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کر دے چاہے اس کو پھانسی کی سزا ہی کیوں نہ ملے۔ لڑکی اس مشورہ سے متفق نہ ہوئی اور چلی گئی۔ چند روز کے بعد مرکزی پولیس کو اطلاع ملی کہ وہ لڑکی مہاتما جی سے مشورہ لینے واردھا آشرم میں آئی تھی۔ پولیس کے افسر تحقیقات کے لیے واردھا آشرم پہنچے ار مہاتما جی سے سوالات کیے گئے۔ مہاتما جی نے ان کے کسی بھی سوال کا جواب دینے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ وہ اس لڑکی کے آنے اور بات چیت کرنے سے انکار کرتے

ہیں تو یہ دروغ بیانی تھی جس کے لیے آپ کسی قیمت پر بھی تیار نہ ہو سکتے تھے اور اگر اس لڑکی نکے آنے اور بات چیت کا اقرار کرتے ہیں تو پھر اس وعدہ شکنی کے مرتکب ہوتے ہیں جو وعدہ انہوں نے لڑکی سے کیا تھا۔ چنانچہ پولیس کے افسر کسی بھی سوال کا جواب لیے بغیر واپس چلے گئے۔ اس واقعہ سے بھی اندازہ ہو سکتا ہے کہ وعدہ کی پابندی کو گاندھی ازم میں بھی کتنا بلند مرتبہ حاصل ہے۔

سیالکوٹ جیل کا ایک واقعہ میں اپنی زندگی میں کبھی بھی فراموش نہیں کر سکتا جو مجھے لالہ گنیش داس ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ جیل نے بتای۔ سیالکوٹ کی ایک گلی (جس میں جانے کے لیے صرف ایک ہی راستہ تھا یعنی یہ گلی دوسری طرف سے بند تھی) کی ایک خاتون کا تعلق ایک دوسرے محلّہ کے نوجوان سے ہو گیا۔ مرد کے مقابلہ پر عورت میں فطرتاً اپنی عزت کا احساس زیادہ ہوا کرتا ہے۔ اور وہ کسی قیمت پر بھی اپنی ذلت کو برداشت نہیں کر سکتی۔ خاتون نے محبوب سے یہ وعدہ لیا کہ وہ اس کے اور اپنے تعلق کا کسی دوسرے سے کبھی ذکر نہ کرے گا۔ چنانچہ یہ شخص اپنی محبوبہ سے ملنے کے لیٔ عام طور پر رات کے گیارہ بارہ بجے کے بعد اس خاتون کے گھر آتا جب گلی کے لوگ اپنے اپنے گھروں میں سوئے ہوتے' اور گلی سنسان ہوتی۔ اور علی الصبح روشنی ہونے سے پہلے اپنے گھر واپس چلا جاتا۔ اس سلسلہ کو ایک عرصہ ہو گیا۔ ایک روز جب یہ شخص اپنی محبوبہ کے گھر میں تھا تو ایک چور چوری کرنے کی نیت سے اس گلی کے ایک دوسرے مکان میں داخل ہوا۔ گھر کے لوگ جاگ پڑے مالک نے چور کو پکڑنے کی کوشش کی اور چور بھاگ گیا۔ چور کے بھاگنے اور گھر کے مالک کے ہلاک ہونے کے بعد اس گھر سے جب شور بلند ہوا تو گلی کے لوگ جمع ہو گئے اور مجمع کے علاوہ پولیس بھی موقع پر پہنچ گئی۔ جب یہ کیفیت تھی تو اس شخص کے سامنے جو اپنی محبوبہ کے گھر میں تھا' سوال پیدا ہوا' کہ گلی تو دوسری طرف سے بند ہے' اب یہ واپس اپنے گھر کس طرح جائے گا کیونکہ راستہ میں لوگ جمع ہیں۔ ظاہر ہے کہ کوئی صورت نہ تھی۔ بہر حال وہ گھر سے نکلا اور مجمع نے

جب اس دوسرے محلّہ کے اجنبی کو دیکھا تو پولیس کے حوالے کر دیا۔ اس سے پوچھا گای کہ رات کے وقت یہ اس گلی میں کیوں آیا۔ یہ کچھ جواب نہ دے سکا۔ کیونکہ اس کو اپنی محبوبہ سے کیے گئے عہد کو راز میں رکھنے اور اس بدنامی کا احساس تاھ جب یہ کوئی تسلی بخش جواب نہ دے سکا تو سب لوگوں اور پولیس کو یقین ہو گیا کہ یہی چور ہے اور اسی کے ہاتھوں سے گھر کا مالک ہلاک ہوا ہے۔ چنانچہ اس شخص کا قتل اور چوری کے جرم میں عدالت میں چالان ہوا۔ یہ سیشن سپرد کیا گیا۔ سیشن جج نے اس کو پھانسی کی سزا دی۔ ہائیکورٹ میں اپیل کی گئی تو جج ہائیکورٹ نے اس سے سوال کیا کہ اگر تم مجرم نہیں ہو تو رات کے وقت اس گلی میں کیوں گئے؟ یہ سوال سننے کے بعد یہ کوئی جواب نہ دے سکا۔ کیونکہ اصل واقعہ بتاتا ہے کہ تو یہ عہد شکنی کا مجرم ہوتاہ اور اس کی محبوبہ کی عزت کو خطرہ ہے اس نے جب اس سوال کا کوئی تسلی بخش جواب نہ دیا تو ہائیکورٹ کے جج نے اپیل خارج کر دی اور چند روز کے بعد اس کو سیالکوٹ جیل میں پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ جیل کے سٹاف سے قیدیوں کے جرائم چھپے نہیں رہتے اور ان کو علم ہو جاتا ہے کہ فلاں شخص مجرم ہے اور فلاں بے گناہ۔ لالہ گنیش داس ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ جیل کو علم ہو چکا تھا کہ اس شخص نے نہ تو قتل کیا ہے اور نہ چوری کی نیت سے اس گلی میں گیا تھا۔ لالہ گنیش داس نے اس سے پوچھا کہ وہ عورت کون تھی۔ جس کی عزت کو بچانے اور اپنے وعدہ پر قائم رہنے کے لیے تم پھانسی پر چڑھنے والے ہو لالہ گنیش داس کے اس سوال پر اس نے جواب دیا کہ ”لالہ جی اگر میں نے اس خاتون کا نام لینا ہی ہوتا تو سیشن جج اور ہائیکورٹ جج ک سامنے کیوں نہ لیتا۔ اب تو اس راز کے ساتھ ہی مجھے پھانسی کے تختہ پر چڑھنا چاہیے“ چنانچہ یہ شہید راز اور شہید وعدہ چند روز بعد پھانسی پر چڑھا دیا گیا

پنڈت جیون لال مٹو پنجاب پولیس میں انسپکٹر سی آئی ڈی تھے۔ یہ اپنے ہمعصروں میں بہت لائق اور ہوشیار تسلیم کیے جاتے تھے اور سیاسی سازشوں میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے معاوضہ میں انکو کنگز پولیس میڈل بھی ملا ہوا تھا۔ (یہ میڈل بہت کم

افسروں کو ملتا ہے اور اس تمغہ کو حاصل کرنے والا زندگی بھر کچھ ماہوار الاؤنس یا پنشن کا حق دار بھی رہتا ہے) مارشل لاء کے زمانہ میں آپ] نے بھسوڑ (ریاست پٹیالہ) کے مشہور انقلاب پسند ماسٹر موتا سنگھ کو گرفتار کرلیا۔ ماسٹر موتا سنگھ کئی برس سے مفرور تھے مفروری کی حالت میں ہی افغانستان گئے جہاں سے کنگ نادر خاں سے ان کے گہرے دوستانہ تعلقات تھے ماسٹر موتا سنگھ کو گرفتار کرنے کے بعد آپ ماسٹر جی کو لدھیانہ ریلوے سٹیشن پر لائے۔ تاکہ لاہور جانے والی گاڑی پر سوار ہوں' کیونکہ لدھیانہ ہی اس گاڑی کے لیے جنکشن تھا۔ لاہور جانے والی گاڑی میں ابھی کئی گھنٹے باقی تھے تو ماسٹر موتا سنگھ نے پنڈت جیون لال سے کہا "کہ آپ لدھیانہ میں اپنے ایک رشتہ دار سے مل کر اسے گرفتاری کی اطلاع دینا چاہتے ہیں اور پنڈت ج ان کو ان کے رشتہ دار کے ہاں لے جائیں۔ پنڈت جیون لال بہت ہوشیار اور تجربہ کار تھے وہ جانتے تھے کہ بڑے لوگ غلط وعدے نہیں کیا کرتے۔ اور اپنے وعدے پر سختی کے ساتھ پابند ہوتے ہیں۔ اور ماسٹر موتا سنگھ بھی ایک بلند شخصیت ہیں۔ آپ نے ماسٹر موتا سنگھ سے کہا "اگر آپ چاہیں تو اکیلے چلے جائیں مگر وعدہ کیجیے کہ لاہور والی گاڑی کے آنے سے پہلے سٹیشن پر پہنچ جائیں گے"۔ ماسٹر موتا سنگھ نے جواب سے حیران کہ وہ گرفتاری کی حالت میں ہیں اور ان پر اکیلے چلے جانے کا بھروسہ کیا جا رہا ہے۔ پنڈت جیون لال مٹو کی اجازت سے ماسٹر موتا سنگھ اکیلے ریلوے سٹیشن سے شہر گئے اور ایک گھنٹہ کے اندر واپس آ گئے۔ پنڈت جیون لال مٹو کا بیان ہے کہ ماسٹر موتا سنگھ کو اکیلے جانے کی اجازت دینا ایک بہت بڑے خطرہ کو لبیک کہنا تھا۔ کیونکہ اگر ماسٹر موتا سنگھ فرار ہو جاتے و پنڈت جیون لال کے ملازمت میں رہنے کا سوال ہی پیدا ہنہیں ہوتا تھا۔ اور ان کا مستقبل بالکل تباہ ہو جاتا۔ مگر وہ جانتے تھے کہ اپنے وعدے کی پاسداری صرف لوفر اور غیر ذمہ دار لوگ ہی نہیں کیا کرتے ورنہ جو لوگ کچھ بھی بلند ہوں وہ اپنی زبان کے پابند ہوتے ہیں۔

ہندوستانکے آزاد ہونے کے بعد ہندوستان نے بہت ترقی کی ۔کوئی قصبہ کوئی تحصیل کوئی ضلع یا کوئی شہر ایسا نہ تھا جہاں کارخانے قائم نہ کیے گئے ہوں۔صنعت کے اعتبار سے ہندوستان بہت بلند ہوگی اور پاکستان بھی اس اعتبار سے اب قدم بڑھا رہا ہے۔مگر جہاں تک اخلاقی گراوٹ کا سوال ہے ہندوستان اور پاکستان دونوں ممالک مین شرمناک حد تک گراوٹ پیدا ہو چکی ہے ۔جس کی وجہ ان ممالک کے وزراء اور لیڈر رہیں جو ووٹ لینے کے لیے پبلک کے ساتھ دن رات جھوے اور غلط وعدے کرتے ہیں۔ان کو اپنی وعدہ شکنیوں پر شرم محسوس نہیں ہوتی ۔اور سو میں سے نوے وزراء ایسے ہیں جنسے جو چاہو وعدہ لے لو۔اور جو ہر روز ہی نہیں ہر گھنٹہ اور ہر منٹ وعدہ شکنیوں کے مرتکب ہوتے ہیں ۔انکی اس اخلاقی گراوٹ کا اثر پبلک پر بھی پڑ رہا ہے۔ چنانچہ دونوں ممالک کی پولیس کی تو یہ حالت ہے کہ ہر ملزم گرفتار ہونے پر اس کو بچانے کا جھوٹا وعدہ کر کے اس سے بیان لیا جاتا ہے اور بیان لینے کے بعد اس سے جیل بھر جاتے ہیں ۔اور اکثر ایسا ہوتا ہیک ملزم بے گناہ ہوتے ہوئے بھی مقدمہ کی گرفت سے بچنے کے لیے جرم کا اقرار کر لیتے ہیں۔ چنانچہ پولیس کی اس شرمناک گراوٹ پر اب تو گورنرز اور ہائیکورٹوں کے ججوں نے بھی آنسو بہانے شروع کر دیے ہیں ۔

الیکشن کے لطائف

ہندوستان اور پاکستان جیسے ممالک میں جہاں کہ پبلک ووٹ کی قدر و قیمت سے قطعی ناآشنا ہیں اور انتخابات میں کسی امیدوار کو ووٹ دینا صرف ایک ذاتی منفعت کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے' اور انتخابات کو فتنہ پردازیوں کی طرح الیکشن پردازیاں ہی قرار دیا جانا چاہیے۔اس سلسلے کے چند ذاتی تجربات ملاحظہ فرمایئے:

چند برس ہوئے دہلی میونسپلٹی کے انتخابات تھے اور دریا گنج کے علاقہ سے ایک تو کمیونسٹ امیدوار تھے اور دوسرے انڈی پنڈنٹ ۔انتخابات کی رونق اپنے جوبن پر تھی تو انڈی پنڈنٹ امیدوار کے حق میں پراپیگنڈہ کرنے کے لیے ایک ڈیپوٹیشن دفتر ''ریاست'' میں آئی ۔راقم الحروف نے ان سے پوچھا فرمایئے کیا حکم ہے؟ ڈیپوٹیشن کے ایک سرکردہ ممبر نے جواب دیا کہ یہ امیدوار اس علاقہ سے کھڑے ہوئے ہیں اورس ڈیپوٹیشن کے آنے کی غرض یہ ہے کہ ایڈیٹر ریاست انکو اپنا ووٹ دیں۔اس پر میرے اور امیدوار کے درمیان یہ بات چیت ہوئی۔

میں: آپ میونسپل کمیٹی کی ممبری کے لیے کیوں کھڑے ہورہے ہیں؟

امیدوار: تاکہ میونسپل کمیٹی میں جاکر لوگوں کی سوا کی جائے

میں: تو آپ کے خیال میں آپ بھی اپنے گلی کوچوں کے لوگوں کی سیو کر کے اپنا کام ختم کر چکے ہیں ح اور اب اپنے علاقہ سے باہر شہر کی خدمت انجام دینا چاہتے ہیں۔

امیدوار: جی ہاں! میری خواہش تو یہی ہے۔

میں: آپ یہ غلط بیانی کیوں فرمارہے ہیں۔کیونکہ جہاں تک سیوا یا خدمت کا سوال ہے لوگ اتنے دکھی ہیں کہ اگر آپ اپنی زندگی بھر میں صرف ایک گلی یا محلّہ کی خدمت انجام دیں تو س کے لیے ایک زندگی کیا کئی جنم چاہئیں۔یہ کہیے کہ آپ ڈپٹی کمشنر سے ہاتھ ملانے کی غرض سے اور ممری کے ذریعہ ذاتی مفادات حاصل کرنے

کے لیے میونسپلٹی میں جانا چاہتے ہیں۔

میرا یہ جواب سن کر ڈیپوٹیشن کے ممبروں نے سمجھ لیا کہ یہ ووٹ نہ مل سکے گا چنانچہ ڈیپوٹیشن واپس چلا گیا اور میں نے اپنا ووٹ ان کے حق میں استعمال نہ کیا۔ کیونکہ میرے ضمیر کے مطابق کسی غیر مستحق شخص کو اپنا ووٹ دینا پبلک کے ساتھ بے انصافی اور گناہ ہے۔

راقم الحروف کے ایک سکھ دوست ذاتی اعتبار سے بہت دلچسپ اور لطیفہ گو ہیں۔ آپ لدھیانہ میں رہتے ہوئے اور پنجاب اسمبلی کے ممبر رہے ہیں۔ آپ جب بطور امیدوار کھڑے ہوئے تو اپنے حلقہ میں گئے۔ الیکشن میں صرف تین دن باقی تھے۔ اور اپ پروپیگنڈہ اور اپنا اثر و رسوخ استعمال کرنے کے لیے بے حد مصروف تھے۔ کوئی اپنے ووٹ کی قیمت دس روپیہ اور کوئی ایک سو روپیہ طلب کرتا۔ کوئی شراب کی ایک بوتل پر مطمئن تھا اور کوئی چاہتا تھا کہ ووٹ کی قیمت کے طور پر امیدوار اس کے مقدمہ میں تحصیلدار یا مجسٹریٹ سے سفارش کرے۔ ایک ووٹر نے مطالبہ کیا کہ اگر امیدوار گانے کی محفل منعقد کرے اور اس محفل میں گانے کے لیے کسی طوائف کو منگایا جائے اور شراب کا دور ہو تو اس ووٹر کے زیر اثر پچاس کے قریب ووٹ آپ کے حق میں ووٹ دیں گے۔ چنانچہ قہر ووٹر بر جان امیدوار۔ اسی روز آپ نے اپنا ایک نمائندہ فیروز پور بھیج کر وہاں سے مجرا کرنے والی ایک طوائف ساٹھ روپے نقد اور ریلوے کا کرایہ دیکر منگائی۔ شراب کی ایک درجن بوتلیں آئیں اور ووٹر صاحبان کی دعوت ہوئی۔ یہ امیدوار بہت دلچسپ اور لطیفہ گو ہیں۔ آپ نے جب یہ حالات دیکھے تو اپنے ایک دوست سے کہا کہ ”یہ کمبخت ووٹران آئندہ تین روز میں جو بھی مطالبہ کریں گے میں پورا کروں گا۔ کیونکہ یہ ووٹ دینے کے وقت تک اپنے آپ کو میرا داماد سمجھتے ہیں اور ناجائز مطالبات پیش کیے جا رہے ہیں۔ مگر میں آئندہ پانچ برس تک انکا داماد بن رہوں گا اور انکے ووٹ کے طفیل زیادہ سے زیادہ ذاتی مفاد حاصل کروں گا۔ چنانچہ

روپیہ اور دوسرے ناجائز استعمال کرنے کے بعد یہ سردار جی ممبر اسمبلی منتخب ہوئے اور انہوں نے ڈنکے کی چوٹ پر لیڈری کا لطف اٹھایا۔

رائے بہادر ڈاکٹر متھرا داس آف موگا آنکھوں کے سرجنوں میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ آپ نے آنکھوں کے اتنے اپریشن کیے ہیں کہ جن کا مقابلہ دنیا کا کوئی سرجن نہیں کر سکتا۔ ذاتی اعتبار اور کریکٹر کی بلندی کے اعتبار سے بھی آپ بہت ہی بلند ہیں جنکی مہاتما گاندھی نے بھی ریڈیو پر تعریف کی تھی۔ انہوں نے ایک غلطی (بلکہ اپنی زندگیکی سب سے بڑی غلطی) کی آپ پنجاب اسمبلی کی ممبری کے لیے کھڑے ہو گئے۔ آپ کو یقین تھا کہ اس حلقہ میں ہزاروں لوگ آپ کے مداح اور زیر بار احسان ہیں وہ آپ کو ووٹ دیں گے آپ کے مقابلہ پر کانگرسی امیدوار تھا۔ آپ کو اور آپ کے تمام دوسوں کو یقین تھا کہ آپ بہت بڑی کثریت سے کامیاب ہوں گے۔ مگر ووٹنگ سے چار روز پہلے پنڈت نہرو وہاں پہنچ گئے اور انہوں نے کہا کہ گو ڈاکٹر متھرا داس بہت ہی بلند اور نیک ہیں مگر سوال کانگرس کے پرسٹیج کا ہے۔ اس لیے ووٹ کانگرس کے نمائندہ کو دیا جائے۔ جس نے انگریزوں سے مقابلہ کیا۔ پنڈت جی کی اس تقریر کا نتیجہ یہ ہو کہ ڈاکٹر صاحب ناکام ہو گئے۔ کیونہ اس وقوت مناسب اور غیر مناسب کا نہیں بلکہ کانگرسی اور غیر کانگرسی کا سوال تھا۔

انتخابات کے سلسلہ میں کانگرس کے عروج و زوال کے متعلق بھی ایک دلچسپ واقعہ سن لیجیے۔ انگریزوں کے زمانہمیں الیکشن ہوا۔ تو سیالکوٹ کے حلقہ میں ایک امیدوار تو کانگرس کا تھا جو نہ سرف دنیاوی اعتبار سے بلکہ قابلیت کے لحاظ سے بھی معمولی تھا۔ اور اس کے مقابلہ میں اک رائے بہادر تھے جو بہت بڑے رئیس اور اعلی تعلیم یافتہ تھے۔ رائے بہادر صاحب کے مداحوں کا ایک ڈیپوٹیشن ایک ووٹ کی ترغیب دینے کے لیے ایک ووٹر کے پاس پہنچا۔ اس ڈیپوٹیشن کے ایک ممبر نے جب یہ کہا کہ کانگرسی امیدوار کے مقابلہ پر رائے بہادر بہت لائق ہیں تو اس ووٹر نے جواب

دیا کہ "رائے بہادر چاہے کتنے بھی لائق ہوں مگر وہ کانگرسی نہیں۔ ہم تو کانگرس کے نمائندہ کو ووٹ دیں گے کانگرس چاہے کسی بازاری کتے کو کھڑا کر دے۔ یہ واقعہ تو کانگرس کے عروج کے زمانہ کا ہے۔ اور زوال کیا یہ کہ سیالکوٹ کے رہنے والے اسی شخص کے پاس (جو پرانا قلعہ نئی دہلی میں آباد ہے) کانگرسیوں کا ایک ڈیپوٹیشن ووٹ لینے گیا تو اس نے جواب دی کہ کانگرس کو ووٹ نہ دوں گا چاہے بازاری کتے کو ووٹ دینا پڑے"۔

راقم الحروف نے پڑوس میں ایک بزرگ رہا کرتے تھے۔ جو دوسرے چوتھے روز تشریف لاتے اور ضرورت کے مطابق مشورہ بھی طلب فرماتے۔ انتخابات کا زمانہ تھا اور شہر میں دس دس روپیہ میں ووٹ کا اقرار فروخت ہو رہا تھا۔ بعض جگہوں پر ووٹ کا نرخ بیس اور تیس روپیہ تک جا پہنچا تھا۔ آپ نے فرمایا "جناب ہمارے تو دو ووٹ ہیں ایک میرا اور ایک میرے پہاڑیے ملازم کا۔ تو ایک ایک سو روپے سے کم قیمت پر ووٹ نہ دیں گے" یہ سنکر ان بزرگ نے فرمایا "ہمارے گھر کے تو آٹھ ووٹ ہیں اس پر میں نے جواب دیا کہ آپ کے آٹھ سو روپے کھرے۔ جس امیدوار سے چاہو مل جائیں گے۔ تیسرے وز یہ حضرت قریب کے سکول میں ووٹ دینے پہنچے۔ امیدواروں نے ان کی آؤ بھگت کی کہ ووٹ ان کو دیا جاء۔ مگر جب امیدواروں نے ان سے سو سو روپیہ فی ووٹ یعنی آٹھ سو روپیہ کی رقم سنی تو ٹھنڈے ہو گئے۔ کیونکہ اس روز اس علاقے میں ووٹ کا ریٹ دس روپیہ تھا۔ اس طرح یہ بزرگ منہ دیکھتے رہ گئے۔

اکثر شراب کی دکانوں پر بکری کے اعداد و شمار حاصل کیے جائیں تو ثابت ہو جائے گا کہ انتخابات کے دنوں میں ان دکانوں کی سیل میں کئی گنا اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس اضافہ کا باعث مہاتما گاندھی کے نام پر ووٹ مانگنے والے کانگرسی ہی زیادہ ہوا کرتے ہیں کیونکہ دوسری بدنصیب پارٹیاں برسر اقتدار نہ ہونے کے باعث روپیہ زیادہ صرف

نہیں کرسکتیں۔

مجھے چاہے جمہوریت کا مخالف سمجھ لیا جائے مگر واقعہ یہی ہے کہ دو برس ہوئے میں جب پاکستان کے صدر جنرل ایوب سے ملا اور انہوں نے ایک صاف دل فوجی شخصیت ہونے کے باعث دل کھول کر باتیں کیں تو میں نے ان سے کہا کہ جن ممالک میں پبلک ووٹ کی قدر و قیمت سے ناآشنا اور نافرض شناس ہوں وہاں جمہوریت کے معنی ''چھوٹے چوروں کے نمائندے بڑے چور'' ہوا کرتے ہیں۔ پاکستان کی پبلک میں ووٹ کی قدر و قیمت کا احساس پیدا کیا جائے اور پھر جمہور ادارے یعنی اسمبلیاں اور پارلیمنٹ قائم کی جائے۔ کیونکہ جمہوری ادارے امریکہ اور انگلستان جیسے تعلیم یافتہ ملکوں میں تو ایک رحمت ہیں۔ جہاں لوگ ووٹ کی قدر و قیمت جانتے ہیں اور مشرقی ممالک میں یہ ایک لعنت ہے۔ جہاں دس دس روپیہ ووٹ فروخت ہوتا ہے۔ اور پچاس پچاس روپیہ میں ضمیر کی نیلامی ہوتی ہے۔

انتخابات کی کند چھری سے اچھے بلند نی اور دیانتدار لوگ کیونکر سیاسی اعتبار سے ذبح کیے جاتے ہیں۔ اس کا اندازہ بھارت میں ڈاکٹر کاٹجو مسٹر اشوک' پنڈت شر رام شر ما اور اچاریہ کرپلانی جیسے لوگوں کی شکست سے لگایا جاسکتا ہے۔

مزاح کے تختۂ مشق

ہنسی (انسان کا بے اختیاری کے عالم میں مسکرا دینا یا قہقہہ مارنا) کے مسئلہ پر مشہور مزاح نویس مسٹر غلام احمد فرقت کاکوروی نے ایک بہت طویل مضمون لکھا ہے جو ابھی شائع نہیں ہوا۔ اس مضمون میں انہوں نے اس مسئلہ پر بہت ہی دلچسپ اور مفید بحث کی ہے۔ یہ مضمون انہوں نے غالباً یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرنے کے لیے لکھا ہے۔ مگر میں ہنسی کو تین اسباب میں تقسیم کرنے کا مدعی ہوں۔ اول فحش یعنی جب کسی کے منہ سے فحش یا برہنہ کلمہ سنا جائے تو انسان ہنس یا مسکرا دیتا ہے۔ دوسرے بے وقوفی کی بات اور تیسرے غیر مناسب اور غیر موزوں واقعہ (مثلاً کوئی سکھ ٹوپی پہن لے) یعنی ہنسی یا مسکراہٹ صرف ان تین بنیادوں پر قائم ہوا کرتی ہے اور دنیا میں کوئی انسان بھی ایسا نہیں جو دن میں کئی بار ہنس نہ دیتا ہو یا ہنسی کو پسند نہ کرتا ہو۔ چنانچہ میں بھی جب کام سے فارغ ہو جاؤں تو چاہتا ہوں کہ ہنسی اور مذاق کے چند لمحے نصیب ہوں تاکہ کام اور محنت کی تھکاوٹ دور ہو۔ اور اس غرض کے لیے عام طور پر شام کا وقت رکھتا ہوں۔ اس سلسلہ کے چند واقعات سنیئے۔

بہت برس ہوئے میرے پڑوس میں ایک صاحب رائے صاحب لالہ گوپال داس آنریری مجسٹریٹ رہا کرتے تھے۔ یہ لالہ گوپال داس زندگی بھر پنجاب میں ایکسٹرا اسسٹنٹ رہے۔] پنشن لینے کے بعد انہوں نے دہلی میں رہائش اختیار کی اور وہاں آنریری مجسٹریٹ مقرر ہو گئے۔ آپ ڈھانچہ کے مجسٹریٹ تھے جو ڈالیاں اور نذرانے قبول کر لیا کرتے تھے۔ اور مقدمات میں سفارش کو بھی برا نہ سمجھتے تھے۔ خاندانی لحاظ سے ان کی صاحب زادی بخشی سر ٹیک چند جج ہائیکورٹ سے بیاہی ہوئی تھیں۔ اور ان کی رشتہ داریاں اچھے کھاتے پیتے گھرانوں میں تھیں۔ لالہ گوپال داس دوسرے تیسرے روز شام کے وقت میرے ہاں تشریف لاتے اور ان کو کبھی کبھی اپنی کار میں سیر کے لیے بھی لے جاتا۔

تبادلہ آبادی کے بعد اب تو دہلی کی آبادی بیس لاکھ کے قریب ہے۔ مگر اس زمانہ میں اس شہر کی آبادی چار لاکھ کے قریب تھی۔ کم آبادی کے باعث اخبارات کے پڑھنے والے حلقوں میں شاید ہی کوئی ایسا شخص ہوگ جو میرے نام سے اور اخبار ریاست سے واقف نہ ہو۔ اور دہلی کی جتنی بھی اہم یا مشہور شخصیتیں تھیں۔ ان میں سے ہر ایک دوسرے سے واقف تھا۔ اس زمانہ میں میرے ہاں آنے والے اصحاب میں ایک صاحب ماسٹر امیر چند کھنہ بھی تھے جو دہلی میں انکم ٹیکس کا کاروبار کرتے ...... رائے صاحب گوپال داس بھی ان ماسٹر میر اچند ھنہ سے واقف تھے کیونکہ ان دونوں کا کبھی کبھی میرے ہاں ملنے کا اتفاق ہوتا۔ میں ایک روز شام کے وقت رائے صاحب گوپال داس کو اپنی کار میں سیر کے لیے گلے گیا ہم کشمیری دروازے سے باہر علی پور روڈ] پر جا رہے تھے وائے صاحب نے ایک کوٹھی پر ایک سائن بورڈ دیکھا جس پر انگریزی حروف میں ''امیر چند کھنہ'' لکھا تھا۔ یہ شاندانہ کوٹھی دہلی کے ایک بہت بڑے رئیس لالہ سری رام (مصنف خمخانہ جاوید) کے داماد امیر چند کھنہ کی تھی۔ چونکہ لالہ سری رام کے ہاں اولاد زینہ نہ تھی ان کی لاکھوں کی جائیداد بھی امیر چند کھنہ کو ملی تھ رائے صاحب گوپال داس نے جب یہ سائن بورڈ دیکھا تو آپ نے فرمایا کہ کیا یہ کوٹھی ان ہی ماسٹر امیر چند کھنہ انکم ٹیکس پریکٹیشنر کی ہے۔ جو آیا کرتے ہیں؟ مجھے شرارت سوجھی۔ میں نے رائے صاحب کے اس سوال کے جواب میں جی ہاں کہہ دیا۔ رائے صاحب کو یقین ہوگیا کہ میرے ہاں آنے والے انکم ٹیکس پریکٹیشنر ماسٹر امیر چند کھنہ ہی اس کوٹھی کے بھی مالک ہیں۔ چنانچہ اسکے بعد رائے صاحب نے پوچھا کہ جب اتنی بڑی اور شاندار کوٹھی امیر چند جی کے پاس ہے تو یہ چونے منڈی کے ایک معمولی محلّہ میں کیوں رہتے ہیں؟ یہ سن کر میں نے جواب دیا امیر چند کنجوس آدمی ہے۔ کوٹھیاں تو اس کے پاس کئی ہیں جو دوسرے لوگوں کو کرایہ پر دے رکھی ہیں اور یہ خود ایک معمولی مکان میں چونے منڈی میں رہتا ہے۔ میرا یہ جواب سن کر رائے

صاحب خاموش ہو گئے ۔اور دوسری باتیں شروع رک دیں ۔ رائے صاحب کو یہ یقین ہو گیا کہ مریے ہاں اانے والے ماسٹر امیر چند کھنہ لاکھوں روپیہ کی جائیداد اور کوٹھیاں رکھتے ہیں ۔اور کنجوس ہونے کے باعث انہوں نے یہ کوٹھی کرایہ پر دے رکھی ہیں اور یہ خود چونے منڈی کے ایک معمولی مکان میں رہتے ہیں ۔

پانچ سات روز کے بعد ایک دن ماسٹر امیر چند کھنہ میرے ہاں آئے ہوئے تھے و رائے صاحب گوپال داس بھی تشریف لائے ۔ نمستے اور آداب عرض کے بعد بیٹھے تو رائے صاحب نے ماسٹر امیر چند سے کہا کھنہ صاحب علی پور روڈ والی کوٹھی اپ کی تو بہت شاندار ہے ۔ چند روز ہوئے ہم سیر کو گئے تو دیکھی تھی ۔ میں نے رائے صاحب سے جب یہ سنا تو میں نے فوراًلالہ امیر چند کھنہ کو اشارہ کر دیا ۔وہ سمجھ گئے کہ یہ رائے صاحب سے مذاق ہو رہا ہے ۔آپ نے جواب دی کہ آپ کی مہربانی ہے گویا کہ ماسٹر امیر چند کھنہ نے بھی میرے بیان پر مہر لگادی ۔اور رائے صاحب کو پورا یقین ہو گیا کہ علی پور روڈ والی کوٹھی فی الحقیقت ان ماسٹر صاحب امیر چند ہی کی ہے ۔اور یہ کنجوس ہونے کے باعث خود چونے منڈی کے ایک مکان میں رہتے ہیں ۔

اس واقعہ کے تین چار سال بعد نواب بھوپال والے مقدمہ میں ہوشنگ آباد گیا ۔مقدمہ کی وہاں اس خیال سے ہر روز ساعت ہو رہی تھی کہ یہ جلد ختم کر دیا جائے ۔ میں وہاں پندرہ روز مسلسل رہا ۔میری غیر حاضر میں رائے صاحب روزانہ اخبار ہندوستان ٹائمز پڑھا کرتے تھے ۔آپ نے ایک خبر پڑھی جس میں اطلاع دی گئی تھی کہ مسٹر امیر چند کھنہ کی بیوی (یعنی مرحوم مسٹر سری رام مصنف خمخانہ جاوید کی صاحبزادی) کا انتقال ہو گیا ہے ۔اور تین روز بعد چوتھا کہ رسم ادا ہو گی ۔ رائے صاحب نے جب یہ خبر پڑھی تو آپ کو افسو ہوا کیونکہ ماسٹر صاحب امیر چند کھنہ ان کو ملا کرتے تھے ۔ تین روز بعد انہوں نے میرے ہاں سے معلوم کیا کہ اگر میں ہوشنگ آباد سے واپس آ گیا ہوں تو ماتم مرتسی کے لیے دونوں اکٹھے چلیں ۔ میں ابھی واپس نہ آیا تھا ۔رائے صاحب

پرانے زمانہ کے وضعدار لوگوں میں سے تھے آپ نے ماسٹر امیر چند کھنہ کے ہاں ماتم پرسی
اور چوتھے کی رسم میں شامل ہونا ضروری سمجھا اور آپ تنہا ہی تانگہ میں امیر چند کے ہاں
چونے منڈی تشریف لے گئے۔ یہ جب وہاں پہنچے تو ماسٹر امیر چند کھنہ میز پر بیٹھے
اپنے کسی موکل کے انکم ٹیکس کے کاغذات دیکھ رہے تھے۔ آپ حیران کہ آج ان کی
بیوی کا چوتھا ہے اور یہ میز پر بیٹھے کاغذ ادیکھ رہے ہیں۔ یہ بھی ماسٹر جی کے پاس دوسری
کرسی پر بیٹھ گئے اور ان کو جرات نہ ہوئی کہ یہ اظہار افسوس یا ماتم پرسی کرتے۔ تھوڑی دیر
بعد امیر چند نے پوچھا فرمایئے رائے صاحب! آج کیسے تشریف لائے؟ رائے
صاحب کیا جواب دیتے۔ کچھ تامل کے بعد کہا کہ میں چوتھے کی رسم میں شامل ہونے
کے خیال سے آیا تھا۔ آپ کی بیوی کے انتقال پر بہت افسوس ہے۔ ہندوستان ٹائمز میں
یہ خبر پڑھی ماسٹر امیر چند یہ سن کر کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ ان کو وہ مذاق یاد آ گیا جو علی پور
روڈ والے امیر چند کھنہ کی کوٹھی کے متعلق ہوا تھا آپ نے جواب دیا کہ وہ دوسرے امیر
چند کھنہ ہیں جن کی بیوی کا انتقال ہوا تھا۔ رائے صاحب یہ سنتے ہی اور اپنی غلط فہمی کو
محسوس کرنے کے بعد واپس چلے گئے۔ میں پانچ چھ روز کے بعد ہوشنگ آباد سے
واپس آیا تو ماسٹر امیر چند نے رائے صاحب کے ان کے ہاں ماتم پرسی کے خیال سے
جانے کا واقعہ سنایا تو میں نے بے اختیار قہقہہ مارتے ہوئے جواب دیا کہ دوسرے ہم
نام لوگوں کی جائیدادوں پر ناجائز قبضہ کرنا آسان نہیں۔ قبضہ کے بعد ماتم پرسیاں بھی
کرانی پڑتی ہیں۔ کئی روز تک رائے صاحب کا یہ واقعہ دوستوں کی دلچسپی کا باعث
ثابت ہوا۔

کئی برس ہوئے جوش ملیح آبادی دہلی میں تھے۔ اور سرکاری رسالہ (آج کل)
کے ایڈیٹر تھے۔ سرکاری اور غیر سرکاری تمام حلقوں میں آپ عزت و احترام کے
جذبات کے ساتھ دیکھے جاتے تھے۔ یکم اپریل کا دن تھا۔ اس سے تین چار روز پہلے
میں نے نہایت شاندار دعوتی کارڈ چھپوائے یہ دعوتی کارڈ حضرت جوش کی طرف سے

تھے۔ اوران میں لکھا گیا تھا کہ شام کو پانچ بجے اسپلینڈ ریسٹورنٹ چاندنی چوک میں فلم ایکٹریس گیتا بالی کے اعزاز میں ٹی پارٹی دی جارہی ہے اور آپ اس پارٹی میں شریک ہونے کے لیے تشریف لائیے۔ ان دعوتی کارڈوں پر دہلی اخبارات لیڈروں اور بڑے لوگوں نے ایڈریس لکھ کرا کتیس مارچ کو یہ کارڈ تیار کر لیے گئے۔ یہ تمام کارروائی راز میں رکھی گئی۔ تاکہ جوش صاحب کو اس کا علم نہ ہو۔ ان کارڈوں پر جب پتے لکھے جارہے تھے تو دوپہر کے وقت مسٹر دیس راج پاہوہ مع اپنی بیوی کے تشریف لائے۔ ان کو کچھ پتہ نہ تھا کہ کیا ہورہا ہے۔ انہوں نے جب یہ کارڈ دیکھے تو کہا اچھا گیتا بالی کے اعزاز میں جوش صاحب پارٹی دے رہے ہیں ان کے یہ الفاظ سن کر میں مسکرایا اور میری مسکراہٹ دیکھ کر یہ حیران کہ میں مسکرایا کیوں۔ انہوں نے مسکراہٹ کو دیکھ کر پوچھا کیا بات ہے مسکرا رہے ہو؟ میں ان سے اصل بات چھپا نہ سکا۔ جب بتایا کہ یہ کارڈ اپریل فول کے ہیں اور آج رات کو ڈاک خانہ سے پوسٹ کیے جائیں گے تو وہ بھی کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ مجھ سے انہوں نے وعدہ کیا کہ یہ کسی دوسرے سے اس دعوت کا ذکر نہ کریں گے۔ اور انہوں نے اپنے دوستوں کو دینے کے لیے چھ دعوتی کارڈ بھی لے لیے۔ مسٹر دیس راج پاہوہ سب جج جب چلے گئے اور انہوں نے یہ کارڈ اپنے دوست سب ججوں کو ممنون احسان کرنے کے لیے دیے گئے میں نے یہ تمام کارڈ جن کی تعداد پانچ سو کے قریب تھی شام کو چھ بجے کے قریب بڑے ڈاکخانے کے لیٹر بکس میں ڈال دیے۔ تاکہ یہ اگلے روز صبح کی ڈاک میں لوگوں کو مل جائیں۔ تمام کارڈ پوسٹ کر دیے گئے تو میں اگلے روز شام کو چار بجے اسپلینڈ ریسٹورنٹ میں معہ تین چار دوستوں کے پہنچ گیا۔ اس ریسٹورنٹ کے مالک میرے دوست تھے۔ ان سے یہ کہہ کر کہ ان کے برآمدہ والے کمرہ پر پردے ڈلوا دیے جائیں۔ یہ کمرہ بازار کے بالکل قریب تھا۔ تاکہ میں تو اس (دعوت) میں شامل ہونے والوں کو دیکھ سکوں اور وہ مجھے نہ دیکھ سکیں۔ پانچ بجے سے دس منٹ پہلے ہی لوگوں نے آنا شروع کر دیا یہ جب

ریسٹورنٹ میں آتے تو پوچھتے کہ گیتابالی کی پارٹی کہاں ہے۔؟ ہمارے پروگرام کے مطابق ان کو جواب دیا جاتا کہ پچھلی طرف ہال میں پارٹی ہے۔ گیتابالی بھی اوپر کے کمرہ میں تیار ہو رہی ہے اور آپ تشریف رکھیے۔ یہ بیچارے کچھ دیر بیٹھتے اور جب ہوٹل کے بیروں وغیرہ کی مسکراہٹ سے ان کو احساس ہو جاتا کہ یہ اپریل فول ہے تو یہ کھسیانی ہنسی ہنس کر چل دیتے۔ اس سلسلہ کے دو واقعات بہت دلچسپ ہیں۔ پارٹی میں شامل ہونے کے لیے دہلی کے ایک بہت بڑے کانگرسی مولوی صاحب بھی اپنے کندھے پر مولویانہ رومال رکھے تشریف لائے ان کے ہاتھ میں دعوتی کارڈ بھی تھا۔ ان کو دیکھ کر میں صبر نہ کر سکا۔ اس برآمدہ والے پردہ دار کمرے سے باہر نکل آیا۔ مولوی صاحب کا استقبال کیا۔ گویا میں جوش صاحب کی طرف سے میزبانی کے فرائض انجام دے رہا ہوں۔ مولوی صاحب کو اندر کے کمرے میں لے گیا۔ ہوٹل کے ملازم اور بیرے مولوی صاحب کو دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ مگر مولوی صاحب کچھ کہہ نہ سکے کہ یہ مسکراہٹ کیوں ہے۔ میں نے مولوی صاحب سے کہا آپ کا تشریف لانا جوش صاحب اور ہم لوگوں کے لیے انتہائی عزت کا باعث ہے۔ آپ نے پوچھا کہ جوش صاحب کہاں ہیں؟ تو میں نے عرض کیا کہ آپ تو جوش صاحب کو جانتے ہی ہیں نا اوپر کے کمرہ میں گیتابالی کے ساتھ بات چیت کر رہے ہیں۔

مولوی صاحب کچھ دیر تو انتظار کرتے رہے تو ایک سب جج صاحب مع اپنی بیوی کے تشریف لائے۔ ان کی بیوی نے بہت قیمتی ساڑھی پہنی ہوئی تھی۔ تا کہ گیتابالی ان کے لباس سے مرعوب ہو سکے۔ میں نے بھی ان کا استقبال کیا۔ مگر یہ بہت ہوشیار تھے انہوں نے جب دیکھا کہ ریسٹورنٹ کا مالک اور بیرے وغیرہ سب مسکرا رہے ہیں تو ان کو احساس ہوا کہ یہ اپریل فول کا شکار ہوئے ہیں۔ یہ محسوس کرنے کے بعد انہوں نے لالہ دیس راج اور مجھے دونوں کو مطعون کیا۔ کیونکہ ان کو میرے اور دیس راج کے تعلقات کا علم تھا۔ ان سب جج کے جانے کے بعد مولوی صاحب بھی جانے کو تیار

ہوئے۔مگر میں نے کہامولوی صاحب چائے توپی کری جایئے۔ چنانچہ ریسٹورنٹ کے بیرے کو چائے لانے کے لیے کہا۔اورمولوی صاحب نے چائے پی۔اس دعورت میں شامل ونے کے لیے دوسو کے قریب حضرات تشریف لائے۔اوران دوسو میں سے کچھ تو ریسٹورنٹ میں داخل ہونے سے پہلے ہی واپس جانے والے لوگوں کو واپس جاتے دیکھ کراوردوسرے لوگوں سے یہ سن کر کہ یہ اپریل فول ہے واپس چلے گئے۔کچھ ریسٹورنٹ کے اندرجا کراورمعلوم کرنے کے بعد واپس گئےاورکچھ نے اپنی خفت مٹانے کے لیے اپنی جیب سے پیسے خرچ کرکے چائے پینا ہی مناسب سمجھا۔ جوش صاحب کی پوزیشن بہت دلچسپ تھی۔بعض لوگوں نے پارٹی میں شامل نہ ہونے کابذریعہ خط اظہارمعذرت کیا۔تووہ حیران کہ یہ پارٹی کیسی تھی۔کس کوپارٹی دی گئی؟ اوران کومعذرت کے خط کیوں لکھے جارہے ہیں؟ دوروز کے بعد جوش صاحب کو معلوم ہوا کہ اصل واقعہ کیا ہے تو آپ اس مذاق کی داد دینے کے لیے میرے ہاں تشریف لائے میں نے ان کومولوی صاحب کے متعلق بتایا تو آپ نے کہامولوی صاحب غالباً گیتابالی کوتوبہ کرنے کی تلقین کے لیےتشریف لائے تھے تاکہ وہ فلمی لائن چھوڑدے۔

مذاق کے سلسلہ میں اس قسم کے کئی اوردلچسپ واقعات ہیں۔میں جب کبھی ان واقعات کاخیال کرتاہوں تو گومیں بے اختیار ہوکرہنس دیتاہوں۔مگر بیوقوف بننے والوں کی بیوقوفی کا خیال کرتے ہوئے ان کے متعلق مرے دل میں ہمدردی کے جذبات بھی پیدا ہوتے ہیں۔اورمیری دلی خواہش ہوتی ہے کہ یہ دوست مجھے معاف کردیں۔

☆☆☆

انقلاب کی نذر

حضرت مسیح نے ایک جگہ فرمایا ہے کہ زمانہ کے انقلاب کے باعث اوپر کے لوگ نیچے آجائیں گے اور نیچے کے لوگ اوپر چلے جائیں گے۔ ابن مریم کے اس قول کے مطابق وہ اچھوت آج ہریجنوں کی صورت میں وزارتوں کی کرسیوں پر تشریف فرما ہیں جن کو کوئی چھونا بھی پسند نہیں کرتا تھا اور وہ سابق والیان ریاست سرکاری ملازمتوں کے حاصل کرنے اور کاشتکاری میں مصروف ہیں جن کا حکم قانون کی حیثیت رکھتا تھا۔ زمانہ کے اس انقلاب کے سلسلہ میں چند واقعات عرض کرتا ہوں:

آج سے تقریباً ایک سو برس پہلے کشمیری براہمنوں کا ایک خاندان پنجاب میں بہت بڑی اہمیت رکھتا تھا۔ جس کے سربراہ راجہ پنڈت سورج کول تھے۔ راجہ پنڈت سورج کول گو پنجاب میں ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر تھے مگر انگریزی حکومت کے حلقوں میں ان کو بہت اقتدار نصیب تھا۔ اور تعزیرات ہند کی ترتیب کے سلسلہ میں بھی ہندوستان کی مرکزی گونمنٹ نے پنجاب گونمنٹ سے انکی خدمات حاصل کی تھیں۔ یہ مجھ سے ان کے ایک بہت قریبی عزیز نے بتایا تھا کہ راجہ سورج کول کے تین فرزند تھے راجہ ہری کشن کول (جو پنجاب میں کمشنر تھے) راجہ دیا کشن کول (جو پٹیالہ وغیرہ کئی ریاستوں میں سالہا سال تک پورے اختیارات کے ساتھ وزیر اعظم رہے) اور ڈاکٹر بال کشن کول (جو پنجاب میں ایک نامور ڈاکٹر تھے جن کو خدا ترسی اور شرافت کے اعتبار سے ایک سادھو کہنا چاہیے) یعنی راجہ سورج کول کے ستاروں کا اثر سمجھیے کہ آپ کے تینوں صاحب زادگان کو بھی انتہائی عروج نصیب ہوا۔ مگر زمان کا انقلاب ملاحظہ فرمائیے کہ راجہ سورج کول کے پوتوں کے متعلق اگر آج کوئی معلوم کرنا چاہے تو اس سے ان کے کسی قریب کے رشتہ دار سے ہی پوچھنا پڑے گا کیونکہ ان میں سے صرف ایک ریلوے کے بہت بڑے افسر تھے اور ان کو کچھ ہی لوگ جانتے ہیں باقی کے اصحاب کے متعلق کچھ پتہ نہیں کہ وہ کہاں ہیں اور کیا کرتے ہیں۔ پچھلے دنوں ان میں

سے ایک کے متعلق معلوم ہوا تھا کہ وہ شملہ میں بزازی یعنی کپڑے کا کاروبار کرتے ہیں۔یعنی یہ خاندان زمانہ کے انقلاب کی نذر ہو گیا۔

دہلی کے حکیم شریف خاں صاحب کو تمام ہندوستان میں عروج حاصل تھا' جو حکیم اجمل خاں کے بزرگ تھے۔اس خاندان کے تمام لوگ ہی حکمت اور طبابت کرتے تھے۔یہ عام پبلک سے کبھی ایک پیسہ فیس یا دوائی کی قیمت نہ لیتے تھے۔ان کی آمدنی کا ذریعہ سابق والیان ریاست تھے۔جن کے ہاں یہ ایک ایک یا دو دو ہزار روپیہ روزانہ فیس پر علاج کرنے کے لیے جاتے۔ویسے تو اس خاندان کے ہر حکیم نے پبلک کی بیش بہا خدمات انجام دیں اور شہرت حاصل کی مگر حکیم اجمل خاں کے سیاسی میدان میں آنے کے باعث ان کو بہت بڑا عروج حاصل ہوا۔ان کے انتقال کے بعد طبابت کے اعتبار سے ان کے بھتیجے حکیم محمد احمد خاں اور حکیم ظفر احمد خاں کو بھی بہت اقتدار حاصل ہوا۔مگر زمانہ کا انقلاب اب اس خاندان کی حالت یہ ہے کہ حکیم اجمل خاں صاحب کے اکلوتے فرزند حکیم جمیل احمد خاں تو کئی روز تک اپنے گھر کی اوپر کی منزل سے نیچے ہی نہیں اترتے۔اور اس خاندان کی شریف منزل (جہاں والیان ریاست رؤسا امراء اور عام پبلک کا ہر وقت مجمع رہتا تھا) میں اب ہر طرف اداسی اور بے رونقی نظر آتی ہے۔یعنی اس خاندان کا عروج اور اقتدار بھی زمانہ کے انقلاب کی نذر ہو گیا۔

۱۹۴۷ء میں انگریزوں کے جانے اور کانگرس گورنمنٹ قائم ہونے کے بعد ہندوستان کی نئی گورنمنٹ کے سامنے سب سے بڑا سوال ہندوستان کے والیان ریاست کو اختیارات کے اعتبار سے مفلوج کرنے کا تھا۔اور مرکزی گورنمنٹ کے ہوم منسٹر سردار پٹیل چاہتے تھے کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے کے مصداق تمام راجے اور مہاراجے خود ہی الاؤنس لے کر اختیارات سے محروم ہو جائیں۔چنانچہ جب تمام والیان ریاست مرکزی گورنمنٹ کی طرف سے اختیارات سے محروم ہونے

کی رائے دی گئی اور اس رائے کا پروانہ مہاراجہ دیا کے پاس بھی پہنچا۔ جس میں لکھا تھا کہ مہاراجہ دیتا کے اختیارات فی الحال مقامی کانگرس کمیٹی کے پریذیڈنٹ (جو کسی زمانہ ریاست دیتا کے ملازم تھے اور مہاراجہ کے حکم سے ہی ملازمت سے علیحدہ کیے گئے تھے) کے سپرد کیے جائیں تو مہاراجہ بہت گھبرائے۔ کیونکہ ان کے سامنے تمام خاندانی حقوق اور پورے اختیارات سے محروم ہونے کا سوال تھا۔ آپ نے رائے لینے کے لیے اپنے دوستوں کو تار دیے۔ اور جن لوگوں کو تار دیے گئے ان میں دہلی کے ایڈووکیٹ مسٹر برج بہاری توکلی بھی تھے۔ مسٹر توکلی جب دیتا پہنچے اور مہاراجہ محل میں مہاراجہ سے ملنے کے لیے گئے تو مہاراجہ غم غلط کرنے کے لیے شراب پیے ہوئے تھے۔ توکلی صاحب سے باتیں ہوئیں تو مہاراجہ بار بار قریب پڑی اپنی تلوار کے دستہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے فرماتے "میں اپنے موقوف کیے ہوئے ملازم کو اختیارات سپرد کرنے سے پہلے اسے قتل کر دوں گا۔ اور خود مر جاؤں گا۔ توکلی صاحب بہت دور اندیش شخصیت ہیں۔ انہوں نے مہاراجہ کو سمجھایا کہ اب تلوار کے دستہ پر ہاتھ رکھنے کا سوال نہیں۔ دنیا کے حالات کے ساتھ ہندوستان بدل چکا ہے۔ اور ہندوستان کے بدلنے کا اثر والیان ریاست پر بھی ہوگا۔ آپ کو بھی دوسرے مہاراجوں اور نوابوں کی طرح الائنس قبول کر کے بے اختیار ہو جانا چاہیے۔ مہاراجہ بہت افسردہ اور غمگین تھے مگر زمانہ کے انقلاب کا کیا علاج۔ مہاراجہ کو کانگرس گورنمنٹ کے حکم کو لبیک کہتے ہوئے پبلک کی ایک میٹنگ مین آنا پڑا۔ اور وہاں آپ نے کھلے طور پر اپنے اختیارات سے دستبردار ہونے کا اعلان کیا۔ اور آپ کے ساتھ ہی ایک دوسری کرسی پر آپ کا موقوف شدہ ملازم بیٹھا تھا اپنے سابق آقا پر طنز کے ساتھ مسکرا رہا تھا۔

چند برس کی بات ہے، میں صبح آٹھ بجے کے قریب مضمون لکھ رہا تھا کہ چپڑاسی نے آ کر بتایا کہ ڈاکٹر ڈھلہ (یہ صاحب ریاست بہاولپور کے رہنے والے تھے۔ تبادلہ آبادی کے سلسلہ میں بہاولپور سے دہلی منتقل ہوئے اور آج کل دہلی میں پریکٹس

کرتے ہیں) ملنے کے لیے آئے ہیں۔ میں نے ان کو لانے کے لیے کہا۔ ڈاکٹر صاحب جب آئے تو انہوں نے ایک خط دیا۔ جو بہاولپور کے سابق حکمران ہز ہائی نس امیر صاحب بہاولپور کے پرائیویٹ سیکرٹری مقبول حسن قریشی کا تھا۔ اس خط میں لکھا تھا کہ ولی عہد بہادر پرنس عباسی صاحب دہلی تشریف لا رہے ہیں۔ ان کو ایک ہزار روپیہ دے دیجیے۔ یہ ایک ہزار روپیہ بعد میں کبھی واپس کر دیا جائے گا۔ ڈاکٹر ڈھلہ نے زبانی بتایا کہ ولی عہد صاحب سکاوٹس کی کانفرنس کے سلسلہ میں پاکستان کے نمائندہ کے طور پر دہلی آئے ہیں۔ ان کے ساتھ ان کی بیوی بھی ہیں اور یہ اشوکا ہوٹل میں مقیم ہیں۔ باتوں باتوں میں ڈاکٹر صاحب نے یہ بھی بتایا کہ ولی عہد صاحب تین چار روز دہلی میں قیام کریں گے۔ اور اس کے بعد آگرہ اور اجمیر دیکھنے کے بعد بمبئی سے ہوائی جہاز کے ذریعہ کراچی جائیں گے۔ امیر صاحب بہاولپور بہت ہی مخلص بلند اور ہمدرد دل رکھنے والے لوگوں یں سے تھے۔ میرے دل مس ان کے لیے صرف انتہائی عزت واحترام کے جذبات ہیں بلکہ مجھ پر ان کے احسانات بھی ہیں۔ کیونکہ اگر کبھی مجھے مالی مشکلات پیدا ہوئیں تو انہوں نے ہمیشہ ہی بڑی فراخدلی کے ساتھ مدد کی۔ آپ ''ریاست'' کے بہت قدردان تھے اور کرنل قریشی کے ساتھ بھی راقم الحروف کے بھائیوں جیسے تعلقات تھے۔ میں نے کرنل قریشی کا جب یہ خط پڑھا تو میرے آنسو نکل گئے اور مین دیر تک زمانہ کے انقلاب پر غور کرتا رہا۔ کیونکہ اگر ہندوستان میں انقلاب نہ پیدا ہوتا تو آج بہاول پور کے ولی عہد کے دہلی آنے پر سینکڑوں لوگ ہوائی اڈے پر استقبال کے لیے موجود ہوتے۔ بہاول پور ہاؤس کی وسیع اور شاندار بلڈگ کے سامنے ملنے والوں کی درجنوں کاریں کھڑی ہوتیں۔ دعوتیں دینے والے بہاولپور پیلس کے ڈرائنگ روم میں ملاقات کے منتظر ہوتے۔ ارو اس پانچ سات روز کے دورہ میں ولی عہد کا اپنے اخراجات اور خیر خیرات پر آسانی سے دو تین لاکھ روپیہ صرف ہو جاتا۔ مگر زمانہ کا انقلاب کہ آج اگر خود امیر صاحب بہاولپور

بھی پاکستان سے ہندوستان آئیں یا مہاراجہ پٹیالہ ہندوستان سے پاکستان جائیں تو نئے قانون کے مطابق ایک ملک سے دوسرے ملک میں پچاس روپیہ ہندوستانی اور پچاس روپیہ پاکستانی سے زیادہ اپنے ساتھ نہیں لے جاسکتے۔ چاہے دوسرے ملک پہنچنے کے بعد انکو ٹیکسی کے کرایہ میں ہی کیوں نہ ایک سو روپیہ پہلے دن صرف کرنا پڑے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ ولی عہد صاحب کے اس دورہ کے لیے کرنل قریشی نے کہاں سے اور کتنے روپے کا انتظام کیا۔ کیونکہ اس سفر میں دس پندرہ ہزار روپیہ خرچ کرنا معمولی بات تھی۔ میرے پاس اس وقت صرف دس روپیہ تھے۔ کیونکہ اس سے زیادہ کبھی جمع بھی نہیں کرتا تھا۔ اور روپیہ کے آنے سے پہلے خرچ کا ایسٹی میٹ بن جاتا ہے۔ میں پریشان ہوگیا کہ ایک ہزار روپیہ کہاں سے انتظام کیا جائے۔ حافظ محمد یوسف صاحب آف ''شمع'' کو ٹیلی فون کیا کہ ان سے قرض لیا جائے۔ مگر وہ دہلی سے باہر تھے۔ لالہ شیو نرائن ٹھاکر ایڈیٹر ''مطمئن'' کو ٹیلی فون کیا تو انہوں نے بتایا کہ ان کے پاس صرف ڈھائی سو روپے موجود ہیں یہ ان سے منگا لیے جائیں اتفاق ایسا ہوا کہ اس روز ڈھائی سو کے منی آرڈر آ گئے تین سو روپیہ ایک دوست سے قرض لے لیا۔ اور دو سو روپیہ ایک دوست سے لے کر شام کو تین بجے تک ایک ہزار روپیہ جمع ہوگیا۔ جو میں نے ایک لفافہ میں بند کر کے یہ لفافہ ولی عہد صاحب کو اشوکا ہوٹل بھیج دیا۔ میں رات کو نو بجے سونے اور صبح تین چار بجے جاگ کر کام شروع کرنے کا عادی ہوں۔ اگلے روز تین بجے آنکھ کھلی تو دیر تک زمانہ انقلاب پر غور کرتا رہا اور سوچتا رہا کہ میں نے اگر کسی دوست کی امیر صاحب بہاولپور کے پاس سفارش کی تو ہز ہائی نس نے اسے بھی ہزار ہا روپیہ دے کر اپنی فیاضی کا ثبوت دیا۔ ایک جرنلسٹ دوست کی ضروریات کی توجہ دلائی گئی تھی تو آپ نے اس دوست کو دس ہزار روپیہ بھیج دیا تھا۔ اور کبھی ایسا نہ ہوا کہ میں نے کسی کے متعلق ہز ہائی نس کو لکھا ہو اور آپ نے میری اس درخواست پر توجہ نہ فرمائی ہو۔ مگر زمانہ کا انقلاب آج ان ہی فیاض اور وضعدار اور مالی

اعتبار سے دیوان سنگھ کی ایک بڑی پناہ گاہ امیر صاحب بہاولپور کے ولی عہد دہلی آتے ہیں تو اسی دیوان سنگھ سے ایک ہزار روپیہ منگانے پر مجبور ہیں۔ کیونکہ انقلاب کے بعد اگر ہندوستان سے پاکستان اور پاکستان سے ہندوستان پچاس روپیہ لے جانے کی پابندی نہ ہوتی تو ولی عہد کا دیوان سنگھ سے روپیہ منگانے کا سوال ہی نہ تھا۔

موجودہ مہاراجہ نابھ اوران کی والدہ کے تعلقات کچھ کشیدہ سے ہیں۔ مہاراجہ کی والدہ چاہتی ہیں کہ ان کی رہائش کے لیے ان کو ڈیرہ دون میں ایک کوٹھی دی جائے تاکہ وہ اپنے دوسرے بچوں کے ساتھ وہاں رہ سکیں۔ مگر مہاراجہ اس کے لیے تیار نہ تھے۔ مہاراجہ کی والدہ ہندوستان کی ہیلتھ منسٹر راجکماری امرت کور کے پاس گئیں اور حالات بتائے۔ راجکماری نے اس مسئلہ پر پنڈت نہرو کو توجہ دلائی تو یہ مسئلہ فیصلہ کے لیے مرحوم مولانا ابوالکلام آزاد کے سپرد ہوا۔ مولانا مرحوم نے مہاراجہ کو طلب فرما کر یہ فیصلہ کیا کہ ڈیرہ دون کی کوٹھی مہاراجہ کی والدہ کو دی جائے۔ جاور مہاراجہ نے بھی اس کا اقرار کرلیا۔ مگر مہاراجہ نے جب واپس جاکر اس فیصلہ کے متعلق اپنی بیوی کو بتایا تو ان کی بیوی نے اس فیصلہ کو ماننے سے انکار کر دیا اور کہا کہ وہ خود مولانا مرحوم سے کہیں گی کہ کوٹھی کی ضرورت ان کو ہے۔ چنانچہ مہاراجہ اوران کی بیوی مولانا آزاد کی کوٹھی گئے تاکہ مولانا کو تبدیلی فیصلہ پر آمادہ کرسکیں۔ یہ دونوں محمد اجمل خاں پرائیویٹ سیکرٹری مولانا سے ملے اور آنے کا مقصد بیان کی۔ اجمل خاں صاحب نے مولانا کو اطلاع دی اور بتایا کہ اس مقصد کے لیے ملنا چاہتے ہیں۔ مولانا نے مہاراجہ کے ملنے کا مقصد سن کر اجمل خاں صاحب سے کہا کہ مہاراجہ سے کہہ دو کہ میں ایسے شخص سے نہیں مل سکتا جس کی زبان کا اعتبار نہ ہو۔ اجمل خاں صاحب نے مولانا کا جواب مہاراجہ سے کہہ دیا اور مہاراجہ معہ اپنی بیوی کے مولانا سے ملاقات کے بغیر واپس تشریف لے گئے۔ کیا یہ زمانہ کا انقلاب نہیں کہ اس واقعہ سے اگر پانچ برس پہلے مولانا ابوالکلام آزاد کسی قومی مقصد کے لیے بھی نابھ جاتے تو مہاراجہ ان کو بغیر مقدمہ چلائے جیل بھیج

دیتے۔ مگر آج یہی مہاراجہ مولانا کی ملاقات کے لیے مولانا کی کوٹھی جاتے ہیں تو مہاراجہ کو ملاقات سے انکار کر دیا جاتا ہے۔

مرزا خیر الدین دہلی کے سابق بادشاہ بہادر شاہ کے کنبہ میں مرزا الٰہی بخش کے خاندان میں سے ہیں۔ آپ نہ صرف دہلی مین آنریری مجسٹریٹ تھے اور انگریزوں کی حکومت سے ایک ہزار روپیہ ماہوار پولیٹکل پنشن پاتے تھے بلکہ تمام شہزادوں کے ہیڈ آف فیملی بھی تھے۔ ۱۹۴۷ء تک مرزا خیر الدین اور ان کی فیملی کو دہلی میں بہت بڑا اقتدار حاصل تھا۔ مگر ۱۹۴۷ء میں دہلی میں جب فسادات ہوئے اور ہندو صرف ہندو ہونے اور مسلمان صرف مسلمان ہونے کے جرم میں قتل کیے جا رہے تھے تو مرزا خیر الدین اپنی تمام جائیداد چھوڑ کر پرانے قلعہ کے کیمپ کی طرف بھاگے۔ تاکہ اپنی جان بچاسکیں۔ میرے ایک دوست چشم دید گواہ ہیں کہ مرزا صاحب جب دریا گنج سے پرانے قلعہ کی طرف بھاگے جا رہے تھے تو ان کا سر ننگا تھا۔ یہ صرف ایک کرتہ اور پاجامہ پہنے ہوئے تھے۔ اور ان کے پاؤں میں جوتا بھی نہ تھا۔ کیمپ میں پہنچنے کے بعد آپ پاکستان چلے گئے وہاں پہلے تو ان کو شہزادوں کا سربراہ سمجھ کر ان کی خوب آؤ بھگت ہوئی۔ اور جلسوں کی صدارتیں ان کو پیش کی گئیں۔ مگر بعد میں وہاں پر بھی ان پر آوازے کسے گئے۔ کیونکہ ان کے بزرگ مرزا الٰہی بخش کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہی بہادر شاہ ظفر کو گرفتار کرانے کا باعث بنے تھے۔ یعنی زمانہ کا انقلاب کہ ایسے لوگ نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے۔ اور ان کی اولاد آئندہ شائد دفاتر میں کلرکیوں کو غنیمت سمجھے۔

چند برس ہوئے مسلمانوں کا ایک ڈیپوٹیشن ہندوستان کے صدر بابو راجندر پرشاد کی خدمت میں حاضر ہوا جس کا مقصد یہ تھا کہ اردو زبان کو ہندی کے ساتھ ساتھ پورے حقوق دیے جائیں۔ اور اس ڈیپوٹیشن کے ممبروں نے مہاتما گاندھی کی اس تقریر کا حوالہ دیا جس میں مہاتما جی نے کہا تھا کہ اردو اور ہندی دونوں زبانوں کو ملا کر

ملک ہندوستان کی زبان ہندوستانی ہوگی۔ بابو راجندر پرشاد اس ڈیپوٹیشن کے ممبروں کی جب سب باتیں سن چکے تو آپ نے مختصر جواب دیا کہ آپ یہ مطالبہ اور باتیں اس زمانہ کی کر رہے ہیں جب پاکستان قائم نہ ہوا تھا۔ یعنی زمانہ کے انقلاب نے ہندوستان میں سے اردو اور پاکستان میں سے ہندوستانی دونوں کو ختم کر دیا۔

ہندوستان کے اس پچھلے انتخابات کے سلسلہ میں مہاراجہ نابھ نواب مالیر کوٹلہ اور نواب لوہارو' تینوں نے کانگرس ہائی کمانڈ سے پنجاب اسمبلی کے لیے ٹکٹ کی درخواست کی مگر یہ درخواستیں نامنظور کر دی گئیں۔ درخواستوں کی اس نامنظوری کو دیکھ کر کانگرس کے ایک ناکام امیدوار نے خوب کہا کہ میں پھر بھی اچھا رہا۔ انتخاب میں کامیاب نہ ہونے کے بعد میں اپنے آپ کو پلکڈ ممبر اسمبلی تو کہہ سکتا ہوں جیسے بی اے کے امتحان میں فیل ہونے والا اپنے آپ کو پلکڈ بی اے کہا کرتا ہے۔ یہ مہاراجہ نابھ نواب مالیر کوٹلہ' اور نواب لوہارو تو اپنے آپ کو پلکڈ ممبر اسمبلی بھی نہیں کہہ سکتے کیونکہ کانگرس نے ان کو ٹکٹ ہی نہ دیا۔ ان تین سابق والیان ریاست کو ٹکٹ کا نہ ملنا بھی زمانہ کا انقلاب ہی قرار دیا جا سکتا ہے۔ جو درخواستیں کرتے ہیں مگر ان کی درخواستیں ردی کی ٹوکری میں ڈال دی جاتی ہیں۔

دنیا کے دوسرے ممالک میں تو جب انقلاب آیا تو نئی گورنمنٹوں نے اپنی راہ صاف کرنے کے لیے زمانہ سابق کے برسراقتدار لوگوں کو پھانسیاں دیں' اور گولیوں کا نشانہ بنایا۔ ہندوستان اور پاکستان کی گورنمنٹوں کی تعریف ہی کی جانی چاہیے۔ کہ اس راہ میں کوئی شخص ہلاک نہ کیا گیا گو غداروں کو معاف کر دینے کا یہ نتیجہ ضرور ہوا کہ غداروں کی غلاظت انقلاب کی راہ میں قربانی کرنے والوں کو ہی غلیظ اور ناپاک بنانے کا باعث ثابت ہوئی۔

☆☆☆

حسن اور شباب کی تباہ کاریاں

ہندی زبان کے مشہور شاعر بہاری نے اپنی زندگی میں صرف سات سو دو ہے (اشعار) کہے ہیں۔اوران سات سو دوہوں میں سے ہر دوہہ کو ہندی کے دوسرے شعراء نے امرت (آب حیات) سے تشبیہہ دی ہے۔ بہاری کا ایک دوہہ ہے جس کے معنی ہیں کہ دنیا میں شباب اور سیلاب کو کوئی روکنے والا پیدا نہ ہوا۔بہاری کے اس دوہے کے مطابق حسن و شباب کی فی الحقیقت پوزیشن یہ ہے کہ ان کی تباہ کاریوں کا حلقہ دنیا کے ہر ملک تک وسیع ہے۔حسن و شباب کی چمک دیکھنے والے کو مفلوج اور معطل کر دیتی ہے۔اور وہ لوگ نصیحت کے مستحق یا تعزیر کے سزاوار قرار نہ دیے جانے چاہئیں جو حسن و شباب کی زد میں ہوں۔کیونکہ ان کی زد میں آنے والا ہر شخص بے بس اور مجبور ہو جاتا ہے۔اور نہ صرف ان کی زد میں آنے والے ہی ہر شخص تباہ ہو جاتا ہے۔ بلکہ حسن و شباب اسے بھی برباد کر دیتا ہے جس کو خدا کی طرف سے یہ نعمت نصیب ہوئی یعنی حسن اور شباب والا اپنے پرستار کے ساتھ خود بھی فنا ہو جاتا ہے۔

بہت برس ہوئے پشاور کے علاقہ کے رہنے والے ایک نوجوان کو بہت ہی خوبصورت تھے۔اور جن کے چہرہ پر صوبہ سرحد کی صحت بخش سرخی وسپیدی نمایاں تھی۔ قوم کی خدمت کرنے کے شوق میں تارک وطن ہو کر فیروز پور آ گئے اور بھائی تخت سنگھ کے زنانہ کالج سکھ کنیا میاں ودیالہ کے مردانہ حصہ میں مقیم ہوئے۔ان کا نام اکالی بشن سنگھ تھا۔(اس زمانہ میں موجودہ اکالیوں کا وجود نہ تھا اکالی کے معنی ہیں موت سے نہ ڈرنے والا۔اور بشن سنگھ نے اپنے نام کے ساتھ اکالی صرف اس خیال سے ہی چسپاں کیا کہ آپ موت سے نہ ڈرتے ہوئے سرفروش کے جذبات کے ساتھ قوم کی خدمت انجام دیں گے۔)اس اکالی بشن سنگھ کی عمر اس وقت بائیس یا چوبیس برس کے قریب تھی۔ جب یہ نوجوان قومی خدمت کا دعویٰ کرتے ہوئے فیروز پور میں تھا تو اس نوجوان کے متعلق لوگوں کے دو قسم کے خیالات تھے۔کچھ لوگ تو کہتے ہیں کہ اس

نوجوان کا حسن و شباب نہ معلوم قومی میدان میں کیا گل کھلائے۔ اور کچھ لوگ اس کی تعریف کرتے ہوئے کہتے کہ کم عمری ہی میں قوم کی خدمت کا شوق آئندہ اسے سکھوں کا بہت بڑا لیڈر بنانے کا باعث ہوگا۔ یہ اکالی بشن سنگھ دو برس کے قریب سکھ کنیا میاں ودیالہ میں رہے۔ دن رات کتابوں کا مطالعہ کرتے اور فیروز پور کے ضلع میں جہاں بھی سکھوں کا کوئی جلسہ یا دیوان ہوتا وہاں تبلیغ کے سلسلہ میں تقریریں کرتے۔ سوائے کھانے پینے اور کپڑے کی بہت ہی کم ضروریات کے کوئی معاوضہ نہ لیتے۔ ان کی شہرت دور دور تک پھیل گئی۔ پھر آپ فیروز پور سے کسی دوسرے مقام پر چلے گئے جہاں گوردوارہ میں مقیم ہوئے۔ اور بعد میں سنا کہ وہاں سے ایک نوجوان اور خوبصورت لڑکی کا اغوا کر کے چین یا ملایا کی طرف کسی غیر ملک کی طرف نکل گئے۔ یعنی ان کا حسن و شباب نہ صرف اس لڑکی کی تباہی کا باعث ہوا، بلکہ حسن و شباب نے ان کو قومی خدمت اور پبلک لائف کے شاندار مستقبل سے بھی محروم کر دیا۔

دہلی میں ایک صاحب مسٹر ایس ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ تھے بہت شریف بہت نیک اور بہت دیانتدار اور مذہبی خیالات کے عیسائی۔ آپ کا اصل وطن جہلم پنجاب تھا اور آپ ایک بہت معزز برہمن خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ بچپن میں ہی گھر سے چلے گئے اور عیسائی مذہب قبول کر لیا۔ گریجویٹ ہونے کے بعد آپ پہلے سب جج ہوئے اور پھر مجسٹریٹ مقرر کیے گئے۔ کئی برس دہلی میں ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ رہے۔ آپ دہلی ہی میں تھے کہ آپ کی انتڑیوں میں زخم ہو گیا اور ہندو راؤ ہسپتال میں داخل کیے گئے۔ ہسپتال والوں نے بیماری کو خطرناک بتایا اور مشورہ دیا کہ آپ لندن کے کسی بڑے ہسپتال سے علاج کرائیں اس کے علاوہ آپ کا لڑکا آر ایف ایس (جو آج کل ہندوستان کی مرکزی گورنمنٹ میں اسسٹنٹ سیکرٹری ہے) انڈین سول سروس کے لیے انگلینڈ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ آپ ایک عرصہ سے سوچ رہے تھے کہ آپ لندن جا کر اپنے بیٹے کی تعلیم اور اپنی صحت کے متعلق خیالات معلوم

کریں۔ چنانچہ آ ڈاکٹری مشورہ سے لندن گئے۔ وہاں غالباً دو تین ماہ ہسپتال میں علاج کراتے رہے اور بالکل اچھے ہوگئے تو ان کے واپس آنے پر راقم الحروف بھی ان سے ملنے اور صحت کے متعلق دریافت کرنے ان کی کوٹھی گیا۔ لندن کے متعلق باتیں ہو رہی تھیں تو باتوں باتوں میں آپ نے فرمایا:

میرے ذہن میں ایک طویل عرصے سے یہ خلش تھی کہ ہندوستان کے جو طلبہ انڈین سول سروس وغیرہ کی اعلیٰ تعلیم کے لیے لندن جاتے ہیں اور کامیاب ہوتے ہیں ان کامیاب طلباء میں سب سے پہلے نام عام طور پر مدراسی لڑکوں کے آئیر' آئینگر اور ریے وغیرہ ہوتے ہیں۔ یعنی یہ سب سے زیادہ نمبر حاصل کرتے ہیں۔ اور ان کی تعداد بھی کافی ہوتی ہے۔ پنجاب کے لڑکے یا تو کامیاب ہی نہیں ہوتے اور اگر کامیاب ہوتے بھی ہیں تو کم نمبروں کے ساتھ۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ اس مسئلہ پر میں نے ایک طویل عرصہ سے سوچ رہا تھا۔ مگر مدراسی لڑکوں کی قابلیت اور پنجابی طلباء کی نا اہلیت کی وجہ معلوم نہ ہوئی تھی۔ مگر اب لندن جا کے یہ مسئلہ حل ہو گیا۔ مدراسی لڑکوں کی زیادہ تعداد اور اچھے نمبروں میں کامیاب ہونے کی وجہ صرف یہ ہے کہ شکل وصورت کے اعتبار سے مدراسی طلباء کال کلوٹے اور بدصورت ہوتے ہیں۔ لندن کی لڑکیاں ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتیں۔ اور یہ دن رات پڑھنے اور محنت کرنے میں مصروف رہتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ بہت کافی نمبروں کے ساتھ کامیاب ہو جاتے ہیں۔ ان کے مقابلہ میں پنجابی لڑکے خوبصورت اور اچھی صحت کے نوجوان ہوتے ہیں۔ جن کے چہروں پر سرخی وسپیدی چمکتی ہے۔ لندن کی لڑکیاں ان کے حسن وشباب سے متاثر ہو کر ان کے پیچھے لگ جاتی ہیں۔ یہ لڑکے عشق ومحبت میں مبتلا ہو کر تعلیم اور محنت سے غافل ہو جاتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ کہ یہ یا تو امتحان میں کامیاب نہیں ہوتے اور اگر ہوتے ہیں تو کم نمبروں کے ساتھ۔ یہ کبھی اول یا دوم نہیں نکلتے''۔

یعنی حسن وشباب پنجابی طلباء کی ترقی کی راہ میں بھی مخل ہو کر ان لڑکوں کی ناکامی کا

باعث ہوتا ہے اور یہ لڑکے کافی تعداد میں ناکام ہو کر واپس چلے آتے ہیں۔

راقم الحروف کو موسیقی سے بے حد دلچسپی ہے۔ اور اس دلچسپی ہی کا نتیجہ ہے کہ کئی راگوں اور راگنیوں سے تھوڑی بہت واقفیت ہے۔ ان کو سنکر ذہن انتہائی طور پر محفوظ ہوتا ہے۔ غزل یا گیت سے ایک قسم کی نفرت سی ہو چکی ہے۔ اور ریڈیو پر بھی صرف انگویوں کو سنتا ہوں جو اچھا گائے ہوں۔ میں جب دہلی میں تھا تو کبھی کبھی اچھا گانا سننے کو دل چاہتا تو دو چار دوستوں کو ساتھ لیکر اپنی کار میں میرٹھ چلا جاتا۔ کیونکہ دہلی میں کسی طوائف کے ہاں جانے کی جرات نہیں ہوتی۔ میرٹھ میں ہم لوگ وہاں کے ایک مقامی اخبار کے ایڈیٹر کی رہنمائی میں بہت اچھا گانے والی کسی طوائف کے ہاں جا کر گانا سنتے۔ اور گانا سننے کے بعد رات کو گیارہ بجے دہلی واپس آجاتے۔ مرحوم مسٹر رنگا آئر ممبر مرکزی اسمبلی میرے ہاں مقیم تھے۔ میں ان کو دو اور دو تین دوستوں کو ساتھ لے کر میرٹھ گیا۔ وہاں ہم لوگوں نے شام کو ان جرنلسٹ دوست کے ہاں کھانا کھایا۔ کھانا کھانے کے بعد ہم کنک منڈی کے قریب ایک بہت اچھا گانے والی طوائف کے ہاں گئے۔ یہ طوائف بہت اچھا گاتی تھی۔ عمر بھی پینتالیس پچاس برس کے قریب تھی۔ سیاہ رنگ اور کافی حد تک بدصورت۔ مگر اس کی لڑکی بہت خوبصورت تھی۔ اس کی عمر سولہ سترہ برس کے قریب ہوگی۔ رنگ گورا اور موسیقی کے اعتبار سے قطعی جاہل۔ ہم وہاں جب پہنچے تو دیکھا کہ ماں گا رہی ہے۔ اور بیٹی اس کے قریب بیٹھی ہے۔ اور جو لوگ وہاں موجود ہیں ان کو گانے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ اور سب کی آنکھوں کا مرکز بیٹی ہی ہے۔ ہم ایک گھنٹہ کے قریب طوائف کا گانا سنتے رہے۔ اس نے رات کا راگ دلیس اور بعد میں درگا گایا' اور بہت اچھا گایا۔ کیونکہ گانے والے یا گانے والی کو جب یہ احساس ہو کہ اس کے گانے کی قدر کی جا رہی ہے تو موسیقار پورے شوق سے گاتا ہے۔ میں چند ماہ پہلے بھی اس طوائف کا گانا سن چکا تھا اور مجھے علم تھا کہ اس کی بیٹی موسیقی کے فن سے ناواقف ہے۔ تو میں نے ایک قسم کی شکایت کرتے ہوئے طوائف

سے کہا۔

''آپ تو بہت اچھا گاتی ہیں آپ نے اپنی بیٹی کو اس قابل قدر فن سے محروم رکھا۔ یہ لڑکی بھی اگر محنت کرتی اور کسی اچھے استاد سے سیکھتی تو اپنی زندگی میں کامیاب ہوتی''۔

میری اس شکایت یا شکوہ کو سنکر اس طوائف نے جواب دیا وہ مجھے اچھی طرح یاد ہے اس نے کہا:

''سردار جی گانا تو بدصورت طوائفوں کی قسمت میں ہی لکھا ہے۔ خوبصورت لڑکیوں کو چاہنے والوں سے فرصت کیا ہے۔ کہ وہ اس فن کی ریاضت کریں''۔

اس طوائف کے اس مختصر جواب کا مطلب یہ تھا کہ حسن وشباب سے طوائفوں کے لیے بھی خود تباہ ہونے اور دوسروں کو تباہ کرنے کا باعث ہوتا ہے۔ یہ اپنے چاہنے والوں کے نرغہ میں موسیقی میں محنت نہیں کر پاتیں۔ اور اپنے چاہنے والوں کے گھر کی اینٹ سے اینٹ بجادیتی ہیں۔

حسن اور شباب کی تباہیوں کے سلسلہ میں ایک اور واقعہ تو بے حد دلچسپ ہے۔ مرحوم مہاراجہ پٹیالہ نے جب راقم الحروف پر کئی مقدمات قائم کیے۔ اور آپ ان تمام ہی میں ناکام رہے تو مہاراجہ کو ان کے ایک جنسی مشیر نے مشورہ دیا کہ کوئی بہت خوبصورت اور نوجوان لڑکی دیوان سنگھ کو پھنسانے کے لیے دہلی بھیجی جائے۔ اور یہ دانہ پھینک کر دیوان سنگھ کا شکار کیا جائے۔ یہ تجویز عرصہ دراز تک زیر غور رہی۔ مگر اس پر اس لیے عمل نہ کیا گیا کہ مہاراجہ جانتے تھے کہ میں کافی ہوشیار ہوں اور اس طریقہ سے پھنسایا نہ جاسکوں گا۔

لندن کا باتصور رسالہ 'ٹیٹلر' بہت اچھی کوالٹی کے آرٹ پیپر پر شائع ہوتا ہے۔ اور اس کی تصاویر کا کوئی دوسرا رسالہ مقابلہ نہیں کرسکتا۔ یہ رسالہ باقاعدہ طور پر میں ہر ہفتہ خریدتا ہوں۔ جب انگلستان کے بادشاہ کنگ ایڈورڈ نے تاج وتخت کو حسن وشباب

کی چوکھٹ پر قربان کر دیا تو اس رسالہ میں کنگ ایڈورڈ کی بہت ہی خوبصورت کئی رنگ میں ایک تصویر اس رسالہ میں سے کاٹ کر اور فریم میں لگوا کر اسے اپنے کمرے کی دیوار پر لگا دیا۔ کیونکہ کنگ ایڈورڈ کے لیے اس کے تاج و تخت کو چھوڑنے کے بعد میرے دل میں انتہائی عزت و احترام اور قدر کے جذبات پیدا ہو چکے تھے۔ ایک روز ایک محب الوطنی اور انارکسٹوں سے تعلق رکھنے والے ایک دوست لاہور آئے۔ وہ انگلستان کے اس بادشاہ کی تصویر کو میرے کمرے میں دیکھ کر بہت حیران ہوئے۔ کیونکہ وہ میرے خیالات اور ''ریاست'' کی حب الوطنی کی پالیسی سے واقف تھے۔ میں نے ان کے تعجب اور حیرانی کے جذبات کو دیکھ کر کہا

''یہ تصویر اس دیوتا یا فرشتہ کی ہے جس نے حسن و شباب کی چوکھٹ پر برطانیہ کے تاج و تخت کو قربان کر دیا۔ اور سورج سے غروب نہ ہونے والی سلطنت کی بادشاہت کو چھوڑ کر اس سلطنت سے جلاوطن ہونا قبول کیا۔''

میرا یہ جواب سن کر یہ دوست سکتہ کی حالت میں تھے۔ کوئی جواب نہ دے سکے اور ایک آہ بھر کر کئی منٹ خاموش رہے۔ کیونکہ انہوں نے محسوس کیا کہ حسن و شباب کی تباہیوں کا حلقہ صرف عام لوگوں تک ہی محدود نہیں۔ یہ تباہیاں بادشاہوں اور سلطنتوں تک بھی وسیع ہو سکتی ہیں۔

حسن و شباب ویسے تو عام طور پر تباہی کا باعث ہے مگر انکی یاد بھی کم تکلیف دہ نہیں۔ میں ہر قسم کی عورتوں سے بہت باتیں کیا کرتا ہوں تاکہ عورت کی ذہنی کیفیت یعنی سائیکالوجی کے اعتبار سے معلومات حاصل کی جائیں۔ میں نے سینکڑوں ہی طوائفوں اور نوجوان لڑکیوں سے بھی طویل عرصہ تک باتیں کی ہیں۔ اور اس مسئلہ پر ایک کتاب بھی لکھنا چاہتا ہوں۔ اس سلسلہ میں ایک معمر خاتون سے باتیں کرنے کا اتفاق ہوا۔ جو اپنے شباب کے زمانہ میں بہت ہی خوبصورت تھی۔ اس سے اس بے چاری کے شباب کے زمانہ کی باتیں ہو رہی تھیں تو اس نے باتوں باتوں میں آہ بھرتے

ہوئے کہا۔

''کیا پوچھتے ہو میں جب جوان تھی اور کبھی بازار میں نکلتی تو دکانوں پر بیٹھے ہوئے نوجوان ایک دوسرے کو کہنیاں مارتے ہوئے کہا کرتے کہ دیکھو وہ جا رہی ہے''۔

یعنی حسن و شباب اپنے عروج کے زمانہ میں تو تباہی خیز ہوا ہی کرتا ہے۔ زمانہ گزرنے کے بعد اس کی یاد بھی تکلیف دہ ہے۔

پنجاب (پاکستان) اور پنجاب (ہندوستان) میں قتل کے جتنے واقعات ہوئے ہیں ان میں سے نوے فیصدی کی تہہ میں حسن و شباب کی فتنہ انگیزیاں ہیں۔ اور ان فتنہ انگیزیوں کو دیکھ کر ہی پنجابی زبان کے ایک شاعر نے کہا

گورا رنگ نہ ربا کے نوں دیویں
سارا پنڈ ویری پا لیا

(خدا کسی کو حسن و شباب نہ دے جو کسی کو تمام کے تمام گاؤں کو ہی دشمن بنانے کا باعث ثابت ہو)

حسن و شباب میں ایک ایسی کشش ہے جو بیان نہیں کی جا سکتی جو انتہائی تباہی کا باعث ہے۔ اور اگر حسن و شباب کی نعمت حاصل ہونے کے بعد حاصل کرنے والا اپنے اور دوسرے کے لیے تباہی کا باعث نہ ہو تو پھر اسے انسان نہیں کہا جا سکتا۔ وہ تو پھر انسان سے بہت ہی بلند ہے جسے فرشتہ کہنا چاہیے۔

کریکٹر کی پستیاں

اگر اپنی کمزوریوں کا اعتراف اور حق وصداقت کا اظہار دل و دماغ کی طہارت کا باعث قرار دیا جا سکتا ہے تو پھر اس کا اقرار کرنا پڑے گا کہ ہندوستان اور پاکستان کی پبلک کا کردار اس قدر پست ہے کہ جس کی مثال یورپ اور امریکہ تو کیا ایشیا کے کسی دوسرے ملک میں بھی نہیں مل سکتی۔ جس کی ذمہ داری چاہے انگریزوں کی دو صد سالہ حکومت کی گردن پر ہو یا انگریزوں کے جانے کے بعد ہمارے موجودہ لیڈروں کے اعمالنامہ پر جن کی زندگی کا مقصد ہی پرمٹ بازی' رشوت' خویش پروری اور بددیانتی ہے چنانچہ کریکٹر کی پستی کے سلسلہ میں چند ذاتی تجربات سنیے:

چند برس ہوئے راقم الحروف اپنے دفتر ''ریاست'' تراہا بیرم خاں سے ٹیکسی میں دریا گنج کی طرف جارہا تھا تو دیکھا کہ ڈاک خانہ دریا گنج کے قریب جہاں کہ پھلوں کی ریڑھیاں ہیں ٹریف رکا ہوا ہے۔ ڈاک خانہ کے قریب تو ڈاک لے جانے والی پوسٹل ڈیپارٹمنٹ کی سرخ لاری کھڑی تھی۔ اور تنگ راستہ سے ہر تانگے والا پہلے نکل جانے کی کوشش مین تھا۔ ایک کینسٹیبل ان تانگوں کو پیچھے واپس جانے کے لیے کہہ رہا تھا۔ تا کہ راستہ صاف ہو جائے۔ ٹریفک کی اس رکاوٹ کے باعث میرے والی ٹکسی میں بھی پھلوں والی ریڑھیوں کے پاس رک گئی اور چند منٹ کھڑی رہی تو میں نے دیکھا کہ ایک پھل فروش دیہات کی ایک بوڑھی عورت کے ساتھ جھگڑ رہا ہے۔ عورت کہہ رہی ہے کہ آم گندے ہیں اس کے پیسے واپس کیے جائیں۔ اور پھل فروش کہہ رہا ہے کہ وہ پیسے نہیں دے گا کیونکہ اس نے آم فروخت کر دیے ہیں۔ اس جھگڑے کی وجہ یہ تھی کہ پھل فروش نے لکڑی کی ایک چھوٹی سی پیٹی میں نیچے تو گندے سڑے ہوئے اور کرم خوردہ آم ڈالے' اور ان کے اوپر پانچ یا چھ اچھے آم رکھ دیے۔ اور بولی شروع کر دی۔ دو آنہ' چار آنہ' چھ آنہ' دس آنہ۔ اس بڑھیا نے یہ سمجھ کر کہ آموں کی پیٹی بھری ہوئی ہے۔ بارہ آنہ کی بولی دی۔ یہ بولی بارہ آنہ میں ختم ہو گئی۔ پیٹی کو اٹھا کر جب بڑھیا اپنے

کپڑے میں آم ڈلوا رہی تھی تو اس نے دیکھا کہ اوپر کے پانچ چھ آموں کو چھوڑ کر باقی تمام کے تمام آم گندے ہیں۔ یعنی پھل فروش چاہتا تھا کہ بڑھیا بارہ آنے دے کر ہیضہ کے جراثیم کی بھری ہوئی پیٹی وصول کرے اور بڑھیا ان جراثیم کو قبول کرنے سے انکار کر رہی تھی۔ اس کا مطالبہ تھا کہ بارہ آنہ واپس کیے جائیں۔ اس جھگڑے کو دیکھ کر کچھ لوگ جمع ہو گئے۔ ان میں سے کچھ اپنی برادری کے پھل فروش کی حمایت کر رہے تھے اور راہ چلتے لوگ بڑھیا کے حق میں تھے۔ میں ٹیکسی میں بیٹھا دو تین منٹ یہ تماشا دیکھتا رہا۔ میں صبر نہ کر سکا۔ میں نے اس دیہاتی بڑھیا کو بارہ آنہ دیے اور کہا کہ وہ گندے آموں کو چھوڑ کر چلی جائے اور پھل فروش سے صرف یہ کہا کہ کوئی بات نہیں۔ جب ہمارے لیڈر اور وزراء رشوت خویش پروری' پرمٹ بازی اور بے ایمانی کے ذریعہ کروڑوں روپیہ پیدا کر رہے ہیں تو تمہارا بارہ آنہ میں ہیضہ کے جراثیم فروخت کرنا جائز ہے۔ میرے اس طنز کو سن کر پھل فروش شرمندہ ہو گیا۔ اتنے میں راستہ صاف ہو گیا اور میں اس خیال میں ہی تھا کہ اس بدنصیب ملک کا مستقبل کیا ہے جہاں ہیضہ کے جراثیم بھی فروخت ہوتے ہوں۔ ٹیکسی روانہ ہو گئی اور میں چلا گیا۔

امرتسر کے ایک صاحب اپنے رشتہ داروں سے ملنے اپنے گھر کی چار خواتین کے ساتھ دہلی آیا کرتے اور یہ دوسرے تیسرے مہینہ تشریف لاتے۔ اس کے بعد دہلی کے یہ لوگ بریلی چلے گئے تو یہ امرتسر سے بریلی بھی اکثر جایا کرتے۔ ایک مرد اور چار خواتین کا یہ قافلہ پانچ افراد کی صورت میں جاتا' مگر ٹکٹ صرف ایک مرد کے لیے خریدا جاتا اور چاروں خواتین صرف پلیٹ فارموں کے ٹکٹ پر ہی سفر کرتیں۔ جس کی صورت یہ تھی کہ امرتسر سے جب روانہ ہوتے تو مرد کا ایک ٹکٹ دہلی کا لے لیا گیا اور چاروں خواتین پلیٹ فارم کے ٹکٹ لے کر پلیٹ فارم پر چلی گئیں۔ گاڑی جب چلنے والی ہوئی تو مرد مردوں کے خانہ میں اور خواتین عورتوں کے خانہ میں بیٹھ گئیں۔ راستہ میں اگر ٹکٹوں کی چیکنگ ہوئی تو مرد نے اپنے خانہ میں بیٹھکر ٹکٹ چیکر کو اپنا ٹکٹ دکھا دیا اور

اگر لیڈی ٹکٹ چیکر عورتوں کے خانہ میں ٹکٹ چیک کرنے آئیں تو ان خواتین کا یہ جواب ہوتا کہ ان کا ٹکٹ ان کے مردوں کے پاس ہے۔ جو مردوں کے کسی خانہ میں بیٹھے ہیں۔ لیڈی ٹکٹ چیکر کے لیے یہ تو ممکن ہی نہ تھا کہ وہ ان خواتین کو اپنے ساتھ لے کر مردوں کے خانہ میں ان خوتین کے مرد ساتھیوں کو تلاش کرتی۔ یا خواتین سے کہتی کہ اپنے مردوں کو تلاش کر کے ٹکٹ لائیں۔ لیڈی ٹکٹ چیکر اپنے آپ کو بے بس سمجھ کر چلی جاتی۔ اور جب یہ لوگ دہلی پہنچتے تو خواتین پلیٹ فارم پر ہی ٹھہرتیں مرد اپنا ٹکٹ لے کر باہر جاتا اور باہر جانے کے بعد پلیٹ فارم کے پانچ ٹکٹ لے کر پھر باہر آ جاتا۔ اور خواتین کو باہر لے جاتا۔ اس مرد اور اس کے گھر کی ان چار خواتین کے سفر کی یہ دلچسپ ایجاد کئی برس تک جاری رہی۔ اور میرا خیال ہے کہ یہ لوگ اب بھی جب سفر کرتے ہیں تو صرف ایک ٹکٹ اور چار پلیٹ فارموں کے ٹکٹوں کو ہی کام میں لاتے ہیں۔ کیونکہ قانون چاہے کتنا ہی سخت ہو قانون کا مقابلہ کرنے والے اگر اس قانون کو مفلوج کر سکتے ہیں تو ان کو کون روک سکتا ہے۔

ڈیرہ دون کے قریب پہاڑوں میں سے چونا ملا ہوا ایک خاص قسم کا پتھر نکلتا ہے جو شوگر یعنی چینی صاف کرنے کے کام آتا ہے۔ اس پہاڑ کو پتھر کو لے جانے کے لیے لاریوں کی سہولت کی خاطر گورنمنٹ نے پختہ سڑک بنا دی ہے۔ اور سڑک پر دن رات لاریاں چلتی ہیں۔ اس سڑک کے بالکل کنارے ڈسٹرکٹ بورڈ نے دیہات کے لوگوں کے فائدہ کے لیے ایک آیورویدک شفاخانہ قائم کیا ہوا ہے۔ جو ایک کمرہ کی صورت میں ہے۔ اس کمرہ میں ایک میز ایک کرسی اور آیورویدک کی کچھ ادویات رکھی ہیں اس شفاخانہ کے انچارج ایک وید صاحب صبح آتے ہیں اور شام کو شفاخانہ بند کر کے اپنے گھر ڈیرہ دون چلے جاتے ہیں۔ ایک روز رات کے قریب ایک لاری اس سڑک پر جا رہی تھی کہ اس شفاخانہ کے بالکل قریب لاری کا انجن خراب ہو گیا' اور لاری کو رکنا پڑا۔ اس لاری میں ایک سکھ ڈرائیور اور ایک کلینر تھا۔ لاری کا انجن خراب ہونے

پر ڈرائیور نے انجن کی مرمت شروع کر دی جو ایک گھنٹہ تک جاری رہ۔ کلینر کھڑے کھڑے اکتا گیا تو اس نے سوچا کہ مصروفیت کے لیے اس کا کمرہ کا کیوں نہ جائزہ لیا جائے۔ اس کمرہ کو تالا معمولی قسم کا تھا جو ایک جھٹکہ ہی سے کھل گیا۔ سردار کلینر نے اندر دیکھا وچھوٹی سی ایک میز پر ایک معمولی کرسی اور کچھ ادویات رکھی تھیں۔ سردار جی نے میز اور کرسی کو باہر نکال کر لاری میں رکھلیا۔ اتنے میں انجن مرمت ہو گیا اور آپ روانہ ہو گئے۔ اگلے روز وید صاحب اپنے شفاخانہ میں تشریف لائے تو ان کو معلوم ہوا کہ میز اور کرسیغائب ہے۔ پولیس مین رپورٹ ہوئی مگر کہاں پتہ چلتا۔ ڈرائیور صاحب میز کو تو اپنے گھر لے گئے اور کلینر کے حصہ میں کرسی آئی پولیس نے اپنی مثل میں کوئی پتہ نہیں چلتا لکھ کر مثل داخل دفتر کر دی۔ اس شفاخانہ کے قریب کے دیہاتی جو اس شفاخانہ سے علاج کراتے تھے چوری کرنے والوں کو چند روز کوستے رہے۔ مگر ان دیہاتیوں کو یہ بھی غنیمت سمجھنا چاہیے تھا کہ ڈرائیور اور کلینر ادویات اپنے ساتھ نہ لے گئے۔ اگر ان کو یہ علم ہوتا کہ فلاں دوائی معجون مقوی اعصاب ہے تو وہ بھی لے جاتے۔

راقم الحروف فیروز پور جیل میں نظر بند تھا تو وہاں کے ساٹھ کے قریب دہلی کے کانگرسیتھے۔ جیل کے حکام ایجی ٹیشن سے ڈرتے ہوئے لائل پور سے خالص ایگ مارک سرکاری مہر والا گھی ان کانگرسی قیدیوں کے لیے منگایا کرتے تھے۔ دہلی کے ایک کانگرسی لیڈر جب جیل میں آئے تو اپنے کھانے کے لیے پانچ سیر کا ڈالڈا کا ڈبہ بھی اپنے ساتھ لے کر آئے۔ اور یہی کانگرسی جیل میں سے دیے گئے راشن کے انچارج تھے۔ چنانچہ ایک دن ان لیڈر صاحب نے اپنا پانچ سیر ڈالڈا کا بناسپتی تو لائل پو کے خالص گھی میں ملا دیا اور لائل پور کے خالص گھی سے ڈالڈا کا خالی ڈبہ بھر لیا۔ اس ہیرا پھیری کو ایک دوسرے کانگرسی لیڈر نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا' جب کہ یہ ہیرا پھیری کی جا رہی تھی۔ اس ہیرا پھیری کا دہلی کے تمام کانگرسیوں میں چرچا تھا مگر خاموشی اختیار کر لی گئی تا کہ مہاتما گاندھی کی امت بدنام نہ ہو۔

دہلی کی ایک تقریب میں پنڈت نہرو شامل ہوئے۔ چونکہ ایسی تقریبوں مس فوٹو لیے جاتے ہیں ہر شخص کی خواہش ہوتی ہیکہ وہ پنڈت نہرو کے قریب کھڑا ہو اور یہ فوٹو اخبارات میں شائع ہو۔ دہلی کے ایک اردو ماہوار رسالہکے ایڈیٹر صاحب بھی اس تقریب میں شامل ہوئے۔ اور جب فوٹو اتروانے کے لیے تمام لوگ کھڑے ہوئے تو یہ ایڈیٹر صاحب اس گروپ میں پنڈت نہرو کے ساتھ جا کھڑے ہوئے۔ تمام گروپ کا فوٹو لیا گیا تو ایڈیٹر صاحب نے اس گروپ کے دوسے تمام لوگوں پر سوائے ان ایڈیٹر صاب اور پنڈت صاحب کے ایک دوسرے فوٹو گرافر نے سیاہی لگوا دی تا کہ فوٹو میں صرف پنڈت نہرو اور ایڈیٹر صاحب ہی نظر آئیں۔ سیاہی والا یہ فوٹو (جس میں پنڈت نہرو اور ایڈیٹر صاحب تھے بلاک کی صورت میں یڈیٹر صاحب کے رسالہ میں شائع ہوا معاملہ پریس ایڈوائزر تک پہنچا۔ تا کہ ایڈیٹر پر جلسازی کے جرم میں مقدمہ چلایا جائے ایڈوائزر نے اس جلسازی کو پبلک پراسیکیوٹر کے پاس رائے کے لیے بھیجا۔ مگر پبلک پراسیکیوٹر نے وکیل کو رائے دی کہ اس فوٹو کا بگاڑ کر شائع کرنا جلسازی اور اخلاقی اعتبار سے اک شرمناک جرم ہے مگر قانون کے مطابق یہ جلسازی قابل تعزیر نہیں۔ اس رپورٹ کے بعد معاملہ داخل دفتر کر دیا گیا۔ کیونکہ قانون سے بچ کر جرم کیا جائے توی جرم قابل سزا نہیں رہتا۔

بہت برس ہوئے میرٹھ سے ایک ہفتہ وار اردو اخبار ''چنچل'' جاری تھا جو کبھی کبھی شائع کر دیا جاتا تھا۔ اس اخبار چنچل کے ایڈیٹر صاحب کبھ کبھی دفتر ''ریاست'' بھی آیا کرتے تھے۔ ایک روز آپ اپنے ایک دوست کے ساتھ تشریف لائے۔ اور باتوں باتوں میں یہ ذکر ہوا کہ چنچل کی جگہ کوئی دوسرا ادبی اور سیاسی نام ہوتا تو اچھا ہوتا۔ اس کے جواب میں ایڈیٹر صاحب تو خاموش رہے۔ ان کے دوست نے مسکراتے ہوئے کہا بات یہ ہے کہ میرٹھ میں ایک پہاڑی طوائف چنچل کماری بہت خوبصورت ہے۔ ایڈیٹر صاحب اس سے محبت کرتے ہیں۔ اس طوائف کو خوش کرنے کے لیے آپ نے

''چنچل'' نام سے اخبار جاری کیا ہے۔ یہ سن کر میں بھی مسکرا دیا اور صرف یہ کہا کہ انسان کو محبت کے لیے سب کچھ ہی کرنا پڑتا ہے۔

میرے پڑوس میں ایک بزرگ رہتے ہیں۔ جن کے ہاں آٹھ دس مرغیاں تھیں۔ تا کہ ان سے انڈے کھا سکیں۔ مرغیاں جب گندی جگہ جائیں یا گندگی کھائیں تو ان میں وبا پھیل جاتی ہے۔ چنانچہ ان مرغیوں میں بھی وبا پھیل گئی اور مرغیوں نے مرنا شروع کیا۔ جب تین چار مرغیاں مر چکیں اور ایک روز ایک مرغی لڑکھڑا رہی تھی تو ان بزرگ کی ایک لڑکی بھاگتے ہوئے میرے ہاں آئی اور بھنگی کے لڑکے سے (جو تمام محلّہ کا مشترکہ بھنگی تھا اور میرے ہاں صفائی کیا کرتا تھا) کہا کہ پیا جی بلاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ فوراً چلے آؤ بہت ضروری کام ہے۔ یہ بھنگی میرے ہاں کا صفائی کا کام چھوڑ کر اس لڑکی کے ساتھ چلا گیا اور ایک گھنٹہ کے بعد واپس آیا تو میں نے اس سے پوچھا کہ کیا ضروری کام تھا جو صفائی کو ختم کیے بغیر چلا گیا۔ اور اب ایک گھنٹہ کے بعد واپس آیا ہے۔ بھنگی کے اس لڑکے نے جواب دیا کہ ان کی مرغیوں میں وبا پیدا ہو چکی ہے۔ ہر روز ایک دو مرغاں مر جاتی ہیں۔ ایک مرغی لڑکھڑا رہی تھی اور انہوں نے کہا کہ اس کو فوراً لے جاؤ اور اس کے مرنے سے پہلے جتنی قیمت میں یہ فروخت ہو اسے فروخت کر آؤ۔ میں مرغی کو لے کر فروخت کرنے گیا اور بارہ آنے میں فروخت کر آیا ہوں۔

یہ سن کر میں دم بخود رہ گیا اور دیر تک سوچتا رہا کہ ان بزرگ کو بارہ آنے ملنے چاہئیں تھے۔ چاہے بیمار مرغی خریدنے والا اس مرغ کا گوشت کھا کر خود بیمار ہو جائے اور اس ک بیماری پر سو روپیہ ڈاکٹروں یا دوا فروشوں کو دینا پڑے۔

میں جب انبالہ اور فیروز پور جیل میں نظر بند تھا تو میری عدم موجودگی میں دفتر کے بعض ملازم کئی ہزار روپیہ ہضم کر کے بھاگ گئے اور انہوں نے حساب کتاب کے رجسٹر بھی جلا دیے۔ تا کہ ان کا غبن ثابت نہ ہو سکے۔ گورنمنٹ نے ایک حکم کے ذریعہ اخبار کو بھی بند کر دیا۔ میں نظر بندی سے رہا ہو کر جب دہلی پہنچا اور اخبار کو پھر سے

جاری کرنے کی کوشش کی تھی تو میں ان تمام لوگوں کے پاس گیا جن سے لین دین تھا مثلاً دفتری، پریس والے کاغذ کے سوداگر اور بلاک میکر وغیرہ تمام ان لوگوں کا حساب صاف کیا جائے اور بازار میں ساکھ قائم رہ سکے۔ ان تمام نے بتایا کہ ان کا کتنا کتنا روپیہ ریاست کے ذمہ تھا یا ہے پریس والوں کے پاس گیا تو انہوں نے کہا کہ جب سے میں جیل گیا ہوں ان کو چھپائی کا ایک پیسہ ادا نہیں کیا گیا۔ اس خیال سے کہ دفتر والوں کو دقت نہ ہو جب تک کہ گورنمنٹ نے اخبار بند نہیں کیا یہ اخبار بغیر اجرت لیے چھاپتے رہے۔ اور اتنا عرصہ چھپائی باقی ہے۔ میں نے نیا مکان کرایہ پر لیا وہاں سامان چھانٹ رہا تھا تو ایک بوری سے وہ واؤچر اور رسیدیں پڑی تھیں جو میری غیر حاضری میں اکاؤنٹنٹ نے رکھی تھیں۔ ان کاغذات کو میں نے دیکھا، تو انمیں اس پریس کی چھپائی کی اجرت کی وہ تمام رسیدیں موجود تھیں جو ہر ہفتہ پریس کو ادا کی گئی۔ کیونکہ پریس والوں نے میری عدم موجودگی میں دفتر والوں کا اعتبار کرنے سے انکار کر دیا تھا اور وہ اجرت لے کر اخبار کے فرمے اٹھانے دیتے۔ ان رسیدوں کو دیکھ کر جو تاریخ وار تھیں میں حیران رہ گیا کہ چھپائی کی اجرت تو ہر ہفتہ ادا کی جاتی رہی پریس کے مالک کہتے ہیں کہ انہوں نے میری عدم موجودگی میں ترس کرتے ہوئے اجرت کا مطالبہ ہی نہ کیا۔ اور وہ بغیر اجرت اخبار چھاپتے رہے۔ میں حیران اس تذبذب کی صورت میں ہی پریس کے مالک کے پاس پہنچا۔ یہ مالک مسلمان تھا۔ میں نے ان سے کہا کہ دفتر کے رجسٹر تو سب ضائع ہو چکے ہیں۔ اب تو صرف ایک ہی صورت ہے کہ ان تمام لوگوں سے ایمان کا واسطہ دے کر پوچھا جائے کہ ان کا کتنا روپیہ باقی ہے۔ تاکہ یہ روپیہ ادا کر دیا جائے۔ آپ مہربانی فرما کر ایک کاغذ پر لکھ دیجیے کہ آپ ایمان سے کہتے ہیں کہ آپ کا اتنا روپیہ باقی ہے تاکہ یہ روپیہ ادا کیا جائے۔ پریس کے پروپرائٹر نے کہا بہت اچھا اور آپ نے ایک کاغذ لے کر اس پر حلفاً ایمان کی قسم کھا کر لکھا جب سے دیوان سنگھ نظر بند ہوا ہر چھپائی کی اجرت کبھی دفتر ریاست نے ادا نہیں کی اور یہ رقم دفتر

ریاست کے ذمہ ہے۔ پریس کے مالک نے جب یہ لکھا تو میں نے اس حلف نامہ کو تہہ کر کے اپنی جیب مین ڈال لیا۔ اور اپنے دوسرے جیب سے ایک کاغذ نکالا جس پر پریس کی رسید بک کے نمبر تاریخ اور رقم درج تھی۔ میں نے عرض کیا ذرا اپنے ہاں کی فلاں فلاں ماہ اور تاریخ کی رسید بکیں نکالیے کیونکہ آپ کے دفتر کی تمام رسیدیں ہفتہ وار موجود ہیں میرا یہ مطالبہ سن کر پروپرائیٹر صاحب کا رنگ زرد ہو گیا۔ اور آپ کھسیانے ہو کر جواب دیا کہ رسید بکیں تو انکم ٹیکس والوں کے ہاں گئی ہیں اور اگر رسیدیں آپ کے ریکارڈ میں موجود ہیں تو وہ جعلی ہیں۔ میں نے جواب عرض کیا میں جعلسازی کے فن سے واقف ہوں کیونکہ کئی والیان ریاست نے جعل سازیاں کر کے مجھ پر مقدمات قائم کیے۔ ایک رسید کا جعلی ہونا تو ممکن ہے چھ ماہ تک ہر ہفتہ کی رسیدیں اور وہ بھی آپ کے دفتر کی معہ نمبر اور تاریخ کے جعلی نہیں ہوسکتیں۔ آپ بہت ہی ایمان فروش ہین جو جھوٹے حلفیہ بیان دے سکتے ہیں۔ یہ بزرگ اس کا کیا جواب دیتے۔ مجھے ٹالتے ہوئے صرف یہی کہا کہ انکم ٹیکس کے دفتر سے رسید بکیں واپس آنے پر میں رسید بکیں دکھا سکوں گ۔ اس کے بعد ان بزرگ نے آج تک نہ تو رسید بکیں کبھی دکھائیں نہ بقایا چھپائی کا مطالبہ کیا۔ نہ کبھی مجھے زیارت کرنے کا موقع دیا۔ اور ایک بار جب میں نے چاہا کہ اس پریس میں پھر اخبار کی چھپائی کا انتظام کیا جائے تو آپ نے شرمندگی کے باعث اخبار چھاپنے سے انکار کر دیا۔ اور دفتر ریاست کے مینیجر کو جواب دیا کہ کام زیادہ ہے فرصت نہ ہونے کے باعث اخبار وقت پر نہ چھاپ سکیں گے۔

مرحوم مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے کئی برس ہوئے اپنے اخبار ''آزاد'' کلکتہ میں خدا سے دعا کی تھی کہ جو مجھے آج تک یاد ہے۔ آپ نے فرمایا تھا:

''یا اللہ مسلمانوں کے اخلاق کی گراوٹ اور کریکٹر کی پستی دیکھ کر مجھے بے حد ذہنی کوفت ہوتی ہے۔ اب یا تو مسلمانوں کو اس گراوٹ سے دور کر دے اور اگر تو ان کی گراوٹ کو دور نہیں کر سکتا تو پھر مجھے بھی ان جیسا ہی گرے ہوئے اخلاق اور کریکٹر کا سا

پست بنادے۔تا کہ مجھے ان کی گراوٹ اور کریکٹر کی پستی کو دیکھ کر تکلیف نہ ہو''۔

مرحوم مولانا اپنی زندگی میں یہ ہمیشہ ہی شکایت کیا کرتے تھے کہ خدا نے نہ و مسلمانوں کے اخلاق اور گراوٹ کی اصلاح کی اور نہ ہی ان (یعنی مولانا عبدالرزاق) کو بے اخلاف اور بے ایمان بنایا' اور یہ زندگی بھر ہی اپنی ذہنی کوفت میں مبتلا رہے۔

ایک بزرگ پنڈت نردیو شاستری بہت بلند شخصیت کے ہیں جو دس برس پہلے پنڈت جواہر لال نہرو کے زور دینے پر یوپی کے آمبلی کے لیے کھڑے ہوئے اور کامیاب ہوئے۔اور اب آج کل ہردوار میں ایک مذہبی اور تعلیمی درس گاہ چلا رہے ہس۔آپ گرمیوں میں دو ماہ کے لیے راجپورہ (ڈیرہ دون) آ کر ایک آشرم میں آ کر مقیم ہوا کرتے ہین اور کبھی کبھی سیر کرنے کے لیے جاتے ہوئے راقم الحروف سے بھی ملنے آجاتے ہیں۔آپ ایک روز آئے' اور پبلک کے کریکٹر کی پستی اور گراوٹ کا ذکر چل پڑا تو راقم الحروف نے ان سے کہا تھا:

''ہندوستان ماتھالوجی کے مطابق شری کرشن نے گیتا میں کہا ہے کہ جب پبلک میں انتہائی پستی اور گراوٹ پیدا ہوگی تو شری کرشن اس گراوٹ اور پستی کو دور کرنے کے لیے پھر نئے جنم میں اس دنیا میں آئیں گے۔مگر میں کہتا ہوں کہ اگر شری کرشن اپنے وعدہ کے مطابق اس دنیا میں بھی آجائیں تو پبلک کی موجودہ گراوٹ بے ایمانی اور پستی کی اصلاح کرنے کے لیے شری کرشن کو بھی کم از کم سو برس لگ جائیں گے۔یعنی وہ موجودہ گراوٹ کو ایک سو برس سے پہلے دور نہیں کر سکتے''۔

میرے اس بیان کو سن کر شاستری جی کھلکھلا کر ہنس پڑے کیونکہ ان کی زندگی ہی ریفارم کرتے گزری ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ یہ درست ہے کہ ہندوستان نے انگریزوں کے پنجرے سے آزاد ہونے کے بعد اقتصادی اور صنعتی اعتبار سے بہت ترقی کی ہے۔اس ملک میں کوئی شہر قصبہ یا مقام ایسا نہیں جہاں کارخانے قائم نہ ہوں۔اربوں روپیہ کے صنعتی ادارے قائم ہو گئے اور زرعی اعتبار سے ملک میں ٹریکٹر

بھیڑوں کی طرح پھر رہے ہیں۔ اور موجودہ گورنمنٹ کے جو مخالف یا دشمن ان واقعات سے انکار کرتے ہیں وہ اپنے منہ کو گندہ کرنے کے مجرم ہیں۔ مگر پچھلے چودہ برس میں پبلک کے کریکٹر کی جو گراوٹ اور پستی پیدا ہوئی ہے اسے یقیناً شری کرشن بھی اپنی انتہائی کوششوں کے باوجود ایک سو برس سے پہلے دور نہ کر سکیں گے۔ کاش کہ ہندوستان اور پاکستان کی گورنمنٹیں پبلک کی اس شرمناک حالت پر اپنی پوری قوت کے ساتھ متوجہ ہوں۔

☆☆☆

احمقانہ خوشامدیں

ایک کہاوت ہے دانا دشمن کے مقابلے میں نادان دوست زیادہ تکلیف دہ ہوتا ہے۔اس کہاوت کے مصداق احمقانہ خوشامدیں بھی تباہی کا باعث ہو کرتیں احمقانہ خوشامدوں کے سلسلہ میں چند واقعات سنیئے:

آج سے بہت برس پہلے ہندوستان کے سنٹرل انٹیلی جنس بیورو (سی۔آئی۔ڈی) کے ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل خان بہادر تصدق حسین تھے۔آپ بہت ہی دیانتدار بہت ہی شریف بہت لائق اور حق وصداقت کا ساتھ دینے والے تھے۔چنانچہ یہ واقعہ دلچسپ ہے کہ آپ کے گہرے ذاتی دوستوں میں ڈاکٹر انصاری اور حکیم اجمل خاں جیسے محبان وطن بھی شامل تھے۔اور گورنمنٹ کے حلقوں میں آپ] کی پوزیشن کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ آپ کا جب انتقال ہوا تو گورنمنٹ ہند نے سیاہ حاشیہ کے ساتھ گورنمنٹ گزٹ جاری کیا اور وائسرائے کی سفارش پر آپ کے صاحبزادہ کی دو سو روپیہ ماہوار تاحیات پنشن مقرر کر دی گئی جس زمانہ میں تصدق حسین صاحب ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل تھے ان کے اسسٹنٹ ڈائریکٹر جنرل خان بہادر محمد مظہر (ہندوستان کے مفتی اعظم مولانا اشرف علی تھانوی کے چھوٹے بھائی) تھے۔ان دونوں کے درمیان ذاتی تعلقات بھی ایسے تھے جیسے حقیقی بھائیوں کے ہوں۔اور یہ واقعہ ہے کہک خان بہادر تصدق حسین کا جب انتقال ہوا تو مظہر صاحب کو ایسا صدمہ ہوا جیسا حقیقی بھائی یا بیٹے کو ممکن تھا۔تصدق حسین صاحب کا انتقال کے بعد سینئر ہونے کے باعث مظہر صاحب تصدق حسین کی جگہ ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل مقرر کیے گئے ،مظہر صاحب کے ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل مقرر ہونے کے بعد دہلی کے ایک ہفتہ وار اخبار ''سلطنت'' (یہ اخبار کبھی کبھی اس دن شائع ہوتا جب کسی کی تعریف کرنی ہوتی یا کسی کے خلاف لکھنا ہوتا۔اور ایڈیٹر صاحب تعریف یا گالیوں والا پرچہ دکھا کر دو چار سو روپیہ لے لیتے۔اور اپنا گزارہ کرتے) میں مظہر صاحب کی تعریف میں ایک مضمون

شائع ہا۔ جسمیں لکھا تھا کہ تصدق حسین تو ایک ڈمی تھے۔ جوکوئی کام نہ کر سکتے تھے۔ اور دفتر کی مشینری صرف مظہر صاحب تھے جو ڈپٹی ڈائریکٹر بننے کے حقدار تھے۔ اور اب گورنمنٹ نے حق بحقدار رسید کا ثبوت دیا۔ مظہر صاحب اس ترقی پر مبارکباد کے مستحق ہیں۔ ایڈیٹر صاحب ''سلطنت'' تصدق حسین صاحب کی مذمت اور مظہر صاحب کی تعریف والا پرچہ لے کر مظہر صاحب کے دفتر پہنچے چپڑاسی کے ہاتھ وزیٹنگ کارڈ بھیجا۔ اور مظہر صاحب نے ان کو بلالیا۔ آپ نے وہ پرچہ اس خیال سے مظہر صاحب کے سامنے رکھا کہ مظہر صاحب بہت خوش ہوں گے۔ اور دو چار سو روپیہ بطور انعام بطور حق خدمت یا بطور چندہ عطا فرمائیں گے۔ مظہر صاحب نے جب یہ ایڈیٹوریل پڑھا تو آپ سکتہ میں آگئے۔ کچھ بول نہ سکے۔ کیونکہ آپ کے تصدق حسین صاحب سے حقیقی بھائیوں جیسے گہرے تعلقات تھے۔ بیس پچیس برس کا تھا اور اخلاقی اعتبار سے بھی آپ فرشتوں کی طرح بلند تھے۔ یہ ایڈیٹوریل پڑھ کر ان کو بہت صدمہ ہو۔ کیونکہ یہ احمقانہ خوشامد اور غیر شریفانہ مذمت تھی۔ مظہر صاحب جب خاموش تھے تو ایڈیٹر صاحب نے اس خاموشی کو دیکھ کر داد حاصل کرنے کے خیال سے پوچھا کیا آپ نے یہ مضمون پسند فرمایا؟ یہ سن کر مظہر صاحب نے جو جواب دیا وہ یہ تھا:

''مجھے افسوس ہے کہ قانون کے مطابق تمہارے جیسے کمینہ شخص کو قتل کرنا قابل تعزیر ہے۔ ورنہ میرا جی چاہتا ہے کہ تمہیں پستول کی گولی سے ہلاک کر دوں۔ تمہارے جیسے ذلیل شخص کو اس دنیا میں رہنے کا حق حاصل نہ ہونا چاہیے''۔

مظہر صاحب کا یہ جواب سن کر ایڈیٹر صاحب چلے گئے آج نہ تو تصدق صاحب اس دنیا میں موجود ہیں نہ مظہر صاحب اور نہ یہ ایڈیٹر صاحب اور یہ اخبار بھی اس زمانہ میں چند ہفتہ زندہ رہ کر بند ہو گیا تھا۔ مگر مظہر صاحب کا یہ جواب میں آج تک نہ بھول سکا۔ اور جب کبھی کوئی شخص کسی دوسرے شخص کی احمقانہ خوشامد کرتا ہے تو مظہر صاحب کے یہ الفاظ مجھے یاد آجاتے ہیں۔

میں جن دنوں ریاست نابھ میں ملازم تھا۔ وہاں ایک صاحب سردار سوہن سنگھ راہی بھی سرکاری ملازمت میں تھے جو پنجابی زبان میں نظمیں کہا کرتے تھے۔ یہ سردار سوہن سنگھ گوجر خان (ضلع راولپنڈی) کے رہنے والے تھے۔ اور مہاراجہ کے ساتھ ان کے کچھ ذاتی دوستانہ تعلقات بھی تھے۔ ان تعلقات کے باعث ہی آپ وہاں ملازم ہوئے مہاراج نابھ کی جب سالگرہ ہوا کرتی تھی تو مختلف طریقوں سے لوگ خوشامدانہ قصائد پڑھا کرتے تھے۔ نذریں پیش کرتے۔ اور جلسے تقریریں اور محفلیں اور مشاعرے منعقد ہوتے تھے۔ ایک بار مہاراجہ کی سالگرہ تھی تو سردار سوہن سنگھ نے مہاراجہ کی تعریف میں ایک قصیدہ لکھ کر مہاراجہ کو بھیجا۔ اس قصیدہ میں دعا کی گئی تھی کہ مہاراجہ کی ریاست نابھ کو اتنی وسعت نصیب ہو کہ مہاراجہ کوہ ہمالیہ سے لنکا تک اور مدراس سے درہ خیبر تک حکمران ہوں۔ یہ قصیدہ مہاراجہ کے پرائیویٹ سیکرٹری سردار گوردیال سنگھ کے ذریعے مہاراجہ کو بھیجا گیا۔ مہاراجہ نے جب یہ قصیدہ پڑھا تو آپ نے مسکراتے ہوئے سردار گوردیال سنگھ پر طنزاً کہا:

''سردار سوہن سنگھ سے کہیے کہ وہ احتیاط کریں اور اس قصیدہ کی کاپی وہ گورنمنٹ کے کسی بڑے افسر کو نہ دکھا بیٹھیں۔ ورنہ میں تو تمام ہندوستان پر قبضہ کرنے کے جرم میں نابھ کی گدی سے محروم ہو جاؤں گا۔ اور سردار سوہن سنگھ کو سازش کرنے کے جرم میں جیل جانا پڑے گا''۔

یعنی مہاراجہ نابھ اپنی ریاست نابھ سے باہر ایک انچ زمین تو لے نہ سکتے تھے، مگر سردار سوہن سنگھ کی احمقانہ خوشامد نے ریاست نابھ کو حدود کو سیلون، مدراس، ہمالیہ اور درہ خیبر تک وسیع کر دیا تھا۔

فیروز پور میں ایک صاحب کرنل ریڈی سول سرجن تھے۔ اس زمانہ میں اضلاع کے سول سرجن جیلوں کے سپرنٹنڈنٹ بھی ہوا کرتے تھے اور اس عہدہ کا ان کو ایک یا دو سو روپیہ ماہوار الاؤنس دیا جاتا تھا۔ کرنل ریڈی بھی سول سرجن ہونے کے علاوہ

سپرنٹنڈنٹ جیل تھے۔ چونکہ آپ پیشہ کے لحاظ سے ڈاکٹر تھے آپ بہت ہی نرم دل خداترس اور نیک تھے۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ آپ جیل کے قیدیوں کے ساتھ بھی بے حد نرمی کا سلوک کرتے تھے۔ ایک بار آپ نے ایک قیدی کو بیمار ہونے کے باعث قید ختم ہونے سے چند روز پہلے رہا کر دیا تو اس قیدی نے کرنل ریڈی (جو انڈین میڈیکل سروس کے ممبر تھے) کو دعا دیتے ہوئے کہا کہ خدا حضور کو بڑے لاٹ صاحب کا عہدہ دیں اس احمقانہ خوشامد کو سن کر کرنل ریڈی مسکرا دیے اور آپ نے کہا۔

''میں انڈین میڈیکل سروس کا ممبر ہوں۔ یہ تو ممکن ہے کہ میں پنجاب کا ہسپتالوں کا انسپکٹر جنرل ہو جاؤں اور یا زیادہ سے زیادہ تمام ہندوستان کا ڈائریکٹر جنرل انڈین میڈیکل سروس بن جاؤں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ میں تمہاری دعا کے مطابق پنجاب کا لیفٹیننٹ گورنر یا ہندوستان کا وائسرائے بنا دیا جاؤں۔ کیونکہ لیفٹیننٹ گورنر تو انڈین سول سروس کے ممبر بنتے ہیں اور وائسرائے انگلستان سے آتے ہیں۔

کرنل ریڈی کا یہ جواب سن کر قریب کھڑے داروغہ جیل اور جیل کے سٹاف کے دوسرے تمام ملازمین ہنس پڑے۔ کیونکہ احمقانہ خوشامد کرنے والے بیچارے قیدی کو علم ہی نہ تھا کہ کوئی سول سرجن یا سپرنٹنڈنٹ جیل لاٹ صاحب نہیں ہوسکتا۔

مرحوم خواجہ حسن نظامی بطور ایک مصنف یا مضمون نویس کے بہت ہی بلند تھے۔ اور آپ نے اردو علم و ادب میں ایک نئی راہ قائم کی۔ وزات محنت کرنے کے اعتبار سے بھی کم لوگ آپ کا مقابلہ کر سکتے تھے۔ مگر جہاں تک روحانیت کا تعلق ہے اور حق و صداقت کے اظہار کا سوال ہے آپ صفر ہی تھے۔ اور آپ کا ہفتہ وار اخبار ''منادی'' صرف بڑے لوگوں کی تعریف اور اپنے ذاتی پراپیگنڈہ کے لیے وقف تھا۔ ایک بار آپ نے اپنے اخبار میں ڈاکٹر سپرو کی تعریف کرتے ہوئے سفارش کی کہ ڈاکٹر صاحب کو آل انڈیا ریڈیو محکمہ کا ڈائریکٹر جنرل بنا دیا جائے حالانکہ اس سے ایک عرصہ پہلے آپ ڈاکٹر سپرو وائسرائے کی انتظامیہ کے ممبر رہ سکے تھے۔ جن کی وکالت

کے ذریعہ ماہوار آمدنی پچیس ہزار روپیہ کے قریب تھی۔ جب وائسرائے کی انتظامیہ کونسل کے ممبر تھے تو آل انڈیا ریڈیو جیسے درجنوں محکمے آپ کے ماتحت تھے۔ خواجہ حسن نظامی کے اس نوٹ کو پڑھ کر دہلی کے اعلیٰ حلقوں میں بہت مذاق اڑایا گیا۔ اور مرحوم ڈاکٹر مسٹر ضیاالدین احمد آف مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے تو ڈاکٹر سپرو کی اس احمقانہ خوشامد اوران کے اپنے متعلق منادی میں کی گئی ایک تعریف کے متعلق خوب کہا:

''افسوس ہے کہ تعزیرات ہند میں ایسی احمقانہ خوشامد کو بھی توہین کی دفعہ ۵۰۰ میں کیوں نہ شامل کرلیا گیا''۔

مرحوم حکیم اجمل خان صاحب کے صاحب زادہ حکیم جمیل احمد خاں کو بھی اس کے مصاحبوں کی احمقانہ خوشامدوں نے تباہ کردیا۔ ان خوشامدیوں کی خوشامد کے سلسلہ اک ایک واقعہ بہت دلچسپ ہے۔ ہندوستان کے وائسرائے (اوراب ہندوستان کے صدر بھی) گورنمنٹ ہاؤس میں سال میں ایک مرتبہ دہلی کی پبلک کو پارٹی دیا کرتے تھے۔ اس پارٹی میں شامل ہونے کے لیے دعوت نامے پارلیمنٹ کے ممبروں اور گورنمنٹ کے اعلیٰ افسروں کے علاوہ دہلی کے معززین کے نام بھی جاری کیے جاتے۔ اس دعوت میں شامل ہونے والوں کی تعداد دو ہزار کے قریب ہوتی۔ بہت برس ہوئے وائسرائے کے ہاں ایک پارٹی دی گئی اور دو ہزار کے قریب جو دعوت نامے جاری کیے گئے ان میں حکیم جمیل احمد خاں صاحب کا بھی نام تھا۔ چنانچہ بہت کافی بڑے سائز کے لفافہ کے اندر جب خوبصورت دعوتی کارڈ حکیم صاحب کے پاس بذریعہ ڈک پہنچا تو آپ نے شام کو ہی اپنے خوشامدیوں (جن میں ہندوستان دواخانہ کے مینجر وغیرہ بھی ہوتے) کو یہ دعوت نامہ دکھایا اور رائے طلب کی کہ اس پارٹی میں شامل ہونا چاہیے یا نہیں جب یہ رائے طلب کی گئی تو ایک خوشامدی نے عرض کیا حضور میری رائے میں تو پہلے وائسرائے ہمارے ہاں آئیں اور بعد میں حضور وائسرائے کے ہاں جائیں تو مناسب ہوگا۔ کیونکہ حضور کے خاندان کے وقار کا تقاضا یہ ہے کہ پہلے وائسرائے (جو صرف ایک سرکاری

ملازم ہیں) ہمارے ہاں آئیں۔ اس خوشامدی کی اس رائے کو سن کر حکیم جمیل احمد خاں دوسرے خوشامدی کی طرف متوجہ ہوئے تا کہ وہ خوشامدی بھی اپنی رائے دے۔ خوشامدیوں کی اس محفل میں نوے فیصل جاہل نالائق اور سیاست سے قطعی نا آشنا تھے۔ اس خوشامدی نے بھی کہا کہ ہاں حضور پہلے وائسرائے کا آنا ضروری ہے۔ اس کے بعد حضور کا گورنمنٹ ہاؤس جانا مناسب ہوگا چنانچہ یہ واقعہ دلچسپ ہے کہ گورنمنٹ ہاؤس کے اس دعوت نامہ کے جواب میں وائسرائے کے نام ایک خط لکھا گیا جس میں حکیم صاحب کی طرف سے ارشاد ہوا کہ شریفی خاندان (حکیم اجمل خاں کے بزرگ حکیم شریف خاں تھے) کے وقار کے خیال سے آپ کی خدمت میں درخواست ہے کہ آپ پہلے ہمارے ہاں آیئے تو پھر ملازمت بازدید کے لیے شریفی خاندان کے ہیڈ گورنمنٹ ہاؤس میں آئیں گے۔ جن لوگوں کو حکیم اجمل خاں سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے وہ اس بات کا اقرار کریں گے کہ حکیم صاحب ذاتی طور پر بے حد شریف وضعدار اور اخلاقی اعتبار سے بلند شخصیت ہیں۔ مگر خوشامدیوں کے نرغہ میں آ کر حکیم صاحب بالکل ہی تباہ ہو گئے۔ وہ شریف منزل جہاں ہر وقت سینکڑوں مریضوں کا مجمع رہا ہندوستان کے اکثر راجے مہاراجے اور نواب علاج کے لیے آتے اور حکیم اجمل خاں صاحب کے زمانہ میں جسے ایک مرکزی حیثیت حاصل تھی آج وہاں الو بول رہے ہیں۔ اس خاندان کا نہ ہندوستانی دواخانہ سے اب کوئی تعلق ہے نہ یونانی وویدیک کالج سے۔ حالانکہ یہ دونوں انسٹی ٹیوشنز اس خاندان کے روپیہ اور کوششوں سے قائم ہوئیں۔ اور خاندان کے زوال کا باعث صرف حکیم جمیل احمد خاں کے خوشامدیوں کی احمقانہ خوشامدیں ہیں۔

ایک کہاوت ہے کہ خوشامد سے خدا بھی خوش ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ کہاوت درست ہو مگر میرا تجربہ یہ ہے کہ جہاں تک انسانوں کا تعلق ہے خوشامدیوں کی احمقانہ خوشامدیں ان لوگوں کی تباہی کا باعث ہوا کرتی ہیں۔ جو ان خوشامدوں سے متاثر ہوں اور جو اپنی عقل کو استعمال نہ کر سکتے ہوں۔

ستاروں کے اثرات

ہندوؤں میں تو سوائے گنتی کے چند مغرب زدہ اور انگلستان یا دوسرے ممالک کے تعلیم یافتہ لوگوں کے ایک شخص بھی ایسا نہیں جو ستاروں کے اثرات کا قائل نہ ہو۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ جب بھی کسی ہندو خاندان کا بچہ پیدا ہوتا ہے تو فوراً اس بچہ کی پیدائش کا وقت لکھ لیا جاتا ہے تاکہ اس کا زائچہ تیار کیا جا سکے۔ مگر ہندوستان اور پاکستان کے مسلمانوں میں جوتش یا ستاروں کے اثرات پر یقین نہیں کیا جاتا۔ کیونکہ مذہبی اعتبار سے ان مسلمانوں کا اعتقاد یہ ہے کہ مستقبل کے متعلق سوائے خدا کے کسی دوسرے شخص کو علم نہیں۔ مگر دوسرے اکثر مسلم ممالک کے لوگ جوتش پر یقین رکھتے ہیں۔ چنانچہ مصر کا جوتش جو تمام دنیا میں مشہور ہے جو ہزار برس سے وہاں رائج ہے اور جہاں کا ہر مسلمان ستاروں کے اثرات کا قائل ہے میں ستاروں کے اثرات کے متعلق چند ذاتی تجربات بیان کرتا ہوں:

پنجاب کے پہلے اور آخری سکھ حکمران مہاراجہ رنجیت سنگھ اور نابھ کے مرحوم راجہ ہیرا سنگھ (موجودہ راجہ پرتاپ سنگھ کے دادا' اور کوڈائی کنال میں نظر بند کیے گئے مرحوم مہاراجہ گورچرن سنگھ کے والد) کے زائچہ میں بہت کچھ مناسبت تھی۔ یعنی دونوں کے ستارے ملتے تھے۔ دونوں کے ایک جیسے ستاروں کا اثر تھا کہ:

۱۔ دونوں مہاراجگان کی شکل ملتی تھی۔ ایک جیسا جسم' ایک جیسی ڈاڑھی' اور ایک جیسا بارعب چہرہ وغیرہ۔

۲۔ دونوں کے والد اور بزرگ معمولی سردار تھے یعنی یہ مہاراجہ نہ تھے۔

۳۔ دونوں خود ہی ریاستوں کے مالک یعنی مہاراجہ ہوئے۔

۴۔ دونوں لڑکے اپنی اپنی ریاستوں کے حکمران یعنی مہاراجہ مقرر ہوئے مگر دونوں ہی گدیوں سے معزول کیے گئے۔

۵۔ دونوں کے لڑکے یعنی مہاراجہ دلیپ سنگھ اور مہاراجہ گورچرن سنگھ اپنی ریاستوں

سے جبراً جلاوطن کیے گئے۔

۶۔ دونوں لڑکوں نے جلاوطنی کی حالت میں پردیس میں انتقال کیا۔

۷۔ دونوں کے علاقہ یعنی پنجاب اور نابھ کو ہندوستان میں مدغم کر لیا گیا اور ان کی خودمختاری ختم کر دی گئی۔

۸۔ دونوں یعنی مہاراجہ رنجیت سنگھ اور مہاراجہ ہیرا سنگھ بڈرکھں (سنگرور) کے قلعہ میں ایک ہی برج میں پیدا ہوئے۔ کیونکہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے ننھیال بڈرکھاں میں تھے اور مہاراجہ ہیرا سنگھ کے بزرگ اسی جگہ کے رہنے والے تھے۔

۹۔ مہاراجہ ہیرا سنگھ اور مہاراجہ رنجیت سنگھ دونوں اپنی رعایا کی بہتری میں ذاتی دلچسپی لیا کرتے تھے اور دونوں ہر روز صبح اپنی رعایا کی فریاد خود سنتے۔

۱۰۔ دونوں کے بیٹوں یعنی مہاراجہ دلیپ سنگھ اور مہاراجہ گورچرن سنگھ نے واپس گدیوں پر آنے کی سرتوڑ کوشش کی مگر دونوں ہی ناکام ہوئے۔

مشہور انقلاب پسند مرحوم صوفی انبا پرشاد جو ہندوسان کے انقلاب پسندوں کی پہلی صف میں شمار کرنے کے مستحق ہیں (اوجوت ۱۹۰۶ء میں مرحوم سردار اجیب سنگھ او رشیخ ضیاءالح کے ساتھ ہندوسان سے ایران چلے گئے تھے۔ کیونکہ انگیرزوں کی ولیس ان کو گرفتار کرنا چاہتی تھی) جوتش اور یوگ کے ماہر تھے۔ انقلاب پسندوں کی یہ تثلیث جب ایران پہنچی، تو وہاں کے برطانوی سفیر نے ایران کی گورنمنٹ پر اپنے اثرات استعمال کرتے ہوئے (کیونکہ اس زمانہ میں ریذیڈنٹ ہونے کے اعتبار سے ایران کی پوزیشن ریاست پٹیالہ بڑودہ یا گوالیار سے زیادہ نہ تھی، اور برطانیہ جو چاہتا ایران میں کرتا) تینوں کو گرفتار کرنا چاہا۔ ان تینوں میں سے سردار اجیت سنگھ تو ایک ایرانی قافلہ کے ساتھ کسی دوسرے ملک کو بھاگ گئے اور سوفی انبا پرشاد اور شیخ ضیاءالحق گرفتار کر کے برٹش قونصل خانہ ایران کے احاطہ میں حوالات میں قید کر دیے گئے۔ اس کے بعد ان دونوں میں سے شیخ ضیاالحق تو بیڑیاں پہنا کر ہندوستان بھیج دیے گئے اور

یہاں سات برس تک جیلوں میں رہے۔ صوفی انبا پرشاد کے متعلق راقم الحروف کو برنالہ (پٹیالہ) کے رہنے والے ایک پنشنر سکھ حوالدار (جو اس زمانہ میں ہندوستان کے دوسرے فوجی سپاہیوں کے ساتھ ایران میں برطانوی قونصل خانہ میں مقرر تھا۔ کیونکہ اس زمانہ میں برٹش قونصل خانہ کی حفاظت کے لیے چند گاردیں تو برطانیہ سے منگائی جاتی تھیں اور چند گاردیں ہندوستان کی سکھ پلٹن نمبر چودہ یا پندرہ میں سے حاصل کی جاتی تھیں۔ جن کے متعلق برٹش گورنمنٹ کو یقین تھا کہ یہ سکھ ہونے کے باعث ایران کے مسلمانوں کی سازش میں شریک نہیں ہوسکیں گے) نے بتایا کہ یہ سکھ حوالدار حوالات کے اس کمرہ پر پہرہ دیا کرتا تھا جس کمرہ میں صوفی انبا پرشاد قید تھے ایک روز قید کی ہی حالت میں صوفی صاحب نے اس سکھ حوالدار سے پوچھا سردارجی کا آپ کے پاس جنتری ہے؟ اس سکھکے پاس ایک جنتری لاہور کے پنڈت گردہاری لال کی تھی۔ صوفی صاحب نے کہا کہ کل جب پہرہ پر آؤ تو وہ جنتری ساتھ لیتے آنا۔ اگلے روز یہ سکھ حوالدار اپنے کوارٹر سے جنتری ساتھ لے گیا۔ اور یہ صوفی صاحب کو دے دی گئی۔ صوفی صاحب اس جنتری کو دیکھنے کے بعد کئی گھنٹہ تک جوتش کا حساب لگاتے رہے۔ حساب لگانے کے بعد آپ نے اس سکھ حوالدار کو بتایا کہ فلاں روز اس کا آخری دن ہے۔ اور وہ اس روز فلاں وت انتقال کر جائیں گے۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ تاریخ اور مقررہ وقت پر صوفی صاحب کا اس حوالات ہی میں انتقال ہوا۔ صوفی صاحب کو ایک قبرستان مں دفن کیا گیا۔ اگلے روز یہ قبر شکستہ صورت میں کھلی تھی۔ اور اس میں سے صوفی صاحب کا جسم غائب تھا۔ جس کی وجہ یہی قرار دی جاسکتی ہے کہ یوگ کے ذریعہ آپ نے جسم میں پھر زندگی پیدا کرلی اور آپ قبر سے نکل گئے۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ اب بھی لوگ اس قبر والی جگہ پر فاتحہ خوانی کے لیے آتے ہیں اور تہران میں یہ قبر ہندی پیر کی قبر کے نام سے مشہور ہے۔

صوفی انبا پرشاد کے سلسلہ میں ایک واقعہ بہت ہی دلچسپ ہے۔ پانچ سات برس

ہوئے ہندوستان میں ایران کے سفیر مسٹر حکمت مقرر ہوئے۔ جو بہت ہی علم دوست شخصیت تھے اور ہندوستان مین ایران کے سفیر مقرر ہونے سے پہلے تہران کے ایک کالج میں پروفیسر تھے۔ یہ مسٹر حکمت جب ہندوستان پہنچے تو انہوں نے دہلی کے ایک جرنلسٹ کے نام کے ساتھ صوفی کا لفظ دیکھا۔ آپ نے یہ سمجھا کہ یہ جرنلسٹ بھی صوفی انبا پرشاد کا قریبی رشتہ دار ہے۔ اور اس سے صوفی انبا پرشاد کے حالات معلوم کرنا چاہے۔ کیونکہ مسٹر حکمت صوفی انبا پرشاد کے بہت بڑے مداحون میں سے تھے۔ اور آپ فاتحہ خوانی کے لیے صوفی انبا پرشاد کی قبر پر اکثر جایا کرتے تھے۔ مسٹر حکمت نے اس جرنلسٹ سے ملنے اور حالات معلوم کرنے کا کام اپنے سیکرٹری مسٹر اخلاق مرزا کے سپرد کیا۔ مسٹر اخلاق مرزا اس جرنلسٹ سے ملے تو اس جرنلسٹ نے اپنی انتہائی اخلاقی گراوٹ اک ثبوت دیتے ہوئے آپ کو صوفی انبا پرشاد کا قریبی رشتہ دار ظاہر کیا۔ مسٹر مرزا کی تسلی نہ ہوئی اور آپ دفتر ''ریاست'' تشریف لائے اور چاہا کہ اصل حالات معلوم کیے جائیں۔ چنانچہ جب مسٹر مرزا کو بتایا گیا کہ دہلی کا یہ صوفی جرنلسٹ تو پنجاب کا رہنے والا ہے جو ۱۹۴۷ء میں دہلی آیا اور صوفی انبا پرشاد یوپی کے رہنے والے تھے۔ تو وہ اس جرنلسٹ کی شرمناک دروغ بیانی پر حیران رہ گئے۔ کیونکہ دونوں کے خاندان کا کسی قسم کا بھی کوئی تعلق نہ تھا۔ اس دروغ بیانی کے متعلق جب مسٹر مرزا نے پروفیسر حکمت کے تمام حالات بیان کیے تو اندازہ ہوسکتا ہے کہ ان پر ہندوستان کے لوگوں اور ہندوستان کے جرنلسٹوں کے اخلاق کے متعلق کیا اثر ہوا ہوگا۔

سرواڑہ میں ایک بہت لائق جوتشی مسٹر سوامی ہیں جو جوتش کے متعلق کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ اور جنہوں نے دنیا کی تمام بڑی شخصیتوں کے متعلق پیشن گوئیاں بھی کی ہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ان کی پیشن گوئیوں کے متعلق ایک کتاب میرے پاس موجود تھی۔ جو ریویو کے لیے آئی تھی۔ یہ کتاب میری دوسری کتابوں میں موجود تھی۔ کہ شام کے وقت میں نے پاکستان ریڈیو سے مسٹر جناح کے

انتقال کی خبر سنی۔ اس خبر کو سننے کے بعد میں نے سوامی کی کتاب دیکھی تو اس میں یہ درج تھا کہ مسٹر جناح اس ماہ میں انتقال کریں گے۔ چنانچہ میں نے مسٹر جناح کے انتقال پر جو نوٹ لکھا اس کے ساتھ یہ بھی بتایا گیا تھا کہ دو برس پہلے کی شائع کی گئی مسٹر سوامی کی فلاں کتاب میں مسٹر جناح کی موت کے متعلق پیشگوئی کی گئی تھی۔

مرحوم مہاراجہ کو بھی جوتش پر پورا اعتقاد تھا۔ جب آپ کے ہاں ولی عہد (موجودہ مہاراجہ پرتاب سنگھ) پیدا ہوئے تو آپ نے ایک ہزار روپیہ روزانہ فیس مدراس سے ایک جوتشی کو نابھ طلب کیا۔ مدراس میں اکثر لوگ جوتش کے علم سے واقف ہیں اور بڑے بڑے رئیس بھی اس علم سے واقفیت رکھنا اپنے لیے باعث فخر سمجھتے ہیں۔ یہ جوتشی بھی اچھے کھاتے پیتے خاندان سے تھا اور یہ مسٹر ڈی ایم نرسنگا راؤ کی سفارش پر منگایا گیا تھا۔ یہ جوتشی ایک ماہ کے قریب نابھ کی سرائے شادیات (مہمان خانہ) میں مقیم رہا اور ایک ماہ کی فیس اس نے تیس ہزار روپیہ حاصل کی۔ یہ جوتشی جب بچہ (یعنی موجودہ راجہ) کا زائچہ وغیرہ تیار کر چکا تو اس نے بتایا کہ یہ بچہ اپنے باپ کے لیے بہت منحوس ہے اور یہ اپنے لیے اپنے باپ کی گدی خالی کرائے گا۔ اس جوتشی کی یہ پیشن گوئی مہاراجہ کے لیے بہت افسوسناک اور تکلیف دہ تھی۔ مگر ہوا یہی کہ اس بچہ کے پیدا ہوتے ہی اس کے باپ کے مصائب میں اضافہ ہوتا چلا گیا اور یہ غالباً چار برس کا تھا کہ اس کا باپ گدی سے محروم ہو گیا اور جلاوطن ہو گیا۔ مہاراجہ نابھ اس کے بعد جب کوڈائی کنال میں نظربند تھے تو آپ نے چاہا کہ وہ اپنے مستقبل کے متعلق بھی جوتشی کو بلوا کر دریافت کریں مگر معلوم ہوا کہ وہ جوتشی انتقال کر چکا ہے۔

اب تو راقم الحروف کو جوتش کے متعلق کوئی زیادہ دلچسپی نہیں کیونکہ انسان فطرتاً اس وقت ہی جوتشیوں کے دروازوں کے چکر کاٹتا ہے جب وہ تکلیف میں ہو۔ اور میری موجودہ زندگی ایک حد تک سکون اور اطمینان کی ہے۔ مگر ایک زمانہ تھا کہ مقدمات او رمالی مشکلات کے زمانہ میں میں نے درجنوں جوتشیوں سے مشورے لیے۔ اور یہ

واقعہ دلچسپ ہے کہ میں نے اپنی پیدائش کے وقت سورج کی صحیح پوزیشن کے متعلق کولابہ (بمبئی) ہی کی آبزرویٹری سے بھی معلوم کیا تھا کہ چار اگست کو جہلم میں (جہاں میں پیدا ہوا تھا) سورج کے طلوع ہونے کا وقت کیا تھا۔ جب تک پیدائش کی صحیح تاریخ اور درست وقت اور مقام کا علم نہ ہو کوئی جوتشی بھی صحیح حالات نہیں بتا سکتا کیونکہ اعداد و شمار اور حساب کا سوال ہے اس میں مذہب یا روحانیت وغیرہ کا کوئی تعلق نہیں۔ اور جو جوتشی وقت کے مطابق حساب لگائے بغیر پیشن گوئیاں کرتے ہیں وہ لوگوں کو دھوکہ دینے اور تاریکی میں رکھنے کا باعث ہیں۔ چنانچہ راقم الحروف کو اپنے زائچہ یعنی کنڈلی کے مطابق اچھے جوتشیوں نے جو کچھ بتایا وہ آج تک کبھی بھی غلط ثابت نہیں ہوا۔ اس سلسلہ کا ایک واقعہ تو بہت ہی دلچسپ ہے کہ میری پیدائش کے پندرہ منٹ بعد سورج طلوع ہوا۔ اور جوتش کے علم کے مطابق اگر میں پندرہ منٹ یعنی سورج کے جہلم میں طلوع ہونے کے فوراً بعد پیدا ہوتا تو میں ہندوستان کی کسی بڑی ریاست کا حکمران ہوتا۔ کیونکہ ستاروں کے گرہ سورج کے طلوع ہونے کے فوراً بعد بدل گئے تھے اور سورج طلوع ہونے سے پہلے اور بعد میں کے گرہوں میں فرق تھا۔

میری رائے میں نہ صرف انسان بلکہ جانوروں اور مکانوں پر بھی ستاروں کا اثر ہوتا ہے۔ میرے بہنوئی مرحوم لالہ دیوان چند ملہوترہ نے لاہور میں ایک مکان خریدا۔ یہ مکان جب خرید لیا گیا تو لوگوں نے بتایا کہ یہ مکان بہت منحوس ہے۔ اور اس مکان کو خریدنے والے کئی لوگ تباہ ہو گئے مگر میرے بہنوئی نے پرواہ نہ کی۔ کیونکہ مکان لاہور کی گنجان آبادی میں تھا۔ اور بہت ارزاں مل رہا تھا۔ اس مکان کے خریدنے کے بعد نہ صرف ان کو کاروبار میں نقصان ہونا شروع ہوا اور دو برس میں ان کی مالی حالت بہت خراب ہو گئی بلکہ میرے بہنوئی کا انتقال بھی ہو گیا یہ حالات دیکھتے ہوئے میرے بھانجہ نے اس مکان کو فروخت کر دیا۔ جس کے بعد ان کی مالی حالت پھر سنبھل گئی۔

ریاست دیتا میں میرے ایک دوست نے گھوڑا خریدا۔ اس گھوڑے کو خریدے

ہوئے ایک ماہ ہوا تھا کہ اس دوست پر مصائب آنا شروع ہو گئے۔ چنانچہ اس دوست نے معلوم کیا کہ تو پتا چلا کہ یہ گھوڑا اس سے پہلے پانچ اصحاب کے پاس تھا۔ اور یہ ان پانچوں ہی کی تباہی کا باعث ہوا۔ اس کے بعد میرے اس دوست نے گھوڑا فروخت کرنے کی بہت کوشش کی مگر اس کی نحوست کے باعث اسے کوئی خریدنے کے لیے تیار نہ تھا اور آخر اس گھوڑے کو دوست نے جنگل میں کھلا چھوڑ دیا۔ تا کہ اس کی نحوست کا اثر ضائع ہو۔ اور یہ واقعہ ہے کہ اس گھورے کی ملکیت سے دست بردار ہونے اور اسے جنگل میں کھلا چھوڑنے کے بعد میرے اس دوست کے حالات پھر اچھے ہو گئے۔

میری کتیا نے سات بچے دیے۔ ان سات میں سے ایک تو مر گیا اور چھ زندہ رہے۔ ان چھ میں سے ایک مادہ رکھلی اور پانچ بچے دوسوں کو دے دیے۔ یہ مادہ کتیا میرے لیے بہت ہی برکت کا باعث ثابت ہوئی۔ اس کے پیدا ہونے کے بعد کاروبار اچھا ہو گیا۔ اور میری مالی مشکلات میں کافی کمی آ گئی۔ اس کے ستاروں کے اچھے اثرات ہی کے باعث میں نے اس کا نام لکی رکھا۔ یہ لکی کتیا میرے پاس غالباً پانچ برس رہی۔ پانچ برس کا یہ عرصہ میرے لیے بہت ہی برکت کا باعث تھا۔ جب تک یہ زندہ رہی میری مالی حالت اچھی رہی۔ اااور اس کے پاگل ہو جانے کے باعث سے ہلاک کرنا پڑا۔ کیونکہ پاگل پن کے باعث اس نے مجھے بھی کاٹ لی تھا۔ اس کتیا سے مجھے بے حد انس تھا اور اس کو بھی مجھ سے بہت محبت تھی۔ یہ مجھ سے ایک منٹ بھی الگ نہ ہوتی۔ میں غسل خانہ میں بھی جاتا تو یہ ایک کونہ میں بیٹھی مجھے دیکھتی رہتی۔ اس کتیا کو ہلاک کرنے کا مجھے بے حد افسوس ہے۔ مگر کوئی دوسری صورت بھی نہ تھی اس کے پاگل ہونے کے باعث اسے ہلاک کرنا ہی پڑا۔

میرے اپنے زائچے کے مطابق یہ لازمی تھا کہ میرے والد میری پیدائش کے چھ ماہ کے اندر انتقال کر جاتے۔ کیونکہ میرے گرہ ہی ایسے تھے۔ چنانچہ میری عمر چالیس روز کی تھی کہ میرے والد انتقال کر گئے۔ اور تمام خاندان نے مجھے منحوس سمجھا۔ مجھے

خاندانکی تباہی کا باعث سمجھتے ہوئے میری والدہ نے بھی شروع شروع میں مجھے تباہ کن قرار دیتیں۔ اور گھر کے تمام لوگ مجھ میں کم ہی دلچسپی لیتے۔ مگر جوتش کے مطابق جو لوگ اپنے والدین کے لیے منحوس ہوں (جسے پنجابی زبان میں والدین پر بھاری کہا جاتا ہے) وہ خود بڑے صاحب اقبال اور بڑی شخصیت ہوتے ہیں ستاروں کے اثرات کے مطابق میری قسمت میں اپنے والدین سے کچھ بھی حاصل کرنا نہیں تھا۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ میرا بچپن کا زمانہ انتہائی افلاس اور تنگدستی میں بسر ہوا۔ اور میرے حالات ایسے بھی نہ تھے کہ سکول کی ایک روپیہ ماہوار فیس حاصل کر سکتا۔

جوتش اور ستاروں کے متعلق اس روشن پہلو کے ساتھ اس کا تاریک پہلو بھی سن لیں جوتشیوں میں اکثریت ایسے لوگوں کیہے جو بہت ہی جھوٹے دروغ باف اور بے ایمان ہیں ایسے جوتشیوں میں سے ایک جوتشی کو میں نے سمجھایا کہ اپنے گاہکوں کیساتھ جھوٹ نہ بولا کرو انکو غلط نہ بتایا کرے۔ اور ستاروں کا جو بھی برا اا چھا اثر ہو وہ بتا دیا کرے۔ میری اس نصیحت کا اس جوتش نے جواب دیا کہ وہ مجھے اب تک یاد ہے اس بد بخت نے کہا:

''اگر ہم جوتشی ستاروں کے برے اثرات اپنے گاہک پر بیان کریں تو انسانی فطرت اور سائکالوجی کے مطبق س گاہک کے دماغ پر برا اثر ہوتا ہے۔ اور برا اثر ہونے کے باعث وہ اپنے جیب سے روپیہ نہیں نکالتا۔ اور اگر ہم جھوٹ بولتے ہوئے برے ستاوں کی صورت میں بھی اس کو اچھے اثرات سے اور روشن مستقبل دکھائیں تو یہ خوش ہو کر فوراً ہی جیب سے روپیہ نکال دیتا ہے۔ اس لیے ہم مجبور ہیں کہ جھوٹ بولتے ہوئے اپنے گاہک کو صرف روشنی ہی دکھائیں۔ اس کی زندگی کا تاریک پہلو اس کے سامنے نہ لایا جائے''۔ یہ تو درست ہے کہ ایک جوتشی اپنے گاہک کو مستقبل کے متعلق روشنی دکھائے تو انسانی فطرت کے مطابق یہ گاہک خوش ہو کر جوتشی کو روپیہ دیتا ہے۔ مگر اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مستقبل میں جب واقعات غلط ثابت ہوتے ہیں تو یہ گاہک نہ

صرف جوتشی کو گالیاں دیتا ہے بلکہ وہ جوتش کے علم کو بھی لچر قرار دیتا ہے۔ چنانچہ ایسے جوتشیوں کے سلسلہ میں مرحوم سردار بلدیو سنگھ کی پوزیشن بھی بےحد دلچسپ اور قابل رحم تھ۔ آپ جب ہندوستان کی ڈیفنس منسٹری سے محروم ہوئے تو آپ نے جوتشیوں کو اپنے ہاں بلوانا شروع کر دیا۔ آپ وزیر آباد کے ایک جوتشی کے پلے پڑ گئے۔ یہ جوتشی خود جوتش سے واقف نہ تھا مگر اس کے پاس جوتش کی ایک کتاب تھی جس کو دیکھکر یہ پوچھنے والوں کو مستقبل کے حالات بتا دیتا۔ چنانچہ اسکے پنجہ میں جب سردار بلدیو سنگھ پھنس گئے تو اس جوتشی نے سردار صاحب سے وقتاً فوقتاً بہت روپیہ لیا۔ پھر ڈیفنس منسٹر ہونے کا یقین دلاتے ہوئے ان کو ان کی دیوی کی پوجا کی تلقین کی اس سلسلہ کا یہ واقعہ دلچسپ یہ کہ سردار صاحب اپنے غسل خانہ میں ایک پاؤں پر کھڑے ہو کر دیوی کی پوجا کیا کرتے۔ جوتشی جی نے ان کے روپیہ سے دہلی میں جائیداد بنالی۔ مگر سردار صاحب ڈیفنس منسٹری کی خواہش اپنے سینہ میں لے ہی اس دنیا سے چلے گئے۔

ماسٹر تارا سنگھ بھی ایک عرصہ سے جوتشیوں کے ہاتھوں گرفتار ہیں۔ اور جوتشیوں کی دروغ بافیوں کا شکار ہو کر تباہ ہوتے چلے آ رہے ہیں۔ ابھی چند ماہ کا ذکر ہے کہ راقم الحروف سے ماسٹر صاحب سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ اور دیر تک سکھ اور کانگرس سیاست کے متعلق ان سے گفتگو ہوئی ماسٹر صاحب نے باتوں باتوں میں فرمایا:

"سردار پرتاپ سنگھ زیادہ سے زیادہ ایک برس اور پنجاب میں برسر اقتدار رہ سکتے ہیں پنڈت نہرو زیادہ سے زیادہ دو برس اور ہندوستان کے وزیر اعظم رہیں گے"۔

ماسٹر صاحب کا یہ الہام سن کر میں اپنی ہنسی ضبط نہ کر سکا۔ عرض کیا کہ انتخابات میں ہندوستان کی پبلک نے پنڈت نہرو کو پانچ برس تک حکومت کرنے کا نیا چارٹر دیا ہے۔ اور سردار پرتاپ سنگھ کے وزیر اعلیٰ نہ رہنے کا اس وقت کوئی سوال ہی نہ تھا کہ جب تک کہ پنجابی صوبہ کا ہوا موجود ہے۔ اور آپ دونوں کے اقتدار کے خاتمہ کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ ماسٹر صاحب کیا جواب دیتے۔ وہ بہت ہی نیک آدمی ہیں اور یہ واقعہ

افسوس ناک ہے کہ وہ عمر اور صحت کے خرب رہنے کے باعث دماغی اعتبار مفلوج کر چکے ہیں۔ کسی دوسرے کی وہ نہیں سنتے اور دوسرے جوتشیوں کی غلط روش نے ان کو تباہ کر دیا ہے۔ اب اس سپنچر کے گرہ کی صورت میں سنت فتح سنگھ کا ان کے پیچھے پڑ جانا تو شاید ماسٹر جی کے اقتدار کو بالکل ہی ختم کر دے۔

راقم الحروف پچھلے کئی برس سے کوشش کر رہا ہے کہ ہندوستان میں جوتش کے متعلق ایک انسٹیٹیوٹ قائم کیا جائے۔ جس کا مقصد اچھے ایماندار اور لائق جوتشی پیدا کرنا ہو۔ اس انسٹی ٹیوٹ میں جوتش کا علم سکھانے والوں میں گڑھوال، کشمیر، مدراس اور دوسرے علاقوں کے لائق معمر اور تجربہ کار جوتشی اچھی تنخواہوں پر مقرر کیے جائیں تا کہ اس قابل قدر علم کو زندہ رکھا جا سکے۔ چنانچہ مرحوم گوسوامی گنیش دت جی اگر زندہ رہتے تو اب تک ایسی انسٹی ٹیوشن پپت رشی آشرم ہردوار میں قائم ہو چکی ہوتی۔ جس کا گوسوامی جی نے راقم الحروف سے وعدہ کیا تھا۔ اب اس سلسلہ میں ڈاکٹر کاٹجو سے بھی درخواست کی گئی ہے۔ کہ وہ اپنے سنسکرت کالج کے ساتھ ساتھ ایک ایسی انسٹی ٹیوشن کے قائم کرنے کے مسئلہ پر بھی غور کریں۔ ڈاکٹر صاحب کے جواب کے مطابق شاید ایسا قدم اٹھایا جائے جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس قابل قدر علم کو نہ صرف زندہ اور قائم رکھا جا سکے گا بلکہ اس انسٹی ٹیوشن کا ایک مقصد یہ بھی ہوگا کہ کوئی جوتشی غلط بیانی نہ کرے۔ اور لوگوں کو جھوٹے اور فریب کار جوتشیوں سے نجات دلائی جائے جو عوام اور اس علم کو نقصان پہنچانے کے سب سے زیادہ ذمہ دار ہیں۔

☆☆☆

دولت کی فتنہ پردازیاں

رسول اللہ ﷺ نے خدا سے دعا کی تھی کہ:

''یا اللہ مجھے غریبوں کی صف میں رکھنا، اور اس دنیا کو چھوڑنے کے بعد بھی غریبوں میں ہی جگہ دینا۔''

رسول اللہ ﷺ کی اس دعا کی تقلید کرنے کے لئے شاید ہی کوئی شخص تیار ہو سکے۔ کیونکہ ہر شخص اس کوشش میں ہے کہ جس جائز یا ناجائز طریقہ سے ممکن ہو یہ دولت حاصل کرے۔ حالانکہ دولت انسان کے لئے باعث اطمینان نہیں۔ کیونکہ اگر دولت قلب کے لئے باعث سکون و مسرت ہوتی، تو راک فلر، نظام دکن، برلے اور ڈالمے مطمئن ہوتے۔ دولت کی فتنہ پردازیوں اور تباہ کاریوں کے سلسلہ میں ایک انتہائی درد ناک اور تازہ واقعہ سن لیں، جو ہمیشہ ہی میرے لئے ناقابل فراموش ثابت ہوا۔

دنیا کے نامور ترین شاعر سر رابندر ناتھ ٹیگور خاندانی اعتبار سے بھی۔۔۔۔۔ ہندوستان میں بہت بڑی پوزیشن رکھتے تھے۔ آج سے ایک سو تیس برس پہلے آپ کے دادا مسٹر دوار کا ناتھ ٹیگور ہندوستانی رؤسا میں غالباً واحد شخصیت تھے، جو ملکہ وکٹوریہ کی ملاقات کے لئے اپنے تیس ملازموں کے ساتھ لندن گئے۔ آپ پہلے ہندوستانی تھے، جن کے گھر اس زمانہ کے وائسرائے آئے۔ یعنی اس سے پہلے کسی ہندوستانی کو بھی وائسرائے کے میزبان ہونے کا فخر نصیب نہ ہوا تھا۔ اور آپ کی فیاضیوں کی حالت یہ تھی، کہ جب آپ کا انتقال ہوا، تو آپ کے ذمہ ایک کروڑ روپیہ قرضہ تھا۔ مسٹر دوار کا ناتھ ٹیگور کے صاحبزادہ مسٹر دیبندر ناتھ ٹیگور ایک درویش صفت بزرگ تھے، جنہوں نے ایک سادہ زندگی بسر کرتے ہوئے نہ صرف اپنے والا کا یہ ایک کروڑ روپیہ قرضہ ادا کیا، بلکہ اپنے باپ کی وصیت کے مطابق ایک لاکھ روپیہ خیرات میں بھی دیا۔ بنگال میں مسٹر دیبندر ناتھ ٹیگور کو مہاں رشی کہا جاتا۔ ان مسٹر دیبندر ناتھ ٹیگور کے گھر ڈاکٹر سر رابندر ناتھ ٹیگور نے جنم لیا، جو شاعر، مصور، موسیقار، ایکٹر، ڈرامہ نویس اور مصنف

تھے، تمام ایشیا میں یہی واحد شخصیت تھے جن کی کتاب گیتا نجلی نے کئی لاکھ روپیہ کا نوبل پرائز حاصل کیا ڈاکٹر سر رابندر ناتھ ٹیگور کی بین الاقوامی اعتبار سے کیا پوزیشن تھی، اس کے متعلق میں صرف ایک واقعہ ہی بیان کرتا ہوں۔ مرحوم مہاراجہ نابھ، جب کہ آپ ولی عہد تھے، انگلستان گئے، اور وہاں کئی برس رہے۔ انہوں نے ایک بار راقم الحروف کو اپنے انگلستان کے حالات بیان کرتے ہوئے بتایا تھا کہ آپ جب انگلستان میں تھے (یہ واقعہ غالباً 1910ء کا ہے) تو اس وقت انگلستان کے لوگ سوائے ڈاکٹر سر رابندر ناتھ ٹیگور کے کسی بھی دوسرے ہندوستانی لیڈر کے نام سے واقف نہ تھے، اور اس کے کئی برس بعد وہاں کے لوگ مہاتما گاندھی اور پنڈت جواہر لال نہرو کے نام سے واقف ہوئے۔

اوپر کے یہ حالات تو سر رابندر ناتھ ٹیگور اور آپ کے خاندان کے ہیں، اب اس کے بعد کے حالات سنئے:

سر رابندر ناتھ ٹیگور کے صرف ایک ہی بیٹے مسٹر راتھند رناتھ ٹیگور تھے، جن کا حال ہی میں 3 جون 1921ء کو راجپورہ (ڈیرہ دون) میں تہتر برس کی عمر میں انتقال ہوا۔ راتھند رناتھ ٹیگور اپنے باپ کے اکلوتے بیٹے تھے۔ آپ اپنے والد مرحوم کی زندگی میں شانتی نکیتن یونیورسٹی سے منسلک رہے۔ وہاں آپ غالباً وائس چانسلر یا چانسلر تھے۔ راتھند رناتھ ٹیگور جب شانتی نکیتن میں تھے، تو آپ وہاں ایک خاتون کے عشق میں مبتلا ہو گئے۔ یہ خاتون وہاں کی ملازم کی بیوی تھیں۔ اس عشق کے جب وہاں کے دوسرے لوگوں کو علم ہوا، تو آپ خاتون کو لے کر راجپورہ آ گئے۔ راجپورہ پہنچنے کے بعد آپ نے یہاں ایک کوٹھی کرایہ پر لی۔ یہ وہی کوٹھی ہے، جس میں آج کل ایک صاحب ڈاکٹر ورما رہتے ہیں اس کوٹھی میں کچھ عرصہ رہنے کے بعد آپ نے ذاتی کوٹھی تعمیر کی، جس پر ساٹھ ہزار روپیہ کے قریب لاگت آئی، اور آپ کی اس کوٹھی کا نام کاٹھ بنگلہ ہے۔ اس کوٹھی کے نام پر ہی بس سٹینڈ کا نام ہے۔ راتھند رناتھ ٹیگور خاندانی

اعتبار سے رئیس تھے۔اس کے علاوہ آپ کو دو ہزار روپیہ ماہوار تو شانتی نکیتن سے آتا، اور تین ہزار روپیہ ماہوار کے قریب آپ کو اپنے باپ کی کتابوں کی رائیلٹی کے طور پر ملتا۔آپ راجپورہ میں تقریباً آٹھ برس سے مقیم تھے۔اس اٹھ برس میں آپ نہ تو کسی کے ہاں جاتے اور نہ کسی کو مدعو کرتے۔آپ اپنی معشوقہ کے ساتھ تنہائی کی زندگی بسر کرتے۔اور یہ واقعہ دلچسپ ہے کہ قریب کی کوٹھیوں میں بھی بہت کم لوگ ایسے ہوں گے، جنہوں نے کبھی آپ کو دیکھا ہو۔کیونکہ اگر سیر کے لئے موٹر میں جاتے، تو تاریکی میں، تاکہ کسی کا سامنا نہ ہو۔راقم الحروف جس کوٹھی میں آج کل مقیم ہے، یہ کوٹھی کاٹھ بنگلہ سے صرف چند قدم کے فاصلہ پر ہے۔میری خواہش تھی، کہ کبھی آپ کا نیاز حاصل ہو، مگر ایسا نہ ہوسکا۔کیونکہ مجھے بتایا گیا، کہ آپ کسی شخص سے بھی ملنا پسند نہیں کرتے۔

راتھندر ناتھ ٹیگور کا 3 جون کی صبح کو ساڑھے نو بجے کے قریب انتقال ہوا۔انتقال سے پہلے آپ صرف دو روز بیمار رہے۔انتقال سے دو گھنٹہ پہلے آپ نے کاغذ طلب کیا، تاکہ کچھ لکھیں۔مگر کچھ نہ لکھ سکے، اور نہ کچھ کہہ سکے۔انتقال کے بعد آپ کی معشوقہ کے حکم سے ملازموں نے پتھروں کو لے جانے والی لاری کرایہ پر لی۔آپ کی لاش ایک معمولی چارپائی پر رکھی گئی چارپائی پر آپ کے بستر کا ایک گدیلہ بچھایا گیا۔لاش ایک دھوتی میں لپیٹی گئی، اور لاش پر آپ کے بستر کی ایک چادر ڈال دی گئی۔لاش ڈیرہ دون کے شمشان کو روانہ ہوئی لاش کے ساتھ بیس کے قریب بنگالی تھے، جو راجپورہ میں رہتے ہیں، جن کو انتقال کی اطلاع دی گئی۔

راتھندر ناتھ جی کے انتقال کے بعد تار کے ذریعہ شانتی نکیتن بھی اطلاع دی گئی۔شانتی نکیتن سے ساڑھے تین بجے ٹیلی فون آیا، کہ لاش کو لینے کے لئے ہوائی جہاز دہلی سے آرہا ہے۔لاش کو جلایا نہ جائے، اور لاش کلکتہ بھیجی جائے۔یہاں سے جواب دیا گیا، کہ لاش مرگھٹ بھیجی جا چکی ہے۔ٹیلی فون پر کہا گیا، کہ مرگھٹ میں لاش کو نہ جلانے کے لئے ہدایت کی جائے۔یہاں سے جواب دیا گیا، کہ کوئی ایسا آدمی یہاں

موجود نہیں، جو مرگھٹ بھیجا جائے۔ کیونکہ مرگھٹ یہاں سے چھ میل کے فاصلہ پر ہے۔ شانتی نکیتن والوں کو جب اطلاع ملی، تو انہوں نے پنڈت جواہر لعل نہرو کو ٹیلی فون پر اطلاع دی، اور کہا کہ لاش کو لانے کے لئے دہلی سے ہوائی جہاز بھیجا جائے پنڈت نہرو کی ہدایت کے مطابق لاش کو کلکتہ لے جانے کے لئے ہوائی جہاز 4 جون کی صبح کو سہارنپور پہنچا۔ مگر اس سے پہلے لاش جلائی جا چکی تھی۔ کیونکہ یہاں یہ کوشش تھی، کہ جتنی جلدی ممکن ہو لاش کو سپرد آتش کر دیا جائے۔ 3 اور 4 جون کی درمیانی شب کو کلکتہ پولیس کی ہدایت کے مطابق ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور سپرنٹنڈنٹ پولیس ڈیرہ دون رات کو دو بجے کوٹھی کاٹھ بنگلہ پہنچے۔ تمام سامان کی فہرست تیار کی گئی، اور کمروں کو تالا لگا کر مہریں لگا دیں گئیں۔ تین روز کے بعد شانتی نکیتن سے کچھ لوگ معہ بیوہ راتھندر ناتھ ڈیرہ دون پہنچے، تا کہ مرحوم کی ہڈیاں ہی شانتی نکیتن لے جائیں اور اب شائد بیوہ راتھندر ردون اور مرحوم کی داشتہ کے درمیان مقدمہ بازی بھی ہو۔ کیونکہ کچھ نہیں کہا جا سکتا، کہ بینکوں میں کتنا روپیہ موجود ہے، اور کوٹھی کاٹھ بنگلہ کس کے نام ہے۔ راتھندر ناتھ ٹیگور کے کوئی اولاد نہیں لاش کو جلد سپرد آتش کرنا ایک معمہ ہے، جس کی تہہ میں غالباً دولت کی فتنہ پردازیاں اور تباہ کاریاں ہیں۔ کاش مرحوم راتھندر ناتھ ٹیگور مالدار نہ ہوتے۔ رسول اللہ ﷺ کی اپنے متعلق خواہش کے مطابق یہ بھی غریبوں کی صف میں ہوتے، تو ان کی لاش کلکتہ یا شانتی نکیتن جاتی، جہاں کہ جنازہ میں شائد لاکھوں کی تعداد میں لوگ شامل ہوتے اور بڑے پڑ دادا کا پڑ پوتا، بڑے ادا کا پوتا اور بڑے باپ کا بیٹا پتھروں کو لے جانے والی لاری میں ڈیرہ دون کے مرگھٹ میں نہ لے جایا جاتا۔

جن کے جلوے نہ سما سکتے تھے ایوانوں میں
ان کی آج خاک اڑی پھرتی ہے ویرانوں میں

راتھندر ناتھ ٹیگور نے عشق و محبت کی راہ میں شانتی نکیتن کو ہمیشہ کے لئے

چھوڑنے اور غریب الوطنی اختیار کرنے میں غلطی کی یا نہیں، اس کا فیصلہ مرحوم ہی کر سکتے تھے۔ بہر حال عشق و محبت کے لئے آپ کی قربانی سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

کاش کہ آپ کے مرنے کے بعد وہ بھی آپ کے عشق کی داد دیتے، جن کے لئے آپ نے اپنا مستقبل تباہ کر لیا اور دنیا یہ شعر گنگنانے پر مجبور نہ ہوتی:

پڑھی نماز جنازہ ہماری غیروں نے
مرے تھے جن کے لئے وہ رہے وضو کرتے

☆☆☆☆☆☆☆☆

مہارانی چھتر پور بُرے ستاروں کے اثرات

بعض بچوں کی پیدائش ایسے بُرے ستاروں کے زیر اثر ہوتی ہے، کہ وہ زندگی بھر مصائب و مشکلات کا شکار رہتے ہیں۔ ان بے چاروں کو سکھ اور آرام کا ایک دن بھی نصیب نہیں ہوتا۔ ایسے لوگوں میں سے ہی مرحوم مہاراجہ چھتر پور کی پہلی بیوی تھیں۔

مہاراجہ چھتر پور کی یہ بیوی مہاراجہ بانسواڑہ کی بیٹی تھیں۔ ابھی بچپن کا زمانہ تھا، کہ ان کی والدہ نے انتقال کیا، اور یہ سوتیلی والدہ کے رحم پر رہنے کے لئے مجبور ہوئیں۔ سوتیلی والدہ کا سلوک ایسا تھا، جیسا سوتیلی اولاد کے ساتھ ہوتا ہے یہ بے چاری اپنی سوتیلی والدہ کے مظالم برداشت کرتیں، اور زبان سے کچھ نہ کہہ سکتیں، کیونکہ باپ اپنی نئی بیوی پر فدا تھے اس لڑکی نے بانسواڑہ کے محلات میں اچھی تعلیم حاصل کی، اور اس نے ہندی زبان میں اشعار کہنے بھی شروع کر دیئے، کیونکہ ان کو لٹریچر کا شوق تھا۔ اس لڑکی کی عمر اٹھارہ برس کی تھی کہ 1928ء میں ان کی شادی مہاراجہ چھتر پور سے ہو گئی، اور یہ بطور مہارانی کے چھتر پور چلی گئیں۔ چھتر پور پہنچنے کے بعد انہوں نے دیکھا کہ ان کے شوہر دہلی کی ایک پیار ن طوائف لالی کے زیر اثر ہیں اور یہ ان کی طرف کوئی توجہ نہیں کرتے حالانکہ یہ بیوی بہت خوبصورت بہت لائق اور بہت ہی شریف تھیں مہارانی نے بہت کوشش کی کہ مہاراجہ یعنی ان کے شوہر لالی کے چنگل سے آزاد ہوں، اور یہ اپنی بیوی سے محبت کریں، مگر ان کو کامیابی نصیب نہ ہوئی۔

1930ء کا واقعہ ہے مہارانی چھتر پور کو اپنے کسی ملازم سے علم ہوا کہ اخبار ”ریاست“ مہارانیوں اور بیگمات پر کئے جا رہے مظالم کو بے نقاب کرتا ہے، اور اس کے کئی مضامین کئی ریاستوں کی اصلاح کر چکے ہیں۔ اس بے چاری نے اپنے حالات کے متعلق ہندی زبان میں (اس خاتون کو یہ علم ہی نہ تھا کہ ”ریاست“ اردو میں شائع ہوتا ہے کیونکہ سینٹرل انڈیا کے ہندو اردو نہ جانتے تھے وہاں رواج صرف ہندی کا تھا)

ایک دردناک نظم لکھی، اور شائع کرنے کے لئے ایک عورت کے ذریعہ دفتر ''ریاست'' کو بھجوائی جس کا ترجمہ ''ریاست'' میں شائع کیا گیا۔ اس نظم کا ترجمہ یہ تھا:

''میں خدا سے شکایت کرنے کا دیتا رکھتی ہوں، کہ بچپن میں سوتیلی ماں سے واسطہ پڑا، جو نا قابل برداشت تھا میں نے اس زمانہ میں سوتیلی والدہ کی سختیاں صبر کے ساتھ اس خیال سے برداشت کیں، کہ جب بڑی ہوں گی اور میری شادی ہو جائے گی، تو مجھے شوہر کی محبت نصیب ہو گی، اور یہ برے دن ایک خواب ہو جائیں گے۔ مگر قسمت کے کھیل کہ شادی کے بعد اب میرے شوہر کو میرے جذبات کا احساس نہیں میں اس کی محبت سے محروم ہوں اے خدا کیا تم نے مجھے اسی لئے پیدا کیا تھا کہ میں تمام زندگی ہی مصائب و مشکلات برداشت کرتی رہوں، اور مجھے سکھ آرام کا ایک دن نصیب نہ ہو۔''

معصوم و بے گناہ مہارانی چرکھاری ابھی اپنے شوہر یعنی مہاراجہ چرکھاری کی بے اعتنائی کا شکار تھی، اور خدا سے شکوہ کر رہی تھی کہ مہاراجہ نے ایک نئی شادی کا سلسلہ جاری کر دیا۔ اس نئی شادی کے لئے بات چیت نیپال کے وزیراعظم کے خاندان میں ہوئی۔ نیپال کے وزیراعظم اس زمانہ میں عملی طور پر نیپال کے حکمران تھے مہاراجہ نیپال ایک ڈمی صورت میں ہوا کرتے، جو وزیراعظم کی اجازت کے بغیر ایک جگہ سے دوسری جگہ جا بھی نہ سکتے، کیونکہ وزیراعظم کی پشت پر برٹش گورنمنٹ تھی، اور وزیراعظم برٹش گورنمنٹ کی افواج کے لئے گورکھے رنگروٹ دیتے۔ اس زمانہ اس سے پہلے اور اس کے بعد وزیراعظم نیپال کے خاندان کی اکثر لڑکیاں ہندوستان کے والیان ریاست کے لڑکوں کے ساتھ بیاہی جاتیں، کیونکہ ان کے لئے نیپال میں مناسب مالدار شوہر نہ مل سکتے۔ ان لڑکیوں کو جہیز میں دس دس بارہ بارہ لاکھ روپیہ دیا جاتا۔ چھوٹے درجے کے ہندوستان والیان ریاست روپیہ کے لالچ میں نیپال کی ارنا یعنی وزیراعظم فیملی میں شادیاں کر لیتے۔ حالانکہ ان لڑکیوں کا رنگ گورا اور نکھرا ہوتا، مگر

ناک نقشہ کے اعتبار سے ہندوستانی نقطہ نگاہ سے یہ کوئی زیادہ خوبصورت نہ ہوتیں، کیونکہ ان کے چہرے جاپانیوں اور چینیوں کی طرح کچھ چپٹے سے ہوتے۔ مہاراجہ چرکھاری نے بھی نیپال میں شادی کرنے کا ارادہ صرف روپیہ کے لالچ سے کیا۔ کیونکہ مہاراجہ اپنی عیاشیوں کے مقروض ہو چکے تھے، اور ملازموں کو تنخواہیں بھی وقت پر نہ ملتی تھیں۔ چنانچہ مہاراجہ کی نیپال میں شادی ہوئی اس شادی میں مہاراجہ کو زیور اور جواہرات کے علاوہ دس لاکھ روپیہ نقد جہیز میں ملا۔ اور ایک شرط بھی تھی، کہ مہاراجہ چرکھاری اپنی ریاست کا دیوان رانا صاحب (یعنی وزیر اعظم نیپال) کی مرضی سے مقرر کریں، تاکہ یہ دیوان مہاراجہ پر کنٹرول کر سکے۔

مہاراجہ چرکھاری کی شادی نیپال میں ہوگئی، اور نئی نویلی دلہن چرکھاری آ گئیں مگر مہاراجہ کے حالات تبدیل نہ ہوئے۔ جو روپیہ نیپال سے ملا، وہ چند روز میں ہی عیاشی پر صرف ہوگیا۔ نیپال والی رانی کے ساتھ بھی وہی سلوک ہوا، جو بانسواڑہ والی مہارانی کے ساتھ ہو رہا تھا۔ یعنی مہاراجہ اس رانی میں دلچسپی نہ لیتے۔ کئی کئی ماہ، تک ایک دوسرے کا سامنا نہ ہوتا۔ گورنمنٹ کے حکم سے لالی طوائف کا ریاست چرکھاری میں داخلہ بند کر دیا گیا، تو مہاراجہ نے لالی کی ایک رشتہ دار لڑکی جوگلی پہاڑن کو اپنے پاس رکھ لیا، اور جب جوگلی کے متعلق پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ نے اعتراضات کیے، تو مہاراجہ نے ایک اور طوائف کو اپنے محلات میں ڈال لیا، جس کے بطن سے ایک لڑکا بھی پیدا ہوا۔ مگر چونکہ یہ لڑکا شادی شدہ بیوی سے نہ تھا، اس بے چارے کی پوزیشن ایک داشتہ زادہ سے زیادہ نہ تھی حالانکہ مہاراجہ نے کوشش کی کہ اس کو چرکھاری کا ولی عہد قرار دیا جائے۔

مہاراجہ چرکھاری طوائفوں کے چکر میں ہی تھے کہ آپ بعض جنسی بیماریوں میں مبتلا ہو گئے پہلے تو بانسواڑہ والی مہارانی ہی اپنی قسمت کو رو رہی تھیں، اس کے بعد نیپال والی مہارانی بھی بدنصیبیوں کا شکار ہوئی۔ ان دونوں کے بطن سے کوئی اولاد نہ

تھی۔ مہاراجہ کی بیماریوں میں اضافہ ہوتا چلا گیا، اور ان بیماریوں میں ہی مہاراجہ کا انتقال ہوگیا۔

چند برس ہوئے مجھے معلوم ہوا تھا، کہ ان دونوں مہارانیوں کو الاؤنس ملتا ہے، اور یہ موت کے انتظار میں اپنی زندگی کے دن گزار رہی ہیں۔ حضرت مسیحؑ نے انجیل میں لکھا ہے کہ انسان کی زندگی کو خوشگوار رکھنے کے لئے تین باتیں ضروری ہیں:

1 انسان کو مصروفیت ہو

2 انسان کے لئے محبت کا کوئی مرکز ہو

3 انسان کو آئندہ کے لئے کوئی امید یا توقع ہو۔

ان تینوں باتوں میں سے چرکھاری کی دونوں مہارانیوں کو ایک بات بھی نصیب نہیں۔ والیان ریاست اور ان کی مہارانیوں اور بیگمات کو سوائے کھانے پینے اور بار بار لباس بدلنے کے کوئی دوسرا کام نہیں ہوا کرتا۔ یعنی یہ دونوں مہارانیاں بھی، مصروفیت سے قطعی محروم ہیں۔ شوہر یا اولاد نہ ہونے کے باعث ان کی محبت کا کوئی مرکز نہیں۔ اور آئندہ کے لئے توقعات کا تو کوئی سوال ہی نہیں۔ کیونکہ اگر ان کے ہاں اولاد ہوتی، تو یہ توقع کر سکتی تھیں، کہ ان کے بچے بڑے ہو کر ان کے لئے آرام و راحت اور دلچسپیوں کا باعث ہوں گے۔ مگر ستاروں کے برے اثرات سے کون بچائے، جب کہ قسمت میں ہی تباہی لکھی ہو افسوس کہ بانسواڑہ والی مہارانی چرکھاری کا نہ ماضی خوشگوار تھا، نہ حال خوشگوار ہے اور نہ مستقبل خوشگوار ہوگا۔ یہ بے چاری معصوم اور بے گناہ اپنی زندگی کے دن پورے کر رہی ہے۔ اور اس کی بدنصیبیوں کا ساتھ دینے کے لئے نیپال والی رانی بھی شامل ہوگئیں کاش کہ یہ دونوں مہاراجہ چرکھاری سے نہ بیاہی جاتیں، اور اگر یہ عام لوگوں کی بیویاں ہوتیں، تو ان کی زندگی یقیناً موجودہ کے مقابلہ پر زیادہ خوشگوار ہوتی۔

☆☆☆☆☆☆☆

زیادہ نیک ہونا بھی جرم ہے

مہاتما گاندھی کا جب قتل ہوا، تو برطانیہ کی مشہور اور قابل احترام شخصیت مسٹر برنارڈ شا نے اس خبر کو سنتے ہی کہا تھا:

''زیادہ نیک ہونا بھی ایک جرم ہے''

یعنی مہاتما گاندھی ایک فرقہ پرست اور متعصب شخص کے ہاتھوں قتل نہ ہوتے، اگر آپ کا دل اور دماغ فرقہ پرستی کے جراثیم سے قطعی پاک نہ ہوتا، اور آپ ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک نظر سے نہ دیکھتے۔ زیادہ نیک ہونے کے جرم کے سلسلے میں واقعات سنئے:

میں جس زمانہ میں میڈیکل پریکٹس کرتا تھا، اور آنکھوں کے آپریشن کرنے کے سلسلہ میں سندھ کے ایک مقام پر میر پور ماتھیلو (ضلع سکھر) میں مقیم تھا، تو ایک روز اس قصبہ میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی، اور ہر شخص کی زبان پر بھائی کنور کا نام تھا اور ہر کوئی منتظر تھا کہ رات کو بھائی کنور کا رقص اور گانا ہوگا اس وقت تک مجھے کچھ معلوم نہ تھا کہ بھائی کنور کون ہے۔ رات کو دس بجے کے قریب قصبہ کے لوگوں نے اس جگہ پر جانا شروع کیا، جہاں بھائی کنور گانے والے تھے ان لوگوں کے ساتھ میں بھی بھائی کنور کا گانا سننے چلا گیا۔

بھائی کنور ایک درویش صفت صوفی تھے۔ آپ سندھ کے دیہات، قصبوں اور شہروں کا دورہ کرتے۔ آپ کے ساتھ سو ڈیڑھ سو کے قریب آپ کے مداح اور معترف ہوا کرتے۔ ہر مقام پر دو تین روز قیام کرتے، اور پھر اگلے قصبہ، شہر یا گاؤں چلے جاتے۔ ہر مقام کے لوگ آپ کو پہلے گاؤں، قصبہ یا شہر سے لینے آتے، اور بعد میں دوسرے مقام پر چھوڑ آتے۔ آپ جتنے روز قیام کرتے، ہزارہا لوگ ایک ہی لنگر میں کھانا کھاتے، اور ہر روز رات کے وقت آپ کا رقص اور گانا ہوتا۔ میں جب بھائی کنور (جن کو اکثر لوگ بھگت کنور بھی کہتے) کی مجلس والی جگہ پہنچا، تو میں نے دیکھا کہ

وہاں ہزارہا ہندو اور مسلمان جمع ہیں گیس کی روشنی کے ہنڈے جل رہے ہیں۔ بھائی کنور کے پاؤں میں گھنگرو بندھے ہیں، اور آپ کھڑے ہو کر سازوں کے ساتھ رقص کر رہے ہیں۔۔ اس رقص کے ساتھ گورو نانک، کبیر، خواجہ فرید، سورداس، تلسی داس اور سندھ کے مسلمان صوفیوں کا کلام گایا جا رہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ بھائی کنور موسیقی کے فن سے تو زیادہ واقف نہ تھے، مگر آپ کے گلے میں اس قدر اثر تھا، کہ وہاں ہر شخص جھوم رہا تھا جس کی وجہ یہ تھی کہ آپ دنیا کے لالچ سے قطعی بالند رہتے ہوئے صرف بطور ایک مشنری کے صوفی ازم کی تبلیغ کے لئے ایسی محفلیں منعقد کرتے۔ اور جب آپ رقص کرتے، تو ایسا محسوس ہوتا کہ میرا بائی پریم کے رنگ میں رنگی ہوئی، سری کرشن کے سامنے رقص کر رہی ہے۔

بھائی کنور کی یہ محفل رات کو نو دس بجے سے شروع ہو کر سورج کے طلوع ہونے تک جاری رہی اور وہاں ایک شخص بھی ایسا نہ تھا۔ جو اس محفل کو چھوڑ سکا ہو، یا جس نے چند منٹ کے لئے بھی اس محفل سے جانا گوارا کیا ہو۔ چنانچہ راقم الحروف بھی صبح تک بھائی کنور کا گانا سننے، اور رقص سے لطف اندوز ہونے کے لئے وہاں موجود رہا۔ حالانکہ مجھے کسی مذہب سے کوئی بھی دلچسپی نہیں، اور تصوف کو بھی میں ایک مذہب سمجھتا ہوں۔

بھائی کنور کے میر پار ماتھیلو کے اس گانے اور رقص کے بعد ان کی کشش مجھے روہڑی اور ڈھرکی بھی لے گئی جہاں کہ ان کی محفل منعقد ہوئی اور میں آپ کے گانے اور رقص کو اب تک نہیں بھول سکا۔ اور یہ واقعہ ہے کہ اگر کبھی ریڈیو سے بھائی کنور کے گانے کا ریکارڈ سن لیتا ہوں تو اپنے جسم میں حظ اور لطف کی ایک کرنٹ سی محسوس کرتا ہوں۔

بھائی کنور کے متعلق ایک واقعہ بہت دلچسپ ہے۔ آپ عام طور پر ہندوؤں کے مندروں اور مسلمان فقراء کی درگاہوں کے سامنے اپنے رقص کی محفلیں منعقد کرتے،

کیونکہ ہندو اور مسلمان صوفیوں سے آپ کو ایک قسم کا عشق تھا۔ آپ ایک بار امرتسر گئے، تو آپ نے چاہا کہ آپ وہاں دربار صاحب میں بھی رقص کریں اور گورو صاحبان کا کلام گائیں مگر گوردوارہ کے منتظم اکالیوں نے آپ کو اس کی اجازت نہ دی اس انکار سے آپ بہت مایوس اور بد دل ہوئے تو آپ نے دربار صاحب کے بالکل قریب گھنٹہ گھر کے پاس ہی اپنا رقص شروع کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں ہزارہا لوگ آپ کا کیرتن یعنی گانا سننے اور رقص دیکھنے جمع ہو گئے، اور آپ کی بلند اور پرکشش آواز دربار صاح تک پہنچتی رہی۔

بھائی کنور زندگی بھر اسی طرح دیہات، قصبوں اور شہروں میں دورہ کرتے رہے۔ جب بھی سفر کرتے آپ کے ہمراہ سوڈیڑھ سو معتقدین کا ایک قافلہ ہوتا پبلک کے دلوں میں آپ کے لئے عزت و احترام کے جذبات کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے، کہ ریلوے کے ملازموں کی خواہش ہوتی کہ قافلہ کے لوگ ریلوے کا ٹکٹ نہ خریدیں۔ کیونکہ یہ کسی اپنی ذاتی غرض کے لئے سفر نہ کرتے، اور یہ دورہ صرف پبلک مفاد کے لئے ہوتا مگر بھائی کنور کسی شخص کو بھی بغیر ٹکٹ کے سفر کرنے کی اجازت نہ دیتے۔ بھائی کنور زندگی بھر اپنے مشن میں مصروف رہے، اور آخر آپ ایک روز ریلوے سٹیشن سکھر پر ایک متعصب ملا ٹائپ کے مسلمان کے ہاتھوں اسی طرح قتل کر دیئے گئے، جس طرح گاڈسے نے مہاتما گاندھی کو قتل کیا تھا، کیونکہ بقول مسٹر برناڈ شا، دنیا میں زیادہ نیک ہونا بھی ایک جرم ہے۔

1947ء کے فسادات کا زمانہ تھا ہندوستان سے پاکستان کا علاقہ الگ کر دیا گیا تھا۔ پاکستان کے مسلمان، اور ہندوستان کے ہندو اپنے دماغی توازن سے محروم ہو کر مذہب کے نام پر انسانوں کو قتل کر رہے تھے تو جالندھر میں مسلمانوں کو جلانے کے لئے چالیس فٹ لمبی اور چالیس فٹ چوڑی ایک چتا تیار کی گئی جس میں کئی من لکڑیاں جلتی رہتیں اور جو مسلمان ملتا اسے قتل کر کے اسے چتا میں ڈال دیا جاتا۔ جالندھر کے ایک

کانگرسی سکھ بابو گلاب سنگھ، اس شرمناک ظلم کو برداشت نہ کر سکے، اور آپ نے مسلمان محلوں میں سے مسلمانوں کو نکال کر حفاظت کے ساتھ مسلم کیمپ میں پہنچانے کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیا۔ آپ نے ہزارہا مسلمانوں کو موت کے منہ سے بچالیا۔ آپ کئی روز تک یہ خدمت انجام دیتے رہے ایک روز مسلمانوں کے محلّہ کے ایک مسلمان نے آپ کو چھرے کے ساتھ اس جرم میں ہلاک کر دیا، کہ آپ سکھ ہیں۔ کیونکہ اس زمانہ میں، صرف مسلمان یا سکھ ہونا ہی ایک ایسا جرم تھا، جس کی سزا موت سے کم نہ تھی۔ ان بابو جی کی موت کا اصل حالات سے واقف مسلمانوں کو بہت صدمہ تھا، مگر کیا ہوسکتا تھا، جب کہ دنیا میں زیادہ نیک ہونا بھی جرم ہے۔

کانپور کے نیک دل اور گاندھی بھگت کانگرسی مسٹر گنیش شنکر ودیارتھی سے کون ہندوستانی ہے، جو واقف نہ ہو۔ آپ زندگی بھر اپنے ہندی کے روزانہ اخبار کے ذریعے ہندو مسلم اتحاد قائم رکھنے کی کوشش میں مصروف رہے۔ آپ یو پی کے صوبہ کے ایک قابل صد احترام لیڈر تھے مگر کس قدر شرم کا مقام ہے کہ کانپور میں جب ہندو مسلم فساد ہوا تو مسٹر ودیارتھی جی کو بھی فساد کرنے والوں نے قتل کر دیا۔ مسٹر ودیارتھی کے قتل کی وجہ بھی یہی تھی کہ:

آپ زیادہ نیک تھے، اور زیادہ نیک ہونا دنیا میں جرم ہے

☆☆☆☆☆☆☆☆

سفید پوشی کی مصیبتیں

پنجابی زبان کی ایک کہاوت ہے:

نہ موئی جٹی، نہ موئی بھرمٹی

اندروڑ موئی کھتر ٹی

اس کہاوت کے معنی ہیں، بیوہ ہونے کی صورت میں نہ تو جاٹ کی بیوی تباہ ہوتی ہے، کیونکہ وہ دوسری شادی کر لیتی ہے، اور نہ براہمنی خاندان کی عورت، کیونکہ وہ دوسروں کے گھروں سے خیرات لے کر اپنا پیٹ پال لیتی ہے۔ اور اگر تباہ ہوتی ہے، تو کھترانی عورت، جو بیوہ ہونے کے بعد نہ دوسری شادی کر سکتی ہے، اور نہ خاندانی وقار کے باعث خیرات لے کر پیٹ پال سکتی ہے۔ یہ مجبور ہے کہ گھر کی چار دیواری کے اندر رہ کر بیوگی کے مصائب برداشت کرے اور اپنی زندگی مشکلات میں ہی ختم کر دے اس کہاوت کے مطابق دنیا میں سفید پوشی ایک مصیبت ہے اگر اس کے ساتھ تنگ دستی بھی ہو کیونکہ سفید پوش نہ تو اپنے وقار سے محروم ہو سکتا ہے اور نہ وہ اپنی شان کے خلاف خیرات قبول کر سکتا ہے۔ سفید پوشی کے مصائب کے سلسلہ میں چند واقعات سنئے:

انگریزوں کے زمانہ میں موجودہ پارلیمنٹ کی جگہ مرکزی آسمبلی تھی۔ اس آسمبلی میں مخالف پارٹی کے لیڈر پنڈت موتی لال نہرو تھے۔ جن کے ساتھ دیوان چمن لال اور مسٹر رنگا آئر، پنڈت شام لال نہرو اور مسٹر ریڈی وغیرہ نوجوانوں کی ایک پارٹی تھی۔ یہ لوگ گورنمنٹ کی مخالفت میں ہمیشہ کانگرس اور پنڈت موتی لال نہرو کا ساتھ دیتے۔ گورنمنٹ ان نوجوانوں سے بہت خوفزدہ تھی، کیونکہ آسمبلی میں یہ گورنمنٹ کو بے نقاب کرتے ہوئے اپنی تقریروں کے ذریعے آتش باری کرتے، اور گورنمنٹ اس کوشش میں رہتی، کہ ان نوجوانوں کو تحقیقاتی کمیشن کا ممبر مقرر کر کے الاؤنس کے ذریعہ ان کو زیر اثر رکھا جائے۔

مرکزی آسمبلی کے ان نوجوان ممبروں سے راقم الحروف کے گہرے دوستانہ تعلقات تھے یہ اکثر دفتر ''ریاست'' میں آیا کرتے، اور ان میں سے بعض تو کئی کئی

ہفتہ راقم الحروف کے ہاں مقیم بھی ہوتے پنڈت شام لال نہرو پنڈت موتی لال نہرو کے حقیقی بھتیجے تھے پنڈت شام لال نہرو جب دفتر ''ریاست'' میں آتے تو اکثر وہ باتیں بتایا کرتے، جو لیڈروں کے راز سے تعلق رکھتیں چنانچہ ایک روز آپ نے بتایا کہ:

گورنمنٹ کی مخالفت کے سلسلہ میں پنڈت موتی لال نہرو نے تمام کانگرسی ممبروں کو حکم دیا کہ کوئی ممبر بھی گورنمنٹ کے مقرر کئے ہوئے کسی کمیشن کی ممبری قبول نہ کرے، کیونکہ ان کمیشنوں کے ذریعے دیا جانے والا الاؤنس ایک قسم کی رشوت ہے۔

پنڈت موتی لال نہرو کا یہ حکم ان ممبروں کے لئے تو کسی اثر کا باعث نہ تھا، جو کھاتے پیتے خاندان سے تعلق رکھتے تھے، مگر ان ممبروں کے لئے مالی پریشانی کا باعث تھا، جو اسمبلی کی ممبری کے ذریعہ صرف تین سو روپیہ ماہوار کے قریب سرکاری خزانہ سے ممبری کی فیس حاصل کرتے، اور جن کی آمدنی کا دوسرا کوئی ذریعہ نہ تھا چنانچہ ان لوگوں نے جن کی آمدنی کا کوئی ذریعہ نہ تھا پنڈت شام لال نہرو کو پنڈت موتی لال نہرو کے پاس بھیجا تا کہ شام لال جی اپنے چچا پنڈت موتی لال نہرو سے مل کر کہیں کہ کمیشنوں کی ممبری قبول نہ کرنے کی پابندی عائد نہ کی جائے، تا کہ یہ ممبر گورنمنٹ سے کمیشنوں کی ممبری کے ذریعہ الاؤنس لے کر اپنا گزارہ کرتے رہیں۔ چنانچہ پنڈت شام لال نہرو موتی لال نہرو کے پاس پہنچے، اور درخواست کی کہ کانگرس کے نمائندہ ممبران اسمبلی پر کمیشنوں کی ممبری قبول نہ کرنے کی پابندی عائد نہ کی جائے، کیونکہ اس صورت میں وہ ممبران اسمبلی مالی مشکلات کا شکار ہوں گے، جن کی آمدنی کا اور کوئی ذریعہ نہیں۔ پنڈت موتی لال نہرو نے جب اپنے بھتیجے پنڈت شام لال نہرو سے یہ سنا تو آپ بہت غصے میں آئے اور آپ نے انگریزی میں جواب دیا:

''بیگ، بارو آر سٹیل مگر سرکاری کمیشنوں کی ممبری مت قبول کرو یہ ممبری کانگرسی ممبروں کو بد دیانت بنانے کا باعث ہے''

''بیگ، بارو آر سٹیل'' کے معنی تھے چاہے گداگری کرو، چاہے دوسروں سے قرض

لو اور چاہے چوری کرو، مگر کمشنوں کی ممبری قبول نہ کی جائے۔

پنڈت شام لال نہرو نے پنڈت موتی لال نہرو سے جب یہ سنا، تو آپ نے جواب دیا:

''سفید پوشی کے باعث ہم لوگ بیگ (یعنی گداگری) نہیں کر سکتے، شرم محسوس ہوتی ہے بارو (یعنی قرض لینے) کے لئے تیار ہیں، مگر کوئی قرض نہیں دیتا، اور سیٹل (چوری) کرنے کی ہمت نہیں، کسی چوری کے الزام میں جیل نہیں جا سکتے۔''

پنڈت شام لال نہرو کا یہ جواب سن کر پنڈت موتی لال نہرو بے اختیار ہنس دیئے، اور آپ نے ہنستے ہوئے کہا:

''چاہے کچھ ہو، کوئی کانگرسی ممبر اسمبلی، کسی سرکاری کمیشن کی ممبری قبول نہیں کر سکتا۔''

پنڈت موتی لال نہرو فطرتاً بہت فیاض تھے، اور آپ کی آمدنی کے ذرائع بھی بہت وسیع تھے آپ نے آمدنی کے محدود ذرائع رکھنے والے کانگرسی ممبران اسمبلی کی دوسرے طریقوں سے امداد شروع کی، اور ان سفید پوشوں کو مالی پریشانی سے بچایا۔

امرتسر کے ہندو ایک خاندان کے حالات سنئیے، جس کا راقم الحروف کو ذاتی علم ہے۔ اس خاندان میں میاں بیوی، تین لڑکیاں اور ایک لڑکا تھا۔ میاں ساٹھ روپیہ ماہوار کے قریب پیدا کرتے، اور یہ ہمیشہ تنگدست رہتے۔ بڑی لڑکی جوان ہوئی تو اس کی شادی کا مسئلہ سامنے تھا مگر گھر میں ایک پیسہ نہ تھا، جو اس کی شادی پر صرف کیا جاتا کیونکہ ساٹھ روپیہ ماہوار میں بچایا ہی کیا جا سکتا تھا ساٹھ روپیہ ماہوار میاں بیوی اور چھوٹے چھوٹے بچوں کے لئے کافی نہ تھے بڑی لڑکی کے جوان ہونے پر اس لڑکی کی ایک جگہ سگائی کی گئی، اور شادی کے لئے چند ماہ تک روپیہ واپس ادا کرنے کا وعدہ کر کے چار سو روپیہ ایک ساہوکار سے قرض لیا گیا۔ یہ روپیہ لڑکی کی شادی پر صرف ہوا۔ لڑکی اپنے سسرال گئی، اور یہ تین چار ماہ کے بعد حاملہ ہو گئی کیونکہ ہندوستانیوں اور پاکستانیوں کو کھانے کے لئے روٹی چاہے نہ ملے، مگر یہ بچے پیدا کرنے کی ''فرض

شناسی'' کے پابند رہتے ہیں۔اس عمل کے نتیجہ کے طور پر جب بچہ پیدا ہونے والا تھا تو ڈلیوری سے ایک ماہ پہلے دستور کے مطابق لڑکی اپنے میکہ آ گئی تاکہ اس کی ماں محبت اور اخلاص کے ساتھ خدمت انجام دے سکے۔لڑکی کے میکہ پہنچنے کے بعد قرض خواہ نے تقاضہ شروع کیا۔کیونکہ چند ماہ تک قرضہ واپس کرنے کا وعدہ کیا گیا تھا اور اب قرضہ لئے ایک برس سے زیادہ عرصہ ہو گیا تھا اس دن رات کے تقاضہ سے تنگ آ کر اور برادری کی بدنامی سے بچنے کے لئے لڑکی کی ماں نے لڑکی کا زیور، جو اسے سسرال سے ملا تھا، گروی رکھ کر روپیہ حاصل کیا اور قرض خواہ کو ادا کر دیا گیا۔لڑکی کے میکہ آنے کے ایک ماہ بعد لڑکی کے ہاں بچہ پیدا ہوا، اور بچہ ہونے کے دو ماہ بعد جب لڑکی کے سسرال واپس جانے کا مسئلہ پیش تھا تو سوال پیدا ہوا کہ بغیر زیور کے لڑکی کو کیونکر بھیجا جائے کیونکہ زیور تو ایک دوسرے ساہوکار کے پاس گروی رکھا گیا تھا۔ادھر جب لڑکی کو سسرال واپس جانے میں دیر ہوئی تو لڑکی کے خسر کو بھی علم ہو گیا کہ وہ زیور لڑکی کے والدین نے گروی رکھ دیا ہے جو اسے سسرال سے ملا تھا۔چنانچہ خسر نے بغیر زیور اپنے بیٹے کی بیوی کو واپس لے جانے سے انکار کر دیا۔ادھر لڑکی کے والدین کے لئے یہ ممکن ہی نہ تھا، کہ وہ روپیہ دے کر زیور ساہوکار سے واپس لیتے اور لڑکی کو معہ زیور واپس سسرال بھیجتے اس نازک صورت کا اثر لڑکی پر بھی پڑا، وہ ڈلیوری کے باعث کمزور تو تھی ہی اسے بخار شروع ہو گیا یہ بخار تپ دق کی صورت میں تبدیل ہو گیا اور تپ دق کا جو نتیجہ ظاہر ہو سکتا ہے اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں چنانچہ سفید پوشی نہ صرف اس خاندان کی ذلت و رسوائی کا باعث ثابت ہوئی بلکہ اس لڑکی کی زندگی کو بھی سفید پوشی کی نظر ہونا پڑا۔نہ معلوم ہندوستان اور پاکستان میں کتنے لوگ سفید پوشی کے مصائب کا شکار ہوتے چلے جا رہے ہیں، مگر اس سفید پوشی کو سفید پوشی ہی کہا جاتا ہے، اسے کوئی بھی سیاہ پوشی کہنے کے لئے تیار نہیں۔

☆☆☆☆☆☆

سابق والیان ریاست کی خوش فعلیاں

مرحوم مہاراجہ نابھ سال میں نو ماہ کے قریب تو مسوری یا ڈیرہ دون میں قیام فرماتے، کیونکہ ان مقامات کی آب و ہوا آپ کو بہت پسند تھی، اور صرف تین ماہ کے قریب اپنی ریاست نابھ میں رہتے۔ ایک بار آپ چیمبر آف پرنس کے اجلاس میں شرکت کے لئے دہلی تشریف لے گئے اور وہاں لیڈیو کیسل روڈ کی ایک کوٹھی میں مقیم تھے کہ آپ کے پاس ڈیرہ دون سے اطلاع پہنچی کہ آپ کا ایک بلا جو ایرانی نسل کا تھا ایک پرندہ کو پکڑنے کے لئے ایک درخت پر چڑھ گیا۔ اس کے درخت پر چڑھنے کے بعد پرندہ اڑ گیا مگر پرندہ کو پکڑنے کی کوشش میں یہ درخت سے گر گیا ہے اور اس کی گردن پر چوٹ آئی ہے اس اطلاع کے پہنچنے پر مہاراجہ نے ڈیرہ دون اپنے اسسٹنٹ سیکرٹری کو تار دیا کہ بلا کی خیریت کی بذریعہ تار اطلاع دی جائے اور اس کی حالت سے نہ صرف ہر روز بذریعہ تار اطلاع دی جائے بلکہ اس کے علاج کے لئے سول سرجن کی خدمات بھی حاصل کی جائیں کیونکہ مقامی ویٹرنری ہسپتال کا ڈاکٹر زیادہ اعلیٰ کوالیفائیڈ نہ تھا، چنانچہ اس بلے کے علاج کے لئے سولہ روپیہ روزانہ فیس پر سول سرجن مقرر کیا گیا اور ہر روز ایکسپریس تار کے ذریعے بلے کی خیریت اور حالت کے متعلق ڈیرہ دون سے دہلی اطلاع پہنچا کرتی۔ یہ بلا غالباً ایک ماہ کے قریب بیمار رہا۔ انداز کیا جا سکتا ہے کہ سول سرجن اور ویٹرنری سرجن کی فیسوں اور ایکسپریس تاروں (کیونکہ ریاستوں سے تار صرف ایکسپریس ہی جایا کرتے، وہاں روپیہ کے مصارف کا کوئی سوال نہ تھا) پر کتنا روپیہ صرف ہوا ہوگا۔ اور اس سلسلہ کا یہ واقعہ دلچسپ ہے کہ سٹاف کے لوگ منہ سے تو کچھ کہنے کی جرأت نہ کرتے، مگر جب تار آتا، تو آپس میں مسکراتے ہوئے مذاقاً صرف یہ کہا کرتے، کہ بلا صاحب پہلے سے اچھے ہیں، اور ان کی زندگی خطرے سے محفوظ ہے۔

پنجاب کی ایک رانی صاحبہ ایک بار دہلی تشریف لائیں آپ ''ریاست'' کو بہت

پسند فرمایا کرتیں اور راقم الحروف کی بہت مداح تھیں دہلی پہنچنے کے بعد آپ راقم الحروف کو نیاز حاصل کرنے کا موقعہ دینے کے لئے دفتر ''ریاست'' میں بھی تشریف لائیں ان کے اعزاز میں چائے کا انتظام کیا گیا، اور چائے کی میز پر دوسری بہت سی اشیاء کے ساتھ پھل بھی تھے ان پھلوں کے ساتھ انگور بھی تھے۔ چنانچہ راقم الحروف یہ دیکھ کر حیران رہ گیا، کہ ان کے پرائیویٹ سیکرٹری صاحب انگوروں کی ڈنڈیاں توڑ کر رانی صاحبہ کو انگور پیش کرتے، یعنی رانی صاحب کا انگوروں سے ڈنڈیاں خود توڑ کر انگور کھانا بھی ان کی ریاستی شان کے خلاف تھا۔

سینٹرل انڈیا کی ایک ریاست کے نواب صاحب نے ایک اچھی نسل کا جوڑا لندن میں خریدا اور وہ یہ جوڑا آپ اپنے ساتھ ولایت سے لائے۔ ایک برس کے بعد اس جوڑے کے بچے پیدا ہوئے، جو بہت خوبصورت تھے۔ مگر نواب صاحب کے حکم سے ان تمام بچوں کو ابلتے ہوئے پانی میں ڈلوا کر ہلاک کر دیا گیا۔ اس ظلم کی وجہ یہ تھی کہ نواب صاحب نہ چاہتے تھے کہ اس نسل کے بچے کسی دوسرے کے پاس بھی جائیں اور لوگ یہ کہیں کہ اس نسل کے بچے فلاں کے پاس بھی ہیں۔

پٹیالہ کے مرحوم کنور رنبیر سنگھ (مرحوم مہاراجہ بھوپندر سنگھ کے حقیقی چچا) کرسمس کے ایام میں کلکتہ تشریف لے گئے۔ اس زمانہ میں کلکتہ والی گوہر جان کی بہت شہرت تھی آپ نے اپنا سیکرٹری بھیج کر گوہر جان کو مجرے کے لئے طلب فرمایا گوہر جان کا زمانہ عروج کا تھا اس نے سیکرٹری کو جواب دیا کہ مجرا کرنے یعنی اس کے گانے کی فیس پانچ ہزار روپیہ ہوگی۔ سیکرٹری یہ سن کر واپس کنور صاحب کے پاس پہنچے اور بتایا کہ گوہر جان اپنے مجرے کی فیس کا پانچ ہزار روپیہ بتاتی ہے۔ یہ سن کر کنور صاحب کچھ ناراض ہوئے، اور گوہر جان کے اس جواب کو گستاخی قرار دیا۔ مگر حکم دیا کہ گوہر جان کو بلا لو پانچ ہزار روپیہ دے دیا جائے گا۔ پرائیویٹ سیکرٹری پھر گوہر جان کے ہاں گئے اور اپنے ساتھ گوہر جان کو لے آئے گوہر جان کنور صاحب کے سامنے پیش ہوئی تو کنور

صاحب نے اپنی پیشانی پر بل ڈالتے ہوئے پرائیویٹ سیکرٹری کو حکم دیا کہ اسے فیس پانچ ہزار روپیہ دے دیا جائے، اور آپ اس کا گانا سننا نہیں چاہتے۔ کنور صاحب کو فیس ادا کرنے اور گانا نہ سننے کا مقصد یہ تھا کہ گوہر جان کی توہین ہو۔

مرحوم مہاراجہ جیند کو مچھلی کے شکار کا بہت شوق تھا۔ آپ ایڈمنسٹریشن میں کوئی دلچسپی نہ لیتے تھے ریاست کا تمام کام آپ نے وزیراعظم ڈاکٹر ڈھینگرہ پر چھوڑ رکھا تھا آپ دن بھر کسی جھیل یا بڑے جوہڑ کے کنارے بیٹھے مچھلیاں پکڑتے اور رات کو اپنی ریلوے سیلون میں آرام فرماتے۔ ایک بار آپ کی سیلون کئی روز تک ایک چھوٹے سے ریلوے اسٹیشن پر کھڑی رہی یہ اسٹیشن ایک جھیل کے قریب تھا سیلون کے کئی روز کھڑے رہنے کے باعث سیلون کی بیٹریاں ختم ہوگئیں، تو سوال پیدا ہوا، کہ بیٹریاں کیونکر چارج کی جائیں کیونکہ اگر گاڑی حرکت میں ہو تو بیٹریاں بھی ساتھ ساتھ چارج ہوتی رہتی ہیں آپ نے حکم دیا کہ سیلون کو اس گاڑی کے ساتھ لگا دیا جائے جو ٹرین اس اسٹیشن سے بھٹنڈہ جا رہی تھی۔ چنانچہ یہ سیلون صرف بیٹریاں چارج کرنے کے لئے معہ مہاراجہ کے اس اسٹیشن سے بھٹنڈہ گئی، اور واپس آئی۔ دو سو میل سفر کرنے کے بعد بیٹریاں چارج ہوئیں اور مہاراجہ پھر مچھلی کے شکار میں مصروف ہو گئے۔

پنجاب کی ایک مہارانی کا کتا جس کی قیمت زیادہ سے زیادہ پچاس روپیہ تھی، لاہور میں گم ہو گیا، جبکہ مہارانی اپنے شوہر کے ساتھ وہاں مقیم تھیں مہاراجہ کا تمام اسٹاف کتے کی تلاش میں دن بھر مارا مارا پھرتا رہا، مگر کتا نہ ملا۔ آخر مہارانی کی طرف سے لاہور کے ایک اخبار ''سول اینڈ ملٹری گزٹ'' اور ''ٹریبون'' میں اشتہار دیا گیا کہ اس حلیہ کا کتا گم ہو گیا ہے جو شخص اس کتے کو لائے گا اس کو پانچ سو روپیہ انعام دیا جائے گا مگر کتا نہ ملا کیونکہ وہ شخص شائد انگریزی اخبارات نہ پڑھتا ہوگا، جس نے آوارہ پھرتے اس کتے کو باندھ لیا تھا۔

میر صاحب خیر پور سندھ بے اختیار کر دیئے گئے۔ اور خیر پور میں ایک انگریز

پورے اختیارات کے ساتھ بطور وزیر اعظم بھیج دیا گیا اس انگریز نے نہ صرف میر صاحب پر بہت پابندیاں عائد کر دیں بلکہ ان کے ذاتی معاملات میں بھی مداخلت شروع کر دی میر صاحب جب بہت پریشان ہوئے تو آپ نے اپنا ایک معتمد بھیج کر راقم الحروف کو اپنے پاس بلوایا تا کہ اس انگریز کی زیادتیاں بتا سکیں اور ان زیادتیوں کو ''ریاست'' میں بے نقاب کیا جائے۔ مئی کا مہینہ تھا، اور سندھ کی گرمی اور لو اپنے جوبن پر تھی۔ راقم الحروف دہلی سے خیر پور پہنچا۔ ریلوے اسٹیشن پر میر صاحب کی کار موجود تھی یہ کار خیر پور سے کئی میل فاصلہ پر مجھے وہاں لے گئی، جہاں میر صاحب مقیم تھے اس جگہ نہ کوئی محل تھا، نہ مکان اور میر صاحب ریت کے ایک ٹیلہ پر کیمپ لگائے اس کیمپ میں تشریف فرما تھے اس کیمپ کی کیفیت یہ تھی، کہ اس کے چاروں طرف قناتیں تھیں اور قناتوں کے اندر خس کی ٹٹیاں لگی تھیں، اور چھت کی جگہ سائبان تھا اس کیمپ کے باہر تو آگ برس رہی تھی اور لو کے باعث کھڑا ہونا بھی مشکل تھا مگر کیمپ کے اندر درجنوں ملازم پانی کی مشکیں ٹٹیوں پر چھڑک رہے تھے، جس سے اندر کی فضا نہ صرف گرم تھی، بلکہ سرد بھی تھی میر صاحب لکڑی کے ایک چبوترہ پر تشریف فرما تھے اور تمام کیمپ کے اندر قالین بچھے ہوئے تھے راقم الحروف جب کیمپ کے اندر پہنچا تو ایسا معلوم ہوا کہ وہ دوزخ سے بہشت میں آ پہنچا ہے۔ دو گھنٹہ کے قریب میر صاحب سے باتیں ہوئیں باتیں کرنے کے بعد راقم الحروف جب کیمپ سے باہر آیا تو ایسا محسوس ہوا کہ وہ پھر سے بہشت سے دوزخ میں پہنچ گیا ہے۔ میر صاحب کا سیکرٹری جو باہر چھوڑنے کے لئے آیا اس سے راقم الحروف نے پوچھا کہ:

''میر صاحب اس گرمی میں بھی اپنے محلات میں کیوں نہیں رہتے، اور ریت کے ٹیلے پر کیوں کیمپ لگا رکھا ہے۔''

تو اس سیکرٹری نے مسکراتے ہوئے صرف یہی جواب دیا، کہ:

''سرکار کھلی ہوا میں رہنا زیادہ پسند کرتے ہیں''

اس جواب کو سن کر میں نے اپنے دل میں کہا کہ یہ نواب اور راجے جتنی جلدی بھی ختم ہو جائیں۔۔۔۔ اچھا ہے۔۔۔۔۔۔ یہ چاہے انگریزوں کے ہاتھوں ختم ہوں۔۔۔۔یا کمیونزم کے ہاتھوں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

سیاسی لیڈروں کی دروغ بیانیاں

تبادلہ آبادی سے پہلے کا واقعہ ہے کہ راولپنڈی جیل میں ایک بہت ہی شریف اور دیانتدار اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ سردار جاگیر سنگھ تھے، جو رشوت نہ لینے کے اعتبار سے اپنے تمام محکمہ میں شہرت رکھتے تھے، اور آج کل غالباً حصار میں ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ ہیں۔ میں جب دہلی جیل میں تھا، تو یہ اس وقت دہلی جیل میں تھے اور بعد میں جب میں لاہور گیا تو یہ اس وقت لاہور جیل میں تھے۔ دونوں جیلوں میں مجھے ان کو قریب سے دیکھنے کا اتفاق ہوا ان کی غیر معمولی دیانت داری کے باعث ان کے لئے میرے دل میں انتہائی عزت کے جذبات تھے اور یہ بھی مجھے اپنا مخلص دوست اور خیر خواہ سمجھتے، اور جب کبھی دہلی آتے تو مجھ سے ملے بغیر نہ جاتے۔

سردار جاگیر سنگھ ایک دفعہ راولپنڈی سے دہلی آئے، اور مجھ سے ملے، تو کچھ پریشان سے تھے میں نے پوچھا کہ:

''کب آئے، اور کیوں آئے؟''

تو آپ نے بتایا کہ:

''پنجاب گورنمنٹ جیلوں کے سٹاف میں تخفیف کر رہی ہے، اور یہ خطرہ ہے، کہ شائد آپ بھی اس تخفیف کی نذر ہو جائیں، اور آپ راولپنڈی سے دہلی اس لئے آئے ہیں، کہ آپ سردار منگل سنگھ ممبر مرکزی اسمبلی (جو ان کے ہموطن یعنی لدھیانہ کے رہنے والے تھے) سے مسٹر بھیم سین سچر وزیر جیل خانہ جات پنجاب سے سفارش کر دیں کہ ان کو تخفیف کا شکار نہ ہونے دیا جائے۔'' میں نے پوچھا کہ:

''سردار منگل سنگھ نے کیا جواب دیا؟''

تو آپ نے بتایا کہ

''سردار منگل سنگھ نے وعدہ کیا ہے کہ آپ جب لاہور جائیں گے، تو مسٹر بھیم سین سچر سے زبانی کہیں گے اور وہ مسٹر بھیم سین سچر کو خط لکھنا مناسب نہیں سمجھتے۔''

میں نے سردار جاگیر سنگھ سے کہا کہ:

''میرے تجربہ کے مطابق لیڈر کلاس میں سے تو نوے فیصدی لوگ جھوٹ بولتے ہیں اور اخبارات کے ایڈیٹروں میں سے پچانوے فیصدی جھوٹ لکھتے ہیں اس لئے آپ سردار منگل سنگھ کے زبانی وعدہ کا اعتبار نہ کیجئے میری رائے یہ ہے کہ اگر آپ ان سے سفارش کرانا ہی چاہتے ہیں تو بہتر صورت یہ ہے کہ ریلوے کا کرایہ خرچ کر کے آپ ان کو اپنے ساتھ لاہور لے جائیے، اور اپنے سامنے ان سے مسٹر جسٹس بھیم سین سچر سے کہلوائیے۔''

سردار جاگیر سنگھ نے کہا کہ:

''سردار منگل سنگھ لدھیانہ کے رہنے والے ان کے ہم وطن ہیں، وہ ان سے جھوٹا وعدہ نہیں کر سکتے۔''

یہ کہہ کر اور چائے پی کر سردار جاگیر سنگھ چلے گئے مجھے علم نہیں کہ سردار منگل سنگھ نے سردار جاگیر سنگھ کے متعلق مسٹر جسٹس بھیم سین سچر سے سفارش کی یا نہیں۔

1947ء کے فسادات سے چند ماہ پہلے کا واقعہ ہے ایک مضمون کے سلسلہ میں ماسٹر تارا سنگھ نے مجھ پر امرتسر میں توہین کا ایک مقدمہ دائر کیا تھا۔ اس مقدمہ کے سلسلہ میں مجھے کئی بار دہلی سے امرتسر جانا پڑا۔ میرا معمول یہ تھا کہ میں رات کو دہلی سے سوار ہوتا۔ صبح امرتسر پہنچتا، دن کے وقت عدالت میں حاضری دیتا اور اسی شام کو چھ بجے کے قریب امرتسر سے سوار ہو کر اگلی صبح واپس دہلی پہنچ جاتا جس روز میری پیشی ہوتی اس کے متعلق میں جالندھر میں اپنے ایک دوست مسٹر اکرام الحق کو دو روز پیشتر اطلاع دے دیتا۔ مسٹر اکرام الحق اپنے بیوی بچوں کے ساتھ کھانا لے کر جالندھر شہر کے اسٹیشن پر آ جاتے کھانے والا ٹفن کیریئر تو یہ گاڑی میں رکھ دیتے اور پچھلی پیشی والا خالی ٹفن کیریئر واپس لے لیتے چند منٹ ان سے باتیں ہو جاتیں اور ہر پیشی پر ایسا ہی ہوتا۔

میں ایک روز پیشی پر امرتسر گیا۔ جالندھر مسٹر اکرام الحق سے مل کر اور کھانا لے کر واپس آ رہا تھا تو لدھیانہ اسٹیشن پر سردار منگل سنگھ مل گئے یہ مرکزی اسمبلی کے سیشن میں شامل ہونے کے لئے دہلی آ رہے تھے سردار منگل سنگھ میرے دیرینہ دوست تھے بہت تپاک سے ملے اور آپ نے اپنے ملازم سے جوان کو اسٹیشن پر چھوڑنے آیا تھا کہ وہ فوراً جا کر ریفریشمنٹ روم سے میرے لئے کھانا لے آئے میں نے کہا کہ:

''کھانا میرے پاس رکھا ہے ایک دوست نے جالندھر دے دیا تھا''

مگر سردار صاحب نے ایک نہ سنی، اور انہوں نے اپنے ملازم کو ریفرشمنٹ روم میں بھیج دیا اور ملازم ایک تھالی میں کھانا لے کر آ گیا۔ ریلوے کے ہندو ریفرشمنٹ رومز میں کھانا جس قدر بدمزہ ہوتا ہے، مجھے اس کا پہلے تجربہ تھا۔ میں نے ان ریفرشمنٹ رومز کا کھانا کئی برس سے چھوڑ رکھا تھا، اور اگر کسی ریلوے ریفرشمنٹ روم کا کھانا کھاتا تو صرف انگریزی ریفرشمنٹ رومز کا۔ اب ادھر تو سردار منگل سنگھ کا اخلاص اور محبت کے ساتھ منگایا ہوا کھانا میری سیٹ پر پڑا تھا، اور ادھر اسی سیٹ کے نیچے ٹفن کیریئر میں مسلمانوں کے گھر کا پکا ہوا لذیذ کھانا رکھا تھا۔ میں مجبور تھا، کہ سردار صاحب کا منگایا ہوا بدمزہ کھانا کھاؤں، اور اپنے ذہن اور ذائقہ دونوں پر ظلم کروں بہر حال میں نے سردار صاحب کا منگایا ہوا کھانا کھایا، کیونکہ انکار نہ کر سکتا تھا۔

کھانا کھانے کے بعد سردار منگل سنگھ میرے سامنے والی برتھ پر اپنا بستر بچھا کر بیٹھ گئے میں کھانے سے فارغ ہو چکا تو کچھ دیر بعد گاڑی حرکت میں آئی۔ میرے اور سردار منگل سنگھ کے درمیان یہ بات چیت ہوئی:

میں: سردار صاحب! یہ تو بتائیے، کہ آپ کے پاس سفارش کرانے والے کتنے ہر روز آتے ہیں۔ کیونکہ آپ مرکزی اسمبلی کے ممبر ہیں، اور آپ کی کانسٹی ٹیونسی کا حلقہ بھی بہت وسیع ہے۔

سردار منگل سنگھ: روزانہ اوسط پچاس ساٹھ لوگوں کی ہے

میں: تو پھر اس بڑی تعداد کا کیا کرتے ہیں۔

سردار منگل سنگھ: کسی کو سفارشی خط دیا جاتا ہے، کسی سے زبانی سفارش کرنے کا وعدہ کیا جاتا ہے، کسی کو پھر آنے کے لئے کہہ کر ٹال دیا جاتا ہے، اور کسی سے کہا جاتا ہے، کہ آپ جب لدھیانہ جائیں، تو اس وقت ان کو یاد کرایا جائے۔ کیونکہ اکثر لوگ ایسے ہوتے ہیں، جو چاہتے ہیں کہ ڈپٹی کمشنر لدھیانہ یا وہاں کے کسی دوسرے افسر سے سفارش کی جائے کیونکہ یہ میرے علاقہ ضلع لدھیانہ کے رہنے والے ہوتے ہیں۔

میں: اور اگر آپ سفارش یا چھوٹا وعدہ نہ کریں تو پھر؟

سردار منگل سنگھ: پھر یہ لوگ دشمن ہو جائیں، اور انتخاب کے دنوں میں نہ صرف مجھے ووٹ دیں بلکہ دوسروں کو ووٹ نہ دینے کے لئے بھی ورغلاتے ہیں۔

میں: تو گویا ایک لیڈر کے لئے جھوٹ بولنا اور غلط وعدے کرنا لازمی ہے۔ اور اگر ایک لیڈر جھوٹ نہ بولے، اور غلط وعدے نہ کرے، تو وہ لیڈر نہیں رہ سکتا۔

سردار منگل سنگھ: بلاشبہ

سردار منگل سنگھ سے میں یہ سننے کے بعد اپنی برتھ پر لیٹ گیا، اور دیر تک سوچتا رہا، کہ دنیا کے لوگ دن رات طوائفوں کو صرف اس لئے کوستے ہیں کہ ان کے ظاہر اور باطن میں فرق ہوتا ہے۔ کیا ہمارے ملک کے لیڈروں اور ایڈیٹروں کی حالت طوائفوں کے مقابلہ پر زیادہ بدتر نہیں؟ کیونکہ ایک طوائف کی مار کا حلقہ، تو صرف ایک یا دو چار لوگوں تک محدود ہوتا ہے اور لیڈروں اور ایڈیٹروں کی مار کی زد میں ہزارہا لوگ آتے ہیں۔

یہ سوچتے سوچتے میں سو گیا اور صبح جب آنکھ کھلی تو میرٹھ چھاؤنی کا اسٹیشن تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

شاہین کے نشیمن میں ہے زاغوں کا بسیرا

لندن کے فلیٹ سٹریٹ کو اگر انگلستان کا صحافتی مرکز قرار دیا جا سکتا ہے (کیونکہ اس سٹریٹ میں ہی لندن کے قریب قریب تمام اخبارات کے دفاتر ہیں) تو دہلی کے ترا ہا بیرم خاں (جہاں سے صرف ایک مربع فرلانگ کے اندر اندر پھاٹک مفتی والا اور کوچہ چیلاں وغیرہ کا علاقہ ہے) کو شارع علم (کیونکہ مصر وغیرہ عرب ممالک میں بازار یا گلی کو شارع کہا جاتا ہے، یا شاہراہ ادب (کیونکہ ایران میں بازار یا گلی کو شاہراہ کہتے ہیں) ہی کہنا چاہئے کیونکہ دہلی کا ایک مربعہ فرلانگ کا یہ علاقہ سینکڑوں برس تک علم و ادب کا مرکز رہا۔ اور علمی و ادبی اعتبار سے اگر اس علاقہ کی مرکزیت 1947ء کے فسادات کے زمانہ میں ختم ہوئی، تو اس لئے کہ اس علاقہ کے قریب قریب تمام مسلمان ادیب اور علماء پاکستان چلے گئے۔ ایک اہل الرائے کے قول کے مطابق دنیا میں شباب، سیلاب اور انقلاب سے پیدا ہونے والی تباہیوں کو کوئی نہ روک سکا۔

اس ترا ہا بیرم خاں کے قریب ہی کوچہ چیلاں پر جہاں مولانا محمد علی، سر عبدالقادر، مولانا راشد الخیری، ملا واحدی، سر سید احمد، مولوی ذکا اللہ، مسٹر آصف علی، مولانا احمد سعید، خواجہ حسن نظامی اور منشی عبدالحمید وغیرہ درجنوں ادیب، مصنفین، سیاست دانوں اور اہل زبان حضرات نے اپنی عمر کا زیادہ یا تمام کا تمام حصہ بسر کیا۔ اس ترا ہا بیرم خاں کے بالکل قریب ہی پھاٹک مفتی والاں ہے جہاں کہ راقم الحروف نے پچھلے تیرہ برس کا زمانہ قیام کیا، اور جہاں سے کہ اس عرصہ میں اخبار ''ریاست'' شائع ہوتا رہا۔

میں پھاٹک مفتی والاں کی خصوصیات سے واقف نہ تھا۔ اس محلّہ سے صرف اتنا ہی تعلق تھا، کہ وہاں ہندوستان کے ایک سابق ترین خوشنویس منشی دین محمد (مشہور مصنف مسٹر ضیاء الدین برنی اور جلی خط کے یکتا خوشنویس مسٹر یوسف کے والد) رہا کرتے۔ یہ منشی دین محمد بھی ضلع گوجرانوالہ کے رہنے والے تھے، مگر عمر بھر دہلی میں رہے۔ منشی صاحب راقم الحروف کو اپنے عزیزوں کی طرح سمجھتے۔ مجھ پر جب کوئی

مقدمہ بنتا، یا کوئی مصیبت نازل ہوتی، تو یہ بڑھاپے میں نماز پڑھنے کے بعد میرے حق میں دعا کرتے۔ میں کبھی کبھی ان کے اس اخلاص کا شکریہ ادا کرنے کے لئے ان کی خدمت میں حاضر ہوتا۔

1947ء میں جب دہلی میں فسادات ہوئے، اور مسلمانوں کو زیادہ آبادی نے پاکستان جانے کا فیصلہ کیا، تو نصف درجن کے قریب اصحاب نے مجھے پیغام بھیجا کہ:

میں ان کے مکان میں آجاؤں، جو کہ خالی ہونے والا ہے۔

ان نصف درجن اصحاب میں ہی ماسٹر عبدالحمید منیجر ہمدرد دواخانہ اور ان کے بھائی بھی تھے۔ ان کا پیغام ملنے پر میں ان کے مکان میں گیا، تو دیکھا، کہ یہ لوگ اپنا سامان باندھ رہے تھے، اور پاکستان جانے کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ میں نے مکان دیکھا، تو یہ کافی بڑا اور وسیع تھا۔ میں نے کرایہ پوچھا تو ان لوگوں نے جواب دیا کہ:

کرایہ کا کوئی سوال نہیں، میں بغیر کرایہ کے ہی ان کے مکان میں رہوں جس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ ان لوگوں کے دلوں میں میرے لئے عزت اور محبت کے جذبات تھے۔ یہ مجھے دیانتدار سمجھتے تھے ان کا یقین تھا کہ یہ جب چاہیں گے، میں مکان ان کو واپس کر دوں گا دوسرے یہ شرنارتھیوں سے خوفزدہ تھے، اور ان کو یہ احساس تھا، کہ شرنارتھی مکان پر قبضہ کرنے کے بعد کبھی نہ چھوڑیں گے، نہ کرایہ دیں گے، اور جو سامان وہاں باقی رہ جائے گا (کیونکہ جس مکان میں مالکان پچاس، ساٹھ یا ستر برس تک رہے، اس طویل عرصہ میں ہر روز، ہر ہفتہ یا ہر ماہ کچھ نہ کچھ سامان لاتے رہے۔ اس تمام کے تمام سامان کا لے جانا آسان نہ تھا، اور ہر شخص چاہتا تھا، کہ جو سامان نہ جا سکے، وہ محفوظ رہے۔ تاکہ اگر حالات نے اجازت دی، تو یہ واپس آکر اپنا سامان لے سکیں) اسے شرنارتھی خورد برد کر لیں گے۔

میں نے جواب دیا کہ:

بغیر کرایہ کے میرا اس مکان میں آنا ممکن نہیں

تو انہوں نے کہا کہ:

اچھا جو کرایہ میں مناسب سمجھوں، وہ مقرر کر لیا جائے۔

چنانچہ اس مکان کا پچھتر روپے ماہوار کرایہ مقرر رہوا۔ اس مکان کے ایک کمرہ میں تو مالکان مکان نے اپنا وہ تمام سامان رکھ کر تالا لگا دیا، جسے وہ منتقل نہ کر سکے تھے، اور ایک کمرہ میں ظفر احمد صاحب پرنٹر و پبلشر ''ریاست'' کا سامان رکھ کر اسے تالا لگا دیا گیا، کیونکہ وہ بھی فسادات کے باعث پاکستان جا رہے تھے (یہ سامان کئی برسوں تک ان کمروں میں محفوظ پڑا رہا۔ اور بعد میں یہ دونوں اصحاب اس سامان کو لے گئے) میں اس پھاٹک مفتی والاں والے مکان میں منتقل ہو گیا، کیونکہ انور صاحب کے چرخہ والاں والے مکان، جہاں میں رہتا تھا، گنجائش کم تھی۔

اس وقت تک مجھے کچھ علم نہیں تھا، کہ اس پھاٹک مفتی والاں (جہاں میں نے رہائش اختیار کی ہے) کو علمی، ادبی اور مذہبی اعتبار سے کتنی بڑی اہمیت حاصل ہے۔ چنانچہ ایک روز مسٹر شریف الحسن (جو اس محلّہ کے ہی رہنے والے تھے، اور آج کل غالباً مصر میں پاکستان گورنمنٹ کے پبلسٹی افسر ہیں) تشریف لائے، تو انہوں نے بتایا کہ:

اس پھاٹک مفتی والاں کے محلّہ میں سینکڑوں برس تک مفتیوں کے خاندان رہے۔ یہ مفتی نہ صرف مذہبی اعتبار سے تمام ہندوستان پر حکومت کرتے تھے، اور ہندوستان کے مسلمان بادشاہ کسی بھی مذہبی مسئلہ میں ان مفتیوں کی رائے کے خلاف فیصلہ نہ کر سکتے۔ بادشاہ اورنگزیب بچپن کے زمانہ میں اس محلّہ کے مفتیوں کے ہاں آ کر ہی قرآن پڑھتے اور مذہبی تعلیم حاصل کرتے۔

چنانچہ اسی سلسلہ میں ہی شریف الحسن صاحب نے بتایا کہ:

اورنگزیب کے استاد مفتی صاحب کے مکان میں آج کل گائے اور بھینس رکھنے والے گھوسی رہتے ہیں۔ اس مکان کی دیواروں پر گوبر کے اپلے لگائے جاتے ہیں، اور ایک دیوار پر سے اپلے اتر گئے تھے، اپلوں کے نیچے سے ستون ننگا ہوا، تو دیکھا گیا کہ

یہ ستون سنگ مرمر کا ہے۔

میں نے شریف الحسن صاحب سے جب اس محلّہ کی اتنی بڑی تاریخی اہمیت کے واقعات سنے خیال کیا کہ اب میں اس محلّہ میں رہتا ہوں، تو میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

شاہین کے نشیمن میں ہے زاغوں کا بسیرا

کیونکہ یہ درست ہے کہ اورنگزیب کے زمانہ میں ہی معصوم اور بیگناہ گورو تیغ بہادر چاندنی چوک کے گوردوارہ سیس گنج والے مقام پر قتل کیے گئے، اور درویش صوفی حضرت سرمد کا سر جامع مسجد کے سامنے تن سے جدا کیا گیا۔ ان دونوں اولیائے اللہ کو ظلم کا شکار اورنگزیب کے حکم سے ہی کیا گیا، مگر کوئی بھی معقولیت پسند شخص اورنگزیب کی بلندی، ایثار، قابلیت اور علمیت سے انکار نہیں کر سکتا جس نے اپنی زندگی میں سرکاری خزانہ سے اپنی ضروریات کے لئے کبھی ایک پیسہ نہ لیا، اور جس کی تعریف میں گورو گوبند سنگھ نے بھی ظفر نامہ کے نام سے ایک مدحیہ قصیدہ لکھا۔ یہ قصیدہ بھائی منی سنگھ کے ہاتھ اورنگ آباد (دکن) بھیجا۔ اگر گورو تیغ بہادر اور حضرت سرمد پر ظلم ہوا، تو اس کی وجہ صرف سیاست تھی۔ کیونکہ سیاست تو ہر برسر اقتدار بادشاہ کے ہاتھوں سے ظلم کراتی ہے، اب کرا رہی ہے، اور آئندہ کراتی رہے گی۔ کیونکہ ظلم اور سیاست دونوں لازم و ملزوم ہیں، یہ ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے۔

☆☆☆☆☆☆

فرض اور حب الوطنی میں تصادم

ایک صاحب رائے بہادر لالہ سورج نرائن (پنجاب ہائیکورٹ کے موجودہ جج، مسٹر بشن نرائن کے والد، اور مشہور انقلاب پسند لالہ ہردیال کے سنبھندی، کیونکہ مسٹر بشن نرائن کی شادی لالہ ہردیال کی اکلوتی صاحبزادی کے ساتھ ہوئی تھی) سالہا سال تک دہلی میں سرکاری وکیل رہے۔ سرکاری وکیل ہوتے ہوئے بھی اگر آپ کو معلوم ہو جاتا، کہ فلاں شخص بیگناہ ہے، تو آپ عدالت میں کھلے طور پر کہہ دیتے، کہ یہ ملازم بیگناہ ہے۔ چاہے یہ ملزم قتل کے الزام میں ہی کیوں نہ ماخوذ ہوتا، اور پولیس چاہے اس بیان پر اپنا سر ہی کیوں نہ پیٹ لیتی اور چاہے آپ کے کسی رشتہ دار کا دوست ہی ملزم ہوتا، آپ کے کسی عزیز اور رشتہ دار میں یہ جرات نہ تھی، کہ وہ اپنے دوست کی سفارش کرتا۔ چنانچہ راقم الحروف کو اچھی طرح یاد ہے۔ میرے ایک مقدمہ نواب بھوپال بنام ایڈیٹر "ریاست" (جو دہلی میں چل رہا تھا، اور جس میں نواب بھوپال کے نمائندوں نے جعلی کاغذات تیار کرا کر عدالت میں پیش کئے تھے) میں اب بھی سر عبدالرحمٰن کے ساتھ نواب بھوپال کے وکیل تھے۔ میری طرف سے مسٹر برج بہاری توکلی (جو لالہ سورج نرائن کے قریبی رشتہ دار اور گہرے دوست تھے) وکیل تھے مسٹر توکلی کے راقم الحروف کے ساتھ نہ صرف ایک وکیل اور موکل کے تعلقات تھے، بلکہ ہم دونوں کے ساتھ گہرے اور بھائیوں جیسے دوستانہ تعلقات بھی تھے۔ جس کا نتیجہ یہ تھا، کہ مسٹر توکلی نے سالہا سال تک راقم الحروف کے مقدمات کی مفت پیروی کی، اور کبھی ایک پیسہ فیس نہ لی۔ نواب بھوپال والے اس مقدمہ میں ایک روز باتوں باتوں میں راقم الحروف نے مسٹر توکلی سے کہا:

"رائے بہادر لالہ سورج نرائن تو آپ کے گہرے ذاتی دوست ہیں۔"

میں نے اتنا ہی کہا تھا، اور آگے کہنے والا ہی تھا، کہ مسٹر توکلی نے میری بات ٹوکتے ہوئے کہا:

''سورج نرائن بڑے ٹیڑھے آدمی ہیں یہ کسی کی سفارش نہیں مانتے، اور ہمیں ان سے کوئی توقع نہ رکھنی چاہئے۔''

مسٹر توکلی نے جب یہ کہا، تو میں خاموش ہوگیا۔ کیونکہ اس جواب کے بعد لالہ سورج نرائن کے متعلق کچھ کہنا لاحاصل تھا۔ لالہ سورج نرائن کی دیانتداری کا نتیجہ یہ تھا، کہ دہلی کی پبلک میں ایک شخص بھی ایسا نہ تھا، جس کے دل میں آپ کے لئے عزت واحترام کے جذبات نہ ہوں۔ اور اعلیٰ حکام اور سرکاری ملازموں میں آپ کی کیا قدر تھی، اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے، کہ آپ خطاب یافتہ رائے بہادر تھے، اور آپ غالباً پچیس برس تک دہلی میں سرکاری وکیل رہے۔

مجھے ٹھیک تو یاد نہیں غالباً 1930ء کی بات ہے گورنمنٹ نے کانگرس کی آرگنائزیشن کو خلاف قانون قرار دیا تھا۔ کانگرس کے خلاف قانون دیئے جانے کی صورت میں بھی کانگرس ورکنگ کمیٹی کا اجلاس ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی دریا گنج میں ہوا۔ اس اجلاس کے ختم ہوتے ہی ورکنگ کمیٹی کے تمام ممبر گرفتار کر لئے گئے۔ ان ممبروں میں مرکزی اسمبلی کے صدر مسٹر پٹیل اور پنڈت مالویہ بھی تھے۔ کیونکہ کانگرس ورکنگ کمیٹی نے ایسا ریزولیشن پاس کیا تھا، جو گورنمنٹ کی نظروں میں انتہائی باغیانہ تھا۔ کانگرس ورکنگ کمیٹی کے ممبروں کا یہ مقدمہ دہلی ڈسٹرکٹ جیل کے اندر ہوا مقدمہ کی کارروائی سننے کے بعد ملزموں کے چند رشتہ داروں اور اخبارات کے نمائندوں کو اجازت دی گئی تھی۔ راقم الحروف بھی اس مقدمہ کی کارروائی دیکھنے کے لئے جیل کے اندر گیا۔ مقدمہ کی سماعت ایک درخت کے نیچے ہوئی۔ مجسٹریٹ ایک اینگلو انڈین مسٹر پول ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ دہلی تھے۔ ورکنگ کمیٹی کے ممبر اس درخت کے نیچے اس طرح بے تعلق بیٹھے تھے، جیسے نہ کوئی عدالت ہے، اور نہ مجسٹریٹ رائے بہادر سورج نرائن اس مقدمہ میں سرکاری وکیل تھے سرکاری گواہ جن میں زیادہ تر پولیس کے افسر، اور گورنمنٹ کے زرخرید لوگ تھے، پیش ہوئے۔ شہادتیں لی گئیں۔ لالہ

سورج نرائن نے بحث کی، اوراس بحث کے آخر میں جب آپ نے یہ کہا کہ:

''ملزم قانون کی نگاہ میں باغی ہیں، اوران کوسخت سزادی جائے۔''

تو لالہ سورج نرائن کی آنکھیں ترتھیں، اور آپ کے گلے سے آواز نہ نکلتی تھی۔ جب آپ اپنی بحث ختم کر کے جیل کے دروازہ سے باہر نکلے،تو آپ زارزار رورہے تھے، اوراپنے آنسو رومال سے پونچھ رہے تھے۔جیل کے دروازہ سے جب آپ باہر نکلے،تو آپ کے آنسوؤں کودیکھ کرجیل سے باہر منتظر کھڑے لوگوں میں سے ایک نے حیرت کے ساتھ پوچھا:

''رائے بہادرصاحب، کیابات ہے،آپ رورہے ہیں؟''

تو آپ نے جواب دیا:

''کچھ نہیں،فرض اورحب الوطنی میں تصادم ہوگیا ہے، اس لئے آنسو نکل آئے۔''

یعنی اخلاق اورحب الوطنی کا تقاضہ تو یہ تھا، کہ رائے بہادرخودبھی کانگرس ورکنگ کمیٹی کے ممبروں کے ساتھ اس وقت جیل میں ہوتے، اورجیل سے باہر نہ جاسکتے،مگر بطورسرکاری وکیل کے فرض شناسی کا ثبوت دیتے ہوئے،آپ سے یہ گناہ اورپاپ سرزدہوا، کہ وطن پرفدا ہونے والے ملک کے حریت پرست لیڈروں کوآپ نے باغی کہا،اورعدالت سے آپ نے ان کوسزادینے کی سفارش کی۔

دنیا میں فرض اورحب الوطنی کا بارہا تصادم ہوا۔اس تصادم کا اکثرلیڈروں کوسامنا کرنا پڑا، اورمہاتما گاندھی بھی اس تصادم کا سامنا کرنے سے نہ بچ سکے۔مثلاً جب سرداربھگت سنگھ کو پھانسی ہونے والی تھی،تو مہاتما گاندھی کے سامنے دوسوال تھے،ایک تو یہ کہ:

آپ حب الوطنی کی جذبات سے متاثر ہوتے ہوئے وائسرائے سے سرداربھگت سنگھ کوچھوڑدینے کی یا ان کی موت کوعمرقید کی صورت میں تبدیل کرنے کی سفارش کرتے۔

دوسری طرف

آپ کی فرض شناسی کا سوال تھا

کیونکہ عدم تشدد کے ایک صحیح مقلد کے لئے یہ لازمی ہے کہ وہ تشدد کی کسی صورت میں بھی حمایت نہ کرے۔ تشدد کرنے والا چاہے انتہائی بلند محب وطن ہی کیوں نہ ہو۔ چنانچہ مہاتما گاندھی نے اپنی عدم تشدد کی فرض شناسی کے مقابلہ پر سردار بھگت سنگھ کی زندگی کی پرواہ نہ کی۔ گو اس وقت تمام ملک کے اندر مہاتما گاندھی کے اس اقدام کے خلاف انتہائی غم و غصہ پیدا ہو چکا تھا۔

یہ درست ہے، کہ انسان کے لئے حب الوطنی، اخلاق، ایمان، عزت اور دولت کی بہت بڑی قیمت ہے۔ مگر فرض کا ان سب کے مقابلہ پر بلند مرتبہ ہے۔ اور انسان کو اس وقت اپنی راہ اختیار کرتے ہوئے پورے طور پر غور کر لینا چاہئے، جب ان میں سے کسی کا بھی فرض کے ساتھ تصادم ہو۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

اک گلے پردیسی چنگا

بہت برس ہوئے، لاہور میں میرے ایک رشتہ دار، نارتھ ویسٹرن ریلوے کے کلیم ڈیپارٹمنٹ میں ملازم تھے، جو لوگوں کے گمشدہ مال کے ہزارہا اور لاکھوں روپیہ کے کلیم پاس کرتے۔ ان کی اوپر کی ناجائز آمدنی کئی ہزار روپیہ ماہوار تھی، کیونکہ کلیم پاس کرانے والے ان کو رشوت دے جاتے۔ اور اس ناجائز آمدنی میں سے یہ کافی روپیہ ہر ماہ عیش و عشرت پر صرف کرتے ایک روز میں ان سے ملنے کے لئے ان کے گھر گیا، تو ان کے ہاں ایک پنجابی طوائف کا گانا تھا۔ میں وہاں پہنچا تو یہ مجھے بھی اپنی اس پرائیویٹ محفل میں لے گئے، جہاں یہ اور ان کے دوست بیٹھے گانا سن رہے تھے۔ یہ طوائف بہت سریلی اور لاہور کے خاندانی کنجروں میں سے تھی۔ اس نے جو گایا، وہ مجھے اب تک یاد ہے، اس نے گایا تھا۔

پردیسی نال نہ لائیے یاری
بھانویں لکھ سونے دا ہووے
اک گلے پردیسی چنگا
نالے یاد کرے، نالے رووے

(پردیسی کے ساتھ محبت نہ کیجئے، چاہے اس میں کتنی بھی خوبیاں ہوں، کیونکہ وہ اپنی محبوبہ کو چھوڑ کر اپنے دیس چلا جانے پر مجبور ہوگا۔ پردیسی عاشق میں صرف ایک قابل تعریف صفت ضرور ہے کہ جب یہ چلا جائے گا تو اپنی محبوبہ کو یاد کر کے روئے گا)

اس طوائف کے گانے کو اپنی زندگی میں کبھی بھی بھول نہیں سکا۔ اور جب دیکھتا ہوں کہ کسی کی آنکھیں کسی پردیسی کی آنکھوں سے الجھ گئی ہیں، تو فوراً ہی یہ گانا یاد آجاتا ہے۔ یہ پوزیشن تو عشق و محبت کی راہ میں ایک پردیسی کی ہے۔ مگر میری رائے میں دیس والوں کی اپنے دیس میں نہ کبھی کوئی قدر ہوئی، اور نہ ہو سکتی ہے کیونکہ اپنے دیس میں تو ایک صاحب کمال جوگی بھی جوگڑا (ناکارہ اور ناکام درویش) ہی کہلاتا ہے اور

باہر کے رہنے والے درویشوں کی ہی قدر ہوتی ہے میں اس مضمون میں پردیسی ہونے کے فوائد بتاتا ہوں:

بہت برس ہوئے، میں تین چار روز کے لئے دہلی سے اپنے وطن حافظ آباد گیا۔ میرے وہاں پہنچنے سے اگلے روز میرے عزیزوں میں سے ایک لڑکا ملنے کے لئے آیا، اور اس نے اپنی بیکاری سے تنگ آ جانے کے حالات بیان کرتے ہوئے بتایا، کہ دو برس ہوئے اس نے بی اے کا امتحان دیا، اور یہ پاس ہوگیا۔ امتحان میں پاس ہونے کے بعد یہ اپنے گھر آ گیا، کہ شاید حافظ آباد میں ہی اسے کوئی کام مل سکے۔ مگر حافظ آباد معمولی قصبہ تھا، وہاں کیا کام ملتا۔ اس کے گھر میں آسودگی تھی، اچھا کھانا کھاتا، اچھا پہنتا۔ چند ماہ تو گھر والوں کی آؤ بھگت میں صرف ہوگئے، کیونکہ اس نے بی اے پاس کیا تھا۔ اس کے بعد بیکاری کے باعث یہ گھر والوں کی نظروں میں گرنا شروع ہوا۔ کیونکہ انسانی فطرت کے مطابق بیکار شخص کے لئے اس کے گھر والوں کے دل میں محبت اور رحم کے جذبات تو ہو سکتے ہیں مگر عزت اور قدر کے جذبات نہیں ہو سکتے۔ جس کا دلچسپ ثبوت یہ دیکھا جا سکتا ہے، کہ اگر ایک ماں کے دو بیٹے ہوں۔ ان دو میں سے بڑا بیکار ہو، اور چھوٹا برسر روزگار کسی اعلیٰ عہدے پر ہو، تو چھوٹا بیٹا جب بھی رخصت پر اپنے گھر آئے گا، تو اس کی ماں اس کی قدر کرتے ہوئے نہ صرف اس کی خاطر تواضع میں مصروف ہو جائے گی، بلکہ ضرورت کے وقت بڑے بیٹے سے یہ کہہ دے گی، کہ وہ اپنے چھوٹے بھائی کے لئے کھانا لائے، یا اس کی کوئی دوسری خدمت انجام دے۔ کیونکہ جہاں تک محبت کا سوال ہے، ماں کی نظر میں دونوں بیٹے ایک حیثیت رکھتے ہوں، مگر جہاں تک عزت کا سوال ہے، یقیناً بڑے بیکار بیٹے کے مقابلہ پر چھوٹا برسر روزگار بیٹا زیادہ قابل قدر ہے۔ اس نوجوان نے جب یہ حالات سنائے، اور اسکے جانے کے بعد میں نے ایک دوست سے اس کے حالات دریافت کئے، تو اس دوست نے بتایا کہ یہ نوجوان نہ صرف بیکاری سے تنگ آ چکا ہے، اور عزیز و

اقارب کی نظروں میں گر گیا ہے، بلکہ اس میں وہ کمزوریاں پیدا ہو چکی ہیں، جو بیکار لوگوں میں ہوا کرتی ہیں۔ مثلاً دوسرے لوگوں کی بدگوئی کرنا، اور دوسروں کے درمیان تعلقات کو ناخوشگوار بنانا وغیرہ۔ کیونکہ انسان کا دماغ خالی نہیں رہ سکتا، یہ جب بھی بیکار ہوگا، تو اس کے ذہن میں برے خیالات پیدا ہوں گے۔ یہ نوجوان اگلے روز پھر آیا، اور اس نے اپنے حالات پھر بتائے اور روتے ہوئے مجھ سے مشورہ لیا کہ اسے کیا کرنا چاہئے، تو میں نے اس سے صرف یہی کہا:

''تمہاری بیماری کا علاج صرف یہ ہے کہ تم حافظ آباد کو چھوڑ کر کہیں دوسری جگہ چلے جاؤ، وہاں چاہے بھوکے مر جاؤ۔ تمہاری نجات پردیسی ہونے میں ہی ہے۔''

میری اس نصیحت کو اس نے غور کے ساتھ سنا۔ اور یہ واقعہ ہے کہ یہ اگلے روز بغیر کسی آئندہ کی سکیم یا پروگرام کے میرے ساتھ ہی حافظ آباد سے لاہور چلا آیا۔ لاہور میں چند روز کے بعد یہ ایک بینک میں ملازم ہو گیا۔ جب تبادلہ آبادی ہوا، تو وہ اس بینک کی سیالکوٹ برانچ کا مینجر تھا۔ اب بھی یہ ملازمت کرتے ہوئے اپنی بسر بسر کر رہا ہے۔ اور میرا یقین ہے کہ اگر یہ اپنے دیس کو چھوڑ کر پردیسی نہ ہوتا، تو اس کی تمام زندگی ہی اپنے گھر میں بیکاری اور بیکاری سے پیدا ہونے والی کمزوریوں میں بسر ہوتی۔

1947ء کے دنوں میں جب پاکستان کے علاقہ کے ہندو ہندوستان چلے آئے، تو تبادلہ آبادی کی زد میں آنے والے ضلع گجرات (پنجاب) کے ایک ہندو ذیلدار بھی تھے۔ یہ سالہا سال سے ''ریاست'' کے خریدار اور میرے بڑے معترف اور مداح تھے یہ پہلے تو چند روز امرتسر میں ٹھہرے پھر اپنے کسی عزیز کے ہاں انباہ گئے انبالہ کے پلیٹ فارم پر پہنچے تو ہجوم میں سے کسی نے ان کا ٹرنک غائب کر لیا۔ جس میں چند ہزار روپیہ نقد اور چند ہزار روپے کے زیورات تھے دو چار روز یہ انبالہ کے بعد دہلی چلے آئے، کیونکہ یہاں ریلوے میں ان کا داماد ملازم تھا۔ یہ جب دہلی پہنچے، تو بہت تنگ

دست تھے۔ دہلی پہنچنے کے چند روز بعد یہ مجھ سے ملے، تو اپنے حالات بتاتے ہوئے انہوں نے خواہش ظاہر کی، کہ ان کے دو لڑکوں کو کسی جگہ ملازم کرا دیا جائے، تا کہ یہ اپنا گزارہ کر سکیں لڑکوں کی تعلیم وغیرہ کے متعلق پوچھا تو معلوم ہوا کہ یہ صرف سات سات اور آٹھ آٹھ جماعت تک پڑھے ہیں میں نے ذیلدار صاحب سے ایک قسم کی ملامت کرتے ہوئے کہا کہ آپ نے بچوں کو زیادہ تعلیم کیوں نہ دی تو اس کے جواب میں ذیلدار صاحب نے بتایا:

''ذیلدار صرف وہ ہو سکتا ہے، جس کے پاس بہت کافی زمین ہو۔ میرے پاس بہت کافی زمین تھی، دودھ پینے کے لئے کئی بھینسیں اور گائیں۔ سواری کے لئے کئی گھوڑیاں اور ہزارہا روپیہ سالانہ کا اناج فروخت ہوتا تھا۔ میں نے سوچا کہ ان لڑکوں نے تو اپنا زمیندارہ کا کام ہی کرنا ہے، تو ان کو زیادہ کیوں پڑھایا جائے۔ اگر ہم غریب ہوتے اور لڑکوں نے ملازمت کرنی ہوتی، تو ان کو زیادہ تعلیم دیتے۔''

آٹھ سات جماعت تک پڑھے ہوئے لڑکوں کو دہلی میں اگر ملازمت مل سکتی تھی، تو صرف کسی دفتر میں چپڑاسی کی، اور وہ بھی اس صورت میں کہ اگر یہ لڑکے سائیکل چلانا جانتے کیونکہ دہلی کے چپڑاسی گھوڑوں پر نہ چڑھتے تھے، اور یہ لڑکے گھوڑوں پر سواری کرنے کے عادی تھے میں نے ان ذیلدار صاحب سے اس وقت یہی کہا:

''آپ کے لڑکوں کو اپنے دیس میں رہنے نے تباہ کیا۔ اگر ان کو پردیسی بننا ہوتا، اور یہ دوسرے علاقوں میں جا کر روپیہ پیدا کرنے کے لئے تعلیم حاصل کرتے، تو آج ان کو چپڑاسی کی ملازمت حاصل کرنے کے لئے کوشش نہ کرنی پڑتی۔''

ان ذیلدار صاحب کے لڑکوں کو فی الحقیقت اپنے دیس نے مارا ان لڑکوں کا اپنے دیس میں رہنا ان کے اعصاب میں سے محبت و مشقت کو زائل کرنے کا باعث ثابت ہوا۔ اور اگر یہ تعلیم حاصل کر کے پردیسی ہو جاتے، تو ان کے اندر اپنی زندگی کو خود بلند لے جانے کی قوت پیدا ہوتی۔ یہ شائد اپنے خاندان میں آفتاب بن کر چمکتے، اور تبادلہ

آبادی کی زد میں آتے ہوئے بھی تباہ نہ ہوتے۔

جہاں تک مجھے یاد ہے، میں جب پانچویں جماعت میں پڑھتا تھا تو ساتھ پڑھنے اور کھیلنے والے ہم پانچ دوست تھے ان پانچ میں سے کوئی پانچویں جماعت سے آگے نہ گیا۔ یعنی کسی کو بھی چھٹی جماعت میں پڑھنا نصیب نہ ہوا۔ ان پانچ میں سے میں تو بچپن میں ہی گھر سے بھاگ گیا، اور بعد میں پانچ پانچ اور سات سات روپیہ ماہوار تنخواہ پر ملازمت کرتے کرتے کہیں سے کہیں جا پہنچا، مگر باقی کے چار حافظ آباد میں رہے۔ جنہوں نے میری طرح پردیسی ہونا قبول نہ کیا، کیونکہ ان کے گھروں میں خوشحالی تھی۔ اب یہ چاروں جب ملتے ہیں تو ان کے حالات کو سن کر بہت تکلیف محسوس کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ یہ بھی میری طرح اگر پردیسی ہوتے تو کتنا اچھا ہوتا۔

ابھی حال میں ماسٹر تارا سنگھ کا خط آنے پر میں پاونٹہ صاحب گیا، جہاں گوردوارہ گوبند سنگھ پاونٹہ ڈیرہ دون سے تیس میل کے فاصلہ پر دریائے جمنا کے کنار بہت ہی پر فضا جگہ پر ہے۔ ماسٹر تارا سنگھ اس گوردوارہ میں مقیم تھے ان سے اس گوردوارہ کے متعلق معلوم ہوا، کہ گورو گوبند سنگھ اس گوردوارہ والی جگہ پر بطور ایک پردیسی کے چار برس اور دس ماہ رہے، اور اس علاقہ میں آپ نے پہاڑی والیان ریاست کے ساتھ کئی لڑائیاں لڑیں۔ اس گوردوارہ کے حالات کے بعد جب دوسرے پچھلے تاریخی واقعات سنے تو معلوم ہوا کہ گورو صاحب بھی دوسرے پیغمبروں اور اوتاروں کی طرح زندگی بھر پردیسی رہے ان کو اپنے وطن میں رہنے کا ایک روز بھی موقع نہ ملا۔ اور شائد ہر پیغمبر اور اوتار کے لئے ضروری ہے کہ وہ کبھی بھی اپنے گھر کا منہ نہ دیکھے اور اپنی زندگی پردیس میں ہی گزارے۔ کیونکہ اپنے گھر میں رہ کر انسان بلندی اختیار نہیں کر سکتا۔ صرف پردیسی کی صورت میں ہی اس میں خود اعتمادی، قابلیت، ابھرنے اور بلند جانے کی سپرٹ پیدا ہو سکتی ہے۔ چنانچہ حضرت مسیح، رسول اللہؐ، کرشن، رام، گورونانک، مہاتما

گاندھی اور سوامی دیانند سب کو ہی پردیسی ہونا پڑا، اور ایک پردیسی ہوتے ہوئے ہی یہ اپنے دیس والوں کی نجات کا باعث ثابت ہوئے۔

اپنے گھر، وطن یا دیس میں رہنے والوں کے لئے لفظ پردیسی بہت خوفناک ہے، اور مائیں اپنے بچوں کو پردیس بھیجتے ہوئے ایک قسم کی ہیبت سی محسوس کرتی ہیں۔ مگر میں اپنے تجربہ کی بنیادوں پر یہ کہتا ہوں کہ ایک پردیسی ہوتے ہوئے وہ لوگ جب یاد آ جائیں جن سے دل کو تعلق ہے اور یہ یاد اپنے ساتھ دو چار آنسو بھی لے آئے تو یہ آنسو اور اک گلے پردیسی چنگا نالے یاد کرے نالے رووے کا گنگنانا اپنے اندر وہ حظ اور لطف رکھتا ہے جسے آب حیات کہنا چاہئے اور سچ تو یہ ہے کہ یہ آب حیات کسی اچھی قسمت والے کو ہی نصیب ہوا کرتا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

طوائفوں کا منبع و ماخذ

آپ کسی بھی طوائف کے پچھلے حالات کی تحقیقات کریں، تو یہ ثابت ہوگا کہ ایک دو یا تین پشت پہلے یہ اچھے خاندان سے تعلق رکھتی تھی، اور اگر اس نے شادی کر لی تو دو تین یا چار پشت کے بعد لوگ اس کی طوائفیت کو بھول گئے۔ ان طوائفوں کی انسٹی ٹیوشن یا نسل میں اضافہ ہوتا ہے، تو اس صورت میں کہ شرفاء کی لڑکیاں بری صحبت کے باعث گھروں سے نکل جاتی ہیں۔ گھروں سے چلے جانے کے بعد ان کو اپنے ساتھ لے جانے والے ان کے وفادار ثابت نہیں ہوتے۔ یہ شرم اور رسوائی کے باعث اپنے گھر واپس نہیں جا سکتیں، اور یہ مجبور ہوتی ہیں، کہ طوائفوں کا پیشہ اختیار کریں۔

چند برس ہوئے، دہلی میں مسٹر جمنا داس اختر ایڈیٹر سویرا، سردار کچھمن سنگھ ٹھیکیدار اور چند دوسرے سوشل ورکرز نے معصوم و بے گناہ لڑکیوں کو طوائفوں کے قبضہ سے نکال کر ان کو اپنے والدین کے پاس واپس بھیجنے کی تحریک شروع کی تھی۔ اس سلسلہ میں کچھ مشورہ کے لئے دفتر ''ریاست'' میں آئے یہ اپنے اس مشن کی تبلیغ کے لئے طوائفوں کے بازار جی ٹی روڈ جانے والے تھے، تو راقم الحروف سے بھی انہوں نے ساتھ چلنے کے لئے کہا میں کسی بھی تحریک میں کوئی حصہ نہ لیا کرتا، مگر صرف اپنی معلومات کو وسیع کرنے اور دلچسپی محسوس کرتے ہوئے ان کے ساتھ ہو لیا۔ ہم لوگ جی ٹی روڈ کے طوائفوں کے ایک مکان میں گئے، جس کا ایک ہی زینہ تھا۔ مگر اس زینہ سے ملحق تین چار کمرے تھے، اور ان کمروں میں مختلف طوائفیں رہتی تھیں ہم جب وہاں پہنچے تو اس وقت دوپہر کے دو تین بجے تھے اور یہ وقت طوائفوں کے کاروبار کا نہیں ہوتا۔ کیونکہ طوائفوں کا کاروبار آٹھ نو بجے شروع ہو کر بارہ اک بجے رات جاری رہتا ہے۔ ہم جب زینہ پر چڑھنے کے بعد ان کمروں کے سامنے پہنچے تو یہ تمام طوائفیں ہمیں دیکھنے کے لئے اپنے کمروں سے باہر آ گئیں کچھ کا خیال تو غالباً یہ تھا کہ ہم پولیس سے تعلق رکھتے ہیں اور کسی طوائف کی تلاشی، یا کسی ملزم کی گرفتاری کے لئے یہاں

آ ئے ہیں، اور بعض طوائفیں اس خیال میں بھی تھیں کہ ہم انتہائی طوائف زدہ ہیں، جو دوپہر کو بھی ان کے کوٹھوں پر مارے مارے پھر رہے ہیں۔ ان طوائفوں کے کمروں میں سے ہم ایک طوائف کے کمرہ میں داخل ہوئے وہ شخص بھی ہمارے ہمراہ تھا، جس نے بتایا تھا کہ یہ طوائف بی اے تک تعلیم یافتہ ہے اور اس نے ابھی حال ہی میں یہ قابل نفرت پیشہ اختیار کیا ہے ہم اس طوائف کے کمرے میں پہنچے تو ہم نے دیکھا کہ اس کے ہاں بہت صاف ستھرا فرش ہے جس پر سفید چادر بچھی ہے ایک بکس پر تو مہاتما گاندھی کا فوٹو رکھا ہے اور فوٹو کے اس فریم پر پھولوں کا ایک ہار پڑا ہے اور دوسرے بکس پر کرشن مہاراج کا ایک بت ہے اور بت کے گلے میں بھی پھولوں کا ہار ہے ہم اس فرش پر بیٹھ گئے، اور بات چیت شروع ہوئی تو اس بات چیت سے معلوم ہوا کہ اس لڑکی کی عمر بیس برس کے قریب ہوگی اس کا رنگ سلیٹی سا تھا، یعنی نہ گورا، نہ سیاہ نقش بہت معمولی یعنی یہ حسین لڑکیوں میں شمار نہ کی جا سکتی تھی۔ دو برس پہلے اس نے ناگپور یونیورسٹی سے بی اے پاس کیا تھا۔ یہ ناگپور کے ایک کالج کے پروفیسر کی لڑکی ہے اور مہاراشٹر کی رہنے والی ہے اس کا تعلق ناگپور کے ایک نوجوان سے ہوگیا، اور یہ دونوں اپنے گھروں سے بھاگ آئے۔ چند ماہ تو ادھر ادھر پھرتے رہے، اس کے بعد اس نوجوان نے اس لڑکی سے تعلق منقطع کر لیا۔ اور وہ واپس ناگپور چلا گیا۔ اس نوجوان کے چلے جانے کے بعد یہ لڑکی بے آسرا سی ہوگئی۔ اس کو کسی نہ کسی کی پروٹیکشن کی ضرورت تھی، کیونکہ عورت فطرتاً پروٹیکشن چاہتی ہے یہ پروٹیکشن چاہے باپ سے نصیب ہو، بھائی سے، یا بیٹے سے۔ ایک غنڈے نے اس کو اپنی پروٹیکشن میں لیا، تو اس نے بھی چند روز کے بعد اس کو چھوڑ دیا۔ آخر یہ ایک طوائف کے ہاں پہنچ گئی، یا اس غنڈہ کے ذریعے پہنچا دی گئی، اور اس نے طوائفوں کا پیشہ جاری کر دیا۔ مگر چونکہ بچپن سے جوان ہونے تک اس نے ایک اچھے خاندان میں پرورش پائی، اور اس کو شروع سے ہی مذہبی اور حب الوطنی کے جذبات نصیب ہوئے اس لئے یہ طوائفوں کا پیشہ

اختیار کرتے ہوئے بھی سری کرشن اور مہاتما گاندھی دونوں کی پوجا کرتی ہے، اور صبح اٹھتے ہی ان پر پھولوں کے ہار چڑھاتی ہے۔

یہ لڑکی بہت سنجیدہ، بہت سمجھدار اور ہوشیار تھی۔ اس نے محسوس کر لیا کہ ہم لوگ کسی بری نیت سے اس کے ہاں نہیں آئے، اور ہماری غرض صرف اصلاح ہے۔ اس کے دل میں ہمارے لئے انتہائی عزت و احترام کے جذبات تھے، اور اس نے بہت کھل کر باتیں کیں اس نے بتایا کہ یہ شرم اور رسوائی کے خیال سے پھر واپس اپنے والدین کے پاس جانا نہیں چاہتی، کیونکہ وہاں کی سوسائٹی اس کو نفرت و حقارت کی نظروں سے دیکھے گی نہ یہ اپنے والدین کو اپنی موجودہ حالت یا پتہ سے اطلاع دینا چاہتی ہے اور یہ اب کسی شخص سے شادی کرنے کے لئے بھی تیار نہیں، جس کی دو وجوہ ہیں ایک تو یہ کہ کسی ایسے بلند اخلاق شخص کا ملنا مشکل ہے، جو صرف اصلاح کے خیال سے اس سے شادی کرے، اور اس کے ذہن پر کسی طوائفانہ زندگی کے زمانہ کی یاد تازہ نہ رہے۔ اور اگر اس کو کوئی شوہر مل سکتا ہے تو صرف ایسا ملے گا، جس کی کسی دوسری جگہ شادی نہ ہو سکتی ہو یعنی جسے کوئی لڑکی دینا پسند نہ کرتا ہو۔ ایسے شخص سے اس کی زندگی اور زیادہ کوفت کا باعث ہوگی۔ اور دوسرے اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ نا گپور سے لانے والے نوجوان کی طرح وہ شخص بھی چند روز کے بعد اس کو چھوڑ نہ دے گا، جو اس سے شادی کرے گا۔ اس بے چاری کی ان باتوں اور اعتراضات کا ہمارے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ ہم اس بات چیت کے بعد بھی اس کو کس طرح کہہ سکتے تھے کہ یہ اس پیشہ کو چھوڑ دے جبکہ ہمارے پاس اس کے مستقبل کے لئے کوئی پروگرام یا گنجائش نہ تھی ہم نے صرف یہی کہا کہ یہ تعلیم یافتہ ہے، اور اس کے لئے بہتر ہے کہ یہ کسی سکول میں بچوں کو پڑھانے کے لئے ملازمت اختیار کر لے۔ ہم اس کو کوئی تسلی بخش جواب نہ دے کر واپس آ گئے واپس آنے کے بعد میں دو تین روز سوچتا رہا کہ ایسی صورت میں ایک گمراہ ہو چکی عورت کے مستقبل کو کیونکر مفید بنایا جا سکتا ہے، مگر کچھ سمجھ میں نہ آتا

تھا۔

میں نے بہت سی طوائفوں کے پچھلے حالات کا مطالعہ کیا ہے۔ پہاڑی طوائفوں کو چھوڑ کر (کیونکہ ان کے خاندان صدیوں سے یہی پیشہ اختیار کرتے چلے آرہے ہیں، اور نینی تال کے علاقہ میں چند دیہات اور قصبے ایسے بھی ہیں جہاں صرف طوائفوں کے خاندان ہی آباد ہیں۔ اور ان کی لڑکیاں ہر زمانہ میں دہلی، مراد آباد، سہارنپور، میرٹھ، لکھنو اور الہ آباد وغیرہ مقامات پر جاتی ہیں) دوسری ہندو یا مسلمان طوائفوں میں ایک بھی ایسی نہیں جو دوسری یا تیسری پشت پہلے کسی اچھے خاندان سے تعلق نہ رکھتی تھی اور جب بھی ان سے باتیں ہوئیں تو انہوں نے اپنے پہلے خاندان پر فخر نہ کیا ہو مثلاً یہ فلاں نواب کے خاندان سے ہے اور اس کی نانی گھر سے نکل آئی تھی، اور اس کی نانی نے بعد میں یہ طوائفوں کا پیشہ اختیار کیا یہ فلاں لالہ کی نواسی ہے، اور اس کی ماں گھر سے بھاگ آئی تھی، جس نے بعد میں طوائف کا پیشہ اختیار کیا تھا۔

طوائفوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ایک گانے والی خاندانی طوائفیں اور دوسری پیشہ کرنے والی جو موسیقی سے نا آشنا ہیں اور جو لوگوں کی صرف جنسی خواہشات کو پورا کرنے کے لئے وقف ہیں پہلی کلاس کی یعنی ''خاندانی'' طوائفیں عام طور پر مالدار ہوتی ہیں یہ بڑی بڑی فیس پر مجرا کرنے جاتی ہیں یہ صرف کسی ایک سیٹھ، ساہوکار، نواب یا راجہ سے ناجائز تعلقات رکھتی ہیں جہاں سے ان کو چند سو یا چند ہزار روپیہ ماہوار ملتا ہے۔ یہ کسی قیمت پر بھی کسی دوسرے سے تعلق پیدا نہیں کرتیں۔ یہاں بغیر ناجائز تعلقات کے ان کے ہاں جانے والے کئی ہوتے ہیں، جن کا آنا جانا صرف گانا سننے یا بات چیت کرنے تک محدود ہوتا ہے جسے تفریح کہتے ہیں۔

خاندانی طوائفوں کے ہاں اگر کوئی نیا شخص جائے، تو یہ اس کے ساتھ بہت فیاضی کا ثبوت دیتی ہیں۔ یعنی اس کی دعوت پر دس پندرہ یا بیس روپے صرف کر دیتی ہیں۔ اور اگر اس نئے آنے والے نے بار بار آنا شروع کیا (جس کا مطلب یہ ہے، کہ اس کے

دل میں اس طوائف کے لئے کشش پیدا ہوگئی) تو یہ طوائف اس کے گھر کی اینٹ سے اینٹ بجا دیتی ہے۔ یہ طوائفیں بہت بڑی سائیکالوجسٹ ہوتی ہیں اپنے ملنے جلنے والوں پر ہمیشہ یہ اثر چھوڑتی ہیں کہ ان کو ملنے والے سے کوئی لالچ نہیں اور یہ صرف محبت کی طلبگار ہیں۔ یہ کاروباری سلسلہ یعنی جیب خالی کرنے کا کام یہ اپنی ماں یا نانی پر چھوڑ دیتی ہیں دوسری قسم یعنی پیشہ ور طوائفوں کی آمدنی بہت محدود ہوتی ہے اور یہ بہت مشکل کے ساتھ اپنا گزارہ کرتی ہیں یہ عام طور پر جنسی امراض میں بھی مبتلا ہوتی ہیں کیونکہ ہر قسم کے لوگ ان کے ہاں جاتے ہیں۔

طوائفیں بڑے گھروں میں کیونکر مدغم ہو جاتی ہیں، اس سلسلہ میں مسلمان روسا، زمینداروں اور جاگیرداروں میں یہ تو عام طور پر نکاح ہونے کے بعد پردہ میں بیٹھ جاتی ہیں اور ایک پشت کے بعد کسی کو کوئی خیال نہیں ہوتا، کہ فلاں لڑکی یا فلاں لڑکے کی ماں طوائف تھی۔

ہندوؤں میں بھی ایسی مثالیں مل سکتی ہیں، کہ ایک طوائف کو اس کے خاندان میں دوسری خواتین کے برابر پوزیشن حاصل ہوئی۔ مثلاً پنجاب کی ایک ریاست کے مہاراجہ کے گھر میں ایک پہاڑن طوائف تھی۔ اس پہاڑن طوائف کے بطن سے ایک لڑکا پیدا ہوا، جو مہاراجہ کی کوششوں سے ولی عہد قرار پایا، اور بعد میں یہ اس ریاست کا مہاراجہ ہوا اس طوائف زدہ مہاراجہ کی شادی پنجاب کے ایک رئیس کی لڑکی سے ہوئی اور اب لوگوں کو خیال بھی نہیں کہ موجودہ مہاراجہ کی دادی طوائف تھی یعنی طوائفوں کا منبع و ماخذ عام طور پر بڑے خاندان ہی ہیں اور اگر کوشش کی جائے تو یہ طوائفیں پھر اچھے خاندانوں میں مدغم ہو سکتی ہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆

عورت اور محبت کی شراکت

دہلی کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کے بہت ہی قریبی رشتہ داروں کے خاندان کی ایک خاتون دہلی میں تھیں، جو اردو زبان کے لحاظ سے ایک اتھارٹی، حسن و خوبصورتی کے اعتبار سے ہزاروں میں ایک شرافت کا مجسمہ، اور اپنی سہیلیوں اور رشتہ داروں میں انتہائی عزت اور محبت کی نگاہوں سے دیکھی جاتیں، اور شہزادی کے نام سے مخاطب ہوتیں۔ اس خاتون کے ننھیال بنارس میں تھے، اور اس کی اپنی شادی بھی بنارس میں ہی ایک مرزا صاحب سے ہوئی تھی، جو یو پی میں سرکاری ملازم تھے اس خاتون کی خاندانی آمدنی ہزار روپیہ ماہوار تھی، اور اس کے شوہر بھی اچھے کھاتے پیتے گھرانے سے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شوہر کو عیاشی کے لئے کافی روپیہ مل جاتا۔ چنانچہ آپ نے اپنی زندگی میں بہت فراخدلی کے ساتھ طوائفوں پر روپیہ برباد کیا جس کا نتیجہ یہ تھا کہ بیوی اپنی فطری بے زبانی کے باعث شوہر سے تو کچھ نہ کہہ سکتی، مگر شوہر کی حالت کو دیکھ کر ہر وقت کرب و اذیت محسوس کرتی راقم الحروف اور اس خاتون کے درمیان کئی برس تک خط و کتابت کا سلسلہ چلتا رہا۔ یہ ہر ہفتہ "ریاست" کی زبان کے متعلق غلطیوں پر نشان لگا کر بھیج دیتیں، تاکہ مجھے اپنی غلطیوں کا احساس ہو سکے، اور میری زبان درست ہو۔ خط و کتابت میں یہ معصوم اور بیگناہ اپنے حالات بھی لکھا کرتیں، اور ضرورت ہوتی، تو مشورہ بھی لے لیتیں۔

کئی برس کی بات ہے اس خاتون کے ماموں معہ اپنی کنواری بیٹی کے اپنی اس بھانجی سے ملنے کے لئے دہلی آئے اور یہ باپ بیٹی کئی ماہ یہاں مقیم رہے اس خاتون کے شوہر یعنی مرزا صاحب بھی ان دنوں طویل رخصت لے کر دہلی تشریف لائے۔ خاتون کے ماموں اور ماموں زاد بہن کو دہلی آئے ہوئے کئی ماہ ہوئے تھے، کہ اس خاتون کا میرے پاس خط پہنچا۔ جس میں اس نے اپنی انتہائی ذہنی کوفت کا اظہار کرتے ہوئے بتایا کہ اس کے شوہر نے طوائفوں پر بے دریغ روپیہ تباہ کرنے کے بعد اب گھر

میں ہی جنسی نقب زنی شروع کر دی ہے۔ یعنی اس نے اپنی بیوی کی ماموں زاد بہن پر ڈورے ڈالنے شروع کر دیئے ہیں محبت کی راہ میں ڈیڑھ سو روپیہ مالیت کا ایک نیکلس اس لڑکی کی نذر کیا ہے، اور لڑکی کی محبت کا رخ بھی اپنی بہن سے بدل کا بہنوئی یعنی مرزا صاحب کی طرف بدلتا جا رہا ہے اور یہ پریشان ہے کہ کیا کرے؟

اس خط کو پڑھ کر میں سوچتا رہا کہ اس خاتون کی بہن کے ذہن کو بدلنے کے لئے کیا کرنا چاہئے کئی روز سوچنے کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ جب تک عورت کی فطرت کے مطابق یہ قدم نہ اٹھایا جائے لڑکی کو نصیحت کرنے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ کیونکہ ایسی صورت میں نصیحت کام نہیں دیا کرتی میں نے ایک سکیم تیار کرنے کے بعد شہزادی صاحبہ (اس خاتون کو خاندانی اعتبار اور شاہی خاندان میں سے ہونے کے باعث عزیز و اقارب میں شہزادی ہی کہا جاتا تھا) کو لکھا کہ میں کل آپ کو ایک خط بھیجوں گا۔ اس خط کو ظاہراً طور پر تو اپنی بہن سے چھپانے کی کوشش کریں، تاکہ اس کے دل میں اس خط کو پڑھنے کا زیادہ اشتیاق پیدا ہو۔ مقصد یہ ہے کہ یہ لڑکی اس خط کو پڑھ لے چنانچہ اس خط میں تفصیل کے ساتھ طریقہ بتایا کہ جو خط میں کل لکھوں گا اسے کس طریقہ سے استعمال کیا جائے، یعنی ایکٹنگ کی کیا صورت ہو۔

اگلے روز میں نے شہزادی صاحبہ کو خط لکھا، جس کے الفاظ مجھے اب تک یاد ہیں، جو یہ تھے:

''میں کل اپنی کار میں سیر کے لئے قطب مینار گیا تھا۔ وہاں کے ریسٹورنٹ کے ساتھ والے کمرہ میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ آپ کے شوہر مرزا صاحب ایک طوائف کے ساتھ مقیم ہیں، اور شراب پینے میں مصروف ہیں مجھے یہ دیکھ کر یہ کچھ شرمندہ ہوئے میں وہاں سے بدر پور والی سڑک پر روکھلا چلا گیا مرزا صاحب کی اس حالت کو دیکھ کر اور بھی افسوس ہوا، کیونکہ آپ نے چند روز ہوئے لکھا تھا کہ یہ طوائفوں کے بعد آپ کی بہن پر بھی ڈورے ڈال رہے ہیں یعنی انہوں نے اپنے گھر میں ہی نقب زنی شروع کر

دی ہے۔میری دعا ہے، کہ خدا مرزا صاحب کو عقل عطا کرے اور وہ تمام خاندان کی تباہی کا باعث نہ ہوں۔''

یہ خط میں نے لفافہ میں بند کر کے اسی ذریعہ سے ہی دستی بھیج دیا، جس ذریعہ سے خطوط آیا کرتے تھے یہ خط شہزادی صاحبہ نے پڑھا۔شہزادی صاحبہ کی بہن بھی پاس بیٹھی تھیں، کیونکہ میری خط و کتابت کا راز اس لڑکی سے چھپا ہوا نہیں تھا، اور یہ میرے تمام خطوط پڑھ لیا کرتیں۔میرا یہ خط جب شہزادی صاحبہ نے پڑھا، تو میری ہدایت کے مطابق انہوں نے اپنی پیشانی پر بل ڈال لئے، اور خط کو پھر لفافہ میں ڈال کر اپنے تکیہ کے نیچے رکھ دیا۔لڑکی نے دریافت کیا، کہ خط میں کیا ہے، جس کے باعث پیشانی پر بل ڈال لئے گئے، تو شہزادی نے غصہ کی حالت میں صرف یہی کہا ''کچھ نہیں'' یہ کہنے کے بعد شہزادی صاحبہ پانی کا لوٹا لے کر پاخانہ میں چلی گئیں، تاکہ ان کی غیر حاضری میں لڑکی اس خط کو پڑھ لے، اور وہ یہ خیال بھی نہ کر سکے، کہ کوئی ڈرامہ کھیلا جا رہا ہے۔ شہزادی صاحبہ بیس پچیس منٹ تک پاخانہ میں رہیں۔وقت کو غنیمت سمجھتے ہوئے لڑکی نے تکیہ کے نیچے سے خط نکالا غور سے پڑھا اور پھر خط کو لفافہ میں ڈال کر اپنی جگہ تکیہ کے نیچے رکھ دیا، گویا کہ اس نے خط کو پڑھا نہیں۔شہزادی صاحب جب پاخانہ سے واپس آئیں، تو آپ نے دیکھا کہ لڑکی کا چہرہ غصہ سے لال ہو رہا تھا، اور پیشانی پر بل تھے۔شہزادی صاحبہ نے دیکھا کہ خط تو اپنی جگہ پڑا ہے مگر اس کا رخ بدلا ہوا ہے یعنی جب رکھا تھا تو پتہ والی طرف اوپر تھی اور لفافے کا جوڑ نیچے اور اب جوڑ والی طرف اوپر تھی، اور پتہ والی طرف نیچے جس کا مطلب یہ تھا کہ خط پڑھ لیا گیا ہے اور اس خط کے پڑھنے کا ہی نتیجہ یہ ہے کہ بہن کا چہرہ سرخ ہے اور پیشانی پر بل ہے۔

اس واقعہ کے ایک گھنٹہ کے بعد شہزادی صاحبہ کے شوہر یعنی مرزا صاحب بازار سے واپس آئے اور باہر مردانہ میں اپنی بیوی کے ماموں کے پاس بیٹھ گئے لڑکی منتظر تھی اور اس ایک گھنٹہ میں کئی بار جھانک کر مردانہ میں دیکھ چکی تھی کہ دولہا بھائی (یعنی مرزا

صاحب) بھی واپس آئے ہیں، یا کہ نہیں لڑکی نے جب دیکھا کہ مرزا صاحب آ گئے ہیں اور اپنی بیوی کے ماموں کے ساتھ بیٹھے باتیں کر رہے ہیں تو لڑکی نے گتے کے ڈبے میں سے اونچی ایڑھی والے اس سینڈل کو نکالا جو مرزا صاحب نے اپنی اس سالی کو تین روز پہلے بطور تحفہ دیا تھا اس سینڈل کا ایک پاؤں لے کر آپ مردانہ میں آ گئیں اور پورے زور کے ساتھ مرزا صاحب کے منہ پر سینڈل مارتے ہوئے کہا:

''حرامزادے پہلے تو میری بہن کو تباہ کیا، اور اس کا لاکھوں روپیہ طوائفوں کو کھلا کر عیاشی کرتے رہے، اور اب مجھ پر ڈورے ڈال کر مجھ کو تباہ کرنا چاہتے ہو میں اب تمہارے جال میں نہیں پھنس سکتی۔''

مرزا صاحب اور مرزا صاحب کی بیوی دونوں حیران کہ یہ کیا ہوا دونوں میں سے کسی کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا۔ لڑکی کے والد جب اندر آئے تو لڑکی اپنا سامان باندھ رہی تھی اپنے والد کو دیکھ کر کہا کہ ہم رات کی ٹرین سے واپس بنارس جا رہے ہیں میں اس دولہا بھائی کی شکل بھی نہیں دیکھ سکتی جو ایک طرف تو مجھ پر ڈورے ڈال رہا ہے اور دوسری طرف بازاری عورتوں کے ساتھ شرابیں پیتا، اور عیاشیاں کرتا ہے۔ لڑکی کے والد نے بہت چاہا کہ باپ اور بیٹی چند روز اور دہلی میں رہیں مگر لڑکی نے صاف کہہ دیا کہ اگر ابا یہاں رہتے ہیں تو رہیں یہ خود ہرگز یہاں نہ رہے گی۔ اور شام کو بنارس جاتے ہوئے لڑکی اپنی بہن، یعنی اپنی شہزادی صاحبہ سے گلے مل کر زار زار روتی رہی، اور کہا کہ اس شوہر سے تمہارا طلاق لینا ہی اچھا ہے۔

شہزادی صاحبہ تبادلہ آبادی کے زمانہ میں جب دہلی میں قتل عام جاری تھا، تو یہ اس خیال سے لاہور چلی گئیں کہ امن ہونے کے بعد اپنے گھر میں واپس آ جائیں گی لاہور جانے کے بعد ان کی انتڑیوں میں تپ دق کی جراثیم پیدا ہو گئے اور لاہور میں ہی ان کا انتقال ہوا۔

میں 1960ء فروری کے مہینہ میں لاہور گیا تو ایک روز میں نے اس خاتون کی قبر

پر بھی حاضری دی تا کہ اگر روحوں کا کوئی وجود ہے اور اس نیک، مخلص اور بلند خاتون کی روح بھی اگر دیکھ رہی ہے تو وہ محسوس کرے کہ بطور ایک مداح اور معترف کے اس خاتون کو بھول نہیں سکا اور جب کبھی دل اس دنیا سے اکتاتا ہے تو اس خاتون کی تصاویر اور اس کے خطوط دیکھ لیا کرتا ہوں۔

☆☆☆☆☆☆

مرحوم مسٹر نارٹن کی خوش فعلیاں

ہندوستان نے انگلیوں پر گنے جانے والے چوٹی کے سب سے بڑے قانون دان پیدا کیے، ان میں مرحوم مسٹر نارٹن بہت اہم شخصیت تھے۔ آپ کی پریکٹس ہندوستان کے تمام صوبہ جات تک وسیع تھی آپ کی آمدنی کا اندازہ پچاس ہزار روپیہ ماہوار کے قریب تھا۔ آپ یورپین ہوتے ہوئے بھی انتہائی پرو انڈین تھے۔ اور یہ واقعہ بے حد دلچسپ اور ہندوستان کی تاریخ میں بہت بڑی اہمیت رکھتا ہے، کہ آپ نے اپنے زمانہ کے ہر انارکسٹ کے مقدمہ کی بغیر ایک پیسہ فیس لئے پیروی کی۔ ان محبان وطن انارکسٹوں میں مرحوم مہارشی آر بندو گھوش بھی تھے، جن پر انگریزوں کے خلاف تشدد اور سازش کرنے کے کئی مقدمات چلے ان تمام مقدمات کی مسٹر نارٹن نے بغیر ایک پیسہ فیس لئے پیروی کی، اور جن کی رائے پر عمل کرتے ہوئے ہی مسٹر آر بندو گھوش نے ہندوستان کو ہمیشہ کے لئے خیر باد کہہ کر فرانس کے ہندوستانی علاقہ پانڈیچری میں پناہ لی، تا کہ انگریزی حکومت کی پولیس ان پر نئے مقدمات قائم نہ کر سکے۔

مرحوم مسٹر نارٹن طبعاً بہت ہی فیاض، مخیّر اور مالدار شخصیت تھے۔ آپ ایک ایک مقدمہ میں پچاس پچاس ہزار روپیہ فیس لیتے، اور غریبوں کے مقدمات نہ صرف مفت کرتے، بلکہ ان کے مقدمہ کے دوسرے تمام اخراجات بھی اپنی جیب سے ادا کرتے اور چونکہ آپ کی پریکٹس ہندوستان کے تمام صوبہ جات تک وسیع تھی، آپ کا اکاؤنٹ بھی قریب قریب ہر صوبہ کے بڑے بینکوں میں تھا کیونکہ مقدمہ کی پیروی کے لئے جہاں جاتے وہاں ہی بینک میں روپیہ جمع کرا دیتے، اور اکثر بڑے شہروں میں آپ نے اپنی رہائش کے لئے کوٹھیاں بھی خریدی ہوئی تھیں چنانچہ کئی برس ہوئے راقم الحروف مرحوم مہاراجہ نابھ سے ملنے کے لئے صوبہ مدراس کے پہاڑی مقام کوڈائی کنال گیا، تو معلوم ہوا کہ وہاں بھی جھیل کے کنارے مسٹر نارٹن کی ایک شاندار کوٹھی موجود ہے اور مرحوم مسٹر نارٹن کے پرو انڈین، غریب نواز اور ظلم کے دشمن ہونے کا

اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے، کہ آپ نے اپنے انتقال سے چند برس پہلے ہندوستانیوں کے حقوق کے لئے ایک بہت ہی شاندار انگریزی ہفتہ وار اخبار جاری کیا، جس کا نام ''لوکر'' (Looker) تھا۔

ہندوستان کی قانون و عدالت کی تاریخ میں نابھ اور پٹیالہ کے اس مقدمہ کو بہت بڑی اہمیت حاصل ہے، جو انبالہ میں چلا، اور جس کے جج لکھنو ہائیکورٹ کے جسٹس مسٹر سٹوارٹ تھے اس مقدمہ کے حالات یہ ہیں:

نابھ کے مہاراجہ ریودمن سنگھ، اور پٹیالہ کے مہاراجہ بھوپندر سنگھ کے درمیان کشیدگی سی پیدا ہوگئی تھی، اور اس کشیدگی کی وجہ لیڈری ہی تھی۔ یعنی مہاراجہ پٹیالہ چاہتے تھے کہ وہ روپیہ کے زور سے سکھوں کی لیڈری حاصل کریں، اور مہاراجہ نابھ چاہتے تھے کہ مہاراجہ نابھ سکھوں کی لیڈر ہوں یہ کشمکش اور کشیدگی عداوت کی صورت میں تبدیل ہو گئی ریاست نابھ کی حدود میں موضع لوہٹ بدھی کے مقام پر ایک شخص بجاما سنگھ نے بم تیار کئے یہ بم تیار کئے جارہے تھے کہ بے احتیاطی کے باعث ایک بم پھٹ گیا اس بم پھٹنے کے باعث اس مکان کی چھت اڑ گئی۔ جس مکان میں یہ بم تیار کئے جاتے تھے اور ایک گھوڑا ہلاک ہوا جو ساتھ والی کوٹھڑی میں بندھا تھا اس بم کے چلنے کی اطلاع گورنمنٹ آف انڈیا تک پہنچی اور گورنمنٹ نے جب تفتیش شروع کی، تو مہاراجہ پٹیالہ کی طرف سے یہ الزام لگایا گیا کہ یہ بم مہاراجہ نابھ نے مہاراجہ پٹیالہ کو ہلاک کرنے کے لئے بنوائے اور مہاراجہ نابھ کا بیان یہ تھا کہ مہاراجہ پٹیالہ نے یہ بم مہاراجہ نابھ کو بدنام کرنے کے لئے نابھ کے علاقہ میں تیار کرائے چنانچہ ایک دوسرے پر لگائے گئے ان اور بعض کئی دوسرے الزامات کی تحقیقات کرنے کے لئے گورنمنٹ آف انڈیا نے لکھنو ہائیکورٹ کے ایک یورپین جج جسٹس سٹوارٹ کو مقرر کیا۔

اس مقدمہ کی کارروائی سرکٹ ہاؤس انبالہ میں ہوئی مہاراجہ نابھ کی طرف سے ہندوستان کے چوٹی کے تین وکلاء مسٹر نارٹن، پٹنہ کے سر علی امام (جو بعد میں

وائسرائے کی انتظامیہ کونسل کے ممبر، اور ریاست حیدر آباد کے وزیر اعظم مقرر ہوئے) اور سر علی امام کے حقیقی بھائی مسٹر حسن امام تھے اور پٹیالہ کی طرف ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو، اور مسٹر سیمن کے علاوہ کئی اور وکلاء بھی تھے اس مقدمہ میں کتنا روپیہ دونوں فریقین کا خرچ ہوا اس کا اندازہ صرف اسی سے لگایا جا سکتا ہے کہ نابھ اور پٹیالہ سے مقدمہ کے اخراجات کے لئے کرنسی نوٹوں سے بھرے ہوئے ٹرک جایا کرتے اور ہر گواہ کے لئے دس ہزار روپیہ رشوت مقرر تھی یعنی جو گواہ بھی ریاست کے حق میں گواہی دے اسے اس ریاست کی طرف سے دس ہزار روپیہ دیا جاتا۔

چمار اور بھنگی گواہوں نے بھی اس مقدمہ میں دس دس ہزار روپیہ شہادت دینے کے معاوضہ میں وصول کیا۔ اور بجا سنگھ کی شہادت اپنے حق میں لینے کے لئے تو دونوں ریاستیں لاکھوں روپیہ صرف کرنے کی کوشش میں تھیں اور چونکہ بجا سنگھ انبالہ جیل میں رکھا گیا تھا، اس سے پیغام رسانی کرنے کے لئے جیل کے وارڈوں اور دوسرے ملازموں نے بھی ہزارہا روپیہ وصول کیا۔

نابھ اور پٹیالہ کے اس مقدمہ کے حالات تو بہت دلچسپ ہیں، جن پر ایک ضخیم کتاب لکھی جا سکتی ہے اس مضمون میں صرف مسٹر نارٹن کی زندہ دلی کا ایک واقعہ بیان کرتا ہوں، کیونکہ میں اس زمانہ میں ریاست نابھ میں ملازم تھا مقدمہ کے سلسلہ میں مجھے بھی اکثر انبالہ جانا پڑتا، اور مسٹر نارٹن سے گھنٹوں باتیں ہوا کرتیں۔

مسٹر نارٹن کی عمر اس وقت غالباً ستر برس کی ہو گی۔ مگر آپ جسٹس سٹوارٹ کی عدالت سے شام کو واپس آنے کے بعد سات بجے کے قریب ہی مقدمہ کی تیاری میں مصروف ہو جاتے، اور صبح چار بجے تک وہ اس تیاری میں مصروف رہتے۔ یعنی صبح دس بجے سے شام کے چار بجے تک تو جسٹس سٹوارٹ کی عدالت میں مقدمہ کی پیروی کرتے اور شام کو سات بجے سے علی الصبح چار بجے تک مقدمہ کی تیاری کرتے۔ اس عرصہ میں آپ وسکی کی ایک بوتل، اور سوڈے کی ایک درجن بوتلیں ختم کرتے۔ رات

کو چار بجے سے صبح نو بجے تک سوتے اور نو بجے بیدار ہونے کے بعد غسل اور بریک فاسٹ سے فارغ ہونے کے بعد ٹھیک دس بجے جسٹس سٹوارٹ کی عدالت میں پہنچ جاتے یہ عدالت انبالہ چھاؤنی کے سرکٹ ہاؤس میں ہوتی، جہاں کہ جسٹس سٹوارٹ کی رہائش کا بھی انتظام تھا۔ مسٹر نارٹن مقدمہ کی تیاری میں مصروف رہنے کے بعد سنیچر کی رات کو فرنٹیر میل میں لاہور یا دہلی چلے جاتے لاہور جاتے تو وہاں سٹیفل ہوٹل میں اور اگر دہلی جاتے تو وہاں میڈن ہوٹل میں قیام کرتے اتوار کا تمام دن تو ان یورپین لڑکیوں کے ساتھ تفریح اور سینما وغیرہ میں مصروف رہتے اور اتوار کی رات کو فرنٹیر میل میں سوار ہو کر موسوار کو علی الصبح انبالہ چھاؤنی پہنچ جاتے، اور چند گھنٹہ سو کر اور نو بجے غسل اور بریک فاسٹ سے فارغ ہو کر ٹھیک دس بجے جسٹس سٹوارٹ کی عدالت میں پہنچ جاتے یہ ان کا معمول تھا اور جس طرح دوسرے انگریز اتوار کو قطعی کوئی کام نہیں کرتے، آپ بھی اتوار کا دن ہمیشہ تفریح کے لئے وقت رکھتے۔

مسٹر نارٹن مرحوم مہاراجہ نابھ کے ذاتی دوستوں میں سے تھے۔ اس لئے آپ نے اس مقدمہ کے سلسلہ میں مہاراجہ سے دو ہزار روپیہ روزانہ فیس وصل کی، اور یہ مقدمہ غالباً دو ماہ کے قریب ہر روز ہوتا رہا۔ اور یہی روزانہ فیس سر علی امام اور مسٹر حسن امام کی تھی، کیونکہ تینوں ایک ہی معیار کے قانون دان اور مہاراجہ کے ذاتی دوستوں میں سے تھے۔

مسٹر نارٹن ہر سنیچر کی رات کو جب لاہور یا دہلی جاتے تو وہاں پہنچنے کے بعد وہ اپنی تفریح کے لئے کسی نہ کسی یورپین لڑکی کو منگا لیا کرتے دن بھر اس لڑکی کے ساتھ کھاتے پیتے، اور سیر و تفریح میں مصروف رہتے اور اس سلسلہ میں کئی لڑکیاں ان کے انتظار میں رہتیں، کیونکہ دوسرے تمام مصارف کے علاوہ واپس آتے ہوئے ایک سو کا نوٹ لڑکی کو دے دیا کرتے۔ آپ ایک بار لاہور گئے وہاں آپ نے تفریح کے لئے ایک یورپین لڑکی کو بلوایا۔ یہ لڑکی دن بھر مسٹر نارٹن کے ساتھ تفریح میں مصروف رہی لڑکی

بہت خوبصورت تھی آپ رات کو جب واپس آنے والے تھے تو آپ نے لڑکی سے کہا اگر وہ چاہے تو ایک ہفتہ کے لئے ان کے ساتھ انبالہ جا سکتا ہے لڑکی نے محسوس کیا کہ یہ بوڑھا بہت مالدار ہے اور اسے پسند کرتا ہے اس نے مسٹر نارٹن سے کہا کہ وہ ایک ہفتہ کے لئے ساتھ جانے کا معاوضہ پانچ ہزار روپیہ لے گی مسٹر نارٹن بہت تجربہ کار، خرانٹ اور دلچسپ شخصیت تھے۔ آپ نے جواب دیا ''بہت اچھا'' چنانچہ یہ لڑکی مسٹر نارٹن کے ساتھ انبالہ چلی آئی مسٹر نارٹن دن بھر عدالت میں رہنے کے بعد شام کو جب اپنے ہوٹل واپس آتے، تو آپ تھوڑی دیر کے بعد مقدمہ کی تیاری میں مصروف ہو جاتے ہر روز کی طرح ایک رات میں ایک بوتل وہسکی اور ایک درجن سوڈا کی بوتلیں ختم کر دیتے یہ لڑکی کرسی پر ان کے سامنے بیٹھی وہسکی پیتی رہتی، اور مسٹر نارٹن جب مقدمہ کے کاغذات سے اکتا جاتے، تو تھوڑی دیر کے لئے اس لڑکی سے بات چیت کر لیتے، اور آپ ہمیشہ کی طرح علی الصبح چار بجے اپنے بیڈروم میں چلے جاتے اسی طرح جب ایک ہفتہ ختم ہوا تو اس لڑکی نے پانچ ہزار کا مطالبہ کیا اور کہا کہ یہ واپس لاہور جانا چاہتی ہے مسٹر نارٹن نے کہا ''بہت اچھا'' چنانچہ آپ نے ایک سو روپیہ تو ٹکٹ وغیرہ کے مصارف کے لئے نقد اور پانچ ہزار روپیہ کا لاہور کے بینک کا چیک دیا، مگر چیک پر دستخط غلط کر دیئے۔ جو پڑھے ہی نہ جا سکتے تھے لڑکی بہت خوش کہ اس کو پانچ ہزار روپیہ مل گیا۔ یہ اس چیک کو لے کر لاہور پہنچی اور دوسرے یا تیسرے روز روپیہ لینے بینک گئی تو بینک کے اکاؤنٹنٹ نے چیک دیکھ کر اور دستخطوں کے نمونے کے دستخطوں سے ملا کر کہا:

''میڈم! اس چیک کے دستخط اصلی دستخطوں سے نہیں ملتے آپ دستخط درست کرا کرلائیے، تو آپ کو روپیہ مل سکتا ہے۔''

بینک والوں کا یہ جواب سن کر لڑکی حیران یہ رات کی گاڑی پھر انبالہ واپس آئی مسٹر نارٹن سے ملی، تو اس کے اور مسٹر نارٹن کے درمیان یہ بات چیت ہوئی:

لڑکی: مسٹر نارٹن! بینک والے کہتے ہیں کہ چیک پر دستخط غلط ہیں آپ نیا چیک لکھ دیں

مسٹر نارٹن: نہیں! میں نے جان بوجھ کر دستخط غلط کیے، کیونکہ تمہاری ایک ہفتہ کی دوستی کی قیمت پانچ ہزار روپیہ نہیں ہوسکتی۔

یہ جواب سن کر لڑکی کچھ تیز ہوئی تو مسٹر نارٹن نے کہا:

''دیکھو، اگر شور پیدا کرو گی، تو میں تمہیں بلیک میلری میں گرفتار کرا دوں گا۔ میں وکیل ہوں اور قانون کو جانتا ہوں ہاں اگر تم معقولیت کے ساتھ بات چیت کرنے کو تیار ہوتو میں تمہارا معاوضہ ادا کردوں گا۔''

چنانچہ پھر بات چیت شروع ہوئی تو مسٹر نارٹن نے کہا

''دیکھو، تم معقولیت کی بات کرو یہ درست ہے کہ میں ایک ہفتہ تمہاری رفاقت سے محظوظ ہوا مگر یہ بھی درست ہے کہ میرے اس پانچ ہزار روپیہ کے چیک سے تمہیں کئی روز تک نا قابل بیان خوشی اور مسرت نصیب ہوئی جس صورت میں کہ ہم دونوں نے مساوی طور پر حظ اور لطف حاصل کیا، پھر تمہیں ایک روپیہ بھی نہ لینا چاہئے۔''

یہ سن کر لڑکی بہت ناراض اور بددل ہوئی، اور آخر بات چیت کے بعد مسٹر نارٹن نے لڑکی کو ایک سو روپیہ روزانہ کے حساب سے ساتھ سو روپے نقد دیتے ہوئے کہا کہ:

''یہ معاوضہ مناسب اور موزوں ہے''

چنانچہ لڑکی سات سو روپیہ لے کر اس امید کے ساتھ واپس لاہور چلی گئی کہ ہر اتوار کو مسٹر نارٹن لاہور آیا کرتے ہیں مستقل گاہک ہیں، فیاض ہیں، ایسے اچھے گاہک کو ہاتھوں سے نہ جانے دینا چاہیے میں نہیں کہہ سکتا کہ مسٹر نارٹن نے اس کے بعد بھی لاہور جا کر کبھی اس لڑکی کو بلوایا یا نہیں مگر یہ واقعہ انبالہ کے نابھ کیمپ میں کئی روز تک دلچسپی کا باعث رہا کیونکہ جس صورت میں کہ مسٹر نارٹن اس لڑکی کی رفاقت سے ایک ہفتہ محظوظ رہے اور لڑکی کو اس چیک کی رفاقت سے کئی روز نا قابل بیان مسرت اور خوشی

نصیب ہوئی، اور دونوں مساوی طور پر فائدہ میں رہے۔

لڑکی کے لئے مناسب تھا کہ وہ روپیہ طلب نہ کرتی اور اگر مسٹر نارٹن نے اس کو سات سو روپیہ دیا، تو یہ بھی مسٹر نارٹن کی انتہائی فیاضی اور غیر ضروری فراخدلی کا ثبوت تھا مگر بعض حلقوں میں اسے وعدہ شکنی ہی قرار دیا جائے گا۔

☆☆☆☆☆☆☆

بد سے بدنام برا

ہندوستان میں تو ایک کہاوت مشہور ہے ''بد سے بدنام برا'' یعنی پبلک کی نگاہوں میں کوئی برے سے برا شخص بھی اتنا قابل تعزیر قرار نہیں دیا جاتا، جتنا کہ بری شہرت رکھنے والا یعنی بدنام اور انگریزی کے ایک مصنف اور اہل الرائے نے کہا ہے کہ:

''مجھے ان لوگوں کے ساتھ ہمدردی ہے، جو بے نقاب ہو گئے''

یعنی پبلک کی نگاہوں میں صرف وہی لوگ مجرم قرار دیئے جاتے ہیں جو بے نقاب ہو جائیں ورنہ غور کیا جائے تو ہر شخص ہی کسی نہ کسی حد تک کسی نہ کسی صورت میں گناہگار ہے بد اور بدنام کے سلسلہ میں چند ذاتی واقعات اور تجربات بیان کرتا ہوں:

میں کئی برس سے ہر روز کھانے سے پہلے نصف پیگ (یعنی ایک اونس یا نصف چھٹانک) برانڈی پیتا ہوں اور اکثر ایسا ہوا کہ میں نے چھ چھ ماہ تک اس کے پینے کا کبھی خیال تک نہ کیا وہسکی، جن، رم یا ٹھرے سے مجھے کچھ نفرت سی ہے گو میرے گھر میں دوستوں کے لئے وہسکی ہمیشہ موجود رہی، مگر میں نے اسے کبھی نہ پیا یعنی شراب پینے کا عادی نہیں ہوں اور میری زندگی میں کبھی ایک بار بھی ایسا نہیں ہوا کہ میں شراب خوری کی وجہ سے اپنے حواس سے محروم ہوا۔ حضرت جوش تو مجھے برانڈی کا ں صف پیگ پیتے دیکھ کر فرمایا کرتے ہیں، کہ میں شراب کو رسوا کرتا ہوں۔ مگر چونکہ زیادہ شراب پینے والے کئی دوست میرے ہاں آیا کرتے، اور وہسکی پیتے، اکثر حلقوں میں مجھے بھی ان دوستوں کے معیار کا ہی ''پیاک'' یعنی شراب خور قرار دیا جاتا۔ اور ان حلقوں کو میں چاہے کتنا یقین دلاؤں مگر یہ لوگ یقین کرنے کو تیار نہیں چنانچہ کئی برس ہوئے میں مرحوم مسٹر رچھپال سنگھ شیدا وغیرہ کئی دوستوں کے ساتھ میرٹھ سے بذریعہ کار دہلی آ رہا تھا۔ یہ کار میں چلا رہا تھا، اور ایک چھکڑے کو بچاتے ہوئے ایکسیڈنٹ ہو گیا، تو ان تمام دوستوں نے جو مجھے شراب خور سمجھتے ہیں یہی یقین کیا کہ میں شراب میں بدمست ہو کر اپنی کار خود چلا رہا تھا جو یہ ایکسیڈنٹ ہوا اور بعض دوستوں کے خطوط

بھی ملے جن میں لکھا تھا کہ زیادہ شراب نوشی کا یہی نتیجہ ہوا کرتا ہے یعنی میں برا نہ ہوتے ہوئے بھی بدنامی کا سزاوار قرار دیا گیا۔

مجھ پر بعض والیان ریاست نے ڈیڑھ درجن کے قریب جھوٹے اور بے بنیاد مقدمات چلائے، اور ان فرضی مقدمات میں ان والیان ریاست کو شکست ہوئی ان مقدمات میں ایک مقدمہ جعلی کرنسی نوٹوں کو اپنے قبضہ میں رکھنے کا بھی تھا اس مقدمہ میں گو ہائیکوٹ نے پولیس کے خلاف بہت سخت ریمارکس کیے، اور مجھے قطعی بے قصور قرار دیا۔ مگر کئی ایک حلقوں میں یہ یقین کیا جاتا تھا، کہ میں فی الحقیقت جعلی کرنسی کی تجارت کرتا ہوں چنانچہ یہ واقعہ دلچسپ ہے، کہ میں جب نظر بندی سے رہائی حاصل کر کے دہلی پہنچا اور اخبارات میں میری رہائی کی اطلاع شائع ہوئی تو چند ہفتہ بعد ایک صاحب پشاور سے تشریف لائے میں میز پر بیٹھا اخبار کے لئے مضامین لکھ رہا تھا آپ نے آنے کے بعد کہا کہ آپ راز میں کچھ بات کہنا چاہتے ہیں اگر اس راز کو افشا نہ کیا جائے میں نے یقین دلایا، تو آپ نے دو جعلی کرنسی نوٹ میرے سامنے رکھتے ہوئے کہا:

”آپ ان جعلی نوٹوں کو اصل نوٹوں سے مقابلہ کر لیجئے کوئی شخص ان کو جعلی قرار نہیں دے سکتا، کیونکہ یہ بہت بڑے ایک ایکسپرٹ کاریگر نے تیار کیے ہیں آپ کو جتنے نوٹ درکار ہوں پچاس فیصد کمیشن پر دیئے جائیں گے یعنی دس ہزار روپیہ کے اصلی نوٹوں کے تبادلہ میں بیس ہزار روپیہ کے یہ نوٹ ہوں گے اور آپ جتنے نوٹ چاہیں، آپ کو مل سکتے ہیں میں پشاور سے صرف آپ سے ملنے آیا ہوں۔“

میں اس شخص کو کیا جواب دیتا میں نے صرف یہی کہا کہ:

”میں اگر چاہوں، تو اسی وقت آپ کو گرفتار کرا سکتا ہوں مگر چونکہ میں آپ سے وعدہ کر چکا ہوں اور آپ نے مجھ پر اعتماد کیا ہے میں اعتماد شکنی کا مجرم نہیں ہونا چاہتا اس لئے آپ مہربانی فرما کر اسی وقت میرے مکان سے چلے جائیے اور آئندہ پھر کبھی ادھر

آنے کا رخ نہ کیجئے‘‘

یہ سن کر یہ حضرت جو پشاوری لنگی پہنے، اور مولویوں کی طرح داڑھی رکھے ہوئے تھے چلے گئے ان کے جانے کے بعد میں دیر تک سوچتا رہا کہ مجھے بدنامی کے اس داغ کو دھونے کے لئے کیا صورت اختیار کرنی چاہئے۔

تبادلہ آبادی سے پہلے میں قریب قریب ہر ماہ لاہور جایا کرتا، اور وہاں صرف ایک روز ہی قیام ہوتا میں لاہور میں عام طور پر ریلوے اسٹیشن کے قریب برگنزا ہوٹل میں قیام کرتا، اور وہاں ہی دوست اور احباب ملنے کے لئے آجاتے ایک بار میں لاہور گیا، تو مسٹر نازش رضوی تشریف لائے اور باتوں باتوں میں انہوں نے بتایا کہ فلم ایکٹرس آشا پوسلے اور اس کے گھر کے کئی لوگ کئی بار آپ کا پوچھ چکے ہیں اور ملنا چاہتے ہیں ان کا گھر ہوٹل کے بالکل قریب آسٹریلیا بلڈنگ میں ہے۔ میں نے کہا کہ ابھی لنچ کھانے کے بعد جاتا ہوں۔

آشا پوسلے کے متعلق پوزیشن یہ ہے کہ آشا کا باپ بھائی ناتھ ربابی خاندان سے تھا (ربابیوں کو نصف سکھ اور نصف مسلمان کہنا چاہئے یہ لوگ قومیت کے لحاظ سے مسلمان ہیں، مگر گوردواروں میں کیرتن کرنے اور سکھوں کے قریب رہنے کے باعث تہذیب وتمدن کے اعتبار سے ان پر سکھ ازم کے اثرات ہیں) چنانچہ آشا کا دادا، یعنی بھائی ناتھ کا باپ اپنے دہلی کے قیام میں روزانہ صبح گوردوارہ سیس گنج جایا کرتا بھائی ناتھ گراموفون دہلی میں بطور سازندہ کے ملازم تھے، اور ان کی رہائش دفتر ’’ریاست‘‘ والے ہملٹن روڈ والے مکان کے بالکل قریب تھی، اور اسی بلڈنگ میں ہی صبیحہ کا باپ محمد علی اور ماں بالو ماہئے والی رہا کرتے۔ یہ تمام لوگ کبھی کبھی ملنے کے لئے دفتر ’’ریاست‘‘ میں آتے یعنی ان کے ساتھ دوستانہ مراسم تھے،۔ اور میرے لئے خوشی کا مقام تھا کہ میں لاہور میں ان لوگوں سے ملتا۔

چنانچہ لنچ کھانے کے بعد میں ان کے مکان پر گیا، جو اس ہوٹل کے بالکل قریب

تھا میں جب اس مکان کے قریب گلی میں پہنچا تو دیکھا کہ ایک درجن کے قریب فلم زدہ نوجوان لڑکے ادھر ادھر پھر رہے ہیں اور یہ اس کوشش میں ہیں کہ کسی صورت سے آشا پوسلے ان کو نظر آ جائے میں جب اس گلی میں پہنچا، تو میں نے ان لڑکوں ہی سے پوچھا کہ:

''آشا پوسلے کا مکان کون سا ہے؟''

میرے اس دریافت کرنے پر ایک لڑکے نے طنز آمیز اشارہ کے ساتھ بتایا کہ وہ سامنے والا مکان ہے اور دوسرے لڑکے بھی مجھے دیکھ کر نیم مسکراہٹ کا اظہار کر رہے تھے۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ ان لڑکوں کے خیال میں صرف کالجوں کے لڑکے ہی فلم زدہ نہیں، بلکہ داڑھیوں والے سکھ بھی زخم خوردہ ہیں۔

ان لڑکوں کی مسکراہٹ کو دیکھ کر میں مسکرا دیا، اور مکان کا راستہ پوچھا، تو ایک لڑکا رہنمائی کرتے مجھے اپنے ساتھ اس مکان کے زینہ تک لے گیا، جو پچھلی طرف تھا۔ میں اس مکان کے زینہ تک پہنچا، تو بے تکلف زینہ کے اوپر چڑھ گیا پھر اوپر جا کر دیکھا تو دروازہ اندر سے بند تھا تا کہ کوئی شخص ان کے مکان میں داخل نہ ہو سکے۔

میں نے دروازہ پر پہنچ کر دروازہ کھٹکھٹایا، تو اندر سے ایک آواز آئی:

''کون ہے؟''

میں نے کوئی جواب نہ دیا ''مگر شرارتاً'' پھر زور سے دروازہ کھٹکھٹایا میرے زور سے دروازہ کھٹکھٹانے پر اندر سے آشا پوسلے نے اپنی ماں کی آواز دی ''بی بی! کوئی شخص زور زور سے دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے، اور یہ باز نہیں آتا'' آشا کی ماں یعنی ماسٹر ناتھ کی بیوی اپنی بیٹی کی اس شکایت کو سن کر دروازہ پر آئی اور اس نے اندر سے ہی تحکمانہ لہجہ میں کہا:

''تم کون ہو، جو دروازہ کھٹکھٹا رہے ہو جاؤ یہاں سے''

یہ سن کر میں نے پھر دروازہ کھٹکھٹایا، تو آشا کی ماں نے بہت احتیاط کے ساتھ

آہستہ سے دروازہ کھولا۔ اسے شک تھا کہ گلی میں آوارہ گردی کرنے والے کالجوں کے لڑکے اوپر آنا چاہتے ہیں دروازہ کھلنے پر جب آشا کی ماں نے مجھے دیکھا تو اس نے انتہائی خوشی کا اظہار کرتے ہوئے ربابیانہ انداز میں کہا:

''رکھاں گوروان دیاں، کدوں آئے او''؟ (آپ پر گورو صاحبان کی رحمت نازل ہو، آپ کب آئے ہیں؟)

دروازہ کھلا، میں اندر چلا گیا، تو پھر کے تمام لوگوں نے خوشی و مسرت کا اظہار کیا۔ آشا کا باپ بھائی ناتھ بخار میں مبتلا تھا اور وہ ایک کمرہ میں ریشمی رضائی اوڑھے لیٹا ہوا تھا۔ ریشمی رضائی، ریڈیو اور فرنیچر کو دیکھ کر میں نے اندازہ کرلیا کہ ان پر خدا کا فضل ہے ماسٹر ناتھ کا دہلی کا افلاس ختم ہو چکا ہے اور اب خوشحالی کے دن ہیں میں ان کے مکان پر دس منٹ کے قریب بیٹھا ماسٹر ناتھ سے باتیں ہوئیں کاروبار کی حالت پوچھی آشا نے تو اپنے تمام ساز دکھائے، جو اس کے گانے کے وقت بجائے جاتے ہیں اور اس کی بہن حشمت نے پنجابی کی اپنی ایک دو نظمیں دکھائیں، کیونکہ اس لڑکی کو لکھنے کا بہت شوق ہے، اور یہ اب منشی فاضل کا امتحان بھی پاس کر چکی ہے ان سب سے بات چیت کرنے اور اس وعدہ کے بعد کہ میں پھر جب کبھی لاہور آیا ان کے ہاں آیا کروں گا زینہ سے نیچے اترا اور گلی میں پہنچا تو دیکھا کہ فلم زدہ لڑکے بدستور ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر چکر کاٹ رہے ہیں۔ مجھے دیکھ کر یہ پھر مسکرائے جس کا مطلب یہ تھا کہ میں تو خوش نصیب ہوں، کہ مجھے آشا پوسلے کی بازیابی نصیب ہوئی، اور یہ لڑکے بدنصیب ہیں، جو بدستور چکر کاٹ رہے ہیں ان کی مسکراہٹ کو دیکھ کر میں بھی مسکرا دیا، اور مسکراتے ہوئے ان لڑکوں سے کہا، کہ:

''میں تم لوگوں کی طرح فلم زدہ نہیں ہوں میں تو آشا پوسلے کے باپ بھائی ناتھ سے ملنے گیا تھا میرے ان کے ساتھ دیرینہ تعلقات ہیں۔''

میرے اس بیان کو سن کر لڑکوں کی مسکراہٹ ہنسی میں بدل گئی، اور ایک لڑکے نے

قہقہہ مارتے ہوئے کہا:

''جی ہاں! ہم سب جانتے ہیں کہ آج کل داڑھیوں کے پردہ میں کیا کچھ ہو رہا ہے، آپ صفائی پیش نہ کیجئے۔''

یہ سن کر میں ہنس دیا اور چلا آیا راستہ میں سوچتا رہا کہ بد کے مقابلے پر بدنام زیادہ قابل تعزیر ہے۔

انسان کا فرض ہے کہ وہ اپنے دامن کو بدیوں سے بچائے مگر اس سے زیادہ ضروری ہے کہ انسان بدنام نہ ہو اور وہ محتاط رہے کیونکہ پچھلے واقعات گواہ ہیں کہ احتیاط نہ کرنے کے باعث وہ لوگ بھی بدنام ہوئے، جو انتہائی بلند اور نیک تھے۔ حالانکہ ان کا قصور کوئی نہ تھا۔ اور اس سلسلہ میں مہاتما گاندھی کی مثال ہمارے سامنے موجود ہے، جن پر انتہائی بلند، انتہائی پارسا اور انتہائی نیک ہوتے ہوئے بھی بعض کم ظرفوں نے ان کی زندگی میں ان پر غلط اور بے بنیاد الزامات لگائے۔

☆☆☆☆☆☆☆

دیوان سنگھ نا قابل اعتبار

دنیا کے لوگ تو مساجد، مندروں اور گوروں میں جا کر اپنی خوشحالی کے لئے دعائیں کرتے ہیں، اور منتیں مانتے ہیں، کہ خدا ان کو روپیہ اور دولت دے۔ مگر اس صورت میں کہ میرے بیان پر یقین کیا جائے، تو میں ایمانداری کے ساتھ سچ کہتا ہوں، کہ میں نے نہ صرف اپنی خوشحالی کے لئے دعا نہ کی۔ بلکہ ہمیشہ یہی خواہش رہی، کہ خدا کبھی بھی جمع کرنے کے لئے روپیہ نہ دے۔ اور صرف اتنا روپیہ ملتا رہے، جس کو صرف کرتے ہوئے میں بغیر کسی تکلیف کے زندگی بسر کرسکوں۔ میری اس فطرت کا نتیجہ یہ ہے کہ میرے پاس کبھی بھی اور کسی زمانہ میں بھی اتنا روپیہ نہ تھا، کہ میں اسے بطور سرمایہ کے جمع کرسکتا۔ اور میری پچھلی تمام زندگی میں ایک دن بھی ایسا نہ تھا، جبکہ میں مقروض نہ تھا۔ چنانچہ مجھے اچھی طرح یاد ہے، میں جب سولہ برس کی عمر میں تھا، تو میں آٹھ دس روپیہ کا مقروض تھا۔ اور اس کے بعد کبھی بھی ایسا دن دیکھنا نصیب نہ ہوا، کہ میں قرضہ سے سبکدوشی حاصل کرسکا، ہاں قرضہ میں کمی بیشی ہوتی رہی۔ یعنی کبھی دس ہزار، کبھی بیس ہزار اور کبھی تیس ہزار اور ایک زمانہ ایسا آیا کہ میرے ذمہ دوستوں کا چھتیس ہزار روپیہ قرضہ تھا اور ایک پیسہ کی جائیداد نہ تھی۔ یعنی قرض خواہوں نے روپیہ دیا، تو جائیداد گروی رکھ کر نہیں بلکہ ویسے ہی اعتبار کرکے اور یہ یقین کرتے ہوئے کہ میں بد دیانت نہیں ہوں اور قرضہ ادا کردوں گا اور میرے ہمیشہ مقروض رہنے کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ پہلا قرضہ تو ابھی ادا نہ ہوتا، کہ اس توقع اور امید پر میں مزید قرضہ لے لیتا، کہ روپیہ آئے گا اور میں قرضہ ادا کردوں گا چنانچہ قرضہ دینے والے دوستوں نے تو مجھے ہمیشہ ہی قابل اعتبار قرار دیا، مگر میرے عزیز و اقارب، اور گھرے دوستوں نے روپیہ پیسہ کے معاملہ میں مجھے ہمیشہ ہی نا قابل اعتبار قرار دیا، جس کی چند مثالیں پیش کرتا ہوں:

میری والدہ جب تک زندہ رہیں، ان کا زیادہ زمانہ اپنے وطن حافظ آباد میں ہی

بسر ہوا۔ کیونکہ خاندان کی لڑکیاں ان سے مانوس تھیں، اور وہ بہت ہی محبت کے ساتھ والدہ کی خدمت انجام دیتیں تھیں۔ اس کے علاوہ دہلی کا پانی بھی ان کو موافق نہ تھا۔ آپ کبھی کبھی مہینہ دو مہینہ کے لئے میرے پاس دہلی آ جاتیں۔۔۔۔ جب یہ دہلی آتیں، تو نقد روپیہ کے علاوہ میرے گھر میں جو سامان ہوتا، اس میں سے زیادہ سامان، مثلاً کراکری، چمڑے کے سوٹ کیس، ہینڈ بیگ، کپڑے اور بسترے وغیرہ جاتے ہوئے اپنے ساتھ حافظ آباد لے جاتیں، اور جب میں اس پر اعتراض کرتا، تو یہ جواب ہوتا کہ یہ سامان میں دوسرے لوگوں کو دے دوں گا اس لئے بہتر یہ ہے کہ یہ حافظ آباد چلا جائے، تاکہ محفوظ رہے چنانچہ ایک بار میں حافظ آباد گیا اور وہاں تین چار روز رہا، تو دیکھا کہ دو درجن کے قریب چمڑے کے سوٹ کیس، اور ہینڈ بیگ پڑے ہیں اور وہ روغن نہ لگانے اور احتیاط سے نہ رکھنے کے باعث پچک سے گئے ہیں یعنی میری والدہ نے روپیہ پیسہ اور سامان کے متعلق مجھے ہمیشہ ہی ناقابل اعتبار سمجھا، اور فضول خرچ سمجھا، اور کوشش کی کہ جو کچھ بھی ممکن ہو مجھ سے حاصل کر لیا جائے تاکہ وہ محفوظ رہے۔

میری والدہ کو روپیہ پیسہ کے اعتبار سے مجھے ناقابل اعتبار سمجھتی تھیں، مگر ان کو مجھ سے محبت بھی بہت زیادہ تھی، اور وہ میری تکلیف برداشت نہ کر سکتی تھیں، اور مجھے جب روپیہ کی ضرورت ہوتی، تو میں مصنوعی طور پر اپنی پریشانیکا اظہار کرتا جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ وہ روپیہ مجھے دے دیتیں چنانچہ 1947ء کا ایک دلچسپ واقعہ ہے:

''ریاست'' کے پرنٹر اور پبلشر مسٹر ظفر احمد جن کو میں اپنے بھائیوں سے بھی زیادہ عزیز سمجھتا تھا باوجود دہلی کے قتل عام کے واقعات کے مجھے یہاں چھوڑ کر پاکستان نہ جانا چاہتے تھے۔ مگر میں یہ چاہتا تھا کہ یہ فوراً وہاں چلے جائیں، تاکہ یہ دہلی میں قتل نہ ہوں ظفر صاحب کے ساتھ ان کے گھر کے لوگوں کے جانے کا بھی سوال تھا کچھ اور مسلمان دوست بھی ایسے تھے، جن کے متعلق میں نہ چاہتا تھا کہ اس زمانہ میں وہ دہلی میں رہیں۔ کیونکہ سوائے مسلمانوں کے چند محلوں کے دہلی میں مسلمان ہونا بھی جرم

تھا، اور گورنمنٹ کی انتہائی کوشش کے باوجود دہلی میں داخل ہو چکے شرنارتھی اپنے ذہنی پاگل پن کو چھوڑنے کے لئے تیار نہ تھے سوائے ہوائی جہاز کے دہلی سے لاہور جانے کا دوسرا کوئی ذریعہ محفوظ نہ تھا، کیونکہ دہلی اور لاہور کے درمیان گاڑیوں کی گاڑیاں کرپانوں اور تلواروں کا شکار ہو رہی تھیں۔ ہوائی جہاز کے ذریعہ جانے کے لئے اس تمام قافلہ کے لئے کم از کم ایک ہزار روپیہ کا سوال تھا، کیونکہ ہوائی جہاز میں سیٹیں حاصل کرنے کے لئے کرایہ کے علاوہ رشوت کا بھی سوال تھا۔ بغیر رشوت کے ہوائی جہاز میں سیٹ کا ملنا ممکن نہ تھا۔ اور میری حالت یہ تھی کہ اخبار بند کیونکہ ڈاکخانے معطل ہو چکے تھے کوئی منی آرڈر نہیں، بینک بیلنس میں صرف دس بارہ روپیہ بہت پریشانی، کہ یہ لوگ لاہور کیونکر پہنچ سکیں۔ سردار سردول سنگھ کولیشر اس سے پہلے دہلی پہنچ چکے تھے میں ان کے پاس گیا، اور چار سو روپیہ ان سے قرض لیا مگر یہ روپیہ کافی نہ تھا میری والدہ بھی اس سے پہلے دہلی پہنچ چکی تھیں اور دفتر ''ریاست'' میں ان کی رہائش کا انتظام کر دیا گیا تھا میں نے سوچا کہ والدہ سے روپیہ لینا چاہئے چنانچہ میں نے مصنوعی طور پر اپنے چہرے سے انتہائی پریشانی کا اظہار کیا والدہ نے پوچھا کیا بات ہے پریشان کیوں ہو؟ میں نے کہا کچھ نہیں والدہ نے پھر پوچھا کہ بتاؤ تو پریشان کیوں ہو؟ میں نے جواب دیا:

''میری پریشانیاں تو جاری رہتی ہیں فسادات کے باعث اخبار بند ہے، منی آرڈر نہیں آرہے، آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں مگر جن لوگوں نے روپیہ لینا ہے وہ تقاضا کر رہے ہیں کوئی بات نہیں میری تو تمام زندگی ہی ایسے حالات میں بسر ہوئی''

میرے اس جواب کے بعد والدہ نے پوچھا کہ کتنا روپیہ ان لوگوں کو دینا ہے؟ میں نے کہا چند سو روپیہ کی ضرورت ہے والدہ نے کہا کہ ان کے پاس تو صرف سو روپیہ کا ایک نوٹ موجود ہے یہ کہہ کر والدہ اندر گئیں اور بکس میں سے ایک سو روپیہ کا نوٹ نکال لائیں میں نے جب یہ نوٹ دیکھا تو ان سے کہا کہ رہنے دیجئے دیکھا

جائے گا مگر اپنے چہرے سے پریشانی کا زیادہ اظہار کیا۔ میرے اس کہنے پر کچھ دیر تو خاموشی سی رہیں اس کے بعد والدہ پھر کمرہ کے اندر گئیں اور بکس میں سے ایک سو روپیہ کا ایک اور نوٹ نکال لائیں اور یہ دونوں نوٹ دیتے ہوئے کہا کہ:

''بس میرے پاس صرف دوسو روپیہ تھا، جو میں نے دے دیا میرے پاس اور کوئی روپیہ نہیں۔''

میں نے دوسو روپیہ لینے سے بھی انکار کر دیا، تو پھر کچھ سناٹا سا رہا کیونکہ ایک طرف تو والدہ روپیہ دینا نہ چاہتی تھیں دنیا کی ہر عورت کو روپیہ اور زیور سے محبت ہوا کرتی ہے اور دوسری طرف میری پریشانی کو بھی برداشت نہ کر سکتی تھیں آخر کچھ دیر اسی کشمکش میں مبتلا رہنے کے بعد ایک سو روپیہ کا ایک اور نوٹ اور سونے کا ایک ٹکڑا جو غالباً تین چار تولہ کا ہوگا بکس میں سے نکال لائیں میں نے یہ تین سو روپیہ اور سونے کا ٹکڑا ظفر صاحب کو دیا تاکہ وہ اگلی صبح ہوائی جہاز میں سب کو لاہور لے جائیں۔ چنانچہ ظفر صاحب سردار سردول سنگھ کولیشر والا اور یہ روپیہ معہ سونے کے ٹکڑے کے لے گئے، اور اگلی صبح وہ ہوائی جہاز کے ذریعہ لاہور کے لئے روانہ ہو گئے۔ والدہ سے روپیہ لینے کے بعد شام کو والدہ میرے پاس بیٹھی تھیں تو میں نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ ان سے بات چیت کرتے ہوئے پوچھا:

میں: میں آپ کا ایک ہی بیٹا ہوں اور آپ کو مجھ سے بے حد محبت بھی ہے آپ یہ بتائیے کہ آپ کے خیال میں لائق ہوں یا نالائق؟

والدہ: تم یہ کیوں پوچھتے ہو؟

میں: میں تو ویسے ہی پوچھتا ہوں مگر آپ سچ سچ بتائیے جو کچھ کہ آپ سمجھتی ہیں۔

والدہ: (سوچنے کے بعد) دوسرے لوگ اور حافظ آباد کے تمام عزیز اور رشتہ دار تو تمہیں بہت لائق سمجھتے ہیں مگر میری رائے میں تم لائق نہیں ہو، بلکہ تمہیں نالائق اولاد ہی قرار دینا چاہئے جس نے کبھی کوئی مکان یا جائیداد نہ بنائی، بلکہ اپنی خاندانی زمین

بھی فروخت کر دی۔ اور اب جو کچھ میرے پاس ہے وہ بھی تم لے رہے ہو میں تمہیں لائق کیسے سمجھ سکتی ہوں اور یہی وجہ ہے کہ میں تمہیں حافظ آباد کے گھر کی چابیاں نہیں دیتی، اور تمہارا اعتبار نہیں کرتی کیونکہ اگر چابیاں دیں تو تم وہاں کا تمام سامان لوگوں کو دے دو گے۔

یہ لطیفہ دلچسپ ہے، کہ تبادلہ آبادی کے بعد میری والدہ کئی برس زندہ رہیں، مگر آپ نے حافظ آباد کے مکان کی چابیاں کبھی کسی کو نہ دیں۔ چابیوں کے متعلق میرا بھی کبھی اعتبار نہ کیا اور ان کا یقین تھا کہ جو سامان وہ چھوڑ آئی ہیں وہ بدستور وہاں ہی ہو گا۔ مگر وہاں کیفیت کیا تھی، اس کے متعلق ذیل کا دلچسپ واقعہ ملاحظہ کیجئے:

دو تین برس ہوئے، حافظ کے ڈاکٹر عبدالحمید قریشی نے راقم الحروف کو ایک خط لکھا۔ اس خط پر وہاں کی میونسپل کمیٹی کے صدر ملک علی بہادر خاں کے علاوہ کئی دوسرے اصحاب کے دستخط تھے، اور اس خط میں لکھا تھا کہ:

''حافظ آباد کے لوگ اس مکان پر ایک کتبہ لگانا چاہتے ہیں، جس میں ''ناقابل فراموش'' کا مصنف اور اخبار ''ریاست'' کا ایڈیٹر دیوان سنگھ پیدا ہوا، اور جہاں اس نے پرورش پائی یہ محلّہ پہلے تمام کا تمام ہندوؤں اور سکھوں کا تھا اور اب اس میں پناہ گزین رہتے ہیں پتہ نہیں چل سکا کہ یہ کون سا مکان ہے اس لئے آپ ایک نقشہ بنا کر بھیجئے تا کہ اس مکان پر کتبہ لگایا جا سکے۔''

''یہ دلچسپ خط مجھے ملا، تو میں نے ڈاکٹر قریشی کو جواب دیا، کہ:''

''میں پیدا تو جہلم میں ہوا، جہاں میرے والد ڈاکٹر تھے۔ اور میں بچپن ہی سے حافظ آباد سے چلا گیا تھا، اس لئے کتبہ لگانے کا خیال ترک کر دیں۔ ہاں میں آپ کو مکان کا نقشہ بھیج رہا ہوں۔ آپ صرف یہ کریں، کہ میرے مکان کی اوپر کی منزل میں لکڑی کا ایک بکس دیوار اور چھت کے ساتھ ہے، جسے پڑچھتی کہتے ہیں۔ اس پڑچھتی میں فلاں جگہ میرا پانچویں جماعت کے امتحان کا سرٹیفکیٹ، اور میرے انتقال کر چکے

بڑے بھائی کا ایک آخری خط موجود ہے۔ آپ یہ دونوں کاغذات وہاں سے لے کر مجھے بھیج دیجئے۔"

میرے اس خط کے پہنچنے پر ڈاکٹر قریشی میرے مکان پر گئے، تو ان کا جواب آیا، کہ وہ اس مکان پر گئے تھے، مگر وہاں پڑچھتی موجود نہیں ہے۔ معلوم ہوتا ہے، کہ پناہ گزینوں نے جب اس مکان پر قبضہ کیا، تو ایندھن کی کمی کے باعث ان لوگوں نے اس پڑچھتی کی لکڑی اکھاڑ کر جلا دی تھی، اور اب چھت اور دیوار کے ساتھ اس کے صرف نشانات باقی ہیں۔ یعنی ادھر تو پناہ گزینوں نے پڑچھتیوں کی لکڑی تک جلا دی تھی، اور ادھر میری والدہ اس مکان کی چابیاں سنبھالے ہوئے تھیں، اور مجھے ناقابل اعتبار سمجھتے ہوئے انہوں نے مجھے چابیاں نہ دیں۔

میری والدہ کے مجھے ناقابل اعتبار قرار دینے کے سلسلہ میں ایک اور دلچسپ واقعہ سن لیں۔ میری والدہ تبادلہ آبادی سے چند برس پہلے حافظ میں مقیم تھیں، تو ایک روز آپ نے خاندان کی تمام لڑکیوں میں کچھ روپیہ تقسیم کیا، اور کچھ روپیہ گوردوارہ میں دیا۔ جب ان سے پوچھا گیا، کہ ایسا کیوں کر رہی ہیں؟ تو آپ نے جواب دیا:

"جب کسی ضعیف شخص کا انتقال ہو، تو رسم کے مطابق اس کے مرنے کے بعد خاندان کی لڑکیوں کو، اور گوردوارہ میں بطور خیرات روپیہ دیا جاتا ہے۔ میں ضعیف ہوں، اور موت کا کچھ پتہ نہیں، کہ کب ہو۔ مجھے اپنے بیٹے پر اعتبار نہیں، کہ وہ میرے مرنے کے بعد رسم کے مطابق لڑکیوں کو اور گوردوارہ میں روپیہ دے گا، یا نہیں۔ اس لئے چاہتی ہوں، کہ میں خود ہی اپنی زندگی میں ان کو دے جاؤں۔"

یعنی میری والدہ نہ صرف اپنی زندگی میں، بلکہ اپنے انتقال کے بعد بھی مجھے انتہائی ناقابل اعتبار قرار دیتی تھیں۔

میرے ناقابل اعتبار کے بارے میں ایک لطیفہ سن لیجئے۔ مرحوم شیخ ضیاء الحق (مولوی عبدالحق صاحب صدر انجمن ترقی اردو کے حقیقی چھوٹے بھائی) راقم الحروف

کے کرم فرماتھے۔اورآپ کے اخلاص اور محبت کی یہ کیفیت تھی، کہ آپ ہاپڑ سے ہر اتوار کی صبح کو دہلی پہنچتے۔اپنی بیوی سے کھانا پکوا کر اپنے ساتھ لاتے۔یہ کھانا میرے ساتھ کھاتے دن بھر دفتر ''ریاست'' میں رہتے،اورتھوڑی سی برانڈی بھی پیتے۔میں نے برانڈی کے لئے شیشہ کی ایک بہت خوبصورت صراحی اٹھارہ روپیہ میں خریدی تھی۔اس صراحی میں سے آپ نے تھوڑی سی برانڈی پی،تو شام کو جاتے ہوئے یہ صراحی اپنے ساتھ لے گئے۔جب یہ جارہے تھے،تو میں نے کہا:

''شیخ صاحب،یہ کیوں اپنے ساتھ لئے جارہے ہیں؟''

تو آپ نے بے تکلف جواب دیا:

''صراحی بہت خوبصورت ہے،اورتم سے کوئی نہ کوئی ضرور لے جائے گا۔اس لئے میں ہی کیوں نہ لے جاؤں۔''

یہ کہتے ہوئے آپ صراحی اپنے ساتھ لے گئے،کیونکہ وہ جانتے تھے،کہ روپیہ کے علاوہ سامان کو اپنے پاس رکھنے کے اعتبار سے بھی میں نا قابل اعتبار ہوں۔

مرحوم لالہ ہیرالال آف گراموفونکمپنی بہت نیک،مخلص اور فیاض شخصیت تھے، اوران کی کمپنی کا ساٹھ ستر روپیہ ماہوار کا اشتہار''ریاست'' میں شائع ہوا کرتا تھا۔اس کے علاوہ جب کبھی ضرورت ہوتی،تو میں ان سے سو دوسو روپیہ بطور ایڈوانس لے لیا کرتا۔ایک بار گورنمنٹ نے''ریاست'' سے ایک ہزار روپیہ کی ضمانت طلب کی،اور ضمانت کے داخل کرنے کے لئے دس روز کی مہلت تھی۔اس حکم کے وصول ہونے پر راقم الحروف لالہ ہیرالال جی کے پاس گیا،اوربتایا،کہ ایک ہزار روپیہ کی ضمانت طلب کی گئی ہے،اورمیرے پاس ایک پیسہ موجودنہیں۔لالہ ہیرالال جی نے پوچھا،کہ روپیہ داخل کرنے کے لئے کتنے دن کی معیاد ہے؟میں نے جواب دیا،دس روز کی تو لالہ جی نے فرمایا:

''تم روپیہ کے لئے دوسری جگہ پر بھی کوشش کرو،اور جتنا روپیہ کم ہو،آخری روز آ

کر مجھ سے لے جانا۔ میں ایک ہزار روپیہ تمہیں ابھی دے دیتا ہوں، مگر تمہارا اعتبار نہیں، تم دوسری جگہ خرچ کردو گے، اور ضمانت کے لئے روپیہ کی پھر دقت ہو گی۔"

چنانچہ کچھ روپیہ تو میں نے دوسری جگہوں سے حاصل کر لیا۔ باقی روپیہ معیاد کے آخری روز لالہ جی سے لیا، اور ضمانت سرکاری خزانہ میں داخل کر دی۔ یعنی لالہ جی کے دل میں راقم الحروف کے لئے عزت اور قدر تھی، مگر روپیہ پیسہ کے معاملہ میں وہ بھی مجھے نا قابل اعتبار ہی سمجھتے تھے۔

روپیہ پیسہ کے معاملے میں میری زندگی کے بہت سے دلچسپ واقعات ہیں، مگر ابھی حال کا واقعہ تو شاید میرے لئے تمام زندگی بھر نا قابل فراموش ہی رہے گا۔ واقعہ یہ ہے:

صوبہ گجرات میں ایک صاحب سردار حاکم سنگھ ٹرانسپورٹ کے کنٹریکٹر ہیں، اور ان کے پاس کئی بسیں اور ٹرک ہیں۔ یہ رہنے والے تو ضلع انبالہ کے ہیں، مگر کئی برس سے وہاں کاروبار کرتے ہیں۔ سردار حاکم سنگھ ایڈیٹر "ریاست" کے بہتر معترف اور مداح ہیں، اور کئی برس سے یہ کبھی کبھی پانچ سو روپیہ بھیج دیا کرتے ہیں، تا کہ مجھے اخراجات کے اعتبار سے تکلیف نہ ہو۔ اور جب کبھی دہلی آتے، تو اس وقت بھی کچھ روپیہ دے جاتے۔ اس کے علاوہ میں جب بھی کبھی کسی ضرورت مند کے متعلق لکھوں، تو یہ اسے بھی سو پچاس روپیہ بھیج دیا کرتے ہیں۔ میں جب دہلی سے ڈیرہ دون آ گیا، تو میں نے اس پچھلے جولائی کے مہینے میں ان کو لکھا، کہ جہاں میں رہتا ہوں، جگہ بہت پر فضا ہے۔ آپ چند دن کے لئے یہاں آئیے، اور میرے پاس قیام کیجئے۔ میرے زور دینے پر آپ اگست میں یہاں ڈیرہ دون تشریف لائے، اور آپ نے میرے پاس دو ہفتے قیام کیا، کیونکہ گجرات میں گرامی کا زور تھا۔ آپ کو یہاں آئے ہوئے تین چار روز ہوئے تھے، تو آپ نے دریافت کیا، کہ کیا قریب کی کوٹھیوں میں کوئی درمیانہ درجہ کی کوٹھی قابل فروخت ہے، یا کوئی ایسی زمین ہے، کہ جہاں چھوٹی سی کوٹھی بنا لی جائے۔

میں نے سمجھا، کہ یہ پرفضا جگہ انہوں نے پسند کی ہے، اور یہ اپنے لئے کوئی کوٹھی لینا چاہتے ہیں چنانچہ انہوں نے چند کوٹھیاں اور جگہ دیکھیں تو میں نے پوچھا، کہ آپ اپنی کوٹھی کے لئے کتنا روپیہ صرف کرنا چاہتے ہیں؟ اس کے جواب میں آپ نے فرمایا:

''میں اپنے لئے تو کوئی کوٹھی خریدنا نہیں چاہتا، کیونکہ گجرات میں میری اپنی کوٹھی اور جائیداد موجود ہے۔ میں چاہتا ہوں، کہ تم کرایہ کی کوٹھی میں نہ رہو۔ میں تمہارے لئے ایک چھوٹی سی کوٹھی خرید کر تمہیں دینا چاہتا ہوں، جہاں کہ تم ہمیشہ رہو۔''

یہ جواب سن کر میں حیران ہو گیا۔ جب زیادہ بات چیت ہوئی، تو میں نے ان سے کہا، کہ میرے لئے کوٹھی خریدنے کا خیال چھوڑ دیجئے۔ میں نے زندگی میں کوئی جائیداد نہ بنائی، اور نہ بنانا چاہتا ہوں۔ کیونکہ اگر مجھے جائیداد بنانے کا شوق ہوتا، تو میں اس زمانہ دہلی میں ہی جائیداد بنا لیتا، جبکہ مجھے لاکھوں روپیہ سالانہ کی آمدنی تھی۔ آپ اگر کچھ کرنا ہی چاہتے ہیں، تو آپ کتاب ''ناقابل فراموش'' کے ہندی ایڈیشن کے لئے کچھ کریں۔ کیونکہ ہندوستان میں اب اردو ختم ہو چکی ہے، اور اگر یہ کتاب ہندی میں شائع ہو، تو اس کے لئے بہت بڑی گنجائش ہے۔ اس پر آپ نے پوچھا، کہ یہ کتاب کتنی تعداد میں شائع کرنا چاہتے ہو، اور اس کتاب کے کاغذ پر کتنا خرچ آئے گا؟ میں نے جواب دیا، کہ پہلا ایڈیشن تین ہزار کی تعداد میں چھپے گا۔ اس کے لئے تین ٹن یعنی تین سو رم کاغذ صرف ہو گا، تین ٹن کاغذ پر پانچ ہزار روپیہ خرچ آئے گا۔ چنانچہ آپ نے فرمایا:

''میں اس کتاب کے لئے آپ کو پانچ ہزار روپیہ بھیج دوں گا، مگر شرط یہ ہے، کہ یہ روپیہ میں کاغذ تیار کرنے والی ملز کو ڈائریکٹ بھیجوں گا آپ کو نہ دوں گا کیونکہ آپ کو روپیہ پیسہ کے معاملے میں ناقابل اعتبار سمجھتا ہوں، روپیہ تمہارے ہاتھ میں آئے گا، تو تم خرچ کر دو گے۔''

چنانچہ سردار صاحب نے گجرات پہنچنے کے بعد پانچ ہزار روپیہ بھیج دیا ہے، اور یہ

روپیہ شری گوپال پیپر ملز جمنا نگر (ضلع انبالہ) کے نام بذریعہ ڈرافٹ بھیجا ہے، تاکہ میں یہ روپیہ حاصل نہ کرسکوں اس روپیہ کا کاغذ اب دو ہفتہ کے اندر جمنا نگر کی اس ملز سے میرے پاس یہاں پہنچ رہا ہے، اور اس کاغذ کے پہنچنے کے بعد ''نا قابل فراموش'' کے ہندی ایڈیشن کی چھپائی شروع ہوگی، کیونکہ نوسو روپیہ کے مصارف سے ہندی ترجمہ ہو چکا ہے۔

میرے تمام دوست اور عزیز و اقارب مجھ پر فضول خرچی کا الزام لگاتے ہیں، اور روپیہ پیسہ کے معاملہ میں مجھے ناقابل اعتبار قرار دیتے ہیں۔ مگر میں یہ بتادیتا ہوں، اور ایمانداری کے ساتھ سچ کہتا ہوں، کہ اگر میری فطرت میں روپیہ صرف کرنے، اور ضرورت مندوں کو دینے کی سپرٹ موجود نہ ہوتی تو میں اپنی زندگی میں لاکھوں روپیہ پیدا نہ کرتا، اور نہ مجھے کامیابی حاصل ہوتی۔ روپیہ پیسہ کے معاملہ میں اگر میں کمینہ اور کنجوس ہوتا تو نہ تو ''ریاست'' جاری ہوتا اور نہ میں یہاں تک پہنچتا۔ اور یقیناً گمنامی کی حالت میں آج کسی ہسپتال میں بوتلیں صاف کرتا، اور ٹنکچر آیوڈین کی شیشیوں پر لیبل چسپاں کرتا، جیسا کہ میں اپنی آغاز کی زندگی میں تھا میرا ایمان ہے کہ جتنا روپیہ ضرورت مندوں کو بغیر کسی غرض کے دیا جائے، تو اس سے دس، بیس نہیں، پچاس گنا اور زیادہ خدا بھیجتا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

پولیس اور جرائم کا اقرار

یورپ اور امریکہ کی پولیس تو جرائم کا سراغ سائنٹفک طریقوں سے لگاتی ہے، اور شائد ہی کوئی ایسا مقدمہ ہوگا، جس میں ان کو سائنٹفک طریقوں کو اختیار کرتے ہوئے کامیابی نہ ہو۔ چنانچہ مقدمہ میں شیشوں پر لگے ہوئے انگلیوں اور ہاتھوں کے نشانات، پستول اور بندوق میں سے نکلی ہوئی گولی اور نالی کے اندر کے فوٹو، السیشن کتوں کے ذریعے کپڑوں اور خون کی بو، موٹروں کے ٹائروں کے گھسے ہوئے حصہ کے نشان، خطوط پر لگے ہوئے ہاتھوں کی انگلیوں کے مارکس وغیرہ، سینکڑوں طریقے اختیار کئے جاتے ہیں اور چند روز میں ہی ملزم گرفتار ہو جاتے ہیں مگر ہندوستان اور پاکستان میں جرائم کا ثبوت حاصل کرنے کے لئے پولیس کے پاس صرف ایک ہی ذریعہ ہے، جسے ''تھری ڈگری'' یعنی تشدد کہا جاتا ہے۔ اور اس ''تھری ڈگری'' کے طریقہ میں، ناک میں سرخ مرچیں ڈالنا، سردیوں میں برف کی سل پر لٹانا، مارنا پیٹنا، تھیلے میں پاخانہ ڈال کر ملزم کے منہ پر باندھنا، ہتھکڑی لگا کر دن بھر کھڑے رکھنا، برسات کے دنوں میں تنگ کوٹھڑی کے اندر کئی سو کینڈل پاور کا لیمپ بجلی کا جلا کر ملزم کے پاس مچھروں اور پتنگوں کو جمع کرنا، اور کئی روز تک سونے نہ دینا وغیرہ ذریعے شامل ہیں۔ اس ''تھری ڈگری'' طریقے کے سلسلے میں مجھے ایک دلچسپ واقعہ یاد آ گیا، جس کا علم مجھے گوڑ گاؤں میں اس وقت ہوا، جب کہ میں ایک مقدمہ کے سلسلہ میں وہاں گیا۔

یہ واقعہ 1941ء کا ہے۔ اس زمانہ میں انڈین سول سروس کے ایک نوجوان ممبر مسٹر لغاری (یہ صاحب آج کل غالباً ملتان میں کمشنر ہیں، اور ڈیرہ غازی خاں کے ایک بہت بڑے رئیس اور زمیندار خاندان سے تعلق رکھتے ہیں) سیٹلمنٹ کی ٹریننگ لینے کے لئے عارضی طور پر بطور سیٹلمنٹ آفیسر گوڑ گاؤں میں تعینات تھے، اور آپ وہاں معہ اپنی بیوی کے سرکاری ریسٹ ہاؤس میں مقیم تھے مسٹر لغاری اعلیٰ تعلیم یافتہ

ہونے کے علاوہ نوجوان تھے۔ دو برس پہلے تعلیم حاصل کرنے اور انڈین سول سروس میں داخل ہونے کے بعد واپس ہندوستان آئے تھے، اور آپ پولیس کے طریقہ ہائے تفتیش سے قطعی ناواقف تھے۔ سرکاری ریسٹ ہاؤس میں قیام کئے آپ کو دو تین ماہ ہوئے تھے، کہ گرمیوں کے زمانہ میں آپ جب کہ اپنی بیوی کے ہمراہ ریسٹ ہاؤس کی چھت پر سوئے ہوئے تھے، آپ کے کانوں میں ''ہائے مار دیا''

''ہائے میں بیگناہ ہوں۔''

''خدا کے لئے مجھے معاف کر دو''

کی دردناک آواز پہنچی۔ رات کے بارہ ایک بجے کا وقت تھا۔ آپ برداشت نہ کر سکے، اور کپڑے پہن کر پولیس کے تھانہ میں چلے گئے، جہاں سے کہ یہ آوازیں آ رہی تھیں۔ (پولیس تھانہ ریسٹ ہاؤس سے بہت کم فاصلے پر تھا) تھانہ میں پہنچنے کے بعد آپ نے دیکھا، کہ ایک ملزم کو کنسٹبلوں کے ہاتھوں پٹوایا جا رہا ہے، اور جب تشدد کے باعث ملزم کو چوٹ پہنچتی ہے، اور تکلیف ہوتی ہے، تو وہ بے چارا چلاتے ہوئے ہائے مار دیا وغیرہ کہتا ہے اور پولیس کے سب انسپکٹر صاحب جو ضلع گوجرانوالہ کے کھتری ہندو تھے، کرسی پر پاس بیٹھے زدوکوب کی پریکٹس دیکھ رہے تھے، اور ملزم سے مطالبہ کیا جا رہا ہے، کہ وہ اپنے جرم کا اقرار کرے، اور بتائے کہ چوری کا مال کہاں رکھا ہے؟

مسٹر لغاری نے تھانہ پہنچنے کے بعد جب یہ کیفیت دیکھی، تو آپ نے سب انسپکٹر سے مطالبہ کیا، کہ ملزم پر تشدد نہ کیا جائے۔ سب انسپکٹر مسٹر لغاری سے ناواقف تھا، اس نے پوچھا، کہ:

''آپ کون ہیں؟ جو ہمیں نصیحت کر رہے ہیں''

مسٹر لغاری نے جواب دیا:

میں یہاں گوڑگاؤں میں سیٹلمنٹ آفیسر ہوں۔ میرا نام لغاری ہے، اور میں انڈین

سول سروس کا ممبر ہوں۔

یہ سن کر سب انسپکٹر نے اپنے پولیسانہ انداز میں کہا:

"اگر آپ سیٹلمنٹ آفیسر ہوں، تو جا کر جریب سے زمین ناپیے آپ کو پولیس کے معاملات میں مداخلت کرنے کا حق حاصل نہیں۔"

مسٹر لغاری یہ سن کر گوڑ گاؤں کے ڈپٹی کمشنر مسٹر کول (کشمیری پنڈت) کے ہاں پہنچے۔ مسٹر کول بھی انڈین سروس کے ممبر تھے۔ ان سے تمام حالات بیان کیے، تو مسٹر کول کپڑے پہن کر مسٹر لغاری کے ساتھ تھانہ میں پہنچے، اور آپ نے بطور ڈپٹی کمشنر سب انسپکٹر کو حکم دیا، کہ ملزم ان کے حوالے کیا جائے۔ ڈپٹی کمشنر کا یہ حکم سن کر سب انسپکٹر کے ہوش اڑ گئے۔ ملزم کو مسٹر کول کے سپرد کر دیا گیا۔ مسٹر کول ملزم کو اپنے ساتھ اپنی کوٹھی میں لے آئے، اور مسٹر لغاری واپس ریسٹ ہاؤس چلے گئے۔

اگلی صبح ڈپٹی کمشنر کے حکم سے سب انسپکٹر کے خلاف ایک ملزم پر تشدد کرنے کے جرم میں مقدمہ قائم کیا گیا۔ اس زمانہ میں گوڑ گاؤں میں سپرنٹنڈنٹ پولیس ایک انگریز تھے، جن کا نام میں بھول گیا ہوں۔ اس سپرنٹنڈنٹ پولیس نے جب یہ دیکھا، کہ ڈپٹی کمشنر کے حکم سے سب انسپکٹر کا چالان کیا گیا ہے، اور اس کو پوچھا تک نہیں گیا، تو اس انگریز سپرنٹنڈنٹ پولیس نے انسپکٹر جنرل پولیس پنجاب سے یہ شکایت کی کہ ڈپٹی کمشنر نے بغیر اس سے پوچھے یا اسکی اجازت لئے بغیر سب انسپکٹر پر مقدمہ دائر کر دیا ہے، اور یہ پولیس کے کام میں مداخلت ہے۔ انسپکٹر جنرل پولیس نے گورنر سے شکایت کی ادھر اس زمانے کے وزیر اعلی سر سکندر حیات تھے، جو ڈپٹی کمشنر کی حمایت پر ہو گئے۔ نتیجہ یہ ہوا، کہ گوڑ گاؤں میں پولیس اور مجسٹریٹوں کے درمیان "اخلاقی جنگ" شروع ہو گئی۔ مجسٹریٹوں نے پولیس کے چالان کیے ہوئے ملزموں کو چھوٹی چھوٹی باتوں کو سامنے رکھ کر اور شک کا فائدہ دے کر چھوڑنا شروع کر دیا۔ پولیس کے کسی بھی چالان میں کوئی مجسٹریٹ پہلے کی طرح امداد نہ کرتا، اور ایڈمنسٹریشن میں ایک سکتہ سا

پیدا ہو گیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا، کہ سپرنٹنڈنٹ پولیس کو تو سرگودھا تبدیل کر دیا گیا اور سب انسپکٹر پر مقدمہ قائم ہوا۔ چونکہ گوڑ گاؤں کی تمام مجسٹریسی پولیس کے خلاف تھی، سب انسپکٹر نے ہائیکورٹ میں مقدمہ کے کسی دوسرے مقام میں تبدیل کئے جانے کی درخواست دی، جو منظور ہوئی۔ اس کا مقدمہ گوڑ گاؤں سے کرنال تبدیل کر دیا، اور اس مقدمہ میں اسے کرنال کے مجسٹریٹ نے دو برس قید سخت کی سزا دی۔ قید ہونے کے باعث سب انسپکٹر ملازمت سے علیحدہ کر دیئے گئے، اور اب یہ دہلی کلاتھ ملز دہلی میں ملازم ہیں۔

یہ سب انسپکٹر ذاتی طور پر بہت ہی شریف اور تعلیم یافتہ بیان کئے جاتے ہیں ایک اہل الرائے کا قول ہے:

''مجھے ان لوگوں سے ہمدردی ہے، جو بے نقاب ہو گئے۔''

یعنی دنیا میں تمام لوگ ہی گناہ کرتے ہیں، مگر بدنام وہ ہوتے ہیں جن کے گناہ بے نقاب ہو جائیں اسی طرح ہی پولیس ''تھری ڈگری'' یعنی تشدد کا استعمال تو قریب قریب ہر مقدمہ میں کرتی ہے اور تحقیقات کے متعلق سائنٹیفک طریقے رائج نہ ہونے کے باعث اگر یہ تشدد استعمال نہ کرے تو شاید یہ کسی ایک مقدمہ کو بھی کامیابی کے ساتھ ثابت نہیں کر سکتی مگر چونکہ یہ سب انسپکٹر مسٹر لغاری کے ہاتھوں بے نقاب ہوئے نہ صرف ان کا مستقبل تاریک ہو گیا بلکہ یہ سرکاری ملازمت سے بھی محروم ہو گئے۔

پولیس کے تشدد کے سلسلہ میں ایک دوسرا دلچسپ واقعہ بھی سن لیجئے:

کئی برس ہوئے، کالکا کے قریب شملہ سے آنے والی ریل موٹر پر ڈاکہ پڑا رات کے نو بجے کا وقت تھا ڈاکوؤں نے لائن پر ایک بڑا پتھر رکھ کر ریل موٹر کے ڈرائیور کو مجبور کیا، کہ وہ ریل موٹر کھڑی کرے۔ ریل موٹر کے کھڑی ہونے پر ڈاکوؤں نے اس کے یورپین مسافروں کو لوٹا اور ڈرائیور کو پستول کی گولی سے ہلاک کر دیا ریل موٹر کو لوٹ کر جب ڈاکو فرار ہو گئے تو کالکا کے ریلوے سٹیشن سے پولیس اور ریلوے سٹاف

موقع پر پہنچا، اور ریل موٹر کالکا کے ریلوے سٹیشن پر لائی گئی اس واقعہ کو تمام ہندوستان
میں بہت بڑی اہمیت حاصل ہوئی، کیونکہ وائسرائے اور مرکزی گورنمنٹ و پنجاب
گورنمنٹ کے تمام اعلیٰ افسر ریل موٹر کے ذریعہ ہی شملہ سے کالکا آیا کرتے۔ پولیس
کی ایک بہت بڑی جمعیت جس میں کئی سپرنٹنڈنٹ پولیس اور ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس
شامل تھے، اس واقعہ کی تفتیش پر مقرر ہوئے۔ تحقیقات اور مقدمہ کی تفتیش کا سلسلہ کئی ماہ
تک جاری رہا۔ پولیس کی تھیوری یہ تھی، کہ اس ڈاکہ کی تمام ذمہ داری یا تو کمیونسٹوں پر
ہے، یا کانگرسیوں، جو اس زمانہ میں ''انقلاب زندہ باد'' کے نعرے بلند کرتے تھے۔
شملہ، کالکا اور انبالہ کے علاقہ کے قریب قریب تمام سرکردہ کمیونسٹ اور کانگریسی لیڈر
گرفتار کر لئے گئے۔ ان پر بہت تشدد کیا گیا گرفتار ہونے والوں میں شملہ کے ایک
بوڑھے کانگرسی لالہ دیوان چند بھی تھے، جن کو گرفتار کر کے جالندھر لے جایا گیا، جہاں
کہ ان کا کوئی ہمدرد یا واقف نہ تھا۔ اس تشدد کا نتیجہ یہ ہوا، کہ بعض پولیٹکل ورکرز نے
اپنے جرم کا اقرار کر لیا مجسٹریٹوں کے سامنے ان سے اقراری بیان لئے گئے۔ سرکاری
گواہ تیار کر کے ان کو معافی دی گئی ان کے بیانات مجسٹریٹوں سے تصدیق کرا لئے
گئے۔ جب اس مقدمہ کی تکمیل ہو گئی، اقراری ملزموں، سرکاری گواہوں اور چشم دید
گواہوں کو بیانات رٹا دیئے گئے، اور مقدمہ کے عدالت میں جانے میں صرف دو ہفتہ
باقی تھے، کہ بھٹنڈہ کے ایک وکیل شام کو سیر کے لئے شہر کی طرف گئے۔ بھٹنڈہ اور شہر
کے درمیان ان وکیل صاحب کو ایک ڈاکو ملا، اور اس ڈاکو نے وکیل صاحب کو دھمکی
دے کر اور پستول دکھا کر ان کا جیب خالی کرا لیا۔ ڈاکو وکیل سے جیب خالی کرانے کے
بعد بھٹنڈہ شہر کی طرف چل پڑا اور وکیل صاحب بھی آہستہ آہستہ اس ڈاکو کے پیچھے
چلے آئے، تاکہ معلوم ہو، کہ یہ کہاں رہتا ہے۔ ڈاکو بھٹنڈہ کی ایک سرائے کے ایک
کوارٹر میں داخل ہوا، تو وکیل صاحب فوراً تھانہ پہنچے۔ پولیس کے افسروں کو تمام واقعہ
بیان کیا اور بتایا کہ ڈاکو فلاں کوارٹر میں داخل ہوا ہے۔ پولیس کے افسروں نے جب یہ

سنا،تو یہ اپنی بندوقیں لے کر اس سرائے کے کوارٹر میں پہنچے۔ دروازہ کھٹکھٹایا گیا،تو اندر سے آواز آئی:

’’کون ہے؟‘‘

پولیس کے افسروں نے کوئی جواب نہ دیا، اور دروازہ پھر کھٹکھٹایا،تو اندر سے ڈاکو نے دروازہ کے سوراخوں میں دیکھا، کہ دروازہ پر مسلح پولیس کھڑی ہے۔ڈاکو نے یہ دیکھ کر اندر سے اپنی بندوق کے ساتھ فائر کیا۔ اس کے جواب میں باہر سے فائر ہوئے ۔ چند منٹ تک یہ فائرنگ دونوں طرف سے جاری رہی،تو اندر سے ایک عورت نے آواز دی، کہ اندر سے فائر کرنے والا پولیس کی گولی سے ہلاک ہو چکا ہے، اب فائرنگ بند کر دی جائے۔ اس عورت کے یہ کہنے پر فائرنگ بند ہوئی، اور عورت سے دروازہ کھولنے کے لئے کہا گیا۔عورت نے دروازہ کھولا،تو ڈاکو مر چکا تھا، اور کوارٹر میں صرف وہ عورت (ڈاکو کی بیوی) موجود تھی۔ پولیس نے ڈاکو کی لاش پر قبضہ کیا، اور عورت گرفتار ہوئی،تو عورت نے اپنے شوہر کی ڈاکہ زنیوں کے پچھلے تمام واقعات بتاتے ہوئے یہ بھی بتایا کہ اس کے شوہر اور شوہر کے بھائی، یعنی اس کے دیور نے کالکا کے قریب ریل موٹر پر ڈاکہ ڈالا تھا، اور ان دونوں نے اس ڈاکہ میں روپیہ کے علاوہ فلاں فلاں چیز حاصل کی۔ اس کا دیور آج کل اپنے گھر میانوالی میں ہے، کیونکہ یہ میانوالی کے رہنے والے ہیں اس بیان کے بعد پولیس کے افسروں نے سپرنٹنڈنٹ پولیس میانوالی کے ملزم کو گرفتار کرنے اور ملزم کے گھر کی تلاشی لینے کے لئے تار دیا۔ملزم گرفتار ہوا، اور تلاشی میں اس تمام سامان کے علاوہ پولیس کو رولڈ گولڈ کی وہ پنسل بھی ملی، جو ریل موٹر میں سوار ایک یورپین خاتون سے ان ڈاکوؤں نے حاصل کی تھی چنانچہ گرفتاری کے بعد مرنے والے ڈاکو کے ایک بھائی پر قتل اور ڈاکہ کا مقدمہ قائم ہوا ریل موٹر میں جو لوگ سوار تھے، ان کی شہادتیں ہوئیں۔ لوٹے ہوئے سامان کی شناخت کی گئی۔ پنسل والی یورپین خاتون کی بھی شہادت ہوئی، اور ملزم کو

انبالہ جیل میں پھانسی دی گئی۔ اس وقت راقم الحروف انبالہ جیل میں نظر بند تھا، جب کہ اس کو پھانسی ہوئی۔ یہ تمام واقعات راقم الحروف کو خود ملزم نے اور نظر بندی سے رہائی کے بعد ایک پولیس افسر نے بتائے، جو کاکا کے ڈاکہ والے مقدمہ کی تفتیش میں شامل تھا۔ یعنی اس مقدمہ میں ''تھری ڈگری'' یعنی تشدد کی ''برکات'' کے باعث کئی بے گناہ کانگرسی اور کمیونسٹ ورکرز ملزموں کے کٹہرے میں جانے والے تھے، جن کے اقراری بیان تشدد کے ذریعہ پولیس حاصل کر چکی تھی۔ اگر ٹھنڈہ کا واقعہ نہ ہوتا تو نہ معلوم کس کس ورکر کو پھانسی ملتی۔ کون کون سرکاری گواہ کے طور پر عدالت میں پیش ہوتا، اور کون کون مقدمہ کو ثابت کرنے کے لئے عدالت میں حلفیہ بیان دیتا، اور نہیں کہا جا سکتا، کہ اصل حالات ظاہر ہونے کے بعد ان اقراری بیانات کا کیا ہوتا، جو بے گناہوں نے تشدد سے مجبور ہو کر مجسٹریٹوں کے سامنے دیئے تھے، اور اقرار کیا تھا، کہ یہ ڈاکہ انہوں نے ڈالا تھا۔

☆☆☆☆☆

شرنارتھیوں کے ''لیڈر مسٹر رائے''

دو برس کی بات ہے، سبزی منڈی کے گھنٹہ گھر کے باہر بہاولپور کے ایک شرنارتھی مسٹر رائے (ان کے نام کے ساتھ رائے تھا۔ مثلاً جسونت رائے، کلونت رائے یا دلباغ رائے۔ مجھے ان کا پورا نام تو یاد نہیں۔ میں ان کو مسٹر رائے کے نام سے ہی مخاطب کیا کرتا) سبزی فروخت کرتے، اور سبزی کے کاروباری میں ایک دو روپیہ روزانہ پیدا کر لیتے۔ ان کے ہاں کوئی بال بچہ نہ تھا۔ گھر میں صرف ایک بیوی اور یہ خود تھے۔ ان کے دماغ میں کچھ خلل سا پیدا ہو گیا۔ شام کو اپنے کاروبار سے فارغ ہونے، یعنی سبزی فروخت کرنے کے بعد یہ لیڈری کے دورہ پر روانہ ہو جاتے۔ اس زمانہ میں پچیس تیس شرنارتھیوں نے پنڈت جواہر لال نہرو کی کوٹھی کے پاس ''ستیہ گرہ'' شروع کر دیا تھا، جسے یہ ''دھرنا'' کہتے۔ اس ''دھرنا'' کی صورت یہ تھی، کہ یہ وزیراعظم کی کوٹھی کے پاس کھلے میدان میں بیٹھے رہتے۔ وہاں ان کے لئے شرنارتھی باری باری کھانا پکا کر بھیج دیتے اور جب پنڈت نہرو اپنی کار میں کوٹھی سے نکلتے تو یہ مردہ باد کے نعرے بلند کر دیتے۔ یہ ''دھرنا'' جب شروع ہوا تو مسٹر رائے نے بھی ٹوکری میں سبزی رکھ کر فروخت کرنا چھوڑ دیا اور ان ''دھرنا'' والوں میں شامل ہو گئے، کیونکہ کھانا وہاں مفت مل جاتا۔ یہ اپنے آپ کو ان دھرنا بازوں کا لیڈر سمجھنے لگ گئے۔ دن رات وہاں ہی رہتے۔ شام کو اپنی بیوی سے مل آتے، اور دوپہر کو کسی وقت روزانہ اخبارات کے دفاتر میں چلے جاتے، تاکہ یہ اخبارات ان کا بیان شائع کریں۔ اور کوئی کوئی روزانہ اردو اخبار ان کے بیان شائع بھی کر دیتا۔ مسٹر رائے کو جب اخبارات کے دفاتر کے چکر کاٹتے بہت روز ہو گئے تو اخبار ''پرتاب'' کے ایک سب ایڈیٹر نے مسٹر رائے سے کہا، کہ شرنارتھیوں اور پنڈت جواہر لال نہرو کے درمیان جو اختلاف ہے اسے اخبار ''ریاست'' کا ایڈیٹر دیوان سنگھ ختم کر سکتا ہے (کیونکہ اخبارات والوں میں سے اکثر کو یہ علم تھا کہ دفتر ''ریاست'' میں کوئی نہ کوئی پاگل آتا رہتا ہے، اور وہاں ان کے ساتھ''

اخلاص ومحبت'' کا سلوک ہوتا ہے) مسٹر رائے نے دفتر ''ریاست'' کا ان سے پتہ پوچھا، اور اگلے روز یہ دفتر ''ریاست'' میں تشریف لائے۔

پچھلے کئی برس سے ہر زمانہ میں کوئی نہ کوئی پاگل ضرور ایڈیٹر ریاست پر کرم فرمارہا۔ اور شام کے وقت بطور تفریح کے ان حضرات سے بات چیت ہوا کرتی۔ کیونکہ تمام دم مصروف رہنے کے بعد اگر شام کو نصف گھنٹہ کے ریب کسی پاگل سے بات چیت کر لی جائے، تو اس تفریح سے تمام تکان رفع ہو جاتی ہے۔ اس بات چیت میں انسان بعض اوقات اس قدر قہقہے لگانے پر مجبور ہو جاتا ہے، کہ یہ کیف لطائف کی بہترین کتابیں پڑھنے پر بھی نصیب نہیں ہوسکتا۔ مسٹر رائے جب تشریف لائے، اور ان سے بات چیت ہوئی، تو معلوم ہوا کہ آپ بھی ''کام'' کے آدمی ہیں۔ ان کا تشریف لانا خدائی رحمت ہے، اور اب ایک دو برس اچھے گذر جائیں گے۔ مسٹر رائے نے بتایا، کہ آپ ''دھرنا'' مارنے والے شرنارتھیوں کے ''لیڈر'' ہیں اور اخبار ''پرتاب'' کے دفتر سے آپ کو معلوم ہوا کہ ایڈیٹر ریاست اور پنڈت نہرو کے گہرے دوستانہ تعلقات ہیں۔ ایڈیٹر ریاست اپنے اثرات استعمال کرتے ہوئے شرنارتھیوں کا مسئلہ حل کرا سکتا ہے، اور آپ اس غرض کے لئے تشریف لائے ہیں۔ اس بات چیت سے راقم الحروف سمجھ گیا، کہ یہ حضرت بھی دماغی اعتبار سے ''روحانی'' بزرگ ہیں میں نے پوچھا کہ آپ لوگوں کے مطالبات کیا ہیں؟ تو آپ نے فرمایا کہ چونکہ ملک میں غذا کی کمی ہے، اور شرنارتھی ابھی پورے طور سے بسائے نہیں جا سکے، اور غذا کے مسئلہ کا حل اور شرنارتھیوں کا بسانا پنڈت نہرو کے بس میں نہیں، اس لئے خوراک اور عمارات (مسٹر رائے سنٹرل پی ڈبلیو ڈی کے محکمہ کو عمارات کا محکمہ فرمایا کرتے) کی وزارت ان کے حوالہ کر دی جائے، تاکہ ملک میں غذا کافی مل سکے، اور تمام شرنارتھی بسا دیئے جائیں۔ مسٹر رائے اس روز ایک گھنٹہ کے قریب بات چیت کرتے رہے، اور آپ نے کھانا بھی ہمارے ساتھ ہی کھایا۔ جب یہ جانے لگے، تو ان کو ایک روپیہ بس کے کرایہ کے نام پر دے دیا گیا،

کیونکہ میں نے محسوس کیا، کہ یہ بے چارے تنگدست ہیں، اور اپنے دھرنا کیمپ میں تین میل پیدل سفر کرتے ہوئے جائیں گے۔ ان سے کہہ دیا گیا؟ کہ آپ پانچ سات روز کے بعد آئیں، تاکہ اس عرصہ میں پنڈت نہرو سے بات کرلی جائے۔

ایک ہفتہ کے بعد مسٹر رائے پھر تشریف لائے، اور آپ نے پوچھا، کہ پنڈت نہرو سے بات چیت ہوئی؟ تو راقم الحروف نے بتایا کہ پنڈت جی سے ٹیلی فون پر نصف گھنٹہ کے قریب بات چیت ہوتی رہی، اور پنڈت جی نے فرمایا ہے کہ وہ دوسرے شرنارتھیوں کی تو پرواہ کرنے کے لئے تیار نہیں، مگر وہ چاہتے ہیں کہ مسٹر رائے دھرنا والے شرنارتھیوں سے الگ ہو جائیں، اور اس کے معاوضہ میں مسٹر رائے کو پچاس ہزار روپیہ نقد اور رہائش کے لئے کرزن روڈ پر ایک شاندار کوٹھی دے دی جائے گی، اور اس کے ساتھ ہی راقم الحروف نے مسٹر رائے سے کہہ دیا، کہ اس پچاس ہزار روپیہ میں سے پچیس فیصدی ساڑھے بارہ ہزار بطور کمیشن کے میرا حصہ ہوگا، کیونکہ مجھے بھی روپیہ کی سخت ضرورت ہے۔ اس ''آفر'' کو سن کر مسٹر رائے کچھ تو خوش ہوئے، کہ آخر پنڈت نہرو ان کے سامنے جھکنے پر مجبور ہوئے، اور مسکراتے ہوئے آپ نے فرمایا میں نے پنڈت نہرو کو سینکڑوں خطوط لکھے، مگر پنڈت جی نے کسی ایک کا بھی جواب نہ دیا۔ اب پنڈت جی نے محسوس کرلیا ہے، کہ ہندوستان کے تمام شرنارتھی میرے پیچھے ہیں۔ مگر میں پچاس ہزار روپیہ اور کوٹھی لے کر شرنارتھیوں سے غداری نہیں کروں گا۔ میرا مطالبہ صرف ایک ہی ہے، کہ خوراک اور عمارات دونوں کی وزارتیں میرے سپرد کردی جائیں۔ آپ کے اس انکار پر میں نے ان سے کہا، کہ آپ زیادہ لالچ نہ کیجئے۔ فی الحال تو آپ پچاس ہزار روپیہ اور کوٹھی لے لیجئے، تاکہ مجھے بھی ساڑھے بارہ ہزار روپیہ کمیشن مل جائے، وزارتوں کے متعلق بعد میں دیکھا جائے گا۔ میرے اس کہنے پر مسٹر رائے مجھ پر برس پڑے، کہ میں بھی ان کو شرنارتھیوں کے ساتھ غداری کرنے کی تلقین کرتا ہوں۔ اس بات چیت کے بعد میں نے کہا، کہ اچھا اب آپ تشریف لے

جائیے، میں پنڈت جی سے پھر پوچھتا ہوں، کہ وہ دونوں وزارتیں آپ کو دینے کو تیار ہیں یا نہیں؟ میں نے بس کے لئے پھر ان کو ایک روپیہ نذر کر دیا، تا کہ بے چارے اپنے ''وار کیمپ'' میں واپس پیدل نہ جائیں۔

اس بات چیت کے پانچ چھ روز بعد مسٹر رائے پھر شام کو تشریف لائے (کیونکہ ان کو پہلے روز ہی کہہ دیا گیا تھا، کہ وہ شام کو سات بجے کے بعد تشریف لایا کریں، تا کہ دن کو آنے کی صورت میں میرے کام کا حرج نہ ہو) جب یہ تشریف لاتے، تو نیچے سے ہی آواز دے دیا کرتے، تا کہ بغیر اطلاع اوپر آنے کی صورت میں میرے کتے بھونک کر ان کا خیر مقدم نہ کریں۔ انہوں نے آواز دی، تو میں نے اوپر تشریف لانے کے لئے کہا۔ پہلے دو تین بار تو ان کے آنے پر کتوں نے بھونک کر ان کا استقبال کیا تھا مگر اس بار جب یہ اوپر آئے تو کتوں نے اپنی دمیں ہلا کر ان کا خیر مقدم کیا۔ کیونکہ یہ کتے سمجھ گئے کہ یہ ہمیشہ کے آنے والے دوستوں میں سے ہیں، یہ غیر نہیں ہیں۔ جب کتے دم ہلاتے ہوئے ان کے پاس گئے، تو میں نے کہا، کہ دیکھئے، کہ یہ کمبخت بھی اب سمجھتے ہیں کہ آپ ہمارے نیتا اور لیڈر ہیں۔ یہ سن کر مسٹر رائے مسکرا دیئے، اور آپ نے پوچھا، کہ کیا پنڈت جی سے مزید کوئی بات چیت ہوئی؟ میں نے جواب دیا، کہ پنڈت نہرو بہت مصروف تھے، اور غیر ممالک کے مہمانوں کے باعث ان کو فرصت نہ تھی۔ صرف تھوڑی دیر ٹیلی فون پر بات چیت ہوئی۔ میں نے پنڈت جی کو بہت سمجھایا، کہ وہ خوراک اور عمارات کے دونوں محکمے آپ کے سپرد کر دیں، مگر پنڈت جی نہیں مانتے اور وہ محسوس کرتے ہیں کہ ایسا کرنا ان کا بے اختیار ہونا ہے۔ اور پنڈت جی نے کہا ہے کہ اگر مسٹر رائے خود پچاس ہزار روپیہ اور اپنی رہائش کے لئے کوٹھی لینا شرنارتھیوں سے غداری سمجھتے ہیں، تو پھر صورت یہ ہے، کہ تمام کا تمام کناٹ پیلس شرنارتھیوں کو دے دیا جائے۔ اور کناٹ پیلس کے موجودہ دکانداروں اور دفاتر سے کہا جائے گا کہ وہ شرنارتھیوں کے کوارٹروں میں چلے جائیں، کیونکہ یہ لوگ تیس

چالیس برس سے کناٹ پیلس میں رہ چکے ہیں۔ سوشلزم کے اصول کے مطابق اب ان کو شرنارتھیوں کے کوارٹروں میں چلے جانا چاہئے، تاکہ کناٹ پیلس میں شرنارتھی بسا دیئے جائیں۔ پنڈت جی کی اس آفر کو سن کر مسٹر رائے مسرت اور غرور کے ساتھ مسکرا دیئے، اور آپ نے فرمایا، کہ میں کسی قیمت پر بھی سوائے خوراک اور عمارتوں کی وزارتوں کے صلح نہیں کرسکتا۔ اگر پنڈت جی شرنارتھیوں کو مطمئن کرنا چاہتے ہیں، تو اس کی صورت صرف ایک ہی ہے، کہ یہ دونوں وزارتیں میرے حوالہ کردیں، تاکہ میں ملک کے خوراک اور بسانے کے مسائل حل کردوں۔ مسٹر رائے کے اس جواب پر میں نے ان سے بار بار درخواست کی، کہ آپ پنڈت جی کی یہ "آفر" قبول کرلیں، اور اس کے ساتھ پاس بیٹھے ہوئے دوستوں سے بھی کہا، کہ وہ مسٹر رائے کو پنڈت جی کی اس آفر کے قبول کرنے پر آمادہ کریں، اور تمام دوستوں نے بھی مسٹر رائے سے کہا کہ وہ پنڈت جی کی کناٹ پیلس والی آفر کو منظور کرلیں۔ مگر مسٹر رائے نہیں مانے اور کھانا کھانے کے بعد یہ کہہ کر واپس چلے گئے کہ میں پنڈت جی کو دونوں وزارتیں یعنی خوراک اور عمارات کے محکمے چھوڑنے پر آمادہ کروں۔

مسٹر رائے ایک ہفتہ کے بعد پھر تشریف لائے۔ وہی قصہ، کہ یہ قبول کرلو، اور ضد نہ کرو، مگر مسٹر رائے سوائے وزارتوں کے آمادہ نہیں ہوئے۔ آخر میں نے کہا، کہ چونکہ میں درمیان پڑا ہوں، میں نہ آپ کی رعایت کرتا ہوں، اور نہ پنڈت جی کی۔ اور بطور ایک غیر جانبدار یہ فیصلہ کرتا ہوں کہ پنڈت جی شرنارتھیوں کو کناٹ پیلس اور کناٹ سرکس کی تمام عمارتوں کے علاوہ چاندنی چوک کا مسجد فتح پوری سے لے کر موتی سینما تک کا ایک طرف کا حصہ دے دیں، اور ایک حصہ یہاں کے دکانداروں کے پاس ہی رہنے دیں۔ یہ دکاندار دہلی کے قدیم باشندے ہیں، ان کو دکانوں سے محروم کرنا مناسب نہیں۔ مسٹر رائے نے میری اس پیشکش کو بھی نامنظور کردیا، اور آپ نے مجھے فرمایا کہ میں بھی پاکستان کا رہنے والا ہوں، شرنارتھی ہو کر شرنارتھیوں کے ساتھ غداری

کر رہا ہوں ۔ میں نے مسٹر رائے کے سامنے ہاتھ باندھ کر ان سے درخواست کی، کہ وہ اس فیصلہ کو قبول کر لیں، مگر مسٹر رائے نہیں مانے، اور غصہ کی حالت میں چلے گئے ۔

دس بارہ روز کے بعد آپ پھر تشریف لائے، اور پھر بات چیت ہوئی تو میں نے کہا کہ پنڈت جی سے مزید کوئی بات چیت نہیں ہو سکی، کیونکہ وہ دہلی سے باہر اور اپنے کام میں بہت مصروف تھے ۔ مسٹر رائے یہ کہہ کر چلے گئے، کہ اگر میں کوشش کروں، تو فیصلہ ہو سکتا ہے، اور میں پنڈت جی کو دونوں وزارتیں مسٹر رائے کے حوالہ کرنے پر آمادہ کر سکتا ہوں ۔

چند روز کے بعد پھر تشریف لائے تو میں غصہ کی حالت میں بیٹھا تھا، اور ملازم کی ایک غلطی پر اسے ڈانٹ رہا تھا ۔ میں نے غصہ کی حالت میں ہی ان سے کہا، پنڈت جی سے بات چیت ہوئی ہے، وہ کہتے ہیں کہ وہ آپ کی کچھ پرواہ کرنے کے لئے تیار نہیں جو کرنا ہے کر لو ۔ یہ سن کر مسٹر رائے بھی غصہ سے مغلوب ہو گئے ۔ اس روز چاند کی چودھویں تاریخ تھی (جوں جوں چاند زیادہ بڑھے، پاگلوں کے پاگل پن میں اضافہ ہوتا جاتا ہے، اور چاند کے کم ہونے کی صورت میں ان کے پاگل پن میں کمی ہو جاتی ہے اس لئے ہی پاگل پن کو انگریزی زبان میں لیونی سی یعنی چاند کی بیماری کہا جاتا ہے) آپ نے غصہ کی حالت میں فرمایا، کہ اچھا اگر یہ صورت ہے، اور پنڈت جی ہمارے مطالبات منظور کرنے کے لئے تیار نہیں تو پھر میں زلزلہ اور سیلاب لا کر دنیا کو تباہ کر دوں گا ۔ آپ کے یہ الفاظ سن کر قریب بیٹھے ہوئے تمام دوست قہقہہ مار کر ہنس پڑے ۔ مگر میں اپنی ہنسی ضبط کرتے ہوئے ہاتھ باندھ کر عرض کیا، رائے صاحب ایسا نہ کیجئے، زلزلہ اور سیلاب کی صورت میں تمام شرنارتھی تباہ اور غرق ہو جائیں گے ۔ مسٹر رائے نے جواب دیا، چونکہ شرنارتھی تکلیف میں ہیں، تمام دنیا کو تباہ ہو جانا چاہئے، اور کوئی پرواہ نہیں، اگر دنیا کے ساتھ شرنارتھی تباہ ہو جائیں ۔ بہت مشکل کے ساتھ مسٹر رائے کے غصہ کو یہ کہہ کر ٹھنڈا کیا گیا، کہ اچھا پنڈت جی سے پھر بات چیت کرتے

ہیں۔ رائے صاحب اپناٹی اے یعنی سفر خرچ کا ایک روپیہ لے کر اور کھانا کھا کر چلے گئے۔

یہ سلسلہ ڈیڑھ دو سال کے قریب جاری رہا۔ آپ پچھلی فروری میں تشریف لائے تو میں پاکستان گیا ہوا تھا۔ وہاں سے واپس آیا تو ڈیرہ دون چلا گیا، معلوم ہوا کہ آپ اب بھی کبھی کبھی میرے مکان پر تشریف لے جاتے ہیں اور جب آپ کو معلوم ہوتا ہے کہ میں ڈیرہ دون میں ہوں تو گلی اور محلّہ والوں سے شکوہ کرتے ہیں کہ میں شرنارتھیوں کا فیصلہ پنڈت نہرو سے کرائے بغیر ڈیرہ دون چلا گیا، اور میں نے شرنارتھیوں کے متعلق اپنا فرض ادا نہ کیا۔

ایم این رائے کی کایا پلٹ

پچھلی نصف صدی میں دنیا میں جن لوگوں کو سیاسی اعتبار سے بہت بڑی بین الاقوامی شہرت نصیب ہوئی، ان میں مرحوم مسٹر ایم۔ این رائے ایک اہم شخصیت تھے۔ آپ امپریلزم کے بہت سخت دشمن اور ورکر کلاس کے کمیونسٹ تھے۔ چنانچہ موجودہ نوجوان حلقہ ابھی پیدا بھی نہ ہوا تھا، کہ آپ ہندوستان سے روس چلے گئے، اور وہاں مشہور انقلاب پسند مسٹر لینن کے ساتھیوں میں شامل ہو گئے۔

مسٹر رائے نے لینن کے ساتھیوں میں شامل ہونے کے بعد درجنوں بار دنیا کے مختلف ممالک کا سفر کیا، مگر غلط نام سے اور جعلی پاسپورٹوں اور ویزوں کے ساتھ، آپ ہندوستان میں جب 1930ء میں گرفتار ہوئے، تو اس وقت بھی آپ کے پاس ایک غلط نام کا جعلی پاسپورٹ تھا۔ اور اس موقعہ پر جس ڈرامائی انداز میں آپ کی گرفتاری ہوئی، وہ بہت ہی دلچسپ اور برٹش گورنمنٹ کے جاسوسی کے وسیع ذریعہ کا ثبوت ہے۔ مسٹر رائے تاج محل ہوٹل بمبئی میں مقیم تھے۔ آپ اگلے روز جہاز کے ذریعہ انگلستان جانے والے تھے۔ آپ کی سیٹ اس جہاز میں ریزرو ہو چکی تھی، کہ علی الصبح چار بجے پولیس نے آپ کو تاج محل ہوٹل کے کمرہ سے گرفتار کر لیا۔ مسٹر رائے کی گرفتاری کی اطلاع تمام ہندوستان میں بجلی کی طرح پھیل گئی، کیونکہ آپ پہلی قطار کے انقلاب پسند ہونے اور بین الاقوامی شہرت رکھنے کے باعث ہندوستان کے ہر شخص کے دل میں جگہ رکھتے تھے اس گرفتاری کے دو تین روز بعد راقم الحروف کو خان بہادر مسٹر تصدق حسین ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل انٹیلی بیورو گورنمنٹ ہند سے ایک ٹی پارٹی میں ملنے کا اتفاق ہوا تو راقم الحروف نے خان بہادر سے طنزاً کہا خان بہادر آپ نے مسٹر رائے کو خوب سوتے ہوئے تاج محل ہوٹل میں گرفتار کیا۔ میرے اس طنز کا جواب خان بہادر تصدق حسین نے جو دیا وہ مجھے اب تک یاد ہے۔ آپ نے کہا:

"سردار صاحب! آپ لوگوں کو کیا علم، کہ برٹش گورنمنٹ کے ذرائع کس قدر وسیع

ہیں مسٹر ایم این رائے جب غلط نام کے پاسپورٹ کے ساتھ یورپ کے ایک دوسرے ملک سے انگلستان پہنچے تو ہمیں علم تھا، کہ وہ لندن میں ہیں۔ ان کی انگلستان سے روانگی کا ہمیں علم تھا ان کے ہندوستان پہنچنے پر ہم نے اپنے بھروسہ کے افسران ان کے پیچھے لگا دیئے۔ ہم ان کی نگرانی کرتے رہے، اور دیکھتے رہے، کہ یہ ہندوستان میں کس کس شہر میں جاتے ہیں، اور کس کس سے ملتے ہیں، تا کہ ہمیں معلوم ہو جائے، کہ ان سے کس کس کا تعلق ہے، اور کون کون ہندوستان میں کمیونزم کا ستون ہے؟ اور ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں پھرنے کے بعد جب واپس انگلستان جانے والے تھے، تو ہم نے ان کو گرفتار کر لیا۔ اس سے پہلے ان کو گرفتار نہ کرنے کی وجہ صرف یہ تھی، کہ ہم معلوم کرنا چاہتے تھے کہ ہندوستان میں کس کس کا ان کے اور روس کی کمیونسٹ پارٹی کے ساتھ تعلق ہے۔''

خان بہادر تصدق حسین بہت بلند لوگوں میں سے تھے۔ بے حد دیانتدار، بہت لائق اور غیر معمولی شریف وضعدار، اور بہت ہی دوست نواز۔ ان کی ہر دلعزیزی کا اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے، کہ ان کے ذاتی دوستوں میں مولانا محمد علی اور ڈاکٹر انصاری جیسے درجنوں آل انڈیا لیڈر بھی تھے میں نے جب آپ سے مسٹر رائے کے اس سے پہلے گرفتار نہ کئے جانے کی وجہ سنی، تو میں حیران رہ گیا۔ چنانچہ اس وقت ہی آپ نے باتوں باتوں میں مسٹر رائے کے متعلق ایک اور دلچسپ واقعہ بتایا، کہ مسٹر رائے جاپان میں کمیونزم کا جال پھیلانے کے لئے گئے۔ وہاں کئی ماہ رہے، اور آپ کے پاس دوسرے نام کا پاسپورٹ تھا۔ آپ ٹوکیو سے سنگاپور گئے تو اسی غلط اور جعلی پاسپورٹ کے ساتھ۔ برٹش گورنمنٹ کے ذریعہ ان کی نگرانی کی جا رہی تھی۔ سنگاپور پہنچے تو وہاں آپ کی نگرانی کے لئے ایک برٹش پولیس افسر موجود تھا۔ سنگاپور پہنچنے پر یہ سمجھتے تھے کہ برٹش گورنمنٹ یا گورنمنٹ آف انڈیا کو ان کے متعلق کچھ علم نہیں، اور یہ برطانوی حکام کو الو بنا کر پوشیدہ طور پر غلط نام کے پاسپورٹ کے ساتھ سفر کر رہے

ہیں۔ مگر ان کی آنکھیں کھل گئیں، جب سنگاپور میں ایک برٹش پولیس آفیسر نے ان سے مسکراتے ہوئے کہا "مسٹر رائے گڈ مارننگ" اس گڈ مارننگ سے ان کو معلوم ہو گیا، کہ برٹش پولیس اتنی بے وقوف نہیں جتنا کہ مسٹر رائے سمجھتے ہیں۔

مسٹر رائے کی گرفتاری کے بعد پولیس کے لئے ایک بہت مشکل پیدا ہوئی، کہ جب پولیس آپ پر مقدمہ چلانے والی تھی، تو پولیس کو کوئی ایسا گواہ نہ ملتا تھا، جو عدالت میں یہ کہے کہ یہی مسٹر ایم این رائے ہیں۔ یعنی جو آپ کی شناخت کی تصدیق کرے۔ کیونکہ آپ کو ہندوستان سے روس گئے ایک طویل زمانہ ہو چکا تھا۔ آپ کو جاننے والے تو انڈر گراؤنڈ تھے، اور یا مر چکے تھے۔ چنانچہ آپ پر مقدمہ چلا تو آپ آخری وقت تک یہی کہتے رہے کہ آپ ایم این رائے نہیں، اور آپ کو غلط طور پر گرفتار کیا گیا ہے۔ اور پبلک کے ایک حصہ کا بھی یہی خیال تھا، کہ گرفتاری کسی دوسرے شخص کی ہوئی ہے، اور مسٹر رائے پولیس کے ہاتھوں میں نہیں آ سکے۔ چنانچہ آپ کے اس مقدمہ میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ایک پروفیسر نے (جو مسٹر رائے کا دیرینہ دوست تھا) عدالت میں شہادت دیتے ہوئے یہ تصدیق کی کہ یہی مسٹر ایم این رائے ہیں اس مقدمہ میں مسٹر رائے کو چھ برس قید سخت کی سزا ہوئی۔

مسٹر ایم این رائے جیل میں قید تھے، کہ ڈرامائی انداز میں آپ کو رہا کر دیا گیا۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ سیاسی خیالات کے اعتبار سے آپ کی کایا پلٹ ہوئی۔ یعنی آپ نے کمیونزم کا لباس اتار دیا، اور برٹش گورنمنٹ کو یقین دلایا، کہ آپ اب کمیونزم کے بہت بڑے مخالف ہیں، اور آپ آئندہ اپنی زندگی کمیونزم کی مخالفت کرتے بسر کریں گے رہائی کے بعد آپ نے ڈیرہ دون میں مستقل طور پر سکونت اختیار کی اور دہلی سے آپ نے کمیونزم کی مخالفت کے لئے ایک ہفتہ وار اخبار جاری کیا۔ کشمیر کے پنڈت پریم ناتھ بزاز اور مسٹر رام سنگھ وغیرہ کئی اصحاب آپ کے ساتھ شامل ہو گئے۔ اس اخبار اور اینٹی کمیونزم پراپیگنڈہ پر پانی کی طرح روپیہ صرف ہونا شروع ہوا لوگ حیران

تھے کہ یہ روپیہ کہاں سے آیا؟ چنانچہ کانگرس کے لیڈروں کو جب اصل حالات کا علم ہوا، تو انہوں نے مرکزی اسمبلی میں سوالات دریافت کیے جس کے جواب میں انگریز ہوم منسٹر نے اقرار کیا، کہ کمیونزم کی مخالفت اور پراپیگنڈہ کے لئے گورنمنٹ ہند کے خزانہ سے مسٹر رائے کو ایک لاکھ روپیہ دیا گیا ہے۔ مسٹر رائے کا ہندوستان کی برٹش گورنمنٹ سے ایک لاکھ روپیہ وصول کرنا ہندوستان کے سیاسی حلقوں کی آنکھیں کھولنے کا باعث ثابت ہوا، اور آپ کے لئے لوگوں میں نفرت وحقارت کے جذبات پیدا ہو گئے۔ کیونکہ جو شخص اپنے معیار پر قائم نہ رہے، اور ان کو اس وقت ثابت ہو، وہ اپنے وقار کی اپنے ہاتھوں مٹی پلید کرتا ہے، چاہے یہ کتنی بھی بڑی شخصیت کا مالک کیوں نہ ہو۔ حضرت مسیح نے کہا ہے " کامیابی ان کے ہاتھوں میں ہوگی، جو آخری وقت تک میدان میں قائم رہیں گے۔"

مسٹر ایم این رائے نے کمیونزم کے دشمن اور برٹش کے پراپیگنڈاسٹ ہونے کے بعد اپنی بیوی کے ساتھ ڈیرہ دون میں مستقل رہائش اختیار کی چند برس ہوئے مسٹر رائے کا ڈیرہ دون میں انتقال ہوا، اور اب چند ماہ ہوئے، آپ کی بیوی بھی قتل کی گئیں۔

مسٹر رائے کے کوئی اولاد نہ تھی، اور آپ کی آخری زندگی پبلک ورکرز کے لئے عبرت کا باعث ہونی چاہئے کیونکہ ڈیرہ دون کی شاندار کوٹھی میں رہنے کے مقابلہ پر اگر آپ فاقہ کرتے ہوئے مرتے تو زیادہ اچھا تھا، تاکہ آئندہ تاریخ میں آپ کو اچھے الفاظ کے ساتھ یاد کیا جاتا۔

☆☆☆☆☆☆☆

کامیاب اور ناکام زندگی

یہ مسئلہ ہر شخص کے لئے قابل غور ہونا چاہئے، کہ آیا اس کی زندگی کامیاب ہے، یا ناکام اور اگر کامیاب ہے، تو اس کے حق میں کیا دلائل ہیں، اور اگر ناکام ہے، تو اسے ناکام کیونکر قرار دیا جاسکتا ہے؟ چنانچہ بہت برس ہوئے، جب خواجہ حسن نظامی مرحوم نے دہلی سے روزنامہ اخبار ''رعیت'' جاری کیا رعیت کا دفتر ملا واحدی صاحب ایڈیٹر نظام المشائخ کے مکان میں تھا، تو واحدی صاحب نے ایک بار مجھے رات کو بارہ ایک بجے تک دفتر کی میز پر بیٹھے کام کرتے دیکھا اور پوچھا کہ اتنی دیر تک کام کیوں کر رہے ہو؟ تو میں نے کہا تھا کہ زندگی کو کامیاب بنانے کے لئے اس کے بعد واحدی صاحب نے پوچھا کہ زندگی کو کامیاب کس صورت میں کہہ سکتے ہو؟ تو میں نے جواب دیا:

''جب انسان مرے، تو چند لاکھ روپیہ چھوڑے (یعنی اپنی زندگی میں لاکھوں روپیہ پیدا کرے) اور اس کے جنازہ میں چند ہزار لوگ شامل ہوں (یعنی وہ پبلک میں انتہائی مقبول اور ہر دلعزیز ہو)''

کامیاب زندگی کے لئے میرا یہی نظریہ سالہا سال تک قائم رہا۔ مگر اب چند برس سے میرا خیال بدل چکا ہے۔ کیونکہ نظام دکن کی زندگی کو کامیاب قرار نہیں دیا جاسکتا، جس صورت میں کہ اس کے پاس کروڑوں یا شائد اربوں روپیہ نقد اور جواہرات کی صورت میں موجود ہے۔ جس کی اپنی اولاد بھی دشمن ہے، اور جس کو ایک لمحہ کے لئے بھی راحت اور سکون نصیب نہیں۔ اور جہاں تک جنازہ میں شامل ہونے کا سوال ہے، جس صورت میں، کہ ایک کارخانہ دار اور ملوں کے مالک کے مرنے کے بعد اس کے کارخانے کے ہزاروں مزدور جنازہ کے ساتھ چلے جاتے ہیں تو اسے بھی کامیاب زندگی قرار نہیں دیا جاسکتا۔ چنانچہ اگر مجھ سے آج کوئی شخص سوال کرے، کہ کامیاب زندگی کے لئے کیا ضروری ہے؟ تو میں کہہ سکتا ہوں، کہ اس شخص کی زندگی کو کامیاب قرار دیا جاسکتا ہے، جو مقروض حالت میں مرے، اور جس کی موت پر عام پبلک آنسو

بہائے۔ کیونکہ مقروض وہ ہوگا، جس کو روپیہ سے محبت نہ ہوگی، جو فیاض ہوگا، جس کی دولت دوسروں کے کام آئے گی، اور جس کی زندگی (بقول رسول اللہ کی دعا کے) بطور ایک مسکین کے بسر ہوگی۔

اور ذاتی خیالات کو چھوڑ کر میں اب کامیاب یا ناکام زندگی کے متعلق چند واقعات بیان کرتا ہوں، تاکہ ہر شخص خود اس مسئلہ پر غور کرے، کہ اس کی زندگی کامیاب ہے، یا ناکام؟

یہ ایک تاریخی واقعہ ہے، کہ اورنگ زیب کا جب آخری وقت آیا، اور اس کی زندگی کی کوئی امید باقی نہ رہی، تو اس کے وزیر اعظم دوسرے وزراء کے ساتھ اس کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ہاتھ باندھ کر عرض کیا، کہ حضور کا اب آخری وقت قریب ہے۔ اگر حضور کی کوئی ایسی خواہش باقی ہو، جو پوری نہ ہوئی ہو، تو حکم کیجئے کہ وہ خواہش پوری کی جائے، وزراء کی اس درخواست کو سن کر اورنگ زیب نے جواب دیا:

''میرے پاس دولت اور جواہرات کی کوئی کمی نہیں۔ میں تمام ہندوستان کا مالک اور حکمران رہا۔ اولاد موجود ہے، اور کسی قسم کی کوئی کمی نہیں۔ مگر میں اپنی خواہش اپنے ساتھ لئے جا رہا ہوں، جو پوری نہیں ہوئی۔ اور وہ خواہش یہ ہے، کہ مجھے اپنی زندگی میں کام کا ایک شخص بھی ایسا نہ ملا، جیسا کہ میں چاہتا تھا۔''

اورنگ زیب کی اس خواہش کو سن کر وزیر اعظم نے تو جواب یہ دیا، کہ حضور کام کا آدمی تو اسے سمجھتے تھے، جو حضور کی طرح ہی محنتی، دیانتدار، لائق، بلند اور غیر معمولی شخصیت ہوتا۔ اور اگر حضور کو ایسا شخص مل جاتا، تو وہ آپ سے آدھا ہندوستان بھی اپنی ملکیت میں لے لیتا۔ اورنگ زیب کے اس جواب کا مطلب یہ تھا، کہ ہندوستان کا یہ بادشاہ ایک کامیاب ترین حکمران ہوتے ہوئے بھی اپنی زندگی کو کامیاب نہ سمجھتا تھا اور مرتے ہوئے یہ اپنی اس خواہش کو اپنے ساتھ ہی لے گیا، کہ اسے زندگی میں کام کا کوئی ایسا شخص نہ ملا، جیسا کہ وہ چاہتا تھا۔ یعنی اس کے اپنے خیال کے مطابق اس کی زندگی

پورے طور پر کامیاب نہ تھی۔

آج سے ستر اسی برس پہلے سکھوں میں بابا کھیم سنگھ بیدی ایک بہت ہی اہم شخصیت تھے، جنہوں نے اپنی زندگی میں لاکھوں ہندوؤں کو سکھ بنایا۔ ان کے معتقدین کا حلقہ تمام پنجاب کے علاوہ افغانستان تک وسیع تھا، اور برٹش گورنمنٹ کے حلقوں میں بھی آپ کا بہت احترام کیا جاتا۔ ان بابا سر کھیم سنگھ کا جب آخری وقت تھا، اور ان کے معتقدین اور لواحقین نے ان کی پوری نہ ہونے والی کسی خواہش کے متعلق دریافت کیا، تا کہ اس کو پورا کیا جائے تو بابا صاحب نے فرمایا تھا:

''میں صرف ایک خواہش اپنے ساتھ لئے جا رہا ہوں، جو پوری نہیں ہوئی۔ اور وہ خواہش یہ ہے کہ میری موت میدان جنگ میں نہ ہوئی۔ کاش کہ میں میدان جنگ میں لڑتے لڑتے مرتا۔''

یعنی بابا سر کھیم سنگھ جیسا کامیاب ترین اور پنجاب کا محبوب ترین لیڈر بھی میدان جنگ میں مرنے کی صورت میں اپنی زندگی کو کامیاب سمجھتا تھا اور یہ اپنی زندگی کو تب کامیاب قرار دیتے، اگر ان کی موت کا سبب ضعیفی، بڑھاپا یا بیماری نہ ہوتی، اور یہ میدان جنگ میں شہید ہوتے۔

مرحوم مسٹر رفیع احمد قدوائی کا جب انتقال ہوا تو آپ غالباً ستر اسی ہزار روپیہ کے مقروض تھے، اور یہ قرضہ پنجاب نیشنل بینک کا تھا۔ حالانکہ آپ نے اپنی زندگی میں غالباً کروڑوں روپیہ سرمایہ داروں سے لے کر ضرورت مندوں کو دیا، جسے ضرورت مندوں کی امداد کرنے کے اعتبار سے ایک کامیاب ترین زندگی قرار دیا جا سکتا ہے۔ آپ کی ہر دلعزیزی اور مقبولیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ نہ صرف دہلی میں ہزارہا لوگ آپ کی موت کی اطلاع سن کر آنسو بہا رہے تھے، بلکہ دہلی سے لکھنؤ تک کے ریلوے اسٹیشنوں پر بھی لاکھوں لوگ موجود تھے، تا کہ وہ ریلوے کے اس ڈبہ کو ہی دیکھ لیں، جس میں کہ آپ کی میت جا رہی تھی۔ گویا کہ ایک کامیاب زندگی کا اندازہ

مالی حالت سے نہیں لگایا جاسکتا، بلکہ اس کی فیاضی اور دوسروں کے کام آنے سے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی زندگی کا بھی زیادہ حصہ افلاس اور تنگدستی میں بسر ہوا۔ مگر آپ کے انتقال کے بعد آپ کے جنازہ کا جلوس جن لوگوں نے دیکھا ہے، وہ اقرار کریں گے کہ سوائے مہاتما گاندھی کے جنازہ کے دہلی کی آنکھوں نے دوسرے کسی شخص کے جنازہ کا اتنا طویل جلوس نہیں دیکھا۔ آپ کی موت پر ہندوستان کے ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں کے علاوہ غیر ممالک کے لوگوں نے بھی آنسو بہائے اور آئندہ کی تاریخ میں بھی آپ جیسی فاضل ترین شخصیت کا نام سنہری حروف کے ساتھ لکھا جائے گا۔ اس عزت اور شہرت کی موجودگی میں آپ کی مالی پوزیشن سے متعلق یہ واقعہ دلچسپی کے ساتھ سنا جائے گا، کہ جب آپ کا انتقال ہوا، تو آپ کی اقساط کے ذریعے خریدی ہوئی موٹر کی آٹھ قسطیں باقی تھیں، اور آپ کے انتقال کے بعد اقساط ادا نہ ہونے کے باعث موٹر کمپنی اس موٹر کو لے گئی۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری مالی اعتبار سے تنگدست تھے، مگر آپ نے اپنے افلاس کا نہ تو کسی سے اظہار کیا، اور نہ کبھی کسی سے مالی امداد طلب کی۔ مگر آپ کی کامیاب ترین زندگی کا اس سے ہی اندازہ لگایا جا سکتا ہے، کہ آپ کا ملتان میں جب انتقال ہوا، تو ایک لاکھ کے قریب انسان آپ کے جنازہ کے ساتھ آنسو بہا رہے تھے۔ یعنی ایک کامیاب زندگی کے لئے روپیہ کا سوال نہیں بلکہ عزت و احترام کے جذبات کا سوال ہے، جو اس کے لئے لوگوں کے دلوں میں ہونا چاہئے۔

اخبار ''ریاست'' کو جب بند کرنے کا اعلان کیا گیا، تو صحافتی حلقوں میں یہ خبر خلاف توقع تھی کیونکہ اس میں دو صفحات کے قریب ہر ہفتہ عدالتی اشتہار ہوتے، اور اردو کے ہفتہ وار اخبارات کے لئے اسے غنیمت سمجھا جاتا۔ اس کے بند ہونے کی اطلاع سن کر کئی ایک اخبارات کے مالکان نے کوشش کی اور پیغام بھیجا کہ اخبار ان کو دے دیا جائے۔ جس کا مقصد یہ تھا، کہ یہ لوگ اشتہارات سے فائدہ اٹھائیں۔ مگر اس

خیال سے کہ کوئی شخص اخبار کی گزشتہ شہرت اور پوزیشن کا ناجائزہ فائدہ نہ اٹھا سکے، اسے کسی کو بھی دینے سے انکار کر دیا گیا۔ چنانچہ اس سلسلہ کا یہ واقعہ دلچسپ ہے، کہ ایک صاحب (جو اپنا ہفتہ وار اخبار کبھی ایک یا دو سو کی تعداد میں چھاپ لیا کرتے تھے) لالہ شونرائن بھٹنا گر ایڈیٹر ''وطن'' کے پاس گئے اور آپ نے ریاست کے بند ہونے کے مسئلہ پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا:

''بھٹنا گر صاحب! دیوان سنگھ کی عقل پر پتھر پڑ گئے اخبار ریاست اس قدر کامیاب تھا، کہ اس میں دو صفحات کے ہر ہفتہ عدالتی اشتہارات ہوتے ہیں۔ حالانکہ ہم لوگ ایک ایک اشتہار کے لئے عدالتوں میں جاتے، اور ریڈروں اور سب ججوں کی خوشامد کرتے ہیں۔ یہ سب پچھلے جنم کے برے کرموں کا نتیجہ ہے کہ دیوان سنگھ کی عقل پر پتھر پڑ گئے نہ تو یہ خود اخبار چلاتا ہے، اور نہ کسی دوسرے کو دیتا ہے، کہ وہ عدالتی اشتہارات سے فائدہ اٹھا سکے۔''

گویا کہ اس جرنلسٹ کے خیال میں زندگی کی کامیابی صرف اسی میں ہے، کہ عدالتی اشتہارات کے لئے اخبار کو جاری رکھا جائے، اور ان اشتہارات کے ذریعہ اپنے بال بچوں کا پیٹ بھرا جائے، اور اخبار کا پبلک مفاد یا پبلک خدمت سے کوئی تعلق نہ ہو۔

مرکزی اسمبلی کے ایک سکھ ممبر بہت برس ہوئے، دوسرے تیسرے روز دفتر ''ریاست'' میں تشریف لایا کرتے، کیونکہ ان کے ساتھ کئی برس کے تعلقات تھے۔ ایک روز آپ نے خواہش ظاہر کی، کہ میں پنجاب کی ایک چھوٹی سکھ ریاست کے سکھ وزیر پر زور دے کر اس ریاست کے راجہ کی بہن کا رشتہ ان ممبر اسمبلی کے صاحبزادہ سے کرا دوں۔ میں نے ان کی اس خواہش کا اظہار سنا تو میں نے ان سے راز میں کہا، کہ لڑکی کا چال چلن اچھا نہیں، کیونکہ کچھ عرصہ ہوا، لڑکی اپنے اتالیق کے ساتھ بھاگ گئی تھی، اور چار روز کے بعد لڑکی کے بھائی اس کو بہت مشکل کے ساتھ واپس لائے۔ اس لڑکی

کے یہ حالات ہیں، انہوں نے مجھ سے جب سنا تو کچھ حیران سے ہوئے، اور خاموشی کی حالت میں چلے گئے۔ تین روز کے بعد پھر تشریف لائے ،تو آپ نے فرمایا:

”دیوان سنگھ جی! میں نے سوچا ہے، اور سوچنے کے بعد فیصلہ کیا ہے، کہ کوئی حرج نہیں، اگر یہ رشتہ ہو جائے۔ کیونکہ رشتہ ہونے کی صورت میں ہماری رشتہ داری ایک راجہ کے خاندان میں ہوگی، اور خاندان کی پوزیشن بلند ہوگی۔ آپ کوشش کرکے اور اس ریاست کے وزیر پر زور دے کر رشتہ کرا ہی دیجئے۔“

گویا کہ سردار جی اس میں ہی اپنی زندگی کامیاب سمجھتے تھے، اگر ان کے لڑکے کی شادی ایک راجہ کی بہن سے ہو جاتی۔ چاہے اس راہ میں ان کو اپنی خودداری سے محروم ہوکر واقف کار حلقوں میں ذلیل ہی ہونا پڑتا۔

راقم الحروف کے ایک دوست اردو کا ماہوار رسالہ شائع کرتے ہیں۔ یہ رسالہ دوسو سے زیادہ نہیں چھپتا، کیونکہ معیار اعتبار سے یہ بہت ہی دلچسپ اور غیر دلچسپ ہے۔ ایک روز یہ دوست تشریف لائے اور رسالہ میں مسلسل نقصان کا رونا روتے ہوئے آپ نے پبلک کی ناقدرشناسی کی شکایت کی، اور رائے طلب کی، کہ کیا کرنا چاہئے۔ راقم الحروف نے جواب دیا، کہ رسالہ اگر نقصان میں چل رہا ہے، تو اس کو بند کر دیجئے۔ میری یہ رائے سن کر آپ خاموش ہو گئے، اور تھوڑی دیر چپ رہنے اور سوچنے کے بعد آپ نے فرمایا:

”رسالہ کے بند کرنے کا مطلب تو یہ ہوگا، کہ ہم زندہ ہی مر گئے۔ کیونکہ بند کرنے کے بعد نہ تو کوئی ہمیں دعوتی کارڈ بھیجے گا۔ نہ کسی پارٹی میں مدعو کئے جائیں گے نہ کبھی کوئی سینما کا پاس مل سکے گا، اور نہ ہی کسی بڑے لیڈر یا افسر سے ملاقات ہو سکے گی۔“

گویا کہ اس دوست کے خیال میں زندگی کی کامیابی اسی میں ہے، کہ یہ چائے پارٹیوں میں مدعو کئے جائیں، لیڈروں اور افسروں سے ہاتھ ملائیں، سینما کے پاس مفت حاصل کریں۔ اور اس اعتبار سے یہ زندہ رہیں اور مر چکے لوگوں میں شمار نہ

ہوں۔

ایک بنیا ایک ہزار روپیہ جمع کرنے کے بعد دو ہزار روپیہ جمع کرنے کی توقع کرتا ہے۔ پھر تین ہزار روپے جمع کرنے کے خواب دیکھتا ہے۔ پھر چار ہزار، دس ہزار، پچاس ہزار، اور ایک لاکھ اور اسے جمع کرنے کے اعتبار سے صبر نہیں آتا، چاہے یہ لاکھوں روپیہ جمع کر لے۔ کیونکہ اس کے خیال میں اس کی زندگی تب ہی کامیاب قرار دی جاسکتی ہے، اگر یہ عمر بھر روپیہ جمع کرتا رہے۔ اس راہ میں چاہے اس کو گناہ بھی کرنے پڑیں۔

سندھ کے مرحوم دیوان دیا رام گدومل اپنی زندگی بھر جو پیدا کرتے، وہ غریبوں پر صرف کرتے رہے، اور آخر ایک لڑکی کی عزت بچانے کے لئے آپ نے اپنی عزت بھی قربان کر دی۔ کیونکہ ان کی زندگی کا مقصد یا کامیابی روپیہ پیدا کرنا، یا لوگوں سے واہ واہ حاصل کرنا نہ تھا، بلکہ خدا کی مخلوق کی خدمت انجام دینا تھا۔ چنانچہ روپیہ پیدا کرنے والے لوگوں اور زندہ باد کے نعرے لگوانے والے لیڈروں کے خیال میں تو ان کی زندگی ایک ناکام ترین زندگی تھی۔ مگر جہاں تک بغیر کسی غرض کے دوسروں کی خدمت انجام دینے کے مشن کا سوال ہے، آپ کی زندگی موجودہ صدی میں غالباً کامیاب ترین زندگی تھی۔

کامیاب اور ناکام زندگی کے مسئلہ پر ہر شخص کو خود ہی غور کرنا چاہئے، اور غور کرنے کے بعد اس کو فیصلہ کرنا ہوگا، کہ کامیاب زندگی کسے کہتے ہیں؟ اور اپنی زندگی کو کامیاب بنانے کے لئے اسے کیا کرنا ہے؟ مگر جہاں تک میری رائے کا سوال ہے، میں تو اس شخص کی زندگی کو ہی کامیاب قرار دیتا ہوں، جو دوسروں کے لئے زندہ رہے، اور دوسروں کے لئے مرے۔ گو میں خود اس اعتبار سے ایک ناکام ترین شخصیت ہوں۔ کاش کہ اب تک ناکام رہنے کے بعد میری موت ہی کسی مظلوم کو ظلم سے بچانے کی راہ میں ہو، اور میری اس آخری آرزو کو خدا قبول کرے۔

☆☆☆☆☆

مہارانیوں اور بیگمات کی بیچارگیاں

یہ مسئلہ بہت دلچسپ، بہت دقیق اور مردوں کے لئے بہت ہی غور طلب ہے، کہ عورت کیا چاہتی ہے؟ یعنی شادی کے بعد عورت کیونکر اپنے شوہر کے ساتھ خوشگوار، مطمئن اور پرکیف زندگی بسر کرسکتی ہے۔ کیونکہ اگر تحقیقات کی جائے تو نوے فیصدی عورتیں شادی کے بعد ایک غلامانہ زندگی بسر کرتے ہوئے ذہنی اور قلبی عذاب میں مبتلا ہیں۔ گویہ بے زبان ہونے کے باعث کسی سے بھی اپنی پر عذاب زندگی کا اظہار نہیں کرسکتیں۔ اور راقم الحروف کی خواہش ہے، کہ وہ اس مسئلہ پر تفصیل کے ساتھ بحث کرتے ہوئے ایک کتاب شائع کرے۔ چنانچہ اس مضمون میں مہارانیوں اور بیگمات کی دردناک اور پرعذاب زندگی کے متعلق صرف چند واقعات بیان کئے جاتے ہیں، تاکہ دنیا کو معلوم ہوسکے کہ ان مہارانیوں اور بیگمات کی اصل کیفیت کیا ہے، جن کو دوسری عورتیں قابل رشک سمجھتی ہیں۔

دفتر ''ریاست'' میں ایک صاحب ماسٹر عبدالکریم کئی برس تک سرکولیشن ڈیپارٹمنٹ کے انچارج رہے۔ یہ ماسٹر عبدالکریم بہت ہی شریف، دیانتدار، نیک اور وفا شعار تھے۔ اور وہ دفتر ''ریاست'' یا راقم الحروف کے خلاف کوئی بات نہ سن سکتے تھے۔ ان کے کریکٹر کی بلندی کا صرف ایک ہی واقعہ سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مقدمہ نواب بھوپال بنام ایڈیٹر ''ریاست'' کے سلسلہ میں مقدمہ کے دوران نواب بھوپال کی طرف سے ان کو پانچ ہزار روپیہ رشوت پیش کی گئی، تاکہ یہ ایک جعلی تحریر کے متعلق اسے دیوان سنگھ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تصدیق کردیں، اور عدالت میں بیان دے دیں۔ مگر باوجود اس بات کے کہ صرف چالیس روپیہ ماہوار تنخواہ پاتے تھے (کیونکہ اس زمانہ میں اردو اخبارات کے دفاتر میں تنخواہوں کا معیار ایسا ہی تھا۔ اور جو کلرک آج کسی اخبار میں ایک سو روپیہ ماہوار تنخواہ پارہا ہے، اس کی تنخواہ اس زمانہ میں پچیس تیس روپیہ ماہوار سے زیادہ نہ تھی) آپ نے پانچ ہزار روپیہ کو ٹھکرا دیا۔ اس

پیشکش کو قبول نہ کرنے کے بعد راقم الحروف کو بتا دیا، کہ ان کو کس ذریعہ سے اور کن لوگوں نے رشوت پیش کی کیونکہ اس سے پہلے دفتر ریاست کے کئی ملازم جھوٹی شہادت دینے کے لئے بھوپال سے ہزار ہا روپیہ وصول کر چکے تھے۔

ماسٹر عبدالکریم نے جب بھوپال کا پانچ ہزار روپیہ رشوت قبول کرنے سے انکار کر دیا تو دہلی کے واقف کار حلقوں اور اخبارات میں آپ کے متعلق بہت ہی عزت و احترام کے جذبات پیدا ہو گئے۔ کیونکہ پانچ ہزار روپیہ کی رقم معمولی نہ تھی۔ آپ کی یہ شہرت دہلی کے ایک رئیس خاندان تک پہنچی، جس کے عزیزوں اور رشتہ داروں میں کاٹھیاواڑ کی ایک نوجوان بیگم بھی تھیں۔ اس رئیس خاندان کی ایک خاتون نے کاٹھیاواڑ کی اس بیگم سے ماسٹر عبدالکریم کی سفارش کرتے ہوئے آپ کی وفا شعاری کی سپرٹ کی تعریف کی، اور چاہا کہ یہ بیگم صاحبہ ماسٹر صاحب کو بطور اپنے ایک معتمد کے ملازم رکھیں۔ چنانچہ یہ بیگم صاحبہ جب دہلی آئیں، تو ماسٹر عبدالکریم کو طلب کیا گیا، اور بیگم صاحبہ نے ماسٹر صاحب کو ایک سو روپیہ ماہوار اور کھانے پینے وغیرہ کے تمام اخراجات پر ملازم رہنے کے لئے کہا۔ ماسٹر عبدالکریم اس پیشکش کے بعد ''دفتر ریاست'' میں تشریف لائے اور تمام حالات بیان کئے۔ اور چونکہ ماسٹر عبدالکریم کا کاٹھیاواڑ کی ریاست میں ملازم ہونا ایک سو روپیہ اور دوسرے اخراجات پر ان کے لئے مفید تھا۔ اس لئے ان کو خوشی کے ساتھ اجازت دے دی گئی، کہ وہ بیگم صاحبہ کے ساتھ کاٹھیاواڑ چلے جائیں۔ اور ماسٹر صاحب دہلی سے بیگم صاحبہ کے ساتھ روانہ ہو گئے۔

ماسٹر صاحب کو کاٹھیاواڑ کی ان بیگم صاحبہ کے پاس ملازم ہوئے دو ماہ ہوئے تھے، کہ ایک روز ماسٹر صاحب دفتر ریاست تشریف لائے۔ یہ لباس کے لحاظ سے ایک ریاستی اہلکار معلوم ہوتے تھے۔ سر پر راجپوتوں جیسی رنگین اور نوکدار پگڑی، اعلیٰ درجہ کی گرم سرج کی اچکن، اور اس پر سنہری رنگ کے بٹن، سفید تنگ پاجامہ اور ریشمی جرابوں

کے ساتھ پالش کیا ہوا سیاہ بوٹ۔ ماسٹر صاحب کے رئیسانہ اہلکارانہ ٹھاٹ دیکھ کر طبیعت بہت خوش ہوئی، اور دفتر کا تمام سٹاف آپ سے گرمجوشی کے ساتھ ملا۔ ماسٹر صاحب دوسرے تمام لوگوں سے ملنے کے بعد جب راقم الحروف کے کمرے میں آ کر بیٹھے تو ان کے اور راقم الحروف کے درمیان یہ باتیں ہوئیں:

میں: سنائیے ماسٹر صاحب آپ کی صحت تو اچھی ہے؟

ماسٹر صاحب: آپ کی مہربانی سے بالکل اچھا ہوں۔

میں: کیا کاٹھیاواڑ میں آپ کا دل تو لگ گیا؟

ماسٹر صاحب: جی ہاں! دل تو لگانا ہی پڑتا ہے

میں: آپ کتنے روز کی رخصت پر آئے ہیں؟

ماسٹر صاحب: میں رخصت تو پندرہ روز کی لے کر آیا ہوں، مگر میں اب واپس نہ جاؤں گا۔

میں: کیوں کیا بات ہے، آپ واپس نہ جائیں گے؟ ایک سو روپیہ ماہوار تنخواہ پاتے ہیں، باقی کے تمام اخراجات ریاست ادا کرتی ہے، پھر آپ کیوں نہ جائیں گے؟

ماسٹر صاحب: کچھ ایسے ہی حالات ہیں وہاں کے ایک سو روپیہ ماہوار کے مقابلہ پر آپ کے دفتر کے چالیس روپیہ ماہوار اچھے ہیں۔

میں: آخر بتائیے تو سہی، کہ وہاں کیوں واپس نہ جائیں گے؟

ماسٹر صاحب: بات یہ ہے کہ وہاں نواب صاحب تو خوبصورت لڑکوں میں گھرے رہتے ہیں دن رات شراب پی جاتی ہے دس دس روز تک نواب صاحب زنانہ محلات میں نہیں آتے۔ سوائے شکار کے نواب صاحب کو دوسرا کوئی کام نہیں، اور اس کے علاوہ اور بھی کچھ حالات ہیں۔ میں تو کسی قیمت پر بھی وہاں نہیں جاؤں گا۔

میں: اور کیا حالات ہیں؟

ماسٹر صاحب: مجھے بتاتے ہوئے کچھ شرم سی محسوس ہوتی ہے۔ کیونکہ آپ کا ادب کرتا ہوں اور ایسی کبھی کوئی بات آپ کے سامنے نہیں کہی۔

میں: پھر بھی بتائیے تو سہی، آپ کے وہاں جانے میں اور کیا رکاوٹ ہے؟

ماسٹر صاحب: بات یہ ہے، کہ میں وہاں گیا، تو ایک ماہ کے قریب تو مجھے وہاں کوئی کام نہ تھا۔ صرف صبح و شام بیگم صاحبہ کی خدمت میں حاضر ہو کر سلام کرنا، اور اپنے کوارٹر میں پڑے رہنا۔ اس عرصہ میں نواب صاحب کا صرف ایک روز نیاز حاصل ہوا، کیونکہ میرا کام بیگم صاحبہ کی خدمت ہی تھا۔ ایک ماہ کے بعد ایک روز میں بیگم صاحبہ کی خدمت میں حاضر تھا، اور دستور کے مطابق ہاتھ باندھے کھڑا تھا، تو بیگم صاحبہ نے پان پیش کرنے والی ملازمہ سے کہا، کہ وہ نیچے کی منزل میں چلی جائے۔ اور جب وہ چلی گئی، تو بیگم صاحبہ آئینے کے سامنے کھڑی ہو گئیں، اور آپ نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے فرمایا، کہ ماسٹر صاحب یہ میرے بال کیسے ہیں، خوبصورت معلوم ہوتے ہیں یا نہیں؟ میں نگاہیں نیچی کئے کھڑا تھا۔ کیونکہ ریاستوں میں مودب ہو کر کھڑا ہونا پڑتا ہے۔ میں نے نیچے نگاہ کئے ہی جواب دیا، حضور بہت اچھے ہیں۔ اس سے اگلے روز جب بیگم صاحبہ نئی ساڑھی پہن کر آئینہ کے سامنے کھڑی ہوئیں، تو آپ نے دریافت کیا، کہ یہ ساڑھی خوبصورت ہے؟ میں نے پھر نیچے نگاہ کئے ہی جواب دیا، کہ حضور بہت اچھی ہے۔ اس طرح دریافت کرنے کا سلسلہ کئی روز جاری رہا، کیونکہ بیگم صاحبہ دن میں کئی کئی بار لباس اور زیورات تبدیل کرتیں، اور ہر بار ان کے خوبصورت ہونے کے متعلق دریافت کرتیں۔ میں سمجھ گیا، کہ ان کی نیت کچھ اچھی نہیں۔ ادھر مجھے خوف، کہ اگر نواب صاحب کو علم ہو گیا، کہ بیگم صاحبہ مجھ سے اپنے حسن کی داد چاہتی ہیں، تو نہ معلوم نواب صاحب میرے ساتھ کیا سلوک کریں۔ اس لئے پندرہ روز کی رخصت لے کر آ گیا ہوں، اور اب میں واپس جانا نہیں چاہتا۔

میں: میری رائے میں تو آپ کو ملازمت چھوڑنی نہ چاہیئے۔

ماسٹر صاحب: ریاستوں کی حالت تو آپ جانتے ہیں اگر نواب صاحب نے غلط فہمی کے باعث ہی شراب اور غصہ کی حالت میں مجھے گولی ماردی، تو میرے بیوی بچے کیا کریں گے؟ میں تو کسی قیمت پر بھی اب وہاں جانے کے لئے تیار نہیں، اور نہ جاؤں گا۔ آپ مجھے اپنی پہلی جگہ پر ہی ملازمت دے دیجئے۔

میں نے ماسٹر صاحب کو بہت سمجھایا، کہ وہاں کی ملازمت ترک نہ کریں۔ مگر وہ اس قدر سہمے ہوئے تھے، کہ وہ واپس ریاست میں نہ گئے۔ حالانکہ بیگم صاحبہ نے اپنی دہلی کے رشتہ داروں کی معرفت ان کو واپس آنے کے کئی پیغام بھیجے، اور وہ پھر اخبار ''ریاست'' میں ملازم ہو گئے۔

جو جوان لڑکیاں اس وہم میں مبتلا ہیں، کہ ان کی شادی کسی نواب، رئیس، مہاراجہ، زمیندار یا جاگیر دار سے ہو، اور وہ شادی کے بعد اپنی زندگی بہت پر لطف اور خوشگوار صورت میں بسر کریں گی، غلطی پر ہیں۔ بڑے گھروں کی خواتین اطمینان کی زندگی سے قطعی محروم ہیں۔ کیونکہ ان روساء میں سے شائد ہی کوئی ایسا ہوگا، جس کی ایک سے زیادہ بیویاں یا داشتہ عورتیں نہ ہوں۔ اور ایک عورت کے لئے یہ بہت بڑا ذہنی عذاب ہے، کہ وہ اپنے شوہر کی محبت میں کسی دوسری عورت کو شریک کرے۔ چنانچہ راقم الحروف کی بعض مہارانیوں ار بیگمات سے جو بات چیت ہوئی، ان میں سے چند نے مغموم صورت میں یہ الفاظ کہے:

1 راجپوتانہ کی ایک بڑی ریاست کی ضعیف اور بیوہ مہارانی نے کہا:

''بھائی صاحب! عورتیں جب ہمارے گلے میں ہیروں اور موتیوں کے نیکلس دیکھتی ہیں، تو ان نیلکسوں کو حسرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ ان بیچاریوں کو کیا معلوم کہ ہیروں اور موتیوں کے یہ نیکلس ہمارے لئے سانپ ہیں، جو ہمیں ہر وقت ڈستے رہتے ہیں۔''

2 پنجاب کی ایک مہارانی نے ایک بار بات چیت کے دوران آنکھوں میں آنسو

بھرتے ہوئے کہا:

’’سردار صاحب! میں اگر اپنے مہاراجہ شوہر کے مقابلہ میں کسی جاٹ سے بیاہی جاتی، تو میری زندگی خوشگوار ہوتی۔ سنہری صوفوں پر بیٹھنے اور سپرنگ دار پلنگوں پر سونے سے بدرجہا اچھا ہوتا، میں اپنے جاٹ شوہر کے لئے روٹی پکا کر کھیت میں لے جاتی۔‘‘

3 شملہ کے علاقہ کی ایک رانی نے کہا تھا:

’’سفر کرتے ہوئے جب ٹرین میں کسی ہم سفر کو میرے رانی ہونے کا علم ہوتا ہے، تو وہ مجھے حسرت کی نگاہوں سے دیکھتی ہے۔ اس بیچاری کو کیا علم میں دن رات خون کے آنسو روتی ہوں۔‘‘

4 کاٹھیاواڑ کی ایک بیگم (جن کا پچھلے دنوں کراچی میں انتقال ہوا) مجھ سے اپنے دکھ اور دل کا حال بیان کرنے کے لئے دہلی آئیں، اور گورنمنٹ ہاؤس کے پیچھے پہاڑی پر ان سے بات چیت ہوئی، تو اس بیچاری نے کہا:

’’میری ماں مجھے پیدا نہ کرتی، اور وہ مجھے پیدا کرنے سے پہلے بانجھ ہو جاتی، تو اچھا ہوتا، تاکہ مجھے موجودہ عذاب کی زندگی سے واسطہ نہ پڑتا۔‘‘

5 یو پی کے ایک بہت بڑے تعلقہ دار کی بیوی کا ایک بار خط آیا۔ اس خط میں مظلوم نے لکھا:

’’آپ نوابوں اور مہاراجوں کے مظالم کو بے نقاب کرتے ہیں، کبھی یو پی کے تعلقہ داروں پر بھی توجہ کیجئے، اور ان کی اینٹ سے اینٹ بجا دیجئے جن کی زندگی کا مقصد صرف شراب پینا، طوائفوں کے مجرے دیکھنا، اور کئی کئی داشتائیں رکھنا ہے، اور جن کی بیویاں ناقابل بیان مظالم کا شکار رہیں۔‘‘

6 راجپوتانہ کی ایک مہارانی تیرتھ یاترا کے بہانہ ہردوار گئی۔ اس نے اپنا ایک معتمد دہلی بھیج کر مجھے طلب کیا۔ وہاں کی ایک دھرم شالہ کے اوپر کے کمرہ میں اس سے

بات چیت ہوئی، تو اس معصوم اور مظلوم خاتون نے روتے ہوئے کہا:

''کیا یہ ممکن ہے، کہ میں اب ہردوار سے واپس اپنی ریاست میں نہ جاؤں، اور کوئی شخص مجھے اپنے گھر میں برتن دھونے اور روٹی پکانے پر ملازم رکھ لے، اور میں اپنی آئندہ زندگی وہاں ہی بسر کردوں۔''

راقم الحروف کے پاس کئی درجن مہارانیوں اور بیگمات کے خطوط موجود ہیں، جو ان بیچاریوں نے اپنے شوہروں کے مظالم کے متعلق مجھ پر اعتماد اور بھروسہ کرتے ہوئے لکھے۔ میں ان خطوط کو اعتماد شکنی کے الزام کے خوف سے شائع نہیں کرتا، ورنہ ان کو پڑھنے کے بعد کوئی عورت بھی کسی مہاراجہ، نواب یا رئیس کے ساتھ شادی کرنے پر آمادہ نہ ہو۔ کیونکہ رئیس کی بیوی بننے سے ہزار درجہ بہتر ہے، کہ دوزخ میں زندگی گزار دے۔

☆☆☆☆☆☆☆

سیلف پراپیگنڈہ کی حماقتیں

اخبار ''ریاست'' کے جاری ہونے سے پہلے خواجہ حسن نظامی اور میں دونوں نے مل کر دہلی سے ایک روزانہ اردو اخبار ''رعیت'' جاری کیا، جو چند ماہ سے زیادہ عرصہ تک جاری نہ رکھا جا سکا۔ اس زمانہ کا ایک واقعہ ہے۔ مرحوم خواجہ صاحب کے ساتھ میں ایک روز دہلی کے ریلوے اسٹیشن گیا، کیونکہ ان کے دوست آنے والے تھے۔ ہم جب ریلوے اسٹیشن پہنچے، تو معلوم ہوا، کہ گاڑی ایک گھنٹہ لیٹ ہے۔ ایک گھنٹہ کے لئے پھر واپس گھر جانا غیر مناسب تھا، اور ہم دونوں ریلوے اسٹیشن کے ریفرشمنٹ روم میں چلے گئے، تاکہ وقت گزار سکیں۔ اس ہوٹل کے مالک خواجہ صاحب کے مرید معترف تھے۔ ریفرشمنٹ روم میں باتیں ہو رہی تھیں۔ تو پراپیگنڈہ کا ذکر چل پڑا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے، کہ خواجہ صاحب نے پراپیگنڈہ کے مسئلہ پر تفصیل کے ساتھ بحث کرتے ہوئے فرمایا تھا:

''زمانہ پراپیگنڈہ کا ہے، اور پراپیگنڈہ کے معنی یہ ہیں، کہ قریب بیٹھے لوگوں کو کہنیاں ماری جائیں، اور کہنیاں مارتے ہوئے ان سے یہ کہا جائے، کہ تم مجھے دیکھو۔''

یعنی پراپیگنڈہ کے معنی ہی یہ ہیں، کہ اپنی تعریف کی جائے، اور تعریف کرتے ہوئے لوگوں کو مجبور کیا جائے کہ وہ بھی اس کی تعریف میں شامل ہوں۔

خواجہ حسن نظامی کے یہ الفاظ گو اب میرے ذہن میں محفوظ ہیں، مگر میں کبھی بھی اپنی زندگی میں ان الفاظ سے متفق نہیں ہو سکا۔ کیونکہ میں نے آج تک کبھی بھی ایسا نہ دیکھا، کہ کسی لیڈر یا جرنلسٹ نے اپنے متعلق غلط پراپیگنڈہ کیا ہو اور پبلک اس پراپیگنڈہ سے متاثر ہوئی ہو اس کا ثبوت یہ ہے، کہ اردو زبان میں اپنا ذاتی پراپیگنڈہ کرنے کے اعتبار سے شائد مرحوم خواجہ حسن نظامی کا کوئی شخص بھی مقابلہ نہ کر سکتا تھا، جنہوں نے ہزارہا کی تعداد میں اپنے حق میں کتابیں، پمفلٹ، پوسٹر اور اشتہارات

شائع کیے، مگر پبلک اس لٹریچر سے کبھی بھی متاثر نہ ہوئی، اور لوگوں نے خواجہ صاحب کو وہی کچھ سمجھا، جو کچھ کہ وہ فی الحقیقت تھے۔ یعنی ان کا لٹریچر پڑھنے والوں نے ان کی سیاست اور مذہبیت کا کبھی اقرار نہ کیا، اور ان کی ادبی خدمات کی ان کے دشمنوں نے بھی داد دی، کیونکہ ادبی لحاظ سے وہ افی الواقعہ ایک قابل قدر شخصیت تھے۔ آپ کے مقابلہ میں مہاتما گاندھی نے اپنی تعریف میں کبھی ایک لفظ بھی نہ کہا، مگر آج دنیا کے ہر ملک میں گاندھی ازم کے حق میں نعرے بلند ہو رہے ہیں، اور گاندھی کا نام، پہاڑوں کی تاریک غاروں کے اندر بھی پہنچ گیا ہے۔ میرے اس مثال دینے کا مطلب یہ ہے، کہ غلط پراپیگنڈہ کی بنیادیں قطعی کھوکھلی ہوا کرتی ہیں۔ ان بنیادوں پر اعتماد کرنا حماقت ہے۔ اور اگر ایک انسان دنیا میں اپنے آپ کو اچھا اور نیک کہلوانا چاہتا ہے تو اس کی بہتر صورت صرف یہ ہے کہ وہ خود نیک ہو جائے۔ اس کے نیک اور اچھا ہونے پر دنیا اس کی نیکی کی قائل ہو کر اسے نیک کہنے کے لئے خود مجبور ہو گی۔ ورنہ نیک نہ ہوتے ہوئے ایک شخص کا پراپیگنڈہ کے ذریعے نیک اور اچھا کہلوانے کی کوشش کرنا ایک ایسی حماقت ہے، جس کی معقولیت پسند حلقے داد نہیں دے سکتے، یا دوسرے الفاظ میں نیک کہلوانے کے لئے نیک ہونا چاہئے۔ نیک ہونے کے بعد پبلک خود نیک کو نیک کہے گی۔ نیک نہ ہوتے ہوئے پراپیگنڈہ کے ذریعے نیک کہلوانے کی کوشش کرنا ایک احمقانہ جسارت ہے، جسے اپنے ذہن کو دھوکہ دینا بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ سیلف پراپیگنڈے کے سلسلہ میں دلچسپ واقعات بیان کرتا ہوں، جو میرے خیال کی تائید میں ہیں:

مرحوم لالہ دیش بندھو گپتا دہلی کے لیڈروں میں سے تھے، اور ان کا اخبار ''تیج'' ان کے پراپیگنڈے کے لئے وقف تھا۔ مہاتما گاندھی یا ہندوستان کا دوسرا کوئی لیڈر جب بھی دہلی آتا، تو آپ اس لیڈر کے استقبال کے لئے دہلی کے ریلوے اسٹیشن پر ضرور پہنچتے، اور فوٹو گرافروں سے اس لیڈر کے ساتھ کھڑے ہو کر فوٹو اتراتے

جاتے۔ یہ فوٹو اگلے روز اخبار ''تیج'' کے پہلے صفحہ پر چھپتے، اور ان کے نیچے لکھا جاتا '' لالہ دیش بندھو جی گپتا فلاں لیڈر کا دہلی میں استقبال کر رہے ہیں۔'' مہاتما گاندھی ایک مرتبہ دہلی اسٹیشن پر پہنچے۔ لالہ دیش گپتا نے آپ کا وہاں استقبال کیا۔ فوٹو لئے گئے، اور یہ فوٹو جن میں مہاتما جی کے ساتھ گپتا صاحب بھی کھڑے تھے اخبار تیج میں شائع ہوئے خیر یہ تو معمولی واقعہ تھا چند ماہ کا ذکر ہے، مہاتما گاندھی پھر دہلی پہنچے اس وقت لالہ دیش بندھو گپتا دہلی میں موجود نہ تھے، وہ کلکتہ گئے ہوئے تھے مگر مہاتما جی کے دہلی پہنچنے کے بعد اگلے روز وہی بلاک پھر ''تیج'' میں شائع کیا گیا، جو چند ماہ پہلے شائع ہو چکا تھا، اور جس کے نیچے لکھا تھا:

''مہاتما گاندھی دہلی میں دہلی کے لیڈر لالہ دیش بندھو گپتا مہاتما جی کا ریلوے اسٹیشن پر استقبال کر رہے ہیں۔''

یعنی لالہ دیش بندھو گپتا تو کلکتہ میں ہیں، مگر ان کے مہاتما گاندھی کے استقبال کرنے کا بلاک ''تیج'' میں شائع ہو رہا ہے۔ اس بلاک کے شائع ہونے کے بعد دہلی کی سوشلسٹ پارٹی کے ایک لیڈر اس بلاک کی چھپی ہوئی ''تیج'' کی ایک کاپی لے کر مہاتما گاندھی کے پاس برلا ہاؤس پہنچے، جہاں کہ مہاتما جی مقیم تھے، اور بتایا کہ لالہ دیش بندھو تو کلکتہ میں ہیں، اور وہ استقبال کے لئے ریلوے اسٹیشن پر موجود نہ تھے۔ مگر ان کے اخبار میں چند ماہ پہلے کا فوٹو شائع کیا گیا ہے۔ تاکہ لوگوں کو یہ یقین دلایا جائے، کہ لالہ دیش گپتا دہلی کے بڑے لیڈر ہیں، جو مہاتما گاندھی جی کا استقبال کرتے ہیں۔ مہاتما گاندھی سوشلسٹ پارٹی کے اس لیڈر سے تمام واقعہ سن کر مسکرا دیئے، اور آپ نے جواب میں صرف یہی کہا:

''مجھے ان سب باتوں کا علم ہے، اور میں جانتا ہوں، کہ کیا کچھ ہو رہا ہے، مگر میں اچھے ساتھی اور بے غرض ورکرز کہاں سے لاؤں؟''

دہلی کے سوداگر شیشہ و کراکری، باوا بچتر سنگھ بہت ہی دلچسپ شخصیت ہیں، اور یہ

انسانی کمزوریوں اور صفات کا مجموعہ ہیں۔ آپ میں یہ بہت بڑی صفت موجود ہے کہ آپ راست گو ہیں اور کسی قیمت پر بھی جھوٹ نہیں بول سکتے۔ اور کمزوری یہ ہے کہ آپ اپنا ذاتی پراپیگنڈہ کرنے کے اعتبار سے پاگلوں کی حد تک اپنے دماغی توازن سے محروم ہیں۔ آپ ہر وقت اس کوشش میں رہتے ہیں، کہ بڑے لیڈروں کی ساتھ ان کا فوٹو شائع ہو، چنانچہ بعض پریس فوٹوگرافرز اپنا کیمرہ لئے اس تاک میں رہا کرتے ہیں، کہ باوا صاحب پنڈت جواہر لال نہرو وغیرہ بڑے لیڈروں کے گلے میں ہار وغیرہ ڈالیں، یا ان سے مصافحہ کریں، تو یہ فوراً فوٹو لے لیں، کیونکہ ایسے فوٹو خریدتے وقت باوا صاحب فوٹوگرافروں کی فوٹو کی کافی قیمت ادا کرتے ہیں۔ باوا صاحب کی زندگی کا ایک دلچسپ واقعہ ہے ایک بار دہلی کے گاندھی بھگت مسٹر برج کرشن چاندی والے اور سوشلسٹ میر مشتاق احمد ان کے پاس کسی قومی تحریک کے لئے چندہ لینے گئے، تو باوا صاحب نے اپنی راست گوئی اور صاف دلی کا ثبوت دیتے ہوئے جواب دیا:

”آپ کے پاس لیڈری ہے اور میرے پاس روپیہ اگر مجھے اس اپنی قومی تحریک کے جلسہ کا صدر بناؤ تو میں آپ کا روپیہ دے سکتا ہوں، ورنہ نہیں۔“

مسٹر برج کرشن اور میر صاحب واپس چلے آئے، یہ سودا نہ ہو سکا۔ کیونکہ دونوں حضرات کا تو خیال تھا، کہ باوا صاحب قومی کام سمجھ کر بطور امداد روپیہ دیں گے، مگر باوا صاحب لیڈری خریدنا چاہتے تھے۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ دہلی میں چاہے کسی پارٹی کا کوئی جلسہ ہو اگر اس جلسہ کی صدارت کی کرسی پر باوا صاحب کو بٹھا دیا جائے تو آپ سو دوسو روپیہ بطور امداد دے دیا کرتے ہیں، کیونکہ سو دوسو روپیہ دے کر تمام اخبارات میں آپ کی صدارت کا پراپیگنڈہ ہو جاتا ہے۔ مگر آپ کے اس سیلف پراپیگنڈہ کی فی الحقیقت پوزیشن یہ ہے کہ آپ جدھر سے نکل جائیں لوگ انگلیاں اٹھا کر کہا کرتے ہیں، کہ:

”چاندی کی جوتی والے باوا صاحب جا رہے ہیں۔“

کیونکہ آپ نے ایک بار الیکشن کے زمانہ میں اپنی صاف بیانی اور راست گوئی کا ثبوت دیتے ہوئے اپنی تقریر میں کہا تھا، کہ آپ چاندی کی جوتی، یعنی روپیہ کے زور سے ووٹ حاصل کریں گے۔ میرا یقین ہے، کہ اگر باوا صاحب کو پراپیگنڈہ کا خبط نہ ہوتا، اور جتنا روپیہ آپ نے آج تک پراپیگنڈہ پر خرچ کیا، یہ روپیہ بغیر کسی غرض کے آپ قومی تحریکوں کو دیتے، تو آج پبلک لائف میں آپ یقیناً بلند مقام حاصل کر چکے ہوتے۔

راقم الحروف کے ایک دوست سردار صاحب خطاب یافتہ بھی ہیں، اور ایک ماہوار رسالہ بھی شائع کرتے ہیں، اور فطرت کے اعتبار سے یہ بہت ہی سیدھے اور نیک ہیں۔ آپ نے دیکھا، کہ ایک دوسرے ”رائے بہادر“ خطاب یافتہ کے لڑکے اپنے آپ کو رائے زادہ لکھتے ہیں، تو یہ چونکہ خطاب یافتہ سردار صاحب ہیں یہ کیوں نہ اپنے صاحبزادہ کو کسی خطاب سے سرفراز فرمائیں۔ آپ نے اس مسئلہ پر سوچنے اور غور کرنے کے بعد اپنے رسالہ میں اپنے صاحبزادہ کو ”کنور صاحب“ لکھنا شروع کر دیا۔ حالانکہ ”کنور صاحب“ کا لفظ صرف والیان ریاست کے لڑکوں کے لئے استعمال ہوا کرتا تھا۔ کچھ عرصہ تک آپ کے رسالہ میں آپ کے صاحبزادہ کے نام کے ساتھ ”کنور“ کا خطاب چھپتا رہا، اور جرنلسٹوں کی برادری اس نئی اختراع سے لطف اندوز ہوتی رہی، تو آپ نے محسوس کیا، کہ آپ کا یہ سیلف پراپیگنڈہ ایک حماقت تھی، جس کا الٹا اثر ہو رہا ہے۔ چنانچہ آپ نے اپنے صاحبزادہ کے نام کے ساتھ کنور لکھنا چھوڑ دیا۔

لاہور کے اخبار ”لائل گزٹ“ کے ایڈیٹر مرحوم سردار امر سنگھ ایک کٹر فرقہ پرست شخصیت تھے۔ اور فرقہ پرستی کے علاوہ سکھوں کو برٹش گورنمنٹ کے وفا شعار رہنے کی تلقین کرنا بھی آپ اپنا صحافتی فرض سمجھتے تھے۔ ہندوستان میں جب سیاسی بیداری

پیدا ہوئی، اور برطانیہ کے وفا شعاروں کا پبلک میں زندہ رہنا مشکل ہوگیا، تو آپ نے اپنے اخبار ''لائل گزٹ'' کا نام شیر پنجاب مہاراجہ رنجیت سنگھ کے نام منسوب کرتے ہوئے ''شیر پنجاب'' رکھ دیا، مگر پالیسی وہی فرقہ پرستی اور پرو برٹش زہر کھانڈ میں لپیٹ کر سکھوں کو کھلایا جاتا۔ سردار امر سنگھ کے انتقال کے بعد آپ کے ایک صاحبزادہ اس اخبار ''شیر پنجاب'' کو چلا رہے ہیں یہ صاحبزادہ اپنے والد مرحوم کی برسی کے دن پوسٹر شائع کرتے ہیں جن میں سردار امر سنگھ کو شیر پنجاب اور مجاہد آزادی لکھا جاتا ہے۔ ان پوسٹروں اور برسی کو دیکھ کر وہ لوگ تو مسکرا دیتے ہیں، جو مرحوم سردار امر سنگھ کے حالات اور پالیسی سے واقف تھے، مگر اس برسی کو منانے والے خوش ہیں، کہ وہ اس پراپیگنڈا کے ذریعے اپنے والد کے لئے ان شہداء میں جگہ حاصل کر رہے ہیں جو وطن آزادی کے لئے پھانسی کے تختوں پر چڑھ گئے تھے۔ چنانچہ اس سلسلہ کا یہ واقعہ دلچسپ ہے، کہ اب بعض گورمکھی اخبارات میں آج کل سردار امر سنگھ کی سیاسی اور قومی زندگی کو بے نقاب کرتے ہوئے امر سنگھ کے نام کے ساتھ شیر پنجاب لکھنا شیر پنجاب مہاراجہ رنجیت سنگھ اور سکھ قوم کی توہین قرار دیا جا رہا ہے۔

ہر فلم پروڈیوسر چاہے اس کی فلم اچھی ہو، یا بری فلم کے پراپیگنڈہ پر بہت کافی روپیہ خرچ کرتا ہے، اور اخبارات میں اس فلم کے حق میں لکھوانے اور اشتہارات شائع کرنے کے علاوہ آدم قد پوسٹر بھی دیواروں پر چسپاں کئے جاتے ہیں۔ مگر پبلک جب اس فلم کو دیکھتی ہے اور دیکھنے کے بعد محسوس کرتی ہے کہ فلم اچھی نہیں اور غلط پراپیگنڈہ کیا گیا تو فلم دیکھنے والے نہ صرف پروڈیوسر اور ڈسٹری بیوٹر کو کوستے ہیں بلکہ اخبارات کے ان ایڈیٹروں کو بھی ماں بہن کی گالیاں دیتے ہیں جنہوں نے اس فلم کی غلط تعریف کی تھی، اور توصیفی ریویو کیا تھا۔ پچھلی جنگ کے زمانہ میں جرمنی اور برطانیہ کے حق میں پراپیگنڈہ کرنے والوں نے اپنی تعریف اور دشمنی کی مخالفت میں اتنا زیادہ جھوٹ بولا، جس کو لا انتہا اور لا محدود قرار دیا جاسکتا ہے۔ مگر واقعہ یہ تھا، کہ اس پروپیگنڈے کو سننے

اور پڑھنے والوں میں سے ایک شخص بھی ایسا نہ تھا، جو ان کو سچ سمجھتا ہو، اور پراپیگنڈا کرنے والے کی دروغ بیانیوں کی داد نہ دیتا ہو۔

یہ چند واقعات تو اس بات کی تائید میں ہیں کہ غلط پراپیگنڈے کا پبلک پر کوئی اثر نہیں ہوتا، اور پبلک ہر لیڈر کو ویسا ہی سمجھتی ہے، جیسا کہ وہ فی الحقیقت ہے۔ چاہے پراپیگنڈہ کرنے والا اپنے ذہن کو دھوکہ دیتے ہوئے اس پراپیگنڈا کے نتائج کچھ ہی سمجھے۔ اس کے مقابلہ پر میں صرف ایک مثال دیتا ہوں۔ مولانا حسرت موہانی نے اپنی تمام زندگی میں کبھی ایک لفظ بھی اپنے حق میں نہ کہا، اور نہ کہلوایا، اور یہ درویش صفت لیڈر اپنی تمام عمر فاقہ اور تنگدستی کا شکار ہو کر گمنام رہنے کی کوشش میں رہا۔ یہاں تک کہ آپ پارلیمنٹ کا ممبر ہوتے ہوئے بھی دہلی کی ایک ٹوٹی ہوئی مسجد میں قیام کرتے۔ مگر کیا ہندوستان اور پاکستان میں ایک شخص بھی ایسا ہے، جس کی زبان حسرت موہانی کا نام لیتے ہوئے، چٹخارے نہ لیتی ہو اور جس کا سر اس قلندر کی یاد میں جھک نہ جاتا ہو۔ میرے ان مثالوں کو دینے کا مقصد یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اچھا اور نیک کہلوانا چاہے، تو اسے غلط مقصد کے پراپیگنڈہ پر روپیہ ضائع نہ کرنا چاہے۔ اچھا اور نیک کہلوانے کی صورت صرف یہ ہے کہ انسان خود اچھا اور نیک ہو اس کے اچھا اور نیک ہونے کی صورت میں پبلک خود بخود مجبور ہو گی، کہ وہ اسے اچھا اور نیک قرار دے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

مقدمہ ماسٹر تارا سنگھ بنام دیوان سنگھ

اخبار ''ریاست'' کے جاری ہونے سے کئی برس پہلے میرے اور ماسٹر تارا سنگھ کے درمیان اخلاص کے واقعات تھے، اور میں ان کے روزانہ اخبار ''اکالی'' کو کچھ عرصہ ایڈیٹ بھی کرتا رہا ہوں۔ ماسٹر صاحب باوجود میری مذہبی کمزوریوں کے مجھ پر ہمیشہ کرم فرماتے اور اخبار ''ریاست'' کے جاری ہونے کے بعد آپ جب کبھی دہلی آتے، تو دفتر ''ریاست'' میں ضرور تشریف لاکر دوست نوازی کا ثبوت دیتے آپ کے متعلق میری شروع سے اب تک یہ رائے رہی کہ آپ انتہائی بلند، انتہائی نیک اور انتہائی دیانتدار ہیں۔ مگر دماغی اعتبار سے آپ ایک طویل عرصہ سے اس سٹیج پر پہنچ چکے ہیں، جس سٹیج پر آخری عمر میں مولانا حسرت موہانی پہنچ چکے تھے، یا اب مسٹر پرشوتم داس ٹنڈن پہنچ چکے ہیں۔ جس کی وجہ ان کی صحت کا اچھا نہ رہنا اور عمر کی زیادتی ہے۔ چنانچہ آپ کی دیانتداری کا اندازہ تو اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ ایک زمانہ میں جب آپ مرحوم مہاراجہ پٹیالہ کے خلاف ایجی ٹیشن کر رہے تھے، تو مہاراجہ نے اپنے آدمی کے ہاتھ آپ کو ایک کورا چیک دستخط کرکے بھیجا، اور کہا، کہ جتنے لاکھ روپیہ چاہو، اس چیک پر لکھ کر بینک سے لے لو، مگر مخالفت چھوڑ دو، تو ماسٹر صاحب یہ چیک دیکھ کر مسکرا دیئے، اور چیک پھاڑتے ہوئے اس آدمی سے کہا، کہ جو قدم اٹھایا گیا ہے، وہ واپس نہیں جائے گا آپ کی دماغی کیفیت کے سلسلہ کا ایک واقعہ تو بہت ہی دلچسپ ہے۔ تبادلہ آبادی سے کئی برس پہلے آپ ایک روز لاہور گئے، اور سر دول سنگھ کولیشر سے ملے، تو آپ نے سر دول سنگھ سے کہا:

''سکھوں کے دو لیڈر سردار گوپال سنگھ قومی اور ماسٹر سندر سنگھ لائلپوری تو دماغی خرابی کے باعث لاہور کے پاگل خانہ میں زیر علاج رہ چکے ہیں، اور میں اب اپنے متعلق بھی محسوس کرتا ہوں کہ میرا دماغ جواب دے رہا ہے، اور میں بھی شائد پاگل خانہ بھیجا جاؤں۔''

سردار سردول سنگھ کویشر نے ماسٹر تارا سنگھ کو تسلی دیتے ہوئے یہ کہا کہ:

''ماسٹر صاحب آپ ایسا خیال کبھی نہ کیجئے''

مگر ماسٹر صاحب کے جانے کے بعد سردار سردول سنگھ نے راقم الحروف سے (جو اتفاق سے اس روز لاہور میں تھا) کہا، کہ:

''ماسٹر تارا سنگھ محسوس کرتے ہیں، کہ وہ اپنی دماغی خرابی کے باعث پاگل خانہ جانے والے ہیں، مگر سوال یہ ہے کہ وہ پاگل تھے کب نہیں؟''

یعنی وہ شروع سے ہی پاگل تھے۔

میں جب دہلی جیل میں تھا، تو وہاں ایک صاحب سردار پیارا سنگھ بھی قید تھے۔ جو قید ہونے سے پہلے ترنتارن میں پوسٹ ماسٹر تھے، اور ڈاک خانہ کا روپیہ تغلب کرنے کے جرم میں دو تین برس کے لئے قید ہوئے۔ میں تو جیل سے رہائی کے بعد پھر اخبار کے کاروبار میں مصروف ہو گیا، اور سردار پیارا سنگھ رہائی کے بعد عارضی طور پر میجر برڈ وڈ کے دفتر میں کلرک ہو گئے۔ میجر برڈ وڈ کی پوزیشن یہ تھی، کہ آپ فوج میں میجر تھے۔ ہندوستان کے سابق کمانڈر انچیف فیلڈ مارشل جنرل برڈ وڈ کے صاحبزادہ تھے۔ اس زمانہ میں آپ جالندھر میں لیزن آفیسر کے طور پر کام کر رہے تھے۔ آپ کا کام یہ تھا کہ آپ سکھوں اور گورنمنٹ کے درمیان اچھے خوشگوار تعلقات قائم رکھیں، تا کہ سکھ زیادہ سے زیادہ تعداد سے فوج میں بھرتی ہوں یہ میجر برڈ وڈ اس زمانہ میں ماسٹر تارا سنگھ اور گیانی کرتار سنگھ وغیرہ سکھ لیڈروں سے اکثر ملا کرتے۔

ایک روز سردار پیارا سنگھ نے (جو میجر برڈ وڈ کے دفتر میں بطور کلرک کام کر رہے تھے) مجھے خط لکھا، اور اس خط میں یہ اطلاع دی، کہ ماسٹر تارا سنگھ نے میجر برڈ وڈ کی معرفت وائسرائے کو ایک خط بھیجا ہے، جس میں یہ چاہا گیا ہے کہ ہندوستان کو جب آزاد کیا جائے تو سکھوں کو کانگرس اور مسلم لیگ سے علیحدہ پنجاب کا وہ علاقہ بطور سکھ سٹیٹ دیا جائے، جس علاقہ میں سکھوں کی اکثریت ہے، اور میجر برڈ وڈ نے ماسٹر تارا

سنگھ کے اس خیال کی سفارش کی ہے۔ یہ خط جب میرے پاس پہنچا، تو میں نے سردار پیارا سنگھ کا نام لئے بغیر ''ریاست'' میں ایک سخت ایڈیٹوریل لکھا، اور اس ایڈیٹوریل میں ماسٹر تارا سنگھ پر کانگرس سے غداری کا الزام لگایا۔ کیونکہ جب کوئی قومی معاملہ ہو یا وطن پرستی کا سوال ہو، تو میں ہمیشہ ہی ذاتی تعلقات کی پرواہ نہ کرتے ہوئے آواز بلند کر دیا کرتا۔ میرے اس ایڈیٹوریل کے شائع ہونے کے بعد ماسٹر تارا سنگھ نے اخبارات میں یہ بیان دیا کہ ان پر اخبار ''ریاست'' میں لگایا گیا یہ بیان قطعی غلط اور بے بنیاد ہے ماسٹر تارا سنگھ کے اس بیان کے شائع ہونے کے بعد میں نے سردار پیارا سنگھ کو خط لکھا، کہ ماسٹر صاحب نے آپ کی اطلاع کی تردید کی ہے، اس تردید کی موجودگی میں آپ کی پوزیشن کیا ہے؟ تو سردار پیارا سنگھ نے مجھے لکھا، کہ وہ خط جو میجر برڈوڈ نے وائسرائے کو لکھا تھا، وہ خط انہوں نے (یعنی پیارا سنگھ نے) خود ٹائپ کیا تھا، اور یہ واقعہ بالکل درست ہے۔ سردار پیارا سنگھ کے اس خط کے پہنچنے کے بعد میں نے اخبار ''ریاست'' میں ماسٹر تارا سنگھ کو چیلنج کیا کہ اگر آپ اس اطلاع کو غلط اور بے بنیاد قرار دیتے ہیں تو آپ مجھ پر توہین کا مقدمہ قائم کیجئے میں ثابت کروں گا کہ آپ پر کانگرس کے ساتھ غداری کرتے ہوئے سکھ سٹیٹ قائم کرنے کا جو الزام ''ریاست'' میں لگایا گیا ہے وہ درست ہے۔ میں نے یہ چیلنج اس خیال سے حوصلہ اور جرات کے ساتھ دیا، کہ میجر برڈوڈ انگریز ہیں۔ ماسٹر تارا سنگھ نے مقدمہ کیا تو میں میجر برڈوڈ کی شہادت سے اپنے الزام کو ثابت کر دوں گا۔ میرے اس چیلنج کے بعد ماسٹر تارا سنگھ نے مجھ پر امرتسر کی عدالت میں توہین کا مقدمہ دائر کر دیا۔ اس عدالت کے مجسٹریٹ ایک سکھ تھے، جو آج کل پنجاب کے کسی ضلع میں ڈپٹی کمشنر ہیں۔

ماسٹر تارا سنگھ کے مقدمہ کرنے کے بعد عالت نے میرے نام سمن جاری کئے۔ یہ سمن دہلی میں پہنچے۔ میں اس مقدمہ کی پہلی پیشی پر امرتسر نہیں گیا۔ میں نے میڈیکل سرٹیفکیٹ بھیج دیا اور امرتسر میں اپنے چچا زاد بھائی سردار ہوشیار سنگھ کو لکھا کہ وہ ایک تو

امرتسر کے کسی سب سے اچھے اور لائق وکیل کو مقدمہ کی پیروی کے لئے مقرر کریں اور دوسرے مجھے اطلاع دیں کہ پہلی پیشی پر عدالت کیا کچھ کرتی ہے۔ چنانچہ پہلی پیشی پر تو کوئی کارروائی نہیں ہوئی، صرف نئی تاریخ مقرر کر دی گئی، اور امرتسر کے ایک لائق ترین وکیل مسٹر چاولہ کو مقرر کر دیا گیا۔ اگلی پیشی پر میں امرتسر گیا، اور قانون کے مطابق میں نے عدالت میں اپنی حاضری کے متعلق ضمانت دے دی۔

میں جب امرتسر گیا، اور تمام حالات معلوم کئے، تو مجھے اطلاع دی گئی کہ سکھ مجسٹریٹ اور ماسٹر تاراسنگھ کے ذاتی تعلقات ہیں۔ ماسٹر صاحب اکثر اس مجسٹریٹ سے ملتے ہیں۔ یہ مجسٹریٹ ماسٹر جی کے ہاں اکثر آیا کرتے ہیں، اور ماسٹر صاحب بھی اس مجسٹریٹ کے ہاں جاتے ہیں۔ اس اطلاع کے ملنے پر ہم نے فیصلہ کیا، کہ اس مجسٹریٹ کی عدالت میں مقدمہ کا ہونا خطرہ سے خالی نہیں، اور ہمیں اس عدالت سے مقدمہ ضرور تبدیل کرالینا چاہئے چنانچہ مشورہ کے بعد ہم نے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی عدالت میں مقدمہ کے کسی دوسری عدالت میں تبدیل کرنے کی درخواست دی، اور اس درخواست میں لکھا کہ چونکہ ماسٹر تاراسنگھ اور مجسٹریٹ کے ذاتی تعلقات ہیں ہمیں اس مجسٹریٹ سے انصاف کی توقع نہیں۔ اس زمانہ میں امرتسر میں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ایک انگریز تھے۔ انگریز چاہے اپنے ملک کے مفاد کے لئے ہندوستانیوں پر زیادہ سے زیادہ ظلم کر سکتے تھے، مگر عدالتوں کے انصاف کے لحاظ سے وہ فرشتے تھے۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے یہ مقدمہ اس مجسٹریٹ کی عدالت سے ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی عدالت میں تبدیل کر دیا، جو ایک مسلمان تھا۔ یہ ہماری پہلی فتح اور ماسٹر تاراسنگھ کی ابتدائی شکست تھی، کیونکہ عام خیال تھا کہ سکھ مجسٹریٹ ماسٹر تاراسنگھ کی طرفداری کرے گا۔

اس مقدمہ کی دو پیشیاں ہی ہوئی تھیں، کہ فسادات شروع ہو گئے۔ پاکستان کے قائم ہونے کا اعلان ہوا۔ پنجاب میں خونریزی کا دور جاری ہو گیا، اور امرتسر میں قتل عام کے علاوہ اے ڈی ایم مجسٹریٹ کی عدالت میں بھی بم چلا، کیونکہ وہ مسلمان تھا۔

مگر وہ بچ گیا، اور کئی ماہ تک عدالتوں کا کام قطعی بند ہو گیا۔

پاکستان کے قائم ہونے کے بعد فسادات جب ختم ہوئے، تو مقدمہ پھر شروع ہوا۔ میرے نام حاضری کے سمن آئے۔ تو میں نے اس پیشی پر بھی میڈیکل سرٹیفکیٹ بھیج دیا۔ چونکہ کئی ماہ تک فسادات کے باعث مقدمہ جاری نہ ہو سکا۔ مجھے مقدمہ کی تیاری کے لئے کافی وقت مل گیا۔ مگر میرے لئے ایک مشکل پیش آئی وہ یہ کہ ملک کی تقسیم اور ہندوستان کے آزاد ہونے کے بعد ہی جب تمام انگریزی افواج اور انگریز افسر ہندوستان سے واپس انگلستان چلے گئے، تو ان کے ساتھ ہی میجر برڈ وڈ بھی انگلستان چلے گئے، اور کچھ پتہ نہ چل سکا، کہ وہ کہاں ہیں اور ان کا پتہ کیا ہے؟ تاکہ بند سوالات کے ذریعے ان کا بیان لیا جائے۔ جب کوئی پتہ نہ چلا تو آخر میں نے انڈیا آفس کو لندن خط لکھا، کہ میجر برڈ وڈ کہاں ہیں؟ تو وہاں سے جواب آیا کہ وہ آج کل افریقہ میں کسی انگریزی پلٹن کی کمان کر رہے ہیں۔ مقدمہ میں ہماری کامیابی کی صرف ایک ہی صورت تھی کہ ہم میجر برڈ وڈ سے شہادت کے ذریعے ماسٹر تارا سنگھ کے وائسرائے کو لکھے گئے خط کو ثابت کر سکتے۔ اور ماسٹر تارا سنگھ کا بیان یہ تھا، کہ انہوں نے میجر برڈ وڈ سے کوئی بات ہی نہیں کی، اور نہ وائسرائے کو خط لکھا۔ میں اس ذہنی کشمکش میں مبتلا تھا، کہ کپورتھلہ کے مہاراجہ کے ایک کلرک نے مجھے خط لکھا جس میں مجھے اطلاع دی گئی کہ مہاراجہ کپورتھلہ کے پاس میجر برڈ وڈ کی لکھی گئی ایک نئی کتاب لندن سے مہاراجہ کپورتھلہ کے پاس پہنچی ہے جو میجر برڈ وڈ نے مہاراجہ کو بھیجی ہے اس کتاب میں نہ صرف میجر برڈ وڈ کے اور سکھ لیڈروں کے تعلقات کا ذکر ہے بلکہ اس میں ماسٹر تارا سنگھ اور میجر برڈ وڈ کے اور سکھ لیڈروں کے تعلقات کا ذکر ہے، بلکہ اس میں ماسٹر تارا سنگھ اور میجر برڈ وڈ کی اکٹھی تصاویر بھی ہیں۔ یہ کتاب میرے لئے مسرت کا باعث تھی۔ میں نے ہوائی ڈاک کے ذریعہ بمبئی کے دو تین بڑے کتب فروشوں کو خط لکھے کہ کتاب مجھے فوراً بھیج دی جائے مگر ان کا جواب آیا کہ یہ کتاب ابھی تک ان کے

پاس نہیں پہنچی، مگر پہنچنے والی ہے چنانچہ دو تین ہفتہ کے بعد یہ کتاب میرے پاس پہنچ گئی جو ماسٹر تارا سنگھ اور میجر برڈوڈ کے تعلقات کا ناقابل تردید ثبوت تھا۔ اس کتاب کا ماسٹر تارا سنگھ کو علم ہوا، تو وہ کچھ پریشان سے ہوئے، اور ان کو افسوس ہوا کہ میجر برڈوڈ نے یہ تصاویر کیوں چھاپ دیں۔ بہر حال اس کتاب کا شائع ہونا ہمارے لئے بہت مفید تھا اور یہ ثابت کرتا تھا کہ ریاست میں جو کچھ لکھا گیا وہ بے بنیاد نہ تھا، اور ایڈیٹر ''ریاست'' کا وہ ایڈیٹوریل نیک نیتی اور حب الوطنی کے جذبات کی بنیادوں پر تھا۔

اب یہ مقدمہ جاری ہوا، تو ایک ہندو مجسٹریٹ کی عدالت میں تھا، اور یہ مجسٹریٹ مقدمات کو جلدی ختم کرنے کے اعتبار سے بہت مستعد اور محنتی تھے۔ میرے وکیل نے جب ان کے ہاں پہلی پیشی پر میرا میڈیکل سرٹیفکیٹ پیش کیا، تو مجسٹریٹ نے صرف دس روز بعد کی تاریخ دی اور میرے وکیل سے کہا کہ:

''اس آئندہ پیشی پر اگر ملزم عدالت میں حاضر نہ ہوا، تو اس کے خلاف نہ صرف بلا ضمانت وارنٹ جاری کئے جائیں گے، بلکہ اس ڈاکٹر کو بھی جرح کے لئے طلب کیا جائے گا، جس نے میڈیکل سرٹیفکیٹ دیا ہے۔''

عدالت کا یہ رویہ دیکھتے ہوئے میرے وکیل نے مجھے لکھا، کہ میں آئندہ پیشی پر ضرور امرتسر کی عدالت میں حاضر ہو جاؤں، ورنہ بلا ضمانت وارنٹ جاری ہو جائیں گے۔ کیونکہ مجسٹریٹ محسوس کرتا ہے، کہ یہ میڈیکل سرٹیفکیٹ شائد جھوٹا ہے، اور مقدمہ میں ٹال بازی کی جا رہی ہے۔

میرے وکیل کا یہ خط جب میرے پاس پہنچا تو میں نے سول سرجن کا سرٹیفکیٹ حاصل کرنے کے لئے سول سرجن کو بلا بھیجا، تا کہ وہ اپنی فیس لے کر مجھے دیکھ لے اور سرٹیفکیٹ دے۔ میرا آدمی جب سول سرجن کو لینے گیا تو سول سرجن نے جواب دیا کہ وہ بے حد مصروف ہے اور اس کے لئے میرے پاس آنے کے لئے وقت نہیں۔ اسکے بعد اروِن ہسپتال کے سینئر فزیشن ڈاکٹر ڈھانڈا کو ٹیلی فون کر کے بلایا اور سرٹیفکیٹ لیا

تاکہ اس ڈاکٹر پر کوئی بات نہ آئے، جس نے پہلے سٹیفکیٹ دیا تھا۔ ڈاکٹر ڈھانڈا کا سٹیفکیٹ میں نے امرتسر بھیج دیا، اور وکیل کو لکھا کہ کوئی قریب کی تاریخ لے لی جائے میں اس تاریخ پر ضرور حاضر ہو جاؤں گا۔ چنانچہ اگلی پیشی پر میں امرتسر پہنچ گیا۔

مقدمات کے متعلق میں ہمیشہ محتاط رہا کرتا ہوں، اور وقت سے دس منٹ پہلے عدالت میں پہنچ جایا کرتا ہوں اس روز دس بجنے میں ابھی دس منٹ باقی تھے، اور عدالت میں صرف چپڑاسی اور عدالت کا ریڈر ہی آیا تھا، کہ میں وہاں پہنچ گیا، اور وکیلوں کی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ ٹھیک دس بجے مجسٹریٹ عدالت میں آ گئے، اور چونکہ میں ہی صرف عدالت میں بیٹھا تھا، آپ نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے پوچھا:

''آپ کیوں بیٹھے ہیں؟''

میں نے جواب دیا:

''میں ایک ملزم ہوں، اور مقدمہ کے سلسلہ میں آیا ہوں''

مجسٹریٹ نے پوچھا:

''کونسا مقدمہ؟''

میں نے جواب دیا:

''ماسٹر تارا سنگھ نے مجھ پر توہین کا کیا ہوا ہے۔''

مجسٹریٹ نے پوچھا:

''آپ سردار دیوان سنگھ ہیں؟''

''میں نے جوابدیا:''

جی ہاں!

مجسٹریٹ نے جب یہ سنا تو آپ نے چپڑاسی سے کہا:

''ماسٹر تارا سنگھ کو آواز دو۔''

چپڑاسی عدالت کے برآمدہ میں گیا تو اس نے آواز دی:

''کوئی ماسٹر تارا سنگھ حاضر ہے''

جب کوئی جواب نہ ملا، تو چپڑاسی نے آکر کہا کہ ماسٹر تارا سنگھ حاضر نہیں ہے۔ یہ سن کر مجسٹریٹ نے کہا کہ ابھی ماسٹر تارا سنگھ آتے ہیں تو میں مقدمہ لیتا ہوں آپ بیٹھیے دسمبر کا مہینہ تھا اور کافی سردی تھی۔ میں نے کہا کہ میں باہر دھوپ میں بیٹھتا ہوں مجسٹریٹ نے جواب دیا جہاں دل چاہے بیٹھیے۔ ماسٹر تارا سنگھ کے آنے پر میں آپ کو بلوالوں گا۔ چنانچہ میں عدالت سے باہر آکر دھوپ میں ایک وکیل کے پاس بیٹھ گیا۔

گیارہ بجے کے قریب ماسٹر تارا سنگھ معہ نصف درجن کے قریب کرپانیں پہنے ہوئے اپنے ہمراہیوں کے تشریف لائے۔ عدالت میں گئے، تو مجسٹریٹ نے اپنے چپڑاسی کو بھیج کر مجھے بلوالیا میں بھی عدالت میں گیا تو مجسٹریٹ اور ماسٹر صاحب کے درمیان یہ بات چیت ہوئی:

مجسٹریٹ: ماسٹر صاحب! آپ کے لئے مناسب نہیں، کہ آپ اخبارات پر مقدمہ کریں، آپ کو یہ مقدمہ واپس لینا چاہئے۔

ماسٹر صاحب: سردار دیوان سنگھ تو میرے دیرینہ دوست ہیں۔ میں مقدمہ کرنا نہ چاہتا تھا، مگر مجھ پر کانگرس کے ساتھ غداری کرنے کا سنگین الزام لگایا گیا ہے۔

مجسٹریٹ: کیا سنگین الزام لگایا گیا ہے؟ ایسے الزامات تو اخبارات میں ہر روز لگائے جاتے ہیں آپ کی توہین کیا ہوئی ہے، کیا آپ لوگوں پر تنقید کرنے کا اخبارات کو حق حاصل نہیں۔

ماسٹر صاحب: مجھ پر الزام لگایا ہے، کہ میں نے کانگرس کے خلاف وائسرائے کو خط لکھا۔

مجسٹریٹ: تو اس میں آپ کی ذات پر کیا حملہ ہے؟ میں نے مثل دیکھی ہے، اور مضمون پڑھا ہے۔ آپ کی کوئی توہین نہیں ہوئی، اور نہ آپ پر کوئی ذاتی حملہ کیا گیا۔ آپ دونوں فریق صلح کر لیجئے۔

مجسٹریٹ کی اس ہدایت پر میں اور ماسٹر تارا سنگھ دونوں عدالت سے باہر آ گئے۔ کچھ دیر میرے اور ماسٹر تارا سنگھ کے مشترکہ دوست صلح کی بات چیت کرتے رہے۔

آخر عدالت میں داخل کرنے کے لئے ایک درخواست لکھی گئی، جس میں تو پہلے ماسٹر تارا سنگھ نے لکھا کہ:

''میں ایمانداری کے ساتھ سردار دیوان سنگھ کو یقین دلاتا ہوں، کہ میں نے کانگرس کے ساتھ کوئی غداری نہیں کی۔''

اس کے بعد میں نے لکھا کہ:

''میں ماسٹر تارا سنگھ پر لگایا الزام واپس لیتا ہوں''

اس کے بعد ماسٹر صاحب نے لکھا کہ:

''میں مقدمہ واپس لیتا ہوں''

یہ درخواست لے کر ہم عدالت میں گئے مقدمہ واپس لینے کی مجسٹریٹ نے تصدیق کی، اور مثل کو داخل دفتر کرنے کا حکم لکھا۔ اس کے بعد مجسٹریٹ نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا:

''سردار صاحب! آپ مجھے نہیں جانتے، اور نہ آپ کبھی مجھ سے ملے ہیں، مگر میں آپ کو اچھی طرح سے جانتا ہوں میرے دل میں آپ کے لئے انتہائی عزت و احترام کے جذبات ہیں۔ کئی برس ہوئے، میں دہلی میں مجسٹریٹ تھا۔ اس وقت وہاں مسٹر ایسر ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ تھے، اور مسٹر ایسر بھی آپ کا ذکر کیا کرتے تھے اور آپ کی بہت تعریف کرتے تھے۔''

یہ سن کر میں نے مذاقاً کہا کہ:

''جناب اگر آپ کے دل میں میرے لئے یہ جذبات تھے، تو آپ مجھے پہلے بتاتے، میں ماسٹر جی کے ساتھ صلح ہی نہ کرتا۔''

میرا یہ جواب سن کر تمام لوگ ہنس پڑے۔ اس کے بعد مجسٹریٹ نے ہم دونوں

یعنی مجھے اور ماسٹر تارا سنگھ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا، آپ دونوں ہی بہت بڑی اور اہم شخصیت ہیں۔ مجھے پامسٹری کا شوق ہے۔ اگر آپ لوگوں کو کوئی اعتراض نہ ہو، تو میں آپ دونوں کے ہاتھوں کے پرنٹس لینا چاہتا ہوں چنانچہ آپ نے میرے اور ماسٹر تارا سنگھ دونوں کے ہاتھوں کے کالی سیاہی سے پرنٹس لئے پرنٹس لینے کے بعد دونوں کا شکریہ ادا کیا اور ہم دونوں اپنے ہاتھوں کی سیاہی کو کاغذ سے صاف کرتے ہوئے عدالت سے باہر آ گئے۔

اس واقعہ کے بعد چار پانچ برس تک نہ تو میں نے کبھی ماسٹر تارا سنگھ کو کوئی خط لکھا، اور نہ ہی ماسٹر تارا سنگھ مجھ سے ملے۔ پانچ برس کے بعد ایک روز دہلی کے سکھوں کے لیڈر سردار رچھپال سنگھ کا ٹیلی فون آیا۔ آپ نے فرمایا:

''ماسٹر تارا سنگھ جی آپ سے ملنا چاہتے ہیں، کیا آپ مکان پر ہی ہیں، اور آپ کس وقت مل سکتے ہیں؟''

میں نے سمجھا، کسی نے مذاق کیا ہے۔ کیونکہ مقدمہ کے بعد کئی برس سے نہ تو ماسٹر صاحب کبھی ملے اور نہ خط و کتابت ہوئی میں نے صرف یہی جواب دیا کہ جب ماسٹر جی فرمائیں گے میں آ جاؤں گا۔ اس پر سردار رچھپال سنگھ نے حیران ہو کر پوچھا، کہ کیا آپ خود آ جائیں گے؟ تو میں نے جواب دیا، مجھے آنے میں کیا دقت ہے؟ اس کے بعد سردار رچھپال سنگھ ماسٹر جی سے وقت مقرر کرنے چلے گئے، اور واپس آ کر اگلے روز نو بجے کا وقت مقرر رہا۔ میں نے پوچھا کہ ماسٹر صاحب کہاں مقیم ہیں؟ تو انہوں نے بتایا کہ سردار حکم سنگھ ممبر پارلیمنٹ کی کوٹھی میں میں نے ٹیلی فون بند کرنے کے بعد ٹیلی فون ڈائریکٹری میں سے سردار حکم سنگھ کا نمبر دیکھا، اور یہ نمبر ملایا، تو سردار رچھپال سنگھ تھے۔ میں نے ان سے یہی کہا کہ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ کسی نے آپ کے اور ماسٹر جی کے نام سے مذاق تو نہیں کیا؟ میں اگلے روز، سردار حکم سنگھ کے پاس گیا۔ وہاں ماسٹر تارا سنگھ کے پاس بیس کے قریب مقامی سکھ بیٹھے باتیں کر رہے تھے، اور یہ باتیں

غالباً مقامی گوردوارہ کمیٹی کے جھگڑوں کے متعلق ہی تھیں۔ میں جب پہنچا، تو ماسٹر جی کھڑے ہو گئے آپ میرا بازو پکڑ کر دوسرے کمرے میں لے گئے، جہاں کوئی دوسرا شخص نہ تھا۔ ماسٹر جی نے پوچھا:

''کیا تم مجھ پر ناراض تو نہیں ہو؟''

میں نے کہا:

''ناراضگی کا سوال ہی کیا ہے؟''

ماسٹر صاحب نے کہا:

''نہیں، قسم کھا کر سچ بتاؤ، کہ تم ناراض تو نہیں ہو۔''

میں نے کہا:

''چھوٹی باتوں سے ناراض ہونے کی توقع صرف چھوٹے اور پست لوگوں سے ہی کی جا سکتی ہے۔ میرے دل میں تو آپ کے لئے نہ صرف عزت و احترام، بلکہ محبت کے جذبات بھی ہیں۔''

ماسٹر صاحب سے نصف گھنٹہ کے قریب باتیں ہوئیں۔ اس کے بعد آپ سے کبھی ملنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ سردار رچھپال سنگھ نے اس سال کے شروع میں بتایا کہ ماسٹر جی کو جب اخبار ریاست کے بند ہونے کی اطلاع ملی تو ان کو بے حد افسوس ہوا اور وہ سوچ رہے تھے کہ وہ اخبار ریاست کی کس صورت میں امداد کر سکتے ہیں۔

ماسٹر تارا سنگھ کے متعلق میرا ایمان ہے کہ ایسے بلند لوگ ہندوستان میں بہت کم پیدا ہوئے۔ اور اگر ان کی دماغی حالت بھی درست ہوتی، تو ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں کے صرف دو چار لیڈر ہی ان کا مقابلہ کر سکتے۔۔۔۔۔ ہندوستان کی آئندہ نسلیں یقیناً آپ کی ذات پر فخر کریں گی، اور آئندہ کی تاریخ میں آپ کا نام سنہری حروف میں لکھا جائے گا۔

☆☆☆☆☆☆☆

روپیہ کے ذریعہ لیڈری

لیڈروں کی کئی اقسام ہیں 1 سیاسی لیڈر (مثلاً مرحوم مسٹر بال گنگادھر تلک یا مرحوم مسٹر جناح)2 مذہبی لیڈر (مثلاً پنڈت دین دیال شرما دیا کھیان چچتی یا مولانا اشرف تھانوی)3 پیدائشی لیڈر (شوکت حیات ولد سکندر حیات یا سردار سرجیت سنگھ مجیسٹھ ولد سردار سنگھ سنگھ مجیسٹھ) 4 فلمی لیڈر (مثلاً پرتھوی راجکپور فلم ایکٹر و ممبر پارلیمنٹ) 5 صحافتی لیڈر (مثلاً مرحوم مولانا ظفر علی خاں)6 پروفیشنل لیڈر (مثلاً لالہ جگت نرائن) 7 روحانی لیڈر (مثلاً سنت ونوبا بھاوے)وغیرہ اور ان تمام اقسام کے علاوہ لیڈروں کی ایک قسم وہ ہے جو صرف روپیہ کے زور سے لیڈری حاصل کرتی ہے۔ مثلاً ہندوستان کے سابق ڈیفنس منسٹر سردار بلدیو سنگھ کی لیڈری کی واحد کوالیفکیشن صرف یہ ہے کہ آپ کے پاس کروڑوں روپیہ موجود ہے، اور آپ دوسرے لیڈروں کو روپیہ دے کر خود لیڈری حاصل کرتے ہیں چنانچہ آپ کی لیڈری کے متعلق چند واقعات سنئے:

سردار بلدیو سنگھ تعلیمی اعتبار سے غالباً میٹرک سے آگے نہیں گئے، کیونکہ آپ راقم الحروف کی طرح غلط انگریزی لکھتے اور بولتے ہیں۔ اور اس سلسلہ کا ایک دلچسپ واقعہ ہے کہ کئی برس ہوئے لاہور کے روزانہ اخبار زمیندار نے آپ کا بھیجا ہوا ایک تار شائع کر دیا تھا جس کی انگریزی غلط تھی یعنی انگریزی کی قابلیت کے اعتبار سے آپ چند لائنیں بھی درست نہیں لکھ سکتے، اور چند جملے بھی درست نہیں بول سکتے۔ حالانکہ سردار بلدیو سنگھ کے والد سردار بہادر سردار اندر سنگھ ٹاٹانگر کے کروڑپتی کارخانہ داروں میں سے ہیں، اور سردار بلدیو سنگھ چاہتے، تو اپنی تعلیم لندن یا برلن تک جاری رکھ سکتے تھے، کیونکہ آپ کو روپیہ کی کوئی پرواہ نہ تھی۔

سردار بلدیو سنگھ جب جوان ہوئے، تو آپ کے والد اندر سنگھ نے چاہا، کہ ان کا یہ بیٹا بھی ان کے ٹاٹانگر کے کاروبار میں شامل ہو۔ مگر اسے اتفاق سمجھئے یا ایک ایکسیڈنٹ یعنی ایک حادثہ کہ آپ کی ملاقات ماسٹر تارا سنگھ سے ہوگئی اکالیوں کو روپیہ کی ضرورت

تھی، اور سرمایہ دار سردار بلدیو سنگھ اکالی لیڈروں کے لئے بلند کئے جا رہے زندہ باد کے نعروں کو حسرت کی نظر سے دیکھتے تھے دونوں اس نتیجہ پر پہنچے کہ بلدیو سنگھ تو ''پنتھ'' کو روپیہ دیں اور ''پنتھ'' سردار بلدیو سنگھ کو لیڈری دے۔ یہ سمجھوتہ پاکستان کے قیام اور تبادلہ آبادی سے کئی برس پہلے کا ہے۔

مرحوم مہاراجہ نابھ کے نظر بندی کے زمانہ میں مہاراجہ کے پاس ایک صاحب سردار نرنجن سنگھ طالب ملازم تھے، جو مہاراجہ کے پاس غالباً تین چار برس کوڈائی کنال (صوبہ مدراس) میں رہے۔ یہ سردار نرنجن سنگھ طالب (جو آج کل پنجاب میں ڈپٹی منسٹر ہیں) مہاراجہ کی ملازمت سے الگ ہو کر کلکتہ چلے گئے۔ جنہوں نے وہاں سے ایک روزانہ گورمکھی اخبار دیش درپن جاری کیا سردار بلدیو سنگھ سیر و تفریح کے لئے اکثر کلکتہ جایا کرتے۔ کلکتہ میں ہی سردار بلدیو سنگھ سے سردار نرنجن سنگھ طالب کی واقفیت ہوئی، اور یہ واقفیت گہرے دوستانہ تعلقات تک پہنچی۔ سردار نرنجن سنگھ طالب کے بنگالی کانگرسی لیڈروں کے ساتھ بھی تعلقات تھے، اور جب مسٹر سبھاش چندر بوس ہندوستان سے افغانستان کے راستے جرمنی گئے، تو سفر کے اخراجات کے لئے سردار بلدیو سنگھ نے سردار نرنجن سنگھ طالب کی معرفت ہی مسٹر سبھاش چندر بوس کو دس ہزار روپیہ دیا، کیونکہ سردار بلدیو سنگھ کو تو لیڈری کی ضرورت تھی یہ لیڈری روپیہ کے معاوضہ میں چاہے اکالیوں سے ملتی، چاہے کانگرسیوں سے۔

یہ واقعہ اس زمانہ کا ہے، جبکہ سردار بلدیو سنگھ مشترکہ طور پر اکالیوں کے لیڈر اور برٹش گورنمنٹ کے چمچہ تھے۔ برٹش گورنمنٹ کے وفا شعار ہونے کے باعث سرسکندر حیات منسٹری میں آپ بھی منسٹر تھے پنجاب کی گورنری انڈین سول سروس کے ایک بہت ہی ہوشیار، لائق اور خرانٹ مسٹر گلینسی کے قبضہ میں تھی۔ مسٹر سبھاش چندر بوس کے ہندوستان چلے جانے کے بعد انگریزوں کی سی آئی ڈی نے یہ تحقیقات شروع کر دی، کہ مسٹر سبھاش چندر بوس کی ہندوستان سے روانگی میں کن کن لوگوں کا ہاتھ ہے؟ تو

اس تحقیقات کے سلسلہ میں سردار سردول سنگھ کولیشر مرحوم، مسٹر شنکر لال آف دہلی اور سردار نرنجن سنگھ طالب وغیرہ تو گرفتار کرکے ''انٹروگیشن'' کے لئے لاہور کے قلعہ میں بھیجے گئے اور گورنر ایکسلینسی نے سردار بلدیو سنگھ کو جب آنکھیں دکھائیں، اور دھمکی دی، کہ اگر سردار صاحب نے تمام حالات نہ بتائے، تو گورنمنٹ سردار صاحب تو کیا ان کے والد اور تمام خاندان کے کارخانے اور جائیداد ضبط کرلے گی تو سردار بلدیو سنگھ نے نہ صرف وہ سب کچھ بتادیا جوان کا ہاتھ مسٹر سبھاش چندر بوس کے ہندوستان جانے کے سلسلہ میں تھا بلکہ آپ نے اپنے بیان میں وہ تمام رقمیں بھی لکھوادیں، جو آپ نے اس وقت تک کانگرسیوں، اکالیوں اور انارکسٹوں کو دی تھیں تاکہ آپ کی جائیداد ضبط نہ ہو اور برٹش گورنمنٹ ان کو اپنا سیاسی متبنیٰ سمجھتی رہے۔ سبھاش چندر بوس کے متعلق تحقیقات کے سلسلہ میں دوسرے لوگوں نے سی آئی ڈی والوں کے پاس کیا کیا بیانات دیئے ان کا راز میں رہنا ہی اچھا ہے کیونکہ ان لوگوں کے بے نقاب ہونے کا مستقبل میں وہ زمانہ مناسب ہوگا، جبکہ یہ لوگ جو آج تقریروں میں اپنی حب الوطنی اور بہادری کے قصے بیان کرتے ہیں، برسر اقتدار نہ ہوں گے اور آئندہ نسلیں ان کی تحریروں کے فوٹو سے سبق لیا کریں گی۔

مسٹر سبھاش چندر بوس کے متعلق جب تمام لوگوں کے اقرار بیان ہو چکے اور اس سلسلہ کے ایک درجن کے قریب سیاسی لیڈر یا ورکر جیلوں میں نظر بند تھے تو گجرات جیل سے سردار نرنجن سنگھ طالب کا راقم الحروف کے پاس دہلی پیغام پہنچا اس پیغام میں مجھ سے چاہا گیا تھا کہ میں سردار بلدیو سنگھ سے ملوں اور ان کے ذریعہ سردار نرنجن سنگھ طالب کی رہائی کی کوشش کروں سردار نرنجن سنگھ طالب سے میرے بھی گہرے دوستانہ تعلقات تھے کیونکہ نہ صرف میری ان سے ملاقات اس وقت کوڈائی کنال میں ہوئی، جبکہ آپ مرحوم مہاراجہ نابھ کے پاس ملازم تھے بلکہ بعد میں جب کبھی کلکتہ جاتا تو ان سے ملتا اور یہ جب کبھی دہلی آتے تو بغیر ملے نہ جاتے ان کا پیغام پہنچنے کے بعد میں

لاہور گیا۔ لاہور پہنچنے کے بعد میں نے سردار بلدیو سنگھ کی کوٹھی ٹیلی فون کیا، کہ میں دہلی سے آیا ہوں، اور ملنا چاہتا ہوں۔ ٹیلی فون پر سردار بلدیو سنگھ کے پرائیویٹ سیکرٹری تھے۔ انہوں نے جب میرا نام سنا، تو بغیر سردار بلدیو سنگھ سے پوچھے، آپ نے مسرت اور گرم جوشی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ میں کل صبح نو بجے سردار بلدیو سنگھ کی کوٹھی پہنچ جاؤں۔ چنانچہ میں اگلے روز ٹھیک نو بجے سردار بلدیو سنگھ کی کوٹھی پہنچ گیا وہاں ان کا پرائیویٹ سیکرٹری موجود تھا، جس نے مجھے ویٹنگ روم میں بٹھایا اور کہا کہ سردار صاحب ابھی آنے والے ہیں کیونکہ وہ ملاقاتوں کے لئے نو بجے اوپر کی منزل سے نیچے تشریف لے آیا کرتے ہیں میں نے اپنا وزیٹنگ کارڈ اس ملازم کو دے دیا کہ یہ سردار صاحب کو دے دیا جائے میں ٹھیک نو بجے سردار بلدیو سنگھ کی کوٹھی پہنچا تھا اس کے بعد ساڑھے نو بج گئے تو میں نے اسی ملازم سے پوچھا کہ سردار صاحب کب تشریف لائیں گے؟ تو اس ملازم نے کچھ بے رخی اور لاپروائی کے ساتھ جواب دیا کہ سردار صاحب ابھی اشنان کر رہے ہیں (یعنی غسل فرما رہے ہیں) اس کے بعد دس بج گئے، ساڑھے دس بج گئے، گیارہ بج گئے، اور ساڑھے گیارہ بجے تو پھر اسی ملازم نے یہی جواب دیا کہ سردار صاحب ابھی غسل خانہ میں ہیں غسل خانہ سے باہر تشریف نہیں لائے میں حیران کہ یہ کیسا غسل ہے جو ڈھائی گھنٹہ میں بھی ختم نہیں ہوا کیونکہ اگر سکھوں کا بڑا غسل یعنی بالوں کو دھونے والا غسل ہوتا تو زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹہ صرف ہوتا، اور اگر کسی میت یعنی مردہ کا غسل ہوتا تو پھر بھی اس کے لئے ڈیڑھ گھنٹہ سے زیادہ وقت کی ضرورت نہ تھی یہ سردار بلدیو سنگھ کا کیسا غسل ہے، جو ڈھائی گھنٹہ میں بھی ختم نہیں ہوا میں سمجھ گیا کہ سردار صاحب ملنا نہیں چاہتے ٹال رہے ہیں۔

گورنر گلینسی کو بیان دینے اور معافی مانگنے کے بعد سردار بلدیو سنگھ بطور انگریزوں کے سعادت مند کے ہر سیاسی شخص سے ملتے ہوئے گھبراتے ہیں، اور یہ اوپر کی منزل سے ایک ہفتہ بھی نیچے نہ آئیں گے، اگر میں ان کے ویٹنگ روم میں بیٹھا رہا۔ یہ

سوچنے کے بعد میں نے وہاں سے چلے جانے کا فیصلہ کیا اور جب ان کی کوٹھی کے برآمدہ سے نکل کر ٹیکسی میں سوار ہونے لگا تو میں نے دیکھا کہ سردار صاحب اوپر کے برآمدہ میں ٹہل رہے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ ایڈیٹر ریاست چلا جائے تو یہ نیچے تشریف لائیں اور میرے جانے کے انتظار میں ٹہل رہے ہیں لاہور سے واپس آنے کے بعد میں نے سردار نجن سنگھ طالب کو گجرات جیل میں پیغام بھیج دیا کہ سردار بلدیو سنگھ کی کوٹھی پر کیا کچھ ہوا اور وہ سردار صاحب سے اب کسی امداد کی توقع نہ رکھیں۔

اس واقعہ کے کچھ عرصہ بعد سردار بلدیو سنگھ کے ایک بہت بڑے گہرے دوست جو میرے بھی دوست تھے اور سردار بلدیو سنگھ کی وزارت کے زمانہ میں ان کی پارٹی کے ایک ستون قرار دیئے جاتے تھے، تشریف لائے۔ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد انہوں نے سردار بلدیو سنگھ کا ایک پیغام دیا، اور خود بھی یہ خواہش ظاہر کی کہ ''ریاست'' کو لمیٹڈ صورت میں تبدیل کر دیا جائے ایڈیٹر ریاست اس لمیٹڈ کا مینجنگ ڈائریکٹر ہو اور وہ جو شرائط چاہیں آرٹیکل آف ایسوسی ایشن میں مقرر کر لی جائیں اس لمیٹڈ کمپنی کے پچاس ہزار کے حصے سردار بلدیو سنگھ خرید لیں گے تاکہ ریاست کو زیادہ عروج اور ترقی نصیب ہو۔ میں نے اس دوست کی یہ سکیم اور اس کی تفصیلات سن کر جو جواب دیا وہ مجھے اب تک یاد ہے میں نے کہا تھا:

''چودھری صاحب! سردار بلدیو سنگھ اگر روپیہ دیں گے، تو صرف اس غرض کے لئے کہ میں اخبار کے ذریعہ ان کی لیڈری کو چمکاؤں کسی بھی لیڈر کی لیڈری کو چمکانا میری فطرت کے خلاف ہے جس کا ثبوت ''ریاست'' کے پچھلے فائلوں سے مل سکتا ہے سردار بلدیو سنگھ اگر روپیہ دیں گے تو ان کا روپیہ قطعی ضائع ہو جائے گا اور میری پوزیشن یہ ہے کہ گو میں روپیہ جمع نہیں رکھ سکتا اور نہ روپیہ سے مجھے محبت ہے مگر تجارتی اعتبار سے اخبار سے کافی آمدنی ہے۔۔۔۔ میں نہ صرف خود بھی اچھی خوشحالی کی زندگی بسر کر رہا ہوں، بلکہ اس آمدنی میں سے دوستوں کی خدمت بھی انجام دیتا ہوں لمیٹڈ کی

صورت میں اگر مجھے زیادہ روپیہ آئے گا تو وہ لاحاصل ہوگا۔ کیونکہ میں نے کبھی روپیہ اپنے پاس نہیں رکھا۔ اس لئے یہ سودا نہ میرے لئے مفید ہے اور نہ ہی سردار بلدیو سنگھ کے لئے اور آپ اس خیال کو چھوڑ دیجئے۔

میرا یہ جواب سن کر چودھری صاحب خاموش ہو گئے اور تھوڑی دیر کے بعد آپ نے پھر فرمایا:

"اگر آپ پسند کریں، تو آپ خود سردار بلدیو سنگھ سے مل لیجئے، میں آپ کی ملاقات کا انتظام کرتا ہوں۔ شائد آپ ملنے کے بعد اخبار کو لمیٹڈ کرنے پر آمادہ ہو سکیں۔"

اس کا میں نے جو جواب دیا وہ اور بھی دلچسپ تھا میں نے کہا:

چودھری صاحب! لاہور میں سردار بلدیو سنگھ کی کوٹھی کے اوپر کے برآمدہ میں سے سردار صاحب کا ایک بار دور سے درشن کرنے کا ہی اس قدر افسوس ہے، جس کا اب تک اثر محسوس کر رہا ہوں اور میں نہیں چاہتا، کہ سردار صاحب سے ملاقات اور باتیں کروں، آپ اس خیال کو بھی چھوڑ دیجئے۔

چنانچہ یہ واقعہ ہے، کہ میں اور سردار بلدیو سنگھ پچھلے بارہ تیرہ برس دہلی میں رہے، مگر نہ تو کبھی مجھے آپ کے نیاز حاصل کرنے کا اتفاق ہوا، اور نہ میں نے کبھی آپ کے درشن کی خواہش کی حالانکہ آپ کی کوٹھی والی سڑک تغلق روڈ پر اور آپ کی کوٹھی کے بالکل قریب ہی ڈاکٹر سید محمود (سابق وزیر خارجہ گورنمنٹ ہند) کی خدمت میں بارہا حاضر ہوا، اور کئی گھنٹہ موصوف کی کوٹھی پر رہا۔ مگر کبھی یہ خیال نہ آیا کہ جاتے یا آتے ہوئے سردار بلدیو سنگھ کا نیاز بھی حاصل ہو جائے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ سردار بلدیو سنگھ تو روپیہ کے زور سے لیڈری حاصل کرنے والوں میں سے ہیں اور یہ خاکسار پیدائشی طور پر روپیہ کی اینٹ سے اینٹ بجانے والوں میں سے ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

صحافتی امپریلزم

اردو جرنلزم کی پچھلی نصف صدی میں کیا حالت تھی، اس سلسلہ کے چند واقعات دلچسپی سے خالی نہ ہوں گے۔

صحافتی کورٹ فیس

''ریاست'' کے عروج کے زمانہ میں راقم الحروف دوستوں سے ملنے کے لئے مہینہ میں ایک آدھ بار دہلی سے لاہور ضرور جایا کرتا اور یہ سفر صرف ایک دن کا ہوتا، کیونکہ مصروفیت کے باعث اس سے زیادہ وقت نہ دیا جا سکتا تھا۔ یعنی رات کو فرنٹیر میل میں دہلی سے سوار ہوتا، اگلی صبح لاہور پہنچتا، اور اسی روز شام کے وقت فرنٹیر میل میں سوار ہو کر اگلی صبح واپس دہلی پہنچ جاتا۔ لاہور میں میرا قیام کئی برس تک پہلے امپیریل ہوٹل میں ہوتا، کیونکہ اس ہوٹل کے مالک مجھ سے کوئی بل چارج نہ کرتے، چاہے میرے ساتھ اور دوست بھی ہوتے۔ کیونکہ اس کے معاوضہ میں ان کا اشتہار ''ریاست'' میں مسلسل شائع ہوا کرتا۔ اور اس کے بعد میں کئی برس تک ریلوے اسٹیشن کے نزدیک برگنزا ہوٹل میں قیام کرتا۔ میں چاہے امپریل ہوٹل میں قیام کرتا، یا برگنزا ہوٹل میں، ہوٹل میں پہنچنے کے بعد اور غسل کرنے ک بعد میں سیدھا ایک دوست کے ہاں پہنچتا، جو ایک اردو ہفتہ وار اخبار کے مالک اور ایڈیٹر تھے۔ ان کے ہاں پہنچنے کے بعد سب سے پہلے میں ان کو ایک روپیہ دیتا، اور کہتا، کہ کسی آدمی کو بھیج کر سید مٹھا کے نکو شاہ حلوائی سے پوریاں منگا دو۔ کیونکہ نکو شاہ کی پوریاں تمام لاہور میں مشہور تھیں، او رلذت کے اعتبار سے ان کا مقابلہ دہلی یا لاہور میں کوئی دوسرا حلوائی نہ کر سکتا تھا۔ یہ دوست بغیر کسی تکلف کے ایک روپیہ لے کر اپنے کسی عزیز کو پوریاں لینے بھیجتے۔ کیونکہ یہ فی الحقیقت ہمیشہ ہی تنگدست رہتے، اور دوستوں سے دو دو چار چار روپیہ لے کر اپنا گزارہ کرتے۔ پوریوں کے آنے تک گپ بازی ہوتی، اور باتوں باتوں میں یہ اپنے

افلاس کا اظہار کرتے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا، کہ مجھے دس پندرہ یا بیس روپیہ ان کو نذر کرنے پڑتے۔ یعنی ان کے ہاں بیٹھ کر پوریاں کھانے کی یہ فیس مجھے ادا کرنی پڑتی۔ مگر مجھے دلی مسرت نصیب ہوتی، کہ میں اس طریقہ سے ہی ایک دوست کی خدمت انجام دیتا ہوں۔ ایک روز میں پوریوں کے انتظار میں تھا، کہ ان کے ہاں ایک صاحب فیروز پور سے تشریف لائے۔ اور انہوں نے اپنے مصائب بیان کرتے ہوئے چاہا، کہ ان پر جو ظلم وہاں کے تحصیلدار کے ہاتھوں ہو رہا ہے، اسے اخبار میں شائع کیا جائے۔ مظالم کی یہ داستان جب اس شخص نے سنائی، تو ایڈیٹر صاحب نے پوچھا کہ سب سے پہلے یہ بتایئے، کہ آپ ہمارے اخبار کے خریدار ہیں، یا نہیں؟ اس کے جواب میں اس نے بتایا کہ وہ خریدار نہیں ہیں، تو ایڈیٹر صاحب نے کہا کہ چھ روپیہ سالانہ چندہ ہے۔ یہ رقم دیجئے اور آپ اخبار کے خریدار ہوں گے، تو پھر ہم اس مسئلہ پر غور کر سکتے ہیں، کہ آیا آپ پر کئے جا رہے ظلم کے خلاف آواز پیدا کی جا سکتی ہے، یا نہیں؟ ایڈیٹر صاحب کے اس مطالبہ پر اس شخص نے بتایا کہ وہ غریب ہے اور چھ روپیہ ادا نہیں کر سکتا۔ تو ایڈیٹر صاحب نے فرمایا، تو پھر اخبار میں اس ظلم کے خلاف آواز بھی پیدا نہیں کی جا سکتی۔ اس گفتگو کو سننے کے بعد راقم الحروف نے مزاحیہ انداز سے اس غریب شخص سے کہا، آپ چاہے امیر ہوں یا غریب، یہ چندہ تو اخبارات کی کورٹ فیس ہے، جس کو ادا کئے بغیر اس صحافتی عدالت میں شنوائی نہیں ہو سکتی، یہ کورٹ فیس تو آپ کو دینی پڑے گی۔ کیونکہ نہ تو کوئی عدالت بغیر کورٹ فیس کے کوئی درخواست لے سکتی ہے، اور نہ اخبارات اپنی اس کورٹ فیس، یعنی چندہ کے بغیر کوئی بات سن سکتے ہیں۔ راقم الحروف کے اس لطیفہ پر وہاں بیٹھے تمام دوست ہنس پڑے۔

صحافتی ریمانڈ

لاہور کے ایک ایڈیٹر صاحب اپنے اخبار میں گندے اور سنسنی پیدا کرنے والے مضامین لکھنے میں بہت مشہور تھے۔ لندن کے اخبار ''ٹٹ بٹس'' اور ''نیوز آف دی

ورلڈ‘‘ کے مضامین سے ترجمہ کر کے شائع کر کے اپنے اخبار کو دلچسپ بنا لیتے، اور کبھی کبھی موقع ملنے پر کسی نہ کسی ریاست پر بھی ہاتھ صاف کر لیتے۔ آپ نے ایک مضمون ریاست کپورتھلہ کے متعلق لکھا۔ جس میں مرحوم مہاراجہ پر غلیظ الزامات لگائے۔ ریاست کپورتھلہ کے وزیراعظم خان بہادر میاں عبدالحمید مہاراجہ کے یورپ کے عشرت کدوں کی سیر کے باعث ریاست کے انچارج ہوا کرتے، اور نہ چاہتے تھے، کہ مہاراجہ کی عیاشیوں کا لوگوں کو پتہ چلے، اور مہاراجہ کی بدنامی ہو۔ اس کے علاوہ میاں صاحب کچھ کمزور طبیعت کے بھی تھے۔ آپ نے اپنا آدمی بھیج کر اس اخبار کے ایڈیٹر صاحب کو کپورتھلہ ہاؤس لاہور میں بلوایا، اور ایک سو روپیہ اس غرض کے لئے دیا، کہ یہ آئندہ کپورتھلہ کے خلاف نہ لکھیں۔ اس ’’سمجھوتہ‘‘ کو ہوئے ایک برس ہا تھا، کہ اس اخبار میں مہاراجہ کپورتھلہ کے خلاف پھر ایک مضمون شائع ہوا، اور اس مضمون کے شائع ہونے کے بعد آپ اسی ہفتہ شملہ چلے گئے، جہاں کہ میاں عبدالحمید مقیم تھے۔ شملہ پہنچنے کے بعد آپ شام کو مال روڈ پر گئے کیونکہ شملہ کا ہر شخص شام کو مال روڈ پر سیر کے لئے آیا کرتا، اور آپ کو یقین تھا کہ میاں صاحب بھی مال روڈ پر آئیں گے تھوڑی دیر آپ ماروڈ پر پھرتے رہے، میاں صاحب بھی وہاں آ گئے۔ سلام و دعا کے بعد میاں صاحب اور ایڈیٹر صاحب کے درمیان یہ گفتگو ہوئی

میاں صاحب: ایڈیٹر صاحب آپ نے پھر وعدہ شکنی کی۔ آپ نے وعدہ کیا تھا، کہ آئندہ ریاست کپورتھلہ یا مہاراجہ کپورتھلہ کے خلاف کبھی کچھ نہ لکھا جائے گا۔

ایڈیٹر صاحب: ہاں میاں صاحب میں اپنے وعدے پر قائم ہوں۔

میاں صاحب: وعدے پر کیا خاک قائم ہیں۔ اس ہفتہ ہی آپ نے مہاراجہ کے خلاف مضمون لکھا ہے۔

ایڈیٹر صاحب: میاں صاحب آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے، میں ریاست کپورتھلہ کے خلاف نہیں ہوں۔ اس ہفتہ والا مضمون تو صرف بطور ایک ریمائنڈر کے ہے، کیونکہ ایک

برس ہو گیا۔ ایک سال سے آپ نے کچھ نہیں بھیجا، اب آپ کو سالانہ قسط ادا کرنی چاہئے۔

میاں صاحب ''ریمانڈ'' سن کر ہنس دیئے اور فرمایا کہ کل ان کی کوٹھی پر آ کر سالانہ قسط لے جائیے۔ چنانچہ ایڈیٹر صاحب اگلے روز صبح میاں صاحب کی کوٹھی پہنچے ایک سو روپیہ کے دس دس روپیہ والے نوٹ لئے، اور واپس تشریف لے گئے۔

ضمیر کی قیمت ایک پیالی چائے

لاہور کے ایک ہفتہ وار اخبار کے ایڈیٹر صاحب کے مرحوم مہاراجہ نابھ سے بھی کچھ مراسم تھے۔ مرحوم مہاراجہ سردار سردول سنگھ کویشر کے بہت گہرے دوست تھے۔ مگر ایک زمانہ ایسا آیا، کہ مہاراجہ اور سردار سردول سنگھ کویشر کے درمیان کچھ کشیدگی سی پیدا ہو گئی۔ ان ایڈیٹر صاحب کو جب مہاراجہ نابھ اور سردار سردول سنگھ کی کشیدگی کا علم ہوا، تو آپ نے مہاراجہ کو خوش کرنے کے لئے سردار سردول سنگھ کے خلاف ایک بہت ہی گندہ اور مغلظ لیڈر لکھا، اور یہ مضمون مہاراجہ کو بھیجا گیا، تا کہ مہاراجہ خوش ہوں اس واقعہ کے دو ہفتہ بعد ایک بہت بڑے کانگرسی لیڈر لاہور آئے، اور ان کے اعزاز میں سردار سردول سنگھ کویشر نے بہت شاندار دعوت دی، جس میں کہ لاہور کے تمام سرکردہ لیڈروں اور ورکروں کو بھی دعوت نامے بھیجے گئے۔ اور اس کے ساتھ سردار صاحب نے ان ایڈیٹر صاحب کو بھی دعوتی کارڈ بھیج دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا، کہ اس پارٹی میں ایڈیٹر صاحب تشریف لائے، جن کا استقبال سردار سردول سنگھ کویشر نے کیا، اور ان کو ایک بہت اچھی جگہ بٹھایا، جہاں کہ دوسرے کانگرسی لیڈر بیٹھے تھے۔ چائے کے ختم ہونے کے بعد دوسرے لوگوں کے ساتھ ایڈیٹر صاحب بھی اپنے گھر واپس چلے گئے، اور بہت خوش کہ سردار سردول سنگھ نے ان کے ساتھ بہت محبت اور عزت کا سلوک کیا، اور لیڈروں کے ساتھ بٹھایا، چنانچہ اس عزت افزائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایڈیٹر صاحب نے اگلے ہفتہ ہی ایک دوسرا لیڈر لکھا، جس میں کہ سردار سردول سنگھ کی تعریف کرتے

ہوئے ان کے کانگریس کا صدر منتخب کئے جانے کی سفارش کی گئی۔اس واقعہ کے دس روز بعد سردار سردول سنگھ کولیشر ملے، اور ان سے تمام حالات معلوم ہوئے، تو راقم الحروف نے ان سے کہا، آپ کو کمال حاصل ہے، کہ آپ نے ایک آنہ کی چائے کی ایک پیالی میں ان ایڈیٹر صاحب کا ضمیر خرید لیا۔سردار سردول سنگھ یہ سن کر مسکرا دیئے اور کہا کہ ایک کامیاب لیڈر کے لئے ضروری ہے کہ وہ مخالف کا بھی مسکرا کر جواب دے، اور کوشش کرے، کہ دشمن بھی اس کے دوست ہوں۔

ایڈیٹری ایک مفید پیشہ

پٹیالہ میں ایک صاحب پنڈت ملکھی رام شرما کسی دفتر میں کلرک تھے، وہاں ساٹھ روپیہ تنخواہ پاتے۔انہوں نے پٹیالہ میں دیکھا، کہ ایڈیٹر لوگ وہاں آتے ہیں، بڑے بڑے افسروں اور مہاراجہ سے ملتے ہیں، اور رخصت ہوتے وقت سو دوسو روپیہ بطور رخصتانہ بھی وصول کرتے ہیں۔آپ نے سوچا، کہ اس کلرکی کے مقابلہ پر تو ایڈیٹری ہی اچھی ہے۔کلرکوں کو تو ڈپٹی کمشنر سے ملنا بھی ممکن نہیں، اور یہ ایڈیٹر مہاراجہ سے مل لیتے ہیں۔سرکاری دعوتیں اڑاتے، اور چلتے وقت بطور رخصتانہ روپیہ وصول کرتے ہیں۔
آپ اس کلرکی سے مستعفی ہو گئے، اور دہلی تشریف لے آئے۔دہلی پہنچنے کے بعد آپ راقم الحروف سے ملے، اور اپنا اخبار جاری کرنے کے سلسلہ میں مشورہ طلب کیا۔راقم الحروف سے نیا اخبار جاری کرنے کے متعلق جب بھی کوئی مشورہ لیتا، تو وہ مشورہ لینے والوں کی کبھی حوصلہ شکنی نہ کرتا۔حالانکہ وہ جانتا، کہ اخبار جاری کرنا ایک خار دار میدان میں قدم رکھنا ہے۔کیونکہ اگر حوصلہ شکنی کی جاتی، تو راقم الحروف پر پیشہ ورانہ حاسد ہونے کا الزام لگایا جاتا۔پنڈت ملکھی رام شرما نے ’’انصاف‘‘ کے نام سے ڈیکلریشن داخل کر دیا، اور یہ اخبار جاری ہو گیا۔
پنڈت ملکھی رام شرما ذاتی اعتبار سے بہت ہی مخلص اور دوست نواز شخصیت تھے۔آپ نے اخبار جاری کر دیا۔چند ماہ تو یہ اخبار ہر ہفتہ باقاعدہ شائع ہوتا رہا۔اس

کے بعد جب مالی مشکلات پیدا ہوئیں، تو یہ اخبار کبھی دو ہفتہ بعد اور کبھی تین ہفتہ بعد شائع ہوتا۔ آپ اکثر دفتر ''ریاست'' میں تشریف لایا کرتے۔ جنگ کے زمانہ میں آپ نے حکام سے مل کر کنٹرول کے اشتہارات حاصل کر لئے۔ آپ کے اخبار کا نام عدالتی اشتہارات کی سرکاری لسٹ میں شامل کر دیا گیا۔ سینما کا بھی کوئی نہ کوئی اشتہار حاصل کر لیتے، اور اپنا گزارہ کر لیتے۔ مگر آپ اپنی مالی مشکلات بیان کیا کرتے۔ ایک روز راقم الحروف نے پنڈت ملکھی رام سے کہا، کہ پنڈت جی اس صورت میں اخبار جاری رکھنے سے کیا حاصل، جبکہ یہ اخبار نہ تو آپ کے لئے کافی مالی منافع کا باعث ہے، اور نہ پبلک کی کوئی خدمت انجام دے رہا ہے۔ کبھی کبھی شائع ہوتا ہے، اور اسے کوئی اہمیت حاصل نہیں۔ پنڈت جی نے میرے سوال کا جو جواب دیا، وہ بہت ہی دلچسپ تھا۔ آپ نے فرمایا۔

''اخبار جاری کرنے سے پہلے میں پٹیالہ کے ایک دفتر میں ساٹھ روپیہ ماہوار کا کلرک تھا، اور ایک کلرک کی جو پوزیشن ممکن ہے، وہ آپ پر ظاہر ہے۔ اب میں ایک ہفتہ وار اخبار کا ایڈیٹر ہوں۔ جب چاہتا ہوں، چیف کمشنر، ڈپٹی کمشنر اور دوسرے افسروں سے مل سکتا ہوں۔ لوگ مجھے ایڈیٹر صاحب کہتے ہیں، اور میری بیوی بھی محلّہ میں ایڈیٹرنی صاحبہ کہلاتی ہے۔ ٹی پارٹیوں میں مدعو کیا جاتا ہوں، سینما کے پاس مفت مل جاتے ہیں۔ کئی لوگ میرے پاس آتے ہیں، اور مجھ سے افسروں سے سفارش کراتے ہیں۔ اب میں پٹیالہ یا سنگرور وغیرہ کسی ریاست میں جاتا ہوں، تو وہاں سرکاری مہمان ہوتا ہوں، اور وہاں سے رخصت ہوتے وقت سو دو سو روپیہ بھی دیا جاتا ہے۔ اخبار جاری کرنے سے پہلے پٹیالہ کے ڈپٹی کمشنر سے ملنا ممکن نہ تھا۔ اب میں وہاں کے وزراء سے بے تکلف ملتا ہوں، اور میں کھا پی کر سو ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار بچا لیتا ہوں۔ آپ ہی بتائیے کہ وہ کلرکی اچھی تھی یا یہ ایڈیٹری۔ اور اگر میں اب اخبار بند کر دوں، تو پھر کلرکی کرنا میری حماقت نہ ہوگی؟ کیونکہ اخبار بند کرنے کے بعد میں اب

سوائے کسی دفتر کی کلرکی کے کر بھی کیا سکتا ہوں۔''

پنڈت ملکھی رام شرما کی یہ صاف بیانی مجھے لاجواب کرنے کے لئے کافی تھی۔ کیونکہ اگر پبلک کی خدمت کا سوال نہ ہو، تو معمولی قابلیت کے لوگوں کے لئے اخبار جاری کرنا منافع بخش پیشہ ہے۔

خریدار کم ہونے کا روشن پہلو

دہلی سے ایک ہفتہ وار انگریزی اخبار ریاستوں کے معاملات کے لئے وقف تھا۔ اس اخبار میں بعض ریاستوں کی تعریفیں اور بعض کی مخالفت ہوتی۔ یہ اخبار ہمیشہ ہی دو سو سے زیادہ کبھی نہ چھپا، اور ان دو سو پرچوں میں سے بھی پچاس کے قریب تو خریدار تھے، ایک سو کے قریب اخبار بڑے بڑے لوگوں اور اخبارات کو مفت بھیجا جاتا، اور پچاس پرچے دفتر میں پڑے رہتے۔ چنانچہ اس اخبار میں تین ماہ تک پنجاب کی ایک مسلم ریاست کے خلاف مضامین شائع ہوتے رہے، اور نواب صاحب پر الزامات لگائے گئے۔ تین ماہ کی اس ''صحافتی گولہ باری'' کے بعد نواب صاحب کے سیکرٹری دہلی آئے، اور اس اخبار کے ایڈیٹر صاحب سے ملے۔ پانچ سو روپیہ میں فیصلہ ہوا تو اگلے ہفتے معاہدہ کے مطابق ایڈیٹر صاحب نے ایک ایڈیٹوریل شائع کیا، جس میں اس بات کا اظہار افسوس کیا گیا، کہ اس اخبار کو ان نواب صاحب کے متعلق غلط اطلاعات ملی تھیں، جن کی اب تردید کی جا رہی ہے۔ اس اخبار کے مدراسی ایڈیٹر صاحب دوسرے چوتھے روز دفتر ''ریاست'' میں تشریف لایا کرتے۔ اس تردیدی ایڈیٹوریل کے شائع ہونے کے بعد آپ جب دفتر ''ریاست'' میں تشریف لائے تو باتوں باتوں میں راقم الحروف نے ان ایڈیٹر صاحب سے دریافت کیا، کہ تین ماہ تک مسلسل مخالفت کے بعد اب تردید کرنے کا اس اخبار کے پڑھنے والوں پر کیا اثر ہوگا؟ تو ایڈیٹر صاحب نے بے تکلفی سے ارشاد فرمایا:

''سردار صاحب خریدار ہیں کہاں، جو محسوس کریں گے۔''

یعنی جب اخبار کے خریدار ہی نہیں، تو محسوس کون کرے گا۔ پچاس خریدار ہیں، اور دو سو کی تعداد میں اخبار چھپتا ہے۔ یہ پچاس خریدار محسوس کرتے ہیں، تو کریں، ایڈیٹر صاحب کا پانچ سو روپیہ بھی تو ملا، جس سے اب کئی ماہ کے لئے کاغذ خرید لیا جائے گا۔ راقم الحروف اس جواب کو سن کر خاموش ہو گیا۔ کیونکہ ایسی تردیدیں کرنا ان اخبارات کے لئے ممکن نہیں، جو ہزارہا کی تعداد میں چھپتے ہیں۔ ان اخبارات کے خریدار اعتراضات سے بھرے ہوئے خطوط لکھ دیتے ہیں۔ ایسی تردیدیں ان اخبارات میں شائع ہونا بہت آسان ہیں، جن کے خریدار نہ ہوں۔

اخبارات کا خاندانی جرنلزم

ایک اہل الرائے کا قول ہے، کہ شاعروں، مصوروں، مصنفوں، موسیقاروں، صحافیوں، سنگتراشوں اور دوسرے آرٹسٹوں کو قدرت پیدا کرتی ہے، اور ان میں پیدائشی طور پر ان فنون کی صلاحیت ہوتی ہے۔ جہاں تک اس قول کے صحیح ہونے کا سوال ہے، دوسرے ممالک میں تو یہ قول شائد درست ہی ہے، مگر جہاں تک صحافت کے پیشہ اور ہندوستان اور پاکستان کا تعلق ہے، اس قول کو درست قرار نہیں دیا جا سکتا۔ کیونکہ یہاں صحافت کا پیشہ اکثر صورتوں میں خاندانی ہوا کرتا ہے۔ چاہے جرنلزم کے فن کے اعتبار سے اس پیشہ میں شیر کا بیٹا گیدڑ، باز کا بیٹا کوا، اشیئن کا بیٹا فاکس ٹریر، اور عربی گھوڑے کا بیٹا گدھا ہی کیوں نہ پیدا ہو۔ چنانچہ ہندوستان اور پاکستان میں اس قول شکنی کے حق میں ذیل کے صرف چند ثبوت پیش کیے جا سکتے ہیں:

1 مولانا ظفر علی خاں ایڈیٹر ''زمیندار'' کے صاحبزادہ مولانا اختر علی خاں، اور پوتے مولانا منصور علی خاں ایڈیٹر ''زمیندار''

2 مہاشہ کرشن ایڈیٹر ''پرتاب'' کے صاحبزادہ مہاشہ نریندر اور مہاشہ ویریندر ایڈیٹر ''پرتاب''

3 مہاشہ خوشحال چند عرف سوامی آنند سروتی ایڈیٹر ''ملاپ'' کے صاحبزادہ مہاشہ

یش اور مہاشہ رنبیر ایڈیٹر "ملاپ"

4 سردار امر سنگھ ایڈیٹر "شیر پنجاب" کے صاحبزادہ سردار جنگ بہادر سنگھ ایڈیٹر "شیر پنجاب"

5 سردار سوہن سنگھ ایڈیٹر "خالصہ رپورٹ" کے صاحبزادہ سردار بخشیش سنگھ ایڈیٹر "موجی" و پوتے سردار کرپال سنگھ ایڈیٹر "خالصہ"

6 حافظ عزیز حسن بقائی ایڈیٹر "حریت" کے صاحبزادہ مسٹر انیس بقائی ایڈیٹر "حریت"

7 سردار لابھ سنگھ نارنگ ایڈیٹر "فتح" کے صاحبزادہ سردار مہندر سنگھ نارنگ ایڈیٹر "فتح"

8 مسٹر جگت نرائن ایڈیٹر "ہند سماچار" کے صاحبزادہ مسٹر رمیش چندر ایڈیٹر "ہند سماچار"

9 ماسٹر تارا سنگھ ایڈیٹر "پربھات" کے صاحبزادہ سردار موہن سنگھ ایڈیٹر "پربھات"

انٹرویو نہ دینے کی سزا

لاہور کے ایک ہفتہ وار اردو اخبار کے ایڈیٹر صاحب جنوبی ہندوستان کے دورہ کے لئے مدراس وغیرہ گئے تو مرحوم آربندو گھوش کی شہرت آپ کو پانڈیچری بھی لے گئی۔ پانڈیچری پہنچنے کے بعد آپ آربندو آشرم تشریف لے گئے، اور چاہا کہ مرحوم آربندو گھوش سے ملاقات ہو۔ مگر آشرم کے مینجر نے بتایا کہ رشی آربندو سال میں صرف ایک روز لوگوں سے ملتے ہیں، اور اس کے علاوہ وہ کسی سے کوئی ملاقات نہیں کرتے۔ آشرم کے مینجر کا یہ جواب ایڈیٹر صاحب کے خون میں تلاطم پیدا کرنے کے لئے کافی تھا۔ آپ واپس لاہور پہنچے تو آپ نے مرحوم آربندو گھوش کے خلاف سلسلہ وار چار مضامین شائع کئے۔ ان مضامین میں مرحوم آربندو کو مغرور، متعصب، خود غرض، مکار اور بزدل لکھا۔ ان مضامین کا گو پبلک پر کوئی اثر نہ ہوا، کیونکہ مرحوم آربندو گھوش نہ

صرف ہندوستان بلکہ غیر ممالک میں بھی ایک رشی تسلیم کئے جاتے تھے۔ مگر ایڈیٹر صاحب نے تو یہ مضامین لکھ کر اپنے دل کو ٹھنڈا کر لیا۔ معلوم نہیں ہو سکا، کہ ایڈیٹر صاحب نے ان مضامین والے چار پرچے مرحوم آر بندو کو بھی بھیجے تھے، یا نہیں کیونکہ اردو اخبارات سرخ نشانات لگا کر وہ پرچے ان لوگوں کو ضرور بھیجا کرتے ہیں، جن کے خلاف یہ مضامین ہوں۔

☆☆☆☆☆☆

نشہ اور قوت ارادی

نشہ اور قوت ارادی دونوں متضاد ہیں۔ یعنی جس شخص کو نشہ کی عادت ہو، وہ قوت ارادی سے قطعی محروم ہو جاتا ہے۔ اور جس میں قوت ارادی کافی ہو، اس کا کسی بھی نشہ سے مغلوب ہونا ممکن نہیں میں اس سلسلہ میں چند واقعات بیان کرتا ہوں۔

1942ء میں دہلی کے ساٹھ کے قریب کانگرسی لیڈر اور ورکر ملتان جیل میں تھے، اور ان کانگرسیوں کے ساتھ راقم الحروف بھی شامل تھا۔ حالانکہ میں کانگرسی نہ تھا، اور میرے ان لوگوں کے ساتھ شامل کئے جانے کی وجہ صرف یہ تھی، کہ دہلی پولیس کے بعض بڑے افسر میرے خلاف تھے۔ کیونکہ میں نے مقدمات کے سلسلہ میں ان افسروں پر ہائیکورٹ میں بعض سنگین الزامات لگائے تھے۔ ہمیں ملتان جیل میں لے گئے کچھ روز ہی ہوئے تھے، کہ دہلی اور دوسرے مقامات کے کچھ قیدیوں کا ایک قافلہ ملتان جیل سے انبالہ جیل تبدیل کر دیا گیا۔ ہم لوگ رات کو نو بجے کے قریب قیدیوں کے ایک ڈبہ میں ملتان سے روانہ ہوئے، اور یہ گاڑی صبح چار بجے کے قریب رائے ونڈ اسٹیشن پر پہنچی۔ ہمارے رائے ونڈ پہنچنے پر کسی کانگرسی نے ہمیں اسٹیشن پر دیکھ لیا، اور ہمارے ڈبہ کو کاٹ کر اسٹیشن کے قریب کھڑا کر دیا گیا۔ کیونکہ رائے ونڈ سے ٹھنڈہ جانے والی گاڑی کچھ دیر کے بعد لاہور سے آتی تھی، اور یہ ڈبہ اس گاڑی کے ساتھ لگا کر فیروزپور سے لدھیانہ کے راستہ انبالہ جانا تھا۔ علی الصبح چار بجے جب یہ ڈبہ رائے ونڈ پہنچا، اور رائے ونڈ منڈی کے لوگوں کو ہمارے رائے ونڈ اسٹیشن پر چار پانچ گھنٹے قیام کرنے کا علوم ہوا، تو ادھر تو ڈبہ کے قیدیوں کو پولیس نے ضروریات سے فارغ ہونے کی اجازت دی، اور ادھر رائے ونڈ کے لوگوں نے فوراً ہی ہم لوگوں کے لئے چائے کا انتظام کیا۔ یہ لوگ بہت بڑے بڑے برتنوں میں ہمارے لئے چائے لے آئے۔ گاڑی کے خانہ میں پانی کم تھا، اس لئے قیدیوں نے کچھ تو وہ پانی استعمال کیا اور ہاتھ منہ دھونے کے لئے پلیٹ فارم کے نل سے پانی حاصل کیا۔ ابھی تمام لوگ

ہاتھ منہ دھونے سے فارغ ہوئے تھے، کہ رائے ونڈ منڈی کے لوگ چائے لے آئے، اور جو قیدی ہاتھ منہ دھونے سے فارغ ہوئے تھے، انہوں نے چائے پینا شروع کر دی، اور جو لوگ ابھی ہاتھ منہ دھوکر فارغ نہ ہوئے تھے، ان میں لدھیانہ کے ایک کانگرسی سکھ بھی تھے۔ یہ سردار جی ساٹھ برس کی عمر کے تھے۔ اور افیون کھانے اور چائے پینے کے عادی تھے۔

افیون کھانے والے اکثر عموماً قبض میں مبتلا ہوتے ہیں، ان سردار جی کا بھی پاخانہ میں کافی وقت صرف ہوا۔ جب یہ پاخانہ سے باہر آئے تو دوسرے وہ لوگ چائے پی رہے تھے، جو ہاتھ منہ دھوکر فارغ ہو چکے تھے پلیٹ فارم کا نل اس ڈبہ سے تھوڑے فاصلہ پر تھا۔ سردار جی نے جب لوگوں کو چائے پیتے دیکھا، تو آپ نے سوچا کہ اگر وہ نل پر ہاتھ دھونے گئے تو چائے ختم ہو جائے گی۔ آپ افیون اور چائے کی طلب میں مبتلا تھے۔ آپ نے یہی فیصلہ کیا، کہ بغیر ہاتھ منہ دھوئے ہی چائے پی لینا چاہئے، تا کہ چائے نہ ختم ہو جائے۔ چنانچہ آپ نے صابن یا مٹی سے ہاتھوں کو صاف کئے بغیر ہی اپنے گلاس میں چائے طلب کی اور افیون کھانے کے ساتھ اپنے گلاس میں چائے پی لی۔ میں اس منظر کو ڈبہ میں بیٹھا دیکھ رہا تھا۔ مجھ سے نہ رہا گیا، اور میں نے سردار جی سے مذاقاً کہا:

''سردار جی آپ نے اپنے ہاتھ صابن یا مٹی سے صاف نہیں کئے، اور چائے پی لی۔''

میرا یہ اعتراض سن کر سردار جی بہت شرمندہ ہوئے، اور آپ نے شرمندہ اور نادم ہوتے ہوئے جواب دیا:

''پانی کا نل دور تھا، اگر میں نل پر جاتا، تو چائے ختم ہو جاتا۔''

سردار جی کا یہ جواب سن کر میں نے مذاقاً یہی کہا:

''جی ہاں، قیدی ہونا بھی آپت کال ہے، جہاں کہ سب کچھ جائز قرار دیا جا سکتا ہے۔''

(آپت کال ہندی زبان میں اس زمانہ کو کہتے ہیں، جبکہ انسان مجبوری کی حالت میں ہو، اور غیر مناسب قدم بھی اٹھا سکتا ہو) یعنی اگر سردار جی افیون اور چائے کے نشہ میں مبتلا نہ ہوتے، تو اس وقت اپنی قوت ارادی سے محروم ہو کر بغیر اچھی طرح ہاتھ صاف کئے چائے طلب نہ فرماتے۔

مرحوم مولانا محمد علی نے راقم الحروف کو نشہ کے سلسلہ میں ایک بہت ہی افسوسناک واقعہ سنایا۔ آپ 1917ء کے قریب خلافت ایجی ٹیشن کے سلسلہ میں جب نظر بند کئے گئے، تو آپ سب سے پہلے گرفتار کئے جا کر دہلی کے قریب مہرولی میں نظر بند کئے گئے۔ اور دہلی کے لوگ جب آپ سے ملنے کے لئے مہرولی جانا شروع ہوئے، تو آپ بتول (سی پی) جیل بھیج دیئے گئے بتول جیل میں اس وقت ایک بوڑھا قیدی بھی موجود تھا، جس کو کئی برس کے طویل عرصہ قید کی سزا تھی۔ یہ قیدی ہونے سے پہلے تمباکو کھانے اور بیڑی پینے کا بہت عادی تھا، اور اس زمانہ جیل میں قیدیوں کو بیڑی پینے کی سخت ممانعت تھی۔ ایک روز افسر جیل کے معائنہ کے لئے آیا، تو اس افسر نے جیل کے اندر پان کھایا۔ اس پان میں تمباکو بھی تھا۔ اس افسر نے جب پان کھایا، اور پان کھانے کے بعد پان کی پیک کو تھوکا، تو اس بوڑھے قیدی نے اس تھوک کو اٹھا کر اپنے منہ میں رکھ لیا، تاکہ وہ تمباکو کی اپنی طلب کو پرا کر سکے۔ مرحوم مولانا کو یہ منظر دیکھ کر بہت تکلیف ہوئی، اور آپ نے جیل کے افسروں سے سفارش کر کے اس قیدی کے لئے پرائیویٹ طور پر بیڑی پینے کا انتظام فرمایا۔ اگر یہ قیدی تمباکو کے نشہ کے باعث اپنی قوت ارادی سے قطعی محروم نہ ہو چکا ہوتا تو اس کو تھوک کی غلاظت کھانے کی ضرورت نہ تھی۔

دہلی کے ڈاک خانہ میں سے ایک بیمہ چوری ہو گیا، جو غالباً بیس ہزار روپیہ کا تھا، اور یہ بیمہ بینک نے اپنی دہلی برانچ کو بھیجا تھا۔ بیمہ کے گم ہونے پر ڈاک خانہ کے پوسٹ ماسٹر نے پولیس کو اطلاع دی۔ پولیس تحقیقات کے لئے آئی، اور ڈاک خانہ کا ایک کلرک اس سلسلہ میں گرفتار کیا گیا، جو شراب پینے کا عادی تھا۔ اس کلرک کو گرفتار کر

کے حوالات بھیج دیا گیا۔اس مقدمہ کی تحقیقات پر ایک سکھ انسپکٹر پولیس مقرر ہوا، جس کا نام غالباً سردار جسونت سنگھ تھا۔ان سردار جسونت سنگھ نے تحقیقات کے سلسلہ میں بہت کوشش کی، کہ بیمہ کا پتہ چل سکے، اور آپ نے وہ کچھ بھی کیا، جو پولیس عام طور پر مشتبہ ملزموں کے ساتھ کرتی ہے، مگر کلرک جرم سے انکار ہی کرتا رہا۔ یہ تحقیقات ایک ہفتہ تک جاری رہی۔سردار جسونت سنگھ ہر روز ہی اس کلرک سے ''انٹیروگیشن'' کرتے رہے، اور ''تھری ڈگری'' طریقے بھی استعمال ہوئے مگر کلرک نے جرم کا اقرار نہ کیا۔ آخر سردار جسونت سنگھ کو جب یہ علم ہوا کہ کلرک شراب پینے کا عادی ہے تو آپ اس کلرک کو اپنے کوارٹر میں لے گئے اسے دم دلا سا دیا۔ بہت اچھا کھانا پکوایا، جس میں مرغ بھی تھا۔ایک بوتل شراب منگائی، اور اس کلرک سے آپ نے کہا:

''میں سکھ ہوں، اور تم میرے سکھ بھائی ہو۔مجھے بہت افسوس ہے کہ میں ایک ہفتہ تک تمہارے لئے جسمانی اذیت کا باعث ثابت ہوا۔ گورنمنٹ بہت ظالم ہے، جس کے حکم سے میں نے تمہیں تکلیف دی۔آپ میرے ساتھ کھانا کھائیے میں آپ کو تکلیف دینے کے گناہ کی معافی چاہتا ہوں۔''

اس سکھ کلرک کو کھانے سے پہلے شراب پیش کی گئی کلرک بہت خوش، کہ انسپکٹر بدسلوکی کی معافی چاہتا ہے جب کلرک نے شراب کے کافی پیگ پی لئے، اور انسپکٹر صاحب بھی پینے میں شامل رہے، تو انسپکٹر صاحب نے گورنمنٹ کو گالیاں دیتے ہوئے کہا کہ وہ بھی گورنمنٹ کے خلاف ہے اور اگر یہ کلرک یہ بیمہ انسپکٹر کو دے، تو بیمہ کی رقم نصف نصف کر لی جائے گی۔اور مقدمہ داخل دفتر کر دیا جائے گا۔کلرک نے شراب کافی پی لی تھی، اور وہ نشہ سے مغلوب تھا۔اس نے نشہ کی حالت میں انسپکٹر صاحب پر اعتبار کر لیا، اور بتا دیا، کہ اس نے بیمہ والا لفافہ اپنے مکان کے ایک کونہ میں دفن کر رکھا ہے۔اس اطلاع کے ملنے پر انسپکٹر صاحب اس کلرک کو اپنے ساتھ کلرک کے گھر لے گئے گھر کے اس کونہ کو کھودا گیا جہاں کہ بیمہ کا لفافہ دفن تھا۔لفافہ انسپکٹر

صاحب نے حاصل کر لیا۔ کلرک پر مقدمہ قائم ہوا، اور اسے عدالت سے سرکاری روپیہ تغاب کرنے کے جرم میں چار برس کی قید سخت کی سزا ہوئی۔ یعنی اگر یہ کلرک بھی شراب نوشی کی عادت کے باعث اپنی قوت ارادی سے محروم نہ ہوتا، تو شائد اس بیمہ کا کبھی بھی کوئی سراغ نہ نکلتا، اور کلرک قید اور ملازمت سے موقوف بھی نہ ہوتا۔

نشے تو تمام ہی برے ہیں، مگر گانجہ ان سب میں نقصان دہ ہے۔ گانجہ پینے والا اپنی قوت ارادی سے بالکل ہی محروم ہو جاتا ہے، اور یہ روز بروز سوکھتا چلا جاتا ہے ایک نیم پاگل سوامی پارس ناتھ تین برس تک دفتر ''ریاست'' میں بطور مہمان مقیم رہے۔ یہ ہندی زبان کے اچھے مضمون نگار اور شاعر تھے۔ آگرہ کے ایک ماہوار رسالہ کو بھی ایڈٹ کرتے رہے۔ ان کے سنیاسی ہونے کے بعد حضرت احمق پھپھوندوی کا خط لے کر دہلی آ گئے۔ چونکہ یہ نیم پاگل اور تعلیم یافتہ تھے، اور قریب قریب ہر زمانہ میں راقم الحروف کو نیم پاگلوں سے دلچسپی رہی، کیونکہ یہ باتوں باتوں میں بہت تفریح کا باعث بنتے ہیں، آپ کو بہت اخلاص اور قدر کے ساتھ دفتر ''ریاست'' میں رکھا گیا۔ آپ کو خیالی طور پر الہ آباد کی ہندی زبان کی ایک مشہور شاعرہ سے بہت عشق تھا۔ ایک تو یہ عشق، رات پھر اپنی معشوقہ کے خیال میں مصروفیت اور دوسرے آپ گانجہ پیتے، آپ بہت دبلے پتلے تھے۔ ایک روز میں نے باتوں باتوں میں آپ سے اپنے موٹاپے کی شکایت کی تو آپ نے فرمایا:۔

''تم میرے نسخے پر عمل نہیں کرتے، ورنہ چند روز میں ہی تمہاری چربی بہت کم ہو جائے گی۔''

میں نے عرض کیا فرمایئے وہ نسخہ کیا ہے؟ تو آپ نے ارشاد فرمایا:

''گانجہ پینا شروع کر دو، ایک ماہ میں جسم تناسب میں آ جائے گا۔''

میں ان کو کیا جواب دیتا یہ نسخہ کئی روز تک دوستوں میں تفریح کا باعث رہا، کیونکہ سوامی جی سے ملنے کے لئے شام کو کئی دوست آیا کرتے۔ میں نے دیکھا، کہ یہ بھی

گانجہ پینے کے باعث اپنی قوت ارادی سے قطعی محروم ہو چکے تھے گانجہ کے فروخت کرنے کی سرکاری طور پر ممانعت تھی، مگر انہوں نے جامع مسجد کے قریب ناجائز گانجہ فروخت کرنے والوں کو تلاش کر لیا تھا۔ اگر وہاں کوئی گانجہ فروش نہ ملتا، تو بے چارے گانجہ خریدنے کے لئے غازی آباد جاتے، اور وہاں سے حاصل کرتے۔

گانجہ کے متعلق ایک بہت ہی افسوسناک واقعہ ہے۔ نابھ کے ایک اچھے خاندان کے ایک نوجوان کو گانجہ پینے کی عادت تھی۔ اس نوجوان کی عمر بیس برس کی تھی۔ اس کے والدین نے اس کی شادی کر دی۔ کیونکہ ہندوستان میں چاہے کوئی بیکار ہو، اور اپنا گزارہ بھی نہ کر سکے، اس کے والدین اس کی شادی ضرور کر دیتے ہیں۔ شادی کے بعد بھی جب یہ نوجوان کوئی کام نہ کرتا، اور گانجہ پیتا، تو گھر والے اس کو کوستے۔ یہ گھر والوں کی دشنام طرازی سے تنگ آ گیا، تو یہ اپنی بیوی کو لے کر گھر والوں سے الگ ہو گیا۔ الگ ہونے کے بعد نہ آمدنی کا کوئی ذریعہ تھا۔ اور گانجہ پینے کے باعث یہ اپنی قوت ارادی سے قطعی محروم ہو چکا تھا اور اس کے علاوہ اس کی صحت بھی تباہ ہو چکی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی بیوی آوارہ ہو گئی، اور یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر نہ صرف خاموش رہتا، بلکہ اپنی بیوی کے ذریعہ اپنے اخراجات بھی پورے کرتا۔ یعنی گانجہ کے نشہ کے باعث یہ بالکل تباہ اور اپنے خاندان کے لئے باعث ندامت ثابت ہوا۔

میں دہلی جیل میں تھا، کہ وہاں آرمینین نسل کا ایک موٹر ڈرائیور جیل میں لایا گیا، جس کو دہلی پولیس نے اس شبہ میں گرفتار کیا کہ وہ جاسوس ہے یہ شخص مسٹر شاہ کا موٹر ڈرائیور رہا تھا، اور مسٹر شاہ وہ اہم شخصیت تھے، جنہوں نے عرب کو انگریزوں کے زیر اثر رکھنے میں بہت بڑا پارٹ ادا کیا تھا۔ اس آرمینین کو چائے پینے کی بہت عادت تھی۔ یہ جب جیل میں آیا، اور میں اس سے ملا، تو اس نے ملتے ہی سب سے پہلے یہ سوال کیا، کہ خدا کے لئے مجھے ایک کپ چائے دو۔ کیونکہ چائے نہ ملنے کے باعث یہ بہت بے حال تھا، میں نے اس کو چائے پلائی، تو یہ کچھ مطمئن سا تھا۔ میرا یقین ہے کہ

اگر یہ بے چارا جاسوس ہوتا، اور چائے کی طلب اس کو مجبور کرتی ،تو یہ اپنے ملزم ہونے کا فوراً اقرار کر لیتا، مگر یہ قطعی بے قصور تھا۔ چائے نہ ملنے کے باعث یہ بھی اپنی قوت ارادی سے قطعی محروم ہو چکا تھا، کیونکہ حوالات میں اسے چائے نہ دی گئی تھی، اور چائے نہ ملنے کے باعث یہ اپنے دماغی توازن سے بھی ایک حد تک محروم ہو چکا تھا۔

میں اصولاً شراب پینے کے خلاف نہیں ہوں، اور اگر بہت تھوڑی مقدار میں اچھی شراب پی لی جائے، تو اسے صحت کے لئے مفید سمجھتا ہوں۔ چنانچہ بہت برس ہوئے ہندوستان کی ایک بہت بڑی میڈیکل اتھارٹی جنرل سوکھے نے مہاتما گاندھی کے اخبار ''ہری جن'' میں شراب پینے کے حق میں ایک مضمون لکھا تھا اور شراب کے قطعی ممانعت کے قانون کی مخالفت کرتے ہوئے کہا تھا، کہ چالیس برس کی عمر کے بعد انسان کو اپنی صحت قائم رکھنے کے لئے تھوڑی سی شراب ضرور پینا چاہئے۔ کیونکہ اس عمر کے بعد انسان کے جسم کو الکحل یعنی شراب کی ضرورت ہے اور میں بھی کبھی کبھی نصف پیگ کے قریب کھانا کھانے سے پہلے برانڈی پیتا ہوں۔ میں اپنی پچھلی تمام زندگی میں کبھی بھی شراب سے مغلوب نہ ہوا، اور اکثر ایسا ہوا کہ میں نے کئی کئی ماہ تک شراب کو چھوا تک نہیں، حالانکہ شراب میرے گھر میں موجود رہی۔ مگر میں ادنیٰ کلاس کی شراب اور اس کے زیادہ پینے کو قوت ارادی کے لئے تباہ کن اور صحت کے لئے سخت مضر سمجھتا ہوں، اور ان لوگوں کو قابل رحم قرار دیتا ہوں، جو شراب سے مغلوب ہو کر اپنی قوت ارادی سے قطعی محروم ہو جاتے ہیں، اور قوت ارادی سے محروم ہونے کے باعث جرائم کے مرتکب بھی ہوتے ہیں۔ چنانچہ میری رائے ہے کہ ہندوستان کی گورنمنٹ، افیون، چرس، گانجہ، تمباکو اور شراب پر سخت پابندیاں عائد کرے اور ان کا فروخت اور استعمال قابل تعزیر جرم قرار دیا جائے۔ مگر اچھی قسم کی شراب مثلاً برانڈی وغیرہ میڈیکل سرٹیفکیٹ پر پرمٹ کے ذریعہ ضرورت مند لوگوں کو دی جائے۔

☆☆☆☆☆☆

گناہگاروں کی بے گناہیاں

شری کرشن پانچ ہزار برس پہلے تھے۔ حضرت مسیح دو ہزار برس پہلے۔ حضرت محمدؐ تیرہ سو برس پہلے اور گورو نانک چار سو برس پہلے گورو نانک کے بعد درجنوں نہیں، سینکڑوں درویش، ولی اللہ اور خدا رسیدہ بزرگ پیدا ہوئے، جو اپنی تمام زندگی لوگوں کو گناہوں سے باز رہنے کی تلقین کرتے رہے۔ مگر دنیا کے گناہ کم نہ ہوئے۔ اور جب تک دنیا قائم ہے، گناہ ہوتے رہیں گے۔

گناہوں کے مسئلہ پر غور کیا جائے تو ان کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک وہ حصہ جس کو انسان گناہ سمجھ کر کرتا ہے، اور دوسرا وہ حصہ، جن کے ہم مرتکب تو ہوتے ہیں، مگر ان کو ہم گناہ نہیں سمجھتے۔ یعنی گناہگار ہوتے ہوئے بھی ہم اپنے آپ کو بیگناہ قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ میں چند ایسے گناہ پیش کرتا ہوں، جو فی الحقیقت تو گناہ ہیں، مگر ہم ان کو گناہ نہ سمجھتے ہوئے ان کے مرتکب ہوتے ہیں۔

میری عمر پندرہ برس کی تھی، اور میں حافظ آبادی کی منڈی کی ایک دکان پر منیمی (یعنی لنڈے حرفوں میں دکان کی کلرکی) کا کام سیکھتا تھا۔ میری یہ شروع سے ہی عادت بلکہ فطرت ہے، کہ میں ہر شے کو دیکھنے کے بعد اس پر غور کرتا ہوں۔ اور اس منیمی کو سیکھنے یا منیمی کرنے (کیونکہ میں نے ایک برس کے قریب بطور منیم کے بھی ملازمت کی) کے زمانہ میں بھی ہر بات پر غور کرتا۔ اس زمانہ پنجاب کی منڈیوں میں دو بڑی یورپین فرموں کے دفاتر ہوتے تھے، ایک سنڈے پٹیر ک کمپنی اور دوسری ریلی برادرزان دونوں کمپنیوں کا کام یہ تھا، کہ یہ ان منڈیوں سے اناج خرید کر یورپ بھیجتیں اور ان دونوں فرموں کے ذریعے پنجاب کا کروڑہا من غلہ ہر سال یورپ جاتا۔ حافظ آباد کی اس منڈی کے بالکل قریب ایک بہت بڑا احاطہ تھا۔ منڈی کا جو دکاندار ان کمپنیوں کے پاس اپنا غلہ فروخت کرتا، غلہ فروخت کرنے سے پہلے اس احاطہ کو استعمال کرتا۔ جس کی صورت یہ تھی، کہ جتنا غلہ فروخت کرنا ہوتا، وہ اس احاطہ میں ایک

طرف جمع کر دیا جاتا، اور دوسری طرف مٹی کا بہت بڑا ڈھیر لگا دیا جاتا۔ یہ مٹی چھلنی میں چھنی ہوئی بہت باریک ہوتی، اور چیکنی (یعنی جس مٹی میں چپکنے کی صفت ہو) ہوا کرتی۔ سب سے پہلے احاطہ میں چند انچ اونچائی میں غلہ بچھا دیا جاتا، پھر اس پر چیکنی مٹی کا پاؤڈر ڈالا جاتا۔ چیکنی مٹی کے پاؤڈر کو غلہ پر ڈالنے سے پہلے غلہ پر مشکوں کے ذریعے پانی کا چھڑکاؤ کیا جاتا، اور پھر مزدور اس غلہ، پانی اور مٹی کے مکسچر کو پاؤں کے ساتھ چند منٹ ہلاتے، تاکہ گیلی مٹی غلہ کے ساتھ چپک جائے۔ اس کے بعد پھر نیا غلہ چند انچ تک اونچائی میں بچھایا جاتا، پھر پانی کا چھڑکاؤ ہوتا، اور پھر مٹی ڈال کر مزدوروں سے پاؤں کے ذریعے ملایا جاتا، اور اس طرح غلہ کا یہ ڈھیر دس دس پندرہ پندرہ اور بیس بیس فٹ بلند چلا جاتا، اور پھر اسکو بوریوں میں بھرا جاتا۔ یعنی منڈیوں کے یہ دکاندار، جو صبح ہی ہر روز مسجد، گوردوارہ، مندر یا ٹھاکر دوارہ میں ضرور جاتے، ان دونوں فرموں کے پاس غلہ فروخت کرنے سے پہلے غلہ میں سینکڑوں من مٹی اور پانی ملاتے، اور ایک دکاندار بھی اس بے ایمانی پر شرم محسوس نہ کرتا۔ اور اگر کبھی کوئی اعتراض کیا جاتا، تو اس اعتراض کا جواب صرف یہ ہوتا، کیا صرف ہم ہی کرتے ہیں، کیا تمام دکاندار یہ بے ایمانی نہیں کرتے۔ گویا کہ چونکہ تمام دکاندار ہی یہ گناہ اور بے ایمانی کرتے ہیں، اس لئے یہ گناہ بے گناہی قرار دے دیا گیا ہے۔

میرا اندازہ ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کے اردو، ہندی، انگریزی اور گورمکھی اخبارات کے حلقوں میں شائد پانچ فیصدی ایسے اخبارات ہوں گے، جن کے پاس اے بی سی کا اشاعت کے متعلق سرٹیفکیٹ نہ ہو، اور یہ مشتہرین کے پاس اپنی اشاعت کے متعلق جھوٹ نہ بولتے ہوں۔ اور جھوٹ بھی دوگنا، سہ گنا، پانچ گنا، دس گنا اور بیس گنا۔ یعنی اصل اشاعت پانچ سو ہوگی، تو مشتہرین کو دھوکہ دینے اور اشتہارات لینے کے لئے اس اخبار کا کنونیر مینجر یا ایڈیٹر پانچ، سات یا دس ہزار اشاعت بتائے گا۔ اور اگر اصل اشاعت سے کوئی واقف پرائیویٹ طور پر اس جھوٹ، بے ایمانی اور دھوکہ

کے متعلق دریافت کرے، تو جواب یہی ہوتا ہے کہ کیا یہ بے ایمانی صرف ہم ہی کرتے ہیں، دوسرے تمام اخبارات نہیں کرتے؟ یعنی چونکہ یہ گناہ سب اخبار والے کرتے ہیں، اس لئے یہ گناہ ثواب قرار دے دیا گیا ہے۔

آپ کسی افسر کو ٹیلی فون کیجئے، اور ملاقات کے لئے وقت پوچھئے ٹیلی فون پر جواب دینے والا یا تو ملازم ہوگا، یا افسر کی بیوی جواب یہ ہوگا، ٹیلی فون بند نہ کیجئے، میں دیکھ کر بتاتا ہوں (یا بتاتی ہوں) کہ صاحب گھر پر ہیں یا نہیں حالانکہ صاحب ٹیلی فون کے پاس ہی بیٹھے چائے پی رہے ہوتے۔ ملازم یا بیوی جب پوچھتیں، کہ فلاں صاحب ملنے کے لئے وقت پوچھتے ہیں اور اگر صاحب ملنا نہ چاہیں تو ملازم یا بیوی ٹیلی فون کرنے والے کو جواب دیتے ہیں کہ صاحب گھر پر نہیں ہیں اور اگر ٹیلی فون کرنے والا یہ پوچھے کہ صاحب کا گھر پر آنے کا کون سا وقت ہے؟ تو جواب دیا جاتا ہے، کہ کچھ نہیں کہا جا سکتا، کہ کب آئیں گے۔ یعنی اس افسر نے اگر نہ ملنا ہو، تو ملازم یا بیوی کو بے تکلفی کے ساتھ جھوٹ بول کر کہنا پڑتا ہے، صاحب گھر پر نہیں ہیں۔ گویا کہ جھوٹ، جھوٹ بولنے والی فہرست سے خارج ہو چکا ہے۔

صوبہ جات کے وزراء دورہ پر جاتے ہیں اور یہ دورہ اگر ان کی کانسی ٹیوانسی میں ہو، تو یہ مصنوعی اور تصنع والی مسکراہٹ اور گرم جوشی کے ساتھ اپنے سرکردہ ووٹروں سے مصافحہ کرتے ہوئے پوچھتے ہیں کیا آپ لوگوں کو کوئی تکلیف تو نہیں؟ جواب میں ووٹر کہتا ہے کہ جناب آپ نے پچھلے سال حکم دیا تھا کہ کنوئیں کے پاس گندے پانی کی نکاسی کے لئے نالی بنائی جائے، مگر ابھی تک نالی نہیں بنائی گئی۔ یہ سن کر وزیر صاحب مصنوعی غصہ کی صورت میں اپنے پرسنل اسسٹنٹ کو (جو ساتھ ہی ہوتا ہے) فرماتے ہیں یہ پی ڈبلیو ڈی والے بہت خودسر ہیں، انہوں نے میرے حکم کی اب تک تعمیل نہیں کی۔ آپ نوٹ کیجئے کہ ان کو سزا دی جائے اور فوراً نالی بنائی جائے۔ یہ سن کر دیہاتی بھی خوش ہو جاتا ہے، اور وزیر صاحب بھی اپنے دورہ کا فرض پورا کر لیتے ہیں۔ ایک

برس اور گزر جاتا ہے، اور اگلے برس دورہ پر پھر وہی پی ڈبلیو ڈی کو کوسنے کا ڈرامہ کھیلا جاتا ہے۔ کیونکہ جمہوریت کے جھنڈے کے نیچے کسی وزیر کا جھوٹ بولنا کوئی گناہ نہیں، وزراء کی وعدہ خلافیاں ثواب قرار دے دی گئی ہیں، اور نئے انتخابات تک ان وعدہ خلافیوں اور طفل تسلیوں کا سلسلہ جاری رہے گا۔

آپ بازار میں سامان خریدنے جایئے۔ ایک دکاندار ایسا نہ ملے گا، جو زیادہ قیمت بتا کر کم قیمت نہ لیتا ہو، اور جھوٹ بولتے ہوئے گاہک کی جیب تراشی کرنا تجارتی ہوشیاری نہ سمجھتا ہو۔ مثلاً انڈے فروخت کرنے والے کے پاس جایئے۔ انڈوں کا نرخ پوچھیے، جواب ملے گا، دو روپیہ دس آنہ درجن، یعنی ساڑھے تین آنے کا ایک انڈہ گاہک دو آنہ دینا چاہے گا۔ دکاندار تین آنے کا مطالبہ کرے گا۔ آخر ڈھائی آنہ پر فیصلہ ہوگا۔ دو انڈوں کی قیمت پانچ آنہ دیتے ہوئے گاہک کہے گا، انڈے گندے نہ ہوں، تازہ ہوں۔ دکاندار کہے گا، بالکل تازہ ہیں، انڈے ہیں خراب ہوں، تو واپس کر دیجیے انڈے گھر پر لائے گئے، تو ان میں سے ایک گندہ، ایک اچھا۔ دکاندار خوش، کہ اس نے پانچ آنے میں ایک اچھا اور ایک گندہ انڈہ فروخت کیا۔ گاہک اب گندے انڈے کو لے کر واپس کرنے دکاندار کے پاس جائے، تو ایک گھنٹہ کا وقت صرف ہونے کے علاوہ دکاندار سے بک بک بھی کرنی پڑتی ہے گاہک مجبور ہے کہ دکاندار کو کوستے ہوئے گالیاں دے کر صبر کر لے۔ کیونکہ موجودہ اقتصادی کشمکش کے دور میں تجارتی بے ایمانی کو بددیانتی قرار نہیں دیا گیا۔

اردو اخبارات کے مالکان اور پبلشروں کو تجربہ ہے، کہ کسی کاتب کے پاس مسودہ لے کر جایئے، اور کتاب کی بات کیجیے تو کاتب بے تکلف دو تین روز کا وعدہ کرے گا۔ دو تین روز کے بعد جایئے، تو پھر دو روز کا وعدہ ہوگا۔ اور اس طرح ہی دس بارہ روز کی وعدہ بازی معمولی بات ہے، کیونکہ کاروبار کی دنیا میں وعدہ خلافی کو اخلاقی کمزوری قرار نہیں دیا جاتا۔

میرے پڑوس میں ایک صاحب کے ہاں چند مرغیاں تھیں۔ مرغیوں کی وباء پیدا ہوئی تو ان مرغیوں نے مرنا شروع کیا۔ جب دو چار مرغیاں مرگئیں، اور ایک مرغی پر کچھ غنودگی کا اثر تھا، تو انہوں نے بھنگی کو مرغی دے کر کہا، کہ بازار جا کر فوراً اس مرغی کو جتنے میں فروخت ہو، بیچ آؤ۔ بھنگی اس نیم مردہ مرغی کو آٹھ آنہ میں فروخت کر آیا اور اس پڑوسی نے یہ خیال نہ کیا، کہ آپ نے آٹھ آنہ حاصل کرنے کے لئے مرغی خریدنے والے انسان کے جسم میں بیماری کے جراثیم داخل کر دیئے۔ کیونکہ بیمار مرغی فروخت کرنا قانوناً یا اخلاقاً کوئی گناہ نہیں، اگر مرغی خریدنے والا تین روپیہ کی مرغی ارزاں سمجھ کر آٹھ آنہ میں خریدتا ہے۔

بہت برس ہوئے گراموفون کمپنی اپنی دہلی کی برانچ کے ذریعے اردو اخبارات کو اپنے ہاں سے جاری کئے گئے نئے گراموفون ریکارڈ ریویو کے لئے بھیجا کرتی تھی، اور اس سلسلہ میں دفتر ''ریاست'' میں بھی ہر ماہ چار یا پانچ ریکارڈ آیا کرتے تھے۔ گراموفون ریکارڈوں کو بھیجنے کا یہ سلسلہ کئی برس تک جاری رہنے کے بعد فوراً بند کر دیا گیا، تو راقم الحروف نے اپنی اس کمپنی کے ایک کلرک سے ریکارڈوں کے بند ہونے کی وجہ دریافت کی تو معلوم ہوا کہ دہلی کے ایک اخبار نے ریویو والے ریکارڈ بازار میں ریکارڈ فروخت کرنے والی ایک دکان کے پاس فروخت کر دیئے۔ اس کا علم گراموفون کمپنی کے مالک لالہ ہیرا لال کو ہو گیا، تو آپ نے حکم دیا کہ آئندہ ریویو کے لئے ریکارڈ اردو اخبارات کو نہ بھیجے جائیں اس اردو اخبار کے مالک نے سمجھا ہو گا جس طرح تبادلہ میں آئے ہوئے اخبارات ردی خریدنے والے کے پاس فروخت کر دیتے ہیں، ان ریکارڈوں کو بھی ریکارڈ فروخت کرنے والی دکان کے پاس کچھ کم قیمت پر فروخت کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

اگر بازار میں کسی کا گرا ہوا نوٹ یا روپیہ وغیرہ کوئی سکہ مل جائے، تو شائد ایک شخص بھی ایسا نہ ملے گا، جو اس کو اٹھا کر اپنے جیب میں رکھ لینا گناہ سمجھتا ہو۔ حالانکہ اس کو

اٹھا کر جیب میں ڈال لینا گناہ ہے، کیونکہ اس پر اٹھانے والے کا کوئی حق نہ تھا۔ اس جرم میں ہی سعودی عرب میں ہاتھ کاٹنے کی سزا دی جاتی ہے۔ اور بغیر مہر لگے ہوئے ٹکٹ لفافوں سے اتارنے کے لالچ میں تو ہر شخص ہی مبتلا ہے، اور یہ نہیں سوچا جاتا کہ یہ بے گناہی فی الحقیقت گناہ ہے۔

سرکاری دفاتر کے کلرکوں میں پچھتر فیصدی ایسے بابو ضرور موجود ہیں، جو اپنے دفتر میں سے کاغذ، پنسلیں، پنیں اور دوسری اسٹیشنری بغیر کسی تکلف کے اپنے بچوں کے لئے لے جاتے ہیں، اور اس چوری کو چوری قرار نہیں دیا جاتا۔ حالانکہ یہ قانوناً قابل تعزیر چوری ہے، اور اخلاقاً ایک شرمناک گناہ۔

اوپر بیان کئے گئے سینکڑوں میں سے یہ صرف چند گناہ ہیں، جن کو گناہ نہیں سمجھا جاتا۔ اور اگر کوئی ان ایسے گناہوں پر اعتراض کرے، تو ان گناہوں کو صرف ایک غلطی قرار دیا جاتا ہے حالانکہ یہ گناہ قابل سزا جرائم ہیں نہ کہ غلطی کاش کہ ہم گناہگار اپنی ان بگناہیوں پر سنجیدگی کے ساتھ غور کریں، اور جھوٹ، بے ایمانی اور بد دیانتی کو سچ، ایمانداری اور دیانتداری قرار نہ دیں، اور مہاتما گاندھی کی زندگی کے صرف ایک واقعہ کو ہی اپنے لئے نصب العین قرار دیں۔ وہ واقعہ یہ ہے۔

مہاتما گاندھی کے سابرمتی آشرم میں ایک شخص بچوں کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ اور اس کے ہاتھ میں ایک لیموں تھا، اس شخص نے یہ لیموں چھپا لیا، اور بچہ سے مذاق کرتے ہوئے کہا کہ اس نے یہ لیموں دریائے سابرمتی میں پھینک دیا ہے۔

مہاتما گاندھی کو جب بچہ کے سائے کئے گئے اس مذاق کا علم ہوا، تو آپ نے اپنی پراتھنا میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا، کہ آپ ایک بچہ کے ساتھ مذاق کرتے ہوئے جھوٹ بولنا گناہ سمجھتے ہیں، اور چاہتے ہیں کہ آئندہ کوئی شخص آشرم میں مذاق کرتے ہوئے بھی جھوٹ بولنے کا مرتکب نہ ہو۔

☆☆☆☆☆☆

ریاستوں میں پیدا ہونا گناہوں کی سزا

نابھ میں ایک صاحب بہادر سردار بھائی کاہن سنگھ نابھ تھے آپ ریاست نابھ کے علاقہ کے ایک گاؤں پتھو کے رہنے والے تھے بہت فاضل، ہندی اور پنجابی زبانوں کے عالم، بہت خوبصورت، دراز رنگ، سفید داڑھی، اور سفید لباس میں نور کا ایک بت معلوم ہوتے۔ آپ مرحوم مہاراجہ نابھ (جو معزول کئے جانے کے بعد صوبہ مدراس کے مقام کوڈائی کنال میں نظر بند کئے گئے تھے، اور جن کا وہاں ہی انتقال ہوا) کے اتالیق تھے۔ یہ مہاراجہ جب گدی پر بیٹھے، تو آپ نابھ میں فارن منسٹر مقرر کئے گئے، کیونکہ آپ سیاسی گتھلیوں کو سلجھانے کے اعتبار سے بہت بڑی اہلیت رکھتے تھے۔ آپ کو نابھ میں فارن منسٹر مقرر ہوئے چند برس ہوئے تھے، کہ آپ مہاراجہ کے معتوب ہو گئے۔ مگر مہاراجہ کے اس عتاب کا ابھی اظہار نہ ہوا تھا، کہ ایک روز اتوار کو آپ پٹیالہ چلے گئے، جہاں کہ آپ کا صاحبزادہ کالج میں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ آپ شام کو پٹیالہ سے واپس آئے، تو آپ کے پٹیالہ جانے کی اطلاع مہاراجہ کو پہنچ گئی۔ اگلے روز مہاراجہ کی خدمت میں حاضر ہوئے، تو مہاراجہ نے آپ سے جواب طلب کیا، کہ آپ بغیر اجازت کے پٹیالہ کیوں گئے؟ اس اعتراض پر بھائی کاہن سنگھ نے جواب دیا، کہ اتوار تھا، اس لئے اپنے بیٹے سے ملنے پٹیالہ چلا گیا۔ میں قیدی تو نہیں ہوں، کہ اجازت لے کر جاتا۔ یہ جواب سن کر مہاراجہ نے کہا کیا آپ کا قیدی ہونا مشکل یا ناممکن بات ہے؟ بھائی کاہن سنگھ خاموش ہو گئے، اور آپ نے محسوس کیا، کہ مہاراجہ آپ کے خلاف ہیں، اور نہ معلوم آپ کب جیل بھیج دیئے جائیں۔ آپ اپنے گھر واپس آ گئے، ملازم سے سامان باندھنے کے لئے کہا اور رات کی گاڑی نابھ سے سرینگر چلے گئے۔

اگلے روز مہاراجہ کے پاس اطلاع پہنچی کہ بھائی کاہن سنگھ بغیر اجازت کے رات کو نابھ سے کہیں چلے گئے ہیں، تو ریاست نابھ کے فارن ڈیپارٹمنٹ کی طرف سے

اخبارات کو اطلاع دی گئی، کہ بھائی کاہن سنگھ بغیر اطلاع دیئے نابھ سے غائب ہیں۔ اس اعلان کے شائع ہونے کے بعد بھائی کاہن سنگھ کا اخبارات میں ایک بیان شائع ہوا جس میں آپ نے کہا کہ میں گرمیوں میں ہمیشہ کسی نہ کسی پہاڑ پر جایا کرتا ہوں اس لئے سرینگر آ گیا۔ میں ریاست نابھ کا خیر خواہ ہوں۔ میں مہاراجہ کا نہ صرف سالہا سال تک اتالیق رہا، بلکہ نابھ کے شاہی خاندان کے ممبروں کے ساتھ میرے ذاتی گہرے تعلقات بھی ہیں۔ ریاستوں کی پبلک عموماً اور سکھ حلقوں میں خصوصاً یہ ایک معمہ تھا، کہ بھائی کاہن سنگھ کے نابھ سے بغیر اطلاع چلے جانے کا اصلی سبب کیا ہے؟ مگر کسی کی سمجھ میں نہ آتا تھا، اور ہر شخص حیران تھا، کہ مہاراجہ اور بھائی کاہن سنگھ کے اتنے گہرے اور اخلاص کے تعلقات کے ناخوشگوار ہونے کا اصلی سبب کیا ہے؟

اس زمانہ میں مہاراجہ نابھ اور مہاراجہ پٹیالہ کے تعلقات ناخوشگوار سے تھے، مگر تعلقات عداوت کی حد تک نہ پہنچے تھے۔ چند ماہ یعنی گرمیوں کا زمانہ تو خاموشی میں گزر گیا۔ گرمیوں کے بعد ریاست پٹیالہ کی طرف سے اخبارات میں اعلان شائع ہوا، کہ سردار بھائی کاہن سنگھ ریاست پٹیالہ میں فارن منسٹر مقرر ہو گئے ہیں۔ اس اعلان کا شائع ہونا تھا کہ نابھ اور پٹیالہ کے درمیان تعلقات کی خوشگواری عداوت کی صورت میں تبدیل ہو گئی۔ اور نابھ کا کوئی شخص پٹیالہ نہ جاتا، اور پٹیالہ کے کسی شخص کو پٹیالہ آنے کی جرأت نہ ہوتی۔

بھائی کاہن سنگھ کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ اور آپ نے سکھ ازم کے متعلق دو کتابیں ''گورمت پربھاکر'' اور ''گورمت سدھاکر'' ایسی لکھی تھیں جن کو مذہبی اعتبار سے بڑی اہمیت حاصل تھی۔ اس لئے سکھوں میں آپ بہت ہی عزت و احترام کی نظروں سے دیکھے جاتے تھے نابھ اور پٹیالہ کے تعلقات جب عداوت کی صورت میں تبدیل ہو گئے، تو سکھ لیڈروں میں تعلقات کی اس کشیدگی کو بہت تشویش کے ساتھ محسوس کیا گیا۔ اور کوششیں شروع ہوئیں، کہ تعلقات زیادہ خراب نہ ہوں اور غلط

فہمیاں دور کی جائیں۔ اس سلسلہ میں اس زمانہ کے سکھ لیڈر سردار بہادر سریندر سنگھ مجیٹھ وغیرہ کئی اصحاب نے کوشش کی، مگر کامیابی نہ ہوئی۔ آخر سردار بہادر بھائی ارجن سنگھ آف باگڑیاں (بھائی ارجن سنگھ نابھ، پٹیالہ اور جیند کی سکھ ریاستوں کے مذہبی مشیر تھے، اور ان کے ہاتھوں ہی ان ریاستوں کی تمام رسومات ادا ہوتیں) کی کوششوں سے یہ تعلقات کچھ اچھے ہوئے۔ اس گفت وشنید میں شرط یہ طے پائی، کہ بھائی کاہن سنگھ واپس نابھ بھیج دیئے جائیں، اور ریاست نابھ میں ان کے ساتھ کسی قسم کی کوئی زیادتی نہ کی جائے۔ چنانچہ اس حکم کے سلسلہ میں بھائی کاہن سنگھ واپس نابھ بھیج دیئے گئے نابھ پہنچنے کے بعد آپ کو اپنے گاؤں میں نظر بند کر دیا گیا۔ اس نظر بندی کے زمانہ میں آپ کو اجازت نہ تھی، کہ آپ اپنے گاؤں پتھو سے باہر جاسکیں، یا ریاست نابھ کے باہر کے کسی آدمی سے تعلق رکھیں۔ بھائی کاہن سنگھ کئی برس تک اپنے اس گاؤں میں نظر بند رہے۔ ادھر نابھ اور پٹیالہ کے تعلقات ظاہرہ طور پر گو اچھے ہو گئے تھے، مگر دلوں میں کدورت باقی تھی، اور دلوں کی کدورت کچھ عرصہ کے بعد پھر ظاہر ہونا شروع ہوئی۔ کیونکہ پولیٹکل ڈیپارٹمنٹ کے افسر مہاراجہ نابھ کی انڈیپنڈنٹ یا اینٹی برٹش پالیسی کے باعث مہاراجہ کے مخالف تھے۔ مہاراجہ پٹیالہ گورنمنٹ کے بہت بڑے وفا شعاروں میں سے تھے، اور گورنمنٹ چاہتی تھی کہ وہ مہاراجہ پٹیالہ کو اپنے ہاتھوں میں بطور ایک ٹول کے استعمال کرتے ہوئے مہاراجہ نابھ کو کچل دے۔ یعنی تعلقات کے پھر کشیدہ ہونے کی وجہ دراصل پولیٹکل ڈیپارٹمنٹ کے افسر تھے، جو مہاراجہ پٹیالہ کو تھپکی دے رہے تھے۔ تعلقات کی یہ کشیدگی بہت بڑی عداوت کی صورت میں تبدیل ہوتی چلی گئی۔ عداوت کی یہ کیفیت جاری تھی، کہ ریاست نابھ کی حدود کے ایک مقام ولدی میں بم پھٹا۔ یہ بم بہت خطرناک قسم کا تھا۔ اس بم کے پھٹنے سے مکان کی چھت اڑ گئی، اور ایک گھوڑی جو ساتھ والے کمرہ میں بندھی تھی، ہلاک ہو گئی۔ بم کے اس حادثہ کے بعد مہاراجہ نابھ نے تو الزام لگایا، کہ یہ بم مہاراجہ پٹیالہ نے

مہاراجہ نابھ کو گورنمنٹ کی نظروں میں ذلیل کرنے کے لئے رکھوایا ہے، اور مہاراجہ پٹیالہ نے مہاراجہ نابھ پر یہ الزام لگایا، کہ مہاراجہ نابھ کے حکم اور روپیہ سے بم سازی کا مقصد مہاراجہ پٹیالہ کو ہلاک یا بدنام کرنا تھا۔ دونوں ریاستوں نے گورنمنٹ سے شکایتیں کیں۔ انگریزی پولیس کے افسروں نے تحقیقات کی۔ اور اس تحقیقات کا نتیجہ یہ ہوا، کہ مہاراجہ نابھ اور مہاراجہ پٹیالہ کے ایک دوسرے پر لگائے گئے الزامات کی تحقیقات کے لئے لکھنو ہائیکورٹ کے ایک جج جسٹس سٹورٹ مقرر ہوئے، یہ مقدمہ انبالہ چھاؤنی کے سرکٹ ہاؤس میں شروع ہوا، اور اس تحقیقات کے نتیجہ کے طور پر ہی مہاراجہ نابھ گدی سے معزول کیے گئے۔

مہاراجہ نابھ جب سیاسی مشکلات میں مبتلا تھے، اور جسٹس سٹورٹ نے تحقیقات شروع کی، تو مہاراجہ نے بھائی کاہن سنگھ کو ان کے گاؤں پتھو سے نابھ بلوالیا، تا کہ آپ ان سے بھی مشورہ لے سکیں۔ کیونکہ بھائی کاہن سنگھ سیاسی گتھیوں کو سلجھانے کی اہلیت رکھتے تھے، اور خطاب یافتہ یعنی سردار بہادر ہونے کے باعث آپ کا انگریز افسروں پر بھی کچھ اثر تھا۔ بھائی کاہن سنگھ اپنے گاؤں سے نابھ آ گئے، اور آپ مہاراجہ کے مشورہ طلب کرنے پر مشورہ دیتے۔ یہ مشورہ یہی ہوتا، کہ پولیٹکل ڈیپارٹمنٹ سے تعلقات اچھے کریں۔ مگر مہاراجہ کا دل آپ کے متعلق صاف نہ تھا، اور مہاراجہ کے دل کے صاف نہ ہونے کا نتیجہ یہ تھا، کہ ریاست نابھ کا ہر افسر بھائی کاہن سنگھ سے دور رہتا۔ کوئی شخص ان کو مہاراجہ کا معتوب سمجھتے ہوئے ان سے نہ ملتا، مگر میں نے کوئی پرواہ نہ کی۔ کیونکہ میں زندگی بھر ہی فطرتاً خطرات کو لبیک کہنے کا عادی رہا، اور بھائی کاہن سنگھ کے پاس دوسرے تیسرے روز جانا شروع کر دیا۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ بھائی صاحب ایک فاضل ترین شخصیت تھے، اور میں چاہتا تھا، کہ ان کی قابلیت اور بلندی سے میں کچھ حاصل کرسکوں۔

میری اس جرأت کو دیکھ کر بھائی صاحب کے دل میں میرے لئے پیار پیدا ہو

گیا۔ بہت عزت اور محبت کے ساتھ مجھ سے پیش آتے۔

میں کئی کئی گھنٹے ان سے باتیں کرتا۔ لٹریچر پر اور سیاست پر بحث ہوتی، مگر ان باتوں کا نابھ اور پٹیالہ کی سیاست سے کوئی تعلق نہ ہوتا۔ کیونکہ مہاراجہ کا مخلص دوست ہونے کے باعث میرے لئے یہ ممکن ہی نہ تھا، کہ میں کوئی ایسی بات کرتا، جو مہاراجہ کے مفاد کے خلاف ہو۔ میں دوستوں کا مخلص نہ ہونا بہت کمینہ پن سمجھتا ہوں، بلکہ اسے دوستوں سے غداری بھی قرار دیتا ہوں۔

بھائی کاہن سنگھ کی ان ملاقاتوں میں سے میں نے بہت کچھ حاصل کیا۔ ایک روز میں ان کے ہاں پہنچا تو کھانے کا وقت تھا۔ میں کھانا کھا کر گیا تھا۔ بھائی صاحب کھانا دیر سے کھایا کرتے تھے۔ مجھے کھانے میں شریک ہونے کا کہا تو میں نے کہا کہ میں کھا کر آیا ہوں۔ آپ نے باتیں کرتے ہوئے ہی اپنا کھانا منگا لیا۔ کھانے کے لئے تھوڑے سے چاول اور سبزی تھی۔ میں نے کہا، بھائی صاحب آپ کھانا بہت کم کھاتے ہیں، اس کے جواب میں آپ نے فرمایا:

''گرمیوں کے دن ہیں، اس لئے میں تھوڑے سے چاول اور سبزی کھاتا ہوں۔ کیونکہ پچھلے پچیس برس سے گرمیاں پہاڑ پر جا کر بسر کیں، اب مہاراجہ سے پہاڑ پر جانے کی اجازت نہ طلب کرسکا، کیونکہ مہاراجہ مشکلات میں ہیں۔ ویسے بھی کھانا کم ہی کھاتا ہوں، کیونکہ اصولاً بڑھاپے میں کم کھانا چاہئے۔ اس کے علاوہ انسان کو چاہئے کہ چالیس برس کی عمر سے پہلے وہ کھائے، جو لذیذ ہو۔ کیونکہ اس عمر تک معدہ ہر قسم کی غذا ہضم کرسکتا ہے، اور چالیس برس کی عمر کے بعد وہ کچھ کھانا چاہئے، جو مفید ہو۔ بعض لوگ کھانا کھاتے ہوئے اپنی بھوک سے زیادہ کھا جاتے ہیں، اور کھانے کے بعد افسوس کرتے ہوئے کہتے ہیں، کہ کھانا لذیذ تھا، اس لئے چند لقمے زیادہ کھا گیا۔ ایسے لوگ انسان کہلانے کے مستحق نہیں، ان کو تو حیوان ہی کہنا چاہئے، جو کھانے پر بھی کنٹرول نہ کرسکیں، اور جو قوت ارادی سے قطعی محروم ہوں۔''

ایک روز باتوں باتوں میں آپ نے ذکر کیا، کہ جب آپ پٹیالہ میں فارن منسٹر تھے،تو آپ نے سولن کے قریب ریاست پٹیالہ کی حدود میں اپنی ایک کوٹھی تعمیر کی تھی۔ چونکہ یہ کوٹھی پٹیالہ کے علاقہ میں ہے، اور نابھ اور پٹیالہ کے تعلقات کشیدہ ہیں، اس لئے آپ کوٹھی میں جا کر رہائش اختیار نہیں کر سکتے۔اس پر میں نے کہا، بھائی صاحب آپ نے یہ کوٹھی ایک ریاست کی حدود میں تعمیر کر کے غلطی کیوں کی؟ آپ نے کوٹھی انگریزی علاقہ میں کیوں تعمیر نہ کی؟تو آپ نے فرمایا:

''دیوان سنگھ جی! اگر ایک غلطی کی ہو،تو اس کا افسوس کریں۔ زندگی میں بہت غلطیاں کی ہیں، اور سب سے بڑی غلطی تو یہ ہوئی، کہ ایک ریاست کے علاقہ میں جنم لے لیا۔جس کا نتیجہ یہ ہے، کہ تکلیفیں اٹھا رہے ہیں۔اگر ریاست نابھ کی حدود میں جنم لینے کی غلطی نہ کرتے،تو زندگی آرام اور راحت کے ساتھ بسر کرتے۔''

میں نے لاہور کے ایک مصور سے گورو گوبند سنگھ کی ایک تصور ایک سو روپیہ میں خریدی۔اس تصویر کے خریدنے کا مقصد یہ تھا، کہ یہ مہاراجہ کو نذر کی جاتی۔تصویر بہت خوبصورت اور آرٹ کے اعتبار سے قابل قدر تھی۔مہاراجہ سیاسی مشکلات میں مبتلا تھے، اور مہاراجہ کی ان مشکلات میں مناسب نہ تھا، کہ میں مہاراجہ کو نذر کرتا۔میں نے یہ تصویر بھائی صاحب کو نذر کر دی۔تصویر دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔

تصویر قبول کرنے کے بعد آپ ایک گھنٹہ تک آرٹ کے متعلق بات چیت کرتے رہے۔ اور اس بات چیت میں آپ نے ہندوستان کے درجنوں آرٹسٹوں کی قیمتی تصاویر کا ذکر کیا، کیونکہ آپ کو علم و ادب کے علاوہ آرٹ اور موسیقی سے بہت دلچسپی تھی۔اور جس موضوع پر بات ہوتی، آپ مرحوم مولانا ابوالکلام آزاد کی طرح اس موضوع پر گھنٹوں بحث کرتے۔اس بات چیت میں آپ نے ڈاکٹر ٹیگور اور ٹیگور کے خاندان کی تیار کی ہوئی کئی تصاویر کا ذکر کیا، اور فرمایا، کہ بنگالی مصور موزمدار کی ایک ایک تصویر پانچ پانچ ہزار روپیہ میں فروخت ہوئی ہے۔

مرحوم مہاراجہ سرکشن پرشاد وزیر اعظم حیدر آباد (دکن) علمی، ادبی اور آرٹ کی قدر کرنے کے اعتبار سے ملک کی ان چند شخصیتوں میں سے تھے، جواب بھی صرف انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ بہت زمانہ ہوا آپ نے ایک لاکھ روپیہ میں ایک کتاب مہا بھارت خریدی تھی۔ اس کتاب کے ہر صفحہ پر ایک قلمی تصویر تھی، جو اس صفحہ کے واقعہ سے تعلق رکھتی تھی۔ میں جس زمانہ میں ریاست نابھ میں ملازم تھا، میرے ان مرحوم مہاراجہ کے ساتھ تعلقات تھے۔ مہاراجہ جب سیاسی مشکلات میں تھے، اور ان مشکلات کے سلسلہ میں ہی مہاراجہ دہلی آگئے، اور سردار بہادر بھائی کاہن سنگھ بھی مہاراجہ کے ساتھ دہلی گئے، میں بھی ساتھ تھا۔ میں مہاراجہ ہوٹل میں مقیم تھا، اور بھائی صاحب وڈلینڈ ہوٹل میں قیام فرماتے تھے۔ میں ہر روز بھائی صاحب سے ملنے کے لئے ان کے ہوٹل میں حاضر ہوتا۔ ایک روز خواجہ حسن نظامی صاحب سے ملنے گیا، تو خواجہ صاحب نے فرمایا، کہ مہاراجہ سرکشن پرشاد اپنی فیاضیوں کے باعث بہت مقروض ہو چکے ہیں۔ یہ قرضہ غالباً بیس لاکھ کے لگ بھگ ہے، اور آپ کی جاگیر کی سالانہ آمدنی چھ لاکھ روپے ہے۔ مہاراجہ نے ان کے پاس یہ کتاب (یعنی مہا بھارت باتصویر جو کئی جلدوں میں اور بہت ضخیم تھی) فروخت کرنے کے لئے بھیجی ہے، اور میں کوشش کروں، کہ مہاراجہ نابھ اس کتاب کو خرید لیں۔ خواجہ صاحب کو مہاراجہ کی مشکلات کا علم نہ تھا۔ میں نے تمام حالات بتائے، اور کہا کہ مہاراجہ نابھ کے ان حالات میں کہنا تو ممکن نہیں۔ میری رائے میں بھائی کاہن سنگھ صاحب سے مشورہ کرنا چاہئے۔ چنانچہ اس کتاب کی ایک جلد میں خواجہ صاحب سے لے کر وڈلینڈ ہوٹل گیا۔ یہ جلد بھائی صاحب کو دکھائی۔ بھائی صاحب اس نایاب کتاب کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ اور جب میں نے یہ بتایا، کہ یہ کتاب مہاراجہ سرکشن پرشاد وزیر اعظم حیدر آباد کی ملکیت ہے۔ بہت زمانہ گزرا یہ کتاب مہاراجہ نے ایک لاکھ روپیہ میں خریدی تھی۔ مہاراجہ اب بیس لاکھ روپیہ کے مقروض ہیں، اور اس کتاب کو فروخت کرنا چاہتے ہیں، تو یہ سن کر

بھائی کاہن سنگھ کی آنکھوں نے آئے ،مگر ان کا چہرہ بتا رہا تھا، کہ ان کا دل رو رہا ہے۔ مشورہ کرنے پر آپ نے رائے دی، کہ مہاراجہ سے کہنا تو لا حاصل ہو گا۔ یہ کتاب نواب صاحب رام پور کو دکھائی جائے ۔نواب صاحب پرانی اور قلمی اور کتابوں کے بہت قدر دان تھے،وہ شائد اسے خرید لیں۔ان سے بات چیت کرنے کے بعد میں کتاب واپس خواجہ صاحب کو دے آیا۔اور بتایا، کہ بھائی صاحب کی رائے میں نواب صاحب رام پور سے ملنا چاہئے۔اس کے بعد مجھے معلوم نہیں ہو سکا کہ خواجہ صاحب مرحوم نواب صاحب رام پور سے ملے یا کہ نہیں،اور اس نایاب کتاب کا کیا ہوا۔

مہاراجہ نابھ کی معزولی کے بعد بھائی کاہن سنگھ نے مستقل طور پر نابھ میں ہی رہائش اختیار کر لی تھی ، کیونکہ وہاں ان کا اپنا مکان تھا،اور وہاں کے سب سے بڑے تاریخی گوردوارہ بابا اجپال سنگھ سے ان کا خاندانی تعلق تھا۔اس کے بعد آپ کبھی کبھی دہلی آتے ،تو وہاں سردار بہادر بساکھ سنگھ ٹھیکیدار کے ہاں قیام کرتے ۔دہلی پہنچتے ہی مجھے ٹیلی فون پر اطلاع دیتے۔کہ آپ دہلی آئے ہیں۔میں سردار بساکھ سنگھ کی کوٹھی پر ان کی خدمت میں حاضر ہو جاتا جتنے روز قیام فرماتے ، ہر روز جاتا۔کیونکہ آپ سے بات چیت کرنے میں روحانی لذت محسوس ہوتی، جو کسی بڑے سے بڑے عالم بزرگ سے بات چیت کرنے میں نصیب ہوتی ہے۔کئی برس ہوئے بھائی صاحب انتقال فرما چکے ہیں۔ جب بھی آپ کا خیال آتا ہے،تو آنکھیں تر ہو جاتی ہیں،اور جب میں سوچتا ہوں، کہ اس معیار کے کتنے لوگوں کو مجھے اپنی زندگی میں ملنے کا اتفاق ہوا،تو یہ دیکھ کر مایوس ہو جاتا ہوں، کہ ایسے لوگ صرف انگلیوں پر ہی گن سکتا ہوں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

مذہب قاضی الحاجات

عربی زبان میں روپیہ اور دولت کو قاضی الحاجات، ضروریات پوری کرنے والا (کیونکہ روپیہ دے کر اس سے ہر شے خریدی جا سکتی ہے) قرار دیا گیا ہے۔ مگر جہاں تک مذہبی کتابوں میں سے اپنے مطلب کی بات حاصل کرنے کا تعلق ہے، مذہب کو بھی قاضی الحاجات قرار دیا جانا چاہئے۔ کیونکہ ہر مذہبی مجاور اپنی ضروریات کے مطابق اپنے حق میں مذہبی قول پیش کر دیتا ہے۔ اس سلسلہ کے دو دلچسپ واقعات پیش کرتا ہوں۔

موگا (ضلع فیروزپور) میں ایک صاحب حکیم الشیر داس تھے۔ پیشہ کے لحاظ سے طبیب تھے، اور دلچسپیوں کے لحاظ سے ان کو موسیقی کا بہت شوق تھا۔ ان کے مکان کے مردانہ بیٹھک میں طبلہ، سارنگی، طاؤس اور ہارمونیم وغیرہ ساز پڑے رہتے، اور شام کو ان کے دوست اپنے کاروبار سے فارغ ہو کر اس بیٹھک میں جمع ہوتے۔ راگ رنگ کی یہ محفل کافی دیر تک گرم رہتی، اور گانا سننے والے کئی دوسرے لوگ بھی جمع ہو جاتے۔

موگا سنگھ سبھا نے فیصلہ کیا، کہ وہ اپنا سالانہ جلسہ بہت شان کے ساتھ منائے۔ اور اس موقع پر دھرم پرچار کرتے ہوئے لوگوں کو امرت چھکایا جائے، یعنی غیر سکھوں کو سکھ مذہب میں داخل کیا جائے۔ چنانچہ جلسہ کو زیادہ کامیاب کرنے کے لئے سنگھ سبھا کے سیکرٹری (جن کا نام مجھے یاد نہیں رہا، اور جو موگا کی عدالت میں عرضی نویس تھے) نے سکھ کنہیا مہاودیالہ فیروزپور کے مینجر بھائی تخت سنگھ کو خط لکھا، کہ اس جلسہ کے لئے کنہیا مہاودیالہ کے راگیوں کے جتھے کو موگا بھیجا جائے۔ اس خط کے پہنچنے پر بھائی تخت سنگھ نے اپنے دربار کے راگیوں کو تاکید کی، کہ فلاں تاریخ کو یہ موگا پہنچ جائیں اور خط کے جواب میں سیکرٹری سنگھ سبھا کو اطلاع دی، کہ راگیوں کا جتھا جلسہ سے ایک روز پہلے شام کو موگا پہنچ جائے گا۔ تاکہ یہ جتھا نگر کیرتن (تبلیغ کے سلسلہ میں مذہبی لوگ شہر کے بازاروں میں بھی جلوس نکالا کرتے ہیں، تاکہ لوگوں کو جلسہ کا علم ہو جائے،

اسے نگر کیرتن کہا جاتا ہے) میں حصہ لے سکے۔ اس خط کو پڑھ کر سیکرٹری صاحب مطمئن تھے۔ اور جلسہ شروع ہونے سے ایک گھنٹہ پہلے جلسہ کرنے والے مقامی سکھ شام کو ریلوے اسٹیشن پہنچ گئے، تا کہ ٹرین میں سے فیروزپور کے راگیوں کو لے کر وہاں سے نگر کیرتن کا جلوس شروع کیا جائے۔ مگر جب ٹرین موگا کے ریلوے اسٹیشن پر پہنچی، تو اس میں راگی نہ تھے۔ جس کی وجہ یہ تھی، کہ راگی اور پرچارک کلاس عام طور پر غیر ذمہ دار ہوتی ہے۔ ان لوگوں کو یاد ہی نہ رہا، کہ انہوں نے موگا جانا ہے۔ جب راگی نہ پہنچے تو جلسہ کرنے والے مقامی سکھوں نے مجبوراً صرف ڈھول اور چھینے (چھینے ہاتھوں سے بجائے جاتے ہیں، اور ان کو ایک قسم کا ساز ہی کہنا چاہئے) بجا کر ہی نگر کیرتن کا جلوس نکال لیا، اور یہ لوگ گرنتھ صاحب کے شبد پڑھتے ہوئے موگا کی منڈی اور بازاروں میں سے جلوس لے گئے۔

نگر کیرتن ختم ہونے کے بعد سنگھ سبھا کے سیکرٹری اور ان کے ہمراہیوں کو تشویش ہوئی، کہ اگلے روز جب جلسہ ہوگا، تو بغیر راگیوں کے جلسہ میں رونق نہ ہو سکے گی۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد ان لوگوں نے فیصلہ کیا، اور وہ یہ کہ حکیم الشیر داس کے پاس پہنچے اور حکیم صاحب سے درخواست کی، کہ یہ معہ اپنے دوست موسیقاروں اور سازوں کے اگلے روز علی الصبح سنگھ سبھا کی بلڈنگ میں پہنچ جائیں، اور وہاں گرنتھ صاحب کے شبد پڑھیں، تا کہ جلسہ میں کچھ تو دلچسپی پیدا ہو۔ حکیم الشیر داس بہت با اخلاق اور دلچسپ شخصیت تھے۔ آپ نے اگلے روز علی الصبح سنگھ سبھا میں پہنچنے کا وعدہ کر لیا، اور وقت مقررہ پر معہ اپنے موسیقاروں اور سازوں کے جلسہ کے شروع ہونے سے پہلے پہنچ گئے۔

جلسہ شروع ہوا اس جلسہ کا مقصد یہ تھا، کہ سکھ مذہب کی تبلیغ کی جائے، غیر سکھوں کو سکھ بننے کے لئے کہا جائے، سکھ بنانے کی رسم ادا کی جائے، یعنی غیر سکھوں کو امرت چھکایا جائے اور امرت چکھنے والے سکھ مذہب کو ذریعہ نجات قرار دیتے ہوئے بالوں کو

نہ کٹوائیں، کیسوں کو رکھنے، کچھہرا پہننے اور کنگھا، کرپان اور کڑا اپنے پاس رکھنے کے پابند ہوں۔ جلسہ شروع ہونے پر حکیم صاحب اور ان کے موسیقار دوستوں نے گرنتھ صاحب کے تین چار شبد پڑھے تھے، کہ آپ نے ان شبدوں کے بعد گرنتھ صاحب میں سے ہی بھگت کبیر جی کا یہ شبد پڑھا:

کبیر اک پریت سیوں کہئے آن دیدھا جائے

بھاویں لامبے کیس کر بھاویں گھرا منڈائے

اس شبد کے معنی یہ تھے، کہ محبت صرف ایک خدا سے کرنے کی صورت میں ہی دل کی بے چینی رفع ہوتی ہے خدا سے محبت کرنے والا چاہے بال لمبے رکھ لے، یا بالوں کو بالکل ہی اڑا دے۔

جلسہ کا مقصد سکھ مذہب کی تبلیغ اور تبلیغ کی پہلی شرط یہ کہ بال نہ کٹوائے جائیں، کیونکہ بالوں کے بغیر نجات حاصل نہیں ہو سکتی، اور ادھر حکیم الشیر داس گرنتھ صاحب میں سے ہی ایسا شبد پڑھ رہے ہیں، جو سکھ مذہب کے اصولوں، بلکہ سب سے بڑے اصول یعنی بالوں کی تردید اور مخالفت میں ہے۔ سیکرٹری صاحب سنگھ سبھا بہت پریشان، کہ کیا ہو؟ آپ نے حکیم صاحب سے کہا، کہ آپ یہ شبد نہ پڑھئے، کوئی دوسرا شبد پڑھئے۔ حکیم صاحب بہت پر مذاق شخصیت تھے۔ آپ نے سیکرٹری صاحب سے کہا، کہ کیا یہ شبد گرنتھ صاحب میں موجود نہیں؟ اور اگر موجود ہے، تو پھر آپ اس شبد کے پڑھنے کی ممانعت کیوں فرما رہے ہیں؟ یا مجھے آپ ہی کوئی دوسرا شبد بتا دیجئے میں وہ گا دیتا ہوں۔ شبد کے متعلق یہ جھگڑا فضا کو کچھ ناخوشگوار صورت میں تبدیل کرنے کا باعث ہوا، اور چند شبدوں کے گانے کے بعد حکم صاحب معہ اپنے ہمراہی موسیقاروں اور سازوں کے واپس چلے گئے، اور شام کی نشست جبکہ غیر سکھوں کو امرت چکھانے کی رسم ادا کی جانے والی تھی۔

پچھلی راشن بندی کا زمانہ تھا یو پی کے کانگرسی خیال کے مسلمانوں نے جمعیت

العلمائے ہند کے کچھ ممبروں کے اہتمام میں لکھنو میں ایک جلسہ کیا۔ اس جلسہ کا مقصد یہ تھا کہ مسلمان اپنا ووٹ کانگرسی امیدوار کو دیں، جو ایک ہندو تھا۔ کئی ہندو اور مسلمان لیڈروں نے تقریریں کیں، اور یہ تقریریں ہندو مسلم اتحاد کے حق میں تھیں۔ ان تقریروں کے بعد ایک مولوی صاحب تقریر کرنے کے لئے پلیٹ فارم پر تشریف لائے۔ یہ مولوی صاحب ظاہراطور پر کھدر پوش تھے مگر مذہبی اعتبار سے ہندوؤں اور کانگرس دونوں کے خلاف، بلکہ کچھ جماعت اسلامی (جو ہندوستان کے مسلمانوں میں ہندوؤں کے خلاف منافرت پیدا کرنے کے حق میں ہے) سپرٹ کے تھے۔ آپ نے اپنی تقریر قرآن مجید کی ایک آیت سے شروع کی، اور آیت پڑھنے کے بعد اس کا ترجمہ ان الفاظ میں کیا:

''اے ایمان والو! اگر تم ان لوگوں کی فرمانبرداری کروگے، جنہوں نے کفر کیا ہے، تو یہ تم کو پیچھے کی طرف دھکیل دیں گے، اور تم نقصان اٹھانے والے ہو جاؤگے۔''

الیکشن کا زمانہ، انتخاب کے لئے جلسہ، ہندو امیدوار اور قرآن کی آیت پڑھی جا رہی ہے، جس میں مسلمانوں سے کہا گیا ہے، کہ وہ کافروں (ہندوؤں) کی فرمانبرداری نہ کریں۔ تمام کانگرسی پریشان کہ اس مولوی سے کیا کہا جائے۔ کیونکہ قرآن کی آیت پڑھنے سے تو روکا نہیں جا سکتا، یہ مذہب میں مداخلت ہے۔ اور اگر آیت پڑھنے دی جائے تو مسلمان ووٹروں کے ہندو امیدوار کے خلاف ہو جانے کا خدشہ۔ مولوی صاحب نے یہ آیت اور اس کا ترجمہ ختم کیا، تو ان سے کہا گیا، کہ اپنی تقریر ختم کریں، وقت بہت تنگ ہے۔

یہ حقیقت بے حد دلچسپ ہے، کہ جس طرح عدالتوں میں وکیل اپنے اپنے حق میں ہائیکورٹوں کے رولنگ پیش کرتے ہیں، اور یہ رولنگ قطعی متضاد ہوتے ہیں۔ ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں کے مذہبی مجاور بھی اپنے حق میں جو چاہیں، مذہبی کتابوں کے اقوال پیش کر دیتے ہیں۔ گویا ان کے خیال میں مذہب قاضی الحاجات

ہے، ان سے جو چاہو، حاصل کرلو۔

مثلاً اگر سکھ چاہیں، تو گرنتھ صاحب سے ہی سکھ ازم کو ہندو ازم کا مخالف ثابت کر سکتے ہیں اور اگر ہندو چاہیں تو گورو کو کرشن بھگت ثابت کر دیں۔ احراری مسلمان چاہیں، تو قرآن میں سے ہندو مسلم اتحاد کے حق میں آیتیں پیش کر دیں، اور مسلم لیگی مسلمان چاہیں، تو مسلمانوں کو ہی ہندوؤں کا مخالف ثابت کر دیں۔ اور آریہ سماجی چاہیں، تو وہ ویدوں سے بت شکنی کے حق میں شلوک نکال دیں، اور سناتن دھرمی چاہیں، تو ویدوں میں سے ہی بتوں کی پوجا ثابت کر دیں۔ مذہبی مجاوروں کی اس مذہب بازی کا نتیجہ ہے، کہ دنیا کا زیادہ حصہ آج مذہب کا مخالف ہے، اور لوگ مجبور ہیں کہ مذہب سے الگ رہ کر ہی سکون اور اطمینان حاصل کریں۔

☆☆☆☆☆☆

تبادلہ آبادی کے نتائج

1947ء کے فسادات اور تبادلہ آبادی کے زمانہ میں جب دہلی کے مسلمان اپنے آبائی وطن کو چھوڑ کر پاکستان جا رہے تھے، تو میرے پاس کئی مسلمان دوستوں کے پیغام پہنچے، کہ میں ان کا مکان کرایہ پر لے لوں۔ کیونکہ یہ دوست سمجھتے تھے کہ ان کے مکان چھوڑنے کی صورت میں ان کے مکان پر شرنارتھی قابض ہو جائیں گے اور یہ شرنارتھی نہ صرف آئندہ مکان کا کرایہ ادا نہ کریں گے، بلکہ یہ گھر کے اس سامان کو بھی اپنے قبضہ میں کر لیں گے، جس سامان کو یہ پاکستان منتقل نہیں کر سکتے۔ کیونکہ یہ ممکن ہی نہ تھا، کہ یہ گھر کے اس سامان کو کسی دوسری جگہ منتقل کر سکتے، جو سامان یہ پچھلے تیس، چالیس یا پچاس برس میں آہستہ آہستہ جمع کرتے رہے۔ کیونکہ کوئی مکان بھی ایسا نہ تھا، جو گھر کے سامان سے بھرا ہوا نہ تھا۔ میں ان دوستوں کے مکانات کو دیکھنے گیا، تو ایک مکان میں نے پسند کیا، جو پھاٹک مفتی والاں، تراہا بیرم خاں میں تھا، اور جہاں کہ تبادلہ آبادی کے بعد سے اخبارات "ریاست" کا دفتر اور میری رہائش اخبار کے بند کرنے کے زمانہ تک رہی۔ میں یہ مکان دیکھنے گیا، تو یہ مکان میں نے پسند کیا۔ یہ مکان ماسٹر عبدالمجید مینجر ہمدرد دواخانہ اور ان کے بھائیوں کا تھا۔ میں جب اس مکان کو دیکھنے گیا، تو وہاں سامان باندھا جا رہا تھا، اور ماسٹر صاحب کے بھائی پاکستان جانے کی تیاریوں میں تھے۔ مکان بہت فراخ تھا، میں نے پسند کیا۔ اور کرایہ کے متعلق بات چیت ہوئی، تو مالکان مکان نے بہت زور دیا، کہ کوئی کرایہ نہ لیں گے اور میں کرایہ کے بغیر وہاں رہوں۔ میرے لئے یہ ممکن نہ تھا، اور میں نے بغیر کرایہ کے مکان لینے سے انکار کر دیا، تو آخر فیصلہ ہوا، کہ میں پچھتر روپے ماہوار کرایہ ادا کروں گا۔ میں اپنا سامان اس مکان میں لے آیا۔ اپنے گھر کا جو سامان یہ پاکستان نہ لے جا سکتے تھے، انہوں نے یہ سامان ایک کوٹھڑی میں بند کر دیا، اور اپنا تالہ لگا دیا۔ کیونکہ یہ جانتے تھے کہ سامان میری موجودگی میں محفوظ رہے گا۔ چنانچہ یہ سامان غالباً دو برس

تک اس کوٹھڑی میں محفوظ بند رہا، اور حالات کے بہتر ہونے پر دو برس بعد یہ اپنا سامان اس کوٹھڑی سے نکال لے گئے۔ اور ایک دوسری کوٹھڑی میں ظفر احمد صاحب (جو میرے ساتھ دفتر ''ریاست'' میں کئی برس تک رفیق کار رہے ہے، اور اب کراچی میں ہیں) نے بھی اپنا سامان بند کر دیا۔ ظفر صاحب بھی غالباً چار برس بعد حالات کے بہتر ہونے پر پرمٹ لے کر اپنا یہ تمام سامان ایک ٹرک میں لاہور لے گئے۔ یعنی میں اس مکان کا پچھتر روپیہ ماہوار مالکان مکان کو کرایہ ادا کرتا رہا اور اس کے علاوہ ان کے سامان کی چوکیداری کے فرائض بھی میرے ذمہ تھے، کیونکہ میری موجودگی میں اس سامان میں سے ایک پیسہ کا نقصان بھی ممکن نہ تھا۔

دہلی کے تعلیم یافتہ مسلمانوں کے حلقہ میں جو لوگ مجھے جانتے تھے، یا اخبار ''ریاست'' پڑھتے تھے ان کے دل میں میرے لئے بہت قدر تھی کیونکہ ''ریاست'' کے ہر زمانہ اور ہر اشاعت میں مظلوموں کے حق میں آواز پیدا کی جاتی۔ ان مظلوموں میں ہندوستان کے عیسائی اور مسلمان وغیرہ بھی شامل تھے، جن پر کئے جانے والے مظالم کو میں برداشت نہ کرتا تھا۔ اور سچ تو یہ ہے، کہ ان مظالم کو دیکھ کر میرا خون ابل آتا تھا۔ اس مکان کو کرایہ پر لینے کے بعد جو مسلمان اس محلّہ میں یا ترا ہا بیرم خاں کے قریب رہ گئے، وہ مجھے بہت ہی عزت اور محبت کی نگاہوں سے دیکھتے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ آئندہ اگر ان کو کبھی میری امداد کی ضرورت ہوئی، تو میں اپنی ذات کو خطرہ میں ڈال کر بھی ان کی حمایت میں کھڑا ہو جاؤں گا۔ یعنی اس علاقہ کے مسلمانوں میں میری پوزیشن ایک میر محلّہ کی سی تھی۔ یہ لوگ اکثر میرے پاس آیا کرتے، اور اپنے متعلق رائے طلب کرتے اور میں بھی ان کو وہ رائے دیتا جسے میں ایمانداری کے ساتھ درست سمجھتا۔

ایک روز ایک حکیم صاحب (جو ترا ہا بیرم خاں کے علاقہ میں اپنا مطب کرتے تھے اور جامعہ طبیہ میں ملازم بھی تھے) میرے پاس تشریف لائے یہ حکیم صاحب کھدر کا

لباس پہنا کرتے اور دل سے کانگرسی تھے۔ انہوں نے بتایا کہ چونکہ ان کی دکان کے قریب تمام دکانوں پر شرنارتھی قابض ہو چکے ہیں، یہ شرنارتھی ان کو بہت تنگ کرتے ہیں کوئی مسلمان عورت بازار میں سے بے برقع کے ساتھ گزرے، تو یہ اس پر آوازے کستے ہیں۔ اور جب حکیم صاحب اپنے مطب میں بیٹھے ہوتے ہیں، تو دوسری طرف منہ کر کے ایک شرنارتھی اونچی آواز سے دوسرے شرنارتھی کو سنا کر کہتا ہے کہ:

''یہ کم بخت اب یہاں سے جاتے کیوں نہیں؟''

اور جب یہ اس قسم کی آوازیں کستے ہیں تو اکثر ماں بہن کی گالیاں بھی دے دیتے ہیں۔ جس کا مقصد یہ ہے کہ حکم صاحب تنگ آ کر اس دکان کو چھوڑ جائیں۔ ان حالات میں حکیم صاحب کو کیا کرنا چاہئے؟ ان کو رائے دی جائے حکیم صاحب سے جب میں نے سنا، تو مجھے تکلیف ہوئی، اور میرے اور حکیم صاحب کے درمیان یہ بات چیت ہوئی:

میں: میری تو رائے یہ ہے کہ آپ کو پاکستان چلے جانا چاہئے۔

حکیم صاحب: آپ پرو کانگرسی ہیں، تمام عمر آپ فرقہ پرستوں کی مخالفت کرتے رہے، آپ کے اخبار کی پالیسی انڈی پنڈٹ ہے، اور ظلم کے خلاف آواز پیدا کرنا آپ کا شعار ہے آپ مجھے تلقین کرتے ہیں کہ میں کانگرسی ہوتے ہوئے پاکستان چلا جاؤں۔

میں: میری تو آپ کے متعلق یہی رائے ہے میں اپنے ضمیر کے خلاف غلط رائے نہیں دے سکتا۔ جس صورت میں کہ اس ظلم کا کوئی علاج نہیں اور گورنمنٹ بھی ایسے مظالم کو بند کرنے کے اعتبار سے بےبس ہے، تو دوسری صورت بھی کیا ہے؟ میری تو یہی رائے ہے کہ آپ بھی ہجرت کر کے پاکستان چلے جائیے۔

حکیم صاحب: میں حیران ہوں کہ آپ ایک حب الوطن اور پرو کانگرسی ہوتے ہوئے یہ رائے دے رہے ہیں۔ میں زندگی بھر مسلم لیگ کا مخالف رہا ہوں، میں

پاکستان کیوں جاؤں؟

میں: اگر آپ پاکستان نہیں جانا چاہتے، تو پھر ظلم برداشت کیجئے اس ظلم سے نجات حاصل کرنے کی دوسری صورت بھی کیا ہے؟

حکیم صاحب: اگر آپ پاکستان میں رہ گئے ہوتے، تو آپ کی وہاں پوزیشن کیا ہوتی، اوراپ وہاں اپنے متعلق کیا کرتے؟

میں: میں نے اس مسئلہ پر کئی بار غور کیا ہے۔ میں اگر پاکستان میں رہ گیا ہوتا، تو انتہائی کوشش کر کے ہندوستان چلا آتا، اور اپنے آپ کو فرقہ پرست مسلمانوں کے رحم پر نہ چھوڑتا۔

حکیم صاحب: اور اگر وہاں سے آپ ہندوستان نہ آسکتے تو؟

میں: تو پھر خودکشی کر کے اپنے آپ کو ختم کر لیتا، کیونکہ میرے لئے ایسی ذہنی اذیت کو برداشت کرنا ممکن نہ تھا۔

حکیم صاحب: اور اگر آپ خودکشی بھی نہ کر سکتے، تو پھر کیا کرتے؟

میں: اگر خودکشی کرنے کی بھی مجھ میں جرات نہ ہوتی، تو پھر میں اسلام قبول کر کے اپنے ذہن کو ایسے شرمناک ظلم سے نجات دے لیتا۔

حکیم صاحب میری باتیں سن رہے تھے، اور حیران تھے کہ میں کیا کہہ رہا ہوں مگر میں تو وہی کچھ کہہ رہا تھا، جسے میں درست سمجھتا تھا کیونکہ میں کسی بھی شخص کو غلط رائے دینا بدترین قسم کا کمینہ پن سمجھتا ہوں۔ چنانچہ میری اب بھی یہی رائے ہے، کہ اگر کوئی شخص اطمینان کے ساتھ زندگی بسر نہیں کر سکتا، وہ مستقبل کے متعلق خطرہ سمجھتا ہے۔ وہ نہیں کہہ سکتا، کہ اس کو ظلم کا کب نشانہ بننے پڑے گا، اور وہ حالات کا مقابلہ بھی نہیں کر سکتا، تو اس کے لئے بہتر ہے کہ وہ مکان، گاؤں، قصبہ، شہر یا ملک سے ہجرت کر جائے۔ چنانچہ میں نے حکیم صاحب کو ریاست نابھ کا ایک دلچسپ واقعہ سنایا کہ اخبار ”ریاست“ کے جاری کرنے سے پہلے میں ریاست نابھ میں سرکاری ملازم تھا۔ مجھے

وہاں ملازم ہوئے ایک برس ہوا تھا، کہ وہاں کے ایک سابق ہندو وزیر (جو مہاراجہ کے معتوب تھے) کے متعلق مہاراجہ کو کسی نے بتایا، کہ یہ سابق وزیر مہاراجہ کو اپنے زیر اثر کرنے کے لئے چنڈی دیوی کا پاٹھ کرتا ہے، اور اس نے اس سلسلہ میں ہی اپنے گھر میں ایک ہون (عبادت اور پاٹھ کے لئے ایک جگہ کا جلانا) جاری کر رکھا ہے۔ مہاراجہ نے جب یہ سنا، تو آپ نے اپنے ایک مخبر کو اصل حالات معلوم کرنے کے لئے اس سابق وزیر کے مکان پر بھیجا۔ اس مخبر نے دیکھا، کہ اس مکان میں ہون ہو رہا ہے، اور اسی برس کے ضعیف اور کمزور سابق وزیر اسی ہون کے پاس بیٹھے چنڈی دیوی کا پاٹھ کر رہے ہیں۔ مخبر نے تمام واقعہ مہاراجہ کو بتایا، تو مہاراجہ نے حکم دیا کہ اس سابق وزیر کو گرفتار کر کے جیل بھیج دیا جائے۔ چنانچہ سپرنٹنڈنٹ پولیس چند پولیس کانسٹیبلوں کے ساتھ رات کو بارہ بجے اس سابق وزیر کے مکان پر گئے، اور وزیر کو گرفتار کر کے بحکم حضور مہاراجہ صاحب جیل کے اندر چھوڑ گئے۔ کیونکہ اس زمانہ میں ریاستوں میں والی ریاست کا حکم ہی قانون ہوا کرتا تھا۔ یہ واقعہ رات کو بارہ بجے ہوا۔ میں صبح جاگا، تو آٹھ بجے کے قریب ایک دوست ملنے آئے، اور انہوں نے بتایا کہ سابق وزیر صاحب رات کو بارہ بجے مہاراجہ کو چنڈی کے پاٹھ کے ذریعے مسخر کرنے کے جرم میں جیل بھیج دیئے گئے ہیں۔ اس واقعہ کو سن کر میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے اس ریاست میں ملازمت نہ کرنی چاہئے۔ دوپہر کو میں نے مہاراجہ کو ایک خط لکھا، کہ میں یہاں اب ملازمت نہیں کرنا چاہتا۔ میرا استعفیٰ منظور کر لیا جائے۔ میرے اس خط کے جواب میں مہاراجہ نے اپنا آدمی بھیج کر مجھ سے دریافت کیا کہ میں کیوں مستعفی ہونا چاہتا ہوں؟ اس آدمی کو میں نے جواب دیا، کہ جس ریاست میں یہ یقین نہ ہو کہ رات کو سونے کے بعد اگلی صبح کے سورج کی شعاعیں یہ اپنے گھر میں دیکھ سکتا ہے اور یہ شعاعیں شائد اسے جیل کی دیواروں کے اندر ہی دیکھنی ہوں گی میں ایسی ریاست میں ملازمت نہیں کر سکتا۔ مجھے اس ریاست اور اس ریاست کے حکمران کی خدمت سے سبکدوش کر دیا

جائے۔ مہاراجہ میرے ذاتی دوست اور مہربان تھے۔ انہوں نے میرا استعفیٰ منظور نہ کیا، اور مجھے تشفی کا پیغام بھیج کر مجبور کیا، کہ میں نابھ سے نہ جاؤں۔ کچھ عرصہ کے بعد ان وزیر صاحب کو بھی جیل سے رہا کردیا گیا۔ اس واقعہ کو بیان کرنے کے بعد میں نے حکیم صاحب سے کہا، کہ جس انسان کو یہ بھی اطمینان نہ ہو کہ وہ اب یا آئندہ عزت و احترام کی اطمینان بخش زندگی بسر کرسکتا ہے اسے تو ہجرت کرنی ہی چاہئے میرے اس جواب سے حکیم صاحب بہت مایوس تھے۔ آپ میرا یہ جواب سن کر چلے گئے، اور اس کے بعد پھر کبھی میری رائے لینے کے لئے نہیں آئے مگر میں مطمئن تھا کہ میں نے حکیم صاحب کو وہی رائے دی جسے میں ایمانداری کے ساتھ درست اور صحیح سمجھتا تھا۔

پاکستان کو جب قائم کرنے کا فیصلہ ہوا، تو اس وقت نہ تو مہاتما گاندھی یہ سمجھتے تھے کہ ملک کی تقسیم کے سلسلہ میں لاکھوں انسان فرقہ پرستی کے ظلم کا شکار ہوں گے اور نہ مسٹر جناح کو یہ خیال تھا کہ کروڑوں انسانوں پر مصائب نازل ہوں گے کانگرسی اور مسلمان لیڈر صرف وزارتوں کے قلمدانوں کے تبادلہ کے حق میں تھے۔ مگر ہوا وہ جس کی توقع نہ تھی اور جسے انسانیت کے نام پر اور دامن پر ایک شرمناک اور کبھی بھی نہ مٹنے والا سیاہ دھبہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ اگر تبادلہ آبادی کا ہونا لازمی تھا، اور یہ تبادلہ آبادی صرف دو قوموں کی تھیوری کی بنیادوں پر ہوا، تو بہتر تھا کہ یہ تبادلہ آبادی مکمل طور پر ہوتا یعنی تمام مسلمان پاکستان چلے جاتے، اور تمام ہندو ہندوستان آجاتے، اور معصوم، بیگناہ، اور سیاست سے ناآشنا مردوں عورتوں اور بچوں کو تہ تیغ نہ کیا جاتا۔

ہندوستان کی تقسیم کے سلسلہ میں ایک اور واقعہ بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ اس سال کی پچھلی مئی کے پہلے ہفتہ میں میرے عزیزوں میں ایک لڑکی کی شادی تھی۔ اس شادی کی تقریب امرتسر میں ہونے والی تھی، اور میں بھی وہاں جانا چاہتا تھا۔ میں نے امرتسر جانے سے پہلے اپنے امرتسر کے دوستوں کو خطوط لکھے، کہ میں وہاں 3 مئی کو پہنچ رہا ہوں، اور وہاں ان سے ملوں گا۔ جن لوگوں کو میں نے خطوط لکھے، ان میں ماسٹر تارا

سنگھ بھی تھے۔ کیونکہ ماسٹر صاحب سے میرے دیرینہ اور گہرے دوستانہ اخلاص کے مراسم ہیں، اور ان ذاتی تعلقات پر سیاسی مخالفت کبھی بھی اثر انداز نہ ہوئی۔ حالانکہ میں ہمیشہ ہی ماسٹر صاحب کے پنجابی صوبہ کی مخالفت کرتا رہا۔ میرے اس خط کے جواب میں ماسٹر صاحب نے مجھے لکھا کہ وہ خود بھی مجھ سے ملنا چاہتے ہیں مگر وہ 3 مئی کو امرتسر میں نہ ہوں گے، وہ اس روز پٹیالہ میں ہوں گے۔ 4 مئی کو دہلی جا رہے ہیں 5 مئی کو پاونٹہ صاحب (پاونٹہ صاحب وہ مقام ہے جہاں گورو گوبند سنگھ تین چار برس مقیم رہے۔ جہاں ایک بہت بڑا گوردوارہ دریائے جمنا کے کنارے ہے، اور جو ڈیرہ دون سے تیس میل کے قریب ہے) اور میں ان کو پاونٹہ صاحب میں ملوں۔ میں شادی کی تقریب کے سلسلہ میں امرتسر نہ جا سکا اور 5 مئی کو ماسٹر صاحب سے ملنے کے لئے بس کے ذریعہ پاونٹہ صاحب چلا گیا میں پاونٹہ صاحب بارہ بجے دوپہر کے قریب پہنچا تو ماسٹر صاحب کے ساتھیوں نے بتایا کہ ماسٹر صاحب صبح سے منتظر تھے ماسٹر صاحب سے دو تین گھنٹہ تک باتیں ہوئیں میں واپس ڈیرہ دون چلا آیا، اور ماسٹر صاحب امرتسر چلے گئے۔ امرتسر جانے کے چند روز بعد ماسٹر صاحب نے فاقہ کشی شروع کر دی، اور اس فاقہ کشی کے شروع ہونے کے بعد ایک طرف تو ملک کے لیڈروں کی طرف سے تاروں، خطوط، ریزولیشنوں اور پیغاموں کا سلسلہ شروع ہوا، جن میں فاقہ توڑنے کے لئے کہا جا رہا تھا، اور دوسری طرف مجھے اطلاع پہنچی، کہ یو پی کے انسپکٹر جنرل پولیس نے اپنے صوبہ کے تمام تھانوں کو حکم دیا ہے، کہ وہ اپنے اپنے علاقہ کے سکھوں کی فہرستیں اور پتے تیار کریں، تاکہ اگر ماسٹر تارا سنگھ کے فاقہ اور فاقہ کے بعد موت کے باعث ہندوؤں اور سکھوں میں فسادات ہوں تو اس صوبہ میں سکھوں کی حفاظت کی جا سکے، اور سکھوں کو فسادات سے بچایا جا سکے۔ چنانچہ اس حکم کے مطابق ڈیرہ دون کے ضلع کے سکھوں کی فہرستیں بھی تیار ہونی شروع ہوئیں، اور اس کی اطلاع میرے پاس بھی پہنچی۔ اس اطلاع کو سن کر میں نے تارا سنگھ کو ایک خط لکھا، جس کا

مفہوم یہ تھا:

محترم ماسٹر جی!

جو لوگ آپ کو فاقہ چھوڑنے کے لئے تار بھیج رہے ہیں، خطوط لکھ رہے ہیں اور جلسے کر کے ریزولیوشن پاس کرر ہے ہیں، میں ان تمام کو انتہائی بیوقوف سمجھتا ہوں، اور میں خود بیوقوفوں میں سے نہیں ہوں۔ کیونکہ نہ تو آپ نے ان لوگوں کے کہنے سے فاقہ کشی شروع کی، اور نہ ان کے کہنے سے بند کریں گے۔ اس کی تمام تر ذمہ داری صرف آپ پر ہی ہے۔ آپ جیسا چاہیں کریں، مگر میں آپ کی اطلاع کے لئے لکھ رہا ہوں کہ یو پی کی گورنمنٹ نے اپنے صوبہ کے تمام تھانوں کو حکم دیا ہے کہ اس صوبہ میں ہندوؤں اور سکھوں میں فساد ہو تو سکھوں کو بچایا جا سکے، اور سکھ ہندو فرقہ پرستوں کے مظالم کا شکار نہ ہوں۔ اس حکم اور دوسری اطلاعات کا خیال کرتے ہوئے یہ پیشین گوئی کرتا ہوں، کہ اگر آپ نے فاقہ نہ چھوڑا، م اور آپ کی موت ہوئی تو اس موت سے متاثر ہو کر فرقہ پرست اور عاقبت نا اندیش اکالی یقیناً پنجاب کے ہندوؤں پر حملہ کریں گے، اور اس حملہ کے جواب میں ہندوستان کے دوسرے صوبہ جات مثلاً یو پی وغیرہ کے ہندو سکھوں پر حملہ کر دیں گے۔ اور ہندوستان کے تمام صوبہ جات میں وہی کچھ ہو گا، جو 1947ء میں ہندوستان اور پاکستان میں ہوا تھا۔ اب آپ خود ہی سوچ لیجئے، کہ آپ کی موت سکھوں کی کس قدر خدمت انجام دے گی، اور آپ کی روح، آئندہ دوزخ کے کس حصہ میں مستقل قیام کرے گی۔

نیاز مند دیوان سنگھ

میں نہیں کہہ سکتا، کہ ماسٹر صاحب نے فاقہ شروع کیا تھا، تو کن خیالات کے زیر اثر ہو کر اور فاقہ کشی ترک کی، تو کن حالات میں؟ مگر مجھے اس کا یقین ہے، کہ اگر ماسٹر تارا سنگھ کی موت فاقہ کے باعث ہوتی، تو آج دیوان سنگھ سکھ ہونے کے جرم میں ڈیرہ دون میں مقیم نہ ہوتا۔ یہ یا تو فرقہ پرست ہندوؤں کی چھری یا تلوار کا نشانہ بن چکا ہوتا،

یا کسی دوسرے مقام پر کسی ہندو دوست کی پناہ میں ہوتا۔ کیونکہ ماسٹر تارا سنگھ کی موت کے بعد ممکن ہی نہ تھا، کہ عاقبت نا اندیش اور اپنے ذہن میں پنجابی صوبہ کا پاگل پن رکھنے والے فرقہ پرست اکالی پنجاب کے ہندوؤں پر حملہ نہ کرتے، اور اس کے جواب میں ہندوستان کے فرقہ پرست ہندو سکھوں کو ختم کرنے کے لئے قدم نہ اٹھاتے۔ کیونکہ مذہبی جذبات کی بنیادوں پر جب کبھی ممالک تقسیم ہوئے، اور اس تقسیم کے سلسلہ میں تبادلہ آبادی ہوا، تو اس تبادلہ آبادی نے انسان کے خون سے زمین کو ضرور سرخ کیا۔

☆☆☆☆☆☆☆

مشرقی ممالک اور جنسی احساس کمتری

مشرقی اور مغربی ممالک کے لوگوں کا ذہنی اعتبار سے مقابلہ کیا جائے، تو یہ واقعہ انتہائی دلچسپ ہے، کہ یورپ اور امریکہ میں آپ کو ایک شخص بھی ایسا نہ ملے گا، جو جنسی احساس کمتری میں مبتلا ہو، اور مشرقی ممالک میں ایک شخص بھی ایسا نہیں، جو اپنے آپ کو جنسی اعتبار سے کسی نہ کسی حد تک کمزور نہ سمجھتا ہو، اور جس کو مقوی ادویات کی ضرورت نہ ہو۔ جس کا نتیجہ یہ ہے، کہ یورپ اور امریکہ کے کسی بھی اخبار یا رسالہ میں مقویہ ادویہ کا ایک بھی اشتہار نظر نہیں آتا، اور ہندوستان اور پاکستان کا شائد ہی کوئی اخبار یا رسالہ ایسا ہوگا، جس میں گندے جنسی اشتہارات موجود نہ ہوں۔ اور ان ممالک کے وید اور حکیم تو صرف مقوی ادویات اور کچے سنگھیے کے کشتوں پر ہی زندہ ہیں۔

اخبار ''ریاست'' کو جاری ہوئے چند برس ہی ہوئے تھے، اور اس میں دوسرے اشتہارات کے علاوہ جنسی بیماریوں کے اشتہارات بھی کافی تھے، تو بجنور سے ایک مسلمان کا خط میرے پاس پہنچا، جس میں یہ سطور تھیں:

''آپ کے اخبار کا میں مداح ہوں، اور میرے گھر کے تمام لوگ اسے شوق سے پڑھتے ہیں، اور تمام بچے بھی ہر ہفتے اس کے منتظر رہتے ہیں۔ پرسوں کا واقعہ ہے، میری لڑکی جس کی عمر گیارہ برس کی ہے، اور جو پانچویں جماعت میں پڑھتی ہے، آپ کا اخبار میرے پاس لائی، اور اس نے اس میں سے ایک اشتہار دکھاتے ہوئے معصومانہ انداز میں مجھ سے پوچھا، کہ لفظ احتلام کے کیا معنی ہیں؟ اپنی بچی کا یہ سوال سن کر میری جو حالت ہوئی وہ بیان نہیں کر سکتا اس کا اندازہ آپ خود ہی کر سکتے ہیں۔ میں نے لڑکی کو ٹالتے ہوئے ایک کام سے بھیج دیا، اور جب وہ چلی گئی تو اس اشتہار والے صفحہ کو اخبار میں سے پھاڑ دیا، تا کہ وہ اس اشتہار کو مجھے پھر نہ دکھا سکے۔''

اس خط کو میں نے جب دیکھا، تو میں نے انتہائی شرمندگی محسوس کی۔ کچھ دیر سوچتا رہا، اور سوچنے کے بعد فیصلہ کیا، اور اخبار میں اعلان کر دیا کہ آئندہ ''ریاست'' میں کوئی بھی جنسی اشتہار شائع نہ ہوگا۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ اس قدم کے اٹھانے کے باعث ''ریاست'' کی اشتہارات کی آمدنی میں کئی سو روپیہ ماہوار کی کمی ہو گئی اس کے بعد کوئی اشتہار کسی دوائی کا شائع ہوا، تو بہت ہی احتیاط کے ساتھ تاکہ ''ریاست'' معصوم اور بیگناہ لڑکیوں اور لڑکوں کے ذہن کو پلید کرنے کا باعث ثابت نہ ہو۔

چند برس ہوئے راقم الحروف ہندوستان ہیلتھ منسٹر راجکماری امرت کور سے ملا اور میں نے اردو کے اخبارات کے کٹنگ دیتے ہوئے ان سے درخواست کی کہ ہندوستان کے اخبارات کو اس پلیدگی سے نجات دی جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گورنمنٹ ہند نے فحش اشتہارات کے خلاف ایک قانون پاس کیا۔ پاکستان کے ہیلتھ منسٹر جنرل برکی کو بھی میں نے لکھا اور کچھ اخبارات کے گندے اشتہارات اس خط کے ساتھ بھیجے اور میرا ارادہ تھا کہ پچھلے سال جب میں پاکستان گیا تو جنرل برکی سے خود مل کر اخبارات کی اس پلیدگی پر ان کی توجہ دلاتا، مگر وقت نہ ہونے کے باعث ایسا نہ کر سکا۔ مجھے افسوس ہے، کہ پاکستان کی گورنمنٹ نے اس سلسلہ میں اب تک کوئی قدم نہیں اٹھایا، اور پاکستان کے اکثر اخبارات اس غلاظت میں مبتلا ہیں۔

جنسی احساس کمتری کے سلسلہ کا ایک واقعہ بیان کرتا ہوں، جو دلچسپ اور افسوسناک بھی ہے۔ جرنلزم کا پیشہ اختیار کرنے سے پہلے میں میڈیکل پریکٹس کرتا تھا اور طبی دنیا کی نئی ایجادات سے مجھے بہت دلچسپی تھی، جو اب بھی قائم ہے میں نئی ایجاد ہونے والی ادویات کی فہرستیں اور لٹریچر منگا تا رہتا ہوں، اور اگر کوئی اچھا ڈاکٹر ملنے کے لئے آجائے، تو بعض بیماریوں کے متعلق اس سے بھی دیر تک بحث ہوا کرتی ہے۔ میں ناگپور جیل میں تھا، تو اس جیل کا سٹاف مجھ سے بہت اچھی طرح پیش آتا، کیونکہ یہ

لوگ اخبارات کے اثرات سے واقف تھے۔ جیل کے سپرنٹنڈنٹ کرنل موڈی تو دوسرے تیسرے روز میرے پاس آیا کرتے، اور میری ضروریات دریافت کرتے۔ مگر ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ اور اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ ہر روز صبح میرے پاس آتے، اور اس کے بعد شام کو قیدیوں کی گنتی کرنے اور بارکیں بند کرنے کے بعد میرے پاس آ جاتے۔ وہاں ہی چائے پیتے کیونکہ میرے پاس بسکٹ، انڈے اور پھل وغیرہ کافی مقدار میں موجود رہتے، اور ایک آدھ گھنٹہ باتیں کرتے۔ ایک روز باتوں میں ری جوڈی نیشن (اعادہ شباب) کے مسئلہ پر ذکر شروع ہو گیا تو میں نے اپنی معلومات کے مطابق ان کو بتایا کہ بڑھاپا کیوں آتا ہے، گلینڈز (غدود) کا فعل کیا ہے، تندرست غدود کا اعصاب اور دماغ پر کیا اثر ہوتا ہے، اور شباب اور قوت کو قائم رکھنے کے لئے کیا کرنا چاہئے؟ یہ باتیں ایک گھنٹہ کے قریب ہوتی رہیں۔ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ اور اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ چلے گئے تو اس وارڈر نے جو میرے پہرے پر قریب ہی کھڑا تھا (میرے پہرے پر اس وارڈ میں ایک سپاہی وارڈ ہمیشہ موجود رہتا۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ میں دوسرے کسی قیدی سے بات نہ کروں مجھے جیل کی خرابیوں کا دوسرے قیدیوں سے علم نہ ہو اور میں رہا ہونے کے بعد جیل کی ان خرابیوں کو اخبار میں بے نقاب نہ کروں جیل کے ان افسروں کے جانے کے بعد مجھ سے سوال کیا:

''سردار جی! یہ ڈپٹی صاحب آپ سے باتیں کر رہے تھے، کیا یہ طاقت اور قوت کے متعلق تھیں؟''

میں نے جواب دیا کہ ''ہاں''

میرا یہ جواب سن کر اس وارڈر نے جو یوپی کے ضلع پرتاب گڑھ کا رہنے والا بائیس برس کا جوان تھا (کیونکہ پولیس اور جیل میں بطور سپاہی کے ملازم ہی وہ شخص ہو سکتا ہے، جو ہٹا کٹا و جوان اور اچھی صحت کا مالک ہو) کہا:

''سردار جی! میری ابھی چھ ماہ ہوئے شادی ہوئی ہے، اور ایک ماہ ہوا، میں اپنی

بیوی کو یہاں لے آیا ہوں آپ مجھے بھی طاقت کی کوئی دوائی دیجئے۔''

یہ سن کر میں حیران ہو گیا کہ یہ کم بخت بائیس برس کا ہٹا کٹا جوان ہے۔ اس کی صحت بہت اچھی ہے، مگر یہ بھی احساس کمتری میں مبتلا ہے میں نے اس کو سمجھایا، کہ یہ کوئی دوائی مت کھائے، اس کو کسی دوائی کی ضرورت نہیں۔ مگر اس نے ہاتھ باندھ باندھ کر التجائیں شروع کیں کہ اسے دوائی ضرور دی جائے۔ اس کی ان التجاؤں کو دیکھ کر مجھے اس پر رحم بھی آتا تھا، اور میں اس کی بے وقوفی اور ناواقفیت پر مسکرا بھی رہا تھا۔ جب اس نے مجھے بہت ہی تنگ کیا، اور میرے پاؤں پکڑ لئے، تو میں نے سوچا کہ گو یہ وارڈر میرے پہرے پر ہے مگر چونکہ یہ میرا لحاظ کرتا ہے میں دوسرے قیدیوں سے باتیں کر لیا کرتا ہوں۔ اگر یہ وارڈر بددل ہو گیا، تو یہ مجھے اپنے افسروں کے حکم کے مطابق کسی قیدی سے کوئی بات نہ کرنے دے گا۔ اس بدبخت کا ذہن بھی جنسی احساس کمتری میں مبتلا ہے، میں نے اس سے کہا کہ اچھا تمہیں دوائی دوں گا۔

میں اس وارڈر کو چھ سات روز ٹالتا رہا، تاکہ یہ دوائی لینے کے ارادہ سے باز آجائے، مگر اس کی التجاؤں میں روز بروز زیادتی ہوتی گئی۔ میں اس کی دوائی حاصل کرنے کی التجا سے تنگ آ گیا۔ اس کے علاوہ نہ تو اس کم بخت کو کسی دوائی کی ضرورت تھی، اور نہ ہی جیل میں میرے پاس کوئی دوائی ہی تھی میں نے سوچنے کے بعد فیصلہ کیا کہ اس بیوقوف کو تسلی کے لئے کسی شیشی میں اس کو کوبرا بوٹ پالش (کیونکہ میرے پاس یہی موجود تھی) دے دوں، اور کہوں کہ اس سے چند سیکنڈ مالش کیا کرے چنانچہ میں نے اس کو ایک چھوٹی شیشی بازار سے لانے کو کہا شام کو یہ شیشی جس پر کارک لگا تھا مجھے دی گیا رات کو میں نے کوبرا پالش والی شیشی میں سے تھوڑی سی پالش اس شیشی میں بھر دی، اور اسے کاغذ میں لپیٹ کر رکھ دیا۔ اگلے روز صبح یہ میرے پہرے پر آیا تو میں نے اسے یہ شیشی دی اور کہا کہ اس دوائی میں سے چنے کے برابر (حکیم اور ویدا پنی دوائی دیتے وقت چنے کے برابر، جو کے برابر یا چاول کے برابر ہی بتایا کرتے ہیں،

اور یہی اوزان ہندوستان کے جہلا میں مقبول ہیں) دوائی لے کر دو چار سیکنڈ مالش کیا کرے ۔ یہ کم بخت دوائی لے کر بہت خوش تھا۔ دوپہر کو پہرہ سے فارغ ہو کر اپنے کوارٹر میں واپس گیا۔ وارڈروں کے کوارٹروں کے صحن کے ایک کونہ میں اینٹوں کا چھوٹا سا پردہ ہوتا ہے، تا کہ پردہ کے اندر غسل کیا جا سکے۔ اس نے کوارٹر میں پہنچتے ہی اپنی بیوی سے کہا کہ وہ کھانا تیار کرے اس کی بیوی برآمدہ میں روٹیاں پکانے میں مصروف ہوگئی۔ اور یہ خود غسل کے لئے اس پردہ والی جگہ گیا۔ اس نے پہلے تو اس شیشی میں سے چنے کے برابر دوائی نکالی، اس دوائی کی انگلی سے مالش کی اور مالش کرنے کے بعد اس نے غسل کیا غسل سے فارغ ہونے کے بعد برآمدہ میں اپنی بیوی کے پاس آ کر اس نے کھانا کھایا اور دوائی کی شیشی کو لے کر اپنے کپڑوں والے ٹرنگ میں کپڑوں کی تہہ کے اندر چھپا دیا، تا کہ اس کی بیوی کو دوائی کا پتہ نہ چلے، اور یہ علم نہ ہو کہ اس کا شوہر جنسی کمزوری کی بیماری میں مبتلا اور زیر علاج ہے۔

یہ وارڈر اگلے روز پھر پہرے پر آیا تو بہت خوش تھا میں نے پوچھا کیا دوائی استعمال کی؟ میرے اس سوال کے جواب میں اس نے انتہائی اطمینان اور مسرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا یہ دوائی بہت ہی اچھی ہے میں نے جب مالش کی تو اس دوائی کا فوراً ہی اثر ہوا۔ یہ سن کر میں مسکرا دیا، اور اپنی مسکراہٹ کو ضبط کرتے ہوئے اس ہونق سے کہا کہ اس دوائی کے متعلق کسی دوسرے سے ذکر نہ کرنا تم چونکہ میرے پہرے پر ہو، اس لئے دوائی صرف تمہیں ہی دی ہے۔

یہ وارڈر پوربیا اور ضلع پرتاب گڑھ (یوپی) کا رہنے والا تھا سی پی کی جیلوں میں پوربئے وارڈروں کی کافی تعداد ہے، اور ناگپور جیل میں بھی نصف سے زیادہ وارڈر پوربئے تھے۔ اس پوربئے وارڈر نے اپنے ایک دوسرے راز دار دوست وارڈر سے اس دوائی کے فوری اثر کا ذکر کیا دوائی کی تعریف سن کر یہ وارڈر بھی میرے پاس پہنچا، اور اس نے بھی دوائی دینے کے لئے التجائیں کیں۔ اس کے چار پانچ روز بعد دو اور

وارڈر آپہنچے۔ ادھر میری کو برا بوٹ پالش والی شیشی بھی ختم ہوگئی اور خدا کا شکر، کہ میری ''ڈاکٹری'' کی شہرت اور زیادہ وارڈروں تک نہ پہنچی تھی کہ میں جیل سے رہا ہو گیا اور اس سلسلہ کا یہ واقعہ تو بہت ہی دلچسپ ہے کہ ایک وارڈ بجائے اس کے کہ وہ ناگپور سے سیدھا الہ آباد اپنے گھر جاتا، وہ ناگپور سے دہلی آیا اور دفتر ریاست میں پہنچنے کے بعد مجھ سے کہا کہ وہ اپنے گھر جا رہا ہے، صرف دوائی لینے کے لئے دہلی آیا ہے، اور اسے دوائی دی جائے۔ میں اس بدبخت کو کیا جواب دیتا۔ میں نے صرف یہی کہا، کہ میری ڈاکٹری ناگپور جیل کے بڑے دروازے تک ہی محدود تھی۔ میں تو ایک اخبار ایڈٹ کرتا ہوں، میں ڈاکٹر نہیں ہوں۔ یہ نہیں مانا، اور اس نے میرے پاؤں پکڑ لئے اور کہا کہ پرماتما کے لئے اس کو بھی وہ کالے رنگ کی طاقت کی دوائی دی جائے، جو دوسرے وارڈروں کو دی تھی۔ اس کی بار بار کی التجاؤں سے مجبور ہو کر میں نے اس سے یہ وعدہ لے کر کہ یہ پھر کبھی میرے پاس نہ آئے گا اور نہ اس دوائی کا کسی دوسرے سے ذکر کرے گا میں نے اس بیوقوف کو بھی ایک چھوٹی شیشی میں اپنی نئی خریدی ہوئی کو برا بوٹ پالش میں سے پالش دی اور یہ الہ آباد روانہ ہوا۔

میرے ان واقعات کو بتانے کا مقصد یہ ہے کہ لوگ اشتہاری حکیموں اور دیدویدوں کے ہاتھوں تباہ نہ ہوں۔ جنسی کمزوری کوئی بیماری نہیں ہے، یہ صرف ذہنی احساس کمتری ہے۔ جس میں مشرقی ممالک کے لوگ بلا وجہ مبتلا ہیں۔ کیونکہ اگر یہ کوئی بیماری ہوتی، تو یورپ اور امریکہ کے لوگ بھی مقوی ادویات کی تلاش کرتے۔ مگر ان ممالک کے کسی شخص کو بھی کبھی کسی مقوی دوا کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ ہندوستان کے اخبارات میں ویدوں اور حکیموں کے جو اشتہارات شائع ہوتے ہیں، ان اشتہارات والی ادویات نہ صرف مفید ہی نہیں بلکہ اکثر حالات میں انتہائی نقصان رساں اور مہلک بھی ثابت ہوتی ہیں۔ مثلاً اگر کوئی ہائی بلڈ پریشر میں مبتلا ہو اور وہ ان ادویات (جن میں عام طور پر کچلہ اور سنکھیا ہوتا ہے تاکہ دوران خون میں مزید تحریک

ہو) کو استعمال کرے تو یہ دوائی استعمال کرنے والا فالج میں مبتلا ہوسکتا ہے اور فالج ایسا نامرادمرض ہے کہ اس کے مقابلہ پر موت ہزار درجہ بہتر ہے کیونکہ مفلوج شخص اپنی ضروری حاجات سے فارغ ہونے کے لئے بھی دوسروں کا محتاج ہو جاتا ہے۔

جنسی ادویات کے سلسلہ میں اخبارات یا حکیموں اور ویدوں سے کچھ کہنا لا حاصل ہے کیونکہ اخبارات اور حکیموں ویدوں کو پبلک مفاد سے کوئی تعلق نہیں اور یہ تجارتی اڈے ہیں، جو اپنے چند پیسوں کے لئے پبلک کی صحت اور پبلک کا مفاد قربان کر سکتے ہیں ان ادویات اور نالائق، نا اہل حکیموں اور ویدوں کو ختم کرنے کی صورت تو صرف ایک ہی ہے کہ گورنمنٹ پبلک کو اس جنسی فراڈ سے بچانے کے لئے سخت قدم اٹھائے، اور جنسی اشتہار بازی کو قانوناً بند کر دیا جائے، تا کہ پبلک کی صحت، اخلاق اور کریکٹر تباہ نہ ہو۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

عورت میں بچہ کی قدرتی خواہش

ہندو متھیالوجی کے مطابق اس شخص کی نجات ممکن ہی نہیں، جس کے ہاں اولاد نہ ہو۔ یعنی ایک ہندو کی نجات تب ہی ممکن ہے، اگر اس کے مرنے کے بعد اس کی اولاد اس کی روح کو ثواب پہنچانے کے لئے خیرات کرے، جسے شرادھ کہا جاتا ہے۔ اور ہندوؤں کے علاوہ دوسری اقوام میں بھی اولاد کو بہت بڑی اہمیت حاصل ہے۔ کیونکہ عام طور پر یہ یقین کیا جاتا ہے، کہ اولاد جوان ہونے پر اپنے والدین کے لئے ایک آسرا ثابت ہوگی۔

جن عورتوں کے بطن سے اولاد پیدا ہو، وہ بہت مطمئن رہتی ہے، اور جن کے ہاں کوئی اولاد نہ ہو، یعنی یہ بانجھ ہوں، ان کی زندگی کا خوشگوار بسر ہونا ممکن ہی نہیں۔ اولاد سے محروم ہونا ان کے لئے قدم قدم پر تکلیف کا باعث ہوتا ہے۔ کیونکہ اولاد سے محروم عورت نہ صرف خود ہمیشہ مغموم رہتی ہے، بلکہ یہ سوسائٹی میں بھی قابل وقعت قرار نہیں دی جاتی اور عزیز و اقارب کو چھوڑ کر اگر شادی کے بعد دو تین برس عورت کے بطن سے کوئی بچہ پیدا نہ ہو، تو اس عورت کی ساس اپنی بہو کے متعلق تشویش محسوس کرتے ہوئے اس خیال میں مصروف ہو جاتی ہے کہ اس کے بیٹے کی دوسری شادی ہو اور اکثر حالتوں میں دوسری شادی کر دی جاتی ہے جو پہلی بیوی کے لئے نا قابل برداشت مصائب و مشکلات کا باعث ہوتی ہے۔

بانجھ ہونے کی صورت میں عورت کوشش کرتی ہے کہ اگر اس کے بطن سے اولاد کا ہونا ممکن نہیں، تو وہ کسی دوسرے کے بچہ کو اپنی گود میں لے، اور اسے پالے، تا کہ ماں کی محبت کا قدرتی لطف وہ حاصل کر سکے۔ حالانکہ اس میں جبری محبت کے جذبات کو اختیار کرتے ہوئے وہ ایک نئی ذہنی کوفت میں مبتلا ہوا کرتی ہے، جب اس کو یہ خیال آتا ہے کہ یہ بچہ کسی دوسری عورت کا ہے۔ اس کے علاوہ دوسری عورت کا بچہ پالنے کی صورت میں جب اس بچہ سے توقعات پوری نہ ہوں، تو ان توقعات کا پورا نہ ہونا اس

کے لئے انتہائی اور نا قابل برداشت کوفت کا باعث ہوتا ہے۔ مثلاً ہندوستان کے ایک بہت بڑے کانگرسی لیڈر مسلمان کے ہاں کوئی اولاد نہ ہو۔ اس لیڈر کی بیوی نے اپنی حقیقی بہن کی بیٹی کو گود میں لے لیا۔ یہ لڑکی جوان ہوئی، تو اس کی محبت ایک نوجوان سے ہو گئی، جس سے یہ شادی کرنا چاہتی تھی، مگر اس کو پالنے والی اس کی خالہ (جسے اس کی ماں ہی کہنا چاہئے) چاہتی تھیں، کہ اس لڑکی کی شادی اس کے رشتہ داروں میں ہو۔ چنانچہ جب لڑکی نے اپنی ماں کی خواہش کے خلاف اظہار کیا، تو اس کی ماں یعنی لیڈر کی بیوی نے غصہ کے عالم میں لڑکی سے شکایت کرتے ہوئے کہا:

"اگر تم میرے بطن سے پیدا ہوتی، تو انکار نہ کرتی، اور جیسا میں کہتی، ویسا ہی کرتی چونکہ میرے بطن سے پیدا نہیں ہوئی، اس لئے میری خواہش کی پرواہ نہیں کر رہی۔"

یہ سن کر لڑکی نے زار زار رونا شروع کر دیا۔ کیونکہ ایک تو اس بے چاری پر احسان فراموشی کا الزام تھا، اور دوسرے اس کی شادی اس کی مرضی کے خلاف ہو رہی تھی۔ مگر یہ مجبور تھی، کیونکہ شادی آخر وہاں ہی ہوئی، جہاں کہ وہ نہ چاہتی تھی۔

عورت فطرتاً اپنی سوتن کے بچوں سے محبت نہیں کرتی۔ مگر بانجھ ہونے کی صورت میں دیکھا گیا ہے کہ یہ اپنی سوتن کے بچوں سے محبت کرنے پر بھی مجبور ہے۔ کیونکہ سوتن کے بچوں سے محبت کرنے کے مقابلہ پر محبت کے خلد میں زندگی بسر کرنا، اس کے لئے زیادہ تکلیف کا باعث ہوتا ہے۔ راقم الحروف کے ایک دوست کی دو بیویاں ہیں۔ پہلی بیوی کے بطن سے کئی بچے ہیں، اور دوسری بیوی کے بطن سے کوئی بچہ نہیں۔ دوسری بیوی کے تعلقات اپنی سوتن یعنی شوہر کی پہلی بیوی سے انتہائی ناخوشگوار، بلکہ عداوت کی حد تک خراب ہیں۔ مگر سوتن کی لڑکیوں سے اس کو محبت ہے، اور ان لڑکیوں کو وہ اخلاص اور محبت کے ساتھ اپنے پاس رکھتی، اور ان کی پرورش کرتی ہے۔ کیونکہ یہ اپنی اولاد نہ ہونے کے باعث مجبور ہے، کہ کسی دوسری عورت کے بچوں کو پالے، یہ بچے چاہے اس کی سوتن کے ہی کیوں نہ ہوں۔ اور اگر اس کے بطن سے بچے پیدا

ہوتے، تو یہ ممکن ہی نہ تھا، کہ یہ سوتن کے بچوں کو پالتی، اور ان سے محبت کرتی۔

بانجھ ہونے کی صورت میں نہ صرف عورت دوسرے کے بچوں کو محبت کرنے پر مجبور ہے، بلکہ مویشیوں، پرندوں، درندوں اور دوسرے جانوروں میں بھی یہی سپرٹ پائی جاتی ہے۔ کتا چھ ماہ کی عمر میں پہنچنے پر بالغ ہو جاتا ہے، اور کتیا عام طور پر ایک برس میں بچے دینا شروع کر دیتی ہے۔ میری ایک کتیا جس کا نام لکی ہے، بانجھ ہے، مگر اس کی ماں مسلسل بچے دیتی رہی۔ یہ لکی جب تین برس کی ہو گئی، اور یہ حاملہ نہ ہوئی تو ایک روز جب اس کی ماں نے بچے دیئے، تو یہ اپنی ماں کے پاس جا کر بچوں کے سامنے لیٹ گئی، اور اس نے اپنی دودھ دینے والی جگہ بچوں کے سامنے کر دی، تا کہ بچے اس کا دودھ پئیں۔ حالانکہ جس صورت میں کہ یہ کبھی حاملہ نہ ہوئی، اور اس کے بطن سے کبھی بچہ پیدا نہ ہوا۔ اس کے تھنوں میں دودھ کا سوال ہی کیا تھا؟ مگر یہ فطرتاً مجبور تھی، کہ دوسری کتیا کے بچوں سے ہی محبت کرے، اگر اس کے بطن سے کوئی بچہ پیدا نہیں ہوا۔

میرے ایک دوست ریٹائرڈ انسپکٹر پولیس ہیں، جو آج کل ڈیرہ دون میں مقیم ہیں ان کی پہلی اور مرحوم بیوی کے بطن سے کئی بچے ہیں، جو جوان ہیں۔ دوسری بیوی سے کوئی اولاد نہیں، اور وہ بانجھ ہے۔ دوسری بیوی نے پہلے تو اپنی سوتن کی لڑکیوں کو محبت کے ساتھ پالا۔ یہ لڑکیاں جب جوان ہوئیں، اور شادی ہونے کے بعد یہ جب اپنے سسرال چلی گئیں، تو اس بیوی نے پھر محبت کی فضا میں ایک خلا سا محسوس کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا، کہ یہ اپنے پڑوسی کے بچوں کو گود میں اٹھائے پھرتی ہے۔ میں جب ان کے ہاں جاتا ہوں، تو اس کی گود میں نیا بچہ دیکھتا ہوں۔ کیونکہ کسی بچہ کی ماں یہ گوارا نہیں کر سکتی، کہ وہ اپنا بچہ مستقل طور پر اسے دے۔ چنانچہ ایک دن میں ان کے ہاں گیا، تو میں نے مذاق سے کہا، کہ آپ کے ہاں نیا بچہ پیدا ہو گیا؟ میرے یہ الفاظ سن کر ویسے تو وہ مسکرا دی، کیونکہ یہ مذاق تھا، مگر اس کی آنکھیں کچھ تر سی ہو گئیں۔ کیونکہ اس نے محسوس کیا، کہ اپنی اولاد نہ ہونے کے باعث یہ دوسروں کے بچے پالنے اور بدلنے پر مجبور

ہے۔

دہلی میں میرے پڑوس میں ایک حلوائی رہتے تھے، جن کے ہاں کوئی اولاد نہیں۔ اس حلوائی کی بیوی نے ایک دوسری عورت کی لڑکی اس شرط پر گود میں لی، کہ لڑکی کے ساتھ اگر اچھا سلوک نہ کیا گیا، تو یہ لڑکی واپس لے لی جائے گی۔ چنانچہ لڑکی کی اصلی ماں اپنی بچی کو دیکھنے کے لئے سال میں ایک مرتبہ دہلی آتی ہے۔ اور گو لڑکی کو علم ہے، کہ اس کی اصلی ماں کون ہے، مگر اس کو اصلی ماں سے کوئی زیادہ رغبت نہیں، کیونکہ پچھلے چودہ پندرہ برس سے یہ اپنی پالنے والی ماں کی محبت کی آغوش میں ہے۔ اس سے ہی مانوس ہے، اور یہ اپنی پالنے والی اس ماں سے جدا ہونے کے لئے تیار نہیں۔ کیونکہ بچہ سے اگر اخلاص کے ساتھ محبت کی جائے، اور اس کی سہولتوں کا خیال رکھا جائے، تو یہ بچہ فطرتاً اپنے اصلی ماں باپ کو بھی بھول جاتا ہے۔ اور بچہ کی جب یہ کیفیت ہو، تو اس کے پالنے والے والدین بھی اس سے اپنی حقیقی اولاد سے زیادہ محبت کرتے ہیں۔

ہندی کے مشہور شاعر بہاری کا ایک دوہہ ہے، جس میں عورت اپنے محبوب سے کہتی ہے:

''میں اگر تم سے محبت کرتی ہوں، تو تم پر احسان نہیں کرتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میرا دل تم سے محبت کرتا ہے، اور میں اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہوں۔ یعنی یہ محبت بلا واسطہ ہے، میرے بس میں نہیں، کہ میں محبت سے کنارہ کش ہو جاؤں۔''

اس دوہہ کے مطابق دنیا کی ہر عورت محبت کرنے پر مجبور ہے، اور وہ بغیر محبت کے خالی نہیں رہ سکتی۔ یہ محبت چاہے اسے اپنے محبوب سے ہو، شوہر سے، ماں باپ سے، بھائی بہنوں سے، اپنے بچوں سے یا کسی دوسرے کے بچہ سے۔ چنانچہ محبت کے متعلق عورت کی اس فطرت کی موجودگی میں یہ واقعہ دلچسپ ہے، کہ ہر عورت کے دل میں اپنے شوہر سے اس زمانہ سے ہی محبت کے جذبات شروع ہو جاتے ہیں، جس روز کہ اس کی سگائی ہو۔ یعنی جس روز اس کو یہ علم ہو جائے، کہ فلاں شخص سے اس کی شادی ہو

گی۔ محبت کے یہ جذبات شادی سے پہلے اور شادی کے بعد اس زمانہ تک اپنے پورے جوبن اور عروج پر رہتے ہیں، جبکہ اس عورت کے بطن سے بچہ پیدا نہ ہو، اور بچہ پیدا ہونے کے بعد فوراً ہی محبت کے نوے فیصدی جذبات تو اس بچہ میں منتقل ہو جاتے ہیں، اور صرف دس فیصدی جذبات اس کے دل میں شوہر کے لئے باقی رہتے ہیں۔ یہ انسانی فطرت کے مطابق ہے۔ چنانچہ اگر کوئی عورت یہ کہتی ہے، کہ اس کے ہاں بچہ پیدا ہونے کے بعد بھی اس کے دل میں اس کے شوہر کے لئے محبت کے سو فیصدی جذبات موجود ہیں، تو وہ عورت یقیناً جھوٹ بولتی ہے۔ اس کے اس بیان پر یقین نہیں کیا جا سکتا۔ جس کا ثبوت یہ ہے کہ بچہ پیدا ہونے سے پہلے عورت اپنے شوہر سے یہی کہا کرتی ہے، کہ بھوکے رہیں گے، گداگری کر لیں گے، جھونپڑی میں رہائش اختیار کر لیں گے، اور مصائب برداشت کر لیں گے، مگر محبت کی راہ نہ چھوڑیں گے، مگر بچہ پیدا ہونے کے بعد یہی عورت اپنے شوہر کو آنکھیں دکھاتی اور روکتی ہوئی مطالبہ کرتی ہے، کہ بچہ کے لئے فراک لاؤ، جوتی لاؤ، دودھ کا ڈبہ لاؤ، اپنی زندگی کا بیمہ کراؤ، تا کہ بچہ کے بڑے ہونے پر یہ تعلیم حاصل کر سکے، اور جائیداد خریدو، تا کہ اولاد کے کام آئے۔ شوہر اور بچہ کی محبت کے سلسلہ میں ایک اور مثال دی جا سکتی ہے۔ مثلاً حضرت عزرائیل اگر عورت سے یہ کہے، کہ وہ اس کے گھر سے اس کے بچہ اور شوہر دونوں میں سے ایک کی جان لینا چاہتا ہے، وہ بچہ کی جان دینا چاہتی ہے، یا شوہر کی تو عورت ہاتھ باندھ کر عزرائیل سے التجا کرے گی، کہ وہ دونوں میں سے کسی کی جان نہ لے۔ اور اگر حضرت عزرائیل اس التجا کو قبول کرنے سے انکار کر دے، اور عورت دونوں میں سے ایک کی جان دینے پر مجبور ہوئی، تو وہ لازمی طور پر اپنے شوہر کو اپنے بچہ پر قربان کر دے گی۔ یعنی یہ بیوہ ہونا تو برداشت کر لے گی، مگر بچہ سے محروم ہونے پر تیار نہ ہو گی۔

حضرت مسیح نے انجیل میں فرمایا ہے، انسان کی زندگی کو خوشگوار رکھنے کے لئے تین باتیں ضروری ہیں:

1 انسان مصروف رہے، 2 محبت کا کوئی مرکز ہو 3 آئندہ کے لئے کوئی توقع یا امید ہو۔

ان تینوں میں سے جس بات کی کمی ہو، انسان محسوس کرتا ہے۔ اور زندگی خوشگوار تب ہی رہ سکتی ہے، اگر تینوں باتیں میسر ہوں۔ چنانچہ اگر عورت کے بیوہ ہونے کی صورت میں اس کے ہاں کوئی اولاد نہ ہو، تو اس کے لئے زندگی گذارنا ایک عذاب سے کم نہیں، اور اگر بیوہ ہونے کی صورت میں عورت کے ہاں بچے ہوں، یا عورت صرف حاملہ ہی ہو، تو وہ اس توقع پر ہی اپنی زندگی بسر کرسکتی ہے، کہ حمل کے نتیجہ میں جو بچہ پیدا ہوگا، اس سے محبت کرے گی، اس کی پرورش کرے گی۔ وہ بڑا ہوگا، وہ اس کی خدمت کرے گا، اور وہ اپنی ماں کی مشکلات دور کرے گا۔ یعنی عورت بیوہ اور حاملہ ہونے کی صورت میں بھی اپنے بچہ کے خیال میں مصروف اور اس بچہ کے متعلق آئندہ توقع رکھتے ہوئے اپنے مصیبت کے دن کاٹ لیتی ہے۔

عورت اور مرد دونوں کے محبت کے جذبات پر انصاف اور دیانتداری کے ساتھ غور کیا جائے، تو یہ اقرار کرنا پڑے گا، کہ مرد کے مقابلہ پر عورت بہت زیادہ بلند ہے۔ مرد وقتی طور پر محبت کا ساتھ دیتا ہے، مگر عورت فطرتاً محبت پر جان دیتی ہے۔ چنانچہ یہ واقعہ افسوسناک اور دلچسپ ہے، کہ جن لوگوں کی بیویاں بچوں کو چھوڑ کر انتقال کر جائیں، ان بیویوں کے شوہر چند روز بعد ہی نئی بیوی کی تلاش شروع کر دیتے ہیں۔ یہ تلاش یہ کہہ کر شروع کی جاتی ہے، کہ پہلی بیوی کے بچوں کو پالنے والا کوئی نہیں، اور نئی بیوی بچوں کو پال سکے گی، اور ان کی پرورش کر سکے گی۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے، کہ اس شخص کی نئی شادی کا ہونا ہی بچوں کے مصائب کا آغاز ہوا کرتا ہے، اور بچوں کی نئی اور سوتیلی ماں بچوں کی تباہی کے لئے میدان پیدا کرتی ہے۔ چنانچہ وہ لوگ انتہائی مکار اور عاقبت نا اندیش ہیں، جو بچوں کی موجودگی میں نئی شادی کریں، اور شادی کی ضرورت بچوں کی پرورش بتائیں۔

میری رائے میں ان لوگوں کو بھی شادی نہ کرنی چاہیے، جن کے ہاں بچے موجود ہوں، کیونکہ بچوں کا ماں کے بغیر یتیمی کا صدمہ کم تکلیف دہ ہے، اس کے مقابلہ پر کہ ان کو سوتیلی ماں کے مظالم کا تختۂ مشق بننے دیا جائے۔

☆☆☆☆☆☆

بچوں اور عورتوں کی دعاؤں اور بد دعاؤں کا اثر

میرا جرنلزم کا پیشہ اختیار کرنے کا شروع کا زمانہ تھا، اور میں لاہور کے اردو ہفتہ وار اخبار ''ہندوستان'' میں مرحوم لالہ رام رچھپال سنگھ شیدا کے ماتحت کام کرتا تھا، تو وہاں دفتر ہندوستان میں (جو لوہاری دروازہ کے باہر ہسپتال روڈ پر، ایک وسیع احاطہ میں تھا) کبھی کبھی مرحوم رائے بہادر مول راج ایم اے ریٹائرڈ سیشن جج تشریف لایا کرتے۔ رائے بہادر مرحوم اس زمانہ پنجاب کی بہت اہم شخصیتوں میں سے تھے۔ آپ غالباً پنجاب یونیورسٹی کے سب سے پہلے ایم اے تھے۔ آریہ سماج کے لیڈر جنہوں نے سوامی دیانند کی صحبتیں دیکھیں، اور بہت ہی حق پرست اور سچائی پسند جو جھوٹ اور بے ایمانی کو پسند نہ کرسکیں۔ آپ ایک روز دفتر ''ہندوستان'' کے صحن میں بیٹھے شیدا صاحب سے باتیں کر رہے تھے، اور یہ باتیں عورتوں کے متعلق ہو رہی تھیں، تو رائے بہادر نے باتوں باتوں میں کہا:

''بیوی کو خوش کرنا کیا مشکل ہے۔ اگر بیوی کپڑا اور زیور طلب کرے، تو اس سے کہہ دینا چاہئے کہ تم بغیر زیور اور کپڑے کے ہی مجھے چاند جیسی خوبصورت معلوم ہوتی ہو۔ یہ بیچاری ان الفاظ کو سن کر ہی مطمئن ہو جائے گی، اور مسکرا دے گی۔''

اگر غور کیا جائے، تو لالہ رائے بہادر مول چند کا یہ قول عورت کی فطرت کے عین مطابق ہے۔ کیونکہ دنیا کی ہر عورت اپنے حسن کے متعلق داد چاہتی ہے، اور اگر اس کے حسن کی تعریف کی جائے، تو اس کے اعصاب میں ایک ناقابل بیان خفیف سی جنبش اور ذہن میں آب حیات نما مسرت کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں۔ اور اگر کسی دردمند کی دلداری کرنا حج اکبر ہے، تو ایک عورت کے حسن کی تعریف کرتے ہوئے اسے ناقابل بیان مسرت پہنچانا کئی بار کے حج کا ثواب حاصل کرنا قرار دیا جاسکتا ہے۔

یہ کیفیت تو عورت کے حسن کی تعریف کرتے ہوئے ثواب حاصل کرنے کے متعلق ہے۔ عورت پر ظلم کرنا ایک ایسا گناہ ہے، جس کی سزا کو شائد خدا بھی معاف نہیں

کر سکتا، کیونکہ دنیا کی ہر عورت بے زبان ہے۔ یہ اپنے دل کا دکھ بیان نہیں کیا کرتی۔ یہ ظلم برداشت کرتے ہوئے خاموش رہا کرتی ہے، اور اس کی بے زبانی ہی زبان ہو جایا کرتی ہے۔ اس سلسلہ میں چند واقعات بیان کرتا ہوں:

یو پی میں ایک ڈپٹی کلکٹر تھے، بہت اچھے خاندان میں سے۔ ان کی شادی بھی ایک گریجویٹ لڑکی سے ہوئی۔ یہ لڑکی بھی بہت اچھے خاندان سے اور بہت ہی شریف، معصوم اور نیک تھی۔ تبادلہ آبادی کے سلسلہ میں ڈپٹی صاحب معہ اپنی بیوی کے پاکستان چلے گئے۔ وہاں بیوی کے بطن سے ایک لڑکی پیدا ہوئی، جس کا بعد میں انتقال ہو گیا۔ یہ میاں بیوی خوشی و مسرت کی زندگی بسر کر رہے تھے، کہ ڈپٹی صاحب کی ایک فیشن ایبل عیسائی لڑکی سے آنکھ لڑ گئی۔ کچھ روز تو اس عیسائی لڑکی سے عارضی تعلقات جاری رہے، اس کے بعد اس لڑکی کے مجبور کرنے پر ڈپٹی صاحب نے اس سے بھی شادی کر لی، کیونکہ اسلام نے تو ہر مرد کو چار شادیاں تک کرنے کی اجازت دی ہے۔ ہندوؤں میں مذہباً تعداد کا کوئی سوال ہی نہیں، جتنی چاہو کرو۔ اور اگر اب پابندیاں جاری ہوئیں، تو ہندوستان کے شادی کے متعلق نئے قانون کے باعث۔ ڈپٹی صاحب کے اس نئی عیسائی بیوی سے جوں جوں محبت کے زیادہ تعلقات ہوتے گئے۔ پہلی بیوی نظروں سے گرتی چلی گئی، اور پہلی بیوی کی معصومیت اور سادگی شوہر کو بیوقوفی نظر آنے لگی۔ عیسائی بیوی بہت چالاک اور تجربہ کار تھی۔ اس نے نائٹ کلبوں میں جانا شروع کر دیا، جہاں بغیر شوہر کے کپتانوں اور میجروں کے ساتھ ڈانس کرتی۔ پہلی بیوی نے مناسب سمجھا، کہ ان حالات میں وہ اپنے والدین کے پاس لکھنو چلی جائے۔ وہاں گئی، تو تین ماہ کے بعد ویزا کی معیاد ختم ہونے پر پاکستان کی شہری ہونے کے باعث ہندوستان سے چلے جانے پر مجبور ہوئی۔ کراچی واپس پہنچی تو اپنے ایک رشتہ دار کے ہاں رہنے پر مجبور ہوئی۔ کیونکہ اس عرصہ میں شوہر اپنی عیسائی بیوی کے ساتھ سرکاری ملازمت کے سلسلہ میں ایک غیر ملک میں چلے گئے تھے۔ شوہر واپس

آئے، تو پہلی بیوی اپنے میاں کی کوٹھی میں چلی گئی، جہاں اس کی پوزیشن ایک آیا یا ملازمہ کی سی تھی۔ کیونکہ نئی بیگم صاحبہ کا حکم تھا کہ وہ اپنی پہلی بیوی سے بات نہ کریں۔ اور اس کا کام صرف یہ تھا، کہ نئی بیگم صاحبہ کی بچی کو کھلانا، اور اپنے کمرے میں بند رہنا۔ شوہر اپنی نئی بیوی کے نائٹ کلبوں کے حالات سنتے، تو اپنا خون پی کر خاموش رہتے۔ ایک روز موقع پا کر جب کہ دوسری بیوی ایک میجر کے ساتھ نائٹ کلب میں تھی، شوہر اپنی پہلی بیوی کے پاس پہنچے۔ زار زار روتے ہوئے اپنی زندگی سے بیزاری کا اظہار کیا، خودکشی کی تمنا ظاہر کی۔ غلطیوں کی معافی چاہی، اور اپنی بے بسی و مجبوری بیان کرتے ہوئے پوچھا، کہ اب دوسری بیوی سے چھٹکارا کیسے ہو؟ یہ معصوم کیا بتاتی؟ یہ بھی اپنے شوہر کے ساتھ رونے لگی۔ کیونکہ ایک شریف عورت سوائے رونے کے کر ہی کیا سکتی ہے۔ دوسری بیوی سے جب میاں یہ کہتے کہ:

''نائٹ کلبوں میں نہ جاؤ''

تو وہ زور سے جواب دیتی کہ:

''عدالت میں جا کر تمام تنخواہ قرق کرا لوں گی، اور تمہاری عزت مٹی میں ملا دی جائے گی۔''

اب میاں تنخواہ کے قرق ہونے اور عزت کے چلے جانے کے خوف سے دوسری بیوی کے ہاتھوں میں ایک ٹول ہیں، اور یہ بیوی جب چاہتی ہے، اس ٹول کو پہلی بیوی کے خلاف استعمال کر لیتی ہے۔ کیونکہ پہلی بیوی کا کوئی آسرا یا پناہ نہیں، جہاں یہ اپنی بقایا زندگی گزار سکے۔

پچھلے سال میں جب کراچی گیا، تو ایک خاتون نے جو تمام حالات سے واقف تھی، اور جو سوشل اصلاح میں حصہ لیتی ہیں، یہ حالات بتائے۔ میں کیا کر سکتا تھا؟ یہی کہا کہ:

''پہلی بیوی کی بے زبانی کے اثرات قدرت کی طرف سے ظاہر ہو رہے ہیں، جو

ظلم کرنے والے شوہر دوسری بیوی کے حالات سے متاثر ہوکر ایک نا قابل بیان ذہنی کوفت میں مبتلا ہیں۔ اور نہ معلوم پہلی بیوی کی بے زبانی کب زبان ثابت ہو، اور میاں کی تنخواہ قرق اور عزت مٹی میں ملے۔ کیونکہ میاں نے تو عیسائی عورت سے شادی کی، تو اس کے شباب سے متاثر ہوکر، اور اس عیسائی خاتون نے اسلام قبول کرنے کے بعد ڈپٹی صاحب سے نکاح کیا، تو کئی سو روپیہ ماہوار تنخواہ اور عہدہ کو دیکھ کر۔''

میں یہ تمام حالات سن کر ہندوستان واپس آ گیا۔ اب بھی جب کبھی اس معصوم اور بیگناہ خاتون پر کئے جا رہے مظالم، اور ان مظالم کے آئندہ نتائج کا خیال کرتا ہوں، تو کانپ اٹھتا ہوں، اور مجھے افسوس ہے، کہ میں اس خاتون کو ان مظالم سے نہیں بچا سکتا۔ ہندوستان پہنچنے کے بعد میں نے ان حالات کے متعلق پاکستان کے صدر محمد ایوب خاں کو ایک خط لکھا۔ مگر وہ بھی کیا کر سکتے ہیں؟ کیونکہ ان مظالم کی نوعیت ایک پرائیویٹ قسم کی ہے، اور موجودہ قانون گھروں کی چار دیواری، اور کوٹھیوں کے احاطہ کے اندر مداخلت نہیں کر سکتا۔ ہاں اگر بلیک مارکیٹ یا سمگلنگ کا سوال ہوتا، تو شائد اسے بھی کسی فوجی عدالت کے سپرد کر دیتے۔

مرحوم مہارانی دھولپور (کوڈائی کنال میں نظر بندی کی حالت میں ہی انتقال کرنے والے مرحوم مہاراجہ نابھ کی حقیقی بہن، اور چند برس ہوئے انتقال کرنے والے مرحوم مہاراجہ دھولپور کی حقیقی بھاوج) بہت ہی نیک خاتون تھیں۔ آج سے پچاس برس پہلے جب آپ کے شوہر نے لاولد ہونے کی صورت میں انتقال کیا، تو اس خاتون کے دیور دھولپور کی گدی پر بٹھا دیئے گئے۔ چونکہ اس خاتون کے کوئی اولاد نہ تھی، اور آپ اپنے دیور سے بھی کسی اچھے سلوک کی توقع نہ کرتی تھیں، آپ کے بھائی (مرحوم مہاراجہ نابھ) نے آپ کو پیغام بھیجا، کہ آپ آئندہ زندگی گزارنے کے لئے نابھ چلی آئیں، اور جواہرات یا روپیہ آپ کے پاس ہے، وہ ساتھ لے آئیں۔ مہارانی اپنے بھائی کی اس رائے سے متفق ہوگئیں۔ نابھ سے مہاراجہ نے اپنی بہن کو

لانے کے لئے دوسردار بھیجے ایک سردار (جس کا نام غالباً کشن سنگھ تھا) تو تمام زیورات، جواہرات اور روپیہ بکسوں میں بند کر کے نابھ روانہ ہو گیا، اور مہارانی دوسرے روز جانے کے لئے تیار ہوئیں، تو ان کے دیور یعنی نئے مہاراجہ دھولپور نے پولیٹکل ایجنٹ کو تار دیا، کہ ان کی بھاوج زیورات، جواہرات اور روپیہ نابھ لے جا رہی ہیں۔ اس تار کے پہنچنے پر اگلے روز جب نابھ جانے کے لئے مہارانی دھولپور ریلوے اسٹیشن پہنچیں، تو پولیٹکل ایجنٹ وہاں پہنچ گیا۔ تمام سامان کی تلاشی لی گئی، مگر ان بکسوں میں سوائے کپڑوں اور دوسرے سامان کے کچھ نہ تھا۔ کیونکہ زیورات، جواہرات اور روپیہ تک ایک روز پہلے ہی روانہ ہو چکا تھا، اور وہ اس وقت تک نابھ کے محلات میں بھی پہنچ گیا تھا۔ پولیٹکل ایجنٹ نے مہارانی کو اپنے میکہ یعنی نابھ جانے کی اجازت دے دی۔ یہ مہارانی جب نابھ پہنچیں، تو کچھ روز تو ان کی بہت آؤ بھگت ہوئی، اور بھائی نے بہن کو آنکھوں پر بٹھایا، مگر بعد میں گھروں کے جھگڑے اور کشیدگیاں عداوت کی صورت اختیار کر گئیں۔ مہارانی نے اپنے زیورات اور جواہرات طلب کئے، تو ٹال بازی شروع ہوئی۔ مہارانی تنگ آ کر مستقل طور پر نابھ سے ڈیرہ دون چلی آئیں۔ ڈیرہ دون میں آپ نے تنگدستی کی زندگی بسر کرنا شروع کی، کیونکہ نہ دیور سے تعلقات خوشگوار تھے، نہ بھائی سے

آپ نے اپنے بھائی کے خلاف پولیٹکل ڈیپارٹمنٹ سے شکایت کی، تو پولیٹکل ڈیپارٹمنٹ نے گھریلو معاملات میں مداخلت کرنے سے انکار کر دیا۔ مہارانی نے پھر پنڈت مالویہ سے فریاد کی، کیونکہ ان کے بھائی اور دیور دونوں پنڈت جی کے دوست اور معترف تھے۔ مگر دونوں میں سے کسی نے بھی پنڈت مالویہ کی درخواستوں پر توجہ نہ دی۔ چنانچہ اس سلسلہ کا مجھے ایک دلچسپ واقعہ یاد ہے:

میں نابھ میں تھا۔ مہاراجہ پر پولیٹکل ڈیپارٹمنٹ کا عتاب نازل تھا۔ حالات نازک صورت اختیار کرتے چلے جا رہے تھے، مہاراجہ نے اپنے آدمی الہ آباد بھیج کر

پنڈت مالویہ کو بلا بھیجا۔ پنڈت مالویہ پہلے تو ٹالتے رہے، مگر آخر مجبور کرنے پر نابھ آئے۔ دو تین روز تک مہاراجہ ان سے اپنی سیاسی پریشانیاں بیان کرتے رہے۔ اور جب پنڈت جی نابھ سے الہ آباد کے لئے روانہ ہونے والے تھے، تو مہاراجہ نے اپنے پرائیویٹ سیکرٹری سردار گورویال سنگھ ولٹ، (پنجاب کے جج ہائیکورٹ جسٹس ولٹ کے والد) کو دس ہزار روپیہ بطور رخصتانہ دے کر پنڈت جی کے پاس گیسٹ ہاؤس بھیجا۔ پنڈت جی نے روپیہ لینے سے انکار کرتے ہوئے، سردار گوردیال سنگھ سے جو الفاظ کہے، وہ مجھے اب تک یاد ہیں۔ آپ نے ہندی زبان میں فرمایا:

''سردار صاحب! آپ کے مہاراجہ کے گھر کا تو مجھے پانی بھی گرہن کرنا (پینا) نہ چاہئے، کیونکہ مہاراجہ نے اپنی بہن مہارانی دھولپور پر ظلم کیا ہے۔''

سردار گوردیال سنگھ کے بار بار ہاتھ باندھ کر مجبور کرنے پر پنڈت جی نے یہ روپیہ لے لیا اور آپ واپس چلے گئے۔

مہاراجہ کے گدی سے علیحدہ ہونے اور میرے نابھ سے چلے آنے کے بعد میں نے اخبار ریاست جاری کیا، تو ایک روز مہارانی صاحبہ دھولپور نے دہلی پہنچنے کے بعد مجھے طلب فرمایا۔ آپ نے ''ریاست'' کی والئے ریاست کے مظالم کو بے نقاب کرنے کی پالیسی کی بے حد تعریف کی۔ اس کے بعد یہ تعلقات بہت ہی گہرے ہو گئے، جیسے حقیقی بھائی اور بہن کے ہوتے ہیں۔ مہارانی صاحبہ جب کبھی دہلی آتیں، تو ریلوے اسٹیشن پر اترتے ہی ان کی پرائیویٹ سیکرٹری مس صادق ریلوے انکوائری آفس سے مجھے ٹیلی فون پر آنے کی اطلاع دیتیں۔ جتنے روز آپ دہلی میں رہتیں، میں ہر روز ان کی خدمت میں حاضر ہوتا۔ مجھے مخاطب کرتے ہوئے وہ مجھے ''بھائی صاحب'' کہتیں، مگر میں عزت و احترام سے ان کو ''مہارانی صاحبہ'' کہہ کر ہی مخاطب کرتا۔

کئی برس ہوئے ان مہارانی صاحبہ کا انتقال ہو چکا ہے۔ اور چونکہ میں اعمالوں کی

سزا ملنے کا قائل ہوں (یہ سزا چاہے اس دنیا میں ملے، یا آئندہ دنیا میں) میرا یقین اور ایمان ہے کہ ان مہارانی دھولپور کی بے زبانی ہی زبان ثابت ہوکر مہاراجہ کی تباہی کے اسباب میں سے ایک سب سے بڑا سبب تھا۔ اگر ان مہارانی پر ظلم نہ ہوتا، تو ان مہارانی کی دعائیں اپنے بھائی کے مصائب کو کم کرنے کا باعث ہوتیں کیونکہ کسی بھی عورت کی دعائیں یا بددعائیں اثرات سے خالی نہیں ہوا کرتیں۔

ایک عرصہ سے میرا ارادہ دو کتابیں لکھنے کا ہے، اور ان کتابوں کے متعلق مواد جمع اور یادداشتیں نوٹ کر رہا ہوں۔ ایک کتاب تو عورتوں کی سائیکالوجی کے متعلق ہوگی، جس میں بتایا جائے گا کہ عورت کیا ہے؟ یہ کیا چاہتی ہے؟ یہ کس سلوک کی مستحق ہے؟ مرد کے مقابلہ پر کتنی بلند ہے؟ اور دوسری کتاب، میری اپنی غلطیوں اور اپنے مظالم کے متعلق ہوگی۔

عورتوں کے سائیکالوجی کے متعلق لکھنے کا مقصد تو یہ ہے، کہ وہ لوگ اپنی آنکھیں کھول سکیں، جو عورت کو مرد کے مقابلہ پر بہت ہی بلند نہیں سمجھتے، کیونکہ میری ایماندارانہ رائے یہ ہے کہ:

''قوت ارادی، محبت، وفا شعاری، قربانی، ساتھ دینے اور بھولنے کے اعتبار سے مرد کو وہاں سجدہ کرنا چاہئے، جہاں عورت اپنے پاؤں رکھے۔''

اور دوسری یعنی اپنے گناہوں کا اقرار کرنے والی کتاب کے لکھنے کا مقصد یہ ہے، کہ میں نے جو غلطیاں، گناہ یا مظالم کئے، اور جن کی سزائیں اس زندگی میں تکالیف کی صورت میں قدرت کی طرف سے پاتا رہا۔ گناہوں کے اس اقرار کے باعث میں آئندہ جنم میں کوئی سزا نہ پاسکوں، اور معاف کر دیا جاؤں۔ کیونکہ حضرت مسیح کے قول اور عیسائیوں کے اصول کے مطابق گناہوں کے اقرار کا مرتبہ بہت بلند ہے، اور مہاتما گاندھی نے بھی اس راہ کو اختیار کیا ہے۔ چنانچہ اگر خدا نے مجھے دوسری یعنی گناہوں کے اقرار والی کتاب کے لکھنے کی توفیق دی، تو میں اس میں اپنے گناہوں کا اقرار

کرتے ہوئے بتاؤں گا کہ گھریلو زندگی میں ہمارے اپنے گھر میں عورتوں پر کیا مظالم ہوئے؟ ان مظالم کے کیا نتائج قدرت نے ظاہر کیے، اور عورتوں کی بے زبانی ہی کیونکر زبان ثابت ہوئی۔ اور ان مظالم کا گو میں باعث نہ تھا، مگر میں ان مظالم کی ذمہ داریوں سے بری قرار نہیں دیا جاسکتا۔

اوپر کے واقعات تو عورتوں کی دعاؤں اور بد دعاؤں کے متعلق ہیں۔ بچوں کی دعاؤں کے سلسلہ میں تفصیل میں نہ جاتے ہوئے میں اپنا ذاتی تجربہ بیان کرتا ہوں، کہ:

''مجھے جب کبھی کوئی ذہنی کوفت محسوس ہوئی، تو میں نے دس، پندرہ یا بیس روپیہ کے پھل یا مٹھائیاں لے کر سکول میں یا محلہ میں بچوں میں تقسیم کر دیئے، تو ایک یا دو گھنٹہ کے اندر ہی اس کے اثرات ذہنی کوفت کے ختم ہونے کی صورت میں ظاہر ہوئے۔ اور جو شخص بھی چاہے، اور جب کبھی اس کو ذہنی کوفت اور پریشانی ہو، تو وہ اس نسخہ کو استعمال کر کے تجربہ حاصل کر سکتا ہے۔ کیونکہ معصوم بچوں اور بیگناہ عورتوں کی نہ تو دعائیں خالی جاتی ہیں، نہ بد دعائیں بغیر اثرات کے رہ سکتی ہیں۔ اور جو لوگ آرام و راحت سے محروم نہ ہونا چاہیں، ان کو معصوم بچوں اور بیگناہ عورتوں کی بد دعاؤں کو کسی قیمت پر بھی حاصل نہ کرنا چاہئے۔''

☆☆☆☆☆☆

بلیک مارکیٹ کے روشن پہلو

1942ء میں جب مہاتما گاندھی اور کانگریسی لیڈر گرفتار ہوئے تو اس سے پہلے نہ تو ہندوستان میں زیادہ گرانی تھی، اور نہ بلیک مارکیٹ۔ کانگریسی لیڈروں کے گرفتار ہوتے ہی بازار میں ہر شے کی قیمتیں چڑھ گئیں، اور بلیک مارکیٹ کا زور ہو گیا۔ میں بھی کانگریسی اصحاب کے ساتھ گرفتار ہوا تھا۔ حالانکہ میں نہ کبھی کانگریسی تھا، اور نہ اب کانگریسی ہوں۔ صرف ایک بار مرحوم مولانا عارف ہسوی مجھ سے چار آنہ کانگرس کی ممبری کے چندہ کے نام پر لے گئے تھے۔ میں اگست 1942ء میں گرفتار ہوا، اور 1943 کے آخر میں نظر بندی سے رہا کیا گیا۔ اس رہائی کے بعد میں نے دیکھا، کہ دہلی کا نقشہ ہی بدلا ہوا ہے۔ ہر شے بلیک مارکیٹ میں فروخت ہو رہی ہے، اور کوئی مکان بھی بغیر ''پگڑی'' (یعنی مکان کرایہ پر لو، تو کرایہ کے علاوہ چند سو یا چند ہزار روپیہ بغیر لکھت پڑھت کے بطور رشوت دو) نہیں مل سکتا۔ اس زمانہ کے حالات کو دیکھتے ہوئے ملا واحدی صاحب ایڈیٹر ''نظام المشائخ'' نے ایک واقعہ لکھا:

آپ کشمیری دروازہ جا رہے تھے، تو ایک لالہ جی نے ایک تانگے والے سے پوچھا، کہ:

''چاندنی چوک چھوڑنے کا کرایہ کیا لوگے؟''

تانگے والے نے جواب دیا:

''ایک روپیہ''

تو لالہ جی نے کہا، کہ:

''میونسپل کمیٹی کے مقرر کیے ہوئے ریٹ کے مطابق تو کرایہ بارہ آنہ گھنٹہ ہے، تم چاندنی چوک چھوڑنے کا ایک روپیہ طلب کیسے کرتے ہو؟''

اس کے جواب میں تانگے والے نے جواب دیا:

''لالہ جی! گھوڑے کا چارہ اور دانہ بھی تو بلیک مارکیٹ میں خریدتا ہوں، اگر میں

نے تانگہ کا کرایہ بلیک میں طلب کرلیا،تو کیا غضب ہوگیا۔‘‘

واحدی صاحب نے اس منتظر کو دیکھ کر اپنے رسالہ میں ایک مضمون لکھا تھا، جس میں یہ شکایت کی گئی تھی، کہ:

’’بڑے لوگ لاکھوں روپیہ بلیک مارکیٹ کے ذریعہ پیدا کررہے ہیں، اگر غریب بھی بلیک مارکیٹ میں چند پیسے زیادہ لیں،تو یہ جرم قابل معافی قرار دینا چاہئے۔‘‘

میری نظر بندی کے زمانہ میں سٹاف کے بعض لوگ دفتر کا ہزار ہا روپیہ تغلب کر کے دہلی چھوڑ گئے تھے، اور یہ خیال کرتے ہوئے کہ جب تک جنگ جاری ہے، میں رہا نہ ہوں گا، اور نہ معلوم کتنے برس نظر بند رہوں، شیخ احسان الحق مرحوم نے میرا رہائشی مکان دار کو واپس کردیا۔اور دو گیراج لے کر تمام سامان اس میں بھر دیا گیا،تا کہ کرایہ کا بوجھ مجھ پر نہ پڑے چنانچہ رہائی کے بعد میرے سامنے سب سے اہم سوال نیا مکان کرایہ پر لینے کا تھا، جہاں کہ میں رہ سکوں، اور اخبار کو پھر جاری کیا جائے۔ چند دوستوں نے مکان تلاش کرنا شروع کیا،تو معلوم ہوا کہ چند ہزار روپیہ ’’پگڑی‘‘ ادا کئے بغیر مکان کا ملنا ممکن نہیں۔مگر میرے پاس ’’پگڑی‘‘ تو کیا کرایہ پیشگی دینے کے لئے بھی روپیہ موجود نہ تھا۔آخر محلّہ گھڑیا میں ایک خالی مکان کا پتہ لگا۔ میں نے یہ مکان جا کر دیکھا،تو معلوم ہوا کہ یہ بہت بڑا مکان ہے۔مکان کے اوپر کے اور پچھلے حصوں میں کئی لوگ آباد ہیں، اور سامنے کے تین چار بڑے کمرے خالی ہیں۔ میں نے ان کمروں کے خالی رہنے کی وجہ پوچھی،تو ایک پڑوسی نے مجھے بتایا، کہ:

’’یہاں ایک غلط افواہ گرم ہے کہ ان کمروں میں بھوت رہتے ہیں، اس لئے کوئی شخص ان کمروں کو کرایہ پر لینے کی جرأت نہیں کرتا۔‘‘

میں نے جب یہ سنا،تو میرے ذہن نے بھی بھوتوں کے خوف کا کچھ اثر محسوس کیا، کیونکہ میں بھوتوں کے وجود کا قائل ہوں۔مگر کرتا بھی کیا، جب کہ دوسرا کوئی مکان چند ہزار روپیہ پگڑی کے بغیر نہ مل سکتا تھا، اور میری جیب میں ایک سو روپیہ بھی نہ تھا۔

میں نے مالک مکان کے نمائندہ مسٹر سبزواری سے مذاقاً یہ کہہ کر مکان کرایہ پر لے لیا کہ:

''میں بھی تو آخر والیان ریاست کے لئے بھوت ہوں۔ اور اگر ان کمروں میں بھوت رہتے بھی ہیں، تو بھوت x بھوت = صفر کے مطابق، میرے یہاں آنے پر بھوت ان کمروں کو چھوڑ جائیں گے۔''

چنانچہ میں نے کمرے پچاس روپیہ ماہوار کرایہ پر لے لئے، اور شرط یہ طے ہوئی کہ مالک مکان مسٹر ادریس جو یو پی میں انجینئر ہیں، اور جو عنقریب ریٹائر ہونے والے ہیں ریٹائر ہو کر جب واپس دہلی آئیں گے، تو یہ کمرے ان کے لئے خالی کرنے ہوں گے۔ یہ شرائط زبانی طے پائیں، اور کرایہ نامہ بھی نہ لکھا گیا، کیونکہ مسٹر ادریس کے نمائندہ کے دل میں میرے لئے عزت کے جذبات تھے، اور وہ میری زبان پر اعتبار کرتے تھے۔ ان کمروں کے کرایہ پر لینے کے بعد میں اپنا سامان لے آیا۔ تمام سامان کو درست کیا، ایک کمرہ میں رہائش اختیار کی۔ ایک کمرہ میں اپنا ذاتی دفتر رکھا، اور بڑا کمرہ سٹاف کے لوگوں کے لئے وقف کر دیا۔

مالک مکان مسٹر ادریس انجینئر کی ملازمت میں اگر ایک سال کا اضافہ نہ ہوتا تو آپ میرے مکان لینے کے چھ ماہ بعد ریٹائر ہو جاتے۔ مگر آپ کی ملازمت میں ایک سال کا اضافہ ہو گیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا، کہ مجھے ان کمروں میں ڈیڑھ برس رہنے کا موقع مل گیا۔ ڈیڑھ برس کے بعد ادریس صاحب ملازمت سے علیحدہ کر دیئے گئے، اور آپ واپس دہلی پہنچ گئے۔ انجینئروں اور سرٹوں وغیرہ کے پاس عام طور پر بہت کافی فرنیچر ہوتا ہے، کیونکہ ان کی تحویل میں لکڑی کے گودام ہوتے ہیں، اور جتنا فرنیچر یہ چاہیں، بغیر ایک روپیہ صرف کئے بنواتے چلے جاتے ہیں۔ ادریس صاحب جب آئے، تو فرنیچر اور سامان کا مال گاڑی کا بھرا ہوا ڈبہ بھی ساتھ لائے، دہلی پہنچنے کے بعد میرے پاس تشریف لائے، اور آپ نے فرمایا، کہ:

''آپ کا قیام تو فی الحال ان کے کسی رشتہ دار کے ہاں ہے، کیونکہ بیوی بچے ساتھ تھے۔ سامان مال گودام میں پہنچ چکا ہے، اور اس سامان کے رکھنے کا سوال ہے۔''

انہوں نے جب یہ کہا، تو میں نے ان کے سامان کے لئے فوراً ہی ایک کمرہ خالی کر دیا، تا کہ ان کے سامان پر ڈیمرج نہ پڑے۔ یہ ٹھیلوں پر سامان لے آئے، اور انہوں نے اس بڑے کمرے میں اپنا سامان بھر دیا۔ سامان رکھنے کے بعد باتیں ہوئیں، تو انہوں نے فرمایا کہ میں نے مکان لیتے وقت یہ وعدہ کیا تھا، کہ جب یہ ریٹائر ہونے کے بعد دہلی آئیں گے، تو کمرے خالی کر دیں گے۔ میں نے جواب دیا کہ:

''آپ اطمینان رکھئے، میں یہ کمرے چند روز میں خالی کر دوں گا، چاہے مجھے جمنا کے کنارے چھپروں میں بھی کیوں نہ رہنا پڑے۔''

میں نے ان کمروں کو چند روز میں ہی خالی کر دینے کا وعدہ کیا، اور کوئی دوسرا مکان تلاش کرنے پر آدمی مقرر کر دیئے۔ دہلی میں مکانات کی بہت دقت تھی۔ کئی روز تلاش کرنے پر بھی کوئی مکان نہ ملا، تو مسٹر انور مالک رسالہ ''بانو'' نے مجھ سے کہا، کہ:

''جب تک کوئی مکان نہیں ملتا، یہ اپنے مکان کے چند کمرے میرے لئے خالی کر دیتے ہیں۔''

چنانچہ میں اپنا سامان انور صاحب کے مکان میں منتقل کرنے کا انتظام کر رہا تھا، تو معلوم ہوا کہ ادریس صاحب چیف کمشنر سے ملے ہیں اور آپ نے چیف کمشنر سے کہا ہے کہ:

''دیوان سنگھ تو کمرے خالی کر رہا ہے، مگر دوسرے لوگ کمرے خالی نہیں کرتے۔ اور چونکہ آپ ریٹائر ہو کر دہلی آ گئے ہیں، اور ان کو اپنی رہائش کے لئے سرکاری طور پر باقی کمرے بھی حکماً خالی کرائے جائیں۔''

ادریس صاحب کی اس درخواست کو سن کر چیف کمشنر نے جواب دیا کہ:

''چونکہ قانوناً کسی کرایہ دار کو مکان سے نکالا نہیں جا سکتا، اس لئے گورنمنٹ بے

بس ہے، اور چیف کمشنر اس سلسلہ میں کچھ نہ کرنے کے لئے مجبور ہیں۔''

چیف کمشنر کے اس جواب کی اطلاع سن کر اس بلڈنگ میں رہنے والے ایک صاحب میرے پاس آئے، اور آپ نے میرے کان میں کہا، کہ:

''ادریس صاحب کو چیف کمشنر نے جواب دے دیا ہے، اور ادریس صاحب قانوناً مکان خالی نہیں کرا سکتے، میں ان کمروں کو بھی خالی نہ کروں''

یہ سن کر میں نے جواب دیا، کہ:

''میں تو کمرے خالی کروں گا، چاہے مجھے کسی جنگل میں جھونپڑی بنا کر رہنا پڑے کیونکہ میں قانون کے مقابلہ میں اخلاق، اور اپنی زبان کا زیادہ پابند ہوں۔''

چنانچہ میں نے یہ کمرے خالی کر دیئے۔ ادریس صاحب نے پچیس روپیہ کا چیک مجھے دے دیا، جو کہ یہ ان کے ذمہ باقی تھا، کیونکہ میں ہر ماہ کرایہ پیشگی دیا کرتا، اور میں اپنا سامان انور صاحب کے مکان میں لے آیا۔ ادریس صاحب کے گھر کے لوگ بہت کافی تعداد میں تھے، اور میرے چھوڑنے والے کمرے ان کے لئے کافی نہ تھے۔ چنانچہ وہاں سے چلے آنے کے بعد ایک روز ادریس صاحب ملے تو انہوں نے بتایا کہ:

''ایک شخص نے پانچ سو روپیہ لے کر کمرہ خالی کیا، حالانکہ اس کمرہ کا کرایہ صرف پندرہ روپیہ ماہوار تھا۔''

یعنی اس کمرہ میں رہنے والے نے الٹا مالک مکان سے دو برس اور دس ماہ کا کرایہ وصول کر کے کمرہ خالی کیا (بلیک مارکیٹ کی تجارت بھی کیسی دلچسپ ہے، کہ نہ صرف مکان کا کرایہ مکان دار کو ادا نہ کرو، بلکہ اس سے الٹا روپیہ وصول کر کے مکان خالی کیا جائے) یہی حالت بعض دوسرے کرایہ داروں کی تھی، اور بعض نے تو قانون کی آڑ میں اب تک اپنے کمرے خالی نہیں کئے۔ حالانکہ مالک مکان کو ان کمروں کی سخت ضرورت تھی۔

پھاٹک مفتی والاں میں جہاں کہ اخبار ریاست کا دفتر تھا، اس بلڈنگ میں ایک

کمرہ باہر ڈیوڑھی کے پاس ہے، جس میں گرمیوں کے زمانہ میں میرا دفتر ہوا کرتا۔ کیونکہ اوپر کی منزل میں گرمی نا قابل برداشت ہوتی، میں گرمیوں میں تو دن بھر اس کمرہ میں رہتا مگر سردیوں کے موسم میں اس کے اندر دوسرا سامان رکھ دیا جاتا۔ اور اگر کسی شخص کو چند روز کے لئے ضرورت ہوتی، یا زیادہ دن رہنے والا کوئی مہمان آتا، تو اس کمرہ میں ہی اس کا انتظام کر دیا جاتا۔ چنانچہ چند برس ہوئے، برسات زیادہ ہوئی، تو پڑوس کے ایک مسلمان کے مکان کی چھت گر گئی۔ اس بیچارے کے پاس رہنے کے لئے کوئی جگہ نہ تھی، تو یہ اپنے بیوی بچوں کو لے کر اس کمرہ میں ہی آ گیا، اور اس میں دو ماہ کے قریب رہا، جب تک کہ برسات ختم ہونے کے بعد اس مکان کی مرمت نہ ہو گئی۔

سردیوں کے دنوں میں اس کمرہ میں صرف سامان رکھا تھا، کہ میرے پڑوس کے ایک صاحب جو موسیقار ہیں، تشریف لائے، اور آپ نے فرمایا، کہ ان کے ایک دوست تبدیل ہو کر شملہ سے آئے ہیں، اور ان کو رہائش کی دقت ہے، باہر کا یہ کمرہ ان کو چند روز کے لئے دے دیا جائے۔

میں نے پوچھا، کہ:

''وہ اکیلے ہیں یا بیوی بچوں کے ساتھ ہیں؟''

اس موسیقار نے بتایا، کہ:

''وہ فی الحال اکیلے ہی ہیں، مکان ملنے پر وہ اپنے بیوی بچوں کو شملہ سے لے آئیں گے۔''

یہ سن کر میں نے کہا، کہ:

''ان کے رہنے کے لئے میں ایک دوسرے کمرہ میں انتظام کر دیتا ہوں، جہاں کہ ایک اور دوست مقیم ہیں۔ آپ ان سے کہئے کہ وہ اپنا سامان یعنی ٹرنک بستر ہ لے آئیں۔''

میرا یہ جواب سن کران موسیقار نے کہا کہ:

''باہر کا کمرہ دے دیجئے اور وہ اس کا کرایہ دیں گے۔''

میں نے جواب دیا، کہ:

''کرایہ کا کوئی سوال ہی نہیں، اور نہ میں نے آج تک کوئی کمرہ کسی کو کرایہ پر دیا، کیونکہ اس کو قانوناً اور اخلاقاً دونوں صورتوں میں جرم سمجھتا ہوں، اور باہر والے اس کمرہ میں کاغذ کے سینکڑوں رم پڑے ہیں۔ میں دوسرے کمرہ میں آپ کے دوست کی رہائش کے لئے انتظام کر دیتا ہوں، اور جب وہ کسی دوسرے مکان کا انتظام کر لی، تو وہاں چلے جائیں۔''

میرے اس کہنے پر بھی وہ بار بار باہر کا کمرہ چاہتے تھے، اور کرایہ پر دینے کے لئے زور دے رہے تھے حیران کہ ان کے دوست کو بغیر کرایہ چند روز رہائش کے لئے جگہ دے رہا ہوں، مگر یہ اس سے انکار کر رہے ہیں، اور کرایہ پر باہر کا کمرہ لینا چاہتے ہیں میں نے جب اس موسیقار کے ایک پڑوسی سے کرید کر پوچھا تو پتہ چلا کہ اس موسیقار کی سکیم یہ تھی کہ:

''وہ اس کمرہ پر قبضہ کر کے کسٹوڈین کے دفتر سے اس کمرہ کو اپنے نام الاٹ کرا لے، اور وہاں یہ موسیقی کا سکول جاری کرے۔''

میں نے اس شخص کی نیت کے متعلق جب یہ سنا، تو حیران رہ گیا، کیونکہ پبلک میں کریکٹر کی اس کمزوری کے پیدا ہونے کی وجہ صرف بلیک مارکیٹ تھی۔

میرے محلّہ میں ایک صاحب تبادلہ آبادی سے پہلے کے آباد تھے، جن کا اصلی وطن ملتان تھا۔ تبادلہ آبادی کے سلسلہ میں جب پاکستان کے علاقہ کے ہندو ہندوستان آئے، تو ان کو جہاں سر چھپانے کو جگہ ملی، وہاں چلے گئے۔ دہلی میں پنجاب کے رہنے والوں نے بھی نئے آنے والے شرنارتھیوں کی بہت امداد کی۔ ملتان کے یہ صاحب اس محلّہ میں پچیس برس سے رہتے تھے۔ ان کے ایک دوست جب تبادلہ آبادی کے

سلسلہ میں دہلی آئے، تو انہوں نے اپنے اس دوست کے لئے اوپر کی منزل میں ایک کمرہ عارضی طور پر خالی کر دیا، تاکہ جب تک یہ اپنا کوئی دوسرا انتظام نہ کرلیں، وہاں رہ سکیں، اور یہ پریشانی کا شکار نہ ہوں۔ بغیر کسی کرایہ کے ان کے دوست کو اس کمرہ میں رہتے ہوئے ایک عرصہ ہو گیا، تو ایک روز کسٹوڈین کے دفتر سے مالک مکان کے نام حکم پہنچا، کہ اوپر کا وہ کمرہ جس میں ان کا دوست رہتا ہے، رہائش رکھنے والے کے نام الاٹ کر دیا گیا ہے۔ مالک مکان اس حکم کو دیکھ کر حیران کہ وہ کمرہ صرف ان کی تکلیف کا خیال کرتے ہوئے بغیر کرایہ دیا گیا، اور اب سرکاری طور پر ان کا قبضہ قرار دیا جا رہا ہے۔ مالک مکان نے کسٹوڈین کے دفتر میں جا کر پتہ کیا، تو معلوم ہوا کہ ان کے دوست نے یہ دیکھ کر کمرہ کو الاٹ کرنے کی درخواست دی، کہ یہ دس روپیہ ماہوار کرایہ دیتا ہے۔ مالک مکان کو اس کمرہ کی ضرورت نہیں، اس لئے یہ کمرہ اس کے نام الاٹ کر دیا جائے۔ یعنی بلیک مارکیٹ اور مکانات کی دقت نے دوستوں کے لئے دوستوں کو بھی سانپ اور غدار بنا دیا، اور احسان شناسی کی جگہ احسان فراموشی نے حاصل کر لی۔

بلیک مارکیٹ اور سمگلنگ لے سلسلہ میں کراچی کا ایک دلچسپ واقعہ بھی سن لیں میں پچھلے سال پاکستان گیا، تو چار روز کراچی میں رہا۔ دہلی میں پاکستان کی سمگلنگ کے بہت قصے سنا کرتا تھا، کہ اتنے من سونا پکڑا گیا، اتنے لاکھ کی گھڑیوں پر پولیس نے قبضہ کیا، اور جو گھڑی دہلی میں چار سو روپیہ میں ملتی ہے وہ پاکستان میں سمگلروں کے ذریعہ ڈیڑھ سو روپیہ میں مل سکتی ہے۔ کیونکہ سمگلر سمندر کے راستہ بغیر کسٹم ڈیوٹی ادا کئے کروڑوں روپیہ کا مال کویت وغیرہ عرب ممالک سے پاکستان لاتے ہیں، کراچی پہنچنے کے بعد میں نے دوسرے روز ایک دوست سے کہا، کہ وہ کسی سمگلر کو میرے پاس لائیں میں اس سے سمگلنگ کے متعلق بات چیت کر کے معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ چنانچہ وہ دوست ایک سمگلر کو یہ کہہ کر میرے پاس لائے کہ ایک بیوپاری چند ہزار روپیہ

کی گھڑیاں خریدنا چاہتا ہے۔ یہ سمگلر معہ ایک درجن کے قریب مختلف قسم کی قیمتی گھڑیوں کے تشریف لائے۔ ان سے بات چیت ہوئی، اور گھڑیوں کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ فوجی حکومت کے باعث ان کے مال کی قیمتیں بہت چڑھ گئی ہیں اور ان ''بیچاروں'' کا کاروبار بھی ٹھپ ہے۔ چنانچہ ایک گھڑی کے متعلق میں نے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ اس گھڑی کی قیمت فوجی حکومت سے پہلے ڈیڑھ سو روپیہ تھی اب اس کی قیمت تین سو روپیہ ہے اور یہ گھڑی ہندوستان کے بازاروں میں ساڑھے تین سو روپیہ میں ملتی ہے۔ میں نے اس سے اور دوسری گھڑیوں کے موجودہ مارکیٹ ریٹ معلوم کئے، تو میں نے اس سمگلر سے (چونکہ میں نے کوئی گھڑی خریدنی نہ تھی، اور سمگلنگ کے متعلق صرف معلومات حاصل کرنی تھیں) کہا، کہ:

''میں تو اس خیال میں تھا، کہ جو گھڑی مارشل لاء سے پہلے ڈیڑھ سو روپیہ میں ملتی تھی، وہ اب بھی ڈیڑھ سو روپیہ میں ملے گی۔''

تو میرے اس کہنے پر اس سمگلر نے بہت ہی دلچسپ جواب دیا اس نے کہا کہ:

''جناب وہ زمانہ چلا گیا، جب یہ گھڑی ڈیڑھ سو روپیہ میں مل سکتی تھی۔ اب تو مارشل لاء کا زمانہ ہے۔ لاکھوں روپیہ کا مال ضبط ہو جاتا ہے، اور اس کے علاوہ اگر گرفتاری ہو، تو مارشل لاء کی عدالتیں سات سال سے کم عرصہ کے لئے جیل خانہ میں نہیں بھیجتیں۔ آپ خود ہی خیال کیجئے کہ اتنے بڑے خطرہ کی صورت میں اب ہم یہ گھڑی ڈیڑھ سو روپیہ میں کیسے دے سکتے ہیں۔''

اس سمگلر کا یہ بیان سن کر میں نے مسکراتے ہوئے مذاقاً اس سے کہا:

''گویا کہ مارشل لاء کے خطرہ کے باعث آپ نے ڈیڑھ سو روپیہ کی گھڑی پر ڈیڑھ سو روپیہ انشورنس فیس زیادہ کر لی ہے، اور اس انشورنس فیس کو شامل کر کے آپ یہ گھڑی اب تین سو روپیہ میں فروخت کرتے ہیں۔''

میرے اس جواب پر یہ سمگلر بھی ہنس پڑا اور چلا گیا۔ کیونکہ اس نے سمجھ لیا، کہ

ہندوستان کا یہ سکھ تاجر مال کی زیادہ قیمت ادا نہیں کر سکتا، اور یہ مارشل لاء کے زمانہ سے پہلے کے خواب دیکھ رہا ہے۔

ان چند واقعات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے، کہ بلیک مارکیٹ اور سمگلنگ نے ہندوستان اور پاکستان کی پبلک کے کریکٹر پر کیا اثر کیا۔ اور یہ خلاف توقع نہ ہو گا، اگر کریکٹر کی یہ گراوٹ دونوں ممالک میں ایک دوامی حیثیت حاصل کر لے، کیونکہ اب تک نہ تو ہندوستان میں کانگرس گورنمنٹ لوگوں کے کریکٹر کو بلند لے جا سکی، اور نہ پاکستان کے مارشل لاء کا ہنٹر ہی وہاں کی پبلک کو مستقل طور پر بلند لے جا سکا۔ اور اس ہنٹر کا کچھ مفید اثر ہوا تو صرف اس زمانہ تک کے لئے عارضی صورت میں، جب تک کہ سختی جاری رہی۔

☆☆☆☆☆

مذہب کا انتہائی درجہ

میرے ایمان اور عقیدہ کے مطابق دنیا کے تمام مذاہب کے بانی ہی بلند ترین شخصیتیں تھیں، اور ان کے اقوال اور اسوۂ حسنہ انسان کو بلند لے جانے کا باعث ہو سکتا ہے۔ مگر مذہبی مجاوروں اور مذاہب کے مقلدین نے اپنے مذاہب کو خوفناک اور تاریک صورت میں پیش کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہے، کہ دنیا کا زیادہ حصہ مذاہب سے متنفر ہو گیا۔ میں اس سلسلہ میں چند واقعات پیش کرتا ہوں، جو دلچسپ ہیں:

میرے وطن حافظ آباد کے رہنے والے ایک صاحب ماسٹر لابھ سنگھ تھے، جو پنجاب کے کئی اضلاع میں سکول ماسٹر رہے۔ یہ ماسٹر لابھ سنگھ بہت ہی بلند اور نیک شخصیت تھے، مگر مذہبی اعتبار سے ان کا دماغ مالیخولیا کی حد تک پہنچ چکا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا، کہ آپ متعدد بار ملازمت سے معطل ہوئے، اور آخر میں شاید یہ موقوف بھی کر دیئے گئے۔ بہت برس ہوئے آپ دہلی تشریف لائے اور راقم الحروف کے ہاں مقیم ہوئے آپ کا ارادہ دہلی میں دس پندرہ روز قیام کا تھا۔ آپ کو میرے ہاں آئے تین روز ہوئے تھے کہ شام کو آپ اپنے رہائشی کمرہ سے دفتر کے کمرہ میں تشریف لائے۔ آپ نے وہاں دیکھا، کہ میرے ساتھ ایک صاحب بیٹھے باتیں کر رہے ہیں، اور باتیں کرتے ہوئے یہ سگریٹ بھی پی رہے ہیں، تو آپ فوراً واپس اپنے کمرہ میں چلے گئے۔ میں جب کام سے فارغ ہوا، اور اپنے رہائشی کمرہ کی طرف گیا، تو دیکھا، کہ ماسٹر صاحب اپنا بستر باندھ چکے ہیں، اور جانے کی تیاریوں میں ہیں۔ میں نے پوچھا کہ آپ جا رہے ہیں؟ تو آپ نے فرمایا، کہ ہاں میں نے دریافت کیا کہ آپ تو دس پندرہ روز دہلی میں قیام کرنے والے تھے، کیا آپ کا کام ختم ہو گیا جو جا رہے ہیں؟ تو آپ نے جواب دیا نہیں، میرا کام تو ابھی ختم نہیں ہوا، مگر میں یہاں قیام نہیں کر سکتا، کیونکہ یہاں سگریٹ پینے والے لوگ بھی آتے ہیں۔ میں نے ماسٹر صاحب سے التجا کی اور سمجھانا چاہا کہ اگر کوئی دوسرا شخص سگریٹ پیتا ہے تو ہمیں کیا، یہ اس کا اپنا فعل

ہے مگر ماسٹر صاحب نہ مانے اور اپنا سامان لے کر گوردوارہ سیس گنج میں چلے گئے، جہاں کہ آپ نے آٹھ دس روز قیام کیا۔ اس کے بعد آپ کئی بار دہلی آئے، مگر آپ نے دفتر ''ریاست'' میں قیام کرنا مناسب نہ سمجھا، کیونکہ یہ دفتر سگریٹ زدہ اور ان کے مذہبی خیال کے مطابق پلید تھا۔ حالانکہ میں نے کئی بار کوشش کی، کہ یہ جب کبھی دہلی آیا کریں، تو میرے ہاں ہی قیام کریں، تا کہ مجھے ان کی خدمت کی سعادت نصیب ہو۔

میرے رشتہ میں ایک چچا سردار روپ سنگھ کپور تھے۔ ان کی شروع کی زندگی تو بطور ایک سب انسپکٹر کے گزری، مگر ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد یہ اپنا زیادہ وقت گوردوارہ جانے، وہاں پاٹھ کرنے، اور گھر واپس آ کر مذہبی کتابیں پڑھنے میں صرف کرتے۔ آپ بہت ہی نیک اور مخلص شخصیت تھے۔ راقم الحروف سے بے حد محبت کرتے، اور میں جب کبھی حافظ آباد جاتا، اور ان کو میرے وہاں آنے کا علم ہوتا، تو ملنے کے لئے تشریف لاتے، اور میں بھی ان کے ہاں حاضری دینا اپنا ایک فرض اور سعادت مندی سمجھتا۔ ایک بار میں حافظ آباد گیا، اور یہ ملنے کے لئے تشریف لائے تو باتوں باتوں میں آپ نے خواہش ظاہر کی کہ اخبار ریاست ان کے نام جاری کر دیا جائے۔ چنانچہ دہلی پہنچنے کے بعد میں نے ان کے نام اخبار جاری کر دیا، اور آپ اس اخبار کا بہت ہی شوق کے ساتھ مطالعہ کرتے۔ اس واقعہ کے ایک سال بعد مجھے حافظ آباد جانے کا اتفاق ہوا۔ آپ کو جب علم ہوا تو آپ ملنے تشریف لائے باتیں ہو رہی تھیں تو آپ نے دریافت کیا کہ ریاست اخبار میں جو افسانے شائع ہوتے ہیں، یہ درست واقعات ہوتے ہیں، یا صرف خیال ہی خیال ہوتا ہے؟ یعنی یہ اصل واقعات نہیں ہوتے۔ میں نے عرض کیا کہ ہر افسانہ صرف خیال ہی ہوتا ہے، تا کہ لوگوں کے ذہن پر اثر ڈالا جائے، اور یہ اصل واقعات نہیں ہوتے۔ تو آپ نے فرمایا کہ اگر یہ افسانے اصل واقعات نہیں ہوتے، اور صرف خیال ہوتا ہے، تو آئندہ مجھے اخبار ریاست نہ بھیجا جائے، کیونکہ میں کوئی جھوٹی بات پڑھ یا سن نہیں سکتا۔ میں نے عرض

کیا کہ ان افسانوں کا مقصد تو صرف اصلاح ہے، یہ جھوٹ کی نیت سے نہیں لکھے جاتے۔ مگر آپ نہیں مانے، اور آپ نے فرمایا کہ آئندہ ریاست کبھی نہ بھیجا جائے اور پھر اسی ہفتہ آپ نے پوسٹ مین سے کہا کہ ریاست واپس بھیج دیا جائے اور آپ اسے چھونا بھی پاپ اور گناہ سمجھتے ہیں۔ چنانچہ اس کے بعد آپ کئی برس زندہ رہے، مگر آپ نے ریاست کو کبھی ہاتھ نہ لگایا۔ اور میں نہیں کہہ سکتا، کہ اس کے بعد آپ کا راقم الحروف کے متعلق کیا خیال تھا، جو افسانوں کے ''جھوٹ'' کو شائع کرنے کا مجرم تھا۔

نواب صاحب رام پور کے پرائیویٹ سیکرٹری مسٹر ظفر دہلی تشریف لائے، اور راقم الحروف کے ہاں مقیم ہوئے۔ آپ کو میرے ہاں قیام کئے آٹھ دس روز ہوئے تھے، کہ آپ کے بڑے بھائی بھی دو تین روز کے لئے دہلی تشریف لائے، اور وہ بھی راقم الحروف کے ہاں ہی مقیم ہوئے۔ یہ دونوں بھائی شیعہ مذہب سے تعلق رکھتے تھے، مگر ظفر صاحب تو میرے ہی ہاں کھانا کھاتے۔ ان کے بھائی جب تشریف لائے، اور میں نے ان سے بھی کھانے کی میز پر تشریف لانے کے لئے کہا تو آپ نے اپنی طبیعت اچھی نہ ہونے کا عذر کر کے ٹال دیا۔ میں نے سمجھا، کہ ان کی طبیعت اچھی نہیں، اور جب پوچھا کہ پرہیزی کھانا تیار کرا دیا جائے، تو آپ نے فرمایا کہ نہیں آپ کچھ نہ کھائیں گے۔ میں نے بھی سمجھا کہ اگر طبیعت اچھی نہیں تو ان کا نہ کھانا ہی بہتر ہے اس کے بعد شام کو آپ نے پھر کھانے سے انکار کیا اور چائے تک نہ پی آپ نے رات کو بھی کھانا نہ کھایا اور اگلی صبح آپ نے پھر انکار کیا میں حیران کہ یہ اتنا طویل فاقہ کیوں کرتے ہیں؟ اور جب میں نے بار بار کہا تو ظفر صاحب اور میرے مشترکہ دوست یوسف صاحب نے میرے کان میں کہا کہ یہ کٹر کلاس کے شیعہ ہیں اور یہ کسی ہندو یا سکھ کے ہاں تو کیا سنی مسلمانوں کے ہاں بھی کھانا کھانا مناسب نہیں سمجھتے اور یہ اپنے ایک شیعہ دوست کے ہاں کھانا کھا لیتے ہیں۔ یہ سن کر میں حیران کہ یہ مذہب کی پستی ہے یا مذہبی مالیخولیا کہ ایک مسلمان کسی دوسرے مسلمان کے ہاں کھانا کھاتے

ہوئے بھی ہچکچاہٹ محسوس کرتے۔

وہ مقدمہ ہوشنگ آباد میں چل رہا تھا، جو مرحوم نواب بھوپال نے اپنی توہین کے متعلق راقم الحروف کے خلاف وہاں جاری کیا۔ یہ مقدمہ وہاں کے سیشن جج مسٹر بھنڈ راکر کی عدالت میں تھا۔ مسٹر بھنڈ راکر بہت ہی نیک، دیانتدار اور مذہب پرست شخصیت تھے۔ آپ صبح غسل وغیرہ سے فارغ ہو کر دو گھنٹہ کے قریب ٹھاکر جی کے سامنے بیٹھ کر پوجا کرتے۔ وہاں لوگوں میں یہ افواہ تھی کہ پوجا کرتے ہوئے آپ کو مقدمات کے متعلق جو خیال آئے وہ خیال ٹھاکر جی کا حکم سمجھتے ہوئے اس کے مطابق فیصلہ کرتے ہیں ہوشنگ آباد کے ڈاک بنگلہ (جہاں مقدمہ کے دنوں میں راقم الحروف اور اس کے وکیل قیام کرتے) کے قریب ایک صاحب رہتے تھے جو مرکزی اسمبلی کے ممبر بھی تھے (میں ان کا نام بھول گیا ہوں) اور یہی راقم الحروف کے ضامن بھی تھے۔ ان کے ساتھ والی کوٹھی میں ان ممبر اسمبلی کے بھائی رہتے، جو ان سے بڑے تھے، اور رائے بہادر اور ریٹائر سیشن جج تھے۔ یہ ممبر اسمبلی اور ریٹائر سیشن جج اکثر ڈاک بنگلہ میں ہم سے ملنے آیا کرتے، اور یہ دونوں بھائی راقم الحروف سے بہت ہی محبت اور اخلاص کا سلوک کرتے۔ ایک روز راقم الحروف نے ان ریٹائرڈ سیشن جج صاحب سے کہا کہ ایک زمانہ میں جب آپ سیشن جج تھے مسٹر بھنڈ راکر آپ کے ماتحت سول جج تھے اور آپ ان سے اب بھی اکثر ملا کرتے ہیں کسی وقت باتوں باتوں میں مسٹر بھنڈ راکر کو ٹٹولئے کہ مقدمہ کے متعلق ان کا کیا خیال ہے؟ اور یہ کیا فیصلہ دیں گے؟ ریٹائرڈ سیشن جج صاحب نے جواب دیا کہ یہ مسٹر بھنڈ راکر سے پوچھیں گے اگلے روز ریٹائرڈ سیشن جج صاحب مسٹر بھنڈ راکر سے ملے اور انہوں نے باتوں باتوں میں پوچھا کہ مقدمہ کی صورت کیا ہے اور آپ کیا فیصلہ دیں گے؟ تو مسٹر بھنڈ راکر نے جواب دیا رائے بہادر صاحب! آپ جانتے ہیں کہ میں ٹھاکر جی کا پجاری ہوں اور ٹھاکر جی جو فرمائیں گے میں اس کے مطابق ہی فیصلہ دیا کرتا ہوں، میں ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا، کہ میں اس

مقدمہ میں کیا فیصلہ دوں گا۔ جو ٹھاکر جی فرمائیں گے میں تو ویسا ہی کروں گا۔

چنانچہ مسٹر بھنڈ ر اکر سے ملنے کے بعد رائے بہادر صاحب ڈاک بنگلہ میں آئے، اور انہوں نے بتایا کہ ان کے اور مسٹر بھنڈ اکر کے درمیان کیا بات چیت ہوئی۔ میں نے رائے بہادر صاحب سے جب یہ سنا کہ مسٹر بھنڈ ر اکر ٹھاکر جی کے حکم کے مطابق فیصلہ کریں گے تو میں نے مسکراتے ہوئے کہا کہ اب میری خیر نہیں، میں نے ایسی صورت میں کہ کبھی ٹھاکر جی کی پوجا نہیں کی ٹھاکر جی کے مجھ پر خوش ہونے کا کیا سوال ہے۔ ٹھاکر جی پوجا نہ کرنے کے باعث یقیناً مجھ پر ناراض ہوں گے، اور میرا سزا پانا لازمی ہے۔

چنانچہ چند روز کے بعد مسٹر بھنڈ ر اکر نے مقدمہ کا فیصلہ کیا، اور ٹھاکر جی کے حکم کے مطابق مجھے نو ماہ قید سخت کی سزا دی، جو ہائیکورٹ میں جا کر تین ماہ رہ گئی اور یہ بھی ٹھاکر جی کی مہربانی ہی سمجھئے کہ جیل میں مجھے اے کلاس میں رکھا گیا جہاں کہ مجھے گھر جیسی بلکہ گھر سے بھی زیادہ اچھی اور بہتر سہولتیں میسر تھیں۔ کیونکہ گھر میں تو ہر ماہ کوئی نہ کوئی ڈگری اور قرقی ہوا کرتی۔ جیل میں نہ کوئی ڈگری تھی، نہ قرقی اور نہ قرقی کے وارنٹ گرفتاری۔

☆☆☆☆☆☆

ہم نام ہونے کے تاریک اور روشن پہلو

تبادلہ آبادی سے پہلے لاہور میں دو پولیٹکل ورکر بہت نمایاں حیثیت کے تھے، ایک سردار سردول سنگھ وکیل اور دوسرے سردار سردول سنگھ کولیشر ان میں سے سردار سردول سنگھ وکیل کی شہرت تو صرف پنجاب تک محدود تھی، اور سردار سردول سنگھ کولیشر تمام ہندوستان میں وسیع شہرت رکھتے تھے۔ کیونکہ آپ سالہا سال تک کانگرس ورکنگ کمیٹی کے ممبر رہے، اور ایک بار کانگرس کے صدر جب گرفتار ہوئے ،تو اس صدر کی جگہ صدر نامزد ہوئے۔ یعنی یہ آل انڈیا لیڈر تھے۔

مدراس میں کانگرس کا اجلاس تھا، اور وہاں ہر صوبہ کے کانگرسیوں کے لئے علیحدہ علیحدہ کیمپ تھے۔ صوبہ مدراس کے ایک درمیانہ درجہ کے لیڈر (جن کو اس سے پہلے نہ تو کبھی سردار سردول سنگھ کولیشر سے ملنے کا اتفاق ہوا تھا، اور نہ سردار سردول سنگھ وکیل سے آپ کبھی ملے تھے) پنجاب کیمپ میں گئے تاکہ پنجابی کانگرسیوں کی خیر خیریت دریافت کریں اور اگر کسی لیڈر کو کوئی ضرورت ہو تو وہ پوری کی جائے۔ پنجاب کیمپ کے ایک پنجابی والنٹیر نے کیمپ میں مقیم کانگرسی اصحاب سے ان مدراسی لیڈر کا تعارف کرایا۔ اور جب یہ لیڈر سردار سردول سنگھ وکیل کے خیمہ میں پہنچے ،تو والنٹیر نے سردار صاحب سے تعارف کراتے ہوئے کہا:

''آپ سردار سردول سنگھ ہیں''

''مدراسی لیڈر نے سردار سردول سنگھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے نہ صرف گرم جوشی کا اظہار کیا، بلکہ تھوڑی سی بات چیت کے بعد کہا''

''سردول سنگھ جی آپ واپس پنجاب جانے سے پہلے کسی روز ہمارے ہاں کھانے پر بھی تشریف لائیے۔''

سردار سردول سنگھ وکیل نے کہا:

''بہت اچھا''

چنانچہ طے پایا، کہ سردار صاحب تیسرے روز رات کو ڈنر پر تشریف لائیں گے، اور سردار صاحب نے مدراسی لیڈر کے گھر کا پتہ نوٹ کرلیا۔

تیسرے روز سردار سردول سنگھ وکیل اس مدراسی کے ہاں ڈنر پر تشریف لے گئے۔ آپ کے جانے سے پہلے مدراسی لیڈر کے گھر کی عورتوں نے خوب تیاریاں کیں۔ سنہری ساڑھیاں، زیورات کے ساتھ کاجل، لپ سٹک اور پاؤڈر کا استعمال کیا۔ کیونکہ عورتیں ایسے مواقع پر اپنے آپ کو خوبصورت بنانے کے لئے اپنے تمام ذرائع صرف کر دیتی ہیں۔ سردار صاحب پہنچے، تو گھر کے تمام لوگوں نے انتہائی گرمجوشی کے ساتھ استقبال کیا، ڈرائنگ روم میں بیٹھنے اور بات چیت کرنے کے بعد تمام لوگ ڈائننگ روم میں گئے اور ڈائننگ ٹیبل پر چھریوں اور کانٹوں نے حرکت شروع کی۔ کھانا کھایا جا رہا تھا، تو مدراسی لیڈر نے باتیں کرتے ہوئے کہا:

''ویل مسٹر کولیشر آپ کی رائے میں گاندھی کے بعد کانگرس کی کیا پوزیشن ہوگی؟''

سردار سردول سنگھ وکیل نے جب ''مسٹر کولیشر'' کے الفاظ سنے، تو آپ نے اپنی انتہائی دیانت داری اور صاف بیانی کا ثبوت دیتے ہوئے کہا:

''میں یہ غلط فہمی رفع کر دینا چاہتا ہوں، کہ میں سردار سردول سنگھ کولیشر نہیں ہوں، وہ دوسرے صاحب ہیں۔ میں سردار سردول سنگھ وکیل ہوں۔''

مدراسی لیڈر سردار سردول سنگھ وکیل کو ہی سردار سردول سنگھ کولیشر سمجھتے ہوئے تھے اور نہ معلوم آپ اپنے ذہن میں کولیشر صاحب جیسے آل انڈیا لیڈر سے کیا توقعات لئے بیٹھے تھے کیونکہ ہر کانگرسی فطرتاً بنیا ہوا کرتا ہے، یہ بغیر اپنی غرض کے کسی سے بات بھی نہیں کرتا۔ بہر حال اس مدراسی لیڈر نے جب یہ سنا، کہ آپ آل انڈیا لیڈر سردار سردول سنگھ کولیشر سے بات چیت نہیں کر رہے، ان کے سامنے ایک دوسرے صاحب سردار سردول سنگھ وکیل ہیں۔ کھانا تو جاری رہا، مگر چھریوں اور کانٹوں کی رفتار کچھ سست سی ہوگئی۔ اور سردار سردول سنگھ وکیل کی اس وقت کیا پوزیشن تھی، اس پر اظہار نہ کرنا ہی

مناسب ہے۔

ہم نام ہونے کے سلسلہ میں ایک اور واقعہ سنئیے دہلی کے اخبارات کے حلقوں میں جنگ بہادر سنگھ نام کے دو اصحاب ہیں، ایک رانا جنگ بہادر سنگھ جو انگریزی اخبار کے اعلیٰ درجہ کے روزانہ اخبارات کو ایڈٹ کرتے رہے اور سالہا سال تک ''ٹریبیون'' لاہور کے ایڈیٹر بھی رہے، اور دوسرے سردار جنگ بہادر سنگھ جو مرحوم سردار امر سنگھ ایڈیٹر ''شیر پنجاب'' کے صاحبزادہ ہیں، اور اپنے اس ہفتہ وار اردو اخبار کو چلا رہے ہیں۔ سال میں چھ مہینے بمبئی اور کلکتہ میں اشتہارات حاصل کرتے ہے، اور بمبئی اور کلکتہ کا جب کوئی ایڈورٹائزر آ جائے، تو اسے خوش کرنے کے لئے ٹی اور ڈنر پارٹیاں بھی دیا کرتے ہیں۔ بمبئی کے ایک ایڈورٹائزر دہلی آئے، تو سردار جنگ بہادر سنگھ نے مقامی اخبارات کے ایڈیٹروں اور مینجروں کو ایک ریسٹورنٹ میں مدعو کیا۔ جہاں کہ اس ایڈورٹائزر کو ٹی پارٹی دی گئی۔ اخبارات کے ایڈیٹر چاہے ایک دوسرے کو ناپسند ہی کرتے ہوں، مگر دوسری کی دی گئی پارٹیوں میں شامل ضرور ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ یہ جانتے ہیں کہ اگر یہ آج دوسرے کی دی گئی پارٹی میں شامل نہ ہوں گے، تو کل کو دوسرا ان کی پارٹی میں شامل نہ ہوگا۔ سردار جنگ بہادر سنگھ نے نہ صرف دہلی کے قریب قریب تمام اخبارات کے نمائندوں اور رانا جنگ بہادر سنگھ کو دعوتی کارڈ بھیج دیئے، بلکہ آپ نے اپنی حسب عادت مرکزی گورنمنٹ کے کئی وزراء کو بھی یہ کارڈ بھیجا، تاکہ ان وزراء کو معلوم ہو کہ دہلی میں آپ کو اہمیت حاصل ہے، اور آپ پارٹیاں دیتے ہیں۔ ان وزراء کے دعوتی کارڈ ہندوستان کے وائس پریذیڈنٹ سر رادھا کرشن کو بھی بھیجا گیا۔ سر رادھا کرشن کے رانا جنگ بہادر کے ساتھ گہرے ذاتی دوستانہ تعلقات ہیں، اور ان دونوں کو غالباً کشمیر میں دو ہفتہ کے قریب ایک ہی جگہ اکٹھے رہنے کا بھی اتفاق ہوا تھا۔ سر رادھا کشن کے پاس جب یہ دعوتی کارڈ پہنچا، تو آپ نے سمجھا کہ یہ دعوت نامہ رانا جنگ بہادر کی طرف سے ہے اور رانا صاحب نے ''شیر پنجاب'' کے

نام کا کوئی نیا اخبار جاری کیا ہے، اس دعوت نامہ کے مطابق آپ وقت مقررہ پر اس ریسٹورنٹ میں پہنچ گئے۔ ریسٹورنٹ کے دروازہ پر سردار جنگ بہادر سنگھ مہمانوں کا استقبال کر رہے تھے، جنہوں نے سر رادھا کرشن کو لے جا کر بٹھایا۔ سر رادھا کرشن کو وہاں بیٹھے چار پانچ منٹ ہوئے تھے، کہ رانا جنگ بہادر سنگھ بھی پارٹی میں پہنچ گئے۔ اور آپ نے پارٹی میں پہنچ کر جب سر رادھا کرشن سے ہاتھ ملایا، تو رانا جنگ بہادر سنگھ کو سر رادھا کرشن نے انگریزی میں کہا:

''مہمان تو موجود ہیں، مگر میزبان غائب ہیں''

یعنی یہ دعوت رانا جنگ بہادر نے دی ہے، اور میزبان ہوتے ہوئے مہمانوں کے بعد آئے۔ سر رادھا کرشن کے یہ الفاظ سن کر رانا صاحب نے بتایا کہ اس پارٹی میں وہ میزبان نہیں ہیں اور وہ بھی ایک مہمان ہی ہیں اور یہ پارٹی ایک دوسرے صاحب سردار بہادر سنگھ نے دی ہے، جو ایک ہفتہ وار اردو اخبار چلاتے ہیں۔ سر رادھا کرشن یہ سن کر پریشان ہوئے اور آپ نے کہا:

''میں نے سمجھا تھا، کہ آپ نے ''شیر پنجاب'' کے نام کا اخبار جاری کیا ہے اور آپ ہی میزبان ہیں میں آپ کی وجہ سے ہی اس پارٹی میں شامل ہوا۔

رانا جنگ بہادر سنگھ نے راقم الحروف کو اس واقعہ کے علاوہ اور بھی کئی ایسے واقعات بتائے جن میں کہ لوگ آپ کے نام کی غلط فہمی کا شکار ہوئے۔

اوپر کے دو واقعات کے علاوہ ایک تیسرا واقعہ بھی سن لیجئے دہلی میں ایک صاحب پیارے لال بھلہ رہتے ہیں، جو کسی زمانہ میں اخبار ''تیج'' میں رپورٹر تھے، اور آپ نے بعد میں اپنا ایک اخبار ''آج'' جاری کیا تھا۔ آپ آج کل مختلف قسم کے پمفلٹ یا چھوٹی چھوٹی کتابیں شائع کرتے ہیں تین چار برس ہوئے ایک سرکلر مرکزی اور صوبہ جات کے تمام وزراء اور لیڈروں کو بھیجا گیا تھا، جس میں لکھا تھا کہ آپ مہاتما گاندھی کی سالگرہ کے موقع پر مہاتما جی کے متعلق ایک کتاب شائع کر رہے ہیں۔ اس کتاب

میں شائع کرنے کے لئے اپنا پیغام بھیجئے اور اس کتاب کے لئے اپنی گورنمنٹ سے آرڈر بھجوایئے۔ اور آپ نے اس فارم میں اپنے نام کے ساتھ بھلہ نہ لکھا، صرف پیارے لال لکھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وزراء اور لیڈروں کی بہت بڑی تعداد نے یہ سرکلر مسٹر پیارے لال سابق پرائیویٹ سیکرٹری مہاتما گاندھی کی طرف سے آیا سمجھ کر پیغام بھیجے مبارکباد کے خطوط لکھے اور بہت بڑی تعداد میں کتاب کے آرڈر بھجوائے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک اطلاع کے مطابق مسٹر پیارے لال بھلہ کو اس ہم نامی کے سودے میں ایک لاکھ روپے کا فائدہ ہوا۔ گو بعد میں پنڈت نہرو کو اپنے ایک بیان میں کھلے طور پر اس کتاب اور پیارے بھلہ سے بے تعلقی کا اظہار کرنا پڑا، جبکہ پنڈت نہرو کو اس واقعہ پر توجہ دلائی گئی۔ مگر پنڈت جی کا بیان قطعی بے معنی تھا، جبکہ پیارے لال بھلہ کا ہم نامی کا تیر اپنا کام کر چکا تھا۔

ہم نامی کے اس قسم کے واقعات کے سلسلہ میں وہ لوگ تو یقیناً فائدہ میں رہتے ہیں، جو بڑے لوگوں کا نام استعمال کرتے ہیں، مگر وہ لوگ ہمدردی کے مستحق ہیں جن کا نام استعمال کیا جائے۔ کیونکہ ان بڑے لوگوں کا جرم صرف یہ ہے، کہ ان کے ہم نام لوگ بھی اس دنیا میں موجود ہیں۔

☆☆☆☆☆

تبادلہ آبادی، جرائم پیشہ لوگوں کا گنگا اشنان

ہندو متھیالوجی کے مطابق اگر کوئی بڑے سے بڑا گنہگار بھی ہردوار جا کر گنگا میں اشنان کر لے، تو اس کے تمام گناہ دھل جاتے ہیں میں یہ تو نہیں کہتا کہ گنگا میں نہانے کے باعث گنہگاروں کے گناہ دھل جاتے ہیں، یا نہیں، مگر یہ واقعہ ہے کہ تبادلہ آبادی نے پاکستان اور ہندوستان کے تمام جرائم پیشہ لوگوں کو معصوم اور بے گناہ بنا دیا۔ کیونکہ ہندوستان کے جرائم پیشہ مسلمانوں کا ہندوستان میں، اور پاکستان کے جرائم پیشہ ہندوؤں اور سکھوں کا تمام ریکارڈ پاکستان میں رہ گیا۔ اور یہ جرائم پیشہ جہاں گئے، وہاں کی پولیس کو کچھ پتہ نہ تھا، کہ ان کے ہاں آنے والے نئے شرنارتھیوں اور پناہ گزینوں کا پچھلا اعمال نامہ کیا ہے؟ پولیس کے ایک افسر کے قول کے مطابق اگر کوئی جرائم پیشہ قتل کرنے یا ڈاکہ ڈالنے کے بعد کسی گوردوارہ یا مندر میں جا بیٹھتا، تو پولیس کو کچھ معلوم نہ ہو سکتا، کہ جرم کرنے والا کون تھا اور کہاں گیا؟ اس سلسلہ کا میں ایک واقعہ بیان کرتا ہوں جو دلچسپ ہے:

1947ء میں جب کہ دہلی میں قتل اور خونریزی جاری تھی، تو ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ مسٹر ایم ایس رندھاوا نے دہلی کے بہت سے مسلمانوں کو آنریری پولیس آفیسر ڈسٹرکٹ کے اختیارات دے دیئے تھے۔ جس کا مقصد یہ تھا، کہ یہ لوگ قتل یا فساد کرنے والوں کو موقع پر ہی گرفتار کر کے جیل بھیج سکیں، اور اس سلسلہ میں ہی دہلی کی سوشلسٹ پارٹی کے لیڈر میر مشتاق احمد بھی مجسٹریٹ درجہ اول بنا دیئے گئے۔ گورنمنٹ کی طرف سے ان کو ایک اچھی قسم کا ریوالور دے دیا گیا، تا کہ جہاں مناسب سمجھیں، قاتلوں اور فسادیوں پر فسادات سے روکنے کے لئے استعمال کر سکیں۔ اور چونکہ میر مشتاق احمد بغیر کسی خوف کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے محلوں کا دورہ کرتے، اور قتل و خونریزی کو روکتے، آپ اس ریوالور کو معہ کارتوسوں کے ہر وقت اپنے پاس رکھتے کیونکہ صبح سے رات 12 بجے تک آپ امن قائم رکھنے کے لئے دورہ کرتے، اور

مصروف رہتے۔

میر مشتاق احمد راقم الحروف کے مخلص کرم فرماؤں میں سے ہیں، اور کبھی کبھی دفتر ریاست میں بھی تشریف لایا کرتے ہیں ایک روز آپ تشریف لائے تو دوسرے چار پانچ آنریری سب انسپکٹروں اور کانسٹیبلوں کے ساتھ آپ کے ہمراہ ایک خوبصورت، جوان اور بارعب سکھ تھا، اوران سردار صاحب کی کمر میں بھی پستول اور کارتوس والی پٹی بندھی تھی۔ میر صاحب نے ان سردار صاحب سے تعارف کراتے ہوئے فرمایا:

''آپ سردار کرپال سنگھ جوہر ہیں ضلع جہلم کے رہنے والے ہیں ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس رہ چکے ہیں اوراب میرے ساتھ فسادات کو روکنے کے لئے کام کر رہے ہیں۔''

میں نے اس تعارف کے بعد سردار کرپال سنگھ سے ہاتھ ملایا، اور کچھ دیر باتیں ہوتی رہیں سردار کرپال سنگھ نے بتایا کہ آپ ضلع جہلم کے بہت بڑے رئیس خاندان سے تعلق رکھتے ہیں پنجاب میں ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ آف پولیس تھے، مگر آپ مستعفی ہو گئے تھے اور موجودہ کئی سپرنٹنڈنٹ پولیس اور ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس ان کے ہمراہیوں میں سے ہیں۔ کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد میر صاحب معہ اس آنریری قافلہ کے تشریف لے گئے۔

اس واقعہ کے چند ماہ بعد ایک روز شام کو پولیس کے ایک انسپکٹر معہ چند کنسٹبلوں اور سردار کرپال سنگھ کے تشریف لائے۔ یہ لوگ جب پہنچے، تو رسمی نمستے اور ست سری اکال کے بعد سردار کرپال سنگھ نے بتایا، کہ یہ کچھ عرصہ سے راشن کے ڈیپارٹمنٹ میں کنٹرولر مقرر تھے، جہاں کہ شرنارتھیوں کو مفت راشن ملتا ہے۔ ایک کلرک کی شرارت کے باعث ان پر غلط الزام لگایا گیا ہے، اوران کو شبہ میں گرفتار کیا گیا ہے، اوران کی ضمانت دی جائے۔ یہ بیان تو سردار کرپال سنگھ کا تھا اور پولیس کے انسپکٹر نے بتایا کہ یہ سردار صاحب راشن کے ایک دفتر میں افسر مقرر کئے گئے تھے جہاں انہوں نے نہ

صرف سرکاری روپیہ غبن کیا، بلکہ جعلسازیاں کرتے ہوئے رجسٹروں میں بھی غلط اندراج کئے ہیں اور یہ پانچ ہزار روپیہ کی ضمانت پر چھوڑے جا سکتے ہیں، تا کہ ان کا مقدمہ عدالت میں جائے، تو ضامن ان کو عدالت میں پیش کرے۔ میں نے انسپکٹر سے جب یہ حالات سنے، تو سردار کرپال سنگھ سے کہا کہ:

''میں آپ کی ضمانت نہیں دے سکتا، کیونکہ میں آپ کو نہیں جانتا۔ آپ کی اور میری رشتہ داری صرف یہ ہے کہ آپ ایک بار میر مشتاق احمد کے ساتھ میرے مکان پر آئے۔''

میں نے جب یہ کہا تو سردار کرپال سنگھ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور آپ نے دردناک الفاظ میں کہا:

''میں شریف خاندان کا شرنارتھی ہوں، ہم لاکھوں روپیہ کی جائیدادیں پاکستان میں چھوڑ آئے ہیں۔ مجھ پر قطعی غلط اور جھوٹا الزام لگایا گیا ہے۔ اگر آپ ضمانت نہ دیں گے، تو پولیس مجھے حوالات میں بند کر دے گی آپ کو میرے ساتھ ہمدردی کا سلوک کرنا چاہئے میں کہیں بھاگ نہیں رہا معزز سرکاری عہدہ پر رہ چکا ہوں اور خاندانی آدمی ہوں آپ مہربانی فرما کر ضمانت ضرور دے دیجئے۔''

سردار کرپال سنگھ نے جب یہ کہا تو مجھے خیال آیا کہ پولیس نے ان پر غالباً جھوٹا مقدمہ بنایا ہے۔ میں نے میر مشتاق احمد سے یہ دریافت کرنے کے لئے کہ ضمانت دوں یا نہ دوں میر صاحب کو ٹیلی فون کیا مگر میر صاحب اپنے دفتر میں موجود نہ تھے مجھے خیال آیا کہ ضمانت دینے میں کیا حرج ہے میں نے انسپکٹر سے کہا کہ لائی ضمانت کا کاغذ میں دستخط کر دیتا ہوں چنانچہ انسپکٹر نے ضمانت نامہ لکھا میں نے دستخط کئے اور کرپال سنگھ ضمانت پر رہا ہو کر اپنے گھر چلے گئے۔

اگلے روز میں نے میر مشتاق احمد کو پھر ٹیلی فون کیا اور تمام واقعہ بیان کیا تو میر صاحب نے بتایا کہ کرپال سنگھ بڑا عیار اور جرائم پیشہ ہے۔ اس نے یہاں کے حکام کو

بھی دھوکہ دے کر ریوالور کا لائسنس لے لیا تھا، جو ضبط کرلیا گیا۔اس کی ضمانت نہ دینی چاہئے تھی میں نے کہا کہ اب تو میں ضمانت دے چکا ہوں اور ضمانت صرف ملزم کے عدالت میں پیش ہونے تک کے زمانہ کے لئے ہے میں مقدمہ کے عدالت میں جانے کے بعد عدالت میں نئی ضمانت نہ دوں گا چنانچہ میں نے اپنے آدمی کے ذریعے کرپال سنگھ کو کہلا بھیجا کہ وہ عدالت میں نئی ضمانت پیش کرنے کا انتظام کرلے میں آئندہ اس کا ضامن نہیں رہنا چاہتا۔

دہلی سوشلسٹ پارٹی کے کچھ کارکنان نے میر مشتاق احمد کی سرپرستی یا امداد میں ایک آرگنائزیشن قائم کی تھی، جس میں مسٹر جمنا داس اختر ایڈیٹر ''سویرا'' اور سردار کچھمن سنگھ گل ٹھیکیدار وغیرہ باثر حضرات بھی شامل تھے۔اس آرگنائزیشن کا مقصد یہ تھا کہ دفاتر میں سے رشوت کو کم کیا جائے، غنڈہ ازم کو ختم کیا جائے اور معصوم اور بے گناہ کم عمر لڑکیوں کو طوائفوں کے چنگل سے بچایا جائے، تاکہ یہ لڑکیاں آئندہ طوائفوں کا پیشہ اختیار نہ کریں اس آرگنائزیشن نے جب سردار کرپال سنگھ کے متعلق حکام کی توجہ دلائی، اور بتایا کہ یہ کرپال سنگھ ایک پیشہ ور دھوکا باز ہے، جو لوگوں کو مختلف طریقوں سے لوٹتا ہے اور پرمٹ دلانے کے نام پر پبلک کی جیب خالی کرتا ہے تو پولیس کے افسروں نے بتایا کہ کرپال سنگھ کا نام ایک عرصہ سے دس نمبر کے بدمعاشوں کی فہرست میں درج ہے، اور اس فہرست کو تھانہ دریا گنج (جس علاقہ میں کرپال سنگھ رہتا تھا) میں دیکھا جا سکتا ہے چنانچہ سوشلسٹ ورکرز نے تھانہ دریا گنج میں جا کر دیکھا تو وہاں دس نمبر بدمعاشوں کی فہرست میں فی الحقیقت کرپال سنگھ کا نام موجود تھا۔

راقم الحروف اپنی انتہائی مصروفیت کے باعث نہ تو کبھی کسی جلسہ، کانفرنس اور میٹنگ میں شامل ہوا، اور اسے لوگوں سے ملنے کا بھی بہت کم اتفاق ہوتا۔صرف چند گہرے دوست شام کو تشریف لے آتے ان دوستوں سے معلوم ہوتا کہ کرپال سنگھ اکثر عدالتوں میں پھرتا رہتا ہے کیونکہ اس پر پولیس نے کئی مقدمات چلا رکھے ہیں مگر

میں نے اس میں کوئی دلچسپی نہ لی۔

کرپال سنگھ کی ضمانت دیئے دو یا تین برس ہوئے تھے، کہ ایک روز کرپال سنگھ آیا اور اس نے بتایا کہ سردار بلدیو سنگھ (ڈیفنس منسٹر) اس کے گہرے دوست ہیں۔ یہ ہفتہ میں ایک دو بار سردار بلدیو سنگھ سے ملنے جایا کرتا ہے وہاں اخبار ریاست اور اس کے ایڈیٹر کا ذکر آ گیا تھا اور سردار بلدیو سنگھ نے راقم الحروف سے ملنے کی خواہش ظاہر کی ہے اور پوچھا ہے کہ میں کب سردار صاحب سے مل سکتا ہوں؟ میں ابھی ان کے ہاں جا رہا ہوں، مجھے گھر سے ٹیکسی کے لئے روپیہ لانا یاد نہیں رہا، آپ دس روپیہ دے دیجئے تا کہ میں سردار بلدیو سنگھ کے ہاں جا کر ان سے ملاقات کا وقت مقرر کر آؤں۔

یہ سن کر میں نے کرپال سنگھ سے کہا:

''آپ ابھی تشریف لے جایئے، اور پھر کبھی اس دفتر میں آنے کا رخ نہ کیجئے، ورنہ اچھا نہ ہوگا۔''

یہ سن کر کرپال سنگھ گھبرا گیا، اور کہا:

''کیوں، کیا بات ہے، آپ ناراض ہو گئے؟''

میں نے جواب دیا:

''میں ناراض نہیں ہوا، تمہارے جیسے چار سو بیس کلاس کے لوگوں سے ملنا نہیں چاہتا۔''

یہ کہہ کر میں کھڑا ہو گیا، اور کہا، کہ ابھی یہاں سے جاؤ چنانچہ وہ چلا گیا اور پھر کبھی واپس نہیں آیا۔

اس زمانہ کا تو مجھے کچھ علم نہیں مگر آج سے دو برس پہلے کرپال سنگھ پر نصف درجن کے قریب دھوکہ کے مقدمات چل رہے تھے، اور ایک دو مقدمات میں اس کو سزائے قید بھی ہو چکی تھی۔ روزانہ اخبارات میں اس کے مقدمات کی تفصیل شائع ہوا کرتی۔ مجھے کچھ علم نہیں کہ یہ شخص اب جیل میں ہے یا کہ جیل سے باہر مگر کبھی سوشلسٹ پارٹی کا

کوئی ورکر ملے تو میں اس سے پوچھ لیا کرتا ہوں کہ جہلم کے سابق ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس کا اب کیا حال ہے، اور کتنے مقدمات اس پر چل رہے ہیں؟ تبادلہ آبادی میں ہزار عیب ہوں، مگر اس کی ایک صفت سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا کہ پولیس کے ہسٹری شیٹ پیچھے رہ جانے کے باعث ہندوستان اور پاکستان دونوں ممالک کے جرائم پیشہ لوگ گنگا کا اشنان کر کے اپنے گناہوں سے پاک ہو گئے تھے۔ کیونکہ پولیس کو کچھ علم نہیں تھا، کہ کسی جرائم پیشہ کا پچھلا اعمال نامہ کیا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆
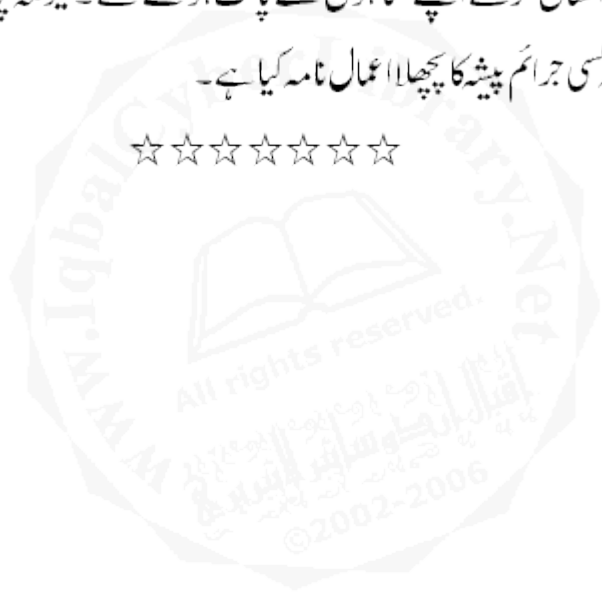
ماں کی محبت

محبت کا مسئلہ اس قدر وسیع ہے، کہ اس پر کئی ضخیم کتابیں لکھی جاسکتی ہیں محبت کی بنیاد قربت ہے یعنی جو شخص جتنا قریب ہوگا، اتنی ہی اس سے محبت ہوگی۔ محبت کے فلسفہ پر غور کیا جائے ہتو اس کی درجہ بندی ذیل کی صورتوں میں کی جاسکتی ہے۔

1 سب سے زیادہ محبت ماں کو بیٹی سے ہوا کرتی ہے کیونکہ بیٹی نہ صرف ماں کے بطن سے پیدا ہوئی، اور یہ جوان اور شادی ہونے کے زمانہ تک اپنی ماں کے سایہ حاطفت میں ہی رہتی ہے، بلکہ یہ ماں کی سب سے بڑی رازدار بھی ہوتی ہے۔ ماں اور بیٹی کی محبت میں اس وقت کمی شروع ہوا کرتی ہے، جب بیٹی کی شادی ہونے کے بعد بیٹی کی محبت کا مرکز اس کا شوہر ہوجائے۔

2 ماں اور بیٹی کی محبت کے بعد محبت کا دوسرا درجہ ماں اور بیٹے کی محبت کو دیا جاسکتا ہے۔ جس کی وجہ ایک تو یہ ہے، کہ بیٹا ماں کے بطن سے پیدا ہوا، اور وہ سالہا سال تک اپنی ماں کی آغوش میں پرورش پاتا ہے۔ بلکہ ماں یہ بھی محسوس کرتی ہے کہ بیٹا بڑا ہوکر اس کا خدمت گزار اور بڑھاپے میں ایک آسرا ہوگا۔

3 ماں بیٹی، اور ماں بیٹے کی محبت کے بعد محبت کا تیسرا درجہ بہن کا اپنی بہنوں اور بھائیوں سے ہوا کرتا ہے۔ کیونکہ بہن کا اپنی بہنوں اور بھائیوں سے محبت بے غرض ہوتی ہے، اور محبت کا یہ سلسلہ بہن کی زندگی میں ختم نہیں ہوا کرتا۔

4 محبت کے اعتبار سے چوتھا درجہ بیٹی کا اپنی ماں اور باپ سے قرار دیا جاسکتا ہے۔ اور چونکہ عورت محبت کی دیوی ہے، یہ محبت کے لئے پیدا ہوئی، اور محبت کے لئے زندہ رہتی ہے، یہ چاہے ماں ہو، یا بہن اور یا بیٹی اس کی محبت کا مقابلہ مرد نہیں کرسکتا۔ باقی کے تمام رشتہ داروں کی محبت کی بنیاد ذاتی اغراض پر ہی ہوا کرتی ہے۔

مثلاً بیوی کی اپنے شوہر سے محبت اس زمانہ تک رہ سکتی ہے، جب تک کہ شوہر بیوی کی ہر ضروریات پوری کرتا رہے۔ شوہر کی محبت اس وقت تک ہوا کرتی ہے، جب تک

کہ بیوی کا شباب قائم رہے۔ باپ بیٹے سے صرف اس صورت میں محبت کر سکتا ہے، اگر باپ کو بیٹے سے خدمت گزاری کی توقع ہو۔ بھائی اپنے بھائی سے صرف اس زمانہ تک محبت کر سکتا ہے، جب تک ان کی شادیاں نہ ہو جائیں، اور ان کی محبت کا مرکز ان کی بیویاں اور بچے نہ ہو جائیں، اور اکثر صورتوں میں ان بھائیوں کی محبت ذاتی اغراض کے باعث دشمنی کی صورت میں بھی تبدیل ہو جایا کرتی ہے جس کا ثبوت عدالتوں کے مقدمات سے مل سکتا ہے۔ بہر حال میدان میں سب سے بلند درجہ ماں کا ہے۔ اس سلسلہ میں چند واقعات بیان کئے جا سکتے ہیں:

کئی برس ہوئے، مرحوم مہاراجہ نابھ گدی سے معزول کئے جانے کے بعد جب الہ آباد میں گرفتار ہوئے، اور کوڈائی کنال (صوبہ مدراس) میں قید کئے گئے، تو گرفتاری کے بعد الہ اباد سے کوڈائی کنال تک مہاراجہ کے ساتھ جانے کے لئے گورنمنٹ نے آگرہ کے ایک ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس سردار بہادر کشن سنگھ کو مقرر کیا۔ ان سردار بہادر کے مہاراجہ کے ساتھ بھیجنے کے دو مقاصد تھے۔ ایک تو یہ کہ مہاراجہ سکھ تھے، اور سردار کشن سنگھ بھی سکھ۔ کسی شخص کو یہ اعتراض نہ ہوگا، کہ گورنمنٹ نے مذہبی اعتبار سے مہاراجہ کو سہولتیں بہم نہ پہنچائیں یعنی تین چار روز کے طویل سفر میں سردار بہادر کشن سنگھ مہاراجہ کی مذہبی ضروریات پوری کر سکتے ہیں، اور دوسری وجہ یہ تھی کہ چونکہ سردار بہادر کشن سنگھ تین چار روز تک مہاراجہ کے ساتھ ریلوے کے ایک ہی خانہ میں ہم سفر ہوں گے۔ یہ باتیں کرتے ہوئے مہاراجہ کو کرید سکتے ہیں کہ گورنمنٹ کے متعلق مہاراجہ کے آئندہ ارادے کیا ہیں؟ اور اگر گورنمنٹ مہاراجہ کے نابالغ بیٹے (موجودہ مہاراجہ) کو گدی پر بٹھانے کے بعد نابھ لے جائے تو کیا مہاراجہ اپنے بیٹے اور مہارانی کے نابھ جانے کی مخالفت کریں گے، یا نہیں؟ چنانچہ سردار بہادر کشن سنگھ نے باتوں باتوں میں مہاراجہ سے پوچھا:

''اب آپ کی گرفتاری اور جلاوطنی کے بعد آپ کی مہارانی اور نابالغ بیٹے کی

پوزیشن کیا ہو گیا؟ یعنی آپ کی مہارانی اور بیٹا آپ کا ساتھ دینے کے لئے کوڈائی کنال آئیں گے، یا کہ وہ آپ کی پرواہ نہ کرتے ہوئے گورنمنٹ کی مرضی کے مطابق ڈیرہ دون سے نابھ چلے جائیں گے؟''

سردار بہادر کشن سنگھ کے اس سوال کا مہاراجہ نے جو جواب دیا وہ یہ تھا جو مرحوم مہاراجہ نے راقم الحروف کو اپنی نظر بندی کے زمانہ میں کوڈائی کنال میں بتایا، جب کہ راقم الحروف مہاراجہ سے ملنے وہاں گیا آپ نے سردار بہادر کشن سنگھ کو جواب دیا:

''سردار بہادر! اگر میری ماں زندہ ہوتی، اور آپ مجھ سے میری ماں کے متعلق پوچھتے، کہ وہ نظر بندی میں میرا ساتھ دینے کے لئے کوڈائی کنال آئے گی، یا نہیں؟ تو میں آپ کو بتاتا، کہ وہ یقیناً آئے گی۔ کیونکہ ماں کی ماِمتا اسے کوڈائی کنال آنے کے لئے مجبور کرتی۔ اب میں اپنی بیوی کے متعلق کیا کہہ سکتا ہوں، جو بیوی ہے، اور جس نے ولایت میں تعلیم حاصل کی ہے۔''

مہاراجہ کے اس جواب کا مطلب یہ تھا، کہ ماں کو جو محبت اپنے بیٹے کے ساتھ ہو سکتی ہے، وہ بیوی کو اپنے شوہر کے ساتھ نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کچھ عرصہ کے بعد مہارانی اپنے نابالغ بیٹے (یعنی موجودہ مہاراجہ) کو لے کر گورنمنٹ کی مرضی اور مرحوم مہاراجہ کی خواہش کے خلاف نابھ چلی گئیں۔ وہاں نابالغ مہاراجہ کا شاہی جلوس نکلا۔ اور نئے مہاراجہ کو گدی پر بٹھانے کی رسم ادا کر دی گئی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے بعد مرحوم مہاراجہ نابھ کے واپس گدی پر آنے کا کوئی سوال ہی باقی نہ رہا، اور مہاراجہ نے نظر بندی کی حالت میں ہی کوڈائی کنال میں موت کو لبیک کہا، آپ کے انتقال کے بعد آپ کی ہڈیاں نابھ لا کر دفن کر دی گئیں اور اگر مہاراجہ کی ماں زندہ ہوتی، تو یہ ممکن ہی نہ تھا، کہ وہ اپنے بیٹے سے جدا رہتی، اور وہ کوڈائی کنال میں اپنے بیٹے کا ساتھ نہ دیتی۔

مقدمہ نواب بھوپال بنام ایڈیٹر ریاست کے آخری فیصلہ کے مطابق مجھے تین ماہ

قید کی سزا ہوئی، اور میں ناگپور جیل میں اے کلاس میں رکھا گیا اے کلاس کا مطلب یہ تھا کہ خدمت کے لئے تین قیدی بطور ملازم ہر وقت موجود، ڈبل روٹی، مکھن، انڈے، گوشت، پھل بسکٹ اور مٹھائی وغیرہ جو چاہو، سو کھاؤ، کوئی کام نہ کرو، کتابیں، رسائل اور اخبارات پڑھو، اور آرام سے سو جاؤ۔ یعنی جیل کی زندگی گھر کی زندگی سے ہزار درجہ بہتر تھی۔ اور میری والدہ (جو حافظ آباد اپنے وطن میں تھیں) کو یہ علم تھا کہ جیل میں آرام سے ہوں، مگر میرے ناگپور جیل میں پہنچنے کے دو تین دن بعد میری والدہ کا جو خط حافظ آباد سے میرے پاس پہنچا اس کے الفاظ یہ تھے، جو اب تک مجھے یاد ہیں آپ نے لکھا تھا:

''تمہارے جیل جانے کے باعث مجھے جو روحانی کوفت ہے، وہ میں بیان نہیں کر سکتی، اور ایک ماں ہونے کے باعث میری آتما کو یہ دکھ ہونا لازمی تھا۔ میں چاہتی ہوں، کہ ناگپور آ کر تمہیں دیکھوں، مگر میرا ایک عورت ہونے کے باعث وہاں جانا شائد تم پسند نہ کرو۔ آج اگر تمہارے والد یا تمہارے بڑے بھائی زندہ ہوتے، تو وہاں پہنچے۔ کسی رشتہ دار کو وہاں بھیجنا لا حاصل ہے۔ تم مجھے ہر روز خط لکھتے رہا کرو، تا کہ تمہاری صحت کی خبر میرے لئے کچھ اطمینان کا باعث ہو۔ جیل سے جب تمہاری رہائی ہو، تو اس سے پہلے مجھے اطلاع دینا، تا کہ تمہارے دہلی پہنچنے سے پہلے میں دہلی پہنچ جاؤں۔''

یعنی ماں کو یہ علم ہے، کہ اس کا بیٹا جیل میں آرام کی زندگی بسر کر رہا ہے، اور وہاں اسے کوئی تکلیف نہیں، مگر جیل کا خیال ہی اس کے لئے روحانی کوفت کا باعث ہے۔ اور اگر اسے کوئی خیال آیا، تو یہ کہ اس کے بیٹے کا باپ اور بڑا بھائی (جن کا انتقال ہوئے سالہا سال گذر چکے تھے) اگر زندہ ہوتے تو وہ ان کو ناگپور بھیجتی، اور وہ اس کے بیٹے کی مشکلات میں امداد کرتے۔

میں جب کبھی جیل گیا، میرا کافی وقت وہاں قیدیوں کی ذہنی کیفیت کے مطالعہ میں

گزرتا۔ اودھ میں اس سلسلہ میں ہر قسم کے قیدیوں سے ملتا، اور ان سے بات چیت کرتا۔ چنانچہ ماں کی ممتا کا ایک واقعہ میرے لئے ہمیشہ ہی ناقابل فراموش رہا۔

ایک عورت کی گود میں بچہ تھا، اور اس عورت پر اپنے شوہر کو زہر دے کر ہلاک کرنے کے جرم میں مقدمہ چل رہا تھا۔ سیشن کورٹ سے اس کو پھانسی کی سزا کا حکم ہو چکا تھا۔ اس کی اپیل کو ہائیکورٹ نے بھی خارج کر دیا تھا۔ پھانسی کے روز صبح اس کو پھانسی پر لٹکانے کے لئے گارد لے جانے والی تھی، تو اس سے اس کا بچہ دینے کے لئے کہا گیا، مگر یہ اپنا بچہ جیل کے ملازمین کے حوالے کرنے کے لئے تیار نہ تھی۔ یہ بچہ کو اپنے سے الگ نہ کرنے کے لئے کافی دیر جدوجہد کرتی رہی، اور چاہتی تھی کہ یہ اپنے آخری لمحوں تک بچہ کو جدا نہ کرے۔ مگر جیل کے حکام ایسا کرنے کے لئے مجبور تھے، اور وہ قید کی کوٹھڑی میں ہی بچہ کو لینا چاہتے تھے۔ کافی جدوجہد کے بعد اس بے چاری نے جب اپنے بچہ کو دیا، تو وہ زار زار رو رہی تھی اس کو اپنی موت کا خیال نہ تھا اور اس کو اگر کوئی خیال تھا تو صرف یہ کہ اس کے مرنے کے بعد اس کا بچہ کہاں رہے گا، اسے کون رکھے گا، اور اس کا مستقبل کیا ہوگا؟ یعنی ماں نہ صرف اپنی زندگی میں اپنے بچے سے بے حد محبت کرنے پر مجبور ہے، بلکہ یہ چاہتی ہے، کہ اس کے مرنے کے بعد بھی اس کے بچہ کو تکلیف نہ ہو۔

میرے پڑوس میں ایک ریٹائرڈ تحصیلدار رہتے تھے، اور ان تحصیلدار کے ساتھ والے کمرہ میں ایک عورت اور اس کا جوان لڑکا رہا کرتے۔ اس لڑکے کو چوری کی عادت تھی، اور چوری کے الزام میں قید بھی ہو چکا تھا۔ اس مکان اور تحصیلدار والے مکان کا برآمدہ ملتا تھا۔ یعنی ایک شخص آسانی کے ساتھ ایک برآمدہ سے دوسرے برآمدہ میں جا سکتا تھا، کیونکہ دونوں کے درمیان لکڑی کا ایک معمولی پردہ سا تھا ان دونوں مکانوں کے سامنے ایک ڈاکٹر کا مکان تھا گرمیوں کے دن تھے میں بھی اپنے مکان کی چھت پر سویا ہوا تھا اور تحصیلدار بھی اپنی چھت پر سوئے ہوئے تھے سامنے والے ڈاکٹر

نو بجے والا سینما شو دیکھنے گئے اور ڈاکٹر صاحب کی بیوی رات کو گیارہ بجے کے قریب سڑک کی طرف دیکھ رہی تھی کہ اس کے شوہر آئیں تو وہ کھانا گرم کرے۔ جب وہ سڑک کی طرف دیکھ رہی تھی تو اس نے دیکھا کہ تحصیلدار والے مکان میں برآمدہ سے کوئی شخص داخل ہوا ہے اس نے جب یہ دیکھا تو اس نے مجھے آواز دی۔ میں ابھی جاگ رہا تھا۔ میں نے جواب دیا، تو اس نے بتایا کہ ابھی ابھی کوئی شخص برآمدہ کے راستہ تحصیلدار کے کمرہ میں داخل ہوا ہے۔ یہ سن کر میں بھاگتے ہوئے فوراً نیچے اتر آیا، اور میں نے شور پیدا کیا، تو اس شور کو سن کر تحصیلدار جاگے۔ اور وہ لڑکا جو چوری کرنے کے لئے تحصیلدار کے کمرہ میں داخل ہوا تھا، برآمدہ سے ہی واپس اپنے کمرہ میں چلا گیا۔ یہ سب میری آنکھوں کے سامنے ہوا تھا، اور مجھے معلوم ہو گیا کہ چوری کرنے والا پڑوس کا جوان لڑکا ہے۔ چنانچہ میں نے فوراً زینہ کے راستہ اس لڑکے کے کمرہ میں گیا۔ اس کمرہ کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ میں نے دروازہ کھٹکھٹایا تو کوئی جواب نہیں۔ جب زیادہ کھٹکھٹایا، شور کیا، اور میں نے لڑکے کو پولیس میں دینے کی دھمکی دی، تو لڑکے کی ماں نے بچاؤ کی دوسری کوئی صورت نہ دیکھتے ہوئے دروازہ کھول دیا۔ میں بہت غصہ میں تھا۔ غصہ کی کیفیت میں ہی میں نے لڑکے کو پیٹنا شروع کر دیا۔ اور جب میں لڑکے کو پیٹ رہا تھا، تو اس کی ماں میرے اور لڑکے کے درمیان آ گئی، اور اس نے اپنے بازو پھیلا کر اپنے لڑکے کو اپنی پناہ میں لے لیا، اور کہا:

''مجھے مار لو، مگر میرے بیٹے کو نہ مارو''

ماتا کی حالت میں ماں کی اس کیفیت کو دیکھ کر میں نے نہ صرف لڑکے کو پیٹنا بند کر دیا، بلکہ میں نے لڑکے کو گرفتار کرانے کا ارادہ بھی بدل دیا۔ حالانکہ چند منٹ پہلے میں نے یہ فیصلہ کر لیا تھا، کہ لڑکے کو عدالت سے کافی سخت سزا دلوائی جائے، تا کہ اس لعنت سے محلّہ صاف ہو جائے اس لڑکے کی ماں کی اس کیفیت کا مطلب ہے یہ کہ کسی مجرم کو لوگ چاہے کچھ سمجھیں اور اس کو قابل تعزیر قرار دیں، مگر اس کی ماں اس سے محبت کرتے

ہوئے اس کو اپنی پناہ میں لینا اپنا فرض سمجھتی ہے، اور اس کی امداد کے لئے مجبور ہے۔

محبت کے متعلق جہاں تک ایک مرد کا سوال ہے، اسے کوئی اہمیت نہیں دی جا سکتی۔ یہ اپنی ماں سے محبت کرے، بیٹی سے، بہن سے یا بیوی سے، اس کا محبت کرنا صرف حالات پر منحصر ہے۔ اور اس کی محبت کے جذبات دوامی نہیں ہوا کرتے۔ ان کی بنیاد کا انحصار صرف حالات پر ہے۔ یعنی یہ ضرورت کے مطابق محبت کرتا ہے۔ مگر عورت اپنے محبت کے غدود (گلینڈز) کے باعث ہر زمانہ میں محبت کرنے رپ مجبور ہے، اور وہ بغیر محبت کئے زندہ نہیں رہ سکتی۔ اور اس کے محبت کے جذبات کا تجزیہ اس صورت میں کیا جا سکتا ہے، یہ جوان ہونے سے پہلے اپنے والدین سے محبت کرتی ہے۔ اپنی سگائی کے روز سے اس کی محبت کا مرکز اس کا ہونے والا شوہر ہوتا ہے، اور یہ اس زمانہ میں کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھنا نہیں چاہتی۔ شادی کے بعد بھی اس کی محبت کا مرکز اس کے بچہ پیدا ہونے کے زمانہ تک اس کا شوہر ہی ہوتا ہے، اور اس کے بچہ پیدا ہونے کے بعد اس کی محبت اس کے شوہر کے ساتھ تو صرف دس فیصدی رہ جاتی ہے اور اس کے محبت کے نوے فیصدی جذبات اس کے بچہ میں منتقل ہو جاتے ہیں۔ پھر جب تک اس کا بچہ اور یہ خود زندہ رہے، اپنے بچہ پر اپنی جان نثار کرنے کے لئے تیار رہتی ہے۔ اور اس کے بچہ کی ماں کے ساتھ محبت صرف اس حد تک محدود ہے کہ جب وہ بیمار ہو اور اس کو جسمانی تکلیف ہو تو یہ کروٹ بدلتے ہوئے صرف ''ہائے ماں'' کہہ دے۔

چنانچہ رسول اللہ ﷺ کا یہ حکم بجا ہے کہ:

''بہشت ماں کے قدموں کے نیچے ہے''

کیونکہ ماں کی محبت کروڑوں روپیہ صرف کرنے پر بھی نصیب نہیں ہو سکتی، اور وہ لوگ بدنصیب ہیں، جنہوں نے ماں کی محبت کی قدر نہ کی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

نواب بھوپال سے دو ہزار روپیہ ہرجانے کی وصولی

مقدمہ نواب بھوپال بنام ایڈیٹر ''ریاست'' کا فیصلہ جب سیشن کورٹ میں ہو چکا، تو اس فیصلہ کے خلاف میں نے ہائیکورٹ میں اپیل کی۔ ہائیکورٹ میں نواب بھوپال کی طرف سے ڈاکٹر تیج بہادر سپرو، مسٹر سی پی راماسوامی آئیر سابق لاءممبر گورنمنٹ آف انڈیا ہر عبدالرحمٰن سابق جج لاہور ہائیکورٹ اور مسٹر ہدایت اللہ موجودہ جج سپریم کورٹ ہندوستان کے علاوہ دو تین اور چھوٹے وکیل بھی تھے۔ اور راقم الحروف کی طرف سے مسٹر کیدار سابق وزیر سی پی، مسٹر محمد شریف سابق وزیر قانون سی پی، مسٹر برج بہاری توکلی ایڈووکیٹ دہلی اور سردار بہادر بھگوان سنگھ بیرسٹر اجمیر تھے۔ جس روز یہ مقدمہ ہائیکورٹ میں پیش ہونے والا تھا، تو دو روز پہلے میں معہ اپنے وکلاء کے ناگپور پہنچ گیا مگر سی پی راماسوائی آئیر کا ایک تار مسٹر ہدایت اللہ کے پاس مدراس سے پہنچا۔ جس میں آپ نے لکھا تھا، کہ وہ ایک ضروری کام کے باعث اس پیشی پر ناگپور نہیں پہنچ سکتے، اور ہائیکورٹ میں کوئی نئی تاریخ لے لی جائے، تاکہ آپ اس روز وہاں پہنچ کر دوسرے وکلاء کے ساتھ بحث میں حصہ لے سکیں۔ اس تار کے پہنچنے پر مسٹر ہدایت اللہ، مسٹر کیدار کے پاس آئے، اور تار دکھا کر آپ نے خواہش ظاہر کی کہ دونوں پارٹیاں مل کر کسی نئی تاریخ کے لئے ہائیکورٹ سے درخواست کریں مسٹر کیدار نے جب یہ تار مجھے دکھایا اور پوچھا کہ کیا کرنا چاہئے؟ تو میں نے نئی تاریخ لینے سے انکار کر دیا اور کہا کہ:

''سرسی پی راماسوامی آئیر آئیں یا نہ آئیں، ہم نئی تاریخ نہیں لیں گے، اور لازمی طور پر اس تاریخ کو ہی بحث کریں گے۔''

مسٹر ہدایت اللہ نے اس جواب کی اطلاع ایکسپریس تار کے ذریعہ سرسی پی کو مدارس دی تو سرسی پی نے پھر تار دیا کہ:

''جس قیمت پر بھی ممکن ہو، مقدمہ میں تاریخ تبدیل کرا دی جائے کیونکہ اس پیشی

پر ان کا آنا ممکن نہیں۔''

مسٹر ہدایت اللہ یہ تار لے کر پھر ہمارے پاس آئے، اور ہم نے پھر انکار کیا، تو آپ نے کہا:

''نواب بھوپال کی طرف سے وہ کوئی متعینہ رقم بطور ہرجانہ (کیونکہ میرے اور وکیلوں کے دہلی سے ناگپور آنے اور جانے میں روپیہ صرف ہوا) ادا کرنے کے لئے تیار ہیں۔''

یہ سن کر ہم نے مسٹر ہدایت اللہ کو ٹالنے کے لئے کہا، کہ:

''ہم دو ہزار روپیہ ہرجانہ لے کر تاریخ تبدیل کرنے پر آمادہ ہو سکتے ہیں۔''

مسٹر ہدایت اللہ نے یہ سن کر کہا:

''آپ دو ہزار روپیہ ادا کرنے کے لئے تیار ہیں۔''

ہم نے تو دو ہزار روپیہ کی زیادہ رقم اس لئے کہی، کہ وہ نہ اتنی بڑی رقم ادا کریں گے، اور نہ تاریخ تبدیل ہو گی کیونکہ عدالتوں کا ہرجانہ عام طور پر دس یا بیس روپیہ ہوا کرتا ہے۔ چنانچہ اس جواب کے بعد ہم انکار نہ کر سکے، اور مسٹر ہدایت اللہ اپنی کوٹھی جا کر ایک سو روپیہ کے بیس نوٹ لے آئے میرے اور بھوپال کے وکیلوں نے مل کر ہائیکورٹ میں تاریخ تبدیل کرنے کے لئے درخواست دی اور تاریخ تبدیل کر دی گئی۔

دو ہزار روپیہ ہرجانہ ملنے پر میں نے اپنے چاروں وکیلوں میں پانچ پانچ سو روپیہ تقسیم کر دیا۔ ان چاروں وکیلوں نے روپیہ لینے سے انکار کر دیا، مگر بعد میں جب میں نے زور دیا اور قسم کھائی کہ میں یہ روپیہ نہ رکھوں گا تو انہوں نے قبول کر لیا۔ چنانچہ مجھے یاد ہے کہ مسٹر محمد شریف نے جب بار بار انکار کیا تو میں ان سے لپٹ گیا، اور کہا کہ اگر آپ قبول نہ کریں گے تو میں آپ سے قانونی امداد بھی نہ لوں گا تو آپ نے مجبور ہو کر یہ رقم لے لی۔

اس سلسلہ میں یہ بتانا بھی خالی از دلچسپی نہ ہوگا، کہ اس مقدمہ میں نواب بھوپال کی طرف سے جو گواہ پیش ہوئے تھے، ان میں ایک صاحب خان بہادر ولایت اللہ تھے۔ یہ ولایت اللہ نواب بھوپال کے دوستوں میں سے تھے، اور کئی برس تک ریاست بستر (جہاں کا سابق مہاراجہ آج کل گورنمنٹ انڈیا کے خلاف اخبارات میں بیان دے رہا ہے، اور نیا چیمبر آف پرنس قائم کر کے سابق والیان ریاست کا گورنمنٹ آف انڈیا کے خلاف ایک محاذ قائم کرنے کی کوششوں میں ہے) میں وزیراعظم رہے۔ ان کے ایک صاحبزادہ مسٹر اکرام اللہ پچھلے دنوں تو پاکستان گورنمنٹ کے لندن میں ہائی کمشنر تھے، اور اب پاکستان کے فارن ڈیپارٹمنٹ کے سیکرٹری ہیں اور دوسرے صاحبزادہ مسٹر ہدایت اللہ آج کل ہندوستان کی سپریم کورٹ کے جج ہیں۔

دو ہزار روپیہ بطور ہرجانہ نواب بھوپال سے وصول کرنے، یہ روپیہ وکیلوں میں تقسیم کرنے اور نئی تاریخ لینے کے بعد میں مسٹر توکلی اور سردار بہادر بھگوان سنگھ کے ساتھ واپس دہلی آ گیا۔ دہلی پہنچنے کے بعد جب ہرجانہ کی اس رقم کا بار روم کے وکلاء کو علم ہوا، تو وہ تمام ہی حیران تھے۔ کیونکہ ہندوستان کی عدالتوں کی تاریخ میں کبھی بھی اتنی بڑی رقم بطور ہرجانہ نہ کسی نے وصول کی، اور نہ ادا کی گئی، ایک اور وکیل نے تو کہا، کہ:

''اگر ہر پیشی پر اس طرح ہی ہرجانہ وصول ہوتا رہا، تو یہ وکیل صاحب بغیر کسی فیس کے مقدمہ کی پیروی کرنے کے لئے تیار ہیں۔''

اور ایک پریس رپورٹر نے مذاقاً جب یہ کہا کہ:

''اس رقم میں دہلی کی عدالتوں کے پریس رپورٹروں کا بھی کچھ حصہ ہونا چاہئے۔''

تو راقم الحروف نے پریس رپورٹروں کے کمرہ کے لئے چھ کرسیاں ''دفتر ریاست'' سے بھجوا دیں۔ کیونکہ اس کمرہ میں صرف ایک کرسی اور لکڑی کا ایک بنچ موجود تھا۔ یعنی اس ''مال غنیمت'' میں سے پریس رپورٹروں کو چھ کرسیاں ملیں۔

اس مقدمہ کے فیصلہ کے کئی ماہ بعد سر سی پی راماسوامی آئیر جب دہلی آئے، تو ان کا ایک دوست راقم الحروف سے ملا۔ اس کے ملنے کے بعد راقم الحروف اور سر سی پی کے درمیان گہرے دوستانہ تعلقات قائم ہو گئے۔ اور یہ بہت ہی دلچسپ واقعہ ہے کہ اس کے بعد مرحوم مہاراجہ نابھ نے سر سی پی کو اپنے معاملات کے سلسلہ میں قانونی رائے لینے کے لئے کوڈائی کنال بلایا، اور باتوں باتوں میں مہاراجہ سے یہ کہہ دیا، کہ:

اخبار ''ریاست'' کا گورنمنٹ آف انڈیا پر بہت اثر ہے اور لارڈ ولنگڈن وائسرائے کے دل میں بھی دیوان سنگھ کے لئے عزت و احترام کے جذبات ہیں۔

تو مہاراجہ نے مجھے لکھا کہ میں ان کے لئے گورنمنٹ آف انڈیا کے پولیٹکل ڈیپارٹمنٹ پر اپنے اثرات استعمال کروں۔ میں نے مہاراجہ کو لکھا، کہ میرا کوئی اثر نہیں۔ مگر مہاراجہ نے اسے درست سمجھنے سے انکار کر دیا، اور پھر لکھا کہ ان کو معتبر ذریعہ سے معلوم ہوا ہے کہ میرے اثرات ہیں اور میں مہاراجہ کے لئے کوشش کروں چنانچہ عرصہ تک یہ خط و کتابت جاری رہی، اور اس سلسلہ میں مہاراجہ کے تار بھی مجھے ملے۔ مگر چونکہ فی الحقیقت میرا یا اخبار ریاست کا پولیٹکل ڈیپاورٹمنٹ پر کوئی اثر نہ تھا، میں کچھ کر نہ سکتا تھا مگر مہاراجہ کو اس کا یقین نہ آیا اور ابھی چند برس ہوئے پچھلے کاغذات اور دوستوں کے اہم خطوط دیکھ رہا تھا، کہ مہاراجہ کے خطوط اور تار بھی دیکھ لئے ان کو دیکھ کر میرے آنسو نکل آئے، اور میرے منہ سے بے اختیار یہ شعر نکل گیا۔

گاہے گاہے باز خواں ایں دفتر پارینہ را
تازہ خواہی داشتن گر داغ ہائے سینہ را

مہاراجہ کے ان خطوط اور تاروں کو دیکھتے ہی میرے ذہن میں تمام واقعات کی یاد تازہ ہو گئی، تو میں نے ایک خط سر سی پی راماسوامی آئر کو لکھا اس خط کا جو جواب انہوں نے مدراس سے بھیجا اس میں انتہائی محبت اور شفقت کا اظہار کرتے ہوئے لکھا کہ وہ جب دہلی آئیں تو ان سے ضرور ملوں اور وہ اپنے لڑکے کے ہاں قیام کریں گے (ان

کے صاحبزادہ دہلی میں ایک کروڑ پتی فرم والٹاس لمیٹڈ کے مینجنگ ڈائریکٹر ہیں) مگر میں بھول گیا، اور ان سے ملاقات نہ ہوسکی۔ حالانکہ میں ان کے صاحبزادہ کو ٹیلی فون کرکے پوچھا، کہ وہ دہلی کب آرہے ہیں؟ تو انہوں نے بتایا کہ بنارس یونیورسٹی کی میٹنگ کے سلسلہ میں عنقریب آنے والے ہیں۔

میرا ارادہ ہے، کہ میں ایک کتاب شائع کروں، اور اس کتاب میں وہ تمام خطوط ہوں، جو بڑے لوگوں، ہندوستان کے لیڈروں، پیشوا، شعراء، ریاستوں کے وزراء، والیان ریاست اور ان کی بیگمات اور مہارانیوں نے مجھے لکھے، اور جو میرے پاس محفوظ ہیں مگر شائد میری یہ آرزو پوری نہ ہوسکے، کیونکہ ایسی ضخیم کتابوں کے شائع کرنے کے لئے ہزارہا روپیہ کا سوال ہے اور یہاں حالت یہ ہے کہ چیلوں کے گھونسلے میں تو شائد گوشت کا کوئی ٹکڑا مل جائے مگر راقم الحروف کے لئے یہی گھر میں غنیمت ہے کہ صبح کے بعد شام کو کھانے کے لئے روٹی نصیب ہو۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

ربابی، ستھرے اور نہنگ

1947ء کے انقلاب اور تبادلہ آبادی کے سلسلہ میں ویسے تو لاکھوں انسان تباہ ہو گئے، اور ہلاک ہونے کی تعداد بھی لاکھوں تک پہنچتی ہے، مگر اس انقلاب نے ربابیوں، نہنگوں اور ستھروں کے تو پیشہ یا فرقہ کو بالکل ہی ختم کر دیا۔ کیونکہ اب کوشش کرنے پر بھی ہندوستان میں ایک ربابی، نہنگ یا ستھرا نظر نہیں آتا، جس کی وجہ انقلاب ہی ہے۔ کیونکہ 1947ء سے پہلے ان تینوں پیشوں یا فرقوں سے تعلق رکھنے والے لوگ کثرت کے ساتھ متحدہ ہندوستان کے شہروں میں ملتے تھے۔

ربابی:

ربابیوں کی ابتدا ایک مسلمان بھائی مردانہ سے ہوئی، جو گورونانک کے ساتھ رہتے اور رباب بجا کر گوروصاحب کے شبد گاتے۔ اور تبادلہ آبادی سے پہلے شائد ہی کوئی شہر یا قصبہ ایسا ہوگا، جہاں گوردوارہ ہو، اور وہاں ربابیوں کے دو چار خاندان نہ ہوں۔ یہ لوگ مذہب کے اعتبار سے مسلمان تھے، اور مرنے کے بعد یہ مسلمانوں کے قبرستان میں ہی دفنائے جاتے تھے۔ مگر ذریعہ معاش کے باعث یہ پچاس فیصدی مسلمان تھے اور پچاس فیصدی سکھ۔ کیونکہ ہر ربابی علی الصبح چار بجے گوردوارہ جاتا، اور آٹھ بجے تک وہاں کیرتن (یعنی سازوں کے ساتھ گوروصاحبان کا کلام گانا) کرتا مجھے اچھی طرح یاد ہے، میری عمر پانچ چھ برس کی تھی میرے وطن حافظ آباد کے ربابی ہر سنکرانت (دیسی مہینہ کی پہلی تاریخ) کو علی الصبح چار بجے میرے دادا کے ماموں زاد بھائی سردار جواہر سنگھ کپور (جن کے گھر کی دیوار ہمارے گھر سے ملتی تھی) کے ہاں آتے۔ کیونکہ سنکرانت ہندوؤں اور سکھوں میں ایک متبرک دن قرار دیا جاتا ہے، یہ ربابی دو گھنٹہ کے قریب کیرتن کرتے اور ہمارے خاندان کے تمام لوگ اور پڑوسی ان کے گانا شروع کرنے پر اپنی اپنی چارپائیوں پر بیٹھ جاتے۔ کیونکہ کیرتن ہوتے ہوئے

لیٹے رہنا گورو صاحب کے کلام کی بے ادبی قرار دیا جاتا۔ جب سکھوں میں سنگھ سبھا کی تحریک جاری ہوئی، تو سنگھ سبھا سے تعلق رکھنے والے بعض متعصب سکھوں نے یہ چاہا، کہ رباہی سکھ مذہب اختیار کرلیں، یعنی اسلام چھوڑ دیں مگر ان سکھوں کو بہت کم کامیابی ہوئی۔ کیونکہ رباہیوں نے اپنا ابتدائی مذہب چھوڑنے سے انکار کر دیا، اور صرف چند خاندان کے لوگوں نے سکھ ازم قبول کیا۔ مثلاً امرتسر کے مشہور رباہی بھائی نتھو سکھ ہونے کے بعد بھائی نتھا سنگھ اور بھائی کتھو رباہی سکھ ہونے کے بعد بھائی کتھا سنگھ ہوئے۔ یہ رباہی نسب کے لحاظ سے میراثی تھے، اور ہر میراثی چونکہ فطرتاً لطیفہ گو اور پر مذاق ہوتا ہے، بھائی نتھا سنگھ اور کتھا سنگھ کے متعلق ایک دلچسپ واقعہ ہے یہ دونوں بھائی مذہب قبول کرنے کے بعد معہ اپنے بیوی بچوں کے دربار صاحب امرتسر میں تخت اکال بنگلہ کے سامنے کیرتن کر رہے تھے، تو اس خاندان کی ایک خاتون نے جمائی لی اور جب جمائی لی تو جمائی کے بعد اس کے منہ سے نکل گیا ''یا اللہ'' کیونکہ اس بیچاری کو سکھ مذہب اختیار کئے تھوڑا عرصہ ہی ہوا تھا۔ جب اس کے منہ سے ''یا اللہ'' کے الفاظ نکلے تو قریب بیٹھے ہوئے سکھ ہنس دیئے ان سکھوں کی ہنسی کو محسوس کرتے ہوئے اس خاتون نے پنجابی زبان میں مذاقاً کہا:۔

بھراؤ! ہسدے او سانوں سکھ ہویاں تھوڑا ہی عرصہ ہویا اے۔ اللہ آہستہ آہستہ جائے گا، اور واہگورو آہستہ آہستہ آئے گا۔

(بھائیو! کیوں ہنستے ہو ہمیں سکھ مذہب اختیار کئے تھوڑا عرصہ ہی ہوا ہے۔ خدا زبان پر سے آہستہ آہستہ جائے گا، اور واہگورو زبان پر آہستہ آہستہ آئے گا)

تبادلہ آبادی کے فوراً بعد رباہیوں کی پوزیشن بہت نازک تھی ہندوستان میں ان کو مذہب کے اعتبار سے مسلمان قرار دیا جاتا، اس لئے ان کی زندگی خطرہ میں تھی۔ یہ بیچارے پاکستان جانے کے لئے مجبور ہوئے، حالانکہ پاکستان جانا نہ چاہتے تھے، اور اس سلسلہ میں راقم الحروف نے بھی ریاست میں کئی ایڈیٹوریل لکھے۔ جن میں سکھوں

سے مطالبہ کیا گیا کہ ان لوگوں کو سکھوں کا پروٹیکشن نہ دینا احسان ناشناسی ہے۔ کیونکہ ان کے خاندان پانچ سو برس کے طویل عرصہ سے گوردواروں میں کیرتن کیا کرتے تھے۔ مگر ان بیچاروں کو کوئی پروٹیکشن نہ دی گئی، اور یہ تمام کے تمام پاکستان چلے گئے۔ پاکستان پہنچنے کے بعد یہ اقتصادی تباہی کا شکار ہوئے۔ کیونکہ وہاں گوردواروں پر ہی قفل لگ گئے، تو ان کا کیرتن کون سنے؟ اور ان کی قدر کون کرے؟ ربابیوں میں اکثر اصحاب موسیقی کے اعتبار سے بہت صاحب کمال ہوئے اور اب جب کبھی لاہور کے ریڈیو اسٹیشن سے بھائی لال کے کسی خاندان کے کسی فرد کا گانا سنتا ہوں، تو ایک طرف تو ان کے فن کے کمالات سے محظوظ ہوتا ہوں، اور دوسری طرف اس فرقہ کی بالکل تباہی کا تصور کرتے ہوئے آنکھیں تر ہو جاتی ہیں، جس کی ذمہ داری سکھ لیڈروں پر ہے۔

ستھرے:

1947ء کے انقلاب سے پہلے متحدہ ہندوستان میں پنجاب کا کوئی شہر ایسا نہ تھا جہاں ستھرے بازاروں میں گھومتے نظر نہ آتے یہ لوگ تارک الدنیا ہوتے ان کا اپنے گھر اور خاندان سے کوئی تعلق نہ ہوتا۔ اور یہ اپنے ہاتھوں میں چھوٹے چھوٹے ڈنڈوں کی ایک جوڑی لے کر ان کو بجاتے ہوئے گاتے اور دکانوں سے ایک ایک پیسہ مانگتے اگر دکاندار ان کو پیسہ دے دیتا پھر تو یہ پیسہ لے کر اگلی دکان کے سامنے ڈنڈے بجانا اور گانا شروع کر دیتے۔ اور اگر دکاندار پیسہ نہ دیتا تو یہ وہاں سے نہ جاتے چاہے دن بھر ان کا اسی دکان پر ڈنڈتے بجاتے، اور گاتے بجاتے گذر جاتا۔ کیونکہ یہ اس احساس میں مبتلا تھے کہ چونکہ یہ تارک الدنیا ہیں ان کو حق حاصل ہے کہ یہ دوسرے لوگوں سے لے کر اپنی زندگی بسر کریں۔ چنانچہ یہ واقعہ دلچسپ ہے کہ ستھروں میں عام طور پر اعلیٰ کھتری خاندان کے لوگ مثلاً کپور اور طھوترے وغیرہ ہوا کرتے۔ اور راقم الحروف نے اپنے بچپن کے زمانہ میں درجنوں بار دیکھا کہ جب کسی دکاندار نے ان کو

پیسہ نہ دیا، تو یہ کئی کئی گھنٹہ دھوپ میں ہی اس دکان کے سامنے ڈنڈے بجاتے اور گاتے رہتے۔ اور یہ صرف اس وقت ہی وہاں سے آگے گئے جب ان کو پیسہ مل گیا یا دکاندار اپنی دکان بند کر کے چلا گیا۔ میں نے بہت کوشش کی کہ تبادلہ آبادی کے بعد کوئی ستھرا نظر آ جائے اور اکثر دوستوں سے بھی ذکر کیا، تو سب دوستوں نے یہی کہا کہ 1947ء کے بعد انہوں نے بھی کوئی ستھرا کسی جگہ نہیں دیکھا نہ معلوم یہ کیوں، اور کیسے ختم ہو گئے؟

نہنگ:

سکھوں اور نہنگوں کا فرقہ ایک انسٹی ٹیوشن تھی، جو اپنے آپ کو فنا فی الپنتھ (یعنی اپنے پنتھ یا مذہب کے لئے وقف) قرار دیتے۔ یہ دس دس اور بیس بیس کے مجمع کی صورت میں دورہ کرتے، اور ایک ایک مقام پر کئی کئی روز رہتے۔ یہ گداگری کو حرام قرار دیتے۔ اگر کوئی شخص کچھ دیتا، تو اسے پرے رکھ دینے کو کہتے، اور پھر اس کو اٹھا لیتے، اور اس طرح حاصل کرنے کو یہ لوٹنا قرار دیتے۔ یعنی ان میں گداگری تو حرام تھی مگر اصولاً یہ لوٹ مار کو جائز قرار دیتے تھے یہ اپنے آپ کو فوجاں یعنی فوج کا ایک حصہ سمجھتے۔ چنوں کے بادام، نیند کو اڑنگ بڑنگ ہونا، غیر سکھ ہندو کو سرمنا یا سرگھسا، مسلمانوں کو ترک اور جوئیں مارنے کو شکار کرنا کہتے۔ ان کے پاس گھوڑا، لوہے کے چند برتن (جن میں یہ کھانا پکاتے اور کھاتے) اور کرپان یعنی تلوار اور لوہے کا نیزہ ضرور ہوتا۔ ان کی پگڑی سیاہ رنگ کی ہوتی، جس پر یہ لوہے کے چکر لگاتے۔ چند روز سے زیادہ ایک جگہ قیام نہ کرتے، اور اپنا زیادہ وقت عبادت میں گزارتے۔ نہنگوں کے سلسلے میں مجھے ایک دلچسپ واقعہ یاد ہے مرحوم کنور رنبیر سنگھ (موجودہ مہاراجہ پٹیالہ کے دادا کے چھوٹے بھائی) کی کوٹھی میں ایک نہنگ رہا کرتا، جس کے پاس ایک مریل سا ٹٹو ہوتا۔ اس ٹٹو کا نام اس نے کہر سنگھ رکھا ہوا تھا۔ اس ٹٹو کو اس نے کچھہرا (یعنی سکھوں کا جانگیہ) بھی پہنایا ہوا تھا۔ ایک روز یہ ٹٹو گھاس چرتے چرتے کنور صاحب

کی کوٹھی کے برآمدہ میں چلا گیا۔ وہاں ایک فوجی پہرہ پر تھا جب اس فوجی نے دیکھا کہ ٹٹو برآمدہ میں چلا گیا۔ تو اس نے ٹٹو کو گردن سے پکڑ کر برآمدہ سے باہر نکالا نہنگ سکھ یہ منظر دور سے بیٹھا دیکھ رہا تھا اس نے غصہ میں آکر اپنی تلوار کرپان میں سے نکالی اور فوجی کو للکار کر کہا:

''تو کہیر سنگھ کے بالوں، کیسوں کی بے ادبی کرتا ہے'' (کیونکہ ٹٹو کی گردن پر بال تھے) ٹٹو کہیر سنگھ کا مالک یہ نہنگ سنگھ کئی برس تک معہ اپنے ٹٹو کے کنور رنبیر سنگھ کی کوٹھی کے احاطہ میں رہا اور یہ ریاست پٹیالہ کے تمام لوگوں میں مشہور تھا۔ اور وہ لوگ چاہے اس کو پاگل ہی سمجھتے ہگر یہ اپنے آپ کو گورو گوبند سنگھ کی ''فوجاں'' ہی قرار دیتا تھا۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ نہنگوں کے ختم ہونے کا ذمہ دار 1947ء کا انقلاب ہے یا اکالیوں کا عالم وجود میں آنا؟ کیونکہ اکالی بھی پچیس فیصدی کے قریب نہنگ ہی ہیں، جو گرفتاری کے وقت نہنگوں کی طرح اپنے باپ کا نام گورو گوبند سنگھ اور اپنی سکونت آنند پور صاحب (جہاں سکھ ازم کی بنیاد گورو گوبند سنگھ نے رکھی) ہی لکھواتے ہیں۔ بہر حال یہ واقعہ ہے کہ 1947ء سے پہلے پنجاب کے ہر شہر اور ہر قصبہ میں ربابیوں اور ستھروں کی طرح نہنگ نظر آتے تھے۔ مگر اب ان میں سے کسی کا بھی وجود نظر نہیں آتا، جسے افسوسناک قرار دیا جانا چاہئے۔ کیونکہ یہ اس زمانہ کی یادگار تھے، جب ہندوستان میں ہر شخص کو بغیر کسی کوشش کے کھانے کو مل جاتا تھا، غلہ کی افراط تھی، آبادی کم تھی اور یہ تینوں پبلک پر بوجھ محسوس نہ کئے جاتے تھے۔

☆☆☆☆☆☆

اقتدار اور عروج کے خاتمہ کے بعد

مرحوم مولانا ابو الکلام آزاد کے پرائیویٹ سیکرٹری محمد اجمل خان علمی و ادبی اعتبار سے ایک لائق ترین شخصیت ہیں۔ کئی کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔ اس کے علاوہ ذاتی طور پر یہ بلند لوگوں میں سے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ تھا، کہ آپ پچیس تیس برس تک مرحوم مولانا کے ساتھ رہے۔ اجمل خاں صاحب جب مولانا مرحوم کے سیکرٹری تھے، تو کسی صوبہ کا کوئی بھی وزیر ایسا نہ تھا، جو آپ کا دوست ہونا اپنے لئے باعث فخر قرار نہ دیتا ہو۔ اور آپ کے عروج کی حالت یہ تھی، کہ بڑے بڑے سابق والیان ریاست بھی یہ سمجھ کر آپ کی خوشامدیں کرتے، کہ ان کے ذریعہ سے یہ مرحوم مولانا تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں حالانکہ واقعہ یہ تھا کہ مولانا سے ملنے کی خواہش رکھنے والوں کے متعلق آپ کا رویہ بالکل وہ ہوتا، جو کچھ کہ مولانا چاہتے۔ یعنی خاں صاحب مولانا صاحب کے ایک گراموفون تھے، اور وہی کچھ کرتے، جو کہ مولانا کی خواہش ہوتی۔ مگر جو لوگ مولانا سے ملنے میں کامیاب ہوتے، وہ اس ملاقات کو خاں صاحب کا احسان سمجھتے، اور جو ملاقات سے محروم رہتے (کیونکہ مرحوم مولانا فطرتاً ریزرو اور تنہائی پسند تھے) وہ خاں صاحب کو کوستے۔ چنانچہ راقم الحروف کو ذاتی علم ہے کہ پنجاب کے ایک سابق مہاراجہ معہ اپنی مہارانی کے مولانا سے ملنے کے لئے آئے۔ مولانا نے ملنے سے انکار کر دیا کیونکہ مولانا اس مہاراجہ کو ناپسند کرتے تھے اس ملاقات کے نہ ہونے کا ذمہ دار بھی مہاراجہ نے خاں صاحب کو ہی قرار دیا۔ چنانچہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مرحوم مولانا کے زمانہ حیات میں محمد اجمل خاں کو کتنا بڑا عروج حاصل تھا۔ اور تمام ہندوستان میں شائد ایک بھی پولیٹکل ورکر اور لیڈر یا وزیر ایسا نہ تھا، جو خاں صاحب کی دوستی کے لئے بے قرار نہ ہوتا، اور جو آپ کی درباداری نہ کرتا۔

محمد اجمل خاں صاحب کبھی کبھی دفتر ''ریاست'' میں تشریف لایا کرتے تھے۔ مرحوم مولانا، کے انتقال کے غالباً ایک سال بعد ایک روز تشریف لائے، تو راقم

الحروف نے آپ سے سوال کیا:

''خاں صاحب! مرحوم مولانا کے زمانہ حیات میں تو بڑے سے بڑا لیڈر، وزراء اور سابق والیان ریاست آپ کی دربارداری کرتے۔ ان لوگوں میں سے کتنے ایسے لوگ ہیں، جن کا اب بھی آپ کے ساتھ ویسا ہی اخلاص کا سلوک ہے، جیسا کہ مرحوم مولانا کے زمانہ میں تھا؟''

خاں صاحب نے میرے اس سوال کا جو جواب دیا، وہ یہ تھا آپ نے فرمایا:

''بہت کم لوگ ایسے ہیں، جن کے رویہ میں کوئی فرق نہیں آیا اور بعض نے نہ تو صرف کبھی خط تک نہ لکھا، بلکہ اگر میں نے ان کو خط لکھا تو انہوں نے کوئی جواب ہی نہ دیا اور صرف گیانی کرتار سنگھ وزیر مشرقی پنجاب کے کریکٹر کی تعریف کی جانی چاہئے جن کو ایک معاملہ کے متعلق میں نے چندی گڑھ خط لکھا۔ گیانی صاحب اس وقت بمبئی میں تھے۔ یہ خط ان کی ڈاک میں چندی گڑھ سے بمبئی پہنچا، اور گیانی صاحب نے جب یہ خط پڑھا، تو آپ نے اپنے بلند فطرت ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے بمبئی سے ٹرنک کال کے ذریعہ باتیں کیں اور بتایا کہ آپ مجھ سے ملنے کے لئے چار پانچ روز میں دہلی پہنچ رہے ہیں۔ اور چار پانچ روز کے بعد جب آپ دہلی آئے، تو آپ کو میرے مکان کو پتہ نہ تھا۔ نصف گھنٹہ کے قریب مکان تلاش کرتے رہے، اور تلاش کرنے کے بعد ملے۔''

گویا کہ خاں صاحب کی دوستی کا دم بھرنے والے سینکڑوں کانگرسی لیڈروں، وزراء اور سابق والیان ریاست میں سے صرف ایک گیانی کرتار سنگھ ہی ایسے تھے، جن کی آنکھیں نہ پھریں اور جنہوں نے اپنے کریکٹر کی بلندی کا ثبوت دیا۔

راقم الحروف کئی برس سے اس کوشش میں تھا کہ ''ریاست'' کو بند کر دیا جائے اور دہلی سے دور کسی مقام پر تنہائی کی زندگی بسر کروں اور سکون میں کتابیں لکھی جائیں۔ چنانچہ سب سے پہلے یہ خیال تھا کہ جنوبی ہندوستان میں مالابار کے کسی پرفضا مقام پر

رہائش اختیار کروں۔ مگر مسٹر ایم ایس رندھاوا (آئی سی ایس) نے اس خیال کی مخالفت کرتے ہوئے رائے دی کہ کانگڑہ کا پہاڑی علاقہ زیادہ اچھا ہے۔ کانگڑہ کے علاقہ میں پالم پور وغیرہ آدمی بھیج کر حالات معلوم کیے، تو پتہ چلا کہ وہاں بلندی زیادہ ہے سردیوں میں تکلیف ہوگی۔ اس کے بعد پنڈت خوشدل ایڈیٹر ''دیش سیوک'' ڈیرہ دون دہلی آئے تو انہوں نے بتایا کہ ڈیرہ دون اور مسوری کے درمیان راجپور صرف تین ہزار فٹ کی بلندی پر بہت اچھی اور پر فضا جگہ ہے پنڈت خوشدل کی اس اطلاع پر راقم الحروف ایک روز کے لئے جگہ دیکھنے راجپور آیا، تو جگہ پسند آئی، اور یہاں مستقل قیام کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ یعنی میں کئی برس سے اس کوشش میں تھا، کہ ریاست کو ہمیشہ کے لئے بند کر کے دہلی چھوڑ دوں اور دہلی سے دور کسی پر فضا مقام پر اپنی زندگی بسر کروں۔ مگر میرے کسی بھی دوست کو یہ یقین نہ آتا تھا کہ میں ایسا کروں گا کیونکہ میری تمام زندگی ہی انتہائی مصروفیت میں گزری، اور دوست خیال کرتے تھے کہ میں اپنی انتہائی مصروفیات کو چھوڑ نہیں سکتا۔ چنانچہ جب ایک بار اخبار ریاست کو بند کر دینے کا اخبار میں اظہار کیا تو مرحوم بھیا شیخ احسان الحق نے اپنے ایک خط میں لکھا کہ:

''تم اخبار کے خریداروں کو اخبار کے بند کر دینے کی دھمکیاں دیتے ہو، اور اس سے باز نہیں آتے۔''

یعنی کوئی دوست بھی یہ یقین نہ کرتا تھا کہ میں اخبار ''ریاست'' کو بند کر کے کسی پہاڑی اور پر فضا مقام پر تنہائی کی زندگی بسر کروں گا۔ مگر وقت آ گیا کہ ریاست ٹرسٹ نے میری درخواست پر ریاست کو ہمیشہ کے لئے بند کر دینے کا ریزولیوشن پاس کر دیا، اور اخبار یکم جنوری 1960ء سے ہمیشہ کے لئے بند کر دیا گیا۔ اس اعلان اور اخبار کے بند ہونے کے بعد دوستوں کو یقین آیا کہ میں جو کچھ لکھ رہا تھا وہ دھمکی نہ تھی بلکہ میں اپنے ذہن میں اس کا فیصلہ کر چکا تھا۔

رسالہ ''شمع'' کے مالک اور ایڈیٹر حافظ محمد یوسف ذاتی اعتبار سے بہت بلند لوگوں

میں سے ہیں اور ان میں بعض ایسی صفات موجود ہیں جو کم لوگوں میں پائی جاتی ہیں آپ کئی برس سے ریاست کو مسلسل ڈھائی سو روپیہ ماہوار یا تین ہزار روپیہ سالانہ کے قریب امداد دیا کرتے آپ ریاست کے بہت قدر دان اور معترف تھے آپ نے جب ریاست کے بند ہونے کی اطلاع اخبار ریاست میں پڑھی تو آپ کو بہت افسوس ہوا اور آپ دفتر ریاست میں تشریف لائے تا کہ کسی صورت میں اخبار کو زندہ رکھنے پر مجھے آمادہ کر سکیں۔آپ نے فرمایا کہ:

''آپ ڈھائی سو روپیہ جو امداد دے رہے ہیں، اس میں اور بھی اضافہ کر دیں گے۔''

مگر میں نے جواب دیا کہ

''جو قدم اٹھایا گیا ہے، وہ سوچ سمجھ کر اٹھایا گیا ہے، اور یہ قدم اب واپس نہ جائے گا۔''

چنانچہ آپ مجھے اخبار کو جاری رکھنے پر آمادہ نہ کر سکے،تو آپ نے افسوس کے جذبات میں مجھے تنبیہہ کرتے ہوئے فرمایا:

''سردار صاحب اخبار ''ریاست'' دیوان سنگھ ہے اور دیوان سنگھ اخبار ریاست یہ آپ سوچ لیجئے کہ اخبار ریاست اگر بند کر دیا گیا تو دیوان سنگھ بھی ختم ہو گیا، اسے کوئی پوچھے گا بھی نہیں۔اگر زندہ رہنا چاہتے ہو تو اخبار کو بند مت کرو۔''

حافظ محمد یوسف کی اس تنبیہہ کا میں نے جو جواب دیا وہ یہ تھا:

''حافظ صاحب! میں معمولی حیثیت کے لوگوں میں سے تھا۔صرف پانچویں جماعت تک تعلیم حاصل کر سکا زندگی بھر ناموافق حالات کا مقابلہ کیا۔قطعی سیلف میڈ تھا۔اردو نہ جاننے والی سکھ قوم اور پنجاب میں پیدا ہو کر اردو کے مرکز دہلی سے ایسا شاندار اخبار جاری کیا، جس کی مثال نہیں مل سکتی۔لاکھوں روپیہ پیدا کیا، اور لاکھوں ہی خرچ کر دیئے۔اخبار میں چالیس چالیس صفحات کے مستقبل اشتہارات اور ستر ستر

صفحات کی مستقل ضخامت والیان ریاست کے حملوں کا مقابلہ کیا اور بڑے سے بڑوں کے دانت کھٹے کر دیئے بہت شہرت حاصل کی اور پبلک کی قابل رشک خدمت انجام دی۔ اور سچ یہ ہے کہ اب کوئی بھی خواہش باقی نہیں رہی اور نہ اب یہ آرزو باقی ہے کہ پبلک لائف جاری رہے۔ میں تو اخبار بند کر چکا ہوں اس کو پھر جاری کرنے کا خیال بھی نہیں کر سکتا اس کے لئے تیار ہوں اور چاہتا ہوں کہ ریاست کے بند ہونے کے ساتھ ہی میری پبلک لائف بھی ختم ہو جائے اور میں دنیا سے الگ سکون اور اطمینان کی زندگی بسر کروں۔''

میرا یہ جواب سن کر اور مایوس ہو کر حافظ صاحب اپنے دفتر چلے گئے اور جن خیالات کا حافظ صاحب نے اظہار کیا، ایسے خیالات ہی کئی درجن دوسرے دوستوں اور مداحوں نے اپنے خطوط میں اور زبانی طور پر ظاہر کئے مگر یہ تمام خیالات مجھے متاثر نہ کر سکے کیونکہ جو قدم اٹھایا گیا وہ تمام حالات پر غور کرنے کے بعد اٹھایا گیا۔

اخبار ''ریاست'' کو بند کر دینے دہلی کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ دینے اور ایک پہاڑی مقام پر تنہائی کی زندگی بسر کرنے کی صورت میں پچھلے ایک برس کے اندر مجھے جو تجربات حاصل ہوئے وہ دلچسپ ہیں اور ان کا بیان کرنا پبلک کے لئے مفید ہو سکتا ہے اور وہ تجربات یہ ہیں:

1 ان لوگوں سے میرے تعلقات بالکل منقطع ہو گئے، جن لوگوں کی دوستی صرف سود و زیاں یا نفع و نقصان کی بنیادوں پر تھی اور ان ایسے لوگوں سے تعلقات منقطع ہونے کا خیال کرتا ہوں تو خس کم جہاں پاک کہتے ہوئے دلی مسرت سی حاصل ہوتی ہے، کیونکہ ایسے لوگوں کی دوستی کا نہ ہی ہونا اچھا ہے، جو صرف اقتدار و عروج کے ساتھی تھے۔

2 ان دوستوں سے تعلقات اور زیادہ مضبوط ہو گئے، جن کی دوستی ذاتی اغراض کی بنیادوں پر نہ تھی کیونکہ یہ لوگ بغیر کسی غرض سے دوست اور مداح تھے۔

3 میں جوتش کے علم اور ستاروں کے اثرات کا ہمیشہ قائل رہا، اور اب ایک تازہ اور دلچسپ تجربہ نے مجھے ستاروں کے اثرات کا اور زیادہ قائل کر دیا ہے۔ میں جب دہلی سے ڈیرہ دون منتقل ہونے کے خیال سے ایک روز کے لئے ڈیرہ دون آیا، تا کہ جگہ کا انتخاب کرسکوں، تو میں نے دوسری کئی کوٹھیوں اور کاٹیجوں میں موجودہ جگہ (یعنی کاٹیج نمبر 193 راجپور روڈ) پسند کی اور یہ پسند کرنے کے بعد جب اس کاٹیج کو کرایہ پر لیا گیا تو اس وقت تک مجھے کچھ علم نہ تھا کہ اس سڑک پر کون لوگ آباد ہیں اور پڑوس میں کن لوگوں کی کوٹھیاں ہیں؟ کیونکہ میں اس علاقے سے قطعی ناواقف تھا اور جب میں نے دہلی سے ڈیرہ دون منتقل ہو کر اس کاٹیج میں رہائش اختیار کی تو چند روز کے بعد معلوم ہوا کہ کئی درجن کے قریب والیان ریاست اختیارات سے محروم ہونے کے بعد اور یہ سمجھتے ہوئے کہ بے اختیاری کی حالت میں اب ان کا اپنی ریاستوں میں رہنا ذلت اور رسوائی کا باعث ہے، یہ اس راجپور روڈ پر ہی مستقل طور پر مقیم ہیں اور انہوں نے یا تو یہاں کوٹھیاں خرید لیں اور یا اپنی نئی کوٹھیاں تعمیر کر لیں اور یہ واقعہ بہت ہی دلچسپ ہے کہ میری کاٹیج نمبر 193 راجپور روڈ سے چند قدم کے فاصلہ پر ہی کئی سابق والیان ریاست رہتے تھے درجنوں سابق والیان ریاست اور راقم الحروف کا اس راجپور روڈ پر قیام یقیناً ستاروں کے اثرات کے باعث ہے قسمت دیکھئے کہ یہ لوگ اپنے اختیارات سے معزول ہونے اور میں اخبار ریاست کو بند کرنے کے بعد ایک سڑک پر مقیم ہوئے یا دوسرے الفاظ میں جہاں تک ستاروں کے اثرات کا تعلق ہے یا تو ان کمبختوں نے میرا پیچھا نہ چھوڑا، اور یہ مجھے بھی اپنے پاس ہی کھینچ لائے اور یا میں کمبخت نے ان کا پیچھا نہ چھوڑا، اور یہ جہاں گئے میں بھی وہاں پہنچ گیا۔

4 پچھلی ایک برس کی تنہائی کی زندگی میں مجھے کتابوں کا مطالعہ اور حالات پر غور کرنے کا ایسا موقع میسر آیا جو زندگی میں کبھی بھی نصیب نہ ہوا تھا اور اگر اخبار ریاست بند نہ ہوتا تو اس قدر سوچنے اور غور کرنے کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔

5 مہاتما گاندھی کی مقلد سلیڈ (میراں بھین) نے اپنی زندگی اور حالات پر ایک کتاب لکھی ہے مس سلیڈ نے اپنی زندگی کے کئی برس کشمیر رشی کیش گڑھوال اور کانگڑہ کے پہاڑی مقامات پر بسر کئے ہیں آپ نے اپنے حالات میں جگہ جگہ ہمالیہ کے پہاڑی مقامات کی تازہ ہوا کی تعریف کی ہے اور میرا بھی تجربہ یہ ہے کہ شہروں کی راہوں اور مٹی میں ملی ہوئی یہ ہوا اور شوروغوغا کی فضا، ہمالیہ کے پہاڑوں کی تازہ ہوا، اور سکون کی زندگی کا مقابلہ نہیں کر سکتی ۔میری رائے یہ ہے کہ ہر شخص کی زندگی میں ایسا وقت آنا چاہئے کہ وہ مصروفیت اور جدوجہد کی زندگی سے فارغ ہو کر تنہائی اور سکون کی زندگی بسر کرے اور یہ زندگی بہت بڑی نعمت ہوگی اگر اس میں ہمالیہ کے پہاڑوں کی تازہ اور فرحت بخش ہوا بھی نصیب ہو۔

انگریزی زبان کی ایک کہاوت ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ مصیبت بہت تکلیف دہ ہوا کرتی ہے مگر اس کا ایک روشن پہلو ضرور موجود ہے کہ مصیبت میں دوستوں کا امتحان ہو جاتا ہے اس طرح اقتدار اور عروج کا ختم ہونا تکلیف دہ ضرور ہے مگر اس کا روشن پہلو یہ ضرور موجود ہے کہ وہ دوست الگ ہو جاتے ہیں جن کی دوستی صرف سود وزیاں یا فائدہ ونقصان کی بنیادوں پر ہوا کرتی تھی ۔اور اس چھانٹ میں صرف وہی دوست باقی رہ جاتے ہیں جن کی دوستی اخلاص، محبت اور قدر کی مخلص اور بے غرض دوستوں کی بہت بڑی تعداد اخبار ''ریاست'' کے بند ہونے کے بعد بھی میری ساتھ ہے، جن پر میں فخر کرسکتا ہوں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

برادری کا حسد اور مخالفت

بہت برس ہوئے دہلی سے انگریزی زبان میں ایک فلمی ہفتہ وار رسالہ ''مووِیز'' جاری تھا، جس کے ایڈیٹر مسٹر ایس وی کرپا رام تھے۔ یہ کرپا رام جی بہت ہی شریف، مخلص، وضعدار اور دوست نواز شخصیت تھے۔ اور ان کی وضعداری کے سلسلہ میں یہ واقعہ بہت دلچسپ ہے کہ چار پانچ برس تک ہر روز ہی شام کو تشریف لاتے رہے۔ چائے پینے اور گپ بازی کرنے کے بعد یا تو واپس اپنے گھر چلے جاتے، اور یا میرے ساتھ کار میں سیر کو جاتے۔ اور ان کی نیک فطرت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ فلمی حلقوں میں آپ فلمی گاندھی کے نام سے مشہور تھے کیونکہ فلمسازی کی گندی لائن اور طوائفوں یا نیم طوائفوں کے جھرمٹ میں بھی یہ کریکٹر کے لحاظ سے بلند رہے۔

کرپا رام جی رہنے والے ضلع جہلم کے تھے جہاں بچپن میں ہی ان کی شادی وہاں ہوئی، اور ان کی بیوی کے بطن سے کئی لڑکیاں تھیں اس شادی کے کئی برس بعد ان کی اس بیوی کا انتقال ہو گیا، تو آپ نے ریاست حیدرآباد کی رہنے والی ایک خاتون سے شادی کر لی۔ ان کی یہ بیوی بہت ہی شریف اور نیک تھیں، اور ریاست حیدرآباد میں بطور ڈاکٹر کسی ہسپتال کی انچارج تھیں، جہاں ان کو ڈھائی تین سو روپیہ ماہوار تنخواہ ملتی۔ اس خاتون کے بطن سے کوئی بچہ نہ تھا، اور یہ اپنی تنخواہ میں مزے سے گزارہ کر لیتیں۔ اور ادھر کرپا رام جی بھی دو تین سو روپیہ ماہوار پیدا کر کے اپنا گزارہ کر لیتے۔ یعنی یہ میاں بیوی ''نو لاس نو پرافٹ'' کے اصولوں پر کسی دوسرے کے رحم پر نہ رہتے۔ اور ان میاں بیوی کے تعلقات صرف اس حد تک تھے کہ بیوی سال کے بعد ایک ماہ کی رخصت معہ تنخواہ لے کر دہلی آ جاتیں' اور اپنے شوہر کے ساتھ ایک ماہ گزار کر اپنی ملازمت پر واپس حیدرآباد چلی جاتیں۔

ایک روز چائے پر کرپا رام جی نے بتایا کہ ان کی بیوی حیدرآباد سے آئی ہیں۔ یہ سن کر میں نے کہا کہ:

''جس روز مناسب ہوا ان کو چائے یا کھانے پر لے آیئے''۔

کرپا رام جی نے میری اس درخواس پر اپنے منہ سے تو کچھ نہ کہا' صرف سر کو دائنی طرف سے بائیں طرف ہلا دیا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ اس دعوت سے انکار کر رہے ہیں۔ ان کی اس کیفیت کو دیکھ کر میں نے پوچھا کہ آپ انکار کیوں کر رہے ہیں؟

انہوں نے جواب دیا کہ:

''ان کی بیوی چائے یا ڈنر پر نہ آسکیں گی''۔

میں نے اس کی وجہ پوچھی تو آپ نے جواب دیا:

''میں اپنی بیوی کو چائے یا ڈنر پر نہیں لا سکتا۔ کیونکہ میں اپنی برادری (یعنی جرنلزم کی برادری) کی فطرت سے واقف ہوں۔ کیونکہ اگر بیوی خوبصورت ہوئی تو تم لوگ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھو گے اور اگر وہ بدصورت ہوئی تو جب کبھی آپس میں ملو گے اس بیچاری کا مذاق اڑاؤ گے''۔

یہ سن کر میں نے کرپا رام جی سے کہا:

''آپ کی بیوی ایک برس کے بعد یہاں آئی ہیں۔ مناسب ہے کہ ان کو چائے یا ڈنر کی تکلیف دی جائے' تا کہ ان کو خیال نہ ہو کہ اس کے شوہر کا کوئی ایسا دوست نہیں جو چائے یا ڈنر پر ہی اسے بلائے۔ یعنی اس کا شوہر محروم الاحباب ہے۔ اس میں تو آپ کی ہی عزت ہے۔ تا کہ بیوی یہ سمجھے کہ اس کے شوہر کے مخلص دوست بھی موجود ہیں۔ اور چونکہ میں اپنے ہر دوست کی بیوی کو اپنی بیوی کی طرح عزت کرتا ہوں' اس لیے میں نے آپ سے کہا ہے''۔

کرپا رام جی میرے اس سمجھانے پر مان گئے' اور تین روز بعد یہ اپنی ڈاکٹر بیوی کو چائے پر لے آئے۔ اور چائے کے بعد یہ جوڑا رات کو ڈنر تک میرے ہاں ہی رہا۔

کرپا رام جی کی بیوی بہت ہی نیک اور شریف تھیں اور عمر کے لحاظ سے بھی وہ شباب اور بڑھاپے کے اتصال کے زمانہ سے گزر رہی تھیں۔ مگر خط و خال اور رنگ

کے اعتبار سے بہت ہی بدصورت تھیں۔ اس قدر بدصورت کہ جن کو دیکھ کر ہر شخص کو بہن جی کہنا پڑے۔ کرپا رام جی جب اپنی بیوی کے ساتھ تشریف لائے تو ویسے تو میں نے گرمجوشی کے ساتھ ان کا خیر مقدم کیا مگر میں اپنے دل میں سمجھ گیا کہ کرپا رام جی کی اپنی بیوی کو چائے پر نہ لانے کی اصل وجہ کیا تھی۔ چائے پر باتیں ہوتی رہیں اور چائے کے بعد بھی باتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ باتیں یہی کہ فلاں بیماری کے لیے کون سا نیا علاج دریافت ہوا ہے؟ میڈیکل سائنس نے بہت ترقی کی ہے۔ ریاست حیدرآباد کی ایڈمنسٹریشن کا کیا حال ہے' نظام کیوں انتہائی کنجوس ہیں اور مہاراجہ سرکشن پرشاد کی مقبولیت کی کیا پوزیشن ہے وغیرہ۔ ان باتوں کے سلسلہ میں ہی ڈنر کا وقت آ گیا اور یہ جوڑا کھانا کھانے کے بعد اپنے گھر واپس چلا گیا۔

اگلے روز شام کو کرپا رام جی حسب معمول تشریف لائے تو آپ نے بتایا کہ:

''ان کی بیوی یہاں سے جانے کے بعد بہت خوش تھیں اور اپنے میزبان کی تعریف کر رہی تھیں''۔

یہ سن کر میں نے کرپا رام جی سے مذاقاً کہا:

''آپ تعریف کو تو چھوڑے میں ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں' کیا آپ کو زندگی گزارنے کے لیے کوئی اچھی بیوی نہ مل سکی تھی؟ آپ کی قسمت میں یہی پھٹ ہوئی ڈھولک جیسی لکھی تھی جسے بجاتے چلے جا رہے ہو؟ اور آپ کی بیوی نے کسی مریل اور سڑیل پٹواری سے شادی کیوں نہ کی؟ اور اس نے تمہارے جیسے پنجابی جوان' خوبصورت اور انگریزی اخبار کے لائق ایڈمنسٹرٹر کو کیوں اپنی گرفت میں لے لیا۔ اور تم دونوں شادی کر کے کیوں بیوقوفی کی؟''

یہ سن کر کرپا رام جی نے کہا:

''یہی وجہ تھی کہ میں اپنی بیوی کو تمہارے ہاں چائے یا ڈنر پر نہ لانا چاہتا تھا۔ کیونکہ میں اپنی برادری کے لوگوں کو جانتا تھا اور محسوس کرتا تھا' کہ چونکہ میری بیوی بدصورت

ہے‘تم لوگ میری بیوی کا مذاق اڑاؤ گے‘‘۔

یہ سن کر میں نے کہا:

’’کرپا رام جی میں کسی دوسرے سے تو نہیں کہہ رہا‘میں تو صرف آپ سے ہی کہہ رہا ہوں۔ میں گناہگار تب ہوں گا‘اگر میں آپ کی بیوی کی بدصورتی کا کسی دوسرے سے ذکر کر کے اس کا مذاق اڑاؤں‘‘۔

کرپا رام جی میرے اس ڈیفنس سے مطمئن نہ تھے اور بار بار کہے جا رہے تھے:

’’میں اپنی برادری کے لوگوں کی فطرت سے واقف تھا۔ اگر میری بیوی خوبصورت ہوتی‘ و برادری کے لوگ میری بیوی کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے اور اب بیوی بدصورت ہے تو اس کا مذاق اڑایا جا رہا ہے‘‘۔

کرپا رام جی یہ کہہ رہے تھے تو میں محسوس کر رہا تھا کہ ان کے چہرہ سے دوستانہ شکوہ یا مذاق کا جواب دینے کی جگہ کچھ ناراضی کے جذبات کا بھی اظہار ہو رہا ہے۔ میں نے یہ کیفیت دیکھ کر کرپا رام جی سے معافی مانگ لی کیونکہ ایسے مواقع] پر میں فوراً معافی مانگ لیا کرتا ہوں۔

کرپا رام جی اب اپنی آنکھوں کی بصارت سے محروم ہو چکے ہیں اور آج کل آپ مستقل طور پر مسٹر پرتھوی رام فلم ایکٹر کی کوٹھی میں بمبئی میں مقیم ہیں۔ مجھے معلوم نہیں کہ ان کی یہ بیوی آج کل کہاں ہیں؟ گو ان کی بیوی کو علم نہیں کہ میں نے اس خاتون کے حسن کی تعریف میں ان کے شوہر سے کیا کہا تھا مگر پھر بھی میں اپنے ضمیر کی پاکیزگی کے لیے چاہتا ہوں کہ اس خاتون سے بھی صدق دل سے معاف کرنے کی التجا کروں۔ گو میرا ذہن کرپا رام جی کے یہ الفاظ اب تک بھول نہیں سکا۔

’’میں برادری کی فطرت سے واقف ہوں میں اپنی بیوی کو چائے پر نہیں لا سکتا کیونکہ اگر میری بیوی خوبصورت ہو گی تو برادری کے لوگ میری بیوی کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھیں گے اور اگر بدصورت ہو گی تو مذاق اڑائیں گے‘‘۔

بہت برس ہوئے میں نے تین ہزار روپیہ میں نئی کار خریدی (اس زمانہ میں وہ کار تین ہزار روپیہ میں مل جاتی تھی، جو آج کل تیرہ چودہ ہزار روپیہ میں بھی مشکل سے ملتی ہے) اس کار کو خریدنے کے ایک ماہ بعد میں کانگڑہ کے علاقے میں سیر کرنے کے لیے گیا، جہاں کہ پالم پور کے قریب کوٹھی ''الہلال'' میں نواب صاحب بہاولپور مقیم تھے علاقہ کی سیر اور بیج ناتھ کے ڈاک بنگلہ میں نواب صاحب کا چار پانچ روز کا مہمان رہنے کے بعد جب واپس امرتسر آیا تو خیال آیا کہ اب امرتسر تو آ گیا ہوں لاہور یہاں سے تیس میل کے قریب ہے وہاں دوستوں سے بھی کیوں نہ ملتا جاؤں؟ اور جب لاہور پہنچا تو خیال آیا کہ یہاں سے حافظ آباد تین چار گھنٹہ کا راستہ ہے حافظ آباد والدہ صاحبہ کی خدمت میں بھی کیوں نہ حاضری دوں؟ چنانچہ میں لاہور سے حافظ آباد گیا۔ حافظ آباد میں تین چار روز رہا۔ وہاں دوستوں سے بھی ملا۔ اور یہ تین چار روز بہت دلچسپی کے گزرے اور دن بھر دوستوں اک مجمع رہتا۔ تیسرے روز ایک دوست نے بتایا کہ میرے ایک قریبی رشتہ دار ایک دوسرے رشتہ دار سے اپنے مالدارانہ جذبات کا اظہار کرتے ہوئے کہہ رہے تھے:

''یہ دیوان سنگھ اپنے آپ کو بڑا آدمی سمجھتا ہے۔ اور کار میں سیر کرتا پھر رہا ہے۔ مگر اس کی حالت یہ ہے کہ اس نے نہ کوئی مکان تعمیر کیا اور نہ ہی کوئی زمین وغیرہ جائیداد خریدی۔ میں تو اس کو تب بڑا آدمی سمجھتا جب یہ زیادہ نہیں تو دو چار ہزار روپیہ کا ہی ایک نیا مکان تعمیر کرتا یا زمین خریدتا۔ اس کو کون بڑا آدمی کہہ سکتا ہے؟''

اس رشتہ دار کا حاسدانہ اعتراض سن کر میرے ایک دوست نے جو یہ بات چیت سن رہا تھا، مجھ سے یہ واقعہ بیان کیا تو میں نے کہا:

''آپ اس رشتہ دار کے اعتراض کا خیال نہ کیجیے یہ برادری ہے اور برادری کی یہ فطرت ہے کہ اگر تو انسان مالی اعتبار سے اچھی حالت میں ہو تو برادری کے لوگ حاسدانہ اعتراض کیا کرتے ہیں، اور اگر مالی حالت اچھی نہ ہو تو یہ مذاق اڑایا کرتے

ہیں۔اوراس رشتہ دار نے یہ خیال نہ کیا کہ جو شخص کار خریدنے پر تین ہزار روپیہ صرف کرسکتا ہے اس کے لیے چار پانچ ہزار روپیہ مکان یا زمین پر صرف کرنا کوئی مشکل کام نہیں۔مگر میں نہ تو اپنی زندگی میں کوئی جائیداد خریدوں گا اور نہ برادری کے اعتراضات ختم ہو سکتے ہیں کیونکہ یہ برادری ہے''۔

میں نابھ کی نظر بندی سے رہا ہوا تو اخبار ''ریاست'' جاری کرنے سے پہلے تین چار ماہ کے قریب حافظ آباد رہا کیونکہ بیکار تھا۔نہ کوئی ملازمت مل سکی' اور نہ ابھی ''ریاست'' جاری کیا تھا۔حافظ آباد کے اس قیام کے زمانہ میں موگا کے مشہور آئی سپیشلسٹ رائے بہادر متھرا داس پاہوہ بھی چند روز کے لیے اپنے وطن حافظ آباد آئے اور میں ان سے ملنے ان کے مکان پر گیا۔ان کے مکان پر ایک درجن کے قریب لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔جن کا مقصد یہ تھا کہ یہ ڈاکٹر صاحب کو مریض دکھانے کے لیے اپنے گھر لے جائیں۔میرے وہاں پہنچنے کے چند منٹ بعد ڈاکٹر صاحب وہاں موجود ان لوگوں کے ساتھ ان کے گھروں میں آنکھوں کے مریضوں کو دیکھنے کے لیے روانہ ہوئے۔میں بھی ساتھ ہو لیا مگر میں ان سب سے پیچھے تھا۔ڈاکٹر صاحب اور یہ لوگ بازار میں سے گزر رہے تھے کہ اس مجمع کو دیکھ کر ایک دکان پر بیٹھے ہوئے دو معمر اشخاص میں سے ایک نے دوسرے سے پوچھا کہ:

''یہ کون جا رہا ہے جس کے ساتھ اتنے لوگ ہیں؟''

تو دوسرے معمر شخص نے جواب دیا:

''یہ نانک پاہوے کا لڑکا متھرا داس پاہوہ ہے' جو موگا میں آنکھیں بناتا ہے اور ڈاکٹر ہے۔اس کے ساتھ وہ لوگ جا رہے ہیں جو اپنے گھروں میں آنکھوں کے مریضوں کو دکھانا چاہتے ہیں''۔

ڈاکٹر متھرا داس خطاب یافتہ رائے بہادر ہیں۔انہوں نے اپنی زندگی میں آنکھوں کے لاکھوں آپریشن کیے۔بین الاقوامی شہرت کے مالک ہیں۔امریکہ اور

انگلستان کے ڈاکٹر ان سے آنکھوں کے آپریشن سیکھنے کے لیے ان کے پاس آتے ہیں۔ یہ وائسرائے کے بھی آنریری سرجن ہیں اور ہندوستان کا کوئی ایسا صوبہ نہیں جہاں کے لوگوں کے انہوں نے آپریشن نہ کیے ہوں۔ اور کسی صوبہ کا کوئی ڈاکٹر ایسا نہیں جو ان کو نہ جانتا ہو اور ان کی عزت واحترام نہ کرتا ہو۔ اور انکے والد مرحوم ڈاکٹر نانک چند پاہوہ بھی اپنے زمانے میں ایک کامیاب ڈاکٹر تھے۔ جو زندگی بھر مختلف ہسپتالوں میں ڈاکٹر رہے۔ مگر بازار میں بیٹھے ہوئے دو معمر اشخاص کی نظروں میں تو رائے بہادر ڈاکٹر متھر اداس تو متھر اداس پاہوہ ہیں' اور ان کے والد مرحوم ڈاکٹر نانک چند پاہوہ ''نانک پوہوہ'' کیونکہ یہ دونوں معمر بزرگ برادری میں سے تھے اور برادری کے لوگ اپنی برادری کے کسی فرد کی تعریف نہیں کر سکتے چاہے یہ فرد پیغمبر ہی کیوں نہ ہو۔

برادری کے سلسلہ میں ایک اور لطیفہ یاد آ گیا جو اگر چہ ایک لطیفہ ہی ہے۔ مگر دلچسپ بہت ہے۔ ایک جہاں گرد یورپ سے کسی ملک سے تمام دنیا کی سیر کے لیے گیا۔ اس کے پاس مختصر سے سامان کے علاوہ ایک کتا بھی تھا۔ تمام ممالک کی سیر کرنے کے بعد جب یہ جہاں گرد واپس پہنچا تو لوگوں نے اس سے مختلف ممالک کے حالات پوچھے۔ جس کے جواب میں اس نے بتایا کہ یہ ایرا بھی گیا وہاں کے لوگوں نے اس کو ایرانی کھانے کھلائے۔ ہندوستان گیا تو وہاں اس نے ہاتھی کی سواری کی۔ اور یہ والیان ریاست کا مہمان ہوا۔ برما گیا تو وہاں اس نے بدھ مہاتما کے بڑے بڑے بت دیکھے۔ افغانستا نگیا تو وہاں اس نے دنبے کا پلاؤ کھایا۔ تبت گیا تو لاما نے روپیہ دیا۔ نیپال گیا تو وہاں کے لوگوں نے سونے کی مہریں دیں۔ اور چین گیا تو وہاں اس کو چینی کھانے دیے گئے جو بہت لذیذ تھے۔ یہ لوگ جب جہان گرد سے تمام ممالک کے حالات دلچسپی سے سن چکے تو انہوں نے جہاد گرد کے کتے سے پوچھا کہ:

''بتاؤ کہ کیا تمہاری بھی ان ممالک میں بہت خاطر تواضع ہوئی؟''

اس سوال کے جواب میں کتے نے کہا:

''میں جس گاؤں یا شہر گیا اپنے مالک کے ساتھ گیا۔ اس گاؤں یا شہر میں داخل ہوتے ہی میری برادری یعنی دوسرے کتوں نے بھی بھونکتے ہوئے میرا خیر مقدم کیا۔ اور یہ اس وقت تک میرا پیچھا کرتے ہوئے بھونکتے رہے جب تک کہ میں اس گاؤں یا شہر سے باہر نہیں نکلا۔ میری برادری نے کہیں مجھے آرام سے نہ رہنے دیا''۔

اوپر کا واقعہ گو ایک لطیفہ ہی ہے۔ مگر اس کتے کا اس برادری نے جو خیر مقدم کیا وہ خلاف توقع نہیں۔ کیونکہ ہر نسل ہر قوم ہر گاؤں اور ہر شہر کی برادری کے لوگ اپنی برادری کے دوسرے لوگوں سے یہی سلوک کیا کرتے ہیں۔ اور برادری کے ہاتھوں محفوظ رہنے کی صرف ایک ہی صورت ہے' کہ انسان برادری کے لوگوں کو نہ تو دشمن بنائے اور نہ ان کو دوست سمجھے تا کہ ان لوگوں کو حسد اور مخالفت کا موقع نہ ملے۔ ان کی دوستی اور دشمنی دونوں نقصان کا باعث ہیں۔

سرمایہ داروں کی جیب تراشیاں

یکم جنوری ۱۹۵۸ء کو مرحوم مولانا ابوالکلام آزاد کے طلب کرنے پر میں جب ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور باتیں شروع ہوئیں تو آپ نے دریافت کیا کہ اخبار ''ریاست'' کی مالی پوزیشن کیا ہے؟ انکے اس سوال کے جواب میں میں نے بتایا کہ چھ ہزار روپیہ کے قریب تو قرضہ ہے اور پانچ سو روپیہ کے قریب نقصان ہے۔اور اس پانچ سو روپیہ ماہوار میں سے اڑھائی سو روپیہ ماہوار ایک دوست دیتے ہیں تو آپ نے فرمایا:

''سردار صاحب ہمارے پاس کافی تعداد میں برلے اور ڈالمیے ہیں۔مگر ان سرمایہ داروں سے جب کسی نیک کام کے لیے روپیہ دینے کو کہا جائے تو یہ سرمایہ دار پانچ ہزار روپیہ تب دیتے ہیں جب انکو پچیس ہزار روپیہ کے مفاد کی توقع ہو۔اور یہ دس ہزار روپیہ تب دیتے ہیں جب ان کو پچاس ہزار روپیہ کے مفاد کی توقع ہو۔یہ لوگ بغیر مفاد کے ایک پیسہ بھی نہیں دیتے۔چاہے کوئی پیغمبر بھی ان سے روپیہ طلب کرے''۔

میں نے مرحوم مولانا سے کسی مالی امداد کی درخواست نہ کی تھی یہ خود ہی انہوں نے فرمایا کیونکہ وہ بہت ہی ہمدرد اور قدرشناس تھے اور ان کا دل دوسروں کی مشکلا سے متاثر ہو جاتا تھا۔اس کے بعد دوسرے موضوع پر باتیں شروع ہو گئیں۔

سرمایہ داروں کی ذہنی کیفیت کے متعلق مولانا مرحوم نے جو کچھ فرمایا فی الحقیقت سرمایہ داروں کی یہ فطرت ہے مگر سوال یہ ہے کہ پبلک کاموں کے لیے سرمایہ داروں سے روپیہ لینا گناہ ہے یا ثواب؟

کیونکہ سیاسی، مذہبی، تعلیمی، اور سوشل اصلاح کے میدان میں غالباً صرف ایک پنڈت جواہر لال نہرو ہی ایسی شخصیت ہیں جنہوں نے اپنی زندگی میں کسی بھی سرمایہ دار سے کبھی ایک پیسہ طلب نہ کیا اور اگر سرمایہ داروں نے ان کو روپیہ دیا تو بغیر طلب کیے اپنی اغراض کے لیے پنڈت نہرو کے کسی سرمایہ دار سے کسی قومی کام یا تحریک کے

لیے روپیہ طلب نہ کرنے کی وجہ غالباً یہ ہے کہ آپ کے پاس اپنی عمر کے اخراجات کے لیے کمپنیوں کے حصوں کی صورت میں کافی روپیہ موجود ہے جو آپ کے والد مرحوم نے چھوڑا تھا۔ آپ مالی اعتبار سے کسی کے محتاج نہیں۔ اور اگر آپ کو سفر کرنے دوسروں کو دعوت دینے یا کسی دوسری جگہ خرچ کرنے کی ضرورت ہو تو آپ آسانی سے اپنا ذاتی روپیہ صرف کر سکتے ہیں چنانچہ میں نے اپنی زندگی میں سوائے پنڈت جواہر لال نہرو کے دوسرا کوئی ایسا لیڈر یا پبلک ورکر نہیں دیکھا جس نے کسی نہ کسی صورت میں سرمایہ داروں سے روپیہ حاصل نہ کیا ہو۔ پنڈت مالویہ گوسوامی گنیش دت، سر سید احمد اور ماسٹر تارا سنگھ وغیرہ نے تو لاکھوں نہیں بلکہ کروڑوں روپیہ سرمایہ داروں سے حاصل کیا۔ اور اس روپیہ میں انہوں نے اپنی ذات پر ایک پیسہ بھی صرف نہ کیا۔ یہ روپیہ لیتے رہے اور صرف پبلک تحریکوں اور پبلک کاموں کے لیے چنانچہ سرمایہ داروں کی اس جیب تراشی کے سلسلہ میں چند واقعات بیان کرتا ہوں۔ جن کو یقیناً ثواب قرار دینا چاہیے۔

مرحوم مسٹر رفیع احمد قدوائی کو سرمایہ داروں سے روپیہ لینے اور اس روپیہ کو پبلک تحریکوں یا ضرورت مندوں میں صرف کرنے کے اعتبار سے پہلی صف کے لوگوں میں شمار کیا جانا چاہیے۔ کانگرس کے پچھلے الیکشن کے زمانہ میں یو۔ پی کانگرس کو روپیہ کی سخت ضرورت تھی۔ اور ہر سرمایہ دار کو اس کوشش میں تھا کہ یہ کانگرس کا ٹکٹ حاصل کر کے اسمبلی یا پارلیمنٹ میں جائے۔ کیونکہ اس الیکشن کے زمانہ میں ملک میں صرف کانگرس ہی ایک ایسی پارٹی تھی جو پبلک میں مقبول تھی اور جو عوام سے ووٹ حاصل کر سکتی تھی۔ چنانچہ آپ روپیہ جمع کرنے کے لیے کانپور گئے جہاں کہ درجنوں کی تعداد میں کروڑ پتی کارخانہ دار تھے۔ آپ کے وہاں پہنچنے کے بعد ہر سرمایہ کار کی کوشش شروع ہوئی کہ وہ مسٹر قدوائی کو خوش کرے، اور خوش کرنے کے بعد ان سے الیکشن کا ٹکٹ حاصل کرے۔ چنانچہ ایک سرمایہ دار آپ کے پاس پہنچے۔ اور سرمایہ دار نے

ایک لاکھ روپیہ الیکشن فنڈ میں قدوائی صاحب کو دیا۔ اور قدوائی صاحب نے شکریہ کے ساتھ چیک کو قبول کر لیا۔ اس سرمایہ دار نے روپیہ دینے کی غرض یہ تھی کہ اس کو کانگرس کا ٹکٹ ملے۔ اس سے اگلے روز ایک دوسرے سرمایہ دار تشریف لائے اور اس سرمایہ دار نے بھی قدوائی صاحب کو ایک لاکھ روپیہ دیا اور ان کی غرض بھی یہی تھی کہ یہ کانگرس کا ٹکٹ حاص کرے۔ اس سرمایہ دار کے روپیہ دے کر چلے جانے کے بعد قدوائی صاحب کے ایک ہمراہی نے جو لکھنو میں قدوائی صاحب کے ساتھ آئے تھے قدوائی صاحب سے کہا:

''قدوائی صاحب! سیٹ تو صرف ایک ہے اور الیکشن کے لیے ایک ایک لاکھ روپیہ آپ نے دونوں سیٹھوں سے لے لیا آپ ٹکٹ کس کو دیں گے؟''

اس کے جواب میں آپ نے اپنے ہمراہی سے کہا:

''مین نے تو کسی سے بھی ٹکٹ دینے کا وعدہ نہیں کی اور میں ان دونوں میں یکسی کو بھی ٹکٹ نہ دوں گا۔ کیونکہ یہ دونوں ہی ٹکٹ لینے کے اہل نہیں ہیں۔ اور اگر یہ خود ہی غلط امیدوں پر اپنی جیب تراشی کرنا چاہتے ہیں تو ہم ان دونوں کی جیب تراشی کیوں نہ کریں اور انکی جیب تراشی کے ثواب کو کیوں ٹھکرایا جائے؟''

قدوائی صاحب سرمایہ داروں کی جیب تراشی کرنے اور جیب تراشی کے اس روپیہ کو پبلک کاموں پر صرف کرنے کے اعتبار سے کس قدر فیاض تھے اس کا اندازہ صرف ایک واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے:

لکھنو کا ایک روزانہ انگریزی اخبار مالی مشکلات میں مبتلا تھا۔ اس اخبار کے مینجر دہلی آئے اور قدوائی صاحب سے ملے۔ اپنی مالی مشکلات کا اظہار کیا تو قدوائی صاحب نے پوچھا۔

''آپ کو فی الحال کتنے روپیہ کی ضرورت ہے؟''

اخبار کے مینجر نے کہا۔

’’تین ماہ سے سٹاف کو تنخواہیں نہیں دی گئیں۔اور اخبار بھی کچھ مقروض ہے فی الحال ساٹھ ہزار روپیہ کی ضرورت ہے۔‘‘

قدوائی صاحب نے کہا۔

’’اچھا‘‘۔

(کیونکہ جو شخص بھی ان سے روپیہ لینے آتا آپ کسی سے کوئی وعدہ نہ کرتے اور اچھا کہنے کا مطلب ہی یہ ہوا کرتا کہ روپیہ ضرورت مند کے پاس پہنچ جائے گا)

چنانچہ چار روز بعد قدوائی صاحب کا آدمی لکھنو پہنچا اور جس نے اخبار کے مینجر کو ساٹھ ہزار روپیہ دے دیا۔

اور اس اخبار کا ہی کیا سوال ہے‘یہ واقعہ حیرت انگیز اور دلچسپ ہے ک آپ نے اپنی زندگی میں سرمایہ داروں سے کروڑوں روپیہ حاصل کیا اور امداد حاصل کرنے والے کانگرسی‘سوشلسٹ ہندومہاسبھائی‘ کمیونسٹ اور جن سنگھی بھی ہوے۔کیونکہ آپ جب کسی کی امداد کرتے تو یہ دیکھنا گناہ سمجھتے کہ امداد حاصل کرنے والے ضرورت مند کے ذاتی خیالات اور عقیدہ کیا ہے۔

امرتسر میں ایک بہت بڑا سرمایہ دار ٹرانسپورٹ کا کاروبار کرتا تھا۔جسے قماربازوں کو گورو سمجھا جاتا ہے کیونکہ اس کا بیان ہے کہ چند برس پہلے امرتسر میں اکثر قمارباز اس کے زیر اثر تھے۔پچھلے انتخابات مس کانگرس کے کچھ لیڈر گیانی گورمکھ سنگھ وغیرہ اس کے پاس گئے اور الیکشن کی امداد دینے کے لیے کہا۔اس سرمایہ دار نے جواب دیا کہ:

’’یہ ایک لاکھ روپیہ کانگرس کو انتخابات کے سلسلہ میں دینے کے لیے تیار ہیں مگر شرط یہ ہے کہ جب پنڈت جواہر لال نہرو امرتسر آئیں تو ان کے گھر پر کھانا کھانے کے لیے تشریف لائیں‘‘۔

چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ پنڈت جواہر لال نہرو امرتسر گئے تو اس سرمایہ دار کے ہاں کھانے پر تشریف لے گئے۔کیونکہ کھانے پر جانے کی فیس ایک لاکھ روپیہ مقرر ہو چکی

تھی گو پنڈت نہرو کو کچھ علم نہ تھا کہ انکے کھانے پر جانے کی شرط کیا طے ہو چکی ہے۔ اور ایک بیان کے مطابق جب پنڈت جی کو اصل حالات معلوم ہوئے تو ان کو بے حد افسوس ہوا۔ مگر یہ افسوس لاحاصل ہے کیونکہ پچھلے تیرہ برس کے اندر کانگرس گورنمنٹ پبلک میں وہ مرتبہ حاصل کر چکی ہے جو تیرہ برس پہلے برٹش گورنمنٹ کو ہندوستان میں حاصل تھا۔ اور کانگرس کے لیڈر آج اتنے ہی خودغرض اور زر پرست ہیں جتنے کہ آج سے تیرہ برس پہلے رائے بہادر خان بہادر اور سردار بہادر تھے۔

دہلی کے ایک کروڑ پتی بنیے چند برس ہوئے پاکستان گئے تو وہاں آپ نے فلیٹی ہوٹل میں قیام کیا۔ آپ شراب کے رسیا تھے اور عورتوں سے بھی سرمایہ دارانہ دلچسپی فرمایا کرتے تھے۔ لاہور میں بغیر پرمٹ کے شراب کی ممانعت تھی۔ آپ بمبئی میں ایک فلم ایکٹرس کے ساتھ فلیٹی ہوٹل میں شراب پی رہے تھے کہ پولیس نے چھاپہ مارا اور آپ گرفتار ہوئے اور ابھی یہ معاملہ صرف پولیس کے چھاپہ مارنے والے افسر اور آپ ہی کے درمیان تھا کہ آپ نے دس ہزار روپیہ وہ پلیس افسر کو نذر کیا اور آپ کو چھٹکارا حاصل ہوا۔ کیونکہ ایک بنیا اپنی جیب تراشی کراتا ہے تو صرف اس وقت جب کہ یا تو اسے اپنے بے عزت ہونے کا خطرہ ہو یا اس کو ایک روپیہ کے دس روپیہ ہونے کی توقع ہو۔

رائے بہادر لالہ ایشر داس ساہنی پنجاب کے بہت بڑے سرمایہ دار تھے جن کے پاس جنگلات کے لاکھوں روپیہ کے ٹھیکے اور انشورنس کمپنی کے مالک تھے۔ ایشر داس ساہنی کے صاحبزادہ مسٹر دیوی چند ساہنی پاکستان کے مرحوم وزیر اعظم نواب زادہ لیاقت علی خاں کے ہم زلف ہیں۔ یعنی مسز دیوی چند اور بیگم لیاقت علی دونوں حقیقی بہنیں ہیں جو الموڑہ کے ایک عیسائی خاندان کی لڑکیاں ہیں۔ رائے بہادر یشر داس ساہنی کی کء برس تک اخبار ''ریاست'' کے خریدار رہے اور آپ اس اخبار کو بہت پسند فرماتے تھے۔ آپ اپنے لکڑی کے کاروبار کیسلسلہ میں ایک بار ہردوار گئے اور

وہاں اپنے ایک ممبر مرچنٹ دوست سردار حکم سنگھ سے ملے تو سردار صاحب نے دیکھا کہ رائے بہادر کے ہاتھوں میں اخبار ''ریاست'' ہے سردار حکم سنگھ بھی ریاست کے بہت مداح اور قدر دان تھے۔ چنانچہ اخبار ''ریاست'' کے متعلق ان دونوں کے درمیان بات چیت ہوتی رہی اور سردار حکم سنگھ نے رائے بہادر سے کہا:

''اگر آپ اخبار ریاس کے اتنے ہی مداح ہیں اور خود کروڑ پتی بھی ہیں تو پھر اس اخبار کی مالی امداد کیوں نہیں کرتے؟ جس صورت میں کہ یہ اخبار مالی مشکلات میں مبتلا ہے''۔

رائے بہادر نے سردار حکم سنگھ کے اس خیال کو سن کر کہا کہ:

''ہاں میں ضرور امداد کروں گا ایسے اچھے اخبار کی امداد ہونی چاہیے''۔

یہ سن کر سردار حکم سنگھ نے کہا کیا امداد کریں گے؟

تو رائے بہادر نے مخیّرانہ اور فاتحانہ انداز میں کہا۔

''میں اس اخبار کو ایک سو روپیہ بھیج دوں گا''۔

یہ سن کر سردار حکم سنگھ نے کہا:

''رائے بہادری صاحب ایک سو روپیہ بھیجنے کی بیوقوفی نہ کرنا سینکڑوں روپیہ تو دیوان سنگھ خود دوسرے لوگوں کو دے دیا کرتا ہے۔ اگر بھیجنا ہے تو چند ہزار روپیہ بھیجیے''۔

رائے بہادر صاحب سردار حکم سنگھ کے الفاظ سن کر چپ ہو گئے۔ سردار حکم سنگھ نے راقم الحروف کو جب یہ واقعہ سنایا تو راقم الحروف نے سردار حکم سنگھ سے کہا:

''سردار صاحب! دنیا کا ہر سرمایہ دار پبلک ورکرز اور اخبارات کو گداگر سمجھا ہے اور ان سرمایہ داروں کے خیال میں پبلک کام کرنے والوں کی قیمت چند سو روپیہ سے زیادہ نہیں۔ ہاں یہ سرمایہ دار صرف اس صورت میں اپنی جیب کو ترشوانے کے لیے پیش کر دیتے ہیں جب ان کو پبلک ورکرز کی سفارش پر ایک روپیہ کے دس روپیہ بننے کی

توقع ہو''۔

یو۔پی کے موجودہ وزیر اعلیٰ مسٹر گپتا نے ابھی حال ہی میں ایک جگہ تقریر کرتے ہوئے کھلے الفاظ میں کہا ہے کہ:

''میں بہت بڑا گداگر ہوں جس نے کانگرس کے لیے سرمایہ داروں سے اپنی زندگی میں لاکھوں روپیہ حاصل کیا''۔

اس بیان کے ساتھ اگر مسٹر گپتا یہ بھی فرما دیتے تو بہت اچھا ہوتا کہ:

''سرمایہ داروں نے اپنی اس لاکھوں روپیہ کی خیرات کے معاوضہ میں کتنے کروڑ روپیہ]پیدا کیا۔ کیونکہ ایک سرمایہ دار بھی ایسا نہیں مل سکتا جو روپیہ دیتے وقت یہ نہ سوچتا ہو کہ روپیہ صرف کرنے کی صورت میں کتنے گنا زیادہ روپیہ واپس آئے گا؟''

بہت برس ہوئے جس زمانہ میں جوش ملیح آبادی دہلی میں تھے اور آپ ابھی پاکستان نہ گئے تھے تو آپ کے ہاں چند دوست بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ باتوں باتوں میں جب اخبار ''ریاست'' کا ذکر آیا تو ایک دوست نے کہا کہ:

''اخبار ریاست بہت ہی بلند تعصب سے پاک اور بے خوف پرچہ ہے۔ اگر یہ اخبار والیان ریاست سے روپیہ لینے کی آلائش سے بھی محفوظ رہتا تو اس کے ایڈیٹر کو ایک مجاہد کا درجہ حاصل ہوتا''۔

اس اعتراض کے جواب میں جوش صاحب نے کہا:

''مجھے علم نہیں کہ دیوان سنگھ والیان ریاست سے روپیہ لیتا ہے یا نہیں؟ اور اگر لیتا ہے اور اس الزام کو درست مان لیا جائے تو کیا حرج ہے؟ یہ سوروں کا شکار کرتا ہے یعنی اس نے کسی غریب گائے کو ذبح نہیں کیا''۔

یعنی جوش صاحب کے خیال میں سرمایہ دار والیان ریاست سے روپیہ لینا سوروں کا شکار تھا' جسے ثواب قرار دیا جانا چاہیے۔ کیونکہ یہ سور غریب کسانوں کی کھیتیاں برباد کر دیتے ہیں۔

اگر پچھلی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو یہ ثابت ہوگا کہ گزشتہ ہر زمانہ میں جیب تراشیاں کرنے والے سرمایہ دار کی جیب تراشیاں کرنے کا ثواب حاصل کرتے ہیں۔ چنانچہ اس پچھلی جنگ کے زمان میں ڈپٹی کمشنروں اور دوسرے حکام نے قرضہ جنگ کے نام پر سرمایہ داروں کی جو جیب تراشیاں کیں ان کا اندازہ صرف ایک واقعہ ہی سے لگایا جاسکتا ہے:

دہلی کے ایک پنجابی مجسٹریٹ (جن کی پشت پر ڈپٹی کمشنر اور چیف کمشنر کی امداد تھی) دہلی کے سرمایہ داروں کو اپنی کوٹھی پر طلب فرماتے اور کھلے الفاظ میں کہتے کہ:

''لالہ جی! قرضہ جنگ کے لیے پچاس ہزار روپیہ دیتے ہو کہ یا حوالات میں جانا پسند کرتے ہو؟''

لالہ جی نے اپنی غربت اور کاروبار کے بند ہونے کا ڈیفنس پیش کرتے۔

مجسٹریٹ صاحب کی دھمکیاں اور رائے صاحب کے خطاب کا لالچ دیتے اور آخر پچیس تیس ہزار روپیہ میں فیصلہ ہو جاتا۔

یعنی سرمایہ داروں کی جیبیں نہ صرف کانگرس کے ہاتھوں سے محفوظ نہیں یہ انگریزوں کے زمانہ میں بھی تراش ہوتی رہیں۔

سرمایہ داروں کا روپیہ صرف عزت کے حاصل کرنے یا اس خطرہ میں پڑنے کی صورت میں جیبوں سے باہر نکلتا ہے یعنی ایک سرمایہ دار حکومت کے حلقہ میں عزت حاصل کرنے یا بیاہ شادی کے سلسلہ میں برادری سے واہ واہ حاصل کرنے کے لیے روپیہ صرف کرتا ہے' یا یہ اس وقت جب اس پر کوئی مقدمہ قائم ہو' اور اس کی عزت خطرہ میں ہو۔ چنانچہ ہندوستان کے کروڑ پتی سیٹھ رام کرشن ڈالمیا نے لیڈر بننے اور اخبارات جاری کرنے پر کروڑوں روپیہ خرچ کیا جب ان پر فوجداری مقدمات قائم ہوئے تو آپ نے لاکھوں روپیہ وکیلوں کو بطور فیس ادا کیے۔ اور آپ کو جب ہائیکورٹ نے قید کی سزا کا حکم سنایا تو وہ منظر ایک تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ جب آپ نے پنجاب

ہائیکورٹ کے چیف جسٹس مسٹر کھوسلہ کے سامنے ہاتھ باندھ کر کہا تھا:

''میں نے کروڑوں روپیہ پبلک فنڈوں میں دیا۔ مجھ پر صرف اتنا رحم کیا جائے کہ سپریم کورٹ میں اپیل کرنے کے زمانہ تک میری ضمانت لے لی جائے اور مجھے جیل نہ بھیجا جائے''۔

ہائیکورٹ نے آپ کی اس درخواست پر کوئی توجہ نہ دی اور قانون کا وقار قائم رکھا۔

ہاں اگر کسی کانگرسی وزیر کے اختیار میں ہوتا تو اس درخواست کو چند لاکھ روپیہ چندہ لینے کے معاوضہ میں منظور کر لیا جاتا۔

حضرت مسیح کا قول ہے کہ:

''سوئی کے ناکہ سے ایک اونٹ کا نکلنا ممکن ہے مگر کسی سرمایہ دار کا بہشت میں جانا ممکن نہیں''۔

اور گورونانک نے بھی کہا ہے کہ:

''دولت بغیر گناہ کیے جمع نہیں ہوسکتی۔ اور یہ مرنے کے بعد ساتھ نہ جائے گی''۔

مگر اس صورت میں کہ سرمایہ دار اپنی جیب تراشیاں پنڈت مالویہ مسٹر رفیع احمد قدوائی سوامی گنیش دت اور ماسٹر تارا سنگھ جیسے بے غرض پبلک لیڈروں کے ہاتھوں کرائیں تو ان کے گناہوں میں بہت حد تک کمی آسکتی ہے۔ اور بقول حضرت مسیح:

''سرمایہ دار گو بہشت میں تو نہ جائیں گے مگر جیب تراشی کے باعث ان کو پل صراط کے قریب کوئی نہ کوئی جگہ ضرور مل جائے گی''۔

گوسوامی گنیش دت کی گداگری اور فیاضیاں

موجودہ صدی میں ہندوستان نے جن بلند لوگوں کو پیدا کیا یہ ان میں گوسوامی گنیش دت بھی ایک اہم شخصیت ہیں۔ جنہوں نے اپنی زندگی میں درجنوں سکول کالج، مندر دھرم شالائیں، اور دوسری پبلک انسٹی ٹیوشنز قائم کیں۔ اور لاکھوں نہیں شاید کروڑہا روپیہ والیان ریاست سیٹھوں، شاہوکاروں اور کارخانہ داروں سے حاصل کر کے رفاہ عامہ پر خرچ کای۔ مگر جن کی ذاتی جائیداد ایک پیسہ کی بھی نہ تھی۔ اور شاید یہ یقین نہ کیا جائے گا کہ شام کو جب کھانے کا وقت ہوتا اور بھوک محسوس ہوتی تو آپ کسی اپنے دوست یا پڑوسی کو بھیج کر دو روٹیاں اور دال سبزی منگا لیتے۔ چنانچہ ایک سنیاسی درویش کی تعریف یہی ہے کہ اس کا اپنا اس دنیا میں کچھ نہ ہو اس کے پاس جو کچھ ہو وہ پبلک کے لیے ہو اور اس کا کھانا، پہننا، پینا، اوڑھنا، چلنا، پھرنا، سونا، جاگنا، بولنا اور سانس لینا صرف خدا کی مخلوق کے لیے وہ تو گوسوامی گنیش دت فی الحقیقت ایک سنیاسی یا درویش تھا۔

میں گوسوامی گنیش دت جی سے ذاتی طور پر واقف نہ تھا۔ اور صرف آپ کا نام سنا کرتا تھا۔ یا اخبارات میں پڑھتا۔ ایک روز آپ کے روزانہ اخبار ویر بھارت کے مینجر اور مدیر درگا پرشاد لاہور سے دہلی آئے اور انہوں نے بتایا کہ بھائی پرمانند نے ایک مضمون کے سلسلہ میں ایڈیٹر پرنٹر اور پبلشر ''ویر بھارت'' پر توہین عدالت کا مقدمہ دائر کیا ہوا ہے۔ یہ مقدمہ دیوان حکم چند مجسٹریٹ لاہور کی عدالت میں ہے۔ دیوان حکم چند کے بھائی پرمانند کے ساتھ دوستانہ تعلقات ہیں۔ ان دونوں کے آریہ سماج کی کالج پارٹی کے لیڈروں سے بھی گہرے تعلقات ہیں۔ اور بھائی جی پرمانند کے گوسوامی گنیش دت (مالک ویر بھارت) کے ساتھ تعلقات کشدہ ہیں۔ کیونکہ دیوان حکم چند سے ہمیں انصاف کی توقع نہیں اس لیے مقدمہ کو کسی دوسری عدالت میں تبدیل کرنے کے لیے ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سے میرے یعنی دیوان سنگھ

تعلقات ہیں اور میں ان ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سے کہوں کہ ی مقدمہ کسی دوسرے مجسٹریٹ کی عدالت میں تبدیل کر دیا جائے جہاں ملزموں کو انصاف مل سکے۔

مسٹر درکا پرشاد صرف اس غرض کے لیے ہی یہاں لاہور سے دہلی آئے تھے۔ انہوں نے جب یہ کہا تو میں کچھ پریشان سا تھا۔ جس کی دو وجوہات تھیں۔ ایک تو یہ کہ ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ بہت ہی دیانتدار اور انصاف پسند تھے۔ اور دوسرے بھائی پرمانند جی کے ساتھ میرے بھی گہرے تعلقات تھے اور ان کے لیے میرے دل میں انتہائی عزت واحترام کے جذبات تھے کیونکہ بھائی پرمانند جیسے لیڈر بھی ہندوستان نے کم پیدا کیے۔ یعنی ایک طرف تو بھائی پرمانند اور دوسری طرف گوسوامی گنیش دت دونوں محب الوطن دونوں انتہائی نیک اور دونوں ہی بلند شخصیتیں کہ جن کو مائیں کبھی کبھی ہی پیدا کرتی ہیں۔ کچھ سوچنے کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ میں اگر ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ لاہور سے سفارش کر رہا ہوں تو صرف مقدمہ کو ایک مجسٹریٹ کی عدالت سے دوسرے مجسٹریٹ کی عدالت میں بھیجنے کے لے تا کہ ملزم انصاف حاصل کر سکیں میں اصل مقدمہ میں تو سفارش نہیں کر رہا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ پنڈت درگا پرشاد کے ساتھ لاہور جاؤں۔ چنانچہ میں اسی رات فرنٹیر میل میں لاہور گیا پنڈت درگا پرشاد نے بہت چاہا کہ وہ میرا ٹکٹ بھی خریدیں مگر میں نے انکار کر دیا اور کہا کہ اگر انہوں نے میرا ٹکٹ خریدا تو میں نہ جاؤں گا۔ کیونکہ میں نے اپنی زندگی بھر اگر کسی دوست سے کبھی کوئی خدمت کی اور اس خدمت کے سلسلہ میں سفر کیا تو اخراجات اپنے پاس ہی سے کیے۔ کیونکہ میں اخراجات کے لیے روپیہ لے کر کسی کی خدمت کرنا کریکٹر کی ایک کمزوری سمجھتا ہوں۔ لاہور پہنچنے کے بعد میں وہاں برگنزا ہوٹل میں مقیم ہوا جو ریلوے سٹیشن کے بالکل قریب ہے کیونکہ میرا وہاں قیام اکثر اس ہوٹل میں ہی ہوتا ہوٹل میں پہنچنے کے بعد میں نے ایڈیشنل مجسٹریٹ (میں ان کا نام لکھنا مناسب

نہیں سمجھتا) کو ملنے کے لیے ٹیلیفون کیا تو انہوں نے جواب دیا کہ میں ابھی ان کے پاس چلا آؤں، وہ میرا انتظار کریں گے۔ میں ٹیکسی لے کر ان کی کوٹھی گیا۔ اور جب ان کی کوٹھی کے باہر پھاٹک کے اندر پہنچا تو (اتفاق حسنہ) سمجھیے کہ دیوان حکم چند مجسٹریٹ ان ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سے مل کر باہر نکل رہے تھے۔ یعنی جن کے خلاف میں شکایت کرنے گیا کوٹھی میں سب سے پہلے وہی مجھ کو ملے۔ میں کوٹھی میں پہنچا اور وزیٹنگ کارڈ بھیجا تو فوراً اندر بلا لیا گیا۔ معمولی بات چیت اور خیر و خیریت پوچھنے کے بعد میں نے لاہور آنے کی اصل غرض بیان کی تمام حالات سننے کے بعد انہوں نے فرمایا کہ اگر ملزموں کو فی الحقیقت دیوان حکم چند سے انصاف کی توقع نہیں تو وہ مقدمہ کو کسی دوسری عدالت میں تبدیل کر دیں گے۔ میں نے کہا کہ اگر انہیں انصاف کی توقع ہوتی تو میں دہلی سے لاہور صرف اس غرض سے آتا ہی نا۔ چنانچہ اگلے روز مقدمہ کے انتقال کی پیشی تھی۔ ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے یہ مقدمہ ایک دوسری عدالت میں تبدیل کر دیا اور میرے دہلی سے لاہور جانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ گوسوامی گنیش دت سے بھی گہرے دوستانہ تعلقات پیدا ہو گئے۔ اور آپ جب کبھی لاہور سے دہلی آتے تو دفتر ریاست میں تشریف لایا کرتے۔ اور دہلی میں آپ برلا مندر نئی دلی کے ایک کاٹج میں قیام فرماتے جہاں میں بھی جایا کرتا تھا۔

گوسوامی گنیش دت جی سناتن دھرم سبھا کے بہت بڑے لیڈر تھے۔ میرا خیال ہے کہ سناتن دھرمی حلقوں میں سوائے پنڈت مالویہ اور پنڈت دین دیال شرما دیا دکھان داچسپتی کے گوسوامی گنیش دت جی سے زیادہ کوئی لیڈر مقبول نہ تھا۔ اور مہاراجہ بھرت پور ار مہاراجہ پٹیالہ جیسے درجنوں والیان ریاست ک علاوہ پنڈت جواہر لال نہرو اور ہندوستان کے صدر مسٹر راجندر پرشاد بھی ان کا انتہائی ادب کرتے اور بعض تو ملنے پر ان کے پاؤں چھوتے۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ بغیر کسی پبلک خدمت انجام دینے کے اعتبار سے آپ صحیح معانی میں سنیاسی یا درویش تھے۔ آپ کی ذاتی جائیداد سوائے دو تین

جوڑے کھدر کے کپڑوں کے کوئی نہ تھی۔ آپ کے ادنی سے اشارے پر مہاراجہ پٹیالہ جیسے والیان ریاست اور سیٹھ برلا جیسے سرمایہ دار لاکھوں روپیہ آپ کے قدموں میں رکھدیتے۔ آپ کا ذاتی خرچ کبھی بھی نہ تھا۔ اور بھوک محسوس ہوتی تو آپ ملنے والوں یا پڑوسیوں کے گھروں سے کھانے کے لیے دو روٹیاں اور دال سبزی منگا لیتے۔ یعنی ہاتھوں سے کروڑوں روپیہ نکلنے کی صورت میں بھی اپنی زات کے لیے ایک گداگر یا فقیر تھے۔

گوسومی گنیش دت جی کو جوتش کے علم سے ایک قسم کا عشق تھا۔ چونکہ راقم الحروف کو بھی اسس علم پر پورا یقین ہے۔ میں نے ایک بات ان سے درخواست کی تھی کہ آپ ہندوستان میں جوتش کا ایک عدیم المثال کالج قائم کریں تاکہ یہ قابل قدر علم پھر عروج پر پہنچ سکے۔ آپ میری اس رائے سے قطعی متفق تھے اور آپ نے وعدہ کیا کہ آپ اس کا انتظام کریں گے۔ مجھے علم نہیں کہ آپ نے اس سلسلہ میں کوئی قدم اٹھایا تھا یا نہیں۔ اور آپ کی سیٹھ برلا کے روپیہ سے قائم کی گئی ہردوار کی نئی انسٹی ٹیوشن اور درسگاہ کے متعلق کوئی انتظام کیا یا نہیں؟ مگر میرا یقین تھا کہ اگر آپ چند برس اور زندہ رہتے تو ہندوستان میں جوتش کا علم پھر ایک بار بلندی پر پہنچ جاتا۔

میں جب نظر بند کیا گیا تو میری عدم موجودگی میں گورنمنٹ نے اخبار ریاست کو بھی بند کر دیا تھا۔ نظر بندی سے رہائی حاصل کرنے کے بعد میں جب دہلی پہنچا تو اخبار کو پھر سے جاری کرنے کی کوشش میں تھا۔ تو آپ کو لاہور میں کسی نے بتایا کہ اخبار ریاست پھر جاری ہو رہا ہے۔ مگر روپیہ کی دقت ہے۔ یہ سنکر آپ نے دو ہزار روپیہ کا چیک بھیجا جو دس روز بعد کی تاریخ کا پوسٹ ڈیٹ تھا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ اگر قلندر صفت بزرگ کے پاس روپیہ اس وقت موجود نہ تھا اور آپ نے چیک بھیجنے کے بعد دس روز کے اندر روپیہ کا انتظام کرلیا۔ اس چیک کے بھیجنے کے ایک ماہ بعد آپ کا پیغام پہنچا کہ اور روپیہ کی ضرورت ہو تو لکھو تاکہ بھیجا جائے۔ مجھے ضرورت نہ تھی میں نے

شکریہ ادا کرتے ہوئے لکھ دیا کہ اب ضرورت نہیں کیونکہ دوسرے دوستوں نے بھی روپیہ بھیج دیا اور کام چل رہا ہے۔ اس کے چند برس بعد آپ ایک روز دفتر ''ریاست'' میں تشریف لائے تو میں نے باتوں باتوں میں اس امداد کا شکریہ ادا کرنا چاہا۔ جو آپ نے اخبار کو دوبارہ جاری کرتے وقت کی تھی وت آپ نے بات کاٹ کر کہا۔

''دیوان سنگھ جی! آپ کرایہ تک لیے بغیر کسی غرض کے دہلی سے لاہور آئے اور آپ نے مقدمہ میں کوشش کی۔ کیا اس کی کوئی قیمت نہ تھی؟ ایسے اخلاص اور بے غرضی کی قیمت تو کروڑوں روپیہ سے بھی کم ہے بغیر غرض کے کام آنے والے کہاں ملتے ہیں؟''

میں نے جب اخبار ریاست کو بند کر کے اپنی زندگی کسی پہاڑی مقام پر گزارنے کا فیصلہ کر لیا اور میں سوچ رہا تھا کہ کانگڑہ کے پہاڑوں میں جاؤں یا مالابار (مدراس) کے علاقہ میں یا ڈیرہ دون کے قریب موجودہ جگہ یعنی راجپور میں تو آپ یہ سن کر بہت خوش ہوئے اور آپ نے نہ صرف مجھے ہردوار (جہاں آپ مقیم تھے) قیام کرنے کی دعوت دی بلکہ کہلا بھیجا کہ آپ وہاں بغیر ایک پیسہ خرچ کیے میرے لیے کچھ زمین کا بھی انتظام کریں گے۔

آپ نے اپنے ایک معتمد سے کہا کہ تم کرایہ کے لیے ایک سو روپیہ لے کر دہلی جاؤ اور دیوان سنگھ کو یہاں ہردوار لاؤ تا کہ اس سے یہاں قیام کرنے کے لیے کہا جائے اور مشورہ دیا جائے کہ اس معتمد نے حیران ہو کر پوچھا کہ ایک سو روپیہ کی کیا ضرورت ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ تم دیوان سنگھ کو جانتے نہیں اس ے پاس اکثر پیسہ نہیں ہوتا۔ یہ ایک سو روپیہ اس کو کرایہ اور اخراجات کے لیے دے دینا۔ یہ ایک سو روپیہ کے بھیجنے کی ہدایت کے متعلق مجھے مسٹر جمنا داس اختر ایڈیٹر ''سویرا'' نے گوسوامی جی کے انتقال کے بعد فرمایا۔ کیونکہ گوسوامی جی میرے پاس اپنا آدمی بھیجنے والے تھے کہ انکا انتقال ہو گیا۔

گوسوامی گنیش دت آج دنیا میں موجود نہیں ہیں۔ اور اس وقت بہت کم لوگوں کو

ان کا قدر دان قرار دیا جا سکتا ہے۔مگر چند سو برس کے بعد کی نسلیں اس درویش سنیاسی کی قدر کریں گی۔کیونکہ مشرقی ممالک میں اگر ان بڑی شخصیتوں کی پرستش ہوتی ہے تو سینکڑوں برس بعد یعنی انکی زندگی میں یا ان کے مرنے کے کچھ عرصہ بعد ان کو قدر نہیں ہوا کتی۔جس کا ثبوت ہے کہ حافظ شیرازی اور غالب جیسے شاعر منشی پریم چند جیسے افسانہ نویس حسرت موہانی جیسے محب الوطن لیڈر اور سوامی رام تیرتھ جیسے ریفارمر (ان سوامی رام تیرتھ جن کے متعلق یہ واقعہ ہے کہ آپ لاہور کے ایک رائے بہادر کروڑ پتی سرمایہ دار کے لڑکے کو پڑھاتے تھے۔اور آپ نے اس کروڑ پتی سے ہردوار جانیکے لیے پچاس روپیہ بطور ایڈوانس یا قرضہ لینا چاہا تو اس رائے بہادر کروڑ پتی نے پچاس روپیہ دینے سے انکار کر دیا تھا) اپنی زندگی میں تو تنگ دست رہے اور ان ان کے نام کی اکیڈمیاں اور آشرم جاری کیے جا رہے ہیں اور ان کی قبروں اور سادھیوں پر پھول چڑھائے جا رہے ہیں۔

گوسوامی گنیش دت اور میرے تعلقات کے سلسلہ میں سب سے زیادہ اور قابل غور اور قابل تقلید مسئلہ یہ ہے کہ اگر تو ان کے نمائندہ پنڈت درگا پرشاد کے ساتھ جاتے ہوئے میں ان سے کرایہ یا حق الخدمت کے طور پر کچھ وصول کرتا تو میرے اور گوسوامی جی کے تعلقات میرے لاہور جانے کے بعد اگلے روز ہی ختم ہو جاتے۔گوسومی جی کے دل میں میرے لیے عزت واحترام کے جذبات کا سوال ہی نہ تھا بلکہ آپ مجھے کرایہ کا ایک ٹٹو سمجھتے۔مگر چونکہ اگر ان کی خدمت کی گئی تو بغیر کسی غرض یا معاوضہ کے۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ اس بے غرض خدمت کو اپنی زندگی کے آخری لمحوں تک نہ بھولے اور اخبار ''ریاست'' کی مالی پریشانیوں میں بھی مفید ثابت ہوئے۔

چنانچہ طویل تجربہ کے بعد میری رائے ہے کہ جو لوگ اپنے دوستوں یا کسی کی بھی خدمت انجام دیں تو وہ خدمت انجام دیتے وقت اس خدمت کا معاوضہ حاصل کرنے کے خیال کو کمین پن سمجھیں۔بلکہ اگر وہ حق الخدمت کے خیال کو اپنے دل میں جگہ

دینے پر مجبور ہیں اور اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے تو بہتر یہ ہے کہ خدمت انجام دینے سے انکار کر دیں۔ اور اس میدان میں کبھی قدم نہ رکھیں۔ کیونکہ میرا ابھی یہ تجربہ ہے کہ بغیر کسی غرض کے خدمت انجام دینے کی صورت میں اس خدمت کا پچاس یا سو گنا زیادہ معاوضہ نصیب ہوتا ہے۔ اور غرض کے ساتھ معاوضہ وصول کرنے کی صورت میں ٹٹو کے کرایہ سے زیادہ کچھ نہیں ملتا۔

اب دیوان حکم چند مجسٹریٹ کے متعلق بھی سن لیجیے جن کے خلاف میں نے ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سے شکایت کی تھی۔ اپ آج کل انبالہ میں مقیم ہیں۔ اکثر دہلی آیا کرتے ہیں اور جب دہلی آتے ہیں تو رائے بہادر ڈاکٹر متھرا داس صاحب کے ہاں مقیم ہوتے ہیں۔ ادھر میرے بھی ڈاکٹر صاحب کے ساتھ گہرے تعلقات نیاز مندانہ تعلقات ہیں۔ اور میں بھی انکے ہاں جایا کرتا تھا۔ ایک روز کھانے کی میز پر دیوان حکم چند اور میں دونوں بیٹھے ہوئے تھے کہ باتیں ہو رہی تھیں تو مجھے لاہور کا واقعہ یاد آیا اور وہ منظر میرے ذہن میں تازہ ہو گیا۔ جب دیوان حکم چند تو ملاقات کے بعد ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی کوٹھی سے نکل رہے تھے۔ اور میں ان کے خلاف شکایت کرنے کے لیے اس کوٹھی میں داخل ہو رہا تھا۔ اس خیال کے آتے ہی میں بے اختیاری کے عالم میں مسکرا دیا۔ مگر میری اس مسکراہٹ کو دیوان صاحب یا کسی دوسرے نے محسوس نہیں کیا۔ دیوان صاحب فطرتاً بہت نیک شخصیت ہیں۔ اور یہ شاندار بھائی پرمانند والا مقدمہ میں بھائی پرمانند کی رعایت نہ کرتے۔ مگر کیا کیا جائے؟ بعض اوقات نیک لوگوں کے خلاف بھی دلچسپی لینی ہی پڑتی ہے۔ اور بھائی پرمانند بھی انتہائی نیک تھے۔ ان تمام واقعات کا خیال کرتے ہوئے کبھی کبھی دعا کر لیا کرتا ہوں، کہ خدا مجھے میرے گناہ معاف کر دے کیونکہ میں نے اپنی زندگی میں کئی نیک لوگوں کے ساتھ مذاق کیے یا ان کی مخالفت کی۔

☆☆☆

طوائفوں میں دیویاں

پرجا سوشلسٹ پارٹی کے لیڈر میر مشتاق احمد کے ساتھ فروز پور جیل میں کانگرسی لیڈروں کے متعلق بات چیت ہو رہی تھی۔ تو میں نے میر صاحب سے کہا:

''حیرانی کی بات ہے کہ اکثر کانگرسی لیڈر اور ورکر کئی کئی برس تک مہاتما گاندھی کے ساتھ کام کرنے کے بعد بھی بلند نہ ہو سکے' اور ان کی ذہنیت پست ہی رہی''۔

تو میر صاحب نے خوب کہا تھا:

''جس طرح کائی سالہا سال تک دریا کے کنارے پانی میں رہنے کے بعد بھی کائی ہی رہتی ہے یہ کانگرسی لیڈر اور ورکر بھی سیاہی کائی ہیں جو مہاتما گاندھی کے ساتھ سالہا سال تک کام کرتے رہے مگر ان پر کوئی اثر نہ ہو سکا۔ اور یہ بلند نہ ہوئے''۔

یہ درست ہے کہ اکثر کانگرسی لیڈر سالہا سال تک مہاتما گاندھی کے ساتھ کام کرنے اور کانگرس میں رہنے کے بعد بھی بلند نہ ہو سکے۔ اور کریکٹر کے لحاظ سے یہ ادنیٰ قسم کے رشوت خور اور بلیک مارکیٹیے ہیں۔ مگر میری رائے میں ان لوگوں کو بلند ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ جو خود بلند ہونا چاہیں۔ اور میرا تجربہ تو یہ ہے کہ طوائفوں کی ادنیٰ اور قابل نفرت سوسائٹی میں بھی بعض ایسی شخصیتیں مل سکتی ہیں جن کی پاجا یا پرستش کی جانی چاہیے۔ چنانچہ میں اپنے ذاتی تجربہ کی بنیاد پر چند مثالیں پیش کرتا ہوں:

آج سے ساٹھ ستر برس پہلے دہلی میں طوائفوں سے تعلقات رکھنا' نہ صرف کوئی عیب نہ سمجھا جاتا تھا بلکہ اسے امرا اور رئیس اپنے خاندانی وقار کا ایک حصہ بھی قرار دیتے اور شاید ہی کوئی امیر یا رئیس ایسا تھا جس کے کسی نہ کسی طوائف کے ساتھ تعلقات نہ ہوں۔ ان تعلقات کی تہہ میں چاہیے جنسیات کو دخل بھی نہ ہوتا اور طوائفوں سے تعلقات صرف آمد و رفت یا موسیقی کی محفلوں تک ہی محدود رہتے۔ اس زمانہ میں دہلی کی طوائفوں دونی اور چونی کو بہت بڑا عروج حاصل تھا۔ یہ دونوں بہنیں موسیقی کے

اعتبار سے تمام ہندوستان میں مشہور تھیں ل اور دونی کی لڑکی موتی جان کو تو اپنے فن میں کمال حاصل تھا۔ کیونکہ اس کے گلے کو خدا نے وہ اثر عطا کیا تھا کہ جب روتی تو اس وقت بھی گلے سے موسیقیت کا اظہار ہوتا تھا۔ میں نے جب دہلی سے اخبار ''ریاست'' جاری کیا تو دونی اور چونی تو بہت بوڑھی ہو چکی تھیں اور موتی جان بھی اپنی عمر کے آخری حصہ میں تھی۔ موتی جان کے کئی بچے تھے اور اس نے ریاست بھوپال کے ایک افسر سے شادی کر لی تھی۔ اس زمانہ میں موتی جانے کے سب سے بڑے لڑکے کی عمر بائیس تیئیس برس ہو گی۔ اور اس لڑکے کی آمد و رفت یا دوستانہ تعلقات خواجہ حسن نظامی اور خواجہ صاحب کے تمام دوستوں سے بھی تھے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں باعث ہی میرے تعلقات بھی اس لڑکے سے گہرے دوستانہ ہو گئے اور یہ تعلقات اس قدر بڑھ گئے کہ غالباً پندرہ برس تک یہ لڑکا شام کو ہر روز میرے پاس آتا چائے پیتا اور ہم دونوں کار میں سیر کے لیے جاتے۔ سیر سے واپس آنے کے بعد ہم اکٹھے کھانا بھی کھاتے۔ اور کھانا کھانے کے بعد یہ اپنے گھر چلا جاتا۔ پھر علی الصبح چار بجے میں اپنی کار میں اس کو مسٹر پوتھن جوزف ایڈیٹر ''ہندوستان ٹائمز'' کو ساتھ لے کر سیر کے لیے جاتا اور سیر کے بعد ان دونوں کو اپنے اپنے گھروں میں واپس آجاتا۔ موتی جان کے اس لڑکے سے گہرے دوستانہ تعلقات کے باعث میں کبھی کبھی ان کے گھر بھی جاتا۔ اور اس روز تو مجھے ضرور جانا ہوتا جس روز موتی جان ارو اس کے شوہر کے درمیان تعلقات کچھ کشیدہ ہوتے۔ کیونکہ موتی جان اور اس کے شوہر دونوں مجھ پر بھروسہ کرتے تھے۔ اور میں ان میں صلح صفائی کرا دیتا۔

ایک روز راجپوتانہ کی ایک ریاست کی مہارانی صاحبہ کا دس ہزار روپیہ کا ایک کرنسی نوٹ میرے پاس پہنچا یہ نوٹ اس مہارانی نے اپنے شوہر یعنی مہاراجہ کی اطلاع کے بغیر بھیجا اس نوٹ کو بھیجنے کی غرض یہ تھی کہ میں اس کے سو سو روپیہ والے چھوٹے نوٹ اس مہارانی کو بھیج دوں اور اس کے شوہر کو اس کا علم نہ ہو۔ میں نے چھوٹے نوٹ

حاصل کر لیے تو ایک ماہ تک اس مہارانی کا کوئی معتمد لینے نہ آیا۔ ان نوٹوں کو میں اپنے پاس رکھنا نہ چاہتا تھا تاکہ مجھ سے خرچ نہ ہو جائیں میں موتی جان کو بہت دیانتدار سمجھتا تھا۔ اور اس اعتبار سے وہ فی الحقیقت بہت بلند کریکٹر کی عورت تھی۔ میں نے سو سو روپیہ کے ایک سو نوٹوں کو رومال میں باندھا اور موتی جان کے ہاں گیا اور کہا کہ:

''ان نوٹوں کو اپنے پاس محفوظ کر لیجیے جب ضرورت ہوگی تو لے جاؤں گا''۔

یہ نوٹ موتی جان نے اپنی لوہے کی سیف میں رکھ دیے جہاں ایک ماہ پڑے رہے اور جب راجپوتانہ سے اس کا معتمد یہ نوٹ لینے آیا تو میں موتی جان کے ہاں ضا کر یہ نوٹ لایا اور اس مہارانی کو بھیج دیے۔ اور یہ واقعہ دلچسپ ہے کہ رومال میں بندھے ہوئے دس ہزار روپیہ کے ان نوٹوں کو موتی جان نے ایک ماہ کے عرصہ میں کبھی کھول کر بھی نہ دیکھا وہ اسی طرح رومال میں بندھے رہے اور جب میں ان کو واپس طلب کیا تو دیکھا کہ رومال میں یہ اسی طرح سے بندھے ہیں جیسے میں نے دیے تھے۔ ورنہ موتی جان نوٹوں کے اس بنڈل سے انکار کر دیتی تو میں ان کے متعلق کسی سے ذکر بھی نہ کر سکتا تھا۔ کیونکہ پبلک پوزیشن کے باعث میرے لیے یہ ممکن ہی نہ تھا کہ میں کسی سے کچھ کہہ سکتا۔ اس واقعہ کا اب بھی جب کبھی خیال آتا ہے تو سوچتا ہوں کہ موتی جان طوائفوں کے خاندان میں پیدا ہوئی۔ اس کی زندگی کا کافی حصہ بطور طوائف کے بسر ہوا، مگر دیانتداری کے اعتبار سے تو اسے ایک دیوی ہی قرار دیا جا سکتا ہے۔

میں نے جب ''ریاست'' جاری کیا تو اس زمانہ میں نئی دہلی کی سرکاری عمارتیں اور گورنمنٹ ہاؤس تیزی کے ساتھ زیر تعمیر تھے ان عمارتوں کو تعمیر کرنے والے زیادہ تر سکھ ٹھیکیدار تھے اور ایک ایک ٹھیکہ دار کے پاس لاکھوں روپیہ کے ٹھیکے اور ان کے ماتحت ہزارہا مزدور کام کرتے تھے۔ کیونکہ گورنمنٹ روپیہ اور مصارف کی پروہ نہ کرتے ہوئے چاہتی تھی کہ نیا دارالسلطنت جلدی سے جلدی تعمیر ہو۔ ان سکھ ٹھیکہ

داروں میں راقم الحروف کے کئی دوست تھے اور ایک ٹھیکہ دار (جو انبالہ کے رہنے والے تھے) کے ساتھ تو بہت گہرے دوستانہ تعلقات تھے۔ ان ٹھیکہ دار صاحب کو اپنے ٹھیکہ سے لاکھوں روپیہ کا سالانہ منافع تھا۔ ان کے جیب سے ہر وقت کرنسی نوٹوں سے بھرے رہتے اور ان کرنسی نوٹوں میں پانچ پانچ دس دس اور سو سو کے نوٹ ہوتے۔ یہ ٹھیکہ دار صاحب ہفت میں ایک دو بار تفریح کے لیے چاوڑی بازار (جہاں اس زمانہ میں طوائفیں رہتی تھیں) بھی جایا کرتے اور چاوڑی بازار میں ایک طوائف سے ان کے کچھ جنسی تعلقات بھی تھے۔ یہ جب کبھی حسینی (یہ وہی حسینی تھی جس نے بعد میں دہلی کے مشہور غنڈہ کوکین فروش عبدالستار کے ساتھ نکاح کر لیا تھا اور عبدالستار وہی غنڈہ تھا جس نے پولیس کو خوش کرنے کے لیے لاہور میں معصوم اور بیگناہ پروفیسر عبدالغفور پر اور کراچی میں فوجی جرنیل پر جھوٹے اور بے بنیاد مقدمات چلانے کی سازش کی تھی) کے ہاں جاتے تو حسینی کو دس روپیہ فیس دیتے۔ (کیونکہ اس زمانہ میں دس روپیہ آج کے پچاس روپیہ کے برابر تھے) ایک روز یہ سکھ ٹھیکہ دار حسینی کے ہاں گئے اور انہوں نے اپنی جیب سے دس روپیہ کا نوٹ نکال کر دینے کے بجائے غلطی سے سو روپیہ کا نوٹ دے دیا۔ نوٹ دے کر یہ اپنی کار میں واپس گھر چلے آئے اور ان کو کچھ پتہ نہیں کہ انہوں نے دس روپیہ کا نوٹ دیا یا سو روپیہ کا؟ کیونکہ ان کے جیب نوٹوں سے بھرے رہتے تھے۔ ایک ہفتہ کے بعد یہ ٹھیکہ دار پھر حسینی کے ہاں گئے تو حسینی کی ماں نے کہا:

"سردار جی! آپ جب پچھلی بار آئے تھے تو غلطی سے دس کی جگہ سو روپیہ کا نوٹ دے گئے تھے آپ کا سو روپیہ کا یہ نوٹ پڑا ہے"۔

ان ٹھیکہ دار صاحب نے مجھے بتایا کہ حسینی کی ماں نے جب یہ سردار صاحب سے کہا تو طوائف کے اس گھر کی دیانتداری کی سپرٹ دیکھ کر مسرت کے باعث ان کی آنکھیں تر ہو گئیں اور آپ نے حسینی کی ماں کو چار سو روپیہ دیا اور کہا کہ:

''یہ پانچ سو روپیہ آپ لوگوں کی دیانتداری کا نذرانہ ہے''۔

اس واقعہ کے بعد حسینی کے عبدالستار کے ساتھ نکاح سے پہلے ٹھیکہ دار صاحب کے کئی برس تک حسینی سے تعلقات رہے اب یہ ٹھیکہ دار اس دنیا میں نہیں ہیں کئی برس ہوئے ان کا انتقال ہو گیا اور اپنی زندگی میں جب کبھی ملتے تو اس واقعہ کا اکثر ذکر کرتے۔

دہلی میں چھنا مل والوں کا مشہور خاندان ہے اس خاندان والوں کو لاکھوں روپیہ سالانہ صرف جائیداد کے کرایہ سے وصول ہوتا ہے۔ اور اس خاندان کے مالدار ہونے کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ دہلی کے آخری تاجدار بہادر شاہ کی بھی ضرورت کے وقت اس خاندان سے قرض لیا کرتے۔ اس خاندان کے ایک ممبر کے پاس بطور داشتہ ایک طوائف تھی اس طوائف کو تمام اخراجات کے علاوہ کئی سو روپیہ ماہوار بطور تنخواہ ملتی۔ اس طوائف کی اولاد کو چھنامل والوں نے خاندان ہی سے روپیہ سے اعلیٰ تعلیم دی گئی اور اس طوائف کے ایک لڑکے نے تو ان کے روپیہ سے بیرسٹری بھی کی یہ بیرسٹر صاحب اب سوسائٹی میں ایک بہت بڑی پوزیشن رکھتے ہیں۔ یہ طوائف چھنا مل والوں کی فیملی کے اس ممبر کے پاس سالہا سال تک بطور داشتہ رہی۔ اس کے بعد اس نے ایک پروفیسر سے نکاح کر لیا۔ یہ پروفیسر صاحب بہاول پور کالج میں بطور پرنسپل بھی رہے۔ اور مجھے یاد ہے بہت برس ہوئے میں نواب صاحب بہاول پور سے ملنے گیا تو یہ مجھے وہاں ملے۔ بہاولپور سے ریٹائر ہونے کے بعد یہ دہلی چلے آئے ارو تبادلہ آبادی سے پہلے یہ قروع باغ میں مقیم تھے۔ اس طوائف کے متعلق یہ دلچسپ واقعہ ہے کہ جب اس پروفیسر صاحب سے نکاح کر لیا تو نکاح کے فوراً بعد اس نے وہ تمام سامان کپڑا زیورا اور روپیہ وغیرہ ایک بیل گاڑی میں لدوا کر چھنا مل والوں کی فیملی کے اس ممبر کے ہاں یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ:

''چونکہ میں نے اب نکاح کر لیا ہے اس سامان کپڑے اور روپیہ کو استعمال کرنا

اب حرام سمجھتی ہوں‘‘۔

اس نکاح کے بعد میرے پاس اطلاعیں آتی رہیں کہ یہ طوائف اب پروفیسر صاحب کے گھر میں نماز اور تلاوت قرآن میں مصروف رہتی ہے۔ ان اطلاعوں کو سن کر کئی بار جی چاہا کہ میں پروفیسر کے گھر جاؤں اور اس خاتون کے بلند کریکٹر کی داد دوں مگر اسی خیال سے جرات نہ ہوئی کہ یہ خاتون اب پردہ میں ہے شاید پروفیسر صاحب میرے اس خیال کو پسند نہ کریں۔ مجھے معلوم نہیں کہ پروفیسر صاحب اور ان کی بیوی زندہ ہیں یا نہیں اور تبادلہ آبادی کے باعث پاکستان چلے گئے یا دہلی میں ہی رہے؟ مگر جب بھی اس خاتون کے ذہنی انقلاب کا خیال آتا ہے تو عزت واحترام کے جذبات کے ساتھ یہ ناقابل بیان سی مسرت محسوس کرتا ہوں اور میرے دل سے یہ دعا نکلتی ہے کہ:

’’اگر تو یہ خاتون زندہ ہے تو خدا اسے زیادہ سے زیادہ مسرت اور اطمینان کی زندگی نصیب کرے‘ اور اگر یہ اس دنیا میں موجود نہیں تو اس کو آغوش رحمت نصیب ہو‘‘۔

مرحوم مہاراجہ بھرت پور جب برسراقتدار تھے تو ان کے پاس بطور داشتہ ایک پہاڑی طوائف تھی۔ مجھے ٹھیک تو یاد نہیں رہا‘ اس کا نام غالباً لیلا تھا۔ یہ رہنے والی تو نینی تلا کے علاقہ کی تھی‘ مگر اس کا خاندان بہت برس سے میرٹھ میں مقیم تھا یہ لیلا کئی برس تک مہاراجہ کے پاس رہی اور مہاراجہ کے اختیارات سے محروم ہونے کا ایک باعث یہ طوائف بھی تھی۔ جس نے مہاراجہ سے زیور جواہرا اور نقدی کی صورت میں لاکھوں روپیہ حاصل کیا کیونکہ سابق والیان ریاست جب کسی طوائف کو روپیہ دیتے تو وہاں ہزاروں کا سوال نہ ہوتا۔ اس راہ میں لاکھوں روپیہ تباہ کیا جاتا۔ یہ لیلا مہاراجہ کے پاس بھرت پور میں تھی کہ مہاراجہ بے اختیار کر دیے گئے اور آپ دہلی میں آ گئے کیونکہ گورنمنٹ نے آپ کو حکم دیا تھا کہ بھرت پور کے علاقہ میں سے ایک میل دور رہیں۔ مہاراجہ جب دہلی آئے پہلے تو یہ راجپور روڈ کی ایک کوٹھی میں مقیم ہوئے۔ پھر سبزی

منڈی کی ایک کوٹھی میں چلے گئے ارو بعد میں کھمبہ روڈ کی ایک دومنزلہ کوٹھی میں آپ نے رہائش اختیار کی ۔ جو سردار سر سوبھا سنگھ کی ملکیت میں تھی اور جس میں ایک عرصہ تک آل انڈیا ریڈیون کا دفتر بھی رہا۔ دہلی پہنچنے کے بعد مہاراجہ گدی سے علیحدہ کیے جانے کے صدمہ کے باعث بیمار ہوگئے اوران کی بیماری آخر تپ دق کی صورت میں تبدیل ہوگئی ۔

سابق والیان ریاست کے اختیارات سے محروم ہونے کے بعد گورنمنٹ ان کا الاؤنس مقرر کردیتی ۔یہ الاؤنس ایک محدود رقم کی صورت میں ہوتا۔مگر چونکہ ان کو اپنی پہلی پوزیشن قائم رکھنی ہوتی یہ معزولی کے بعد بھی اپنے اخراجات کم نہ کرسکتے تھے۔ ارو آخر قرضہ حاصل کرتے یا کسی دوسری صورت سے یہ اخراجات پورے کرتے ۔ مہاراجہ بھرت پور معزول ہونے کے بعد جب دہلی آئے تو یہ لیلا بھی ان کے ساتھ ہی تھی ۔اخراجات کی زیادتی اور آمدنی کی کمی کا نتیجہ یہ ہوا کہ مہاراجہ نے لوگوں سے قرضہ لینا شروع کردیا۔ اور جب قرضہ نہ مل سکا تو لیلا نے اپنی وفا شعاری کا ثبوت دیتے ہوئے مہاراجہ کو اپنا روپیہ زیورات اور جواہرات دینے شروع کردیے۔حالانکہ لیلا کے والدین چاہتے تھے کہ یہ روپیہ زیورات اور جواہرات مہاراجہ کو نہ دے ۔مہاراجہ کی بیماری پر پانی کی طرح خرچ ہوتا اور لیلا بھی اپنے زیور اور جواہرات فراخدلی سے دیتی چلی گئی ۔حالانکہ وہ جانتی تھی کہ مہاراجہ تپ دق میں مبتلا ہیں اوران کا زندہ رہنا ممکن نہیں ۔کیونکہ اس زمانہ میں تپ عق کا علاج سٹیپٹو مائی سین وغیرہ ایجاد نہ ہوا تھا۔ چنانچہ وہ وقت آ گیا کہ جب مہاراجہ کی زندگی کی کوئی امید نہ رہی ۔مگر لیلا نے زیورات اور جواہرات دینے سے ہاتھ نہ روکا۔اور آخر کار مہاراجہ کا جب انتقال ہوا تو پولیٹکل ایجنٹ بھرت پور مہاراجہ کی لاش کو بھرت پور پہنچانے کے سلسلہ میں ان کی کوٹھی میں دہلی پہنچا۔تو وہ نظارہ بے حد دردناک تھا کہ ادھر تو مہاراجہ کا جنازہ موٹر میں بھرت پور روانہ ہوا اور ادھر لیلیٰ بغیر ایک پیسہ کے مفلسی کی حالت میں سفید سوتی ساڑھی پہنے اپنے میکے

میرٹھ روانہ ہوئی۔ اور اس بیچاری پر میرٹھ میں جب اسکے گھر والوں نے اس کی بیوقوفی پر طعنہ زنی شروع کی تو اس نے جواب دیا کہ:

''روپیہ اور دولت کا کیا سوال ہے؟ یہ اپنی خوش نصیبی سمجھتی اگر مہاراجہ تپ دق کی بیماری سے اچھے ہو جاتے تو ان کی جگہ یہ خود تپ دق میں مبتلا ہو کر مر جاتی''۔

مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کہ مہاراجہ کے انتقال کے بعد دہلی کے تمام واقف کار حلقوں میں تو لیلا کے کریکٹر اور ایثار کی تعریف کی جا رہی تھی اور دہلی کو طوائفوں کی لیلا کے قربانی کے کریکٹر کو بیوقوفی قرار دیا جا رہا تھا۔

اس واقعہ کے بعد اگر میرٹھ کا کوئی اخبار نویس راقم الحروف سے ملنے کے لیے آتا تو میں اس سے لیلا کی زندگی کے متعلق ضرور دریافت کرتا۔ اور ان سے یہ معلوم کر کے مجھے اس طوائف کی تعریف کرنی پڑتی کہ اس نے مہاراجہ کے انتقال کے بعد میرٹھ میں اپنا آبائی پیشہ پھر دوبارہ اختیار نہیں کیا۔ اور یہ اپنی زندگی کی بھجن پاٹھ اور سادہ زندگی میں بسر کر رہی ہے۔

طوائفوں کا پیشہ بہت ہی ذلیل اور قابل نفرت ہے۔ ایک طوائف کا کریکٹر یہ ہے کہ وہ اپنے عشاق اور ملنے والوں کے گھر کی اینٹ سے اینٹ بجا دے مگر اس پیشہ میں بھی بعض ایسی عورتیں مل سکتی ہیں جن کو کریکٹر کی بلندی کے اعتبار سے ایک دیوی قرار دیا جا سکتا ہے۔ جن کے قدموں پر وہ سیاسی لیڈر قربان کیے جا سکتے ہیں۔ جن کی سیاسی زندگی کا مقصد صرف روپیہ پیدا کرنا ہے۔

زمانہ کا انقلاب

دنیا کی موجودہ نسل یعنی جو لوگ بیسویں صدی میں پیدا ہوئے انہوں نے اپنی آنکھوں کے سامنے جو انقلاب دیکھے ان کو دیکھنے کا ہمارے بزرگوں میں سے کسی کو بھی کبھی اتفاق نہیں ہوا تھا۔ اور اس کو تو چھوڑیے کہ بجلی، بھاپ، اور ایٹم سائنس کے اعتبار سے وہ کچھ سامنے آ گیا جس کا تصور بھی نہ کیا جا سکتا تھا۔ سیاسی اعتبار سے بھی ہندوستان اور پاکستان کی موجودہ نسل نے وہ کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا جس کی توقع نہ کی جا سکتی تھی۔ اس سلسلہ کے چند دلچسپ واقعات سن لیجیے:

آج سے پچاس برس پہلے ہر ہندوستانی انگریزوں کا وفا شعار ہونا اپنا ایمان سمجھتا تھا اور اگر کوئی حریت پرست ہندوستان میں خودمختار حکومت قائم کرنے کا مطالبہ کرتا تو اسے دماغی توازن سے محروم قرار دیا جاتا۔ مگر آج ہندوستان اور پاکستان کے لوگ پتھر کے ان بتوں کو بھی سڑکوں پر دیکھنا پسند نہیں کرتے جن کا تعلق انگریزوں کی فتوحات سے تھا۔ ۱۸۵۷ء کی تحریک کو جسے انگریز اور انگریزوں کے وفا شعار بغاوت قرار دیتے رہے اس تحریک کو اب ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی کہا جاتا ہے۔ یہ زمانہ انقلاب ہے۔

اس موجودہ صدی میں شہنشاہیت اور سرمایہ کاری کے خاتمہ کے لیے سب سے پہلے روس میں ایک چھوٹی سی چنگاری پیدا ہوئی۔ یہ چنگاری نہ صرف دنیا کے سب سے بڑے مطلق العنان زار اور اس کی حکومت کو زمین میں دفن کرنے کا باعث ہوئی بلکہ یہ چنگاری اب ایک خوفناک آگ یعنی کمیونزم کی صورت میں تمام دنیا کی سرمایہ داری کو اپنی لپیٹ میں لینے کے لیے بے قرار ہے۔ اور اب تک دنیا کا نصف سے زیادہ حصہ اس کی لپیٹ میں آ چکا ہے۔ یہ زمانہ کا انقلاب کا ثبوت ہے۔

آج سے چوتھائی صدی پہلے نظام حیدرآباد کے حکم سے انتہا پسندوں کے علاوہ پنڈت مالویہ جیسے ماڈریٹ لیڈروں کا بھی ریاست حیدرآباد میں داخلہ بند تھا۔ مگر آج

جب مسٹر راجندر پرشاد یا پنڈت نہرو جب کبھی دورہ کرتے ہوئے حیدرآباد جائیں تو یہ نظام عثمان علی خاں اپنے دونوں ہاتھ باندھ کر سلام کرتے ہوئے ہوائی اڈہ پر استقبال کے لیے موجود ہوتے ہیں۔ اور یہ زمانہ کا انقلاب ہے کہ اس نظام کے محل کی حیدرآباد پولیس نے پچھلے دنوں عورتوں کے اغوا یا عورتوں کو ناجائز طور پر اپنے قبضہ میں رکھنے کے جرم میں تلاشی لی جس نظام کے حکم دے حیدرآباد کی افواج حرکت میں آجایا کرتی تھیں۔

ٹرکی کے ان سابق وزراء کو ابھی حال میں پھانسی کے تختہ پر چڑھا دیا جانا انقلاب در انقلاب قرار دیا جانا چاہیے جو انقلاب کے صدقہ ہی چند برس پہلے وزارت کی کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ اور اب نئے انقلاب نے ان کے گلے میں پھانسی کی رسیاں ڈال دیں۔

افغانستان کو بھی انقلاب کی زد میں ہی قرار دیا جانا چاہیے کہ اس ملک میں گو حکومت فی الحال ایک مطلق العنان بادشاہ کی ہے۔ مگر یہ ملک آج فوجی اقتصادی اور رسل ورسائل کے اعتبار سے روس جیسے کمیونسٹ ترین ملک کے رحم و کرم پر ہے۔

ہندوستان اور پاکستان دونوں ممالک کے نئے انقلابات کی داد نہ دینا بے انصافی ہوگی۔ کہ کسی ایک شخص کو بھی پھانسی دیے بغیر ان ممالک میں نئی اور مضبوط گورنمنٹیں قائم ہوگئیں۔ اور وہ لوگ دبک کر اپنے گھروں کے اندر بیٹھنے پر مجبور ہو گئے جو انگریزوں کے دست و بازو تھے۔

یہ بھی زمانہ کا انقلاب ہے کہ نواب مالیر کوٹلہ اور مہاراجہ نابھ جیسے سابق والیان ریاست کانگرس گورنمنٹ کے دروازہ پر انتخابات کے لیے کانگرس کا ٹکٹ لینے کے لیے درخواستیں کر رہے ہیں، اور ان کی یہ درخواستیں ردی کی ٹوکری میں ڈال دی گئیں۔ حالانکہ اس کلاس کے والیان ریاست نے انگریزوں کے زمانہ میں کسی بھی کانگرسی لیڈر اور ورکر کو اپنے علاقہ میں قدم رکھنے نہ دیا، اور اگر کسی نے قدم رکھا تو اسے تا حکم

ثانی جیلوں میں ڈال دیا گیا۔

یہ واقعہ انقلاب کا ناقابل تردید ثبوت ہے کہ ہندوستان کے ان برطانوی گرگوں نے چودہ اور پندرہ اگست ۱۹۴۷ء کو ہی انگریزی فرموں کے سلے ہوئے کوٹ اور نکٹائیاں اتار کر پھینک دیں اور انہوں نے کھدر کی آٹھ بٹنوں والی جواہر کٹ واسکٹیں پہن لیں جن کا ایمان تھا کہ انگریز ہندوستان میں دوامی طور پر حکمران رہیں گے اور انگریزوں کی سلطنت میں کبھی بھی سورج غروب نہ ہوگا۔

میں اسے بھی زمانہ کا انقلاب سمجھتا ہوں' کہ زندگی بھر میری ڈاک سنسر ہوتی رہی گھر سے نکلتے ہی سی آئی ڈی کے لوگ اس طرح پیچھا کرتے جیسے چوروں اور جرائم پیشہ لوگوں کا کیا جاتا ہے۔ اور آج راقم الحروف گورنمنٹ آف انڈیا سے دو سو روپیہ ماہوار ٹریری پنشن پا رہا ہے۔

کیا یہ انقلاب کا ثبوت نہیں کہ ہندوستان کے تعلقہ دار اپنی اس خاندانی زمینداریوں اور جاگیروں سے آج محروم ہو کر کاشتکاروں کی صفوں میں کھڑے ہونے پر مجبور ہو گئے جو زندگی بھر اپنے کاشتکاروں کو ظلم کا نشانہ بناتے رہے اور جو بغیر محنت کیے ان کاشتکاروں کے پسینہ بہا کر پیدا کیے ہوئے روپیہ پر عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتے تھے۔

اسے بھی زمانہ کا انقلاب ہی قرار دیا جانا چاہیے کہ آج ہندوستان اور پاکستان اور افغانستان کی وہ نوجوان لڑکیاں اور عورتیں اپنے سروں کو ننگا رکھتے ہوئے اپنے سینہ اور جسم کے دوسرے حصوں کی نمائش کرنا اپنا فطری حق سمجھتی ہیں جو آج سے چند برس پہلے گھروں کی چار دیواری سے باہر جانا ایک مذہبی اور مجلسی گناہ سمجھتی تھیں۔ اور اگر ان کے گھر کے اوپر فضا میں بھی کبھی کوئی ہوائی جہاز پرواز کرتا تو یہ اپنے آپ کو چھپانے کے لیے اور پردہ کرنے کے لیے گھر کی کوٹھڑیوں میں چلی جاتیں۔

زمانہ کے ان انقلابات کے ساتھ میں اپنے چند تجربات بیان کروں گا جو بہت

دلچسپ ہیں اور میرے لیے زندگی بھر ہمیشہ ناقابل فراموش ثابت ہوئے:

موجودہ راجہ نابھ جب بالغ ہوئے تو اپنے گھریلو جھگڑوں کے باعث اس خاندان میں بھی خانہ جنگی شروع ہوئی۔ اور اس خاندانی کشمکش کا نتیجہ یہ ہے کہ آج مہاراجہ نابھ کے نہ صرف اپنی حقیقی والدہ بلکہ اپنے حقیقی بھائیوں کے ساتھ بھی تعلقات کشیدہ ہیں اور مقدمات عدالتوں میں چل رہے ہیں۔ دو تین برس ہوئے مہاراجہ کی والدہ نے گورنمنٹ آف انڈیا کے وزیر اعظم اور وزیر خارجہ کے پاس شکایت کی کہ ان کے بیٹے موجودہ مہاراجہ نے اپنی والدہ کی وہ کوٹھی بھی اپنے قبضہ میں کر لی ہے جس میں ان کی والدہ اور بھائی مقیم تھے۔ پنڈت نہرو نے نابھ کا یہ گھریلو جھگڑا مرحوم مولانا آزاد کے سپرد کر دیا کیونکہ ایسے جھگڑے مولانا اپنے مشفقانہ اثرات استعمال کرتے ہوئے نپٹایا کرتے تھے۔ یہ جھگڑا جب تصفیہ کے لیے مولانا کے سامنے پیش ہوا تو مولانا نے مہاراجہ کو سمجھایا کہ ان کا اپنی والدہ سے ایسا سلوک کرنا مناسب نہیں' اور مہاراجہ نے اقرار کیا کہ آپ یہ کوٹھی اپنی والدہ کے لیے خالی کر دیں گے۔ چند روز بعد مہاراجہ اپنے اس وعدہ سے منحرف ہو گئے۔ اور اس سلسلہ میں ق ی آ پھر مرحوم مولانا سے ملنے گئے۔ مولانا کو جب مہاراجہ کے آنے کی اطلاع ہوئی تو مرحوم مولانا نے اپنے پرائیویٹ سیکرٹری مسٹر اجمل خاں کی معرفت جواب دیا کہ میں ایسے شخص سے ملنا پسند نہیں کرتا جو شخص اپنی زبان پر قائم نہ ہو۔ یہ جواب سن کر مہاراجہ نے چاہا کہ مولانا صاحب سے چند منٹ کے لیے ہی حاضری کا موقع دیں مگر مولانا قوت ارادی کے اعتبار سے بہت مضبوط شخصیت تھے۔ آپ نے منے سے قطعی انکار کر دیا اور مہاراجہ واپس چلے گئے۔ یہ واقعہ مرحوم مولانا نے راقم الحروف سے بیان کیا' جسے یقیناً ایک بہت بڑا انقلاب قرار دینا چاہیے۔ کیونکہ اگر ہندوستان آزاد نہ ہوتا یہاں انگریزوں کی حکومت ہوتی سابق والیان ریاست برسر اقتدار رہتے اور مولانا ابوالکلام مہاراجہ سے ملنے کے لیے نابھ جاتے تو یقیناً یہی مہاراجہ مرحوم مولانا سے ملنے کے لیے انکار کر دیتے۔ کیونکہ مہاراجہ

میں اتنی جرات ہی نہ ہوتی کہ وہ مولانا کو ملنے کا موقع دے کہ انگریزوں کا ناخوش کرتے جیسا کہ انگریزوں کے زمانہ میں کسی کانگرسی لیڈر کا کسی مہاراجہ یا نواب سے ملنا ممکن نہ تھا۔

راقم الحروف کی عمر سولہ یا سترہ برس کی تھی اور وہ چھ روپیہ ماہوار تنخواہ پر فیروز پور کے سول ہسپتال میں اپرنٹس کمپونڈر تھا۔ اس زمانہ میں اس ہسپتال کے انچارج ڈاکٹر ایک صاحب رائے صاحب لالہ سری رام کھنہ اسسٹنٹ سرجن دہلی کے رہنے والے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس زمانہ میں جب سکولوں کی چھٹیاں ہوئیں تو رائے صاحب ڈاکٹر سری رام کے صاحبزادہ سری بھگوان ان چھٹیوں میں اپنے والد کے پاس فیروز پور آئے۔ یہ سری بھگوان بالکل اپنے باپ کی شکل کے بہت خوبصورت تھے۔ پانچویں یا آٹھویں جماعت میں پڑھتے ہوں گے۔ بہت خوبصورت سوٹ پہنتے اور میری نگاہوں میں ان کا لباس اور ہسپتال کے سٹاف میں ان کی قدر میرے لیے انتہائی قابل رشک اور باعث کشش تھی۔ اور یہ واقعہ ہے کہ میری کم حیثیتی میں یہ جرات بھی نہ تھی کہ میں کبھی ڈاکٹر سری رام سے ہم کلام ہوتا۔ میں چھ ماہ کے قریب اس ہسپتال میں رہا اور اس کے بعد ابوہر اور پھر موگا کے ہسپتال میں تبدیل ہو گیا۔ اور ڈاکٹر سری رام بھی فیروز پور سے پنجاب کے کسی دوسرے ضلع میں تبدیل ہو گئے موگا کی ملازمت کے بعد مانسہ (ریاست پٹیالہ) میں میڈیکل پریکٹس شروع کر دی اس کے بعد اخبارات کے دفاتر میں ملازم ہوا۔ اخبارات میں ملازمت کرنے کے بعد ریاست نابھ میں ملازم ہو گیا۔ کیونکہ مرحوم مہاراجہ نابھ میرے مضامین کے معترف اور مداح تھے اور مہاراجہ کی معزولی کے بعد میں نے اخبار ریاست جاری کیا۔ میرے حالات تو یہ تھے اور رائے صاحب ڈاکٹر سری رام پنجاب کے مختلف اضلاع میں اسسٹنٹ سرجن اور سول سرجن رہنے کے بعد ریاست کپورتھلا میں چیف میڈیکل آفیسر ہو گئے۔ اور بعد میں ریٹائر ہونے کے بعد اپنے وطن دہلی واپس آ گئے اور قرول باغ میں مقیم ہو

ے رائے بہادر ڈاکٹر سری رام کے صاحبزادہ سری بھگوان سکول اور کالج کی تعلیم کے بعد وکیل ہوئے اور آپ دہلی کی ڈسٹرکٹ کورٹ میں پریکٹس کرتے یہ مسٹر برج بہاری توکلی ایڈووکیٹ کے دوستوں میں سے تھے اور توکلی صاحب میرے گہرے دوست تھے جو میرے مقدمات سالہا سال تک بغیر ایک پیسہ فیس لیے مفت کرتے رہے اور چونکہ قریب قریب ہر دور میں سابق والیان ریاست وغیرہ نے میرے خلاف مقدمات جاری رکھے ہیں جب کبھی دہلی کی عدالتوں میں بار روم میں جاتا اور توکلی صاحب سے ملتا تو میں ں ے ان سے کبھی یہ ذکر کیا کہ میں نے ان کو بچپن میں فیروزپور میں دیکھا تھا اور نہ ان کو یاد تھا کہ میں فیروزپور میں ان کے والد کے ماتحت ملازم رہ چکا ہوں اس معمولی واقفیت میں کئی برس گزر گئے ۔تو ایک روز توکلی صاحب میرے پاس آ ۓ اور انہوں نے کہا کہ مسٹر سری بھگوان کے والد رائے صاحب ڈاکٹر سری رام کھنہ ریٹائر ہونے کے بعد دہلی آ گئے ہیں اور اب چاہتے ہیں خہ یہ بیکار نہ رہیں اور کسی ریاست میں بطور چیف میڈیکل آفیسر ملازم ہو جائیں ۔ان کو اور ان ے بیٹے مسٹر سری بھگوان کی خواہش ہے کہ آپ (یعنی دیوان سنگھ) کسی ریاست کے مہاراجہ ناب یا وزیر کے پاس سفارش کر کے ان کو ملازمت دلا دیں ۔اور اس غرض کے لیے ہی بات چیت کرنے آنا چاہتے ہیں ۔توکلی صاحب نے کہا تو میں مسکرا دیا ۔میری مسکراہٹ دیکھ کر توکلی صاحب حیران کہ بات تو سنجیدگی کے ساتھ ہو رہی ہے یہ مسکراہٹ کیسی؟ آپ نے پوچھا تم مسکرا کیوں رہے ہو؟ تو میں ں ے جواب دیا کہ زمانہ کے انقلاب کو دیکھ کر مسکرا رہا ہوں کہ جب میری عمر سولہ برس کی تھی تو میں چھ روپیہ ماہوار تنخواہ پر فیروزپور ہسپتال میں رائے بہادر سری رام کھنہ ڈاکٹر کے تحت اپرنٹس کمپونڈر تھا اور میری یہ حیثیت بھی نہ تھی کہ میں کبھی ڈاکٹر سری رام سے ہم کلام ہوتا ۔مگر آج یہی ڈاکٹر سری رام آپ سے سفارش کراتے ہوئے مجھ سے درخواست کر رہے ہیں کہ میں ان کو کسی ریاست میں ملازم کرا دوں ۔ میں نے توکلی صاحب سے وعدہ کیا

کہ رائے صاحب ڈاکٹر سی رام کے لیے کسی ریاست میں انتظام کروں گا۔ مگر کچھ عرصہ کے بعد ہی رائے صاحب کا انتقال ہو گیا اور مجھے افسوس ہے کہ میں ان کی خدمت انجام نہ دے سکا۔

پنجاب کے وزیر اعلیٰ سردار پرتاپ سنگھ کیروں سے جب کبھی دہلی آتے تو ملنے کے لیے دفتر ''ریاست'' میں اکثر تشریف لاتے اور یہ ان کی بندہ نوازی اور بلندی کا ثبوت تھا کیونکہ راقم الحروف اور سردار پرتاپ سنگھ کے ذاتی تعلقات ان کے سیاسی میدان میں آنے سے پہلے کے ہیں۔ جب کہ آپ امریکا میں مقیم تعلیم حاصل کر کے واپس ہندوستان آئے تھے۔ ایک روز ایک دوست میرے پاس آئے اور انہوں نے کہا کہ سردار پرتاپ سنگھ کیروں سے دہلی آئے ہوئے ہیں اور جمنا کینال ریسٹ ہاؤس میں مقیم ہیں' اور یہ چاہتے ہیں کہ ان کا تعارف سردار کیروں سے کرایا جائے۔ اس وقت نو بجے تھے میں نے جمنا کینال ریسٹ ہاؤس میں ٹیلیفون کر کے پوچھا کہ کیا سردار پرتاپ سنگھ وہاں موجود ہیں؟ تو وہاں سے بتایا گیا کہ موجود ہیں میں ان دوست کو ساتھ لے کر کینال ریسٹ ہاؤس پہنچا۔ اوپر کی منزل کے ایک کمرہ میں سردار صحب موجود تھے اور دوسرے کمرہ میں ملنے والے منتظر بیٹھے تھے۔ ان ملنے والوں میں دوسرے لوگوں کے علاوہ مرحوم رائے بہادر رام سرن داس رئیس اعظم لاہور کے صاحبزادے رائے بہادر لالہ گوپال داس بھی تشریف فرما تھے۔ میں جب اس کمرہ میں پہنچا تو میں نے اپنا وزیٹنگ کارڈ چپڑاسی کے ہاتھ سردار پرتاپ سنگھ کو بھیج دیا۔ اور میں خود لالہ گوپال داس کے ساتھ خیریت و عافیت اور حالات پوچھنے میں مصروف ہو گیا۔ کیونکہ مرحوم رائے بہادر لالہ رام سرن داس کے ساتھ راقم الحروف کے ذاتی تعلقات تھے' اور ایک بار میں اور رائے بہادر مرحوم ہم سفر بھی رہے۔ لالہ گوپال داس سے معلوم ہوا کہ وہ سردار پرتاپ سنگھ سے ملنے کے لیے آج صبح ساڑھے سات بجے سے منتظر بیٹھے ہیں مجھے وہاں بیٹھے پانچ سات منٹ ہی ہوئے تھے کہ چپڑاسی آ کر مجھے سردار

صاحب کے پاس لے گیا۔ اور چند منٹ باتیں کرنے کے بعد میں واپس ڈرائنگ روم میں چلا آیا۔ کیونکہ میں جب کسی سے ملوں تو کام کی بات کرتا ہوں بے معنی باتوں میں اپنا وقت ضائع نہیں کرتا۔ ڈرائنگ روم میں آنے کے بعد میں رائے بہادر لالہ گوپال داس کو سلام کر کے واپس چلا آیا اور مجھے معلوم نہیں کہ رائے بہادر لالہ گوپال داس جی کو سردار پرتاب سنگھ صاحب کی ملاقات کا موقع نصیب ہوا یا کہ نہیں اور اگر موقع ملا تو کس وقت؟ مگر یہ بھی زمانہ کا انقلاب ہے کہ تبادلہ آبادی سے پہلے مرحوم رائے بہادر لالہ رام سرن دس کی لاہور میں کروڑوں روپیہ کی جائیداد تھی۔ رائے بہادر صاحب سی آئی ڈی کے خطاب یافتہ تھے۔ ہندوستان کا کوئی مہاراجہ یا نواب لاہور آتا تو ان کے ہاں مہمان ہوتا۔ آپ کونسل آف سٹیٹ کے سالہا سال تک ممبر رہے اور تمام پنجاب میں بہت بڑی پوزیشن رکھتے تھے۔ مگر آپ کے صاحبزادہ رائے بہادر لالہ گوپال داس سردار پرتاب سنگھ سے ملنے کے لیے جاتے ہیں تو ساڑھے سات بجے سے دس بجے تک ان کو ملاقات کو موقع نصیب نہیں ہوتا۔ اور ہندوستان کی آزادی سے پہلے رائے بہادر لالہ رام سرن داس تو بطور آنریبل ممبر کے کونسل آف سٹیٹ میں گدی والے صوفوں پر بیٹھا کرتے تھے۔ اور سردار پرتاب سنگھ سنٹرل جیل لاہور میں گڑ اور چنے کھایا کرتے تھے۔

آج سے پچاس برس پہلے پنجاب کے اردو جرنلزم میں تین اخبارات کی ایک پرو برٹش تثلیث تھی ۱۔ مولوی محبوب عالم ایڈیٹر ''پیسہ'' اخبار ۲۔ لالہ دینا ناتھ ایڈیٹر ''دیش و ''ہمالہ'' اور ۳۔ سردار امر سنگھ ایڈیٹر ''لائل گزٹ''۔ یہ تینوں بزرگان صحافت میں کسی بھی حریت پرست اخبار کو ہندوؤں اور مسلمانوں اور سکھوں میں زندہ نہ رہنے دیتے اور اگر کوئی آزادی پسند اخبار میدان میں آ جاتا تو حکام سے مل کر اس اخبار کو کچلنے کی متحدہ کوشش کی جاتی۔ چنانچہ اس صحافتی تثلیث کا نشانہ مولوی ظفر علی خاں کا ''زمیندار'' پنڈت ہری رام کا ''ہندو'' لالہ بانکا دیال کا ''جھنگ سیال'' اور سردار ہرچند سنگھ کا

''خالصہ اخبار'' بنائے گئے۔ سردار امر سنگھ تو کھلے طور پر اپنے اخبار ''لائل گزٹ'' (وفا شعار گزٹ) کے ذریعہ سکھوں کو برطانیہ کے وفا شعار ہونے کی عمر بھر تلقین کرتے رہے۔ مگر یہ بھی زمانہ کا انقلاب ہے کہ سردار امر سنگھ کے صاحبزادہ سردار جنگ بہادر سنگھ پبلک کے حافظہ کی کمزوری کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے آج بھی سردار امر سنگھ کی برسی کے موقع پر دہلی میں ایک جلسہ کر لیتے ہیں۔ اور اس جلسہ میں لوگوں کو مدعو کرنے کے لیے پوسٹر شائع کیے جاتے ہیں، اور ان پوسٹروں میں سردار امر سنگھ کو ''مجاہد آزادی'' تک لکھا جاتا ہے۔ مولوی محبوب عالم اور لالہ دینا ناتھ کے صاحبزادے بھی اگر چاہیں تو اپنے والد کو ''فرزند حریت'' لکھ سکتے ہیں۔ کیونکہ انقلاب میں سب کچھ جائز ہے۔

آج سے چوتھائی صدی پہلے برطانیہ کے علاقوں میں سورج غروب نہ ہوتا تھا۔ یعنی برطانیہ کے کسی نہ کسی مقبوضہ علاقہ پر سورج کی کرنیں ضرور موجود ہوتیں۔ مگر آج سورج صرف برطانیہ پر ہی دن کے وقت نظر آتا ہے۔ اور اگر روس کی ایٹم بموں کی دھمکیوں نے کبھی عملی صورت اختیار کی تو کرنیں پھیلانے والا سورج شاید بغیر انسانوں کے ہی برطانیہ پر ایسی کرنیں پھیلائے اور اسے بھی زمانہ کا انقلاب قرار دیا جائے گا۔

☆☆☆

بیکاری اور اس کا سبب

بہت برس ہوئے تبادلہ آبادی سے پہلے کی بات ہے میں لاہور گیا تو وہاں ایک کامیاب بزنس مین سے کہا کہ مجھے اپنے دفتر کے لیے ایک مینجر کی ضرورت ہے' جو انگریزی خط و کتابت کر سکتا ہو اور دیانتدار ہو۔ آپ اخبار ''ٹریبون'' میں اشتہار دے کر کسی اچھے اور محنتی پنجابی کا انتظام کر دیجیے۔ اس دوست نے دریافت کیا کہ کیا تنخواہ دو گے؟ تو میں نے انتہائی دریا دلی کا ثبوت دیتے ہوئے کہا کہ پچھتر ہزار روپیہ ماہوار۔ کیونکہ اس زمانے میں ہمارے ہاتھ ساٹھ روپیہ ماہوار کا مینجر تھا۔ تیس تیس روپیہ ماہور کے کلرک تھے اور پندرہ پندرہ روپیہ ماہوار چپڑاسیوں کو دیے جاتے تھے۔ پچھتر روپیہ مینجر کی تنخواہ سن کر اس دوست نے جواب دیا

''جو شخص دو ڈھائی سو روپیہ ماہوار کم تنخواہ پر رکھا جائے گا اس سے آپ قابلیت محنت اور دیانتداری کی توقع نہیں کر سکتے۔ بلکہ اسے انسان ہی نہیں کہا جا سکتا وہ تو انسان کے جامہ میں حیوان ہوگا''۔

اصل پوزیشن یہی ہے کہ کم تنخواہ پر ذمہ دار لائق اور دیانتدار لوگ نہیں مل سکتے' اور جن میں یہ صفات ہوں وہ ترقی کر کے جلدی ہی اچھی جگہ پر پہنچ جاتے ہیں

میں اپنے دفتر میں جب کسی کو ملازم رکھتا تھا تو دو چار روز اس کی ہر حرکت کی نگرانی کرتا تھا کہ وہ محنتی ہے یا نہیں؟ کام چور تو نہیں دفتر کے کام کو اپنا کام سمجھتا ہے یا نہیں چوری تو نہیں کرتا یہ چالاک تو نہیں۔ اور اس میں عقل اور سمجھ کافی ہے یا نہیں؟ دو چار روز کی نگرانی کے بعد اگر یہ میرے معیار پر پورا اترتا تو بازار کے ریٹ کے مقابلہ میں اس کو پانچ یا دس روپیہ ماہوار زیادہ تنخواہ پر ملازم رکھ لیا جاتا' اور اگر یہ معیار کے مطابق نہ ہوتے تو جتنے دن اس نے کام کیا ہوا تنے دن کے پیسے دے کر اس کو رخصت کر دیا جاتا۔ اور اس انتخاب کا ہی نتیجہ تھا کہ دفتر ''ریاست' میں کام کرنے والے لوگوں کو کسی دوسرے دفتر میں ملازمت حاصل کرنے میں کوئی دقت نہ ہوتی۔ اور ہمارے ہاں کام

کرنا ایک بہت بڑی کوالیفیکیشن سمجھا جاتا۔ چنانچہ دفتر ''ریاست'' میں ذیل کے چند اصحاب جو ایک ایک سو روپیہ ماہوار کے قریب تنخواہ پاتے تھے اس وقت یا تو یہ پانچ پانچ سات سات یا آٹھ آٹھ سو روپیہ ماہوار تنخواہ پا رہے ہیں اور یا انہوں نے اپنی زندگی میں اپنی قابلیت ارو محنت کے باعث لاکھوں روپیہ پیدا کیا مثلاً:

۱۔ مسٹر جگدیش باوا۔ دفتر ''ریاست سے جانے کے بعد روزانہ ''تیج'' میں مینجر مقرر ہوئے اور اب آپ گورنمنٹ ہند کے محکمہ اشتہارات میں غالباً آٹھ سو روپیہ ماہوار تنخواہ پا رہے ہیں۔

۲۔ مسٹر شام سندر پرویز۔ دفتر ''ریاست'' سے جانے کے بعد آپ نے اشتہارات کی ایجنسی جاری کی اور اس وقت ان کی آمدنی کئی ہزار روپیہ ماہور اہے۔

۳۔ پنڈت منموہن لال دیوانہ۔ دفتر ''ریاست'' سے جانے کے بعد آپ نے اپنے کاروبار میں لاکھوں روپے پیدا کیے مگر تبادلہ آبادی کے باعث ان کو نا قابل تلافی نقصان پہنچا اور اب آپ روزانہ ''پرتاب'' میں کام کرتے ہیں۔

۴۔ مسٹر حفیظ ہوشیار پوری۔ اس وقت ریڈیو پاکستان میں اعلیٰ عہدہ پر ہیں اور ادبی اعتبار سے بھی ان کی پوزیشن قابل رشک ہے۔

۵۔ مسٹر شرما۔ آپ نے دفتر ''ریاست'' کے زمانہ ملازمت ہی میں بی اے کیا۔ بعد میں رسالہ ''شمع'' کے محکمہ اشتہارات کے مینجر مقرر ہوئے اور اب آپ غالباً بمبئی کی ایک بڑی ایڈورٹائزنگ ایجنسی سے منسلک ہیں

۶۔ پنڈت سوم ناتھ۔ دفتر ''ریاست'' میں کئی برس رہے۔ اب آپ ''شمع'' اور دفتر ''شمع'' سے تعلق رکھنے والے تمام اردو ہندی رسائل کے مینجر اشتہارات ہیں

۷۔ مسٹر بھاٹیہ۔ دفتر ''ریاست'' کی ملازمت کے بعد اب گورنمنٹ آف انڈیا میں ملازم ہیں۔

ان اصحاب کے علاعد ایک درجن کے قریب اور ایسے لوگ ہیں جو دفتر ''ریاست''

میں کام کرنے کے بعد اب اچھی حالت میں ہیں کیونکہ یہ لوگ لائق محنتی اور دیانتدار تھے۔ اور جن لوگوں میں ان صفات کی کمی تھی وہ اب بھی مختلف دفاتر میں کلرکیاں کر رہے ہیں اور ان کو بلند ہو جانے کا کوئی سوال نہیں۔ کیونکہ اصولاً جن لوگوں کے بلند ہو جانے کی صفات موجود نہ ہوں ان کو دنیا میں کوئی بلند نہیں لے جا سکتا۔ وہ تو زندگی بھر دھکے ہی کھاتے رہیں گے۔

یہ تو درست ہے کہ ہندوستان میں رشوت اور بددیانتی بہت کافی موجود ہے' اور انگریزوں کے زمانہ کے مقابلہ میں اس اعتبار سے بہت پست ہو گئے ہیں مگر جہاں تک ملک کی انڈسٹری کا سوال ہے ہندوستان نے پچھلے تیرہ برس کے اندر اسقدر تیزی سے ترقی کی ہے جس کی مثال دنیا کا کوئی ملک معہ روس کے کوئی پیش نہیں کر سکتا۔ اور اس وقت ہندوستان کا شاید ہی کوئی صوبہ کوئی ضلع کوئی تحصیل اور کوئی قصبہ ایسا ہو گا جس میں نئی صنعتی زندگی' مصروفیت اور بیداری نہ پیدا ہو چکی ہو۔ اور پچھلے ان تیرہ برسوں میں لاکھوں لوگوں کے کام کے لیے نئے میدان پیدا ہو گئے ہیں۔ چنانچہ اس سلسلہ کا ایک تازہ اور دلچسپ واقعہ سن لیجیے۔

پچھلے مہینہ میرے ایک عزیز مسٹر روشن لال یاس کرنال سے آئے' تو میں نے ان سے کہا:

''مجھے ایک گھریلو ملازم کی ضرورت ہے کرنال سے کوئی کام کا محنتی لڑکا تو بھیجیے''۔

یہ سن کر مسٹر روشن لال مسکرا دیے۔ میں نے پوچھا مسکرائے کیوں ہو؟ تو آپ نے جواب دیا کہ:

''جو کام کا آدمی ہو گا اس کو کرنال میں کام کی کمی ہو گی۔ اور وہ وہاں سے باہر نہ جائے گا۔ جبکہ دوسرے تمام شہروں اور قصبوں کی طرح کرنال میں بھی درجنوں نئی انڈسٹریز جاری ہو چکی ہیں۔ اور نان سکیلڈ (کوئی کام نہ جاننے والے) کو بھی کم از کم پینسٹھ روپیہ ماہوار تنخواہ ملتی ہے۔ ہاں اگر کوئی نکما آدمی چاہو جو کام نہ کر سکے تو میں اسے

کرنال بھیج دیتا ہوں''۔

یعنی محنتی اور دیانتدار شخص کے لیے کام کی کمی نہ کبھی پہلے تھی اور نہ کبھی آئندہ کمی ہو گی۔اور جو لوگ نکمے اور کاہل ہیں وہ پچھلی تمام زندگی گلیوں میں جوتیاں چٹخاتے رہے اور آئندہ بھی جاپانی چپلی چٹخاتے رہیں گے۔ان کے لیے نہ کبھی پہلے کام تھا اور نہ ہو گا۔ یہ کمبخت تو بیکاری کے نام پر ہائے روٹی ہائے روٹی کے نعرے بلند کرتے رہیں گے۔

محنتی اور کاہل لوگوں کے سلسلہ میں ایک اور واقعہ سن لیجیے:

بہت برس ہوئے میں ایک بار کلکتہ گیا میرا ارادہ اشتہار کے لیے وہاں ایک کنویسر مقرر کرنے کا تھا۔ میں نے سٹیٹسمین میں کنویر کا اشتہار دیا تو دوسرے لوگوں کے علاوہ ایک اینگلو انڈین بھی انٹرویو کے لیے آئے جن کی عمر ساٹھ برس کے قریب تھی۔ان سے جب باتیں شروع ہوئیں تو میں نے ان سے پوچھا کہ آپ کیا تنخواہ لیں گے؟ تو آپ نے جواب دیا:

''مسٹر دیوان سنگھ جو شخص اچھا کنویسر ہو گا وہ کبھی بھی تنخواہ رپ کام نہ کرے گا۔ کیونکہ اسے بھروسہ ہوتا ہے کہ وہ محنت کر کے کوئی بھی کام کر سکتا ہے۔صرف نکمے کنویسر ہی تنخواہ پر کام کرتے ہیں جن کو اپنی ذات اور محنت پر اعتبار نہیں ہوتا۔میں کئی اخبارات کے لیے مارکیٹ سے بزنس حاصل کرتا ہوں اور صرف سٹیٹسمین سے ہی ایک ہزار روپیہ ماہوار بطور کمیشن حاصل کر لیتا ہوں۔آپ مجھے یہ بتائیے کہ اگر میں آپ کے اخبار کو بزنس دوں تو آپ اس پر مجھے کیا کمیشن دیں گے؟''

یہ سن کر میری آنکھیں کھل گئیں اور میں نے کلکتہ میں تنخواہ پر کنویسر رکھنے کا ارادہ بدل دیا اور جو لوگ انٹرویو کو لیے آئے تھے ان کو کمیشن پر کام کرنے کو کہا۔

بعض لوگ ہوشیار اور چالاک میں کوئی فرق نہیں سمجھتے اور ان دونوں کو ایک ہی درجہ دیتے ہیں۔حالانکہ دونوں میں بڑا فرق ہے ہوشیار اسے کہا جاتا ہے جو بد دیانت

نہ ہو ذہین اور محنتی ہو جسے انگریزی میں کلیور کہتے ہیں۔ چالاک شخص لازمی طور پر بددیانت بھی ہوتا ہے۔ اسے انگریزی میں ''کننگ'' کہتے ہیں۔ میرے رائے میں جب کسی شخص کو ملازم رکھیے یا اس سے دوستی کیجیے تو یہ دیکھ لیجیے کہ وہ ہوشیار ہے چالاک نہیں۔

اور کام کرنے والے کو ہاتھ باندھنے کی ضرورت محسوس نہ ہو' کیونکہ زیادہ تنخواہ اور نکمے ہونے کی صورت میں ملازم صرف ہاتھ باندھ کر اور خوشامد کر کے ہی ملازمت میں رہ سکتا ہے وہ اپنے مالک پر ایک بوجھ ہوگا۔

جو لوگ بیکاری اور ملازمت یا کاروبار میں کامیاب نہ ہونے کی شکایت کرتے ہیں وہ فی الحقیقت نالائق کریکٹر سے محروم کاہل اور نکمے ہیں کیونکہ کام کا آدمی ایک دن کے لیے بھی بیکار نہیں رہ سکتا۔ اگر اس کے اندر محنت کرنے اپنے مالک کا مخلص اور وفا شعار رہنے دیانتدار ہونے اور کام کو ایک فرض سمجھنے کی سپرٹ ہو اور ان کے لیے اس دنیا میں کوئی جگہ نہیں جو دیانتدار نہیں ہیں یا کام چور ہیں محنت نہیں کرتے غیر مخلص ہیں اور چالاکی کو ہوشیاری سمجھتے ہوئے مجرمانہ ذہنیت رکھتے ہیں۔

موسیقی کا چسکا

سکھوں کا کوئی گوردوارہ ایسا نہیں جہاں ہر روز صبح تین چار بجے کے قریب آسا کی وار (یعنی راگ آسا میں شبدوں کا گانا) شروع نہ کی جاتی ہو' اور موسیقی کا یہ سلسلہ صبح آٹھ بجے تک جاری رہتا ہے۔ چنانچہ ہر اس سکھ کو مذہبی اعتبار سے صحیح النسب قرار دیا جانا چاہیے جو راگ آسا سے واقف ہو۔ اور ایک دوست کے قول کے مطابق وہ سکھ مذہبی اعتبار سے صحیح النسل نہیں جو راگ آسا نہ جانتا ہو۔ اور سیاسی اعتبار سے ہندوستان کو وہ کانگرسی صحیح النسل نہیں جس نے اپنی زندگی میں جائز پرمٹ لے کر روپیہ پیدا نہ کیا ہو۔ بہر حال میں چونکہ سکھوں کے گھر میں پیدا ہوا ہوں اور بچپن میں میرا ہر روز گوردوارہ جانا لازمی تھا' میں بھی راگ آسا سے واقف تھا اور آسا کے علاوہ مجھے کسی دوسرے راگ سے کوئی واقفیت نہ تھی۔

بہت برس ہوئے روزنہ اخبار "ریعت" کے جاری کرنے اور ریاست ناھب کی ملازمت سے پہلے میں ریاست حیدرآباد گیا۔ میرے وہاں جانے سے کوئی تین برس پہلے سے وہاں کے وزیراعظم مہاراجہ کشن پرشاد سے خط و کتابت تھی۔ اس سفر کی غرض یہ تھی کہ میں حیدرآباد (دکن) میں ملازمت حاصل کروں حیدرآباد پہنچنے سے پہلے راستہ میں ایک ہفتہ کے قریب ناندیڑ (یہ مقام منماڑ اور حیدرآباد کے درمیان چھوٹی لائن پر ہے۔ اس مقام پر ہی گورو گوبند سنگھ کا وصال ہوا' اور اس جگہ جہاں کہ گورو صاحب کا وصال ہوا ایک بہت ہی عالیشان اور اہم گوردوارہ ہے) ٹھہرا۔ ناندیڑ کے گوردوارہ میں بھی ہر روز صبح تین چار بجے کے قریب آسا کی وار ہوتی ہے۔ اس زمانہ میں آسا کی وار کے فرائض ادا کرنے کے لیے ایک موسیقار بھائی تھمن سنگھ تھے جن کا اب انتقال ہو چکا ہے' یہ بھائی تھمن سنگھ موسیقی کے فن مین بہت کمال شخصیت تھے اور انہوں نے ایک نیا ساز بھی خود تیار کیا تھا۔ جو پچاس ساٹھ تاروں پر مشتمل تھا میں جتنے روز ناندیڑ رہا ہر روز صبح تین چار بجے آسا کی وار سنتا' اور آسا کی وار کے سلسلہ میں ایک روز بھائی

تھمن سنگھ نے واگ ایر بھروں میں ایک شبد گایا جس کے بول تھے جے توں متھرا ساڈڑا اک بھوری نہ وچھوڑ (اگر تو یار دوست ہے تو پھر ہمیں ایک لمحہ کے لیے بھی نہ بھولنا) یہ بھائی تھمن سنگھ موسیقی کے فن میں بہت کمال تھے۔ راگ بھروں میں بہت بڑی کشش ہے۔ صبح چھ بجے کا پرسکوں سماں میں نے اس وقت میں ایسی کیفیت سی محسوس کی جسے میں آج تک نہ بھول سکا۔ اور یہ واقعہ ہے کہ جب بھی ریڈیو پر کسی موسیقار سے راگ بھروں سنتا ہوں تو بھائی تھمن سنگھ اور وہ شبد جے تومترا ساڈڑا اک بھوری نہ وچھوڑ یاد آجاتے ہیں

دہلی میں ریڈیو اسٹیشن قائم ہوئے تھوڑا ہی عرصہ ہوا تھا۔ گرمیوں کا زمانہ تھا کہ میں کھلی چھت پر سویا ہوا تھا۔ اور دن بھر کام کرنے کے بعد تھکاوٹ کے باعث نیند کا غلبہ تھا کہ ریڈیو سٹیشن پر ملکہ پکھراج پہاڑی راگ میں پہاڑی گا رہی تھیں میرے مکان سے کچھ فاصلہ پر کسی شخص نے چھت پر ہی ریڈیو لگا رکھا تھا جس کی آواز دور دور تک پہنچ رہی تھی۔ ملکہ پکھراج کے گانے کی آواز میرے کانوں میں بھی پہنچی۔ نیند کا غلبہ تھا میں نے کوشش کی کہ میں سویا رہوں اور میرے کانوں پر اس موسیقی کا کوئی اثر نہ ہو مگر میں ایسا نہ کر سکا۔ اس کا اندازہ کیجیے کہ جس زمانہ میں اس نے ریڈیو پر اس وقت گایا اس زمانہ میں وہ مہاراجہ ہری سنگھ آف جموں وکشمیر کے پاس ایک ہزار روپیہ ماہوار تنخواہ اور مختلف اقسام کے الاؤنس پر ملازم تھیں۔ ریڈیو پر اس وقت گانے کے کئی بعد تک اس کی آواز پھر ریڈیو پر نہ سنی گئی' تو میں نے ریڈیو سٹیشن والوں سے کہا کہ وہ ملکہ پکھراج کو کیوں نہیں گواتے؟ میرے کہنے پر ریڈیو سٹیشن والوں نے اپنا ایک آدمی جموں (جہاں کی ملکہ پکھراج رہنے والی تھی) بھیجا تو وہاں سے پتہ چلا کہ اس نے ایک تحصیلدار کے ساتھ شادی کر لی ہے وہ اب اپنے شوہر کے ساتھ منٹگمری میں ہے اور اسنے شادی کے بعد گانا چھوڑ دیا ہے۔ اس کے بعد ریڈیو سٹیشن والوں نے ملکہ پکھراج کے شوہر کو منٹگمری خط لکھ کر اسے آمادہ کر لیا کہ وہ اپنی بیوی کو گانے کی اجازت دے۔ چنانچہ اس

کوشش کے بعد ملکہ پکھراج نے پھر ریڈیو سٹیشن پر گانا شروع کیا۔ جب اسے تمام حالات کا علم ہوا تو وہ اپنے شوہر کے ساتھ راقم الحروف کے پاس آئیں اور اس کے بعد جموں کے علاقہ کے پہاڑی گیت (ہر پہاڑ کی پہاڑی الگ ہے) لکھوائے اور ان کا ترجمہ بتایا جو اخبار ''ریاست'' میں شائع ہونے کے بعد کتاب ''جذبات مشرق'' میں بھی شائع ہوئے۔ میں اس سال فروری میں پاکستان گیا تو میری خواہش تھی کہ ملکہ پکھراج کے ہاں جاتا اور ان سے پہاڑی سنتا (کیونکہ میرے رائے میں پہاڑی راگ ملکہ پکھراج سے بہتر کوئی دوسرا نہیں گا سکتا) مگر نہ تو وقت کافی تھا اور نہ یہ علم تھا کہ وہ ان کے شوہر آج کل کہاں ہیں؟ میری یہ خواہش پوری نہ ہو سکی۔ اور اب اگر کبھی ہندوستان یا پاکستان کے ریڈیو پر ملکہ پکھراج کے ریکارڈ سنتا ہوں تو پہاڑی راگ سننے کی وہ لذت محسوس ہوتی ہے جسے بیان نہیں کیا جا سکتا۔

چند برس ہوئے پاکستان کے گورنر جنرل مسٹر غلام محمد جب سرکاری دورہ پر دہلی آیا تو ان کے ساتھ ریڈیو پاکستان کے کنٹرولر مسٹر ذوالفقار احمد بخاری بھی تھے۔ اس پاکستانی قافلہ کو دہلی آئے ہوئے دو روز ہوئے تھے کہ دوپہر کے وقت میرے دفتر کے چپڑاسی نے بایا کہ کراچی ریڈیو کے بخاری صاحب تشریف لائے ہیں میں نے اوپر لانے کے لیے کہا یہ تشریف لائے تو بہت اخلاص محبت اور تپاک سے ملے اور جب باتیں شروع ہوئیں تو میں نے بخاری صاحب سے سب سے پہلے کہا۔

''آپ جیسے ہندوستان کے غدار کو گورنمنٹ ہند کے دہلی آنے کی اجازت کس طرح دی؟'' میرے یہ الفاظ سن کر مسٹر بخاری اور ان کے دونوں ہمراہی حیران کہ میں کیا کہہ رہا ہوں؟ کیونکہ وہ اس بدتمیزی اور بداخلاقی کی توقع کسی دشمن سے بھی نہ کر سکتے تھے۔ مسٹر بخاری نے حیرانی پریشانی اور بددلی کے ملے جلے جذبات میں پوچھا کہ:

''میں نے ہندوستان کے ساتھ کیا غداری کی ہے؟''

تو میں نے جواب دیا:

''پاکستان بنتے ہی آپ یہاں کی تمام اچھے گانے والی طوائفیں اپنے ساتھ لے گئے اور ہمیں ناتجربہ کار گماریوں کے رحم و کرم پر چھوڑ گئے اس سے زیادہ آپ ہمارے ملک کے ساتھ کیا غداری کر سکتے ہیں؟''

میرا یہ جواب سن کر تینوں اصحاب کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ چنانچہ گو اب بعض گماریوں نے بھی مشق کرنے کے بعد موسیقی میں ایک مقام حاصل کر لیا ہے۔ اور بعض لڑکیاں بڑا اچھا گا لیتی ہیں۔ مگر تبادلہ آبادی کے زمانہ میں ہندوستان کے ریڈیو سٹیشنوں کو دو اشخاص نے بہت نقصان پہنچایا۔ ایک مسٹر پٹیل جنہوں ں ے اپنے حکم سے ریڈیو سٹیشنوں پر تمام طوائفوں کے گانے کی ممانعت کر دی تھی اور دوسرے مسٹر ذوالفقار احمد بخاری جو تمام اعلیٰ گانے والی طوائفوں کو اپنے ساتھ ہی پاکستان لے گئے۔ اور ہندوستان کے لوگ ان کی دلکش موسیقی سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو گئے۔ اور یہ بخاری صاحب کا کمال ہے کہ پاکستان میں مولوی کلاس ٹائپ کے لوگوں کی سخت مخالفت اور موسیقی کے خلاف جہاد میں بھی انہوں نے وہاں موسیقی جیسی نعمت کو محفوظ رکھا اور اسے ملازم کے ہاتھوں تباہ نہ ہونے دیا اور اسے بخاری صاحب کی موسیقی کے فن پر بہت بڑا احسان قرار دیا جانا چاہیے۔

مجھے بچپن کے زمانہ سے ہی طوائفوں سے بے حد نفرت ہے' اور کسی پیشہ ور طوائف کو دیکھنا بھی اپنے ذہن پر ایک بار سا محسوس کرتا ہوں۔ مگر اچھا گانے والی کوئی طوائف ہو تو اس کا گانا سن لیتا ہوں اور کسی ایسے شہر میں جہاں مجھے کوئی جانتا نہ ہو۔ تو میں گانا سننے کے لیے طوائفوں کے ہاں بھی چلا جاتا ہوں۔ اس سلسلہ کا ایک واقعہ سنیے۔

آج سے چند برس پہلے کرسمس کے دنوں میں کلکتہ اور جون کے پہلے ہفتہ جب دہلی میں زیادہ گرمی ہوتی تو چند روز کے لیے بمبئی جایا کرتا۔ ایک بار کرسمس کے دنوں

میں کلکتہ گیا میرے ساتھ مسٹر یوسف جمالی بھی تھے کلکتہ سے واپسی کے وقت ہم نے فیصلہ کیا کہ الہ آباد اور بنارس بھی دیکھے جائیں۔ ہم الہ آباد اترے ایک ہوٹل میں قیام کیا۔ شام کو سیر کے لیے نکلے۔ تو تانگہ والہ سے پوچھا کہ یہاں الہ آباد میں سب سے اچھا گانے والی کون سی طوائف ہے؟ اس نے جواب دیا کہ جانکی بائی۔ کیونکہ اس زمانہ میں جانکی بائی موسیقی کے اعتبار سے عروج پر تھی۔ میں نے کہا کہ جانکی بائی کے مکان پر چلو۔ تانگہ جانکی بائی کے مکان پر پہنچا تو ہم دونوں یعنی میں اور یوسف صاحب اس کے کمرہ میں چلے گئے۔ کمرہ میں دیکھا تو سناٹا نہ سارنگی والے استاد جی اور نہ طبلچی۔ جانکی بائی ایک پلنگ پر آرام کر رہی تھیں ہمارے کمرہ میں پہنچنے پر جانکی بائی نے پلنگ پر سے اٹھ کر اپنی گدی (یعنی جہاں سفید چاندنی بچھی تھی بڑے بڑے تکیے رکھے تھے اور پاندان اور اگالدان پڑے تھے) پر تشریف لے آئیں۔ اس نے اپن گدی پر بیٹھتے ہی پاندان کھول کر اور پان لگا کر ہمیں دیے پان دینے کے بعد اس نے کہا:

''فرمایئے! کیسے تشریف لائے؟''

میں نے جواب دیا۔

''آپ کی بہت شہرت سنی تھی آپ کا گانا سننے کے لیے آئے ہیں''

جانکی بائی کے ذہن پر ہمارے متعلق یہ اثر تھا کہ یا تو ہم فوجی تلنگے ہیں یا پولیس کنسٹبل اور گانا کی فیس ہم زیادہ سے زیادہ دوسو روپیہ دے دیں گے۔ اس نے جواب دیا۔

''استاد جی (یعنی سارنگیے) بیمار ہیں اس لیے ہم نے گانا بند کر رکھا ہے افسوس کہ آپ کو یہاں آنے کی زحمت ہوئی''۔

اس کا مطلب یہ تھا کہ واپس چلے جایئے۔ اور کسی دوسری ادنیٰ کلاس کی طوائف کے ہاں غزل ماہیا کاٹپہ سن لیجیے۔ یوسف صاحب طوائفوں کی سائیکالوجی سے خوب واقف تھے۔ آپ جانکی بائی کا یہ جواب سن کر کھڑے ہو گئے اور آپ نے مجھے مخاطب

کرتے ہوئے کہا۔

’’چلیے کسی اور بڑی طوائف کے ہاں چلتے ہیں آخر کسی نہ کسی سے تو ہمیں فیصلہ کرنا ہی پڑے گا‘‘۔

یوسف صاحب کے ان الفاظ کا مقصد یہ تھا کہ ہم کسی بڑی تقریب کے لیے کسی بہت اعلیٰ گانے والی طوائف کو مقرر کرنا چاہتے ہیں جانکی بائی نے جب یوسف صاحب کے یہ سنا تو وہ سمجھی یکہ یہ فوجی یا پولیس کے تلنگے نہیں ہیں یہ تو کسی بڑے مقصد کے لیے آئے ہیں۔اس نے یوسف صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

’’آپ تشریف تو رکھیے آپ کہاں سے آئے ہیں؟‘‘

یوسف صاحب ان معاملات میں بہت تجربہ کار ہیں آپ نے فوراً جواب دیا:

’’ہمارے تعلقہ وار صاحب کے لڑکے کی شادی ہے۔اس شادی کی تقریب کے سلسلہ میں دو تین بہت ہی اعلیٰ گانے والی طوائفوں کی ضرورت ہے۔تعلقہ دار نے انتخاب کے لیے بھیجا ہے۔اس لیے یہاں بھی آئے ہیں‘‘

یوسف صاحب کا یہ جواب سن کر جانکی بائی نے کہا۔۔

’’آپ تشریف رکھیے میں بلواتی ہوں اگر استاد جی آسکیں‘‘

چنانچہ جانکی بائی نے اپنے پہاڑیے ملازم کو بھیجا کہ وہ فوراً سازندوں کو لے آئے۔ چار پانچ منٹ میں سازندے سارنگی اور طبلہ وغیرہ اٹھائے آ گئے۔ساز شروع ہوئے اور جانکی بائی نے سب سے پہلے وقت کا راگ دیس گایا۔اور اس کے بعد اس بیچاری نے ایک گھنٹہ کے قریب اپنی پوری کوشش کے ساتھ اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔جب یہ ایک گھنٹہ کے قریب بطور سیمپل گا چکیں تو میں نے یوسف صاحب کے کان میں پوچھا کہ اس کو کتنے روپے دینا چاہئیں؟ کیونکہ طوائفوں کے معاملہ میں میں بالکل ناتجربہ کار اور رنگروٹ ہوں اور یوسف صاحب کو اس میدان میں نارتھ کمانڈ کا کرنل انچیف کہنا چاہیے۔میرا خیال تھا کہ اس بیچاری نے اپنا پورا زور صرف کر کے گایا ہے۔اسے دس

روپے ضرور دیے جائیں (طوائفوں کے معاملہ میں میری فیاضیاں یا میری حیثیت دس روپیہ سے زیادہ کبھی آگے نہیں بڑھی) یوسف صاحب نے میرے کان میں جواب دیا۔

''قطعی کچھ نہ دینا ورنہ معاملہ گڑبڑ ہو جائے گا''۔

آپ نے جانکی بائی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''آپ ماشاءاللہ خوب گاتی ہیں اور اپنے فن میں خوب ماہر ہیں یہ بتایئے اگر آپ ایک ہفتے کے لیے آئیں تو آپ کی فیس کیا ہو گی؟''

جانکی بائی نے نہایت انکساری کے لہجہ میں جواب دیا۔

''میری فیس ایک ہزار روپیہ سے کم نہیں ہے۔ میں اکثر بڑی بڑی ریاستوں اور جاگیرداروں کے ہاں جاتی ہوں اور یہی فیس لیتی ہوں''۔

جانکی بائی کا یہ جواب سن کر یوسف صاحب نے کہا۔

''ہاں آ جیسی صاحب کمال گانے والی کو فیس اس سے کم کیا ہو سکتی ہے۔ بہت اچھا میں اپنے تعلقہ دار صاحب سے بات کر لوں تو پھر حاضر ہوں گا۔ آپ کو ہمارے ہاں آنے سے بہت تکلیف ہوئی''۔

یہ کہہ کر ہم دونوں اٹھ کھڑے ہوئے جانکی بائی بھی اخلاقاً کھڑی ہو گئیں اور ہم آداب کہہ کر واپس ہوٹل چلے آئے اور اگلے روز صبح دہلی کے لیے روانہ ہو گئے الہ آباد اور دہلی کے درمیان میں نے باتوں باتوں میں یوسف صاحب سے کہا:

''منو بھگوان نے منوسمرتی میں لکھا ہے کہ گوشت کھانے والا' گوشت پکانے والا' اور گوشت لانے والا۔ سب ہی پاپی یعنی گنہگار ہیں۔ اور سب کا جرم ایک ہی جیسا ہے۔ منو بھگوان کے اس ارشاد کے مطابق جانکی بائی کے ساتھ جو تم نے چار سو بیس کی ہے اس میں میرا کوئی قصور نہیں اس کے تم ہی ذمہ دار ہو۔ مگر اس چار سو بیس کی سزا مجھے بھی ملے گی۔ کیونکہ میں نے تمہارے ساتھ مل کر اس کا گانا سنا''۔

یہ سن کر یوسف صاحب ہنس دیے اور کہا۔

''جانکی بائی نے ہمیں فوجی رنگروٹ یا پولیس کے سپاہی سمجھا تو ہم نے کیا جرم کیا؟ بلکہ اس کا گانا سننے کے لیے تھوڑا سا جھوٹ بول دیا۔ اگر وہ ویسے ہی گانا سنا دیتی اور انکار نہ کرتی تو ہم اس پر دس روپے صرف کر دیتے۔ صرف گانا سننے کے لیے ہم الہ آباد اترے آخر میں اس کی بھی کوئی قیمت ہونی چاہیے''۔

موسیقی کے متعلق میری رائے یہ ہے کہ گانے کی مردوں پر قانوناً پابندی عائد کر دی جائے تو اچھا ہو۔ کیونکہ صرف عورت ہی موسیقی کے لیے موزوں ہے، جس کے گلے میں قدرت نے اثر عطا کیا ہے۔ اور موسیقی کو ہر کالج سکول اور تعلیمی انسٹی ٹیوشن میں جگہ دی جانی چاہیے۔ کیونکہ جہاں تک دل دماغ روح اور اعصاب کے لیے مفید ہونے کا تعلق ہے موسیقی کو لذیذ ترین کھانا کھانے حسین ترین اشیاء کو دیکھنے اور بہترین عطریات کو سونگھنے کے مقابلہ میں بہت بلند مرتبہ حاصل ہے اور اس شخص کے لیے جو موسیقی سے لذت آشنا ہو اچھی موسیقی بلاشبہ آبِ حیات سے کم نہیں۔

عیش اور ضرورت میں فاصلہ

راجپوتانہ کی ریاستوں میں بیداری اور سیاسی تحریک پیدا کرنے والے ایک لیڈر مسٹر رام نرائن چودھری (جو پچھلے چند برس تو بھارت میں سیوک سماج میں کام کرتے رہے اور اب آپ نے ایک نئی سیوک سماج قائم کی ہے) غالباً دس پندرہ برس مہاتما گاندھی کے ساتھ ان کے آشرم میں رہے۔ چودھری صاحب راقم الحروف کے دیرینہ اور مخلص دوستوں میں سے ہیں۔ آپ مہاتما گاندھی کے سیوا گرام آشرم میں سے کسی کام کے لیے جب دہلی آتے تو دفتر ''ریاست'' میں ضرور تشریف لاتے۔ اور چند گھنٹہ ان کے ساتھ گاندھی جی اور ان کے آشرم کے متعلق ہی باتیں ہوتی رہتیں۔ میں خرید کرید کر ان سے مہاتما جی کے ذاتی اخلاقی اور سیاسی کریکٹر کے متعلق پوچھا کرتا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ چودھری صاحب نے مہاتما جی کی زندگی کے متعلق جو معلومات حاصل کیں انہوں نے ہی میری زندگی مین ایک انقلاب یا موڑ پیدا کر دیا۔

مسٹر رام نرائن چودھری ایک روز باتیں کر رہے تھے تو ان سے معلوم ہوا کہ مہاتما گاندھی کے آشرم میں جو لوگ مستقل طور پر مقیم ہیں ان کو آشرم سے اخراجات کے لیے فی کس پندرہ روپیہ ماہوار ملتا ہے۔ مثلاً اگر ایک شخص کی بیوی اور دو بچے ہیں تو اس گھر کے چار افراد کے لیے ساٹھ روپیہ دیے جاتے ہیں۔ اور جس خاندان میں چھ افراد ہیں اسے نوے روپے ماہوار ملتے ہیں۔ میں نے چودھری صاحب سے جب اس الاؤنس کے متعلق مزید دریافت کیا تو آپ نے بتایا کہ آشرم میں ایک اصول مقرر کر دیا گیا ہے اور وہ اصول یہ ہے کہ وہاں لگژری یعنی عیش اور نیسے سٹی یعنی ضروریات میں ایک لائن کھینچ دی گئی ہے۔ اور کوئی شخص بھی اس لائن سے ادھر ادھر نہیں جا سکتا۔ مثلاً ریلوے کا سفر کیا جائے تو تیسرے درجہ میں سفر کرنا ضروریات میں سے ہے مگر انٹر سیکنڈ یا فسٹ کلاس میں سفر کرنا عیش میں داخل ہے۔ اس لیے آشرم سے تعلق رکھنے والا ہر شخص مہ مہاتما گاندھی کے تیسرے درجہ میں ہی سفر کرتا ہے۔ کھانے کی اشیاء میں صرف دو

چیزیں رہ جاتی ہیں۔ جو صحت اور زندگی کے لیے مفید ہیں۔ اور ان چیزوں سے قطعی پرہیز کیا جاتا، جو صرف لذیذ ہوتیں۔ کپڑا صرف وہی پہنا جاتا جو جسم کو سردی یا گرمی سے محفوظ رکھ سکے۔ اور اس کپڑے کو نہ پہنا جاتا جو صرف خوبصورتی کے لیے ہو مثلاً ریشمی کپڑا۔ اس طرح کی چند ہی مثالیں اور پیش کی جاتی ہیں مثلاً:

۱۔ اگر کوئی شخص تجارتی اغراض کے لیے اپنے دفتر میں ٹیلی فون رکھتا ہے تو یہ ضروریات میں سے ہے۔ اور اگر وہ صرف گپ بازی اور تفریح کے لیے ٹیلی فون رکھتا ہے تو یہ عیش ہے۔

۲۔ اگر ایک کاروباری شخص وقت کی بچت کے لیے موٹر رکھتا ہے، اور یہ موٹر کاروبار کے سلسلہ میں دن بھر مصروف رہتی ہے۔ تو یہ ضروریات میں سے ہے اور اگر موٹر صرف سیر و تفریح کے لیے ہے تو یہ عیش ہے۔

۳۔ پہننے کے لیے تین چار یا پانچ جوڑے رکھنا ضروریات میں سے ہے اور کپڑوں سے ٹرنک اور بکس بھر رکھنا عیش میں داخل ہے۔

۴۔ دو چار یا پانچ یا دس روپیہ کا مضبوط اور دیر تک چلنے والا فونٹین پین خرید کر استعمال کرنا ضروریات میں سے ہے۔ اور ایک سو روپیہ کا قیمتی اور پارکر یا کوئی دوسرا قلم خرید کر استعمال کرنا عیش ہے۔

یعنی جو شے مفید ہو اور کم قیمت پر مل سکے وہ ضروریات میں داخل ہے اور جو شے اتنی ہی مفید ہو اور زیادہ کی قیمت کی ہو وہ عیش قرار دی جا سکتی ہے۔

مسٹر رام نرائن چودھری میں سے میں نے جب یہ سنا تو میرے ذہن میں بھی ضروریات اور عیش کے درمیان ایک لائن یا فاصلہ قائم کرنے کی سپرٹ پیدا ہوئی۔ اور میری نگاہوں نے دیکھنا شروع کر دیا کہ کون سی ضروریات میں داخل کی جا سکتی ہے اور کس شے کو عیش قرار دیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ایک سلسلہ کا ایک واقعہ دلچسپ ہے میں اس زمانہ میں قرول باغ کے ایک مکان میں رہتا تھا۔ اور دفتر ''ریاست'' ہملٹن روڈ پر

تھا۔ چودھری صاحب سے ضروریات اور عیش کے مسئلہ پر باتیں ہو رہی تھیں اور شام کو میں قرول باغ والے مکان پر پہنچا' تو میں رات کو بہت دیر تک اس مسئلہ پر سوچتا رہا۔ کہ مجھے ضروریات اور عیش کے درمیان فاصلہ قائم رکھنے کے لیے کیا کرنا چاہیے؟ چنانچہ میں اگلے روز جب نو بجے کے قریب دفتر جانے والا تھا تو میں نے اس مکان کی دیواروں کی تمام تصاویر جو آرٹ کے اعتبار سے بہت قیمتی اور قطعوں میں تھیں اتروا کر اپنی کار میں رکھ لیں۔ یہ تصاویر بہت خوبصورت اور سالہا سال سے میرے پاس تھیں۔ اور بعض آرٹسٹوں نے بھی بہت پسند کیا تھا۔ جن کی تعداد پچاس کے قریب تھی۔ ان تمام تصاویر کو میں نے دفتر میں لے جا کر دفتر کے سٹاف میں تقسیم کر دیا۔ اور جب یہ تصاویر دفتر کے سٹاف میں تقسیم کی جا رہی تھیں تو سٹاف کے لوگ ایک دوسرے کو حیرت کے جذبات سے دیکھ رہے تھے۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ میں کہیں پاگل تو نہیں ہو گیا کہ سالہا سال کی رکھی ہوئی تصاویر جو مجھے بہت عزیز تھیں اس طرح بیدردی کے ساتھ ان لوگوں کو دے رہا ہوں میں نے ان لوگوں کی حیرت اور تعجب کو جب محسوس کیا تو میں مسکرا دیا اور ان کی تسلی کے لیے کہا:

''آپ کوئی خیال نہ کیجیے میرے دماغی توازن میں کوئی فرق نہیں آیا۔ میں صرف ضروریات اور عیش میں ایک فاصلہ کرنے کی بسم اللہ کر رہا ہوں''۔

یہ تصاویر میں نے وقتی جذبات سے مغلوب ہو کر تقسیم تو کر دیں مگر شام کو جب قرول باغ والے مکان میں پہنچا تو مکان کے کمروں کی دیواروں کو خالی پایا تو بہت افسوس ہوا۔ اور ایسے محسوس ہوتا تھا جیسے دیواریں بیوہ ہو چکی ہیں۔ اور تو پھر اس نتیجہ پر پہنچا کہ میں نے جو قدم اٹھایا ہے وہی مناسب تھا اور مجھے افسوس نہ کرنا چاہیے۔ چنانچہ اس کے بعد ضروریات اور عیش کے درمیان فاصلہ قائم کرنے کا قدم میں بڑھاتا ہی چلا گیا۔ گو اس پورے طور سے کامیابی نہیں ہو سکی کیونکہ اب بھی جب خط لکھتا ہوں تو ڈائی سے چھپی ہوئی اعلیٰ درجہ کی سٹیشنری کے بغیر لکھنے کو جی نہیں چاہتا۔ حالانکہ اگر گاندھی

ازم کی پیروی کی جائے تو مجھے ڈاک خانہ کے سرکاری خاکی رنگ کے کارڈ اور لفافے کے اندر ارزاں ترین قسم کا کاغذ استعمال کرنا چاہیے جیسا کہ مہاتما گاندھی استعمال کرتے تھے۔ یعنی حسن پرستی کے جذبات اب بھی ساتھ دیتے چلے آ رہے ہیں گو ان میں کافی کمی پیدا ہو چکی ہے۔ اور جہاں تک تصاویر کا تعلق ہے میرے پاس اب سوائے چند مخلص دوستوں کے فوٹو کے ایک تصویر بھی ایسی موجود نہیں جو دیواروں کے آرائش کے لیے ہو' کیونکہ میں اسے عیش قرار دیتا ہوں۔ اور اسے ضروریات میں سے نہیں سمجھتا۔ اور دوستوں کے فوٹو صرف اس لیے رکھے ہیں کہ ان کو دیکھ کر کبھی کبھی پچھلے حالات کی یاد تازہ کر لی جائے اور اگر ممکن ہو تو ان دوستوں کی یاد میں آنسو بھی بہا لیے جائیں۔

گاہے گاہے باز خواں ایں دفتر پارینہ را
تازہ خواہی داشتن گر داغ ہائے سینہ را

عیش اور ضروریات میں فاصلہ قائم کرنا بے حد مشکل ہے اور بعض لوگوں کے لیے یہ ناقابل عمل بھی ہو گا کیونکہ سالہا سال تک عیش کی زندگی بسر کرنے کے بعد اب صرف ضروریات تک قانع رہنا ایک حد تک نفس کشی ہے۔ مگر عیش اور ضروریات کے درمیان لائن یا فاصلہ قائم کر کے اپنی خواہشات کو صرف ضروریات تک محدود رکھنے میں بہت ہی راحت اطمینان اور مسرت ہے۔ اور جو لوگ اس راہ میں قدم اٹھانا چاہیں ان کو قوت ارادی سے بھی کام لینا پڑے گا۔ کیونکہ عیش میں بہت کشش ہے اور اپنی ذہن کو ضروریات تک محدود رکھنا انتہائی مشکل ہے۔

☆☆☆

عیش اور ضروریات میں فرق

مرحوم حضرت سالک ایڈیٹر ''انقلاب'' نے ایک بار خوب کہا تھا:

''اگر کاتب قرآن کی کتابت کرتے ہوئے قرآن کے مقاصد اور مطالب پر غور اور عمل کرتے تو قرآن کی کتابت کرنے والا ہر کاتب پیغمبر یا ولی ہوتا۔ کیونکہ ان کاتبوں میں سے اکثر نے دس دس بارہ بار قرآن کی کتابت کی ہے؟''

مرحوم سالک کا یہ بیان بہت ہی پر معنی اور قابل غور ہے۔ کیونکہ ایک کتاب کو شروع کر کے اس کو ختم کر دینے اور اس پر عمل کرنے میں بہت بڑا فرق ہے۔ اور اس کتاب کا پڑھنا تب ہی مفید ہوسکتا ہے جب اس پر عمل کیا جائے۔

میر مشتاق احمد (سوشلسٹ لیڈر) بہت بلند لوگوں میں سے ہیں۔ ایک بار ان سے کانگرسی حضرات کی بددیانتی بے ایمانی پرمٹ بازی اور رشوت کے سلسلہ میں بات چیت ہو رہی تھی اور راقم الحروف نے جب ان کانگرسی حضرات کی ان ننگ اخلاق حرکات پر تعجب کا اظہار کیا اور کہا کہ ان لوگوں میں وہ حضرات بھی شامل ہو گئے جو سالہا سال تک مہاتما گاندھی جی کے ساتھ رہنے کے بعد بھی اپنی فطرت نہ بدل سکے اور بددیانت ہی رہے''۔

میر مشتاق احمد کے اس بیان کا مطلب بھی یہی ہے کہ اچھی کتابیں پڑھنے اور اچھے لوگوں کے ساتھ رہنے کی صورت میں نہ بدلنے والے اپنے ضمیر میں تبدیلی پیدا نہیں کرتے۔

مہاتما گاندھی موجودہ صدی کی غالباً سب سے بڑی شخصیت تھے۔ اور ان میں سینکڑوں نہیں شائد ہزارہا صفات ایسی تھیں جن پر عمل کرتے ہوئے انسان پیتل سے سونا بن سکتا ہے۔ اور آپ ان کی صفات میں ایک بڑی صفت یہ تھی کہ آپ نے اپنی زندگی میں ضروریات اور عیش (یعنی نسیسٹی اور لگژری) میں ایک لائن کھینچ دی ہے۔ اور اس لائن کو اپنی تمام زندگی میں ہمیشہ قائم رکھا۔ اور کوشش کی کہ آپ کے مقلدین

بھی ضروریات اور عیش میں ایک لائن قائم کریں اور دونوں کو ملنے نہ دیا جائے ۔ کیونکہ اگر انسان کی زندگی کا مقصد سکھ راحت اور آرام ہی ہے تو یہ سکھ راحت اور آرام اس لائن کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتے ۔ کیونکہ اگر بغیر اس لائن کے اختیار کیے سکھ اور راحت نصیب ہو سکتی تو آج برلے‘ ڈالمیے‘ اور سنگھانیے آرام اور راحت کی زندگی بسر کرتے ۔ جن کے پاس کروڑوں روپے موجود ہیں کیونکہ واقعہ یہ ہے کہ یہ لوگ جب ہزار ہا روپیہ کے مالک تھے تو انہوں نے چاہا کہ یہ لاکھوں روپیہ پیدا کریں اور جب انہوں نے لاکھوں روپیہ پیدا کر لیے تو ان کی نگاہیں کروڑوں تھیں اور انہوں نے جب کروڑوں روپیہ حاصل کر لیے تو یہ اب اربوں روپیہ کے خواب دیکھ رہے ہیں ۔

راقم الحروف کو اپنی زندگی میں مہاتما گاندھی سے صرف ایک بار صرف ایک یا دو منٹ کے لیے ملنے کا اتفاق ہوا جب کہ راستہ چلتے ہوئے مرحوم مولانا محمد علی نے مہاتما جی سے ملوایا۔ حالانکہ سالہا سال تک یہ خواہش رہی کہ کچھ بھی عرصہ مہاتما گاندھی کے قدموں میں رہنے اور ان کے اسوہ حسنہ سے کچھ حاصل کرنے کا موقع نصیب ہو اور راقم الحروف اپنی اس خواہش کے پورے نہ ہونے کی وجہ سے اپنی بدقسمتی اور بدنصیبی سمجھتا ہے ۔ مگر جب بھی ایسی شخصیت سے ملنے کا اتفاق ہوا جو مہاتما جی کے قریب رہا کرتی تھی تو کوشش کی گئی کہ اس شخصیت کے ذریعہ سے ہی کچھ حاصل کر سکوں ۔

مہاتما گاندھی کے خیال کے مطابق ضروریات اور عیش میں ایک لائن ہونی چاہیے اور اس لائن کی پرواہ نہ کرنا عیش اور فضول خرچی ہے ۔ تو مہاتما گاندھی کے اس خیال کو میں نے اپنے ذہن میں محفوظ کر لیا۔ اور اس کے بعد کوشش کی گئی کہ میں بھی ضروریات اور عیش میں ایک لائن کھینچ لوں اور اس پر عمل کروں ۔ مگر میں اس کا اقرار کرتا ہوں کہ مجھے اب تک کامیابی نصیب نہیں ہوئی ۔ اور اگر کامیابی نصیب ہوئی تو بہت کم ۔ برائے نام ۔ کیونکہ ایک شخص کا جیسا کریکٹر بن جائے یا اگر کوئی بات فطرت کا ایک حصہ بن

چکی ہوتو اس کریکٹر یا فطرت کو بدلنے کے لیے کئی برس تک ضمیر کے ساتھ جنگ کرنا پڑتی ہے۔ یا دوسرے الفاظ میں اپنی آتما کو کئی برس تک برائی سے دور رکھنے کے لیے ٹھوکریں لگانا پڑتی ہیں۔ چنانچہ اس سلسلہ میں اپنے کچھ واقعات یا تجربات بیان کرتا ہوں:

۱۔ ۱۹۴۲ء کے بعد سے میں اپنے کپڑے خود دھوتا ہوں۔ کیونکہ کپڑوں کا دھونا خود ضروریات میں داخل ہے اور دھوبی سے کپڑے دھلوانا صرف عیش ہے بلکہ اسے صحت کے لیے بھی نقصان سمجھتا ہوں۔ کیونکہ دھوبی کپڑے دھوتے ہوئے دوسرے لوگوں کے گندے کپڑے ان کپڑوں میں ملا کر دھوتے ہیں۔ اور کپڑے دھوتے ہوئے کچھ ورزش بھی ہو جاتی ہے۔

۲۔ مہاتما گاندھی جب کوئی خط یا مضمون لکھتے تو اس کاغذ کے اس بقایا حصے کو پھاڑ کر دوسرے خط یا مضمون کے لیے رکھ لیتے۔ جو خالی یعنی کورا رہ جاتا۔ کیونکہ خالی کاغذ کا ضائع کرنا وہ عیش قرار دیتے تھے۔ مگر میں اس سلسلہ میں قطعی ناکام ہوں، کیونکہ اچھے سفید اور ڈائی کے چھپے ہوئے کاغذوں اور کارڈوں کے بغیر لکھتے ہوئے کچھ ذہنی کوفت سی ہوتی ہے۔ حالانکہ یہ عیش ہے اور اسے ضروریات میں داخل نہیں کیا جا سکتا جس کی وجہ حسن پرستی کے فطری جذبات ہیں جن پر میں قادر نہ ہو سکا۔

۳۔ کئی برس سے میں اپنا کھانا خود پکاتا ہوں اور وہ کھانا صرف ایک دال اور سبزی یا گوشت کی صورت میں ہوتا ہے۔ انسان کا خود کھانا پکانا میں ضروریات میں سے سمجھتا ہوں اور چانکہ میں صرف ہانڈی پکاتا ہوں اس کا میری صحت پر بہت اچھا اثر پڑا۔ کیونہ جب باورچی کے پکائے ہوئے مرغن اور کئی اقسام کے کھانے کھاتا تھا تو میرا وزن دوسو ساٹھ پونڈ (تین من دس سیر) تھا جسے عیش قرار دیا جانا چاہیے۔ اور اب میرا وزن ایک سو ستر پونڈ (دو من پانچ سیر) ہے اور میں اس کوشش میں ہوں کہ اس وزن میں اور بھی کمی ہو جائے کیونکہ طبابت کے اصول کے مطابق میرا وزن ایک سو ساٹھ

پونڈ سے زیادہ نہیں ہونا چاہیے۔

۴۔ میرے پاس ہمیشہ یہ کتے رہے اور اس وقت بھی میرے پاس کاکر سپیشل کتوں کا ایک جوڑا موجود ہے۔ کیونکہ میری السیشن کتیا کو جو چند ماہ ہوئے یہاں سے چیتا اٹھا کر لے گیا ہے۔ کتوں کا رکھنا بلاشبہ عیش میں داخل ہے مگر میں کیا کروں؟

میں میرے ساتھ لیٹتے ہیں تو ایسا حظ محسوس کرتا ہوں کہ جس کی مثال بہترین شراب' لذیذ ترین کھانے' روشن آرا بیگم کی موسیقی اور حسین ترین عورت کو بھی دیکھنے میں نصیب نہیں ہوسکتی۔

۵۔ میری موجودہ قیام گاہ ڈیرہ دون سے چھ میل اور راجپوتانہ سے ایک میل اچپور روڈ پر جنگل میں ہے۔ اور اس کاٹیج کے تین کمرے ہیں۔ ان تین کمروں میں سے ایک کمرہ تو لٹریچر کتابوں اور پرانے فائلوں سے بھرا پڑا ہے اور اس میں کھڑا ہونے کی بھی جگہ نہیں۔ ایک کمرہ مہمانوں کے لیے وقف ہے۔ کیونکہ اکثر دوست تشریف لاتے ہیں۔ اور ایک کمرہ میرے لیے ہے جس میں میرا دفتر میرا ڈرائنگ روم اور میرا بیڈ روم ہے۔ یعنی میری تمام ضروریات اسی کمرہ میں موجود ہیں۔ اگر غور کیا جائے تو میرا قیام ایک کاٹیج میں ہونا بلاشبہ عیش ہے۔ اور مہاتما گاندھی کے اسوہ حسنہ کی پیروی کرتے ہوئے مجھے ایک کٹیا میں رہنا چاہیے کیونکہ کٹیا ہی ضروریات میں داخل ہے۔ مگر چونکہ لٹریچر اور مہمانوں کی رہائش کا بھی سوال ہے' اس لیے میں اپنے ذہن پر جبر کرتے ہوئے اس کاٹیج کو ضروریات میں سے سمجھتا ہوں کہ اس کے بغیر گزارہ نہیں ہو سکتا۔ لٹریچر کہاں رکھا جائے اور مہمان آئیں تو کہاں قیام کریں؟

۶۔ میں زندگی بھر چھ گھنٹے سویا اور اٹھارہ گھنٹے کام کرتا۔ اور کی صورت یہ ہوتی' کہ رات کو نو بجے سو جاتا' اور تین بجے کام کرنے بیٹھ جاتا۔ جو لوگ چھ گھنٹہ سے زیادہ سوتے ہیں وہ صرف بدترین قسم کی عیش کے مرتکب ہوتے ہیں۔ بلکہ اپنی صحت کے ساتھ بھی ظلم کرتے ہیں اور میں ان لوگوں کو تو انسان نہیں حیوان سمجھتا ہوں جو سورج

کے طلوع ہونے کے بعد بھی سوتے ہیں کیونکہ سورج کے طلوع ہونے کے بعد اعصاب کی قوت تباہ ہو جاتی ہے۔میری رائے ہے زیادہ سونے والے حضرت بابا فرید گنج شکر کے اس قول پر عمل کریں کہ بابا صاحب نے فرمایا ہے ''پچھلی رات نہ جاگیوں جیوندڑا مویوں'' (اگر علی الصبح نہیں جاگتا' تو سمجھ لے' کہ تو زندہ ہی مر گیا) کہ سونا یقیناً ضروریات میں سے ہے' کیونکہ اس سے صحت اچھی رہتی ہے۔اور زیادہ سونا یقیناً عیش میں داخل ہے' کیونکہ زیادہ سو کر انسان اپنا وقت اور صحت دونوں تباہ کرتا ہے۔

۷۔مہاتما گاندھی کی زندگی کا ایک دلچسپ واقعہ ہے کہ مہاتما جی افریقہ میں وکالت کرتے تھے۔ایک روز آپ نے دس بجے عدالت میں جاتا تھا۔دھوبی نے وعدہ کیا کہ وہ عدالت میں پہن کر جانے کا کالر دھو کر صبح نو بجے تک آئے گا۔مگر دھوبی نو بجے نہ آیا مہاتما جی عدالت جانا ضروری سمجھتے تھے۔آپ نے اسی روز فیصلہ کیا کہ آئندہ دھوبی کے رحم پر نہیں رہیں گے۔اور اپنا کالر خود دھویا کریں گے۔مہاتما گاندھی کے اسوہ حسنہ کے مطابق جو لوگ ملازموں کے رحم پر رہتے ہیں وہ یقیناً عیش کے مرتکب ہیں۔اگر کام زیادہ ہو' اور انسان یہ زیادہ کام خود نہ کر سکے تو ملازم یا ملازموں کا رکھنا ضروریات میں سے ہے اور اگر کام کم ہو تو خود کام نہ کرنا اور ملازم کے رحم پر رہنا یقیناً عیش ہے جس کو جائز قرار نہیں دیا جا سکتا۔

۸۔وقت دیکھنے کے لیے گھڑی کا اپنے پاس رکھنا ضروریات میں داخل ہے۔ تا کہ انسان وقت کی قدر کر سکے۔اور گھڑی اچھی کوالٹی کی ہونی چاہیے۔ جو درست وقت بتا سکے۔مگر زیادہ قیمتی سونے کی گھڑی یقیناً عیش ہے جس کو فضول خرچی ہی قرار دیا جا سکتا ہے۔

۹۔مہاتما گاندھی ریلوے کے تیسرے درجہ میں سفر کرتے تھے کیونکہ یہ ضروریات میں داخل تھا اور وہ اعلیٰ درجوں میں سفر کرنا عیش قرار دیتے تھے۔اعلیٰ درجوں میں سفر

کرنا یقیناً عیش کے جرم کا ارتکاب ہے مگر میں اس اعتبار سے قطعی ناکام ہوں۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ تیسرے درجہ میں جب زیادہ ہجوم ہو تو میں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ جیسے میرا دم گھٹ رہا ہے۔ اور سفر میں رات کو نہ سونا تو صحت کے اعتبار سے میرے خیال میں زیادہ تکلیف ثابت ہوتا ہے۔ اس لیے میں مجبور ہوں کہ اعلیٰ درجہ میں سفر کر کے عیش کو ضرورت ہی سمجھوں۔

۱۰۔ لباس سادہ اور آرام دہ ہونا چاہیے۔ مگر جہاں تک عورتوں کا سوال ہے میری رائے ہے کہ ان کو کشش والا لباس پہننے کا حق حاصل ہے۔ کیونکہ عورت کی فطرت میں یہ داخل ہے کہ وہ خوبصورت معلوم ہو۔ اور وہ دوسروں کو اپنی خوبصورتی کی داد حاصل کرے۔ عورتوں کے خوبصورت لباس کو میں ضروریات میں سے قرار دیتا ہوں۔ اور مردوں کے فیشن کو عیش سمجھتا ہوں جس کی اجازت نہ ہونی چاہیے۔

ضروریات اور عیش کے درمیان لائن کھینچنے اور اس پر عمل کرنے کے اعتبار سے میں اب تک پورے طور سے کامیاب نہیں ہو سکا۔ اور نہیں کہہ سکتا کہ اپنی زندگی میں کامیاب بھی ہوں گا یا نہیں۔ گو اس کے لیے کوشش میں مصروف ہوں۔ مگر جو لوگ سکھ آرام اور راحت کی زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں تو ان کے لیے مناسب یہ ہے کہ وہ ضروریات اور عیش کے درمیان ایک مضبوط لائن کو کشید کریں اور انتہائی کوشش کی جائے۔ کہ ضروریات اور عیش ہم آغوش نہ ہوں کیونکہ عیش کی کوئی انتہا نہیں جبکہ والیان ملک رؤسا سیٹھ ساہوکار اور کروڑ پتی بھی دن رات عیش میں مصروف رہنے کے باعث بھی اپنی خواہشات کو پورا نہیں کر سکے۔ اور یہ مزید عیش چاہتے ہیں۔ تو ان کو آرام اور راحت نصیب ہونے کا کیا سوال ہے؟ آرام اور راحت تو اسی میں ہے کہ انسان اپنی ضروریات تک محدود رہے اور ضروریات اور عیش کو ہم آغوش نہ ہونے دے۔

☆☆☆

بہادر شاہ بادشاہ کے جوتے کا نیا جنم

دہلی کے چیف کمشنر مسٹر الیکو بیتھ کے ساتھ دہلی ایڈمنسٹریشن کی رشوت اور بد دیانتی کے متعلق ایک بار میری بات چیت ہو رہی تھی تو مسٹر الیکو۔تھ نے بتایا کہ وہ جب انڈین سول سروس کا امتحان دینے والے تھے تو آپ نے اس کتاب ایشیا کے متعلق پڑھی تھی جس میں انگریزوں کو ہدایت کی گئی تھی کہ جب تم الیگزینڈر یا سے آگے قدم رکھو تو ایشیا کے ہر شخص کو چور اور بد دیانت سمجھو۔ مسٹر الیکو۔تھ نے کہا کہ آپ نے جب یہ کتاب پڑھی تو بار بار یہ خیال آتا تھا کہ اس کتاب کے مصنف نے بہت ہی مبالغہ سے کام لیا ہے کیونکہ یہ کیسے ممکن ہے کہ کسی جگہ رشوت اور بد دیانتی کی اتنی زیادتی ہو گی' مگر آپ جب ہندوستان پہنچے تو آپ نے دیکھا کہ تلاش کرنے پر بھی کوئی ایماندار اور دیانتدار شخص نہیں مل سکتا۔ کسی بازار میں جائیے ہر دکاندار جھوٹ بولتا ہے کوئی سچ نہیں کہتا۔ کسی دکان پر قیمتیں مقرر نہیں گاہک دکاندار کی جیب کاٹنے کی فکر میں ہیں اور دکاندار چاہتا ہے کہ وہ گاہک کی جیب تراشی کرے۔ بڑے سے بڑا افسر جھوٹ بولتا ہے اور اس ملک میں قابل اعتماد لوگوں کا بہت قحط ہے۔

مسٹر الیکو۔تھ کا یہ بیان صداقت سے خالی نہ تھا کیونکہ جہاں یورپ اور امریکہ کا ہر شخص سچ بولتا ہے جھوٹ بونا ایک انتہائی شرمناک فعل قرار دیا جاتا ہے اور جرائم کرنے والے لوگ بھی جھوٹ نہ بولتے ہوئے بغیر کسی تشدد کے عدالتوں میں جا کر اپنے جرم کا اقرار کر لیتے ہیں۔ ہندوستان اور ایشیاء کے دوسرے ممالک میں جھوٹ کا ہی سلسلہ رائج ہے۔ یہاں کی عدالتوں میں ملزم تو کیا ایک گواہ بھی ایسا نہ ملے گا جو جھوٹا حلفی بیان نہ دیتا ہو۔ وکیلوں کا کام ہی جھوٹ تصنیف کرنا' جھوٹ بولنا گواہوں اور ملزموں کو جھوٹ بولنے کی ترغیب دینا ہے۔ سچ بولنا بیوقوفی اور حماقت سمجھا جاتا ہے' اور تجارت کی راہ میں جھوٹ بولنا تو ایک آرٹ قرار دیا جاتا ہے۔ چنانچہ جھوٹ اور دروغ بیانیوں کے سلسلہ میں چند واقعات بیان کرتا ہوں۔

دہلی میں تاریخ پرانی اور نایاب اشیاء کی فروخت کرنے کے ایک بہت بڑی دکان ہے۔ مثلاً پرانی قلمی کتابیں، سینکڑوں برس پہلے کے زیورات برتن غالیچے اور ہاتھی دانت کا سامان وغیرہ یہاں فروخت ہوتا ہے۔ اس دکان میں شیشوں والا ساگوان کا ایک بہت خوبصورت شوکیس رکھا ہوتا ہے۔ جس کے اندر مخمل بچھائی ہوئی تھی اور اس مخمل پر دہلی کی وضع کی ایک سنہری اور استعمال کی ہوئی جوتی رکھی ہوتی۔ اس دکان پر امریکہ اور دوسرے غیر ملکی لوگ جن کو تاریخ اشیاء خریدنے کا شوق ہوتا آتے تو ان سے کہا جاتا کہ دہلی آخری تاجدار بہار شاہ بادشاہ جب مقبرہ ہمایوں میں میجر ہڈسن کے ہاتھوں گرفتار ہوا تو بہادر شاہ نے اس وقت یہ جوتی پہنی ہوئی تھی۔ اور تاریک کے اعتبار سے یہ جوتی بہت اہمیت رکھتی ہے۔ چنانچہ امریکن یا یورپین گاہک اس کی قیمت پوچھتا تو پانچ ہزار روپیہ بتائی جاتی۔ اور قیمت کے متعلق تھوڑی بہت بات چیت ہونے کے بعد اس ناواقف اور غیر ملکی گاہک کے پاس یہ جوتی چار ساڑھے چار ہزار روپے میں فروخت کردی جاتی۔ اور چند روز بعد اسی قسم کی نئی جوتی پھر اس شیشے کے بکس میں رکھ دی جاتی۔ اور جب کوئی نیا غیر ملکی ان کی دکان پر آتا تو پھر اس جوتی کو بہادر شاہ کی گرفتاری کے زمانہ کی جوتی کہہ کر اس گاہک کی جیب تراشی کی جاتی چنانچہ مجھے علم نہیں کہ بہادر شاہ کی جوتی کا نیا اور بار بار سر جنم لینا اب بھی جاری ہے یا نہیں مگر میں نے اخبار ''ریاست'' کے جاری ہونے کے شروع کے زمانہ میں اس جوتی کو خود دیکھا ہے۔ جو سنہری رنگ کی اور کچھ میلی سی ہوا کرتی۔ اور نہیں کہا جا سکتا کہ اس دکان کے مالک لالہ جی نے اپنی زندگی میں کتنی ایسی جوتیوں کو جنم دیا اور کتنا روپیہ صرف اس جوتی کے نام پر پیدا کیا۔

دہلی کے جوہریوں کے حالات بھی بہت دلچسپ ہیں۔ یہ جوہری دہلی میں سینکڑوں کی تعداد میں کاروبار کرتے تھے اور ان سب کا کام زیادہ تر ریاستوں میں ہوا کرتا اور ان جوہریوں میں بہت کم تعداد میں ایسے لوگ تھے جو جھوٹ نہ بولتے اور

بے ایمان نہ کرتے ورنہ عام طور پر ان کی کامیابی جھوٹ اور بے ایمانی کی بنیادوں پر ہوا کرتی۔ یہ جوہری سال میں آٹھ آٹھ ماہ ریاستوں کا دورہ کرتے وہاں والیان ریاست اور ان کی مہارانیوں اور بیگمات کو جواہرات اور زیورات دکھاتے۔ ایک ریاست میں کئی کئی ہفتے سرکاری مہمان رہتے اور لاکھوں روپیہ کا بزنس کرتے۔ ان جوہریوں کے بزنس کا طریقہ یہ تھا کہ یہ لوگ دہلی سے روانہ ہوتے وقت سو دوسو روپیہ کے پھل اور تحائف وغیرہ اپنے ساتھ لے جاتے۔ ان پھلوں اور تحائفوں کو پرائیویٹ سیکرٹری کے دفتر میں لوگوں کی نذر کیا جاتا تا کہ ان کی ہمدردی حاصل ہو۔ اور یہ مفید ہو سکیں۔ پانچ سات روز مہمان خانہ میں رہنے کے بعد (کیونکہ والیان ریاست کسی کو فوراً ہی ملاقات کا موقع دینا اپنی شان کے خلاف سمجھتے تھے) والیے ریاست کے سامنے پیش ہوتے۔ وہ جواہرات اور زیورات دکھائے جاتے جو یہ ساتھ لائے۔ والیے ریاست یہ زیورات دیکھنے کے بعد ان کو اپنی بیویوں یعنی مہارانیوں یا بیگمات کے پاس بھیجتے۔ مہارانیاں یا بیگمات اور دوسری عورتیں ان کو دیکھتیں پھر قیمتیں دریافت کی جاتیں جوہری ان کی قیمتیں چار پانچ گنا زیادہ بتاتے۔ والیے ریاست کچھ زیورات اور جواہرات خریدتے ان کے خریدنے کے بعد حکم ہوتا کہ روپیہ بھیج دیا جائے گا۔ کیونکہ ریاستوں میں روپیہ کی ادائیگی عام طور پر کئی ماہ کے بعد کی جاتی۔ وہ بھی دکاندار کے کئی بار آنے اور تقاضا کرنے کے بعد۔ جوہری کی طرف سے مالی مشکلات بیان کی جاتیں اور آخر پرائیویٹ سیکرٹری کے ذریعہ فیصلہ ہوتا۔ تا کہ تمام رقم کا پچیس فیصدی تو اب ادا کر دیا جائے اور پچھتر فیصدی بعد میں ادا کر دیا جائے گا۔ یعنی ان جواہرات اور زیورات کی اصل قیمت (کیونکہ اصل قیمت سے چار پانچ گنا بڑھا کر قیمتیں بتائی جاتی تھیں) تو جوہری کو تو فوراً ہی وصول ہو گئی اور بتائی گئی قیمت کا پچھتر فیصدی والیے ریاست مقروض۔ یعنی ایک روپیہ میں سے چار آنہ اصل قیمت تو جوہری کے جیب میں اور روپیہ میں سے بارہ آنے نواب یا مہاراجہ کے ذمہ

قرضہ اس تجارتی ڈاکہ کے چند ماہ بعد جوہری کا اس ریاست میں دورہ شروع ہو جاتا۔
یہ کئی کئی روز سرکاری مہمان خانے یا کسی شہر کی سرائے میں مقیم رہتا صبح ہی پیلس میں
جاتے ہیں پرائیویٹ سٹاف کے لوگوں سے علیک سلیک ہوتی ہے اور شام کو واپس قیام
گاہ پر آتے ہیں۔ چند روز یہ سلسلہ جاری رہتا ہے اس کے بعد سرکار کی طرف سے
پرائیویٹ سیکرٹری کے ذریعہ کہلوایا جتا ہے کہ ابھی روپیہ موجود نہیں چند ہفتہ بعد آیئے
گا۔ جوہری چند ہفت بعد پھر اس ریاست میں پہنچتا۔ ہے پھر مطالبہ ہوتا ہے پھر ٹال
بازی جاری رہتی ہے۔ اور اس طرح کئی کئی ماہ کئی کئی برس گزر جاتے ہیں۔ اور یہ واقعہ
ہے کہ ان جوہریوں میں سے کئی اصحاب کا لاکھوں روپیہ والیان ریاست کے ذمہ تھا۔
جو نہ وصول ہوا اور نہ اس روپیہ کے وصول ہونے کی کوئی توقع ہے۔ اور جوہریوں کی ا
س تجارتی قمار بازی کا صرف ایک واقعہ ہی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مرحوم مہاراجہ
سر بھوپندر سنگھ آف پٹیالہ کے ذمہ دہلی کے صرف ایک جوہری کا اس وقت دس لاکھ
روپیہ بقایا تھا جب مہاراجہ کا انتقال ہوا۔ اور اس جوہری نے مہاراجہ کے انتقال کے بعد
بہت کوشش کی کہ ی روپیہ وصول ہو مگر وصول نہ ہوا۔ اور قانوناً نہ وصول ہو سکتا ہے۔
کیونکہ ایسے معاملات میں نہ انگریزوں کی گورنمنٹ مداخلت کرتی تھی اور نہ اب
کانگرس گورنمنٹ دخل دیتی ہے۔ کیونکہ یہ پرائیویٹ قسم کے سودے تھے جن کی ذمہ
داری کسی گورنمنٹ نے نہ لی تھی۔ بہر حال جوہری تو مطمئن تھے کہ وہ اصل قیمت
(یعنی بتائی گئی قیمت کا پچیس فیصدی) تو پہلے ہی وصول کر چکے ہیں باقی تمام منافع ہی
منافع تھا۔ اور والیان ریاست جو روپیہ ادا نہ کرنا اس کے لیے جائز نہ سمجھتے تھے وہ
جانتے تھے کہ ان پر تجارتی ڈاکہ زنی کی گئی ہے۔

عام پبلک میں بنارس کے ٹھگ مشہور ہیں۔ مگر تحقیقات کی جائے تو یہ ثابت ہو گا
کہ دہلی کے ٹھگوں کا بنارسی ٹھگوں سے کوئی مقابلہ نہیں کر سکتے۔ بنارس چونکہ مذہبی مقام
ہے شاید وہاں مذہبی ٹھگوں کی اکثریت موجود ہو جو لوگوں کو سورگ یانی بہشت کا ٹکٹ

لے دینے کے اعتبار سے ٹھگی کرتے ہیں مگر جہاں تک تجارتی ٹھگی کا سوال ہے دہلی کا مقابلہ شاید کوئی دوسرا شہر آج نہیں کرسکتا' اور تبادلہ آبادی نے اس ٹھگی میں بہت بڑا اضافہ کردیا۔ مثلاً ایک ایک روپیہ میں ''درست وقت دینے والی'' گھڑیاں اشتہارات کے ذریعے فروخت کی جاتی ہیں۔ عورت کے بطن میں ہی لڑکی سے لڑکا بنا دیا جاتا ہے' کٹ پیس کی مارکیٹ میں پانچ روپیہ کا مال پچاس روپیہ میں فروخت ہوتا ہے' دواخانے قوت کے نام پر فالج گرانے والی ادویات دیتے ہیں' پانچ سو چھپنے والے اخبارات کے پاس دس دس ہزار کی اشاعت کے ایسے ایڈیٹرز کے سرٹیفکیٹ ہیں جن آڈیٹرز کا دنیا میں کوئی وجود ہی نہیں' مذہب کے نام پر لوگوں کو خونریزی کے لیے تیار لیا جاتا ہے۔ ڈکشنریوں میں سیاست کے معنی بے ایمانی اور بددیانتی درج کرنے کی کوشش کی جاری ہے' غنڈے دن کے وقت ہی لوگوں کے سامنے اپنے کمالات دکھاتے ہیں' اپنے گھروں کے سامنے کھلے میدان میں سونا محفوظ نہیں' اور یہ سب کچھ اس وقت ہوتا ہے جبکہ دہلی درجنوں سپرنٹنڈنٹ اور ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس انتظام کے لیے وقف ہیں اور عدالتوں کی دیواروں پر مہاتما گاندھی کی تصاویر لٹک رہی ہیں۔

☆☆☆

آستین کے سانپ

گورنر مائیکل اوڈوائیر کے زمانہ میں پنجاب میں جب مارشل لاء نافذ ہوا تو مارشل لاء کے نفاذ سے پہلے ان لوگوں کی فہرستیں تیار ہو چکی تھیں جو گورنمنٹ کی نظروں میں مشتبہ تھے' اور جن کو گرفتار کیا جانا تھا۔ چنانچہ جس روز مارشل لاء کا اعلان ہوا' لاہور میں ڈیڑھ سو کے قریب سیاسی لیڈروں اور ورکرز کے وارنٹ جاری ہوئے۔ اور ان وارنٹوں کے جاری ہونے سے ایک روز پہلے سردار سردول سنگھ کولیشر کو ان کے ایک دوست سب انسپکٹر مسٹر گیانی نے بتا دیا تھا کہ ڈیڑھ سو کی اس فہرست میں سردول سنگھ کولیشر کے علاوہ کس کس کا نام شامل ہے۔ اس اطلاع کے ملتے ہی سردار سردول سنگھ کولیشر مارشل لاء کے نفاذ سے ایک روز پہلے لاہور سے غائب ہو گئے اور کسی کو کچھ علم نہیں تھا کہ وہ کہاں گئے۔

میں اس زمانہ میں لاہور میں تھا' اور مالی پریشانی کے باعث دو تین مختلف اخبارات میں تھوڑی اجرت پر کام کرتا تھا۔ میں قریب قریب ہر روز سردار سردول سنگھ کولیشر سے ملتا۔ مارشل لاء کا اعلان ہونے کے بعد میں صبح ہی سے سردار سردول سنگھ کو ملنے گیا۔ راستہ میں پہلے تو ایک دوست نے بتایا کہ اس وقت تک پچاس کے قریب گرفتاریاں ہو چکی ہیں۔ اس کے بعد ایک اور دوست نے بتایا کہ پچھتر کے قریب گرفتاریاں ہو چکی ہیں۔ میں سردار سردول سنگھ کولیشر کے مکان پر پہنچا' تو وہاں ان کے معتمد نے بتایا کہ سردار صاحب تو ایک روز پہلے ہی سے غائب ہیں اور وہ جاتے ہوئے میرے لیے پیغام چھوڑ گئے ہیں' کہ فوراً لاہور سے کسی دوسرے مقام پر چلا جاؤں ورنہ میں بھی گرفتار کر لیا جاؤں گا۔ چنانچہ میں لاہور سے پیدل ہی اپنے وطن حافظ آباد کے لیے روانہ ہو گیا کیونکہ ریلوے ٹرینیں بند ہو چکی تھیں اور کسی بھی سواری کا ملنا ناممکن تھا۔

مارشل لاء کے نافذ ہونے کے بعد کچھ روز تو لوگوں پر مارشل لاء کی بہت ہیبت طاری رہی مگر جب ملک کے دوسرے صوبجات میں پنجاب کے مارشل لاء کے خلاف

سخت ایجی ٹیشن پیدا ہوئی' اور وائسرائے کی انتظامیہ کونسل کے واحد ہندوستانی ممبر سر سنکرن نائر نے وائسرائے کی کونسل کی ممبری سے استعفیٰ دے دیا تو مارشل لاء کو زور کم ہوگیا نئی گرفتاریاں روک دی گئیں۔ سر مائیکل اوڈوائیر ریٹائر ہوکر انگلستان چلے گئے۔ ان کی جگہ نئے گورنر مقرر ہو گئے اور مارشل لاء کے گرفتار شدہ ملزمین کے مقدمات عدالتوں میں چلے گئے۔ مگر سردار سردول سنگھ کولیشر کا کچھ پتا نہیں تھا' کہ وہ کہاں ہیں؟ اور ہو چونکہ پہلی قطار کے لیڈروں میں سے تھے ان کے وارنٹ گرفتاری جاری رہے اور انسپکٹر جنرل پولیس نے ان کی گرفتاری کے لیے پنجاب سی۔ آئی۔ ڈی کے ایک بہت ہوشیار اور لائق انسپکٹر جیون لال مٹو (جو پٹیالہ کے وزیر اعظم راجہ سر دیا کشن کول اور جالندھر کے کمشنر راجہ ہری کشن کول کے ماموں زاد یا پھوپھی زاد بھائی تھے) کو مقرر کیا۔ پنڈت جیون لال مٹو پنجاب کی تمام پولیس میں ایک لائق ترین افسر قرار دیے جاتے تھے اور آپ پولیس کا کنگز میڈل (جس کو صرف وہ پولیس آفیسر ہی حاصل کر سکتے تھے جنہوں نے تفتیش کے سلسلہ میں اپنی جان کو خطرہ میں ڈالا ہوا ور اس تحفہ کے حاصل کرنے والوں کو غالباً تیس روپیہ ماہوار تا حیات پنشن بھی ملا کرتی تھی) حاصل کر چکے تھے۔ سردار سردول سنگھ کولیشر کی گرفتاری کا مسئلہ جب انسپکٹر جنرل پولیس نے آپ کے سپرد کیا تو سب سے پہلے آپ نے مختلف ذرائع سے پتا کیا کہ سردار سردول سنگھ کولیشر کے کن لوگوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات تھے یا واقفیت تھی۔ ان معلومات کے حاصل کرنے کے بعد آپ نے لاہور کے ایک سکھ آنریری مجسٹریٹ کو منتخب کیا۔ یہ آنریری مجسٹریٹ سردار بہادر بھی تھے۔ ان سردار بہادر کو اپنے ہاتھوں میں لینے کے لیے پنڈت جیون لال مٹو نے ان کو ہدایت کے ساتھ سردار سردول سنگھ کولیشر کے گھر بھیجا کہ یہ اپنے آپ کو سردار صاحب کا نہایت خیر خواہ اور پنتھ کا خادم ظاہر کریں۔ چنانچہ ان سردار بہادر نے سردار سردول سنگھ کولیشر کے گھر آنا شروع کیا۔ شروع شروع میں تو سردار سردول سنگھ کولیشر کی بیوی نے ان سردار بہادر کا اعتبار نہ کیا

اور جب یہ سردار بہادر کئی روز تک جاتے ہوئے کبھی کبھی پھل وغیرہ لے جاتے اور اپنے آپ کو سردار سردول سنگھ کا بہت بڑا دوست اور غم گسار ظاہر کرتے تو ایک روز سردار صاحب نے سردار سردول سنگھ کی بیوی سے کہا کہ وہ سردار سردول سن گھ کوان کے مقدمہ اور گرفتاری کے متعلق ایک بہت ضروری اطلاع دینا چاہتے ہیں اور اس کے لیے اپنا خاص معتمد بھیجنا چاہتے ہیں سردار صاحب کہاں ہیں؟ تا کہ ان کو پیغام پہنچا دیا جائے یہ سن کر سردار سردول سنگھ کی بیوی متاثر ہو گئیں اور اس خاتون نے جواب دیا کہ سردار صاحب اپنے ماموں سردار بہادر بھائی ارجن سنگھ کے پاس باگڑیاں کے قلعہ میں مقیم ہیں۔ ان کو پیغام وہاں یعنی باگڑیاں کے قلعہ میں پہنچایا جا سکتا ہے۔

سردار بہادر ارجن سنگھ باگڑیاں کے ضلع لدھیانہ کے بہت بڑے رئیس اور جاگیر دار تھے۔ آپ ریاست پٹیالہ نابھ اور جنید کی تینوں ریاستوں (جن کو پھلکیاں سٹیٹس کہا جاتا تھا) کے گرو رتھے۔ اور ان تینوں ریاستوں کا جب کبھی کوئی راجہ گدی پر بیٹھتا تو باگڑیاں کا ہیڈ ہی ان کو تلک لگاتا۔ سردار ارجن بہادر سنگھ اس زمانہ میں باگڑیاں کے ہیڈ تھے۔ اور سکھوں میں ایک لائق ترین شخصیت اور اتھارٹی تسلیم کیے جاتے تھے آپ کا مکان ایک قلعہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ اور آپ کا رہن سہن بھی راجاؤں کا سا تھا۔ پنڈت جیون لال مٹو کے مخبر سردار بہادر کو جب یہ اطلاع ملی کہ سردار سردول سنگھ کولیشر باگڑیاں کے قلعہ میں ہیں تو آپ نے فوراً پنڈت جیون لال مٹو سے مل کر تمام حالات بیان کیے۔ اس اطلاع کے بعد پنڈت جیون لال مٹو انسپکٹر جنرل پولیس سے ملے' اور بتایا کہ سردار سردول سنگھ کولیشر باگڑیاں کے قلع میں چھپے ہوئے ہیں۔ پنڈت جیون لال کی اطلاع کو سن کر انسپکٹر جنرل پولیس نے پندت جیون لال کے ہاتھ ہی ایک خط لکھ کر گورنر کو شملہ بھیجا۔ پندت جیون لال نے شملہ پہنچ کر یہ خط گورنر کو ڈلور کیا۔ اس خط میں انسپکٹر جنرل نے لکھا تھا کہ سردار سردول سنگھ کولیشر باگڑیاں کے قلعہ میں چھپے ہوئے ہیں۔ گورنر نے اس خط کو پڑھنے کے بعد سردار بہادر بھائی ارجن سنگھ چیف

آف باگڑیاں کو طلب کیا جو گرمیوں کے باعث شملہ ہی میں مقیم تھے۔ بھائی ارجن سنگھ گورنر سے ملے تو گورنر نے انسپکٹر جنرل کا خط دکھاتے ہوئے بھائی ارجن سنگھ سے کہا کہ سردار سردول سنگھ کویشر کو گرفتاری کے لیے پولیس کے حوالے کر دو ورنہ آپ کو ایک ملزم کو پناہ دینے کے الزام میں گرفتار کر لیا جائے گا۔ اور آپ کی جاگیر بھی ضبط کر لی جائے گی۔ سرداری بھائی ارجن سنگھ نے جب گورنر کے یہ الفاظ سنے تو آپ بہت گھبرا گئے اور آپ نے وہاں بیٹھے ہی گورنر کے سامنے گورمکھی میں سردار سردول سنگھ کویشر کو خط لکھا کہ:

''آپ کے باگڑیاں کے قلعے میں چھپنے کا گورنمنٹ کو علم ہو چکا ہے۔ میں یہ خط گورنمنٹ ہاؤس شملہ میں بیٹھا گورنر صاحب کے سامنے لکھ رہا ہوں۔ آپ فوراً اپنے آپ کو گرفتاری کے لیے پیش کر دیں''۔

سردار بہادر بھائی ارجن سنگھ کا خط لے کر پنڈت جیون لال مٹو باگڑیاں گئے۔ وہاں آپ نے قلعہ میں پہنچ کر بھائی ارجن سنگھ کے ملازم کے ہاتھ خط یہ کہہ کر سردار سردول سنگھ کویشر کو قلعہ کے اندر بھیجا کہ یہ خط بھائی ارجن سنگھ کا ہے۔ خط ملنے کے بعد سردار سردول سنگھ کویشر کپڑے پہن کر قلعے سے باہر آ گئے۔ اور آپ نے اپنے آپ کو گرفتاری کے لیے پیش کر دیا۔ پنڈت جیون لال مٹو سردار سردول سنگھ کویشر کو ساتھ لے کر لاہور پہنچے' اور لاہور پہنچنے کے بعد اپ کو ریلوے کی پولیس لائن کی حوالات میں بند کر دیا گیا جہاں کہ آپ کئی روز تک رکھے گئے۔

انگریزوں نے ہندوستان میں ایک سو برس سے زیادہ عرصہ حکومت کی۔ اس ایک صدی میں نہ معلوم کتنے ہزار انگریزوں کے مخبر تھے جو آستین کا سانپ ثابت ہو کر محب الوطنوں کے لے مصائب ومشکلات پیدا کرتے ہوئے ملک کے ساتھ غداری کرتے رہے اور جس کے معاوضہ میں یہ سردار صاحب خاں صاحب' رائے صاحب' سردار بہادر' خاں بہادر' اور رائے بہادر وغیرہ بنائے گئے۔ کاش کہ ہندوستان اور پاکستان کی

گورنمنٹیں اب دونوں ممالک کے غداروں کے پچھلے ریکارڈ کو دیکھیں اور گو ملک کے ساتھ غداری کرنے والوں کو کوئی سزنہ دی جائے مگر یہ ریکارڈ تو پبلک میں شائع کر دیا جائے تا کہ ان ممالک کی آئندہ نسلیں اپنی معلومات میں اضافہ کر سکیں۔

مہاراجہ کپورتھلہ کے چچا مسٹر بلاقی رام چوپڑہ

آج سے غالباً ستر برس پہلے کا واقعہ ہے۔ مہاراجہ کپورتھلہ کے ہاں کوئی اولاد نہ تھی اور اس مہاراجہ کے ایک حقیقی بھائی راجہ سر ہرنام سنگھ (ہندوستان کی مرکزی گورنمنٹ کے سابق ہیلتھ منسٹر راجکماری امرت کور کے والد) تھے۔ چونکہ مہاراجہ ے ہاں کوئی اولاد نہ تھی ان کے بھائی راجہ سر ہرنام سنگھ اس کوشش میں تھے کہ ان کے بھائی کے انتقال کے بعد کپورتھلہ کی گدی ان کو دی جائے۔ اور اس غرض کے لیے ہی آپ نے عیسائی مذہب قبول کیا۔ تاکہ آپ برٹش گورنمنٹ کے اعلیٰ حکام کی ہمدردی اور امداد حاصل کر سکیں۔

راجہ سر ہرنام سنگھ کی گدی کے لیے کوششیں ضاری تھیں کہ مہارانی کپورتھلہ حاملہ ہو گئیں۔ اس حمل کا نتیجہ میں ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ ریاست کے اہلکاروں اور مہاراجہ نے اس خیال سے کہ راجہ سر ہرنام سنگھ کے گدی پر بیٹھنے کی صورت میں ریاست کپورتھلہ عیسائیوں کے ہاتھ میں نہ چلی جائے اسی رات مہاراجہ کی لڑکی کو دیوان ہری چند چوپڑہ کے لڑکے (جو اسی رات پیدا ہوا تھا) سے تبادلہ کر لیا گیا اور اعلان کر دیا گیا کہ مہارانی کے بطن سے لڑکا یعنی ولی عہد پیدا ہوا ہے۔

بچوں کے اس تبادلہ ے بعد راجہ سر ہرنام سنگھ نے بہت کوشش کی اور عیسائی پادریوں نے بھی انگلستان تک سفارشیں کیں مگر راجہ صاحب کو کامیابی نہ ہوئی۔ اور دیوان ہری چند چوپڑہ کا لڑکا ہی ریاست کپورتھلہ کا ولی عہد قرار دیا گیا۔

دیوان ہری چند چوپڑہ میرے وطن حافظ آباد کے ایک معزز خاندان کے ممبر تھے اور اس زمانہ میں ریاست کپورتھلہ میں غالباً سو ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار کے ملازم تھے مگر ان کے لڑکے در پردہ طور پر ولی عہد قرار دیے جانے کے بعد ان کے خاندان پر مہاراجہ کپورتھلہ کی نوازشیں اور مہربانیاں شروع ہو گئیں۔ چند برس کے بعد دیوان ہری چند خود تو کپورتھلہ کے جج مقرر کیے گئے اور ان کے خاندان کے متعدد ممبروں کو بھی

سرکاری ملازمت میں لے لیا گیا۔ چنانچہ دیوان ہری چند کا لڑکا (جو مہاراجہ کپورتھلہ تھا کے بعد خود مہاراجہ کپورتھلہ تھا) اپنے حقیقی باپ یعنی دیوان ہری ند کا بہت لحاظ اور احترام کرتا۔ اور یہ مہاراجہ بالغ ہونے کے بعد کبھی کبھی رات کو پوشیدہ طور پر اپنی حقیقی والدہ یعنی دیوان ہری چند چوپڑہ کی بیوی سے ملنے آتا' اور اپنا سر اپنی اس اصلی والدہ کے قدموں میں رکھکر ادب واحترام کرتا۔

دیوان ہری چند چوپڑہ کے ایک بھائی مسٹر بلاقی رام چوپڑہ تھے۔ مسٹر بلاقی رام چوپڑہ کی شادی بچپن ہی میں ہو چکی تھی۔ اور اس بیوی کے بطن سے تین بچے پیدا ہوئے دو لڑکے اور ایک لڑکی۔ ان دو لڑکوں میں سے بڑے لڑکے تو مسٹر نند گوپال تھے جو انقلاب پسند خیالات کے تھے۔ یہ الہٰ آباد کے اخبار ''سوراجیہ'' کو ایڈٹ کرتے تھے اسی سلسلہ میں ہی سات برس کے لیے قید ہوئے۔ اور اب آپ دیال باغ (آگرہ) میں مقیم ہیں۔ اور وہاں رادھا سوامیوں کے اخبار کو ایڈٹ کرتے ہیں۔ چھوٹے لڑکے بچپن میں ہی انتقال کر گئے اور لڑکی کی شادی ایک ڈاکٹر سے ہوئی جن کا نام ڈاکٹر بیدی تھا۔ ان تینوں بچوں کے پیدا ہونے کے مستر بلاقی رام چوپڑہ بیرسٹری کرنے انگلستان چلے گئے انگلستان میں تعلیم حاصل کرنے کے دوران آپ کے گہرے دوستانہ مراسم ایک یورپین لڑکی سے ہو گئے۔ اس لڑکی کے والد انگلستان میں پوسٹ ماسٹر جنرل تھے اس لڑکی سے دوستانہ مراسم ہونے کے زمانہ میں مسٹر بلاقی رام وُنے اس لڑکی پر جو تاثرات چھوڑے وہ ی تھے کہ بلاقی رام شادی شدہ نہیں اور آپ مہاراجہ کپورتھلہ کے چچا ہیں۔

(کیونکہ بلاقی رام دیوان ہری چند چوپڑہ کے بھائی ہونے کے باعث نسب کے اعتبار سے فی الحقیقت مہاراجہ کپورتھلہ کے چچا تھے) چنانچہ ان دوستانہ مراسم کے سلسلہ میں ہی مسٹر بلاقی رام چوپڑہ نے اس لڑکی سے جو وعدہ کیا تھا کہ آپ تعلیم حس اصل کرنے کے بعد اس لڑکی سے شادی کر لیں گے۔

مسٹر بلاقی رام بیرسٹری کرنے کے بعد ہندوستان واپس آ گئے اور آپ نے میانوالی میں وکالت شروع کی۔ اور آ نے وہاں پہنچنے کے بعد اپنی اس دوست لڑکی کو کوئی اطلاع نہ دی۔ اور نہ خط و کتابت جاری رکھی۔ یہ لڑکی طویل عرصہ تک مسٹر بلاقی رام کے خط کا انتظار کرتی رہی مگر کوئی اطلاع نہ ملی تو اس لڑکے نے اپنے باپ کے ذریعے ہندوستان کے وائسرائے سے دریافت کیا کہ ایک نوجوان مسٹر بلاقی رام چوپڑہ بیرسٹری کرنے کے بعد ہندوستان واپس آ گئے تھے آج کل کہاں ہیں؟

وائسرائے نے تحقیقات کی تو لاہور ہائیکورٹ نے بتایا کہ یہ صاحب آج کل میانوالی میں وکالت کرتے ہیں۔ اس اطلاع کے پہنچنے پر لڑکی نے مسٹر بلاقی رام کو میانوالی خط لکھا اور شادی کرنے کا وعدہ یاد دلایا۔ تو بلاقی رام جی نے جواب دیا کہ:

''بیرسٹری کرنے کے لیے ولایت جانے سے پہلے آپ شادی شدہ اور تین بچوں کے باپ تھے اور ان حالات میں آپ شادی نہیں کر سکتے''۔

مسٹر بلاقی رام کا یہ جواب اس لڑکی کے لیے بہت ہی صدمہ کا باعث تھا مگر اس لڑکی نے حوصلہ اور جرات سے کام لیتے ہوئے مسٹر بلاقی رام کو ایک رجسٹرڈ نوٹس دیا جس میں لکھا کہ:

''گو آپ کی پہلے شادی ہو چکی تھی مگر میں پھر بھی ہندو مذہب اختیار کرنے کے بعد آپ سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔ اگر آپ شادی سے انکار کرتے ہیں تو آپ ایک لاکھ روپیہ بطور ہرجانہ ادا کریں اور ہرجانہ ادا کرنے کی صورت میں ہندوستان کی کسی عدالت میں مقدمہ درج کیا جائے گا''۔

اس نوٹس اور مزید خط و کتابت کے بعد مسٹر بلاقی شادی پر آمادہ ہو گئے۔ یہ لڑکی ہندوستان آئی۔ اس زمانہ ہندوؤں میں کسی شخص کا غیر ہندو عورت کے ساتھ شادی کرنا ممکن نہ تھا۔ شادی کی رسم امرتسر کے دربار صاحب میں سکھ طریقہ شادی یعنی آنند پڑھے جانے کی صورت میں ادا ہوئی۔

مسٹر بلاقی رام چوپڑہ لائق شخصیت تھے۔ مگر قسمت نے ان کا کبھی ساتھ نہ دیا آپ میانوالی میں بطور بیرسٹر کامیاب نہ ہوئے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ مرحوم لالہ ہرکشن لال آپ کے گہرے دوستوں میں سے تھے۔ لالہ ہرکشن لال نے بنکوں انشورنس کمپنیوں اور کارخانہ جات کی جو سکیمیں جاری کیں وہ تمام بلاقی رام کے دماغ کی اختراع تھیں۔ میاوالی میں ناکام ہونے کے بعد آپ اپنے وطن حافظ آباد چلے گئے یہاں آپ نے چاولوں اور برف کا ایک بڑا کارخانہ جاری کیا' مگر اس میں بھی آپ کامیاب نہ ہوئے۔ اور پھر ڈیرہ دون چلے آئے جہاں کہ آپ زندگی کے آخری لمحوں تک مقیم رہے۔

مسز بلاقی رام چوپڑہ نہایت ہی نیک خاتون تھیں۔ میری عمر دس برس کی تھی جب میں نے اس خاتون کو حافظ آباد میں دیکھا۔ اس خاتون نے یورپین لباس ترک کر دیا تھا۔ یہ شلوار کرتہ اور دوپٹہ پہنا کرتیں۔ اگر برادری میں کوئی موت ہوتی تو دوسری عورتوں کے ساتھ مرنے والے کے گھر جاتیں۔ اور ان عورتوں کے ساتھ مل کر سینہ کوبی کرتیں شادی بیاہ میں ڈھولک کے ساتھ شادی کے گیت گاتیں خوشی اور غمی میں شریک ہوتیں۔ اور اس نے بطور ایک ہندو خاتون کے اپنے آپ کو ڈھال لیا۔ اس خاتون کے بطن سے دو لڑکے اور دو لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ لڑکوں میں سے ایک لڑکا تو آج کل ڈیرہ دون میں ایک پریس کا مالک ہے۔ اور اس کی شادی ایک نیپالی خاتون سے ہو چکی ہے جس کے کئی بچے ہیں۔ دوسرا لڑکا گورنمنٹ میں ملازم ہے اور آج کل غالباً شملہ میں ہے۔ لڑکیوں میں سے ایک لڑکی کی شادی مرحوم سردار جوگندر سنگھ سابق منسٹر تعلیم گورنمنٹ ہند کے لڑکے سے ہوئی اور دوسری لڑکی مرحوم سردار پورن سنگھ کے لڑکے سردار منموہن سنگھ سے بیاہی گئی جو آج کل پنجاب میں سیشن جج ہیں۔

مہاراجہ نابھ کے گدی سے معزول ہونے کے چند روز بعد ہی میں راجہ ہرنام سنگھ سے ملا تھا۔ اور یہ ملاقات مرحوم مہاراجہ کے ایک پیغام کے سلسلہ میں ہوئی۔ مہاراجہ

نے چاہا تھا کہ راجہ صاحب معزولی کے سلسلہ میں وائسرائے سے ملیں۔ راجہ سر ہرنام سنگھ کو مذہبی خیالات کے اعتبار سے حضرت مسیح کے مقلد تھے مگر لباس اور رسم و رواج کے اعتبار سے خالص ہندوستانی تھے۔ بہت بڑی اور شاندار پگڑی پہنتے۔ اور حقہ استعمال کرتے۔ میں جب ان سے ملا تو میں نے محسوس کیا کہ ان کو مہاراجہ نابھ کی معزولی کا بے حد افسوس ہے۔ بہت دیر تک ہمدردی کا اظہار کرتے رہے۔ آپ ہندوستانی عیسائیوں میں سب سے بڑی پوزیشن کے عیسائی تھے ان کے چار صاحبزادے اور ایک صاحب زادی تھی۔ صاحبزادوں میں بڑے کنور رنبیر سنگھ جو پنجاب میں ڈپٹی کمشنر تھے۔ دوسرے راجہ مہاراجہ سنگھ جو بمبئی کے گورنر رہے۔ تیسرے کرنل شمشیر سنگھ جو پنجاب میں سول سرجن تھے اور چوتھے کنور دلیپ سنگھ جو پنجاب میں جج ہائیکورٹ رہے۔ آپ کی صاحبزادی راجکماری امرت کور مہاتما گاندھی کی صحیح معانی میں مقلد ہیں جو ہندوستان کے مرکزی گورنمنٹ میں کئی برس تک ہیلتھ منسٹر رہیں۔ راجہ سر ہرنام سنگھ بہت ہی نیک اور بلند لوگوں میں سے تھے۔ اور جب بھی کسی نواب یا مہاراجہ کو کوئی مشکل پیش آتی تو وہ راجہ صاحب کی امداد حاصل کرتا کیونکہ آپ کا برٹش حکام پر بہت بڑا اثر تھا۔

بہت برس ہوئے ایک بار مہاراجہ مرحوم کپورتھلہ دہلی تشریف لائے تو آپ نے اپنا پرائیویٹ سیکرٹری (میرا خیال ہے ان کا نام لالہ متھر اداس تھا) بھیج کر مجھے طلب فرمایا کیونکہ آپ اخبار ''ریاست'' کے بہت بڑے قدردان تھے۔ یہ ملاقات آپ کی کوٹھی مان سنگھ روڈ نئی دہلی میں ہوئی۔ یہ ملاقات ایک گھنٹہ جاری رہی اور مجھے اچھی طرح یاد ہے یکہ آپ نے باتوں باتوں میں مجھ سے پوچھا کہ میں کہاں کا رہنے والا ہوں؟ تو میں نے جواب دیا کہ:

''آپ کے وطن حافظ آباد کا''۔

یہ سن کر آپ تھوڑے سے جھینپ گئے اور مسکرادیے۔ کیونکہ اس کا مطلب یہ تھا

کہ میں دیوان ہری چند چوپڑہ کا ہم وطن ہوں۔ اس ملاقات میں آپ نے یہ بھی پوچھا کہ:

''کیا پئیں گے؟''

تو میں نے جواب دیا:

''کچھ بھی ہو پی لوں گا''۔

چنانچہ آپ نے شیمپین (بہترین قسم کی شراب) لانے کا اپنے ملازم کو حکم دیا اور آپ نے اور میں نے تھوڑی شیمپین پی۔

آج نہ تو مہاراجہ کپورتھلہ زندہ ہیں اور نہ آپ کے ''چچا'' مسٹر بلاقی رام چوپڑہ' نہ دیوان ہری چند چوپڑہ نہ راجہ سر ہرنام سنگھ اور نہ مسٹر بلاقی رام چوپڑہ کی یورپین بیوی۔ اور چند برس کے بعد یہ تمام حالات ہی پنجاب کی تاریخ کا ایک فراموش شدہ ورق ہوں گے۔ جو میرے لیے ناقابل فراموش ہیں۔

کامیابی اور ناکامی کے اسباب

میں اپنی زندگی میں درجنوں سیلف میڈ لوگوں سے ملا ہوں۔ ان سے گھنٹوں باتیں ہوئی ہیں اور میں نے بہت غور کے ساتھ یہ معلوم کرنے کی کوشش کی ہے کہ ان کی کامیابی کے اسباب کیا تھے؟ چنانچہ اس سلسلہ میں مجھے جو کچھ معلوم ہوا اس کا اظہار کرنا پبلک کے لیے مفید ثابت ہوگا۔

رائے بہادر ڈاکٹر متھر اداس آف موگا نے اپنی زندگی بطور ایک سب اسسٹنٹ سرجن (جو اس زمانہ میں ہاسپٹل اسسٹنٹ کہلاتے تھے) شروع کی اور اس زمانہ میں آپ کی ماہوار تنخواہ پچیس روپیہ تھی۔ اس کے بعد آپ بغیر کالج میں ڈگری حاصل کیے اسسٹنٹ سرجن بنا دیے گئے (یہ واقعہ انڈیا کے تمام صوبجات میں پہلا واقعہ تھا کہ بغیر یونیورسٹی کی ڈگری کے سب اسسٹنٹ سرجن بنا دیا گیا) پھر سول سرجن ہوئے۔ وائسرائے کے آنریری سرجن ہوئے۔ آپ نے لاکھوں روپیہ پیدا کیا۔ اور لاکھوں روپیہ ہی سکولوں کالجوں اور ضرورت مندوں کو بطور خیرات یا امداد دیا۔ اور آپ نے اپنی زندگی میں خدا کی مخلوق کو فائدہ پہنچانے کے لیے کتنے بڑے آپریشن کیے اس کا اندازہ ذیل کے اعداد و شمار سے کیا جا سکتا ہے۔ جو آپ کے پچھلے ریکارڈ سے لیے گئے ہیں۔

رسولیاں	۲۳۳۷
ہڈیوں کے آپریشن	۲۶۱۱
ایمپوٹیشن یعنی عضو کا کاٹنا	۵۵۸
آنکھوں کے کیٹریکٹ یعنی موتیا	۲۴۵۱۰۸
پیٹ کے اپریشن	۱۶۲
جگر کے اپریشن	۱۶
پتھری	۱۱۳۶

ہرنیا	۷۵۷
بواسیر	۹۲۹
تپدق کے گلینڈ	۳۹۲
آنکھ کی پتلی کے اپریشن	۳۱۱۲

یعنی دوسرے بڑے اپریشنوں کو چھوڑ کر آپ نے اپنی زندگی میں صرف آنکھ کے موتیا بند کے اپریشن ہی دو لاکھ پینتالیس ہزار ایک سو آٹھ کی تعداد میں کیے۔یعنی اس تعداد کے اندھوں کو خدا نے آپ کے ہاتھوں سے شفا بخشی۔

اب سوال یہ ہیکہ آپ کی اس بے مثال کامیابی کی وجہ کیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ دوسرے ملکوں کو چھوڑ کر صرف ہندوستان ہی میں سینکڑوں لائق ڈاکٹر موجود ہیں۔ مگر جو صفات بطور انسان آپ میں موجود ہیں دوسرے ڈاکٹر ان سے اکثر محروم ہیں مثلاً

۱۔آپ زندگی بھر بارہ چودہ گھنٹے کام کرتے رہے۔

۲۔آپ کو محنت کرنے کے اعتبار سے ایک مشین قرار دیا جا سکتا ہے۔

۳۔فطرتاً فیاض ہیں اگر روپیہ موجود ہو تو دوسروں کو دینے سے انکار نہیں کرتے۔

۴۔غریبوں سے کوئی فیس وصول کرنا پاپ اور گناہ سمجھتے ہیں۔

۵۔آپ کو عیش و عشرت کی زندگی سے فطرتاً نفرت ہے۔

۶۔آپ کو مذہبی تعصب سے سخت نفرت ہے اور باوجود آریہ ساجی ہونے کے گرنتھ صاحب کا پاٹھ ہر روز کرنا آپ کے شعار میں داخل ہے۔

۷۔آپ حد درجہ کے منکسر المزاج ہیں۔

۸۔آپ ہر شخص کے خط کے جواب اسی روز باقاعدگی کے ساتھ دیتے ہیں تا کہ خط لکھنے والوں کو انتظار کی کوفت نہ ہو۔(میرا یقین ہے کہ خط و کتابت کی باقاعدگی نے آپ کی زندگی کو کامیاب بنانے میں بہت بڑا پارٹ ادا کیا ہے۔کیونکہ خطوط کو جواب نہ دینا

انسان کو ناکامی کی طرف لے جاتا ہے)۔

۹۔آپ علی الصبح چار بجے باقاعدگی سے جاگتے اور سیر کرنے جاتے ہیں۔جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب آپ کی عمر اسی برس کے قریب ہے مگر نوجوان لڑکوں کی طرح پھرتیلے ہیں۔

۱۰۔آپ ایک پاکٹ بک اپنی جیب میں رکھتے ہیں اور کوئی بات یاد رکھنے والی ہو تو فوراً نوٹ کر لیتے ہیں تا کہ آپ بھول نہ جائیں اور یہ ممکن ہی نہیں کہ آپ نے جو کام کرنا ہو اسے فراموش کر دیں۔

پنجاب کے کنگ آف انڈسٹریز لالہ ہرکشن لال مرحوم ایک غیر معمولی شخصیت تھے جو بہت لائق، بہت دیانتدار، بہت فیاض، بہت محنتی اور بہت رمز شناس تھے۔تعلیم کے لحاظ سے بیرسٹر تھے مگر آپ نے وکالت کبھی نہ کی اور اگر کی تو بہت ہی تھوڑا عرصہ۔اور آپ نے درجنوں کارخانے بنک اور انشورنس کمپنیاں جاری کیں اور کروڑہا روپیہ پیدا کیا جس کے باعث آپ کی اوپر کی صفات تھیں۔مگر اتنا عروج حاصل کرنے کے بعد آپ کو آخری عمر میں جس زوال کا سامنا کرنا پڑا اسے تباہی ہی قرار دیا جا سکتا ہے۔ جس کی وجہ صرف ایک ہی تھی۔کہ عروج حاصل کرنے کے بعد آپ نے اپنے ہمراہیوں کی پرواہ نہ کی۔جو آپ کی لمیٹڈ کمپنیوں کے حصہ دار تھے۔حالانکہ ہندوستان میں لمیٹڈ کمپنیوں کے حصے عام طور پر وہی لوگ خریدتے ہیں جو ان کمپنیوں میں ناجائز فوائد حاصل کرنا چاہتے ہوں۔یعنی اگر آپ ان کمپنیوں کے حصہ داروں کی خواہشات کی وہ چاہے جائز تھیں یا ناجائز پرواہ کرتے ان حصہ اروں کے عزیزوں اور رشتہ داروں کو ملازمتیں دیتے اور دوسرے طریقے سے مفید ہتے تو آپ کو زوال کے دن دیکھنے نہ پڑتے۔ چنانچہ ''ریاست'' کو لمیٹڈ کمپنی میں تبدیل کرنے کے خیال کی مخالفت کرتے ہوئے ایک بار آپ نے مجھے نصیحت کی تھی۔

''دیوان سنگھ! بھوکے مر جانا مگر اخبار کو لمیٹڈ کی صورت میں تبدیل نہ کرنا۔تم

انڈیپنڈنٹ فطرت کے ہولمیٹڈ میں حصے والے اگر حصے خریدیں گے تو اس لیے تم ان کو لیڈر بناؤ گے۔ تم ان کی لیڈری کا پراپیگنڈہ نہ کرسکو گے۔ وہ تمہارے دشمن ہو جائیں گے اور تم کو تباہ کر دیں گے۔ میری طرف دیکھ لو۔ میں اپنے کارخانوں اور کمپنیوں کا مالک ہوتا تو کوئی میرا دشمن نہ ہوتا۔ ان کمپنیوں کے حصے دار دشمن ہیں تو صرف اس لیے کہ میں ان کی غلط خواہشات کو پورا نہ کرسکا۔"

یعنی جو لوگ عروج حاصل کرنے کے بعد زوال کا شکار ہوتے ہیں ان میں کچھ کمزوریاں پیدا ہو جاتی ہیں اور یہ کمزوریاں ان کو عروج سے گرا کر زوال کی سطح پر لے آتی ہیں۔ اور انسان کو چاہیے کہ عروج حاصل کرنے کے بعد زوال کے اسباب نہ پیدا ہونے دے۔

مرحوم خان بہادر حافظ محمد حکیم آ کانپور حافظ صاحب راقم الحروف کے بہت گہرے دوستوں میں سے تھے۔ آپ بستی (ریاست پٹیالہ) کے رہنے والے تھے۔ بچپن ہی میں کانپور چلے گئے۔ وہاں آپ نے کروڑوں روپیہ پیدا کیا۔ اور اس وقت ان کے جاری کیے ہوئے کئی کالج اور سکول موجود ہیں۔ اور حافظ آباد روڈ کے نام سے کانپور میں ایک سڑک بھی ہے آپ سالہا سال تک مرکزی کونسل آف سٹیٹ کے ممبر رہے۔ آپ قطعی سیلف میڈ تھے اور آ کے عروج حاصل کرنے کی وجوہ یہ تھیں کہ:

"آپ انتہائی بلند، بہت محنتی، بہت فیاض، بہت دوست پرست، تجارتی اعتبار سے بہت لائق اور بہت مخیّر تھے"۔

رائے بہادر سردار نرائن سنگھ ٹھیکہ دار نئی دہلی کی زندگی چھ سو روپیہ ماہوار کے ایک فوجی سپاہی کی صورت میں شروع ہوئی۔ آپ سیلف میڈ تھے اور ااپ کا کتنا عروج نصیب ہوا اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ آپ کی جائیداکے کرایہ اور ٹھیکہ داری کی آمدنی دس لاکھ روپیہ سالانہ کے قریب تھی۔ جس کی وجہ ی تھی کہ:

"رائے بہادر اپنے ٹھیکیداری کے شعار کا ثبوت دیتے ہوئے اپنے تمام افسروں

اور انجینئروں کو خوش رکھتے بہت محنتی تھے۔ اپنے ملازموں کے بھروسہ پر نہ رہ کر ہر کام کی نگرانی خود کرتے۔ اور اگر کاروبار میں نقصان کا خیال آتا تو رات کو سو بھی نہ سکتے''۔

رائے بہادر سیٹھ سر حکم چند آف اندور شروع زندگی میں دو یا تین روپیہ لے کر اندور سے بمبئی گئے۔ وہاں آپ نے کاروبار میں کروڑ ہا روپیہ پیدا کیا۔ ان کی کامیاب زندگی کے متعلق ان کے بھائی رائے بہادر کلیان داس سے بات چیت ہوئی تو کلیان داس جی نے کہا:

''بھائی صاحب یعنی سیٹھ سر حکم چند اگر سردی کے زمانہ میں لحاف اوڑھ کر آرام سے سو رہے ہوں اور ان کو خیال آ جائے کہ رات کو بارش آ جائے گی اور روئی کا بازار گر جائے گا تو پ بمبئی سے باہر کے شہروں میں جہاں آپ کا روئی کا سٹاک ہے تار دینے کے لیے اپنے ملازم کو بلائیں گے۔ اور اگر ملازم نہ ہو گا تو خود تار گھر جا کر تار دیں گے۔ اور واپس آ کر پھر سوئیں گے۔ یعنی وہ تار دیئے بغیر سو نہ سکیں گے۔ تاکہ کاروبار میں ان کو نقصان نہ ہو۔ وہ اپنے نفع و نقصان کا اس قدر خیال رکھتے ہیں''۔

میری رائے میں کامیاب اور ناکام ہونے کے سلسلہ میں انسان میں یہ صفات یا نقائص ضرور ہوتے ہیں:

ا۔ کامیاب لوگ اپنی قابلیت کو ہمیشہ انڈر ریسٹی میٹ یعنی اصل سے کم سمجھتے ہیں اور ناکام لوگ اپنی قابلیت کو اوور ریسٹی میٹ یعنی اصل سے زیادہ قرار دیتے ہیں۔ یعنی کامیاب لوگ کوشش کرتے ہیں کہ وہ مزید واقفیت اور علم حاصل کریں اور ناکام لوگ اپنے آپ کو عالم یا واقف کار سمجھتے ہوئے مزید سیکھنے کی کوشش نہیں کرتے۔

۲۔ کامیاب لوگ مستعدی کے ساتھ دوسروں کے خطوط کا جواب دیتے ہیں۔ ناکام لوگ خط و کتابت کی پروہ نہیں کرتے۔

۳۔ کامیاب لوگ علی الصبح جاگتے ہیں اور کام شروع کر دیتے ہیں ناکام لوگ سورج طلوع ہونے کے بعد جاگتے ہیں اور جن کا اثر ان کے اعصاب پر کاہلی کی

صورت میں ہوتا ہے۔

۴۔ کامیاب لوگ وقت کے پابند ہوتے ہیں اور ناکام لوگ وقت کی پرواہ نہیں کرتے۔

۵۔ کامیاب لوگ چلنے میں تیز رفتار رکام کرنے کے اعتبار سے مستعد ہوتے ہیں ناکام لوگ کاہل اور سست ہوتے ہیں۔

۶۔ کامیاب لوگوں کو محنت پسند ہے۔ اور وہ کام کے بغیر اکتا جاتے ہیں۔ ناکام لوگ محنت سے جی چراتے ہیں اور آرام طلب ہوتے ہیں۔

۷۔ کامیاب لوگ دیانت دار ہوتے ہیں ناکام لوگ فطرتاً بد دیانت اور خود غرض ہوتے ہیں۔

۸۔ کامیاب لوگ فطرتاً فیاض ہوتے ہیں اور ناکام لوگ غیر ضروری طور پر کنجوس اور کفایت شعار ہوتے ہیں۔

۹۔ کامیاب لوگ اپنی زندگی میں خطروں کو لبیک کہتے رہتے ہیں۔ ناکام لوگ خطرہ برداشت نہیں کر سکتے۔

۱۰۔ کامیاب لوگ اپنے مستقبل کو سوچتے ہیں اور اپنے مستقبل کو شاندار بنانے کی کوشش کرتے ہیں ناکام لوگ اپنے ماضی کا خیال کر کے ہنستے یا روتے ہیں اور مستقبل کی کوئی پرواہ نہیں کرتے۔

۱۱۔ کامیاب لوگ عزت و روپیہ قربان کر دیتے ہیں ناکام لوگ روپیہ پر عزت قربان کرنے سے دریغ نہیں کرتے۔

۱۲ کامیاب لوگ منکسر المزاج ہوتے ہیں ناکام لوگوں کے بلند نہ جانے میں غرور اور تکبر اپنا پارٹ ادا کرتا ہے۔

۱۳۔ کامیاب لوگوں میں قابلیت کا ہونا ضروری ہے۔ ناکام لوگ عموماً نالائق اور ڈفر ہوتے ہیں۔

۱۴۔ کامیاب لوگوں کو اپنے وعدہ اور زبان کا بہت خیال ہوتا ہے۔ ناکام لوگ اس کا خیال نہیں کرتے۔

۱۵ کامیاب لوگ سائیکالوجسٹ ہوتے ہیں یعنی وہ دوسروں کا چہرہ دیکھ کر اس کے دل کا پتہ لے لیتے ہیں۔ ناکام لوگ سائیکالوجسٹ نہیں ہوا کرتے۔

۱۶۔ کامیاب لوگ اپنی ذمہ داری کو محسوس کرتے ہیں ناکام لوگ غیر ذمہ دار ہوتے ہیں۔

۱۷۔ کامیاب لوگ اپنی ساکھ کی پرواہ کرتے ہیں ناکام لوگ اپنی ساکھ کی کوئی قیمت نہیں سمجھتے۔

برے اعمال کے برے نتائج

گورو نانک نے گرنتھ صاحب میں فرمایا ہے کہ مندیں کمیں نانکا جد کر مندا ہو۔ (برے اعمال کا نتیجہ ہمیشہ برا ہی ظاہر ہوتا ہے) اس سلسلہ کا ایک دلچسپ واقعہ سنیے۔

بہت برس ہوئے دہلی میں تین اصحاب کی بہت گہری دوستی تھی۔ (۱) رائے مسٹر کلال چند ایڈووکیٹ (جو سناتن دھرم دہلی کے سیکرٹری اور لیڈر بھی تھے) (۲) رام پرتاب جو تجارت کرتے اور (۳) عبدالستار جو موٹروں کی مرمت کا کام کرتا۔ یہ تینوں حضرات بہت گہرے دوست تینوں درپردہ طور پر مشترکہ کاروبار کی آڑ میں کوکین کا کاروبار کرتے۔ کلکتہ سے کوکین لاتے اور اپنے آدمیوں کے ذریعہ دہلی لاہور راولپنڈی پشاور اور کراچی تک بھیجتے۔ ہر بڑے شہر میں کوکین فروخت کرنے کی ان کی ایجنسیاں تھیں اور کوکین بھیجنے کے لیے یہ صرف اپنے ہندوستانی ایجنٹوں سے ہی کام نہ لیتے بلکہ انہوں نے اس بزنس کے لیے یورپین عورتیں بھی ملازم رکھی ہوئی تھیں۔ جو فسٹ کلاس میں سفر کرتے ہوئے مختلف شہروں تک مال لے جاتیں تاکہ پولیس اور ایکسائز والوں کو شک نہ ہو۔ اس جرائم پیشہ مثلث یعنی تینوں کے کاروبار کی کیا پوزیشن تھی اس کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ عبدالستار کی کوکین رکھنے یا فروخت کرنے کے جرم میں خریبار گرفتاریاں ہوئیں مقدمے چلے اور وکلا کی قانونی کوششوں کے باوجود (کیونکہ تمام مقدمات میں کلال چند بھی ان جرائم کے ایک حصہ دار ہونے کے باعث تندہی سے وکالت کرتے) یہ بری ہو جاتا۔ تو پولیس کے اشارہ اور خواہش پر مسٹر پول ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے ایک مقدمہ میں عبدالستار سے بیس ہزار روپیہ ضمانت طلب کی تاکہ ملزم اتنی بڑی ضمانت نہ دے سکے گا۔ اور یہ حوالات میں بند کر دیا جائے گا۔ اس حکم کو سنتے ہی عبدالستار نے پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک ایک ہزار کے بیس نوٹ مسٹر پول کی میز پر رکھ دیے تاکہ ان نوٹوں کو نقد ضمانت قرار دے دیا جائے۔

یہ مجرمانہ مثلث سالہا سال تک دہلی میں جرائم کرتی رہی۔ کوکین، قتل اور غنڈہ پن کے الزامات میں عبدالستار کی درجنوں بار گرفتاریاں ہوئیں۔ تینوں نے لاکھوں روپیہ پیدا کیا تو ایک بار روپیہ کی تقسیم کے سلسلہ میں عبدالستار اور رام پرتاب کے درمیان تعلقات کشیدہ ہو گئے۔ تعلقات کی یہ کشیدگی دلوں کی عداوت کی صورت میں تبدیل ہو گئی مگر زبانی بول چال جاری رہی تھی۔ ایک روز عبدالستار نے رام پرتاب کو اپنے مکان میں بلا لیا۔ پستول دکھاتے ہوئے اس کو خوفزدہ کر کے اس سے پچیس ہزار روپیہ کا ایک پرونوٹ لکھوایا۔ پرونوٹ لکھوانے کے بعد اس کو قتل کیا، اور قتل کرنے کے بعد اس کی لاش کو لکڑی کے ایک بکس میں رکھ کر اس بکس کو موٹر میں رکھ کر دریائے گنگا کے کنارے گڑھ مکتیر کے مقام پر دریا برد کر دیا۔ رام پرتاب کے قتل کے دو تین روز بعد تک اس کے رشتہ دار رام پرتاب کا انتظار کرتے رہے۔ کہ یہ شاید دہلی سے باہر کسی جگہ گیا ہو۔ اس کے بعد انہوں نے تلاش کی مگر کوئی پتہ نہ چلا۔ شہر میں اس کے قتل کی افواہیں پھیلیں، کیونکہ اس زمانہ میں دلی کی آبادی چار لاکھ تک محدود تھی۔ معاملہ پولیس تک پہنچا مگر کوئی سراغ نہ ملا، کیونکہ رات پرتاب کو قتل کرنے اور اس کی لاش کو دریا برد کرنے کا علم سوائے عبدالستار اور اس کی بیوی حسینی (حسینی پہلے طوائف تھی اور اس کے خوبصورت ہونے کے باعث عبدالستار نے اس کو کافی روپیہ اور قتل کی دھمکی دے کر اس سے شادی کر لی تھی) کے کسی دوسرے کو علم نہ تھا۔ پولیس تحقیقات میں کامیاب نہ ہونے کے باعث مقدمہ قائم نہ کر سکی۔ عبدالستار گرفتار نہ ہوا، چند ماہ بعد عبدالستار نے پرونوٹ کا روپیہ وصول کیا۔ اس پرونوٹ کے روپیہ میں مسٹر کلال کا بھی حصہ تھا، کیونکہ وہ عبدالستار کا جرائم میں مستقل ساتھی اور مستقل وکیل مقدمات میں تھا۔

رام پرتاب کے قتل کے بعد عبدالستار اور کلال چند کے تعلقات بھی روپیہ اور حصہ کی تقسیم کے سلسلہ میں کشیدہ ہو گئے۔ یہ کشیدگی بھی دلوں میں عداوت کی صورت میں اختیار کر گئی۔ اور یہ تعلقات کشیدہ تھے اور ویسے بول چال جاری تھی، کہ عبدالستار کو کسی

دوسرے جرم اور مقدمہ میں قید کی سزا ہو گئی۔ اور یہ دہلی جیل سے روہتک جیل میں بطور ایک قیدی کے تبدیل کر دیا گیا۔ یہ روہتک جیل میں ہی تھا کہ ایک روز رات کو دس بجے کے قریب کلال چند کو کسی نے ٹیلی فون کیا (کلال چند کے گھر والوں کو صرف یہ علم تھا کہ کسی نے ٹیلی فون کیا تھا یہ علم نہ ہو سکا کہ کس نے ٹیلی فون کیا اور ٹیلی فون میں کیا کہا گیا) اور ٹیلی فون سننے کے بعد کلال چند اپنی کار میں بیٹھ کر اور کار کو خود چلاتے ہوئے تنہا گھر سے روانہ ہوا اور رات کو یہ واپس نہیں آیا۔ دہلی میں کچھ لوگ علی الصبح تین چار بجے کو سیر جانے کے عادی تھے ان لوگوں میں سے ایک صاحب کنگزوے کی سڑک پر سیر کو گئے اور انہوں نے دیکھا کہ ایک کار کھڑی ہے۔ کار کا انجن چل رہا ہے اور کار میں ایک لاش پڑی ہے۔ اس دیکھنے والے نے پولیس کو اطلاع دی۔ پولیس پہنچی تحقیقات شروع ہوئیں تو معلوم ہوا کہ یہ لاش کلال چند کی ہے۔ جسے پستول کی گولی سے ہلاک کیا گیا ہے۔ پوسٹ مارٹم کے بعد لاش کلال چند کے ورثہ کے حوالہ کر دی گئی۔

رام پرتاب کے بعد جب کلال چند کا بھی قتل ہو چکا تو اس کے بعد ایک صاحب خاں بہادر میاں محمد صادق ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس پنجاب سے تبدیل ہو کر دہلی آئے اس سے پہلے تو عبدالستار اینڈ کو اپنے لوٹ کے مال میں پولیس والوں کو بھی حصہ دیتی رہی۔ ان کے پولیس افسروں کے ساتھ بہت گہرے دوستانہ تعلقات تھے اور یہ افسر ان کے جرائم کی پردہ پوشی کرتے۔ مگر میاں محمد صادق مذہبی خیال کے احمدی اور بہت ہی دیانتدار اور لائق تھے۔ انہوں نے عبدالستار کے متعلق جب یہ تمام حالات سنے تو انہوں نے فیصلہ کیا کہ یہ عبدالستار کے جرائم کو دہلی میں جاری نہ رہنے دیں گے' اور جس قیمت پر بھی ہو ان جرائم کا خاتمہ کریں گے۔ چنانچہ آپ نے قتل کے ان دونوں واقعات کی پھر تفتیش شروع کی۔ عبدالستار پر رام پرتاب کو قتل کرنے کے الزام میں مقدمہ درج کر لیا۔ مقدمہ عدالت میں گیا۔ عبدالستار کی بیوی حسینی نے اپنی شہادت میں رام پرتاب کو قتل کرنے اور اس کی لاش کو موٹر میں ڈال کر گڑھ مکتیر لے

جانے اور وہاں دریا برد کرنے کے چشم دید حالات بتائے۔ مگر چونکہ لاش والا بکس دریا میں نہ مل سکا اور بغیر لاش کے ثبوت کے قتل کے مقدمہ میں کسی ملزم کو سزا نہیں دی جا سکتی اس لیے عدالت سے عبدالستار بری ہو گیا۔ کلال چند کے قتل کے مقدمہ کے سلسلہ میں پولیس کا بیان یہ تھا کہ عبدالستار روہتک جیل کے افسروں کو رشوت دے کر شام کو جیل سے باہر آ گیا۔ رات کو اس نے اور اس کے بھائی نے کلال چند کو ٹیلی فون کر کے کنگزوے روڈ پر بلایا' اور وہاں دونوں نے اسے پستول کے ساتھ قتل کیا۔ کار کا انجن رات بھر چلتا رہا اور صبح چار بجے سیر کرنے والے نے موٹر اور لاش کو دیکھ کر پولیس کو اطلاع دی۔ خان بہادر میاں محمد صادق نے اس مقدمہ کی محنت کے ساتھ تفتیش کی' اور روہتک جیل کے رجسٹروں کے اندراجات دیکھے۔ مگر جیل کے رجسٹروں میں اس رات عبدالستار جیل میں ہی موجود تھا۔ اس لیے عبدالستار پر تو قتل کا مقدمہ قائم نہ ہو سکا۔ اس کے بھائی پر قتل کا مقدمہ قائم ہوا۔ اور وہ بھی عدالت سے بری ہو گیا۔ کیونکہ قتل کے متعلق کوئی عینی شہادت موجود نہ تھی۔ میاں محمد صادق نیک ہونے کے باعث کوئی جھوٹی شہادت یا جھوٹا گواہ عدالت میں پیش نہ کر سکتے تھے۔

عبدالستار کی زندگی کے حالات بہت ہی دلچسپ ہیں کیونکہ اس کی تمام زندگی ہی جرائم کرتے بسر ہوئی۔ ایک بار یہ کوکین خریدنے کے لیے اپنی موٹر میں (کیونکہ بظاہراً طور پر یہ موٹروں کی مرمت کا کاروبار کرتا اور اس کی تحویل میں بیک وقت کئی گاڑیاں ہوا کرتیں) کلکتہ آ گیا اور ایک ایسے دوست کو بھی ساتھ لے گیا جس کے پاس بندوق کا لائسنس تھا۔ کلکتہ پہنچنے کے بعد انہوں نے جانور فروخت کرنے والی ایک دکان سے ایک ہرن خریدا' اور اس ہرن کا پیٹ چاک کیا۔ پیٹ میں سے تمام غلاظت اور انتڑیوں وغیرہ کو نکالا اور اس کی جگہ کوکین کے ٹین کے ڈبے بھر کر سی دیا۔ اور اس ہرن کو کار کے پیچھے سامان لادنے والے کیریئر میں باندھا۔ اور خود معہ بندوق اور لائسنس والے دوست کے کار میں بیٹھ کر دہلی روانہ ہو گیا۔ راستہ میں جہاں شام ہوتی یہ وہاں

تھانہ میں پہنچتے اور پولیس سٹیشن کے افسر سے کہتے کہ پولیس کے بڑے افسر شکار میں ہیں اور یہ ان کی موٹر ہے اور وہ پیچھے دوسری کار میں آ رہے ہیں۔ پولیس افسر ان دونوں کو بڑے پولیس افسر کے ملازم سمجھ کر کھانا کھلاتا رات کو موٹر کی حفاظت کے لیے پہرہ پر کنسٹیبل مقرر کرتا۔ اور یہ رات کو اس تھانہ میں آرام سے سوتے اور صبح ہی پھر وہاں سے چل دیتے۔ اور اس طرح یہ دونوں پولیس والوں کے پولیس تھانوں میں مہمان رہ کر دہلی پہنچ گئے۔ اور ایک ہزار روپیہ کی کوکین دس ہزار روپیہ میں فروخت کی۔ کیونکہ کوکین کا رکھنا یا فروخت کرنا قانوناً جرم تھا اور کوکین کھانے والے اس کی قیمت دس بیس گنا زیادہ ادا کر کے کوکین خریدتے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ عبدالستار نے اپنی زندگی میں روپیہ لے کر کئی لوگوں کو قتل کیا۔ چنانچہ اس نے اس زمانہ میں جب میرا نواب بھوپال کے ساتھ مقدمہ چل رہا تھا' تو بھوپال کے افسروں سے کہا کہ اگر نواب صاحب اسی ہزار روپیہ دیں تو وہ دیوان سنگھ کو قتل کر سکتا ہے۔ مگر بھوپال کے افسروں نے اس کمینہ اور خطرناک خواہش کو ٹھکرا دیا۔ پاکستان قائم ہونے کے بعد عبدالستار کی لعنت سے ہندوستان پاک ہو گیا۔ تبادلہ آبادی کے بعد بھی اس پر پاکستان میں درجنوں مقدمات قائم ہوئے اور اس کو قید کی سزا ہوئی۔ اور ایک مقدمہ اس پر کراچی میں اس جرم میں بھی قائم ہوا کہ اس نے ایک فوجی جرنیل پر کنگ آف عراق کو قتل کرنے کی سازش کا جھوٹا الزام لگایا۔ کراچی میں مجھے کسی دوست نے بتایا تھا کہ یہ اب جیل میں باقاعدگی کے ساتھ نماز پڑھتا ہے اور مذہبی زندگی اختیار کر لی ہے۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ خدا اس کی اس توبہ اور مذہبی زندگی اختیار کرنے پر اس کے پچھلے گناہ معاف کر دے گا یا نہیں مگر میرے عقیدہ اور ایمان کے مطابق گناہوں کا معاف ہونا بہت مشکل ہے۔ اور جرم کی سزا تو ملتی ہی ہے' وہ چاہے کسی صورت سے بھی ملے' اور اس دنیا میں ملے' یا کسی آئندہ دنیا میں یا آئندہ جنم میں' چنانچہ جب میں رام

پرتاب اور کلال چند کے قتل اور عبدالستار کی مجرمانہ زندگی اور اس کی جیل کی زندگی پر غور کرتا ہوں تو گورونانک کا یہ قول گنگنانے پر مجبور ہو جاتا ہوں:

مندیں کمیں نانکا جد کر مندا ہو۔

انگریز اور ہندوستانی

میں لکھنؤ کے قیام کے زمانہ میں جب الہ آباد گیا اور وہاں تین چار روز تک مرحوم سید اکبر الہ آبادی کی خدمت میں ہر روز کئی کئی گھنٹے حاضری دینے اور باتیں کرنے کی مجھے سعادت نصیب ہوئی تو ایک روز مرحوم نے فرمایا:

''روپیہ سے اتنی محبت کرو جتنی ایک انگریز اپنے بیرہ سے کرتا ہے۔ جب ضرورت ہوئی تو بوائے کہہ کر بیرہ کو آواز دی اور بلا لیا۔ اور جب اس سے کام لے لیا گیا تو کمرہ میں کھڑے رہنے کی اجازت بھی نہ دی۔ کیونکہ انگریز بیرہ سے کام لیتا ہے اس سے محبت نہیں کرتا اس طرح ہی روپیہ سے کام لو مگر اس سے محبت نہ کرو''۔

انگریز کے ہندوستانیوں سے کام لینے اور ان سے محبت نہ کرنے کے سلسلہ میں چند واقعات سنیئے:

مرحوم قاضی سر عزیز الدین احمد ایک سیلف میڈ شخصیت تھے۔ آپ غالباً بطور نائب تحصیلدار سرکاری ملازمت میں شامل ہوئے۔ اس کے بعد تحصیلدار ڈپٹی کلکٹر اور پھر ریٹائر ہونے کے بعد دھولپور اور دتیا وغیرہ میں وزیر اعظم رہے۔ اور یہ واقعہ ہے کہ نظام دکن مہاراجہ پٹیالہ' مہاراجہ بیکانیر اور نواب صاحب بہاولپور وغیرہ درجنوں والیان ریاست نے چاہا کہ آپ ان کے ہاں وزیر اعظم ہوں مگر آپ نے انکار کر دیا۔ کیونکہ آپ نے والیان ریاست کے گہرے اور ذاتی دوست تھے۔ اور دوستوں کے ہاں ملازمت کرنا اصولاً غیر مناسب سمجھتے تھے۔ قاضی صاحب مرحوم کی اس ترقی کی وجہ کیا تھی؟ صرف یہ کہ آپ بے حد محنتی تھے۔ علی الصبح تین چار بجے جاگتے اور اپنے کام میں مصروف ہو جاتے۔ بے حد مخلص اور ایماندار انگریزوں کے خیر خواہ اور دلدادہ بلکہ میں اپنے تجربے سے کہہ سکتا ہوں کہ میں نے اپنی زندگی میں ہندوستانیوں میں سے ایک بھی کوئی دوسرا شخص نہیں دیکھا جو قاضی صاحب مرحوم سے زیادہ انگریزوں کا مخلص اور بے ریا دوست ہو۔ مگر بعض انگریز ان کو ان کے ہندوستانی ہونے کے باعث کیا

سمجھتے ؟ اس کا اندازہ صرف اس ایک واقعہ سے ہی کر لیجیے جو قاضی صاحب نے خود مجھے بتایا تھا:

قاضی صاحب مراد آباد میں ڈپٹی کلکٹر تھے ۔ وہاں کا کلکٹر جو انگریز اور انڈین سول سروس کا ایک ممبر تھا تین ماہ کی رخصت پر لندن گیا تو آپ اس کی جگہ تین ماہ کے لیے قائم مقام کلکٹر مقرر ہوئے۔ اور اس انگریز نے جاتے ہوئے قاضی صاحب کو کام کا چارج دیا تو اس کے ساتھ ہی اپنی کوٹھی کی اس آہنی الماری کی چابیاں بھی دے دیں جن میں کام کے بڑے افسروں کی سروس بکیں (ان سروس بکوں میں سروس ہونے والے افسروں کے متعلق اعلیٰ افسروں کے ریمارک وغیرہ ہوا کرتے تھے جو سروس بک میں وقتاً فوقتاً لکھے جاتے تھے) تھیں ۔ اس انگریز افسر کو رخصت پر گئے اور قاضی صاحب کو کلکٹری کا چارج کے لیے ایک ماہ ہو گیا تو آپ کو خیال آیا کہ سروس بکوں میں سے یہ اپنی سروس بک تو دیکھیں ۔ کہ ان کے متعلق افسروں نے کیا کچھ لکھا ہے کیونکہ یہ الماری کانفیڈنشل تھی اسے سوائے کلکٹر کے کوئی دوسرا نہ کھول سکتا تھا یا اس کے کاغذات نہ دیکھ سکتا تھا۔ اور قاضی صاحب کو قائم مقام کلکٹر ہونے کے باعث اس کے دیکھنے کا موقع مل گیا۔ قاضی صاحب نے جب اپنے متعلق کانفڈنشل فائل دیکھی تو اس میں بعض کلکٹروں اور کمشنروں نے تو آپ کی بہت تعریف کی اور اپنی ذاتی رائے لکھتے ہوئے قاضی صاحب کو انتہائی شریف ' انتہائی نیک ' انتہائی دیانتدار ' اور انگریزوں کا انتہائی مخلص اور وفا شعار لکھا مگر ایک کلکٹر نے ان کے متعلق لکھا تھا:

'' ویری کلیور کننگ اینڈ فیتھ فل ڈاگ ''

(بہت ہوشیار ' چالاک اور وفادار کتا)

قاضی صاحب نے بتایا کہ آپ نے اپنے متعلق جب یہ ریمارکس دیکھے تو آپ کو بہت صدمہ ہوا ۔ کہ بعض انگریزوں کی ان کے متعلق کیا رائے ہے اور ان کے اخلاص اور وفا شعاری کے کیا معانی لیے جا رہے ہیں آپ صبر کر گئے کیونکہ انگریزوں کے

ہندوستانیوں کے متعلق فی الحقیقت یہی رائے تھی۔ یہ حکمران قوم ہندوستانیوں سے کام لیتی تھی ان سے محبت نہ کرتی تھی۔

جنگ کا زمانہ تھا مسٹر سبھاش چندر بوس جاپانیوں کے ساتھ مل کر برما پہنچ چکے تھے۔ برما میں جاپانی افواج کا مقابلہ جنرل الیگزینڈر کی کمانڈ میں انگریزی افواج کر رہی تھیں۔ جاپانیوں کا قدم بڑھتا چلا جاتا تھا۔ انڈیمان جزیرے پر جاپانیوں کا قبضہ ہو چکا تھا۔ اور ہر لمحہ توقع تھی کہ جاپانیوں اور جرمنوں کے ہوائی جہاز کلکتہ اور مدراس پر حملہ کر کے ہندوستان کو میدان جنگ بنا دیں گے۔ چنانچہ دہلی کے چاندنی چوک اور دوسرے بازاروں میں پناہ کے لیے خندقیں کھودی جا چکی تھیں اور دہلی کے باہر اونچے مقامات پر ہوائی جہازوں کو گرانے والی طیارہ شکن توپیں بھی نصب کر دی گئی تھیں تو دہلی کے ڈپٹی کمشنر مسٹر لیرڈ نے دہلی کے مقامی رائے بہادروں اور خان بہادروں کے دلوں کو ٹٹولنا شروع کیا کہ اگر انگریز مصیبت میں گرفتار ہوئے تو سرکار کے ان وفا شعاروں سے کس حد تک امداد کی توقع کی جا سکتی ہے یہ رائے بہادر خان بہادر اور سردار بہادر ڈپٹی کمشنر کی خدمت میں حاضر ہوئے کانگرسیوں سے نفرت کرتے ہوئے اپنی وفا شعاری اور انگریزوں کی مصیبت میں امداد کرنے کا یقین دلاتے۔ دہلی کے خطاب یافتہ اور پرو برٹش سرکردہ اصحاب سے انٹرویو کا یہ سلسلہ جاری تھا تو ایک رائے بہادر جو ایماندار اور صاف گو تھے بھی طلب کرنے پر ڈپٹی کمشنر کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور ان کے اور مسٹر لیرڈ ڈپٹی کمشنر کے درمیان یہ بات چیت ہوئی:

مسٹر لیرڈ: ویل رائے بہادر صاحب! ہندوستان پر جاپانی افواج کے حملہ کا بہت بڑا خطرہ پیدا ہو چکا ہے۔ جاپانی برما اور انڈیمان تک پہنچ چکے ہیں اگر جاپان کی فوجوں نے ہندوستان پر حملہ کیا تو آپ ہماری کیا امداد کریں گے؟

رائے بہادر: حضور ہم کیا امداد کر سکتے ہیں۔ اور ہمارے بس میں بھی کیا ہے کہ ہم امداد کریں۔ پبلک کانگرس کے ہاتھوں میں ہے اور لوگ ہماری سننے کے لیے بھی تیار

نہیں ۔ہم تو زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتے ہیں کہ اپنی جائیداد گورنمنٹ کے نذر کر دیں۔
مسٹر لیرڈ: ہم پوچھتا ہے کہ جاپان کی فوجیں ہندوستان پہنچ گئیں تو آپ کیا کرے گا؟

رائے بہادر: حضور ہم کیا کرے گا جیسے آپ کا سلام کرتا ہے ویسے جاپانیوں کو سلام کرے گا ہمارا کام تو سلام کرنا ہے۔
مسٹر لیرڈ نے رائے بہادر کے یہ الفاظ سنے تو ان کی پیشانی پر بل پڑ گئے ۔ڈپٹی کمشنر کی پیشانی پر بل دیکھ کر اور یہ محسوس کرتے ہوئے کہ ڈپٹی کمشنر اس جواب سے ناراض ہیں رائے بہادر نے کہا حضور اصل بات تو یہی ہے کہ جو میں نے آپ سے کہی ۔ نہ حضور ہندوستانیوں کے خیر خواہ ہیں اور نہ ہندوستانی انگریزوں کے ۔ سب اغراض کا سودا ہے۔ویسے جو کہیے میں بھی دوسرے خطاب یافتہ لوگوں کی طرح آپ سے جھوٹ کہہ دیتا ہوں
مسٹر لیرڈ نے رائے بہادر کے یہ الفاظ سنے تو آپ نے انگریزوں کے بلند کریکٹر کا ثبوت دیتے ہوئے رائے بہادر سے کہا:
"رائے صاحب میں آپ کی صاف بیانی پر خوش ہوں اصل بات یہی ہے جو آپ نے ہم سے کہی۔ہم انگریز بھی آپ لوگوں سے کام لیتا ہے آپ سے محبت نہیں کرتا۔آپ لوگ بھی اپنے مطلب کے لیے ہمارے پاس آتا ہے"
دہلی کے سابق ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ایسر مذہباً عیسائی ہیں عیسائی ہونے سے پہلے آپ جہلم کے ایک معزز برہمن خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔اور آپ نہ صرف مذہباً عیسائی ہیں بلکہ دیانتداری رحمدلی شرافت اور کریکٹر کی پاکیزگی کے اعتبار سے بھی عیسائی ہیں۔آپ شملہ میں مجسٹریٹ تھے تو وہاں کمانڈر انچیف فیلڈ مارشل جنرل برڈوڈ کے ایک ملٹری سیکرٹری نے شراب کے نشہ میں ایک قلی کو ٹھوکریں مار کے ہلاک کر دیا۔اس زمانہ میں انگریزوں کے بوٹوں کی نوک کے ذریعہ ہندوستانیوں کی

عموماً اور ہندوستانی قلیوں کی خصوصاً تلیاں کثرت سے پھٹا کرتی تھیں اور انگریز ہندوستانیوں کے مقابلہ پر اپنے کتوں کو زیادہ عزیز سمجھتے تھے۔ اس ملٹری سیکرٹری کے ہاتھوں سے جب قلی ہلاک ہو گیا تو سب سے پہلے پولیس نے اہی اس ملٹری سیکرٹری کا قتل کے الزام میں چالان نہ کیا۔ کیونکہ ایک سب انسپکٹر میں یہ کہاں جرات تھی کہ وہ کسی اعلیٰ فوجی افسر کا قتل کے الزام میں چالان کرتا (اس فوجی افسر کا زیر دفعہ ۳۲۵ کسی کند آلہ سے کسی انسان کو ضرب شدید پہنچانا) چالان کیا گیا جس کی سزا زیادہ سے زیادہ دو برس ہو سکتی تھی قلی کی لاش کا سول سرجن نے پوسٹ مارٹم کیا تو انہوں نے اپنی میڈیکل رپورٹ میں لکھا کہ قلی کی تلی بہت بڑھی ہوئی تھی جو معمولی چوٹ کے باعث اتفاقاً پھٹ گئی۔ یہ چالان مسٹر ایسر کی عدالت میں پیش ہوا۔ مسٹر ایسر نہ صرف نیک دل عیسائی جو ظلم برداشت نہ کر سکتے بلکہ ہندوستانی بھی جنہوں نے محسوس کیا کہ انگریز دراصل ملزم تو قتل کا ہے مگر انگریز ہونے کے باعث اس کے ساتھ رعایت اور اس کی طرف داری کی جا رہی ہے۔ اس کے علاوہ گو جنرل برڈوڈ نے ڈائریکٹ تو مسٹر ایسر سے کچھ نہیں کہا مگر دوسرے ذریعہ سے مسٹر ایسر کے کانوں میں یہ بات ڈال دی گئی کہ جنرل برڈوڈ چاہتے ہیں کہ ان کے ملٹری سیکرٹری کو باعزت بری کر دیا جائے۔ تاکہ اس افسر کی ملازمت قائم رہ سکے اور سزا پانے کے باعث وہ موقوف نہ کر دیا جائے۔ مسٹر ایسر اس کشمکش میں تھے اور ان کو اطلاع ہوئی کہ شملہ کا ڈپٹی کمشنر بھی ان سے اس مقدمہ کے سلسلہ میں سفارش رنے والا ہے تو آپ نے مقدمہ کی کارروائی کو تیزی کے ساتھ جاری کر دیا۔ تاکہ مقدمہ جلدی ختم ہو جائے اور چند روز میں ملزم کو دو برس قید سخت زیر دفعہ ۳۲۵ سنا دی۔ مسٹر ایسر کا یہ فیصلہ شملہ کے فوجی سیکرٹریٹ کے حلقوں میں زبردست سنسنی پیدا کرنے کا باعث ثابت ہوا۔ کیونکہ یہ پہلا واقعہ تھا کہ ایک قلی کو ٹھوکریں مار کر ہلاک کرنے کے جرم میں ایک اعلیٰ افسر کو دو برس کی قید سخت کی سزا سنائی گئی۔ اس زمانہ میں قلیوں کی تلیوں کے پھٹنے کی سزا کسی انگریز کو نہ دی جاتی تھی۔

انگریز ہندوستانیوں کے حاکم تھے اور ہندوستانی انگریزوں کے محکوم ۔ حاکم قوم محکوم قوم سے محبت نہیں کیا کرتی ۔ یہ محکوم قوم کو صرف بیرہ سمجھتے ہوئے صرف کام لیا کرتی ہے ۔

جہاں تک ہندوستانی مستغیث اور ہندوستانی ملزم یا ہندوستانی مدعی اور ہندوستانی مدعا علیہ کے درمیان انصاف کرنے کا تعلق تھا۔ انگریز بلاشبہ فرشتہ تھے ۔اور انگریزوں میں بعض ایسی صفات پائی جاتی تھیں، جو عام انسانوں میں نہیں مل سکتیں ۔مگر جہاں انگریز اور ہندوستانی کے درمیان انصاف کرنے کا تعلق تھا۔ یا جہاں انگریزوں کے اپنے ملک کی آبرو اور مفاد کے جانے کا سوال پیدا ہوتا تھا۔ انگریز بہت بڑا ظالم اور ایک ایسا بد دیانت اور بد کردار تھا، جس نے اپنے ضمیر کو نیلام کیا ہو۔اور جس کا کریکٹر بہت پلید ہو چکا ہو۔

جرنلزم سے بہتر عورتوں کی دلالی

دہلی سے ایک سکھ ہفتہ وار گورمکھی اخبار شائع کرتے ہیں۔ یہ حضرت اپنے اخبار میں تو پنجاب کی کیرون گورنمنٹ کی حمایت کرتے ہیں، تاکہ ان کو دو تین سو روپیہ ماہوار کے اشتہارات ملتے رہیں۔ مگر ذاتی طور پر یہ دہلی کے مقامی اکالی لیڈروں کے ساتھ مقامی سکھ پالیٹکس میں حصہ لیتے ہیں۔ ایک دن یہ حضرت درشن دینے یا درشن کرنے کے لئے دفتر ''ریاست'' میں تشریف لائے، اور ان کے ساتھ دو مقامی اکالی لیڈر بھی تھے۔ جب یہ تشریف لائے اور ست سری اکال کہنے کا آپس میں تبادلہ ہو چکا اور تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد ان ایڈیٹر صاحب اور راقم الحروف کے درمیان ذیل کی گفتگو ہوئی۔

ایڈیٹر صاحب: آپ جرنلزم میں بہت نامور شخصیت ہیں اور آپ کے اخبار کو بے مثال کامیابی نصیب رہی، میں اس میدان میں نیا ہوں اور مجھے بتایئے کہ کامیابی حاصل کرنے کے لئے مجھے کیا کرنا چاہیئے۔

راقم الحروف: میں اس کے متعلق کیا بتا سکتا ہوں؟۔ یہ تو ہر شخص کا اپنا کردار اور اپنی کوشش ہے۔ جو اسے کامیاب یا ناکام بناتی ہے۔ آپ جیسی کوشش کریں گے ویسا ہی نتیجہ ہوگا۔

ایڈیٹر صاحب: آپ تجربہ کار ہیں۔ آپ مجھے بتائیں کہ کامیاب ہونے کے لئے مجھے کیا کرنا چاہیئے؟۔

راقم الحروف: میرا خیال ہے آپ میرے تجربے سے فائدہ نہ اٹھا سکیں گے۔ اس لئے میرا آپ سے کچھ کہنا قطعی لاحاصل ہے۔

ایڈیٹر صاحب: میں آپ کی نصیحت پر ضرور عمل کروں گا۔ آپ تجربہ کار جرنلسٹ ہیں۔ مجھے ضرور بتایئے۔ کہ مجھے کامیابی حاصل کرنے کے لئے کیا کرنا چاہیئے۔

راقم الحروف: اگر آپ میری پچھلی زندگی کے تجربات سے فائدہ اٹھانا ہی چاہتے

ہیں تو میں اپنی ایمان داری کی رائے ظاہر کر دیتا ہوں۔

ایڈیٹر صاحب: ہاں ضرور بتایئے۔

راقم الحروف: میری رائے ہے کہ صبح چاندنی چوک کے گوردوارہ میں سیس گنج میں جایئے، جہاں کے گورو تیغ بہادر شہید ہوئے تھے۔ اور شہادت کے مقام کے سامنے کھڑے ہو کر ارداس (دعا) کیجیے اور حلف کیجیے کہ آپ آئندہ اپنی زندگی میں کبھی بھی روپیہ پر پبلک مفاد کو قربان نہیں کریں گے۔ اور جہاں روپیہ اور پبلک مفاد دونوں میں سے ایک کے انتخاب کا سوال ہوگا۔ وہاں روپیہ کو پبلک مفاد پر قربان کر دیں گے۔ پبلک مفاد کو روپیہ پر قربان نہیں کریں گے۔

ایڈیٹر صاحب: اگر میں نے پبلک مفاد پر روپیہ کو قربان کر دیا پھر تو اخبار میں ایک پیسہ کی آمدنی نہ ہوگی اور میرے بچے بھوکے مر جائیں گے۔

راقم الحروف: میں یہ ماننے کو تیار نہیں ہوں کہ اگر آپ نے روپیہ کو پبلک مفاد کے مقابلہ پر عزیز نہ قرار نہ دیا تو آپ کے بیوی بچے بھوکے مر جائیں گے۔ کیوں کہ اگر ایسا ہوتا تو اخلاص سے پبلک کی خدمت کرنے والے اور ایمان داری سے کام کرنے والے تمام لیڈروں کے بیوی بچے بھوکوں مر جاتے۔ حالانکہ ملک کے مخلص لیڈروں میں گاندھی جی، اور مالویہ جیسے بعض لیڈروں نے پبلک فنڈ کے لئے لاکھوں نہیں کروڑوں روپیہ پبلک سے حاصل کیا۔ میرا تجربہ ہے کہ اگر مخلص ورکر ہو تو اسے پبلک کاموں کے لئے روپیہ کی کمی نہیں ہوا کرتی۔ لوگ اس ورکر کے پیچھے روپیہ اور نوٹوں کی تھیلیاں لیے پھرتے ہیں۔ اور اگر روپیہ نہیں ملتا تو صرف ان ورکرز کو جو پبلک کو اپنی ذاتی اغراض کا تختۂ مشق بناتے ہیں۔

ایڈیٹر صاحب: اگر میں آج آپ کی رائے پر عمل کروں، پھر نہ تو اخبار شائع ہو سکتا ہے، اور میرے بیوی بچے بھی بھوکوں مر جائیں گے۔

راقم الحروف: یہ تو درست ہے کہ آپ کو اس زمانہ تک تکلیف ہوگی۔ جب تک کہ

پبلک آپ کو مخلص ورکر اور دیانت دار جرنلسٹ ہونے کا یقین نہ آجائے۔مگر میں یہ ماننے کے لئے تیار نہیں، کہ آپ کے پبلک کا مخلص خادم ہونے کا پبلک کو یقین آجائے ،تو پھر پبلک کاموں کے لئے روپیہ کی کمی ہو۔میرا تجربہ یہ ہے کہ پبلک اس وقت تک ہم لوگوں کو روپیہ نہیں دیتی۔جب تک کہ وہ ہمیں قومی چور سمجھتی ہے۔اور اسے حق بھی حاصل ہے کہ قومی چوروں کے لئے اپنی جیب خالی نہ کرے۔مگر اس صورت میں کہ ہم فی الحقیقت ایمان دار اور پبلک کے خادم ہوں ،تو پبلک روپیہ کی کمی نہیں رہنے دیتی۔یعنی کمی ہم میں ہے۔کہ ہم پبلک کے مخلص خادم نہیں۔اور ہم پبلک مفاد کو ذاتی اغراض پر قربان کر دیتے ہیں۔پبلک کے لئے مخلص ورکرز کے لئے روپیہ کی کمی نہیں۔

ایڈیٹر صاحب: پبلک مفاد کے لئے اپنے کاروبار کو تباہ کرنا تو میرے لئے خطرناک ہوگا۔آپ کوئی اور صورت بتایئے کہ میری زندگی کامیاب ہو۔

راقم الحروف: آپ کا مطلب یہ ہے کہ تجارتی اعتبار سے کیوں کر زیادہ روپیہ پیدا کر سکتے ہیں؟۔

ایڈیٹر صاحب: جی ہاں!

راقم الحروف: اگر ایسی صورت ہے تو میں ایک دوسرا نسخہ بھی بتا دیتا ہوں۔مگر پھر آپ کو پبلک مفاد کی قطعی پرواہ نہ کرنی ہوگی۔بلکہ اگر آپ پبلک کی ڈس سروس کریں، یعنی پبلک کا نقصان بھی ہو تو آپ کو پرواہ نہ کرنا ہوگی۔

ایڈیٹر صاحب: ہاں ہاں آپ بتایئے مجھے کیا کرنا چاہیئے؟۔

راقم الحروف: اس کے لئے بہترین صورت یہ ہوگی کہ آپ نینی تال یا الموڑہ کے علاقے سے تین چار نوجوان اور خوب صورت پہاڑی لڑکیاں منگوایئے۔وہاں سے پہاڑی لڑکیاں بہت ارزاں مل جاتی ہیں۔ان لڑکیوں کی عمر تیرہ سے سولہ برس کے درمیان ہو۔ان لڑکیوں کو لے کر آپ جی۔ٹی روڈ (جہاں طوائفیں پیشہ کرتی ہیں) پر

ایک اچھا سا شاندار مکان کرایہ پر لے کر رہیئے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ ماہوار آمدنی دو ہزار روپیہ سے کم نہ ہوگی، بلکہ بعض اوقات تو آپ دو، دو، تین، تین سو روپیہ روزانہ پیدا کر لیں گے۔ اس کے علاوہ دو تین برس تک آپ کے دروازے پر موٹریں کھڑی رہیں گی۔ دو تین برس بعد ان لڑکیوں کو تو نینی تال یا الموڑہ بھیج دیجیے اور نئی لڑکیاں لے آئیے۔ اور اس طرح اپنا کاروبار جاری رکھیں۔ اس طرح آپ زندگی میں لاکھوں روپیہ پیدا کریں گے۔

میں نے جب ان سکھ ایڈیٹر صاحب کو روپیہ پیدا کرنے کا یہ نیا نسخہ بتایا تو ایڈیٹر صاحب کا رنگ فق ہو گیا۔ اور وہ بہت شرمندہ ہوئے۔ مگر ان کے ہمراہی مقامی اکالی لیڈر اس نئے نسخہ کو سن کر مسکرا رہے تھے۔ اور وہ کبھی میری طرف دیکھتے اور کبھی ایڈیٹر صاحب کی طرف۔

اس واقعہ کے چند ماہ بعد معلوم ہوا کہ ایڈیٹر صاحب امریکہ کے نئی دہلی کے سفارت خانہ کے پراپیگنڈہ ڈیپارٹمنٹ میں ملازم ہو گئے ہیں۔ اور اخبار کا ڈیکلریشن اپنی بیوی کو دلوا دیا ہے۔ یعنی یہ خود امریکن سیوا میں مصروف ہو گئے اور پنتھ کی خدمت انہوں نے اپنی بیوی کے سپرد کر دی۔ اور دہلی کے وہ مقامی لیڈر جو آپ کے ساتھ آئے تھے۔ ایک بار مجھے دہلی کی عدالتوں کے کمپاونڈ میں ملے۔ تو یہ میرا الموڑہ اور نینی تال والا نسخہ یاد کر کے مسکرا دیئے۔

آج سے پچاس ساٹھ برس پہلے ہندوستان میں اخبار نویسوں کو انتہائی عزت واحترام کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ:

''یہ لوگ اخبار جاری کرتے تو پبلک خدمت کے خیال سے۔ مگر اب ہندوستان کا جرنلزم ایک خالص تجارت ہے۔ جس پر پبلک مفاد قربان کر دیا جاتا ہے۔ اور کچھ بڑے اخبار تو ایسے ہیں کہ جو لاکھوں روپے کا سرمایا لگا کر کروڑوں روپیہ پیدا کرنے کی فکر میں ہیں۔ اور چھوٹے اخبارات کا زیادہ حلقہ اپنا ضمیر فروخت کرنے ہی کو جرنلزم

سمجھتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ پبلک کے دل میں اب اخبار نویسوں کے لئے عزت و محبت کے جذبات نہیں ہیں۔ اخبارات جاری ہیں تو تجارت کی غرض سے۔ اور لوگ اخبارات پڑھتے ہیں تو صرف چٹخارے لینے، اپنا وقت صرف کرنے اور خبریں اور معلومات حاصل کرنے کے لئے، اور میری ایمانداری کی رائے یہ ہے کہ ہم جرنلسٹ اگر پبلک مفاد کو روپیہ اور ذاتی اغراض پر قربان کرنے سے باز نہیں رہ سکتے تو بہتر ہے کہ ہندو پاک کی گورنمنٹیں اس جرنلزم کا گلا گھونٹ دیں اور ہم پیٹ بھرنے کے لئے کوئی اور ذریعہ اختیار کریں۔ پبلک کو نقصان پہنچانے والے ہمارے موجودہ جرنلزم کے مقابلے پر نینی تال اور الموڑہ والا نسخہ فی الحقیقت ہزار درجہ بہتر ہے۔ کیونکہ اس نسخہ سے صرف چند لوگ تباہ ہوں گے اور موجودہ جرنلزم سے تباہ ہونے والا پبلک کا حلقہ بہت وسیع ہے۔

لیڈروں اور ایڈیٹروں کے لئے مجرب نسخے

دو برس ہوئے پنجاب کے وزیر گیان سنگھ روڑے والا دفتر ''ریاست'' میں تشریف لائے اور آپ کے آنے کا مقصد مشورہ کرنا تھا۔ کہ آپ اپنے روزنامہ اخبار کا ایڈیٹر مقرر کریں، جو آپ پٹیالہ سے جاری کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے پوچھا؟ آپ کتنا روپیہ صرف کرنا چاہتے ہیں۔ تو آپ نے بتایا کہ آپ نے صرف دس ہزار کا انتظام کیا ہے۔ میں نے ان سے تمام حالات سننے کے بعد کہا کہ نہ صرف دس ہزار سرمایے سے ایک روزنامہ اخبار جاری کرنا سخت غلطی ہوگی، بلکہ کسی بھی لیڈر کا اپنا اخبار جاری کرنا ایک غلط ترین اقدام ہے۔ اس کی دو وجوہ ہیں۔ ایک تو یہ کہ اپنا اخبار جاری کرنے کی وجہ سے تمام اخبارات رقابت کے باعث اس لیڈر کے دشمن ہو جاتے ہیں۔ دوسرے لوگوں کو جب پراپگینڈہ کرنے کے باعث یہ علم ہوتا ہے کہ پراپیگنڈہ کرنے والا اخبار اس لیڈر کی ملکیت ہے۔ تو اس اخبار کے پراپیگنڈے کا پبلک پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اور پبلک محسوس کرتی ہے کہ یہ اخبار اپنے ملک کی قصیدہ خوانی کرتا ہے۔ میرے اس جواب پر سردار گیان سنگھ نے سوال کیا، کہ پھر اپنے حق میں پبلک رائے کو پیدا کرنے کے لئے لیڈروں کو کیا کرنا چاہیئے؟ تو میں نے بتایا کہ دوسرے اخباروں کے مالکان اور ایڈیٹروں سے دوستانہ تعلقات پیدا کرنا چاہیئے۔ اور چھوٹے اخبارات کو تو نقد روپیہ بطور امداد دیا جائے، اور جن بڑے اخبارات کا ضمیر تھوڑے روپے سے نہیں خریدا جا سکتا، ان کے ایڈیٹروں اور مالکان کی دعوتیں کی جائیں۔ چنانچہ ان ایڈیٹروں اور لیڈروں کی کامیابی کے لئے چند مجرب نسخے لکھتا ہوں، جو بلاشبہ مفید ہیں۔

لیڈروں کے لئے

ا۔ لیڈر اپنا ذاتی اخبار کبھی جاری نہ کریں، کیونکہ اپنا اخبار جاری کرنے کی صورت میں تجارتی رقابت کے باعث دوسرے تمام اخبارات اس لیڈر کے خلاف ہو جائیں

گے ۔اور قدم قدم پر اس کی مخالفت کریں گے ۔

۲۔اپنا اخبار جاری نہ کرنے کی صورت میں لیڈر کو چاہیئے کہ وہ فاقہ کش اور مالی مشکلات میں مبتلا اخبارات کا ضمیر خریدنے کے لئے ان اخبارات کو کبھی کبھی مالی امداد دے دیا کریں، تاکہ یہ اخبارات اس لیڈر کے بیانات شائع کریں ۔اس کی تصویریں شائع کریں ۔اس کے حق میں اڈیٹوریل لکھیں۔

۳۔اگر لیڈر وزیر ہو یا وزراء پر اس کا اثر ہو تو یہ لیڈر اپنے اثرات کا استعمال کرتے ہوئے ان ایسے اخبارات کے لئے سرکاری اشتہارات کا انتظام کرے۔چاہے یہ اخبارات سو دو سو ہی چھپتے ہوں۔

۴۔اگر اخبار زیادہ اشاعت رکھتا ہو، اور تجارتی اعتبار سے کام یاب ہو تو اس اخبار کے مالکان کو کبھی نقد روپیہ پیش نہ کیا جائے ۔کیونکہ چند سو یا ایک ہزار روپیہ دینا اخبار کے مالک کے لئے باعث کشش نہ ہوگا۔اس اخبار کے مالک کو اپنے ہاں آنے کی دعوت دی جائیں ۔اور ان سے مسکرا مسکرا کر باتیں کی جائیں ۔اور کبھی کبھی کوئی قیمتی شے مثلاً ان کی بیوی کے لئے ریشمی ساڑھیاں، کوئی جڑاو نیکلس یا موسمی پھل آم وغیرہ بھیجے جائیں۔

۵۔کام یاب اخبارات کے سب اڈیٹروں کو کبھی کبھی نقد روپیہ، وسکی کی چند بوتلیں، یا کپڑے کے تھان بھیجے جائیں ۔تاکہ ان لوگوں کی ہمدردی بھی حاصل کی جائے ،اور یہ لوگ خبریں ترتیب دیتے وقت عنوانات اس لیڈر کے حق میں قائم کریں۔

۶۔لیڈر کو کوشش کرنی چاہیئے کہ وہ اپنے ووٹروں کے حلقہ میں کسی ایک فرد کو بھی بد دل یا ناراض ہونے کا موقع نہ دے، چاہے اسے لوگوں سے جھوٹے وعدے ہی کرنا پڑیں، کیونکہ ووٹر اگر بد دل ہوں گے تو یہ ووٹ اس لیڈر کے حق میں نہ دیں گے، اور الیکشن میں ناکامی ہوگی۔

۷۔ لیڈر تقریر ضرور کر لیتا ہو۔ اور اگر یہ تقریر نہ کر سکتا ہو تو تقریر کرنے کی مشق کرے، اور اس کی تقریر میں جوش ہو۔ اور یہ لوگوں کو بیوقوف بنانے پر قادر ہو۔ ورنہ اچھی تقریر نہ کرنے کی صورت میں یہ لوگوں کی سادہ لوحی سے فائدہ نہ اٹھا سکے گا۔

۸۔ الیکشن کا زمانہ جب قریب ہو تو یہ اپنی کانسٹی ٹیونسی کے لوگوں سے زیادہ سے زیادہ اخلاص اور محبت کا اظہار کرے، کوئی بااثر ووٹر بیمار ہو تو یہ اظہار ہمدردی کے خیال سے اس ووٹر کے گھر چلا جائے، اور ادنیٰ لوگوں سے بھی مسکرا مسکرا کر اور ہاتھ باندھ کر ملے۔

الیکشن کے زمانہ میں لیڈر کو چاہیئے کہ وہ کوشش کر کے بھی افتتاحی تقریبوں میں حصہ لے۔ یہ رسم افتتاح چاہے کسی ہوٹل، دواخانہ یا جوتوں کی دکان کے سلسلہ میں ہی کیوں نہ ہو، تاکہ ایسے مواقع پر وہ اپنے ووٹروں سے میل جول قائم رکھ سکے۔

۱۰۔ لیڈر کو چاہیئے کہ وہ کچھ غنڈوں کو بھی اپنے ہاتھوں میں رکھے۔ تاکہ اس لیڈر کے طلب کیے گئے جلسوں میں یہ غنڈے زندہ باد کے نعرے بلند کریں۔ اور اگر کوئی شخص جلسہ میں مخالفت کرے تو یہ اس کی آواز کو پیدا کرنے سے روک سکیں۔

۱۱۔ لیڈر کے لئے مناسب ہے کہ وہ اپنے وقت کا زیادہ حصہ گھر سے باہر اور ووٹروں سے ملنے میں صرف کرے۔ خصوصاً الیکشن کے زمانہ میں۔

۱۲۔ لیڈر کا فرض ہے کہ وہ مقامی حکام مثلاً مجسٹریٹوں اور پولیس افسروں سے گہرے دوستانہ تعلقات رکھے۔ تاکہ اگر کوئی ووٹر جرم کرے تو لیڈر اس کی سفارش اور امداد کر سکے۔

۱۳۔ لیڈر کو چاہیئے کہ جب کبھی ان کے ہاں وزیر اعظم یا کوئی بڑا لیڈر آ جائے تو پریس فوٹو گرافر کے فوٹو لیتے وقت وہ اس بڑے لیڈر کے ساتھ کھڑا ہو جائے، تاکہ لوگوں کو یقین ہو جائے، کہ وزیر اعظم یا بڑا لیڈر اس کا دوست ہے۔

۱۴۔ لیڈر کو چاہیئے کہ اگر پبلک کی طرف سے اسے کوئی تھیلی پیش کرے تو وہ یہ

روپیہ کسی مقامی سکول، کالج یا انسی ٹیوشن کو دے دے، تا کہ لوگوں پر اس کے ایثار اور قربانی کا اثر ہو۔

۱۵۔لیڈر کے لئے مناسب ہے کہ وہ خود روپیہ پرمٹوں کے ذریعہ پیدا کرے اور یہ پرمٹ کسی اپنے دوست کے نام لے کر اس میں اپنا حصہ مقرر کرے۔تا کہ کسی کو اعتراض کا موقع نہ ملے۔

۱۶۔لیڈر کے لئے مناسب ہے کہ وہ کبھی اپنے نام جائیداد نہ خریدے،اور نقد روپیہ اپنے قابل اعتماد دوستوں اور رشتہ داروں کے پاس بطور امانت رکھے،تا کہ وہ ضرورت کے وقت لے سکے۔اور روپیہ کا کوئی ثبوت نہ ہو۔

۱۷۔لیڈر کے لئے مناسب ہے کہ وہ کسی بنک یا ساہوکار کا تھوڑا بہت قرضہ بھی اپنے نام رکھے۔تا کہ لوگ اس کو مقروض اور دیانت دار سمجھیں۔

اخبارات کے ایڈیٹروں کے لئے:۔

۱۔ایک کامیاب ایڈیٹر کے لئے ضروری ہے کہ اس کی کرسی پر سریش کی قسم کی کوئی چیز چپکنے والی لگی ہو۔تا کہ وہ اس کرسی پر ہمیشہ بیٹھا رہے۔اور زیادہ سے زیادہ کام کر سکے۔

۲۔ایڈیٹر کو کسی بھی پارٹی یا جلسہ میں نہ جانا چاہیئے۔تا کہ لوگ اس کے سوشل تعلقات سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کی پالیسی میں مداخلت نہ کریں۔

۳۔اخبار کے ایڈیٹر کو چاہیئے کہ وہ کسی بھی لیڈر سے دوستانہ تعلقات نہ رکھے۔ تا کہ نا معلوم کب اس لیڈر کی مخالفت کرنی پڑے،اور لیڈر کی دوستی اس کی راہ میں مخل ہو۔

۴۔اخبار کے ایڈیٹر کو چاہیئے کہ وہ شادی نہ کرے تا کہ بیوی بچوں کی فکر سے قطعی آزاد رہے۔

۵۔اخبار کے ایڈیٹر جب بھی کوئی مضمون لکھے تو لکھنے کے بعد دیکھ لے کہ اگر اس

مضمون کے لکھنے کے بعد اس پر مقدمہ چلا تو عدالت میں اس مضمون کے متعلق کیا ڈیفنس ہوگا۔

۶۔ بڑے اخبارات کو اے، بی، سی، کا سٹرفکیٹ ضرور لے لینا چاہیئے۔ تاکہ وہ اس سٹرفکیٹ کے ذریعے اچھے اور بڑے پروگرام بنا سکیں۔

۷۔ جو اخبارات چھوٹی حیثیت کے ہیں، ان کو چاہیئے کہ وہ اپنی اشاعت کبھی نہ بتائیں تاکہ مشتہرین کو تاریکی میں رکھتے ہوئے اشتہار حاصل کر سکیں۔

۸۔ جو اخبارات سرکاری اشتہارات لینا چاہیں، ان کے لئے مناسب ہے کہ وہ پبلک کے احساس کی پرواہ نہ کرتے ہوئے صوبہ کے وزراء کی پورے زور سے حمایت اور تعریف کریں، اور ان وزراء کے مخالفین کی مخالفت کرتے رہیں۔

۹۔ اخبار کے ایڈیٹروں کو چاہیئے کہ اگر لوگ ان پر نکتہ چینی کریں تو اپنے اندر نکتہ چینی برداشت کرنے کی قوت پیدا کریں۔ ہاں اگر کوئی دوسرا اپنی ذاتی اغراض کے باعث ذاتی حملہ کرے تو اسے کبھی معاف نہ کریں، اور اسے جیل ضرور بھجوائیں۔ تاکہ کسی دوسرے شخص کو آئندہ ایسا کرنے کا حوصلہ نہ ہو۔

۱۰۔ چھوٹا اخبار ہو یا بڑا، اسے چاہیئے کہ وہ فلم ایکٹرسوں کی نیم عریاں تصاویر ضرور شائع کرے، کیونکہ ان تصاویر کے ذریعہ یہ اخبار اپنے پڑھنے والوں کی جنسی خدمات انجام دے گا۔

۱۱۔ اخبار کے ایڈیٹر کو چاہیئے کہ وہ اپنی بیوی کو بھی اظہار محبت کا کبھی خط نہ لکھے، کیونکہ اگر یہ خط کسی مخالف کے ہاتھ آ گیا تو اس خط کو کسی دوسری عورت سے منسوب کر کے اسے رسوا نہ کیا جا سکے۔

۱۲۔ چھوٹے اخبارات اپنے اندر دلچسپی پیدا کرنے کے لئے پانچ، دس، یا پندرہ برس پہلے کے شائع شدہ مضامین اور افسانے پھر چھاپ سکتے ہیں۔ کیونکہ ان کے پڑھنے والوں کو کچھ یاد نہیں رہتا کہ وہ یہ مضمون پہلے پڑھ چکے ہیں۔

۱۳۔اخبار کا خالص تجارتی ادارہ سمجھتے ہوئے اس کے لئے وہ سب کچھ کیا جائے جو اس کے لئے روپیہ لانے کا باعث ہو۔تا کہ ایڈیٹر صاحب کو محلّہ کے لوگوں، رشتہ داروں، اور دوستوں میں اچھی حیثیت کا قرار دیا جائے، اس کے لئے لوگوں کو مالی مشکلات نہ پیش آئیں۔اور سمجھ دار لوگ اس کو نا کام جرائم پیشہ لوگوں میں شمار نہ کریں۔

The End---------------------اختتام
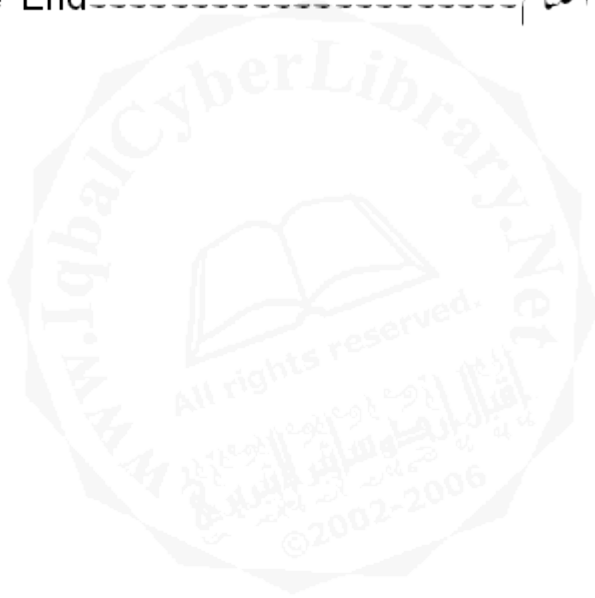
ہے۔

رشوت کھانے والے سپرنٹنڈنٹ پولیس فی تھانہ کچھ رقم ماہوار مقرر کر لیتے ہیں اور یہ تھانہ کی حیثیت سے ہوا کرتا ہے مثلاً جس تھانہ میں جرائم زیادہ ہوں اور تھانیدار کئی ہزار روپے ماہوار پیدا کر لیتا ہو تو اس تھانہ سے ایک ہزار روپیہ ماہوار سپرنٹنڈنٹ پولیس کے لیے ریزرو رہتا ہے اور چھاٹے تھانہ سے پانچ سو یا ڈھائی سو روپے ماہوار اس آمدنی کو بھی سپرنٹنڈنٹ صاحب کی بیوی ''اوپر کی آمدنی'' قرار دیا کرتی ہیں۔

اوپر کی آمدنی کا دارومدار علاقہ پر بھی منحصر ہے۔ پنجاب پنجاب کا کانسٹیبل کسی ملزم سے پانچ روپیہ رشوت لیتا ہے تو یوپی کا کانسٹیبل صرف تمباکو کی بیڑی کے ایک پیکٹ پر ہی مطمئن ہو جاتا ہے۔

بڑے لوگوں کی اوپر کی آمدنی عام لوگوں سے مختلف ہوتی ہے مثلاً اگر کوئی وزیر کسی شخص کو ٹرک کا پرمٹ دے تو وہ پرمٹ دیتے وقت کچھ طلب نہیں کرتا۔ مگر چھ ماہ بعد چندہ کے نام پر پرمٹ لینے والے سے پانچ یا دس ہزار روپیہ وصول کرتا ہے۔ اس سلسلے کا ایک واقعہ مجھے یاد آ گیا۔

پنجاب کے ایک مہاراجہ ظلم کے اعتبار سے بہت بدنام تھے اور ان کو گدی سے اتارنے کا مسئلہ وائسرائے کے سامنے درپیش تھا تو ایجنٹ گورنر جنرل ریاست ہائے پنجاب نے اس مہاراجہ کی امداد کی اور وائسرائے سے کہا کہ اس کو گدی سے اترنے سے بچا لیا اور اس امداد کے باعث ایجنٹ اور مہاراجہ کے درمیان گہرے دوستانہ تعلقات ہو گئے چنانچہ دو برس کے بعد ایجنٹ گورنر جنرل نے اپنی مشکلات کے نام پر مہاراجہ سے دس لاکھ روپیہ حاصل کیا یہ رشوت نہ تھی بلکہ ایجنٹ گورنر جنرل کی صرف اوپر کی آمدنی تھی۔

اوپر کی آمدنی کے سلسلہ میں ایک دلچسپ واقعہ یاد آ گیا پنجاب ک اایک گداگر گداگری کے سلسلہ میں ایک گھر میں گیا اور اس نے خیرات حاصل کرنے کے لئے